2
مرقاۃ المفاتیح
شرح اُردو
مشکوٰۃ المصابیح
للعلامہ الشیخ القاری علی بن سلطان محمد القاری
مترجم: مولانا راؤ محمد ندیم
www.KitaboSunnat.com
مکتبۃ رحمانیۃ

مرقاۃ المفاتیح اردو

للعلامہ الشیخ القاری علی بن سلطان محمد القاری ھجری ۱۰۱۴

شرح

مشکوۃ المصابیح

للامام العلامۃ محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی المتوفی ۷۴۱

مترجم: مولانا راؤ محمد ندیم

جلد دوم

مکتبہ رحمانیہ

MAKTABA-E-REHMANIA

اقراء سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

فون: 042-37224228-37355743

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکتبہ رحمانیہ

نام کتاب: .... مرقاۃ المفاتیح اُردو (جلد دوم)

مترجم: .... مولانا راؤ محمد ندیم

ناشر: .... مکتبہ رحمانیہ

مطبع: .... لٹل سٹار پرنٹرز لاہور

استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت' طباعت' تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔

بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرما دیں۔ ان شاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لیے ہم بے حد شکر گزار ہوں گے۔ (ادارہ)

فہرست

الموضوع

كِتَابُ الطَّهَارَةِ

پاکیزگی کا بیان

طہارت نجاست حکمی اور حقیقی سے ہوگی اور طہارت کی اصل ظاہری اور مخفی عیب سے صفائی اور پاکیزگی حاصل کرنا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ﴾ [الأعراف: ۸۲] "یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں"۔

عبادت علم کا نتیجہ ہے اور عبادات میں سب سے افضل نماز ہے اور طہارت نماز کی ان شرائط میں سے ہے جس پر اس کا صحیح ہونا موقوف ہے اس لئے "كتاب العلم" کے بعد "كتاب الطهارة" لے کر آئے۔

نماز کی شرائط میں سے اس کو خاص اس لئے کیا کہ یہ سقوط کو قبول نہیں کرتی اور اس لئے بھی کہ اس کے مسائل کثیر ہونے کی وجہ سے ان کی طرف احتیاج ہوتی ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "ظاہر کے پاک کرنے میں طہارت کے کئی مراتب ہیں یعنی نجاست حکمی اور حقیقی سے پاکی پھر اعضاء کو گناہوں سے پاک کرنا پھر دِل کو قبیح اخلاق سے پاک کرنا، پھر باطن کو اللہ کے غیر سے پاک کرنا ہے"۔

الفصل الاول:

طہارت نصف ایمان ہے

۲۸۱: عَنْ اَبِىْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيْزَانَ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَآنِ اَوْ تَمْلَأُ مَابَيْنَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَالصَّلٰوةُ نُوْرٌ وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ وَالْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَيْكَ كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَّفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا (رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِىْ رِوَايَةٍ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ تَمْلَآنِ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ لَمْ اَجِدْ هٰذِهِ الرِّوَايَةَ فِى الصَّحِيْحَيْنِ وَلَا فِىْ كِتَابِ الْحُمَيْدِيِّ وَلَا فِى الْجَامِعِ وَلٰكِنَ

ذَكَرَهَا الدَّارِمِيُّ) بَدَلَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ۔

تخریج: أخرجه مسلم ۱/۲۰۳ حديث رقم (۲۲۳-۱)۔وأخرجه أحمد في المسند ۵/۳۴۲ جمعًا بين الروايتان وأخرجه الدارمي ۱/۱۷۴ حديث ۶۵۳۔والترمذي ۵/۵۰۱ حديث ۳۵۱۷ والنسائي بنحوه ۵/۵ حديث رقم ۲۴۳۷۔

ترجمہ: حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ پاکیزگی حاصل کرنا نصف ایمان ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہنا نامۂ اعمال کے ترازو کو بھر دیتا ہے اور سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ دونوں یا فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک آسمان اور زمین کے درمیانی خلا کو بھر دیتا ہے، نماز نور ہے، صدقہ دلیل ہے، صبر کرنا روشنی ہے اور قرآن تمہارے لیے یا تمہارے خلاف دلیل ہے ہر انسان جب صبح کرتا ہے۔ یعنی جب نیند سے بیدار ہوتا ہے۔ تو اپنی جان کو اپنے کاموں میں فروخت کرتا ہے۔ یعنی لگا تا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی جان کو آزاد کرتا ہے یا ہلاک کرتا ہے اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔ دونوں آسمان اور زمین کے درمیانی خلا کو بھر دیتے ہیں ہے۔

اسنادی حیثیت: صاحبِ مشکوٰۃ کا کہنا ہے کہ میں نے اس روایت کو نہ بخاری میں پایا اور نہ مسلم میں اور نہ ہی حمیدی کی کتاب میں یہ روایت مجھے دستیاب ہوئی ہے اور اس طرح یہ روایت مجھے کتاب جامع الاصول میں بھی نہیں ملی۔ البتہ دارمی نے اس روایت کو بجائے سبحان اللہ والحمد للہ کے ذکر کیا ہے۔ (پھر معلوم نہیں کہ صاحب مشکوٰۃ رحمہ اللہ نے اس کو فصلِ اوّل میں کیسے نقل کر دیا ہے) یہ بات ہمارے لئے تعجب خیز ہے۔

راویٔ حدیث:

ابو مالک بن عاصم: یہ ''ابو مالک'' ہیں۔ نام ''کعب'' ہے۔ ''عاصم'' کے بیٹے ہیں اور ''اشعری'' ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے تاریخ میں اور دوسرے حضرات نے ایسا ہی بیان کیا ہے۔ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔ ان سے عبدالرحمٰن بن غنم کی روایت میں امام بخاری رحمہ اللہ نے بطور اظہارِ شک فرمایا کہ ہم سے ابو مالک یا ابو عامر نے حدیث بیان کی۔ ابن المدینی نے کہا کہ یہاں ''مالک'' ہی صحیح ہے۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں وفات ہوئی۔

صاحب مشکوٰۃؒ فرماتے ہیں ''کہ یہاں ابو مالک کعب بن عاصم اشعری مراد ہیں'' امام بخاریؒ کے تاریخ اور اس کے علاوہ میں ہی کہا ہے اور امام بخاریؒ نے عبدالرحمٰن بن غنم کی روایت میں فرمایا ہے: **حد ثنا ابو مالك اَو ابو عامر** شک کے ساتھ ابن المدنی فرماتے ہیں ابو مالک ہی صحیح ہے اور محدثین نے ان سے روایت کی ہے اور یہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں وفات پا گئے تھے۔

تشریح: **قوله: قال رسول الله ﷺ: الطهور شطر الايمان**:

الطهور: ''طاء'' کے ضمہ کے ساتھ ہے اور یہی زیادہ صحیح اور زیادہ ظاہر ہے اور فتحہ کے ساتھ بھی ہے۔ شیخ محی الدین نوویؒ نے فرمایا ہے جمہور اہل لغت اس پر ہیں کہ طہور اور وضو سے مراد جب مصدر ہو تو اس وقت ان کو ضمہ دیا جائے گا اور جب ان سے آلۂ تطہیر یعنی جسے سے پاکی حاصل کی جائے مراد ہو تو اس وقت ان کو فتحہ دیا جائے گا۔ ابن الانباری سے بھی یہی منقول ہے

اور امام خلیل اصمعی ،ابوحاتم سجستانی ،ازہری ،اور چند علماء اس بات کی طرف گئے ہیں کہ یہ فتحہ کے ساتھ اسم اور مصدر میں مستعمل ہے۔

زین العرب فرماتے ہیں کہ طہور یہاں پر اور اس کے علاوہ ان دوسری احادیث میں جو جمہور رواۃ سے مروی ہیں ضمہ کے ساتھ ہے اور سیبویہ نے اس کو فتح کے ساتھ نقل کیا ہے اس لئے کہ وزن فعول مصدر کی صورت میں آتا ہے جیسا کہ الوع اور قبول، پس اگر تو اس کو اسم بنائے آلہ تطہیر کا جیسا کہ سعوط، پس اس صورت میں مضاف محذوف ہوگا۔ای **استعماله** اور جس نے اس کو ضمہ کے ساتھ نقل کیا ہے پس ان پر اشکال نہیں۔

شطر الایمان: امام نووی فرماتے ہیں ''شطر کی اصل نصف ہے''۔بعض کا کہنا ہے کہ ''شطر الایمان'' کا مطلب یہ ہے کہ اجر وضو میں ایمان کے اجر کے نصف کو پہنچ جاتا ہے۔

ملا علی قاری علیہ رحمۃ الباری فرماتے ہیں کہ ''اس بات میں اعتراض ظاہر ہے اس لئے کہ نماز کہ جس کی شرائط میں سے وضو بھی ہے وہاں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نماز کا ثواب ایمان کے ثواب کا نصف ہے بلکہ تمام اعمال میں بھی یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ ایمان کا نصف ہوں ،صرف معتزلہ اور خوارج کے فاسد عقیدہ میں یہ ہو سکتا ہے اس لئے کہ انہوں نے عمل کو ایمان کا شطر (نصف) بنایا ہے اور اس کے علاوہ عمل کے شطر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا ثواب ایمان کے ثواب کے برابر ہو اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے اس حال میں کہ عمل کی صحت یہ ایمان پر موقوف ہے نہ کہ اس کے برعکس۔پس وہ (ایمان) تمام میں اصل ہے۔پس وہ کبھی بھی فرع کے برابر نہیں ہو سکتا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ عمل ایمان کے تحقق پر علامت کی طرح ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ بے شک ایمان پہلے والی غلطیوں کو ختم کر دیتا ہے۔اسی طرح وضو بھی کرتا ہے۔مگر وضو صحیح نہیں ہوتا مگر ایمان کے ساتھ، پس وضو ایمان پر موقوف ہونے کی وجہ سے شطر کے معنی میں ہو گیا۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں ''یہ قول شافعیہ کے اس اصول پر متفرع ہے کہ بے شک وضو یہ عبادت مستقلہ ہے اس میں نیت کی طرف احتیاجگی ہوتی ہے اور وہ اہل سے صحیح ہوتی ہے نہ کہ غیر اہل سے ورنہ ہمارے نزدیک تو کافر کا وضو صحیح ہے (یعنی کافر غسل کرے اور وضو کی نیت نہ کرے تو اس کی نماز صحیح ہوگی اگر اس غسل کے بعد مسلمان ہو گیا۔مترجم) سب سے واضح بات یہ ہے کہ بے شک وضو ایمان کے لئے شطر (نصف) ہے اس لئے کہ ایمان صغائر وکبائر دونوں کو گراتا ہے اور وضو خاص صغائر کے ساتھ اور اس وقت ہمارے نزدیک بھی وضو کو نیت سے مقید کرنا ضروری ہوگا۔تاکہ یہ ایسی عبادت بن جائے جو گناہوں کو دور کرنے والی ہو۔واللہ اعلم۔

زین العرب نے بعض حضرات کی پیروی کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ ایمان سے مراد یہاں پر صلوٰۃ ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ [البقرة : ١٤٣] ''اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو یونہی کھو دے۔'' اور ایمان کا نماز پر اطلاق اس لئے کیا ہے کہ بے شک نماز اس کے آثار میں سے سب سے اعظم ہے اور اس کے نتائج میں سے اور اس کے بھیدوں کے انوارات میں سے سب سے زیادہ بلند ہے، اور طہارت کو شطر صلوٰۃ بنایا گیا ہے۔اس لئے کہ نماز کی صحت تمام شرائط وارکان کے پورا ہونے کے ساتھ ہوتی ہے اور طہارت شرائط صلوٰۃ میں سے سب سے زیادہ قوی اور واضح ہے۔پس اس کو

ایسے طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ گویا اس کے علاوہ کوئی شرط نہیں اور شرط وہ شطر ہوتی ہے جبکہ مشروط اس پر موقوف ہو۔ بعض کا کہنا ہے کہ شطر سے مراد مطلقاً جز ہے نہ کہ نصف حقیقی۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں "یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرة : ۱٤٤] "تو اپنا منہ مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو۔" پھر یا تو ایمان سے نماز مراد ہوگی اس وقت تو کوئی اشکال نہیں ہوتا یا اس سے ایمان متعارف مراد لیا جائے، پس جز اس کے اجزاء کاملہ پر محمول ہوگا اور یہ توجیہ اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں نصف کی عبارت کے ساتھ تصریح ہے اس لئے کہ کبھی نصف کے معنی میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ مشہور حدیث میں وارد ہے:

((علم الفرائض نصف العلم))۔

اور بعض کا کہنا ہے ایمان سے اس کی حقیقت مراد ہے اس لئے کہ ایمان دِل کو شرک سے پاک کرتا ہے اور طہورِ اعضاء کو حکمی اور حقیقی نجاست سے پاک کرتا ہے اور حاصل اس کا یہ ہے کہ بے شک طہارت کے دو نصف ہیں یعنی جنس طہارت کی دو قسمیں ہیں: ① ظاہری طہارت اور ② باطن کی طہارت۔

بعض محققین نے فرمایا ہے کہ طہور گمراہ عقائد اور برے اخلاق سے پاک کرتا ہے، اور یہ تزکیۂ ایمان کامل کا نصف ہے کیونکہ ایمان کامل میں تخلیہ (ترکِ رزائل) اور تحلیہ (محاسن سے مزین ہونا) ہے (تو یہاں پر ایک جز ترک رذائل کو ذکر کیا)۔ (مترجم)

سب سے واضح بات (واللہ اعلم) وہ یہ ہے کہ بے شک ایمان حقیقت پر وہ اللہ تعالیٰ کے غیر سے الوہیت کی نفی اور ربوبیت اور توحید ذاتی کو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کرنے کی خبر دیتا ہے اور یہ مجموعہ ہی کلمہ طیبہ کا معنی ہے کہ جس کلمہ پر ایمان کی بنیاد ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ [البقرة : ۲٥٦] "سو جو شخص شیطان سے بداعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اعتقاد ہو تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا"۔

اور کتاب الطہارت میں اس حدیث کو لانا یہ ہمارے لئے قابل اعتراض نہیں ہے اس لئے کہ بعض مصنفین کے سمجھنے کے مطابق اور ہماری تقریر کی وجہ سے جو ہم نے کی پہلے اور آنے والے جملہ میں کامل مناسبت ظاہر ہو جاتی ہے۔

قوله: والحمد لله تملاء الميزان:

تانیث یہاں پر جملہ یا کلمہ کی تاویل کی بنا پر ہے۔ بعض کا کہنا ہے یہ مذکر کے صیغہ کے ساتھ لفظ یا کلام کے مراد ہونے کی بناء پر ہے (یعنی الحمد للہ کا لفظ یا کلام میزان کو بھر دیتا ہے۔ یا مضاف مقدر ہوگا۔ أي لو قدر ثوابه' مجسما لملأ یا یہ محمول ہے اس بات پر کہ دوسرے جہاں میں اقوال واعمال جسمانی شکل میں ہونگے یعنی کہ ان کی ذوات جسم بن جائیں گی۔

ابن حجرؒ کا یہ قول کہ: ثوابها لو جسم أوهي لو جسمت باعتبار ثوابها کہ اس کا ثواب مراد ہے۔ اگر وہ جسم ہو یا وهي مراد ہے اگر اس کو جسم بنا دیا جائے۔ اس کے ثواب کے اعتبار سے، یہ صحیح نہیں کیونکہ ان میں فرق نہ ہونا ظاہر ہے خوب سمجھ لو۔ بعض محققین نے کہا ہے کہ پس اگر تو اعتراض کرے کہ اعمال کا وزن کیسے کیا جائیگا حالانکہ وہ اعراض ہیں جن کا باقی رہنا محال ہے اور اسی اعتراض کو بلکا اور بوجھل ہونے سے موصوف نہیں کیا جا سکتا۔ پس اس کا جواب یہ ہے کہ نصوصِ شرعیہ کثرت سے وزن

اعمال اور ان کے ہلکے اور وزنی ہونے پر وارد ہیں۔ابن عباس ﷠ سے مروی ہے:

”ترازو کے لئے ایک لسان ہے اور دو پلڑے ہیں ایک پلڑا مشرق میں ہے اور دوسرا مغرب میں، ایک رجسٹر میں آدمی کی نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس کو ایک پلڑے میں رکھا جائے گا اور برائیاں لکھ کر دوسرے پلڑے میں رکھی جائیں گی۔“

پس اس کا قبول کرنا اور اعتراضات کو چھوڑنا ضروری ہو گیا۔کم فہمی اور عقل کے کمزور ہونے کی وجہ سے۔پس بے شک وہ آدمی کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے بھیدوں پر روشناس کرایا ہے اور مقادیر کے عجائب اس کے لئے کھولے ہیں وہ یہ سمجھتا ہے کہ بے شک جو چیز عقل کے ساتھ مقید کی گئی ہے اس کی کوئی مقدار نہیں اور مزید برآں یہ بھی کہ صحائف (نامۂ اعمال) کا تولنا بھی حدیث میں آیا ہے۔

امام غزالی ﷫ فرماتے ہیں کہ نفس فی ذاتہٖ اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کے لئے امور کے حقائق کھل جائیں۔لیکن اس کے جسم سے تعلق کی بناء پر اس انکشافات میں رکاوٹ ہوتی ہے پس جب وہ پردہ موت کے ذریعے کھل جاتا ہے۔تو یہ اس امر کو پہچانتا ہے کہ اس کے اعمال اللہ کے تقرب اور بعد میں مؤثر تھے اور وہ ان آثار کی مقدار کو جانتا ہے اور بعض کو بعض سے زیادہ مؤثر پاتا ہے اور اللہ تعالیٰ قادر ہے اس پر کہ مخلوق کے لئے ایسے سبب کو جاری کریں جو ان کے لئے ایک لمحہ میں اعمال کی مقدار کو کسی شکل حقیقی کے ذریعے یا صورت جسمانی کے ذریعے پہچان کروادے۔پس میزان (ترازو) کی تعریف یہ ہوگی کہ جس کے ذریعے زیادتی اور نقصان میں تمیز دی جاسکے اور اس کی عالم میں مثالیں مختلف ہیں۔جیسا کہ ترازو اور قبان (قبان: تولنے کا آلہ ہے جس کا ایک ہی پلڑا ہوتا ہے جسے کانٹا بھی کہتے ہیں) وزنی چیزوں کے لئے ہے اور اصطرلاب افلاک (سورج اور چاند وغیرہ) کی حرکات کے لئے ہے اور رولر شعر کے اوزان کے لئے۔پس اس بات کو ناسمجھ اور سمجھ دار کے اذہان کے قریب لانے کے لئے جو مقصود تھا اس کی مثال یہاں دی گئی۔پس معتزلہ کا اسی مسئلہ میں مخالفت کرنا اور اس طرح کے دوسرے مسائل میں یہ ان کی خراب عقلوں کی پیداوار ہے اور ان کے کمزور قسم کے ناپائیدار دلائل پر اعتماد کرنے کی وجہ سے ہے۔

قوله: و سبحان الله والحمد لله تملان أوتملأ ما بين السموات والأرض:

یہ راوی کی طرف سے شک ہے امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ”ہم نے دونوں صیغوں کو تثنیہ مؤنث کے ساتھ ضبط کیا ہے“۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں پس پہلا معنی تملان ظاہر ہے اور دوسرا اس میں جملہ کی ضمیر ہے: **اى الجمله الشاملة لهما ملاّ علی** قاریؒ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ مفرد ہونا ان میں کل واحدة کی تقدیر کے ساتھ ہے۔

یا تو یہ ثواب کے اعتبار سے ہے یا یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ سبحان اللہ الحمد للہ بھری ہوئی ہے، ان آیات سے جو صفات ثبوتیہ کے وجود پر اور صفاتِ سلبیہ کی نفی پر دلالت کرنے والی ہیں واللہ اعلم۔

قوله: والصلٰوة نور:

أى فى القبر و ظلمة القيامة: بعض کا کہنا ہے کہ نماز نور اس لئے ہے کہ یہ ناشائستہ باتوں سے روکتی ہے اور اچھی چیزوں کی طرف لے جانے والی ہے جیسا کہ نور۔

بعض کا کہنا ہے کہ نور سے مراد وہ چیز ہے کہ جس کے ذریعے آدمی قیامت میں راستہ پائے گا۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ﴾ [الحديد:١٢] ''ان کا نوران کے آگے دوڑتا ہوگا''۔

اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ نور اسلئے ہے کہ یہ سبب ہے مختلف قسم کے معارف کے روشن ہونے کیلئے اور انشراحِ قلب یعنی دل کے کھلنے کیلئے اور حقائق کے مکاشفہ کیلئے دل کی یکسوئی کی وجہ سے۔

بعض کا کہنا ہے کہ ''نور'' سے مراد نمازی کی چہرے میں وہ علامت ہے (جو سجدوں سے پڑ جاتی ہے) اور صلوٰۃ سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور یہ بعید نہیں ہے۔

قوله: والصدقه برهان:

اس کا معنی یہ ہے کہ آدمی اس کو جائے پناہ بنائے گا جیسا کہ برھان کو بناتا ہے۔ یعنی گھبرا کر اس کی طرف آئے گا۔ پس بے شک بندہ سے جب قیامت کے دن مال کے مصرف کے بارے میں پوچھا جائیگا تو اس کے صدقات جواب میں دلائل کی طرح ہوں گے۔ بعض کا کہنا ہے کہ صدقہ کرنے والے کو ایسی علامت ونشانی سے نوازا جائے گا جس نشانی سے اس کی پہچان ہوگی۔ پس یہ صدقہ برھان ہوگا کامیابی اور ہدایت پر۔ پس اس سے مصرف کے بارے میں پھر سوال نہیں ہوگا۔

قوله: والصبر ضياء:

''ضاء'' اسکی ''یاء'' ''واؤ'' سے منقلب ہے ماقبل کے مکسور ہونے کی وجہ سے۔ الف سے پہلے ہمزہ کے ساتھ بھی مروی ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ صبر نفس کو شہوات کی آرزو سے اور عبادات کی مشقت پر اور مصائب کی مشکلات کے برداشت کرنے میں روکے رکھنا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہاں دنیا اور اس کی لذات سے اور گناہوں سے اور احکام شرعیہ پر صبر کرنا مراد ہے۔ پس بندہ جب ان کے پورا کرنے کے بعد نکلتا ہے تو وہ اس کے لئے روشنی بن جاتی ہیں۔ اس لئے کہ اگر وہ اس پر صبر نہ کرے تو یہ اس کے لئے گناہوں کی اندھیری بن کر لوٹتی ہے یعنی یہ مکلّف گناہوں کی ظلمت میں داخل ہو جاتا ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہاں صبر سے مراد روزہ ہے اس پر قرینہ یہ ہے کہ یہ صلوٰۃ وصدقہ کے ساتھ مذکور ہے اس لئے کہ اس سے زکوٰۃ بھی مراد لی گئی۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں: ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ [البقرہ: ٤٥] ''اور (رنج وتکلیف میں) صبر اور نماز سے مدد لیا کرو'' (صبر سے مراد عند البعض زکوٰۃ ہے) اور باقی جو روزہ کو صبر کا نام دیا گیا ہے۔ روزہ دار کے جمنے کی وجہ سے اور اس کے نفس کو خواہشات سے روکنے کی وجہ سے ہے اور شھر رمضان کو شھر الصبر بھی کہتے ہیں۔ بعض کا یہ بھی کہنا ہے کہ ضیاء سے مراد وہ روشنی ہے جو قبر کے اندھیرے میں ہوگی۔ اس لئے کہ مؤمن جب طاعات ومصائب پر دنیا کی وسعت میں اور اس میں گناہوں سے صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ قبر کی تنگی اور اندھیرے میں کشادگی اور روشنی سے اس کا بدلہ دیں گے۔ بعض محدثین نے فرمایا ہے کہ صبر یہ دل کی روشنی ہے (یعنی یہ دل میں پیدا ہوتی ہے) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں مشقتوں پر صبر کرنا یہ اپنے کو پست رکھنا ہے اور جو اللہ کے دین میں ذلت وخواری برداشت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے طاعات کو اور عبادات کی مشقت کو اور گناہوں سے بچنے کو آسان کر دیتا ہے اور اس وجہ یہ بات بالکل پکی ہے کہ اس کے دل میں روشنی اور ضیاء یہ نور سے زیادہ قوی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا﴾ [یونس: ٥] ''وہ اللہ ایسا ہے جس نے آفتاب کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو نورانی بنایا'' اور یہ اس لئے کہ صبر نماز سے زیادہ وسیع ہے اسلئے کہ واجبات اور منہیات

میں سے ہر کوئی اس کا محتاج ہے ہاں جب روزے کی تفسیر صبر سے کی جائے تو اس وقت یہ دن سے خاص ہونے کی وجہ سے ضیاء بنے گا جیسا کہ سورج دن کے ساتھ خاص ہے۔

نہ یہ کہ روزے کی نماز پر کسی خصوصیت کی وجہ سے مگر اس آدمی کے قول پر جو یہ کہتا ہے کہ روزہ یہ افضل ہے نماز سے اسلئے کہ روزہ میں ایسا رکنا ہے جو صمدانیت (بے نیازی واستغناء) کے مشابہ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور نماز وہ عاجزی ہے اور یہ عاجزی بندے کی صفات میں سے ہے۔

الصوم لی وانا اجزی به ''روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کا بدلہ دونگا''۔ سیدؒ نے اسی طرح تحقیق کی ہے۔

قوله: والقرآن حجة لك او عليك:

اگر تو اس پر عمل کرے۔ **او عليك**۔ اگر تو اس سے اعتراض کرے یا تو اس میں کمی کرے اس کے مقتضی پر عمل نہ کرنے کے ساتھ۔ **كل الناس يغدو۔ اى يصبح أويسير** بعض کا کہنا ہے کہ **الغدو** یہ شروع دن میں چلنے کو کہتے ہیں یہ رواح کی ضد ہے (شام کو چلنا) اور کبھی **غدا يغدو غدوا** ماخوذ ہوتا ہے **غدوة** سے اور غدوہ صبح صادق سے لے کر طلوع شمس کے درمیانی حصہ کو کہتے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ ہر ایک دنیا میں محنت وکوشش کرتا ہے اور اپنے عمل کا اثر آخرت میں دیکھے گا علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ مجمل ہے اس کی تفصیل آگے آرہی ہے

فبائع نفسه ۔ اى حظها باعطائها واخذ عوضها۔ یہ اس کا عمل ہے اور کمائی ہے پس اگر نیک عمل کیا تو تحقیق اس نے اس کو بیچ دیا اور شر کو اس کی قیمت میں لے لیا۔

فمعتقها ۔ من النار بذلك یعنی آگ سے آزاد کرتا ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں فاء سببیت کیلئے ہے اور یہ خبر کے بعد خبر ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بدل البعض ہو فبائع نفسہ سے۔

او موبقها ۔ اى مهلكها: یہ اس طرح کہ اس کو بیچ دیا اور شر کو اس کے بدلے میں لے لیا اور زین العرب نے اشرفؒ اور ان کے علاوہ دوسرے حضرات کی پیروی کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ بیع شراء ہر ایک کا اطلاق ایک دوسرے پر ہوتا ہے ایک کے دوسرے سے تعلق کی وجہ سے اور بیع وشراء کے ذریعے ایک حالت کو چھوڑنے اور دوسرے حالت کو حاصل کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ بائع کا اس چیز کو چھوڑنا جو اس کے ہاتھ میں ہے ترجیح دیتے ہوئے اس چیز کو جو مشتری کے ہاتھ میں ہے۔ پس جس نے اپنے نفس کو پھیر دیا اس چیز سے جس کا وہ عادی تھا اور اپنی آخرت کو دنیا پر ترجیح دی اور خرید لیا اپنے نفس کو آخرت کے ساتھ پس اس نے اس کو سخت دکھ دینے والے عذاب سے آزاد کر دیا اور جس نے دنیا کو آخرت پر ترجیح دی اور اسکے بدلہ میں اس کو خریدا پس اس نے اس نفس کو ہلاک کر دیا کہ اس کو ایک بڑے عذاب کا ہدف بنا دیا۔ تو فبائع نفسہ سے مشتر نفسہ من ربہ مراد ہوگا اس پر دلیل **معتقها** ہے اس لئے کہ آزاد کرنا وہ مشتری ہی سے ہوسکتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس نے دنیا کو چھوڑ کر آخرت کو ترجیح دی تو وہ اپنے نفس کو اپنے رب سے دنیا کے بدلے میں خرید لیتا ہے پس وہ اس کو آزاد کرنے والا ہو جاتا ہے اور جس نے آخرت کو چھوڑ کر دنیا کو ترجیح دی تو وہ دوسری کے ساتھ خریدنے والا ہوا پس وہ اس کو ہلاک کرنے والا ہوا اور یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ مطلب یہ ہے کہ ہر ایک امور میں کوشش کرنا ہے پس کچھ نفس کو اللہ کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں پس وہ آزاد کر دیتے ہیں اور کچھ شیطان

کو پہنچتے ہیں پس وہ اس کو ہلاک کر دیتے ہیں۔

و فی روایة ۔ ظاہر ہی ہے کہ یہ بھی مسلم ہی کی روایت ہے اسی وجہ سے مصنف ان پر اعتراض بھی کر رہے ہیں۔

لا اله الا الله والله اكبر تملان:

مذکر و مؤنث کے صیغہ کے ساتھ دونوں طرح جائز ہے۔

ما بين السماء و الارض۔ یہ بھرنا ثواب کے اعتبار سے ہے اور یا وحدانیت اور بڑائی اور ربانی بزرگی وعظمت کے ظاہر ہونے کے اعتبار سے ہے۔

صاحب مشکوۃ فرماتے ہیں:

لم اجد هذه الرواية ۔ اى التى نسبها صاحب المصابيح الى مسلم۔

فى الصحيحين :اى متنهما

ولا فى كتاب الحميدى ۔ جو کہ صحیحین کیلئے جامع ہے۔

ولا فى الجامع۔ اى الاصول الستته۔

ولكن ذكرها۔ اى هذه الرواية

الدارمى بدل:

یہ کہنا کہ دارمی نے ذکر کیا ہے اس سے جان نہیں چھوٹے گی اس لئے کہ صاحب مشکوۃ نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ تمام وہ جو صحاح سے ذکر کیا جائے گا، جس کو فصل اول سے تعبیر کیا ہے وہ، وہ روایت ہونگی جن کی تخریج شیخین (بخاری ومسلم) یا ان میں سے کسی ایک نے کی ہوگی اور یہ روایت اس میں سے کسی میں بھی نہیں ہے اور کبھی یہ بھی جواب دیا جاتا ہے کہ التزام وہ احادیث کے اصول میں ہے اور باقی یہ روایت بے شک یہ زیادتی ہے جو کہ افادہ کیلئے ہے اور اصل حدیث جو مسلم میں موجود ہے اس پر متفرع ہے۔ واللہ اعلم

سید جمال الدین نے فرمایا ہے کہ قاضی عبداللہ سلمی شافعیؒ نے مصابیح کی تخریج میں یہ بات کی ہے کہ اس روایت کو میں نے مسلم میں نہیں پایا البتہ نسائی نے اس کو عمل الیوم واللیلہ میں ابو مالک اشعریؒ سے روایت کیا ہے پس حدیث کا ظاہر ہی خبر دیتا ہے کہ یہاں دونوں کو جمع کرنا ہے نہ کہ تبدیل کرنا اور باقی دارمی کی روایت کا ظاہر تبدیلی پر مبنی ہے۔

گناہوں کو ختم کرنے والے اور درجات کو بلند کرنے والے کام

۲۸۲:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَايَمْحُو اللّٰهُ بِهِ الْخَطَايَا وَيَرْفَعُ بِهِ الدَّرَجَاتِ قَالُوْا بَلٰى يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ عَلَى الْمَكَارِهِ وَكَثْرَةُ الْخُطَا اِلَى الْمَسَاجِدِ وَانْتِظَارُ الصَّلٰوةِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ وَفِیْ حَدِيْثِ مَالِكِ بْنِ اَنَسٍ فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ فَذَالِكُمُ الرِّبَاطُ۔

أخرجه مسلم في صحيحه ۲۱۹/۱حديث (٤١ـ٥١)۔ وأخرجه الترمذي في السنن ۷۲/۱حديث رقم ٥١۔ وأخرجه النسائي في سننه ۸۹/۱حديث رقم ۱٤۳۔ وأخرجه مالك في الموطأ ۱٦۱/۱حديث رقم ٥٥۔ وأخرجه أحمد في المسند ۲۷۷/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتلا دوں جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو ختم کر دے اور جنت میں تمہارے درجات کو بلند کر دے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا۔ کیوں نہیں۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور ایسا کام بتائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وضو کو صحیح اور کامل کرنا۔ باوجود مشقت کے بیماری یا سخت سردی کی وجہ سے مسجد کی طرف زیادہ قدم چل کر آنا گھر دور ہونے کی وجہ سے اور ایک نماز پڑھنے کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں رہنا۔ پس یہ رباط ہے۔

تشریح: ہمزہ استفہام کیلئے ہے اور لا نافیہ ہے اور **الا تنبیہ** کیلئے نہیں ہے۔ اس پر دیل صحابہ کا بلیٰ سے جواب دینا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ کا اس کو حرف استفتاح کہنا ان کی غفلت ہے۔ (یعنی یہ حرف کلام کو شروع کرنے کیلئے ہے)۔

علی ما یمحو اللّٰہ به الخطایا۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں۔ گناہوں کا مٹنا یہ کنایہ ہے ان کی بخشش سے اور یہ احتمال بھی ہے کہ کراماً کاتبین کے رجسٹر سے مٹایا جانا جو کہ ان گناہوں کے معاف ہونے پر دلالت ہے۔

ویرفع به الدرجات؟ یعنی مراتب کا جفت میں بلند ہونا۔

قالوا بلی یا رسول اللّٰہ۔ سوال جواب کا فائدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ آدمی کے نفس میں زیادہ مؤثر ہو کیونکہ سوال میں ابہام اور جواب میں اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

قال اسباغ الوضوء۔ واؤ کے ضمہ کے ساتھ ہے بعض کا کہنا ہے فتحہ کے ساتھ ای تکمیلہ واتمامہ۔ یعنی اسباغ کہتے ہیں پورے محل کو گھیرنا ہونے کے ساتھ اور وضو کی چمک اعضاء میں (جو آخرت میں ظاہر ہوگی) اس کو لمبا کرنا اور تین بار ہر عضو کو دھونا، بعض کا کہنا ہے اسباغ سے مراد یہ ہے کہ جس کے بغیر نماز درست نہ ہو۔ زین العرب میں اسی طرح ہے سید نے اس کو نقل کیا ہے اور یہ معنی اسباغ کا بعید ہے اس لئے کہ لفظ اسباغ اس کو قبول کرنے سے انکاری ہے اور رفع الدرجات کا معنی بھی، اور وضو کی اصل وضاءۃ سے ہے۔ وضاءۃ کا معنی خوبصورتی ہے تو وضو بھی متوضی کو خوبصورت بناتا ہے اور نہایہ میں سیبویہ نے وضو طہور وقود کو مصادر میں فتحہ کے ساتھ ثابت کیا ہے اور یہ اسم اور مصدر دونوں کیلئے آتے ہیں۔

المکارہ: میم کے فتحہ سے یہ **مکرہ** کی جمع ہے اور **کرہ** سے مشتق ہے اس کا معنی مشقت اور تکلیف و دکھ ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ان مشقتوں میں سے ایک پانی کا کمیاب ہونا اور اس کے حصول میں احتیاجگی کا ہونا یا پانی کو مہنگے داموں خریدنا۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد وہ حالت ہے جو پانی کے استعمال میں مشقت کر دیتی ہے جیسا کہ موسم سرما میں ٹھنڈے پانی کا استعمال یا جسمانی تکلیف میں اس کا استعمال۔

وکثرۃ الخطا: خاء کے ضمہ کے ساتھ یہ (**خطوۃ**) جمع ہے خطوہ دو قدموں کے درمیانی فاصلہ کو کہتے ہیں اور ان کی

کثرت یا گھر دور ہونے سے ہوگی یا بطور تکرار کے۔

الی المساجد۔نماز اور دوسری عبادات کیلئے جانا اس حدیث میں مسجد سے دور والے گھر کو قریب والے گھر پر فوقیت اور فضیلت نہ سمجھی جائے جیسا کہ ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے بے شک بعد کوئی ذاتہ کوئی فضیلت نہیں ہے بلکہ مقصود ان تکالیف کا برداشت کرنا ہے جو اس میں آتی ہیں اسی وجہ سے اگر گھر سے مسجد کی طرف دو راستے ہوں اور وہ دور والے راستے سے آئے تو اس کو زیادہ مقدار میں اجر نہیں ملے گا اور باقی جو حدیث میں زیادہ قدموں کے چلنے کے ذریعے جو ترغیب دی گئی ہے وہ ان لوگوں کیلئے بطور تسلی ہے جن کے گھر مسجد سے دور ہوں اور باقی حضور ﷺ کا یہ ارشاد **((دیارکم تکتب اثارکم))** ''کہ اپنے پہلے گھروں ہی رہو تمہارا چلنا بھی ثواب میں لکھا جاتا ہے''۔ان لوگوں کیلئے کہ جن کے گھر مسجد نبوی ﷺ سے دور تھے اور وہ مسجد نبوی ﷺ کے قریب منتقل ہونا چاہتے تھے، یہ دلیل ہے کہ وہ یہ سمجھے تھے کہ قرب مسجد یہ افضل ہے۔اس لئے کہ اس میں اوقات صلوٰۃ کی معرفت اور جمعہ و جماعت کا فوت نہ ہونا شامل ہے پس حضور ﷺ نے ان کو اپنے اس ارشاد : **تکتب اثارکم** کے ذریعے تسلی دی یعنی اگر تم سے بعض منافع فوت ہونگے تو بعض بھلائیاں اور خیریں بھی تو حاصل ہونگی اور باقی حضور ﷺ کا ان کو گھروں میں رہنے کا حکم دینا اس لئے کہ گھر کا بدلنا اس میں بہت ساری مشقتوں کا جمع ہونا ہے اور اس کے علاوہ بعض کا یہ بھی کہنا ہے کہ حضور ﷺ کا یہ حکم دینا اس لئے تھا، تاکہ مدینہ کا ارد گرد خالی نہ ہو جائے اور خالی ہونے کی صورت میں وہ اعداء کی چالوں اور مکروہ فریب کی جگہ بن جائے گا اور ہماری بات کی تائید آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی کرتا ہے :**شوم الدار بعدها من المسجد** ''کہ گھر کا مسجد سے دور ہونا یہ قابل نحوست ہے''۔

وانتظار الصلوٰة۔ **ای وقتها او جماعتها**۔

بعد الصلوٰة:مطلب یہ ہے کہ جب جماعت سے یا اکیلے نماز پڑھے تو پھر وہ دوسری نماز کا انتظار کر رہا ہو اور اس کی فکر نماز ہی کے ساتھ چمٹی ہوئی ہو بایں طور کہ گھر میں یا مسجد میں بیٹھا ہو۔اسی کا انتظار کر رہا ہو یا اپنے کام میں لگا ہوا ہو لیکن دل نماز سے پیوست ہو۔

فذلکم الرباط۔ راء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور یہ نام ہے اس چیز کا جس کے ذریعے کسی کو بندھا جائے اور لشکر کے قیام کی جگہ (سرحد) کو رباط سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں بے شک حقیقی سرحد یہ اعمال ہیں اس لئے کہ یہ شیطان کے راستوں کو نفس پر بند کرتے ہیں اور خواہش کو مغلوب کرتے ہیں اور وساوس کے قبول کرنے سے نفس کو روکتے ہیں پس ان اعمال کے ذریعے اللہ کا لشکر شیطانی لشکر پر غالب آجاتا ہے اور یہی وہ جہادِ اکبر ہے۔

۲۸۳:وَفِی حَدِیْثِ مَالِكِ بْنِ اَنَسٍ فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ فَذَالِكُمُ الرِّبَاطُ رَدَّدَ مَرَّتَیْنِ (رواه مسلم وفی الروایة الترمذی) ثَلَاثًا۔

صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب اسباغ الوضوء علی المکاره، ح ۳۶۹

ترجمہ:''اور حضرت مالک بن انسؓ کی حدیث میں فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ کا لفظ دو مرتبہ ہے اور جامع ترمذی کی حدیث میں

یہ لفظ تین مرتبہ ہے۔"

تشریح: بعض کا کہنا ہے کہ اسم اشارہ مشارالیہ کے بُعد پر دلالت کر رہا ہے اور اسی طرح رباط کا معرف (**بلام الجنسیة**) خبر کی بعد صورت میں لانا اسم اشارہ کیلئے :**ای ھو الذی یستحق ان یسمی رباطًا**۔ کہ یہ اصل حقدار ہے رباط ہونے کا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد : ذٰلِكَ الْكِتٰبُ ۔ گویا کہا اس کا غیر اس نام کا اہل ہی نہیں اور مزید تاکید اور تقریر کیلئے (**ردد مرتین**) **ای کرر فذلکم الرباط** اور یہ اشارہ ہے اسباب کی طرف کہ جو طاعات اور اچھے اعمال ذکر کیئے گئے ہیں۔ یہی حقیقتاً رباط ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ذکر ہے۔﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا﴾ [آل عمران: ۲۰۰]
"اے ایمان والو خود صبر کرو اور مقابلہ میں صبر کرو اور مقابلہ کیلئے مستعد رہو"۔

رباط وہ جہاد ہے **ای ثواب ھذہ کثواب الجهاد** یعنی کہ اس کا ثواب وہ جہاد کے ثواب کی طرح ہے اسلئے کہ اس میں نفس کا مجاہدہ ہے اس کو مشقتیں اور شدائد کے چکھانے کے ذریعے جیسا کہ جہاد میں ہوتا ہے۔

و فی روایة الترمذی ثلاثا۔ ای کررہ ثلاثا ترغیب میں مبالغہ کرتے ہوئے تین بار دھرایا ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ پہلے سے گھوڑے کا باندھنا ہے (حفاظت سرحد کیلئے) اور دوسرے سے مراد مجاہدۂ نفس ہے اور تیسرے سے مراد حلال کی تلاش ہے۔

وضو سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں

۲۸۴: وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ خَرَجَتْ خَطَايَاهُ مِنْ جَسَدِهٖ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ اَظْفَارِهٖ (متفق علیه)

أخرجه مسلم ۱/۲۱٦ حدیث رقم (۳۳۔۲٤٥)، وأحمد فی المسند ۱/٦٦۔

ترجمہ: حضرت عثمانؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو آدمی اچھی طرح وضو کرے فرائض، سنن اور مستحبات کی رعایت کے ساتھ تو اس کے گناہ اس کے جسم سے خارج ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ خارج ہو جاتے ہیں۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: علامہ طیبی فرماتے ہیں **فاحسن** میں فاء بمنزلہ ثم کے ہے۔ **تراخی فی الرتبه** پر دلالت کرنے میں پس یہ دلالت کرتی ہے۔ اس پر کہ **اطالة النعرة** (اعضاء کی چمک کو لمبا کرنا) اور تین بار اعضاء کا دھونا اور آداب کی رعایت رکھنا مثلاً استقبال قبلہ اور دعاء کا اہتمام جو سلف سے منقول ہے کا نفع یہ افضل ہے، صرف واجبات کے پورا کرنے سے اور اس میں اس طے شدہ قاعدے کی خلاف ورزی ہے کہ فرض کا ثواب نفل کے ثواب سے افضل ہے ہاں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وضوء کا اچھی طرح کرنا اس سے مراد یہ ہے کہ وضوء کی تکمیل کرنے والی اشیاء کو پورا کرنا یہ افضل ہے صرف واجبات پر اقتصار کرنے سے اور قوی بات یہاں یہ ہے کہ فاء محض عطف کیلئے ہے۔ (**جزاء مذکور**) شرط کے مجموعہ یعنی معطوف اور معطوف علیہ پر مرتب ہے۔

خرجت خطایاه۔ یہ اس کی براءت کی مثال اور صورت ہے لیکن یہ عام مخصوص ہے ان صغائر کے ساتھ جو حقوق اللہ سے

متعلق ہیں۔ جیسا کہ آگے آئے گا : مالم یات کبیرة کہ جب تک کبیرہ نہ کرے اور اس اجماع کی وجہ سے جس کو ابن عبدالبر نے نقل کیا ہے کہ کبائر بے شک توبہ ہی سے معاف ہوتے ہیں اور آدمیوں کے حقوق یہ ان کی خوشنودی ورضا سے بندھے ہوئے ہیں۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ یہ ظاہراً اس قطعی نص کے مخالف ہے جس پر اہلسنّت والجماعت کے مذہب کی بنیاد ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾[النساء ٦٨] ''بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ اُن کے ساتھ کسی کو شریک بنایا جائے اور اس کے علاوہ اور جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دینگے''۔

آیت کے دوسرے جز کو توبہ کے ذریعے مقید کرنا معتزلہ کا مذہب ہے جو کہ اس بات سے مردود ہے کہ شرک بھی تو توبہ سے معاف ہو جاتا ہے پھر تفسیر کی کیا وجہ خصوصیت ہے۔

من جسده۔ ای جمیع بدنه او اعضاء وضو به ۔

حتی تخرج من تحت اظفاره۔ ای مثلاً۔

(متفق علیه) ابھری فرماتے ہیں کہ اس میں امام مسلم متفرد ہیں اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں جامع الاصول میں بھی اسی طرح ہے شیخ الاسلام اور حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تخریج کرنے میں مسلمؒ ہی کی طرف نسبت کرنے پر اقتصار کیا ہے۔

۲۸۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا تَوَضَّأَ الْعَبْدُ الْمُسْلِمُ اَوِ الْمُؤْمِنُ فَغَسَلَ وَجْهَهٗ خَرَجَ مِنْ وَجْهِهٖ كُلُّ خَطِيْئَةٍ نَظَرَ اِلَيْهَا بِعَيْنَيْهِ مَعَ الْمَآءِ اَوْمَعَ اٰخِرِ قَطْرِ الْمَآءِ فَاِذَا غَسَلَ يَدَيْهِ خَرَجَ مِنْ يَدَيْهِ كُلُّ خَطِيْئَةٍ كَانَ بَطَشَتْهَا يَدَاهُ مَعَ الْمَاءِ اَوْمَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَآءِ فَاِذَا غَسَلَ رِجْلَيْهِ خَرَجَ كُلُّ خَطِيْئَةٍ مَشَتْهَا رِجْلَاهُ مَعَ الْمَآءِ اَوْمَعَ اٰخِرِقَطْرِالْمَآءِ حَتّٰى يَخْرُجَ نَقِيًّا مِّنَ الذُّنُوْبِ .

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم ٢١٥/١حديث رقم (٣٢_٢٤٤)والترمذى فى السنن ٦/١حديث رقم ٢أخرجه الدارمى ١٩٧/١حديث رقم ٧١٨و مالك فى الموطأ ٣٢/١حديث رقم ٣١۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب کوئی بندہ مسلمان یا فرمایا مؤمن وضو کرتا ہے اور اپنے چہرے کو دھوتا ہے۔ تو پانی کے ساتھ یا فرمایا پانی کے آخری قطرہ کے ساتھ اس کے وہ تمام گناہ جن کی طرف اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کے چہرے سے خارج ہو جاتے ہیں یعنی آنکھوں کے گناہ ختم ہو جاتے ہیں پھر جب ہاتھوں کو دھوتا ہے تو دونوں ہاتھوں کے گناہ جن کو اس کے ہاتھوں نے پکڑا تھا تو پانی کے ساتھ یا فرمایا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ اس کے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں یعنی ہاتھوں کے گناہ ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر جب وہ دونوں پاؤں دھوتا ہے تو اس کے وہ تمام گناہ جن کی طرف وہ پاؤں سے چلا تھا پانی کے ساتھ یا فرمایا پانی کے آخری قطرہ کے ساتھ خارج ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ گناہوں سے بالکل پاک ہو جاتا ہے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: راوی کا یہ شک حضور علیہ السلام کے لفظ میں ہے ورنہ تو یہ دونوں شریعت میں مترادف ہیں اور مؤمن عورت مؤمن مرد کے حکم میں ہے۔

فغسل وجهه: یہ توضا پر عطف تفسیری ہے یا اذا توضا مراد اذا ارادا ہے اور یہی زیادہ بہتر ہے اور اس میں اشارہ ہے نیت کے اعتبار کی طرف جو ثواب کی مقتضی ہے۔

خرج من وجهه: اذا کا جواب ہے

کل خطیء نظر الیها: ای الی اخطیئة یعنی سبب خطیئة کی طرف یہاں سبب پر مسبّب کے نام کا اطلاق ہے بطور مبالغے کے۔

بعینیه۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں یہ تاکید ہے اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس پر زیادتی کرتے ہوئے کہ تاکید مبالغے کیلئے ہے ورنہ نظر وہ آنکھ ہی کے ساتھ ہوتی ہے۔

حافظ صاحب کا وہم ہے کہ یہ **رایته بعینی** کے قبیل سے ہے حالانکہ ایسی بات نہیں ہے اس لئے کبھی دیکھنا ایک آنکھ سے ہوتا ہے اور کبھی دونوں سے۔

مع الماء۔ **ای مع النفصاله** یہ جملہ مجرورۃ المحل ہے۔ او یہ خطیئۃ کی مجاز اً صفت ہے، اور اسی طرح بقیہ اس طرح کے جملوں میں (**اومع اخر قطر الماء**) بعض کا کہنا ہے کہ اَوْ شک روای کیلئے ہے اور بعض کا کہنا ہے دونوں میں سے ایک کیلئے ہے اور قطر کہتے ہیں پانی کا جاری کرنا اور اس کے قطرات اتارنا۔

فاذا غسل یدیه خرج من یدیه :**ای ذَهَب محی**۔ **کل خطیئة کان بطشتها ای اخذتها ویداه**۔ جیسا کہ اجتبیہ نامحرم کو چھونا۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں یداہ بھی تاکید ہے جیسا کہ پہلے بات ہو چکی ہے۔

مع الماء او مع اخر قطر الماء فاذا غسل رجلیه خرج کل خطیئة مشتها) **ها** ضمیر خطیئۃ کیلئے ہے اور وہ منصوب بنزع الخافض ہے۔ **ای مشت بها الی الخطیئة یامرجع وه مصدر هو ای مشت المشیته**۔ حضور ﷺ کے اس قول کی طرح: **واجعله الوارث ای اجعل الجعل**۔

رجلاه : علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ تاکید ہے۔ **له مر الان**۔

حتی یخرج نفیا من الذنوب: اعضاء وضوء کے گناہوں سے یا تمام چھوٹے گناہوں سے ابن الملک فرماتے ہیں کہ یعنی وضوء کرنے والا اپنے وضوء سے ان گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے جو اس نے ان اعضاء کے ساتھ کیے ہوں کو معاف کیا جائے گا۔ اس حدیث اور اس سے پہلے والی حدیث میں کہ جس میں تمام جسم کے گناہوں کے معاف ہونے کا تذکرہ ہے تطبیق اس طرح ہوگی کہ پہلی حدیث میں وضوء کے وقت بسم اللہ پڑھنا مراد ہوگا اور **فاحسن الوضوء** بھی اسی طرف مشیر ہے اور دوسری حدیث کہ جس میں اعضاء وضوء ہی کی معافی مذکور ہے یہ بسم اللہ کے نہ پڑھنے کی صورت میں ہے اور یہ بھی کہ حدیث متقدم میں یہ تصریح نہیں ہے کہ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں اس لئے کہ **من جسده** قول یہ تمام بدن کا احتمال رکھتا ہے اور صرف اعضاء وضوہی کا بھی جس کی طرف :**حتی تخرج من نخت اظفاره** مشیر ہے۔ واللہ اعلم۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، پس اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ عضو کے وہ گناہ جو اس کے ساتھ خاص ہیں ان کو ذکر کیا گیا اور جوان کو ختم کرنے والی چیزیں ہیں ان کا بھی تذکرہ ہوا تو چہرہ جو آنکھ' کان' ناک پر مشتمل ہے اس میں سے صرف آنکھ ہی کو خاص کیوں کیا۔ جواب یہ دیا گیا ہے کہ آنکھ دِل کا ہراول دستہ اور سراغ رساں کی طرح ہے پس جب اس کو ذکر کر دیا گیا تو تمام سے استغناء ہو گیا اور آنے والی حدیث اس بات کو مضبوط کرتی ہے جس میں ہے **:فاذا غسل وجهه خرجت الخطايا من وجهه حتى تخرج من اشفار عينيه۔** ''اور جب اپنا منہ دھوتا ہے تو اس کے منہ سے گناہ خارج ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کی آنکھوں کی پلکوں کے نیچے سے بھی گناہ خارج ہو جاتے ہیں۔''

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جواب دیا جائے کہ بے شک ناک اور زبان کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کے ذریعے اور کان مسح کے ذریعے (پاک ہوتے ہوں) پس آنکھ باقی ہی گئی تعیین کیلئے۔ فصل ثالث میں یہی بات بطور تصریح کے آ رہی ہے۔

یا یہ بھی کہا گیا ہے کہ آنکھ کو اس لئے خاص کیا ہے تا کہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ اس کے گناہوں سے نہیں نکل سکتا کیونکہ اس کا داخل تو دھلتا نہیں۔ واللہ اعلم۔

پھر میں نے ابن حجر کو دیکھا ہے کہ انہوں نے میری بات کی تائید کی ہے اس لئے کہ امام طیبیؒ کے کلام کے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کان کو چہرے میں شامل کرنا یہ صحیح نہیں ہے بلکہ وہ نہ تو چہرے کا حصہ ہیں اور نہ ہی سر کا اور **:الاذنان من الراس** والی حدیث ضعیف ہے اور آنکھ کا سراغ رساں ہونا جیسا کہ طیبیؒ نے ذکر کیا ہے اس کے گناہ کو مغفرت کے ساتھ تخصیص کرنے کی صورت میں، جواب نتیجہ خیز نہیں ہوگا جیسا کہ یہ بات واضح ہے بلکہ بہترین بات جواب میں یہ کہی جا سکتی ہے کہ تخصیص کا سبب اس میں یہ ہے کہ منہ، ناک، کان بے شک ہر ایک کیلئے ایک مخصوص قسم کی طہارت ہے جو چہرے کی طہارت سے خارج ہے۔ تو یہ خود کفیل ہونگے گناہوں سے نکلنے میں بخلاف آنکھ کے کہ اس کے لئے کوئی طہارت نہیں مگر چہرے کے دھونے میں پس اس کی غلطی کو خاص کیا گیا دھونے کے ذریعے نکلنے میں نہ کہ باقی اعضاء میں، وجہ وہی ہے جو ابھی ذکر ہوئی پس اس مضمون کو بخوبی سمجھ لو۔

ابن حجرؒ کا خبر الاذنان ''ضعیف کہنا'' ضعیف ہے۔ اس لئے کہ ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ عبداللہ بن زیدؓ سے یہ روایت نقل کی ہے اور دار قطنی نے ابن عباسؓ سے کہ بے شک نبی ﷺ نے فرمایا کہ کان سر میں سے ہیں۔ یعنی ان کا حکم اس لئے کہ اللہ نے آپ کو بیانِ خلقت کیلئے نہیں بھیجا اور ابن القطان نے بھی اس کی صحت پر تصریح کی ہے۔

نماز گناہوں کے لئے کفارہ ہے

۲۸۶:وَعَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَامِنَ امْرِءٍ مُسْلِمٍ تَحْضُرُهُ صَلَاةٌ مَّكْتُوْبَةٌ فَيُحْسِنُ وُضُوْءَ هَا وَخُشُوْعَهَا وَرُكُوْعَهَآ اِلَّا كَانَتْ كَفَّارَةً لِّمَا قَبْلَهَا مِنَ الذُّنُوْبِ مَالَمْ يُؤْتِ كَبِيْرَةً وَذٰلِكَ الدَّهْرُ كُلُّهٗ. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/ ٢٠٦ حديث رقم (٧۔٢٢٨)۔

ترجمه: حضرت عثمانؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو مسلمان فرض نماز کا وقت آنے پر اچھی طرح وضو کرے اور نماز میں خشوع اور رکوع اچھی طرح کرے۔ تو اس کی یہ نماز اس سے پہلے کیے ہوئے گناہوں کے لئے کفارہ ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہ کیا ہو اور زمانہ بھر ایسا ہوتا رہتا ہے یعنی جو نماز گناہوں کا کفارہ ہے کسی وقت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ فضیلت ہر وقت قائم رہتی ہے اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: مِنْ زائدہ ہے نص کے عام ہونے پر تاکید کے لئے ہے۔''

تحضره صلاه مكتوبة اى مفروضه: یعنی اس کا وقت آجائے یا اس کا وقت داخل ہونے کے قریب ہو جائے

فيحسن وضوء ها: بایں طور کہ اس کے فرائض اور سنن کو بجالائے۔

وخشوعها: ہر رکن کو صحیح طریقے سے پورا کرنا یہ تواضع اور عاجزی کے اعتبار سے بہت بڑھا ہوا ہے یا خشوع سے مراد دِل کا ڈرنا اور نظر کا سجدہ کی جگہ میں جمائے رکھنا اور فکر کو یکسو کرنا اور اس کے ماسوا سے اعراض کرنا ہے اور خشوع ہی میں یہ بھی داخل ہے کہ کپڑوں کو زمین پر پڑنے سے روکنے سے (حفاظت کیلئے) بچے اور اسی طرح ادھر ادھر دیکھنا اور کھیلنا اور جمائی لینا اور آنکھیں بند کرنا وغیرہ سب امور سے بچے اور اس خشوع سے اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف: ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾ [المؤمنون: ۱-۲] ''بالتحقیق ان مسلمانوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں'' اور یہ خشوع ظاہر اور باطن دونوں میں ہے اس لئے حضور ﷺ نے اس آدمی کو کہ جو نماز میں ڈاڑھی یا کپڑے کے ساتھ کھیل رہا تھا فرمایا ''اگر اس کا دِل خشوع والا ہوتا تو اس کے اعضاء میں بھی خشوع ہوتا'' (یعنی اعضاء میں بھی سکون واطمینان ہوتا)۔

وركوعها: تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں رکوع پر صرف اکتفاء کیا سجدے کو ذکر نہیں کیا، اس لئے کہ یہ دونوں رکن ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ہیں پس جب ایک کو اچھی طرح ادا کرنے کی ترغیب دی تو یہ دوسرے کیلئے بھی خود بخود ہوگی اور اس کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا کیونکہ اس میں اس بات پر باخبر کرنا ہے کہ رکوع میں یہ امر زیادہ سخت ہے اسی لئے مزید تاکید کردی اس لئے کہ رکوع کرنے والا رکوع میں اپنے آپ کو اٹھاتا ہے اور سجدہ میں زمین پر بوجھ رکھتا ہے (لہٰذا ان دونوں میں فرق ہے) بعض کا کہنا ہے کہ بہتر بات یہاں یہ ہے کہ رکوع کو سجدہ سے اس لئے خاص کیا کیونکہ رکوع کے بعد سجدے آتے ہی ہیں۔ کیونکہ رکوع کوئی مستقل عبادت نہیں بخلاف سجود کے کہ وہ تو مستقل عبادت ہے جیسے سجدۂ تلاوت اور سجدہ شکر۔ سیدؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

قاضیؒ اور بعض دوسرے حضرات فرماتے ہیں ''رکوع کی تخصیص اس لئے ہے کہ بے شک یہ مسلمانوں کے خصائص میں سے ہے پس مقصود اس پر ابھارنا اور شوق دلانا ہے'' اور شاید یہ اکثر ہوتا ہو (یعنی قاعدہ اکثری ہو) اللہ تعالیٰ کے اس قول کی وجہ سے جو حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں ہے: ﴿وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرَّاكِعِيْنَ﴾ [آل عمران: ٤٣] ''اور سجدہ کیا کرو اور رکوع کیا کرو (ان لوگوں کے ساتھ) جو رکوع کرنے والے ہیں''۔ بعض کا کہنا ہے کہ معنی یہ ہے کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ تو رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرے اور اس کے ساتھ مت ہو جو رکوع نہیں کرتا اسی طرح علامہ طیبیؒ نے ذکر کیا ہے۔ بعض نے اس کا معنی یوں کیا ہے تو تابعداری وفرمانبرداری کر اور نماز پڑھ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ پس اس وقت کوئی اشکال

باقی نہیں رہتا۔

الا کانت ای الصلوٰۃ۔

کفارۃ۔ ای ساترۃ۔

لماقبلھا۔ ای لجمیع ماقبلھا :

من الذنوب :اور جب کبیرہ کا مرتکب ہوگا تو پھر تمام گناہوں کیلئے کفارہ نہیں ہوگی اسی لئے فرمایا(**مالم یوت**)۔تاء کے کسرہ کے ساتھ معروف کا صیغہ ہوگا ایتاء سے اور بعض نے اس کو مجہول مانا ہے۔

کبیرۃ : یہ منصوب ہے اور کوئی اس کے علاوہ یہاں درست نہیں گویا کہ فاعل عمل کو اپنی طرف سے دیتا ہے یا کوئی دوسرا مثلاً بلانے والا اس کو یہ دیتا ہے یا جو اس کو اس پر اُبھارتا ہے یا جو اس کو اس کی قدرت دیتا ہے پس یہ اس آیت کی طرح ہے :﴿ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا......﴾ [الاحزاب : ١٤] ''پھر ان سے خانہ جنگی کے لئے کہا جائے تو (فوراً) کرنے لگیں اور اس کے لئے بہت کم توقف کریں'' مد کے ساتھ :**لا عطوھا من انفسھم** وہی معنی ہے اور ایک نسخہ میں **مالم یات** ہے اتیان سے جیسا کہ مصابیح میں ہے **ای مادام لم یعمل کبیرۃ** یعنی جب تک کہ یہ کبیرہ گناہ نہ کرے۔تورپشتی فرماتے ہیں یات کا مصابیح میں ثابت کرنا صحیح نہیں ہے۔اس لئے کہ حدیث امام مسلم کے متفردات میں سے ہے اور انہوں نے اس کو اتیان سے روایت نہیں کیا اگرچہ **لم یات** یہ معنی کے اعتبار سے زیادہ واضح ہے عربوں کے اس قول کی طرح ہے :**اتی فلان منکرا**۔لیکن روایت کے اعتبار سے قابل اعتبار وہ ایتاء ہی ہے اور صیغہ مجہول سے روایت کرتے ہیں معنیٰ یہ ہوگا کہ جب تک وہ کبیرہ گناہ کا عمل نہ کرے اور ایتاء کو عمل کے قائم مقام رکھنا اس لئے کہ عامل عمل کو اپنی طرح سے دیتا ہے اور مجہول کی صورت میں یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ جب تک کبیرہ کو نہ پہنچے :**من قولھم اتی فلان فی بدنہ ای اصباتہ' علۃ**۔علامہ طیبیؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

(و ذلك) ای التکفیر بسبب الصلوٰۃ۔ واؤ حالیہ ہے اور ذوالحال کانت کی خبر میں ضمیر مستتر ہے اور وہ کفارۃ ہے۔ علامہ طیبیؒ نے یہ بات کہی ہے لیکن اظہر یہ ہے کہ واؤ مستانفہ ہے۔

الدھر۔ ظرفیت کی بناء پر منصوب ہے اور اس کا محل مرفوع ہے خیریت کی بناء پر ائ **حاصل فی جمیع الدھر**۔

کلہ۔ماقبل کیلئے تاکید ہے :**ای لا وقت دون وقت**۔اشرفؒ نے فرمایا ہے:**المشار الیہ اما تکفیر الذنوب** ہے۔ یعنی فرض نماز کا صغائر کو ختم کرنا وہ ایک فرض کے ساتھ نہیں ہے بلکہ فرائض الدھر زمانہ بھر وہ گناہوں کو ختم کرے گی اور یا مالم یوت کا معنیٰ ہے یعنی کبیرہ کا زمانہ بھر نہ لانا فرض نماز کو لانے کے ساتھ یہ ماقبل کیلئے کفارہ ہے اور بہرحال وہ قول جو بعض علماء سے منقول ہے کہ معنی یہ ہے کہ فرض نماز ماقبل کے گناہوں کیلئے کفارہ ہے اگرچہ تمام عمر بھر کے گناہ ہی کیوں نہ ہوں۔لیکن پہلا معنی زیادہ بہتر ہے دلیل حضور ﷺ کا ارشاد ہے: **الصلوات الخمس مکفرات لما بینھن ما اجتنبت الکبائر** پانچ نمازیں درمیانی اوقات کیلئے کفارہ ہیں جبکہ کبائر سے بچا جائے اور یہ ظرفیت کی وجہ سے منصوب ہے :**ای وذلك مستمر فی جمیع الدھر**۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں حضور ﷺ کے ارشاد : **کفارۃ لما قبلھا**........کا معنیٰ یہ ہے کہ تمام گناہ معاف کیئے جاتے

ہیں۔ جب تک کہ کبیرہ نہ ہو پس اگر کبیرہ ہو گیا تو اب صغائر میں سے بھی معافی نہیں ہوگی۔ پس اگر یہ محتمل ہے تو اس کی طرف کوئی نہیں جاتا ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ بے شک یہ حدیث اور اس طرح کی اور احادیث یہ تکفیر سیئات کی صلاحیت کیلئے ہے۔ پس اگر صغائر میں سے کچھ ہوا تو عمل سے اس کو دور کر دیا جائے گا اور اگر کبیرہ ہی ہو صغیرہ نہ ہو تو کبیرہ کو تو معاف نہیں کیا جاتا تو ہمیں امید ہے کہ کبائر میں اس کی وجہ سے کچھ تخفیف ہو جائے گی، ورنہ اس کی نیکیاں اس کے بدلے میں لکھی جائیں گی اور درجات بلند کیے جائیں گے۔ علامہ طیبیؒ نے ہی ذکر کیا ہے اور اشرفؒ کا یہ کہنا: **المکتوبته تکفر ماقبلها**...... (جو پہلے گزرا ہے کہ جس میں عمر بھر کے گناہوں کی تکفیر مراد لینا ہے) یہ علی الاطلاق صحیح نہیں، غور کر لیں۔

وضو کرنے کا طریقہ

۲۸۷: وَعَنْهُ اَنَّهُ تَوَضَّأَ فَاَفْرَغَ عَلٰى يَدَيْهِ ثَلَاثًا ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُمْنٰى اِلَى الْمِرْفَقِ ثَلَاثًا ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُسْرٰى اِلَى الْمِرْفَقِ ثَلَاثًا ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَهُ الْيُمْنٰى ثَلَاثًا ثُمَّ الْيُسْرٰى ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوْئِيْ هٰذَا ثُمَّ قَالَ مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوْئِيْ هٰذَا ثُمَّ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ نَفْسَهُ فِيْهِمَا بِشَيْءٍ غُفِرَ لَهُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ۔ (متفق علیه و لفظه للبخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲۹۵/۱ حدیث رقم ۱۵۹۔ ومسلم ۲۰٤/۱ حدیث رقم (۳۔۲۲٦) والنسائی ٦٥/۱ حدیث رقم ۸۵۔ وأحمد فی المسند ٦٦/۱۔

ترجمہ: حضرت عثمانؓ کے متعلق منقول ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ وضو کیا۔ انہوں نے پہلے اپنے ہاتھوں پر تین مرتبہ پانی ڈالا۔ پھر تین مرتبہ مضمضہ یعنی کلی کی۔ پھر تین مرتبہ استنشاق یعنی ناک میں پانی داخل کر کے ناک جھاڑا۔ پھر تین مرتبہ منہ دھویا۔ پھر تین مرتبہ دایاں ہاتھ کہنی سمیت دھویا۔ پھر تین مرتبہ اپنا بایاں ہاتھ کہنی سمیت دھویا پھر اپنے سر کا مسح کیا پھر اپنا دایاں پاؤں تین مرتبہ دھویا۔ پھر اپنا بایاں پاؤں تین مرتبہ دھویا۔ پھر حضرت عثمانؓ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا ہے جس طرح کہ ابھی میں نے وضو کیا ہے پھر فرمایا جو شخص میرے اس وضو کی طرح وضو کرے۔ پھر دو رکعت نماز تحیۃ الوضو پڑھے اور نماز میں اپنے دل سے باتیں نہ کرے۔ یعنی پوری توجہ اور انہماک سے نماز پڑھے تو اس کے تمام سابقہ گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔

تشریح: (افرغ) افراغ سے ہے یہ بیان کے مبین پر عطف کی طرح ہے۔ **ای صب الماء۔**

علی یدیه ثلاثا: الی فغسلهما الی رسغیهما۔

ثم تمضمض: ای ردد الماء فی فمه۔

استنثر : امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ جمہور اس پر متفق ہیں کہ استنثار ناک سے پانی کا نکالنا ہے استنشاق کے بعد اور استنشاق پانی کو سانس کے ذریعے کھینچنا ہے۔ دوسری روایت جس میں استنثر اور استنشق ہے۔ وہ اس بات کیلئے دلیل ہے اس میں دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے اور یہ نثرۃ سے ماخوذ ہے۔ ناک کے کنارے کو کہتے ہیں اور اس پر بھی علماء کا اجماع ہے کہ تین سے زیادہ کسی عضو کو دھونے کے ساتھ گھیرنا مکروہ ہے اور اگر عضو کو دو چلوؤں سے گھیرے تو وہ ایک ہی شمار ہوگی۔ مسح راس میں عدد کا تذکرہ نہیں ہے۔ پس ظاہر یہی ہے کہ ایک مرتبہ پر اکتفاء ہے، اور یہی جمہور کا مذہب ہے اور اس لئے بھی کہ تکرار وہ غسل تک پہنچ جاتا ہے۔

ثم غسل وجهه ثلاثا۔ اور ظاہر یہی ہے کہ یہ تینوں میں سے ہر ایک دھونے کیلئے قید ہے۔

ثم غسل یده الیمنی الی المرفق۔ میم کے کسرہ اور فاء کے فتحہ کے ساتھ اور اس کے برعکس بھی ضبط کی گیا ہے۔

ثلاثا ثم غسل یده الیسری الی المرفق ثلاثا۔ اس میں ترتیب کی رعایت اور دائیں طرف سے شروع کرنا ہے اور جمہور کے نزدیک **الی مع** کے معنی میں ہے۔

ثم مسح براسه۔ ای بعضه او کله۔ دوسرا ظاہر لگتا ہے۔

ثم غسل رجله الیمنی ثلاثا ثم الیسری ثلاثا۔ اور ان جگہوں میں لفظ **ثم** تراخی کیلئے نہیں جو پے در پے دھونے کے منافی ہے بلکہ محض تعقیب کیلئے ہے۔

ثم قال رایت رسول الله ﷺ ۔ توضا نحو وضوئی هذا: حضرت عثمانؓ نے **نحو** فرمایا **مثله** نہیں فرمایا، اس لئے کہ آپ ﷺ کی حقیقت مماثلت اس پر آپ ﷺ کے علاوہ کوئی قادر نہیں۔ یہ امام نوویؒ کا کلام ہے اور ابن حجرؒ نے امام نوویؒ کے تعاقب میں یہ عجیب بات کی ہے، کہ آپ ﷺ کے اس ارشاد: **من توضا وضوئی هذا ای مثله** میں امام نوویؒ کا واضح ردّ ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ کسی چیز میں مماثلت اس کے تمام اوصاف میں مماثلت کو لازم نہیں کرتی۔

(ملاّ علی قاریؒ فرماتے ہیں) یہ غیر صریح ہے بلکہ غیر صحیح ہے۔ اس لئے کہ امام نوویؒ کی بحث اس میں تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لفظ **نحو** کو لفظ **مثل** پر ترجیح دی ہے اس لئے کہ **نحو** کا لفظ حقیقی مماثلت کی نفی میں واضح ہے، بخلاف **مثل** کے کہ وہ کبھی حقیقی مماثلت میں استعمال ہوتا ہے بلکہ اکثر خصوصاً محدثین کے ہاں کہ جب یہ کہا جائے **روی مثله** تو لفظ اور معنی دونوں مراد ہوتے ہیں اور جب **روی نحوه** کہا جائے تو معنی مراد ہوتا ہے نہ کہ اور باقی۔ حضور ﷺ کا ارشاد (**من توضا وضوئی هذا**) تو اجماعاً یہاں **نحوه** مراد ہے۔ پس حافظ صاحبؒ کا **مثله** مصدر نکالنا بغیر نزاع کے مردود ہے۔ پس بے شک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی جلالت شان کے باوجود جب **مثل** وضوء رسول کے احاطہ سے عاجز آ گئے۔ پس ہر ایک اس بات پر راضی ہوگا کہ وہ آپ کی طرح وضو کرے (کیونکہ **مثل** ممکن نہیں) پس بے شک حضور ﷺ کی تمام سنتوں کا احاطہ اکثر متعمق فقہاء اور متشدد صوفیا پر مشکل ہوا ہے۔ چہ جائیکہ عوام الناس کیلئے ممکن ہو۔

ثم قال: النبی علیه السلام ۔ جب آپ وضو سے فارغ ہوئے۔

من توضا نحو وضوئی هذا: ای جامعا لفرائضه وسننه ۔

ثم یصلی رکعتین: اس میں ہر وضو کے بعد دو رکعتیں پڑھنے کے استحباب کا ثبوت ہے اور اگر کوئی فرض نماز پڑھ لی تو یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ جیسا کہ: **تحیة المسجد** کا ثواب فرض کو ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے۔

لا یحدث نفسه : ای لایکلمها۔

فیهما بشیء : دینا کے امور میں سے اور جو نماز کے متعلق نہیں ہے، ان کے ساتھ مشغول نہ ہو اور اگر کوئی بات اس کو پیش آئے اور یہ اس اعراض کر لے تو یہ معاف ہے اور فضیلت اس کو ملے گی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کے وہ خیالات جو آئے ہیں لیکن ٹھہرتے نہیں ہیں، معاف کر دیئے ہیں۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

بعض کا کہنا ہے کلمہ ایسی چیز کا خیال کہ جس میں یہ ہے یعنی نماز میں جس میں یہ ہے یعنی نماز میں اس سے متعلق نہ ہو اگر چہ آخرت سے متعلق ہو۔ اگر چہ آخرت سے متعلق ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد اس سے امورِ دنیا ہیں۔ اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز کی حالت میں بھی لشکر کی تیاری فرماتے تھے، یعنی ان کا دِل حاضر ہوتا تھا۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی نماز خاص اللہ تعالیٰ کیلئے ہو یعنی ریا اور طمع کیلئے نہ ہو۔

غفر له: مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

ماتقدم من ذنبه: ای من الصغائر۔ اور اس حدیث سے یہ بات سمجھی گئی ہے کہ مغفرت ذنوب وہ مرتب ہے۔ وضو مع الصلوٰۃ پر اور اس سے پہلی حدیث سے صرف وضو پر مرتب ہونا یہ وضو کی فضیلت کی خصوصیت کی وجہ سے ہے۔ **(فلا تعارض)۔**

ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں یہ بات بھی ہے کہ نماز کو وضو پر خصوصیت حاصل ہے نہ کہ اس کے عکس جیسا کہ یہ طے شدہ واضح بات ہے۔ بے شک وضو وہ نماز کیلئے وسیلہ اور شرط ہے اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک گناہوں کو زائل کرنے والا ہو۔ یا خالی وضو وہ اعضاء وضو کے گناہوں کو زائل کرتا ہے اور نماز کے ساتھ تمام اعضاء کے گناہوں کو زائل کرنے والا ہے۔ یا وضو ظاہری گناہوں کیلئے مزیل ہے اور نماز کے ساتھ ظاہری اور باطنی دونوں کیلئے۔ واللہ اعلم

صحیح وضو اور تحیۃ الوضوء سے جنت واجب ہو جاتی ہے

۲۸۸: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَتَوَضَّأُ فَيُحْسِنُ وُضُوْءَهُ ثُمَّ يَقُوْمُ فَيُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ مُقْبِلًا عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهِ وَوَجْهِهِ اِلَّا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۲۰۹ حدیث رقم (۱۷۔۲۳٤) وأحمد فی المسند ٤/۱۵۳۔

ترجمه: ''حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو مسلمان اچھی طرح وضو کرے۔ پھر کھڑا ہو کر دو رکعت نماز پڑھے۔ دل اور منہ سے متوجہ ہو کر۔ یعنی ظاہر اور باطن دونوں کی توجہ کے ساتھ تو اس کے لئے جنت واجب ہو جاتی ہے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

راوئ حدیث:

عقبہ بن عامر: یہ عقبہ بن عامر جہنی ہیں جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے عتبہ

بن ابی سفیان کے بعد حاکم مقرر ہوئے۔(عتبہ بن ابی سفیان حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے)۔ پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو معزول کر دیا۔ ۵۸ھ میں مصر کی سرزمین پر وفات پائی۔ ان سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اور بہت سے حضرات تابعین رحمۃ اللہ علیہم احادیث نقل کرتے ہیں۔

تشریح ابن حجرؒ نے یہاں عجیب بات کہی ہے، کہ **یحسن** کا مطلب یہ ہے کہ واجبات کے ساتھ اداء کرے اور سنن ومستحبات یعنی مکملات کا بھی احتمال ہوسکتا ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں بے شک احسان وضو کا ذکر (توضی) کے بعد یہ مکملات یعنی سنن ومستحبات کے علاوہ کا احتمال بھی نہیں رکھتا اور اس کے ساتھ ساتھ لفظ احسان کی اس پر دلالت بھی ہے اور اس کی طرف اشارہ بھی ہے۔

ثم یقوم: ای حقیقة او حکما خصوصاً جب کہ معذور ہو۔ یہ کہنا بطور اکثریت کے ہے نہ کہ بطور قید احترازی کے اور ثم ترقی کیلئے ہے۔

فیصلی رکعتین مقبل علیهما: ای علی الرکعتین۔

بقلبه: ای باطنه۔

ووجهه: ای ظاهره اوذاته۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں۔ مقبل اصول میں مرفوع پایا گیا ہے اور بعض نسخوں میں مقبلا منصوب ہے حال ہونے کی وجہ سے یعنی حال کو نہا متوجها اور اس کا مرفوع ہونا یہ مشکل ہے اس لئے اگر مرفوع مانیں تو یا تو یہ مسلم کی صفت ہوگی من کو زائد مان کر تو موصوف صفت میں فصل ہے اور یا یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے اور جملہ حال واقع ہے اور یہ بھی بعید ہے واؤ نہ ہونے کی وجہ سے ہاں اس کو فوہ الی فی کے قبیل سے مان لیا جائے۔ تو پھر بات بچ جائے گی اور بہتر یہ ہے کہ یہ ایسا فاعل ہے، جس میں تنازع فعلان ہے مبالغۃً تجرید کا استعمال کرتے ہوئے، اور قوی بات یہاں یہ ہے کہ یہ مسلم کی صفت ہے اور فصل اجنبی نہیں ہے۔

الا وجبت له الجنة: یعنی اللہ تعالیٰ جنت میں داخل کریں گے اپنے فضل کے ساتھ اپنے وعدے کے یقیناً خلاف نہیں کریں گے۔ اس شخص کی طرح جس پر کوئی چیز واجب ہو۔

وضو کے بعد کی دعا

۲۸۹: **وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ يَتَوَضَّأُ فَيُبْلِغُ اَو فَيُسْبِغُ الْوُضُوْءَ ثُمَّ يَقُوْلُ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اِلَّا فُتِحَتْ لَهٗ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ الثَّمَانِيَةُ يَدْخُلُ مِنْ اَيِّهَا شَاءَ** (هكذا رواه مسلم فی صحيحه والحميدی فِیْ افراد مسلم وَكذا ابن الاثيرفی جامع الاصول و ذكرالشيخ محی الدين النووی فی

آخرحديث مسلم على ما رويناه وزاد الترمذى) **اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِىْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِىْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ والحديث الذى رواه المحى السنة فى الصحاح مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ اِلٰى آخِرِهٖ** (رواه الترمذى) **فِىْ جامعه بعينه اِلَّا كَلِمَةً اَشْهَدُ قَبْلَ اَنَّ مُحَمَّدًا۔**

أخرجه مسلم فى صحيحه ۲۰۹/۱حديث (۱۷۔۲۳٤)وأخرجه الترمذى ۷۷/۱حديث رقم ۵۵ وأخرجه النسائى ۹۲/۱حديث رقم ۱٤۸ وأبوداود ۱۱۸/۱حديث رقم ۱٦۹ وأخرجه ابن ماجةفى السنن ۱۵۹/۱حديث رقم ٤۷۰۔

ترجمہ: ''حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے جو انسان وضو کرے اور اس کی خوبیوں کو انتہاء درجہ تک پہنچا دے یا آپ ﷺ نے فرمایا کہ پورا اور مکمل وضو کرے اور پھر یہ پڑھے۔ **اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔** میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں۔ **اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔** میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں اس بات کی کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ تو اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں جس دروازے سے اس کا دل چاہے داخل ہو اس حدیث کو روایت کیا ہے امام مسلم نے اپنی صحیح میں اور امام حمیدی نے افراد مسلم میں اور اسی طرح ابن الاثیر نے جامع الاصول میں ذکر کیا ہے اور امام نوویؒ نے مسلم کی حدیث کے آخر میں جس کو ہم نے روایت کیا ہے یہ ذکر کیا ہے کہ امام ترمذیؒ نے شہادتین کے ساتھ ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ **اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِىْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِىْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۔** اے اللہ مجھے توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی حاصل کرنے والوں میں سے بنا دے۔ یعنی مسلم کی روایت جس طرح ہم نے ذکر کی ہے۔ وہی روایت علامہ نوویؒ نے صحیح مسلم کی شرح میں نقل کی ہے اور اس کے آخر میں۔ رواہ الترمذی کی عبارت کا اضافہ کیا ہے اور وہ حدیث جس کو امام محی السنۃ نے صحاح میں روایت کیا ہے یعنی **من توضأ فاحسن الوضو** .... یعنی جس نے وضو کیا اور اچھا وضو کیا آخر تک اس روایت کو امام ترمذی نے اپنی جامع میں بعینہٖ اس طرح نقل کیا ہے مگر ان **محمدًا** سے پہلے **اشھد** کا لفظ ذکر نہیں کیا۔''

تشریح: من بیانیہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ من تبعیض کیلئے ہے اور یہ حال ضعیف ہے۔

من احد : یہ سیبویہ کی رائے پر مبتدا ہے اور من زائدہ ہے۔

یتوضأ فیبلغ: ابلاغ سے ہے۔

او فیسبغ: اسباغ سے ہے اوْ شک کیلئے ہے۔

الوضوء : واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہے اور بعض نے ضمہ کے ساتھ مانا ہے **ای ماء الوضو** ابن حجرؒ نے یہاں بھی وہی عجیب بات کہی ہے کہا : **اَن یأتی بواجباته ویحتمل مکملاته،** (وجہ غرابت یہ ہے) کہ ابلاغ اور اسباغ کا توضو پر عطف یہ نہیں ہو گا مگر مکملات (سنن و مستحبات) ہی کے مراد ہونے کے ساتھ پس بے شک اصل وضو وہ بغیر واجبات کے متصور ہی نہیں ہے۔

ثم يقول :ای عقيب وضوئه ۔ اشهد ان لا اله الا الله وان محمدا عبده ورسوله۔
علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں۔ وضو کے بعد شہادتین کہنا اس میں اشارہ ہے عمل کے خالص اللہ کیلئے ہونے کی طرف اور دِل کی طہارت کی طرف شرک وریا سے حقیقی اور حکمی نجاست سے اعضاء کو پاک کرنے کے بعد۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں۔ وضو کے بعد کلمات شہادتین کہنا مستحب ہے اور یہ اجماعی مسئلہ ہے اور مناسب ہے کہ اس کے ساتھ وہ کلمات بھی ملا لیئے جائیں جو ترمذی کی روایت میں ہے: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ اور ایسی طرح جو امام نسائی نے **عمل اليوم و الليله** میں مرفوع روایت نقل کی ہے: **سبحانك اللهم و بحمدك اشهد ان لا اله الا انت استغفرك واتوب اليك۔** ہمارے اسلاف فرماتے ہیں۔ غسل کرنے والے کیلئے بھی یہ اذکار مستحب ہیں۔

وفی رواية۔ ای المسلم ۔

اشهد ان لا اله الا الله وحده :ای واحدا بالذات یعنی ذات کے اعتبار سے واحد اور صفات کے اعتبار سے منفرد۔

لا شريك له :ای فی ذاته وصفاته۔

وأشهد۔ اور شاید کہ یہ اشہد کا تکرار فصل کے لمبا ہونے کی وجہ سے ہے۔

و ان محمدا عبده: الافضل

رسوله : الاكمل

الا فتحت: تخفیف اور تشدید دونوں کے ساتھ جائز ہے۔

له ابواب الجنة الثمانية: مرفوع ہے۔

يدخل من ايها شاء: زیادہ ظاہر یہی ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے **ليدخل** کے اس کی جگہ پر رکھنے کے صحیح ہونے کی وجہ سے بعض نے کہا ہے۔ اس کو مزید شرف دینے کے اظہار کیلئے اختیار دیا جائے گا۔ لیکن اس کو الہام نہیں کہا جائے گا۔ مگر اس دروازے سے داخل ہونے کے اختیار کرنے کا جا اس طرح کے اعمال کرنے والوں کیلئے تیار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ریان روزہ داروں کیلئے ہے۔

هكذا رواه مسلم فی صحيحه والحميدی فی افراد مسلم وكذا ابن الاثير فی جامع الاصول۔

وذكر الشيخ محی الدين : یہ عبارت شیخ کے اس کلام کے منافی نہیں ہے۔ کہ جس میں اس نے کہا ہے، میں کسی کیلئے اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ میرا نام محی الدین رکھے، (یعنی حلال قرار نہیں دیتا) اس لئے کہ یہ شیخ کی طرف سے بطور تواضع کے ہے۔

النووی دو واؤں کے ساتھ درمیان میں الف نہیں ہے اور بعض اس کو "**النواوی**" الف کے ساتھ کہتے ہیں اور پہلا ہی وہ قیاس کے اعتبار سے صحیح ہے۔ اس لئے یہ منسوب ہے۔ نوی قریہ کی طرف جو دمشق کے قریب واقع ہے۔ ابن حجرؒ نے یہی کہا ہے۔
فی اخر حديث مسلم علی مارويناه ۔ یہ اخر سے متعلق ہے اور صیغہ معروف کا ہے۔ بعض نے مجہول بنایا ہے۔ ای

علی وفقه یعنی اس کے مطابق روایت کی گئی ہے۔

وزاد الترمذی : یہ نووی کا مذکور ہے۔

اللهم اجعلنی من التوابین : ای للذنوب والراجعین عن العیوب اوراس میں صراحۃً یا لزوماً بندے سے کثرت کے ساتھ گناہ واقع ہونے کی دعاء نہیں ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ جب اس سے گناہ ہوتو اس سے توبہ کرنا بھی دل میں ڈال دیا جائے۔ اگر چہ کثیر مرتبہ ہواوراس میں امت کو تعلیم دینا مقصود ہے۔جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: **کلکم خطاؤون وخیر الخطائین۔**

التوابون : جوتوبہ کرنے والے ہیں اوراللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ ……﴾ [البقرة: ٢٢٢] ''کچھ شک نہیں کہ خدا توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''

ای اللذین لم یرجعوا عن باب مولاهم ۔یعنی جو اپنے مولا کے دروازے سے نہیں ہٹتے اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔

واجعلنی من المتطهرین: یعنی سابقہ گناہوں سے چھٹکارے کے ساتھ اور آئندہ غلطیوں میں ملوث ہونے سے بچنے کے ساتھ یا اخلاق ذمیمہ یعنی برے اخلاق سے پاکی مراد ہے۔پس اس میں اشارہ ہوگا ظاہری اعضاء کی طہارت کا اس لئے کہ وہ ہمارے ہاتھ میں اور مقدرت میں ہے ہم نے اس سے پاکی حاصل کر لی اور باقی باطنی احوال سے پاکی پس بیشک وہ تیرے قبضہ میں ہے پس تو اپنے فضل وکرم سے اس سے بھی پاک کر۔

والحدیث الذی رواه محیی السنة رحمۃ اللہ۔

فی الصحاح ۔

من توصنا فاحسن الوضوء الی اخره۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ پھر اس طرح کہا ہے: **اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شریك له واشهدان محمدا عبده ورسوله اللهم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطهرین فتحت نه ثمانیته ابواب الجنة یدخل من ایها شاء** رواہ عقبہ بن عامر اسی طرح مصابیح میں بھی ہے۔

رواه الترمذی فی جامعه بعینه الا کلمة اشهد ،قبل ان محمدا:

اوراس عبارت سے مقصود صاحب مصابیح پر اعتراض کرنا ہے کہ انہوں نے ترمذی کی روایت کو صحاح میں ذکر کیا ہے۔اس میں ابہام (شک) پڑتا ہے کہ یہ روایت بتمامہ صحیحین میں سے ایک میں یا دونوں میں ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے کتاب ازھار میں یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ حدیث مضطرب اور منقطع ہے اور ضعیف کو لفظاً اور معنیً عبارت کی تغیر کے ساتھ صحیح کے ساتھ ملانا پسندیدہ و مقبول نہیں ہے۔

قیامت کے دن وضو کے اعضاء چمکتے ہوں گے

۲۹۰:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اُمَّتِیْ يُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غُرًّا

مُّحَجَّلِيْنَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوْءِ فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنكُمْ اَنْ يُطِيلَ غُرَّتَهُ فَلْيَفْعَلْ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ١/٢٣٥ حدیث رقم۔ ومسلم ١/٢١٦ حدیث رقم(٣٥۔٢٤٦)وأحمد فی المسند ٢/٣٣٤۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن میری امت کو اس حال میں بلایا جائے گا کہ وضو کی وجہ سے ان کی پیشانیاں چمک رہی ہوں گی اور وضو کے اعضاء چمکتے ہوں گے لہٰذا تم میں سے جو شخص چاہے وہ اپنی پیشانی کے نور کو بڑھائے، تو اس کو چاہئے کہ وہ ایسا ہی کرے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: مراد امت اجابت ہے۔ بلکہ اس میں سے بھی خواص مراد ہیں اور وہ عابدین ہیں۔

يدعون يوم القيٰمة اى يسمون۔

غرا محجلين اور بعض نے **يدعون** کا ترجمہ **ينادون** (یعنی پکارے جائیں گے) کے ساتھ کیا ہے۔ اے چمکدار پیشانی اور سفید ہاتھ پاؤں والو آ جاؤ جنت کی طرف اور بعض نے کہا ہے، کہ ان کو تمام لوگوں کے سامنے بلایا جائے گا۔ یا ان کو حشر کی طرف طلب کیا جائے گا۔ یا ان کو جنت کی طرف اس حال میں بلایا جائے گا کہ ان کے اعضاء وضوء چمک رہے ہونگے۔

اشرفؒ فرماتے ہیں **الخريه اغر** کی جمع ہے اور اس کے معنی سفید چہرے کے ہیں اور محجل ان چوپاؤں کو کہتے ہیں جن کی پنڈلیاں سفید ہوں اور یہ ماخوذ ہے حجل سے جس کا معنی پازیب اور بیڑی کے آتے ہیں۔ گویا کہ ان پنڈلیوں کو سفیدی کی پازیب پہنائی گئی ہے۔ اصل یہ گھوڑے میں ہوتی ہے۔

مطلب اس حدیث کا یہ ہے کہ جب ان لوگوں کے سامنے یا جنت کی طرف بلایا جائے گا۔ وہ اس طرح کے ہونگے اور **غرا محجلين** منصوب ہونگے۔ حال ہونے کی بناء پر جب کہ **يدعون' ينادون** یا **يطلبون** کے معنیٰ میں ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ **يدعون** کیلئے مفعول ثانی ہو جبکہ وہ **يسمون** کے معنی میں لیا جائے۔ **كما يقال فلان يدعى ليشا** کہ فلاں کو شیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ ان کو یہ نام دیا جائے گا بوجہ وضوء کے اثار کے اور پہلا معنیٰ ہی زیادہ بہتر ہے اور اس پر حضور ﷺ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے۔

ياتون يوم القيمه غرا محجلين۔ اس لئے کہ یہی وہ علامت ہے کہ جس کی وجہ سے اس امت اور امم سابقہ کے درمیان فرق ہوگا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وصف ظاہری کے اعتبار سے نام رکھنا یہ بعید نہیں ہے جیسا کہ احمر اس آدمی کا نام رکھ دیا جائے کہ جس میں حمرۃ (سرخائی) پائی جائے اور یہ زیادہ ظاہر ہے اس لئے کہ مقصود وہ شہرت اور تمیز ہے۔ (**من اثار الوضوء**) وضوو واؤ کے فتحہ کے ساتھ۔ مراد وہ پانی جو متوضی کے اعضاء تک پہنچے۔ بعض کا کہنا ہے کہ وضو ضمہ کے ساتھ ہے ازھار میں یہ کہا گیا ہے کہ فتحہ بھی جائز ہے لیکن فتحہ یہ سیدؒ کی اصل ہے اور معنیٰ یہ زیادہ واضح ہے۔

فمن استطاع منكم ان يطيل غرته: اى وتحجيله بايصال الماء الى اكثر من محل الفرض اور غرہ کے ساتھ تحجیل کا تذکرہ نہ کرنا یہ بطور صنعت اکتفاء کے ہے۔

فليفعل: علامہ منذری فرماتے ہیں۔ کہ **فمن استطاع**........ یہ ابو ہریرہؓ کے کلام میں سے مدرج ہے اور یہ ان پر موقوف ہے۔ حفاظ حدیث میں کئی حضرات نے اسی طرح ذکر کیا ہے (مدرج یعنی کلام صحابی ہے جو حدیث میں شامل کر دیا گیا

ہے)ابوا عسقلانی فرماتے ہیں ابونعیم نے کہا ہے ”میں یہ نہیں جانتا ہے کہ من استطاع........یہ قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہے یا قول ابو ہریرہؓ میں سے ہے اور میں نے یہ جملہ احمدؒ کی روایت میں کہ جنہوں نے اس روایت کو صحابہ سے روایت کیا ہے اور وہ صحابہ دس ہیں نہیں دیکھا اور نہ ہی ان سے جنہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ سوائے ابونعیم کی اس روایت کے اور ابن حجرؒ کی یہ بات کہ فمن استطاع......میں یہ دعویٰ کرنا کہ ابو ہریرہؓ کے کلام میں سے ہے۔ لہٰذا غرہ اور تحجیل مسنون نہیں ہے۔ اس وجہ سے مردود ہے کہ مدرج کے صحیح ہونے میں کوئی چیز دلالت نہیں کرتی اور اصل میں اس کا نہ ہونا ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ مدرج ہوتی وہاں پر تو حضرت ابو ہریرہؓ اس کو کسی نہ کسی طریق میں ضرور بیان کرتے اور محض اس کا محتمل ہونا سودمند نہیں ہے۔ لیکن اس کی تحقیق اس آدمی کیلئے ضروری ہے جس کو محدثین اور اصولیین کی اصطلاح کا علم نہیں ہے۔ جو کہ استدلال کرنے والے ہیں کئی وجوہ سے پہلی وجہ یہ ہے کہ اگر فمن استطاع.......کو ابو ہریرہؓ کے کلام میں سے بھی مانیں، تو غرہ تحجیل مسنون نہیں ہوگی، یہ مسلم نہیں۔ اس لئے کہ اس کا مستحب ہونا حضور علیہ السلام کے اس ارشاد (یدعون غرا محجلین) سے معلوم ہوتا ہے اور اطالتہ الغرۃ کا کا ثبوت وہ آئندہ حدیث میں مذکور ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب حفاظ حدیث اپنے کلام میں یہ کہیں کہ یہ مدرج ہے یا موقوف ہے۔ تو فقہاء کرام پر اس کی متابعت واجب ہے بلکہ اگر وہ مرفوع یا موقوف ہونے میں بھی متردد ہوں، تو اس روایت کو یقینی طور پر مرفوع مان کر کسی فقہی مسئلہ کی بنیاد نہیں بنا سکتے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں یہ کہنا کہ 'اگر مدرج ہوتی تو حضرت ابو ہریرہؓ ضرور بیان کرتے، یہ پسندیدہ نہیں۔ اس لئے کہ بحث ہی ان کے قول ہونے میں۔ پس کیسے وہ بیان کرتے کہ یہ ان کا قول ہے یا ان کے علاوہ کسی اور کا اس کو تو بعد والوں نے بیان کیا ہے اور ابونعیم جو ان سے روایت کرنے والے ہیں بغیر واسطے کے ان کا تردد کہ یہ مرفوع ہے یا موقوف بھی حجت کیلئے کافی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے اس روایت میں ان کا شاذ اور منفرد ہونا باقی رواۃ کے مقابلہ میں اور تمام ان طرق کے کہ جو دس کی تعداد تک پہنچ رہے ہیں، اسی پر دلالت کر رہا ہے۔ (کہ یہ مدرج ہے)

اعضاءِ وضو کی زیور کی طرح آرائش کی جائے گی

۲۹۱: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَبْلُغُ الْحِلْيَةُ مِنَ الْمُؤْمِنِ حَيْثُ يَبْلُغُ الْوَضُوْءُ۔

۲۹۱: أخرجه مسلم ۲۱۹/۱ حديث رقم(۴۰۔۲۵۰)وأخرجه النسائى فى السنن ۹۳/۱ حديث رقم ۱۴۹۔ وأخرجه أحمد فى المسند ۳۷۱/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں مؤمن کا زیور وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وضو کا پانی پہنچے گا۔ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ای البیاض: یعنی سفیدی اور بعض نے حلیہ سے مراد جنت میں زینت لی ہے۔

الوضوء: واؤ کے فتحہ کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ مراد ماء الوضوء۔ بعض نے ضمہ کے ساتھ مانا ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں۔ یبلغ یہاں یتمکن کے معنی کو شامل ہے اور منْ کے ساتھ اس کو متعدی کہا گیا ہے۔ ای تتمکن

من المؤمن الحلیة مبلغا یتمکن' الوضوء منه کہ مؤمن کے وہاں تک سفیدی ہوگی، جہاں تک اس کا وضوء ہوتا ہوگا۔
علامہ نوویؒ فرماتے ہیں۔ محدثین نے ان دونوں سے استدلال کیا ہے کہ وضو یہ اس امت کی خصوصیات میں ہے اور بعض دوسرے حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ وضو خاص نہیں ہے بلکہ پیشانی اور ہاتھ پاؤں کا سفید ہونا، یہ اس امت کے ساتھ خاص ہے۔ حضور علیہ السلام کے اس ارشاد کی وجہ سے: هذا وضوئی ووضوء الانبیا من قبلی اور اس کا یہ جواب دیا گیا ہے، کہ یہ حدیث ایسی ہے کہ جس کا ضعف معروف ہے اور مزید یہ کہ اس میں وضو انبیاء کے ساتھ خاص ہونے کا احتمال ہے نہ کہ امم سابقہ کے ساتھ۔ لیکن صحیح بخاری اور اس کے علاوہ بعض دوسری کتابوں میں یہ حدیث بھی ہے۔ کہ حضرت سارہؓ (ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ) اور جریج نے وضو کیا۔ تو لہٰذا مناسب یہی کہ غرہ اور تحجیل حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ اور تمام امتوں میں اس امت کے ساتھ خاص ہو۔ (واللہ اعلم)

الفصل الثانی:

نماز بہترین عمل ہے

۲۹۲: عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِسْتَقِيْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ خَيْرَ أَعْمَالِكُمُ الصَّلٰوةُ وَلَا يُحَافِظُ عَلَى الْوُضُوْءِ اِلَّا مُؤْمِنٌ۔ (رواه مالك واحمد وابن ماجة والدارمی)

أخرجه مالك فی الموطأ ١/٣٤حديث رقم وأخرجه أحمد فی المسند ٥/٢٨٢وأخرجه ابن ماجة فی السنن ١/١٠١حديث رقم ٢٧٧۔وأخرجه الدارمی ١/١٧٤حديث رقم ٦٥٥۔

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ سیدھے رہو اور ہرگز تم سیدھا رہنے کی طاقت نہیں رکھ سکتے ہو اور جان لو کہ تمہارے اعمال میں بہترین عمل نماز ہے اور وضو کی حفاظت صرف مؤمن ہی کر سکتا ہے۔ اس حدیث کو امام مالکؒ امام احمدؒ، امام ابن ماجہؒ اور امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ثوبان۔ یہ ''ثوبان بن بجدد'' ہیں۔ ان کی کنیت ''ابوعبداللہ'' ہے۔ ان کو ''ابوعبدالرحمٰن'' بھی کہا جاتا ہے۔ مکہ اور یمن کے درمیان واقع ''سراۃ'' جگہ سے غلام بنالئے گئے۔ ان کو رسول اللہ ﷺ نے خرید کر آزاد کیا تھا۔ یہ حضور ﷺ کی وفات تک سفر اور حضر میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے۔ پھر ''شام'' آگئے تھے۔ پھر ''رملہ'' میں آئے اس کے بعد ''حمص'' میں مقیم ہوئے اور وہیں ۵۴ھ میں وفات ہوئی۔ ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے۔

تشریح: ''بجدد'' میں ایک نقطہ والی باء مضموم جیم ساکن اور پہلی دال مہملہ مضموم ہے۔

قال رسول الله ﷺ، استقیموا: قاضیؒ فرماتے ہیں۔ استقامت کہتے ہیں حق کی پیروی کرنے اور عدل وانصاف کے قیام اور سیدھے راستے کو لازم پکڑنے کو اور یہ بہت بڑا معاملہ ہے۔ علامہ طیبیؒ نے اس کو ذکر کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ امر اس بارے میں اس میں سے بقدر وسعت کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [البقرہ:

۲۸۶] ''اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلّف نہیں بناتا، مگر اسی کا جو اس کی طاقت میں ہو'' اور اس کو اپنے اس ارشاد سے بیان فرمایا: **ولن تحصوا - ای لن تطیقوا** - یعنی تم استقامت کے حق کو پورا نہیں کر سکتے۔ اس کی تم میں طاقت نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ بہت بڑا امر ہے اور ہمیشہ اس کے حق کی بجا آوری مشکل بات ہے۔ تو مقصود اس میں تنبیہ کرنا ہے۔ مکلّفین کو ان کی طرف سے کمی کے دیکھنے پر اور ان کو مزید کوشش و ہمت پر ابھارنا بھی ہے، تاکہ وہ اعمال جو وہ کر رہے ہیں اسی پر بھروسہ نہ کر لیں اور اس سے غفلت میں نہ ہو اور نہ ہی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوں اس میں کہ جس کو وہ عجز کی وجہ سے چھوڑ رہے ہیں نہ کہ کمی کی وجہ سے بعض نے کہا ہے۔ **لن تحصو ای ثوابها** - کہ تم اس استقامت کا ثواب شمار نہیں کر سکتے۔ تو **لن تحصوا به احصاء** سے ہوگا۔ معنی ہے گننا شمار کرنا۔

طیبیؒ فرماتے ہیں احصاء۔ گننے کے ساتھ حاصل کرنا یہ ماخوذ ہے حصیٰ سے اور حصیٰ کنکریوں کو کہتے ہیں۔ کیونکہ گننے میں عرب حضرات کنکریاں استعمال کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اپنی انگلیوں پر گنتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ معنی یہ ہے کہ تم طاقت نہیں رکھ سکتے۔ لیکن تم صرف کرو اپنی کوشش کو اللہ کی اطاعت میں بقدر اس کے کہ جس کی تمہارے اندر طاقت ہے اور یہ جملہ دو معطوفوں کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے ہے اور یہ اس آدمی کے رد کیلئے لایا گیا ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ وہ کوشش کے ذریعے استقامت کی انتہاء تک پہنچ جائے گا۔

واعلموا ان خير اعمالكم - اى افضلها واتمها - استقامت پر دلالت کے واسطے۔

الصلاة: اى المكتوبه او جنسها - فرض نماز یا جنس نماز مراد ہے۔ اس لئے کہ نماز میں ہر عبادت کا حصہ موجود ہے جیسا کہ قراءت تسبیح تکبیر کھانا پینا چھوڑنا اور اس کے علاوہ کئی چیزیں۔ پس یہ تمام عبادات کی ماں ہے اور گناہوں سے روکنے والی ہے۔

ولا يحافظ: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ جملہ ماقبل ہی سے متعلق ہے **اى يواظب**۔

على الوضوء - حقیقی طور پر یا حکمی طور پر تاکہ نیند کی حالت کو بھی شامل ہو جائے۔

الا مؤمن: مراد جنس ہے اور تنوین تعظیم کیلئے ہے، یعنی نہیں ہمیشگی اختیار کرتا اس پر مگر ایسا مؤمن جو اپنے ایمان میں کامل ہے اور اپنے قلب بدن سے اللہ کے جناب حضوری ہی میں رہتا ہے۔ اس لئے کہ دربار مقدس میں ظاہری طہارت کے بغیر حاضری ادب سے بعید ہے بلکہ ایسا کرنے والا اس کے لائق ہے کہ اس کو دربار سے نکال دیا جائے۔

اسی طرح یہ روایت حاکم بیہقی نے ثوبانؓ سے ابن ماجہ اور طبرانی نے ابن عمروؓ سے اور طبرانی نے حضرت سلمہ بن الاکوع سے روایت کی ہے اور ابن ماجہ نے ابوامامہؓ سے اور طبرانی نے حضرت عبادہؓ سے بھی روایت کی ہے اور ان دونوں کے الفاظ یہ ہیں:

استقيموا ونعما ان استقتم وخير اعمالكم الصلاة ......

وضو علی الوضو کی فضیلت

۲۹۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ تَوَضَّأَ عَلٰى طُهْرٍ كُتِبَ لَهٗ عَشْرُ حَسَنَاتٍ۔

(رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی ١/٨٧حديث رقم ٥٩۔ أخرجه أبوداود فی السنن١/٥٠حديث رقم ٦٢وابن ماجة فی السنن ١/١٧٠حديث رقم٥١٢۔

ترجمه: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو انسان وضو کے اوپر وضو کرے۔ تو اس کے لئے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

تشریح: شرح السنۃ میں ہے۔ کہ وضو کی تجدید مستحب ہے جبکہ پہلے وضو سے کوئی نماز پڑھی ہو اور بعض فقہا نے کہا ہے کہ اگر پہلے وضوء سے نماز نہ پڑھی تو یہ مکروہ ہے۔ علامہ طیبیؒ نے اس کو ذکر کیا ہے اور ابن الملک فرماتے ہیں اور اگر نماز نہ پڑھی تو پھر وضو علی الوضو مستحب نہیں ہے۔ ملاّ علی قاریؒ فرماتے ہیں، کہ نماز ہی کے معنی میں طواف اور تلاوت بھی ہے اور شاید کے سبب کراہت وہ اسراف ہو۔ (رواہ ترمذی اور امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث، اس کی سند ضعیف ہے اور اس کو ابوداؤد اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے)۔

الفصل الثالث:

نماز کی کنجی وضو ہے

۲۹۴:وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ الصَّلٰوةُ وَمِفْتَاحُ الصَّلٰوةِ الطُّهُوْرُ۔

(رواه احمد)

أخرجه أحمد فی المسند ٣/٣٤٠۔ (١)البيهقی فی شعب الايمان ٣/٤حديث رقم ٢٧١١۔ (٢)الجامع الصغير ٢/٥٠١حديث ٨١٩٢۔

ترجمه: ''حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جنت کی کنجی نماز ہے اور نماز کی کنجی وضو ہے۔ اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ای مفتاح درجاتها: ورنہ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ جنت کی چابی وہ کلمہ توحید ہے۔ لہٰذا یہاں نماز اس کے درجات کی چابی ہوگی۔

الطهور: طہور فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ مراد ہوسکتا ہے۔ یعنی طہارت اس کی بڑی چابی ہے۔ کیونکہ یہ اس کی شروط میں سے ایک شرط ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں جیسا کہ نماز بغیر وضوء کے نہیں ہوتی اس لئے بغیر نماز کے جنت میں داخلہ بھی میسر نہ ہوگا اور اس میں ان حضرات کیلئے دلیل موجود ہے جو تارک صلوٰۃ کی تکفیر کے قائل ہیں اور اس بات کے، کہ یہ نماز ایمان اور کفر کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔

اور اس کے علاوہ بعض دوسرے حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ اس کلام سے نماز کی ترغیب دینا ہے اور یہ بات باور کرانا ہے،

کہ نماز ان چیزوں میں سے ہے کہ جن سے آدمی کبھی بھی مستغنی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ یہ جنت میں دخول اولیٰ کے اسباب میں سے ہے۔ عذاب سے پالا پڑے بغیر۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ سند حسن ہے میرکؒ فرماتے ہیں ابوداؤد نے اس کو روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ابویحییٰ القتات ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ بیہقیؒ نے اس کو روایت کیا ہے اس پر جو جامع صغیر میں ہے۔

اگر وضو اچھی طرح نہ کیا جائے تو نماز میں التباس ہو جاتا ہے

۲۹۵:وَعَنْ شَبِيْبِ بْنِ اَبِيْ رُوْحٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ صَلّٰى صَلَاةَ الصُّبْحِ فَقَرَأَ الرُّوْمَ فَالْتَبَسَ عَلَيْهِ فَلَمَّا صَلّٰى قَالَ مَا بَالُ اَقْوَامٍ يُصَلُّوْنَ مَعَنَا لَايُحْسِنُوْنَ الطُّهُوْرَ وَاِنَّمَا يُلَبِّسُ عَلَيْنَا قُرْآنَ اُولٰئِكَ ۔ (رواه النسائی)

أخرجه النسائی فی السنن ۲/۱۵٦ حدیث رقم ۹٤۷۔ وقال حدیث حسن۔وأخرجه أحمد فی المسند ۵/۳٦۳۔

ترجمہ: ''حضرت شبیب بن ابی روح سے روایت ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھائی اور اس میں سورۃ الروم کی قراءت کی اور آپ ﷺ کو نماز کے درمیان التباس ہو گیا جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور اچھی طرح وضو نہیں کرتے اور اس وجہ سے یہ لوگ ہمارے اور قرآن پڑھنے میں التباس ڈالتے ہیں اس حدیث کو امام نسائی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ایک نسخہ میں ابن کے لفظ کے بغیر ہے جامع الاصول میں لکھا ہے۔ ابوروح شبیب بن نعیم اور ابن ابی روح بھی کہا جاتا ہے۔ اہل حمص میں سے وحاظی ہیں۔ شام کے تابعین میں سے ہیں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ یہ صالح للحدیث ہیں۔ باوجود کہ ان کی مرویات کم ہیں رَوح راء کے فتحہ اور حاء مہملہ کے ساتھ ہے۔

نعیم نون کے ضمہ کے ساتھ ہے، شبیب حبیب کی طرح ہے اور تقریب التہذیب میں ہے کہ شبیب بن ابوروح تیسرے طبقے کے ثقہ رواۃ میں سے ہیں اور جنہوں نے ان کو صحابہ میں سے شمار کیا ہے انہوں نے غلطی کی ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے عجیب کلام کیا کہ انکا ذکر اسماء میں نہیں کیا نہ تابعین میں اور نہ ہی صحابہ میں۔

عن رجل من اصحاب رسول الله ﷺ: اور صحابہ سارے کے سارے عادل ہیں۔ لہٰذا جہالت صحابی روایت میں مضر نہیں اور میرکؒ فرماتے ہیں ان کا نام اغر الغفاری ہے۔

ان رسول الله ﷺ صلی صلٰوة الصبح فقرا : ای فیها۔

الروم : ای سورة الروم تمام سورت یا بعض سورت ایک رکعت میں یا دونوں میں۔

فالتبس : ای القرآن اوالروم۔

یعنی اس کی قراءت۔

علیه فلما صلی ۔ ای فرغ من الصلوٰة۔

قال مابال اقوام ۔ ای ماحال جماعات۔

یصلون معنا لا یحسنون الطهور۔

ضمہ اور فتحہ کے ساتھ لایا تون بواجباتہ وسننہ ۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں ۔ احسان الوضوء کا معنی فصل اول میں گزر چکا ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ سنن و مستحبات واجب کی تکمیل کرنے کیلئے ہیں اور سنن و مستحبات کی برکات کی امید کی جاتی ہے اور ان کے فقدان سے غیبی فتوحات کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور سنن و مستحبات کی برکات غیر کی طرف بھی پہنچتی ہیں ۔ جیسا کہ اس میں کم کرنا یہ غیر کے محروم کرنے کی طرف متعدی ہوتی ہے ۔ اے صاحب نظر یہاں غور کر کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جیسی ھیئت سے متاثر ہو سکتے ہیں ۔ پس غیر یعنی اہل بدعت کی صحبت کیسی مؤثر ہوگی ۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حفاظت کرلے اور ہمیں صالحین کی صحبت نصب فرمائے ۔

وانما یلبس: تشدید کے ساتھ ہے ۔

علینا القرآن :ای یخلطه ویغلطه۔

اولئك:ای الذین لا یحسنون الطهور ۔من المنافقون منافقون۔ منافقوں میں سے یا ان کے علاوہ میں سے یا ان کے علاوہ ۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت سند حسن کے ساتھ ہے ۔

تسبیح، تحمید اور تکبیر کی فضیلت

۲۹۶:وَعَنْ رَجُلٍ مِّنْ بَنِیْ سُلَیْمٍ قَالَ عَدَّ هُنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فِیْ یَدِیْ اَوْفِیْ یَدِهٖ قَالَ التَّسْبِیْحُ نِصْفُ الْمِیْزَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ یَمْلَأُهٗ وَالتَّکْبِیْرُ یَمْلَأُ مَا بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَالصَّوْمُ نِصْفُ الصَّبْرِ وَالطُّهُوْرُ نِصْفُ الْاِیْمَانِ۔ (رواہ الترمذی وقال هذاحدیث حسن)

أخرجه الترمذی ٥/٥٠١ حدیث رقم ٣٥١٩ و قال حدیث حسن واخرجه احمد فی المسند ٥/٣٦٣

ترجمه: ''قبیلہ بنی سلیم کے ایک آدمی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان امور کو جو آگے مذکور ہیں میرے ہاتھ پر یا اپنے ہاتھ پر شمار کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سبحان اللہ ۔ کہنا یعنی اس کا اجر اور ثواب آدھے میزان کو بھر دیتا ہے اور الحمدللہ سبحان اللہ کے ساتھ ملا کر کہنا یا صرف الحمدللہ پورے میزان کو بھر دیتا ہے اور اللہ اکبر کہنا زمین و آسمان کے درمیانی حصہ کو بھر دیتا ہے اور روزہ نصف صبر ہے اور طہارت نصف ایمان ہے اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے ۔''

تشریح: یہ ضمیر مبہم ہے اس کے مابعد اس کے لئے مفسر ہے ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ﴾ [البقرة : ٢٩] ''ٹھیک سات آسمان بنا دیا'' اور مفسر اس کا اس جگہ آپ علیہ السلام کا آنے والا ارشاد التسبیح ...... ہے ۔

رسول الله في يدي : یعنی میرے ہاتھ کی انگلیاں پکڑیں اور ہتھیلی میں ان کو گرہ دے رہے تھے پانچ مرتبہ (مطلب یہ ہے کہ ایک ایک کر کے ہتھیلی میں ملا رہے تھے) ان صفات کو شمار کرنے پر مزید سمجھانے اور استحضار کیلئے۔

او في يده: راوی کی طرف سے شک ہے

قال: ای النبی ﷺ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ضمیر راوی کی طرف لوٹے ضمیر مبہم کی تفسیر کرتے ہوئے۔

التسبيح : ای ثوابه یا نفس تسبیح جسم کے اعتبار سے۔

نصف الميزان والحمد لله تملاه : تملاّ مذکر ومؤنث دونوں صیغوں کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ ای الميزان او نصفه' الاخر یعنی سارا میزان بھرتی ہے الحمدللہ یا جو باقی رہا ہے نصف اخر اس کو بھرتی ہے۔ پہلا معنی اظہر ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، حمد کو تسبیح سے دوگنا بنایا اس لئے کہ حمد وہ صفات کمال یعنی ثبوتی اور سلبی صفات کو جامع ہے اور تسبیح صرف صفات سلبی کو۔

والتكبير يملاء : یملأ مذکر ومؤنث دونوں کے ساتھ ہے۔

مابين السماء والارض : ای جنسها یعنی اس کا ثواب اگر جسمانی صورت میں لایا جائے تو آسمان وزمین کو بھر دے گا اور طیبیؒ فرماتے ہیں تکبیر یہ ہے کہ غیر اللہ سے صفت کبریاء وعظمت کی نفی کرنا ہے۔ اس لئے کہ وزن افعل محمول ہوتا ہے مبالغہ پر اور کبریاء (بڑائی) اللہ کے ساتھ خاص ہے پس عارف (اللہ اکبر کہتے) وقت ہیبت وجلال سے بھر جاتا ہے۔ پس وہ غیر اللہ کی طرف نہیں دیکھتا اور اظہر بات یہ ہے کہ وہ اللہ کی کبریائی کا اطراف ونفوس میں مشاہدہ کرتا ہے۔

والصوم نصف الصبر : اور وہ طاعت پر صبر کرنا ہے۔ معصیت اور مصیبت پر صبر باقی رہ گیا، یا صبر روزے میں حلق اور فرج سے ہوتا ہے تو نصف اخر یعنی دوسرے تمام اعضاء سے صبر کرنا باقی رہ گیا اور ابن حجرؒ نے جو کہا ہے اس مقام میں اس کے لئے کوئی وجہ ظاہر نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کہ روزے کو نصف صبر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ صبر یا تو باطن کے ساتھ ہے، یا ظاہر کے ساتھ ہے اور روزہ یہ باطن کے صبر کو جامع ہے، اس لئے کہ اس میں اکثر شہوات کے ارتکاب سے حفاظت ہوتی ہے۔ پس اسی لیئے روزہ کو نصف صبر کہا۔ (ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ یہ طے شدہ بات ہے کہ صبر احوال باطن ہی سے ہوتا ہے نہ کہ اس کے علاوہ (والطهور نصف الايمان) ''طہارت نصف ایمان ہے'' اور یہ شطر کی تفسیر ہے جو پہلی حدیث میں گزر چکا ہے۔

وضو سے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں

۲۹۷: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ الصُّنَابِحِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا تَوَضَّأَ الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ فَمَضْمَضَ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ فِيْهِ وَاِذَا اسْتَنْثَرَ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ اَنْفِهٖ فَاِذَا غَسَلَ وَجْهَهٗ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ وَجْهِهٖ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ اَشْفَارِ عَيْنَيْهِ فَاِذَا غَسَلَ يَدَيْهِ خَرَجَتِ الْخَطَا يَا مِنْ يَدَيْهِ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ اَظْفَارِ يَدَيْهِ فَاِذَا مَسَحَ بِرَأْسِهٖ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ رَاْسِهٖ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ اُذُنَيْهِ

فَإِذَا غَسَلَ رِجْلَيْهِ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ رِجْلَيْهِ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ اَظْفَارِ رِجْلَيْهِ ثُمَّ كَانَ مَشْيُهُ اِلَى الْمَسْجِدِ وَصَلَاتُهُ نَافِلَةً لَهُ. (رواه مالك والنسائی)

أخرجه مالك فی الموطأ ۱/ ۳۱حدیث رقم ۳۰۔وأخرجه النسائی فی السنن ۱/ ۷۴حدیث رقم ۱۰۳وأخرج ابن ماجة نحوه ۱/ ۱۰۳حدیث رقم ۲۸۲۔وأحمد فی المسند ۴/ ۳۴۹۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ الصنابحی سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب مؤمن بندہ وضو کا ارادہ کرتا ہے اور کلی کرتا ہے تو اس کے منہ سے گناہ خارج ہو جاتے ہیں اور جب استنشاق کرتا ہے۔ تو اس کے ناک سے گناہ خارج ہو جاتے ہیں اور جب اپنا منہ دھوتا ہے تو اس کے منہ سے گناہ خارج ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کی آنکھوں کی پلکوں کے نیچے سے بھی گناہ خارج ہو جاتے ہیں اور جب دونوں ہاتھ دھوتا ہے۔ تو اس کے دونوں ہاتھوں سے بھی گناہ خارج ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ناخنوں کے نیچے سے بھی خارج ہو جاتے ہیں اور جب اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو گناہ اس کے سر سے خارج ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کے دونوں کانوں سے بھی گناہ خارج ہو جاتے ہیں اور جب اپنے دونوں پاؤں کو دھوتا ہے تو اس کے پاؤں سے بھی گناہ خارج ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ پاؤں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ خارج ہو جاتے ہیں پھر مسجد کی طرف اس کا چلنا ہوتا ہے اور اس کی نماز اس کے لئے اس کے اعمال میں زیادتی کا باعث ہوتی ہے اس حدیث کو امام مالکؒ اور امام نسائیؒ نے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

الصنابحی: یہ صنابحی ہیں۔ یہ صنابحی اس لئے مشہور ہوئے کہ صنابح بن زاہر بن عامر کی طرف منسوب ہوئے۔ یہ قبیلہ ''مراد'' کی ایک شاخ ہے۔ ان کا ذکر ان کے نام ''عبداللہ'' کے ماتحت حرف عین میں آئے گا۔ صنابحی میں ص پر پیش ہے اور نون غیر مشدد ہے اور ایک نقطہ والی ب اور حاء مہملہ ہے۔

تشریح: صاد کے ضمہ نون کی تخفیف باء اور حاء کے ساتھ ہے اور یہ منسوب ہے صنابح بن زاہر کی طرف قبیلہ مراد کی ایک شاخ ہے اور ان کا واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی وفات سے پہلے ہجرت کی پس جحفہ ہی پہنچے تھے کہ ان کو حضور علیہ السلام کی وفات کی خبر مل گئی اور معروف بات ان کے نسب کے بارے جو امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور امام مسلم نے کتاب الکنی میں اور ان کے علاوہ دوسرے حضرات نے ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا نسب یوں ہے: **عبدالرحمن بن عسيله ابو عبدالله الضابحی۔ عسيله** :ضمہ عین اور فتحہ سین کے ساتھ اور یاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ جامع الاصول میں اسی طرح ہے۔ مصنف فرماتے ہیں بعض نے ابو عبداللہ کہا ہے۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں میرے نزدیک بے شک صنابحی عبداللہ تابعی ہیں نہ کہ صحابی۔ پھر فرمایا: اور ابو عبداللہ الصنابحی یہ صحابہ میں معروف نہ تھے، اور صنابحی ان سے مؤطا میں امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ نے اور سنن نسائی میں امام نسائی نے روایت کی تخریج کی ہے، مصنف فرماتے ہیں امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ وہ راوی ہیں جنہوں نے ابوبکرؓ سے روایت کی ہے۔ حضور علیہ السلام سے ان کا سماع ثابت نہیں ہے، ان کا نام عبدالرحمٰن بن عسیلہ ہے اور کنیت ابو عبداللہ ہے۔ پس خلاصہ یہ ہے کہ صحیح بات یہی ہے کہ یہ ابو عبداللہ ہیں اور تابعی ہیں۔ پس مؤلفؒ کو چاہیئے تھا کہ یہ کہتے (مرسلا) (یعنی

اس کے مرسل ہونے کو ضرور ذکر کرتے)۔

قال رسول الله ﷺ اذا توضا العبد المؤمن: ای الراد الوضوء۔

فمضض: ای غسل فمه۔

مختصر النہایہ میں لکھا ہے کہ مضمضہ اور مصمصہ ایک ہی ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ مہملہ یعنی مصمصہ زبان کے کنارے سے کلی کرنا اور معجمہ نقطہ کے ساتھ سارے منہ کے ساتھ کلی کرنا مراد ہے اور قاموس میں ہے مضمضہ منہ میں پانی کو حرکت دینا۔ پس نقطہ کا زیادہ ہونا نکتہ کے افادہ کیلئے ہے تو مضمضہ کے ساتھ یہاں تعبیر تطہیر میں مبالغہ کا فائدہ دیتی ہے۔

خرجت الخطايا من فيه: ای بعض الخطایا، یا وہ غلطیاں جو منہ سے متعلق ہوں اور یہی ظاہر بھی ہے اور یہ خطایا مفید ہیں۔ صغائر کے ساتھ **كما مره واذا استنثر۔ ای غسل انفه** اور استنشاق میں مبالغہ کرے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں۔ استنثار کو خاص طور پر لائے اس لئے کہ مقصود غلطیوں کا نکلنا ہے اور وہ استنثار کے معنی کے زیادہ مناسب ہے اس لئے کہ استنثار کہتے ہیں پانی کا ناک کے آخری حصہ سے نکالنا۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں، اور اس بات کو مضمضہ کی تعبیر توڑ دیتی ہے اسلئے کہ مضمضہ میں تو پانی کا نکالنا لازم نہیں اصل سنت کے حاصل ہونے کی وجہ سے اگر چہ وہ پانی کو نگل بھی لے پس اس سے گناہوں کا دور ہونا مستفاد ہوتا ہے۔ اگر چہ پانی نہ نکلے اور اسی طرح استنشاق میں بھی۔ پس استنثار کے ساتھ تعبیر کرنا اس میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ مقصود وہ انتہائی صفائی ہے جو استنشاق سے ہوتی ہے اس لئے کہ وہ اقصی انف سے پانی کا نکالنا ہے جو مزید گندگیوں سے صفائی کو لازم ہے وہ گندگیاں کہ جن کے نکالنے کا احاطہ سوائے اس کے اور کسی چیز سے نہیں ہوسکتا، اور اے مخاطب تو یہ بات بخوبی جانتا ہوگا کہ علامہ طیبیؒ نے جو ذکر کیا یہ اس کے منافی نہیں بلکہ وہی بات ہے بلکہ اس میں تو مقام کے مناسب ایک اور نکتہ بھی ہے اور اس سے اس بات کا رد کرنا لازم نہیں آتا اور باوجود یہ کہ یہ بھی کہا گیا ہے جب غالب لوگوں میں کلی میں منہ سے پانی کا نکالنا ہی ہے تو مضمضہ ہی پر اکتفاء کیا بخلاف استنشاق کے کہ اس کو استنثار کے ساتھ تعبیر کیا۔

خرجت الخطايا: جیسے کہ ان چیزوں کا سونگھنا جو اس کے لئے جائز نہیں۔

من انفه : ای مع الماء۔

واذا : اور ایک نسخہ میں فاء کے ساتھ ہے۔

تخرج من تحت اشفار عينيه : ای اهدابهم ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔ پہلے یہ بات حدیث میں گزری ہے کہ گناہ وہ فقط آنکھوں سے نکلتے ہیں اور یہاں اس روایت میں آنکھوں سے خطایا کے نکلنے کو انتہا قرار دیا جو اس کے خلاف ہے، ہاں اگر یہ جواب دیا جائے کہ اس جگہ بطور فرض کے ہے کہ اگر آدمی منہ، ناک اور آنکھ کے علاوہ باقی چہرے میں سے کسی سے گناہ کرے تو بھی اس کے دھونے سے نکل جائے گی۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں پھر تو مناسب یہ تھا اس وقت کہ یوں کہتے: **من ذقنه** یعنی ٹھوڑی سے بھی، (**فاذا**) اس جگہ اور اس کے علاوہ جو اس کے بعد وہ فاء کے ساتھ ہے نہ کہ اس کے علاوہ۔

غسل یدیه ای الی المرفقین۔

خرجت الخطایا من یدیه حتی تخرج من تحت اظفاره فاذا مسح براسه: براسه سے ظاہری استیعاب ہی ہے۔

خرجت الخطایا من راسه حتی تخرج من اذنیه: اذن ،ذال کے ضمہ اور سکون کے ساتھ ہے۔

اِس میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ہے کہ اذنین سر کا حصہ ہے اور مسح راس کے باقی ماندہ پانی سے کانوں کا مسح کیا جائے گا نہ کہ نئے پانی کے ساتھ، جیسا کہ امام شافعیؒ کا مسلک ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے یہاں پر امام شافعیؒ کے مذہب کے اثبات کیلئے تکلف سے کام لیا ہے جس کے سننے سے کان بھی بوریت محسوس کرتے ہیں۔

فاذا غسل رجلیه : ای الی الکعبین۔

وصلاته: فرض نماز ہو یا نفل نماز۔

نافلة له :ای زائدة یعنی یہ گناہوں کے دور کرنے پر زائد ہے رفع درجات کیلئے۔

امام طیبیؒ نے یہی فرمایا ہے یا یہ اعضاء وضو کے گناہ کو دور کرنے سے زائد ہے۔ پس وہ پھر دوسرے گناہوں کو دور کرنے کیلئے ہوگی۔ اگر اس کے علاوہ گناہ ہوئے ورنہ یہ کبائر میں تخفیف کا سبب بنے گی۔ جیسا کہ امام نوویؒ نے ذکر کیا ہے جو کہ پہلے گزر چکا ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس کی سند حسن ہے۔

حوضِ کوثر پر پہچان اعضائے وضو سے ہوگی

۲۹۸:وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَتَی الْمَقْبَرَةَ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ وَدِدْتُّ اَنَّا قَدْ رَاَیْنَا اِخْوَانَنَا قَالُوْا اَوَلَسْنَا اِخْوَانَكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَنْتُمْ اَصْحَابِیْ وَاِخْوَانُنَا الَّذِیْنَ لَمْ یَأْتُوْا بَعْدُ فَقَالُوْا کَیْفَ تَعْرِفُ مَنْ لَمْ یَأْتِ بَعْدُ مِنْ اُمَّتِكَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ اَرَءَیْتَ اَنَّ رَجُلًا لَهٗ خَیْلٌ غُرٌّ مُّحَجَّلَةٌ بَیْنَ ظَهْرَیْ خَیْلٍ دُهْمٍ بُهْمٍ اَلَا یَعْرِفُ خَیْلَهٗ قَالُوْا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ فَاِنَّهُمْ یَأْتُوْنَ غُرًّا مُّحَجَّلِیْنَ مِنَ الْوُضُوْءِ وَاَنَا فَرَطُهُمْ عَلَی الْحَوْضِ۔

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱ /۲۱۸، حدیث رقم (۳۹ـ۲۴۹) وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۹۳، حدیث رقم ۱۵۰، وأحمد فی المسند ۲/۳۰۰

ترجمہ:حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ جنت البقیع کے قبرستان میں دعاء مغفرت کے لئے تشریف لائے۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر آپ ﷺ نے دعاء فرمائی اے مؤمنین کی جماعت تم پر سلامتی ہو اور فرمایا کہ ہم بھی ان شاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں اور میں اس بات کی تمنا اور آرزو رکھتا ہوں کہ ہم اپنے بھائیوں کو دیکھیں صحابہ کرام نے عرض

کیا اے اللہ کے رسول کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم تو میرے دوست ہو اور میرے بھائی وہ ہیں جو ابھی دنیا میں نہیں آئے صحابہ کرامؓ نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ آپ کی امت میں سے جو لوگ ابھی نہیں آئے ان کو آپ قیامت کے دن کس طرح پہچانیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے یہ بتاؤ کہ اگر کسی انسان کے پاس سفید پیشانی اور سفید ٹانگوں والے گھوڑے ہوں اور وہ نہایت ہی سیاہ رنگ کے گھوڑوں میں ملے ہوئے ہوں۔ تو کیا وہ اپنے گھوڑے کو پہچان لے گا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا ہاں۔ اے اللہ کے رسول ﷺ ان امتیازی اوصاف کی وجہ سے وہ ضرور پہچان لے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اسی طرح مؤمنین قیامت کے دن اس حال میں آئیں گے۔ کہ وضو کی وجہ سے ان کی پیشانی اور ہاتھ پاؤں چمک رہے ہوں گے اور اس علامت سے میں ان کو پہچان لوں گا اور میں حوض کوثر پر ان سے آگے جانے والا ہوں گا اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: مقبرہ باء کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ ہے اور کسرہ قلیل الاستعمال ہے اور ظاہر یہی ہے کہ اس سے جنت البقیع کا قبرستان مراد ہے۔

فقال: السلام عليكم: اس میں اشارہ ہے کہ وہ مدفونین آنے والے کو پہچانتے ہیں اور اس کے کلام وسلام کا ادراک کرتے ہیں۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے زندوں اور مردوں کو سلام کرتے وقت السلام کو علیکم پر مقدم کرنا برابر معلوم ہوتا ہے۔

دار قوم مؤمنين: یہ منصوب ہوگا اختصاص کی بناء پر یا نداء کی وجہ سے اس لئے کہ یہ مضاف ہے اور مراد سے دونوں صورتوں میں جماعت اور اہل ہے اور پہلی ترکیب کی صورت میں منزل بھی مراد ہو سکتی ہے۔ امام طیبیؒ نے یہی کہا ہے اور شاید کہ یہاں پر ان دو مجازوں میں سے ایک ہو جو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ذکر ہے: **واسال القرية**۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے قبرستان والوں کیلئے اور ان کی طرح اوروں کیلئے دعا میں تخصیص کی تعیین کرنا مسلمانوں کے ساتھ لفظاً یا نیتاً ان الفاظ سے جو عمومیت کو مقتضی ہیں اخذ ہو رہا ہے۔ واللہ اعلم

انا ان شاء الله بكم لا حقون: اس استثناء میں علماء کے کئی اقوال ہیں باوجود یہ کہ موت حق ہے اس میں کوئی شک نہیں اور اظہر بات یہ ہے کہ یہ بطور تبرک کے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: **لتدخلن المسجد الحرام ان شاء الله امنين**۔ علامہ خطابی اور ان کے علاوہ دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ بے شک یہ اس آدمی کی عادت ہے جو ان شاء اللہ کے ذریعے کلام کو خوبصورت بناتا ہے اور تیسری بات یہ بھی کی گئی ہے کہ بے شک استثناء مبارک جگہ کے ساتھ ملنے پر لوٹ رہا ہے اس لئے کہ متبرک جگہ میں مدفون ہونا امر غیر یقینی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ [لقمن: ۳۴] ''اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا''۔

وددت دال کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ **اى تمنيت واجبت (انا) اى اناو اصحابى (قد راينا اخواننا)** حضور علیہ السلام نے ان کی ملاقات کی تمنا زندگی میں کی۔ بعض نے کہا ہے کہ موت کے بعد تمنا مراد ہے۔

قالوا اولسنا۔ اى اتقول هذا أولسنا۔

اخوانك يا رسول الله؟ قال: انتم اصحابی :یہ بات صحابہ رضی اللہ عنہم کی اخوت کی نفی نہیں ہے لیکن یہاں پر تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کیلئے اخوت پر صحبت کی خصوصیت کو بیان کیا ہے کہ صحابہ بھائی بھی ہیں اور میرے صحابی بھی اور آنے والے صرف اخوۃ ہی ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ [الحجرات : ۱۰] ”کہ سارے مؤمن بھائی بھائی ہیں“۔

واخواننا الذين لم ياتوا بعد:

ای لم يلحقوا الی الان اولم ياتوا الينا بعض نے کہا ہے کہ شاید ظاہر یہاں یہ ہو کہ مراد ان سے وہ لوگ ہوں جو آپ علیہ السلام کے وصال کے بعد تابعین میں سے آنے والے ہوں لیکن صحابہ کا آنے والا سوال اس بات کو قبول نہیں کرتا کیونکہ وہ تابعین اور غیر تابعین دونوں کو شامل ہے۔پس اگر تو کہے کہ اس تمنا کا مقبرہ والوں کے ذکر کے ساتھ کیا جوڑ ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ میں یہ کہتا ہوں کہ پچھلوں کے تصور سے آنے والوں کا تصور ہے، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے عالم ارواح کو سامنے کر دیا گیا۔پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اور بعد میں آنے والوں کی ارواح کا اکٹھے ہونے کی حالت میں مشاہدہ کیا۔

فقالوا: كيف تعرف من لم يات بعد من امتك يا رسول الله:

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں صحابہ کا **كيف تعرف** سے سوال کرنا اس سے محشر میں معرفت مراد ہے۔کیونکہ یہ اس پر مبنی ہے کہ آپ علیہ السلام نے ان کی دنیا میں تمنا کی ہے اور بے شک تمنا اس کی ہوتی ہے جس کا حصول نہ ہوسکتا ہو تو لہٰذا فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخرت میں کیسے ان کو پہچانیں گے؟ اور بے شک ہم نے اس کو آخرت پر محمول کیا ہے تاکہ حضور علیہ السلام کے آنے والے ارشاد: **غر محجلة** کے مطابق ہو جائے کیونکہ غرہ اور تحجیل وہاں ظاہر ہوں گے۔

فقال :اور ایک نسخہ میں فاء کے بغیر ہے۔

ارايت۔ ای اخبرنی ايها المخاطب۔

لوان رجلا له خيل:ای مثلاً۔

غر محجلة بين ظهری خيل: بعض نے کہا ہے کہ **ظهريه** کلام میں زائد ہے۔نہایہ میں ہے: **اقاموا بين ظهرانيهم ای اقاموا بينهم علی سبيل الاستظهار ولا استناد اليهم۔** مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ سامنے ہونگے اور کچھ پیچھے۔پس آپ علیہ السلام دونوں جانبوں سے گھیرے ہوئے ہونگے پھر اس کا استعمال زیادہ ہوا یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان مطلقاً ٹھہرنے میں اس کا استعمال ہو گیا۔علامہ طیبیؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے میں یہ کہتا ہوں پھر اس کا استعمال مجازاً حیوانات کے درمیان اقامت پر ہو جاتا ہے۔

دهم ۔ ای سود۔

بهم:السود۔ اور بعض نے کہا ہے کہ بھم سے مراد وہ ہے کہ جس کا رنگ کسی دوسرے رنگ سے نہ ملتا ہو اور بھم کو دھم سے سیاہی میں مبالغہ پیدا کرنے کیلئے ملایا ہے۔

الا يعرف خيله :ہمزہ انکار کیلئے ہے۔ **قالوا:** بلٰی کہ وہ پہچان لیتا ہے۔

يا رسول الله قال:فانهم : ای امة الاجابة جميعا۔

یاتون غرا محجلین من الوضوء فتحہ اور ضمہ کے ساتھ ہے۔ ای من رجلہ۔

وانا فرطهم علی الحوض ۔ ای متقدمهم الی حوضی فی المحشر۔ بے شک ہر نبی کیلئے حوض ہوگا۔ یقال فرط یفرط فهو فارط وفرط۔ اذا تقدم۔ یعنی جو قوم سے پہلے آئے تا کہ ان کے لئے پانی تلاش کرے اور ان کے لئے ڈولوں اور رسیوں کو مہیا کرے۔

مؤمنوں کو صحیفہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا

۲۹۹: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوَّلُ مَنْ يُّؤْذَنُ لَهٗ بِالسُّجُوْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاَنَا اَوَّلُ مَنْ يُؤْذَنُ لَهٗ اَنْ يَّرْفَعَ رَأْسَهٗ فَاَنْظُرُ اِلٰى مَا بَيْنَ يَدَىَّ فَاَعْرِفُ اُمَّتِىْ مِنْ بَيْنِ الْاُمَمِ وَمِنْ خَلْفِىْ مِثْلَ ذٰلِكَ وَعَنْ يَمِيْنِىْ مِثْلَ ذٰلِكَ وَعَنْ شِمَالِىْ مِثْلَ ذٰلِكَ فَقَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ تَعْرِفُ اُمَّتَكَ مِنْ بَيْنِ الْاُمَمِ فِيْمَا بَيْنَ نُوْحٍ اِلٰى اُمَّتِكَ قَالَ هُمْ غُرٌّ مُحَجَّلُوْنَ مِنْ اَثَرِ الْوُضُوْءِ لَيْسَ اَحَدٌ كَذٰلِكَ غَيْرُهُمْ وَاَعْرِفُهُمْ اَنَّهُمْ يُؤْتَوْنَ كُتُبَهُمْ بِاَيْمَانِهِمْ وَاَعْرِفُهُمْ تَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ ذُرِّيَّتُهُمْ ۔ (رواہ احمد)

اخرجہ احمد فی المسند ۱۹۹/۵۔

ترجمہ: ''حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ قیامت کے دن جن لوگوں کو سجدہ کرنے کی اجازت دی جائے گی ان میں سے سب سے پہلے مجھے سجدہ کرنے کی اجازت دی جائے گی اور پھر ان لوگوں میں سب سے پہلا شخص میں ہوں گا جس کو سجدہ سے سر اٹھانے کی اجازت دی جائے گی۔ چنانچہ میں اپنے سامنے کی طرف دیکھوں گا اور تمام امتوں کے درمیان اپنی امت کو پہچان لوں گا پھر میں اپنے پیچھے دائیں اور بائیں بھی اسی طرح دیکھوں گا یعنی چاروں طرف بہت زیادہ مخلوق دیکھوں گا اور ان میں اپنی امت کو پہچان لوں گا ایک صحابی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ اپنی امت سے لے کر حضرت نوح علیہ السلام کی امت تک کی تمام امتوں میں آپ ﷺ اپنی امت کو کیسے پہچانیں گے آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے اعضاء وضو روشن ہوں گے۔ یعنی پیشانی' دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں دیگر امتوں کو یہ امتیازی خصوصیت حاصل نہ ہوگی اور میں اپنی امت کو اس طرح پہچان لوں گا کہ میری امت کے لوگوں کو صحیفۃ الاعمال دائیں ہاتھ میں پکڑایا جائے گا اور اس سے بھی پہچان لوں گا کہ ان کی چھوٹی اولاد ان کے آگے دوڑ رہی ہو گی اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: یوذن ہمزہ کے ساتھ ہے اور ہمزہ کو بدلا بھی جاتا ہے۔

بالسجود یوم القیامة: اس لئے کہ حضور ﷺ ہی وہ مبارک ہستی ہیں جن کی روح یا نور کو سب سے پہلے اللہ نے پیدا فرمایا۔

وانا اول من یوذن له ان یرفع راسه: یہ مقام شفاعت کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ پس

میرے لئے مقام شفاعت کی اجازت دی جائے گی۔ پس جب میں اس کو دیکھوں گا تو فوراً سجدہ میں گر جاؤں گا پھر آگے فرمایا کہ اللہ فرمائیں گے مجھ کو سجدہ سے اے محمد (ﷺ) سر اٹھایئے۔

فانظر: فاء وضاحت کیلئے ہے یا عبارت یوں ہے **فارفع راسی فانظر**۔

الی مابین یدی : ای قدامی۔

فاعرف: ای اُمیّز۔ تاکہ میرے ساتھ تعلق والے ممتاز ہوں۔

امتی :ای الذین اجابوا۔

من بین الامم ومن خلفی :ای وانظر من ورائی۔

مثل ذلك: یہ منصوب ہے **:ای فاعرف امتی** اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ یہ مبتدا اور خبر سے مل کر جملہ ہے جو پہلے دو جملوں کے مجموعہ پر معطوف ہے یہ صحیح نسخوں کے خلاف ہے اس بات کو قطع نظر کرتے ہوئے کہ یہ خلاف ظاہر بھی ہے جیسا کہ ہمارے تقدیر سے ظاہر ہوتا ہے۔

وعن یمینی مثل ذلك وعن شمالی مثل ذلك: یعنی تمام اطراف سے اور اس میں اشارہ ہے لوگوں کی کثرت اور فرق مراتب کی طرف۔

فقال رجل یا رسول الله کیف تعرف امتك من بین الامم ۔ ای سائرهم۔

فیما بین نوح: یہ امم کا بیان ہے اور اس سے حال ہے **أی الامم کائنة فیما بین نوح** اور اگر کہا جائے کہ یہ **تعرف** کیلئے ظرف ہے تو معنی یہ ہو کہ **کیف تعرف امتك فیما بین نوح**۔ اس وقت امم کا کوئی معنی نہ ہوگا اور باقی جو حضرت نوح علیہ السلام کو خاص کیا گیا ہے باوجود یکہ حضرت آدم علیہ السلام وشیث اور ادریس ان سے پہلے مبعوث کئے گئے تھے۔ تو یہ اختصاص نوح علیہ السلام کی شہرت کی وجہ سے ہے یا ان کی امت کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ہے اور لفظ **الی** حضور ﷺ کے اس قول (**الی امتك**) میں انتہا کیلئے ہے **:ای مبتدئا من نوح منتهیا الی امتك**۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ قیاس تو یہاں یہ تھا کہ عبارت یوں ہوتی **:وامتك** کیونکہ بین کے مابعد واؤ کے ساتھ عطف متعین ہوتا ہے پس نوح کے بعد محذوف مقدر مانا جائے گا اور الی سے پہلے کیونکہ بین اور الیٰ دونوں میں سے ہر ایک اس محذوف پر دلالت کرتے ہیں۔ تقدیر عبارت یوں ہے۔ **:فیما بین نوح وغیره مبتدئا ذلك من امته او زمنه الی امتك او زمنهم**۔

قال هم غر محجلون من اثر الوضوء لیس احد کذلك۔ اور ایک نسخہ میں **لذالك** ہے۔

غیرهم: یہ مرفوع ہوگا بدل ہونے کی وجہ سے اور منصوب ہوگا استثناء کی بناء پر پہلا راجح ہے اور یہ حدیث اس میں واضح ہے کہ غرہ اور تحجیل (چہرے اور اعضاء وضو کی چمک) یہ اس امت کی خصوصیات میں سے ہے۔

واعرفهم انهم یوتون کتبهم بایمانهم: اور شاید کہ یہ دنیا کسی خاص وقت میں ہو امم سابقہ کو نامہ اعمال دینے سے پہلے یا ان کے اعمال ناموں میں ایک نور زائد ہو اُن کے مقابلے میں۔ پھر اس جگہ میں نے ابن حجرؒ کو دیکھا کہ انہوں نے فرمایا ہے

کہ ظاہر حدیث اس بات کی طرف مشیر ہے کہ یہ ان کی خصوصیات میں سے ہے مگر یہ کہ اس کو محمول کیا جائے اس بات پر کہ ان کو نامۂ اعمال دوسروں سے پہلے دیئے جائیں گے یا ایسی صفت کے ساتھ دیئے جائیں گے جو اور کسی کیلئے نہ ہوگی اس لئے کہ آیات اور باقی احادیث عمومیت پر دلالت کرتی ہیں اور اس پر کہ فاسق کو نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔اس پر بھی نصوص دلالت کرتی ہیں اور باقی وہ آیت کہ جس میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جس کو نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے گا وہ جہنم میں داخل نہ ہوگا یہ محمول ہے اس پر کہ وہ اس میں کافر کی طرح داخل نہ ہوگا جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے: ﴿لَا یَصْلٰھَآ اِلَّا الْاَشْقٰی ......﴾[اللیل:۱۵] ''اس میں وہی داخل ہوگا جو بڑا بدبخت ہے۔''

ابن عطیہ نے ایک جماعت سے یہ بات نقل کی ہے کہ جس فاسق کو عذاب دینا طے ہو ہو اس کو آگ میں داخل ہونے سے پہلے اولاً دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال دیا جائے پھر اپنے قول کے خلاف یوں کہا کہ اس کو دائیں ہاتھ نامۂ اعمال جہنم سے نکلنے کے بعد دیا جائے اور اس بات کو رد کیا کہ ظاہر وہ پہلا قول ہی ہے۔

نقاش نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت نقل کی ہے جو پہلی بات کو ثابت کرتی ہے۔لیکن ابن حجرؒ کی بات کہ: **دلت علیہ الایات** کہ قرآنی آیات اور احادیث اس پر دال ہیں یہ بات غیر ظاہر ہے اس لئے کہ آیات قرآنیہ وہ فاسق کو نامۂ اعمال دینے کے حال سے خاموش ہیں کہ دائیں میں دیا جائے گا یا بائیں میں،اور اسی طرح ترازو میں بھاری ہوگا یا ہلکا اور شاید کہ یہ عدم بیان اُمید اور خوف کے درمیان اس کو لانے کیلئے ہو۔واللہ سبحانہ۔

و اعرفھم یسعی: مذکر و مؤنث دونوں صیغوں کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

بین ایدیھم ذریتھم: یہ اختصاص کا بھی احتمال رکھ سکتا ہے یا یہ کسی خاص وجہ وطریقہ سے ہو اور علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ان دو وصفوں کو یہاں پہلے کی طرح تمیز یا جدائی کیلئے نہیں لایا گیا بلکہ ان دونوں کو حضور علیہ السلام نے بطور مدح کے ذکر فرمایا اپنی اُمت کیلئے اور اعزاز و اکرام جس سے ان کو نوازا گیا اس پر خوش ہوتے ہوئے۔ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے ۔

بَابُ مَا یُوْجِبُ الْوُضُوْءَ

جن چیزوں سے وضو واجب ہوتا ہے اُن کا بیان

الفصل الاول:

وضو کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی

۳۰۰:عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تُقْبَلُ صَلَاةُ مَنْ اَحْدَثَ حَتّٰی یَتَوَضَّأَ . (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱/۲۳٤ حدیث رقم ۱۳۵۔ ومسلم ۱/۲۰٤ حدیث رقم (۲۔۲۲۵) وأخرجه أبو داود ۱/٤۹ حدیث رقم ٦۰ وأخرجه الترمذی فی السنن ۱/۱۱۰ حدیث رقم ۷٦ وأخرجه أحمد فی المسند ۲/۳۰۳۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا وضو کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ وضو کر لے۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: ای قبول اجابة و اثابة ۔کہ قبولیت سے یہاں اجابت اور ثواب دینا مراد ہے بخلاف ٹخنوں کو ڈھانپنے والے اور بھگوڑے غلام کی نماز کہ وہ بھی قبول نہیں ہوتی لیکن عدم قبولیت سے مراد ثواب نہ ملنا ہے ہاں اجابت یعنی فرض ساقط ہو جائے گا لہٰذا یہ اعتراض وارد نہیں ہوسکتا کہ عدم قبول سے اس حدیث میں عدم جواز وصحت لازم نہیں آتا، حالانکہ طہارت یہ جواز کی شرط ہے۔

صلوٰة من احدث : ای صار ذا حدث قبل الصلوٰة او؟ فی اثنائها اور مراد نماز سے جس کو مضاف کیا گیا ہے اس کی صورت ہے یا وہ اپنی سابقہ حالت کے اعتبار سے ہے

حتی یتوضا : ای حقیقة او حکما۔کہ حقیقتاً وہ وضو کرے یا حکماً یہاں یتوضا یہ یتطهر کے معنی میں ہے پس اس صورت میں یہ غسل وضو اور تیمّم کو شامل ہو جائے گا۔مظہر فرماتے ہیں معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نماز کو وضوء کے بغیر قبول نہیں کرتے مگر یہ کہ جب وہ پانی کو نہ پائے پس وضوء کے قائم مقام تیمّم ہوگا پس اگر مٹی بھی نہ پائے تو وقتی فرض کو وقت کی تعظیم کی وجہ سے اداء کرے گا پھر اگر پانی اور مٹی کے حاصل ہونے سے پہلے مر گیا تو گنہگار نہ ہوگا اور اگر اپنی زندگی میں اس کو پالیا تو نماز قضاء کرے گا اور یہ تفصیل امام شافعیؒ کے ہاں ہے۔

ہمارے نزدیک وقت کی حرمت کی وجہ سے نماز نہیں پڑھے گا برابر بات ہے کہ وقت تنگ ہو یا مٹی نہ ہو اور یہی حدیث کا ظاہر ہے اور جو یہ کہا گیا ہے کہ یہ نماز پڑھنا اس طرح ضرورت کی وجہ سے ہے اور حضور ﷺ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے: و اذ امرتکم بامر فاتوا منه ما استطعتم ''کہ جب میں تمہیں کسی بات کے متعلق حکم کروں تو اس کو پورا کرو جتنی تم میں طاقت ہو ''۔یہ بات اس حدیث کے اس مضمون کہ :لا تقبل صلوٰته سے رد کی گئی ہے اور اس سے بھی کہ بلا وضو نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے۔پس یہ داخل ہوگا آپ علیہ السلام کے اس ارشاد کے تحت: واذا نهيتم عن امر فاجتنبوه:''کہ جب میں تم کو کسی کام سے روکوں تو ترک جایا کرو''، یہ مطلقاً ہے۔

شرح منیہ میں ہے کہ وہ قیدی جو طہارت کیلئے کوئی چیز نہ پائے وہ طرفین کے نزدیک نماز نہ پڑھے گا اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وہ اشارہ کے ساتھ نماز پڑھے گا۔پھر بعد میں لوٹائے گا اور یہی روایت ہے امام محمدؒ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ مصلین کے ساتھ تشبیہ کرتے ہوئے نماز پڑھے گا۔تاکہ وقت کا حق ادا ہو جائے جیسا کہ روزہ کے اندر ہوتا ہے اور طرفین کی دلیل یہ ہے کہ یہ آدمی اداء کا اہل نہیں ہے ناپاکی کی وجہ سے تو اس کے لئے مشابہت لازم نہیں ہوگی جیسا کہ حائضہ اور اس مسئلہ سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ بے شک نماز بغیر طہارت کے جان بوجھ کر پڑھنا کفر نہیں ہے اس لئے کہ اگر یہ کفر ہوتا تو امام ابو یوسفؒ اس کا حکم نہ دیتے۔بعض نے کہا ہے کہ کفر ہے جیسا کہ غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھنا یا ناپاک کپڑے میں نماز پڑھنا جان بوجھ کر اس لئے کہ یہ امر صلوٰۃ کو ہلکا سمجھنے والا ہے اور سب سے صحیح بات یہ ہے کہ اگر غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھی یا ناپاک کپڑوں میں، تو کافر نہ ہوگا اس لئے کہ اس طرح اداء کرنا کسی حالت میں جائز ہوتا ہے اور اگر نماز پڑھی بغیر طہارت کے جان بوجھ کر تو کافر ہو جائے گا اس لئے

کہ یہ ہر حال میں حرام ہے، گویا کہ یہ شریعت کو ہلکا جان رہا ہے۔
اور ظاہر یہ ہے کہ اگر اداء کرتے وقت کی تعظیم ملحوظ خاطر ہو تو کافر نہ ہوگا اس لئے کہ مسئلہ اجتہادی ہے اور اس لئے بھی کہ اس پر ہلکا سمجھنے کا حکم صادق نہیں آتا بخلاف جبکہ نماز بغیر طہارت کے جان بوجھ کر پڑھے اس ارادہ کے بغیر تو پھر کافر ہوگا اس لئے کہ اس وقت یہ شریعت کو ہلکا سمجھنے والا بن جائیگا اور اگر بغیر طہارت کے نماز پڑھی شرم کی وجہ سے یا ریاء کی وجہ سے یا سستی کی وجہ سے تو آیا یہ شریعت کو ہلکا سمجھنے والا ہوگا یا نہیں تو اس میں بحث ہے اور قوی بات یہ ہے کہ شرم وحیا کی وجہ سے پڑھنے والا مستخف (ہلکا جاننے والا) نہیں بنے گا، بخلاف دوسرے دونوں مسائل میں (کہ اس میں مستخف بن جائے گا) واللہ اعلم اور ابن حجرؒ نے عجیب بات کی ہے کہ یتوضاء کی ضمیر کا محدث کی طرف لوٹنا یہ اس کی اس سابقہ حالت کے اعتبار سے ہے اور شاید کے اس وقت تقدیر کلام یوں ہو :هو فاذا توضا وصلى قبلت صلوته اى صلوة المحدث باعتبار ما كان اور یہ تکلف ہے اس کی ضرورت نہیں ہے اور پھر یہاں پر حتی یا تو غائیہ ہے یا تعلیلیہ ہے یا استثنائیہ ہے۔

بغیر وضو کے نماز قبول نہیں ہوتی

۳۰۱: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طُهُوْرٍ وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُوْلٍ. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فى الصحيح ۱/۲۰٤حديث رقم (۱-۲۲٤)وأخرجه الترمذى فى السنن ۱/٥ حديث رقم ۱۔ وابن ماجة فى السنن ۱/۱۰۰ حديث رقم ۲۷۲۔ وأحمد فى المسند ۲/۳۹ وأخرجه أبو داود عن أبى المليح عن أبيه فى السنن ۱/٤۸ حديث رقم ٥۹ وكذلك النسائى ۱/۸۷ حديث رقم ۱۳۹۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا نماز وضو کے بغیر قبول نہیں کی جاتی اور حرام مال سے صدقہ قبول نہیں کیا جاتا۔ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: طهور ضمہ کے ساتھ پاکی کے معنی میں ہے اور فتحہ کے ساتھ وہ پانی کہ جس سے پاکی حاصل کی جاتی ہے، دونوں نسخے ہیں ان کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ لا تقبل' لا تصح کے معنی میں ہے اس لئے کہ قبول کی نفی یا تو صحت کی نفی کے معنی میں ہے جیسا کہ اس جگہ اور یا یہ ثواب کی نفی کے معنی میں ہوتا ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے: من اتى عرافا اى منجما لم تقبل صلوته اربعين صباحًا۔ ''کہ جو نجومی کے پاس جائے تو اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہیں ہوں گی''۔

ولا صدقة یعنی وہ چیز جو نفس کو بخل کی برائی سے اور شفقت کی کمی سے پاک کرنے والی ہو۔

من غلول: غُلول ضمہ کے ساتھ ہے جیسا کہ صحیح نسخوں میں ہے یعنی مال حرام اور غلول کی اصل وہ غنیمت میں خیانت کرنا ہے، اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ جس نے مال حرام کے ساتھ صدقہ کیا ثواب کی اُمید رکھتے ہوئے تو وہ کافر ہوگیا، اور ابن حجر رحمہ اللہ کو وہم ہوگیا ہے یا انہوں نے یہاں روایت کو غین کے فتحہ کے ساتھ مانا ہے اى كثير الغل یعنی غنیمت میں بہت زیادہ

خیانت کرنے والا اور اس میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مبالغہ یہاں مراد نہیں ہے اسی وجہ سے ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ اس جگہ مراد یہ ہے کہ جس نے خیانت کئے ہوئے مال سے یعنی حرام مال سے صدقہ کیا تو اس صدقہ کرنے پر اس کو ثواب نہیں ہوگا، بلکہ اس پر پکڑ ہوگی اگر اس کو اس کے حرام ہونے کا علم ہوا اور اس کا ثواب مالک کو ہوگا اور اس بات کا محل یہ ہے کہ جب وہ اس کے مالک یا وارث کو پہچانتا ہو ورنہ تو وہ بہر صورت صدقہ کرنے کا مامور ہے۔ یہاں یہ تصور نہیں ہوسکتا کہ اس کو صدقہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور اس سے اس کو قبول نہ کی جائے گا۔

مذی کے بارے میں حکم

۳۰۲: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كُنْتُ رَجُلاً مَذَّآءً فَكُنْتُ اَسْتَحْيِيْ اَنْ اَسْأَلَ النَّبِيَّ ﷺ لِمَكَانِ ابْنَتِهٖ فَاَمَرْتُ الْمِقْدَادَ فَسَأَلَهٗ فَقَالَ يَغْسِلُ ذَكَرَهٗ وَيَتَوَضَّأُ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ١/ ٢٣٠ حدیث رقم ١٣٢۔ وأخرجه مسلم فی صحیحه ١/ ٢٤٧ حدیث رقم (١٧۔٣٠٣) وأخرجه أحمد فی المسند ١/ ٨٠ ومعناه فی کتب السنن من عدة طرق وعدة ألفاظ۔

ترجمہ: ''حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے مذی بہت زیادہ آتی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ میرے نکاح میں تھی اس لئے شرم کی وجہ سے میں براہ راست آپ سے معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ کہ آیا اس سے غسل واجب ہے یا وضو اس لئے میں نے حضرت مقدادؓ کو آنحضرتؐ سے اس مسئلہ کو دریافت کرنے کے لیے کہا۔ انہوں نے آپ ﷺ سے اس کے بارے میں مسئلہ دریافت کیا۔ آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ شرم گاہ کو دھولیا جائے اور وضو کرلیا جائے۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: یہ مذاء مشدد ہے اور مذا سے مراد وہ آدمی ہے جس کو مذی زیادہ آتی ہو اور یہ امذی سے مشتق ہے اور یہ منی سے پتلی ہوتی ہے بلیہ کے ساتھ بوس و کنار وقت یاد یکھنے کے وقت یہ نکلتی ہے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ یہ وہ زرد رنگ کا پتلا سا پانی ہے جو کمزور شہوت کے وقت نکلتا ہے اور مَر مذی کے حکم میں ودی بھی ہے اور ودی وہ سفید قسم کا گاڑھا پانی ہے جو پیشاب کرنے بعد یا بوجھل چیز اٹھانے کے وقت نکلتا ہے۔

فکنت استحیی ان اسال النبی ﷺ: یعنی مذی کے حکم کے بارے میں کہا کہ وہ ناپاک ہے موجب غسل ہے یا نہیں؟

لمکان ابنته: ای فاطمه رضی الله عنها، اس لئے کہ وہ آپؐ کی بیوی تھیں اور مذی کا اکثر نکلنا بیوی سے بوس و کنار کے وقت ہوتا ہے اور سوال میں اس کی کثرت کو ذکر کرنا یہ آپ علیہ السلام کی بیٹی کے ان بعض احوال کی طرف اشارہ ہوتا تھا جس کے اظہار کو آپ علیہ السلام پسند نہ فرماتے، اس لئے کہ یہ ایسی بات ہے کہ سمجھدار لوگ اس کو ظاہر نہیں کرتے خصوصاً بڑے اکابر کی موجودگی میں اور حضرت علیؓ نے یہاں پر حیاء کی علت اس بات کو بنایا ہے تا کہ یہ اعتراض ان پر نہ ہو کہ علم سیکھنے میں اور سوال کرنے میں شرم وحیاء کرنا قابل مذمت ہے

فامرت المقداد : ای التمست منه ان یسال عن ذلك۔

فسالہ : ای مبھما۔اس طرح کہا ہوگا کہ کسی آدمی کے ذکر سے مذی نکلے تو اس کا کیا حکم ہے؟

فقال ﷺ یغسل ذکر :اس کی نجاست کی وجہ سے اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں: **ای ما مسہ منہ لا غیر** یعنی اتنی جگہ کو دھوئے گا جہاں مذی لگی ہے نہ کہ اس کے علاوہ پیشاب پر قیاس کرتے ہوئے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس کا دھونا متعین ہے اور صرف پتھر پر اکتفا کر جائز نہیں ہے اس کے نادر ہونے کی وجہ سے اور یہی حدیث کا ظاہر ہے اور امام شافعیؒ کے اقوال میں سے ایک قول ہے اور امام طحاویؒ فرماتے ہیں حضور ﷺ نے اس لئے حکم دیا ذکر کو دھونے کا تا کہ رگیں سکڑ جائیں اور مذی کا آنا ختم ہو جائے اس لئے کہ آدمی کو پیشاب سے عضو مخصوص کو دھونے کا حکم نہیں ہے تو مذی کے لائق بھی یہی حکم ہونا چاہیئے کہ اس کی وجہ سے بھی عضو مخصوص کو نہ دھویا جائے اور امام حمدؒ نے فرمایا ہے سارے ذکر کا دھونا ضروری ہے اور بعض نے کہا کہ خصیتین کا بھی دھونا بھی روایت کی وجہ سے ضروری ہے اسی طرح ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے

ویتوضا:بعض نے کہا ہے کہ یہاں یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ صحابہ کرام مذی سے ایسے نہیں پرہیز کرتے تھے جیسا کہ پیشاب سے بچتے تھے۔شاید کہ ان کے ہاں اس میں اس کے مقابلہ میں تخفیف ہو اور یہ بات سودمند نہیں ہے کیونکہ اس کے اندر حدیث کے ظاہری مقتضی سے ہٹنا لازم آتا ہے کہ جس کے اندر سارے ذکر کو دھونے کا وجوب ہے اگر چہ اس میں سے اس کو کچھ بھی نہ لگا ہو،اور یہی امام احمدؒ نے فرمایا ہے۔

آگ پر پکی ہوئی چیز سے وضو کا مسئلہ

۳۰۳:وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ تَوَضَّؤُا مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ (رواه مسلم) قَالَ الشَّيْخُ الْاِمَامُ الْاَجَلُّ مُحِيُّ السُّنَّةِ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى هٰذَا مَنْسُوْخٌ بِحَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ۔ (متفق عليه)

أخرجه مسلم فى صحيحه ١/٢٧٢حديث رقم١/٢٧٢حديث رقم(٣٥٢)۔ وأخرج الترمذى نحوه ١/١١٤حديث رقم ٧٩ وأخرجه النسائى فى السنن ١/١٠٦حديث رقم ١٧٥وأخرجه أحمد فى المسند ٢/٢٦٥۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا آگ پر لگی ہوئی چیز کو کھانے کے بعد وضو کرو۔اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے حضرت امام محیؒ السنۃ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم حضرت ابن عباسؓ کی حدیث سے منسوخ ہے۔''(بخاری ومسلم)

تشریح:اس سے مراد وہ چیز ہے جس میں آگ کا اثر ہو جیسا کہ گوشت اور شیرا وغیرہ جو آگ پر پکائی جاتی ہیں۔

رحمہ اللّٰہ تعالٰی:اور ایک نسخہ میں ''**رحمۃ اللہ**'' ہے۔

ھذا منسوخ:یعنی اس کو وضو شرعی واجب پر محمول کرنا جیسا کہ ظاہراً یہی معلوم ہوتا ہے۔

بکری کی دستی کھا کر بغیر وضو نماز پڑھنے کا بیان

۳۰۴: قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَكَلَ كَتِفَ شَاةٍ ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ۔ (متفق علیه)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۲۷۲حدیث رقم۱/۲۷۲حدیث رقم(۳۵۲)۔ وأخرج الترمذی نحوه ۱/۱۱٤حدیث رقم ۷۹وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۱۰٦حدیث رقم ۱۷۵وأخرجه أحمد فی المسند ۲/۲٦۵۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے بکری کی دستی کھائی پھر نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: بعض علماء فرماتے ہیں کہ بہتر بات یہاں یہ ہے کہ پہلی حدیث میں وضو کو لغوی معنی پر محمول کیا جائے یا وضو شرعی مراد ہے اور اس صورت میں امر استحباب کیلئے ہوگا۔

قاضیؒ فرماتے ہیں کہ اصل لغت میں وضو کہتے ہیں بعض اعضاء کے دھونے کو اور ان کو صاف کرنے کو یہ وضاءۃ سے ہے جس کا معنی نظافت یعنی صفائی ستھرائی ہے اور شریعت نے اس کو فعل مخصوص کی طرف نقل کیا ہے اور یہاں وضو سے ہی لغوی معنی مراد ہے اس سے اور اس طرح کی دوسری احادیث سے ہاتھوں کا دھونا ہی مراد ہے تا کہ بو وغیرہ زائل ہو جائے ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی احادیث میں تطبیق کرتے ہوئے اور جن حضرات نے اس کو وضو شرعی پر محمول کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ یہ حدیث ابن عباسؓ سے منسوخ ہے یہ بات اس وقت ثابت ہوگی جب کہ دونوں حدیثوں کی تاریخ کا علم ہو اور اوّل کے مقدم ہونے کا یہاں یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ ابن عباسؓ کی صحبت تو متاخر ہے لہٰذا یہ ناسخ بن جائے گی۔ اس لئے کہ تاخر صحبت یہ تاخر روایت پر دلالت نہیں کرتا مگر یہ کہ متاخر کی صحبت وہ پہلے کی وفات کے بعد ہو یا اس کے غائب ہونے کے بعد ہو بخلاف اس کے کہ جب وہ دونوں جمع ہوں۔

بعض نے کہا ہے کہ ابن الصلاح نے اپنی کتاب میں نسخ کی تصریح کی ہے، انہوں نے فرمایا ہے اور وہ حدیث کہ جس میں نسخ ہے وہ صحابی کا یہ قول ہے: کان اخر الامرین من رسول اللہ ﷺ ترک الوضوء مما مست النار۔ کہ حضور علیہ السلام کا آخری عمل وہ وضو ترک کرنے میں ہے مامسّتُ النّار کے کھانے کے بعد۔ علامہ طیبیؒ نے یہی ذکر کیا ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں شارع علیہ السلام کے کلام کو ہاتھوں کے دھونے پر محمول کرنا یہ بعید ہے اور بے شک اس کو شرعی مفہومات و مدلولات پر محمول کیا جائے گا۔ اس لئے کہ حضور ﷺ شرعیات کے بیان کیلئے مبعوث کئے گئے تھے اور اس میں اصل یہ ہے کہ نسخ کا حکم قول جابرؓ سے نکلتا ہے اور وہ یہ قول ہے: کان اخر الامرین من رسول اللہ ﷺ ترک الوضو مما مست النار۔

اُونٹوں کے باڑہ میں نماز نہ پڑھو

۳۰۵: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ اَنَّ رَجُلاً سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَنَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُوْمِ الْغَنَمِ قَالَ اِنْ شِئْتَ فَتَوَضَّأْ وَاِنْ شِئْتَ فَلَا تَتَوَضَّأْ قَالَ اَنَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُوْمِ الْاِبِلِ قَالَ نَعَمْ فَتَوَضَّأْ مِنْ لُحُوْمِ الْاِبِلِ

قَالَ اُصَلِّیْ فِیْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ قَالَ نَعَمْ قَالَ اُصَلِّیْ فِیْ مَبَارِكِ الْاِبِلِ قَالَ لَا۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ٢٧٥١ حديث رقم(٩٧۔ ٣٦٠)وأخرجه أحمد فی المسند ٨٦/٥۔

ترجمه:حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا۔کیا ہم لوگ بکری کا گوشت کھانے کے بعد وضو کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہیں اختیار ہے اگر تمہارا جی چاہے تو کرلو۔ اگر نہ چاہے تو نہ کرو۔ پھر اس نے عرض کیا۔ کیا ہم اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرو۔ پھر اس شخص نے آپ سے سوال کیا، کیا میں بکریوں کے باڑہ میں نماز پڑھ سکتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا ہاں پڑھ لیا کرو۔ پھر اس شخص نے سوال کیا، کیا میں اونٹوں کے باڑہ میں نماز پڑھ سکتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا نہیں پڑھ سکتے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

جابر بن سمرة: ان کی کنیت ''ابوعبداللہ عامری'' ہے۔ یہ ''سعد بن ابی وقاص'' کے بھانجے ہیں کوفہ میں تشریف لائے اور وہاں ہی ۷۴ھ میں وفات پائی۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔

تشریح:**ان رجلا سال رسول الله ﷺ انتوضأ**: جمع متکلم کے ساتھ اور ایک نسخہ میں یاء مجہول کے ساتھ ہے اور ایک صحیح نسخہ میں اتوضا ہے۔ واحد متکلم کے صیغہ کے ساتھ استفہام کے ساتھ یا بغیر استفہام کے کازرونیؒ فرماتے ہیں کہ مصابیح کے بعض نسخوں میں ایتوضا ہے اور بعض میں انتوضا ہے اور یہ تمام کے تمام اس روایت کو نہیں لانے والے جو کہ یہاں کے مطابق ہو۔ یہاں روایت ااتوضأ ہے دو ہمزوں کے ساتھ لیکن ایک کو بعض روایات میں حذف کیا گیا ہے۔

من لحوم الغنم:ای من اکلها۔

وقال ان شئت فتوضا وان شئت فلا تتوضا: اور ایک نسخہ میں ایک تاء کے حذف کے ساتھ فلا توضأ ہے۔

قال انتوضا من لحوم الابل! قال نعم فتوضا من لحوم الابل! اور اس میں اونٹ کے گوشت کھانے کے بعد وضو کرنے کی تاکید ہے اور یہ امام احمد حنبلؒ کے نزدیک واجب ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں اور یہ مذہب دلیل کے اعتبار سے قوی ہے اور دوسرے حضرات کے نزدیک اس سے مراد ہاتھ منہ کا دھونا ہے اس لئے کہ اونٹ کے گوشت میں ناپسندیدہ بو اور بہت زیادہ چکناہٹ ہوتی ہے، بخلاف بکری کے گوشت کے یا یہ بھی حضرت جابرؓ کی حدیث سے منسوخ ہے۔

قال !ای الرجل (اصلی) حرف استفہام محذوف ہے اور ایک نسخہ میں موجود ہے۔

مرابض: یہ مربض کی جمع ہے میم کے فتحہ اور یاء کے کسرہ کے ساتھ اور یہ بکریوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے اور یہ بکریوں کے لئے ایسے ہی ہے جیسا کہ انسان کیلئے لیٹنا و آرام کرنا اور بروک یہ اونٹ کے بیٹھنے کیلئے مستعمل ہوتا ہے اور جثوم (سینہ کو زمین پر رکھنا) پرندوں کیلئے (یہاں پر تین الفاظ ہوئے: بروك ، ربوض ، جثوم ۔ پہلا اونٹ کے بیٹھنے کی جگہ۔ دوسرا بکریوں کے ٹھہرنے کی جگہ جسے باڑہ بھی کہتے ہیں اور تیسرا پرندوں کے سینے کو زمین پر رکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے)

قال نعم: یعنی بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنے میں کوئی کراہت نہیں ہے، اس لئے کہ ان میں بدکنا اور بھاگنا کہ جس

سے نماز پڑھنے والے پر خشوع اور توجہ خراب ہو جائے وہ نہیں ہوتا۔

قال اصلی فی مبارك الابل ؟ مَبرَكٌ کی جمع ہے میم کے فتحہ کے ساتھ۔

(**قال۔ لا**)اونٹوں کے باندھنے کی جگہ میں نماز پڑھنے کو اس لئے ناپسند فرمایا کہ ان میں بدکنے اور بھاگنے سے امن نہیں ہوتا۔ پس نمازی کو ان کے ٹکرانے کی وجہ سے یا اور کسی طریقے سے نقصان ہوگا۔ پس پھر توجہ نماز میں باقی نہ رہے گی۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ گائے بکریوں کی طرح ہے، لیکن یہ بات محلِ کلام ہے اور ان دونوں جگہوں میں فرق اس بنیاد پر ہے کہ مرابض اور مبارک ناپاکی سے خالی ہوں ورنہ مرابض میں بھی نماز مکروہ ہے، لیکن یہ کراہت نجاست کی وجہ سے ہوگی۔

ابن ماجہؒ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ہی روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے: **توضوا من لحوم الابل ولا تتوضوا من لحوم الغنم وتوضوا من البان الابل ولا تتوضوا من البان الغنم وصلوا فی مراح الغنم ولا تصلوا فی معاطن الابل۔** "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا اونٹ کے گوشت کی وجہ سے وضو کرو اور بکرے کے گوشت کی وجہ سے وضو نہ کرو اور اونٹنی کا دودھ پی کر وضو کرو اور بکری کا دودھ پی کر وضو نہ کرو اور بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھو اور اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ نماز مت پڑھو۔"

جب ہوا کے خروج کا یقین ہو تو وضو ٹوٹ جاتا ہے ورنہ نہیں

۳۰۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا وَجَدَ اَحَدُكُمْ فِیْ بَطْنِهٖ شَیْئًا فَاَشْكَلَ عَلَیْهِ اَخَرَجَ مِنْهُ شَیْءٌ اَمْ لَا فَلَا یَخْرُجَنَّ مِنَ الْمَسْجِدِ حَتّٰی یَسْمَعَ صَوْتًا اَوْ یَجِدَ رِیْحًا۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ١/٢٧٦ حدیث رقم(٩٩۔٣٦٢)۔ وأبوداود ١/١٢٣ حدیث رقم ١٧٧۔ وأحمد فی المسند ٢/٤١٤۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم سے کوئی آدمی اپنے پیٹ کے اندر کچھ محسوس کرے اور اس کو اشتباہ ہو جائے کہ کوئی چیز خارج ہوئی ہے یا نہ۔ تو اس وقت تک وضو کے لئے مسجد سے باہر نہ نکلے جب تک کہ آواز کو نہ سنے یا بو نہ پائے۔ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: جیسا کہ قرقراہٹ یعنی ہوا پیٹ میں گھومے (قرقرہ اصل میں کبوتر کی آواز کو کہتے ہیں جو کہ ہوا کے پیٹ میں گھومنے کی طرح ہوتی ہے)۔

فاشكل: ای التبس۔

علیه اخرج: ہمزہ استفہام کا ہے۔

منه شیء ام لا فلا یخرجن من المسجد: ای للتوضو: اس لئے کہ یقینی بات کو شک باطل نہیں کرتا۔ بعض نے کہا ہے اس مِنَ الْمَسجد سے یہ شک پڑتا ہے کہ غیر مسجد کا حکم مسجد کے خلاف ہے (حالانکہ ایسا نہیں) لیکن یہاں پر اصل میں اس بات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ نماز کی ادائیگی کی حقیقی جگہ وہ مسجد ہی ہے۔ پس مؤمن پر مسجد میں جماعت میں حاضری لازم ہے۔

حتی یسمع صوتا :ای صوت ریح یخرج منه۔

او یجد ریحا :ای بحمد رائحة ریح خرجت منه اور یہ کہنا بے وضوگی کے یقینی ہونے سے مجاز ہے اس لئے کہ حدث کے علم کے یہ دونوں اسباب ہیں۔ بعض علماء نے ایسے ہی فرمایا ہے اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ وہ اس کے نکلنے کو محسوس کرے اگرچہ اس کی بدبو نہ سونگھے۔

شرح السنہ میں یہ ہے کہ اس کا معنی یوں ہے، یہاں تک حدث کا اس کو یقین ہو جائے یہ بات نہیں ہے کہ ریح کی آواز کا سننا یا ریح کا پانا یہ شرط ہے اس لئے کہ ممکن ہے کہ وہ آدمی بہرا ہو وہ آواز نہ سنے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اخشم ہو یعنی اس کو بو محسوس ہی نہ ہوتی ہو، تو وہ ریح کو نہیں پائے گا۔ تو لہٰذا ان کی طہارت اس وقت ختم ہوگی جب ان کو حدث کا ہونا یقینی ہو جائے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس مسئلہ پر دلیل ہے کہ سبیلین میں سے کسی ایک سے ہوا کا نکلنا وضو کو واجب کر دیتا ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب کا یہ فرمانا ہے کہ آگے کی طرف سے ہوا کا نکلنا یہ موجب وضو نہیں ہے۔

اس حدیث میں دلیل ہے کہ یقین وہ شریعت کے کسی معاملہ میں بھی شک کی وجہ سے زائل نہیں ہوتا اور یہی عام علماء کا مسلک بھی ہے اور حنفیہ کے قول کی توجیہ یہ ہے کہ یہ نادر ہے اس لئے نص اس کو شامل نہیں، اسی طرح بعض نے کہا ہے اور صحیح بات وہ ہے جو ابن الہمامؒ نے کہی ہے کہ وہ ہوا جو عضو مخصوص سے نکلتی ہے وہ رگوں کے پھڑکنے سے محسوس ہوتی ہے حقیقت میں ہوا نہیں ہے۔ پس وہ ناقص وضو نہیں ہے جیسا کہ وہ ہوا جو پیٹ کے زخم سے نکلتی ہے۔

دودھ پینے کے بعد کلی کی جائے

۳۰۷ :وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم شَرِبَ لَبَنًا فَمَضْمَضَ وَقَالَ اِنَّ لَهٗ دَسَمًا.

(متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۳۱۳/۱حدیث رقم ۲۱۱۔ وأخرجه مسلم ۲۷٤/۱حدیث رقم (۹۵-۳۵۸) والترمذی ۱٤۹/۱حدیث رقم ۸۹۔ والنسائی فی السنن۱۰۹/۱حدیث رقم ۱۸۷وأبوداود ۳۵/۱ حدیث رقم ۱۹٦۔ وابن ماجة عن أنس ۱٦۷/۱ حدیث رقم ۵۰۱وأخرجه أحمد فی المسند ۲۲۳/۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ پیا۔ اس کے بعد کلی کی اور فرمایا کہ دودھ میں چکناہٹ ہوتی ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: مسلم شریف کی روایت میں یہ زیادتی بھی ہے :**ثم دعا بماء فمضمض ای غسل فمه**۔ ابہریؒ نے ذکر کیا ہے کہ شیخ دینؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ہاتھوں کو صفائی کیلئے دھونا مستنبط ہوتا ہے۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں علماء نے کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھونے کے مستحب ہونے میں اختلاف کیا ہے۔ سب سے ظاہر بات وہ یہ ہے کہ کھانے سے پہلے غسل یدین وہ مستحب ہیں الا یہ کہ ہاتھوں کا ناپاکی اور میل کچیل سے پاک وصاف ہونا یقینی ہو اور فارغ ہونے کے بعد بھی مستحب ہے مگر یہ کہ کھانے کا اثر ہاتھ پر باقی نہ رہا ہو مثلاً یہ کہ کھانا کوئی خشک چیز ہو یا کھانا ہاتھ میں نہ لگا ہو۔

قال ﷺ ان له دسما : دال وسین کے فتحہ کے ساتھ ہے **ای زھومة**۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہ جملہ استینافیہ ہے کلی کرنے کی علت کا بیان ہے اور اس میں یہ خبر دینا ہے کہ کلی کرنا مناسب ہے اور بعض نے کہا ہے کہ پانی کے ساتھ کلی کرنا ہر چکناہٹ والی چیز سے مستحب ہے۔ اس لئے کہ وہ منہ میں باقی رہے گا اور نماز میں اندر چلی جائے گی، پس اس بنیاد پر اس چیز کے کھانے بعد کلی کی جائے گی، جس کا باطن تک پہنچنے کا ڈر ہو۔ علت کو چھوڑتے ہوئے اور حدیث السویق بھی اس کے لئے مؤید ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں یہ شافعیہ کے ہاں ہے اور باقی ہمارے نزدیک تو ظہیریہ میں ہے کہ اگر میٹھا (شکر) یا حلوہ کھالیا پھر نماز پڑھنے لگ پڑا اس حال میں کہ مٹھاس اس کی منہ میں تھی اور وہ تھوک کے ساتھ اندر چلی گئی تو نماز فاسد نہ ہوگی۔

اس حدیث کی باب کے عنوان سے مناسبت یہ ہے کہ کلی کرنا جس کا ذکر ہوا ہے یہ وضو کی تکمیل اور پورا کرنے والی اشیاء میں سے ہے۔

کئی نمازیں ایک وضو سے پڑھنا

۳۰۸: وَعَنْ بُرَيْدَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الصَّلَوَاتِ يَوْمَ الْفَتْحِ بِوُضُوْءٍ وَاحِدٍ وَمَسَحَ عَلٰى خُفَّيْهِ فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ لَقَدْ صَنَعْتَ الْيَوْمَ شَيْئًا لَمْ تَكُنْ تَصْنَعُهٗ فَقَالَ عَمَدًا صَنَعْتُهٗ يَاعُمَرُ. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۲۳۲رقم (۸۶۔۲۷۷)۔وأبو داود ۱/۱۲۰حدیث رقم ۱۷۲والترمذی حدیث رقم ٦١۔ والنسائی ۱/۸٦حدیث ۱۳۳۔ وأحمد فی المسند ۵/۳۵۱۔

ترجمہ: ''حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن ایک وضو کے ساتھ کئی نمازیں ادا کیں۔ یعنی ایک ہی وضو سے پانچوں نمازیں پڑھیں اور موزوں پر مسح کیا۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ آج آپ نے ایسا کام کیا ہے۔ کہ اس سے پہلے آپ ﷺ نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے عمر میں نے قصداً ایسا کیا ہے اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

بریدۃ ابن الحصیب: یہ بریدہ بن الحصیب ''اسلمی'' ہیں۔ بدر سے پہلے اسلام لے آئے تھے مگر غزوہ بدر میں حاضر نہ ہو سکے اور بیعت رضوان میں شریک تھے۔ یہ مدینہ کے رہنے والے تھے۔ پھر بصرہ چلے گئے تھے پھر وہاں سے خراسان جہاد کرتے ہوئے پہنچے اور ''مرو'' میں بزمانہ یزید بن معاویہ ۶۲ھ میں انتقال ہوا۔ خراسان میں وفات پانے والے آخری صحابی تھے ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے۔ حُصیب حسب کی تصغیر ہے۔ تاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ بریدہ اسم تصغیر ہے۔

ابو الحصیب کے بیٹے ہیں حُصیب حاء کے ضمہ کے ساتھ ہے یہ خراسان میں صحابہ میں سب سے آخر میں انتقال کرنے والے صحابی ہیں، اور صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں یہ اسلمی ہیں غزوہ بدر سے پہلے مسلمان ہوئے لیکن بدر میں حاضر نہ ہو سکے اور بیعت رضوان بھی کی۔ پہلے مدینہ میں رہائش پذیر تھے پھر بصرہ منتقل ہو گئے پھر بصرہ سے جہاد کیلئے خراسان کی طرف نکلے تو مرو میں یزید بن معاویہؓ کے زمانہ حکومت میں ۶۲ ہجری کو انتقال ہوا۔ محدثین کرام نے ان سے روایات نقل کی ہیں۔

تشریح: ان النبی ﷺ صلی الصلوات :ای الخمس المعهودة ۔

یوم الفتح :ای یوم فتح مکه۔

بوضو واحد ومسح: مسح یہ حال ہے حرف قد کے مقدر ہونے کے ساتھ۔

علی خفیه: اس میں دلیل ہے کہ وضو ہر نماز کیلئے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے نہیں ہے۔ بعض نے اس کے خلاف کہا ہے دلیل پکڑتے ہوئے بخاری کی روایت سے: عن عمرو بن عامر عن انس کان النبی ﷺ یتوضا عند کل صلوٰة قلت کیف کنتم تصنعون؟ قال ـ یجزی احدنا مالم یحدث: ''حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام ہر نماز کے وقت وضو کرتے تھے راوی کہتے ہیں میں نے کہا تم کیا کرتے ہو؟ تو حضرت انسؓ نے فرمایا کہ ہمارے لئے وضو کافی ہوتا ہے جب تک حدث نہ ہو''۔

فقال له عمر لقد صنعت الیوم شیئا لم تکن تصنعه ؟ فقال۔

عمدا صنعته یا عمر : یہاں ضمیر مذکور کی طرف راجح ہے اور وہ ایک وضوء کے ساتھ پانچ نمازیں پڑھنا اور موزوں پر مسح کرنا ہے، اور عمداً یا تمیز ہے یا حال ہے فاعل سے۔ یہاں عمداً کو مقدم اس لئے کیا ہے تا کہ دین میں ان دونوں مسائل کے جواز کا اہتمام معلوم ہو جائے یا اس کو کسی خاص بات کیلئے مقدم کیا ہے اور وہ رد کرنا ہے ان لوگوں کا جو مسح علی الخفین کو جائز نہیں سمجھتے۔

اس حدیث میں دلیل ہے اس امر پر کہ ایک وضو سے اگر کوئی پانچ نمازیں پڑھنے پر قادر ہو تو یہ مکروہ نہیں ہے، الا یہ کہ بول و براز کا اس پر غلبہ ہو جائے (تو ایسی حالت میں مکروہ ہے) شراح حدیث نے اسی طرح ذکر کیا ہے لیکن ضمیر کو ماقبل سارے مجموعہ کی طرف اور مسح علی الخفین کی طرف لوٹانے میں اس بات کا وہم ہو سکتا ہے کہ موزوں پر مسح کرنے کا حکم یہ فتح مکہ سے پہلے نہ تھا حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ پس صحیح بات یہ ہے کہ ضمیر فقط تمام کی طرف لوٹے حال سے اس کو خالی کرتے ہوئے، پس بے شک یہ بیان ہوگا اس قضیے کا جو خارج میں موجود ہے اور اس جملہ کی غایت یہ ہوگی کہ یہ مسح کے حکم کی ہمیشگی کا فائدہ دے گا اسلام کے اخر تک۔ پس اس وقت اس کے منسوخ ہونے کا وہم اٹھ جائے گا۔ واللہ اعلم

اور شاید کہ اس حدیث اور باب میں مناسبت یہ ہو کہ اس حدیث میں اس بات کی دلالت موجود ہے کہ ہر وہ شخص جو کہ نماز کی طرف اٹھنے کا ارادہ کرے اس پر وضو واجب نہیں ہے۔ جیسا کہ آیت قرآنیہ کے ظاہر سے متوہم ہوتا ہے۔ اس لئے فرمایا: عمدا صنعته یا عمر علماء کرام فرماتے ہیں کہ آیت کی تقدیر یوں ہے: (اذ اقمتم الی الصلوٰة) اذا اردتم القیام الی الصلوٰة وانتم محدثون فاغسلوا...... اور باقی وہ بات کہ جس کی طرف ابن حجرؒ گئے ہیں کہ (شروع اسلام میں) وضو کا واجب ہونا ہر فرض نماز کیلئے تھا۔ اگر چہ حدث نہ بھی ہوا ہو پھر اس حدیث سے وہ منسوخ ہو گیا۔ یہ حدیث کے سیاق وسباق سے بعید ہے اور مزید یہ کہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہوا، اور اس کو بخاری شریف کی وہ روایت جو حضرت انسؓ سے ہے جس کو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں رد کرتی ہے۔

ستو کھانے کے بعد وضو نہیں

۳۰۹:وَعَنْ سُوَيْدِ بْنِ النُّعْمَانِ اَنَّهٗ خَرَجَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَامَ خَيْبَرَ حَتّٰى اِذَا كَانُوْا بِالصَّهْبَاءِ وَهِيَ مِنْ اَدْنٰى خَيْبَرَ صَلَّى الْعَصْرَ ثُمَّ دَعٰى بِالْاَزْوَادِ فَلَمْ يُؤْتَ اِلَّا بِالسَّوِيْقِ فَاَمَرَ بِهٖ فَثُرِّيَ فَاَكَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَاَكَلْنَا ثُمَّ قَامَ اِلَى الْمَغْرِبِ فَمَضْمَضَ وَمَضْمَضْنَا ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱/۳۱۲رقم ۲۰۹ ـوأخرج ابن ماجة نحوه في السنن ۱/۱٦٥حديث رقم ٤۹۲وأخرجه مالك في الموطأ ۱/حديث رقم ۲۰ ـوأخرج أحمد نحوه ۳/٤۸۸ ـ

ترجمه: حضرت سوید بن نعمانؓ سے روایت ہے کہ وہ فتح خیبر کے سال رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر پر گئے۔ جب مقام صہباء پر پہنچے جو کہ خیبر کے قریب ہے عصر کی نماز ادا کی پھر آپ ﷺ نے زادِ راہ منگوایا۔ چنانچہ ستو کے علاوہ اور کچھ نہ تھا اور آپ ﷺ کے حکم سے اس کو گھولا گیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ اور ہم نے کھایا اور پھر مغرب کی نماز کے لئے کھڑے ہوئے آپ ﷺ نے مضمضہ کیا اور ہم نے بھی مضمضہ کیا اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

سوید بن قیس۔ یہ سوید بن قیس ہیں اور ان کی کنیت ''ابو عمرو'' ہے۔ ان کی کنیت ''ابو صفوان'' ہے' ان سے سماک بن حرب روایت کرتے ہیں اور ان کو کوفیوں میں شمار کیا گیا ہے۔

ابن النعمان :نون کے ضمہ کے ساتھ ہے صاحب مشکوٰۃ نے اسماء الرجال میں صرف سوید بن قیس کو ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کی کنیت ابو صفوان ہے سماک بن حرب نے ان سے روایت کی ہے اور ان کا شمار کوفیوں میں ہوتا ہے۔

تشریح:انه خرج مع رسول الله ﷺ عام خيبر :ایْ عام غزوةَ خيبر ۔خیبر یہ معروف شہر ہے یہ غیر منصرف ہے علمیت اور تانیث کی وجہ سے ابھریؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

حتی اذا کانوا : ای النبی ﷺ واصحابه نازلین (بالصهباء) باء کے فتحہ اور مد کے ساتھ۔

وهی :ای الصهباء۔

ادنی خیبر : ای اسفلها او اقربها۔ اور صحیح نسخہ میں یوں ہے: ومن ادنی خیبر ای الصیهباء ۔صہباء یہ خیبر کے قریب ایک جگہ ہے۔

صلی العصر ،ثم دعا بالازواد: زاد کی جمع ہے۔

فلم یوت الا بالسویق: سویق۔ ستو کہتے ہیں جو جَو اور گندم وغیرہ کو کوٹ کر نکالا جاتا ہے۔توشے کیلئے (فامر به ای بالسویق (فثری) ایْ بَلّ: یعنی تر کیا تاکہ اس کا کھانا آسان ہو جائے۔طیبیؒ فرماتے ہیں:فثری ایْ بلّ یہ ثری سے مشتق ہے اور ثری وہ تر مٹی جو اوپر کی مٹی کے نیچے ہو۔ یقال ثرّی التراب اذا رش علیه بالماء۔کہ ثری التُراب کا جملہ جب بولا جاتا ہے کہ جب مٹی پر پانی چھڑکا جائے۔

فاكل رسول الله ﷺ واكلنا ثم قام الى المغرب فمضمض ومضمضنا: پس کلی کرنا مستحب ہوگا۔

ثم صلى ولم يتوضا: اگر چہ وہ ان چیزوں میں سے بھی جس کو آگ پر پکایا جاتا ہے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ مسلم نے بھی اس کو روایت کیا ہے، اور جو اس میں ہے وہ پہلے گزر چکا ہے اور جو گزر چکا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے یوں کہا ہے۔ مصنف کے قول کے بعد رواہ مسلم **وعند البخارى من حديث انس طرف منه** ۔ کہ اس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے اور امام بخاریؒ کے نزدیک حضرت انسؓ کے حدیث میں اس کا کچھ حصہ ہے۔ پس اگر ابن حجرؒ کی مراد حدیث انسؓ سے وہ ہے جو ہم پہلے ذکر کر آئیں تو اس میں اس روایت کا کوئی حصہ نہیں ہے اور اگر مقصود ابن حجرؒ کا مسلم سے وہ متفق علیہ روایت ہے حضرت ابن عباسؓ کی اس لئے کہ اس میں مضمضمہ (کلی) کا ذکر ہے تو پھر یہ تعبیر کرنا محدثین کی اصطلاح نہیں ہے اور اگر اس کے علاوہ اور کوئی مراد تھی تو اس کی وضاحت ہونی چاہیئے تھی تا کہ وہ مؤلف کی تلاش کی کمی پر دلیل بن سکتی۔

الفصل الثانی:

خروجِ ریح کا یقین ناقض وضو ہے

۳۱۰: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَاوُضُوْءَ اِلَّامِنْ صَوْتٍ اَوْرِیْحٍ.

(رواه احمدو الترمذى)

أخرجه أحمد في المسند ۲/ ۴۷۱۔ والترمذی ۱/ ۱۰۹ حدیث ۸۴۔ وأخرجه ابن ماجة ۱/ ۱۷۲ حدیث رقم ۵۱۵۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا وضو کرنا آواز یا بو سے واجب ہوتا ہے۔ اس حدیث کو امام احمدؒ اور امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **اَیْ واجب الا من صوت :اى الا من سماع صوت۔**

اوریح : اى وجدان رائحته ريح خرج منه ۔یعنی ریح کی بدبو کو پائے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پہلے جنس اسباب وضو کی نفی کی پھر اس سے صوت اور ریح کو مستثنیٰ کیا حالانکہ نواقض وضو بہت سارے ہیں تو شاید یہ کہنا کہ خاص صورت میں ہو یعنی مسائل کے اعتبار سے، پس مراد یہاں پر شک کی جنس کی نفی ہے اور یقین کا ثابت کرنا ہے، یعنی مطلب یہ ہوگا طہارت کے ظن کے پہلے ہونے کے ساتھ شک کی وجہ سے وضو نہیں کرے گا۔ مگر یہ کہ صوتِ ریح یا ریح کی بدبو کا یقین ہو جائے (تو اس وقت وضو کرے گا)۔

امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے حدیث حسن صحیح ہے اور ابن ماجہؒ نے بھی اس کو روایت کیا ہے میرک شاہؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

مذی سے وضو اور منی سے غسل ہوتا ہے

۳۱۱: وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الْمَذِيِّ فَقَالَ مِنَ الْمَذِيِّ الْوُضُوْءُ وَمِنَ الْمَنِيِّ الْغُسْلُ . (رواه الترمذى)

أخرجه الترمذي في السنن ١/١٩٣ حديث رقم ١١٤ وقال حسن صحيح وأخرجه ابن ماجة ١/١٦٨ حديث رقم ٥٠٤۔
وأحمد في المسند ١/١٠٩۔ ١١٠۔

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے مذی کے بارے میں سوال کیا۔ کہ اس سے وضو ہے یا غسل تو آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ مذی خارج ہونے سے وضو لازم ہوتا ہے اور منی خارج ہونے سے غسل واجب ہوتا ہے۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔
یعنی مقدادؓ کے واسطے سے جیسا کہ گزر چکا ہے

تشریح: عن المذی: اور ایک نسخہ میں من المذی ہے۔ ای حکمہ میرک شاہؒ فرماتے ہیں مذی جسم کے فتحہ اور ذال کے سکون اور دونوں کے ایک ساتھ کسرہ کے ساتھ مراد وہ پتلا پانی ہے جو بیوی سے بوس و کنار اور ملاعبت کے وقت نکلتا ہے اور قاموس میں ہے: المذي والمذی یہ غني کی طرح اور مذي یاء کے سکون کے ساتھ وہ ہوتی ہے جو بیوی سے ملاعبت اور بوس و کنار کے وقت نکلتی ہے اور سب سے صحیح نسخہ وہ پہلا ہے اور تیسرا موجود نہیں ہے۔

فقال من المذی الوضو: ای واجب۔

ومن المنی الغسل: یہ جو فرمایا یہ مزید افادہ کیلئے ہے اور منْ جواب اسلوب الحکیم کی قسم میں سے ہے۔ جیسا کہ صحابہ کرامؓ نے سوال کیا: انتوضا من ماء البحر کہ کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: هو الطهور ماء ہ والحل میتته ۔ کہ اس کا پانی پاک ہے اور اس کا میتہ حلال ہے (تو جیسے اس جواب میں زیادتی مِنْ اسلوب الحکیم ہے ایسے ہی یہاں پر ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں اور جو پہلے گزر چکی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ وہ ان کے بارے میں سوال کریں۔ تطبیق کی یہ صورت ہے کہ پہلی حدیث میں حضرت علیؓ کا اپنی خاص ذات کے حوالے سے اور کثرت سے مذی آنے کے بارے میں سوال کرنا تھا تو اس خصوصیت میں حیاء کا آنا واضح ہے تو لہٰذا انہوں نے حضرت مقداد کو نائب بنایا سوال کیلئے اور یہاں مطلق مذی کا حکم معلوم کرنا ہے۔ تو اس میں شرم وحیاء کا کوئی پہلو نہ تھا اس لئے خود سوال کیا، تو دونوں حدیثوں کا سیاق، تعدد واقعہ پر دلالت کرتا ہے (ملا علی قاریؒ) فرماتے ہیں کہ ابن حجرؒ کی اس بات کا بعید ہونا کسی پر مخفی نہیں ہے۔
امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے۔ کہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔ ابن ماجہؒ نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔

تکبیر تحریمہ کا مسئلہ

۳۱۲: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطُّهُوْرُ وَتَحْرِيْمُهَا التَّكْبِيْرُ وَتَحْلِيْلُهَا التَّسْلِيْمُ ۔ (رواه ابوداود والترمذی والدارمی)

أخرجه أبو داود في السنن ١/٤٩ حديث رقم ٦١۔ وأخرجه الترمذی فی السنن ١/٨ حديث رقم ٣ وقال أصح شئی فی هذا الباب وأحسن۔ وأخرجه الدارمی فی السنن ١/١٨٦ حديث رقم ٦٨٧۔ وأخرجه أحمد فی المسند ١/١٢٣۔

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نماز کی کنجی وضو ہے اور نماز کی تحریمہ اللہ اکبر کہنا ہے اور نماز کی تحلیل السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنا ہے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ امام ترمذیؒ اور امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے

تشریح **الطھور**: ضمہ کے ساتھ ہے اور فتحہ کے ساتھ بھی ہے: **ای بالماء او التراب** پس **فاقد الطھورین** (پانی۔مٹی نہ پانے والا) اس کے لئے نماز کی حدود میں داخل ہونا جائز نہیں ہے جیسا کہ جملہ کے دونوں اجزاء کے معرفہ لانے میں حصر اسی کی مقتضی ہے اور ہمارا مذہب بھی یہی ہے اور شوافع حضرات نے یہاں یہ عذر بیان کیا ہے کہ نماز کا اس حالت میں بھی درست ہونا جبکہ طھورین نہ ہو ضرورت کی وجہ سے ہے۔

وتحریمھا التکبیر: مظہرؒ فرماتے ہیں نماز میں داخل ہونے کو تحریم کے ساتھ موسوم کیا گیا اس لئے کہ تکبیر تحریمہ نمازی پر کھانے پینے وغیرہ کو حرام کر دیتی ہے۔پس جائز نہیں ہوگا دخول نماز میں مگر تکبیر تحریمہ کے ذریعے کہ جس کے ساتھ نیت بھی ملی ہوئی ہو اور تکبیر تحریمہ ہمارے نزدیک شرط ہے اور امام شافعیؒ کے ہاں رکن ہے۔پھر مراد یہاں پر تکبیر سے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد(**وربك فكبر**)میں وہ تعظیم ہے اور تعظیم یہ عام ہے اللہ اکبر کے خاص ہونے میں یا اس کے علاوہ ہر وہ کلمہ جو مشعر بالتعظیم ہو اور بعض روایت سے لفظ مخصوص ثابت ہے۔پس اس پر عمل کرنا واجب ہے یہاں تک کہ جو آدمی اللہ اکبر یعنی لفظ مخصوص جو روایات میں آیا ہے،اس کو اچھے طریقے سے ادا کرسکتا ہے اس کے لئے اس کا چھوڑنا مکروہ ہے۔جیسا کہ ہم نے قراءت مع الفاتحہ میں کہا ہے اور رکوع وسجود مع التعدیل میں کہا ہے۔کتاب کافی میں اسی طرح ہے۔

ابن الہمامؒ فرماتے ہیں اور اس حدیث سے ظاہراً وجوب ثابت ہوتا ہے اور یہی اس مواظبت کا مقتضی ہے کہ جو ترک کے ساتھ مقارن نہیں ہے۔پس مناسب یہی ہے کہ اسی پر اعتماد کیا جائے۔

وتحلیلھا التسلیم: تحلیل کہتے ہیں شئ حرام کو حلال کرنا،اور تسلیم کو تحلیل سے اس لئے موسوم کیا کیونکہ یہ نمازی پر حرام شدہ چیزوں کا جائز قرار دے دیتی ہے۔نماز سے نکلنے کی وجہ سے اور یہ سلام واجب ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں تحریم اور تحلیل کی نماز کی طرف اضافت یہ اس مناسبت کی وجہ سے ہے جو ان دونوں کے درمیان میں ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نماز کے ان چیزوں کیلئے جو اس میں سے نہیں ہیں محرم ہونے کا سبب وہ تکبیر ہے اور حلال قرار دینے والی وہ سلام ہے۔یعنی نماز ان دونوں کے ساتھ اس طرح ہو جاتی ہے۔پس یہ دونوں مصدر ہونگے جو فاعل کی طرف مضاف ہونگے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں۔بعض کا کہنا ہے۔کہ نماز میں شروع ہونے کو تشبیہ دی گئی ہے معزز بادشاہ کے حریم میں داخل ہونے سے کہ جس کو غیروں سے محفوظ کیا گیا ہو(حریم وہ جگہ جو بادشاہ نے نشانات کے ذریعے اپنے لئے خاص کر لی ہو) اور اس محفوظ جگہ کے دروازے کے کھلنے کا ذریعہ وہ تمام گندگیوں سے پاک ہونے کو بنایا ہے اور غیر کی طرف متوجہ ہونے یا اس کے ساتھ مشغول ہونے کو تحلیل بنایا کمال کے بعد تکمیل پر تنبیہ کرتے ہوئے۔

امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ اس باب میں یہ اصح روایت ہے۔یعنی ان تینوں نے اکیلے حضرت علیؓ ہی سے روایت کی ہے۔

۳۱۳: وَرَوَاهُ ابْنِ مَاجَةِ عَنْهُ وَعَنِ اَبِيْ سَعِيْدٍ ۔

ترجمہ: اور حضرت امام ابن ماجہؒ نے اس حدیث کو حضرت علیؓ اور حضرت ابو سعیدؓ سے روایت کیا ہے۔

فطرت کے خلاف کارروائی نہ کرو

۳۱۴: وَعَنْ عَلِيّ بْنِ طَلْقٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا فَسَا اَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ وَلَا تَأْتُوا النِّسَاءَ فِيْ اَعْجَازِهِنَّ ۔ (رواہ الترمذی وابوداود)

أخرجه أبوداود في السنن ١/١٤١ حديث رقم ٢٠٥۔ والترمذي ٣/٤٦٩ حديث رقم ١١٦٦۔

ترجمہ: حضرت علی بن طلقؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کی ہوا خارج ہو جائے بغیر آواز کے تو اس کو وضو کرنا چاہئے اور تم عورتوں کے ساتھ ان کی مقعد میں جماع نہ کرو اس حدیث کو امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

علی بن طلق: یہ علی بن طلق ''حنفی و یمامی'' ہیں۔ ان سے ''مسلم بن سلام'' روایت کرتے ہیں۔ یہ اہل یمامہ میں سے ہیں ان کی حدیث اہل یمامہ میں پائی جاتی ہے۔

اور ایک نسخہ میں طلق بن علی ہے۔ طلق طاء کے فتحہ لام کے سکون اور قاف کے ساتھ ہے اور یہ منذر کے بیٹے ہیں۔

برقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، بعض حضرات اس کو طلق بن علی کہتے ہیں اور تلقیح میں بھی اسی طرح ہے۔

صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں یہ علی بن طلق الحنفی الیمامی ہیں۔ مسلم بن سلام نے ان سے روایت نقل کی ہے اور یہ اہلِ یمامہ میں سے ہیں اور ان کی حدیث ان میں مشہور ہے۔

تشریح: (قال ۔قال رسول الله ﷺ اذا فسا احدكم) اى خرج الريح التى لا صوت له' من اسفل الانسان (فليتوضا ولا تاتوا النساء) اى لا تحيا معوهن (فى اعجازهن) اى ادبارهن ۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں حدیث حسن اور اس باب میں حضرت عمر ابن عباس اور ابو ہریرہؓ سے بھی روایات ہیں اور میں نے محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ سے یہ سنا ہے کہ وہ یہ فرمار ہے تھے کہ میں علی بن طلق کی اس حدیث کے علاوہ اور کوئی حدیث نہیں پہچانتا اور میں اس حدیث کو طلق بن علی السنجی کی حدیث سے نہیں پہچانتا۔ گویا کہ امام بخاریؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ اصحاب رسول ﷺ میں سے آخری آدمی ہیں۔ میرک شاہؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ :فليبن على صلوته والى حدیث بالاتفاق ضعیف ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں اس مقام میں اس بات کا کوئی دخل نہیں ہے۔

نوم سے استرخاء مفاصل ہو جاتا ہے

۳۱۵: وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ اَبِيْ سُفْيَانَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ اِنَّمَا الْعَيْنَانِ وِكَاءُ السَّهِ فَاِذَا نَامَتِ الْعَيْنُ

اسْتَطْلَقَ الْوِ كَاءُ (رواه الدارمی)

أخرجه الدارمي في السنن ١/١٩٨ حديث رقم ٧٢٢ـ وأخرجه أحمد في المسند ٤/٩٧ـ

ترجمه: حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ آنکھیں سرین کا سر بند ہیں۔ جب آنکھ سو جاتی ہے۔ تو سر بند کھل جاتا ہے۔ (دارمی)

تشریح: **معاوية بن ابی سفيان**: یہ دونوں صحابی ہیں حضرت معاویہؓ کا تذکرہ گزر چکا ہے اور باقی ان کے والد ابو سفیان بن صخر بن حرب اموی قریشی یہ واقعہ فیل سے ۱۰ سال پہلے پیدا ہوئے اور دورِ جاہلیت میں قریش کے بڑے سرداروں میں سے تھے اور قریش میں رؤسا کا جھنڈا ان کے پاس تھا۔ فتح مکہ والے دِن مسلمان ہوئے اور یہ مؤلفۃ القلوب میں سے تھے اور غزوۂ حنین میں شریک ہوئے۔ نبی ﷺ نے غزوۂ حنین کے مالِ غنیمت میں سے ۱۴۰ اوقیہ چاندی مؤلفۃ القلوب میں سے ان کو دی۔ ان کی ایک آنکھ طائف کی لڑائی میں پھوڑ دی گئی تھی، پس اسی طرح یرموک کی لڑائی تک آنکھ کے کانے پن کے ساتھ رہے۔ پس یرموک کی لڑائی میں ان کی آنکھ میں پتھر لگا تو اس کی بینائی چلی گئی ان سے عبداللہ بن عباس ؓ نے روایت کی ہے۔ ۳۴ ہجری کو مدینہ میں انتقال ہوا اور جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔

تشریح: **ان النبی ﷺ قال انما العینان**: یعنی بیداری اور اس میں اسی سے کنایۃ ہے۔

وكاء السه: سین کے فتحہ اور ھاء کی تخفیف کے ساتھ وکاء کہتے ہیں۔ اسی چیز کو کہ جس کے ذریعے تھیلی وغیرہ کو باندھا جائے تا کہ جو چیز تھیلی میں اس کی باہر آنے سے حفاظت ہو جائے، اور **السّہِ ای الاست او حلقة الدبر**۔ بعض نے اس کا معنی دبر (پیٹھ) سے کیا ہے اور اس کی اصل ستہ ہے تاء کو حذف کر دیا گیا ہے اسی وجہ سے اس کی جمع **استاه** اور تصغیر **سیتهة**۔

فاذا نامت العين: ای جنسها۔

استطلق الوكاء: ای انحل۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں۔ **العينان كالوكاء للسه**: بیداری یہ سرین کیلئے ازار بندھ کی طرح ہے۔ یہاں انسان کی آنکھ اور پیٹ اور دبر کو ایک ایسے مشکیزے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس کے منہ کو رسّی وغیرہ سے باندھا گیا اور تشبیہ دی اس چیز کو جو اس کو کھول دے، یعنی سونے کے وقت کی غفلت اس مشکیزے کے دھاگے ورسّی کے کھلنے کے ساتھ اور اس میں اس غفلت کے صادر ہونے کی قباحت کی صورت بیان کرتا ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کا معنی یہ ہے کہ انسان جب تک بیدار رہتا ہے تو اس کا اختیار ہے، تو جو کچھ اس کے پیٹ میں ہے وہ رکا رہتا ہے، پس جب وہ سو جاتا ہے تو اس کا اختیار ختم ہو جاتا ہے اور اس کے جوڑ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، پس اس وقت ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز اس سے نکلے جو اس کی پاکی کو توڑ دے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ نیند اور اسی طرح تمام وہ چیزیں جو مزیل عقل ہیں ان سے طہارت کا ٹوٹنا ان کی ذات کی وجہ نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ ان میں ایسی چیز کے نکلنے کا گمان ہوتا ہے جو ناقض وضو ہو اور اسی وجہ سے اس حکم میں سے وہ نیند کہ جس میں مقعد زمین پر جمی ہو خاص کی گئی ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس میں راوی ضعیف ہے اور میرک شاہؒ فرماتے ہیں کہ مصابیح میں یہ حدیث اس باب میں نہیں ہے اور شاید کہ اس کو کسی اور باب میں لائے ہوں۔

نوم ناقض وضو ہے یا نہیں

۳۱۶:وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِكَاءُ السَّهِ الْعَيْنَانِ فَمَنْ نَامَ فَلْيَتَوَضَّأْ (رواہ ابو داود) وَقَالَ الشَّيْخُ الْإِمَامُ مُحيُّ السُّنَّةِ رَحِمَهُ اللّٰهُ هٰذَا فِيْ غَيْرِ الْقَاعِدِ لِمَاصَحَّ ۔

أخرجه أبو داود في السنن ۱/۱٤۰ حديث رقم ۲۰۳۔ وابن ماجة ۱/۱٦۱ حديث رقم ۱٦۱۔ وأحمد في المسند ۱/۱۱۱۔

ترجمه: ''حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا سرین کا سر بند آنکھیں ہیں۔ لہٰذا جو آدمی سو جائے اس کو چاہئے کہ وضو کرے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے اور حضرت امام محی السنۃ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس آدمی کے لئے ہے جو بیٹھا ہوا نہ ہو۔ بلکہ لیٹ کر سو جائے۔''

تشریح: ابن حجرؒ فرماتے ہیں، اور ابن ماجہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ایک راوی ضعیف ہیں اور میرک شاہؒ فرماتے ہیں اس کی سند میں وضین بن عطاء اور بقیۃ بن الولید ہیں جن میں محدثین کو کلام ہے۔

قال اور ایک نسخہ میں وقال ہے۔

الشیخ الامام محی السنۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ اور ایک نسخہ میں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (هذا) ای هذا الحكم ،(في غير القاعد) ای من النائمين۔ یعنی یہ حکم اس کے بارے میں ہے جو چت لیٹ کر سو جائے۔ پس باقی وہ آدمی جو بیٹھنے کی حالت میں سو جائے اس حال میں کہ اس کی مقعد زمین پر جمی رہے پھر جب بیدار ہوا تو اسی طرح اس کی مقعد جمی ہوئی تھی تو اس کا وضو نہ ٹوٹے گا، اگر چہ اس کا سونا لمبا ہو جائے۔ (لما صح)

نماز کے انتظار میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو اونگھ آ جانا

۳۱۷:عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْتَظِرُوْنَ الْعِشَاءَ حَتّٰى تَخْفِقَ رُؤُوْسُهُمْ ثُمَّ يُصَلُّوْنَ وَلَا يَتَوَضَّأُوْنَ (رواہ ابوداود والترمذی إِلاَّ أَنَّهٗ ذَكَرَفِيْهِ) يَنَامُوْنَ بَدَلَ يَنْتَظِرُوْنَ الْعِشَاءَ حَتّٰى تَخْفِقَ رُؤُوْسُهُمْ......۔

أخرجه أبو داود في السنن ۱/۱٤۰ حديث رقم ۲۰۳۔ وابن ماجة ۱/۱٦۱ حديث رقم ۱٦۱۔ وأحمد في المسند ۱/۱۱۱۔

ترجمه: ''حضرت انسؓ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ انہوں نے فرمایا رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے اصحاب بیٹھے ہوئے نماز عشاء کا انتظار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ نیند کی وجہ سے ان کے سر جھک جاتے تھے اسی حالت میں وہ اٹھ کر نماز پڑھ لیتے تھے اور جدید وضو نہیں کرتے تھے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے ہاں البتہ اتنا فرق ہے کہ امام ترمذی نے اپنی روایت میں يَنْتَظِرُوْنَ الْعِشَاءَ حَتّٰى تَخْفِقَ رُؤُوْسُهُمْ کے بجائے يَنَامُوْنَ کا لفظ ذکر کیا ہے۔''

تشریح: قال: كان اصحاب رسول الله صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ينتظرون العشاء: ای صلاتها الجماعة۔ پس وہ جماعت کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے سو جاتے تھے۔ جیسا کہ آپ علیہ السلام کا یہ ارشاد اس پر دلالت کر رہا ہے

حتی تخفق: تاء کے فتحہ اور فاء کے کسرہ کے ساتھ ای تتحرك وتضطرب۔
رؤوسهم: ای من النوم۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں۔ خفقة لغت میں ہلکی اونگھ کو کہتے ہیں اور تخفق روسهم کا معنی یہ ہے کہ ان کی ٹھوڑیاں ان کے سینوں پر گر جاتی تھیں اور بعض نے کہا ہے یہ خفوق سے ہے اور خفوق کہتے ہیں اضطراب کو۔

ثم یصلون: ای بذلك الوضو۔

ولا یتوضاون: ای وضوء جدیدا۔

رواہ ابوداؤد والترمذی الاانه۔ ای الترمذی۔

الذکر فیه: ای فی حدیثه۔

ینامون: ای قاعدین۔

بدل ینتظرون العشاء حتی تخفق روسهم: ای بدل مجموع قوله۔ یعنی امام ترمذیؒ نے ینتظرون العشاء حتی تخفق روسهم کے بارے میں ینامون ذکر کیا ہے جیسا کہ یہ ظاہر ہوتا ہے نہ کہ صرف: ینتظرون العشاء کے بدلے میں جیسا کہ بعض طلباء نے وہم کیا ہے اس مقام پر اس لئے کہ مصابیح کی تخریج میں ابو اسحاق سلمی شافعیؒ نے منذری سے نقل کیا ہے کہ امام مسلمؒ نے یہ روایت اپنی صحیح مسلم میں نقل کی ہے۔ حضرت انسؓ سے قال کان اصحاب رسول الله ﷺ ینامون ثم یصلون ولایتوضؤون پس یہ روایت اس بات کی تائید کرتی ہے کہ ینامون یہ تمام کے بدلے میں ہے یعنی: ینتظرون العشاء حتی تخفق روسهم کے اور باقی ترمذی کی روایت، پس یہ مسلم کی روایت کے موافق ہے اور صاحب مشکوۃ کو مسلم کی روایت سے ذھول ہو گیا کہ انہوں نے اس کو ذکر نہ کیا میرک شاہؒ نے اسی طرح تحقیق کی ہے۔

اضطجاع کی حالت میں سو جانا ناقض وضو ہے

۳۱۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الْوُضُوْءَ عَلٰی مَنْ نَّامَ مُضْطَجِعًا فَاِنَّهٗ اِذَا اضْطَجَعَ اسْتَرْخَتْ مَفَاصِلُهٗ۔ (رواہ الترمذی وابوداود)

أخرجه أبوداود في السنن ۱/۱۳۹ حديث رقم ۲۰۲۔ والترمذی فی السنن ۱/۱۱۱ حدیث رقم ۷۷ وأحمد فی المسند ۱/۲۵۶۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا وضو اس آدمی پر لازم ہے جو اضطجاع کی حالت میں سو جائے۔ اس لئے کہ جب آدمی لیٹ کر سو جاتا ہے تو استرخاء مفاصل ہو جاتا ہے (اور اس سے خروج ریح کا امکان ہوتا ہے۔) اس حدیث کو امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

اسنادی حیثیت: بقول میرک شاہ یہ حدیث منکر ہے بوجوہ کہ اس میں ہر مردلامی ہے جو کہ کثیر الخطاء ہے۔

تشریح: قال رسول الله ﷺ ان الوضوء: ای وجوبه (علی من نام مضطجعا فانه اذا اضطجع استرخت) ای فترت وضعفت؟

مفاصله: مفصل کی جمع ہے ہڈیوں اور رگوں کے سرے پس اس وقت جبکہ اسرخاء مضا صل هو عادةً۔ کسی چیز

کے نکلنے سے آدمی خالی نہیں ہوتا اور جو عادۃً ثابت ہو وہ یقینی کی طرح ہوتا ہے۔

ابو داؤدؒ نے فرمایا ہے یہ حدیث منکر ہے اور امام ترمذیؒ نے اس کے ابن عباسؓ پر موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے۔ ابن حجرؒ نے اس کو ذکر کیا ہے۔

میرک شاہؒ فرماتے ہیں یہ حدیث منکر ہے سوائے یزید دلانی کے اور کسی نے روایت نہیں کی ہے۔ یزید دلانی کی روایت یوں ہے :عن قتادة عن ابی العالیه عن ابن عباسؓ۔ علامہ منذریؒ فرماتے ہیں، اور ابو داؤد نے جو ذکر کیا ہے وہ دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ بے شک قتادہ کا اس حدیث میں ابو العالیہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ پس حدیث منقطع ہوگی۔ ابن حبانؒ نے ذکر کیا ہے کہ بے شک یزید دلانی یہ بہت زیادہ غلطی کرنے والا اور انتہائی وہمی اور ثقات کی مخالفت کرنے والا ہے۔

کیا مس ذکر ناقض وضو ہے؟

۳۱۹ :وَعَنْ بُسْرَةَ بِنْتِ صَفْوَانَ بْنِ نَوْفَلٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَامَسَّ اَحَدُكُمْ ذَكَرَهٗ فَلْيَتَوَضَّأْ۔ (رواه مالك واحمد وابوداود والترمذی والابن ماجة والدارمی)

أخرجه مالك ۱/۴۲ حديث رقم ۵۸۔ وأحمد فی المسند ۶/۴۰۶۔ وأبوداود فی السنن ۱/۱۲۵ حديث رقم ۱۸۱ وأخرجه الترمذی فی السنن ۱/۱۲۶ حديث رقم ۸۲ وقال حسن صحيح ۔ وابن ماجة فی السنن ۱/۱۶۱ حديث رقم ۴۷۹ والدارمی بلفظ مقارب ۱/۱۹۹ حديث رقم ۷۲۴۔

ترجمہ: حضرت بسرہ بنت صفوان بن نوفلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو شخص اپنے آلۂ تناسل کو ہاتھ لگائے تو اس کو چاہئے کہ وہ وضو کرے۔ اس حدیث کو امام مالکؒ، امام احمدؒ، امام ابو داؤدؒ، امام ترمذیؒ، امام نسائیؒ، امام ابن ماجہ اور امام دارمی ﷭ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

بسرۃ: یہ بسرہ صفوان بن نوفل کی بیٹی تھی اور ورقہ بن نوفل کی بھتیجی تھی۔ نسلاً یہ قرشیہ اسدیہ تھیں۔ ''بسرۃ'' باء ایک نقطہ والی اور سین مہملہ سکون کے ساتھ ہے۔

تشریح: بسرۃ : باء کے ضمہ اس سین کے سکون کے ساتھ ہے صفوان کی بیٹی ہیں، اور یہ صحابیہ ہیں۔ تقریب التہذیب میں اسی طرح ہے صاحب مشکوٰۃ نے فرمایا ہے یہ بسرۃ بنت صفوان بن نوفل قرشیہ اسدیہ ہیں اور یہ ورقہ بن نوفل کی بھتیجی ہیں۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ غیر کے ذکر کو چھونا یا اپنے ذکر کو چھونے کی طرح ہے یعنی حکم ایک ہی ہے اس پر دلیل وہ روایت ہے جو ان الفاظ سے ہے :من مس ذکرا (فلیتوضا) یہ حدیث امام شافعیؒ کی دلیل ہے مس ذکر سے وضو ٹوٹنے کے مسئلہ میں اور لیکن یہ مقید ہے کہ جب ہتھیلی کے ساتھ بلا حجاب چھوئے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں :ای بباطن الکف جیسا کہ اس روایت سے اقتضاءً ثابت ہے: اذا افضی احدکم بیده الی فرجه اور افضاء کہتے ہیں باطن کف سے چھونا یعنی ہتھیلی اور انگلیوں سے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) افضاء اس معنی میں کتب لغت میں معروف نہیں ہے بلکہ مشہور اس کا معنی مطلقاً ایصال

(پہنچانا) ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : ﴿وَقَدْ أَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ﴾ [النساء: ۲۱] ''جبکہ تم ایک دوسرے کے ساتھ صحبت کر چکے ہو''۔

پھر امام طحاویؒ نے وضو کو اس جگہ ہاتھ کے دھونے پر استحباباً محمول کیا ہے۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن اور صحیح ہے اور امام بخاری محمد بن اسماعیلؒ فرماتے ہیں اس باب میں حدیث بسرہ اصح شئ ہے میرک شاہؒ نے اس کو ذکر کیا ہے۔

مس ذکر ناقض وضو نہیں

۳۲۰: وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيّ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ مَسِّ الرَّجُلِ ذَكَرَهٗ بَعْدَ مَا يَتَوَضَّأُ قَالَ وَهَلْ هُوَ اِلَّا بُضْعَةٌ مِّنْهُ (رواه ابوداود والترمذى والروى ابن ماجة نحوه) وَقَالَ الشَّيْخُ الْاِمَامُ مُحِيُّ السُّنَّةِ هٰذَا مَنْسُوْخٌ لِاَنَّ اَبَا هُرَيْرَةَ اَسْلَمَ بَعْدَ قُدُوْمِ طَلْقٍ وَقَدْ (رَوٰى اَبُوْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِذَا اَفْضٰى اَحَدُكُمْ بِيَدِهٖ اِلٰى ذَكَرِهٖ لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا شَيْءٌ فَلْيَتَوَضَّأْ (رواه الشَّافِعِيُّ والدارمي والدارقطني ورواه النسائي عن بسرة الا انه لم يذكر لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا شَيْءٌ) ۔

أخرجه أبوداود۔۱/۱۲۷حديث ۱۸۲۔ والترمذى ۱/۱۳۱حديث رقم ۸۵۔وقال أحسن شئى روي فى هذا الباب۔ وأخرج الترمذى نحوه ۱/۱۶۳حديث رقم ۴۸۳۔ وأخرجه أحمد فى المسند ۴/۲۲۔ أخرجه الشافعي فى مسنده (۱۲۔۱۳)وأخرجه الدارقطنى فى السنن ۱/۱۴۷حديث رقم ۶من باب ماروي فى لمس القبل والدبر وأحمد بمعناه فى المسند ۲/۳۳۳۔ ليس فى النسائى "اذا أفضى " انما ما أخرجه عن سيرة "اذ مس أحدكم ذكره ....." ۱/۱۰۰حديث رقم ۱۶۳۔

ترجمه: ''حضرت طلق بن علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ اگر کوئی آدمی وضو کرنے کے بعد اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگا لے تو اس کا کیا حکم ہے آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ شرم گاہ بھی آدمی کے گوشت کا حصہ ہے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ 'امام ترمذیؒ 'امام نسائی نے روایت کیا اور امام ابن ماجہ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے اور امام محی السنۃؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث منسوخ ہے اس لیے کہ حضرت ابو ہریرہؓ 'حضرت طلق ابن علی کے آنے کے بعد مسلمان ہوئے ہیں۔''

راویٔ حدیث:

طلق بن علی: یہ طلق بن علی ہیں۔جن کی کنیت ''ابو علی'' یمانی ہے۔ان کا تعلق قبیلہ ''بنو حنیفہ'' سے تھا۔ان کو ''طلق بن ثمامہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ان سے ان کے بیٹے ''قیس'' روایت کرتے ہیں۔''الاکمال'' میں ان کی نسبت ''یمامی'' ذکر کی ہے۔

تشریح: سئل رسول الله ﷺ عن مس الرجل ذكره بعد ما يتوضا :قال اوهل هوا لابضة : باء کے فتحہ کے ساتھ ای قطعة لحم ۔

منه: ای من الرجل اور ایک نسخہ میں **منك** ہے یعنی یہ باقی اعضاء کے چھونے کی طرح ہے پس یہ ناقض وضو نہ ہوگا۔

امام طحاویؒ نے حضرت علیؓ سے یہ اثر نقل کیا ہے، فرماتے ہیں میں نہیں پروا کرتا کہ میں نے اپنی ناک کو چھوا ہے یا کان کو یا ذکر کو اور عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے مجھے پروانہیں ہے کہ میں اپنی نماز میں ذکر کو چھولوں یا کان کو یا ناک کو اور بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اسی طرح مروی ہے۔ حضرت سعدؓ سے روایت ہے کہ جب ان کو مس ذکر کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: **ان كان شي منك نجسا فاقطعه ولاباس به** کہ اگر یہ تجھ میں سے نجس ہے تو اس کو کاٹ ڈالو اس چھونے میں کوئی حرج نہیں ہے اور حسنؓ سے روایت ہے کہ وہ مس ذکر کو ناپسند فرماتے تھے۔ پس اگر کوئی کرلے تو اس پر وضو کے قائل نہ تھے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ حق بات یہ ہے کہ دونوں حدیثیں درجہ حسن سے کم نہیں ہیں لیکن یہاں پر طلقؓ کی حدیث کو ترجیح دی جائے گی۔ اس لئے کہ حدیث الرجال وہ اقوی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ علم کے زیادہ یاد کرنے والے اور محفوظ کرنے والے ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے دوعورتوں کی گواہی کو ایک آدمی کی گواہی کے برابر رکھا گیا ہے اور امام طحاویؒ نے حدیث بسرہ کو ضعیف قرار دینے میں لمبا کلام کیا ہے۔ واللہ اعلم

قال الشيخ: اور ایک نسخہ میں واؤ کے ساتھ ہے۔

محی السنة رحمة لله هذا: ای ما رواه طلق

منسوخ لان ابا هريره اسلم بعد قدوم طلق: ای من اليمن۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اور یہ اس وجہ سے ہے کہ حضرت طلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مسجد نبوی کی تعمیر فرمارہے تھے اور یہ ہجرت کے پہلے سال میں تھا اور ابو ہریرہؓ ۷ ہجری کو خیبر والے سال مسلمان ہوئے۔

تقبیل امرأہ ناقض وضو ہے یا نہیں

۳۲۱ : رَوٰی اَبُوْ هُرَيْرَةُ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَفْضٰى اَحَدُكُمْ بِيَدِهٖ اِلٰى ذَكَرِهٖ لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا شَيْءٌ فَلْيَتَوَضَّأْ۔

أخرجه أبوداود ۱/۱۲۷حديث ۱۸۲۔ والترمذی ۱/۱۳۱حديث رقم ۸۵۔وقال أحسن شئي روي فی هذا الباب۔ وأخرج الترمذی نحوه ۱/۱٦۳حديث رقم ٤۸۳۔ وأخرجه أحمد فی المسند ٤/۲۲۔ أخرجه الشافعي فی مسنده (۱۲۔۱۳)وأخرجه الدارقطنی فی السنن ۱/۱٤۷حديث رقم ٦من باب ماروي فی لمس القبل والدبر وأحمد بمعناه فی المسند ۲/۳۳۳۔ ليس فی النسائی "اذا أقضی" انما ما أخرجه عن سيرة "اذ مس أحدكم ذكره ......" ۱/۱۰۰حديث رقم ۱٦۳۔

ترجمه: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ تم میں سے جو شخص اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگائے اور درمیان میں کوئی کپڑا نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وضو کرے اس حدیث کو امام شافعیؒ اور امام دار قطنی نے روایت کیا ہے۔''

اذكم بيده: ایٔ بكفه اور باء تعدیہ کیلئے ہے

تشریح:الی ذکرہ لیس بینہ وبینھا : ای بین ذکرہ وبین یدہ۔

شیٔ : ای مانع کپڑوں وغیرہ سے۔

حافظ عبدالحقؒ فرماتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے۔میرک شاہؒ نے اس کو ذکر کیا ہے۔

امام احمدؒ نے اس کے ہم معنی روایت کی ہے اور ابن حبان نے بھی۔تمام نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے۔

۳۲۲:رواہ الشَّافِعِیُ والدارمی والدارقطنی ورواہ النسائی عن بسرۃ الا انہ لم یذکر لَیْسَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَھَا شَیْءٌ)۔

ترجمہ: ''امام نسائی نے حضرت بسرہ سے یہ روایت نقل کی ہے لیکن اس میں لیس بینہ و بینھا شیء کے الفاظ نہیں ہیں۔

تشریح: وقد روی ابو ھریرۃ :اور ایک نسخہ میں عن ابی ہریرۃ ہے''

تورپشتی رحمۃ اللہ نے شیخ محی السنۃ احمد اللہ پر اعتراض کیا ہے کہ اس میں نسخ کا دعویٰ کرنا احتمال پر مبنی ہے اور یہ احتیاط سے خارج ہے مگر یہ کہ جب یہ قائل ثابت کرے کہ حضرت طلقؓ حضرت ابو ہریرہؓ سے پہلے وفات پا گئے تھے یا اپنے وطن لوٹ گئے ہوں اور اس کے بعد صحبت ان کے لئے باقی نہ رہی ہو اور اس قائل کو یہ معلوم نہیں ہے کہ حضرت طلقؓ نے اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہؓ کے اسلام لانے کے بعد سنا ہے۔

علامہ خطابیؒ نے معالم میں یہ بیان کیا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ مس ذَکر سے وضو کے قائل ہیں اور ابن معینؒ کا مذہب اس کے خلاف تھا اور اس میں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ناسخ اور منسوخ کے پہچاننے کا اس حدیث میں کوئی راستہ نہیں ہے۔علامہ طیبیؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے اور بعض نے علامہ خطابیؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ بے شک احمد بن حنبلؒ اور ابن معینؒ باوجودیکہ کہ یہ دونوں حدیث کی معرفت اور اسماء الرجال کی معرفت میں ہم پلہ اور جلالت شان میں برابر ہیں۔انہوں نے اس باب میں آنے والی روایات میں آپس میں بحث وکلام کیا۔تو ان دونوں کے کلام کو جو آخر میں نچوڑ نکلا وہ یہ تھا کہ دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ حدیث بسرہ اور حدیث طلق سے دلیل پکڑنا ٹھیک نہیں یعنی دونوں قابلِ احتجاج نہیں۔اس لئے کہ **اذا تعارضا تساقطا**۔ اور یہ واقعہ بھی واضح دلیل ہے اس پر کہ یہاں ناسخ منسوخ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں پس اس وقت احوط کو لینا یہ اولیٰ ہے اور ابن حجرؒ نے بھی علامہ طیبیؒ کی موافقت کی ہے۔لیکن اس میں یہ بات قابل غور ہے کہ اگر مراد لینے سے عمل ہے،تو اس پر کوئی اعتراض نہیں،اور اگر مراد اخذ سے وضو کے ٹوٹنے کا حکم ہے پس ہم اس کو احوط تسلیم نہیں کرتے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں ان روایات کے متعارض ہونے کے بعد ہم اقوالِ صحابہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔حضرت علیؓ ابن مسعودؓ ابوالدرداءؓ حذیفہؓ عمار رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ مس ذَکر ناقض للوضو نہیں ہے اور اس کو امام ابوحنیفہؒ نے لیا ہے اور حضرت عمرؓ ابن عمرؓ ابن عباسؓ سعد بن ابی وقاصؓ ابو ہریرہؓ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم وضو کے ٹوٹنے کے قائل ہیں اور اس کو امام شافعیؒ نے لیا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں میں کہتا ہوں کہ صحابہؓ کے اقوال بھی متعارض ہوئے تو یہ بھی قابل احتیاج نہ ہونگے اور اصل وضو

نہ ٹوٹتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ جو بطلان کے قائل ہیں ان کے قول کو احوط فی العمل پر محمول کیا جانا بھی ممکن ہے تو جب بطلان کے قول میں یہ احوط فی العمل کا احتمال آ گیا تو لہٰذا وہ دلیل نہیں بن سکتی واللہ اعلم بالحال۔ پھر امام مالکؒ کا صحیح مذہب اور امام احمدؒ کی ایک روایت یہ ہے کہ اگر شہوت کے ساتھ چھوا تو وضو ٹوٹ جاتا ہے ورنہ نہیں ٹوٹتا۔

۳۲۳: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَبِّلُ بَعْضَ اَزْوَاجِهٖ ثُمَّ يُصَلِّيْ وَلَا يَتَوَضَّأُ (رواه ابوداود والترمذى والنسائى وابن ماجة وقالَ الترمذى) لَايَصِحُّ عِنْدَ اَصْحَابِنَا بِحَالٍ اِسْنَادِ عُرْوَةَ عَنْ عَآئِشَةَ وَاَيْضًا اِسْنَادُ اِبْرَاهِيْمَ التَّيْمِيِّ عَنْهَا وَقَالَ ابوداود هذا مرسل وابراهيم التيمى لم يسمع عن عآئشة۔

أخرجه أبو داود ١/١٢٤ حديث رقم ١٧٩۔ والترمذى فى السنن ١/١٢٣ حديث رقم ٨٦۔وقال نقلاً عن علي بن المديني قال ضعف يحى بن سعيد القطان هذا الحديث وقال هوشبه لا شيء ۔ وقال سمعت محمد بن إسماعيل يضعف هذا الحديث ۔ وأخرجه النسائي فى السنن ١/١٠٤ حديث ١٧ وقال ليس فى هذا الباب أحسن منه۔ وأخرجه ابن ماجة ١/١٦٨ حديث رقم ٥٠٢۔وأحمد ٦/٢١٠۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک زوجہ کا بوسہ لیتے تھے۔ پھر بغیر جدید وضو کے نماز پڑھ لیتے تھے۔ اس حدیث کو امام ابو داؤدؒ امام ترمذیؒ امام نسائیؒ اور امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔''

امام ترمذیؒ: ترمذی نے کہا ہے کہ ہمارے علماء کے نزدیک عروہ کی سند حضرت عائشہ صدیقہؓ سے اور ابراہیم تیمی کی سند حضرت عائشہ سے صحیح نہیں ہے اور ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔ اسلئے کہ ابراہیم تیمی نے سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے یہ نہیں سنا۔

تشریح: وعن عائشةؓ قالت كان النبى صلی اللہ علیہ وسلم يقبل بعض ازواجه ثم يصلى ولا يتوضا۔

ابن الہمامؒ فرماتے ہیں بزار نے سند حسن سے اس کو روایت کیا ہے اور علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اس حدیث وہ حضرات استدلال کرتے ہیں کہ جو ملامست جس کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے یعنی: (اولمستم النساء) میں اس کا معنی جماع سے کرتے ہیں نہ کہ تمام بدن کے چھونے کے ساتھ مگر ابوداؤد نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور کہا ہے کہ یہ منقطع ہے اس لئے کہ ابراہیم تیمی کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سماع ثابت نہیں ہے اور مرسل کی کئی اقسام ہیں مرسل مطلق وہ ہوتی کہ جس میں تابعی یوں کہے: قال رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اور اسی کی ایک قسم کا نام منقطع بھی رکھا جاتا ہے اور وہ پہلے کے علاوہ ہوتی ہے اور اس کی ایک قسم معضل بھی ہے اور معضل وہ ہوتی ہے کہ ارسال کرنے والے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک سے زیادہ آدمی ہوں اور مظہرؒ فرماتے ہیں اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مس المرءة اس حدیث کی وجہ سے وضو کو باطل نہیں کرتا ہے اور شافعیؒ اور احمدؒ فرماتے ہیں اجنبیات عورتوں کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک مس بالشہوت سے وضو ٹوٹ جاتا ہے ورنہ نہیں۔

وقال الترمذی لایصح عند اصحابنا:ای من اهل الحدیث اومن الشافعیه (بحال)ای بای من احوال الطرق (اسناد عروة عن عائشة)۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں صحیحین میں عروہ کا سماع حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اتنی زیادہ مرتبہ ہے کہ شمار سے باہر ہے عروہ یہ حضرت عائشہ کے شاگرد تھے۔

وایضا:ای لایصح (اسناد ابراهیم التیمی عنها)ای عن عائشه ۔(وقال ابو داؤد :هذا مرسل) ای نوع مرسل۔یعنی یہ مرسل کی ایک قسم ہے اور وہ منقطع ہے لیکن ہمارے نزدیک اور جمہور کے نزدیک مرسل حجت ہے۔

وابراهیم التیمی لم یسمع عن عائشه۔ اور ایک نسخہ میں **من عائشه** ہے سید جمال الدین محدثؒ فرماتے ہیں یہ کلام کسی حال میں بھی درست نہیں ہے اس لئے کہ صحیحین میں عروہ کے سماع کا صحیح ہونا عائشہ رضی اللہ عنہا سے کثرت سے واقع ہوا ہے اور عروہ کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سماع میں علماء اسماء الرجال کو اعتراض کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور امام ترمذیؒ سے یہ بات بعید نظر آتی ہے کہ وہ ایسی بات کہیں، باوجود یہ کہ ان کی جامع ترمذی بھری پڑی ہے عروہ کے حضرت عائشہؓ سے سماع کے صحیح ہونے پر اور مصنف پر بھی یہاں تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے اس قول کی نسبت امام ترمذیؒ کی طرف کی ہے، حالانکہ یہ بات اس طرح ان کی کتاب میں اس حدیث کے لانے کے بعد نہیں ہے ان کی کتاب میں یوں ہے، کہ ہمارے اصحاب نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کو چھوڑا ہے اس لئے کہ ان کے نزدیک اس کی اسناد کسی حال کے ساتھ بھی صحیح نہیں ہے۔

میں نے ابوبکر عطار بصری سے سنا کہ وہ علی بن مدینیؒ کا ذکر کر رہے تھے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ سعید بن القطان نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور میں نے محمد بن اسماعیل بخاریؒ سے سنا کہ وہ اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں، اور امام بخاریؒ نے فرمایا ہے کہ حبیب بن ابی ثابت یعنی اس حدیث کے عروہ سے روایت کرنے والے ان کا سماع عروہ سے ثابت نہیں ہے اور تحقیق ابراہیم التیمی سے روایت کی گئی ہے وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں: **ان النبی ﷺ قبلها ولم یتوضا** اور یہ حدیث بھی صحیح نہیں ہے ہم ابراہیم تیمی کا حضرت عائشہؓ سے سماع نہیں پہچانتے اور اس باب میں حضور ﷺ سے کوئی صحیح حدیث منقول نہیں، یعنی کوئی مرفوع روایت نہیں ہے۔

پس مصنفؒ کو یہاں یہ وہم ہوا کہ انہوں نے امام ترمذیؒ کے اس قول کو **:لا یصح عندهم بحال الاسناد** سے **اسناد عروہ عن عائشه** سمجھ لیا، اور اس وہم کا منشا یہ ہے کہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کے دوسرے طریق کو معلل قرار دیا ہے اور وہ تیمی عن عائشہ کا طریق ہے کہ تیمی کا سماع حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت نہیں ہے۔اپنے اس قول کے ساتھ **:وهذ لا یصح ایضا ولا تعرف لابراهیم التیمی سماعا عن عائشه**۔ پس مصنف اس سے یہ سمجھے کہ طریق اولیٰ بھی وہ معلل ہے عروہ کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سماع نہ ہونے میں اور امام بخاریؒ کے نقل کردہ قول سے بھی غافل رہے، کیونکہ امام بخاریؒ کے قول سے جس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن ابی ثابت کا سماع عروہ سے معلل ہے نہ کہ عروہ کا سماع حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے۔ واللہ الموفق

اور سید جمال الدینؒ کے نیک بخت بیٹے میرک شاہؒ فرماتے ہیں اور یہ جو ہمارے زمانہ کے بعض محدثین نے دعویٰ کیا ہے

کہ یہ عروۃ' عروۃ بن الزبیر نہیں ہے بلکہ عروۃ المزنی ہے۔ اس دعویٰ کی کوئی حقیقت نہیں ہے اس لئے کہ امام بیہقی نے تصریح کی ہے کہ عروۃ بن الزبیر ہے اور امام بخاریؒ کا کلام بھی اس کی طرف مشعر ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس جگہ عروۃ سے اگر عروہ مزنی مراد ہو جیسا کہ بعض حفاظ حدیث نے کہا ہے، پس اس کا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سماع ثابت نہیں ہے اور اگر عروہ سے مراد عروۃ ابن الزبیر ہو اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے یعنی حضرت اسماء کے بیٹے تھے اور اس پر امام ترمذیؒ کا کلام دلالت کرتا ہے پس امام ترمذی نے امام بخاریؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اس لئے کہ حبیب بن ابی ثابت نے اس کو عروہ سے نقل کیا ہے اور حبیب کا سماع عروہ سے ثابت نہیں ہے، پس حدیث منقطع ہوگی۔

کھانے کے بعد ہاتھ صاف کر لینا چاہئے

۳۲۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَكَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كَتِفًا ثُمَّ مَسَحَ يَدَهٗ بِمِسْحٍ كَانَ تَحْتَهٗ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰى۔ (رواہ ابوداود وابن ماجۃ)

أخرجه أبو داود في السنن ١/١٣٢ حديث رقم ١٨٩۔ وابن ماجة ١/١٦٤ حديث رقم ٤٨٨۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بکری کے شانے کا گوشت کھایا۔ پھر اپنے ہاتھ نیچے بچھائی ہوئی ٹاٹ کے ساتھ صاف کر لئے پھر کھڑے ہوئے اور نماز پڑھی۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: اكل رسول الله ﷺ كتفا: کاف کے فتحہ اور تاء کے کسرہ کے ساتھ ابن الملک نے اسی طرح ضبط کیا ہے اور قاموس میں ہے کہ: كتف فرح مثل حبل کی طرح ہے اور مطلب یہ ہے کہ بھنی ہوئی بکری کی دست کا گوشت۔

ثم مسح يده بمسح: میم کے کسرہ کے ساتھ اى كساء۔

كان تحته: اى تحت رسول الله ﷺ۔

ثم قام فصلى: اى ولم يتوضا۔ یعنی وضو نہیں کیا۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں دلیل ہے اس پر کہ جس کو آگ نے چھوا ہو اس کے کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا (رواہ ابوداؤد) میرکؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث پر امام ابوداؤد اور منذری خاموش رہے ہیں۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور اس کی اصل صحیح بخاری میں ہے جیسا کہ گزرا اور اس حدیث میں یہ بات بھی ہے کہ کھانے کے بعد ہاتھ کے نہ دھونے میں کراہت نہیں ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ کپڑے سے صاف کرنے کے بعد اس سے کھانے کا اثر زائل ہو جائے۔

کھانے کے بعد وضو کرنا ضروری نہیں ہے

۳۲۵ :وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّهَا قَالَتْ قَرَّبْتُ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ جَنْبًا مَشْوِيًّا فَاَكَلَ مِنْهُ ثُمَّ قَامَ اِلَى الصَّلٰوةِ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ۔ (رواه احمد)

أخرجه أحمد في المسند ٦/٣٠٧۔ والترمذي في السنن ٤/٢٤٠ حديث رقم ١٨٢٩۔وقال حسن صحيح غريب من هذا الوجه۔

ترجمہ: ''حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے بکری کا روسٹ کیا ہوا پہلو پیش کیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس سے کھایا پھر نماز کے لیے کھڑے ہوگئے اور وضو نہیں کیا اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے''

مسند احمد، باقی مسند الانصار، حدیث ام سلمة زوج النبی ﷺ، ح ٢٥٤٠٥

تشریح: ولم يتوضا: یعنی وضو شرعی نہ لغوی یہ بیان جواز کیلئے کیا۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں اور اس کی سند حسن ہے۔

الفصل الثالث:

بات کو مضبوط کرنے کے لئے قسم اُٹھانا

۳۲۶ :عَنْ اَبِيْ رَافِعٍ قَالَ اَشْهَدُ لَقَدْ كُنْتُ اَشْوِيْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بَطْنَ الشَّاةِ ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٢٧٤ حديث رقم (٩٤۔٣٥٧)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے لئے بکری کے پیٹ کے اندر کی چیزیں دل، کلیجی وغیرہ بھونتا تھا اور آپ اس سے کھاتے۔ پھر نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے اور جدید وضو نہ کرتے۔ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قال :اشهد۔ ای اقسم بالله

لقد كنت اشوى: جب اشہد قسم کے معنی تھا تو اسی لئے لام تاکید جواب قسم قد میں داخل ہوا ہے، اور شہادت قسم کے معنی کو اس لئے شامل ہے کہ شہادة کہتے ہیں دِل کے زبان کے مطابق ہونے کی خبر دینا اور مدّعی کے ثبوت کا اعتقاد رکھنا اور اس حدیث میں اس دعویٰ کے اثبات کی دلالت ہے جو صحابہؓ کے درمیان اختلافی ہے۔

لرسول الله : ای لاكله (صلى الله وعليه وسلم بطن الشاة) یعنی جگر کلیجی، تلی دِل وغیرہ۔

ثم صلى۔ یعنی فاكل ثم صلى اور قیاس کا معنیٰ مقتضی تو یہ ہے کہ ثم یصلی ذکر کرتے۔ لیکن ماضی کا صیغہ لائے اس

لئے کہ ابورافع کا یہ قول کنت اشوی یہ ماضی کے معنی میں ہے اس لئے کہ یہ گزری ہوئی حالت کی صورت کا نقل کرنا ہے۔

اکابر کے سامنے نامناسب سوال سے توجہ الی اللہ میں فرق آ جاتا ہے

۳۲۷: وَعَنْهُ قَالَ اُهْدِيَتْ لَهٗ شَاةٌ فَجَعَلْنَا فِي الْقِدْرِ فَدَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ مَاهٰذَا يَا اَبَارَافِعٍ فَقَالَ شَاةٌ اُهْدِيَتْ لَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَطَبَخْتُهَا فِي الْقِدْرِ فَقَالَ نَاوِلْنِي الذِّرَاعَ يَا اَبَا رَافِعٍ فَنَاوَلْتُهُ الذِّرَاعَ ثُمَّ قَالَ نَاوِلْنِي الذِّرَاعَ الْآخَرَ فَنَاوَلْتُهُ الذِّرَاعَ الْآخَرَ ثُمَّ قَالَ نَاوِلْنِي الذِّرَاعَ الآخَرَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّمَا لِلشَّاةِ ذِرَاعَانِ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَمَّا اِنَّكَ لَوْ سَكَتَّ لَنَاوَلْتَنِيْ ذِرَاعًا فَذِرَاعًا مَاسَكَتَّ ثُمَّ دَعَابِمَاءٍ فَتَمَضْمَضَ فَاهُ وَغَسَلَ اَطْرَافَ اَصَابِعِهٖ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰى ثُمَّ عَادَ اِلَيْهِمْ فَوَجَدَعِنْدَهُمْ لَحْمًا بَارِدًا فَاَكَلَ ثُمَّ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَصَلّٰى وَلَمْ يَمَسَّ مَآءً۔ (رواه احمد)

أخرجه أحمد فى المسند٦/٣٩٢۔ ٣٢٨

ترجمہ: ”حضرت ابورافعؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میرے پاس بطور ہدیہ ایک بکری بھیجی گئی۔ چنانچہ میں نے اس کے گوشت کو پکانے کے لئے ہنڈیا میں ڈالا۔ اسی دوران رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور دریافت کیا اے ابورافع یہ کیا چیز ہے؟ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول بکری کا گوشت ہے۔ جو میرے لئے بطور ہدیہ کے لایا گیا تھا۔ اس کو میں نے ہانڈی میں ڈال کر پکایا ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے ابورافع ایک دست مجھے بھی دے دو چنانچہ میں نے ایک دست آپ کی خدمت میں پیش کر دیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا ایک اور دست دے دو۔ چنانچہ میں نے دوسرا دست بھی آپ کی خدمت عالیہ میں پیش کر دیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا ایک اور دست دے دو۔ میں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول بکری کے تو دو ہی دست ہوتے ہیں (اور وہ دونوں میں آپ کی خدمت اقدس میں پیش کر چکا ہوں) رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اے ابورافع اگر تم خاموش رہتے تو مجھ کو دست پر دست دیتے چلے جاتے۔ پھر آپ ﷺ نے پانی منگوایا۔ مضمضہ کیا۔ پھر انگلیوں کے پورے دھوئے اور کھڑے ہوئے پھر نماز پڑھی اور نماز کے بعد پھر ابورافع کے پاس تشریف لائے اور ان کے پاس ٹھنڈا گوشت دیکھا۔ چنانچہ آپ نے اس کو تناول کیا اس کے بعد مسجد میں تشریف لے گئے اور نماز شکر ادا کی اور پانی کو ہاتھ تک نہیں لگایا یعنی نہ مضمضہ کیا اور نہ ہی وضو کیا اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: وعنها ای عن ابی رافع۔

قال اهديت له' ای لابی رافع۔

شاة: یہ فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے بعض نے کہا ہے کہ اس میں صنعت التفات ہے (یعنی متکلم سے غائب کی طرف منتقل ہونا ہے) اور اظہر بات یہ ہے کہ انہوں نے معنی کے ساتھ نقل کیا ہے۔

فجعلها فی القدر: ای للطبخ۔

فدخل رسول الله ﷺ فقال ما هذا۔ ای ای شیء هذا الذی فی القدر۔

یا ابا رافع۔ اس کو ہمزہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور لکھا نہیں جاتا۔

فقال شاة اهديت لنا يا رسول الله فطبختها فى القدر فقال ناولنى الذراع۔ ناولنی یہاں یاء کے فتحہ کے ساتھ اور یاء کے سکون کے ساتھ دونوں طرح جائز ہے۔

یا ابا رافع۔ فناولته الذراع ۔قاموس المحیط میں ہے (ذراع کسرہ کے ساتھ ہے) کہنی کے کنارے سے لے کر ہاتھ کی بیچ والی انگلی تک کو ذراع کہتے ہیں اور باز وکو بھی ذراع کہتے ہیں اور ذراع ان دونوں معنوں میں مذکر مستعمل ہے۔

ثم قال ناولنى الذراع الاخر فناولته' الذراع الاخر ثم قال ناولنى الذراع الاخر: ذراع : دستی کے گوشت سے محبت کی وجہ سے آپ ﷺ نے بار باراس کو طلب کیا کہ بدن کو اس کے ساتھ اپنے مولا کی عبادت پر تقویت ملے گی اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضوری میں مکمل استغراق ہو گا کہ دل میں اس کے سوا اور کچھ نہ کھٹکے۔

فقال: ای ابو رافع بطور التفات کے یہ کہا یا **قال قائل** کی تقدیر پر۔

يا رسول الله انما للشاة ذراعان۔ اور ترمذی کی ایک روایت میں ہے **وكم للشاة من ذراع**؟ اور ظاہر اس مقام میں یہ ہے کہ یہ استفہام استبعاد کی وجہ سے ہے نہ کہ انکار کی وجہ سے کیونکہ انکار اس مقام کے مناسب نہیں ہے۔

فقال له رسول الله ﷺ اما۔ یہ مخفف ہے اور تنبیہ کیلئے ہے۔

انك: اِن کسرہ کے ساتھ ہے۔

لو سكت :ای عما قلت لی ۔یعنی خاموش رہتا اور میرے ادب کو ملحوظ رکھتا۔

لناولتنى ذراعا فذراعا ماسكت۔ ای ما سكت انت وطلبت انا۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں **فذراعا**: میں فاء تعاقب کیلئے ہے جیسا کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد میں ہے :**الامثل فالا مثل** اور **ماسكت** میں لفظ **مامدت** کیلئے ہے اور معنی یہ ہے کہ تو مجھے ذراع کے بعد ذراع دیتا رہتا الی مالانهايه جب تک کہ تو خاموش رہتا پس جب تو بول پڑا تو وہ ختم ہو گئیں۔

اور ترمذی کی روایت میں ہے **ما دعوت ای ما طالبت** یہ دعوۃ سے ہو گا۔ جو فتح کے ساتھ ہے معنی یہ ہے **مدة دوام طلبه** کہ جب تک آپ طلب کرتے رہتے اس لئے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ جو چاہے پیدا فرما سکتے ہیں اور وہ حضور ﷺ کے معجزہ اور کرامت کے اظہار کے واسطے دستی کے بعد دستی پیدا کر سکتے تھے اور حضور ﷺ نے ابورافع کو اس لئے بات کرنے سے منع فرمایا کیونکہ ان کے کلام کی وجہ سے حضور ﷺ کی اپنے ربّ کی طرف توجہ ہٹ کر اس کی طرف یا ان کے سوال کے جواب کی طرف ہو گئی۔ واللہ اعلم

ثم دعا بماء فتمضمض فاه: ای حرك ماء فمه اور ایک نسخہ میں **فمضمض** ہے۔قاموس میں ہے **المضمضة تحريك الماء فى الضم وتمضمض اللوضؤ مضمض**۔مضمضہ منہ میں پانی کے ہلانے کو کہتے ہیں اور تمضمض وضو کیلئے کلی کرنا۔

وغسل اطراف اصابعه: یعنی جو چکناہٹ وغیرہ ہاتھوں پر لگی ہوئی تھی ان کو بقدر حاجت دھویا تکبیر کہنے کے ارادے پر نہیں دھویا۔

ثم قام فصلى ثم عاد اليهم: اى الى ابى رافع واهل بيته۔

فوجد عندهم لحما باردا فاكل۔ اس لئے کہ آپ ﷺ گوشت کو پسند فرماتے تھے اور ہمیشہ وہ آپ ﷺ کیلئے میسر بھی نہ ہوتا تھا۔ ترمذی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ ذراع (دستی کا گوشت) آپ ﷺ کی کوئی مرغوب غذا نہ تھی، بلکہ آپ ﷺ نہ پاتے تھے گوشت مگر کبھی کبھی تو آپ ﷺ دستی کے گوشت کی طرف جلدی کرتے تھے۔ اس لئے کہ وہ گوشت میں سے سب سے جلدی پک جاتا ہے۔

ثم دخل المسجد۔ یعنی معاش سے فراغت کے بعد معاد یعنی (آخرت) کے حصول میں کوشش کی طرف متوجہ ہوئے۔

فصلى: یعنی اللہ کا شکریہ ادا کیا

لم يمس ماء۔ اى للوضوء نہ وضو کیلئے اور نہ ہی نماز سے پہلے منہ دھونے کے لے۔

۳۲۸: رَوَاهُ اَحْمَدُ وَرَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ اَبِيْ عَبَيْدٍ اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يَذْكُرْ ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ اِلٰى آخِرِهٖ۔

أخرجه أحمد فى المسند۶/۳۹۲۔ ۳۲۸

ترجمہ: ''اور اس حدیث کو امام دارمیؒ نے بھی روایت کیا ہے ابو عبید سے۔ مگر ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ سے آخر تک کے الفاظ کو ذکر نہیں کیا۔''

۳۲۹: وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كُنْتُ اَنَا وَاُبَيٌّ وَاَبُوْطَلْحَةَ جُلُوْسًا فَاَكَلْنَا لَحْمًا وَخُبْزًا ثُمَّ دَعَوْتُ بِوَضُوْءٍ فَقَالَا لِمَ تَتَوَضَّأُ فَقُلْتُ لِهٰذَا الطَّعَامِ الَّذِيْ اَكَلْنَا فَقَالَا اَتَتَوَضَّأُ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَمْ يَتَوَضَّأْ مِنْهُ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنْكَ. (رواه احمد)

مسند احمد' كتاب اوّل مسند المدنيين اجمعين' حديث ابى طلحة زيد بن سهل الانصارى عن النبیؐ' ح ۱۵۷۷۰

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں اور ابی بن کعبؓ اور ابو طلحہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے گوشت اور روٹی کھائی۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے وضو کے لئے پانی منگوایا حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت ابو طلحہؓ نے کہا۔ تم وضو کیوں کرتے ہو؟ میں نے کہا اس کھانے کی وجہ سے جو میں نے ابھی کھایا ہے۔ ان دونوں نے کہا کیا پاکیزہ چیزوں کے کھانے سے وضو کرتے ہو۔ ان چیزوں کو کھا کر اس شخص نے وضو نہیں کیا جو تم سے بہتر ہیں (یعنی رسول کریم ﷺ) اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: صاحب مشکوٰۃؒ نے فرمایا ہے کہ ابو طلحہ یہ ابو طلحہ زید بن سہل انصاری نجاری ہیں اور کنیت کے ساتھ مشہور ہیں یہ انس بن مالک کی والدہ کے خاوند ہیں اور یہ مشہور تیر اندازوں میں سے تھے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: **لصوت ابى طلحة فى الجيش خير من فئة۔** ابو طلحہ کی لشکر میں آواز ایک جماعت کی آواز سے بہتر ہے۔ ۳۱ ہجری میں ان کا انتقال ہوا اس وقت ان کی عمر ۷۷ سال تھی۔ اہل بصرہ ان کے بارے ہیں کہتے ہیں کہ جہاد کیلئے سمندر میں انہوں نے سفر کیا اور سمندر ہی میں ان کا انتقال ہوا، ۹ دن کے بعد ایک جزیرہ میں ان کو دفن کیا گیا۔ بیعت عقبہ میں ستر صحابہؓ کے ساتھ حاضر ہوئے اور پھر بدر اور

اس کے بعد ہونے والے غزوات میں شریک ہوئے۔ صحابہ میں ایک جماعت نے ان سے روایت کی ہے۔

جلوسا۔ ای جالسين ۔

فاكلنا لحما و خبزا۔ واؤ مطلق جمع کیلئے ہے۔

ثم دعوت بوضو۔ واؤ کے فتحہ کے ساتھ ای طلبت ماء الوضو۔

فقالا۔ ای ابی و ابو طلحة ۔

لم تتوضا؟ فقلت لهٰذا الطعام الذی اکلنا : یعنی گوشت، روٹی کیونکہ یہ آگ پر پکی ہوئی ہیں۔

فقالا اتتوضا من الطيبات؟ اس حدیث سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ وضو کا ٹوٹنا وہ ایسی خبیث چیز کی وجہ سے ہوتا ہے جو وضو کے منافی ہو جیسا کہ سبیلین سے نکلنے والی نجاست اور یہ معنی معقولی ہے اور اس کے معنی میں خون، پیپ، قئی کا نکلنا ہے۔ ہمارے نزدیک اور اس کے علاوہ کو اس کے ساتھ ملا دیا جائے گا اور اگر وہ معنی معقولی نہیں جیسا کہ نیند، بے ہوشی، جنون، نشہ وغیرہ تو یہ اس لئے ناقض ہیں کہ ان میں کوئی خبیث چیز کے نکلنے کا اندیشہ ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ہم نے کہا ہے قہقہے سے وضو ٹوٹنے کے مسئلہ میں کہ یہ خلافِ قیاس ہے اس کو اس کے مورد پر ہی بند رکھا جائے گا۔

لم يتوضا منه۔ ای من مثل هذا الطعام۔

من هو خير منك ۔ ایٔ النبی ﷺ اور خلاصۂ کلام یہ ہے کہ موجب عقل اور نقل دونوں اعتبار سے منفی ہے۔

تقبیل اور مس امرأۃ کا حکم

۳۳۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا كَانَ يَقُوْلُ قُبْلَةُ الرَّجُلِ امْرَاَتَهٗ وَجَسُّهَا بِيَدِهٖ مِنَ الْمُلَامَسَةِ وَمَنْ قَبَّلَ امْرَأَتَهٗ اَوْ جَسَّهَا بِيَدِهٖ فَعَلَيْهِ الْوُضُوْءُ . (رواه مالك و الشافعي)

أخرجه مالك في الموطأ ۱/۴۳ كتاب الطهارة حديث رقم ٦٤ ـ والشافعي في مسنده (ص ۱۱)۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مرد اپنی عورت کا بوسہ لے یا اس کو ہاتھ لگائے تو یہ بھی ملامست ہے اور جس آدمی نے اپنی بیوی کا بوسہ لیا یا ہاتھ لگایا تو اس پر وضو واجب ہے اس حدیث کو امام مالک اور امام شافعیؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: امرأتهٗ: مفعولیت کی بناء پر منصوب ہے۔

وجسها: جیم کے ساتھ اور سین کی تشدید کے ساتھ ای مسها (بیده من الملامسة) ای المذكورة فی قوله تعالى : اولمستم النساء [مائدة: ۷] (ومن قبل امرئته اوجسها بيده) پس تحقیق اس نے ملامست کی، اور جس نے ملامست کی۔

فعليه الوضو: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ من قبل سے ابن عمر ؓ نے ماقبل بیان کی ہوئی اصل پر تفریع بیان کی ہے یعنی جب بوس و کنار اور چھونا یہ ملامست میں سے ہے، تو پس جس نے بوسہ لیا یا چھوا اس پر وضو لازم ہوگا اور اس کو ترتیب دینا سامع

کے ذہن کی طرف سپرد کیا گیا ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔ کہ مذکورہ تقریر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بہتر تو اس جگہ پر فاء کو لانا ہے نہ کہ واؤ کو یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول و من قبل میں لیکن فاء کو سامع کے ذہن پر بھروسہ کرتے ہوئے چھوڑ دیا گیا ہے اور سامع کے ادنیٰ التفات سے اس ترتیب کو حاصل کرنے کی وجہ سے۔

۳۳۱:وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ كَانَ يَقُوْلُ مِنْ قُبْلَةِ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ الْوُضُوْءُ . (رواه مالك)

موطا مالك' كتاب الطهارة' باب ان عبد الله بن مسعود كان يقول من قُبلة الرجل

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں منقول ہے وہ فرماتے تھے کہ جب مرد اپنی بیوی کا بوسہ لے تو اس پر وضو لازم ہے اس حدیث کو امام مالکؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: امراء ته: یہ منسوب ہے اس بناء پر کہ قبلہ کا مفعول ہے اس لئے کہ قبلہ اسم مصدر ہے۔

الوضوء: مبتدا مؤخر ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں **ای یجب منها الوضو** کہ اس سے وضو واجب ہے مبتدا معرفہ پر خبر کا مقدم کرنا یہ اختلاف کے ہونے کی خبر دیتا ہے اور اس پر رد کرنا ہے جو یہ کہتا ہے، کہ بوسہ اور چھونے کا حکم تمام دوسرے نواقض کی طرح نہیں ہے۔ پس اس سے انکار کر دیا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں قصر قلب ہے عبارت یوں ہو گی: **لیس حکمه الا کحکمها** کہ نہیں ہے تقبیل و مس کا حکم مگر نواقض وضو کے حکم کی طرح۔

۳۳۲:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ إِنَّ الْقُبْلَةَ مِنَ اللَّمْسِ فَتَوَضَّؤُا مِنْهَا۔

رواهما الدارقطنی

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے۔ کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ عورت کا بوسہ لینا لمس میں داخل ہے۔ جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے لہٰذا بوسہ لینے کے بعد وضو کیا کرو۔

تشریح: ان القبله من اللمس: ای المذکور فی الایة۔

فتوضا وامنها: یہ تمام کی تمام احادیث بعض صحابہ کی موقوف روایات ہیں۔ ان میں سے جنہوں نے لمس کو ناقض مانا ہے اور یہ مرفوع کے حکم میں نہیں ہے اس لئے کہ رائے کی اس میں وسعت و گنجائش ہے ساتھ ساتھ یہ بھی احتمال ہے کہ نقض وضو کے قول کو استحباب پر محمول کیا جائے احتیاط کی وجہ سے اور مجتہد کیلئے جائز ہے کہ وہ صحابہ کے اقوال میں جس کو چاہے اختیار کرے خصوصاً جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی وضو کا نہ ٹوٹنا نقل کیا گیا ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث گزری ہے۔ اور اصل تخصیص کا نہ ہونا ہے باوجودیکہ کہ امام شافعیؒ مجتہد کیلئے صحابی کی تقلید کو ضروری نہیں سمجھتے۔

دَمِ سائل سے وضو

۳۳۳:وَعَنْ عُمَرَبْنِ عَبْدِالْعَزِيْزِعَنْ تَمِيْمِ الدَّارِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْوُضُوْءُ مِنْ كُلِّ دَمٍ سَائِلٍ. (رواهما الدارقطنی وقال عمربن عبدالعزيز لم يسمع من تميم الداری ولا رآه ويزيد بن خالد

ويزيد بن محمد مجهو لان).

ترجمہ: حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ حضرت تمیم داریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر بہنے والے خون سے وضولازم ہے۔

اسنادی حیثیت: ان دونوں کی روایتوں کودار قطنی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ عبداللہ بن عبدالعزیز نے نہ تو تمیم داری سے سنا ہے اور نہ ہی ان کو دیکھا ہے اور نیز یہ کہ اس روایت کے دوراوی یزید بن خالد اور یزید بن محمد مجہول ہیں۔

راویٔ حدیث:

تمیم الداری۔ یہ تمیم بن اوس الداری ہیں اور یہ ابو رُقَيَّة (تصغیر کے ساتھ) تمیم بن خارجہ صحابی ہیں پہلے نصرانی تھے۔ پھر ۹ھ میں اسلام قبول کیا۔

مستوق عبادت:

یہ ایک رکعت میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے اور کبھی ایک ہی آیت کو تمام رات بار بار پڑھتے پڑھتے صبح کر دیتے تھے۔ محمد بن المنکدر نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ تمیم داری رات کو صبح تک سوتے رہے اور تہجد کے لئے نہیں اٹھے۔ تو اپنے نفس کو اس غفلت کی سزا دینے کے لئے ایک سال تک تمام رات نوافل پڑھتے رہے اور بالکل نہیں سوئے۔ مدینہ میں رہتے تھے۔ پھر حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد شام میں اقامت گزیں ہو گئے اور وقت وفات تک وہیں رہے۔ سب سے پہلے مسجد میں انہوں نے چراغ جلایا۔ نبی ﷺ سے ان سے دجال اور جساسہ کا قصہ بیان کیا ہے اور ان سے بہت لوگوں نے اس کی روایت کی۔ ان کی روایات کی تعداد اٹھارہ ہے۔ صحیحین میں ان سے صرف ایک حدیث: الدين النصيحة...... منقول ہے۔ داری اپنے دادا کی طرف منسوب ہیں کیونکہ ان کے داداؤں میں سے ایک کا نام دار تھا دار کی طرف منسوب ہے علامہ طاہر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں "الداری" الدار بن ہانی ان سے سن کر بن جیب کی طرف منسوب ہے۔ (المغنی فی صبط السماء الرجال۔ ص ۱۰۳)

یہ عمر بن عبدالعزیز بن مروان بن الحکم: یہ عمر بن عبدالعزیز بن مروان بن الحکم ہیں۔ ان کی کنیت ابوحفص ہے، اموی قریشی ہیں، ان کی ماں ام عاصم بنت عمر بن الخطاب ہے، اور ان کا نام لیلیٰ ہے، ابوبکر بن عبدالرحمٰن سے انہوں نے روایت کی ہے اور امام زہریؒ اور ابوبکر بن حزم نے ان سے روایت کی ہے۔ سلیمان بن عبدالملک کے بعد ان کو خلافت سونپی گئی ۹۹ ہجری میں اور ان کی وفات ۱۰۱ ہجری میں رجب کے مہینے میں حمص کے علاقے دیر سمعان میں ہوئی۔ ان کی خلافت کی مدت دو سال اور کچھ ماہ ہے اور عمر ان کی چالیس سال ہوئی۔ بعض نے کہا ہے کہ چالیس سال پورا نہیں کئے تھے۔

دورِ خلافت اور زہد و تقویٰ:

یہ زہد، عبادت، تقویٰ، عفت اور اچھی سیرت میں اعلیٰ کمال کو پہنچے ہوئے تھے خصوصاً اپنے دورِ خلافت میں۔ بعض نے کہا ہے کہ جب ان کو خلافت دی گئی تو ان کے گھر سے چیخ و پکار سنی گئی، پس جب اس بلند آواز سے رونے کے متعلق پوچھا گیا تو لوگوں نے کہا بے شک عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنی باندیوں کا اختیار دے دیا ہے، پس یہ کہا ہے کہ مجھے ایسی ذمہ داری ملی ہے جو تم میں

مشغولیت سے میرے لئے مانع ہے۔ لہٰذا جو آزادی کو پسند کرے تو میں اس کو آزاد کرتا ہوں اور جو رکنا چاہے تو میں روکتا ہوں لیکن میرے لئے اس کی طرف کوئی رغبت نہ ہوگی۔

عقبہ بن نافع نے ان کی بیوی فاطمہ بنت عبدالملک سے پوچھا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے بارے میں کچھ بتائیں تو فرمانے لگیں کہ میں نہیں جانتی کہ انہوں نے جنابت کی وجہ سے یا احتلام کی وجہ سے غسل کیا ہو جس وقت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو خلیفہ بنایا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی وفات ہو گئی اور وہ فرماتی ہیں کہ لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہوں گے کہ جو عمر بن عبدالعزیزؒ سے نماز‘ روزے کے اعتبار سے زیادہ ہوں، لیکن میں نے لوگوں میں سے کسی کو کبھی اتنا زیادہ اپنے ربّ سے ڈرتے ہوئے نہیں دیکھا جیسے عمر بن العزیز کو دیکھا۔ پس آپؒ جب گھر تشریف لاتے تو اپنی مسجد میں چلے جاتے یعنی گھر میں جو عبادت کی جگہ بنائی تھی۔ پس روتے رہتے اور اللہ سے دعائیں مانگتے رہتے یہاں تک کہ آپ پر نیند غالب آ جاتی پھر بیدار ہوتے اور اس طرح ساری رات کرتے رہتے۔ ان کے مناقب بہت زیادہ ہیں جو کہ ظاہر ہیں۔

وہب ابن منبہ نے فرمایا کہ اگر اس امت میں کوئی مہدی ہے تو وہ عمر بن عبدالعزیز ہیں۔ ان کے مناقب بہت اور ظاہر ہیں۔

تشریح: **الوضوء من کل دم سائل: ای الی ما یجب تطهیره** ۔یعنی اس جگہ میں بہہ جائے جس کا پاک کرنا ضروری ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔

دوسری حدیث کو ابن عدی نے اپنی کتاب کامل میں روایت کیا ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ سے اسی طرح شمنی نے اس کو ایک دوسرے طریق سے بھی ذکر کیا ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں ہم اس حدیث کو نہیں جانتے مگر احمد بن فروخ کے طریق سے اور احمد بن فروخ ان راویوں میں سے ہے کہ جن کی حدیث تو حجت نہیں ہے۔ لیکن حدیث کو اس سے لکھا جاتا ہے۔ بے شک لوگوں نے ان کی حدیث کو لیا ہے اس کے ضعیف ہونے کے باوجود۔ اھ۔ لیکن ابن ابی حاتم نے کتاب العلل میں فرمایا ہے، تحقیق ہم نے ان سے روایات لکھی ہیں اور ہمارے نزدیک اس کا محل سچائی ہے۔

ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کیلئے بخاری کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت موید و معاون ہے۔ کہ جس میں یہ ہے : **جاء ت فاطمه بنت حبیش الیه علیه الصلاة والسلام وقالت یا رسول الله اتی امراة استحاض فلا اطهر افادع الصلوٰة؟ قال لا انما ذلك عرق ولیست بالحیضة فاذا اقبلت الحیضة فدعی الصلوٰة فاذا ادبرت فاغسلی عنك الدم۔** ”فاطمہ بنت؟ حبیش حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں کہنے لگیں اے اللہ کے رسول! میں ایسی عورت ہوں کہ جس کو استحاضہ کی بیماری ہے کہ میں نماز چھوڑ دیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں یہ تو رگ کے پھٹنے کی وجہ خون آتا ہے یہ حیض نہیں ہے، پس جب حیض آ جائے تو نماز کو چھوڑ دے اور جب حیض ختم ہو جائے تو خون کو اپنے سے دھو دے“۔

ہشام بن عروہ فرماتے ہیں میرے والد فرماتے ہیں : **ثم توضی لکل صلوٰة حتی یجی ذلك الوقت ای وقت الحیض**۔ یعنی پھر تو ہر نماز کی لئے وضو کر یہاں تک یہ حیض کا وقت آ جائے اور یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ثم توضی یہ عروہ کا کلام ہے تو اس کا رد یہ ہے کہ یہ بات ظاہر کے خلاف ہے کیونکہ امام ترمذیؒ نے اس کو روایت کہا ہے۔ انہوں نے اس کو اس پر محمول نہیں کیا

ہے۔ترمذیؒ کے الفاظ یہ ہیں :وتوضی لکل صلوٰۃ حتی یجیٔ ذلك الوقت اوراس کو صحیح بھی قرار دیا ہے اور جو قطنی نے حدیث نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سینگی لگوائی اور نماز پڑھی، وضو نہیں کیا اور سینگی لگائی ہوئی جگہوں کے علاوہ مزید اور کسی کو نہیں دھویا۔ یہ ضعیف ہے۔ یہ محقق ابن الہمامؒ کا کلام ''ہدایہ کی شرح'' میں ہے۔ واللہ اعلم

خواجہ عصام الدین کی ''شرح ھدایۃ ہدایہ'' میں ہے۔ باقی حدیث کا مرسل ہونا تو یہ ہمارے نزدیک طعن نہیں ہے اس لئے کہ بے شک ہم مراسل کو قبول کرتے ہیں۔ ابھریؒ نے اس کو ذکر کیا ہے اور ابن الہمام کی ''ھدایۃ ہدایہ کی شرح'' میں ہے مراسل ہمارے اور جمہور کے نزدیک صحبت ہیں۔ و یزید بن خالد ۔ویزید بن محمد مجھو لان۔ میرک شاہؒ فرماتے ہیں یعنی جو دو راوی عمر بن عبدالعزیز سے نقل کرنے والے ہیں۔ سمعانیؒ فرماتے ہیں یہ دونوں ضعیف اور مجہول ہیں۔

ابن الہمامؒ فرماتے ہیں دار قطنی نے اس کو ضعیف طریق سے روایت کیا ہے اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ اس کا ایک اور طریق ہے اور وہ یہ کہ ابن عدی نے اپنی کتاب ''کامل'' میں اس کو روایت کیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ مذہب کی بنیاد اس حدیث پر نہیں ہے بلکہ وہ بخاری شریف کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث پر ہے جیسا کہ اس کا پہلے تذکرہ ہوا ہے۔

بَابُ اٰدَابِ الْخَلَاءِ

قضائے حاجت کے آداب کا بیان

الفصل الاول:

مسئلہ استقبال واستدبار قبلہ

۳۳۴:عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَتَیْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوْهَا وَلٰكِنْ شَرِّقُوْا اَوْغَرِّبُوْا (متفق علیه) قَالَ الشَّیْخُ الْاِمَامُ مُحِیُّ السُّنَّةِ رَحِمَهُ اللّٰهُ هٰذَا الْحَدِیْثُ فِی الصَّحْرَآءِ اَمَّا فِی الْبُنْیَانِ فَلَا بَاْسَ لِمَارُوِیَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۴۹۸/۱ حدیث رقم ۳۹۴۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ۲۲۴/۱ حدیث رقم (۵۹۔۲۶۴) وأبو داوٗد فی السنن ۱۹/۱ حدیث رقم ۹۔ وأخرج الترمذی فی السنن ۱۳/۱ حدیث رقم ۸ وأخرجه النسائی فی السنن ۲۱/۱۔۲۲ حدیث ۲۰۔۲۱۔وأخرجه ابن ماجة بمعناه ۱۱۵/۱ حدیث رقم ۳۱۸۔ وأحمد فی المسند ۴۱۷/۵۔

ترجمہ:''حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم بیت الخلاء میں جاؤ تو قبلہ کی طرف منہ نہ کرو بلکہ اپنا رخ مشرق اور مغرب کی طرف کرو۔ (بخاری ومسلم) حضرت امام محی السنۃؒ فرماتے ہیں کہ یہ جنگل کا حکم ہے۔ بنیان (آبادی) میں استقبال واستدبار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

راویٔ حدیث:

ابوایوب الانصاری۔ یہ ابوایوب ہیں۔خالد بن زید انصاری خزرجی عقبہ اوراس کے بعد والے غزوات میں شرکت کی جب نبی علیہ السلام نے ہجرت کی تو ان کے ہاں پڑاؤ ڈالا اور ان کے ہاں ایک مہینہ قیام فرمایا اور یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ تمام محاربات میں شریک رہے اور افواج کی پہرہ داری کرتے ہوئے قسطنطنیہ میں ۵۱ھ میں وفات ہوئی اور یہ اس وقت یزید بن معاویہ کے ساتھ تھے جب کہ ان کے والد (حضرت معاویہؓ) قسطنطنیہ میں جہاد کررہے تھے تو ان کے ساتھ (شریک جہاد ہونے کے لئے گئے) اور بیمار ہوگئی پھر جب بیماری کا ثقل بڑھ گیا تو اپنے اصحاب کو وصیت فرمائی کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو میرے جنازے کو اٹھالینا۔ پھر جب تم دشمن کے سامنے صف بستہ ہو جاؤ تو مجھے اپنے قدموں کے نیچے دفن کردینا۔ تو لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی قبر قسطنطنیہ کی چہار دیواری کے قریب ہے جو آج تک مشہور ہے۔ جو باعث تعظیم سمجھی جاتی ہے اور اس کے وسیلے سے بیمار لوگ خدا سے شفا چاہتے ہیں تو شفا پاتے ہیں۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہیں۔''قسطنطنیہ'' میں قاف مضموم اور سین ساکن پہلی طاء مضموم اور دوسری طاء مکسور اور اس کے بعد یاء ساکنہ ہے۔ نووی فرماتے ہیں کہ ان حروف کو ہم نے اس طرح منضبط کیا ہے اور یہی مشہور ہے اور قاضی عیاض مغربی نے مشارق میں بہت لوگوں سے نقل کیا کہ اس میں بعد نون کے یاء مشدّدہ بھی ہے۔

تشریح: قسطنطنیہ یہ قاف کے ضمہ سین کے سکون طاء اولی کے ضمہ دوسری طاء کے کسرہ اور اس کے بعد یاء ساکن کے ساتھ ہے۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں ہم نے اس کو اسی طرح ضبط کیا ہے اور یہی مشہور ہے۔ قاضی عیاض مغربی نے (مشارق) میں اکثر حضرات سے نون کے بعد یاء مشدد کی زیادتی کو نقل کیا ہے۔

اذا اتیتم الغائط: ای جئتم وحضرتم موضع قضاء الحاجة۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ غائط اصل میں زمین کی نشیبی جگہ کو کہتے ہیں اور اسی وجہ سے قضاء حاجت کی جگہ کو غائط کہا گیا، اس لئے کہ انسان عادۃً نشیبی جگہ میں قضائے حاجت کرتا ہے۔ کیونکہ وہ زیادہ باپردہ ہوتی ہے۔ پھر غائط کے لفظ میں مزید وسعت کی گئی یہاں تک کہ اس کا اطلاق اس چیز پر ہونے لگا جو آدمی کے بدن سے نکلتی ہے یعنی حال کا نام محل کے نام سے رکھا گیا۔

فلا تستقبلوا القبلة: ای جهة الكعبة۔ اس کی تعظیم کی وجہ سے۔

ولا تستدبروها: اس کے شرف واکرام کیلئے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں پس ان دونوں میں سے ہر ایک جنگل اور آبادی میں قضاء حاجت کی حالت میں حرام ہے اور اعتبار سینے کے ساتھ ہے اس حکم سے مستثنیٰ نہیں ہوگی مگر وہ جگہ جو قضائے حاجت کیلئے بنائی گئی ہو آبادی میں اور جنگل میں اس کے اندر مطلقاً حرمت نہیں ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی آنے والی حدیث کی وجہ سے لیکن اگر اس کو بلا مشقت قبلہ سے انحراف ممکن ہو تو پھر پھرنا افضل ہے۔

ولکن شرقوا اوغربوا۔ ای توجهوا الی جهة الشرق او الغرب۔

''شرح السنۃ'' میں ہے کہ یہ خطاب اہل مدینہ کیلئے ہے اور ان کے لئے جن کا قبلہ اس سمت میں ہے باقی وہ لوگ جن کا قبلہ مشرق یا مغرب کی جانب ہے پس وہ شمال اور جنوب کی جانب پھرے گا۔

''جامع صغیر'' میں روایت یوں ہے:

اذاأتى احدكم الغائط فلا يستقبل القبلة ولا يولها ظهره شرقوا او غربوا۔

اس روایت کو امام احمدؒ نے اور بخاری ومسلم نے اور اصحابِ سنن نے ابوایوبؓ سے روایت کیا ہے۔

قال الشيخ الامام محيى السنة رحمة الله :هذا الحديث :اى حكمه (في الصحراء):

یعنی شافعیہ کے نزدیک۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں اور اسی طرح آبادی میں بیت الخلاء کے علاوہ۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں امام شافعیؒ اور ایک جماعت نے ذکر کیا ہے کہ صحراء وہ خالی نہیں ہوتے کسی نماز پڑھنے والے سے خواہ وہ فرشتہ ہو یا انسان یا جن، پس جب یہ قبلہ رخ بیٹھے گا یا قبلہ کی طرف پیٹھ کرے گا تو بسا اوقات نمازی کی نظر اس کی شرمگاہ پر پڑ سکتی ہے اور باقی بیت الخلاء میں ایسا نہیں ہوتا کیونکہ ان میں سوائے شیاطین کے اور کوئی حاضر نہیں ہوتا۔

واما في البنيان۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں یعنی بیت الخلاء تا کہ یہ بات مطابق ہو جائے اس حدیث کے جس سے مصنف استدلال کر رہے ہیں۔ (**فلا باس**) مظہر فرماتے ہیں یہ امام شافعی کا مسلک ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں جنگل اور آبادی کا حکم استقبال استدبار کی حرمت میں برابر ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ حکم اس لئے برابر ہے کیونکہ علت دونوں میں ایک ہی ہے اور وہ قبلہ کا احترام۔ (**لماروى**) اور بہتر یہ تھا کہ یوں کہتے: **لما رواه عبدالله**۔ ابہریؒ فرماتے ہیں۔ اس عبارت میں مسامحت ہے کیونکہ حدیث صحیح ہے یعنی: رُوِیَ کا غالب استعمال حدیث ضعیف میں ہی ہوتا ہے۔

۳۳۵ :عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ ارْتَقَيْتُ فَوْقَ بَيْتِ حَفْصَةَ لِبَعْضِ حَاجَتِيْ فَرَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْضِيْ حَاجَتَهٗ مُسْتَدْبِرَ الْقِبْلَةِ مُسْتَقْبِلَ الشَّامِ . (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١/٤٩٨ حديث رقم ٣٩٤۔وأخرجه مسلم في صحيحه ١/٢٢٤ حديث رقم (٥٩۔٢٦٤) وأبو داؤد في السنن ١/١٩ حديث رقم ٩۔ وأخرج الترمذي في السنن ١/١٣ حديث رقم ٨ وأخرجه النسائي في السنن ١/٢١۔٢٢ حديث ٢٠۔٢١۔وأخرجه ابن ماجة بمعناه ١/١١٥ حديث رقم ٣١٨۔ وأحمد في المسند ٥/٤١٧۔

''حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں کسی کام کے لئے اپنی بہن حفصہ کے گھر کی چھت پر چڑھا۔ تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو بیت الخلاء میں قضاء حاجت کرتے ہوئے دیکھا۔ آپ کا استدبار قبلہ کی طرف اور استقبال شام کی طرف تھا۔''

(بخاری ومسلم)

تشریح: ابن الملکؒ فرماتے ہیں یہ شیخ کا مذہب ہے اور یہ مذہب اس لئے مدفوع ہے کہ حدیث کا عموم اثر کے ساتھ خاص نہیں ہوتا۔ (ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) یہ بات بھی ضعیف ہے اس لئے کہ اثر وہ مرفوع ہے۔

قال ارتقيت۔ اى صعدت۔

فوق بيت حفصة۔ اىُ سطحه اور یہ راوی حدیث کی بہن ہیں اور حفصہ حضور ﷺ کی زوجہ مطہرہ ہیں۔

لبعض حاجتي۔ قضائے حاجت کیلئے چڑھے تھے، یا اور کسی حاجت کے واسطے۔

فرایت رسول الله ﷺ يقضي حاجته۔ ای فی الخلاء جیسا کہ اس پر دوسری روایت دلالت کرتی ہے۔

مستدبر القبلة۔ اس استدبار میں یہ جواب دینا ممکن ہے کہ یہ عمل نہی سے پہلے کا ہو یا اس وقت کوئی عنصر ہو جس کی وجہ سے استدبار قبلہ ہوا یا اس لئے کہ حضور ﷺ کے حق میں یہ کوئی حرج نہ تھا خصوصاً حالت استغراق میں۔

مستقبل الشام۔ ای بیت المقدس۔ ابن الملکؒ نے کہا ہے۔

ان دونوں کے الفاظ یہ ہیں: مستدبر القبلة مستقبل الشام۔ ابن حجر کو یہاں وہم ہوا ہے انہوں نے کلام کو بدل دیا ہے اور اصل حدیث میں یوں لکھا ہے: مستقبل القبله مستدبر الشام۔ پھر اس جملہ پر تفریع بیان کی ہے اور یوں کہا ہے: کہ جب استقبال قبلہ بیت الخلا میں قضائے حاجت کی حالت میں جائز ہے تو استدبار بطریق اولی جائز ہوگا۔ ابن حجرؒ کی یہ غلطی واضح ہے اور تفریع بیان کرنا اس اصل پر وہ صحیح نہیں ہے۔ اس بات کو غور سے سمجھ لو اور تحقیق بعض علماء نے فرمایا ہے کہ استقبال ممنوع ہے نہ کہ استدبار۔ شاید کہ ان حضرات کا اس مسئلہ میں مأ خذ وہی حدیث ہو۔

ہڈی اور گوبر کے ساتھ استنجاء منع ہے

۳۳۶: وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ نَهَانَا يَعْنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ بِغَائِطٍ اَوْ بَوْلٍ اَوْ اَنْ نَسْتَنْجِيَ بِالْيَمِيْنِ اَوْ اَنْ نَسْتَنْجِيَ بِاَقَلَّ مِنْ ثَلَاثَةِ اَحْجَارٍ اَوْ اَنْ نَسْتَنْجِيَ بِرَجِيْعٍ اَوْ بِعَظْمٍ۔

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم في الصحيح ١/٢٢٣ حديث (٥٧-٢٦٢) وأبو داوٗد ١/١٧ حديث رقم ٧ والترمذي ١/٢٤ حديث رقم ١٦۔ وروى نحوه النسائي ١/٣٨ حديث رقم ٤١۔ وأحمد في المسند ٥/٤٣٩۔

ترجمہ: حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع کیا ہے اس سے کہ ہم بول و براز کے وقت قبلہ کی طرف رخ کریں اور دائیں ہاتھ کے ساتھ استنجاء کرنے سے بھی منع کیا ہے اور استنجاء بالاحجار کی صورت میں تین پتھروں سے کم پتھر استعمال کرنے سے منع کیا ہے۔ ہڈی اور گوبر کے ساتھ استنجاء کرنے سے بھی منع کیا ہے اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

نام و نسب: یہ سلمان فارسی ہیں۔ ان کی کنیت ''ابوعبداللہ'' ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ ہیں۔ فارس الاصل تھے۔ ''رام ہرمز'' کے رہنے والوں میں سے تھے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ ''اصفہان'' کے مضافات میں ایک گاؤں ''جَی'' نامی ہے وہاں کے رہنے والے تھے۔

راہِ حق کی تلاش:

دین کی طلب میں سفر کیا اور سب سے پہلے مذہب نصاریٰ اختیار کیا اور ان کی کتابیں دیکھیں اور اس دین پر پے در پے

مشقتیں برداشت کرتے ہوئے رکے رہے قوم عرب نے ان کو گرفتار کر لیا اور یہودیوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ پھر انہوں نے یہودیوں سے مکاتبت کر لی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدل کتابت میں ان کی امداد فرمائی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سلیمان فارسی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو دس سے زائد آقاؤں کے غلام رہ کر پہنچے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہیں اور یہ بھی انہیں میں سے ہیں کہ جن کے قدم کی جنت الفردوس متمنی ہے۔

عمر مبارک:

ان کی عمر بہت زیادہ ہوئی کہا جاتا ہے کہ ڈھائی سو سال اور بعض روایتوں میں ساڑھے تین سو سال کی عمر ہوئی، لیکن پہلا قول صحیح ہے۔

اپنے ہاتھوں سے روزی کماتے تھے اور صدقہ بھی کیا کرتے تھے۔ انتہائی ممدوح اور ''مجمع الفضائل'' صحابی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی تعریف میں متعدد احادیث منقول ہیں ۳۵ھ میں شہر مدائن میں انتقال ہوا۔ ابو ہریرہ اور انس رضی اللہ عنہما وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں ''فارسی'' میں راء پر کسرہ اور سکون دونوں طرح درست ہے۔

تشریح: قال نهانا۔ یعنی: یرید سسلمان بالناهي۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بے شک راوی نے حضرت سلمان کی طرف سے یہ بات کہی اس لئے کہ صحابی ہیں اور اس طرح کا اطلاق غیر نبی پر نہیں کرتا۔ پس گویا کہ انہوں نے بذات خود اس کی تصریح کی ہے پس فرمایا ہے: **نهانا رسول الله** صلی اللہ علیہ وسلم۔

ان نستقبل القبلة بغائط او بول: ہمارے علماء نے فرمایا ہے کہ بول و براز کے وقت استقبال قبلہ مکروہ تحریمی ہے اور استنجاء کے وقت مکروہ تنزیہی۔

او ان نستجي: ابن الملک فرماتے ہیں اَوْ اس جگہ اور بعد والے جملوں میں عطف کیلئے ہے اور ایک نسخہ میں یہاں پر واؤ ہے اور باقی اس کے بعد والوں جملوں میں اتفاقاً اَو ھی ہے اور اَوْ تنویع کیلئے ہے۔ ''فائق'' میں لکھا ہے کہ استنجاء کہتے ہیں نجاست کا کاٹنا اور یہ ماخوذ ہے: **نجوت الشجرة وانجاها واستنجاها ای قطعها من الارض** سے (**باليمين**) یہ نہی تنزیہی ہے ابن الملک نے ہی فرمایا ہے۔

او ان تستنجي باقل من ثلاثه احجار۔ مظہر فرماتے ہیں دائیں ہاتھ سے استنجاء کرنے کی نہی مکروہ تنزیہی اور کراہت پر محمول ہے نہ کہ مکروہ تحریمی پر اور تین پتھروں کے ساتھ استنجاء کرنا امام شافعی کے ہاں واجب ہے اگر چہ صفائی اس سے کم کے ساتھ بھی حاصل ہو جائے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مقصود انقاء محل ہے نہ کہ عدد متعین۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے: **من استجمر فليوتر من فعل فقد احسن ومن لا فلا حرج** تو امر استحباب کیلئے ہے اور نہی کراہت تنزیہی کیلئے ہے۔

او ان نستجي برجيع: اس کی نجاست کی وجہ سے یہ فعیل مفعول کے معنی میں ہے اور رجیع سے مراد گوبر گندگی وغیرہ ہے اس لئے کہ وہ لوٹتی ہے یعنی طہارت کی حالت سے نجاست کی حالت کی طرف لوٹتی ہے اور ہر مردود رجیع ہے۔

او بعظم: علامہ خطابی فرماتے ہیں استنجاء مردار کی ہڈی کے ساتھ یا مذبوح کی ہڈی کے ساتھ جائز نہیں ہے۔ بعض نے کہا

ہے کہ نہی کی علت وہ ہڈی کا ملائم ہونا ہے، پس وہ نجاست کو زائل نہیں کرے گی اور بعض نے کہا ہے کہ نہی کی علت وہ اس ہڈی کا چوسنا یا چبانا ہے ضرورت کے وقت اور بعض نے کہا ہے کہ علت وہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے: **ان العظم زاد اخوانكم من الجن**۔ یعنی وہ جنات اس ہڈی پر پہلے سے زیادہ گوشت پاتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ بسا اوقات ہڈی زخمی کر دیتی ہے اس لئے منع فرمایا ہے۔

ابوداؤد، دارقطنی، بیہقی نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ روایت کی ہے: **نهى ان يستنجى احد بعظم او روثة او حممة اى فحم حممه** سے مراد کوئلہ ہے۔

دخولِ خلاء کے وقت دُعا پڑھنے کا حکم

۳۳۷: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ . (متفق عليه)

أخرجه البخارى فى صحيحه ١/٢٤٢حديث رقم ١٤٢۔ ومسلم فى صحيحه ١/٢٨٢۔حديث (١٢٢۔٣٧٥) وأبوداوٗد فى السنن ١/١٥حديث رقم ٤۔والترمذى ١/١٠حديث رقم ٥والنسائى ١/٢٠حديث رقم ١٩۔ وابن ماجة فى السنن ١/١٠٩حديث رقم ٢٩٨۔والدارمى ١/١٨٠حديث رقم ٦٦٩وأحمد فى المسند ٣/٩٩۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب بیت الخلاء میں داخل ہوتے تھے یعنی جب داخل ہونے کا ارادہ کرتے تو یہ دعا پڑھتے تھے: ((اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ)) اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں مذکر اور مؤنث جنات سے۔ (بخاری و مسلم)''

تشریح: **اذا دخل الخلاء۔ اى اذا اراد دخول الخلاء**۔ یعنی جب بیت الخلاء جانے کا ارادہ کرے اور ابھری کی ''شرح'' میں ہے کہ شیخ نے فرمایا ہے جو اس حالت میں اللہ کے ذکر کو ناپسند سمجھتا ہے تو وہ اس کی تفصیل یوں بیان کرتا ہے۔ کہ بہر حال وہ جگہیں جو قضائے حاجت کیلئے بنائی گئیں ہوں ان میں دعاء داخل ہونے سے تھوڑا پہلے پڑھے گا اور ان کے علاوہ قضائے حاجت میں شروع ہونے سے پہلے پڑھے گا مثلاً کپڑے اکٹھے کرتے وقت اور یہ جمہور کا مذہب ہے اور جمہور نے کہا ہے کہ جو بھول جائے تو دِل میں اس استعاذہ کو پڑھ لے، زبان سے نہ کہے اور جو حضرات مطلقاً جائز قرار دیتے ہیں جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہے تو وہ اس تفصیل کے محتاج نہیں ہیں۔

يقول اللهم انى: یاء کے سکون کے ساتھ اور فتحہ کے ساتھ دونوں طرح جائز ہے۔

اعوذبك من الخبث: یہ باء کے ضمہ اور سکون کے ساتھ خبیث کی جمع ہے اور وہ جن اور شیطان میں سے تکلیف دینے والے مراد ہیں۔

والخبائث: خبیثہ کی جمع ہے یعنی مذکر شیاطین سے اور مؤنث سے اور بیت الخلاء میں داخل ہونے سے قبل اس دعاء کے پڑھنے کو خاص طور پر اس لئے بتلایا کہ شیاطین وہ بیت الخلاؤں میں حاضر ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں اللہ کے ذکر کو ترک کیا جاتا ہے

اور بعض نے کہا ہے کہ خبث باء کے سکون کے ساتھ کفر یا شر یا گناہ یا مطلقاً ناپسندیدہ شئی کے معنی میں ہے اور خبائث سے مراد مذموم افعال بے کار قسم کی عادات گمراہ کن عقائد اور گھٹیا احوال ہیں۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے الخبث باء کے سکون کے ساتھ مصدر ہے: خبث الشيء يخبث خبثا سے ہے اور علامہ خطابیؒ کے تمام ان الفاظ میں کہ جن کو راویوں نے روایت کیا ہے غلطی پر مبنی کہنا قابل نظر ہے اس لئے کہ خبیث کی جمع جب لائی جائے گی تو اس میں باء کو ساکن کرنا جائز ہے تخفیف کی خاطر جیسا کہ سبل وغیرہ جمعوں میں اور یہ عربوں کے کلام میں مشہور ہے اس کا انکار جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ یہ گمان کریں کہ ترک تخفیف وہ زیادہ بہتر ہے تا کہ کہیں اس کا خبث مصدر سے اشتباہ نہ آجائے (تو پھر ان کی بات محل کلام نہ ہوگی) احمد نے اور اصحاب سنن اربعہ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے۔

قبروں پر پھول چڑھانے کا حکم؟

۳۳۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ بِقَبْرَيْنِ فَقَالَ اِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِيْ كَبِيْرٍ اَمَّا اَحَدُهُمَا فَكَانَ لَايَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ لَا يَسْتَنْزِهُ مِنَ الْبَوْلِ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَكَانَ يَمْشِيْ بِالنَّمِيْمَةِ ثُمَّ اَخَذَ جَرِيْدَةً رَطْبَةً فَشَقَّهَا بِنِصْفَيْنِ ثُمَّ غَرَزَ فِيْ كُلِّ قَبْرٍ وَاحِدَةً قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ لِمَ صَنَعْتَ هٰذَا فَقَالَ لَعَلَّهٗ اَنْ يُّخَفَّفَ عَنْهُمَا مَالَمْ يَيْبَسَا۔ (متفق عليه)

أخرجه البخارى فى صحيحه ٣١٧/١حديث رقم ٢١٦۔ وأخرجه مسلم ٢٤٠/١حديث رقم (١١١-٢٩٢) وأبو داوٗد ٢٥/١حديث رقم ٢٠۔ وأخرجه الترمذى فى السنن ١٠٢/١حديث رقم ٧٠۔ وأخرجه النسائى فى السنن ٢٨/١حديث رقم ٣١۔وابن ماجة مختصرًا فى السنن ١٢٥/١حديث رقم ٣٤٧۔والدارمى ٢٠٥/١ حديث رقم ٧٣٩۔وأحمد فى المسند ٢٢٥/١۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے۔تو آپ نے انہیں دیکھ کر فرمایا کہ ان دونوں قبروں میں قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے اور عذاب بھی کسی بڑی چیز کی وجہ سے نہیں ہو رہا۔ان میں سے ایک تو پیشاب سے نہیں بچتا تھا اور مسلم شریف کی ایک روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ ان میں سے ایک پیشاب سے احتیاط نہیں کرتا تھا اور دوسرا چغل خور تھا۔ پھر آپ نے کھجور کی تر شاخ لی۔اس کو درمیان سے چیر کر دو حصوں میں تقسیم کیا ایک حصہ ایک قبر پر گاڑ دیا اور دوسرا حصہ دوسری قبر پر گاڑ دیا۔صحابہ کرامؓ نے یہ عمل دیکھ کر سوال کیا۔اے اللہ کے رسول آپ ﷺ نے ایسا کیوں کیا آپ ﷺ نے فرمایا شاید کہ اس عمل سے ان کے عذاب میں اس وقت تک تخفیف رہے جب تک یہ شاخیں خشک نہ ہوں۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: مر النبی ﷺ بقبرین فقال انهما: ای صاحبی القبرین (ليعذبان) ابہریؒ نے فرمایا ہے کہ هُما ضمیر کو غیر مذکور کی طرف لوٹایا ہے اس لئے کہ سیاق کلام اس پر دلالت کر رہا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابن عباسؓ نے معنیٰ کے ساتھ نقل کیا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ مضاف کا مقدر ماننا عربوں کے کلام میں کوئی پیچیدہ امر نہیں ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں لام (لیعذبان) میں تاکید کیلئے ہے اور لام تاکید اس صورت میں صحیح ہوگا جب کہ اس کے بعد جواب قسم محذوف ہو اور اِن کی خبر بھی محذوف ہو۔ (ملاّ علی قاریؒ) فرماتے ہیں یہ بات کمزور ہے اس لئے کہ اِنّ کی خبر کو محذوف جاننے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی باوجود یہ کہ جملہ قسمیہ کو اِنّ کی خبر بنانے میں کوئی مانع بھی نہیں ہے۔

وما یعذبان فی کبیر۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کا ارشاد (فی کبیر) یہ واضح دلیل ہے کہ فی تعلیل کے لئے آ سکتا ہے۔ بعض حضرات نے اس جملے کی تشریح یوں فرمائی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ایسے معاملے میں عذاب نہیں ہو رہا تھا، کہ جس سے بچنا ان کے واسطے مشکل اور گراں تھا ورنہ تو اگر مشکل ہو تو اس صورت میں یہ معذور ہوتے جیسا کہ سلسل البول کی بیماری والا اور مستحاضہ یا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیز میں ان کو عذاب نہیں ہو رہا تھا کہ جس کو لوگ بڑا جانتے ہوں اور اس پر جرأت نہ کرتے ہوں، پس ان دونوں پر پیشاب کے وقت چھینٹوں سے بچنا اور چغلی چھوڑنا کوئی قابل مشقت کام نہ تھا اور یہاں یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ ان دونوں امور میں شریعت کا حکم ہلکا ہے بڑا نہیں ہے۔

''نہایہ'' میں لکھا ہے کہ یہ امر دین میں کیسے برا نہیں ہوگا حالانکہ اسی میں (کوتاہی کی وجہ سے) ان کو عذاب ہو رہا ہے۔ ابن حجرؒ نے بھی اسی قول کی پیروی کی ہے۔ (ملاّ علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ اس میں یہ بات بھی قابل غور رہے کہ صغائر پر عذاب دیا جانا بھی ممکن ہے جیسا کہ یہ بات عقائد میں ثابت شدہ ہے معتزلہ اس کی مخالفت کرتے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ صغائر پر عذاب نہیں ہوگا)۔ پس بہتر یہ ہے کہ ان دونوں گناہوں کے کبیرہ ہونے پر حضور ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا جائے جو ایک روایت میں ہے: **بلی انهما کبیران عند الله**۔

اَمَّا ام احدهما فکان لا یستترو من البول: **یستتر استتار** سے ہے اس بات کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ علامہ بغویؒ شرح السنۃ یہ حدیث: **باب الاستتار عند قضاء الحاجة** میں لے کر آئے ہیں اور ایک صحیح نسخہ میں **لا یستنتر** ہے۔ اشرفؒ نے غریب الفاظ کی شرح میں اور نہایہ میں یہ بات کہی ہے کہ:

یستنتر: دو تاؤں کے درمیان نون کے ساتھ ہے اور اس کا معنی ہے بار بار کھینچنا۔ لیثؒ فرماتے ہیں کہ نتر کہتے ہیں ایسا کھینچنا جو زور کے ساتھ ہو۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہی اس لفظ کے معنی کے موافق ہے نہ کہ استنثار اور اس پر شیخ محی الدینؒ کا کلام آگے آئے گا اور ایک دوسری روایت میں **لا یستتر** ہے اور وہ غلط ہے۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ اس تشریح میں یہ بات محل غور ہے کہ استنثار اور استبراء یہ جمہور کے ہاں سنت ہے اور لوگوں کے سامنے ستر کھولنا تمام کے ہاں حرام ہے اور مقام بھی عذاب دینے کا ہے کیونکہ یہ کبیرہ گناہ ہے جیسا کہ ابھی گزرا ہے پس یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ معنی کے موافق ہے نہ کہ استتار اور یہ کہ استتار یہ غلط ہے حالانکہ یہ اکثر کی روایت ہے اور امام بغویؒ اس کو باب الاستتار میں لے کر آئے ہیں اور نیز یہ احادیث میں بار بار کھینچنے کے معنی میں بالکل معروف نہیں ہے بلکہ سختی کے ساتھ ذکر کو کھینچنا یہ اس کے لئے نقصان دہ ہے اور تھکا دینے والے وساوس کا باعث ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ یہ عقل و دین سے خارج ہے (تو صحیح ہوگا)۔ پھر ابن حجر کو وہم ہوا ہے اس مقام پر انہوں نے کہا ہے کہ یہ لفظ **یستبری** کے ساتھ ہے اور اسی کو اصل بنایا ہے اور اس کے علاوہ کا ذکر تک بھی نہیں کیا ہے حالانکہ یہ بخاری و مسلم کی اصل نہیں ہے یہ تو ابن عساکر کی روایت ہے اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے اصل نسخہ کی طرح

ہے: لا یستتر من البول۔

عبدالعزیز الابہریؒ فرماتے ہیں کہ اکثر روایات میں دو ''تاؤں'' کے ساتھ ہے پہلی مفتوح اور دوسری مکسور ہے اور ابن عساکر کی روایت میں لا یستبری باء ساکن کے ساتھ استبراء سے ہے اور مسلم کی ایک روایت میں لا یستنزہ نون ساکن اور اس کے بعد زاء اور ھاء کے ساتھ ہے۔ شیخ محی الدینؒ نے فرمایا ہے اکثر کی روایت کی بناء پر استتار کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے اور پیشاب کے درمیان کوء پردہ وغیرہ نہیں کرتا یعنی اس سے بچتا نہیں، پس یہ معنی لا یستنزہ کے موافق ہو جائے گا اس لئے کہ یہ تنزہ سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہے دور کرنا۔ یہ بہترین تطبیق ہے اور اس کا مال پیشاب سے حفاظت نہ کرنا ہے جو کہ اکثر بطلانِ صلوٰۃ کا سبب ہے اور بطلانِ صلوٰۃ یہ کبیرہ گناہ ہے۔ میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے ارشادفرمایا: عامة عذاب القبر من البول استنز هوا من البول: ''اکثر عذابِ قبر پیشاب کی وجہ سے ہوگا لہٰذا پیشاب کے (چھینٹوں وغیرہ) سے احتیاط کرو''۔

بزار نے اور طبرانی نے الکبیر الاوسط میں اور حاکم نے اور دارقطنی نے اس کو روایت کیا ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضورﷺ نے فرمایا: تنز هوا عن البول فان عامة عذاب القبر من البول۔ دارقطنی نے اس کو روایت کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا: اکثر عذاب القبر من البول۔ اس روایت کو احمد، ابن ماجہ، حاکم نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ ابن ماجہؒ کی روایت کے ہیں امام حاکمؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے شیخین کی شرط پر حضرت ابوامامہؓ سے روایت کہ حضورﷺ نے ارشادفرمایا: اتقوا البول فانه اول ما یحاسب به العبد فی القبر۔ کہ پیشاب سے بچو بیشک قبر میں پہلے اسی کے بارے میں حساب لیا جائے گا۔ طبرانی نے کبیر میں اس کو روایت کیا ہے ایسی سند کے ساتھ جس میں کوئی حرج نہیں۔

واما الاخر فکان یمشی بالنمیمة: مراد وہ شخص ہے جو ان دو شخصوں میں سے ہر ایک کی طرف جائے جن کے درمیان عداوت ہو یا وہ جو ان کے درمیان دشمنی ڈال دے بایں طور کہ ایک کا دوسرے کو گالی گلوچ دینا بتلائے جس سے ان کے درمیان دشمنی پڑ جائے۔ امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ نمیمہ کہتے ہیں دوسرے کی بات کو نقصان پہنچانے کے ارادے سے نقل کرنا اور یہ قبیح ترین عادت ہے۔

جریدة رطبة: فائق میں لکھا ہے کہ جریدہ کھجور کی خشک ٹہنی کو کہتے ہیں جس سے پتے اتار لئے گئے ہوں۔

فشقها بنصفین: ای جعلها مشقوقة حال کونها ملتبسةً بنصفین۔ اصح بات یہ ہے کہ نصفین مفعولِ مطلق ہے حال نہیں اور ''باء'' زائد ہے تاکید کیلئے۔ (ان یخفف) مجہول کے صیغہ کے ساتھ (یعنی بضم الباء وفتح الفاء) اور ایک نسخہ میں فاء کے کسرہ کے ساتھ ہے تو پھر دونوں ضمیریں اللہ کے طرف راجع ہونگی یا گاڑنے کی طرف مجازاً اور اَن کا لَعل کے خبر میں داخل کرنا یہ اس کے عسی کے ساتھ مشابہت کی بناء پر ہے۔

عنهما: صحیح روایت تثنیہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں عنها ہے۔ مالکیؒ فرماتے ہیں عنها مفرد مؤنث کی ضمیر یہ نفس کی

طرف راجع ہے پس لعله و عنها میں دونوں ضمیروں کو میت کی طرف لوٹانا جائز ہے میت کی دو حیثیتوں کے اعتبار سے اور وہ اس کا انسان ہونا اور نفس ہونا ہے (یعنی لعلہ کی ضمیر انسان کے اعتبار سے اور عنها کی ضمیر نفس کے اعتبار سے) اور یہ بھی جائز ہے کہ اول ضامیر شان ہو اور عنها میں ضمیر نفس کی طرف راجع ہو اور ضمیر شان کی تفسیر انْ اور اس کے صلہ کے ساتھ کرنی جائز ہے اور عنهما تثنیہ والی روایت اس تاویل کی متقاضی نہیں ہے۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

ابن حجرؒ نے عجیب بات کی ہے کہ ابن مالک کی روایت کو صحیح روایت کی اصل قرار دیا ہے۔ حالانکہ صحیح نسخوں میں اس طرح نہیں ہے۔ پھر اور بھی قابل تعجب بات یہی کہی کہ تثنیہ کی صورت میں ضمیر شان ہی متعین ہوگی اور یہ بھی صحیح ہے کہ ضمیر مبہم ہو اور مابعد اس کی تفصیر کر رہا ہو جیسا کہ: ﴿وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ﴾ [الجاثیه: ٢٤] ''اور کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے کہ (یہیں) مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہے اور ان کو اس کا کچھ علم نہیں صرف ظن سے کام لیتے ہیں'' میں ہے۔ اس آیت کی اصل یہ ہے ما الحیاة....... پھر اس کو ضمیر کے ساتھ بدل دیا گیا خبر کی اس ابہام و تفسیر پر دلالت کی وجہ سے۔ (ملا علی قاریؒ) فرماتے ہیں پہلی بات کہ ضمیر شان ہونا متعین ہے یہ ٹھیک نہیں ہے جیسا کہ بات گزر چکی ہے بلکہ یہاں تو اس کی صحت میں ضمیر مفرد کی روایت سے بھی زیادہ تکلف کی طرف احتیاجگی ہوتی ہے اور اسی طرح ابہام اور تفسیر والی بات میں بھی تکلف ہے۔ حالانکہ یہ بات تو وہاں کی جاتی ہے جہاں ضمیر کا کوئی مرجع موجود نہ ہو، پس حدیث مذکور اس آیت کی نظیر نہیں ہو سکتی۔

مالم ییبسا۔ صیغہ مذکر کے ساتھ **ای مادام لم ییبس النصفان او القضیبان**۔ اور مؤنث کے صیغہ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے: **ای الشقتان او الجریدتان**۔ امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ باقی حضور ﷺ کا دونوں ٹہنیوں کو قبر پر رکھنا تو بعض محدثینؒ نے اس کے بارے میں یہ کہا ہے کہ حضور ﷺ نے ان قبر والوں کیلئے شفاعت کا سوال کیا تھا۔ پس آپ ﷺ کی دعا قبول ہوئی عذاب میں تخفیف کی صورت میں جب تک کہ یہ ٹہنیاں خشک نہ ہوں۔ امام مسلمؒ نے کتاب کے آخر میں حضرت جابرؓ کی حدیث میں یہ نقل کیا ہے: **ان صاحبی القبرین اجیبت شفاعتی فیهما' ای برفع ذلك عنهما مادام القضیبان رطبین**۔

بعض حضرات نے یوں تشریح کی ہے کہ آپ ﷺ ان کے لئے اس مدت کے درمیان دعا کرتے تھے اس وجہ سے تخفیف ہوئی۔ بعض محدثینؒ نے فرمایا ہے کہ تخفیف اس لئے ہوئی کہ وہ ٹہنیاں جب تک تر رہتی ہیں تسبیح کرتی رہتی ہیں۔ اکثر مفسرین نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾ [الاسراء: ٤٤] کا معنی **ان من شیء حی** سے کیا ہے اور پھر فرمایا ہے کہ ہر چیز کی حیات اس کے مطابق ہے۔ پس لکڑی کی حیات خشک ہونے تک ہے اور پتھر کی جب تک کہ اس کو کاٹا نہ جائے اور محققین یہاں آیت میں عمومیت مراد لیتے ہیں اور تسبیح کو اس کی حقیقت پر محمول کرتے ہیں اس لئے کہ مراد اس سے صانع کے وجود پر دلالت ہے۔

علماء نے قبر کے پاس قرآنِ پاک کی تلاوت کو اس حدیث کی وجہ سے مستحب قرار دیا ہے اس لئے کہ تلاوتِ قرآن زیادہ تخفیفِ عذاب کا سبب ہے بنسبت تر ٹہنیوں کی تسبیح کے اور امام بخاریؒ نے ذکر کیا ہے کہ بریدہ بن الحصیب اسلمیؓ صحابی نے وصیت کی تھی کہ ان کی قبر پر دو ٹہنیاں گاڑی جائیں، پس گویا کہ انہوں نے حضور ﷺ کے عمل کی طرح برکت کو حاصل کرنا چاہا ہے

اورعلامہ خطابیؒ نے لوگوں کے اس فعل کا انکار رد کیا ہے کہ جو قبروں پر پتے اور پھول وغیرہ ڈالتے ہیں اور فرمایا ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور اس حدیث میں عذابِ قبر کا اثبات ہے جیسا کہ اہل حق کا مذہب ہے اور اس حدیث میں ابوال کی نجاست کا ثبوت ہے اور چغل خوری کا حرام ہونا بالخصوص لفظ کان یمشی سے اس کو ذکر کرنا جو کہ استمرار پر دلالت کرتا ہے اور نیز یہ مسئلہ بھی حدیث سے ثابت ہے کہ پیشاب سے نہ بچنا نماز کو باطل کر دیتا ہے اور نماز کا چھوڑنا بغیر کسی شک وشبہ کے گناہ کبیرہ ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں عذاب قبر کی تخفیف کا ثبوت ہے۔ صالحین کے زیارتِ قبور کرنے کی وجہ سے اور ان کی برکات کے پہنچنے کی وجہ سے اور باقی علامہ خطابیؒ کا اس کا انکار کرنا اور یوں کہنا کہ: لا اصل له اس میں واضح کلام ہے اس لئے کہ یہ حدیث اس بات کی اصل بننے کے قابل ہے پھر میں نے ابن حجر کو یہاں دیکھا ہے کہ انہوں نے یہ تصریح کی ہے کہ خطابی کا یہ کہنا کہ لا اصلٗ یہ ٹھیک نہیں ہے بلکہ یہی حدیث اس مسئلہ کیلئے مضبوط دلیل ہے اور اسی وجہ بعض متاخرین ائمہ حنفیہ نے فتویٰ دیا ہے کہ جو لوگوں کے ہاں نیاز بو اور ٹہنی وغیرہ قبور پر رکھنے کی عادت ہے وہ اس حدیث کی وجہ سے سنت ہے اور شاید کہ علامہ خطابی کے کلام کی توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ بے شک یہ حدیث ایک خاص حال کے واقعہ کا بیان ہے یہ عموم کا فائدہ نہیں دیتی اور اسی وجہ سے اس کے لئے توجیہات کو بیان کیا ہے جو کہ پہلے گزر چکی ہیں۔ پس غور وفکر کرو یہ بات محل نظر ہے۔

لعنت کے دو کام

۳۳۹: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِتَّقُوا اللَّاعِنَيْنِ قَالُوْا وَمَا اللَّاعِنَانِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الَّذِیْ يَتَخَلّٰی فِیْ طَرِيْقِ النَّاسِ اَوْفِیْ ظِلِّهِمْ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۲۲۶/۱ حدیث رقم (۶۸۔۲۶۹)۔وأخرجه أبو داوٗد فی السنن ۲۸/۱ حدیث رقم ۲۵ وأخرجه أحمد فی المسند ۳۷۲/۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم ان دو چیزوں سے بچو جو لعنت کا سبب ہیں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول وہ دو چیزیں کونسی ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ایک تو وہ آدمی جو راستہ میں قضائے حاجت کرے دوسرا وہ آدمی جو لوگوں کی سایہ دار چیز کے نیچے پاخانہ کرے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: اللاعنین: ای الامرین الجالبین للعن والشتم۔ یہاں ان دونوں کاموں کو لاعنان کہنا یہ سبب وحامل کا فاعل کے ساتھ نام رکھنے کے قبیل سے ہے یعنی سبب کو فاعل کہا گیا ہے۔ ای الذین هما سببا اللعنة غالبا۔ ازھار میں ہے کہ بعض نے کہا ہے کہ لَاعِن بمعنی ملعون کے ہے۔

الذی یتخلی: یہاں مضاف محذوف ہے ای احدهما تخلی الذی یتخلی۔ یا یہاں پر فعل کو فاعل کے ذکر کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔

فی ظلهم: یعنی سایہ دار درخت جہاں وہ آپس میں باتیں کرتے ہوں۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ مراد اس سے وہ جگہ

ہے جو لوگوں نے مجلس اور آرام گاہ کے لئے منتخب کیا ہو۔ علامہ ابھری فرماتے ہیں سردیوں میں دھوپ سینکنے کیلئے جو جگہیں ہوتی ہیں وہ بھی اسی حکم میں ہیں جیسا کہ گرمیوں میں سایہ والی جگہیں یعنی جہاں لوگ سورج کی دھوپ سینکتے ہیں جیسا کہ سرد علاقوں میں ہوتا ہے اس کا حکم بھی یہی ہے اور اسی طرح پانی کے گھاٹ جیسا کہ آگے روایت میں آ رہا ہے۔ **في طريق الناس او في ظلهم** میں جو اضافت ہے۔ یہ دلالت کر رہی ہے کہ مراد وہ محل ہے جو مباح ہو اس میں کراہت کی مذکورہ صورتیں ہیں باقی جب کوئی مملوک جگہ ہو تو وہاں پر مالک کی اجازت کے بغیر قضاء حاجت کرنا حرام ہے۔

احمد اور مسلم اور ابوداؤدؒ نے اس طرح نقل کی ہے: **اتقوا اللاعنين الذى يتخلى فى طريق الناس او فى ظلهم**۔ جامع صغیر میں بھی اسی طرح ہے۔

دائیں ہاتھ سے استنجاء نہ کیا جائے

۳۴۰: وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا شَرِبَ اَحَدُکُمْ فَلَا یَتَنَفَّسْ فِی الْاِنَاءِ وَاِذَا اَتَی الْخَلَاءَ فَلَا یَمُسُّ ذَکَرَهٗ بِیَمِیْنِهٖ وَلَا یَتَمَسَّحْ بِیَمِیْنِهٖ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١/٢٥٣ حديث رقم ١٥٣۔ ومسلم في صحيحه (٦٣۔٢٦٧)۔ وأبو داوٗد ١/٣١ حديث رقم ٣١ وأحمد في المسند ٥/٢٩٦۔

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی شخص پانی پیئے تو پانی والے برتن میں سانس نہ لے اور جب قضائے حاجت کرے تو دائیں ہاتھ سے مس ذکر نہ کرے اور نہ ہی دائیں ہاتھ سے استنجاء کرے۔ (بخاری و مسلم)

راویٔ حدیث:

ابوقتادۃ۔ یہ ابوقتادہ ہیں۔ ان کا نام حارث ہے۔ ربعی کے بیٹے تھے۔ انصار میں سے ہیں۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کی کنیت نام پر غالب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے مخصوص شہسوار ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تمام محاربات میں شریک رہے۔ ان کی عمر ستر سال تھی۔ ۵۴ھ میں بمقام مدینہ انتقال فرمایا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ صحیح نہیں بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بمقام کوفہ انتقال ہوا۔

تشریح: فلا یتنفس: یہ مجزوم ہے اور تینوں جملوں میں ''لاء'' ناھیہ ہے اور یہ مضموم بھی مروی ہے تو پھر لاء نافیہ ہوگا اسی طرح ابہریؒ نے شیخ محی الدینؒ سے نقل کیا ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہاں نہی کی علت شاید یہ ہو کہ سانس برتن میں لینے سے وہ چیز بدل جائے یعنی مطلب یہ ہے کہ سانس کی حرارت کی وجہ سے پانی کی ٹھنڈک جو کہ پیاس ختم کرنے والی ہے وہ کم نہ ہو جائے۔ یا اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ کہیں اس کے سانس لینے سے کوئی گندگی وغیرہ نہ گرے، بلکہ جب سانس لینے کا ارادہ کرے تو برتن سے منہ ہٹا لے، پس سانس لے پھر پیئے۔

حدیث میں آیا ہے: مصوا الماء مصبا ولاتعبوه عبا۔ ''پانی گھونٹ کر کر پیو ایک ہی سانس میں نہ پی جاؤ''۔امام بیہقی نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے۔نہایہ میں ہے کہ عبٌ کہتے ہیں بغیر سانس لیئے پینا۔ بیضاوی نے فرمایا ہے پانی کو تین سانسوں میں پینا پیاس کو زیادہ ختم کرنے والا ہے اور ہضم میں اقویٰ ہے اور پٹھوں کو کمزور کرنے میں اور معدہ کو ٹھنڈا کرنے میں کم اثر کرنے والا ہے۔

شمائل الترمذی میں ہے: انه ﷺ كان يتنفس في الاناء ثلاثا اذا شرب ويقول هوا مرا واروى۔حدیث کا معنیٰ یہ ہے کہ پانی کو تین مرتبہ میں پیتے ہر بار برتن کو منہ سے جدا کرتے، پس سانس لیتے پھر دوبارہ پیتے۔جس سے روکا گیا ہے وہ برتن مین سانس لینا ہے یا بغیر سانس لیے پینا ہے کیونکہ یہ لالچ حرص اور غفلت پر دلالت کرتا ہے اس لئے حدیث میں آیا ہے: لا تشربوا واحدا كشرب البعير ولكن اشربوا مثنى وثلاث ''کہ اونٹ کی طرح ایک ہی سانس میں نہ پیؤ بلکہ دو اور تین سانسوں میں پیؤ''۔

اور سند حسن روایت وارد ہے :انه ﷺ يشرب في ثلاثة انفاس اذا ادنى الاناء الى فيه سمى الله واذا اخره حمدالله يفعل ذلك ثلاثا۔ ''حضور ﷺ تین سانسوں میں پیتے تھے جب برتن کو منہ مبارک کے قریب کرتے تو بسم اللہ پڑھتے اور جب ہٹاتے تو الحمدللہ پڑھتے تین مرتبہ اس طرح کرتے (یعنی اکثر تین مرتبہ کرتے)''۔اس لئے کہ ایک روایت میں دو سانسوں سے پینے کا ذکر ہے اور بخاری کی ایک روایت میں مرةً اوْ مرّتين کا ذکر ہے اَوْ اس میں تنویع کیلئے ہے۔اس لئے کہ اگر دو سے سیر ہو جاتے تو انہی پر اکتفاء فرماتے ورنہ تین سانسوں میں نوش فرماتے۔

يمس۔سین کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ مروی ہے اور رفع بھی جائز ہے۔

لا يتمسح۔مجزوم ہے یا مرفوع ہے۔

بيمينه: لا يتمسح کا معنی ہے لا يستنجى کیونکہ بخاری کی روایت میں یوں آیا ہے :اذا بال احدكم فلا ياخذ ذكره بيمينه ولا يستنج بيمينه۔الابہریؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

پس اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آدمی پتھر کے ساتھ کیسے استنجاء کرلے گا کیونکہ اگر پتھر کو بائیں میں پکڑا اور ذکر کو دائیں میں تو اس نے دائیں کے ساتھ اس کو چھولیا اور یہ منع ہے اور اسی طرح اس کا عکس۔ہم اس کا یوں جواب دیتے ہیں کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ذکر کو بائیں ہاتھ میں پکڑے اور کسی دیوار سے یا کسی بڑے پتھر سے اس کو صاف کرے اس طرح کہ دائیاں ہاتھ بالکل استعمال نہ کرے۔مظہر اور اشرفی میں اسی طرح ذکر ہے۔

جامع صغیر میں ہے کہ اس کو امام بخاری اور ترمذی نے ابوقتادہ سے روایت کیا ہے اور ابن ماجہؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

اذا شرب احدكم فلا يتنفس في الاناء فاذا اراد ان يعود فلينح الاناء ثم ليعد ان كان يريد۔

سعید بن منصور نے اور ابن سنی نے اور ابو نعیم نے طب میں اور بیہقی نے ابوحسین سے مرسلاً یہ روایت کی ہے:

اذا شرب احدكم فليمص مصا ولا يعب عبا فان الكباد من العب ومسند الفردوس میں حضرت علیؓ سے

بھی اسی طرح کی روایت منقول ہے۔(الکباد سے مراد جگر کی بیماری ہے یعنی ایک ہی سانس میں پینا اس بیماری کا باعث ہے)۔

وضو کرتے وقت ناک کو جھاڑا جائے

۳۴۱:وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ تَوَضَّأَ فَلْيَسْتَنْثِرْ وَمَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْيُوْتِرْ .

(متفق علیه)

أخرجه البخاری فی الصحیح ۱/۲٦۲ حدیث رقم ۱٦۱ ـ ومسلم ۱/۲۱۲ حدیث رقم (۲۲ـ۲۳۷) والترمذی ۱/٤۰ حدیث رقم۲۷ـ والنسائی ۱/٦٦ حدیث رقم ۸۸ـ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۱٤۳ حدیث رقم ٤۰۹ـ وأخرجه الدارمی فی السنن ۱/۱۹۱ حدیث ۷۰۳ـ وأخرجه مالك فی الموطأ ۱/۱۹ کتاب الطهارة حدیث ۳ـ وأحمد فی المسند ۲/۲۳٦ـ

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو آدمی وضو کرے تو اس کو چاہئے کہ وہ ناک کو بھی جھاڑے اور جو آدمی قضائے حاجت کے بعد استنجاء بالاحجار کرے تو اس کو چاہئے کہ طاق عدد کی رعایت کرے۔(بخاری ومسلم)

تشریح: پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ جمہور کے ہاں استنثار کہتے ہیں پانی کا پھینکنا ونکالنا جس کو آدمی چڑھاتا ہے ناک میں پانی ڈالتے وقت (یعنی استنشاق۔ چڑھانا اور استنثار نکالنا) بعض کا کہنا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ ناک کے آخر سے ناک کا پانی (رینٹ وغیرہ) نکالنا۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ظاہراً امر وجوب کیلئے ہے لیکن وجوب کے لئے یہ بات مانع ہے کہ حضور ﷺ نے وضو کیا اور استنثار نہیں کیا جیسا کہ وضو کی روایات کو نقل کرنے والے حضرات کا اس کے ذکر سے خاموش رہنا ہے جو کہ اس کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتا ہے ورنہ وہ حضرات اس پر سکوت نہ کرتے، پس یہاں پر وہ اصولیین کے ضابطے کو لے کر اعتراض نہیں کر سکتے کہ عدم نقل سے عدم فعل لازم نہیں آتا۔ ابن حجرؒ کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ مطلقاً عدم فعل یا عدم مواظبت یہ دلالت کرتا ہے کہ امر استحباب کیلئے ہے۔ نیز یہ بات بھی ہے کہ نفس استنشاق وضو میں واجب نہیں ہے جیسا کہ یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے پس استنثار جو اس کی تکمیل وتمیم کرنے والا ہے وہ کیسے واجب ہو سکتا ہے؟

فلیوتر: یعنی تین یا پانچ یا سات۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ایتار یہ ہے کہ اس کے طاق ہونے کا خیال رکھے اور امر استحباب کیلئے ہے اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے: **من فعل فقد احسن**۔

پیشاب نرم جگہ کیا جائے

۳۴۲:وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَدْخُلُ الْخَلَاءَ فَاَحْمِلُ اَنَا وَغُلَامٌ اِدَاوَةً مِّنْ مَّاءٍ وَعَنَزَةً يَسْتَنْجِیْ بِالْمَاءِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱/۲۵۰ حدیث رقم ۱۵۰ وأخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۲۲۷ حدیث رقم (۷۰ـ۲۷۱) وأخرجه النسائی فی السنن ۱/٤۲ حدیث رقم ٤۵ـ وأخرجه أحمد فی المسند ۳/۱۷۱ـ

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب قضائے حاجت کے لئے تشریف لے جاتے تھے تو میں اور ایک لڑکا پانی کا ایک برتن اور ایک برچھی لیتے تو آپ ﷺ اس پانی سے استنجاء کرتے تھے۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: الخلاء: (یہ مد کے ساتھ ہے) اس سے مراد وضو کرنے کی جگہ ہے۔ اس کو خلاء کہا، کیونکہ انسان اس میں اکیلا ہوتا ہے۔ عبدالعزیز ابہری کی شرح میں ہے کہ شیخ محی الدینؒ نے فرمایا ہے کہ خلاء سے مراد یہاں پر فضاء ہے کیونکہ دوسری روایت میں ہے: **كان اذا خرج لحاجته** اور پانی کے ساتھ برچھی کو لے جانا بھی اس کا قرینہ ہے کہ اس سے مراد قضاء ہے اور نیز جو بیت الخلاء گھر میں ہوتے ہیں ان میں خدمت کے امور گھر والوں کے متعلق ہوتے ہیں (نہ کہ باہر والوں کے) اور امام بخاریؒ نے اشارہ ہے بھی کیا کہ غلام سے مراد ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔

فاحمل انا وغلام: غلام سے مراد۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں بعض نے کہا ہے کہ بلال اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

وعنزة۔ منصوب ہے **اداوة** پر عطف ہے یعنی ہم میں سے ایک لوٹا اٹھاتا اور دوسرا عنزہ (برچھی)۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ **عنزہ** (نون کے فتحہ کے ساتھ ہے) یہ لاٹھی سے لمبا اور نیزے سے چھوٹا ہوتا ہے اور اس میں پھل ہوتا ہے اور حضور ﷺ چھوٹے نیزے کو ساتھ اس لئے رکھتے تھے کہ حضور ﷺ قضاء حاجت کیلئے لوگوں سے دور جایا کرتے تھے، اس طرح کہ وہ آپ ﷺ کو نہیں دیکھ سکتے تھے تکلیف ومصیبت کو دفع کرنے کی خاطر اور نیز اس سے سخت زمین کو کھودتے تھے تاکہ پیشاب کے وقت چھینٹے واپس آپ ﷺ پر نہ پڑیں۔

بعض حضرات نے اس چھوٹے نیزے کے رکھنے میں یہ حکمت بتلائی ہے کہ اسکو حضور ﷺ اپنے پاس گاڑ دیتے تھے تاکہ جو قریب سے گزرنے کا ارادہ کرے وہ اس کو دیکھ کر رُک جائے۔

بالماء: اس حدیث سے اور اس کے علاوہ بعض دوسری احادیث سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ کبھی حضور ﷺ صرف پانی پر اکتفاء فرماتے اور کبھی پتھر پر اور اکثر دونوں کو جمع کرتے تھے۔

الفصل الثانی:

بیت الخلاء جاتے وقت متبرک چیز کو ساتھ لے جانا مکروہ ہے

۳۴۳: عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ نَزَعَ خَاتَمَهٗ (رواه ابوداود والنسائى والترمذى وقال هذاحديث حسن صحيح غريب وقال ابوداود هذاحديث منكروفى روايته) وَضَعَ بَدَلَ نَزَعَ......

أخرجه أبو داوٗد فى السنن ١/٢٥ حديث رقم ١٩۔ وأخرجه الترمذى فى السنن ٤/٢٠١ حديث رقم ١٧٤٦۔ والنسائى فى السنن ٨/١٧٨ حديث رقم ٥٢١٣۔ وابن ماجة ١/١١٠ حديث رقم ٣٠٣۔

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب بیت الخلاء کو جاتے تو اپنی انگشتری اتار دیا کرتے تھے اس حدیث کو امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام نسائی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے اور امام ابوداؤد نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ نیز ان کی روایت میں لفظ نَزَعَ کی جگہ وَضَعَ ہے۔

تشریح: کان النبی۔ ایک نسخہ میں رسول اللہ ہے۔

خاتمہ: خاتم تاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ بعض نے کسرہ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ حضور ﷺ اس لئے اس کو اتارتے تھے کیونکہ اس پر نقش جو تھا وہ یہ الفاظ تھے: ''محمد رسول اللہ'' اور اس حدیث میں دلیل ہے کہ استنجاء کرنے والے کا اللہ اور رسول کے نام سے اور قرآن سے خالی ہونا واجب وضروری ہے۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح کہا ہے۔

عبدالعزیز ابھریؒ فرماتے ہیں کہ اسی طرح باقی رسولوں کے اسماء کو بھی یہ بات شامل ہوگی (یعنی کہ ان کا بھی ادب اسی طرح کرے گا) ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ بول براز کرنے والے کیلئے مستحب ہے کہ بیت الخلاء جانے سے پہلے ہر قابلِ تعظیم چیز کو باہر رکھ کر جائے مثلاً اللہ تعالیٰ کا نام یا کسی نبی کا یا فرشتے کا، پس اگر وہ اس کی مخالفت کرے تو ایسا کرنا مکروہ ہوگا۔ (ملا علی قاریؒ) فرماتے ہیں یہ ہمارے مذہب کے موافق ہے

ھذہ حدیث حسن صحیح غریب: اس پر اشکال پہلے گزر چکا ہے (یعنی حسن صحیح غریب پر)

امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں وہم ہمام راوی کی وجہ سے ہے اور سوائے اس کے اور کسی نے اس کو نقل نہیں کیا۔ ''ہمام'' یہ ابوعبداللہ ہمام بن یحییٰ بن دینار الازری ہے۔ شیخین اس کی حدیث سے استدلال پر متفق ہیں اور ابن معین نے بھی اس کی توثیق کی ہے اور فرمایا ہے: **ثبت ھو فی کل المشائخ**۔ ابن عدیؒ فرماتے ہیں کہ ہمام بن یحییٰ وہ اصدق اور اشہر ہے اس بات سے کہ اس کے لئے منکر حدیث ذکر کی جائے (یعنی یہ صحیح نہیں ہے کہ اس کی حدیث منکر ہے بلکہ وہ تو اصدق ہے) اور اس کی احادیث درست ہیں: اور اسی لئے امام منذری نے ابن عدیؒ اور امام ترمذی کے قول کو درست قرار دیا ہے اور یوں کہا ہے کہ ہم اس حدیث کو تسلیم نہیں کرتے حدیث کی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے غریب ہونے کی وجہ سے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے کہا ہے۔

اور حاکم نے مستدرک میں اس کو روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ شیخین کی شرط کے مطابق ہے۔

میرک شاہؒ نے اسی طرح اس کو ثابت کیا ہے اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ امام ترمذی کی ہمام بن یحییٰ کی حدیث کو صحیح قرار دینا یہ دلیل ہے کہ وہ ان کے نزدیک معتبر ہے اس سے امام ابوداؤد کا اعتراض بھی ختم ہو جاتا ہے، پس یہ حدیث حجت ہوگی۔

بدل نزع۔ بعض روایات میں نزع کی بجائے وضع ہے دونوں کے معنی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جامع صغیر میں یوں ہے **کان اذا دخل الخلاء وضع خاتمہ**۔ اصحاب سنن نے اور ابن حبان نے اور حاکم نے حضرت انسؓ سے اس کو روایت کیا ہے۔

قضائے حاجت کے لئے دُور جانا چاہئے

۳۴۴:وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا اَرَادَ الْبَرَازَ انْطَلَقَ حَتّٰى لَا يَرَاهُ اَحَدٌ ۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه أبو داوٗد في سننه ١/١٤۔ حديث رقم ٢۔وأخرجه ابن ماجة ١/١٢١ حديث رقم ٣٣٥ والترمذي عن المغيرة بن شعبة ١/٣١ حديث رقم ٢٠۔وكذلك الدارمي ١/١٧٦۔ حديث رقم ٦٦٠۔

ترجمہ:''حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب قضائے حاجت کے لئے باہر صحراء میں جاتے تو بہت دور تشریف لے جاتے یہاں تک کہ آپ ﷺ کو کوئی نہ دیکھتا۔(ابوداؤد)''

تشریح:کان النبی۔ایک نسخہ میں رسول اللہ ہے۔

البراز :باء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ کسرہ کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا اس جگہ تصحیف ہوئی ہے۔مراد کھلی فضاء ہے یا قضاء حاجت ہے۔

احد۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ براز (باء کے فتحہ کے ساتھ) کھلی فضاء کا نام ہے عرب اس سے آدمی کے قضائے حاجت کرنے کو کنایہ لیتے ہیں۔کہا جاتا ہے :**تبرز اذا تغوط**۔ اور یہ براز اور غائط بہت اچھے کنایہ ہیں۔عرب ان کے ذریعے فحش بات کو ذکر کرنے سے بچتے تھے اپنی زبانوں کی حفاظت کیلئے ایسی چیز کے ذکر سے کہ جس سے نظروں کو بھی بچایا جاتا ہے اور باء کے کسرہ کے ساتھ اس میں غلط ہے اس لئے کہ براز کسرہ کے ساتھ مصدر ہے **بارز فی الحرب** سے۔

اور نہایہ لابن اثیر میں ہے کہ خطابیؒ نے کہا ہے محدثین اس کو کسرہ کے ساتھ روایت کرتے ہیں جو کہ غلط ہے اس لئے کہ یہ کسرہ کے ساتھ مصدر ہے **مبارزہ فی الحرب** سے اور جوہری نے اس کے خلاف کہا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں کہ البراز یہ مبارزہ فی الحرب سے مشتق ہے اور براز بھی کنایہ ہے۔غذاء کے فضلہ سے اور وہ غائط ہے پھر یہ کہا کہ **براز بفتح الباء** کھلی فضاء کو کہتے ہیں۔

علامہ خطابی کا محدثین سے مراد بظاہر بعض محدثین ہیں اور ان کا محدثین کو غلطی پر ماننا یہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ محدثین کی روایت لغویین سے ان دونوں کے انفراد کے وقت زیادہ قوی ہوتی ہے،پس جب کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی موافقت کرتے ہوں تو پھر وہ کیسے غلط ہو سکتے ہیں اور محقق صاحب قاموس نے بھی کہا ہے کہ براز کتاب کی طرح ہے غائط کو کہتے ہیں۔ہاں یہ بات البتہ اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ مختار روایت وہ بفتح الباء ہی ہے کیونکہ بفتح الباء میں کسی قسم کا التباس نہیں بخلاف بکسر الباء،وہ معنوں میں مشترک ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں سند حسن کے ساتھ روایت کی ہے اور میرک شاہؒ فرماتے ہیں ابن ماجہ نے بھی روایت کی ہے اور اس کی سند میں اسماعیل بن محمد الکوفی ہے جو کہ مکہ مکرمہ میں رہتا تھا۔اس میں بعض حضرات نے کلام کیا ہے اور جامع صغیر میں ہے۔

کان اذا اراد الحاجۃ ابعد۔ابن ماجہ نے اس روایت کو بلال بن الحارث سے اور احمد ونسائی اور ابن ماجہ نے عبدالرحمٰن بن ابی قراد سے اس کو روایت کیا ہے۔

پیشاب کے لئے نرم جگہ تلاش کی جائے

۳۴۵: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ کُنْتُ مَعَ النَّبِیِّ ﷺ ذَاتَ یَوْمٍ فَاَرَادَ اَنْ یَّبُوْلَ فَاَتٰی دَمِثًا فِیْ اَصْلِ جِدَارٍ فَبَالَ ثُمَّ قَالَ اِذَا اَرَادَ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّبُوْلَ فَلْیَرْتَدْ لِبَوْلِهٖ ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبو داؤد في السنن ۱/۱۵ حديث رقم ۳۔ وأحمد في المسند ٤/٣٩٦۔

ترجمہ: ''حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا آپ ﷺ نے پیشاب کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ آپ ایک دیوار کی جڑ یعنی اس کے قریب پہنچے اور نرم زمین تلاش کر کے وہاں پیشاب کیا۔ پیشاب سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم سے کوئی شخص پیشاب کرنے کا ارادہ کرے تو اس کو چاہئے کہ وہ پیشاب کے لئے نرم زمین تلاش کرے اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ذات یوم: لفظ ذات زائد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ساعت سے کنایہ ہے: **ای کنت یوما او ساعته یوم معه علیه الصلاۃ السلام**۔

دمثا: (دال کے فتحہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ) یہ روایت ہے اور یہ محذوف موصوف کیلئے صفت ہے: **ای مکانا لینا سهلا**۔ فائق میں لکھا ہے: **دمث المکان دمثا لان وسهل**۔

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا اس جگہ پیشاب کرنا یہ اس دیوار کے نزدیک تھا جو کہ پرانی تھی کسی کی مملوک نہ تھی کیونکہ پیشاب عمارت کی بنیاد کو نقصان پہنچاتا ہے اور اس کو کمزور کرتا ہے یعنی اس وجہ سے کہ اس میں نمکین پن ہوتا ہے وہ مٹی کو شور بنا دیتا ہے اسی طرح یہاں کہا ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کسی کے ملکیت میں بغیر اجازت سے خواہ اجازت حقیقی ہو یا حکمی یہ کیسے کر سکتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ غیر کے مال کو ناپاک کرنا بھی جائز نہیں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضور ﷺ دیوار کی جڑ سے پیچھے ہو کر بیٹھے ہوں، پس اس صورت میں اس تک پیشاب ہی نہ پہنچا ہو۔

فلیرتد۔ دال کے سکون کے ساتھ: **ای فلیطلب مکانا مثل هذا**۔ مفعول کو حذف کیا گیا ہے حال کی اس پر دلالت کی وجہ سے۔

لبوله۔ تاکہ اس کی طرف پیشاب کے چھینٹے نہ پڑیں۔ اشرفؒ نے فرمایا ہے ارتیاد افتعال سے ہے اور یہ رود سے مشتق ہے جیسا کہ **ابتغاء** یہ **بغی** سے ہے اور اسی سے **رائد**: چراگاہ کا طلب کرنے والا۔

اسنادی حیثیت: میرک شاہؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔ علامہ نوویؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے اس میں ایک راوی ہے جس کا نام ذکر نہیں کیا گیا۔ بیہقی نے بھی (ابوموسیٰ) اس سے روایت کی ہے اور ابوداؤد نے اپنی مراسیل میں اس کو روایت کیا ہے۔ ابوقتادہؓ سے طلحہ نے اور طلحہ سے حارث نے روایت کی ہے مرسلاً فرماتے ہیں ابوقتادہؓ۔ **کان ﷺ اذا راد ان یبول فاتی غراز من الارض ای مکانا یابسا اخذ عودا فنکت به فی الارض حتی یثیر من التراب ثم یبول فیه**۔ جامع صغیر میں بھی اسی طرح ہے پس کثرت طرق سے ضعیف

روایت قوی ہو جاتی ہے۔

قضائے حاجت کے وقت زمین کے قریب ہو کر کشف عورت کیا جائے

۳۴۶: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا أَرَادَ الْحَاجَةَ لَمْ يَرْفَعْ ثَوْبَهُ حَتّٰى يَدْنُوَ مِنَ الْاَرْضِ .

(رواه الترمذی وابوداود والدارمی)

أخرجه الترمذی ۱/۲۱ وأخرجه أبوداؤد عن ابن عمر ۱/۲۱ حدیث رقم ۱۴ والدارمی ۱/۱۷۸ حدیث رقم ٦٦٦۔

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب قضائے حاجت کا ارادہ کرتے تھے۔تو جب تک بیٹھتے وقت زمین کے قریب نہ ہو جاتے۔اپنے ستر سے کپڑا نہ اٹھاتے تھے۔اس حدیث کو امام ترمذیؒ' امام ابوداؤدؒ اور امام دارمی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: زمین کے قریب جا کر جو کپڑا اُٹھاتے تھے اس میں بغیر ضرورت کے ستر کھولنے سے بچنا تھا اور یہ قضائے حاجت کے آداب میں سے ہے۔علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ جنگل اور آبادی کا ایک حکم ہے اس لئے کہ کپڑا اٹھانے میں ستر کا کھلنا ہے اور وہ جائز نہیں ہے مگر ضرورت کے وقت اور زمین کے قریب ہونے سے پہلے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ خلوت کی حالت میں ستر کا ایک دفعہ ہی میں کھولنا اتفاقاً جائز ہے۔

ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے اس کی سند حسن ہے اور جامع صغیر میں ہے۔ابوداؤد اور ترمذی نے اس کو انسؓ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور طبرانی نے الاوسط میں جابرؓ سے روایت کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت

۳۴۷: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّمَا اَنَا لَكُمْ مِثْلُ الْوَالِدِ لِوَلَدِهٖ اُعَلِّمُكُمْ اِذَا اَتَيْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوْهَا وَاَمَرَ بِثَلَاثَةِ اَحْجَارٍ وَنَهٰى عَنِ الرَّوْثِ وَالرِّمَّةِ وَنَهٰى اَنْ يَّسْتَطِيْبَ الرَّجُلُ بِيَمِيْنِهٖ . (رواه ابن ماجة والدارمی)

أخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۱۱٤ حدیث رقم ۳۱۳۔ وأخرجه أبو داؤد فی السنن ۱/۱۸ حدیث رقم ۸ وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۳۸ حدیث رقم ٤۰۔ وأحمد بالفاظ متقاربة۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا شفقت اور نصیحت کے اعتبار سے میں تمہارے لئے ایسے ہوں جیسے باپ بیٹے کے لئے ہوتا ہے چنانچہ میں تمہیں یہ تعلیم دیتا ہوں کہ تم قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف استقبال اور استدبار نہ کرو اور استنجاء بالاحجار کی صورت میں تین پتھر استعمال کرنے کا حکم دیا۔ لید اور ہڈی کے ساتھ استنجاء کرنے سے منع کیا اور اسی طرح دائیں ہاتھ کے ساتھ استنجاء کرنے سے بھی منع کیا اس حدیث کو

امام ابن ماجہ اور امام دارمی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **لولده اعلمکم** :ای امور دینکم۔ یہ استئناف بیانی ہے۔ علامہ خطابیؒ نے فرمایا ہے کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد میں منشاء مخاطبین صحابہ کیلئے انس وکشادگی کا پیدا کرنا تھا تا کہ وہ اپنے دینی مسائل میں جوان کو پیش آتے ہیں سوال کرنے سے شرم وحیاء نہ کریں جیسا کہ ولد' والد کی طرف نسبت میں کہ جب بیٹے کو کوئی بات پیش آتی ہے تو وہ والد کی طرف رجوع کرتا ہے (پس یہی مثال میری تمہارے ساتھ ہے) اس حدیث میں اباء کی اطاعت کا وجوب ہے اور یہ کہ ماں باپ پر اولاد کی تعلیم وتربیت واجب ہے ان کے دین کے بارے میں جس کے وہ ضرورت مند ہیں۔

ولا تستد بروها :ای مطلقًا۔ جیسا کہ ہمارا مذہب ہے اور اس کو آبادی کے ساتھ مقید کرنا ظاہر کے خلاف ہے اور جو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے واقعہ نقل کیا ہے وہ ایک حالت کا بیان ہے عموم کا فائدہ نہیں دیتا اور اس کے ساتھ ساتھ آبادی میں استدبار کا جواز یہ اس میں استقبال کے جواز کو لازم کرنا۔

وامر۔ یعنی حضور ﷺ نے استنجاء کرنے والے کو حکم دیا اور یہ امر استحبابی ہے۔

عن الروث والرمة۔ روث سے گوبر مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ہر ناپاک شئی مراد ہے **رمة مکسر** الراء اور میم کی تشدید کے ساتھ۔ بوسیدہ ہڈیاں رمیم کی جمع ہے اور بوسیدہ ہڈیوں کو رِمہ اس لئے کہتے ہیں کہ اونٹ اس کو کھاتے ہیں: **الابل ترمها ای تاکلها والرمة بضم الراء**۔ پرانی رسّی کو کہتے ہیں اس طرح ازھار میں سیدؒ نے نقل کیا ہے۔ فائق میں ہے :**رمة** پرانی ہڈی کو کہتے ہیں اور یہ رمیم کے معنی میں ہے یا یہ رمیم کی جمع ہے جیسا کہ خلیل اور خلہ۔ یہ مشتق ہے **رم العظم اذا بلی** سے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مطلقاً ہڈی مراد ہے۔ صاحب نہایہ نے فرمایا ہے کہ ہڈی سے اس لئے منع فرمایا کیونکہ یا تو مردار کی ہڈی ہوگی جو کہ ناپاک ہے یا اس لئے کہ اس میں ملائمیت ہوتی ہے جو کہ نجاست کو ختم نہیں کرتی یا اس لئے کہ یہ بدن کو زخمی کر دیتی ہے۔

شرح السنة میں مذکور ہے کہ نہی کی تخصیص (ان مذکورہ چیزوں سے) یہ دلالت کرتی ہے کہ استنجاء ہر ایسی چیز کے ساتھ جائز ہے جو صاف کرنے میں پتھر کے قائم مقام ہو اور وہ ہر پاک جامد نجاست کو ختم کرنے والی غیر محترم ہے جیسے ڈھیلے' لکڑی' پرانا کپڑا اور ٹھیکریاں وغیرہ۔

علماء نے فرمایا ہے کہ کاغذ اگرچہ سفید ہی کیوں نہ ہو وہ محترم ہے ہاں اگر اس پر منطق وغیرہ لکھی گئی ہو اور اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ ہو تو اس سے استنجاء کرنا جائز ہے۔

الرجل بیمینه: عورت کا بھی یہی حکم ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں استنجاء کو اس حدیث میں استطابہ کہا ہے کیونکہ استنجاء میں نجاست کو زائل کرنا ہے اور اس سے پاکی حاصل کرنا ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں، اور ابو داؤد نے بھی (والدارمی) سند حسن کے ساتھ اور احمدؒ نے بھی اس کی طرح روایت کی ہے۔

میرک شاہؒ فرماتے ہیں امام شافعیؒ، ابن حبان، نسائی نے اس کو ملتے جلتے الفاظ سے روایت کیا ہے اور امام مسلم نے بھی اس کو مختصر نقل کیا ہے۔

دایاں ہاتھ مکرم اور بایاں مکروہ امور کے لئے استعمال ہو

۳۴۸: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَ كَانَتْ يَدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ الْيُمْنٰى لِطُهُوْرِهٖ وَطَعَامِهٖ وَكَانَتْ يَدُهُ الْيُسْرٰى لِخَلَائِهٖ وَمَا كَانَ مِنْ أَذًى . (رواہ ابوداود)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ۱/ ۳۲حديث رقم ۳۳۔وأحمد في مسنده ٦/ ٢٦٥۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دایاں ہاتھ وضو کرنے اور کھانے کے لئے تھا اور بایاں ہاتھ استنجاء کرنے کے لئے اور ہر مکروہ کام کے لئے استعمال ہوتا تھا اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: لطهوره۔طہور ضمہ اور فتح دونوں کے ساتھ مروی ہے ای كان يستعمل اليه اليمنى لوضوئه۔
وطعامه! ای لاكله وشربه۔یعنی کھانا پینا اور اسی طرح جو معزز کام ہو جیسے دینا، لینا، پہننا، مسواک کرنا، جوتے پہننے، اور کنگھی کرنا۔

وما كان۔کان تامہ ہے ای ماوجد ووقع۔

من۔یہ بیانیہ ہے۔

اذی۔اذی سے مراد وہ چیز جس کو پاکیزہ نفس ناپسند سمجھے جیسے ناک کی رینٹ' نکسیر' کپڑے اتارنا۔اظہر بات یہی ہے کہ ناک میں پانی ڈالنا دائیں ہاتھ کے ساتھ ہوگا اور اس کو صاف کرنا بائیں سے ہوگا اور اکثر میں نے عام طلبا کو دیکھا ہے کہ وہ کتاب بائیں ہاتھ میں پکڑتے ہیں اور جوتے کو دائیں میں یہ یا تو ان کی جہالت ہے یا اس امر سے غفلت ہے۔
امام نوویؒ نے فرمایا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔میرک شاہؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔ابن حجرؒ فرماتے ہیں یہ معلول ہے لیکن اس کے لئے باب الوضو کے فصل ثانی سے پہلے والی روایت جو کہ آگے آئے گی بطور تائید کے ہے۔

استنجاء میں تین پتھر کفایت کر جاتے ہیں

۳۴۹: وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَاذَهَبَ اَحَدُكُمْ اِلَى الْغَائِطِ فَلْيَذْهَبْ مَعَهٗ بِثَلَاثَةِ اَحْجَارٍ يَسْتَطِيْبُ بِهِنَّ فَاِنَّهَا تُجْزِئُ عَنْهُ ۔ (رواہ ابوداود والنسائی والدارمی)

أخرجه أحمد في المسند ٦/ ١٠٨وأبوداوٗد في السنن ١/ ٣٧حديث رقم ٤٠والنسائي في السنن ١/ ٤٢حديث رقم ٤٤۔والدارمي في السنن ١/ ١٨٠حديث رقم ٦٧٠۔وأخرجه الدارقطني في السنن١/ ٥٤باب الاستنجاء حديث ٤۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی آدمی قضائے حاجت کے لئے جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے ساتھ تین پتھر لے جائے ان کے ساتھ استنجاء کرے۔کیونکہ تین پتھر استنجاء کے لئے کافی ہوتے ہیں اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ 'امام نسائیؒ اور امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: فلیذهب۔ یہ امر استحباب کے لئے ہے۔

معه بثلاثة احجار۔ باء تعدیہ کیلئے ہے۔

یستطیب۔ یہ مرفوع ہے جملہ مستانفہ ہے فلیذھب امر کی علت ہے۔

بهن۔ باء آلہ کیلئے ہے۔

تجزی۔ تاء کے ضمہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ اور اس کے بعد ہمزہ ہے اور ایک نسخہ میں تاء کے فتحہ زاء کے کسرہ اور اس کے بعد یاء ہے معنی ہوگا کافی ہوجاتے ہیں۔ اس سے مستغنی کر دیتے ہیں۔ اس پانی کے قائم مقام ہوجاتے ہیں۔

عنه۔ ای عن الماء۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں **ای عن المستنجی**۔ لیکن یہ مرجع بعید ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں حضور ﷺ نے اس جملہ کو **یستطیب** کے بعد ذکر کیا ہے (یعنی وہ نجاست کو زائل کرتا ہے) آدمیوں کو اس رخصت سے خوش کرتے ہوئے۔

میرک شاہؒ فرماتے ہیں۔ دار قطنی نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے۔

جنات کی خوراک سے استنجاء نہ کرو

۳۵۰: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَسْتَنْجُوْا بِالرَّوْثِ وَلَا بِالْعِظَامِ فَإِنَّهٗ زَادُ اِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ۔

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/ ۲۹ حدیث رقم ۱۸ والنسائی فی السنن ۱/ ۳۷ حدیث رقم ۳۹۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ تم لوگ لید اور ہڈی کے ساتھ استنجاء نہ کرو' کیونکہ یہ تمہارے جن بھائیوں کی خوراک ہے

۳۵۱: رَوَاهُ التِّرمَذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ یَذْكُرْ زَادُ اِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ۔

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/ ۲۹ حدیث رقم ۱۸ والنسائی فی السنن ۱/ ۳۷ حدیث رقم ۳۹۔

ترجمہ: ''اس حدیث کو امام ترمذی اور امام نسائی نے روایت کیا ہے مگر اتنا فرق ہے کہ امام نسائی نے زَادُ اِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ کے الفاظ ذکر نہیں کیے۔''

راویٔ حدیث:

رویفع بن ثابت۔ یہ ''رویفع'' ثابت بن سکن کے بیٹے ''انصاری'' ہیں ان کا شمار ''مصریوں'' میں کیا جاتا ہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو ۴۶ھ میں ''طرابلس'' مغربی پر امیر مقرر کر دیا تھا۔ ان کی وفات ''برقہ'' میں ہوئی اور بعض نے کہا کہ ''شام'' میں ہوئی۔ ان سے حنش بن عبداللہ اور دوسرے حضرات روایت کرتے ہیں۔ ''رویفع'' رافع کی تصغیر ہے۔ رائے مہملہ پر ضمہ اور فاء پر کسرہ ہے اور ''حنش'' حائے مہملہ اور فتحہ کے ساتھ نون کے فتحہ اور شین معجمہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: لا تستنجوا بالروث۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ لید سے استنجاء اس لئے منع فرمایا کیونکہ وہ نجس ہے اور یہ محال

امر ہے کہ وہ کسی نجاست کو زائل کر دے یا کسی کو کم کر دے۔(ملا علی قاریؒ) فرماتے ہیں کہ لید وغیرہ کا دوسری کو کم کرنا محال نہیں ہے۔ پھر بہتر یہ تھا کہ ابن حجرؒ یہاں وہ علت بیان کرتے جو شارع علیہ السلام نے بیان کی ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ لید وغیرہ جنات کی سواریوں کی خوراک بنتی ہیں۔

ولا بالعظام فانه اور ایک صحیح نسخہ میں (**فانها**) ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ **فانه** میں "ہ" ضمیر روث اور عظام کی طرف مذکور کے اعتبار سے راجع ہے جیسا کہ شرح السنۃ، جامع الاصول اور مصابیح کے بعض نسخوں میں وارد ہے اور بعض نسخوں میں اور جامع ترمذی میں **فانها** ہے، پس اس صورت میں ھا ضمیر مؤنث عظام کی طرف راجع ہوگی اور روث اس کے تابع ہوگا اور اسی قاعدہ کی بناء پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا نِا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ [الجمعة: ۱۱] "اور جب یہ لوگ سودا بکتا یا تماشا ہوتا دیکھتے ہیں تو اکثر بھاگ جاتے ہیں اور تمہیں (کھڑے کا) کھڑا چھوڑ جاتے ہیں کہہ دو کہ جو چیز خدا کے ہاں ہے وہ تماشے اور سودے سے کہیں بہتر ہے" یہاں ھا ضمیر تجارت کی طرف راجع ہے اور **لهوا** اس کے تابع ہو کر مراد ہے۔ بہترین نظیر یہ آیت ہے: ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ﴾ [البقرہ: ۴۵] "اور (رنج وتکلیف میں) صبر اور نماز سے مدد لیا کرو اور بیشک نماز گراں ہے مگر ان لوگوں پر (گراں) نہیں جو عجز کرنے والے ہیں" پس غور کر اس آیت اور حدیث میں اصل کو مدنظر رکھا گیا ہے نہ کہ فرع کو اور اس میں مذکورین میں سے اقرب کی رعایت بھی ہے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ روث کے ذکر سے خاموشی اختیار کی گئی وہ اس لئے کہ اس کا جنات کیلئے زاد ہونا بطور مجاز کے ہے کیونکہ یہ بات پہلے ثابت ہو چکی ہے کہ روث وہ ان کے چوپاؤں کیلئے زاد ہے نہ کہ ان کے لئے اور یہ طیبیؒ کے کلام کی مزید وضاحت ہے ورنہ طیبیؒ کے اس کلام کا کوئی معنی نہ ہوگا جو انہوں نے کہا ہے کہ روث عظام کے تابع ہے۔ واللہ اعلم

زاد اخوانکم۔ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے جنات کا مسلمان ہونا بھی ثابت ہوتا ہے کیونکہ حضور ﷺ نے ان کو اخوان یعنی بھائی کہا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کھاتے ہیں۔

حافظ ابو نعیم نے دلائل النبوۃ میں روایت کی ہے کہ جنات نے حضور ﷺ سے ہدیہ طلب کیا تو آپ ﷺ نے ان کو ہڈی اور لید وغیرہ دی۔ ہڈی ان کے لئے اور لید اُن کی سواریوں کیلئے۔ حافظ ابو عبداللہ حاکم نے دلائل النبوۃ میں یہ روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے لیلۃ الجن میں فرمایا یہ نصیبین کے جن تھے جو میرے پاس آئے تھے انہوں نے مجھ سے متاع یعنی زاد کا سوال کیا تھا پس میں نے ان کو ہر ہڈی یا لید یا مینگنی کے ساتھ ان کو زاد یعنی غذا دی۔ میں نے کہا کہ ان چیزوں کا ان کو کیا فائدہ ہوگا فرمایا کہ وہ نہیں پائیں گے کسی متغیر ہڈی کو مگر اس پر پہلے کی طرح گوشت لگا ہوا ہوگا اور نہیں پائیں گے کسی لید وغیرہ مگر اس میں وہی دانے پائیں گے جو کھانے والے دِن میں تھے۔ پس تم میں سے کوئی عظم اور روث سے استنجاء نہ کرے۔(الحدیث)

(اور حب) (دانہ) سے مراد اعم ہے خواہ جو ہو یا گھاس بھوس وغیرہ، اور یہ حضور ﷺ کا معجزہ ہے)۔

اسنادی حیثیت : اس کی سند حسن ہے۔

(**لم یذکر زاد اخوانکم من الجن**) ای قوله **فانه زاد اخوانکم**........ اس باب کی تمام احادیث کا احاطہ

طوالت کا باعث ہے، ابن حجرؒ نے وہ تمام احادیث نقل کی ہیں جو اس مضمون کے متعلق ہیں وہاں مراجعت کر لی جائے۔

ڈاڑھی کو گرہ لگانے اور تانت باندھنے پر وعید

۳۵۱: وَعَنْ رُوَيْفِعِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَا رُوَيْفِعُ لَعَلَّ الْحَيَاةَ سَتَطُوْلُ بِكَ بَعْدِيْ فَاَخْبِرِ النَّاسَ اَنَّ مَنْ عَقَدَ لِحْيَتَهٗ اَوْتَقَلَّدَ وَتَرًا اَوِاسْتَنْجٰى بِرَجِيْعِ دَآبَّةٍ اَوْعَظْمٍ فَاِنَّ مُحَمَّدًا مِنْهُ بَرِیْءٌ. (رواه ابوداود)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ١/ ٣٤حديث رقم ٣٦والنسائي في السنن ٨/ ١٣٥حديث رقم ٥٠٦٧۔

ترجمہ: حضرت رویفع بن ثابتؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ارشاد فرمایا اے رویفع۔ شاید کہ میرے بعد تمہاری زندگی دراز ہو۔ لہٰذا تم لوگوں کو خبردار کرنا کہ جس شخص نے اپنی ڈاڑھی میں گرہ لگائی یا گلے میں تانت باندھی۔ یا لید، گوبر اور ہڈی سے استنجاء کیا۔ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بیزار ہیں اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: رویفع: رافع کی تصغیر ہے (ابن ثابت) صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ یہ انصاری ہیں ان کا شمار مصریین میں ہے اور امیر معاویہؓ نے ان کو مغرب میں طرابلس پر امیر مقرر کیا تھا۔ ۴۶ ہجری میں اور برقہ میں ان کا انتقال ہوا اور بعض نے کہا ہے کہ شام میں ان کا انتقال ہوا۔ حنش بن عبداللہ وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے۔

ستطول: سین زمانہ استقبال کی تاکید کیلئے ہے۔

بك: باء الصاق کیلئے ہے۔

فاخبر الناس: یہ فاء محذوف شرط کی جزاء ہے تقدیر عبارت یوں ہے: **فاذا طالت فاخبر** اور مطلب یہ ہے کہ شاید کہ تیری زندگی طویل ہوگی۔ یہاں تک کہ تو دیکھے گا ایسے لوگوں کو جو گناہوں کا ارتکاب کریں گے اور علانیہ گناہ کریں گے، پس جب تو ایسا زمانہ پالے تو ان کو بتلا دے اور اس میں **اخبار عن الغیب** کے معجزہ کا اظہار ہے کہ جس میں دین میں قرن اوّل کے بعد تبدیلی کی خبر دینا ہے اور یہ کہ امور مذکور انتہائی مہتم بالشان ہیں۔

ان من عقد لحیته: اکثر محدثین نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ داڑھی کا اس طرح علاج کرنا کہ وہ سکڑ جائے اور اس میں گرھیں لگ جائے اور یہ ڈاڑھی کے کنگھی کرنے کی سنت کے مخالف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ ڈاڑھی میں گرہ دیتے تھے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو **ارسال لحیه** کا حکم دیا کیونکہ گرہ لگانے میں عورتوں کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ عجمیوں کی عادت ہے، پس ان کو اس سے روکا گیا ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورت کو بدلنا ہے۔

بعض محدثینؒ نے فرمایا ہے کہ عربوں کی یہ عادت تھی کہ جس کی ایک بیوی ہوتی وہ اپنی ڈاڑھی میں ایک چھوٹی سی گرہ لگاتا تھا اور جس کی دو ہوتیں وہ دو گرھیں لگاتا۔ عبدالعزیز ابھری نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

او تقلد وترا۔ وتر' واؤ، تاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ وہ دھاگہ کہ جس میں تعویذ ہو یا منکے اور رنگ وغیرہ ہو۔ آفات اور نظر سے حفاظت کیلئے وہ لوگ بچے اور گھوڑے کی گردن میں اس کو لٹکاتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ وہ جانوروں کی گردنوں میں گھنٹیاں لٹکاتے تھے۔ تو معنیٰ یہ ہوگا: **او تقلد الفرس وتر القوس** کہ یا وہ شخص جو گھوڑے کی گردن میں تانت کا ہار ڈالے۔ بعض نے کہا ہے کہ گرہ لگانے اور قلادہ ڈالنے سے اس لئے منع فرمایا کیونکہ اس میں جاہلیت والوں کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے کیونکہ یہ ان کے شعار میں سے ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اہل جاہلیت کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنی سواریوں کی گردنوں میں کمان کی تانت کا ہار ڈالتے تھے اور وہ گمان کرتے تھے کہ اس سے نظر نہیں لگتی۔ ابو عبیدؒ نے فرمایا ہے کہ بہتر بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑے کو کمان کی تانت کا ہار پہنانے سے منع فرمایا جو اس لئے پہناتے ہیں کہ گھوڑے کو نظر نہ لگے، کیونکہ اس میں اس گلا گھٹنے کا اندیشہ ہے خصوصاً گھوڑے کے تیز دوڑنے کے وقت اور یہ روایت بھی کی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑوں کی گردنوں سے کمان کی تانتوں کو کاٹنے کا حکم دیا اس بات پر تنبیہ کرتے ہوئے کہ یہ اللہ کی تقدیر کو ٹال نہیں سکتی۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے اور باقی اس وَتر کے ساتھ جانور کا گلا گھٹنا تو یہ سبب عادی ہے، پس اس سے بھی احتراز کیا جائے۔

فان محمدا منه بری: یہ بات وعید کے قبیل سے ہے اور انتہائی شدید قسم کی ڈانٹ ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے **فانا** یا **فانی** سے سے اعراض کر کے **فان محمداً** ذکر کیا ان امور کی اہمیت کو بیان کرنے کیلئے اور اس سے روکنے میں مبالغہ اور تاکید پیدا کرنے کیلئے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ جو بات ابن حجرؒ نے ذکر کی ہے وہ تو سارے جملہ سے نکلتی ہے اس وجہ سے نہیں کہ یہاں پر ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو ذکر کیا ہے۔ اس لئے کہ زید کا یہ قول **فانی بری** اور **فان زیدًا بریٔ** دونوں معنی میں برابر ہو سکتے ہیں یا ظاہر یہاں عدول کی وجہ سے ہے کہ کہیں ضمیر کے ذکر کرنے سے مخاطب راوی کی جانب سے براءت کو نہ سمجھ لیتا اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں اشارہ کرنا ہے اس بات کی طرف کہ بے شک اس معظم نام کے ساتھ موسوم ذات اور معزز صفت والا کہ جس کی پہلے اور آخر والوں نے تعریف کی ہے وہ اس سے بری ہے، پس **فان محمدًا** کو ذکر کرنے میں (ان لوگوں کی) انتہائی قسم کی مذمت کی دلالت ہے اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بری ہوتے مگر اس سے کہ جس کی مذمت بیان کی گئی ہو کیونکہ مذمت یہ حمد کی ضد ہے۔

شیطان انسان کی مقعد کے ساتھ کھیلتا ہے

۳۵۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنِ اكْتَحَلَ فَلْيُوْتِرْ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ اَحْسَنَ وَمَنْ لَا فَلَا حَرَجَ وَمَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْيُوْتِرْ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ اَحْسَنَ وَمَنْ لَا فَلَا حَرَجَ وَمَنْ اَكَلَ فَمَا تَخَلَّلَ فَلْيَلْفِظْ وَمَا لَاكَ بِلِسَانِهٖ فَلْيَبْتَلِعْ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ اَحْسَنَ وَمَنْ لَّا فَلَا حَرَجَ وَمَنْ اَتَى الْغَائِطَ فَلْيَسْتَتِرْ فَاِنْ لَمْ يَجِدْ اِلَّا اَنْ يَّجْمَعَ كَثِيْبًا مِنْ رَمْلٍ فَلْيَسْتَدْ بِرْهُ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يَلْعَبُ بِمَقَاعِدِ بَنِيْ اٰدَمَ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ اَحْسَنَ وَمَنْ لَّا فَلَا حَرَجَ. (رواه ابوداود وابن ماجة والدارمی)

أخرجه أبو داؤد ۱/۳۳حدیث رقم ۳۵وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۱۲۱حدیث رقم ۳۳۷والدارمی فی السنن ۱/۱۷۷ حدیث رقم ٦٦٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی سرمہ لگائے تو اس کو چاہئے کہ طاق کی رعایت رکھتے ہوئے لگائے جس نے اس طرح کیا تو اس نے اچھا کیا اور جس نے اس طرح نہ کیا تو پھر بھی کوئی حرج نہیں۔ اس میں کوئی گناہ نہیں اور جو آدمی استنجاء بالاحجار کرے تو اس کو چاہئے کہ طاق کی رعایت رکھے۔ جس نے ایسا کیا تو اس نے اچھا کیا اور جس نے ایسا نہ کیا تو اس میں کوئی حرج اور گناہ نہیں اور جو آدمی کوئی چیز کھائے اور جو چیز خلال کے ذریعہ سے نکالے تو اس کو چاہیے کہ اس کو پھینک دے اور جو زبان کے ساتھ نکالے تو اس کو چاہئے کہ نگل لے۔ جس نے ایسا کر لیا تو اس نے اچھا کیا اور جو ایسا نہ کرے تو اس میں کوئی حرج اور گناہ نہیں اور جو آدمی قضائے حاجت کے لئے جائے تو اسکو چاہئے کہ پردہ کرے۔ اگر پردہ کرنے کیلئے کوئی اور چیز نہ ملے۔ تو کم از کم ریت جمع کر کے اس کا تودہ بنا لے اپنے پیچھے کی طرف۔ اس لئے کہ شیطان انسان کی مقعد کے ساتھ کھیلتا ہے، جس نے اس طرح کیا تو اس نے اچھا کام کیا ہے اور جس نے ایسا نہ کیا تو اس میں کوئی حرج اور گناہ نہیں اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام ابن ماجہؒ اور امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **من اکتحل:** ابن حجرؒ فرماتے ہیں **ای من اراد الاکتحال** اور اسی طرح باقی صورتوں میں (فعل سے ارادۂ فعل مراد ہے) (ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ یہ بات مخفی نہیں کہ سرمہ ڈالنے والا ایتار کا مامور ہے نہ کہ سرمہ ڈالنے کا ارادہ کرنے والا لہٰذا ارادا **لاکتحال** کی تقدیر نکالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اسی طرح باقی میں بھی اور معنیٰ یہ ہوگا: **من شرع فی الاکتحال** کہ جو سرمہ ڈالنا شروع کرے۔

فلیوتر: یعنی پے در پے تین سلائیاں پر آنکھ میں ڈالے اور بعض نے کہا ہے کہ دائیں میں تین اور بائیں میں دو ڈالے تاکہ مجموعہ وہ طاق عدد بن جائے اور تین مرتبہ وہ حضور ﷺ کے فعل سے ثابت ہے، ورنہ طاق تو ایک مرتبہ میں بھی صادق آتا ہے۔ شمائل ترمذی میں یہ روایت ہے کہ بے شک نبی ﷺ کیلئے ایک سرمہ دانی تھی ہر رات میں آپ ﷺ تین سلائیاں ایک میں اور تین دوسری میں ڈالتے تھے۔

فقد احسن: یعنی ایسا اچھا کام کیا کہ جس پر اس کو ثواب دیا جائے گا اسلئے کہ یہ حضور ﷺ کی سنت مبارکہ ہے اور اس لئے کہ اس آدمی نے اللہ تعالیٰ کے صفات میں سے ایک صفت اپنائی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ وتر ہیں وتر کو پسند کرتے ہیں اور یہ حدیث امور میں طاق عدد کے مستحب ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

ومن لا: ای لا یفعل الوتر۔

فلا حرج: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں اس بات کی دلیل موجود کہ حضور ﷺ کا امر وجوب پر دلالت کرتا ہے ورنہ یہاں وجوب کو ساقط کرنے کیلئے" **لا حرج**" کے ارشاد کی ضرورت نہ تھی۔

ومن لا فلاحرج۔ اس لئے کہ مقصود وہ محل کی صفائی ہے۔ یہ حدیث واضح دلیل ہے کہ تین پتھروں سے کم پر استنجاء جائز ہے اور اسی طرح استعمال احجار میں طاق عدد ہونا شرط نہیں ہے اور یہی امام صاحبؒ کا بھی مذہب ہے۔

فليلفظ : اى فليرم وليطرح ما اخرجه بالخلال۔ کہ خلال سے جو نکالا ہے وہ پھینک دے اور فما تخلل فليلفظ یہ جملہ شرطیہ من اکل کی جزاء ہو۔

ومالاك : یہ ما تخلل پر عطف ہے ای ما اخرجه بلسان۔ بعض نے کہا ہے کہ لوك کا معنی شیءکو زبان سے پھیرنا ہے۔

فليبتلع : یہ بھی جائز ہے کہ ماءموصولہ مبتداء ہو اور اس کی خبر فليلفظ ہو اور موصولہ کی خبر میں فاء کا آنا یہ اس کے شرط کے مشابہہ ہونے کی وجہ سے ہے یا شرط کے معنی کو متضمن ہونے کی وجہ سے ہے اور سارا جملہ شرط کی جزاء ہو۔

مظہرؒ فرماتے ہیں کہ خلال کے ہوئے کو پھینکنے کا حکم دیا ہے اس لئے کہ بسا اوقات خلال کرنے میں خون بھی نکل آتا ہے بخلاف زبان سے نکالنا۔

فقد احسن : یعنی احتیاط پر عمل کیا ہے۔

ومن لا فلا حرج : بے شک یہاں پر حرج کی نفی کی ہے۔ اس لئے کہ خلال میں خون کا نکلنا یقینی نہیں ہوتا اور اگر یقین ہو جائے تو پھر نگلنا حرام ہے۔

فليستتر : علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ پردہ کرنے کا حکم دیا بقدر استطاعت قضائے حاجت کے وقت، تاکہ ایسی جگہ میں نہ بیٹھے کہ جہاں لوگوں کی نظر پڑے، پس اس کا سرفاش ہوگا۔ یا ہوا چلے گی تو اس نجاست کی تری اس کو بھی لگ سکتی ہے۔ پس اس کے کپڑے اور بدن خراب ہو جائیں گے اور یہ سارا کا سارا شیطان کے اس سے کھیلنے اور فساد پھیلانے کا ارادہ کرنے کی وجہ سے ہوگا۔

الان يجع كثيبا من رمل من رمل فليستدبره : علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ استثناء متصل ہے: اى فان لم يجد مايستتر به الاجمع كثيب من رمل فليجمعه ويستدبره۔ (یہاں پر پشت چھپانے کا خاص طور پر حکم دیا) کیونکہ اگلے حصے کو چھپانا دامن یا رانوں کو جمع کرنے کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے۔

فان الشيطان : شيطان فيعال کے وزن پر ہے، شطن سے معنی ہے۔ بعد (دور ہوا) یا شاط سے فعلان کے وزن پر ہے معنی ہے ہلاک ہوا۔

بمقاعد بنى ادم : یعنی شیطان غیر کو اس کی طرف دیکھنے کے وسوسہ ڈالنے پر قادر ہو جائے گا۔

فقد احسن : کیونکہ شیطان کو اس نے رنجیدہ کیا اور وسوسہ کو ختم کیا (ومن لا فلاحرج) اى اذا لم يره۔ یعنی جبکہ اس کو کوئی نہ دیکھے باقی جب ضرورت ہو (اور ستر کی جگہ نہ ہو) تو پھر گناہ دیکھنے والے کا ہوگا نہ کہ قضائے حاجت کرنے والے پر۔

بول فی المغتسل سے وسواس پیدا ہوتے ہیں

۳۵۳ : وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَبُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ فِيْ مُسْتَحَمِّهٖ ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيْهِ اَوْيَتَوَضَّأُ فِيْهِ فَاِنَّ عَامَّةَ الْوَسْوَاسِ مِنْهُ (رواہ ابوداود والترمذی والنسائی) اِلَّا اَنَّهُمَا لَمْ

يَذْكُرَا ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيْهِ اَوْيَتَوَضَّأُ فِيْهِ

أخرجه أبو داؤد في السنن ١ / ٢٩ حديث رقم ٢٧۔ وابن ماجة ١ / ١١١ حديث رقم ٣٠٤۔ وأخرجه النسائي ١ / ٣٤ حديث رقم ٣٦۔ والترمذي ١ / ٣٢ حديث رقم ٢١ ولم يذكر "ثم يغتسل"۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی آدمی اپنے غسل خانہ میں پیشاب نہ کرے۔ جس میں پھر غسل کرے یا وضو کرے یعنی عقل مند انسان ایسا نہیں کر سکتا کہ غسل خانہ میں پیشاب کرے پھر وہیں غسل اور وضو کرے۔ کیونکہ اس سے اکثر وساوس پیدا ہوتے ہیں۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام نسائی نے روایت کیا ہے ترمذی اور امام نسائی نے **ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيْهِ اَوْيَتَوَضَّأُ فِيْهِ**۔ کے الفاظ ذکر نہیں کیے۔

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن مغفل ۔ یہ عبداللہ بن مغفل مزنی ہیں۔ غ معجمہ اور فاء مثقلہ مفتوحۃ کے ساتھ ہے بروزن محمد ہے اصحاب صفہ میں سے ہیں۔ باپ بیٹا دونوں صحابی ہیں' پہلے ان لوگوں میں سے ہیں جو تستر میں داخل ہوئے جب مسلمانوں نے اس کو فتح کیا۔ یہ اصحاب شجرہ میں سے ہیں۔ ان کے والد کو بھی شرف صحابیت حاصل ہے۔ مدینہ میں قیام فرمایا پھر وہاں سے بصرہ چلے گئے اور یہ ان دس میں سے ایک شخص ہیں جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بصرہ بھیجا تھا جو لوگوں کو دین سکھلاتے تھے۔ ''بصرہ'' میں ۶۰ ھ کو انتقال فرمایا۔ ان سے ایک جماعت تابعین کی جن میں حسن بصری رحمہ اللہ بھی ہیں جو روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ بصرہ میں ان سے زیادہ بزرگ کوئی نہیں آیا۔ کازونی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''مغفل'' کبھی عین مہملہ اور قاف کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے اور کبھی غیر منصرف باللہ ذکر کرتے ہیں اور کبھی فاء کے ساتھ ذکر کرتے ہیں یہ گمان کرتے ہوئے کہ لام تعریف فاء اور غیر فاء والے کے درمیان فارق ہے۔ مصابیح میں اس رسم الخط کے ساتھ موجود ہر اسم غین معجمہ اور فاء مہملہ اور قاف کے ساتھ اسم نام کے کوئی صحابی نہیں ہیں۔ البتہ تابعین میں ہیں۔

تشریح: **لا یبولن احدکم**: ازھار میں ہے کہ یہ نہی تنزیہی ہے۔

فی مستحمه۔ مستحم وہ جگہ کہ جس میں غسل کیا جاتا ہے اور یہ حمیم سے ہے اور حمیم گرم پانی کو کہتے ہیں اور یہاں مطلقاً غسل خانہ مراد ہے اور اسی کے معنی میں وضو خانہ بھی ہے اور اسی وجہ سے اس کے بعد فرمایا (**اویتوضا**) (**ثم**) یہ استبعادیہ ہے یعنی عقلمند سے یہ بعید ہے کہ اس سے پہلے اور بعد والی کو اکٹھا کرے۔

یغتسل فیه : اس میں رفع بھی جائز ہے **ای ثم هو یغتسل** اور جزم بھی اور یہی ظاہر ہے اور نہی کے جواب میں نصب کو بھی جائز قرار دیا گیا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ **ثم** کو واؤ کے قائم مقام مانا جائے لیکن اس صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ نہی تمام باتوں سے متعلق ہے جیسا کہ اس جملہ میں: **لا تاکل السمك وتشرب اللبن**۔ حالانکہ جس سے روکا گیا ہے وہ غسل خانے میں پیشاب کرنا ہے۔ برابر بات ہے کہ اس میں غسل کرے یا نہ کرے۔ یہ علامہ طیبیؒ کا کلام ہے۔

''مغنی'' میں ہے کہ کوفیین نے **ثم** کو فاء اور واؤ کے قائم مقام بنایا ہے، اس مضارع کو نصب دینے کے جواز میں کہ **ثم** کے ساتھ ملا ہوا ہو اور فعل شرط کے بعد ہو اور انہوں اپنے مدعیٰ کو ثابت کرنے کیلئے حسنؒ کی قراءت سے استدلال کیا ہے: ﴿وَمَنْ

يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ﴾ [النساء : ۱۰۰] "اور جو شخص خدا اور رسول کی طرف ہجرت کر کے گھر سے نکل جائے پھر اس کو موت آ پکڑے تو اس کا ثواب خدا کے ذمے ہو چکا۔"

يدرکه منصوب ہے۔

اور ابن مالکؒ نے ثم کو فاء اور واؤ کے قائم مقام مانا ہے طلب کے بعد۔ پس حضور ﷺ کے اس ارشاد : **لا يبولن احدکم في الماء الدائم الذی لا يجری ثم يغتسل منه**...... "کوئی آدمی اپنے غسل خانہ میں پیشاب نہ کرے۔ جس میں پھر غسل کرے یا وضو کرے یعنی عقل مند انسان ایسا نہیں کر سکتا کہ غسل خانہ میں پیشاب کرے پھر وہیں غسل اور وضو کرے۔ کیونکہ اس سے اکثر وساوس پیدا ہوتے ہیں" میں تین وجہیں بن سکتی ہیں:

① **يغتسل** مرفوع ہو۔ تو اس صورت میں تقدیر عبارت ہوگی **ثم هو يغتسل** اور روایت بھی اسی طرح وارد ہے۔

② مجزوم ہو۔ اس صورت میں فعل نہی پر عطف ہوگا۔

③ نصب یعنی منصوب ہو۔ تو اس وجہ میں ثم کو واؤ جمع کا حکم دیا جائے گا اور یہاں پر ان کے شاگرد علامہ نوویؒ کو وہم ہوا ہے کہ انہوں نے اس کے حکم دینے سے مراد جمع کے معنی کا فائدہ دینا سمجھا ہے (یعنی واؤ جمع کیلئے ہے تو پھر ثم بھی مطلق جمع کیلئے ہوگا) تو اس بناء پر کہا ہے کہ نصب **يغتسل** میں جائز نہیں ہے کیونکہ یہ اس کی متقاضی ہے کہ **منهی عنه** ان دونوں کا جمع کرنا ہے نہ کہ ان میں سے کسی کا افراد۔ حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے بلکہ منع وہ پیشاب کرنا ہے۔ برابر بات ہے کہ وہ اس میں غسل کرنے کا ارادہ کرے یا اس سے (غسل کرے) یا نہ کرے۔

(ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ ابن مالکؒ نے ثم کو واؤ اور فاء کے حکم دینے سے صرف نصب دینا مراد لیا ہے (دونوں جملوں کی) معیت مراد نہیں لی ہے۔ پھر جو انہوں نے کہا ہے وہ مفہوم کے اعتبار سے ہے، منطوق کے اعتبار سے نہیں اور منطوق کے مراد نہ ہونے پر ایک دوسری دلیل بھی موجود ہے۔ اس کی نظیر علامہ زجاجؒ اور جار اللہ زمخشریؒ کا : **ولا تلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق**۔ میں **تکتموا الحق** کو مجزوم اور منصوب دونوں طرح جائز قرار دینا ہے۔ حالانکہ منصوب ہونے کی صورت میں تمام سے نہی ہوگی (جو کہ معنی کے اعتبار سے صحیح ہیں) لہٰذا امام نوویؒ کا قول اس حدیث میں جس کو ابن مالکؒ نے ذکر کیا ہے کہ نہی دونوں سے ہوگی وہ صحیح ہے اگرچہ صرف ایک کی نہی دوسری حدیث سے معلوم ہوتی ہے جیسا کہ مخفی نے اس پر تنبیہ کی ہے بخلاف امام طیبی کا کلام کہ اس جگہ جس سے روکا گیا ہے وہ صرف پیشاب کرنا ہے غسل کرے یا نہ کرے (**وہ تحت النهی** نہیں ہے) یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ درست بات یہ ہے کہ نہی تمام ہی سے ہے اس علت کی وجہ سے جو اسی حدیث میں مذکور ہے اور اس لئے بھی کہ اگر غسل خانہ میں پیشاب کرے اور اس میں غسل نہ کرے اس طرح کہ اس میں غسل کرنے کو چھوڑ دے یا اس میں پہلے غسل کر لیا اور پیشاب نہ کیا تو یہ اس کے لئے جائز ہے۔

فان عامة الوسواس : یعنی طہارت کے بارے میں اکثر وساوس۔

منه ۔ **ای يحصل من البول في المستحم۔ ثم الغسل فيه**۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ وجہ یہ ہے کہ جب وہ جگہ پیشاب کرنے سے ناپاک ہوگئی تو اس کے دل میں یہ وسوسہ آئے گا کہ کہیں پیشاب کے کچھ چھینٹے پانی پڑنے کی وجہ سے اس پر نہ

پڑ گئے ہوں۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ وساوس اس لئے ہونگے کہ جب پاک پانی پیشاب سے ناپاک زمین پر پڑے گا، پھر وہی پانی اسی کی طرف لوٹے گا۔ اسی وجہ سے اس میں پیشاب کرنے کو مکروہ کہا گیا ہے۔ لہٰذا اگر جگہ ایسی ہو کہ پانی کے چھینٹے لوٹ کر اس پر نہ پڑیں یا وہاں پر پانی کے نکلنے کیلئے سوراخ ہو کہ پانی کھڑا نہ ہوتا ہو تو اس میں پیشاب کرنا مکروہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ وساوس کا باعث نہیں بنے گا۔ پہلی صورت میں اس وجہ سے کہ وہاں چھینٹے پڑنے سے حفاظت ہے اور دوسری صورت میں اس لئے کہ تھوڑے سے پانی کی وجہ سے زمین پاک ہو جائے گی۔

(ملا علی قاریؒ) فرماتے ہیں یہ بات ہمارے علامہ طیبیؒ پر اعتراض کی تائید ہے۔ ابن حجرؒ یا تو علامہ طیبیؒ کے کلام کو بھول گئے ہیں یا علامہ نوویؒ کے کلام کی طرف منتقل ہوئے ہیں اسی وجہ سے اس سے خاموشی اختیار کی ہے۔ واللہ اعلم۔

لم يذكرا ثم يغتسل فيه او يتوضا فيه اور مطلق ذکر ہونے کی شاید یہ وجہ ہے کہ لفظ مستحم سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ جس میں غسل اور وضو کیا جائے۔ یا اکثر ایسا ہوتا ہے اس کو دیکھتے ہوئے مطلق ذکر کیا۔

سوراخ میں پیشاب کرنا منع ہے

۳۵۴: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَرْجِسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَبُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ فِيْ جُحْرٍ.

(رواه ابو داود والنسائی)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۱/ ۳۰ حديث رقم ۲۹ والنسائی فی السنن ۱/ ۳۳ حديث رقم ۳٤ وأخرجه أحمد فی المسند ۵/ ۸۲۔

ترجمه: ”حضرت عبداللہ بن سرجسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی آدمی کسی سوراخ میں پیشاب نہ کرے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام نسائیؒ نے روایت کیا ہے۔“

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن سرجس۔ یہ عبداللہ بن سرجس ”مزنی“ ہیں اور ان کو ”مخزومی“ بھی کہا جاتا ہے۔ ”سرجس“ بروزن ”نرجس“ ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ مخزومی کے حلیف ہیں مخزومی نہیں ہیں۔ یہ بصری ہیں ان کی حدیث بصرہ والوں میں پائی جاتی ہے۔ ان سے عاصم احول وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ سرجس میں دو سین ہیں جن کے درمیان جیم ہے ”نرجس“ کی طرح ہے۔ جیم مکسور اور سین مفتوح ہے اور ایک نسخہ میں جیم کے فتحہ اور سین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں کہ نون کے کسرہ کے ساتھ اور فتحہ کے ساتھ ہے اور مادہ رج س ہے اھ۔ چنانچہ نون زائدہ ہے لہٰذا غیر منصرف ہے جیسا کہ بعض نسخوں میں مذکور ہے اور معتمد یہ ہے کہ منصرف ہے نون کے فتح، راء کے سکون اور جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یہی بات ”مغنی“ میں بھی ہے اور ایک نسخہ میں جیم کے فتحہ کے ساتھ ہے اس کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی ہے۔

تشریح: **عبد الله بن سرجس** : دو سینوں کے ساتھ ان کے درمیان جیم ہے۔ نرجس کے وزن پر ہے اسی طرح

جامع الاصول میں مذکور ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے اسماء الرجال کے بیان میں اسی کو لیا ہے اور تہذیب میں ہے کہ سین کے فتحہ جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے اور قاموس میں ہے النرجس نون کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ ہے۔ پھر یہ اصل نسخہ میں منصرف ہے اور بعض نسخوں میں سین کے فتحہ کے ساتھ غیر منصرف ہے اور یہی ظاہر بھی ہے۔

ابن حجرؒ اور ابن الملکؒ فرماتے ہیں سرجس غیر منصرف علمیت اور عجمہ کی وجہ سے۔ ہمارے شیخ مولانا عبداللہ سندھی مرحوم نے فرمایا ہے کہ اس کو نرجس کی طرح ضبط کیا گیا ہے اس صورت میں یہ غیر منصرف ہے عجمہ اور علمیت کی وجہ سے اس لئے کہ عربوں کے کلام میں فعلل لام کے کسرہ کے ساتھ نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ وزن رباعی کے امر کے ساتھ خاص ہے اور باقی نرجس میں نون زائد ہے اور اگر اس کو جعفر کی طرح ضبط کیا جائے تو یہ منصرف ہوگا۔ سیوطیؒ نے حاشیہ بخاری میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔

ملاّ علی قاریؒ فرماتے ہیں اگر جعفر کی طرح اس کو ضبط کریں تو لام اولی کا فتحہ لازمی ہوگا اس لئے کہ علماء کے ضبط کرنے سے مقصود حرکت اور سکون کا بیان کرنا ہے نہ کہ متصرف اور غیر منصرف ہونے کو بتلانا۔ ہاں البتہ اتنی بات یہاں ضرور ہے کہ اگر اس کو جعفر کی طرح ضبط کریں تو یہ منصرف ہوگا۔ کیونکہ عجمہ کی علت (فعلل کے وزن کا بکسر اللام نہ پایا جانا) اس وقت ختم ہو جائے گی۔ پس اس صورت میں اس کا منصرف ہونا متعین ہوگا لیکن اس فرض وتقدیر کی بناء پر جو جیم کے کسرہ کے ساتھ ثابت ہے اس سے اعراض نہیں کی جائے گا۔ البتہ پہلی سین کے مکسور ہونے کی صورت میں اس کا منصرف ہونا صحیح ہے جیسا کہ قاموس میں مذکور ہے۔ پس اس وقت یہ زبرج کی طرح ہوگا۔ واللہ اعلم

صاحب مشکوٰۃؒ فرماتے ہیں یہ مزنی ہیں اور بعض نے ان کو مخزومی کہا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ ان کے حلیف تھے اور یہ بصری ہیں اور ان کی حدیث بصرہ والوں میں معروف ہے ان سے عاصم احول وغیرہ نے روایت کی ہے۔

فی جحر : جیم کے ضمہ اور حاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ زمین یا دیوار کے سوراخ کو کہتے ہیں۔ نہی اس لئے فرمائی تا کہ ایسی چیز نہ اس سوراخ سے نکلے جو اس کو نقصان پہنچائے۔ یا بسا اوقات اس میں کمزور قسم کا جانور ہوگا تو اس کو اس کے پیشاب کرنے سے تکلیف ہوگی۔

بعض نے کہا ہے کہ وہ سوراخ جو پیشاب کرنے کیلئے بنایا گیا ہو اس میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے نہی کی وجہ یہ ہے کہ سوراخ موذی اور زہریلے جانوروں کا آماجگاہ ہوتی ہے تو ان کی طرف سے تکلیف پہنچنے سے امن نہیں ہوتا اور یہ بھی بعض حضرات سے منقول ہے کہ جو سوراخ میں پیشاب کرتا ہے، اس کو جنوں کی طرف سے تکلیف پہنچنے کا اندیشہ بھی ہوسکتا ہے۔ حضرت سعد بن عبادہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ ان کو جنات نے قتل کر دیا تھا کیونکہ انہوں نے حوران کے علاقے میں ایک سوراخ میں پیشاب کر دیا تھا اور کتب فقہ میں یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے سوراخ سے یہ بات سنی۔

نحن قتلنا سيد الخزرج سعد بن عبادة ☆ ورميناه بسهم فلم نخطی فواده

’’ہم نے خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو قتل کر دیا۔ اور ہم نے ایسا تیر مارا کہ جو ان کے دِل سے نہیں چونکا‘‘۔ واللہ اعلم

لعنت کے کاموں سے بچو

۳۵۵: وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِتَّقُوا الْمَلَا عِنَ الثَّلَاثَةَ الْبَرَازَ فِي الْمَوَارِدِ وَقَارِعَةَ الطَّرِيْقِ وَالظِّلِّ. (رواه ابوداود وابن ماجة)

أخرجه أبو داؤد في السنن ١ /٢٨ حديث رقم ٢٦۔ وابن ماجة في السنن ١ /١١٩ حديث رقم ٣٢٨۔

ترجمہ: ''حضرت معاذؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم تین امور سے بچو جو کہ لعنت کا سبب ہیں پانی کے گھاٹ پر بول و براز کرنے سے، راستہ کے اندر پیشاب کرنے سے اور سایہ میں پیشاب کرنے سے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: (الملاعن) ای مجالب اللعن۔ اس لئے کہ ان پر گزرنے والا لعنت کرتا ہے ان کے برے فعل کی وجہ سے یا اس لئے کہ انہوں نے لوگوں کے قابل نفع چیز کو خراب کر دیا تو یہ ظلم ہے اور ہر ظالم ملعون ہوتا ہے اور ملاعن 'ملعنۃ کی جمع ہے۔ مراد ہر وہ جگہ جس میں لعنت کثرت سے ہو جیسی کہ مأسدة (وہ جگہ کہ جہاں شیر کثرت سے ہوں) یا حدیث کے اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ تم ایسے فعلوں سے بچو جو عموماً اس کرنے والوں پر لعنت کو واجب کر دیتے ہیں۔ گویا کہ ان میں لعنت ہونے کا گمان ہے جیسا کہ اس حدیث الولد مبخلة مجبنة میں ہے۔ کہ اولاد بخل اور بزدلی (کا سبب ہے)۔

زین العربؒ نے فرمایا ہے کہ یہ ملعن کی جمع ہے اور ملعن مصدر میمی ہے یا اسم مکان ہے اور یہ لَعَنَ سے ہے معنی ہے شَتَم گالی دینا۔ اس کے مصدر ہونے کی صورت میں معنی یہ ہوگا: اتقوا للعنات ای اسبابها یا مصدر مبنی للفاعل ہوگا یعنی اجتنبوا اللاعنات ای الحاملات والباعثات علی اللعن۔ کہ جو لعنت کا سبب بنے اس سے بچو۔ پس یہ: اتقوا اللاعنین کی طرح ہوگا۔ واحد کی زیادتی کے ساتھ۔

الثلاثة۔ مواضع مراد ہیں یا افعال مراد ہیں، پہلا زیادہ بلیغ ہوگا کیونکہ وہ مبالغہ پر دلالت کرتا ہے۔ گویا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسی جگہوں سے بچو کہ جس میں یہ کام کئے جاتے ہیں۔ پس افعال کا کیا حال ہوگا (یعنی وہ بطریق اولی منهی عنهٗ ہے۔

البراز: منصوب ہے بدلیت کی وجہ سے اور عطف کے بعد ربط کی بناء پر یا اعنی فعل مقدر ہے اعنی التغوط والبول۔

فی الموارد: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد وہ پانی کی نہر اور چشمہ ہے جہاں لوگ پانی لینے اور استعمال کرنے آتے ہیں۔ پس اس کو محمول کیا جائے گا اس پانی پر جو ہمیشہ کھڑا ہو، جاری نہ ہو۔

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ موارد سے مراد وہ جگہیں ہیں جہاں لوگ آتے ہیں جیسے مجالس یعنی لوگوں کے باتیں کرنے کی جگہیں۔

بعض نے فرمایا ہے یہ موردة کی جمع ہے۔ ورود سے مفعله کے وزن پر مراد پانی کے گزرنے کا راستہ، اگرچہ وہاں پانی نہ ہو۔

قارعة الطريق۔ قارعة الطريق مراد وہ درمیانہ راستہ کہ جو کو لوگ اپنے پیروں سے روندتے ہوں اور اس پر چلتے ہوں۔

(یعنی جو عام گزرگاہ ہو)

والظل !مراد درخت وغیرہ کا سایہ ہے کہ جس میں لوگ آرام کرتے ہیں اور اپنی سواریاں بٹھاتے ہوں۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ گرمیوں میں سایہ کی جگہیں اور اسی طرح سردی میں دھوپ سینکنے کی جگہیں۔ پھر یہاں یہ بات مخفی نہیں ہے کہ ظل کو گرمیوں سے مقید نہ کرنا اولی ہے۔

اسنادی حیثیت : میرک شاہؒ فرماتے ہیں امام ابوداوُدؒ نے اس پر خاموشی اختیار کی ہے۔ اس کی سند حسن ہے۔

قضائے حاجت کے وقت گفتگو مکروہ ہے

۳۵۶ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَا یَخْرُجُ الرَّجُلَانِ یَضْرِبَانِ الْغَائِطَ کَاشِفَیْنِ عَنْ عَوْرَتِھِمَا یَتَحَدَّثَانِ فَاِنَّ اللّٰہَ یَمْقُتُ عَلٰی ذٰلِكَ. (رواه احمد وابوداود وابن ماجة)

أخرجه أحمد في المسند ٣/٣٦وأخرجه أبو داوٗد في السنن ١/٢٢حديث رقم ١٥وابن ماجة في السنن ١/١٢٣ حديث ٣٤٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دو آدمی قضائے حاجت کے لئے اس طرح ساتھ نہ جائیں کہ دونوں اپنی شرم گاہ کو کھول کر باتیں کریں کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ اس حدیث کو امام احمدؒ، امام ابوداوُدؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **لا یخرج الرجلان** : اکثر شارحین کا خیال ہے کہ یہ مجزوم ہے اس لئے کہ یہ نہی ہے۔ پس یہ ملانے کی صورت میں جیم کے کسرہ کے ساتھ ہوگا اور بعض نے کہا کہ یہ نفی ہے، پس اس صورت میں جیم کے ضمہ کے ساتھ ہے ملانے کی صورت میں۔ الرجلان کی طرح **المرء تان** بھی ہے یعنی عورتوں کا بھی یہی حکم ہے۔

الغائط : پس یہاں سبب کو ذکر کر کے مسبب مراد ہے۔ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کہا جاتا ہے: **خربت الارض اذا اتیت الخلاء** اور **ضربت في الارض** سے مراد **اذا سافرت** ہے اور ابھریؒ فرماتے ہیں **الضرب فی الارض** سے مراد ہے زمین کے اوپر جانا اور اصل اس میں یہ ہے کہ جانے والا اس کو اپنے پیروں سے مارتا ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ بعض نے کہا ہے کہ غائط یہ منصوب **بنزع الخافض** ہے **ای للغائط** ۔مختصر النہایہ میں ہے کہ: **یضرب الغائط والخلاء والارض** اس وقت بولا جاتا ہے کہ جب قضائے حاجت کیلئے جائے تو مطلب حدیث کے اس جملہ کا یہ ہوگا کہ وہ دو آدمی جو قضائے حاجت کیلئے چل رہے ہوں یا بیت الخلاء میں آ رہے ہوں اس حال میں۔

کاشفین عن عورتھما۔ کہ ہر ایک دوسرے کے ستر کی طرف دیکھ رہا ہو جانے کے وقت یا پیشاب پاخانہ کرنے وقت۔

یتحدثان۔ یہ حال ثانی ہے اور طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ **یضربان یتحدثان** یہ رُجلان کی صفتین ہیں۔ اس لئے کہ الف لام (تعریف) جنس کیلئے ہے۔ **ای رجلان من جنس الرجال** اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ دونوں خبریں ہوں مبتدا محذوف کیلئے

ای هما يضربان ويتحدثان بطور استئناف کے اور کاشفین حال مقدرہ ہو **یضربان** کی ضمیر سے اور اگر **یتحدثان** کی ضمیر سے حال ہو تو پھر حال مقدرہ نہ ہوگا۔ان تمام تقادیر کی بناء پر نہی تمام چیزوں پر لاگو ہوگی۔کیونکہ یہ مجموعہ سارا کا سارا ہی سبب ہے مقت کا جو کہ غصے سے بھی زیادہ سخت ہے۔

یمقت: قاف کے ضمہ کے ساتھ ہے **ای یغضب**۔

ذلك۔ ای علی ماذکر۔یعنی اس تمام مرکب پر جو کہ حرام پر بھی مشتمل ہے اور وہ دوسرے کی موجودگی میں ستر کا کھولنا ہے اور مکروہ پر بھی اور وہ قضائے حاجت کے وقت باتیں کرنا ہے۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ قضائے حاجت کے وقت اور جماع کے وقت اللہ کا ذکر زبان سے نہیں کرے گا بلکہ دِل سے کرے گا۔

ابوعمر وفرماتے ہیں کہ حضور ﷺ پر (قضائے حاجت کی حالت میں) سلام کیا گیا تو حضور ﷺ نے جواب نہیں دیا اور جب حضور ﷺ بیت الخلاء میں چھینک مارتے تو دِل میں الحمدللہ کہتے۔اسی کو حسن، عمر، شعبی اور نخعی نے بھی ذکر کیا ہے۔

اس کی سند حسن ہے۔

بوقت بیت الخلاء دعا پڑھنا مسنون ہے

۳۵۷: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ هٰذِهِ الْحُشُوْشَ مُحْتَضِرَةٌ فَاِذَا اَتٰى اَحَدُكُمُ الْخَلَاءَ فَلْيَقُلْ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَآئِثِ۔ (رواہ ابوداود وابن ماجة)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ١/١٦ حديث رقم ٦۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ١/١٠٨ حديث رقم ٢٩٦ وأخرجه أحمد فی المسند ٤/٣٦٩۔

ترجمہ: ''حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیت الخلاء میں شیاطین اور جنات حاضر ہوتے ہیں۔اس لیے جب تم میں سے کوئی بیت الخلاء جائے تو یہ دعاء پڑھے۔''

راویٔ حدیث:

زید رضی اللہ عنہ **بن ارقم**۔یہ زید رضی اللہ عنہ بن ارقم ہیں۔ان کی کنیت ''ابوعمرو'' ہے۔یہ انصاری خزرجی ہیں ان کا شمار ''کوفیین'' میں کیا جاتا ہے۔کوفہ میں سکونت اختیار کی اور وہیں وفات پائی۔

عرضِ مرتب: مرتب عرض کرتا ہے کہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ مؤلف ان کی وفات ۸۷ اور عمر پچاسی (۸۵) سال ذکر کی ہے جب کہ ''الاکمال'' میں ان کا سن وفات چھیاسٹھ (٦٦) ہجری مذکور ہے اھ۔ان سے بہت سے حضرات نے روایت کی ہے۔جن میں عطاء بن یسار رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہ جمع ہے حُش کی ضمہ کے ساتھ یہ پائخانہ پھرنے کی جگہ کو کہتے ہیں اور فتحہ کے ساتھ اس کا معنٰی باغ ہے۔اس لئے کہ وہ لوگ گھروں میں بیت الخلاء بنانے سے پہلے وہ اکثر باغوں میں قضائے حاجت کرتے تھے۔

محتضرۃ: یعنی یہ جنات اور شیاطین کے حاضر ہونے کی جگہ ہیں۔ وہ اولادِ آدم کو تکلیف دینے اور نقصان پہنچانے میں گھات لگائے انتظار میں ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ ستر کے کھلنے کی جگہ ہے اور نیز اس میں اللہ کا ذکر بھی نہیں کیا جاتا۔

فلیقل: امر استحباب کیلئے ہے۔

الخبث: باء کے ضمہ اور سکون دونوں کے ساتھ مروی ہے۔

والخبائث: اس سے پہلے حدیث میں یہ بات گزری ہے کہ آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے تھے: اللھم؟أنی اعوذبك من الخبث والخبائث۔ تو لہٰذا اعوذ باللہ اور اعوذبك دونوں صیغوں میں اختیار ہوگا کہ جس کو چاہے پڑھ لے۔ ابن حجرؒ کی یہی رائے ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کبھی یہ کہے اور کبھی وہ یا دونوں کو جمع کرے یا اعوذ باللہ یہ خاص ہے اہل غفلت کے ساتھ اور اعوذبك یہ اھلِ حضوری اور مشاہدہ والوں کے ساتھ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہاں امر ہے اور وہ جو پہلے گزرا وہ فعل ہے۔

اسنادی حیثیت : اس کی سند حسن ہے۔

بسم اللہ شیطان کی آنکھ اور انسان کی شرمگاہ کے درمیان پردہ ہے

۳۵۸: وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سَتْرُمَا بَيْنَ اَعْيُنِ الْجِنِّ وَعَوْرَاتِ بَنِي اٰدَمَ اِذَا دَخَلَ اَحَدُهُمُ الْخَلَاءَ اَنْ يَّقُوْلَ بِسْمِ اللّٰهِ. (رواه الترمذی وقال هذاحديث غريب واسناده ليس بقوی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/۵۰۴حديث رقم ۶۰۶وقال حديث غريب لا نعرفه الامن هذا الوجه ۔ وابن ماجة ۱/۱۰۹ حديث رقم ۲۹۸۔

ترجمہ: ''حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب کوئی آدمی بیت الخلاء میں داخل ہو تو جنات کی آنکھوں اور انسان کی شرم گاہ کے درمیان پردہ یہ ہے کہ وہ کہے: بِسْمِ اللّٰهِ۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند مضبوط نہیں ہے۔

تشریح: اعین الجن: سَتر سین کے فتحہ کے ساتھ مصدر ہے اور بعض نے کہا ہے کہ کسرہ کے ساتھ ہے مراد حجاب (پردہ) ہے۔

وعورات: واؤ کے سکون کے ساتھ ہے۔

اذا دخل احدهم الخلاء: ایک نسخہ میں احدکم ہے۔ کازرونیؒ فرماتے ہیں مصابیح کے بعض نسخوں میں احدکم خطاب کے ساتھ ہے اور بغیر اَنْ کے اور صحیح یہ ہے کہ ضمیر غیب کے ساتھ اور اَنْ کے ساتھ ہو۔

اور علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں سَتر مبتدا ہے اور ما بین میں ما موصولہ مضاف الیہ ہے اور اس کا صلہ ظرف ہے: ای الفعل الذی تعلق به: اور مبتدا کی خبر حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے (ان یقول بسم اللہ) ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ دونوں تعوذ (جو پہلے گزرے ہیں) ان پر بسم اللہ کو مقدم کیا جائے گا۔

(ملا علی قاریؒ) فرماتے ہیں اسی بات میں کوئی بُعد نہیں ہے کہ بسم اللہ کو اُن سے مؤخر کیا جائے تاکہ یہ تلاوت کی طرح تعوذ

کوبسملہ پر مقدم کرنے کے موافق ہو جائے اور اگر ایک پر بھی اکتفاء کرے تو اصل سنت اداء ہو جائے گی اور جمع کرنا دونوں کو یہ افضل ہے۔ پھر ظرف یہاں پر قید واقعی اکثری ہے ستر کھلنے کیلئے جو پردے کا محتاج ہوتا ہے بسملہ کو مقدم کرنے کے ساتھ یہ قید احترازی نہیں ہے۔ پس بے شک مناسب ہے آدمی کیلئے کہ وہ جب ستر کھولنے کا ارادہ کرے کپڑے اتارنے کے وقت یا غسل کے وقت کو بسملہ پڑھ لے۔

(اور یہ بھی کہا ہے) **لا نعرفه الامن هذا الوجه** کہ صرف اسی طریق سے منقول ہے۔

اس کے باوجود فضائل اعمال میں اس پر عمل کیا جائے گا۔ خصوصاً جب کہ احمد نسائی نے حضرت علیؓ سے روایت بھی کیا ہے اور طبرانی نے حضرت انسؓ سے یہ روایت کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: **سر بين اعين الجن وبين عورات بني ادم اذا وضع احدهم ثوبه ان يقول بسم الله** ۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ (**ما**) زائدہ ہے حدیث سابق میں اور یہ کہ حکم عام ہے۔

بیت الخلاء سے خارج ہونے کی دعا

۳۵۹: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا خَرَجَ مِنَ الْخَلَاءِ قَالَ غُفْرَانَكَ.

(رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۱۲ حدیث رقم ۷ وقال حسن غریب۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۱۱۰ حدیث رقم ۳۰۰۔ وأخرجه الدارمی فی السنن ۱/۱۸۳ حدیث رقم ۶۸۰ وأخرجه أبو داوٗد ۱/۳۰ حدیث رقم ۳۰ وأحمد فی المسند ۶/۱۵۵۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب بیت الخلاء سے باہر تشریف لاتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔ **غُفْرَانَكَ**: اے اللہ میں تیری بخشش مانگتا ہوں۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ امام ابن ماجہؒ اور امام دارمی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **غفرانك**: یہ منصوب ہے فعل مقدر کی مستتر ہونے کی وجہ سے۔ بعض نے کہا ہے کہ اصل میں تقدیر یہ ہے **اغفر غفرانك**۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ مغفرہ کی طرح مصدر ہے معنی یہ ہے **اسئالك غفرانك** اور حضور ﷺ کے بیت الخلاء سے باہر آنے کے بعد اس دعا کو پڑھنے میں دو وجہیں بتلائی گئی ہیں۔

اوّل۔ کہ حضور ﷺ اس حالت سے استغفار کیا ہے کہ جس میں اللہ کے ذکر کو ترک کیا جاتا ہے کیونکہ آپ ﷺ تمام حالات میں اللہ کا ذکر کرتے تھے مگر قضائے حاجت وغیرہ میں (تو اس ذکر کے تسلسل میں کمی آنے کی وجہ سے **غفرانك** کہتے)۔

ثانی۔ انسانی طاقت اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی پوری شکر گزاری کرنے سے قاصر ہے کہ کھانے اور پانی کو آسانی سے گلے سے (معدہ میں) اتارنا اور غذا کی بدن کی مصلحت کے مطابق ایک مناسب طریقے سے قضائے حاجت تک ترتیب دینا۔ پس

ان نعمتوں کی حق ادائیگی کی کمی کا اعتراف کرتے ہوئے استغفار کو اپنی جائے پناہ بنایا اور افضل یہ ہے اس کے بعد وہ دعا پڑھے جو حدیث میں آئی ہے: **الحمد للّٰہ الذی اذھب عنی الاذی وعافانی** اور بعض آثار میں یہ دعا وارد ہے: **الحمد للّٰہ الذی اذھب عنی مایوذینی وابقی علی ما ینفعنی۔**

اسی طرح ابوداؤد اور نسائی نے بھی۔

اسنادی حیثیت: ان کی سند حسن ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں بھی اس کو روایت کیا ہے۔ میرک شاہؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

قضائے حاجت کے بعد پانی کے ساتھ استنجاء کرنا

۳۶۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا اَتَی الْخَلَاءَ اَتَیْتُهٗ بِمَآءٍ فِیْ تَوْرٍ اَوْ رَکْوَةٍ فَاسْتَنْجٰی ثُمَّ مَسَحَ یَدَهٗ عَلَی الْاَرْضِ ثُمَّ اَتَیْتُهٗ بِاِنَآءٍ اٰخَرَ فَتَوَضَّاَ۔ (رواہ ابوداود وروی الدارمی والنسائی معناہ)

أخرجه أبو داؤد فی السنن ۱/ ۳۹حدیث رقم ۴۵ وأخرجه ابن ماجة مختصرًا ۱/ ۱۲۸ حدیث رقم ۳۵۸ والدارمی ۱/ ۱۸۳ حدیث ۶۷۸۔ والنسائی ۱/ ۴۵ حدیث رقم ۵۰۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ بیت الخلاء کے لیے تشریف لے جاتے تو میں آپ کے لئے ایک برتن یا چمڑے کے چھاگل میں پانی لاتا تھا۔ آپ اس سے استنجاء کرتے۔ پھر ہاتھ کو زمین پر رگڑتے۔ پھر اس کے بعد میں پانی کا دوسرا برتن لاتا آپ اس سے وضو کرتے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے اور اسی کے ہم معنی روایت امام دارمیؒ اور امام نسائیؒ نے روایت کی ہے۔

راویٔ حدیث:

الحکم بن سفیان۔ یہ حکم بن سفیان ثقفی ہیں ان کو "سفیان بن الحکم" بھی کہا جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے آنحضور ﷺ سے کوئی حدیث نہیں سنی۔ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ان کا سماع ثابت ہے۔

تشریح: کان النبی: اور ایک نسخہ میں رسول اللہ ہے۔

تور: تاء کے فتحہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ) پیتل یا پتھر کا برتن جیسا کہ ٹب (کپڑے دھونے کیلئے) اس سے وضو کیا جاتا ہے اور اس میں کھایا جاتا ہے۔

رکوۃ: راء کے فتحہ اور کاف کے سکون کے ساتھ چمڑے سے بنا ہوا چھوٹا برتن (چھاگل) اس سے پانی پیا جاتا ہے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں اَو یہاں یا تو شک کیلئے ہے اور یہ شک اس راوی سے ہے جو ابو ہریرہؓ سے نقل کر رہا ہے یا اَو تنویع کیلئے ہے یعنی کبھی وہ لائے اور کبھی یہ۔

مسح یدہ علی الارض: ہاتھوں کے دھونے کے وقت بو کو زائل کرنے کیلئے اور یہ سنت ہے۔ ابن الملکؒ اور ابن حجرؒ نے ہی کہا ہے۔

ثم اتيته باناء آخر ،فتوضا: یہاں دوسرے برتن لانے سے یہ مراد نہیں ہے کہ استنجاء سے بچے ہوئے پانی سے وضو جائز نہیں ہے بلکہ دوسرا برتن اس لئے لائے کہ پہلے میں اتنا پانی نہیں تھا جو کہ وضو کیلئے کافی ہو اور اس حدیث میں اشارہ ہے۔ اس بات کی طرف کہ استنجاء میں خوب ستھرائی حاصل کرنی چاہیئے ۔ ہاں البتہ اتنا نہ ہو کہ جو وساوس کا باعث بن جائے پانی استعمال کرنے کے بارے میں۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں یہاں صاحب مشکوٰۃؒ کا دارمی کے ذکر کو اپنی عادت اور دوسرے حضرات کی عادت کے خلاف نسائی کے ذکر پر مقدم کرنے کا سبب یہ ہے کہ دارمی کی روایت نسائی کی روایت کے مقابلے میں اس معنی میں زیادہ واضح اور اتم ہے۔ (ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) عادت کے ساتھ مقید کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حقیقت میں تقدیم کے لائق وہ نسائی ہی ہیں۔ اس لئے کہ ان سے امام مسلم، ابوداؤد اور ترمذیؒ وغیرہ نے روایت کی ہے۔

اسنادی حیثیت : امام ابوداؤد اور منذریؒ اس پر خاموش رہے ہیں اور امام ترمذیؒ نے اسی کے معنی میں ایک روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کی ہے اور اس کی تصحیح بھی کی ہے۔ میرک شاہؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس کو ابن ماجہ نے سند حسن سے روایت کیا ہے۔

شرمگاہ پر پانی چھڑکنا

۳۶۱: وَعَنِ الْحَكَمِ بْنِ سُفْيَانَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا بَالَ تَوَضَّأَ وَنَضَحَ فَرْجَهُ. (رواه ابوداود والنسائی)

(رواه ابوداود والنسائی)

أخرجه أبو داوٗد ١/١١٧ حديث رقم ١٦٦۔ والنسائی ١/٨٦. حديث رقم ١٣٤ وابن ماجة ١/١٥٧ حديث رقم ٤٦١ وأحمد فی المسند ٣/٤١٠۔

ترجمہ: ”حضرت حکم بن سفیانؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب قضائے حاجت کر چکتے تو وضو کرتے اور اپنی شرمگاہ پر پانی چھڑک دیتے تھے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔“

تشریح: الحكم بن سفيان: یہ ثقفی ہیں اور صحابی رسول ﷺ ہیں۔ تقریب میں اسی طرح ہے۔ صاحب مشکوٰۃؒ نے فرمایا ہے ان کو سفیان بن الحکم بھی کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے روایت نہیں سنی۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں ان کا حضور ﷺ سے سماع میرے نزدیک صحیح ہے اور اس تقریر سے ابن حجرؒ کے قول کی وجہ ظاہر ہو جاتی ہے (انہوں نے کہا ہے) او سفيان بن الحكم ورنہ ان کا یہ قول شک میں ڈالنے والا تھا۔

و نضح فرجه: ای رشن ازاره ۔ یعنی یا تہبند کو یا شلوار کو تھوڑے سے پانی کے ساتھ چھینٹے مارتے وسوسہ دور کرنے کیلئے اور یہ امت کو تعلیم دینے کی خاطر تھا۔ نہایہ میں ہے **الانتضاح بالماء** کی صورت یہ ہے کہ تھوڑا سا پانی لے کر اپنی شرمگاہ وغیرہ پر چھینٹے مارے وضو کے بعد تاکہ اس سے شک ختم ہو جائے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں۔ حضور ﷺ نے ایک چلو پانی اپنی شرمگاہ پر پھینکا استنجاء کے بعد یا تو پیشاب کے قطرات آنے کو ختم

کرنے کیلئے ایسا کیا یا وسوسہ کو دور کرنے کیلئے کیونکہ آدمی جب چھینٹے نہ مارے (شرمگاہ پر) اوراس کے بعد وہ تری دیکھے تو وہ گمان کرے گا کہ یہ پیشاب نکلا ہے۔ بخلاف جب پانی کا چھینٹا مارے تو اس وقت وہ یہ سمجھے گا کہ یہ تری پانی کے چھینٹا مارنے کی وجہ سے۔ پس وساوس میں مبتلا نہیں ہوگا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہاں ابن الملکؒ کے قول میں **یعلم یظن** کی جگہ میں مذکور ہے اظہر یہی ہے اوراس کا عکس بھی ہوسکتا ہے کہ **یظن یعلم** کی جگہ ہو۔ علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں **انتضاح** اور **نضح** کا معنی ہے پانی سے دھونا۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ اپنی شرمگاہ کو دھوئے تو وضو کرے اور واؤ یہ مطلق جمع کیلئے ہے۔ بعض نے کہا ہے توضاء یہ استنجاء کے معنی میں ہے۔ بعض حضرات نے یوں تشریح کی ہے کہ نضح کا معنی ہے چھینٹا مارنا۔ ابھریؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں اور ابن ماجہؒ نے بھی سند حسن سے نقل کیا ہے۔

رات کو برتن میں پیشاب کرنا

۳۶۲: وَعَنْ اُمَيْمَةَ بِنْتِ رُقَيْقَةَ قَالَتْ كَانَ لِلنَّبِيِّ ﷺ قَدْحٌ مِنْ عِيْدَانٍ تَحْتَ سَرِيْرَةٍ يَبُوْلُ فِيْهِ بِاللَّيْلِ۔ (رواه ابوداود والنسائی)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ۱/۲۸ حديث رقم ۲٤۔ وأخرجه النسائي في السنن ۱/۳۱ حديث رقم ۳۲۔

ترجمہ: ''حضرت امیمہ بنت رقیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے لکڑی کا پیالہ تھا۔ جو آپ کی چارپائی کے نیچے رکھا رہتا تھا۔ آپ ﷺ رات کو اس میں پیشاب کرتے تھے۔ اس حدیث کو امام ابوداوٗدؒ اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔''

امیمة: ہمزہ کے ضمہ، یاء کے سکون کے ساتھ۔

راویٔ حدیث:

امیمہ بنت رقیقہ: یہ امیمہ ہیں مشہور صحابیہ ہیں جو رقیقہ کی بیٹی ہیں' ان کے والد کا نام ''عبداللہ'' ہے۔ ''رقیقہ'' خویلد کی بیٹی اور حضرت خدیجہ زوجہ نبی کریم ﷺ کی بہن ہیں۔ ان کا شمار اہل مدینہ میں ہے۔ رقیقہ میں راء مضموم ہے اور دونوں قاف پر زبر ہے اور درمیان میں دو نقطوں والی یاء ساکن ہے۔

تشریح: بنت رقیقه: یہ خدیجہ بنت خویلد کی بہن ہیں۔ جامع الاصول میں اسی طرح ہے اور تقریب التہذیب میں ہے کہ یہ دونوں اسماء تصغیر کے ساتھ ہیں اور امیمہ کے والد کا نام عبداللہ ہے اور یہ صحابیہ ہیں۔ ابن الملکؒ نے ذکر کیا ہے کہ یہ اپنی والدہ کی طرف سے حضور ﷺ کی پھوپھی تھی۔ صاحب مشکوٰۃؒ نے رقیقہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ رقیقہ، راء کے ضمہ اور دونوں قاف کے فتحہ اور یاء کے ساتھ ہے۔

قدح من عیدان: ازھار میں ہے **ای من عود من العیدان**۔ یعنی یہ پیالہ **عیدان** (کھجور کے درخت) کی لکڑی سے بنا تھا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ عیدان کے ٹکڑوں سے جوڑ کر بنایا گیا تھا۔

اور میرک شاہؒ فرماتے ہیں۔ مشکوٰۃ اور مصابیح کے نسخوں میں عین کے کسرہ کے ساتھ ہے اور شراح حدیث نے اس کی یہ

وضاحت کی ہے کہ یہ عود کی جمع ہے اور عود لکڑی کو کہتے ہیں اور عود کی جمع کا ذکر کرنا اجزاء کے اعتبار سے ہے جیسے: **برمة اعشار** (پتھر کی ہانڈی کے ٹکڑے) میں اعشار کا ذکر اجزاء کے اعتبار سے ہے۔

صحیح بات یہاں پر کہ جس کو محققین نے اختیار کیا ہے کہ یہ **عیدان** عین کے فتحہ کے ساتھ۔ شیخ مجدالدین فیروز آبادی نے اپنی کتاب قاموس میں لکھا ہے: **العیدان** یہ کھجور کے لمبے درخت کو کہتے ہیں اور یہ عین کے فتحہ کے ساتھ ہے اور اس کی واحد **عیدانة** ہے۔ یہ ایک لکڑی کا پیالہ تھا، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب کرتے تھے اور مصابیح کی تخریج کرنے والے نے بھی اسی کی تصحیح کی ہے کہ یہ فتح کے ساتھ ہے۔ (واللہ اعلم)

تحت سریرہ: اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ چارپائی پر سونا یہ زہد کے منافی نہیں ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر معمولی قسم کے بستر پر اکتفاء فرماتے تھے۔ ایک بار اس بستر کو دوہرا کر دیا گیا تو آپ علیہ السلام نے اس کو اسی طرح بچھانے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا کہ اس کی نرمی نے مجھے اپنے وظائف کیلئے اٹھنے سے روکا یا فرمایا کہ قریب تھا کہ اس کا نرم ہونا مجھے اٹھنے سے روک دیتا۔

یبول فیه باللیل: رات کے وقت اپنے نفس کو تھکانے سے بچانے کے لئے بول کرتے اور اُمت کو تعلیم دینے کے واسطے، کیونکہ اُمت جب بولا کرے گی تو وہ رات کے وقت بیت الخلاؤں میں داخل ہونے سے بچے گی۔ کیونکہ بیت الخلا ئیں شیاطن کے رہنے کی جگہ ہے اور ان کا رات کے وقت نقصان پہنچانا بنسبت دِن کے زیادہ ہے۔

امام داؤد اور منذریؒ نے اس پر خاموشی اختیار کی ہے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی سند حسن ہے۔

کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا حکم

۳۶۳ وَعَنْ عُمَرَ قَالَ رَاٰنِیْ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا اَبُوْلُ قَائِمًا فَقَالَ یَا عُمَرُ لَا تَبُلْ قَائِمًا فَمَا بُلْتُ قَائِمًا (رواہ الترمذی و ابن ماجة قال الشیخ الامام محی السنة رحمه الله) قَدْ صَحَّ۔

اخرجه الترمذی فی السنن تعلیقاً وضعفه ۱/۱۷۔ وابن ماجه ۱/۱۱۱ حدیث رقم ۳۰۵ عن حذیفة۔

ترجمه: ”حضرت عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن مجھے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا عمر کھڑے ہو کر پیشاب نہ کیا کرو۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے کبھی کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔ حضرت امام محی السنۃؒ فرماتے ہیں۔“

تشریح: **وانا ابول قائما**: یہ دونوں حال متداخلہ ہیں۔

لاتبل قائما: علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں۔ نہی تنزیہی ہے اور نہی کی علت یہ ہے کہ اس میں ستر ظاہر ہوگا اس طرح کہ لوگ اس کو دیکھیں گے اور پیشاب کے واپس اس پر پڑنے سے بچاؤ بھی نہیں ہوگا۔

فما بلت قائما بعد: اور اک نسخہ میں **بعدہ** ضمیر کے ساتھ ہے **ای بعد هذا النهی** حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بجالاتے

ہوئے۔

امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ حدیث دو وجہ سے ضعیف ہے۔

(اوّل) اس لئے کہ اس میں مرفوع روایت کرنے والا راوی عبدالکریم بن ابی المخارق ہے اور وہ محدثین کے ہاں ضعیف ہے۔ امام ابوداؤد سجستانی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے اور ان کے علاوہ بعض دوسرے حضرات نے ان میں کلام کیا ہے۔

(ثانی) ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (**ما بلت قائما منذ اسلمت**) کہ جب سے میں مسلمان ہوا ہے میں نے کھڑے ہوکر پیشاب نہیں کیا اور یہ عبدالکریم بن ابی المخارق کی حدیث سے زیادہ صحیح روایت ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں **ان من الجفاء ان تبول قائما** (کھڑے ہوکر پیشاب کرنا یہ گنوار پنا ہے)۔ امام ترمذیؒ نے اس کو روایت کیا ہے۔ میرک شاہؒ نے ازھار سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ دوسری وجہ محلِ نظر ہے اس لئے کہ دونوں روایتوں (**ما بلت قائما منذ اسلمت**) اور (**فما بلت قائما بعد**) میں تطبیق ممکن ہے وہ اس طرح کہ **منذاسلمت** کا مطلب یہ ہے کہ **منذاسلمت و نهيت عن البول قائما**۔ کہ اسلام لانے کے بعد اور اس سے منع کیے جانے کے بعد میں نے کھڑے ہوکر پیشاب نہیں کیا۔ کیونکہ کسی چیز کا اچھا یا برا ہونا وہ شارع علیہ السلام ہی سے معلوم ہوسکتا ہے۔

۳۶۴ :عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ اَتَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُبَاطَةَ قَوْمٍ فَبَالَ قَائِمًا (متفق عليه) قِيْلَ كَانَ ذٰلِكَ لِعُذْرٍ......

أخرجه الترمذي في السنن تعليقاً وضعفه ١٠/١٧ ـ وابن ماجة ١١١/١ حديث رقم ٣٠٥ عن حذيفة ـ

ترجمہ: ''حضرت حذیفہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک قوم کی کوڑی پر آئے اور وہاں کھڑے ہوکر پیشاب کیا۔ امام بخاری و مسلم نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ آپ کا کھڑے ہوکر پیشاب کرنا عذر کی وجہ سے تھا۔''

تشریح: **سباطة قوم** (سین کے ضمہ اور باء کے ساتھ) کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ۔ ابھریؒ نے اسی طرح فرمایا ہے بعض نے کہا ہے کہ **سباطه** اصل میں گھر کے کوڑا کرکٹ کو کہتے ہیں پھر اس کا استعمال کوڑا پھینکنے کی جگہ میں مجازاً ہونے لگا۔ پھر مزید اس میں وسعت ہوئی تو اس کو **فنا** (کھلی جگہ) کے معنی میں استعمال کرنے لگے۔

فبال قائما: بعض محدثین نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت عمر کو حضور ﷺ کا روکنا وہ نہی تنزیہی پر محمول ہوگا نہ کہ نہی تحریمی پر اور بعض نے فرمایا ہے کہ وہ روکنا بطور نہی تحریمی کے تھا اور حضور ﷺ کا یہ فعل عذر کی وجہ سے تھا اور عذر یا تو بیٹھنے کیلئے جگہ نہ پانا تھا، یا آپ ﷺ کے پیر مبارک میں کوئی تکلیف تھی جس سے بیٹھنا مشکل تھا۔

ابوالليثؒ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کی اجازت دی ہے اور بعض حضرات نے اس کو بغیر عذر کے مکروہ قرار دیا ہے اور یہی ہمارا مذہب ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ کناسہ اور سباطہ وہ جگہ ہے کہ جس میں کوڑا کرکٹ اور مٹی وغیرہ پھینکی جاتی ہے، اور اسی طرح جو گھروں سے کوڑا اکٹھا کیا جاتا ہے اور قوم کی طرف سباطہ کی اضافت یہ تخصیص کیلئے ہے تملیک کیلئے نہیں اس لئے کہ یہ شور یلی مردہ

زمین تھی۔

ابھریؒ فرماتے ہیں اگر یہ زمین کسی کی ملکیت میں ہوتی تو حضور ﷺ اس میں پیشاب نہ کرتے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس میں یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کو صراحۃً یا اور کسی طرح ان کا اجازت دینا معلوم ہو۔ شرح السنۃ میں ہے کہ سباطہ اکثر زمین سے بلند ہوتی ہے اس میں پیشاب کرنے والے کی طرف پیشاب کے چھینٹے نہیں لوٹتے اور یہ نرم ہوتی ہے۔

ابھریؒ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ کوڑے والی جگہ کا جو حصہ آپ ﷺ کے سامنے تھا وہ بلند تھا اور جو آپ ﷺ کے پیچھے کی طرف تھا وہ پست تھا اگر اس کی طرف منہ کر کے بیٹھتے تو پیچھے کی طرف گر جاتے اور اگر پشت کر کے بیٹھتے تو آپ ﷺ کا ستر لوگوں کے اوپر ظاہر ہوتا تھا۔ (اس لئے آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا)۔

شیخ محی الدینؒ فرماتے ہیں اگر یہ حدیث صحیح ہو جائے تو یہ تمام سابقہ روایات سے مستغنی کر دیتی ہے۔ لیکن دار قطنی اور بیہقی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے اور اظہر بات یہ ہے کہ اس کو حضور ﷺ نے بیان جواز کیلئے تھا۔ ابھریؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

فيل كان ذلك لعذر: سید جمال الدینؒ فرماتے ہیں۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ حضور ﷺ نے کھڑے ہو کر اس لئے پیشاب کیا کیونکہ آپ ﷺ نے جگہ کے نجاست سے بھرا ہونے کی وجہ سے بیٹھنے کے لئے جگہ نہیں پائی اور بعض نے کہا ہے کہ آپ ﷺ نے ایسا اس لئے کیا کہ اگر اس کی طرف پشت کرتے تو گزرنے والوں کیلئے آپ ﷺ کا ستر ظاہر ہوتا تھا، اور اگر اس کی طرف منہ کرتے تو کمر کے بل گرنے کا ڈر تھا اور ساتھ ساتھ پیشاب واپس آپ ﷺ پر چھینٹے پڑنے کا بھی اندیشہ تھا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ کھڑے ہو کر اس لئے پیشاب کیا کیونکہ اس میں دوسرے راستے سے کسی چیز کے نکلنے سے امن ہوتا ہے۔ بعض نے کہا کہ آپ ﷺ کے پاؤں مبارک پر کوئی زخم تھا۔ ابو ہریرہؓ سے حاکم اور بیہقی نے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے گھٹنے کی تکلیف کے باعث کھڑے ہو کر پیشاب کیا تھا۔

مابض (ہمزہ ساکنہ اس کے بعد باء کے ساتھ ہے) گھٹنے کا اندرونی حصہ۔ اس کی تکلیف کی وجہ سے آپ ﷺ بیٹھنے پر قادر نہ ہوئے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عرب (کمر درد) ریڑھ کی ہڈی کے درد کا علاج کھڑے ہو کر پیشاب کرنے سے کرتے تھے۔ پس شاید کہ آپ ﷺ نے اس عذر کی وجہ سے ایسا کیا ہو، ورنہ حضور ﷺ کی عادت شریفہ بیٹھ کر ہی پیشاب کرنے کی تھی اور یہی پسندیدہ بات ہے اور احیاء میں لکھا ہے کہ چالیس اطباء اس بات پر متفق ہیں کہ بخار میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنا یہ ستر (۷۰) بیماریوں کی دواء ہے۔ زین العربؒ نے اسی طرح کہا ہے۔

الفصل الثالث:

بَوْلُ قَائِمًا کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول

۳۶۵: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَنْ حَدَّثَكُمْ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَبُوْلُ قَائِمًا فَلَا تُصَدِّقُوْهُ مَا كَانَ يَبُوْلُ

اِلَّا قَاعِدًا . (رواه احمدو الترمذی و النسائی)

أخرجه أحمد في المسند ١٩٢/٦ وأخرجه الترمذي في السنن ١٧/١ حديث رقم ١٢۔ والنسائی ٢٦/١ حديث رقم ٢٩ وابن ماجة نحوه ١١٢/١ حديث رقم ٣٠٧۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ جو شخص تم سے یہ بات بیان کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے اس کی تصدیق نہ کرو آپ تو ہمیشہ بیٹھ کر پیشاب کرتے تھے اس حدیث کو امام احمدؒ، اور امام ترمذیؒ اور امام نسائی رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: فلا تصدقوہ: شیخ محی الدینؒ فرماتے ہیں حضرت عائشہ کی یہ حدیث ان کے اپنے علم کی بنیاد پر ہے۔ پس اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گھر میں عادت پر محمول کیا جائے گا۔ (یعنی حضرت عائشہ کو صرف ایسا ہی معلوم تھا)۔

ما كان يبول الا قاعدا: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے اس بات کی تائید ہوتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کھڑے ہو کر پیشاب کرنا وہ کسی عذر کی وجہ سے تھا۔ یعنی اسلئے کہ **كان يبول الا قاعدا** یہ دوام اور عادت اکثریہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ میرک شاہؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام نے وضو کی تعلیم دی

٣٦٦: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ حَارِثَةَ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّ جِبْرِيْلَ اَتَاهُ فِيْ اَوَّلِ مَا اُوْحِيَ اِلَيْهِ فَعَلَّمَهُ الْوُضُوْءَ وَالصَّلٰوةَ فَلَمَّا فَرَغَ مِنَ الْوُضُوْءِ اَخَذَ غُرْفَةً مِّنَ الْمَآءِ فَنَضَحَ بِهَا فَرْجَهٗ . (رواه احمد والدارقطنی)

أخرجه أحمد في المسند ١٦١/٤ وأخرجه الدارقطني في السنن ١١١/١ باب نضح الماء على الفرج حديث رقم ١ وأخرج ابن ماجة ١٥٧/١ حديث رقم ٤٦٢۔

ترجمہ: حضرت زید بن حارثہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے تھے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام جب آپ کے پاس سب سے پہلے وحی لے کر آئے تو آپ کو وضو کی تعلیم دی اور پھر نماز پڑھنے کی تعلیم دی۔ چنانچہ وہ وضو سے فارغ ہوئے تو ایک چلو پانی لیا اور اس کو اپنی شرم گاہ پر چھڑک لیا۔

راویٔ حدیث:

زید بن حارثہؓ، ان کی کنیت ابو اسامہ تھی اور ان کی والدہ سعداء بنتِ ثعلبۃ بنی معن میں سے تھیں۔ ان کی والدہ ان کو لے کر اپنے قبیلہ والوں کی ملاقات کی خاطر نکلیں تو بنی قین بن حرۃ کے لوگوں نے جاہلیت کے زمانے میں لوٹ مار کی، پس وہ جب ان کے ننھیال کے گھروں پر گزرے تو انہوں نے زید کو اُٹھا لیا، اور زیدؓ اس وقت نوعمر تھے ان کی عمر اس وقت ۸ سال بتلائی جاتی ہے۔ بنی قین بن حرہ ان کو عکاظ کے بازار میں لے گئے اور بیچنے کیلئے ان کو لوگوں پر پیش کیا۔ حکیم بن حزام بن خویلد نے ان کو ۴۰۰ درہم میں اپنی پھوپھی حضرت خدیجہ کیلئے خرید لیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ سے نکاح کیا تو حضرت خدیجہؓ نے زید رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہبہ کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر قبضہ کر لیا۔

پھر جب ان کی خبر ان کے گھر والوں تک پہنچی تو ان کے والد حارثہ اور چچا کعب فدیہ دینے کے لئے حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کو اپنے پاس ٹھہرنے اور اپنے گھر والوں کے پاس واپس جانے میں اختیار دے دیا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ٹھہرنے ہی کو اختیار کیا۔ اس لئے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اچھے سلوک اور احسان کو دیکھا ہوا تھا۔ پس اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید کو لے کر حطیم کی طرف نکلے اور فرمایا، جو لوگ یہاں حاضر ہیں وہ گواہ رہیں کہ زید میرا بیٹا ہے، میں اس کا اور یہ میرا وارث ہے۔ پس ان کو زید بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر بلایا جاتا تھا، یہاں تک کہ اسلام کا دور آیا اور یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [الاحزاب: ٥] ''کہ جو متبنّٰی ہیں ان کو ان کے والدین کے نام کے ساتھ بلاؤ یہی اللہ کے ہاں بہتر ہے''۔ پھر ان کو زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔ ایک قول کے مطابق یہ مردوں میں سب سے پہلے مسلمان ہوئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ایک قول کے مطابق ١٠ سال اور ایک قول کے مطابق ٢٠ سال بڑے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح اپنی آزاد کردہ باندی اُم ایمن سے کروایا۔ ان کے بطن سے حضرت اسامہ پیدا ہوئے پھر زینب رضی اللہ عنہا بنت جحش رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح ہوا۔ ان کو حِبِّ رسول اللہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب کہتے تھے)۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کسی صحابی کا نام ذکر نہیں کیا سوائے حضرت زید رضی اللہ عنہ کے نام کے۔ ارشاد فرمایا: ﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا......﴾ [الاحزاب: ٣٧] ''پھر جب زید نے اس سے (کوئی) حاجت (متعلق) نہ رکھی (یعنی اس کو طلاق دے دی) تو ہم نے تم سے اس کا نکاح کر دیا'' ان سے ان کے بیٹے اسامہ اور بعض دوسرے صحابہ نے روایت کی ہے۔ غزوہ موتہ (٨ ہجری جمادی الاول) میں جب کہ یہ لشکر کے امیر تھے ان کو شہید کیا گیا، اس وقت ان کی عمر ٥٥ سال تھی۔

خصوصی فضیلت:

اللہ تعالیٰ نے کسی صحابی کا نام قرآن پاک میں ان کے سوا نہیں لیا۔ وہ آیت یہ ہے: ﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا......﴾ [الأحزاب: ٣٧] ''پھر جب زید نے اس سے (کوئی) حاجت (متعلق) نہ رکھی (یعنی اس کو طلاق دیدی) تو ہم نے تم سے اس کا نکاح کر دیا۔''

تشریح: اتاه في اول ما اوحي اليه: پس سورہ مائدہ کا آخر میں نازل ہونا (کہ جس میں آیات وضو وغیرہ ہیں) وہ اس حکم کی تقریر اور تائید کیلئے تھا۔

فلما فرغ من الوضوء: یہ صریح ہے اس بات میں کہ پانی کا چھڑکنا یہ وضوء کے بعد ہے اور نضح کا معنی شرمگاہ کو دھونا نہیں ہے جیسا کہ پہلے گزرا۔

اخذ غرفة: غرفة ضمہ اور فتحہ کے ساتھ ہے۔

فنضح بها فرجه: حقیقتاً چھڑکاؤ کیا یا اس کپڑے پر جو شرمگاہ کے سامنے تھا۔ یعنی تہبند، شلوار وغیرہ پر۔ ابہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ چھڑکنا اور پانی کا چھینٹا مارنا یہ شاید امت کی تعلیم کیلئے تھا کیونکہ اس سے وساوس اور قطرات کا آنا ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ نضح (چھینٹے مارنا) ٹھنڈے پانی کے ساتھ یہ پیشاب کو روک دیتا ہے۔ پس پھر پیشاب کے قطرات نہیں ٹپکتے اور ظاہر یہ ہے کہ نضح یہ مختص ہے اس شخص کیلئے جو بغیر پانی کے استنجاء کرتا ہے۔

اس کی سند حسن ہے۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پانی چھڑکنے کا حکم دیا

۳۶۷ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ جَآءَ جِبْرِیْلُ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ اِذَا تَوَضَّأْتَ فَانْتَضِحْ .(رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب وسمعت محمدا یَعْنِی الْبُخَارِیَّ یَقُوْلُ الْحَسَنُ عَلِیّ الْهَاشِمِیُّ الراوی منکرالحدیث)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/ ۷۱ حدیث رقم ۵۰۔ وأخرجه ابن ماجة بنحوه ۱/ ۱۵۷ حدیث رقم ۴۶۳۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میرے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور کہا۔ اے محمد ﷺ جب آپ وضو کریں تو تھوڑا سا پانی اپنی شرم گاہ پر ازالہ وسواس کے لئے چھڑک لیا کریں اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے اور کہا ہے کہ میں نے محمد ابن اسماعیل بخاری سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اس حدیث کے ایک راوی حسن بن علی ہاشمی منکر الحدیث ہے۔

اسنادی حیثیت : امام ترمذی ہی نے فرمایا کہ یہ حدیث منکر ہے اور میں نے محمد یعنی امام بخاری کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اس حدیث کے ایک راوی حسن بن علی ہاشمی منکر الحدیث ہیں۔

تشریح: **یا محمد:** اس حدیث میں ارشاد ہے اس بات کی طرف کہ حضور ﷺ کو آپ ﷺ کے مخصوص نام (یا محمد) سے پکارنے کی نہی یہ انسانوں سے متعلق ہے فرشتے اس سے خارج ہیں۔

هذا حدیث غریب: یعنی اس کا راوی متفرد ہے۔

الحسن بن علی الهاشمی الراوی: یاء کے سکون کے ساتھ۔ **ای راوی هذا الحدیث الذی تفرد به۔**

منکر الحدیث: منکر وہ روایت ہے کہ غیر ثقہ اور غیر ضابط جس کو روایت کرنے میں متفرد ہو۔ یہی درست ہے۔ علامہ طیبیؒ نے یہی کہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے ضعف میں اتنی شدت نہیں ہے کیونکہ پہلے متعدد طرق گزرے ہیں۔ پس یہ حدیث فضائل اعمال میں صحت ہوگی۔

پیشاب کرنے کے بعد وضو ضروری نہیں ہے

۳۶۸ : وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ بَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَامَ عُمَرُ خَلْفَهٗ بِكُوْزٍ مِّنْ مَآءٍ فَقَالَ مَا هٰذَا یَا عُمَرُ قَالَ مَآءٌ نَتَوَضَّأُ بِهٖ قَالَ مَا اُمِرْتُ كُلَّمَا بُلْتُ اَنْ اَتَوَضَّأَ وَلَوْ فَعَلْتُ لَكَانَتْ سُنَّةً .

(رواه ابوداود وابن ماجة)

أخرجه أبوداود فی السنن ۱/ ۳۸ حدیث رقم ۴۲۔ وأخرجه ابن ماجة ۱/ ۱۱۸ حدیث رقم ۳۲۷ وأخرجه أحمد فی المسند ۶/ ۹۵۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے پیشاب کیا حضرت عمرؓ پانی کا

لوٹا لے کر آپ کے پیچھے کھڑے ہو گئے رسول اللہ ﷺ نے پوچھا یہ کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپ کے وضو کے لئے پانی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ جب میں پیشاب کروں تو وضو بھی کروں۔ اگر ایسا کرتا تو میرا یہ عمل سنت ہو جاتا۔ اس حدیث کو امام ابوداوٗدؒ اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **فقام عمر خلفه بکوز من ماء**: یہ کھڑا ہونا خدمت کے وظیفہ کو پورا کرنے کے لئے تھا۔ بے شک جو خدمت کرتا ہے، کل کو وہ بھی مخدوم بنتا ہے۔ تحقیق روایت میں وارد ہے کہ ابن عباسؓ نے حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر وضو کیلئے پانی بہایا۔ (یعنی وضو کروایا)۔

ماء تتوضابه: یہاں **تتوضا به** سے مراد **تتطهر به**۔ کہ جس سے پاکی حاصل کی جائے تا کہ استنجاء کو بھی شامل ہو جائے۔

ما امرت: یعنی امر وجوبی۔

کما بلت: بضم الباء، باء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

لکانت :ای الفعلة اور ایک نسخہ میں لکان ہے۔ ای الفعل۔

سنة: ای مو کدة۔ مراد سنت موکدہ ہے ورنہ تو پانی سے استنجاء کرنا اور ہمیشہ وضو کی حالت میں رہنا بغیر خلاف کے مستحب عمل ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات پر دلالت موجود ہے کہ

① حضور ﷺ کا نہ کوئی فعل اور نہ ہی کوئی بات بغیر اللہ کے حکم سے ہوتی تھی۔
② اور یہ کہ حضور ﷺ کی سنتوں کی پیروی کا حکم ہے اگر چہ وہ فرض نہیں۔
③ اور بے شک نبی پاک ﷺ مستحب عمل کو اُمت کی آسانی کی خاطر چھوڑتے تھے۔
④ اور یہ کہ مذکورہ حکم آسانی پر مبنی ہے۔

اسنادی حیثیت : اس کی سند حسن ہے۔

اہل قباء کی طہارت کی تعریف

۳۶۹: وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ وَجَابِرٍ وَاَنَسٍ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰیَةَ لَمَّا نَزَلَتْ فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَثْنٰی عَلَیْکُمْ فِی الطُّهُوْرِ فَمَا طُهُوْرُکُمْ قَالُوْا نَتَوَضَّأُ لِلصَّلٰوةِ وَنَغْتَسِلُ مِنَ الْجَنَابَةِ وَنَسْتَنْجِیْ بِالْمَآءِ قَالَ فَهُوَ ذَاكَ فَعَلَیْکُمُوْهُ ۔

(رواه ابن ماجة/ التوبه:۱۰۸)

أخرجه ابن ماجة ۱/ ۱۲۷ حدیث رقم ۳۵۵۔

ترجمہ: حضرت ابو ایوبؓ، حضرت جابرؓ اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ کہ قباء میں سے ایسے لوگ ہیں کہ جو اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ وہ

اچھی طرح طہارت حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ اچھی پاکیزگی حاصل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اے انصار کی جماعت۔ اللہ تعالیٰ نے طہارت کے سلسلہ میں تمہاری تعریف کی ہے، تم لوگ کیا اور کیسی طہارت کرتے ہو۔ تو انہوں نے عرض کیا کہ ہم نماز کے لیے وضو کرتے ہیں اور جنابت سے غسل کرتے ہیں اور استنجاء بالاحجار کے بعد استنجاء بالماء کرتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا۔ ہاں وہ یہی طہارت ہے جس کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کو لازم پکڑو۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: فیہ رجال: فیہ کی ضمیر مسجد قباء کی طرف راجع ہے یا مسجد مدینہ کی طرف اور یہ جملہ آیت سے بدل واقع ہے۔

یتطهروا: تطہیر کہتے ہیں، پاکی میں مبالغہ کرنا اور یہ بھی احتمال ہے کہ تطہیر سے مراد تین تین بار دھونا ہو۔ علامہ طیبیؒ نے یہی کہا ہے۔

والله يحب المطهرين: مطهرین اصل میں **متطهرين** تھا۔ تاء کو، طاء سے بدل دیا گیا اور طاء کو، طاء میں ادغام کر دیا گیا۔ **ای یرضی عنهم ویرفع ماواهم** کہ اللہ ان سے راضی ہوتے ہیں اور ان کے درجات کو بلند کرتے ہیں۔ یا مطلب یہ ہے کہ اللہ ان سے ایسا معاملہ کریں گے جیسے مُحِب اپنے محبوب سے کرتا ہے۔

اثنٰی علیکم فی الطهور: طہور ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ جائز ہے **ای بسبب استعماله یا فی فعل الطهور** مراد ہے۔ تو اس صورت میں **اثنی** کیلئے **فی الطهور** کو ظرف بنایا ہے بطور مبالغہ کے۔

فهو ذاك: یعنی اللہ تعالیٰ کا تمہاری تعریف کرنا وہ تمہارے کمال طہارت کا اثر ہے۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ **فهو ذاك** کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تمہاری تعریف کرنا یہ اس وجہ سے ہے جو تم نے ذکر کیا ہے۔ یہ حاصل معنی ہے لفظ کا حل نہیں ہے۔ جیسا کہ کسی پر یہ مخفی نہیں ہے۔

فعلیکموه: ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کمال طہارت کو جتنی تم میں طاقت ہے لازم پکڑو۔ واضح بات یہاں یہ ہے کہ **علیکموه** میں استنجاء کی طرف اشارہ ہے کیونکہ استنجاء یہ ذکر میں زیادہ قریب ہے اور ان کے ساتھ خاص بھی ہے، ورنہ تو وضو۔ غسل کو تو مہاجرین بھی کرتے تھے۔ واللہ اعلم

پھر حدیث کے ظاہر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف پانی پر اکتفاء کرتے تھے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ پتھر اور پانی دونوں کو جمع کرتے ہوں اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ظاہری بات یہاں یہ ہے کہ جس چیز کو ان کی خصوصیت قرار دیا گیا اور جو اللہ تعالیٰ کی محبت عظمیٰ کا سبب بنی وہ ان کا پہلی دو کو پورا پورا کرنے کی حرص ہے اور تیسری کو لازم پکڑنے کی۔ جو کہ صرف پتھروں پر اقتصار کرنے سے افضل ہے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) پہلی دو کی تکمیل کو انصار کیلئے ثابت کرنا، مہاجرین کے علاوہ یہ بات قابلِ توقف ہے کیونکہ یہ کسی واضح صحیح نقل کی محتاج ہے۔

امام بغویؒ نے سند کے ساتھ اپنی تفسیر میں مرفوع روایت نقل کی ہے۔ کہ یہ آیت (**فيه رجال يحبون ان يتطهروا** اہل

قباء کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔فرمایا (اس لئے کہ) وہ پانی کے ساتھ استنجاء کرتے ہیں۔

طبرانی اور حاکم اور ان کے علاوہ بعض دوسرے حضرات نے ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے۔فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے عویمر بن سعادہ کی طرف پیغام بھیج کر بلایا۔فرمایا: کہ یہ کونسی طہارت ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہاری تعریف کی ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم میں کوئی مرد وعورت بول و براز سے فارغ نہیں ہوتا مگر وہ اپنی شرمگاہ کو (یا فرمایا) اپنی مقعد کو پانی سے دھوتا ہے۔تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ یہی وہ بات ہے۔

ابن ماجہ، حاکم، دارقطنی وغیرہ نے صحابہ کی ایک جماعت سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے انصار کے گروہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری طہارت حاصل کرنے میں بھلائی کے ساتھ تعریف کی ہے۔وہ تمہاری طہارت کیا ہے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا ہم نماز کیلئے وضو کرتے ہیں اور جنابت کی وجہ سے غسل کرتے ہیں۔فرمایا: کہ کیا اس کے علاوہ بھی اور کوئی بات ہے؟ انہوں نے کہا نہیں اور تو کوئی بات نہیں، ہاں البتہ جو ہم میں سے قضائے حاجت سے فارغ ہو وہ پانی سے استنجاء کرنے کو پسند کرتا ہے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہی وہ بات ہے۔پس اس کو لازم پکڑو۔یہ حدیث مقصود کے بیان میں واضح ہے۔

ابن ماجہ نے روایت میں ایسا اقتصار کیا ہے جو مقصود کے سمجھنے میں رکاوٹ ہے۔پس اس کو سمجھ لو۔

آداب کی تعلیم

۳۷۰: وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَالَ بَعْضُ الْمُشْرِكِيْنَ وَهُوَ يَسْتَهْزِئُ اِنِّيْ لَاَرٰى صَاحِبَكُمْ يُعَلِّمُكُمْ حَتَّى الْخِرَآءَ ةِ قُلْتُ اَجَلْ اَمَرَنَا اَنْ لَّا نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ وَلَا نَسْتَنْجِيَ بِاَيْمَانِنَا وَلَا نَكْتَفِيَ بِدُوْنِ ثَلَاثَةِ اَحْجَارٍ لَيْسَ فِيْهَا رَجِيْعٌ وَلَا عَظْمٌ۔ (رواہ مسلم واحمد واللفظ لہ)

أخرجه ابن ماجة ۱/ ۱۱۵ حديث رقم ۳۱٦۔وأحمد فی المسند ۵/ ۴۳۹۔

ترجمہ: حضرت سلمانؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مشرک آدمی نے بطور استہزاء کے یہ کہا کہ میں تمہارے ساتھی یعنی محمد ﷺ کو دیکھتا ہوں کہ تمہیں ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں۔یہاں تک کہ قضائے حاجت کے لئے بیٹھنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں میں نے کہا۔ہاں آپ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف رخ نہ کریں اور اپنے دائیں ہاتھ سے استنجاء نہ کریں اور تین پتھروں سے کم کے ساتھ استنجاء نہ کریں اور اشیاء استنجاء میں ہڈی اور گوبر لید وغیرہ نہ ہو۔اس حدیث کو امام مسلم اور احمد نے روایت کیا ہے اور الفاظ احمد کے ہیں۔

تشریح: وهو یستهزی: یہ جملہ حال واقع ہے۔

حتی الخراء ة : ای ادبها۔خراءۃ، خاء اور راء کے فتحہ اور بغیر مد کے ہے۔اکثر کے نزدیک اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ممدود یعنی مد کے ساتھ ہے۔بعض حضرات نے کہا ہے کہ مد اور خاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔مسلم شریف کی شرح میں مذکور ہے کہ خراءۃ خاء کے فتحہ اور راء کی تخفیف اور مد کے ساتھ ہے اور یہ نام ہے حدث کی حالت کا، اور باقی نفس حدث تو وہ تاء کے حذف

اور مدّ اور خاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ابھریؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے۔ سید جمال الدینؒ نے فرمایا ہے کہ خراءۃ (خاء کے کسرہ اور راء کی مد کے ساتھ) پاخانہ کرنے اور قضائے حاجت کے وقت بیٹھنے کے معنی میں آتا ہے۔ اکثر رواۃ اس کو مقصور الراء اور مفتوح الخاء کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ علامہ طیبیؒ نے خطابیؒ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ پھر علامہ طیبیؒ نے یہ کہا ہے کہ جوھریؒ نے لکھا ہے کہ یہ فتحہ کے ساتھ مصدر ہے اور کسرہ کے ساتھ اسم ہے۔

ان لانستقبل القبلة: کعبہ کی تعظیم کی وجہ سے کیونکہ وہ ہمارا قبلہ ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں (**لا نستقبل القبله** کے ساتھ **لا نستدبرھا** بھی مراد ہوگا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور شاید یہاں صرف استقبال کو ذکر کرنے میں اس کا کامل طور پر خیال رکھنا مقصود ہو کیونکہ یہ استدبار سے زیادہ قبیح ہے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ ابن حجرؒ کے کلام پر پہلے بات ہو چکی ہے اور ممکن ہے کہ استقبال سے نہی پہلے واقع ہوئی ہے۔ پھر استدبار کی نہی ہوئی ہو یا استقبال کو صرف اس لئے خاص کیا کہ اس سے رکنے میں قبلہ کی زادہ تعظیم واحترام ہے اور اس بات سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جو آدمی قضائے حاجت کے وقت ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ رخ کرنے پر مجبور ہو تو اس کے لئے مناسب ہے کہ وہ استدبار کرے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ اگر اجماع کی مخالفت کا خوف نہ ہوتا، تو میں یہ کہہ دیتا کہ آبادی میں استدبار جائز ہے نہ کہ استقبال حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، میں نے شرعۃ الاسلام کی شرح میں ماتن کے قول **و لا یستقبل القبلة ببول و لا غائط** کے تحت یہ بات دیکھی ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ قضائے حاجت کے وقت اور استنجاء کی حالت میں قبلہ کی طرف منہ کر کے بیٹھنا یہ مکروہ ہے اور اسی طرح پشت کرنا۔ ایک روایت کے مطابق مکروہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ترکِ تعظیم ہے اور ایک روایت میں استدبار یعنی پشت کرنا قضائے حاجت وغیرہ کے وقت مکروہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ پشت کرنے والے کی شرمگاہ قبلہ کے مقابل نہیں ہوتی، بخلاف منہ کرنے والے کے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت بھی منقول ہے کہ قبلہ کی طرف پیٹھ کرنا جائز ہے جب کہ اس کا دامن و قمیص اٹھایا ہوا نہ وہ بلکہ نیچے گرا ہو۔ اسی طرح شرح نقایہ میں ہے اور شاید کہ ماتن استدبار کی نہی کو بیان کرنے کے درپے نہیں ہوئے کیونکہ اس میں اختلاف ہے۔

لا نستنجی بایماننا: استنجاء نہ کرنا دائیں ہاتھ کے ساتھ اس لئے ہے کہ اس میں اس کی تکریم ہے کیونکہ یہ ہمارے کھانے کا آلہ ہے۔

و لا نکتفی بدون ثلاثة احجار: اکتفاء نہ کرنا وہ کامل صفائی حاصل کرنے کیلئے ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس میں ہمارے مذہب کی مکمل وضاحت ہے کہ تین کا عدد واجب ہے اگر چہ صفائی کم سے بھی حاصل ہو جائے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ تصریح واضح نہیں اور اس بات کا ظاہر ہونا بھی محل کلام ہے کیونکہ یہ جملہ حدیث محمول ہے اکثریت پر اس لئے کہ اکثر صفائی تین پتھروں کے بغیر نہیں ہوتی۔ نیز عدم وجوب وہ اس حدیث سے ثابت ہے جو پہلے گزر چکی ہے **من استجمر فلیوتر من فعل فقد احسن ومن لا فلا حرج**۔ (الحدیث)

لیس فیھا: ای فی الاحجار

رجیع ولا عظم: لید نجاست کی وجہ سے اور ہڈی ملائم ہونے کی وجہ سے یا اس لئے کہ جنات کی غذا ہے۔ یہ جملہ احجار کیلئے صفتِ مؤکدہ ہے اور ان چیزوں کے استعمال کے جواز کے وہم کو ختم کرنے کے لئے لایا گیا ہے یا یہ جملہ بطور تغلیب کے وارد ہے۔

اور ابن حجرؒ کا یہ قول: ای وامرنا بالثلاثة الاحجار التی اوجبها علینا ان لا یکون فیها رجیع۔ اس تقدیر عبارت سے اس بات کا وہم ہوتا ہے کہ یہ جملہ لیس فیھا رجیع ولا عظم مصدرہ بالواؤ ہے (یعنی اس کے شروع میں واؤ ہے) حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

اس حدیث میں حضرت سلمانؓ کے جواب میں مکمل رہنمائی ہے اور مشرک کے رد میں مبالغہ ہے۔

اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ حضرت سلمانؓ کا یہ جواب من باب اسلوب الحکیم کے قبیل سے ہے اس لئے کہ مشرک نے جب حضرت سلمانؓ سے بطور استہزاء کے یہ بات کہی تو اس کے جواب میں حق تو یہ تھا کہ اس کو ڈانٹتے یا جواب دینے سے خاموش ہو جاتے، لیکن آپؓ اس کے اس استہزاء کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوئے بلکہ اس کو اس رہنماء کی طرح جواب دیا جو سنجیدہ قسم کے سوال کرنے والے کو (جواب) تلقین کرتا ہے۔ یعنی یہ استہزاء (مذاق) کی جگہ نہیں ہے بلکہ یہ بات سنجیدگی اور حق پر مبنی ہے، پس تجھ پر واجب ہے کہ ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر سیدھے اور مضبوط راستے کو لازم پکڑ ظاہری اور باطنی گندگیوں اور نجاستوں سے پاکی حاصل کرنے کے ذریعے۔

اللہ کے حکم کو روکنے سے عذاب قبر ہوتا ہے

۳۷۱: وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ حَسَنَةَ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَفِيْ يَدِهِ الدَّرَقَةُ فَوَضَعَهَا ثُمَّ جَلَسَ فَبَالَ اِلَيْهَا فَقَالَ بَعْضُهُمْ اُنْظُرُوْا اِلَيْهِ يَبُوْلُ كَمَا تَبُوْلُ الْمَرْاَةُ فَسَمِعَهُ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ وَيْحَكَ اَمَا عَلِمْتَ مَا اَصَابَ صَاحِبَ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ كَانُوْا اِذَا اَصَابَهُمُ الْبَوْلُ قَرَضُوْهُ بِالْمَقَارِيْضِ فَنَهَاهُمْ فَعُذِّبَ فِيْ قَبْرِهٖ. (رواہ ابوداود وابن ماجة)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ١/ ٢٦ حديث رقم ٢٢۔ وأخرجه ابن ماجة في السنن ١/ ١٢٤ حديث رقم ٣٤٦۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن حسنہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ گھر سے نکل کر ہمارے پاس تشریف لائے اس وقت آپ کے ہاتھ مبارک میں ایک ڈھال تھی اس کو آپ نے اپنے سامنے زمین پر رکھ لیا۔ پھر اس کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کیا۔ یہ منظر دیکھ کر ایک مشرک نے کہا۔ ان کو دیکھو اس طرح پیشاب کرتے ہیں جس طرح عورت پیشاب کرتی ہے یہ بات رسول اللہ ﷺ نے سن لی اور فرمایا تجھ پر افسوس ہے۔ کیا تو اس بات کو نہیں جانتا۔ جو بنی اسرائیل کے ایک آدمی کے ساتھ پیش آئی یعنی اس کو عذاب ہوا۔ بنی اسرائیل جب پیشاب کرتے اور پیشاب ان کے کپڑے کو لگ جاتا تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے چنانچہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے دوسرے لوگوں کو اس حکم کو ماننے سے منع کیا تو

اس کو عذاب قبر میں مبتلا کیا گیا اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے اور امام نسائیؒ نے اس حدیث کو حضرت عبدالرحمٰن سے اور انہوں نے حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

عبدالرحمٰن بن حسنہ۔ یہ عبدالرحمٰن بن حسنہ ہیں۔ ''حسنہ'' ان کی والدہ ہیں۔ یہ اپنی والدہ کی طرف نسبت سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے والد عبداللہ بن المطاع ہیں۔ ان سے یزید ابن وہب روایت کرتے ہیں۔ ح اور س دونوں مہملہ اور مفتوح ہیں۔

تشریح: **وعن عبد الرحمن**: یہ صحابی ہیں، اور ان سے ایک روایت مروی ہے۔

ابن حسنة (حاء اور سین اور نون کے فتحہ کے ساتھ) یہ ان کی والدہ ہیں اور ان کے والد کا نام عبداللہ بن المطاع ہے ان سے یزید بن وھب نے روایت کی ہے۔

الدرقه۔ (یہ دال، راء، قاف کے فتحہ کے ساتھ ہے) مراد وہ چمڑے سے بنی ہوئی ڈھال ہے کہ جس میں نہ لکڑی ہو اور نہ کوئی پٹھا ہو۔

فوضعها: یعنی اپنے اور لوگوں کے درمیان اس کو آڑ بنالیا۔

كما تبول المرءة: یعنی پردہ کرنے کے اعتبار سے یا اس طرح بیٹھنے میں یا دونوں مراد ہوں۔ علامہ سیوطیؒ نے یہی کہا ہے۔

ويحك: علامہ طیبیؒ نے کہا ہے۔ نہایہ سے نقل کرتے ہوئے **ويح** یہ ایسا کلمہ ہے جو اس شخص کیلئے کہا جاتا ہے کہ جس کے ساتھ نرمی اور رحم کا ارادہ کیا جائے تو **ويلك** کی جگہ **ويحك** ذکر کیا۔ اس میں حضور ﷺ کی کامل نرمی کی طرف اشارہ ہے اور اس کے ساتھ الفت کے ارادے کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ حضور ﷺ سارے عالموں کیلئے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے اور کفار کی ہدایت کے حریص تھے۔

اما علمت ما اصاب: پہلا :ما: نافیہ ہے، اور اس پر ہمزہ استفہام انکار کیلئے داخل ہے اور دوسرا موصولہ یا موصوفہ یا مصدریہ ہے۔

صاحب بني اسرائيل: یعنی عذاب نیکی سے روکنے کی وجہ سے اور صاحب منصوب ہے اور بعض نے کہا ہے یہ مرفوع ہے۔ شیخ ولی الدین عراقی نے فرمایا ہے کہ یہ مرفوع ہے اور نصب بھی جائز ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے نسائی شریف کے حاشیہ میں یہ بات ذکر کی ہے۔

بالمقاريض: یہ مقراض کی جمع ہے اور یہ کاٹنے کا آلہ ہے (قینچی)۔

فعذب فی قبره: علامہ طیبیؒ نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے اس منافق کے اس امر سے جو کہ مسلمانوں کے ہاں نیکی تھی روکنے کو تشبیہ دی ہے۔ بنی اسرائیل کے اس آدمی کے روکنے کے ساتھ کہ جس نے ان کو اس چیز سے روکا جو ان کے دین میں اچھی اور نیک بات سمجھی جاتی تھی اور مقصود اس سے اس کو ڈانٹنا اور ڈرانا ہے اور یہ کہ وہ جہنمیوں میں سے ہے۔ پس جب اس منافق نے آپ کو حیاء اور عورتوں جیسے فعل کرنے سے عار دلائی، تو حضور ﷺ نے اس کو اس کی بے شرمی پر زجر و توبیخ کی اور اس بات پر بھی

اس کی زجر و توبیخ کی کہ وہ اس بات کا انکار کرنے والا ہے جو پہلی اور آنے والی امتوں کے نیک لوگوں اچھائی سمجھی جاتی ہے۔
یعنی مرسلا روایت کی ہے اور صحابی کی مرسل روایت وہ تمام کے نزدیک مقبول ہے۔ اسی وجہ سے ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ اس کی سند حسن ہے۔

۳۷۲ :وَرَوَاهُ النِّسَائِيُّ عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى ۔

ترجمه: ''اور نسائی نے اس حدیث کو عبدالرحمٰن سے اور انہوں نے ابوموسیٰ سے روایت کیا ہے۔''

تشریح: یہ صحابی ہیں، جیسا کہ گزر چکا ہے اور صاحب مشکوۃؒ نے ان کو صحابہ میں ذکر کیا ہے۔
(عن ابی موسٰی): پس یہ صحابی کی صحابی سے روایت ہوگی۔

پیشاب کرتے وقت سامنے پردہ ہو

۳۷۳ :وَعَنْ مَرْوَانَ الْاَصْفَرِ قَالَ رَاَيْتُ ابْنَ عُمَرَ اَنَاخَ رَاحِلَتَهٗ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ ثُمَّ جَلَسَ يَبُوْلُ اِلَيْهَا فَقُلْتُ يَا اَبَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَلَيْسَ قَدْ نُهِيَ عَنْ هٰذَا قَالَ بَلْ اِنَّمَا نُهِيَ عَنْ ذٰلِكَ فِي الْفَضَآءِ فَاِذَا كَانَ بَيْنَكَ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ شَيْئٌ يَسْتُرُكَ فَلَا بَأْسَ ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبو داؤد في السنن ۱/ ۲۰ حديث رقم ۱۱۔

ترجمه: حضرت مروان اصفر سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت ابن عمرؓ کو دیکھا کہ انہوں نے اپنا اونٹ قبلہ کی طرف بٹھایا اور پھر بیٹھ کر اس کی طرف رخ کر کے پیشاب کیا۔ میں نے یہ دیکھ کر عرض کیا اے ابوعبدالرحمٰن کیا اس طرح قبلہ کی طرف رخ کر کے پیشاب کرنے سے منع نہیں کیا گیا انہوں نے فرمایا ہاں صحراء میں اس سے منع کیا گیا ہے لیکن جب تمہارے اور قبلہ کے درمیان کوئی چیز حائل ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

مراون اصغر۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ بصرہ کے رہنے والے ہیں۔ حدیث ثقہ ہیں ان کے یہ حالات سید اصیل الدین نے مشکوٰۃ کے حاشیہ میں ذکر فرمائے ہیں۔ صاحب مشکوٰۃ نے ان کے اسماء الرجال میں ان کو ذکر نہیں کیا ہے۔ واضح رہے کہ مشکوٰۃ کے اصفر فاء کے ساتھ ہے۔ ایک نسخہ میں غین کے ساتھ ہے۔ یعنی ''اصغر'' ہے۔

تشریح: فقلت ابا عبد الرحمٰن: ایک نسخہ میں یا ابا عبد الرحمن ہے۔
قال: بل: یہ اضراب کیلئے ہے ای لا مطلقًا۔
انما نهی عن؟ ذلك فی الفضاء: ای الصحراء۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ہم نے اس کے ساتھ ہر اس چیز کو ملا دیا ہے جو اس کے معنی میں ہے اور وہ تمام قسم کے مکانات ہیں، مگر وہ مکان جو قضائے حاجت کیلئے بنایا گیا ہو۔
رواه ابو داؤد مرسلا: امام ابوداؤدؒ اس پر خاموش رہے ہیں، اور یہ خاموش رہنا دلیل نہیں بن سکتا اس لئے کہ انہوں

نے حضور ﷺ کے فعل سے استدلال کیا ہے جو کہ پہلے گزر چکا ہے اور فعل رسول ﷺ میں کئی احتمال ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور احتمال کے ہوتے ہوئے استدلال ساقط ہو جائے گا۔

خروجِ خلاء کے وقت دعا

۳۷۴: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا خَرَجَ مِنَ الْخَلَاءِ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ ۔ (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/ ۱۱۰ حدیث رقم ۳۰۱۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب بیت الخلاء سے نکلتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ ۔تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے مجھ سے تکلیف دینے والی چیز کو دور کر دیا اور مجھے عافیت بخشی ۔اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: پیشاب وغیرہ کے رُکنے سے یا انتڑیوں کے ساتھ اترنے سے عافیت مراد ہے۔ابھریؒ نے یہی ذکر کیا ہے اور بعض روایات میں ہے: الحمد لله الذی اذهب عنی ما یوذینی و ابقی علی ما ینفعنی ۔پس ان دو نعمتوں میں غور کرو جو کہ بہت بڑی ہیں۔کھانے والوں کے دِل میں یہ اکثر کھٹکتی بھی نہیں ہیں۔

میرک شاہؒ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں اور اسی طرح نسائیؒ نے ابوذرؓ سے روایت کی ہے اور اس کی سند بھی حسن ہے۔

جنات کی رسول اللہ ﷺ سے درخواست

۳۷۵: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَمَّا قَدِمَ وَفْدُ الْجِنِّ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْهَ اُمَّتَکَ اَنْ یَّسْتَنْجُوْا بِعَظْمٍ اَوْ رَوْثَةٍ اَوْ حُمَمَةٍ فَاِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ لَنَا فِیْهَا رِزْقًا فَنَهَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ ذٰلِکَ۔

(رواه ابوداود)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۱/ ۳۶ حدیث رقم ۳۹۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جنات کا ایک وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔تو اس نے آپ ﷺ سے درخواست کی۔اے اللہ کے رسول آپ اپنی امت کے لوگوں کو منع کر دیجئے کہ وہ گوبر ہڈی اور کوئلہ سے استنجاء نہ کریں کیونکہ ان چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لئے رزق مقدر ہے۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ان چیزوں کے ساتھ استنجاء کرنے سے منع کر دیا۔اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: انه: نون کے سکون اور ھاء کے فتحہ کے ساتھ نہی ،نہی سے امر کا صیغہ ہے۔

حممة: حاء کے ضمہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ ہے ای فحم یصیر نارا یعنی جو کوئلہ بن جائے شرح السنۃ میں ہے

الحمم۔ الفحم (کوئلہ) اور اسی طرح ہر وہ چیز جو لکڑی یا ہڈی وغیرہ سے جل جائے (کوئلہ ہو جائے)۔

بَابُ السِّوَاكِ

مسواک کرنے کا بیان

ابن الملک فرماتے ہیں سواك کا اطلاق فعل پر بھی ہوتا ہے اور اس لکڑی پر بھی ہوتا ہے کہ جس کے ساتھ مسواک کی جاتی ہے۔

اور نہایہ میں لکھا ہے کہ سِواک (سین کے کسرہ کے ساتھ) اور مسواک یہ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ دانتوں کو صاف کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے ساك فاه يسوكه اذا دلكه بالسواك۔ کہ ساك ،يسوك کا مطلب یہ ہے کہ مسواک کے ساتھ دانتوں کو ملنا صاف کرنا، جب الفم (مفعول مذکور نہ ہو) تو پھر کہتے ہیں استاك۔

بعض نے کہا ہے سِوَاك (کسرہ کے ساتھ) یہ مسواک کرنے اور اس لکڑی کا نام ہے، جس سے مسواک کی جائے۔ یہاں مراد وہ پہلا معنیٰ ہے اور یہی ظاہر ہے، یا دوسرا ہے اس صورت میں مضاف محذوف ہوگا ای استعمال السواك اور باب السواك کو سنن وضو سے علیحدہ ذکر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسواک کرنا وضو کے متصل اجزاء میں نہیں ہے۔ نیز اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ مسواک کرنا وضو سے پہلے بھی جائز ہے اور کلی سے تھوڑا پہلے ہی اس کا محل متعین نہیں ہے۔

ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ مسواک کڑوے قسم کے درختوں سے ہو، ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے برابر موٹی اور ایک بالشت لمبی اور یہ کہ مسواک کرنا وہ چوڑائی کے اعتبار سے ہو نہ کہ لمبائی کے اعتبار سے۔

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ چوڑائی لمبائی دونوں طرح مسواک کرے گا، اگر کوئی ایک پر اقتصار کرے تو پھر چوڑائی میں کرے گا اور مسواک کلی کرنے کے دوران کرے گا اور یہی اکثر کا مسلک ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ مسواک وضو سے پہلے ہوگی، اگر آدمی کے پاس مسواک نہ ہو یا دانت گر چکے ہوں تو دائیں ہاتھ کی انگلی سے مسواک کرے گا۔ جیسا کے ''محیط'' میں ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے منہ صاف کرنا بھی مسواک کرنا ہے اور اسی طرح امام بیہقی وغیرہ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ انگلیاں مسواک (کی جگہ) کافی ہو جاتی ہیں۔ اس روایت میں کلام ہے۔

اور طبرانی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے فرماتی ہیں۔ میں نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ آدمی کا منہ خراب (پکا ہو) کیا تو وہ مسواک کرے گا فرمایا: ہاں۔ میں نے کہا وہ کیسے کرے گا، فرمایا: کہ اپنی انگلی کو منہ میں داخل کرے (اور اس کے ساتھ مسواک کرے)۔

امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ مستحب ہے یہ کہ مسواک پیلو کی لکڑی کے ساتھ کرے اور کھردرے کپڑے کے ٹکڑے کے ساتھ جو دانتوں کی میل وغیرہ کو دور کرے اور انگلی کے ساتھ اگر مسواک نرم نہ ہو اور اس کے علاوہ اور کوئی چیز بھی نہ پائے اور مستحب ہے

کہ منہ کے دائیں جانب سے چوڑائی میں شروع کرے اور لمبائی میں مسواک نہ کرے تا کہ دانتوں کا گوشت (یعنی مسوڑھے) زخمی نہ ہو جائیں، اگر اس کے برخلاف کیا تو بھی صحیح ہے لیکن مکروہ ہوگا۔ بعض نے کہا ہے کہ امام نوویؒ کے کلام من فمه عرضا میں عرضا فم سے حال ہے۔ امام شافعی کی شرح میں اسی طرح ہے۔ امام طیبیؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

عرضِ مرتب:

مسواک کا اطلاق آلہ پر بھی ہوتا ہے یعنی مسواک کرنے کا آلہ اور مسواک کا اطلاق فعل پر بھی ہوتا ہے یعنی مسواک کرنا۔

اس باب کی احادیث کو معلوم کرنے سے پہلے چند امور کو بطور توطیہ اور تمہید کے بیان کرنا ضروری ہے:

① احناف کے نزدیک مسواک وضو کرتے وقت کی سنت ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک وضو اور نماز دونوں کے لئے سنت ہے۔

② نماز فجر اور ظہر سے پہلے مسواک کرنے کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔

③ مسواک کرنا خیر و برکت اور فضیلت کا ذریعہ ہے کثرت سے اس کے بارے میں احادیث منقول ہیں اور یہ ثواب جزیل کا باعث ہے۔

④ مسواک میں علماء نے ستر سے زائد فوائد بتائے ہیں اعلاها تذكير الشهادتين عند الموت وادناها اماطة الاذى عن الفم۔

⑤ مسواک سے دانت سفید اور چمکدار ہو جاتے ہیں۔

⑥ مسواک سے مسوڑھے مضبوط ہو جاتے ہیں۔

⑦ مسواک سے دانت مضبوط ہو جاتے ہیں۔

⑧ قرآن کی تلاوت کے وقت مسواک کرنا مستحب ہے۔

⑨ جب دانتوں پر میل چڑھ جائے تو مسواک کرنا مستحب ہے۔

⑩ جب منہ سے بو آئے تو مسواک کرنا مستحب ہے۔

⑪ جب نیند سے بیدار ہو تو مسواک کرنا مستحب ہے۔

⑫ جب بدبودار چیز کھانے سے منہ کا ذائقہ متغیر ہو جائے تو مسواک کرنا مستحب ہے۔

⑬ کسی مجلس میں مسواک کرنا جب کہ منہ سے رال ٹپکے مکروہ ہے۔

⑭ مسواک زیتون، پیلو اور نیم وغیرہ کڑوے درخت کی ہونی چاہئے۔ امام نوویؒ نے پیلو کی مسواک کو مستحب قرار دیا ہے۔

⑮ مسواک کا سر چھنگلیا کی طرح ہو اور طول ایک بالشت ہو۔

⑯ مسواک دانتوں پر عرضاً کرنا اولیٰ ہے نہ کو طولاً کیونکہ اس سے مسوڑھے چھل جاتے ہیں۔

⑰ کلی کے وقت مسواک کی جائے جب کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ وضو سے پہلے مسواک کر لی جائے۔

⑱ دائیں طرف سے مسواک شروع کرنا مستحب ہے۔

(۱۹) اگر مسواک نہ ہو یا دانت ٹوٹے ہوئے ہوں تو انگلی سے صاف کرلیا جائے۔

(۲۰) اگر مسواک کو نرم کرنے کے لئے کوئی چیز نہ ہو تو کسی دوسری چیز سے دانتوں کو صاف کرلیا جائے جیسے موٹا کپڑا' ٹوتھ پیسٹ' منجن اور انگلی وغیرہ سے۔

(۲۱) جب مسواک چار انگشت کے برابر رہ جائے تو اس کو زمین میں دفن کردیا جائے۔

الفصل الاول:

مسواک کا مسئلہ

۳۷۶: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمَّتِیْ لَاَمَرْتُهُمْ بِتَاْخِیْرِ الْعِشَاءِ وَبِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٣٧٥حديث رقم٨٨٧۔ ومسلم ١/٢٢٠حديث رقم (٤٢۔٢٥٢) وأبوداؤد ١/٤٠حديث رقم ٤٠، اللفظ له۔ وأخرج الترمذي شطره الثاني ١/٣٤حديث ٢٢وكذلك ابن ماجة ١/١٠٥ حديث رقم ٢٨٧وأحمد في المسند ٢/٢٤٥۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر مجھے اپنی امت پر مشقت کا ڈر نہ ہوتا تو میں ان کو یہ حکم دیتا کہ وہ عشاء کی نماز کو تاخیر سے پڑھیں اور ہر نماز کے لئے مسواک کریں۔"
(بخاری ومسلم)

تشریح: لو لا ان اشق علی امتی:

شق علیه: بولا جاتا ہے اس کام پر جو بھاری ہو یا اس سخت امر پر بولا جاتا ہے کہ جس کا برداشت کرنا اس کو مشقت اور سختی میں ڈال دے۔ مطلب یہاں یہ ہے کہ اگر اُمت پر مشقت کے واقع ہونے کا خوف نہ ہوتا۔

بتاخير العشاء: یعنی میں ان پر عشاء کو نصف لیل یا ثلث لیل تک مؤخر کرنا فرض قرار دے دیتا۔ یہ تاخیر جمہور کے ہاں مستحب ہے امام شافعیؒ کا قول اس سے خلاف ہے۔

عند كل صلاة: ای وضوئها۔ یہاں کل وضوء صلوٰۃ مراد ہے۔ اس لئے کہ ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں ا حاکمؒ نے اور امام بخاریؒ نے کتاب الصوم میں تعلیقاً حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لو لا ان اشق علی امتی لامرتهم بالسواك عند كل وضوء۔ امام حاکمؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے۔

اور اسی امام احمدؒ اور ان کے علاوہ بعض دوسرے حضرات نے روایت نقل کی ہے:

لولا ان اشق علی امتی لامرتهم بالسواك عند كل طهور۔ (الحدیث)

پس السواك عند كل صلوة کا محل متعین ہوگیا اور شوافع دونوں حدیثوں پر عمل کرتے ہوئے وضو اور نماز دونوں کے شروع میں مسواک کرتے ہیں۔ پھر اس مقام پر یہ بات جان لینی چاہیئے کہ سابقہ دونوں حدیثوں میں وضوء اور طہور کا ذکر ہونا یہ

ان جگہوں کا بیان ہے جن میں مسواک کے استعمال کرنے کی تاکید ہے۔ پھر اس کے مستحب ہونے کی اصل وہ کسی وقت اور سبب کے ساتھ مقید نہیں ہے، ہاں بعض اسباب کی وجہ سے اس کے استعمال کی تاکید معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ کھانے وغیرہ کی وجہ سے یا لمبا خاموش رہنے کی وجہ سے منہ (کے ذائقے) کا بدل جانا۔ ہمارے علماء کرام نے مسواک کو سنن صلوٰۃ میں سے نہیں بنایا ہے۔ اس لئے کہ اس میں مسوڑھوں کے زخمی ہونے اور خون نکلنے کا اندیشہ ہے اور خون کا نکلنا ہمارے نزدیک ناقض وضو ہے تو بسا اوقات اس میں حرج لازم آئے گا اور اس لئے کہ کسی روایت میں یہ ذکر نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے کھڑا ہونے کے وقت مسواک کی ہو۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول عند کل صلوٰۃ کو عند کل وضو پر محمول کیا جائے گا۔ احمد اور طبرانی کی روایت کی وجہ سے۔ وہ روایت یہ ہے۔

لامرتهم بالسواك عند كل وضوء۔

یا حدیث کا مطلب یہ ہے **لو لا وجود المشقة عليهم بالسواك عند كل صلوٰة لامرتهم به لكنى لم امر به لاجل وجودها۔**

کہ: ''اگر نماز کے وقت مسواک کے کرنے میں ان پر مشقت نہ ہوتی تو میں ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم کرتا، لیکن میں نے حکم نہیں دیا کیونکہ اس میں مشقت تھی''۔

جیسا کہ بعض نے کہا ہے کہ اسی طرح کی تقدیر قرینہ سابقہ (بتاحير العشاء) میں ہوئی۔ پس دونوں عبارتیں ایک ہی طریقہ پر پڑھوں گی۔ باقی مسواک کا وضو کی سنت ہونا اور عشاء کو موخر کرنے کا مستحب ہونا وہ دوسرے دلائل کی وجہ سے ہے اور یہ توجیہ زیادہ بہتر ہے اور تحقیق ہمارے بعض علماء صوفیہ نے بھی اپنی عبادت کے متعلق نصیحتوں میں فرمایا ہے اور ان میں سے ایک (امر) مسواک پر ہمیشگی کرنا ہے، خصوصاً نماز کے وقت۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: **لو لا ان اشق على امتى لامرتهم بالسواك مع كل صلوٰة او عند كل صلوٰة۔** شیخین نے اس کو روایت کیا ہے اور احمدؒ نے یہ روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

صلاة بسواك افضل من سبعين صلوة بغير سواك

مسواک کے ساتھ نماز یہ ستر گنا افضل ہے بغیر مسواک کے (پڑھی ہوئی) نماز کے۔ اس حدیث میں باء الصاق یا مصاحبت کیلئے ہے اور ان دونوں کی حقیقت حسی طور پر یا عرفی طور پر متصل ہونا ہے اور اسی طرح مع اور عند کے الفاظ اور نصوص کو حتی الوسع اس کی ظاہری معنی ہی پر محمول کیا جائے گا اور یہاں ظاہری معنی پر محمول کرنا ممکن ہے۔ لہٰذا اس کو مجاز پر محمول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے یا یہ کہنا کہ مضاف (وضو) مقدر ہے۔ یہ توجیہ ہو بھی کیسے سکتی ہے جبکہ مسواک کو نفس صلوٰۃ کے ساتھ فروع کی بعض معتبر کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ تاتارخانیہ میں تتمہ سے نقل کرتے ہوئے یہ عبارت مذکور ہے کہ مستحب ہے مسواک ہمارے نزدیک ہر نماز اور وضو کے وقت اور ہر اس چیز میں جو منہ (کے ذائقے وغیرہ) کو بدل دے اور نیند سے بیدار ہونے کے وقت۔

امام محقق فاضل ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے ہدایہ کی شرح میں کہ مسواک کرنا پانچ جگہوں میں مستحب ہے:

(۱) دانتوں کے زرد ہونے کے وقت۔ (۲) منہ کی بو کے بدلنے کی وجہ سے۔ (۳) نیند سے اٹھنے کے بعد۔ (۴) قیام صلوٰۃ کے

وقت۔⑤اور وضو کے وقت۔

پس اس بات سے یہ واضح ہو گیا کہ بعض کتابوں میں جو نماز کے وقت مسواک کرنے کو مکروہ کہا ہے اور اس کی علت خون کے نکلنے کو بنائی ہے۔وہ صحیح نہیں ہے۔ہاں اگر خون نکلنے کا کسی کو اندیشہ ہو تو وہ نرمی کے ساتھ صرف دانتوں اور زبان پر مسواک کرے نہ کہ مسوڑھوں پر اور یہ کوئی مخفی نہیں ہے۔قاضیؒ نے فرمایا ہے کہ: لو لا یہ شیء کے انتفاء کیلئے آتا ہے دوسرے کے ثبوت کی وجہ سے، اور حقیقت میں یہ مرکب ہے۔لَوْ اور لَا سے اور لَوْ یہ شَیٔ کے منتفی ہونے پر دلالت کرتا ہے دوسرے کے منتفی ہونے کی وجہ سے۔پس اس جگہ مثلاً یہ دلالت کرے گا امر (لامرتھم) کے انتفاء پر مشقت کی نفی کے منتفی ہونے کی وجہ سے اور نفی کا انتفاء یعنی اٹھ جانا ثبوت متضی کے ساتھ ہے۔لہٰذا امر یہاں پر مشقت کے ثبوت کی وجہ سے منتفی ہو جائے گا۔پس یہ دلالت کرتا ہے کہ مستحب وہ مامور (واجب) نہیں ہے امر کے منتفی ہونے کی وجہ سے لیکن استحباب ثابت ہے۔

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ گھر میں داخل ہوتے تو مسواک کرتے

۳۷۷: وَعَنْ شُرَيْحِ بْنِ هَانِیءٍ قَالَ سَأَلْتُ عَآئِشَةَ بِاَيِّ شَیْءٍ كَانَ يَبْدَأُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا دَخَلَ بَيْتَهٗ قَالَ بِالسِّوَاكِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی الصحيح ۱/ ۲۲۰ حديث رقم (۴۳۔۲۵۲) وأخرجه أبو داوٗد فی السنن ۱/ ۴۴ حديث رقم ۵۱۔وأخرجه النسائی فی السنن ۱/ ۱۳ حديث رقم ۸۔وابن ماجة ۱/ ۱۰۶ حديث رقم ۲۹۰ وأحمد فی المسند ۶/ ۱۸۸۔

ترجمہ: ''حضرت شریح بن ہانیؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جب اپنے گھر میں تشریف لاتے تھے تو ابتداء کس کام سے کرتے تھے انہوں نے جواب دیا کہ سب سے پہلے آپ مسواک کرتے تھے۔اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: عن شریح: یہ مخضرمین میں سے قابلِ اعتماد ہیں۔تقریب میں اسی طرح ہے (ابن ھانی) ھانی ہمزہ کے ساتھ ہے۔

صاحب مشکوٰۃؒ فرماتے ہیں کہ (شریح) ان کا نام ابو المقدام الحارثی ہے۔انہوں نے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا زمانہ پایا ہے اور حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ان کے باپ ھانی بن یزید کی کنیت خود رکھی، فرمایا کہ تو ابو شریح ہے۔شریح یہ حضرت علیؓ کے ساتھیوں میں سے تھے ان کے بیٹے کا نام مقدام تھا۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) اس میں اشارہ ہے کہ شریح تابعی ہیں جیسا کہ اصول کی کتاب منار کے متن میں بھی واضح طور پر عبارت موجود ہے: واما التابعی فان ظھرت فتواہ فی زمان الصحابہ کشریح کان مثلھم عند البعض۔اس عبارت میں شریح کو تابعی بتلایا گیا ہے۔

صاحب مشکوٰۃؒ نے اسماء الرجال میں ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے، اس لئے کہ مخضرمین میں سے ہیں جیسا کہ ابن عبدالبر نے استیعاب میں کہا ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ شریح بن ھانئ یہ جلیل القدر تابعین اور مجتہدین میں سے تھے۔

قالت بالسواك: مسواک کرنے کے بہت سارے فوائد ہیں۔ان میں سے ایک اس تبدیلی وتغیر کو زائل کرنا جو خاموش رہنے کے باعث آدمی کے منہ میں پیدا ہو جاتی ہے۔علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے اس لئے کہ حضور ﷺ کی اکثر عادت یہی تھی کہ آپ ﷺ راستے میں گفتگو نہیں فرمایا کرتے تھے۔ابن الملکؒ نے فرمایا ہے۔کہ یہ بات محل نظر ہے کیونکہ مسجدِ نبوی سے حجرے تک راستہ قریب تھا۔بہتر یہ ہے کہ اس کو صفائی میں مبالغہ کرنے یا اور دوسرے فوائد پر محمول کیا جائے۔تحقیق بعض نے کہا ہے کہ مسواک میں ۷۰ فائدے ہیں سب سے کم درجے کا فائدہ وہ موت کے وقت کلمہ (شہادتیں) یاد دلاتی ہے اور افیون کھانے میں ۷۰ قسم کے نقصانات ہیں سب سے کم نقصان وہ موت کے وقت کلمہ (شہادتین) کا بھولنا ہے۔ہم اللہ سے عافیت طلب کرتے ہیں۔

پھر یہاں ابن حجرؒ نے فرمایا ہے۔اس حدیث سے اس بات کی تاکید معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص گھر میں داخل ہو وہ مسواک کے ذریعے ابتداء کرے کیونکہ یہ منہ کی خوشبو میں زیادتی کا سبب ہے اور اپنے اہل کے ساتھ میل جول میں زیادہ رغبت دلانے کا باعث ہے اور جو چیز عنقریب اس کے منہ میں اس کی نیند وغیرہ سے پیدا ہوگی (یہ مسواک کرنا) اس کو بھی ختم کر دے گا،خصوصاً جب خاموشی لمبی ہو اور یہ توجیہ بہتر ہے ان حضرات کے قول سے جنہوں نے کہا ہے کہ حضور ﷺ مسواک سے ابتداء اس لئے فرماتے تھے کہ آپ کی عادت شریفہ اکثر راستہ میں بات نہ کرنے کی تھی اور منہ میں خاموش رہنے کی وجہ سے ایک قسم کی تبدیلی (بو وغیرہ) پیدا ہو جاتی ہے۔پس اس کو زائل کرنے کیلئے آپ ﷺ مسواک کرتے تھے،اور اس میں اُمت کو تعلیم دینا مقصود تھا کہ جو خاموش رہے پھر اپنے ساتھی کے ساتھ بات کرنا چاہئے تو وہ مسواک کرے تاکہ اس کے منہ کی بو کی وجہ سے وہ تکلیف نہ اٹھائے۔

(ابن حجرؒ فرماتے ہیں) اور اس بات کا ردّ یہ ہے کہ ہمارے اصحاب (شوافع) نے گھر میں داخل ہونے والے کیلئے مسواک کرنے کی تاکید کو اور چپ رہنے کے بعد مسواک کی تاکید کو علیحدہ علیحدہ رکھا ہے۔پس ان دونوں کو دو مختلف سبب بنایا ہے تو یہ بات دلالت کرتی ہے کہ گھر میں داخل ہونے والے کیلئے مسواک کرنے کی علت وہ سکوت یعنی خاموشی کے علاوہ ہے جیسا کہ پہلے ہم نے بیان کیا۔اس کو غور سے پڑھ لو۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں ہمارے اصحاب (حنفیہ) نے بھی اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ حق بات یہ ہے کہ مسواک وضو کے مستحبات میں سے ہے نہ کہ وضو کی سنتوں میں سے جیسا کہ جمہور نے ذکر کیا ہے اور پانچ مواقع میں مسواک کرنا مستحب ہے۔

① دانتوں کے زرد ہونے کے وقت۔② بو کے بدلنے کی وجہ سے۔③ نیند سے اٹھنے کے بعد۔④ نماز کے طرف اٹھنے کے وقت۔⑤ وضو کے وقت اور تتبع وتلاش سے اس کے علاوہ بھی کئی مواقع ملتے ہیں۔ایک ان میں سے یہ ہے کہ گھر میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے مسواک کرنا۔حضور ﷺ کی مسواک پر مواظبت اور اہتمام کی دلیل اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جو صحیحین میں ہے کہ وفات کے وقت آپ ﷺ نے عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ کی مسواک لے کر مسواک فرمائی۔

تہجد کے وقت مسواک کرنا

۳۷۸: وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا قَامَ لِلتَّهَجُّدِ مِنَ اللَّيْلِ يَشُوْصُ فَاهُ بِالسِّوَاكِ. (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۳۵٦/۱ حديث ۲۴۵ ـ وأخرجه مسلم في الصحيح ۱/ ۲۲۰ حديث رقم (۴٦ـ۲۵۵) وأبو داوٗد ۴۷/۱ حديث رقم ۵۵ ـ والنسائي في السنن ۸/۱ حديث رقم ۲ وأخرجه ابن ماجة في السنن ۱۰۵/۱ حديث رقم ۲۸٦ ـ وأحمد في المسند ۳۸۲/۵ـ

ترجمہ: ''حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تہجد کی نماز کے لئے اٹھتے تھے تو اپنا منہ مسواک کے ساتھ صاف کرتے تھے۔ (بخاری ومسلم)''

تشریح: اذا قام للتهجد: تہجد یہ هجود سے ہے اور اس کا معنی ہے نیند۔ کہا جاتا ہے: هجدته فتهجد ای ازلت هجوده پس تہجد کا معنی ہے بیداری۔ پھر تہجد کا اطلاق رات کے وقت نماز پڑھنے پر ہونے لگا۔

من الليل: یہ من تبعیضیہ ہے اور تہجد کا مفعول ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ﴾ [الاسراء ۷۹] ''یعنی آپ پر لازم ہے کہ رات کے بعض حصے میں عبادت کریں''۔

یشوص: شین کے ضمہ واؤ کے سکون اور صاد (ص) کے ساتھ۔: شوص: اصل میں کہتے ہیں دھونے کو۔ بعض نے کہا ہے کہ شوص کہتے ہیں نیچے سے اوپر کی طرف (مسواک) کرنے کو۔

دس خصالِ فطرت

۳۷۹: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ قَصُّ الشَّارِبِ وَاِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ وَالسِّوَاكُ وَاسْتِنْشَاقُ الْمَاءِ وَقَصُّ الْاَظْفَارِ وَغَسْلُ الْبَرَاجِمِ وَنَتْفُ الْاِبِطِ وَحَلْقُ الْعَانَةِ وَانْتِقَاصُ الْمَآءِ يَعْنِي الْاِسْتِنْجَآءَ وَقَالَ الرَّاوِيْ وَنَسِيْتُ الْعَاشِرَةَ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ الْمَضْمَضَةَ رواه مسلم وفي روايةٍ بَدَلَ اِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ لَمْ اَجِدْ هٰذِهِ الرِّوَايَةَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ وَلَا فِيْ كِتَابِ الْحُمَيْدِيِّ وَلٰكِنْ ذَكَرَهَا صَاحِبُ الْجَامِعِ وَكَذَا الْخِطَابِيُّ فِيْ مَعَالِمِ السُّنَنِ ـ

أخرجه مسلم في الصحيح ۲۲۳/۱ حديث رقم (۵٦ـ۲٦۱) ـ وأبو داوٗد ۴۴/۱ حديث رقم ۵۳ ـ والترمذي ۵/۵۸ حديث ۲۷۵۷ ـ والنسائي ۱۲٦/۸ حديث ۵۰۴۰ وابن ماجة ۱۰۷/۱ حديث ۲۹۳ وأحمد ۱۳۷/٦ـ

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دس چیزیں دین فطرت سے ہیں: ① لبوں کے بال کٹوانا۔ ② ڈاڑھی کا بڑھانا۔ ③ مسواک کرنا۔ ④ استنشاق کرنا (ناک میں پانی ڈالنا) ⑤ ناخن کٹوانا۔ ⑥ مفاصل کو اچھی طرح دھونا۔ ⑦ بغلوں کے بال صاف کرنا۔ ⑧ زیر ناف کے بال صاف کرنا۔ ⑨ پانی کے ساتھ بالوں کو صاف کرنا۔ ⑩ اس حدیث کے راوی حضرت مصعب یا زکریا فرماتے ہیں کہ دسویں چیز کو میں

بھول گیا ممکن ہے کہ وہ کلی کرنا ہو۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے اور ایک دوسری حدیث میں داڑھی بڑھانے کے بجائے ختنہ کا ذکر ہے۔''

اسنادی حیثیت: صاحب مشکوۃ کہتے ہیں کہ یہ روایت مجھے بخاری ومسلم دونوں میں نہیں ملی اور نہ کتاب حمیدی میں البتہ اس روایت کو صاحب جامع الاصول نے ذکر کیا ہے اور اس طرح خطابی نے معالم السنن میں ابوداؤد کے حوالہ سے عمار بن یاسر کی روایت کے ساتھ نقل کیا ہے۔

تشریح: عشر من الفطرۃ: یعنی ان انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کی سنت میں سے دس صفات اور عادات ہیں جن کی پیروی کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، گویا کہ ہم اس پر پیدا کئے گئے ہیں۔ اکثر علماء سے عشر من الفطرۃ کی ہی تشریح منقول ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ﴾ [البقرۃ:۱۲۴] میں مراد ہے (کلمات سے یہی دس طریقے مراد ہیں) اور بعض نے کہا ہے کہ مراد (فطرت سے) وہ سنت ہے کہ جس کو بطور دین اپنانے کیلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا، یا لوگوں کو اس پر پیدا کیا گیا اور ان کی عقلوں میں اس کا اچھا ہونا فطرۃً ودیعت رکھ دیا گیا، اور یہ معنیٰ زیادہ ظاہر ہے۔ یا عشر من الفطرۃ سے عشر من توابع الدین مراد ہے یعنی یہ دین کی پیروی کرنے والوں کی دس صفات ہیں۔ فطرۃ سے مراد دین ہے اور مضاف توابع محذوف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ زیادہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا﴾ [الروم:۳۰] ''یعنی اللہ تعالیٰ کا وہ دین جس کو مخلوق میں سب سے پہلے آدمی کیلئے اللہ تعالیٰ نے پسند کیا''۔

بعض نے کہا ہے کہ عشر من الفطرۃ کا معنیٰ یہ ہے کہ یہ دس کام ان انبیاء کی سنت ہیں جن کی اقتداء کا ہمارے نبی پاک ﷺ کو حکم دیا گیا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ﴾ [الانعام:۹۰] اور اسی طرح: ﴿اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا﴾ [النحل:۱۲۳] ''سو آپ بھی ان ہی کے طریق پر چلیے''۔ یعنی آپ ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر جو ایک طرف کے ہو رہے تھے چلیے''۔ یہ تشریح بھی پہلے قول کی طرف راجع ہے۔

قص الشارب: ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ لبوں کا خوب اچھی طرح کاٹنا سنت ہے، یہاں تک کہ اوپر والے ہونٹ کی سرخی ظاہر ہو جائے بالکل مونچھوں کو صاف نہ کرے اور احفوا کا جو امر ہے وہ اسی تشریح پر محمول ہے جو ہم نے بیان کی ہے اور قص الشارب کے ذکر سے مونڈنا نکل گیا کیونکہ حلق یعنی مونڈنا یہ مکروہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ حرام ہے کیونکہ یہ مثلہ کرنا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ سنت ہے اس روایت کی وجہ سے کہ جس کو معنی مذکور کے ساتھ احفاء پر محمول کیا گیا ہے۔

اعفاء اللحیۃ: علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ اعفاء کا معنی ہے داڑھی کا بڑھانا عفا النبت بولا جاتا ہے جب گھاس وسبزہ خوب بڑھ جائے اس میں اعفوتہ انا اور اعفیتہ دو لغتیں ہیں اور داڑھی کا کاٹنا یہ عجمیوں کی عادت ہے اور آج کل یہ اکثر مشرکین کا شعار بن چکا ہے جیسا کہ فرنگی (یورپین) اور ہندو اور وہ لوگ جن کا دین میں کوئی حصہ نہیں ہے طائفہ قلندریہ میں سے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں باقی داڑھی کے اطراف یعنی طول وعرض میں بالوں کو کاٹنا داڑھی کو برابر کرنے کے لئے یہ اچھا عمل ہے لیکن اس سے بھی پسندیدہ بات یہ ہے کہ بالکل داڑھی میں سے کچھ بھی نہ کاٹے مگر جب عورت کے داڑھی نکل آئے تو اس

کے لئے اس کا حلق کرنا مستحب ہے۔

السواك: بعض نے کہا ہے کہ جب تھوک وغیرہ میں سے کسی چیز کے مسجد میں گرنے کا اندیشہ ہو تو مسجد میں مسواک کرنا مسنون نہیں ہے۔ مسواک مسجد میں کرنا مسنون نہیں ہے جب تھوک وغیرہ میں سے کسی چیز کے مسجد میں گرنے کا اندیشہ ہو۔ پھر مسواک یہ بالاتفاق سنت ہے اور داؤد ظاہریؒ نے فرمایا ہے کہ واجب ہے اور اسحٰقؒ نے کہا ہے کہ اگر جان بوجھ کر مسواک چھوڑ دی تو نماز باطل ہو جائے گی۔

استنشاق الماء: اور یہ کلی کی طرح ہے جس کا ذکر آ رہا ہے یہ دونوں وضو میں سنت ہیں۔ غسل میں فرض ہیں۔ ہمارے نزدیک اور امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں غسل میں سنت ہیں اور امام احمد اور مالکؒ کی ایک روایت میں ان کا واجب ہونا مذکور ہے۔

قص الاظفار: ناخنوں کا کاٹنا۔ یہ کاٹنا جس طریقے سے ہو سنت ادا ہو جائے گی اور بہتر یہ ہے کہ ہاتھوں میں سے دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی سے شروع کرے پھر وسطی (یعنی درمیان والی) پھر بنصر (اس کے ساتھ والی) پھر خنصر (یعنی ہاتھ کی چھوٹی انگلی) پھر انگوٹھا، پھر بائیں ہاتھ میں چھوٹی انگلی سے شروع کرے اور انگوٹھے تک کاٹے اور پیروں کے اندر بہتر طریقہ یہ ہے کہ دائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی سے شروع کرے اور بائیں کی چھوٹی انگلی پر ختم کرے۔

غسل البراجم: باء کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ) وہ گرہیں جو انگلیوں کے جوڑوں کے ظاہری حصہ پر ہوتی ہیں اور جو باطنی حصہ پر ہوتی ہیں ان کو رواجب کہتے ہیں۔ ابن العراقیؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

علامہ تورپشتی نے فرمایا ہے کہ **براجم** سے مراد وہ جوڑ ہیں جو **اساجع** اور **رواجب** کے درمیان میں ہوں اور رواجب وہ جوڑ ہیں جو پوروں سے ملے ہوئے ہیں اور ان کے بعد براجم ہوتے ہیں اور براجم کے بعد اساجع۔

ابھریؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے اور مراد اس سے (ہاتھ پاؤں) کے تمام قسم کی جوڑوں کی گرہیں اور پوشیدہ جگہوں کا دھونا ہے۔

نتف الابط: باء کے کسرہ اور سکون دونوں کے ساتھ مروی ہے۔ **ای قلع شعرہ** مضاف محذوف ہے۔ **نتف** یعنی اکھاڑنے کے ذکر سے یہ بات معلوم ہے کہ اس کا مونڈنا سنت نہیں ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ **نتف** اس آدمی کے لئے افضل ہے جو اس کی طاقت رکھے۔

حلق العانة: ابن الملکؒ فرماتے ہیں اگر زیر ناف بالوں کو مونڈنے کے علاوہ اور کسی طریقے سے زائل کرے تو یہ سنت کے طریقے کے مطابق نہ ہوگا اور اس بات سے ابن الملکؒ کا اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ زیر ناف بالوں کا زائل کرنا کبھی وہ چونے (بال صفا پاؤڈر) کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور تحقیق حضور ﷺ کا بال صفا کا استعمال کرنا بھی ثابت ہے جیسا کہ سیوطیؒ نے اپنے رسالہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ہاں البتہ یوں کہا جائے کہ اگر قینچی وغیرہ کے ساتھ بالوں کو زائل کرے تو یہ صحیح طرح سے سنت اداء کرنے والا نہ ہوگا۔ امام ابھریؒ نے فرمایا ہے کہ زیر ناف بالوں کی صفائی بغل کے بالوں کی صفائی اور ناخنوں اور لبوں کا کاٹنا اس کی حد چالیس دِن ہے یعنی چالیس دِن سے زیادہ نہ ہونے دے اس کی دلیل حضرت انسؓ کی روایت ہے جو امام مسلم نے نقل

کی ہے حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

وقت لنا في قص الشارب وتقليم والاظفار نتف الابط وحلق العانة ان لا نترك اكثر من اربعين ليلة ۔ہمارے لئے جو مونچھوں کے کٹوانے اور ناخنوں کے اتارنے اور بغل کے بالوں اور زیر ناف بالوں کی صفائی کیلئے وقت مقرر کیا گیا وہ یہ تھا کہ ہم ان امور میں چالیس دِن سے زیادہ نہ ہونے دیں۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے۔ **وحلق العانة**۔زیر ناف بالوں کے مطلق ذکر ہونے میں عورت کا بھی یہی حکم معلوم ہوتا ہے، بلکہ **تدتحد المغيبة** والی حدیث بھی اس مضمون میں واضح ہے۔لیکن اکثر محدثین نے اس کو مردوں کے ساتھ مقید کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ عورت کیلئے بہتر عمل زیر ناف بالوں میں وہ اکھاڑنا ہے اس لئے کہ اس میں زیادہ نظافت ہے اور مونڈنے سے بچے ہوئے بالوں سے خاوند کے نفرت کرنے سے بھی اس میں حفاظت ہے اور اکھاڑنا عورتوں کیلئے اس لئے بھی بہتر ہے کیونکہ مرد کے مقابلہ میں عورت کے اندر شہوت کہیں زیادہ ہیں اس لئے کہ یہ بات وارد ہے کہ عورت کے لئے شہوت کے ۹۹ حصے ہیں اور مرد کیلئے صرف ایک تو اکھاڑنا اس شہوت کو کمزور کرنے کا سبب بنے گا اور حلق کرنا تو مزید تقویت کا باعث ہے، پس ہر ایک کو اس کے مناسب حال حکم دیا گیا۔

انتقاص الماء: قاف اور صاد (ص) کے ساتھ ہے اور یہی صحیح ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے، **انتقاص البول بالماء** یعنی پیشاب کرنے کے بعد شرمگاہ وغیرہ کو پانی کے ساتھ دھونا تا کہ پانی کے روکنے کی وجہ سے پیشاب کے قطرات آنا بندھ ہو جائیں اور اگر یہ دھوئے گا نہیں تو بار بار کچھ نہ کچھ خارج ہوتا رہے گا، تو پھر صفائی حاصل کرنا اور استنجاء کرنا مشکل ہو جائے گا۔پہلی تشریح کے مطابق ماء سے مراد پیشاب ہے اس صورت میں ماء سے مراد مغسول بہ (کہ جس کے ذریعے دھویا جائے) لیا جائے، تو اضاف مصدر کی فاعل کی طرف ہوگی: **اى انتقاص الماء البول**۔انتقاص: یہ لازم بھی استعمال ہوتا ہے اور متعدی بھی۔اکثر لازم استعمال ہوتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں تصحیف ہوئی ہے اصل میں یہ انتفاض الماء تھا (یعنی فاء اور ضاد کے ساتھ یا صاد کے ساتھ) اور اس سے مراد ذکر پر پانی کا چھینٹا دینا ہے اور یہ معنی کے زیادہ قریب ہے کیونکہ ابوداؤد شریف میں الانتضاح ہے، انتقاص کو انہوں نے ذکر نہیں کیا۔زین العرب نے سیدؒ سے اس کو نقل کیا ہے۔

یعنی الاستنجاء: یہ راوی کی تفسیر ہے۔وہ راوی عند البعض وکیع ہیں اور پہلی تفسیر وہ ابوعبید کا قول ہے۔

قال الراوى: ابھریؒ نے ذکر کیا ہے کہ امام مسلم اور اصحاب سنن نے ذکر کیا ہے کہ مصعب وہ راوی ہے جو دسویں چیز کو بھول گیا ہے اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ بھولنے ولا وہ زکریا بن ابی زائدہ ہے اور **الا ان تكون** کا قائل وہ یا تو مصعب ہے اور یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ وہ مصعب سے نقل کرنے والا راوی ہو۔

نسيت: اور ایک نسخہ میں تشدید کے ساتھ (**نُسّيت**) منقول ہے اور یہ صیغہ مجہول ہے۔

العاشرة الا ان تكون المضمضمة: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ استثناء مفرغ ہے یعنی مستثنیٰ منہ مذکور نہیں ہے اور **نسيتُ** کی تاویل اتذکر کے ساتھ کی جائے گی **اى لم التذكر العاشرة فيما اظن شيئا الاان يكون مضمضة**۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ **نسی** نفی کے معنی کو شامل ہے اس لئے کہ دسویں کا چھوڑنا ہر ایک کے ضمن میں موجود ہے: **اى لم**

التذكر شيئا يتم الخصال به عشرة الاان يكون مضمضمة۔

ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ابن حجرؒ کا کلام حقیقۃً ،علامہ طیبیؒ کے کلام ہی کی وضاحت ہے۔ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ مضمضہ اس لئے بتلائی کیونکہ کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کو اکٹھا ہی ذکر کیا جاتا ہے تو جب استنشاق مذکور ہے تو مضمضہ کا ذکر کرنا بھول گئے ہوں گے۔

وفی روایة الختان: ختنہ کہتے ہیں ذکر کی زائد کھال کو کاٹنا۔

بدل؛ یہ منصوب ہے۔

اعضاء اللحية: اعفاء یہ بنا بر حکایت کے مرفوع ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مجرور ہے اضافت کی وجہ سے۔علامہ نوویؒ نے فرمایا ہے ان چیزوں میں سے بعض کے واجب ہونے میں اختلاف ہے جیسا کہ ختنہ کرنا کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا اور واجب کو غیر واجب کے ساتھ ذکر کرنا منع نہیں ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **كلوا من ثمره اذا اثمر واتوا حقه يوم حصاده**)[الانعام۔۱۴۱] یہاں ایتاء (عشر دینا) واجب ہے اور کھانا مباح ہے۔ختنہ کرنا امام شافعیؒ اور بہت سارے علماء کے نزدیک واجب ہے مردوں اور عورتوں دونوں پر اور امام مالکؒ اور اکثر علماء کے نزدیک سنت ہے اور ناخن اتارنا سنت ہے اور مستحب یہ ہے دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی سے شروع کر کے انگوٹھے تک ترتیب سے کاٹے پھر بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے شروع کرے اور انگوٹھے تک کاٹے اور پیروں میں دائیں پیر کی چھوٹی انگلی سے شروع کر کے بائیں کی چھوٹی انگلی پر ختم کرے۔بغل کے بال اکھاڑنا یہ سنت ہے اور مونڈنے اور بال صفا کے استعمال کرنے سے بھی سنت اداء ہو جائے گی اور مونچھوں کا کتروانا سنت ہے اور مستحب ہے کہ دائیں طرف سے شروع کرے اور اگر کسی دوسرے سے لبوں کو کتروائے تو یہ جائز ہے اس میں انسان کی مروّت (آدابِ نفسانیہ) کی توہین وہتک بھی نہیں ہوتی اور نہ ہی اس میں کسی قسم کی کوئی حرمت ہے۔بخلاف بغل اور زیر ناف بالوں کے (کہ وہ خود ہی کرے)۔

ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ بغل کے بالوں کے بارے میں یہ بات محل کلام ہے پھر میں نے ابن حجرؒ کی یہ بات دیکھی ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ بغل کی صفائی بھی خود کرے کسی دوسرے سے نہ کروائے۔یہ تفصیل اس وقت ہے کہ جب بغل کے بال اکھاڑے۔باقی ان کا مونڈنا تو یہ بغیر کسی دوسرے کے سپرد کئے ہوئے متصور نہیں اور علماء کرام بغل کے بالوں کے حلق کرنے کو جائز قرار دیا ہے بغیر کسی قسم کی حرمت اور مروّت (آداب نفسانی) کی ہتک کے۔ظاہر یہی ہے کہ اکھاڑنے میں بھی یہی کہا جائے اس لئے کہ دونوں میں کوئی فرق ظاہر نہیں ہوتا۔

امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ پسندیدہ عمل یہ ہے کہ مونچھوں کو اتنا کتروائے کہ ہونٹ کی سرخی ظاہر ہو جائے بالکل صاف ہی نہ کرے اور حضور ﷺ کے اس ارشاد **احفوا الشارب** کا معنی ہے کہ جو بس ہونٹوں سے بڑھ جائیں ان کو کاٹ دو۔

اور براجم کا دھونا (براجم) وہ انگلیوں کی گرہیں اور مخفی جگہیں ہیں اور یہ باء کے فتحہ کے ساتھ بُرجمۃ کی جمع ہے **برجمه باء** اور جیم کے ضمہ کے ساتھ ہے) سنت ہے اور یہ وضو ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے اور اس کے ساتھ اس میل کے صاف کرنے کو ملایا جائے گا جو کان کے اندرونی حصہ میں جمع ہوتی ہے اور اسی طرح جو کان کے سوراخ میں ہوتی ہے اور جو ناک کے اندر میل وغیرہ

جمع ہوتی ہے اوراسی طرح ہر قسم کی میل کا بدن سے صاف کرنا۔

كتاب الحميدى: جو صحیحین کی جامع ہے۔

صاحب الجامع: اس سے مراد ابن الاثیر کی جامع الاصول ہے۔

معالم السنن: یہ ابوداؤد کی شرح ہے۔

۳۸۰: عَنْ اَبِيْ دَاوٗدَ بِرِوَايَةِ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ۔

ترجمہ: ''ابوداؤد کے حوالہ سے حضرت عمار بن یاسر سے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

عمار بن یاسر۔ یہ عمار بن یاسر عنسی ہیں۔ بنی مخزوم کے آزاد کردہ اور حلیف ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے والد یاسر مکہ مع اپنے دو بھائیوں کے جن کا نام حارث اور مالک تھا اپنے چوتھے بھائی کی تلاش میں تشریف لائے پھر حارث اور مالک تو یمن کی طرف واپس ہو گئے مگر یاسر مکہ میں مقیم ہو گئے اور ابو حذیفہ بن المغیرۃ کے حلیف بن گئے۔ ابو حذیفہ نے ان کا نکاح اپنی باندی سے جس کو سمیہ کہا جاتا تھا کردیا۔ ان کے بطن سے حضرت عمار رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ ابو حذیفہ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو آزاد کر دیا۔ پس عمار رضی اللہ عنہ ابو حذیفہ کے آزاد کردہ اور ان کے باپ ان کے حلیف ہوئے۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ ابتداء میں ہی اسلام لے آئے تھے اور یہ ان کمزور مسلمانوں میں سے ہیں جن کو اللہ کے راستہ میں بہت تکالیف مکہ میں پہنچائی گئیں تاکہ یہ اسلام سے باز آجائیں اور مشرکین مکہ نے ان کو آگ میں بھی جلایا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف گزرتے تو ان پر دست مبارک پھیرتے تھے اور فرماتے تھے اے آگ تو عمار پر ٹھنڈک اور سلامتی وعافیت بن جا جس طرح کہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بن گئی تھی۔ یہ عمار مہاجرین اولین میں سے ہیں اور غزوۂ بدر اور تمام غزوات میں شریک ہوئے ہیں اور ان غزوات میں بڑی تکالیف برداشت فرمائیں۔ ان کا نام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے الطیب المطیب رکھا۔ یہ جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور وہاں ہی ۳۷ھ میں جب کہ ان کی عمر ۹۳ سال کی تھی شہید ہوئے۔ ان سے ایک جماعت جس میں حضرت علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم بھی ہیں روایت کرتے ہیں۔

تشریح: عن ابى داؤد: یہ اسی مذکورہ (وفی رواية الختان بدل اعفاء اللحية) سے متعلق ہے۔

بروایة عمار بن یاسر: یعنی یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی نہیں ہے بلکہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ سیدؒ نے فرمایا ہے کہ صاحب مشکوٰۃ نے گویا یہاں محی السنۃ پر اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے اس روایت کو صحاح میں ذکر کیا ہے۔ حالانکہ یہ روایت صحیحین میں نہیں ہے اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک میں اور یہ ان کے اس وعدے کے خلاف ہے جو انہوں نے کتاب کے شروع میں کیا ہے۔ محی السنۃؒ کی طرف سے یہ جواب ہوسکتا ہے کہ وہ وعدہ باب کے مقاصد اور اصول کے بارے میں ہے نہ کہ حدیث کے الفاظ کے اختلاف اور اس جیسی دوسری چیزوں کے ذکر کرنے میں کہ جو کسی فائدے پر مشتمل ہے۔ غور سے سمجھ لو۔

الفصل الثانی:

مسواک اللہ کی رضا کا ذریعہ ہے

۳۸۱: عَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَلسِّوَاكُ مِطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ مَرْضَاةٌ لِّلرَّبِّ.

(رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ واحمد والدارمی والنسائی وروی البخاری فی صحیحه بِلَا اِسْنَادٍ)

أخرجه الشافعي في مسنده ص١٤ـ وأحمد في المسند ٤٧/٦ والدارمي في السنن ١٨٤/١ حديث رقم ٦٨٤ والنسائي في السنن ١٠/١ حديث رقم ٥ـ وذكره البخاري تعليقاً ١٥٨/٤ كتاب الصوم باب ٢٧ـ

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مسواک کرنا منہ کی طہارت کا سبب ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا باعث ہے۔ اس حدیث کو امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام دارمیؒ اور امام نسائیؒ نے روایت کیا ہے اور حضرت امام بخاری نے اس حدیث کو اپنی صحیح بخاری میں بغیر سند کے نقل کیا ہے۔''

اسنادی حیثیت: امام بخاریؒ نے اس حدیث کو اپنی صحیحہ میں بغیر سند کے بیان کیا ہے۔

تشریح: **فم**: میم کی تخفیف کے ساتھ ہے۔

مرضاة: میم کے فتحہ کے ساتھ ہے اور بعض نے میم کے کسرہ کو نقل کیا ہے۔ مظہرؒ نے فرمایا ہے **مطهر** مصدر میمی ہے اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اسم فاعل کے معنی میں ہو **ای مطهر للفم** اور اسی طرح **مرضاة ای محصل برضا الله تعالیٰ** اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مفعول کے معنی میں ہو **ای مرضی للرب**۔ علامہ طیبیؒ نے اس کی یوں وضاحت کی ہے۔ ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ ان دونوں کو ان کی مصدریت ہی پر باقی رکھا جائے تو پھر تقدیر عبارت یوں ہوگی **ای سبب الطهارة والرضا**۔ یا یہ بطور مبالغے کے ذکر ہیں جیسے: **رجل عدل**۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ دونوں الفاظ یہاں کثرت کے معنی کے لئے ہیں جیسے **ماسنده** (وہ جگہ جہاں شیر بہت ہوں) اور **ماذبة** (وہ جگہ جہاں بھیڑیئے بہت زیادہ ہوں) ۔ ابھریؒ نے اس کو ذکر کیا ہے یعنی مسواک سے غالب گمان یہی ہے کہ وہ طہارت اور رضا کا سبب اور باعث ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

الولد مبخلة مجبنة (کہ اولاد اکثر بزدلی اور بخل کا سبب ہوتی ہے)۔

اور صرف مسواک کی یہی دو خصلتیں ذکر کرنے میں اقتصار کرنا، حالانکہ اس کے اور بہت سارے فوائد ہیں شاید اس لئے ہو کہ یہ ان میں سے سب سے افضل ہیں یا اس وجہ سے کہ یہ دونوں باقی کو بھی شامل ہیں (وہ اس طرح کہ) بے شک دنیا میں یہ ظاہری، باطنی حسی اور معنوی طہارت کے حاصل کرنے پر منحصر ہے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضاء کی تکمیل میں منحصر ہے جو کہ مقصود اعلیٰ ہے۔

وروی البخاری فی صحیحه بلا اسناد: یعنی تعلیقاً روایت کی ہے۔ جزم (یقین) کے صیغہ کے ساتھ اور تعلیقات مجزومہ وہ صحیح ہوتی ہیں۔ علامہ میرک شاہؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

چار امور انبیاء علیہم السلام کی سنت ہیں

۳۸۲: وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَرْبَعٌ مِّنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِیْنَ اَلْحَیَآءُ وَیُرْوٰی الْخِتَانُ وَالتَّعَطُّرُ وَالسِّوَاكُ وَالنِّكَاحُ ۔ (رواہ الترمذی)

الترمذی فی السنن ۳/۳۹۱ حدیث رقم ۱۰۸۰ وقال حسن غریب ۔ وأحمد فی المسند ۵/۴۲۱۔

ترجمہ: ''حضرت ابوایوبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا چار چیزیں رسولوں کی سنت میں سے ہیں: ① حیاء اور شرم کرنا۔ دوسری روایت میں ختنہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ ② خوشبو استعمال کرنا۔ ③ مسواک کرنا۔ ④ نکاح کرنا۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: اربع: یعنی ایسی خصلتیں جو انتہائی عظیم اور جلیل الشان ہیں۔

من سنن المرسلین: یہ انبیاء کے طریقے میں سے ہونا، قول اور فعل دونوں اعتبار سے ہے یعنی وہ طریقے کہ جن کو انبیاء نے کیا اور لوگوں کو اس کی ترغیب دی اور من سنن المرسلین کے جملہ تغلیب ہے (یعنی سب کی سنت قرار دیا) اس لئے کہ انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات میں سے بعض نے ان فضائل میں سے بعض کو نہیں کیا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نکاح نہ کرنا۔

الحیاء: ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔ حیاء سے ان کا شمار شروع کیا اس لئے کہ حیاء سراپا خیر ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے اور حدیث میں یہ بات ثابت ہے کہ ہمارے نبی پاک ﷺ کنواری پردہ نشین عورت سے بھی زیادہ حیاء والے تھے اور علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مضمون کی اور بھی روایات نقل کی ہیں جیسا کہ آگے ان کا تذکرہ آئے گا۔

اور ایک نسخہ میں الحناء ہے (مہندی لگانا)۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ حناء، نون کے ساتھ بھی مروی ہے اور حناء اگرچہ یہ صحیح ترمذی کی روایت میں ہے لیکن یہ غلط ہے جیسا کہ میں نے اس کو شن الغارة علی من اظهر معرة میں اپنے اس قول سے بیان کیا۔ الحناء وعوارہ ۔ (عوار کا معنی ہے کمزور ہونا) کچھ یمنی لوگوں نے گمان کیا ہے کہ مہندی لگانا مردوں کیلئے جائز ہے اور انہوں نے اس میں کچھ تصنیف بھی کیا ہے۔ اس وجہ سے وہ باقی علماء مذہب کے ادب میں کمی کرنے والے ہو چکے ہیں اور داڑھی کو خضاب لگانا یہ ہمارے نبی پاک ﷺ کے علاوہ اور کسی نبی کیلئے ثابت نہیں ہے، پس اس تصحیف شدہ روایت کو اس پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) ابن حجرؒ کے کلام میں ایسی ابحاث ہیں جو کہ (قاری) کیلئے مخفی نہیں ہیں۔

ویروی الختان: ابھریؒ نے فرمایا ہے کہ یہ احتمال ہوسکتا ہے بعض نسخوں میں راویوں سے نون گر گیا ہو اور بعد میں اسی رسم الخط کے ساتھ روایت کی گئی ہو۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ مظہرؒ نے علامہ تورپشتیؒ کے کلام کو یوں مختصر نقل کیا ہے کہ حیاء میں تین قسم کی روایات ہیں۔

① حاء اور یاء کے ساتھ اور مراد اس سے وہ چیزیں ہیں جن کی حیاء مقتضی ہے دین میں سے ہونے کی جیسے کہ ستر کا ڈھانپنا اور ان چیزوں سے بچنا جو خلاف مروت ہیں اور اسی طرح ان گناہوں اور ناشائستہ افعال سے بچنا کہ جن کی شریعت نے

مذمت بیان کی ہے۔حیاء سے مراد وہ حیاء طبعی نہیں ہے جو تمام لوگوں میں مشترک ہوتی ہے، کیونکہ فطرۃً طبیعت میں ہوتی ہے وہ ان سنتوں میں داخل نہیں ہوگی۔

② الختان (خاء اور تاء کے ساتھ) ختنہ کرنا یہ تمام انبیاء کی سنت ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک جیسا کہ پہلے اس کا ذکر گزرا ہے۔بعض روایات میں آیا ہے کہ آدم، شیث، نوح، ھود، صالح، لوط، شعیب، یوسف، موسیٰ، سلیمان، زکریا، عیسیٰ، حنظلہ بن صفوان (اصحاب الرس کے نبی) اور محمد صلوٰت اللہ وسلامہ علیہم یہ سب انبیاء مختون پیدا ہوئے تھے۔

③ الحناء (حاء اور نون مشدد کے ساتھ) یہ روایت صحیح نہیں ہے۔شاید کہ اس میں غلطی ہوگئی ہے اس لئے کہ مردوں کو ہاتھ پاؤں میں مہندی لگانا عورتوں سے مشابہت کی وجہ سے حرام ہے اور بالوں کو خضاب لگانا یہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نہیں تھا لہٰذا اس کی نسبت رسولوں کی طرف کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

والتعطر: یعنی بدن اور کپڑوں میں خوشبو لگانا۔بعض صحابہؓ سے یہ روایت منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسی کستوری خوشبو لگانے میں استعمال فرماتے تھے کہ اگر ہم میں سے کسی کے پاس وہ ہوتی تو ہمارے لئے وہ راس اعمال (اصل مال) ہوتی۔

والسواك: حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسواک میں بہت کثرت فرماتے تھے، یہاں تک آپ علیہ السلام کو منہ مبارک میں حفاء کے لاحق ہونے کا اندیشہ ہوگیا تھا۔(حفاء وہ بہت بڑی بیماری ہے جو دانتوں اور مسوڑھوں کو نقصان پہنچاتی ہے)۔

والنكاح: ابن حجرؒ نے فرمایا ہے میں نے نکاح کے متعلق روایات کو ایک جزء میں جمع کیا ہے جس کا نام میں نے الافصاح فی فضائل النکاح رکھا ہے وہ سو (۱۰۰) سے زائد احادیث ہیں۔

امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

نیند سے بیدار ہونے کے بعد مسواک کرنا

۳۸۳: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم لَا يَرْقُدُ مِنَ الَّيْلِ وَلَانَهَارٍ فَيَسْتَيْقِظُ اِلَّايَتَسَوَّكُ قَبْلَ اَنْ يَّتَوَضَّأَ۔ (رواہ احمد وابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/۴۷ حديث رقم ۵۷۔وأخرجه أحمد في المسند ۶/۱۶۰۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات اور دن کی نیند سے بیدار ہوتے تھے تو وضو کرنے سے پہلے مسواک کرتے تھے اس حدیث کو امام احمدؒ اور امام ابوداودؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: لا یرقد من لیل ولا نھار: مِنْ تبعیضیہ ہے یا مِنْ بمعنی فی ہے۔(نیند کے بعد مسواک کا کرنا اس لئے ہوگا) کیونکہ نیند کی وجہ سے منہ کے ذائقہ اور بو میں تبدیلی آجاتی ہے۔پس نیند سے اٹھنے کے بعد مسواک کرنا ضروری ہوگا۔تاکہ اس بو وغیرہ کو زائل کر سکے، خصوصاً جب کہ گفتگو یا کوئی ذکر کرنے کا ارادہ ہو۔

فیستیقظ: یہ مرفوع ہے۔بعض نے منصوب کہا ہے ای یستنبہ۔علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ یستیقظ میں رفع عطف کی

وجہ سے جائز ہے اور نفی دونوں صیغوں پر وارد ہوگی ایک ساتھ اور نصب بھی جائز ہے اس صورت میں نفی کا جواب گا، اس لئے کہ جاگنا وہ نیند سے پہلے ہوتا ہے کیونکہ نیند کا سبب وہ جاگنا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کلام کو طویل کرنے میں اشارہ اس بات کی طرف کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی عادت شریفہ تھی۔

الا يتسوك قبل ان يتوضا: اس میں یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مسواک کرنے پر اکتفاء فرماتے تھے وضو کیلئے مسواک سے (یعنی وضو کیلئے علیحدہ مسواک نہ کرتے تھے)

اور یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ وضو کے ارادے کے وقت یا کلی کے وقت دوبار مسواک کرتے تھے۔ واللہ اعلم

اس کی سند حسن ہے۔

مسواک کرنے کے بعد دھونا مستحب ہے

۳۸۴: وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَسْتَاكُ فَيُعْطِيْنِي السِّوَاكَ لِاَغْسِلَهٗ فَاَبْدَأُ بِهٖ فَاَسْتَاكُ ثُمَّ اَغْسِلُهٗ وَاَدْفَعُهٗ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ١/ ٤٤ حديث رقم ٥٢۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسواک کرتے اور پھر مجھے دیدیتے تاکہ میں اس کو دھوڈالوں۔ چنانچہ میں آپ سے مسواک لے کر پہلے اس سے خود مسواک کرتی اور پھر دھوتی اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدیتی۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: فيعطيني السواك لا غسله: یہ ہونا یا تو اس کو نرم کرنے کیلئے تھا یا صاف کرنے کے لئے۔ اس حدیث میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ مسواک کرنے کے بعد مسواک کا دھونا افضل ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ اخذ ہوتا ہے کہ دورانِ مسواک اور مسواک کرنے کے بعد رکھنے سے پہلے مسواک کا دھونا سنت ہے اور ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ مستحب ہے کہ مسواک تین مرتبہ تین پانیوں سے کرے (یعنی تین بار کرے اور ہر مرتبہ دھوئے) اور یہ بھی مستحب ہے کہ مسواک نرم ہو۔

فابدابه: اى باستعماله۔ یعنی دھونے سے پہلے میں اس کو برکت حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتی اور مجھے یہ پسند نہیں تھا کہ پانی اس چیز کو لے جائے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لعاب دھن سے اس مسواک کے ساتھ لگا ہوا ہوتا۔

فاستاك ثم اغسله: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے یعنی دھونے سے پہلے بطور تبرک میں مسواک کرتی اور اس حدیث میں اس امر کی دلیل ہے کہ دوسرے کی مسواک کا اس کی رضا کے ساتھ استعمال کرنا مکروہ نہیں ہے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ اس لئے یوں کرتی تھی کیونکہ میاں بیوی کے درمیان بے تکلفی ہوتی ہی ہے۔

وادفعه اليه: تاکہ آپ اپنی مسواک مکمل کرلیں، یا اس کو محفوظ کرلیں۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے دوسرا مطلب ظاہر نہیں ہے اس لئے کہ یہ عرف کے اعتبار سے خلافِ آدب ہے اور نیز اس وجہ کہ حدیث میں آیا ہے کہ (صحابہ فرماتے ہیں): كنا نعه

سواك وطهوره: کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے پانی اور مسواک کا انتظام کرتے تھے۔ہاں یہاں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ کسی دوسرے وقت میں دینا مراد ہو یعنی ادفعہ الیہ وقتاً آخر۔ بلکہ یہی زیادہ واضح لگتا ہے اور حدیث کی دلالت دوران مسواک، مسواک کے دھونے پر ظاہر نہیں ہے۔جیسا کہ یہ بات مخفی نہیں ہے۔

میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی اسناد جید ہے۔

الفصل الثالث:

مسواک کی فضیلت

۳۸۵: عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ اَرَانِيْ فِي الْمَنَامِ اَتَسَوَّكُ بِسِوَاكٍ فَجَآءَ نِيْ رَجُلَانِ اَحَدُهُمَا اَكْبَرُ مِنَ الْاٰخَرِ فَنَاوَلْتُ السِّوَاكَ الْاَصْغَرَ مِنْهُمَا فَقِيْلَ لِيْ كَبِّرْ فَدَ فَعْتُهُ اِلَى الْاَكْبَرِ مِنْهُمَا۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في الصحيح ۱/۳۵٦ حديث رقم ۲٤٦ ـ ومسلم في صحيحه ٤/۷۷۹ حديث (۱۹ـ ۲۲۷۱)۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مسواک کر رہا ہوں اسی دوران دو آدمی میرے پاس آئے۔ان میں سے ایک دوسرے سے بڑا تھا میں نے ان میں سے چھوٹے کو مسواک دینے کا ارادہ کیا۔مگر مجھے حکم دیا گیا کہ بڑے کو مسواک دے دو۔ چنانچہ میں نے ان میں سے بڑے کو مسواک دیدی۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: ارانی: میرک شاہؒ نے فرمایا ہے ہمارے اصل سماع میں یہ صیغہ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ متکلم کا صیغہ ہے اى ارى نفسي اور اصل میں یہ رایت نفسی تھا، اور مضارع کی طرف عدول کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں حال ماضی کی حکایت ہے۔شیخ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے جس نے اس کو ضمہ دیا ہے اس کو وہم ہوا ہے۔لیکن عبدالعزیز ابھریؒ نے فرمایا ہے کہ بعض نسخوں میں ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ بھی منقول ہے، معنی ہیں اظن نفسي۔علامہ کرمانیؒ نے یہ بات کہی ہے، گویا کہ کرمانیؒ نے یہ گمان کیا ہے کہ رؤیا منامیہ کو ظن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔اسی وجہ سے کہا جاتا ہے: رایت نفسی کانی افعل کذا وکذا ونحوہ کہ میں نے اپنے کو دیکھا گویا کہ میں اِس اِس طرح کر رہا ہوں۔لیکن یہ بات بعض ظن میں ہوسکتی ہے اس لئے کہ انبیاء کے خواب حق ہوتے ہیں۔پس اگر ہمزہ کا ضمہ ثابت ہو جاتے تو صحیح یہ ہے کہ اس کو محمول کیا ہے باب افعال الاراءۃ پر جو الاعلام کے معنی میں ہے اور ابن حجرؒ نے ضمہ کے معنی کے علاوہ اور کوئی معنی ذکر نہیں کیا۔

فی المنام اتسوك بسواك: تقدیر عبارت یوں ہے: رایت نفسی فی المنام متسو کا۔مفعول اول مستتر ہے (یعنی نفسی) اور دوسرا ظاہر ہے اور باب علمت (افعال قلوب) میں یہ جائز ہے کہ فاعل اور مفعول دو ضمیریں ایک شئ سے متعلق ہوں لہٰذا مفعول ثالث اتسوک ہوگا۔اسی طرح بعض نے کہا ہے اور یہ اس پر مبنی ہے کہ ضمہ کے روایت میں: باب افعال الاراء ۃ سے ہو نہ کہ رویۃ سے اور اتسوك سے اَن مقدر ہو اور فاعل کے معنی میں ہو ای متسو کا۔

الاصغر منهما: چھوٹے کو شاید اسلئے دی ہو کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہو۔

کبیر: یعنی جو عمر میں بڑا ہے اس کو دو۔

فدفعته الى الاكبر منهما: حدیث کے ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں آپ کی ایک جانب تھے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی بائیں جانب ہوں اور یہی دوسرا مطلب زیادہ مناسب ہے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریب والے کو مقدم کرنے کا ارادہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑے کی تقدیم کا حکم دیا گیا اور یہ حدیث ابن عباسؓ اور اعرابی والی حدیث کے منافی نہیں ہے کہ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پس خوردہ دودھ دینے میں ابن عباسؓ اور اعرابی کو ترجیح دی تھی (اور اس میں بڑے سے شروع کرنے کا حکم ہے) اس لئے کہ اُن دونوں حدیثوں میں یہ بات مذکور ہے کہ ابن عباسؓ اور دیہاتی گنوار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں جانب تھے اور ابوبکرؓ اور عمرؓ وغیرہ دوسرے بڑے بڑے مشائخ وہ بائیں جانب تھے (اس لئے وہاں دائیں کو اختیار کیا) علاوہ ازیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباسؓ سے اجازت بھی طلب کی تھی، مشائخ صحابہ کو دینے کیلئے تو ابن عباسؓ نے فرمایا تھا: **لا اوثر بنصيبى منك احدا** کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی ہوئی چیز پر اپنے سوا کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔

اور ابن حجرؒ نے یہاں پر طویل کلام کیا ہے جو کہ اس مقام میں بے سود ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ابن عباسؓ کی حدیث سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ کبیر سے مراد یہاں پر عمر میں بڑا ہونا ہے نہ کہ علم اور مرتبے میں اور یہاں اس بات کو مراد لینے کی وجہ یہ ہے کہ ابن عباسؓ کی روایت میں دائیں طرف ہونے کا اعتبار ہے عمر اور فضیلت سے قطع نظر کرتے ہوئے تو اُس حدیث میں دائیں طرف میں بیٹھنا ہی اس کے لئے مرجح بنا، پس اسی طرح عمر میں بڑا ہونا یہاں پر مرجح ٹھہرا فضیلت اور مرتبے کا اعتبار کئے بغیر۔ پس اگر تو کہے فرق وہ ممکن ہے بایں طور کہ وہاں پر کوئی خارجی مرجح بھی پایا جائے اور وہ کبر سن (عمر کا بڑا ہونا ہے) پس اس کے ہر ایک کیلئے ظاہر ہونے کی وجہ سے وہی رعایت کا زیادہ حقدار ہے بنسبت اس فضیلت کے جو صرف بعض کے لئے ظاہر ہوتی ہے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) اے مخاطب تو بخوبی اس بات سے باخبر ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عمر میں اور فضیلت میں ایک ساتھ ابن عباسؓ اور دیہاتی کے مقابلے میں بڑا ہوا ہونا اظہر من الشمس ہے اور اس کے باوجود جو دونوں جہتوں کے اعتبار سے مفضول تھا وہ دائیں جانب میں ہونے کی وجہ سے تقدیم کا مستحق ہوا۔ پھر ابن حجرؒ کا یہ کہنا: **لا ستوائهما فى كونهما امامه** "کہ دونوں آدمی سامنے ہونے میں برابر تھے" یہ قول مدفوع ہے کیونکہ اس صورت میں بھی دائیں اور بائیں میں تقابل ثابت ہو جاتا ہے۔ پھر اس بات کو جواب میں تسلیم کر لینے کے بعد ہم اس کو ممنوع قرار دیتے ہیں (یعنی یہ بات قابل تسلیم نہیں ہے) پس واضح قسم کی بات کو چھوڑ کر اضطراب کی طرف جانا یہ اہل عقل وفہم کی عادات میں سے نہیں ہے۔

مبالغہ فی السواک

۳۸۶: وَعَنْ اَبِىْ اُمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ مَاجَاءَ نِىْ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَطُّ اِلَّا اَمَرَنِىْ بِالسِّوَاكِ لَقَدْ خَشِيْتُ اَنْ اُحْفِىَ مُقَدَّمَ فِىَّ. (رواه احمد)

أخرجه ابن ماجة من حديث طويل ١/١٠٦ حديث رقم ٢٨٩ وأحمد فى المسند ٥/٢٦٣۔

ترجمہ: "حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت جبرئیل علیہ

السلام جب بھی میرے پاس آتے تو مجھے مسواک کرنے کا حکم دیتے۔ یہاں تک مجھے ڈر ہوا کہ میں مسواک کی زیادتی سے اپنے منہ کے اگلے حصہ کو چھیل نہ ڈالوں۔ اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ماجاء نی جبریل علیه الصلاة والسلام:

یہ علیه الصلٰوة والسّلام کے جملہ میں یا تو یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں یا راوی کی طرف سے بطور تعظیم کے زیادتی ہے۔

قط: شاید یہ آنا مقید ہو سنن کی تعلیم کے واسطے یا ماجاء نی قط سے کثرت میں مبالغہ مقصود ہو۔

لقد خشیت: یہ مقدر قسم کا جواب ہے تقدیر عبارت یوں ہے: والله لقد خفت۔

احفی: یہ احفاء سے ہے۔

یعنی معنیٰ یہ ہے کہ میں مسواک کے کثرت سے استعمال سے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی وصیت کی وجہ سے اور مسواک پر مداومت کی کثرت کی وجہ سے اپنے منہ کے اگلے حصے یعنی مسوڑھوں کو چھیل لیتا۔

میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ اسناد جید کے احمدؒ نے اس کو نقل کیا ہے اور اس حدیث کے طرق بہت سارے ہیں جن میں بعض بعض کیلئے تقویت کا سبب ہیں۔

مسواک زیادہ سے زیادہ کرنی چاہئے

۳۸۷: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَقَدْ اَكْثَرْتُ عَلَيْكُمْ فِي السِّوَاكِ. (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/ ۳۷٤ حدیث رقم ۸۸۸۔ وأخرجه النسائی فی السنن ۱/ ۱۱ حدیث رقم ٦ وأخرجه الدارمی فی السنن ۱/ ۱۸٤ حدیث رقم ٦۸۲۔ وأخرجه أحمد ۳/ ۱٤۳۔

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تم سے مسواک کے متعلق بہت کچھ بیان کیا ہے۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: لقد اکثرت: یہ معلوم کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

علیکم فی السواك: علامہ طیبیؒ نے کہا ہے کہ اس کلام کا فائدہ باوجود یکہ وہ اس کو جانتے تھے۔ مسواک کے اہتمام کی شان کا اظہار ہے اور اکثرت کا مفعول محذوف ہے ای اطنبت الکلام فی السواك کائنا علیکم۔ زیادہ واضح بات یہ ہے کہ علیکم میں علٰی یہ اکثرتُ کا صلہ ہو، تقدیر عبارت یوں ہوگی: اکثرت علیکم الامر والوصیة فی حق السواك اور کرمانیؒ نے فرمایا ہے کہ بعض نسخوں میں اُکثرت ماضی مجہول کے صیغہ کے ساتھ منقول ہے: ای بولغت من عند الله۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امر میں مجھ کو بطور مبالغے کے حکم دیا گیا۔

مسواک کی فضیلت وحی سے ثابت ہے

۳۸۸ : وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَسْتَنُّ وَعِنْدَهٗ رَجُلَانِ اَحَدُهُمَا اَكْبَرُ مِنَ الْاٰخَرِ فَأُوْحِيَ اِلَيْهِ فِيْ فَضْلِ السِّوَاكِ اَنْ كَبِّرْ اَعْطِ السِّوَاكَ اَكْبَرَهُمَا۔ (رواہ ابو داود)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ١/٤٣ حديث رقم ٥٠۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسواک کر رہے تھے اور آپ کے پاس دو آدمی تھے ان میں سے ایک بڑا تھا اور دوسرا چھوٹا چنانچہ مسواک کی فضیلت کے بارے میں آپ کی طرف یہ وحی نازل کی گئی کہ ان میں سے بڑے کو مسواک دے دو۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: يستن : اى يستاك۔ نہایہ میں ہے کہ استنان مسواک کے استعمال کرنے کو کہتے ہیں یہ اسنان سے افتعال کے باب میں سے ہے مطلب یہ ہے کہ دانتوں کو صاف کر رہے تھے۔

اور ابہریؒ نے فرمایا ہے یہ سِن (سین کے کسرہ کے ساتھ ہے) اور بعض نے سَن سین کے فتحہ کے ساتھ نقل کیا ہے اور یہ ماخوذ ہے: سننت الحديد اى حككت الحجر سے یعنی پتھر کو اتنا رگڑا کہ وہ تیز دھاری دار ہو گیا اور مسن وہ پتھر کہ جس پر کسی چھری وغیرہ کو تیز کیا جائے۔

وعنده رجلان احدهما اكبر من الاخر : وہ دوسرا عمر کے اعتبار سے بڑا تھا، یا فضل و بزرگی کے اعتبار سے۔ پہلی حدیث میں ہم نے اپنے سِناً کے قول ہی پر اقتصار کیا تا کہ ہم اس کو اصغر کے مقابلہ میں لا سکیں۔

فاوحى اليه: یہ وحی کا آنا یا تو بغیر کسی کی طرف میلان کے تھا، تو اس صورت میں یہ تاکید ہوگی وحی منامی کی یا آپ ﷺ نے چھوٹے کو دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اصغر کو مقدم کرنے کے قاعدے کی وجہ سے پھر وحی آئی اس صورت میں پہلا اور یہ ایک ہی واقعہ ہوگا۔

ان كبر : یہ بات وہ ہے جو وحی کی گئی۔

اعط السواك اكبرهما: ظاہر یہی ہے کہ یہ بعض راویوں کی طرف سے بطور تفسیر کے ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حاضرین مجلس میں سے جو بڑا ہے اس کو سلام میں پلانے میں خوشبو لگانے وغیرہ امور میں مقدم کیا جائے گا یعنی اس کا حق پہلے ہے۔ ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے مگر وہ آدمی جو کہ اس کے دائیں جانب ہو (وہ اس وقت زیادہ حقدار ہے) اور علامہ طیبیؒ نے مزید یہ بھی فرمایا ہے۔ کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کی مسواک استعمال کرنا مکروہ نہیں ہے جیسا کہ بعض حضرات جو اس کو ناپسند سمجھتے ہیں وہ اس کے کراہت کے قائل ہیں، ہاں البتہ سنت یہ ہے کہ اس کو پہلے دھو لے پھر اس کو عاریۃً دے دے۔ ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ دوسرے کی مسواک کو استعمال کرنے میں گھن محسوس کرنا اور اس کو ناپسند سمجھنا یہ حضور ﷺ کے علاوہ میں ہے۔ باقی حضور ﷺ کی مسواک کا استعمال تو ہر مؤمن کے ہاں خیر و برکت کا باعث ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ حدیث میں کوئی ایسی بات مذکور نہیں جو دھونے کے منافی ہو۔ بہتر یہ تھا کہ

علامہ طیبیؒ یغیر کی جگہ یناول کہتے۔خود سمجھ لواور اس حدیث کے بارے میں ظاہر یہی ہے کہ یہ خواب کی حالت ہی کی حکایت ہے (جو فصل ثالث کی پہلی حدیث میں گزری) ورنہ ایک امر میں وحی کے تعدد سے اشکال پیدا ہوگا، کیونکہ انبیاء کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں۔

مسواک والی نماز کا ثواب سترّ درجہ زیادہ ہوتا ہے

۳۸۹ : وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَفْضُلُ الصَّلَاةُ الَّتِىْ يُسْتَاكُ لَهَا عَلَى الصَّلَاةِ الَّتِىْ لَايُسْتَاكُ لَهَا سَبْعِيْنَ ضِعْفًا۔ (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

أخرجه أحمدفى المسند ٦/٢٧٢۔والبيهقى فى شعب الايمان۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ نماز کہ جس کے لئے وضو کرتے وقت مسواک کی گئی ہو۔اس نماز پر جس کے لئے مسواک نہیں کی گئی ستر درجہ فضیلت اور ثواب رکھتی ہے۔اس حدیث کو امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔''

تشریح: سبعین: یہ مفعول مطلق ہے یا ظرف ہے تفضّل مقدار سبعین۔

ضعفا: یہ تمیز ہے اور اس سے عدد مذکور کی مثل مراد ہوتی ہے۔قاموس میں لکھا ہے: ضعف الشئ کسرہ کے ساتھ مثله اس چیز کی مثل کو کہتے ہیں یا ضعف سے المثل الی مازاد یعنی دو چند سے بھی زیادہ جو غیر محصور ہو۔اس دوسرے معنی کو ابن حجرؒ نے اختیار کیا ہے لیکن اظہر وہ پہلا معنیٰ ہے پھر یہاں پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ جماعت کی نماز وہ اکیلے کی نماز سے ۲۷ درجہ افضل ہوتی ہے یا بعض کے نزدیک فرض عین ہے (تو مسواک والی نماز ستّر درجے افضل کیسے ہوگی) (تو جواب یہ ہے) کہ ممکن ہے کہ ایک ہی درجہ ہو جو ستّر سے زیادہ کے برابر ہو اور باقی یہ جواب دینا کہ کبھی سنت وہ فرض سے افضل ہوتی ہے جیسے کہ سلام کرنا' جواب دینا' تنگدست کو مہلت دینا اور اس کو بری کر دینا یہ جواب صحیح نہیں ہے اس لئے کہ یہ دونوں فرض کی مصلحت کی وجہ سے اور بطور زیادتی کے حاصل ہوئی ہیں۔

امام احمدؒ نے اس کو نقل کیا ہے اور ان کے الفاظ یہ ہیں: صلاة بسواك افضل من سبعين صلاة بغير سواك۔ابن الہمامؒ نے بھی اس کو اسی طرح ذکر کیا ہے اور اس حدیث کا ظاہر ہماری اس بات کی تائید کرتا ہے جو ہم نے ضعف کے معنی میں اختیار کی ہے کہ ضعف یہ عدد مذکور کی مثل کے معنی میں آتا ہے۔اس لئے کہ احادیث بعض بعض کی وضاحت کرتی ہیں اور ضعف کو ضعف اور اس کی مثل پر محمول کرنا پھر یہ تاویل کرنا کہ قلیل کے بتلانے کے بعد کثیر کو بتلایا ہے۔خلاف ظاہر ہے۔

میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ اس روایت کو احمد، بزار، ابو یعلیٰ اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس حدیث میں کچھ کلام معلوم ہوتا ہے، اس میں مجھے جو ڈر ہے وہ یہ ہے کہ محمد بن اسحٰق کا ابن شہاب سے سماع ثابت نہیں ہے اور اس کو حاکمؒ نے بھی روایت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔اسی طرح میرک شاہؒ نے فرمایا ہے اور محمد بن شہاب کہ امام مسلم نے ان سے متابعات میں روایت کی ہے اور حدیث کیلئے شاہد بھی ہے وہ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جابرؓ کی

حدیث ہے اوران دونوں کوابونعیم نے جید حسن سندوں سے نقل کیا ہے۔

حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ مسواک کان پر رکھتے تھے

۳۹۰ : وَعَنْ اَبِیْ سَلَمَةَ عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ لَوْلَآ اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِیْ لَاَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ وَلَاَخَّرْتُ صَلَاةَ الْعِشَاءِ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ قَالَ فَكَانَ زَيْدُ بْنُ خَالِدٍ يَشْهَدُ الصَّلَوٰتِ فِی الْمَسْجِدِ وَسِوَاكُهٗ عَلٰى اُذُنِهٖ مَوْضِعَ الْقَلَمِ مِنْ اُذُنِ الْكَاتِبِ لَايَقُوْمُ اِلَى الصَّلٰوةِ اِلَّا اسْتَنَّ ثُمَّ رَدَّهٗ اِلٰى مَوْضِعِهٖ رواه الترمذی وابوداود اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يَذْكُرْ وَلَاَخَّرْتُ صَلَاةَ الْعِشَآءِ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔ (رواه ابوداود والترمذی)

أخرجه الترمذی ۱/۳۵حدیث رقم ۲۳وقال حسن صحیح ـوأخرجه أبوداوٗد ۱/ ۴۰حدیث ۴۷وأحمد فی المسند ۴/۱۱۶۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسلمہؓ حضرت زید بن خالد جہنیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر مجھے اپنی امت پر مشقت کا ڈر نہ ہوتا میں ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا اور میں عشاء کی نماز کو ثلث لیل تک مؤخر کرتا۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت زید بن خالد جہنیؓ جب نماز کے لئے مسجد میں آتے تھے تو مسواک ان کے کان پر رکھی ہوتی تھی جس طرح کاتب اپنے کان پر قلم رکھتا ہے۔ وہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو فوراً مسواک کر لیتے اور پھر کان پر رکھ لیتے۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ابوداؤدؒ نے وَلَاَخَّرْتُ صَلَاةَ الْعِشَآءِ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ کے الفاظ ذکر نہیں کئے اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

راویٔ حدیث:

ابوسلمة ۔ یہ ''ابوسلمہ'' اپنے چچا عبداللہ ابن عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت کرتے ہیں۔ زہری وقریشی ہیں۔ ایک قول کے اعتبار سے مدینہ کے مشہور سات فقہاء میں سے ہیں۔ مشہور وصاحب علم تابعین میں سے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی کنیت ہی ان کا نام ہے اور ان سے بہت زیادہ حدیثیں مروی ہیں۔ ابن عباسؓ ابو ہریرہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ سے انہوں نے حدیث کو سنا۔ ان سے زہری یحییٰ بن ابی کثیر شعبی رحمہم اللہ وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ ۹۷ھ میں ان کا انتقال ہوا جب کہ ان کی عمر بہتر سال کی تھی۔

عن زيد بن خالد الجهنی : یہ کوفہ میں رہائش پذیر ہوئے تھے ان سے عطاء بن یسار نے روایت کی ہے۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح کہا ہے اور مصنفؒ نے ان کا ذکر اسماء الرجال میں نہیں کیا ہے۔

تشریح: **لامرتهم** : یعنی بطور وجوب کے۔

ولاخرت: یعنی ہمیشہ۔

صلاة العشاء یا (لاخرت صلٰوة العشاء) کا معنی ہے کہ اس کے مؤخر کرنے کا وجوباً حکم دیتا۔

ثلث الليل: ثُلث، لام کے ضمہ اور سکون کے ساتھ مروی ہے۔

وسواكه على اذنه: اذن، ذال کے ضمہ اور سکون کے ساتھ ہے اور جملہ حال واقع ہے۔

لا يقوم الى الصلٰوة الا استن: یعنی نماز کیلئے مسواک کرتے، پہلی حدیث (یعنی عند کل صلٰوة) کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے اور اس عمل میں یہ منفرد ہیں۔لہٰذا یہ حجت دلیل نہیں ہوسکتی یا مراد استاك لطهارة الصلوه ہے کہ وضو کے وقت مسواک کرتے۔

ثم : ای بعد الصلٰوة۔

رده الى موضعه: ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس جگہ رکھنے میں حکمت یہ ہے اس کے لینے میں آسانی ہوتی ہے اور مسواک کرنا یاد بھی آجاتا ہے، پس مسواک کان پر رکھنا مسنون ہوگا۔ (ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں) اس جگہ اس تکلف کو بیان کرنا جو کہ حرج کا باعث ہے کسی پر مخفی نہیں ہے۔

اور كان محل السواك من اصحاب رسول الله محل القلم والی روایت بعد اس کے کہ اس کی صحت کو تسلیم کر لیا جائے۔ وہ بعض پر محمول ہے جو کہ ایک پر صادق آتی ہے لہٰذا یہ سنت کا فائدہ نہ دے گی۔

هذا حديث حسن صحيح: علامہ طیبی نے فرمایا ہے کہ اس روایت کی دو سندیں ہیں ایک صحیح اور دوسری حسن۔ یا حسن کہنا لغت کے اعتبار سے ہے یا بعض کے نزدیک حسن اور بعض کے نزدیک صحیح تو حسن لذاته صحيح لغيره ہوئی۔

بَابُ سُنَنِ الْوُضُوْءِ

وضو کی سنتوں کا بیان

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے اس عنوان میں سُنن سے مراد صرف وضو کی سنتیں ہی نہیں بلکہ سنن سے مراد اقوال نبی یا افعال نبی یا تقریرات نبی ﷺ ہیں۔ عام اس سے کہ وہ سنت ہوں یا فرض ہوں جیسا کہ کہا جاتا ہے: جاء في السنة یعنی سنت (حدیث) میں اس طرح آیا ہے۔ابن حجرؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

(ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ اے مخاطب تو اس بات سے باخبر ہوگا کہ سنن الوضوء کو اس معنی پر حمل کرنا یہ بعید ہے پس بہتر بات یہاں یہ ہوسکتی ہے کہ اس عنوان کو تغلیب (غلبہ دینے) پر محمول کر لیا جائے اور بعض نے کہا ہے مسواک کو علیحدہ باب میں ذکر کرنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کے اہتمام میں زیادتی کی جائے اور بعض نے کہا ہے کہ مسواک کرنا یہ وضو ہی کے ساتھ خاص نہیں (بلکہ یہ علیحدہ مستقل سنت ہے) لیکن یہ جواب قابلِ رد ہے کیوں کہ ہاتھوں کا دھونا بیدار ہونے کے بعد وہ بھی تو وضو کے ساتھ خاص نہیں جیسا کہ مسلم شریف کی شرح میں مذکور ہے اور اسی دائیں طرف سے شروع کرنا۔ (لہٰذا) اس میں یہ بات ملحوظ رہے کہ کسی چیز کا وضو کی سنتوں میں سے ہونا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ وضوء کے ساتھ خاص بھی ہو۔

الفصل الاول:

غَمْسُ الْيَدِ فِى الْاِنَاءِ

۳۹۱: عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اسْتَيْقَظَ اَحَدُكُمْ مِنْ نَوْمِهٖ فَلَا يَغْمِسُ يَدَهٗ فِى الْاِنَاءِ حَتّٰى يَغْسِلَهَا ثَلَاثًا فَاِنَّهٗ لَايَدْرِىْ اَيْنَ بَاتَتْ يَدُهٗ. (متفق عليه)

أخرجه البخاری ۲٦۳/۱ حديث رقم ۱٦۲۔ ومسلم ۲۳۳/۱ حديث رقم (۸۷۔۲۷۸)۔وأبوداؤد ۷۸/۱ حديث رقم ۱۰۵ وأخرجه الترمذی فی السنن ۳٦/۱ حديث رقم ۲٤۔والنسائی فی السنن ٦/۱ حديث رقم ۱۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱۳۸/۱ حديث رقم ۳۹۳۔ وأخرجه الدارمی ۲۱٦/۱ حديث رقم ۷٦٦ وأخرجه مالك فی الموطأ ۲۱/۱ كتاب الطهارة حديث رقم ۹۔وأحمد فی المسند ۲٤۱/۲۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہو۔اس کو چاہئے کہ وہ اپنے ہاتھ کو پانی کے برتن میں اس وقت تک نہ ڈالے جب تک کہ پہلے اس کو تین مرتبہ دھونہ ڈالے کیونکہ اس کو معلوم نہیں کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گزاری ہے۔(بخاری ومسلم)''

تشریح: احدکم من نومه: من نومه۔کی قید لگانا اس لئے ہے کہ ہاتھ میں نجاست کے لگنے کا وہم وہ اکثر نیند سے اٹھنے والے میں ہوتا ہے یہاں مفہوم مخالف نہیں ہے اور اسی وجہ سے ہمارے علماء نے فرمایا ہے کہ یہ دھونا نیند سے بیدار ہونے والے کے علاوہ کیلئے بھی سنت ہے۔اس لئے کہ یہاں علت دھونے کی وہ یہ ہے کہ اس نے ہاتھ سے بدن کے پسینے اور میل کچیل وغیرہ کو چھوا ہو اور یہ علت بیدار میں بھی موجود ہوتی ہے۔ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں بلکہ بیدار آدمی تو بطریق اولیٰ یہاں مراد ہے کیونکہ یہ علت اس میں دوسرے احتمالات کی زیادتی کے ساتھ موجود ہے اور باقی ابن حجرؒ کی تشریح کہ اگر ہاتھ کا پاک ہونا یقینی ہو اگر چہ سو بھی گیا ہو تو پھر پانی میں ہاتھ ڈالنے میں کراہت نہیں ہے کیونکہ پانی کو ناپاک کرنے کا وہم یہاں منتفی ہے یہ نص کے ساتھ معارضہ ہے۔

فلا یغمس یده (ہاتھ کا ذکر) مثال کے طور پر ہے جیسا کہ ابن حجرؒ نے کہا ہے یا ہاتھ کا ذکر اس لئے ہے کہ اس کو دوسرے اعضاء پر فضیلت دی گئی ہے۔پس بے شک یہ ہاتھ اگر چہ آلہ ہے جب اس کا استعمال ممنوع ٹھہرا تو اس کے علاوہ کا استعمال بطریق اولیٰ ممنوع ہوگا۔

فی الاناء: یعنی پانی کے برتن میں اور اسی کے معنی ہیں، ہر مائع چیز اور یہ بات طے شدہ ہے کہ برتن کا پانی وہ تھوڑا ہی ہوتا ہے لہٰذا اس کو قلیل کے لفظ سے مقید کرنے کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ ابن حجرؒ کو یہ وہم ہوا اور ایک نسخہ میں نون مشدد کی زیادتی کے ساتھ منقول ہے۔ابہریؒ نے فرمایا ہے کہ نون تاکید کے ساتھ مسلم میں ہے اور بغیر نون تاکید کے صحیحین دونوں میں ہے۔ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ حدیث مذکور صحیحین میں بغیر نون تاکید کے ہے اور باقی نون تاکید کے ساتھ مسند بزار میں ہشام بن حسان کی روایت میں ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: فلا یغمسن یده فی طهوره حتی یفرغ علیها ثلاثا۔

ثلاثا: سیدؒ نے فرمایا ہے۔ثلا ثاً، یہ لفظ صرف مسلم میں ہے، لہٰذا اس کو متفق علیہ کہنا محل بحث ہے اور نہی یہاں تنزیہی ہے علت کی دلیل کی وجہ سے، پس تین بار ہاتھ دھونا سنت ہوگا اور اس میں ہمارے مذہب حنفیہ کی دلیل موجود ہے۔اس لئے کہ ہمارے ائمہ نے نجاست غیر مرئیہ کی تطہیر کو تین بار دھونے کے ساتھ مقید کیا ہے۔پس بے شک جب شریعت نے نجاست متوہمہ میں یہ حکم لگایا ہے (جتنی بار دھونا) تو محققہ یعنی جو یقینی طور پر موجود ہے اس میں یہ حکم بطریق اولی موجود ہوگا۔

فانہ لا یدری: یہ علت کا بیان ہے **ای لا یعلم۔**

این باتت یدہ: امام نوویؒ نے امام شافعیؒ اور بعض دوسرے علماء سے یہ نقل کیا ہے کہ اہل حجاز پتھروں کے ساتھ استنجاء کرتے تھے اور ان کے شہر موسم کے اعتبار سے گرم تھے، پس جب وہ سو جاتے تو گرمی کی وجہ سے ان کو پسینہ آتا تھا، پس پھر اس بات سے امن نہیں ہوتا تھا کہ کہیں ہاتھ گھوم کر نجاست کی جگہ پر یا کسی پھنسی یا جوں وغیرہ پر پڑ جائے (لہٰذا غسل ید کا حکم دیا گیا) اور ہاتھ دھونے سے پہلے ہاتھ ڈالنے کی نہی پر اجماع ہے۔لیکن جمہور فرماتے ہیں کہ نہی تنزیہی ہے، تحریمی نہیں ہے۔پس اگر ہاتھ ڈال دیا دھونے سے پہلے تو پانی میں فساد نہیں ہوگا اور نہ ہی ہاتھ ڈالنے والا گناہ گار ہوگا۔

اور تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے یہ نہی اس کے حق میں ہے کہ جو رات گزارے اس حال میں کہ وہ پتھر سے استنجاء کرنے والا ہو اور خارش زدہ ہو اور جو اس طرح کی حالت میں رات نہ گزارے تو اس کے لئے اس معاملے میں وسعت ہے اور اس کے لئے بھی مستحب ہے ہاتھوں کا دھونا اسلئے کہ سنت جب وہ ایک معنی کیلئے وارد ہوتی ہے تو اس معنیٰ کے زوال سے وہ ختم نہیں ہوگی۔

اور شرح السنۃ میں مذکور ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھوں کے دھونے کو امر غیر یقینی سے معلق کیا ہے اور جب امر غیر یقینی سے معلق ہو تو وہ واجب نہیں ہوتی۔پس پانی اور ہاتھوں کی اصل وہ طہارت ہے پس اکثر نے اس حدیث کو احتیاط پر محمول کیا ہے اور حسن بصری اور امام احمد بن حنبلؒ ایک روایت میں اس حدیث کے ظاہر کی طرف گئے ہیں اور ہاتھ دھونے کو انہوں نے واجب قرار دیا ہے اور نہ دھونے کی صورت میں پانی کی نجاست کا حکم لگایا ہے۔علامہ طیبیؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے اور امام شمنیؒ نے عروہ بن زبیر اور احمد بن حنبلؒ اور داؤد ظاہری سے یہ نقل کیا کہ نیند سے بیدار ہونے والے پر ہاتھوں کا دھونا واجب ہے۔حدیث کے ظاہر کی وجہ سے۔

اور ہماری دلیل (عدم وجوب میں یہ ہے) کہ نیند اگر حدث ہے تو وہ پیشاب کی طرح ہوگی اور اگر وہ بسبب حدث ہے تو وہ مباشرت کی طرح ہوگی اور ان میں سے ہر ایک میں ان حضرات کے ہاں بھی ہاتھوں کو برتن میں داخل کرنے سے پہلے دھونا واجب نہیں ہے اور نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل ید کی علت توھم نجاست کو قرار دیا ہے، اور توھم نجاست ہاتھوں کے دھونے کو واجب قرار نہیں دیتا۔پس یہ سنت ہونے کی دلیل ہوگی اور عدم وجوب کی دلیل ہوگی۔

متفق علیہ: ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔

نیند سے بیدار ہو کر ناک اچھی طرح جھاڑ کر صاف کرو

۳۹۲: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا اسْتَيْقَظَ اَحَدُكُمْ مِنْ مَنَامِهٖ فَتَوَضَّأَ فَلْيَسْتَنْثِرْ ثَلَاثًا فَاِنَّ

الشَّيْطَانَ يَبِيْتُ عَلٰى خَيْشُوْمِهٖ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٣٣٩/٦حديث رقم ٣٢٩٥۔ومسلم ٢١٢/١حديث رقم (٢٣-٢٣٨) والنسائي ٦٧/١ حديث رقم ٩٠۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو اور وضو کا ارادہ کرے تو تین مرتبہ ناک میں پانی ڈال کر ناک کو جھاڑے کیونکہ اس کی ناک کے بانسے پر شیطان رات گزارتا ہے۔ (بخاری ومسلم)''

تشریح: **فلیستنثر**: یہ فاء شرط کے جواب کیلئے **ای لیغسل داخل انفه (ثلاثا)** یا تقدیر عبارت یوں ہے: **اذا توضا فلیستنثر عند الاستنشاق**۔ طیبیؒ نے فرمایا ہے **استنثر** کا معنیٰ ہے: **حرك النثرة وهي طرف الانف**۔ یعنی ناک کے کنارے کو حرکت دینا اور یہ ممکن ہے کہ یہ: **نثرت الشئی اذا فرّقنه وبددته**۔ سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے بکھیرنا اور بعض نے کہا ہے کہ استنثار کہتے ہیں اس چیز کو جھاڑنا جو ناک کے اس حصے میں ہے جو دماغ کے بطن سے متصل ہے۔

فان الشیطان: یہ فاء سببیہ ہے۔

یبیت علی خشومه: مطلب یہ ہے کہ جب نیند کے وقت احساس زائل ہونے کی وجہ سے شیطان کو وسوسہ ڈالنا ممکن نہیں ہوتا تو وہ آدمی کے ناک کے آخری حصے میں رات گزارتا ہے تاکہ اس کے دماغ میں بُری خوابیں ڈالے اور اچھی ونیک خوابوں سے اس کو روکے۔ کیونکہ رؤیا (خواب کا) محل وہ دماغ ہے۔ پس آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ناک کے اندرونی حصے کو دھونے کا حکم دیا تاکہ شیطان کا فتنہ وفساد اور اس کی گندگی وبدبو ناک سے دور ہو جائے۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ اور قاضیؒ نے فرمایا ہے کہ خیشوم ناک کا وہ انتہائی حصہ ہے جو متصل ہو دماغ کے اگلے حصے کے ساتھ جو کہ حس مشترک اور خیالات کی جگہ ہے۔ پس جب آدمی سو جاتا ہے تو اس کے اخلاط (اربعہ صفاء بلغم خون سوداء) جمع ہو جاتے ہیں او اس کی ناک کی ریزش خشک ہو جاتی ہے اور حس کمزور ہو جاتی ہے اور تفکر منتشر ہو جاتی ہے، پس اس وقت آدمی بیہودہ خواب دیکھتا ہے، پس جب وہ نیند سے بیدار ہوتا ہے اور خیشوم (ناک کے نتھنے) کو اسی حالت پر چھوڑے رکھتا ہے تو سستی اور کمزوری اس پر چھائی رہتی ہے اور نظر صحیح اس کے لئے مشکل ہوتی ہے اور اسی طرح خشوع وخضوع اور نماز کو اس کے حقوق سے قائم کرنا اس کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ پھر علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ جو بات اس حدیث کی تشریح میں ذکر ہوئی وہ از روئے احتمال کے ہے اور کلماتِ نبویہ کا اس حدیث اور اس جیسی دوسری احادیث میں ادب کا حق یہ ہے کہ اس میں کلام نہ کیا جائے (اور بغیر کسی وجہ کے مانا جائے)۔ پس بیشک اللہ تعالیٰ نے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو عجیب معانی اور اشیاء کی حقیقتوں کے ساتھ خاص کیا ہے کہ جس سے کسی دوسرے کی طاقت قاصر ہے۔

اور امام نوویؒ نے قاضی عیاضؒ سے نقل کیا ہے کہ شیطان کے رات گزارنے میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حقیقت پر محمول ہو کیونکہ دِل کی طرف جانے والے راستوں میں ناک بھی ایک راستہ ہے اور اس پر اور کانوں پر کوئی تالا (رکاوٹ، بندش) بھی نہیں ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ شیطان تالے (رکاوٹ، بندش) کو نہیں کھولتا اور حدیث میں جمائی لیتے وقت منہ کو بند کرنے کا

حکم بھی ہے تاکہ شیطان منہ میں داخل نہ ہو اور یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ استعارہ پر محمول ہو کیونکہ گرد وغبار اور ناک کے نتھنوں کی تری وہ گندگی بن جاتی ہے، جو کہ شیطان کے موافق ہے (یعنی اس سے انسان کو تکلیف ہوتی ہے اور شیطان بھی انسان کی تکلیف پر خوش ہوتا ہے)۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

متفق علیہ: یہ الفاظ بخاری شریف کے ہیں۔ ابن حجرؒ نے اسی طرح کہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضو کیسے کرتے تھے

۳۹۳: وَقِيْلَ لِعَبْدِاللّٰهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَاصِمٍ كَيْفَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ فَدَعَا بِوَضُوْءٍ فَاَفْرَغَ عَلٰى يَدَيْهِ فَغَسَلَ يَدَيْهِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ مَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثًا ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهٗ ثَلَاثًا ثُمَّ غَسَلَ يَدَيْهِ مَرَّتَيْنِ اِلَى الْمِرْفَقَيْنِ ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَهٗ بِيَدِهٖ فَاَقْبَلَ بِهِمَا وَاَدْبَرَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهٖ ثُمَّ ذَهَبَ بِهِمَا اِلٰى قَفَاهُ ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتّٰى رَجَعَ اِلَى الْمَكَانِ الَّذِيْ بَدَاَ مِنْهُ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ رَوَاهُ مَالِكٌ وَ النِّسَائِيُّ وَلِاَبِيْ دَاوٗدَ نَحْوَهٗ ذَكَرَهٗ صَاحِبُ الْجَامِعِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن زید بن عاصمؓ سے سوال کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضو کس طرح کیا کرتے تھے؟ یہ سن کر حضرت عبداللہ نے وضو کے لئے پانی منگوایا جب پانی آ گیا تو انہوں نے دونوں ہاتھوں پر پانی ڈالا اور انہیں گٹوں تک دو دو مرتبہ دھویا۔ پھر کلی کی پھر ناک میں پانی ڈال کر اس کو تین تین مرتبہ جھاڑا پھر اپنا چہرہ دھویا تین مرتبہ، پھر دونوں بازوؤں کو مرفقین سمیت دو، دو مرتبہ دھویا پھر دونوں ہاتھوں کے ساتھ سر کا مسح کیا اس طرح کہ دونوں ہاتھوں کو آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور اسی طرح پیچھے سے آگے کی طرف لائے یعنی انہوں نے مسح سر کے آگے کی جانب سے شروع کیا اور ہاتھوں کو گدی تک لے گئے پھر ان کو لوٹا کر اسی جگہ واپس لائے جہاں سے مسح شروع کیا تھا اور پھر دونوں پاؤں کو دھویا۔ اس حدیث کو امام مالکؒ اور امام نسائی نے روایت کیا ہے اور امام ابوداؤد نے بھی اسی طرح کی روایت کو ذکر کیا ہے''

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن زید: یہ عبداللہ بن زید بن عاصم انصاری ہیں۔ بنو مازن بن نجار میں سے ہیں۔ مشہور صحابی ہیں۔ غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے۔ مگر غزوۂ بدر میں شرکت نہیں کر سکے یہی وہ صحابی ہیں جنہوں نے ''مسیلمہ کذاب'' کو قتل کیا وحشی بن حرب کے ساتھ شریک ہو کر۔ صاحب تہذیب لکھتے ہیں کہ وحشی نے مسیلمہ پر نیزہ سے حملہ کیا تھا، اور حضرت عبدالبر رضی اللہ عنہ نے تلوار کے وار سے کام تمام کیا تھا۔ یہ عبداللہ واقعہ حرہ ۶۳ھ میں قتل کر دیئے گئے۔ ان سے ''عباد بن تمیم'' جو ان کے بھتیجے ہیں اور ابن المسیّب روایت کرتے ہیں۔ ''عباد'' بائے موحدہ کی تشدید کے ساتھ ہے۔

تشریح: وَقِيْلَ لِعَبْدِاللّٰهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَاصِمٍ: یہ انصاری ہیں، مازنی ہیں، قبیلہ مازن بن نجار سے ان کا تعلق ہے۔

فدعا بوضوء: وضو، واؤ کے فتحہ ہے یعنی جس سے وضو کیا جائے مراد پانی، اور باء تعدیہ کے لئے ہے ای طلبه۔

علی یدیه: یہ تثنیہ کے ساتھ ہے اور مصابیح میں ہے: **علی یده الیمنی**۔ اور اس دوسرے نسخہ کی تائید دوسرا آنے والا جملہ کررہا ہے کہ جس میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر مذکور ہے۔

فغسل یدیه :ای الی الرسغین۔

مرتین مرتین: مصابیح میں یہ تکرار منقول نہیں ہے۔ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس تکرار کی وجہ احتیاج یہ ہوسکتی ہے کہ حرف اول پر اقتصار کرنے سے تقسیم کا وہم ہوسکتا تھا (اس لئے مرتین مرتین تکرار سے ذکر کیا) اور حضور ﷺ کا دو دو مرتبہ پر اقتصار کرنا بیان جواز کیلئے تھا، ورنہ صحیح روایت سے آپ ﷺ کا تین تین مرتبہ دھونا ثابت ہے اور اس میں یہ بھی آپ ﷺ نے فرمایا ہے: **من زاد علی ذلك او نقص فقد اساء وظلم** ''کہ جس نے اس سے زائد یا کم کیا اس نے بُرا کام کیا اور ظلم کیا'' اور راوی نے بسملہ اور نیت کے بیان کو ذکر نہیں کیا تو شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اقوال کے قبیل سے ہے نہ کہ افعال کے قبیل سے، یا اس لئے کہ وہ یہ دونوں باتیں مخفی ہوتی ہیں اور باقی مسواک کا مذکور نہ ہونا تو وہ اس لئے تھے کہ وہ ان چیزوں میں سے ہے جو وضو کے ساتھ خاص نہیں۔

ثم مضمض واستنثر ثلاثا: اس ثلاثا میں تنازع فعلان ہے۔

مرفقین: یہ میم کے کسرہ اور فاء کے فتحہ کے ساتھ ہے یا اس کے برعکس (فاء کے کسرہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ) ای **معهما**۔

فاقبل: اس سے مسح کا بیان ہے۔

بدا: اس میں **فاقبل او ادبر** کی تفسیر ہے۔

حتی رجع الی المکان الذی بدامنه: اور یہ طریقہ سر کے مسح کا مستحب ہے اور باقی سر کے بچے ہوئے پانی سے کانوں کے مسح کی نسبت وہ دوسری روایات سے معلوم ہوتی ہے۔

حدیثِ گزشتہ کی مزید تاکید

۳۹۴: وَفِی الْمُتَفَقٌ عَلَیْهِ قِیْلَ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَیْدِ بْنِ عَاصِمٍ تَوَضَّأْ لَنَا وُضُوْءَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَدَعَا بِاِنَآءٍ فَاَکْفَأَ مِنْهُ عَلٰی یَدَیْهِ فَغَسَلَهُمَا ثَلَاثًا ثُمَّ اَدْخَلَ یَدَهٗ فَاسْتَخْرَجَهَا فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ کَفٍّ وَّاحِدَةٍ فَفَعَلَ ذٰلِكَ ثَلَاثًا ثُمَّ اَدْخَلَ یَدَهٗ فَاسْتَخْرَجَهَا فَمَسَحَ بِرَأْسِهٖ فَاَقْبَلَ بِیَدَیْهِ وَاَدْبَرَ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَیْهِ اِلَی الْکَعْبَیْنِ ثُمَّ قَالَ هٰکَذَا کَانَ وُضُوْءُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَفِیْ رِوَایَةٍ فَاَقْبَلَ بِهِمَا وَاَدْبَرَ بَدَاَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهٖ ثُمَّ ذَهَبَ بِهِمَا اِلٰی قَفَاهُ ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتّٰی رَجَعَ اِلَی الْمَکَانِ الَّذِیْ بَدَاَ مِنْهُ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثًا بِثَلَاثِ غُرَفَاتٍ مِنْ مَّآءٍ وَفِیْ اُخْرٰی فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ کَفَّةٍ وَاحِدَةٍ فَفَعَلَ ذٰلِكَ ثَلَاثًا وَفِیْ رِوَایَةٍ

لِلْبُخَارِيِّ فَمَسَحَ رَأْسَهٗ فَاَقْبَلَ بِهِمَا وَاَدْبَرَ مَرَّةً وَاحِدَةً ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ اِلَى الْكَعْبَيْنِ وَفِيْ اُخْرٰى فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِنْ غُرْفَةٍ وَاحِدَةٍ۔

أخرجه البخاری فی الصحیح ۱/۲۸۹حدیث ۱۸۵۔ومسلم ۱/۲۱۰حدیث رقم (۱۸۔۲۳۵)وأخرجه أبوداوٗد ۱/۸۹ حدیث رقم۱۱۸۔وأخرجه النسائی فی السنن۱/۷۱حدیث رقم ۹۷۔وأخرجه ابن ماجة ۱/۱۴۹حدیث رقم ۴۳۴۔ وأخرجه فی الموطأ ۱/۱۸کتاب الطھارۃ حدیث ۱۔

ترجمہ: ''اس کو صاحب الجامع نے ذکر کیا ہے۔ بخاری اور مسلم میں یہ روایت اس طرح ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید بن عاصمؓ سے پوچھا گیا کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ وضو کرتے تھے۔ اسی طرح آپ ہمارے سامنے وضو کر کے دکھائیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن زید نے پانی کا ایک برتن منگوایا۔ جب پانی کا برتن آ گیا۔ تو انہوں نے اس کو جھکایا اور اپنے دونوں ہاتھوں پر پانی ڈال کر تین مرتبہ دھویا۔ پھر ہاتھ برتن میں داخل کیا اور اس سے پانی نکالا۔ پھر ایک چلو سے کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا۔ تین مرتبہ ایسا کیا پھر انہوں نے برتن میں ہاتھ ڈال کر پانی نکالا اور تین مرتبہ منہ دھویا پھر انہوں نے اپنا ہاتھ برتن میں ڈال کر نکالا اور اس طرح سر کا مسح کیا کہ پہلے اپنے دونوں ہاتھ آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور پھر پیچھے سے آگے کی طرف لائے اور پھر اپنے دونوں پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھویا اور پھر فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ اسی طرح وضو کیا کرتے تھے۔ بخاری اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ مسح کرتے وقت اپنے ہاتھوں کو آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور پھر پیچھے سے آگے کی طرف لائے یعنی سر کے اگلے حصہ سے مسح شروع کر کے گدی تک لے گئے۔ پھر گدی کی طرف سے اسی جگہ واپس لے آئے جہاں سے مسح شروع کیا تھا اور پھر اپنے پاؤں کو دھویا اور بخاری و مسلم کی ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے۔ کہ مضمضہ کیا اور استنشاق کیا اور ناک کو تین مرتبہ جھاڑا تین چلوؤں سے۔ ایک اور روایت میں اس طرح ہے کہ پس مضمضہ کیا اور ایک ہی چلو سے ناک میں پانی ڈالا اس طرح تین مرتبہ کیا اور بخاری کی ایک روایت میں اس طرح ہے۔ اپنے سر کا مسح کیا اس طرح کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور پیچھے سے آگے کی طرف لے آئے اور یہ ایک مرتبہ کیا پھر دونوں پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھویا۔ بخاری کی ایک روایت میں اس طرح ہے۔ پس مضمضہ کیا اور ناک جھاڑی تین مرتبہ صرف ایک چلو سے۔''

تشریح: وفی المتفق علیه: ابھریؒ نے فرمایا ہے کہ اس جملہ میں غور کر کیونکہ جو بات متفق علیہ سے مذکور ہے وہ انہی الفاظ کے ساتھ صحیح بخاری میں نہیں پائی گئی (لہٰذا) اس میں یہ بات ہوگی کہ متفق علیہ سے مراد اعم ہے کہ وہ دونوں کے الفاظ ہوں یا کسی ایک کے الفاظ ہوں اور جب ان میں سے کسی ایک کا معنی وہ صلاحیت رکھتا ہے کہ تمام میں شیخ محی السنۃ کی طرف سے عذر بن سکے، پس جب دونوں میں سے ایک کے الفاظ پائے جائیں گے تو پھر وہ کیسے (عذر نہ ہوگا)۔

توضا: یہ امر کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

فاکفا: نہایہ میں ہے یہ کفات الاناء اذا کببته سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی ہے، اوندھا کرنا، انڈیلنا۔ ابھریؒ نے فرمایا ہے کہ شیخ محی الدینؒ نے فرمایا: کفا او اکفایہ امال کے معنی میں ہے اور نسائیؒ نے فرمایا ہے کفاہ کا معنی ہے کبهٗ اور اکفاہ کا

معنی اماله۔

منه: اکفاه کا معنی یہاں پر افرغ اور صبّ کے معنی کو شامل ہے اور اس کو من کے ساتھ متعدی بنایا گیا ہے۔ ابھریؒ نے یہ کہا ہے۔

فاستخرجها: یعنی ہاتھ کو پانی لے کر برتن سے نکالا۔

طیبیؒ نے فرمایا ہے اس حدیث میں اس بات کی دلالت موجود ہے کہ تیسری بار پانی اپنے طاہر اور مطہر ہونے پر باقی رہتا ہے مستعمل نہیں ہوتا۔ اس کا زیادہ سے زیادہ یہی جواب ہوسکتا ہے کہ اس میں ہاتھ کو وضو کیلئے آلہ بنانے کی نیت ہے اور امام مالکؒ کا مذہب اس پانی میں جو حدث دور کرنے میں استعمال ہو، یہ ہے کہ وہ مطہر ہے اور اس کے علاوہ کی موجودگی میں اس کے استعمال کو ناپسند سمجھتے ہیں اختلاف کی وجہ سے۔ اسی طرح ان کے نزدیک ماءِ قلیل ہے کہ جس میں نجاست پڑ گئی ہو اور اس کے (اوصافِ ثلاثہ میں سے کسی میں) تغیر نہ ہوا ہو۔

ابو حامد غزالیؒ نے احیاء میں فرمایا ہے کہ میری یہ تمنا ہے کہ ماءِ قلیل میں امام شافعیؒ کا مذہب امام مالکؒ کی طرح ہوتا کیونکہ وہ پانی کو تغیر کی وجہ سے ناپاک کہتے ہیں ورنہ نہیں اس لئے کہ اس کی ضرورت بھی ہے اور وسوسہ کی پیدا ہونے کی بنیاد وہ قلتین کی شرط لگانا ہے اسی وجہ سے یہ معاملہ لوگوں پر مشکل ہوتا ہے۔

ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ قسم ہے مجھے اپنی جان کے خالق کی کہ بات ایسے ہی ہے جیسا انہوں نے کہی، لیکن اگر یہاں قلتین کی شرط ذکر نہ کرتے تو پھر خطوں میں سے مکہ اور مدینہ طہارت حاصل کرنے کے بارے میں مشکل ترین ہوتے، اس لئے کہ ان میں نہ تو جاری پانی کثرت سے ہے اور نہ ہی کھڑا ہوا پانی زیادہ ہے اور عصر نبی ﷺ سے لے کر صحابہ کے زمانے تک کوئی ایسا واقعہ منقول نہیں کہ جس میں نجاسات سے پانی کی حفاظت کی کیفیت وطہارت کا بیان ہو اور ان کے پانیوں کے برتن بچے اور خادمائیں لے آتی جاتیں تھیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عیسائی عورت کے مٹکے سے وضو کرنے کا واقعہ اس میں صریح امر کی طرح ہے کہ انہوں نے پانی کے تغیر پر اعتماد نہیں کیا اور صحابہ کرامؓ کا اصل توجہ وہ قلوب کی صفائی وستھرائی کی طرف تھی اور اسی میں وہ مستغرق تھے اور ظاہری معاملہ میں وہ نرمی کو اختیار کرتے تھے

واستنثق من كف: اور ایک صحیح نسخہ میں تاء کی زیادتی کے ساتھ اور کاف کے فتحہ کے ساتھ ہے اور کاف کا ضمہ بھی منقول ہے۔

ابھریؒ نے فرمایا ہے اکثر میں کف بغیر ھاء کے ہے اور ابوذرؓ کی ایک روایت میں کفة تاء کی زیادتی کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں غرفة ہے پھر فرمایا کہ ابن بطالؒ نے کہا ہے کہ کفة سے مراد غرفة (چلّو) ہے۔ پس اس کے لئے کف کے نام کو مشتق کیا گیا اور اس کو اس معنی سے مراد لیا گیا، اور فرمایا کہ کلام عرب میں ہم کف کے ساتھ ھاء تانیث کو نہیں پہچانتے ہیں اور شیخ نے فرمایا ہے کہ یہاں کفة سے فعلة مراد ہے (یعنی ایک مرتبہ پانی لینا) نہ یہ کہ یہ کف کی تانیث ہے۔ صاحب مشارقؒ نے فرمایا ہے کہ کفه یہ ضمہ اور فتحہ کے ساتھ ہے غَرفه اور غرفة کی طرح ہے، یعنی چلّو بھر کر۔

ثم ادخل یده: یہاں ید سے جنس مراد ہے۔

فغسل و جهه ثلاثا: یہ تمام (یعنی) افعال ثلاثہ کی قید ہے نہ کہ صرف اخیر کیلئے۔

ثم غسل رجليه: ثم، ان تمام جگہوں میں محض عطف تعقیبی کیلئے ہے جو ترتیب کے سنت ہونے کا فائدہ دیتا ہے یہاں یہ ثم تراخی کیلئے نہیں ہے جو کہ پے درپے ہونے کے منافی ہے جو کہ ہمارے نزدیک مستحب اور امام مالکؒ کے ہاں فرض ہے۔

الى الكعبين: ظاہر یہاں یہ ہوتا ہے کہ ایک بار دھونے پر اکتفاء کی اور مرتین کا بھی احتمال ہے ماقبل والی عبارت کی وجہ سے اور تثلیث تین بار دھونے کا بھی احتمال ہے جیسا کہ اکثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی عادت تھی۔ یہاں ثلاثا نہیں کیا تا کہ دونوں فعلوں کا ایک ساتھ قید ہونے کا وہم پیدا نہ ہو۔ (**هكذا كان وضو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم**): یہ راوی کے گمان کے مطابق اکثر اسی طرح ہوتا تھا یا بعض اوقات میں۔

حتى رجع الى المكان الذى بدامنه: یہ مسح کی تمام انواع میں، کہ جس میں استعاب ہوتا ہے سب سے اچھی صورت ہے۔

وفى رواية فمضمض واستنشق واستنثر: واؤ ان دونوں فعلوں میں فاء کے معنی میں ہے تا کہ غیر مفروضہ اعضاء کے دھونے میں ترتیب کے مستحب ہونے کا فائدہ دے اور ابن حجرؒ نے یہاں عجیب بات کہی ہے کہ واؤ ثم سابقہ کے معنی میں ہے۔

بثلاث غرفات: یہ غین اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ دونوں کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ یہ غرفتہ کی جمع ہے، معنیٰ ہے ایک بار پانی لینا۔ بعض نے کہا ہے الغرفة فتحہ کے ساتھ مصدر ہے غرف سے ای اخذالماء بالكف اور غین کے فتحہ کے ساتھ وہ اسم ہے اور اس کا معنی ہے وہ پانی جس سے چلو بھرا ہوا اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے پانی کا چلو بھرنا۔ یعنی اخذ غرفة ومضمض واستنشق بها یعنی ایک چلو لے کر اس سے کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا اسی طرح دوسری بار اور تیسری بار۔ ہمارے علماء میں سے بعض شراح نے یہی کہا ہے اور یہ ہمارے مذہب کے خلاف ہے زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ تین بار، ان میں سے ہر ایک تین چلوؤں سے ہوا ہو۔ (یعنی پہلے تین بار کلی پھر تین بار ناک میں پانی ڈالنا)۔

وفى اخرى فمضمض واستنشق من كفه واحدة: اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ چلو میں سے کچھ منہ میں اور کچھ ناک میں ڈالا ہو اسی طرح تین بار کیا ہو، یعنی ایک چلو سے اس میں امام شافعیؒ کے مذہب کی دلیل ہے اسی طرح ہمارے ائمہ میں ابن الملکؒ وغیرہ نے کہا ہے لیکن زیادہ قوی بات اس سے یہ ہے کہ یہاں کفۃ میں تنازع فعلان ہے، معنی یہ ہے مضمض من كفة واستنشق من كفة اور وحدة کی قید سے تثنیہ سے احتراز مقصود ہے۔

ثلاث مرات: پس یہ حدیث حالات میں سے اکمل حال پر محمول ہوگی جو ارباب کمال کے نزدیک متفق علیہ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ جو فعل ان ائمہ نے ذکر کیا وہ یہاں جواز کیلئے ہو۔ (واللہ اعلم)

فمسح راسه فاقبل بهما وادبر مرة واحدة: جمہور کے نزدیک تین بار سر کا مسح کرنا نہیں ہے۔ امام شافعیؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ (**وفى اخرى له**) ای للبخاری۔

فمضمض واستنثر: یہ واستنثر یا استنشاق سے کنایہ ہے۔ یا اس کے لوازم میں سے ہے۔

ثلاث مرات من غرفة: غرفۃ، فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے۔

واحدة: یعنی تین بار میں سے ہر ایک، ایک چلو کے ساتھ یا ہر ایک ان تینوں مرتبہ میں سے ایک چلو کے ساتھ، اور تین بار دھونا اکٹھے ایک چلو کے ساتھ۔ یہ معنی بعید ہے اگر چہ امام شافعیؒ کی دلیل ہے۔

صاحب مشکوٰۃؒ نے فرمایا ہے کہ ہم نے اس حدیث میں اتنا طویل کلام اس لئے کیا کہ جو مصابیح کی روایت کے الفاظ ہیں وہ سوائے موطا امام مالک اور نسائی شریف کے اور کہیں نہیں ہیں۔ باقی اس روایت کے ہم معنی روایت تو وہ میں نے متفق علیہ کے عنوان کے بعد ذکر کی ہے اور بقیہ روایات تو میں اس کو اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے لایا ہوں کہ جو مصابیح میں ہے وہ ان روایات سے ہے۔ علامہ طیبیؒ نے اس کو ذکر کیا ہے۔

سید جمال الدین محدثؒ نے فرمایا ہے گویا کہ یہ شیخ محی السنۃؒ پر صاحب مشکوٰۃؒ کی طرف سے اعتراض ہے کہ عبداللہ بن زید کی روایت ان الفاظ کے ساتھ انہوں نے صحاح میں ذکر کی ہے۔ حالانکہ یہ روایت صحیحین میں سے کسی ایک میں بھی نہیں ہے۔ لیکن اس کو جواب یہ ہے کہ یہ صحیحین میں موجود ہے۔ صاحب تخریج المصابیح نے اس حدیث کو منسوب کرتے ہوئے یوں کہا ہے کہ اس حدیث کو اصحاب ستہ نے صحاح میں قریب قریب الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

(ملاّ علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ اے مخاطب! تو اس بات سے بخوبی واقف ہوگا کہ یہ جواب درست نہیں اس لئے کہ صاحب مشکوٰۃ نے مذکورہ حدیث کے الفاظ کی صحیحین میں سے کسی ایک میں وجود کی نفی کی ہے نہ کہ اس کے معنی کی اور صاحب تخریج المصابیح نے اس کے معنی کو ثابت کیا ہے، اسی وجہ سے کہا ہے بالفاظ متقاربہ بلکہ صاحب مشکوٰۃؒ نے خود بھی وہ الفاظ نقل کئے ہیں جو اس روایت کے معنی پر دلالت کرتے ہیں اور طوالت کلام سے صاحب مشکوٰۃؒ نے عذر بھی بیان کیا ہے جو اس جواب کو شامل ہے اگر چہ یہ اعتراض تمام میں وارد ہوتا ہے۔ کیونکہ کتاب کے شروع میں یہ شرط لگائی گئی تھی کہ حدیث کے الفاظ اسی باب سے ہونگے (جو مذکور ہوگا)۔ واللہ اعلم

اعضاءِ وضو کو ایک ایک، دو دو، تین تین مرتبہ دھونا

۳۹۵: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ تَوَضَّأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَرَّةً مَرَّةً لَمْ يَزِدْ عَلٰى هٰذا. (رواه البخاري)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲۵۸/۱ حديث رقم ۱۵۷ ـ وأبو داوٗد في السنن ۹۵/۱ حديث رقم ۱۳۸ وأخرجه الترمذي في السنن ۶۰/۱ حديث رقم ۴۲ ـ وأخرجه ابن ماجة ۱۴۳/۱ حديث ۴۱۱ ـ والدارمي ۱۸۹/۱ حديث رقم ۶۹۶ ـ وأحمد في المسند ۳۳۲/۱ والنسائي ۶۲/۱ حديث رقم ۸۰ ـ

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایک مرتبہ وضو کیا یعنی اعضاء وضو کو ایک ایک مرتبہ دھویا اور اس پر زیادہ نہیں کیا۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: مرة مرة: یہ مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر عضو کو ایک مرتبہ دھویا اور ایک بار مسح کیا۔

ولم یزد علی هذا: یعنی اس وضو میں یا اس وقت میں یا اپنے علم کے اعتبار سے فرمایا، ورنہ تو بے شمار روایات میں زیادتی ثابت ہے اور باقی یہ فعل یعنی ایک ایک بار وضو کرنا، یہ بیان جواز کیلئے ہے، کیونکہ یہ سب سے کم وضو کا درجہ ہے۔

۳۹۶:وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ ـ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۱/۲۵۸حديث رقم ۱۵۸ـوأخرجه أحمد فی المسند ٤/٤١وأخرجه أبوداؤد عن أبی هريرة۱/۹٤ـحديث رقم ۱۳٦ـ وكذلك الترمذی ۱/٦۲حديث رقم ٤۳ـ

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو، دو مرتبہ اعضاء وضو کو دھویا۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔''

تشریح:توضا مرتین مرتین: یہ بھی بیان جواز کیلئے ہے۔ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ یہ وضو میں افضل ہے، پہلے کی بنسبت۔

رواہ البخاری یہاں مختصر عبارت یوں ذکر کرنی چاہیئے تھی رواھما البخاری۔

۳۹۷:عَنْ عُثْمَانَ اَنَّهٗ تَوَضَّأَ بِالْمَقَاعِدِ فَقَالَ اَلَا اُرِيْكُمْ وُضُوْءَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَتَوَضَّأَ ثَلَاثًا ثَلَاثًا .

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ۱/۲۰۷حديث رقم (۹ـ۲۳۰)وفی الباب عن أبی هريرة وعلی بن أبی طالب۔

ترجمہ:''حضرت عثمانؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے مقام مقاعد میں وضو کیا اور فرمایا کیا میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کا وضو کر کے نہ دکھاؤں چنانچہ انہوں نے اعضاء وضو کو تین تین مرتبہ دھویا اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح:انه توضا بالمقاعد: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ مقاعد سے لوگوں کی بازاروں وغیرہ میں بیٹھنے کی جگہیں مراد ہیں اور بعض نے کہا ہے مسجد کے باہر بیٹھنے کی جگہیں اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ مقاعد مدینہ میں ایک جگہ ہے۔

فقال الا : الا یا تنبیہ کیلئے ہے یا ہمزہ استفہام کیلئے ہے۔

فتوضا ثلاثا ثلاثا: ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ یہ وضوء اکمل ہے۔میرک شاہؒ نے فرمایا ہے یعنی ہر عضو کو اعضاء وضو میں تین تین بار دھویا اور عموم حدیث اس بات کو چاہتا کہ مسح رأس بھی تین مرتبہ ہو۔لیکن وہ روایات کہ جس میں اعضاء وضو کی تفصیل ہے، جیسا کہ صحیحین میں اس کی تصریح ہے وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مسح رأس وہ ایک مرتبہ ہوا ہے۔غور سے سمجھ لو۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے مطلب یہ ہے کہ اعضاء وضو میں سے ہر عضو کو تین تین بار پاک کیا اور یہ مسح رأس کے تین مرتبہ ہونے کو بھی شامل ہے اور یہی امام شافعیؒ کا مذہب ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک روایت میں تین بار سر کا مسح کرنے کی تصریح بھی ہے۔

(ملاّ علی قاریؒ نے فرمایا ہے) اور وہ روایت ابوداؤد کی ہے لیکن اس روایت سے جو بات مفہوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ روایت شاذ ہے اور اس میں ثقات کی مخالفت ہے اسی وجہ سے امام بیہقیؒ جو کہ مذہب شافعیؒ کی تصحیح کا انتہائی لحاظ رکھنے والے ہیں، انہوں نے یہ کہا ہے کہ امام شافعیؒ نے مسح کے تکرار میں حضرت عثمانؓ کی اس حدیث پر اعتماد کیا ہے اور ابو انس کی حضرت عثمان سے یہ روایت مطلق ہے اور وہ روایات جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے وضاحت سے ثابت ہیں ان میں تکرار سر کے مسح کے علاوہ دوسرے اعضاء میں ہے، باقی سر کا مسح وہ ایک مرتبہ ہی ہے۔(امام بیہقی کا کلام مکمل ہوا) اور اس لئے بھی تثلیث نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ مسح

ہے لہٰذا تثلیث نہیں ہوگی جیسا کہ پٹی، موزے، اور تیمّم پر مسح کرنا اور اس لئے بھی کہ تثلیث کی صورت میں یہ مسح نہیں رہے گا بلکہ غسل ہو جائے گا۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک ایک مرتبہ اور دو دو مرتبہ اور تین تین مرتبہ وضو کیا یہ اُمت کو تعلیم دینے کی خاطر تھا کہ تمام طرح جائز ہے، اور یہ کہ جو اکمل ہو وہ افضل ہے یعنی ثواب کے اعتبار سے، اور کمال پر زیادتی وہ نقصان ہے اور غلطی ہے اور ظلم اور گناہ ہے جیسا کہ ہم وہ حدیث ابھی بیان کریں گے۔

وضو میں پاؤں کا حکم غسل ہے نہ کہ مسح

۳۹۸ :وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ رَجَعْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنْ مَّكَّةَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ حَتّٰى اِذَا كُنَّا بِمَآءٍ بِالطَّرِيْقِ تَعَجَّلَ قَوْمٌ عِنْدَ الْعَصْرِ فَتَوَضَّأُوْا وَهُمْ عُجَّالٌ فَانْتَهَيْنَا اِلَيْهِمْ وَاَعْقَابُهُمْ تَلُوْحُ لَمْ يَمَسَّهَا الْمَآءُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَيْلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ اَسْبِغُوا الْوُضُوْءَ. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۲۱٤حديث رقم (۲٦۔۲٤۱)وللبخاري معناه ۱/۱٤۲حديث رقم ٦۰؛أخرجه أبوداوٗد ۱/۷۳حديث رقم۹۷۔والنسائي في السنن ۱/۷۷حديث رقم ۱۱۱۔وابن ماجة في السنن ۱/۱٥٤ حديث رقم٤٥۰۔والدارمي ۱/۱۹۲حديث رقم ۷۰٦۔ وأحمد في المسند ۲/۱۹۳۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ مکہ سے مدینہ کی طرف لوٹے۔ یہاں تک کہ جب ہم راستہ میں ایک پانی پر پہنچے تو کچھ لوگوں نے نماز عصر کے وضو کرنے میں جلدی کی۔ چنانچہ جب ہم ان کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ان کی ایڑیاں خشکی کی وجہ سے چمک رہی تھیں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کی ایڑیوں کو خشک دیکھ کر فرمایا ان ایڑیوں کے لیے جہنم کی آگ سے ہلاکت ہے، وضو صحیح اور کامل کیا کرو۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: بماء بالطریق: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ ظرف اول وہ کَانَ کی خبر ہے اور دوسری صفت ہے تقدیر عبارت یہ ہے: حتى اذا كنانازلين بماء كائن في طريق مكة۔

وهم عجال: عین کے ضمہ اور جیم کی تشدید کے ساتھ عاجل کی جمع ہے۔ جیسا کہ جهال جاهل کی جمع ہے اور ایک صحیح نسخہ میں عین کے کسرہ اور جیم کی تخفیف کے ساتھ ہے اور یہ عاجل کی جمع ہے جیسا قيام، قائم کی جمع ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا کہ: تعجل استعجل کے معنی میں ہے یعنی انہوں نے جلدی وضو کرنے کو طلب کیا عصر کے وقت۔ پس انہوں نے وضو کیا اس حال میں کہ وہ جلدی کرنے والے تھے اور زیادہ واضح معنی یہ ہے کہ انہوں نے چلنے میں جلدی کی اور ہم سے آگے نکل گئے عصر کے داخل ہونے کے وقت وضو کی طرف سبقت کرتے ہوئے، پس انہوں نے جلدی سے وضو کیا سفر میں وقت کے تنگ ہونے کے سبب۔

اليهم و اعقابهم: اعقاب، عقب کی جمع ہے۔

تلوح: یعنی ان ایڑیوں میں خشکی ظاہر ہو رہی تھی اور جملہ حالیہ ہے اور اسی طرح (لم یمسھما الماء) جملہ حالیہ ہے۔ تلوح کا بیان ہے۔

فقال رسول الله ﷺ ویل: نہایہ میں ہے کہ ویل کا معنی ہے، رسوائی، ہلاکت، عذاب کی مشقت۔ علامہ طیبیؒ نے اس کو ذکر کیا ہے اور ابھریؒ نے فرمایا ہے نکرہ کے ساتھ ابتداء جائز ہے، اس لئے کہ یہ دعا ہے اور اس کے معنیٰ میں سب سے صحیح قول یہ ہے کہ جو ابن حبان کی حضرت ابوسعید کی روایت میں ہے کہ ویل یہ جہنم کی ایک وادی ہے۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ ویل سے شدتِ عذاب مراد ہے او بعض نے کہا ہے کہ ویل: وہ ایک پہاڑ ہے جو پیپ اور خون کا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس کلمہ کو ہر بے چین ومضطرب کہتا ہے اور اس کی اصل ہلاکت اور عذاب ہے اور قوی بات یہاں یہ ہے کہ اس کو اصل پر محمول کیا جائے وہ یہ کہ اس سے بڑی ہلاکت اور دردناک سزا مراد ہے۔

من النار: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ ایڑھی کو عذاب کے ساتھ خاص کیا، اس لئے کہ یہ وہ عضو ہے جو دھویا نہیں گیا، پس الف لام عہدی ہوگا اور بعض نے کہا ہے کہ صاحب عقب ایڑیوں والا مراد ہے الف لام عہدی ہے اور مضاف محذوف ہے اور یہ اس لئے کہ وہ پاؤں کے دھونے میں وضوء کے اندر پورا اہتمام نہیں کرتے تھے (اس لئے ان کو ڈانٹا اور تنبیہ کی)۔

اسبغوا الوضوء: وضو، واؤ کے ضمہ کے ساتھ ہے یعنی وضوء کے تمام فرائض اور سنتوں کو ادا کر کے وضوء کو پورا کرو یا معنی یہ ہے کہ اس کے واجبات کی تکمیل کرو اور اگر واؤ کا فتحہ ثابت ہو جائے تو یہ بہت بہتر وجہ ہوگی، مطلب یہ ہوگا کہ وضوء کے پانی کو اعضاء وضو تک پورے اہتمام اور استعاب کے طریقہ سے پہنچاؤ۔

بعض نے کہا ہے کہ وہ اسلام اور احکام اسلام میں ابھی نئے نئے داخل ہوئے تھے، پس انہوں نے پاؤں کے دھونے میں مسامحت برتی۔ کیونکہ وہ احکام شرع سے جاہل تھے۔ ابن الملکؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے، اس لئے کہ پہلے یہ بات گزری ہے کہ یہ جلدی کی وجہ سے ہوا تھا۔

اور اس حدیث میں دونوں پاؤں کے پورا پورا دھونے کے واجب ہونے کی دلیل ہے اور یہی حضور ﷺ کا فعل مبارک اور آپ ﷺ کے صحابہ کا فعل نقل کیا گیا ہے۔ بعض شراح حدیث نے فرمایا ہے کہ ظاہر حدیث غسل رجلین کے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ شیعہ (شنیعہ) اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

اور (ارجلکم) جر والی قراءت نصب والی قراءت اس کے متعارض ہے اور جر والی قراءت کو جر علی المجاورت پر محمول کرنا (یعنی قریبی لفظ کے مجرور ہونے کی وجہ سے جر دی گئی) جیسے: جحر ضب حرب اور ماء شن بارد اور جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ﴾ [هود:٢٦] اور ﴿وَحُورٌ عِينٌ﴾ [الواقعة:٢٢] یہ بہتر ہے اس سے کہ نصب کو محلًا مجرور پر محمول کیا جائے۔ اس لئے کہ پہلی بات ہی وہ اس طریقے کے موافق ہے جو ثابت بھی ہے اور معروف بھی۔ پس اس کی طرف ہی رجوع واجب ہے۔ امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث دونوں پاؤں کے دھونے کے واجب ہونے کی دلیل ہے اور اس پر بھی دلیل ہے کہ خالی مسح کرنا وہ کافی نہیں ہے اور یہی جمہور فقہاء کا مذہب ہے۔ سارے شہروں اور تمام زمانوں میں اور فقہاء نے کہا ہے کہ غسل پر مسح واجب نہیں ہے اور یہی داؤد ظاہری کا بھی مذہب ہے اور کسی سے بھی اس کا خلاف ثابت نہیں ہے کہ جس کو اجماع

میں معتبر اور قابل اعتماد مانا جائے اور نیز ہر وہ راوی کہ جس نے حضور ﷺ کے وضوء کا طریقہ مختلف جگہوں اور متعدد صفات سے بیان کیا ہے وہ سارے کے سارے پاؤں کے دھونے پر متفق ہیں۔

اور جر کی قراءت کا فائدہ جو صاحب کشاف نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ پاؤں میں اکثر پانی کے زیادہ بہانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور ابن حاجبؒ نے فرمایا ہے کہ ارجل کا رؤوس پر عطف باوجود یکہ ارجل کا دھویا جانا مراد ہے (یہ ایک قاعدے کی وجہ سے ہے) وہ یہ کہ جب دو فعل ایسے ہوں جو ایک دوسرے کے متناسب ہوں تو وہاں ایک پر اکتفاء کرنا بھی صحیح ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے۔

یا لیت زوجك قد اتی ☆ مثقله اسیفا ورمحا

(یہاں عبارت اصل میں یوں تھی: مقتدا سیفًا وحاملا رمحا) اور دوسرا قول۔ علفتها تبنا وماء باردا (یہاں) اصل میں سقیتها ماء باردا تھا۔

علامہ طیبیؒ نے اس کو نقل کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ زیادہ قوی ہے۔ اس لئے کہ دونوں قراءتیں آیت میں مجمل ہیں ان کی وضاحت و بیان حضور ﷺ کا فعل کرتا ہے وہ اس طرح کہ آپ ﷺ نے دونوں پاؤں پر مسح کیا جب کہ آپ موزے پہنے ہوئے تھے اور دونوں پاؤں کو دھویا جب کہ آپ ﷺ کے پاؤں موزوں سے خالی تھے اور اس کے ساتھ ساتھ دونوں قراءتیں ترتیب کے وجوب کا یا استحباب کا فائدہ بھی دیتی ہیں۔ واللہ اعلم

اس کی اصل بخاری میں ہے۔ ابن حجرؒ نے ایسے ہی فرمایا ہے۔

سر کے مسح کی مقدار

۳۹۹: وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ اِنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ فَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهٖ وَعَلَى الْعِمَامَةِ وَعَلَى الْخُفَّيْنِ. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۲۳۱ حدیث رقم (۸۳-۲۷۴)۔والترمذی ۱/۱۷۰ حدیث رقم ۱۰۰ وأخرجه النسائی ۱/۷۶ حدیث رقم ۱۰۷۔وأحمد ۴/۲۵۵۔

ترجمہ: ''حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہیں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا اور آپ ﷺ نے اپنی ناصیہ پر، پگڑی پر اور موزوں پر مسح کیا۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: المغیرۃ بن شعبۃ: یہ قبیلہ ثقیف میں سے ہیں۔ غزوہ خندق والے سال مسلمان ہوئے اور ان کے غزوات میں پہلا غزوہ، وہ حدیبیہ ہے۔ یہ حضرت امیر معاویہؓ کی طرف سے کوفہ کے امیر تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ علامہ طیبیؒ اور صاحب مشکوۃؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

فمسح بناصیته: بعض نے کہا ہے کہ باء یہاں زائد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ باء تبعیضہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ باء اس بات پر تنبیہ کرنے کیلئے ہے کہ مسح وہ سر کے ساتھ بغیر کسی چیز کے حائل ہونے کے ملا ہوا تھا اور ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ اگر

باء کو تبعیضیہ بناؤ تو اس میں امام شافعیؒ کی دلیل ہے۔ اس بات پر کہ اتنی مقدار کہ جس پر مسح کا اطلاق ہو جائے وہ مسح میں واجب ہے اور اگر باء کو زائدہ بناؤ تو پھر یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل ہے کہ جو فرض مسح رأس میں ہے وہ چوتھائی حصے کا مسح ہے اور وہ پیشانی کے بقدر ہے۔

علی العمامة: ہمارے علماء میں سے بعض شراح نے فرمایا ہے کہ یہاں اس بات کا احتمال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشانی اور عمامے کے علاوہ سر کا مسح کیا اپنے دونوں ہاتھوں کے ساتھ۔ تو راوی نے عمامے کو برابر وسیدھا کرنے کو مسح سمجھ لیا اور جو حضرت ثوبانؓ کی روایت ہے کہ جس میں یہ ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ (لشکر) بھیجا، پس وہاں ان کو شدید سردی لگ گئی، تو جب وہ مدینہ آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پگڑیوں پر مسح کرنے کا حکم دیا۔ تو اس سے وہ پگڑیاں وعمائم مراد ہیں جو زخموں پر باندھی گئی تھیں اور یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ (**وامسحوا برؤسكم**) کے نزول سے پہلے کا واقعہ ہو۔ پس تحقیق علماء نے ذکر کیا ہے کہ سورہ مائدہ قرآن پاک کی سورتوں میں نزول کے اعتبار سے آخری سورت ہے۔ پس آیت کے ظاہر پر عمل کرنا اس مسئلہ میں بہتر ہوگا۔

قاضیؒ نے فرمایا ہے کہ علماء نے عمامہ پر مسح کے بارے میں اختلافات کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالکؒ نے اس کو مطلقاً منع کیا ہے۔ قرآن پاک کے ظاہر کی وجہ سے، اور سفیان ثوری، داؤد ظاہری اور امام احمد بن حنبلؒ نے عمامہ پر مسح میں اقتصار کرنے کو جائز قرار دیا ہے، مگر امام احمد بن حنبلؒ نے عمامہ طہارت پر باندھنے کا اعتبار کیا ہے جیسا کہ موزے کے پہننے میں۔

اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے عمامہ پر مسح کرنے سے فرض ساقط نہیں ہوگا آیت کے ظاہر کی وجہ سے وہ آیت جو کہ (**الصاق**) ملانے پر دلالت کر رہی ہے اور اس کے علاوہ احادیث بھی اس مضمون کی تائید کرتی ہیں۔ لیکن اگر سر کے کچھ حصہ پر کہ جس پر مسح کا اطلاق ہو سکے مسح کیا اور اس پر عمامہ کا (کھولنا) واٹھانا مشکل ہوا اور گیلا ہاتھ اس نے اس پر گزار دیا پورے سر کے گھیرنے کے بدل میں تو یہ (مسح) ٹھیک ہوگا۔ طیبیؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

وعلی الخفین: یعنی ان پر بھی مسح کیا اور مسح علی الخفین بالاجماع جائز ہے اور اس کی احادیث معنی متواتر ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مسح علی الخفین کی روایت نقل کرنے والے ۸۰ صحابہ کرامؓ ہیں۔

اسی طرح طبرانی نے بھی روایت کی ہے اور ابوداؤد اور حاکم نے اس روایت کو ابو معقل کی روایت سے نقل کیا ہے اور اس پر دونوں حضرات نے خاموشی اختیار کی ہے۔ ابو معقلؒ کی روایت یہ ہے: **رايت رسول الله ﷺ يتوضا وعليه عمامة قطرية فادخل يده من تحت العمامة فمسح مقدم راسه ولم ينقض العمامة القطرية۔** ''ابو معقلؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وضوء کرتے ہوئے دیکھا، اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمامہ پہنے ہوئے تھے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کو عمامے کے نیچے داخل کیا پس سر کے اگلے حصے کا مسح کیا اور قطری عمامہ کو نہیں کھولا۔''

قطریه: یہ قاف کے کسرہ اور طاء کے سکون کے ساتھ دھاری دار کپڑے کی ایک قسم ہے۔ صحاح میں اسی طرح مذکور ہے۔

شمنیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ پیشانی اور سر کا اگلا حصہ عمامہ کی چاروں جانبوں میں سے ایک جانب ہے پس اگر چوتھائی سر کا مسح کافی نہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر اقتصار نہ فرماتے اور اگر چوتھائی سے کم کافی ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام عمر

میں اگر چہ ایک مرتبہ ہی سہی۔ جواز کی تعلیم دینے کی خاطر ضرور کرتے۔ پس یہ حدیث مالکیہ اور شافعیہ کے خلاف حجت ہے۔

فضیلت والے امور کو دائیں طرف سے شروع کرو

۴۰۰: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُحِبُّ التَّيَمُّنَ مَا اسْتَطَاعَ فِيْ شَانِهٖ كُلِّهٖ فِيْ طُهُوْرِهٖ وَتَرَجُّلِهٖ وَتَنَعُّلِهٖ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١/٢٥٣ حديث رقم ٤٢٦۔ ومسلم ١/٢٢٦ حديث رقم (٦٧۔٢٦٨) وأخرجه أبو داوٗد في السنن ٤/٣٧٨ حديث ٤١٤٠۔ والترمذي بمعناه ٢/٥٠٦ حديث رقم ٦٠٨ والنسائي ١/٢٠٥ حديث رقم ٤٢١ وابن ماجة ١/١٤١ حديث رقم ٤٠١۔ وأحمد ٦/٩٤۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حتی المقدور اپنے تمام کاموں کو دائیں طرف سے شروع کرنے کو پسند کرتے تھے یہاں تک کہ طہارت میں کنگھی کرنے میں اور جوتا پہننے میں دائیں طرف سے شروع کرنے کی رعایت کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)''

تشریح: یحب التیمن: یعنی دائیں طرفوں سے شروع کرنے کو پسند فرماتے تھے۔ مثلاً دائیں ہاتھ دائیں پاؤں اور دائیں جانب لیکن تیمن مشہور لغت میں کسی چیز سے برکت حاصل کرنے کے معنی میں آتا ہے اور یمن سے ہے جس کا معنی ہے، برکت۔ قاموس میں لکھا ہے کہ یمن ضمہ کے ساتھ برکت کے معنی میں ہے اور مختصر النہایہ میں ہے کہ **الیمن البرکة** اور یمن کی ضد **شوم** ہے اور تیمن کہتے ہیں افعال میں دائیں ہاتھ دائیں پاؤں اور دائیں جانب سے شروع کرنے کو۔

فی شانه : ای فی امره۔

کله : یہ تاکید ہے اور اس سے وہ امور مراد ہیں جو قابل تکریم ہیں۔

فی طهوره : طہور، ضمہ کے ساتھ ہے اور فتحہ بھی منقول ہے مراد اس سے مصدر ہے اور اس سے استنجاء کرنا مستثنیٰ ہے اور طہارت و پاکیزگی حاصل کرنے میں دائیں طرف سے شروع کرنے کا مستحب ہونا اجماعی ہے، بایں طور کہ بائیں ہاتھ سے پہلے دائیں کو دھوئے اور اسی طرح پیروں کے اندر اور غسل میں بائیں جانب سے پہلے دائیں جانب دھوئے اور اسی کے معنی میں ہے مسواک کرنا اور کھانا' پینا' مصافحہ کرنا' لینا اور دینا اور مسجد میں داخل ہونا اور اسی سے ہے دائیں طرف والے کی رعایت رکھنا دینے لینے وغیرہ میں۔

وترجله : یعنی سر اور داڑھی کے بالوں میں کنگھی کرنا اور اسی طرح لبوں کا کتروانا اور سر کا حلق کرنا اور زیر ناف بالوں کو مونڈھنا اور بغل کے بالوں کو اکھاڑنا اور ناخن اتارنا۔ ابن حجرؒ نے اسی طرح کہا ہے، لیکن زیادہ واضح بات یہ ہے کہ ان امور مذکورہ کو **فی طهوره** کے عنوان کے تحت داخل کیا جائے اس لئے کہ یہ امور بدن کو پاک کرنے کے قبیل سے ہیں جیسا کہ کسی پر یہ بات مخفی نہیں ہے۔

وتنعله : اور اسی طرح موزوں کا پہننا اور کپڑوں اور شلوار وغیرہ کا پہننا اور حدیث سے یہ بات بطور مفہوم سمجھی جاتی ہے کہ

بائیں طرف کو آپ ﷺ ہر اس کام کیلئے پسند کرتے تھے جو قابلِ تکریم نہ ہوتا تھا اور ایک روایت میں اس کی تصریح بھی گزر چکی ہے اور اسی میں سے ہے، بیت الخلاء میں داخل ہونا، اور بازار میں داخل ہونا اور گناہ کی جگہ میں جانا اور مسجد سے نکلنا اور ناک صاف کرنا اور تھوکنا اور استنجاء کرنا اور کپڑے اور اسی طرح جوتے وغیرہ کا اتارنا اور حقیقت میں یہ سارا کا سارا دائیں طرف کی تکریم ہی کی طرف لوٹتا ہے۔ پس مسجد سے باہر آتے وقت بائیں کو آگے کرنے میں دائیں کو اس گھڑی میں معزز و مکرم جگہ کیلئے باقی رکھنا ہے اور اسی طرح بائیں کو بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت مقدم کرنے میں اور اسی طرح باقیوں میں بھی۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ: **فی طهوره** یہ **فی شانه** سے بدل واقعہ ہے عامل کے اعادہ کے ساتھ اور شاید کہ حضور ﷺ نے اس میں طہارت کے ذکر سے اس لئے شروع کیا، کیونکہ یہ تمام طاعات کئے دروازوں کے لئے چابی ہے، پس اس طہارت کے ذکر سے ان طاعات کے ذکر کی ضرورت نہ رہی جیسا کہ آپ ﷺ کے ارشاد: **الطهور شطر الایمان** میں یہ بات گزر چکی ہے اور دوسرے نمبر پر **ترجل** (کنگھی کرنا) کو ذکر کیا اور کنگھی کرنے کا تعلق سر کے ساتھ ہوتا ہے اور تیسرے نمبر پر **تنعل** جوتا پہننے کو ذکر کیا اور یہ خاص ہے پاؤں کے ساتھ تا کہ تمام اعضاء و جوارح کو شامل ہو جائے، پس یہ (**فی طهوره**) کل سے بدل کل ہوگا۔

میرک شاہؒ نے فرمایا ہے۔ علامہ طیبیؒ کی اس تشریح کے بعض الفاظ میں تامل (بحث) ہے۔ (ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) محل تامل یہاں علامہ طیبیؒ کا یہ قول: **لعله علیه السلام انما بدا** .... اس کلام سے یہ وہم ہوتا ہے کہ یہ **فی طهوره**........ حضور ﷺ کا کلام ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ اصل کلام اور اسی طرح بدل سارا کا سارا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے۔

میرک شاہؒ نے فرمایا ہے۔ لیکن مسلم میں اس لفظ کے علاوہ ہے۔

الفصل الثانی:

وضو اور لباس کے وقت دائیں طرف سے شروع کرو

۴۰۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا لَبِسْتُمْ وَاِذَا تَوَضَّأْتُمْ فَابْدَأُوْا بِاَیَامِنِکُمْ۔

(رواه احمد وابوداود)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ٤/٣٧٩۔ حدیث رقم ٤١٤١۔ وأخرجه أحمد فی المسند ٢/٣٥٤۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم لباس پہنو یا وضو کرو تو دائیں جانب سے شروع کرو۔ اس حدیث کو امام احمدؒ اور امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **اذا لبستم**: یعنی جب تم قمیص یا شلوار وغیرہ پہنو (تو دائیں طرف سے شروع کرو۔)

واذا توضاتم: یعنی جب تم وضو یا غسل یا تیمّم کے ذریعے طہارت حاصل کرو۔

فابداوا بایامنکم: یہ ایمن کی جمع ہے اور **ایمن**، **یمین** کے معنی میں ہے۔ علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ معتبر روایت یہاں وہ (**بمیامنکم**) ہے اور عربی زبان کے اندر دونوں لفظوں میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ **ایمن** اور **میمنه** یہ

ایسر اور میسرہ کی ضد ہے۔لیکن اس حدیث کو بمیانکم کے لفظ کے ساتھ امام ابوداؤد اپنی کتاب میں تخریج کرنے میں متفرد ہیں۔علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ صاحب مشکوٰۃ نے کہا ہے کہ میں نے ابوداؤد شریف میں باب النعال کے ترجمۃ الباب کے اندر اس حدیث کو ایسے ہی پایا ہے۔علامہ بغویؒ نے شرح السنۃ میں فرمایا ہے کہ،علامہ نوویؒ کی شرح مسلم میں مصابیح کی طرح مذکور ہے اور اس روایت کی تخریج امام احمدؒ نے بھی اپنی مسند میں کی ہے،لہٰذا ابوداؤد اس میں متفرد نہ ہوئے۔

میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ امام ابوداؤد نے اس پر خاموشی فرمائی ہے اور ابن ماجہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔لیکن ابن ماجہ کی روایت میں اذا لبستم نہیں ہے۔ملاّ علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ جامع صغیر میں ہے کہ اس روایت کو ابوداؤد اور ابن حبانؒ نے نقل کیا ہے اور روایت کے لفظ : بایامنکم ہے اور ابن ماجہ نے اس کو ان الفاظ سے نقل کیا ہے: اذا توضاتم فابدؤوا بمیامنکم۔''جب تم وضو کرو تو دائیں اعضا سے دھویا کرو۔''

وضو کرتے وقت بسم اللہ پڑھنے کا مسئلہ

۴۰۲:وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَاوُضُوْءَ لِمَنْ لَّمْ يَذْكُرِاسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ (رواه الترمذی وابن ماجة ورواه احمد وابوداود عن ابی هریرة والدارمی عن ابی سعید الخدری عن ابیه وزادفی اوله' لَاصَلَاةَ لِمَنْ لَّاوُضُوْءَ لَهٗ).

أخرجه الترمذی فی السنن ١/٣٧حدیث رقم ٢٥۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ١/١٤٠ حدیث رقم ٣٩٨۔

ترجمہ:''حضرت سعید بن زیدؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے بوقت وضو تسمیہ کو نہ پڑھا اس کا وضو نہیں ہوا۔اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے امام احمد اور امام ابو داؤد نے اس حدیث کو حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے اور امام دارمی نے حضرت ابوسعید خدری سے اور انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اس حدیث کے شروع میں ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔لَاصَلَاةَ لِمَنْ لَّاوُضُوْءَ لَهٗ۔کہ وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔''

راویٔ حدیث:

سعید بن زید: یہ''سعید زید''بن عمرو بن نفیل کے بیٹے ہیں۔ان کی کنیت''ابواعور''ہے۔عدی قریشی ہیں۔عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔شروع ہی میں شرف اسلام حاصل کیا اور تمام غزوات میں سوائے غزوۂ بدر کے آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ شرکت کی کیونکہ یہ طلحہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے جو قریش کے غلہ والے قافلہ کا کھوج لگانے کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔آنحضور نے غنیمت میں ان کا حصہ بھی لگایا تھا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا ان کے نکاح میں تھیں اور یہی وہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں جن کی وجہ سے عمر رضی اللہ عنہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

تشریح:لمن لم یذکر اسم اللہ علیہ :ابن حجرؒ نے فرمایا ہے اس کی ایک صحیح حدیث اس طرح وضاحت کرتی ہے توضؤوا اباسم اللہ: یعنی بسم اللہ کہتے ہوئے وضو شروع کرو۔بعض حضرات جیسے امام احمد بن حنبلؒ ان کا مذہب یہ ہے کہ وضوء

کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا واجب ہے وہ حدیث کے ظاہر سے دلیل پکڑتے ہیں اور بعض نے کہا ہے اگر بسم اللہ کو وضوء کے شروع میں چھوڑ دیا تو وضوء باطل ہو جائے گا اور بعض نے کہا ہے کہ اگر جان بوجھ کر چھوڑا تو وضوء باطل ہوگا اور اگر بھول کر چھوٹ گئی تو پھر باطل نہ ہوگا اور قاضیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ صیغہ (لا وضوء) شیئی کی نفی میں حقیقت ہے اور مجازاً اس کا اطلاق کسی چیز کے معتبر ہونے کی نفی پر ہوتا ہے اس کی عدم صحت کی وجہ سے جیسے حضور ﷺ کا ارشاد: (لا صلوٰۃ الا بطھور) اور اسی طرح اس صیغہ کا اطلاق وہ نفی کمال کیلئے بھی ہوتا ہے، جیسے حضور ﷺ کا ارشاد: (لا صلوٰۃ الجحار المسجد الا فی المسجد) اور یہاں یہ صیغہ نفی کمال ہی پر محمول ہے۔ اہل ظواہر کو اس سے اختلاف ہے (وہ لا ءکو یہاں نفی حقیقت پر محمول کرتے ہیں) اس لئے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے: **من توضا و ذکر اسم اللہ کان طھورا لجمیع بدنہ ومن توضا ولم یذکر اسم اللہ کان طھورا لا عضاء وضوئہ** ''کہ جس نے وضو کے وقت اللہ کا نام لیا تو یہ اس کے تمام بدن کیلئے پاکی کا سبب ہوگا اور جس نے وضو کیا لیکن شروع میں اللہ کا نام نہ لیا تو یہ وضو صرف اس کے اعضاء وضو کیلئے پاکی کا سبب ہوگا'' اور یہاں طہارت سے مراد گناہوں سے پاکی، کیونکہ ناپاکی (حدث) تقسیم نہیں ہوتی۔

میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ ترمذی کے اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں اور اسی طرح ابن ماجہ کے راوی مگر یزید بن عیاض کہ امام نسائی نے اس کو متروک کہا ہے۔

۴۰۳: وَرَوَاهُ اَحْمَدُ وَّاَبُوْ دَاوٗدَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ۔

ترجمہ: ''اور احمد اور ابوداؤد نے اس حدیث کو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کیا۔''

۴۰۴: وَالدَّارَمِیُّ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیُّ عَنِ اَبِیْهِ وَزَادَ فِیْ اَوَّلَهٗ لَاصَلَاةَ لِمَنْ لَّاوُضُوْءَ لَهٗ۔

ترجمہ: اور امام دارمی نے حضرت ابوسعید خدری سے اور انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اس حدیث کے شروع میں ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ لَاصَلَاةَ لِمَنْ لَّاوُضُوْءَ لَهٗ۔ کہ وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

تشریح ﷺ ''**والدارمی عن ابی سعید الخدری من ابیہ** : طیبیؒ نے فرمایا کہ درست سند یہاں یہ ہے: **عن ابی سعید الخدری عن النبی** ﷺ۔ کیونکہ ابوسعید ہی اصل راوی ہیں اس روایت کے نہ کہ ان کے والد۔''

سید جمال الدین محدثؒ نے فرمایا ہے کہ مصنف کا قول **عن ابی سعید الخدری عن ابیہ** بغیر کسی شک وشبہ کے یہ سہو ہے اس لئے کہ سنن دارمی میں روایت یوں ہے۔ **باب التسمیۃ علی الوضوء ۔اخبرنا عبد اللہ بن سعید قال اخبرنا ابو عامر العقدی قال اخبرنا کثیر بن زید حدثنی ربیح بن عبد الرحمن بن ابی سعید الخدری عن ابیہ عن جدہ عن النبی** ﷺ **قال :لا وضوء لمن لم یذکر اسم اللہ علیہ** : شیخ عفیف کارزونی نے یہ بات نقل کی ہے۔

پس اس سے معلوم ہوا کہ مصنف کی عبارت میں دو قسم کے سہو ہوئے ہیں۔ ایک تو اسناد میں ہے اور دوسرا یہ کہ **لا صلوٰۃ لمن لا وضوء لہ** کی زیادتی دارمی میں نہیں ہے یہ وزادوانی اولہ کی عبارت سے جو مفہوم ہوتا ہے اس کے خلاف ہے اس کو غور سے سمجھ لو۔

فی اولہ لا صلوٰۃ لمن لا وضوء لہ: میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ ترغیب میں (جو حافظ عبدالعظیم قریب کی کتاب ہے) روایت اس طرح ہے: **عن رباح بن عبد الرحمن بن ابی سفیان بن حویطب عن جدتہ عن ابیھا قالت سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: (لا وضوء لمن لم یذکر اسم اللہ علیہ)** اس کو ترمذی نے ان الفاظ سے نقل کیا ہے اور ابن ماجہ بیہقی نے بھی نقل کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ امام بخاری محمد بن اسماعیلؒ نے فرمایا ہے کہ: **احسن شی فی ھذا الباب حدیث رباح ابن عبدالرحمن عن جدتہ عن ابیھا۔** یعنی رباح بن عبدالرحمٰن والی روایت اس باب میں سب سے اچھی روایت ہے۔ امام ترمذیؒ نے فرمایا (**عن ابیھا** میں) ان کے والد کا نام سعید بن زید بن عمرو بن نفیل ہے۔

منذریؒ نے فرمایا ہے کہ اس باب میں بہت زیادہ روایات مروی ہیں لیکن کوئی بھی ان میں سے کلام سے محفوظ نہیں ہے اور تحقیق حسن بصری اور اسحٰق بن راھویہ اس بات کی طرف گئے ہیں کہ بسملہ وضوء میں واجب ہے یہاں تک اگر جان بوجھ کر چھوڑا تو وضوء کا اعادہ کرے گا اور یہی امام احمدؒ کی ایک روایت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جتنی بھی روایات اس مسئلہ میں مروی ہیں وہ کوئی بھی کلام سے محفوظ نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ کثرتِ طرق کی وجہ سے ایک دوسرے کیلئے موید اور ایک قسم کی قوت حاصل کر لیتی ہیں۔

وضو کامل کرو

۴۰۵: وَعَنْ لَقِيْطِ بْنِ صَبِرَةَ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَخْبِرْنِىْ عَنِ الْوُضُوْءِ قَالَ اَسْبِغِ الْوُضُوْءَ وَخَلِّلْ بَيْنَ الْاَصَابِعِ وَبَالِغْ فِى الْاِسْتِنْشَاقِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ صَآئِمًا (رواہ ابوداود والترمذی والنسائی وروی ابن ماجۃ والدارمی) **اِلٰى قَوْلِهٖ بَيْنَ الْاَصَابِعِ۔**

أخرجه أبوداوٗد ۹۷/۱ حديث رقم ۱۴۲۔ والترمذی ۱۵۵/۳ حديث رقم ۷۸۸ وقال حسن صحيح والنسائی مختصرًا ۶۶/۱ حديث رقم ۸۷۔ وابن ماجة ۱۴۲/۱ حديث رقم ۴۰۷ والدارمی ۱۹۱/۱ حديث رقم ۶۹۸ الی "وخلل بين الاصابع" وأخرجه أحمد ۳۲/۴۔

ترجمہ: ''حضرت لقیط بن صبرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول مجھے وضو کے متعلق کچھ بتایئے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم وضو کو کامل طریق سے کیا کرو اور انگلیوں کے درمیان خلال کرو اور اگر تمہارا روزہ نہ ہو تو ناک میں پانی داخل کرنے میں مبالغہ کرو۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد، امام ترمذیؒ اور امام نسائی نے روایت کیا ہے امام ابن ماجہ اور امام دارمی نے اس حدیث کو بین الاصابع تک روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث

لقیط بن عامر: یہ ''لقیط'' ہیں۔ ''عامر بن صبرہ'' کے بیٹے ہیں۔ ان کی کنیت ''ابورزین'' ہے۔ بعض نے ان کو دو علیحدہ افراد سمجھا ہے یہ ان کا وہم ہے۔ ''بنو عقیل'' میں سے ہیں۔ مشہور صحابی ہیں۔ ان کا شمار اہل طائف میں ہوتا ہے۔ ان سے ان کے لڑکے عاصم اور ابن عمرو غیرہ نے روایت کی ہے۔ ''لقیط'' میں لام پر فتحہ اور قاف پر کسرہ ہے اور ''صبرہ'' میں صاد پر فتحہ اور باء موحدہ

پر کسرہ ہے۔ باء کو ساکن پڑھنا اور صاد کو مفتوح و مکسور پڑھنا بھی درست ہے۔

تشریح:لقیط :لام کے فتحہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ مروی ہے۔

ابن صبرۃ :صاد کا فتحہ اور باء کے کسرہ کے ساتھ ہے صاد کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ باء کا سکون بھی جائز ہے۔تہذیب میں اسی طرح ہے اور طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ لقیط بن عامر بن صبرہ ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اس کے علاوہ اور کوئی ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔عقیلی ہیں اور مشہور صحابی ہیں اور ان کا شمار اہل طائف میں سے ہے۔صاحب مشکوٰۃ نے فرمایا ہے کہ یہ لقیط بن عامر بن صبرۃ ہیں،ان کی کنیت ابورزین ہے،ان سے ان کے بیٹے عاصم اور ابن عمرو وغیرہ نے روایت کی ہے۔

اخبرنی عن الوضوء : **ای کمالہ** ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ وضوء سے مراد وہ وضوء ہے جو کامل ہو اور جس کو ہم نے پہچانا ہے اس سے زائد ہو اس میں الف لام کمال کے لئے ہے یا عہد ذہنی کیلئے اور معہود وہ ہے کہ جس کو جانا گیا ہے اور شریعت میں اس کے کرنے والے کی تعریف و مدح ثابت ہے۔

قال اسبغ الوضوء :وضوء،واؤ کے ضمہ کے ساتھ ہے یعنی اس کے فرائض اور سنتوں کو پورا کرا اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ لام یہاں عہد ذھنی کیلئے ہے اور مراد اس سے وہ ہے جو مسلمانوں کے درمیان مشہور و معروف ہے کہ وضوء کیا ہے،پس وضوء کے بارے میں پوچھنے سے مراد اس امر زائد کی تحقیق ہے کہ جس کو وہ جانتے ہیں اسی وجہ سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **اسبغ الوضوء** اور وضوء کا کمال یہ ہے کہ پیشانی کے اوپر سے ٹھوڑی کے نیچے تک پانی پہنچانا اور ایک کان سے دوسرے کان تک چوڑائی میں پانی پہنچانا اور اس کے ساتھ ناک میں پانی ڈالنے اور کلی کرتے وقت مبالغہ کرنا۔یہ تفصیل اسباغ کی چہرہ میں ہوئی اور باقی ہاتھ اور پاؤں،پس کہنی اور ٹخنوں کے اوپر تک پانی پہنچانا اور اس کے ساتھ ساتھ ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا،پس اے مخاطب تو اس مختصر جامع جوابؐ کی بلاغت پر خود ہی غور کر۔

وخلل بین الاصابع :یعنی ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں کا خلال کر۔ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ تشبیک (انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کر کے) ہاتھوں کیلئے کرے اور جو تشبیک کو مکروہ کہا گیا ہے تو اس کا محل وہ آدمی ہے جو مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھا ایسا کر رہا ہو،وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنا عبث کام ہے لہٰذا یہ اس کے لئے مناسب نہیں ہے۔(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) ہمارے نزدیک انگلیوں کے خلال میں تشبیک کرے گا،لیکن اس طریقے سے نہیں کہ جس سے روکا گیا ہے یعنی ہتھیلی کو ہتھیلی کے مقابلے لانا،بلکہ دائیں ہتھیلی کے باطنی حصے کو بائیں کے اوپر رکھے گا اور انگلیوں میں سے بعض کو بعض میں داخل کرے گا اور پیروں کی انگلیوں کے خلال میں مستحب یہ ہے کہ دائیں پیر کی چھوٹی انگلی سے شروع کرے اور بائیں پیر کی چھوٹی انگلی پر ختم کے کیونکہ اس میں ایک تو آسانی ہے اور دوسرا دائیں جانب سے شروع کرنے کی پابندی بھی موجود ہے اور خلال بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے کرے اور اصل سنت جس طرح بھی اداء کرے حاصل ہو جائے گی۔

وبالغ فی الاستنشاق :پانی کو ناک کے اندرونی حصے تک پہنچانے کے ذریعے۔

الا ان تکون صائما :تو پھر مبالغہ نہ کر کہ کہیں پانی ناک سے نیچے نہ اتر جائے،پس روزہ ٹوٹ جائے گا اور اسی طرح کلی کا حکم بھی ہے۔

ائمہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے جیسا کہ ابن خزیمہ ابن حبان اور حاکم۔ اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔

بين الاصابع :ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ انگلیوں کا خلال سنت ہے۔ اگر پانی انگلیوں کے اندر چلا جاتا ہے اور اگر انگلیوں کے اندر پانی نہ جائے مثلاً انگلیاں ملی ہوئی ہوں تو پھر خلال واجب ہے۔

وضو میں تخلیل اصابع کا اہتمام کرو

۴۰۶:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا تَوَضَّأْتَ فَخَلِّلْ اَصَابِعَ يَدَيْكَ وَرِجْلَيْكَ .

(رواه الترمذى وروى ابن ماجة نحوه وقال الترمذى هذا حديث غريب)

أخرجه الترمذى ٥٧/١ حديث رقم ٣٩ وقال حسن غريب وابن ماجة نحوه ١٥٣/١ حديث ٤٤٧ ـ

ترجمہ: ''حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم وضو کرو۔ تو ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کے درمیان خلال کرو۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور حضرت امام ابن ماجہؒ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔''

اسنادی حیثیت: اور ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کو اس طرح بیان کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: **اذا توضات فخلل اصابع يديك ورجليك**: یعنی جب تو وضو شروع کرے یا مطلب یہ ہے کہ جب وضوء کے اعضاء کو دھولے پس ہاتھ اور پاؤں کو دھونے کے بعد انگلیوں کا خلال کرے اور یہی افضل ہے (یعنی ہاتھوں کو دھونے پھر خلال کرے اور اسی طرح پاؤں کو دھوئے پھر خلال کرے) اور اگر ہاتھوں کی انگلیوں کا خلال آخر وضوء تک مؤخر کرے تو یہ بھی جائز ہے، جیسا کہ واؤ جو مطلق جمع کیلئے ہے وہ اس پر دلالت کر رہی ہے۔

وقال الترمذى هذا حديث غريب۔ میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ ترمذی کے بعض میں حدیث حسن ہے۔

پاؤں کی اُنگلیوں کا خلال خنصر کے ساتھ کیا جائے

۴۰۷:وَعَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِذَا تَوَضَّأَ يَدْلُكُ اَصَابِعَ رِجْلَيْهِ بِخِنْصَرِهٖ . (رواه الترمذى وابوداود وابن ماجة)

أخرجه الترمذى فى اسنن ٥٧/١ حديث رقم ٤ وقال حسن غريب لانعرفه الا حديث ابن لهيعة۔ وأبو داؤد ١٠٣/١ حديث رقم ١٤٨ ـ وابن ماجة ١٥٢/١ حديث رقم ٤٤٦ وأحمد فى المسند ٢٢٩/٤ ـ

ترجمہ: ''حضرت مستورد بن شدادؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا تو آپ ﷺ پاؤں کی انگلیوں کا خلال خنصر انگلی کے ساتھ کرتے تھے۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ، امام ابوداؤدؒ اور امام ابن

ماجہ نے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

المستورد بن شداد۔ یہ ''مستورد'' ہیں۔ شداد کے بیٹے ہیں باپ بیٹا دونوں صحابی ہیں۔ ''فہری وقرشی'' ہیں۔ ''بنو محارب بن فہر'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا شمار اہل کوفہ ہے بعد میں مصر کو سکونت گاہ بنایا اور ان میں شمار ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جس روز آنحضرت ﷺ کی وفات ہوئی اس وقت یہ بچے تھے۔ لیکن انہوں نے آنحضرت ﷺ سے حدیث کی سماعت کی اور اس کو یاد رکھا۔ ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔ ''مستورد'' میں کے ضمہ' سین مہملہ کے سکون' دولفظوں والی تاء فوقانیہ کے فتحہ' راء کے کسرہ اور دال مہملہ کے ساتھ ہے۔ ''شداد'' میں پہلی دال مشدد ہے۔

تشریح: **المستورد**: میم کے ضمہ، سین کے سکون، تاء کے فتحہ، راء کے کسرہ اور دال کے ساتھ مردی ہے)۔ جامع الاصول میں اسی طرح ہے۔ تقریب التہذیب میں ہے کہ یہ اور ان کے والد صحابی ہیں۔

ابن شداد: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ قریشی ہیں، اور بنی محارب بن فہر میں سے ہیں، ان کا شمار اہلِ کوفہ میں ہوتا ہے پھر مصر میں سکونت اختیار کی اور ان میں شمار کئے جانے لگے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ حضور ﷺ کی وفات کے وقت نوعمر تھے، مگر انہوں نے حضور ﷺ سے حدیث بھی سنی اور اس کو محفوظ بھی کیا۔ صاحب مشکوٰۃؒ ان کے بارے میں مزید فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضور ﷺ سے روایت کی ہے، اور ایک جماعت نے ان سے روایت نقل کی ہے۔

یدلك اصابع رجلیه: یعنی یخلل جیسا کہ مسند احمد میں ہے۔

بخنصره: جیسا کہ ابھی گزرا۔ عبدالعزیز ابھریؒ نے فرمایا ہے کہ خنصر سے اس لئے خلال کرتے تھے کیونکہ یہ چھوٹی ہوتی ہے اور چھوٹوں سے خدمت لینا ہی مناسب ہے اور انگلیوں کے درمیان اس کا داخل ہونا آسان بھی ہے۔

اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اگر مستوردؓ کی مراد **دلك** سے خلال کرنا ہے تو پھر یہ حدیث چھوٹی انگلی کے ساتھ خلال کے مستحب ہونے کی دلیل ہوگی، اور چھوٹی انگلی بائیں ہاتھ کی ہوگی، اس کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی اس کے لئے مناسب ہے، اس لئے کہ پیروں کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس کیلئے کوئی تکریم نہیں ہے اور اگر مستوردؓ کی مراد، **دلك** سے چھوٹی انگلی کا گزارنا ہے پس اس صورت میں حدیث تمام اعضاء کے ملنے کے مستحب ہونے کی دلیل ہوگی اور یہی ہمارا مذہب ہے اور امام مالکؒ کا مذہب مستحب کی بجائے وجوب کا ہے۔ ملاّ علی قاریؒ فرماتے ہیں ہمارا مذہب میں بھی اختلاف سے نکلنا مستحب ہے کیونکہ اسی میں دین کے معاملہ میں احتیاط ہے۔

یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں۔ صاحب تخریج المصابیح فرماتے ہیں کہ امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے یہ ابن لہیعہ کے طریق کے علاوہ معروف نہیں ہے۔ شیخ زین العراقی فرماتے ہیں ابن لھیعہ اس میں متفرد نہیں ہے بلکہ لیث بن سعد نے اس کی متابعت کی ہے اور عمرو بن الحارث نے اور ابن القطان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ میرک شاہؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

ڈاڑھی کا خلال

۴۰۸: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا تَوَضَّأَ اَخَذَ كَفًّا مِّنْ مَّاءٍ فَاَدْخَلَهٗ تَحْتَ حَنَكِهٖ فَخَلَّلَ بِهٖ لِحْيَتَهٗ وَقَالَ هٰكَذَا اَمَرَنِیْ رَبِّیْ ۔ (رواہ ابو داود)

أخرجه أبو داوٗد ۱/۱۰۱ حديث رقم ۱۴۵۔

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب وضو کرتے تھے تو ایک چلو پانی لیتے پھر اس کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے پہنچاتے اور اس سے اپنی ڈاڑھی میں خلال کرتے اور پھر فرماتے کہ میرے رب نے مجھے اسی طرح حکم دیا ہے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: اخذ كفا من ماء: ظاہر ہی ہے کہ یہ وضو سے فارغ ہونے کے بعد فرماتے تھے اور یہ بھی محتمل ہے کہ وضوء کے درمیان میں چہرہ دھونے کے بعد اور یہی زیادہ بہتر ہے اس لئے یہ وضوء کی تکمیل کرنے والے افعال میں سے ہوگا۔

تحت حنكه: ابھریؒ نے فرمایا ہے کہ حنک (حاء کے فتحہ اور نون کے ساتھ) منہ کے باطن کو کہتے ہیں اور تحت الحنك سے مراد تحت الذقن (ٹھوڑی کے نیچے) ہے۔

فخلل به لحيته: یعنی پانی کا چلو، داڑھی کے نیچے گلے کی طرف سے داخل کرتے پس اس کے ساتھ داڑھی کا خلال کرتے تاکہ پانی اس کی طرف ہر جانب سے پہنچ جائے اور یہ چہرے کے دھونے کے وقت کرتے اس لئے کہ یہ فرض کی تکمیل میں سے ہو جائے گا نہ کہ وضوء سے فارغ ہونے کے بعد، جیسا کہ بعض کو وہم ہوا ہے۔

هكذا امرنی ربی: یعنی وحی خفی کے ذریعے یا جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے۔

اسنادی حیثیت: میرک شاہؒ نے کہا ہے کہ ابوداؤدؒ اس پر خاموش رہے ہیں۔

۴۰۹: وَعَنْ عُثْمَانَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُخَلِّلُ لِحْيَتَهٗ ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

أخرجه الترمذی ۱/۴۶ رقم ۳۱۔ وقال حسن صحيح۔ والدارمی ۱/۱۹۱ حديث رقم ۷۰۴ وابن ماجة ۱/۱۴۸ حديث رقم ۴۳۰۔

ترجمہ: ''حضرت عثمانؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وضو کرتے وقت اپنی ڈاڑھی کا خلال کیا کرتے تھے اس حدیث کو امام ترمذی اور امام دارمی نے روایت کیا ہے۔''

وضو کا بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پینا

۴۱۰: وَعَنْ اَبِیْ حَيَّةَ قَالَ رَاَيْتُ عَلِيًّا تَوَضَّأَ فَغَسَلَ كَفَّيْهِ حَتّٰى اَنْقَاهُمَا ثُمَّ مَضْمَضَ ثَلَاثًا وَاسْتَنْشَقَ ثَلَاثًا وَغَسَلَ وَجْهَهٗ ثَلَاثًا وَذِرَاعَيْهِ ثَلَاثًا وَمَسَحَ بِرَاْسِهٖ مَرَّةً ثُمَّ غَسَلَ قَدَمَيْهِ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ثُمَّ قَامَ فَاَخَذَ

فَضْلَ طَهُوْرِهٖ فَشَرِبَهٗ وَهُوَ قَائِمٌ ثُمَّ قَالَ اَحْبَبْتُ اَنْ اُرِيَكُمْ كَيْفَ كَانَ طُهُوْرُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ.

(رواه الترمذی والنسائی)

أخرجه الترمذی ۱/۶۷حدیث رقم ۴۸۔ وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۷۰حدیث رقم ۹۶ وأخرجه أبو داوٗد مختصرًا فی السنن ۱/۸۳حدیث رقم ۱۱۶۔

ترجمه: ”حضرت ابوحیہؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ہاتھوں کو دھویا یہاں تک کہ ان کو اچھی طرح صاف کیا۔ پھر تین مرتبہ کلی کی۔ تین مرتبہ ناک میں پانی ڈالا۔ تین مرتبہ منہ دھویا' تین مرتبہ دونوں ہاتھ مرفقین سمیت دھوئے ایک مرتبہ اپنے سر کا مسح کیا اور اپنے دونوں پاؤں ٹخنوں سمیت دھوئے پھر کھڑے ہو کر وضو کے بچے ہوئے پانی کو پی لیا اور پھر فرمایا کہ میں نے پسند کیا کہ تمہیں رسول اللہ ﷺ کا وضو کر کے دکھاؤں۔ کہ آپ ﷺ کا وضو کس طرح تھا اس حدیث کو امام ترمذی اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔“

راویٔ حدیث:

ابوحیہ۔ ان کا نام عمرو بن نصر خارقی ہمدانی ہے۔ حدیث کی روایت حضرت علی بن ابی طالب ؓ سے کرتے ہیں۔

تشریح: ابی حیة : حیہ، یاء کے ساتھ ہے۔ میرک شاہؒ نے کہا ہے اور طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ عمرو بن نصر الہمدانی ہیں۔ مصنفؒ نے کہا ہے اس پر زیادتی کرتے ہوئے کہ انہوں نے علیؓ بن ابی طالب سے روایت کی ہے۔

فغسل كفيه: یعنی وضو شروع کیا، یا وضو کا ارادہ کیا، فاء یہاں تعقیب کیلئے ہے اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ فاء توضا میں جو اجمال ہے اس کی تفصیل کیلئے ہے اور کفین سے دونوں ہاتھ پہنچوں تک مراد ہیں۔

حتی انقاهما: یعنی ان کی میل وغیرہ کو دور کر دیا اور دوسری روایات تین بار دھونے پر دلالت کرتی ہیں۔

ومسح براسه مرة : اس حدیث میں دلیل ہے اس مسئلہ کی کہ مسح رأس میں تثلیث نہیں ہے جو کہ جمہور کا مذہب ہے۔ امام شافعیؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں اور باقی اس روایت کو بیانِ جواز پر محمول کرنا جیسا کہ ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے تو وہ مردود ہے اس لئے کہ حضرت علیؓ شارع تو نہیں ہیں اور اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ ان کا مقصود صرف جواز کا بتانا تھا کہ یہ شارع علیہ السلام کے نزدیک جائز ہے، تو پھر حضرت علیؓ کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ بقیہ تمام سنتوں کو بھی چھوڑتے (اور صرف بیانِ جواز کے بتلاتے)۔

اور باقی ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ مسح رأس کی طہارت میں تخفیف کی گئی ہے نہ کہ اس کے علاوہ کسی اور عضو میں کیونکہ یہ اکثر چھپا رہتا ہے۔ یہ بھی مردود ہے، اس لئے کہ نجاست حکمیہ کے اندر اعضاء کے ڈھانپنے اور کھلا رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس کے ساتھ ساتھ ابن حجرؒ کی اس بات کو (غسل قدمیه) بھی رد کرتا ہے۔ کیونکہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ قدمین کو ایک مرتبہ دھویا ہے۔

ثم غسل قدميه الى الكعبين : یعنی ایک ساتھ دھونا۔ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ پاؤں کو تین مرتبہ دھویا اور راوی نے شاید اس کو ظاہر ہونے کی وجہ چھوڑ دیا، یا وضوء میں دوسرے اعضاء مغسولہ پر قیاس کرنے کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ اس لئے کہ یہ بات

بعید ہے کہ کلی اور ناک میں پانی ڈالنا وہ تین بار ہو اور دونوں پاؤں کا دھونا وہ ایک مرتبہ ہو، اسی وجہ سے راوی نے مرۃً نہیں کہا ہے اور یہ ممکن ہے کہ راوی کو تردُد ہو گیا ہو، یا بعض راویوں سے بطور نسیان یا بطور اختصار حذف واقع ہو گیا ہو۔

فاخذ فضل طهوره :طہور، طاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔کازرونیؒ نے اسی طرح کہا ہے **ای بقیة مائه الذی توضابه۔**

فشربه وهو قائم :یہ جملہ حال واقع ہے۔ابن الملکؒ نے فرمایا ہے باقی وضو سے بچے ہوئی پانی کا پینا تو وہ اس وجہ سے ہے کہ یہ ایسا پانی ہے کہ جس سے ایک عبادت (وضو) کو ادا کیا گیا ہے۔پس اس میں برکت ہوگی، پس اس کا کھڑے ہو کر پینا اچھا ہوگا اُمت کو تعلیم دینے کیلئے کہ کھڑے ہو کر اس کو پینا جائز ہے۔

کیف کان طهور رسول ﷺ :ابن الملکؒ نے کہا ہے کہ طہور، طاء کے ضمہ کے ساتھ ہے **ای وضوء ہ وطهارته** اور بعض نسخوں میں فتح کے ساتھ ہے، تو پھر تقدیر عبارت ہوگی: **استعمال الطهور** یا پھر یہ ضمہ کے معنی میں ہوگا، جیسا کہ گزر چکا ہے اور حدیث سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ حضرت علی کا یہ مقصود نہیں ہے کہ حضور ﷺ کا ہمیشہ وضوء اسی مذکورہ تفصیل کے مطابق ہوتا تھا بلکہ مقصود اس سے دیکھے ہوئے افعال میں اجمالی ہئیت کا بیان کرنا ہے۔پس وہ روایات کہ جس میں مختلف عددوں کا تذکرہ ہے یہ اس کے منافی نہیں ہے، یا مقصود حضرت علیؓ کا اس وضوء کا بیان کرنا ہے جو شریعت میں آپ کا وضو ثابت ہوا ہے، یا اس سے مراد وہ وضوء ہے جو آخری عمر میں واقع ہوا ہے۔

۴۱۱ :وَعَنْ عَبْدِ خَيْرٍ قَالَ نَحْنُ جُلُوْسٌ نَنْظُرُ اِلٰى عَلِيٍّ حِيْنَ تَوَضَّأَ فَاَدْخَلَ يَدَهُ الْيُمْنٰى فَمَلَأَ فَمَهُ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَنَثَرَ بِيَدِهِ الْيُسْرٰى فَعَلَ هٰذَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَالَ مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى طُهُوْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهٰذَا طُهُوْرُهُ . (رواه الدارمی)

أخرجه الدارمی فی سننه ۱/۱۹۰حدیث رقم ۷۰۱۔والنسائی فی السنن ۱/۶۷حدیث رقم ۹۱۔

ترجمه: ''حضرت عبد خیرؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم بیٹھے ہوئے حضرت علیؓ کو وضو کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے چنانچہ انہوں نے ایک برتن میں سے اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ پانی لیا۔پھر مضمضہ اور استنشاق کیا اور بائیں ہاتھ سے ناک کو جھاڑا۔اس طرح تین مرتبہ کیا۔پھر فرمایا جس کو یہ بات اچھی لگے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے وضو کو دیکھے۔تو وہ اس وضو کو دیکھ لے آپ ﷺ کا وضو اسی طرح تھا۔اس حدیث کو امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

عبد خیر بن یزید: یہ ''عبد خیر'' یزید کے بیٹے ہیں ان کی کنیت ابو عمارہ ہے۔ہمدان کے باشندہ ہیں۔کہا جاتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کا زمانہ تو پایا لیکن شرف ملاقات سے محروم رہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کبار اصحاب ساتھیوں میں سے ہیں۔محدثین کے نزدیک وثوق اور اعتماد کے شخص ہیں۔کوفہ میں قیام پذیر ہو گئے۔کہا جاتا ہے کہ ایک سو بیس سال کی عمر ہوئی۔خیر ''شر'' کی ضد ہے۔

تشریح: عبد خیر : خیر، شر کی ضد ہے۔ جامع میں اسی طرح ہے۔ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ ہمدانی ہیں۔ حضور ﷺ کا زمانہ تو پایا لیکن ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا اور یہ حضرت علیؓ کے کبار اصحاب میں سے ہیں، قابل اعتماد امانتدار ہیں۔ کوفہ میں رہتے تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی عمر ۱۲۰ سال ہوئی۔ صاحب مشکوۃ نے کہا ہے کہ ان کی کنیت ابو عمارہ ہے اور یہ ابن یزید ہیں۔

تنظر الی علی: تا کہ اس بارے میں ان سے علم حاصل کریں۔

ونثر : یعنی ناک سے ریزش وغیرہ کو نکالا۔

ثلاث مرات : حضرت علیؓ کا وہ فعل جو اس مجمل کیلئے بطور بیان کے ہے وہ گزر چکا ہے، اور اس کے اندر اجمال کے باوجود فصل یا وصل پر کوئی دلالت نہیں ہے (یعنی مضمضمہ اور استنشاق کی بابت) اور ابن حجر کو وہم ہوا ہے انہوں نے کہا ہے اس حدیث کے بارے کہ اس سے وصل کا مسنون ہونا معلوم ہوتا ہے، مضمضمہ اور استنشاق میں۔

رواۃ الدارمی: ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ نسائی نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے۔

۴۱۲: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفٍّ وَّاحِدٍ فَعَلَ ذٰلِكَ ثَلَاثًا . (رواه ابوداود والترمذی)

أخرجه أبوداؤد ۱/۸۷ حديث رقم ۱۱۹ وأخرجه الترمذي في السنن ۱/۴۱ حديث رقم ۲۸۔

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن زیدؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے ایک ہی چلو سے کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا اور تین مرتبہ اس طرح کیا اس حدیث کو امام ترمذی اور امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔“

تشریح: عبد الله بن زيد : طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ زید بن عبدربہ ہیں۔ بیعت عقبہ میں عبداللہؓ حاضر ہوئے تھے اور اس کے بعد ہونے والے غزوات میں شریک رہے اور یہ وہی صحابی ہیں جن کو خواب میں اذان دکھلائی گئی تھی، ہجرت کے پہلے سال مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد اور یہ انصاری ہیں، اور قبیلہ خزرج سے ان کا تعلق ہے۔ صاحب مشکوۃؒ نے فرمایا ہے کہ ان کے والدین بھی صحابی ہیں۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اصل حدیث یہ صحیح میں ہے اور سیدؒ نے فرمایا ہے کہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ صحاح میں گزر چکی ہے، پس اس باب میں حسان کے اندر اس کو اعادہ کرنے کا کوئی معنی نہیں ہے۔ میرکؒ نے فرمایا ہے پھر میں نے غور کیا تو مجھے یہ بات ملی کہ صاحبِ مشکوۃؒ کے اس روایت کو یہاں لانے کی ایک وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اس بات پر تنبیہ کرنا چاہے ہیں کہ صاحب مصابیح کا فعل صحیح نہیں ہے۔

ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے میں نے اس مقام پر غور کیا تو مجھے دونوں معزز سید حضرات سے ان دونوں حدیثوں کے اندر صاحب مصابیح اور صاحب مشکوۃ پر اعتراض جواب کرنے پر تعجب ہوا۔ (یعنی سید جمال الدین محدثؒ اور میرک شاہؒ پر) اس لئے کہ پہلی حدیث جو صحاح میں وارد ہے وہ صاحب مصابیح کی طرف سے نہیں ہے، بلکہ اس کو صاحب مشکوۃؒ نے مصابیح کی

روایت کی تصحیح کیلئے ذکر کیا ہے، اور باقی حدیث ثانی تو وہ محی السنۃ یعنی صاحب مصابیح کا کلام ہے۔ حسن روایات کے ذیل میں اور اس حدیث میں جو صحابی راوی ہیں وہ اس روایت میں نہیں ہیں اور اسی طرح ان دونوں کی تخریج بھی مختلف ہے لہٰذا اعادہ نہ ہوا تو پھر کوئی اعتراض بھی واقع نہ ہوگا کہ اس کے جواب کی ضرورت پڑے۔ واللہ اعلم بالصواب

کانوں کا مسح

۴۱۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ مَسَحَ بِرَأْسِهٖ وَاُذُنَیْهِ بَاطِنَهُمَا بِالسَّبَّابَتَیْنِ وَظَاهِرَهُمَا بِاِبْهَامَیْهِ. (رواه النسائی)

أخرجه النسائي من حديث طويل ۷٤/۱ حديث رقم ۱۰۲۔ والترمذی نحوه ۵۲/۱ حديث رقم ۳٦ وقال حسن صحيح۔ وابن ماجة ۱۵۱/۱ حديث رقم ٤۳۹۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے سر کا اور دونوں کانوں کا مسح کیا اور کانوں کے اندر کا مسح شہادت کی اصابع سے کیا اور ظاہر کا مسح ابہامین کے ساتھ کیا۔ اس حدیث کو امام نسائی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **مسح براسه و اذنيه**: حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے کانوں کا مسح سر کے بچے ہوئے پانی سے کیا اور یہ ہمارے مذہب کے موافق ہے۔

باطنهما: یہ لفظ اذنيه سے بدلیت کی بناء پر مجرور ہے اور نصب بھی پڑھ سکتے ہیں پھر یہ اذنيه کے محل سے بدل ہوگا اور مراد باطن سے یہاں وہ جانب ہے کہ جس میں سوراخ ہے۔

بالسباحتين: مراد مسبحتان ہیں اور شہادت کی انگلیوں کو مسبحتين اس لئے کہتے ہیں کہ اکثر ذکر و تسبیح ان کے ذریعے سے ہوتی ہے اور ان کو مسبابتان کہا جاتا تھا سباحة اور مسبحه یہ ان کے اسلامی ناموں میں سے ہے کیونکہ سبابه کے لفظ میں ایک قسم کی کراہت ہے وہ کراہت یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ گالیاں دیتے تھے ایک دوسرے کو تو اس سے اشارہ کرتے تھے اور یہ سباحة اور مسبحة ان ناموں میں سے ہیں، جن کو حضور اکرم ﷺ نے تبدیل کیا تھا۔

و ظاهرهما: یہ بھی مجرور یا منصوب ہے اور اس سے مراد کان کا وہ حصہ جو سر سے ملا ہوا ہو۔

بابهاميه: ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ کانوں کو چہرے کے ساتھ دھوئے اور سر کے مسح کے وقت مسح کرے اختلاف سے بچتے ہوئے۔ (ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ شریعت میں ایک عضو میں غسل اور مسح کا جمع کرنا معروف نہیں ہے، نیز غسل کے بعد مسح کا وجود ظاہری طور پر فضول ہے۔ ہاں البتہ مسح اور غسل دونوں پاؤں میں صحیح ہے جیسا کہ بعض ظاہریہ نے کیا ہے۔ اس کے لئے ایک بہترین وجہ ہے کہ مسح کو غسل پر مقدم کیا جائے گا کیونکہ غسل اس مسح کیلئے تکمیل بن جائے گا اور اس کے ساتھ اختلاف سے بھی آدمی نکل جائے گا اور میری مراد یہاں پر شیعوں کا اختلاف نہیں ہے بلکہ مراد وہ روایت ہے جو ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ فرض وہ مسح ہے اور اسی طرح وہ روایت جو احمدؒ اوزاعی اور سفیان ثوری اور ابن جبیرؒ سے مروی ہے کہ دونوں پیروں میں مسح جائز ہے ان کے نزدیک، آدمی کو مسح اور غسل دونوں میں اختیار ہے، پھر سارے کانوں کا دھونا

یہ امام زہریؒ کا مذہب ہے اور شعبیؒ اور ایک جماعت کا مذہب یہ ہے۔ کانوں کے اگلے حصے کو دھویا جائے گا اور پچھلے حصے کو سر کے ساتھ مسح کیا جائے گا اور صرف کانوں کے مسح پر اختصار کرنا سر کے مسح کے عوض میں بالا جماع جائز نہیں ہے۔

پھر جمہور حضرات فرماتے ہیں کہ کانوں کے مسح میں تکرار نہیں کرے گا۔ امام شافعیؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں اور نیز غسل مسح کے قائم مقام ہے تمام کے اندر، بخلاف مسح کے کہ وہ غسل کے قائم مقام نہیں ہے۔ پس بیشک ظاہر بات یہ ہے کہ شارع علیہ السلام کا مقصود وہ طہارت کاملہ ہے پس غسل یعنی دھونے والا وہ احوط پر عمل پیرا ہے، پس اس کو مسح کی ضرورت نہیں ہے اور شاید کہ سر کا وضوء میں نہ دھونا وہ حرج کو دور کرنے کیلئے ہو اس لئے کہ وضوء کا آدمی ہر دن محتاج ہوتا ہے، بخلاف غسل کے اور اسی حرج کی وجہ سے ڈاڑھی کا گنا پن اس کے نچلے حصے کو دھونے کے وجوب کیلئے مانع ہے، بخلاف غسل کے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا کہ ابن ماجہؒ نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے۔

۴۱۴: وَعَنِ الرُّبَيِّعِ بِنْتِ مُعَوِّذٍ اَنَّهَارَاَتِ النَّبِيَّ ﷺ يَتَوَضَّأُ قَالَتْ فَمَسَحَ رَأْسَهٗ مَا اَقْبَلَ مِنْهُ وَمَا اَدْبَرَ وَصُدْغَيْهِ وَاُذُنَيْهِ مَرَّةً وَاحِدَةً وَفِيْ رِوَايَةٍ اَنَّهٗ تَوَضَّأَ فَاَدْخَلَ اِصْبَعَيْهِ فِيْ جُحْرَيْ اُذُنَيْهِ .

(رواه ابوداود روى الترمذى الرِّوَايَةُ الْاُوْلٰى وَاحمد وابن ماجة الثانية)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ۹۱/۱ حديث ۱۲۹ ـ والترمذى ۴۸/۱ ـ وقال حسن صحيح وأحمد فى السمند ۳۵۹/۶ وأخرجه الرواية الثانية أبو داوٗد في السنن ۹۱/۱ حديث رقم ۱۳۱ وأحمد فى السند ۳۵۹/۶ وابن ماجة ۱۵۱/۱ حديث ۴۴۱ ـ

ترجمہ: ''حضرت ربیع بنت معوذ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرتے ہوئے دیکھا وہ فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر کے اگلے حصہ پر اور پچھلے حصہ پر کنپٹیوں پر اور کانوں پر ایک مرتبہ مسح کیا اور ایک دوسری میں روایت میں مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا۔ چنانچہ مسح کرتے وقت اپنی دونوں انگلیوں کو اپنے دونوں کانوں کے سوراخوں میں داخل کیا۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی اور امام احمد نے پہلی حدیث کو اور امام ابن ماجہ نے دوسری حدیث کو روایت کیا ہے۔''

تشریح: **الربیع**: یہ تصغیر اور شد کے ساتھ ہے۔ تقریب میں اسی طرح ہے۔ یہ انصاریہ ہیں اور نجار قبیلہ سے ان کا تعلق تھا اور یہ بیعت رضوان میں بیعت کرنے والی عورتوں میں سے ہیں۔ علامہ طیبیؒ نے اس طرح فرمایا ہے۔ صاحب مشکوٰۃؒ فرماتے ہیں ان کی بڑی قدر و منزلت ہے ان کی حدیث اہل مدینہ اور اہل بصرہ میں معروف ہے اور ربیع راء کے ضمہ باء کے فتحہ اور یاء مشدد کے ساتھ ہے۔

معوذ: یہ تعویذ سے اسم فاعل ہے جامع میں اسی طرح ہے۔

ما اقبل منه: یہ (ما) موصولہ ہے۔

وما ادبر: یہ ما اقبل پر عطف ہے اور یہ دونوں راسه سے بدل واقع ہیں۔

وصدغیه واذنیه: یہ رأسهٗ پر معطوف ہے یہ عطف خاص کا عام پر ہے: **ای انهما مسحهما بماء الراس** جیسا کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے اور صدغ سے مراد وہ حصہ جو کانوں اور آنکھ کے درمیان میں ہو (کنپٹی) اور جو بال اس پر لٹکے ہوں اس

کوصدغ سے موسوم کیا جاتا ہے۔علامہ طیبیؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے اور قاموس میں ہے کہ ابن الملکؒ نے کہا ہے کہ صدغ سے مراد وہ بال ہیں جو کان اور پیشانی کے درمیان سر کی دونوں جانبوں میں سے ہر جانب سے ہوں اور یہی مذہب کے زیادہ قریب ہے اور ابھریؒ کی شرح میں ہے کہ صاحب بحر نے کہا ہے کہ صدغ سے مراد وہ بال ہیں جو کان کے کنارے کے محاذی ہو اور اسی طرح جو رخسار کی طرف اترے ہوں اور عزیز کے اندر ہے کہ وہ چیزیں جو چہرے کی حد سے خارج ہیں وہ صدغان ہیں، اور وہ کان کی دونوں جانب جو اوپر کی طرف سے رخسار سے ملی ہوئی ہوں۔

مرة واحدة :شرح السنۃ میں ہے کہ مسح کے تکرار میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا یہ سنت ہے یا نہیں۔اکثر حضرات کی رائے یہ ہے کہ ایک بار ہی مسح کیا جائے گا اور یہ ائمہ ثلاثہ کا مذہب ہے اور امام شافعیؒ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ مسح تین مرتبہ تین نئے پانیوں کے ساتھ سنت ہے۔

في حجري اذنيه :جیم مضمومہ یہاں مقدم ہے ای صما خیھما ۔رافعیؒ نے فرمایا ہے دائیں کو بائیں پر مقدم کرنا وہ ایسے دو عضوؤں میں ہوتا ہے کہ جن کو ایک ساتھ دھونا مشکل ہو جیسا کہ دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں۔باقی دونوں کان تو اس میں دائیں سے شروع کرنا مستحب نہیں ہے، اس لئے کہ ان دونوں کا ایک ساتھ مسح کرنا زیادہ آسان ہے۔ابھریؒ نے اس کو ذکر کیا ہے۔

مسح رأس کرنا ماءِ جدید کے ساتھ

۴۱۵:وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ اَنَّهٗ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ وَاَنَّهٗ مَسَحَ رَأْسَهٗ بِمَاءٍ غَيْرِ فَضْلِ يَدَيْهِ ـ

(رواه الترمذی ورواه مسلم مع زوائد)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۵۰حديث رقم ۳۵۔وقال حسن صحيح ۔وأخرجه أبو داوٗد بمعناء ۱/۸۷حديث ۱۲۰ومسلم فی حديث طويل ۱/۲۱۱حديث رقم (۱۹۔۲۳۶)۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے سر کا مسح کیا ماء جدید کے ساتھ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور امام مسلم نے اس روایت کو کچھ زیادتی کے ساتھ نقل کیا ہے۔جس میں مسح رأس کے ساتھ دیگر اعضاء وضو کے دھونے کا بھی ذکر ہے۔''

تشریح:**وانه** :ان فتحہ کے ساتھ ہے اور یہ عطف ہے النبی پر یا ان کسرہ کے ساتھ ہے اس صورت میں یہ توضا کے فاعل سے حال ہے یا رَاٰی کے مفعول سے۔

مسح راسه بماء غير فضل يديه :تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ آپ ﷺ نے مسح رأس کے لئے نیا پانی لیا، اور اس تری پر جو آپ کے ہاتھوں پر تھی اقتصار نہیں کیا۔ابن الملکؒ نے کہا ہے کہ اس میں امام شافعیؒ کیلئے دلیل ہے۔
ملاّ علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں دو جائز امور میں سے ایک پر عمل کرنا ہے۔ہمارے نزدیک (یعنی ماء جدید سے بھی جائز ہے اور اسی طرح ہاتھوں پر باقی تری سے بھی)۔

مصابیح کے بعض شراح نے کہا ہے کہ یہاں روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے: **بماء غير من فضل يديه اى بقی۔** مطلب یہ ہے کہ ہاتھوں کے اوپر جو پانی باقی تھا اس سے مسح کیا۔

سید جمال الدین محدثؒ نے فرمایا ہے کہ مناسب یہ تھا کہ شیخ اس حدیث کو صحاح میں ذکر کرتے نہ کہ حسان روایات میں اور تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث مسلم شریف سے مخرج ہے مؤلف کو اس بات کا علم نہ ہوا کہ یہ روایت مسلم شریف میں ہے انہوں نے اس کو ترمذی شریف سے نقل کر کے حسان میں ذکر دیا ہے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حسن نہیں ہے (کہ اس کو حسان میں ذکر کیا جائے بلکہ یہ صحیح روایت ہے) لیکن یہاں علامہ بغویؒ صاحب المصابیح پر اعتراض وارد ہوتا ہے نہ کہ صاحب مشکوٰۃ پر کیونکہ صاحب مشکوٰۃؒ صحیح کو غیر صحیح سے جدا کرتے ہیں ان کے کلام میں کوئی ابہام نہیں ہے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) ابن حجرؒ کو یہ وہم ہوا ہے کہ تورپشتی کی مؤلف سے مراد صاحب مشکوٰہ ہیں حالانکہ ایسی بات نہیں ہے ان کی مراد وہ صاحب مصابیح ہیں، جن کی کتاب (مصابیح السنۃ) کی شرح علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے صاحب مشکوٰۃؒ کے پیدا ہونے سے پہلے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ ان پر بھی کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا بلکہ زیادہ سے زیادہ یہی کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اولیٰ کو چھوڑا ہے۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔ یعنی بہتر یہ تھا کہ مسلم کی حدیث کو صحاح میں زوائد کے ساتھ ذکر کرتے پھر ترمذی کی روایت صرف حسان میں ذکر کرتے۔ بلکہ حقیقت میں یہاں علامہ بغویؒ پر اعتراض پورا نہیں ہوتا، مگر اس صورت کہ جب وہ حدیث کو زوائد کے ساتھ حسان روایات کے ذیل میں ذکر کرتے۔ پس زیادہ اچھی توجیہ یہاں یہ ہے کہ شیخ کا مسلم کی حدیث کو صحاح میں ذکر نہ کرنا یہ نسیان پر محمول ہے۔ ان کی شان میں یہ بات بھی نہ کہی جائے کہ انہوں نے اولیٰ کو ترک کیا ہے جیسا کہ یہ بات مخفی نہیں ہے۔

کانوں کے مسح کا حکم

۴۱۶: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ ذَكَرَ وُضُوْءَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ وَكَانَ يَمْسَحُ الْمَاقَيْنِ وَقَالَ الْاُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ (رواه ابن ماجة وابوداود والترمذی) وَذَكَرَا قَالَ حَمَّادٌ لَا اَدْرِیْ الْاُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ مِنْ قَوْلِ اَبِیْ اُمَامَةَ اَمْ مِنْ قَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ.

أخرجه النسائی فی السنن ۱/۸۸حدیث ۱۴۰۔وأخرجه ابن ماجة ۱/۱۴۶حدیث ۴۲۲وأبو داؤد مطولًا ۱/۹۴ حدیث رقم وأحمد فی المسند ۲/۱۸۰۔

ترجمه: "حضرت امامہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے وضو کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ آپ ﷺ آنکھ کے دونوں کناروں کو بھی ملا کرتے تھے اور فرمایا کہ دونوں کان بھی سر میں داخل ہیں اس حدیث کو امام ابن ماجہ امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ حماد راوی نے کہا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ اَلْاُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ کا جملہ ابوامامہ کا قول ہے یا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔ اس حدیث میں مسح اذنین

کا حکم بیان کیا گیا ہے کہ اذنین مسح رأس کے ساتھ مسلّم ہوگا۔''

راویٔ حدیث:

ابوامامۃ الانصاری: یہ ''ابوامامہ سعد'' ہیں سہل بن حنیف انصاری اوسی کے بیٹے ہیں۔ یہ اپنی کنیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے دوسال قبل پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی ان کا نام ان کے نانا ''سعد بن زرارہ'' کے نام پر اوران کی کنیت ان کی کنیت پر تجویز فرمادی تھی۔ یہ بوجہ کم عمری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ نہیں سن سکے۔ اسی لئے بعضوں نے ان کا ذکر صحابہ کے بعد والے لوگوں میں کیا ہیں اور ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو منجملہ صحابہ ثابت کر کے فرمایا ہے کہ وہ مدینہ میں بڑے تابعین کے بڑے علماء میں سے تھے۔ ان سے مروی احادیث کو مراسیل صحابی کہا جائے گا۔ ان کی احادیث کے مقبول ہونے پر محدثین کا اتفاق ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں ابوامامہ سے مراد ابوامامہ باہلی ہوں ان کے حالات ماقبل میں گزر چکے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے جلد اول حدیث: ۳۰۔ اپنے والد اور ابوسعید وغیرہما سے انہوں نے احادیث سنیں اور ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ہیں۔ ۱۰۰ھ میں وفات ہوئی اور آپ کی عمر ۹۲ سال ہوئی۔

تشریح: **ذکر وضوء رسول الله:** آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضوء کے کچھ احوال ذکر کرنے کے بعد۔

قال: یہ ذُکِر سے بدل ہے ای ابو امامة۔

یمسح الماقین: یہ ماق کا تثنیہ ہے مأق، میم کے فتحہ اور ہمزہ کے سکون کے ساتھ ہے اور ہمزہ میں تخفیف بھی جائز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو ملا کرتے تھے۔ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ مأق آنکھ کا وہ کنارہ جو ناک سے ملا ہوا ہو۔ ابوعبید ہرویؒ کا یہ قول ہے اور علامہ جوہری کی کتاب میں ہے کہ وہ حصہ جو ناک اور کان سے ملا ہو اور مشہور لغت موق ہے اور طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ ان دونوں طرفوں کا مسح کرنا اور صاف کرنا یہ وضو کے اندر استحباب پر محمول ہے۔ اسباغ الوضوء میں مبالغہ کے طور پر اس لئے کہ آنکھ میں اکثر ہی کچھ نہ کچھ پڑ جاتا ہے جیسے تنکا وغیرہ جس کی وجہ سے سرمہ یا آنکھ کا پانی نکل آتا ہے اور وہ بہہ کر آنکھ کے کنارے پر جم جاتا ہے اور دونوں طرف کے کناروں کو صاف کرنا یہ زیادہ احتیاط پر مبنی ہے اس لئے کہ علت دونوں میں مشترک ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں شاید کہ (ماقین) تثنیہ ذکر کرنے میں اسی نکتے کی طرف اشارہ ہو۔

وقال: یہ آنے والا جملہ موقوف اور مرفوع دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔

الاذنان من الراس: ابن الملکؒ نے مصابیح کی شرح میں فرمایا ہے: **قال ای ابو امامة وقال علیه الصلاة و السلام الاذنان من الراس** اور بعض نے کہا ہے یہ حضرت ابوامامہ کا قول ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی اسناد درست نہیں ہے اور دار قطنیؒ نے فرمایا ہے اس کو مرفوع کہنا وہم ہے صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے۔ سید جمال الدینؒ نے صاحب تخریج سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

وذکرا: ای ابو داؤد، والترمذی اسی وجہ سے مصنف نے ابن ماجہ کو خلافِ عادت مقدم کیا ہے۔

من قول ابی امامة: یعنی موقوف روایت ہے۔

ام قول رسول الله: یعنی مرفوع روایت ہے۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ حماد کو جوتر دُد یہاں پیدا ہوا وہ اس احتمال کی وجہ سے ہے کہ وَقَالَ کی عبارت جو حدیث میں ہے یا تو اس کا عطف ہو رہا ہے کَانَ پر، پس اس صورت میں یہ حضور ﷺ کا کلام ہے یعنی آپ ﷺ (چہرے کو) دھوتے تھے اور آنکھوں کے کھڑ وَں کو ملتے تھے اور پانی کو کانوں تک نہیں پہنچاتے تھے اور فرمایا کہ کان تو سر کا حصہ اس کے مسح کے وقت ان پر بھی مسح کیا جائے گا اور یا اس احتمال کی وجہ سے کہ یہ (وقال) عطف ہو قَالَ پر یعنی قِیلَ پر (کیونکہ قال ذکر سے بدل ہے تو قال ،قِیلَ کے معنی میں ہوگا) پس اس صورت میں کَانَ یمسح........والا قول حضرت ابوامامہؓ کا ہوگا۔ یعنی راوی کہہ رہا ہے کہ حضرت ابوامامہؓ نے ذکر کیا ہے **کان رسول الله ﷺ یغسل الوجه ویمسح الماقین وقال انهما من الراس۔**

(ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ اے مخاطب تو اس بات سے باخبر ہوگا کہ **الاذنان من الراس** جیسا کلام یہ بطور رائے کے نہیں ہوسکتا، پس یہ موقوف بھی مرفوع کے حکم میں ہوگا۔

اور شرح السنۃ میں مذکور ہے کہ اس بات میں اختلاف ہے کہ کیا کانوں کیلئے نیا پانی لیا جائے گا۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ یہ دونوں علیحدہ عضو ہیں ان کو تین مرتبہ تین نئے پانیوں سے مسح کیا جائے گا۔

اور اکثر علماء فرماتے ہیں کہ کان سر کا حصہ ہیں، ایک ہی پانی کے ساتھ دونوں کا مسح کیا جائے گا اور یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالکؒ اور امام احمد حنبلؒ کا مذہب ہے ابن الملکؒ نے اسی طرح اس بات کو ضبط کیا ہے اور زہریؒ نے فرمایا ہے کہ کان چہرے کا حصہ ہیں ان کو چہرے کے دھونے وقت مسح کیا جائے گا اور شعبیؒ نے فرمایا ہے کہ کان کا ظاہری حصہ وہ سر میں سے ہے اور باطنی حصہ وہ چہرے میں سے ہیں اور حمادؒ نے فرمایا ہے کہ کانوں کے ظاہر اور باطن دونوں کو دھویا جائے گا اور اسحاقؒ نے فرمایا ہے کہ پسندیدہ مذہب یہ ہے کہ کانوں کے اگلے حصوں کو چہرے کے ساتھ مسح کیا جائے اور پچھلے حصوں کو سر کے ساتھ مسح کیا جائے گا۔

وضو میں حد سے تجاوز ظلم ہے

۴۱۷: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ جَآءَ اَعْرَابِيٌّ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ يَسْأَلُهٗ عَنِ الْوُضُوْءِ فَاَرَاهُ ثَلَاثًا ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا الْوُضُوْءُ فَمَنْ زَادَ عَلٰى هٰذَا فَقَدْ اَسَآءَ وَتَعَدّٰى وَظَلَمَ .

(رواه النسائي وابن ماجة وروى ابو داود معناه)

أخرجه النسائي في السنن ۱/۸۸حديث ۱۴۰۔وأخرجه ابن ماجة ۱/۱۴۶حديث ۴۲۲وأبو داؤد مطولًا ۱/۹۴حديث رقم وأحمد في المسند ۲/۱۸۰۔

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ایک دیہاتی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے وضو کے متعلق سوال کیا پھر آپ ﷺ نے اعضاء وضو کو تین تین مرتبہ دھو کر دکھلایا اور فرمایا کامل وضو اس طرح ہے لہٰذا جس آدمی نے اس پر زیادتی کی اس نے برا کیا تعدی اور ظلم کیا۔ اس حدیث کو امام نسائی اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور امام ابوداؤد نے بھی اسی کے ہم معنی روایت نقل کی

ہے۔"

تشریح: عن جده : یعنی عبداللہ بن عمرو بن العاص، اوراس میں پہلے بحث گزر چکی ہے۔

یساله : یہ جاء کے فاعل سے حال واقع ہے جیسا کہ علامہ طیبیؒ اورابھریؒ نے ذکر کیا ہے اورابن حجرؒ نے یہاں عجیب بات کی ہے کہ یہ اعرابی (جو فاعل ہے) اس کی صفت ہے۔

فاراه : یعنی بالفعل دکھلایا اس لئے کہ فعل قول سے ابلغ (واضح) ہوتا ہے۔فعل کے ضبط کے قریب ہونے کی وجہ سے اوردل میں اس کے اثر انداز ہونے کی وجہ سے اوراس لئے بھی کہ حدیث میں آیا ہے: **لیس الخبر کالمعاینة** کہ مشاہدہ وہ خبر کی طرح نہیں ہوتا اور کلام میں حذف ہوا ہے،عبارت مقدرہ یوں ہے : **فاراد ان یریه ماساله فتوضا وغسل الاعضاء (ثلاثا۔ثلاثا)**۔

اساء : یعنی سنت کو چھوڑ کراس نے بُرا کیا۔

وظلم : یعنی اپنے نفس پر نبی پاک ﷺ کی مخالفت کر کے ظلم کیا۔یا اس لئے کہ اس نے اپنے نفس کو تین بار سے زائد پر تھکایا کہ جس پراس کو ثواب حاصل نہ ہوگا یا اس لئے کہ اس نے پانی کو بغیر کسی فائدے کے ضائع کیا۔ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ حضور ﷺ نے ان تین کلمات کے ساتھ مذمت کی،سزا کی سختی کا اظہار کرنے کیلئے اوراس بات سے اس کو روکنے کیلئے۔

امام حافظ الدین نسفیؒ نے فرمایا ہے یہ وعید اس صورت میں ہے کہ جب تین مرتبہ سے زائد کا اعتقاد رکھے کہ سنت یہ ہے۔باقی اگر شک کی وجہ سے دِل کے اطمینان کیلئے تین بار سے زیادہ مرتبہ کیا یا دوسرے وضوء کی نسبت سے زیادتی کی تو کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کہ حضور ﷺ نے اس چیز کو چھوڑنے کا حکم دیا جو شک میں ڈالے اس بات کی طرف کہ جو شک میں نہ ڈالے۔

(ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ حافظ الدین نسفیؒ کا یہ کہنا کہ شک کی وجہ سے اطمینانِ قلب کیلئے زیادتی کرسکتا ہے یہ بات محل تامل ہے کیونکہ تین بار کے بعد شک کی کوئی وجہ نہیں بنتی اوراگر تین بار کے بعد شک ہورہا ہے تو پھراس کی کوئی انتہاء نہیں ہوگی یہ تو وسوسہ ہے اسی وجہ سے ابن المبارکؒ نے اس حدیث کے ظاہر کو لیتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ مجھے تین مرتبہ سے زیادہ وضو کرنے والے کے گناہ گار ہونے کا خطرہ ہے۔

اورامام احمدؒ واسحٰق نے فرمایا ہے کہ تین پر کوئی زیادتی نہ کرے مگر وہ آدمی جو کہ جنون وغیرہ میں مبتلا ہو کیونکہ اس میں یہ شبہ ہے کہ وہ زیادتی دین میں احتیاط کی وجہ سے کرتا ہو۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ہم نے ایسے وسوسے والے بھی دیکھے ہیں کہ ان میں سے بعض ہاتھ کو سوسو مرتبہ دھوتا ہے،لیکن اس کے باوجود وہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اس کا حدث وہ یقینی طور پر باقی ہے۔

اور باقی **او بنیة وضوء اخر** کی توجیہ تو اس میں یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ وضو کے بعد کوئی عبادت کرنے سے پہلے وضوء کی تجدید مستحب نہیں ہے اور نیز تجدیدِ وضوء وہ وضو کے کرنے کے بعد ہی ممکن ہے نہ کہ وضوء کے درمیان اور باقی حافظ الدین نسفیؒ کا یہ کہنا کہ حضور ﷺ نے حکم دیا کہ شک کو چھوڑنے کا........تو اس میں محل تامل یہ بات ہے کہ دوسری مرتبہ (نئے سرے سے) دھونا یہ ان چیزوں میں سے ہے جو اس کو شک میں ڈال رہی ہے لہٰذا (حدیث کی روح) سے اس شک کو چھوڑنا مناسب ہے اس

بات کی طرح کہ جس میں شک نہیں اور غیر مشکوک ہے وہ کہ جس کو شارع علیہ السلام نے متعین کیا ہے تا کہ اس کی جان شک و وسوسہ سے خلاصی حاصل کرے۔ واللہ اعلم

اور بعض نے کہا ہے کہ (تین بار سے زیادہ کرکے) اس نے بے ادبی کی ہے مبالغہ کرنے میں غفلت برتتے ہوئے کیونکہ زیادتی کرنا یہ اس چیز کو کم سمجھنا ہے کہ جس کو شریعت نے کامل قرار دیا ہے اور اس سرحد و حدود سے تجاوز کرنا ہے کہ جس کو شریعت نے مقرر کیا ہے اور جس کو تکمیل کی انتہاء قرار دیا ہے اس سے آگے بڑھنا ہے اور پانی کو ضائع کرنے اور جہاں اس کو خرچ نہ کرنا تھا وہاں خرچ کر کے اس نے ظلم کیا ہے۔

ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ میں اس آدمی سے کہ جو تین بار سے آگے بڑھ جائے گناہ گار ہونے سے امن میں نہیں ہوں اور احمد و اسحقؒ نے فرمایا ہے کہ تین کے عدد پر زیادتی نہ کرے مگر وہ آدمی جو جنون اور وسوسہ میں مبتلا ہے۔

وروی ابو داؤد معناہ: ۔میرک شاہؒ نے فرمایا ہے صاحب تخریج سے نقل کرتے ہوئے کہ ابوداؤدؒ نے اس سے زیادہ لمبی روایت بیان کی ہے اور اس پر خاموشی اختیار کی ہے۔

وضو اور دعا میں تجاوز نہ کرو

۴۱۸: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْمُغَفَّلِ اَنَّهٗ سَمِعَ ابْنَهٗ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ الْقَصْرَ الْاَبْيَضَ عَنْ يَمِيْنِ الْجَنَّةِ قَالَ اَیْ بُنَیَّ سَلِ اللّٰهَ الْجَنَّةَ وَتَعَوَّذْ بِهٖ مِنَ النَّارِ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اِنَّهٗ سَيَكُوْنُ فِیْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ قَوْمٌ يَّعْتَدُوْنَ فِی الطُّهُوْرِ وَالدُّعَآءِ. (رواہ احمد وابوداود وابن ماجۃ)

أخرجه أحمد فی المسند ٤/٨٧ وأخرجه أبو داوٗد فی السنن ١/٧٣ حديث رقم ٩٦ وأخرجه ابن ماجة مقتصرًا على الدعاء ٢/١٢٧١ حديث رقم ٣٨٦٤۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن مغفل سے روایت ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا۔ اے اللہ میں تجھ سے جنت کی دائیں طرف سفید محل کا سوال کرتا ہوں تو انہوں نے کہا۔ اے میرے بیٹے تم اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرو اور دوزخ کی آگ سے پناہ مانگو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ عنقریب اس امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو وضو اور دعاء میں حد سے تجاوز کریں گے۔ اس حدیث کو امام احمدؒ امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔"

تشریح: عبد اللہ بن المغفل: مغفل، میم کے ضمہ، غین کے فتحہ اور فاء کی شد اور فتحہ کے ساتھ منقول ہے۔ کازرونیؒ نے فرمایا ہے کہ محدثین کبھی اس کو عین اور قاف کے ساتھ روایت کرتے ہیں اور کبھی بغیر الف لام کے اور کبھی فاء کے ساتھ اس بات کا گمان کرتے ہوئے کہ لام تعریف فاء والے نسخہ اور غیر فاء والے نسخے میں فرق کرنے والا ہے اور مصابیح کی تمام روایات میں جو اس طریقے سے ہے وہ (غین اور فاء مشددہ) کے ساتھ ہے اور باقی عین اور قاف کے ساتھ تو یہ نام صحابہ میں نہیں ہے بلکہ تابعین میں ہے اور ان کے حالات پہلے گزر چکے ہیں اور ابن حجر عسقلانیؒ نے فرمایا ہے کہ ان کے والد صحابی رسول ہیں۔

اَیْ : یہ ہمزہ کے فتحہ اور یاء کے سکون کے ساتھ حرف ندا ہے کہ جس کے ذریعے قریبی آدمی کو بلایا جاتا ہے۔

بني : یہ ابن، کی تصغیر ہے جو یاء متکلم کی طرف مضاف ہے اور یٰ (یاء) مفتوح اور مکسور دونوں طرح ہو سکتی ہے۔

سل الله الجنة : سلْ یہ سَالَ یَسال جو الف کے ساتھ ہے اس سے امر کا صیغہ ہے یا یہ مہموز میں سے امر کا صیغہ ہے تو اس میں نقل ہوا ہے۔

تعوذ به من النار : بعض نے کہا ہے کہ اس میں خاتمے کے خبر اور ایمان کے ساتھ ہونے کی درخواست کی طرف رہنمائی ہے اور یہی ڈرنے والوں کی آخری درجہ ہے۔

يعتدون : دال کی تخفیف کے ساتھ یعنی جو حد شرعی سے تجاوز کرتے ہیں۔

في الطهور : یہ ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ ہے۔

والدعاء : علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ صحابی رسول نے اپنے بیٹے کے اس عمل کو ناپسند سمجھا اس دعا میں اس لئے کہ اس نے ایسی چیز کی خواہش کی ہے کہ جہاں تک اس کا عمل نہیں پہنچا ہے اور اس نے انبیاء اور اولیاء کے منازل کا سوال کیا ہے اور ایسے سوال کو دعاء میں حد سے تجاوز کرنا شمار کیا، کیونکہ اس میں ادب کی حد سے تجاوز ہے اور دعاء کرنے والے کا اپنے آپ کو کمال کی آنکھ سے دیکھنا ہے (جو صحیح نہیں) اور بعض نے کہا ہے کہ اس نے ایسی معین چیز کا سوال کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس کو کسی دوسرے کیلئے مقدر کیا گیا ہو اور دعا میں تجاوز کرنا وہ بہت ساری وجوہ سے ہوتا ہے اور اصل اس میں یہ ہے کہ آدمی محتاجگی کی جگہ سے بے تکلفی اور کشادگی کی طرف تجاوز کر جاتا ہے اور خاص طور پر اپنے حق میں افراط و تفریط میں سے کسی ایک جانب کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور اسی طرح اپنے علاوہ میں بھی کہ جب اس کے لئے دعا کرے یا بددعا کرے۔

اور پاکی حاصل کرنے میں حد سے بڑھنا یہ ہے کہ پانی ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا اور پاکی حاصل کرنے میں ایسا مبالغہ کرنا کہ جو وساوس تک پہنچا دے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ معنی اس وقت مناسب ہے کہ جب طہور، طاء کے ضمہ کے ساتھ مروی ہو۔ تاکہ پانی کے استعمال کرنے میں تجاوز کرنے کو اور مقررہ حد سے زیادتی کرنے کو شامل ہو جائے۔

ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ طہور میں ضمہ متعین نہیں ہے اس لئے کہ طہور میں فتحہ کے ساتھ بھی ایک لغت ہے بلکہ فتحہ کے ساتھ یہ زیادہ واضح ہے معنی کے افادہ میں کیونکہ اس وقت تقدیر عبارت یہ ہوگی **استعمال ما يطهر به**۔

ابوداؤدؒ اس پر خاموش رہے ہیں۔

میرک شاہؒ نے اس کو نقل کیا۔

میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ ابن ماجہ کی روایت میں فی الطهور کا لفظ نہیں ہے۔ ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ اس باب میں پھر ابن ماجہ کی روایت شاہد نہیں بنے گی، پس بہتر یہ تھا کہ مصنفؒ ابن ماجہ کی روایت کرنے کا ذکر نہ کرتے۔

وضو کا شیطان ولہان ہے

۴۱۹: وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اِنَّ لِلْوُضُوْءِ شَيْطَانًا يُّقَالُ لَهُ الْوَلَهَانُ فَاتَّقُوْا وَسْوَاسَ

الْمَآءِ (رواه الترمذی وابن ماجة وقال الترمذی هذاحديث غريب) وَلَيْسَ اِسْنَادُهٗ بِالْقَوِيِّ عِنْدَ اَهْلِ الْحَدِيْثِ لِاَنَّا لَا نَعْلَمُ اَحَدًا اَسْنَدَهٗ غَيْرُ خَارِجَةَ وَهُوَ لَيْسَ بِالْقَوِيِّ عِنْدَ اَصْحَابِنَا۔

أخرجه الترمذی فی السنن ۸٤/۱ حديث ۵۷ وقال حديث غريب اسناده ليس بالقوی وأخرجه ابن ماجة ۱٤٦/۱ حديث رقم ٤۲۱۔وأحمد فی المسند ۱۳٦/۵۔

ترجمہ: ''حضرت ابی بن کعبؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا وضو کا ایک شیطان ہے جسے ولھان کہا جاتا ہے لہٰذا پانی کے وسوسہ سے بچو۔ اس حدیث کو امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔''

اسنادی حیثیت: اور امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اور محدثین کے نزدیک اس کی اسناد قوی نہیں ہیں کہ خارجہ کے علاوہ کسی اور نے بھی اس کی سند بیان کی ہو اور خارجہ ہمارے محدثین کے نزدیک قوی نہیں ہے۔

تشریح: **ان للوضوء** :یعنی وضوء میں وسوسہ ڈالنے کے لئے۔

شیطانا :یہ خصوصی طور پر اس کام کیلئے ہے۔

الولھان :واؤ اور لام کے فتحہ کے ساتھ یہ **وله يوله ولهانا** کا مصدر ہے اور اس کا معنی ہے کہ بہت زیادہ غمگین ہونا کہ عقل زائل ہونے کے قریب ہو جائے اور شدت غم یا شدت عشق کی وجہ سے متحیر ہونا۔ پس وضوء کے شیطان کو ولہان سے موسوم کیا گیا ، یا تو اس لئے کہ وہ وضوء کے اندر وسوسہ کے طلب کرنے میں حریص ہوتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ لوگوں کو وسوسے کے ذریعے مقام حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ یہاں تک آدمی حیران وششدر اور زائل العقل ہو جاتا ہے وہ نہیں جانتا کہ شیطان کیسے اس کے ساتھ کھیل رہا ہے اور اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کیا پانی عضوء تک پہنچا ہے یا نہیں؟ اور عضو کو کتنی مرتبہ دھویا ہے؟ پس یہ وَلھان اسم فاعل کے معنی میں ہوگا یا اپنی مصدریت ہی پر باقی رہے گا مبالغہ کی وجہ سے جیسے :**رجل عدل**۔

وسواس الماء :علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے **ای وسواسه** یعنی اس کے اس وسوسے سے بچو کہ پانی اعضاء وضو تک پہنچا ہے یا نہیں؟ اور کیا ایک مرتبہ دھویا ہے یا دو مرتبہ اور کیا وہ پانی طاہر ہے یا نجس ہے؟ یا قلتین کو پہنچا ہے یا نہیں؟ ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ ابن حجرؒ نے بھی علامہ طیبیؒ کی متابعت کی ہے یعنی **وسواس الولھان الماء** تو **الماء** کو ضمیر کی جگہ میں رکھا گیا اس کے پانی کے بارے میں کمال وسوسہ ڈالنے میں مبالغہ کیلئے یا شدت ملازمت کی وجہ سے (کیونکہ اکثر وساوس پانی ہی کے متعلق ہیں)۔

وليس اسناده بالقوی عند اهل الحديث :یعنی اگر چہ اس کی اسناد کے رجال فقہاء کے ہاں عادل ہوں۔

لانا لا نعلم احدا :یہ غریب ہونے کی علت ہے۔

غير خارجة :یعنی خارجۃ بن مصعب بن خارجہ۔ علامہ ذھبیؒ میزان الاعتدال میں رقمطراز ہیں کہ یہ انتہائی کمزور راوی ہے اور مغنی میں ہے کہ اس کو دار قطنیؒ وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ میرک شاہؒ نے اس کو نقل کیا۔

ليس بالقوی :اور ایک نسخہ میں **ليس بقوی** ہے۔

عند اصحابنا :یعنی محدثین، علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ ابن المبارکؒ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ سید جمال الدین محدثؒ نے اس کو نقل کیا ہے اور میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے اور اس روایت کو

حسنؓ سے بعض دوسرے طریق سے مروی ہے اور اس باب میں مرفوع حدیث صحیح نہیں ہے۔

وضو کے بعد تولیہ استعمال کرنا

۴۲۰:وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِذَا تَوَضَّأَ مَسَحَ وَجْهَهٗ بِطَرَفِ ثَوْبِهٖ.

(رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۷۵ حديث رقم ٥٤ ـوقال حديث غريب اسناده ضعيف ـ

ترجمه:''حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا جب آپ وضو کرتے تو اپنے کپڑے کے کنارے سے اپنا چہرہ صاف کر لیتے اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح:**بطرف ثوبه** : ای ردائه ابن حجرؒ فرماتے ہیں یہ روایت اگر صحیح ہو تو یہ اس روایت کی طرح ہے جو اس کے بعد والی روایت ہے پس یہ محمول ہوگا اس پر کہ یہ عذر کی وجہ سے ہے یا بیان جواز کیلئے ہے اس لئے کہ حضرت میمونہؓ ایک مرتبہ وضوء کے بعد تولیہ لے کر آئیں تو آپ ﷺ نے اس کو واپس کر دیا اور آپ ﷺ ہاتھوں سے پانی جھاڑ رہے تھے، اور اسی وجہ سے ہمارے اصحاب نے فرمایا ہے کہ وضوء و غسل کرنے والے کے لئے اس کی اتباع کرتے ہوئے تولیے کا استعمال مسنون ہے۔

اور زیلعی کی کنیز کی شرح میں ہے کہ وضوء کے بعد تولیے سے پونچھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ حضرت عثمانؓ اور انسؓ اور حسنؓ بن علی اور مسروقؒ سے منقول ہے۔

اور معراج الدرایہ میں ہے کہ مگر وہ آدمی مبالغہ نہ کرے، پس وضوء کا پانی اعضاء وضوء پر باقی رہے۔ صاحب منیہ نے تولیے سے پونچھنے کے استحباب کی تصریح کی ہے اور ممکن ہے کہ حضور ﷺ کا واپس کرنا کسی عذر کی وجہ سے ہو یا بیان جواز کیلئے ہو۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی اسناد ضعیف ہے۔

رسول اللہ ﷺ ایک کپڑے کے ساتھ اعضاء وضو کو خشک کرتے تھے

۴۲۱ :وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ خِرْقَةٌ يُنَشِّفُ بِهَا اَعْضَاءَهٗ بَعْدَ الْوُضُوْءِ .

(رواه الترمذی وقال هذاحديث ليس بِالقَائِمِ وابو معاذٍ الرَّاوِىُّ ضَعِيفٌ عِنْدَ اَهْلِ الحديث)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۷٤حديث رقم ٥٣ـ وقال ليس بالقائم ـ

ترجمه:''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے ایک کپڑا تھا جس کے ساتھ وضو کرنے کے بعد اعضاء وضو کو خشک کرتے تھے۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے اور اس کا راوی ابو معاذ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔''

اسنادی حیثیت: امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے کیونکہ اس کے ایک راوی ابو معاذ ائمہ حدیث کے نزدیک ضعیف ہیں۔

تشریح: **ینشف** :تفعیل سے معروف کا صیغہ ہے یا تخفیف کے ساتھ **یعلم** کی طرح ہے۔

بھا :ای **اعضاء ہ** جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے۔

بعد الوضوء :بولا جاتا ہے **نشفت الارض الماء تنشفه شربته** یعنی زمین نے پانی جذب کر لیا اور اسی طرح **نشف الثوب العرق ینشفه** کپڑے کا پسینہ کو جذب کر لینا اور اسی سے حدیث بھی ہے یعنی تولیے کے ساتھ وضوء کے پانی کو پونچھتے ۔نہایہ میں اسی طرح ہے اور عباب اور قاموس میں ہے کہ النشف یہ **عَلِمَ** سے ہے اور کہا جاتا ہے: **نشفت الماء تنشیفا** یعنی جب رومال یا کپڑے سے پانی کو صاف کرے اور ازھار میں ہے کہ علماء نے فرمایا ہے کہ تنشیف کا چھوڑنا مستحب ہے اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہ وضوء کے پانی کو صاف نہیں کرتے تھے اور اس لئے بھی کہ وضوء کا پانی وہ نور ہوگا قیامت کے دن اور اگر صاف بھی کر دے تو مکروہ نہیں ہے اور یہی مذہب ابن ابی یعلی کا ہے اس لئے کہ یہ عبادت کے اثر کو زائل کرتا ہے جیسا کہ مسواک روزہ دار کیلئے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اس لئے ہے کہ پانی جب تک اعضاء پر رہے وہ تسبیح کرتا رہتا ہے۔ ابھریؒ نے یہی ذکر کیا ہے۔

ان مذکورہ باتوں میں سے بعض محل تامل ہیں اس لئے کہ مثبت روایت نافی پر مقدم ہوگی اور وضوء کا پانی نور ہے اس کو پونچھا جائے یا نہ پونچھا جائے اس لئے کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جو وضوء میں استعمال کیا گیا ہے۔ نہ کہ وہ جو عضو پر باقی ہو اور کراہت کا یہاں کوئی معنی نہیں ہے، جب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کیا ہے اگر چہ کہ ایک مرتبہ ہی کیا ہو۔

اور ابن ابی یعلیٰ کی جواب وہ باب الصوم میں آئے گا اور وضوء کے پانی کا پونچھنے کے بعد تسبیح نہ کرنا یہ صحیح نقل کا محتاج ہے۔

ابو معاذ الراوی :یہ سلیمان بن ارقم ہیں۔ سید جمال الدین محدثؒ نے یہ بات کہی ہے۔

صعیف عند اھل الحدیث :اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ اس باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت صحیح نہیں ہے اور تحقیق صحابہ میں سے ایک جماعت نے اور اسی طرح تابعین میں سے ایک جماعت نے وضوء کے بعد پونچھنے کی رخصت دی ہے اور یہ ان کی اپنی طرف سے ہے یعنی ذاتی رائے ہے۔ سید جمال الدین محدثؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) **من قبل انفسھم صدر من قبل نفسه** کہ امام ترمذیؒ کا یہ کہنا کہ یہ ان کی طرف سے ہے یہ بھی امام ترمذیؒ کی اپنی ذاتی رائے ہے، اس لئے کہ حضرت عثمانؓ، انسؓ، حسنؓ بن علی جیسے حضرات کی شان میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس طرح کی بات اپنی طرف سے کریں بلکہ ان کا فعل وہ دلالت کرتا ہے کہ حدیث کیلئے اس بارے میں کوئی اصل ہے اور حدیث پر عمل کرنا اگر چہ وہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو وہ رائے پر عمل کرنے سے بہتر ہے اگر چہ رائے مضبوط ہی کیوں نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

الفصل الثالث:

۴۲۲: وَعَنْ ثَابِتِ ابْنِ اَبِی صَفِیَّةَ قَالَ قُلْتُ لِاَبِیْ جَعْفَرٍ هُوَ مُحَمَّدُ الْبَاقِرُ حَدَّثَكَ جَابِرٌ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم تَوَضَّأَ مَرَّةً مَرَّةً وَمَرَّتَیْنِ مَرَّتَیْنِ وَثَلَاثًا ثَلَاثًا قَالَ نَعَمْ . (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

أخرجه الترمذي في السنن ۱/ ٦٥ حديث رقم ٤٥ ـ وابن ماجة ۱/ ۱٤۳ حديث رقم ٤۱۰ ـ

ترجمہ: ''حضرت ثابت بن ابی صفیہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جعفر صادق کے والد سے جن کا نام محمد باقر ہے کہا کہ آپ سے حضرت جابرؓ نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے کبھی ایک ایک مرتبہ کبھی دو دو مرتبہ اور کبھی تین تین مرتبہ وضو کیا انہوں نے جواب دیا ہاں (جابرؓ نے یہ حدیث بیان کی ہے)۔ اس حدیث کو امام ترمذی اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

ثابت بن ابی صفیہ: یہ ثابت ''ابوصفیہ'' کے بیٹے ہیں۔ ان کی کنیت ''ابوحمزہ'' ہے اور کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ یمانی ہیں' ازد سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے محمد بن علی الباقر سے حدیث کو سنا ہے اور وکیع اور ابن عیینہ نے ان سے روایت حدیث کی ہے۔ میرک کا کہنا ہے کہ یہ ضعیف ہیں' رافضی ہیں۔ ان کی وفات ۲۴۸ھ میں واقع ہوئی ہے۔

تشریح: قال نعم: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ محدثین کرام کی یہ عادت ہے کہ قاری ان کے سامنے یعنی شیخ کے سامنے اسناد کو بلند کرنے کیلئے یوں کہتا ہے: حدثك فلان عن فلان وہ شیخ خاموشی سے اس کی تقریر کرتا رہتا ہے (یہ اسی طرح ہے) جیسا کہ شیخ یوں کہے حدثني فلان عن فلان اور طالب علم سنتا رہے۔

علامہ طیبیؒ کی مزید وضاحت ابن حجرؒ کے قول سے یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ روایت کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ شاگرد شیخ کے لئے کہے: حدثك فلان عن فلان كذا اور شیخ سن رہا ہو، پس جب فارغ ہو جائے تو وہ کہے نعم۔ پس یہ شیخ کے اس قول کی طرح ہے حدثني فلان .... اور شاگرد اس حال میں خاموش ہو۔ یعنی سن رہا ہو۔

اسنادی حیثیت: اس کی سند حسن ہے۔

اعضاءِ وضو کو دو دو مرتبہ دھونا نور علی نور ہے

۴۲۳: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ وَقَالَ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ۔

رواه رزين وفيه مقال۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن زیدؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اعضاءِ وضو کو دو دو مرتبہ دھویا اور پھر فرمایا یہ نور علی نور ہے۔''

تشریح: هو نور على نور: ابہریؒ نے فرمایا ہے یہ آیت: ﴿نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ کی طرف اشارہ ہے اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے یہ: ان امتي غر محجلون من آثار الوضوء...... کی طرف اشارہ ہے۔ یا نور علی نور سے ہدایت پر ہدایت مراد ہے، یا سنت فرض پر مراد ہے۔

باقی الوضوء علی الوضوء نور علی نور کی حدیث تو علامہ عراقی نے فرمایا ہے تخریج الاحیاء میں کہ میں اس پر مطلع نہیں ہوا

اور ابن حجر عسقلانیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث ضعیف ہے رزینؒ نے اس کو اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔

سابقہ انبیاء علیہم السلام کا وضو

۴۲۴: وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ ثَلَاثًا ثَلَاثًا وَقَالَ هٰذَا وُضُوْئِيْ وَوُضُوْءُ الْاَنْبِيَآءِ قَبْلِيْ وَوُضُوْءُ اِبْرَاهِيْمَ۔ (رواهُمَا رزين والنووى ضَعَّفَ الثَّانِيْ فِيْ شَرْحِ مسلم)

رواه رزين وفيه مقال۔

ترجمہ: ''حضرت عثمانؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعضاء وضو کو تین تین مرتبہ دھویا اور فرمایا یہ میرا اور مجھ سے پہلے رسولوں کا وضو ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وضو ہے ان دونوں حدیثوں کو رزین نے روایت کیا ہے اور علامہ نووی نے شرح مسلم میں دوسری حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔''

تشریح: توضا: یعنی اعضاء وضو کو دھویا۔

ووضو الانبياء قبلي: یعنی انبیاء کا وضوء ہے نہ کہ ان کی امم کا یا امم انبیاء کے وضو کے تابع ہیں۔

ووضو البراهيم: یہ تخصیص بعد التعمیم ہے۔

والنووی: نووی مد اور بغیر دونوں طرح صحیح ہے۔

ضعف الثانی: یعنی حضرت عثمان کی روایت کو۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ امام نوویؒ کے علاوہ باقی حضرات کا یہ کہنا ہے کہ اس کی سند حسن ہے اور تحقیق طبرانی اور ابن ماجہ نے ابی بن کعبؓ سے اور احمد اور دارقطنیؒ نے ابن عمر سے اس روایت کی تخریج کی ہے۔ بخاری اور بعض دوسری کتابوں میں صحت سے یہ بات منقول ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور سارۃ نے وضو کیا اور نماز پڑھی اور جریج نے وضو کیا اور نماز پڑھی۔ یہ روایات اس بات میں بالکل واضح ہیں کہ وضوء اس اُمت کے خصائص میں سے نہیں ہے، بعض نے اس سے اختلاف کیا۔ ہاں البتہ غرۃ اور تحجیل (ہاتھ پاؤں اور پیشانی کا چمکدار ہونا) وہ اس اُمت کے ساتھ خاص ہے۔ (ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) ظاہر یہ ہے کہ امم سابقہ کا وضوء وہ انبیاء کے وضوء کے علاوہ ہو ورنہ غرۃ اور تحجیل کا اختصاص اس اُمت کے ساتھ پورا نہیں ہوگا۔ کیونکہ اصل غرۃ اور تحجیل پر وضوء کرنے والے کو حاصل ہوگی اور ان کا کمال بھی اُمت کے افراد میں سے ہر فرد کے لئے ثابت ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لئے وضو کرتے تھے

۴۲۵: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّأُ لِكُلِّ صَلَاةٍ وَكَانَ اَحَدُنَا يَكْفِيْهِ الْوُضُوْءُ مَالَمْ يُحْدِثْ۔ (رواه الدارمی)

أخرجه البخاری فی الصحيح ۱/۳۱۵ حديث رقم ۲۱۴۔ وأبوداوٗد بالمعنى ۱/۱۲۰ حديث رقم ۱۷۱ والنسائی فی السنن ۱/۸۵ حديث ۱۳۱۔ وأخرجه الترمذی ۱/۸۸ رقم ۶۰ وقال حسن صحيح وابن ماجة ۱/۱۷۰ حديث رقم ۵۰۹

وأخرجه الدارمی ۱/ ۱۹۸ حدیث رقم ۷۲۰۔ وأحمد فی المسند ۳/ ۱۳۲۔

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر فرض نماز کے لئے وضو کیا کرتے تھے اور ہمیں ایک ہی وضو کافی ہوتا تھا جب تک کہ حدث نہ ہو جائے اس حدیث کو امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **لکل صلوٰۃ** :یعنی فرض نماز اور ترمذی کی روایت میں **طاهرًا اوْ غیر طاهر**۔ میرکؒ نے یہ بات فرمائی ہے۔

مالم یحدث :یہ **احداث** سے ہے اور اس حدیث شریف میں اس بات کو بتلانا مقصود ہے (کہ ابتدائے اسلام میں) وضوء آپ ﷺ پر واجب تھا پھر یہ منسوخ ہو گیا دلیل آنے والی حدیث ہے

علامہ سخاویؒ نے کہا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ صرف آپ ﷺ پر ہی خاص طور پر واجب ہو پھر فتح مکہ میں یہ منسوخ ہو گیا۔ دلیل حضرت بریدہؓ کی وہ روایت ہے جس کی تخریج مسلمؒ نے کی ہے: **انه علیه الصلوٰة والسلام صلی الصلوات یوم الفتح بوضوء واحد وان عمر ساله فقال عمدا ضعته** ۔ اور نیز یہ بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ بطور استحباب کے ایسا کرتے تھے پھر جب آپ ﷺ کو اس کے واجب ہونے کا اندیشہ ہوا تو بیان جواز کیلئے اس کو ترک کر دیا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں میرے نزدیک یہ توجیہ زیادہ قریب ہے اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ نسخ کی توجیہ کی صورت میں نسخ وہ فتح مکہ سے پہلے ماننا پڑے گا۔ حضرت سوید بن النعمان کی حدیث اس پر دلیل ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ غزوہ خیبر میں تھے (کہ جب آپ ﷺ نے ایک وضوء سے دوسری نماز اداء کی) جو کہ فتح مکہ سے کچھ ایام پہلے ہوا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ سوید بن النعمان کی روایت اس کتاب میں **باب مایوجب الوضوء** کے تحت میں گزر چکی ہے اس میں غور کر لو۔ شیخ محی الدینؒ نے فرمایا ہے کہ نسخ کی دلیل وہ روایت بھی ہے کہ جو ابوداؤد اور مسند احمد میں عبیداللہ بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب کے طریق سے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسماء بنت زید بن خطاب نے عبداللہ بن عمر ؓ سے نقل کیا ہے اور انہوں نے عبداللہ بن حنظلہ انصاری سے کہ حضور ﷺ کو وہ نماز کے وقت وضوء کرنے کا حکم دیا گیا، آپ ﷺ چاہے طاہر ہوتے یا غیر طاہر، پس جب یہ آپ ﷺ پر بوجھل ہوا تو اللہ نے تخفیف کر دی کہ وضو صرف حدث کی صورت میں ہے۔ واللہ اعلم۔ میرکؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

وضو لکل صلوٰۃ کا حکم منسوخ ہے

۴۲۶: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيَى بْنِ حَبَّانَ قَالَ قُلْتُ لِعُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَأَيْتُ وُضُوْءَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ لِكُلِّ صَلَاةٍ طَاهِرًا كَانَ اَوْ غَيْرَ طَاهِرٍ عَمَّنْ اَخَذَهٗ فَقَالَ حَدَّثَتْهُ اَسْمَآءُ بِنْتُ زَيْدِ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ حَنْظَلَةَ بْنِ اَبِیْ عَامِرِ الْغَسِيْلِ حَدَّثَهَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اُمِرَ بِالْوُضُوْءِ لِكُلِّ صَلَاةٍ طَاهِرًا كَانَ اَوْغَيْرَ طَاهِرٍ فَلَمَّا شَقَّ ذٰلِكَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُمِرَ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ وَوُضِعَ عَنْهُ الْوُضُوْءُ اِلَّا مِنْ حَدَثٍ قَالَ فَكَانَ

عَبْدُاللّٰهِ يَرٰى اَنَّ بِهٖ قُوَّةً عَلٰى ذٰلِكَ فَفَعَلَهٗ حَتّٰى مَاتَ. (رواه احمد)

أخرجه أحمد في المسند ٥/٢٢٥ ـ وأخرجه أبو داوٗد في السنن ١/٤١ حديث رقم ٤٨ ـ

ترجمہ: ''حضرت محمد بن یحییٰ بن حبان سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ سے کہا کہ مجھے یہ بتائیے کیا حضرت عبداللہ بن عمرؓ وضو لکل صلوٰۃ کیا کرتے تھے چاہے وہ باوضو ہوں یا بے وضو ہوں اور انہوں نے یہ عمل کس سے حاصل کیا تھا۔ حضرت عبداللہ نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت اسماء بنت زید بن خطاب نے یہ حدیث بیان کی کہ حضرت عبداللہ بن حنظلہ ابی عامر الغسیل نے ان سے یہ حدیث بیان کی کہ سرکار دو عالم رسول اللہ ﷺ کو وضو لکل صلوٰۃ کا حکم دیا گیا تھا۔ چاہے آپ باوضو ہوں یا بے وضو ہوں۔ جب آپ کے لئے یہ مشکل ہوا تو پھر ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیا گیا اور وضو لکل صلوٰۃ کو منسوخ کر دیا گیا کہ اب وضو صرف حدث ہو جانے کی صورت میں کیا جائے گا حضرت عبیداللہ نے فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ گمان تھا کہ ان میں ہر نماز کے لئے جدید وضو کرنے کی طاقت ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسی پر عمل کیا اپنی موت تک۔ اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

محمد بن یحییٰ۔ یہ ''محمد'' ہیں۔ ''یحییٰ بن حبان'' کے بیٹے ہیں۔ کنیت ''ابوعبداللہ'' ہے۔ انصار میں سے ہیں۔ ابن عمرؓ، انس بن مالک اور اپنے چچا واسع بن حبان رضی اللہ عنہم سے حدیث کی سماعت کی ہے۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔ مالک بن انس رضی اللہ عنہ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے، اور ان کے زہد، عبادت فقہ علم کے متعلق ہر قسم کے بہت سے فضائل کا ذکر کرتے تھے۔ مدینہ طیبہ میں بعمر ۷۴ سال ۱۲۱ھ میں انتقال فرمایا۔ حبان میں حاء مہملہ مفتوح اور باء (ایک نقطہ والی) مشدد ہے۔

تشریح: محمد بن يحيى بن حبان: حبان حاء کے فتحہ اور کسرہ اور باء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ تابعی ہیں اور انصاری ہیں انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور اپنے چچا واسع بن حبان سے روایت سنی ہے اور اس کی تائید مغنی اور ابن حجرؒ کی مشکوٰۃ کی شرح کے کلام سے بھی ہوتی ہے اور صاحب مشکوٰۃؒ نے اسماء الرجال میں ان کے حالات میں یہ لکھا ہے کہ ان کی کنیت ابوعبداللہ انصاری ہے اور یہ مالک بن انس کے شیخ ہیں اور وہ ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور حبان حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس بات کی تائید ابن حجر عسقلانی کی تحریر المشتبہ میں اس کو نقل کرنے سے ہوتی ہے۔

عمن اخذه: اَرَایت کے معنی سے یہ جار متعلق ہے ای خبرنی عمن اخذه اور ضمیر اسم اشارہ کے معنی میں ہے اور مشار الیہ وہ مخصوص وضوء ہے۔

حدثته: یعنی عبداللہ بن عمر کو اور یہ بھی احتمال ہے کہ عبیداللہ کی طرف ضمیر لوٹے، غور کر لو۔ سیدؒ نے یہ بات کہی ہے۔

میرک شاہؒ نے فرمایا ہے یہ روایت معنی کے اعتبار سے ہے نہ کہ لفظ کے اعتبار، کیونکہ اگر روایت باللفظ ہوتی تو یوں کہتے: حدثتنی اور اس کی مثال اللہ تعالیٰ کی اس ارشاد میں ہے: ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ

الْمِهَادُ﴾ [آل عمران: ۱۲] ”(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم!) کافروں سے کہہ دو کہ تم (دنیا میں بھی) عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے اور (آخرت میں) جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ بری جگہ ہے“ یہاں ستغلبون اور تحشرون تاء اور یاء دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے اگر سیغلبون اور یحشرون ہو تو یہ بعینہٖ ان الفاظ کا اداء کرنا ہے کہ جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور اگر ستغلبون اور تحشرون تاء کے ساتھ ہو تو یہاں الفاظ کے معنٰی کو اداء کرنا ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے نہ کہ وہی لفظ پس قائل فقال حدثته میں وہی ہے کہ جس سے آرایتَ کے ذریعے سوال کیا گیا ہے۔

بنت زید بن الخطاب: یہ حضرت عمرؓ کے بھائی ہیں۔

ان عبد اللہ: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ ان کی عمر حضور ﷺ کی وفات کے وقت ۷ سال تھی انہوں نے حضور ﷺ کو دیکھا بھی اور روایت بھی سنی یہ انصار میں بڑے جید نیک عالم شمار ہوتے تھے اور مدینہ میں ان کے ہاتھ پر بیعت کی گئی یزید بن معاویہ کی امارت کو چھوڑ کر پس اسی وجہ سے یوم الحرہ حرہ کی لڑائی میں قتل کئے گئے۔

ابن حنظلة بن ابی عامر الغسیل: **الغسیل**، یہ مجرور ہے اور حنظلۃ کی صفت ہے حضرت عروہؓ سے روایت ہے کہ آپ علیہ السلام نے حضرت حنظلہ کی بیوی سے دریافت فرمایا کہ حنظلہ کسی حال میں تھے فرمانے لگیں کہ وہ جنبی تھے اور میں نے ان کی ایک طرف کو ابھی دھویا تھا کہ انہوں نے گھبراہٹ والی پکار کو سنا تو فوراً نکل گئے، پس اُحد میں شہید ہو گئے، پس حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا میں نے ملائکہ کو دیکھا کہ وہ حضرت حنظلہ کو غسل دے رہے ہیں۔ علامہ طیبیؒ نے اس کو ذکر کیا ہے۔

بالسواك عند كل صلوة: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ حدیث میں مسواک کی شان کی بلندی پر باخبر کرنا ہے کہ یہ واجب کے قائم مقام بنی ہے اور شاید کہ یہ آپ ﷺ پر واجب ہو۔

الا من حدث: حدث حقیقی ہو یا حکمی۔

یرٰی: یاء کے فتحہ کے ساتھ اور ضمہ کے ساتھ یظن کے معنٰی میں ہے۔

ان به قوه علی ذلك: یعنی حضور ﷺ کے فعل جیسی ان میں طاقت واستطاعت ہے۔

میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ اس کو ابو داؤد نے بھی روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔ شیخ زین الدین العراقیؒ فرماتے ہیں اس کی اسناد میں محمد بن اسحٰق ہے اس نے اس کو عَنْ سے روایت کیا ہے اور وہ مدلس ہے۔

وضو اور غسل میں پانی کا اسراف جائز نہیں

۴۲۷: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِسَعْدٍ وَهُوَ يَتَوَضَّأُ فَقَالَ مَا هٰذَا السَّرَفُ يَاسَعْدُ قَالَ اَفِي الْوُضُوْءِ سَرَفٌ قَالَ نَعَمْ وَاِنْ كُنْتَ عَلٰى نَهْرٍ جَارٍ۔

(رواه احمد وابن ماجة)

أخرجه أحمد في المسند ۲/ ۲۲۱۔ وابن ماجة ۱/ ۱۴۷ حدیث رقم ۴۲۵۔

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کا گزر حضرت

سعدؓ کے پاس سے ہوا اور وہ وضو کر رہے تھے اور وضو میں اسراف کر رہے تھے آپ ﷺ نے یہ دیکھ کر اشارہ فرمایا۔ اے سعد یہ اسراف کیوں کر رہے ہو۔ حضرت سعدؓ نے ارشاد فرمایا کیا وضو میں بھی اسراف ہوتا ہے؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا ہاں! اگر چہ تم جاری نہر پر بھی وضو کر رہے ہو۔ اس حدیث کو امام احمد اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: بسعد :یعنی سعد بن ابی وقاص۔

وهو يتوضا :یہ جملہ حالیہ ہے یعنی وہ وضوء میں اسراف کر رہے تھے یا تو فعلاً جیسے تین سے زیادہ مرتبہ دھونا یا مقداراً جیسے کہ ضرورت سے زیادہ پانی کا استعمال کرنا۔

ماهذا السرف :سَرَف دو فتحوں کیا ساتھ ہے۔

يا سعد :آپ ﷺ نے ان کو ڈانٹنے کیلئے ایسے خطاب فرمایا، یا ان کو اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ اسراف یہ بعید و ناپسندیدہ شمار کیا جاتا ہے، یا یہ خطاب قریب کرنے اور نرمی کرنے کے لئے تھا یہ توجیہ زیادہ قریب ہے اور صحابی کے جواب کے بھی زیادہ مناسب ہے۔

اوفي الوضوء سرف :یہ اس بناء پر ہے کہ جو بعض نے کہا ہے کہ نہیں ہے خیر اسراف میں اور نہیں ہے اسراف خیر میں، پس حضرت سعدؓ نے یہ سمجھا کہ عبادت وطاعت میں اسراف نہیں ہے۔

قال نعم :یعنی اسراف ہے۔

نهر، ھاء کے فتحہ اور سکون کے ساتھ ہے۔

جار : کیونکہ اس میں وقت کا اسراف ہے اور عمر کا ضائع کرنا ہے۔ یا حد شرعی سے تجاوز کرنا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے **وان كنت على نهر جار** یہ مبالغے کے مراد لینے کی تکمیل ہے یعنی آپ ﷺ نے فرمایا ہاں یہ فضول خرچی اور اسراف ہے اس چیز (نہر) میں کہ جس میں تبذیر متصور نہیں ہوئی، پس جو تو کر رہا ہے اس میں کیا حالت ہوگی اور یہ بھی احتمال ہے کہ اسراف سے مراد گناہ ہو۔

اسنادی حیثیت :اس کی سند حسن ہے۔

وضو میں تسمیہ پڑھنے کی فضیلت

۴۲۸ :وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَابْنِ مَسْعُوْدٍ وَابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ تَوَضَّأَ وَذَكَرَ اسْمَ اللّٰهِ فَاِنَّهٗ یُطَهِّرُ جَسَدَهٗ كُلَّهٗ وَمَنْ تَوَضَّأَ وَلَمْ یَذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ لَمْ یُطَهِّرْ اِلَّا مَوْضِعَ الْوُضُوْءِ. (رواهما الدارقطني)

أخرجه الدارقطني ۱/ ۷٤ حديث رقم ۱۲ من باب التسمية على الوضوء۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے وضو کیا اور بسم اللہ پڑھی۔ تو اس نے اپنا تمام جسم گناہوں سے پاک کر لیا اور جس نے وضو

کے شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھی تو اس نے صرف اعضاءِ وضو کو پاک کیا۔"

تشریح: وعن ابی هریرة وابن مسعود وابن عمر :ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ عنہما یہاں تقدیم کے حقدار تھے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ذکر پر اور شاید کہ حدیث باللفظ ہو۔

عن النبی :اور ایک نسخہ میں ان النبی ہے۔

فانه يطهر :یہ تطہیر سے معروف کا صیغہ ہے۔

كله :یہ جسد کی تاکید ہے اور ایک نسخہ میں يطهر لينصر کی طرح ہے اس صورت میں جسده اور كله مرفوع ہوں گے۔

إلا مواقع الوضوء :یعنی وضوء کی مخصوص جگہوں کے گناہ، مراد صغائر ہیں۔

وضو میں انگشتری کو حرکت دینے کا مسئلہ

۴۲۹: وَعَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا تَوَضَّأَ وُضُوْءَ الصَّلَاةِ حَرَّكَ خَاتَمَهٗ فِیْ اِصْبَعِهٖ۔ (رواهما الدارقطنی وروى ابن ماجة الاخير)

أخرجه الدارقطنی فی السنن ۱/۸۳ باب صفة وضوء رسول الله ا ۔ وفيه راويان ضعيفان وقال الدارقطنی لا يصح هذا۔ وأخرجه ابن ماجة ۱/ ۱۵۳ حديث رقم ۴۴۹ ۔

ترجمہ: "حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لئے وضو کرتے تھے تو انگوٹھی کو بھی حرکت دیتے تھے۔ ان دونوں حدیثوں کو امام دارقطنی نے روایت کیا ہے اور امام ابن ماجہ نے صرف دوسری حدیث کو نقل کیا ہے۔"

تشریح: كان النبی :اور ایک نسخہ میں رسول اللہ ہے۔

اذا توضا وضوء الصلاة :الصلاة کی قید سے وضو لغوی یعنی ہاتھ وغیرہ کے دھونے سے احتراز مقصود ہے۔

حرك خاتمة : خاتم فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ مروی ہے۔

فی اصبعه: ہمزہ کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور قاموس میں ہمزہ اور باء کے اندر تینوں حرکات منقول ہیں۔ انگوٹھی کو حرکت دینا اس لئے تھا کہ وضوء میں اعضاء کا دھونا علی الاستعاب فرض ہے۔ لہٰذا انگوٹھی کو (ہاتھوں کے دھوتے وقت) حرکت دینا مسنون ہوگا، یہ مسنون ہونا اس وقت ہے کہ جب پانی پہنچنے کا غالب گمان ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر اس کو حرکت دینا واجب ہے۔

اسنادی حیثیت :ان کی سند حسن ہے۔

بَابُ الْغُسْلِ

نہانے کا بیان

الغسل ضمہ کے ساتھ اس کا معنی ہے مخصوص غسل اور فتحہ کے ساتھ یہ مصدر ہے اور کسرہ کے ساتھ وہ چیز کہ جس کے ساتھ دھویا جائے اور بعض نے کہا ہے کہ ضمہ اور فتحہ کے ساتھ یہ مصدر ہے اور بعض نے کہا ہے کہ غُسل بضم الغین وہ فعل اور ماء غسل کے درمیان مشترک ہے۔

اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ غسل، لغت میں بدن پر پانی کے بہنے کو کہتے ہیں اور شریعت میں عمومیت کے طریقے سے بدن پر پانی کا بہنا نیت کے ساتھ یہ معنی واضح نہیں ہے۔ اس لئے کہ لغت میں یہ سیلان (بہنے) اور اسالۃ (بہانے) سے اعم ہے۔ ہاں البتہ زیادہ سے زیادہ اس میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیلان سے مراد اعم ہو یعنی خود بہے یا کوئی بہائے لیکن اس کے باوجود اس کی بدن کے ساتھ تخصیص کرنا اس کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی، پھر شریعت میں اس کو نیت، کے ساتھ مقید کرنا یہ ابن حجرؒ کے مذہب کے مطابق صحیح ہے یا تمام کے مطابق ہے جب کہ اس کو کمال کیلئے قید بنایا جائے۔

الفصل الاول:

اکسال سے غسل واجب ہو جاتا ہے

۴۳۰: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جَلَسَ اَحَدُكُمْ بَيْنَ شُعَبِهَا الْاَرْبَعِ ثُمَّ جَهَدَهَا فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ وَاِنْ لَّمْ يُنْزِلْ . (متفق عليه)

البخاری فی صحیحه مختصرًا ۱/۳۹۵ حدیث رقم ۲۹۱ ومسلم فی صحیحه ۱/۲۷۱ حدیث رقم (۸۷-۳۴۸) والنسائی فی السنن ۱/۱۱۰ حدیث رقم ۱۹۱ وابن ماجة فی السنن ۱/۲۰۰ حدیث رقم ۶۱۰ والدارمی فی السنن ۱/۲۱۴ حدیث ۷۶۱ حدیث ۷۶۱۔ وأخرجه أحمد فی المسند ۲/۳۴۷۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی آدمی عورت کی چار شاخوں کے درمیان بیٹھ جائے اور پھر جماع کرے۔ تو اس پر غسل واجب اور ضروری ہے اگر چہ اس کو انزال نہ ہو۔ (بخاری و مسلم)''

تشریح: اذا جلس : ای احدکم جیسا کہ ایک صحیح نسخہ میں مذکور ہے۔

الاربع : یعنی عورت کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے دونوں پاؤں اور اس کی شرمگاہ کے دونوں کنارے اور دوسرا راجح ہے کیونکہ یہ تشریح جماع کی تمام ہیئتوں کو شامل ہے، بخلاف اول کے کیونکہ پہلے مطلب میں

چت لیٹنے کی ہیئت کی تخصیص کا وہم ہوتا ہے اور اس لئے بھی کہ ہاتھوں اور پاؤں کو ذکر کرنے میں کسی قسم کی کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ پس اگر یہ مراد بھی ہوں تو یہ بھی بعید نہیں ہے، بخلاف فرج کے کناروں کے کہ ان کا ذکر کرنا تو قبیح سمجھا جاتا ہے اسی لئے ان کو شعَبْ سے کنایہ لیا ہے۔ ابن حجرؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ لیکن ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ دوسرا مطلب جماع کی تمام ہیئتوں کو شامل ہے یہ محل بحث ہے اس لئے کہ جلوس کی قید اس کو قبول نہیں کرتی الاّ یہ کہ اس کو جلوس کی تمام ہیئات کے ساتھ مقید کیا جائے تو پھر صحیح ہے۔

اور بعض نے کہا کہ **شعَبُ** سے مراد اس کی رانیں اور سرین ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد اس کے ہاتھ اور شرمگاہ کے کنارے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ دونوں پاؤں اور رانیں ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ دونوں رانیں اور شرگاہ کے کنارے مراد ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس کی شرمگاہ کی چاروں طرفیں اور **شعَب** سے مراد اطراف و جوانب ہیں اور یہ **شعبة** کی جمع ہے۔

ثم جهدها : یعنی اس کے ساتھ جماع کرے اس طرح کہ ذَکر کے سر (حشفہ) کو اس کی شرمگاہ میں داخل کر دے۔ **جَهد** فتحہ کے ساتھ، نکاح کے ناموں میں سے ہے اور **جَهد** کہتے ہیں مقصود تک پہنچنے میں پوری کوشش و مبالغہ کرنا۔ اس لئے کہ جماع اسی کا متقاضی ہوتا ہے اور اس بات کو ذکر کرنے سے حیاء کی وجہ سے اس کو کنایتاً بیان کیا۔ ابن حجرؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

ابن حجرؒ کی بات میں یہ گزرا کہ **جَهد** فتحہ کے ساتھ نکاح کے اسماء میں سے ہے تو جب یہ نکاح کے اسماء میں سے تو یہ کنایہ نہ ہوگا، پس بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ **جَهد** کی طرف اُس سے عدول کیا کیونکہ اس معنیٰ میں یہ مشہور نہیں ہے۔ پس یہ کنایہ کی طرح ہوگا نہ کہ بصورت تصریح، پھر اصل مدار اس پر ہے (یعنی جماع میں کوشش کرنا) باقی جو اس سے پہلے بتلایا کہ **اذا جلس..** تو وہ بطور قید واقعی و اکثری کے ہے۔

وان لم ینزل : اور اسی طرح عورت کو بھی انزال اگرچہ نہ ہو۔

قاضیؒ نے فرمایا ہے کہ دخول کے ساتھ غسل کے واجب ہونے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ جمہور صحابہ عدم غسل کی طرف گئے ہیں جب تک انزال نہ ہو اور یہی اعمشؒ کا مذہب بھی ہے اور داؤد ظاہری کا بھی اور ان کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد **الماء من الماء** ہے۔ یہ عرف کے اعتبار سے حصر کا فائدہ دیتا ہے اور اس بات کو رد کیا گیا ہے کہ یہ منسوخ ہے۔ حضرت ابی بن کعبؓ کے قول سے فرماتے ہیں کہ منی ہی سے غسل کا حکم وہ اسلام کے شروع زمانے میں تھا پھر اس حکم کو چھوڑ دیا گیا اس حکم کے ساتھ کہ جب مرد کی شرمگاہ عورت کی شرمگاہ سے مل جائے تو غسل کیا جائے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کی وجہ سے کہ جب ان سے اس مسئلہ میں حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے سوال کیا تو انہوں نے یہ روایت نقل کی : **اذا جلس بین شعبها الاربع ومس الختان الختان واجب الغسل**۔

اور **مس الختان** .... کا معنی ہے کہ وہ اس کے مقابل ہو جائے ورنہ مسُ کی حقیقت شرط نہیں ہے اس لئے کہ یہ محاذات (مقابل ہونا) حشفہ کے فرج میں داخل کرنے کے ساتھ پائی جاتی ہے، پس اس کے علاوہ اور کوئی چیز شرط نہیں ہے اور ختان کا ذکر یہاں پر اکثریت کے اعتبار سے ہے۔

(متفق علیہ) سید جمال الدینؒ نے کہا ہے یہ متفق علیہ کہنا اس بات کو چاہتا ہے کہ **وان لم ینزل** کا جملہ متفق علیہ ہے حالانکہ یہ بخاری میں نہیں ہے۔ابن حجرؒ نے بخاری کی شرح میں اس پر تنبیہ کی ہے اور شرف الدین ابواسحٰق سلمی نے مصابیح کی تخریج میں اور اس جملہ کی صحیحین کی طرف نسبت کرنے میں ابن الاثیر نے سبقت کی ہے اور ظاہر یہی لگتا ہے کہ مؤلفؒ نے بھی ان پر اعتماد کر کے یہ نسبت کی ہے یا بخاری کے حاشیہ میں عبارت دیکھی تو یہ وہم ہوا کہ یہ متن کا حصہ ہے۔واللہ اعلم

احتلام سے غسل واجب ہوتا ہے یا نہیں

۴۳۱:وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الْمَآءُ مِنَ الْمَآءِ (رواہ مُسْلِمٌ قَالَ الشَّیْخُ الْاِمَامُ مُحیُّ السُّنَّةِ رَحِمَهُ اللّٰهُ هٰذَا مَنْسُوْخٌ۔

أخرجه مسلم فی الصحیح ۲۶۹/۱حدیث رقم (۸۰ـ۳۴۳)۔ وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱۴۸/۱حدیث رقم ۲۱۷والترمذی تعلیقاً ۱۸۶/۱ضمن حدیث رقم ۱۲۲۔ وأحمد فی مسنده ۲۹/۳۔

ترجمہ:''حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔پانی' پانی سے ہے (یعنی منی کے خروج سے غسل واجب ہوتا ہے)اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے اور حضرت امام محی السنۃؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہے۔''

تشریح:**انما الماء** :یعنی پانی کے استعمال کا واجب ہونا مراد غسل ہے۔

من الماء :یعنی کود کر نکلنے والے پانی کی وجہ سے اور وہ منی ہے۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ دونوں ماءین میں سے ایک سے مراد منی ہے اور دوسرے سے وہ چیز کہ جس کے ذریعے غسل کرے اور ان دونوں میں الف لام عہد ذہنی کیلئے ہے۔

منسوخ :یعنی حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کے ساتھ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے ساتھ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

۴۳۲ :وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اِنَّمَا الْمَاءُ مِنَ الْمَآءِ فِی الْاِحْتِلَامِ ۔ (رواہ الترمذی وَلَمْ اَجِدْهُ فِی الصَّحِیْحَیْنِ)

ترجمہ:''اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ **الْمَاءُ مِنَ الْمَآءِ** کا حکم احتلام کے متعلق ہے۔اس حدیث کو حضرت امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔''

اسنادی حیثیت : ہمیں یہ روایت بخاری و مسلم میں نہیں ملی۔

تشریح: **انماء الماء فی الاحتلام** :یعنی یہ حدیث اس پر محمول ہے۔پس بے شک جس آدمی نے نیند میں اپنے آپ کو جماع کرتے دیکھا پھر بیدار ہوا اور منی کو دیکھا تو اس پر غسل واجب ہے ورنہ اگر نہ دیکھا تو غسل واجب نہیں ہے۔علامہ طیبیؒ نے فرمایا۔مطلب یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث احتلام کے بارے میں وارد ہے کیونکہ اس میں غسل واجب نہیں ہوتا مگر انزال کے ساتھ،نہ کہ جماع کے ساتھ(جو نیند میں دیکھا ہو) کیونکہ جماع میں غسل التقاء ختانین سے

ہوتا ہے انزال ہو یا نہ ہو۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول بطریق احتمال اور تاویل کے ہے اگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ پوری حدیث پہنچی ہوتی تو آپؓ کبھی بھی ایسی تاویل نہ کرتے اور وہ حدیث یوں ہے کہ ابوسعید خدریؓ نے فرمایا ہے کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیر والے دِن قبا کی طرف نکلا یہاں تک کہ ہم بنی سالم (کے محلّہ) میں پہنچے حضور صلی اللہ علیہ وسلم عتبان بن مالک کے دروازہ پر رُک گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زور سے آواز دی پس حضرت عتبان تہبند کھینچتے ہوئے نکلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (لگتا ہے) ہم نے آدمی کو جلدی میں ڈال دیا، تو حضرت عتبانؓ نے کہا اے اللہ کے رسول آپ اس آدمی کے متعلق مجھے بتلایئے کہ جو عورت سے جلدی جدا ہو جائے اور ابھی انزال نہ ہو تو اس پر کیا واجب ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **انما الماء من الماء** کہ پانی (غسل) پانی (منی کے نکلنے) سے ہے اور یہ صحیح حدیث ہے جس کی تخریج مسلمؒ نے اپنی کتاب میں کی ہے۔

لیکن صاحب مشکوٰۃؒ کا ایسے لفظ سے ذکر کرنا جو بلاسند کے مروی ہوتا ہے وہ صاحب مشکوٰۃ کے رواہ کے ظاہر کے خلاف ہے۔ سید جمال الدین نے اسی طرح تحقیق کی ہے۔ سید جمال الدینؒ نے فرمایا ہے کہ صاحب مشکوٰۃؒ کا یہ قول: **لم اجده فی الصحیحین** گویا یہ شیخ محی السنۃ پر اعتراض ہے کہ انہوں نے صحاح کے باب میں اس روایت کو ذکر کیا ہے لیکن ان پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا اس لئے کہ جو انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے وہ مسلم کی روایت کی توجیہ کیلئے ہے یعنی: **انما الماء من الماء** والی حدیث کی، اس لئے کہ وہ (روایت مسلم) باب میں مقصود ہے۔ پس ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کا صحیحین میں موجود نہ ہونا وہ ان کے لئے مضر نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ شرط (کہ صحاح میں صرف صحیحین کی روایات ہوں) یہ مقاصد باب کے متعلق ہے اور جس آدمی نے کتاب مصابیح کو غور و تامل اور تتبع سے دیکھا ہے اس کے لئے یہ بات ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

عورت کے احتلام کا مسئلہ

۴۳۳: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ اُمُّ سُلَيْمٍ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَايَسْتَحْيِ مِنَ الْحَقِّ فَهَلْ عَلَى الْمَرْاَةِ مِنْ غُسْلٍ اِذَا احْتَلَمَتْ قَالَ نَعَمْ اِذَارَاَتِ الْمَآءَ فَغَطَّتْ اُمُّ سَلَمَةَ وَجْهَهَا وَقَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَوَتَحْتَلِمُ الْمَرْاَةُ قَالَ نَعَمْ تَرِبَتْ يَمِيْنُكِ فَبِمَ يُشْبِهُهَا وَلَدُهَا. (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲۲۶/۱حدیث رقم۱۳۰۔وأخرجه مسلم فی الصحیح ۲۵۱/۱حدیث (۳۲۔۳۱۳) وأخرجه فی السنن ۱۱۵/۱حدیث رقم ۱۹۷۔وأخرجه ماجة فی السنن ۱۹۷/۱حدیث رقم ۶۰۰ وفیه بعض الزیادات۔

ترجمہ: ''حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ حضرت ام سلیمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ حق بات کو بیان کرنے سے شرم نہیں کرتا۔ لہٰذا یہ مسئلہ بتایئے کہ اگر عورت کو احتلام ہو جائے تو کیا اس پر غسل واجب ہے آپ نے فرمایا ہاں۔ احتلام کی صورت میں عورت پر غسل واجب ہے جب کہ وہ رطوبت یعنی منی دیکھ لے۔ یہ سن کہ حضرت ام سلمہؓ نے اپنا چہرہ شرم وحیاء کی وجہ سے ڈھانپ لیا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا عورت کو

بھی احتلام ہوتا ہے یعنی کیا مرد کی طرح عورت سے بھی منی خارج ہوتی ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہاں خاک آلود ہو جائے تیرا دایاں ہاتھ اگر اس طرح نہ ہوتا پھر اس کا بچہ اس کے مشابہ نہ ہوتا۔"

راویٔ حدیث:

ام سلیم۔ یہ ام سلیم ملحان کی بیٹی ہیں۔ان کے نام میں اختلاف ہے۔باقوال مختلفہ سہلہ اور عملہ اور ملیکہ وغمیصاء اور رمیصاء بیان کیا گیا ہے۔مالک بن نضر' انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے والد نے ان سے نکاح کیا' انہی کے بطن سے حضرت انس رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ پھر یہ مالک بن نضر بحالت کفر قتل کر دیئے گئے' اس کے بعد یہ اسلام لے آئیں۔ ابوطلحہ نے جب یہ مشرک تھے ان کو پیغام نکاح ڈالا تو انہوں نے انکار کر دیا' اور ان کو اسلام کی دعوت دی' ابوطلحہ اسلام لے آئے تو انہوں نے کہا کہ میں اب تم سے شادی کرتی ہوں اور تم سے مہر تمہارے اسلام کی وجہ سے کچھ نہیں لوں گی' ابوطلحہ نے ان سے شادی کر لی۔ ان سے ایک بڑی جماعت روایت کرتی ہیں ملحان کسرہ'' میم'' سکون'' لام'' اور حاء مہملہ کے ساتھ ہے۔ان سے ایک بڑی جماعت روایت کرتی ہے۔

تشریح: لا يستحي :اصل میں دو، یاؤں کے ساتھ ہے حاء کے سکون کے بعد اور جائز نہیں ہے حدیث کی تفسیر کرنا جب روایت ثابت ہو چکی ہے اگر چہ دوسری لغت میں آیا ہے۔ **لا يستحي** (حاء کے کسرہ اس کے بعد ایک یاء پہلی یاء کی حرکت کو ماقبل حاء کو دینا اور دوسری یاء کو التقاء ساکنین کی وجہ سے حذف کرنے) کے ساتھ۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے یاء اولیٰ کا حذف کرنا جو عین فعل کے مقابلہ میں ہے تخفیفاً جائز ہے۔ پھر ابن حجرؒ کا یہ قول کہ اسم فاعل **مستحيي** میں جائز ہے کہ وہ **مستحيي** مستفل کے وزن پر ہو اور **مستحي** **مسفح** کے وزن پر اور **مستح** **مستف** کے وزن پر ہو۔صحیح نہیں ہے اس لئے کہ پہلی یاء کے ساتھ تعلق جائز نہیں ہے جیسا کہ **قاضي** تنوین کے ساتھ یاء کی صورت میں نہیں پڑھا جاتا، ہاں اصل مستحيي کی (جو مستفع کے وزن پر ہے) مستحيي بوزن مستفعل ہے نہ یہ کہ اس میں تین لغات ہیں۔اس ساری تفصیل میں اس مقام کے اندر سوائے طوالتِ کلام کے اور کوئی فائدہ نہیں ہے۔

من الحق: اى بيانه اور اللہ تعالیٰ نہیں چھوڑتے حق کے بیان کرنے کو جیسے ہم حیاء کی وجہ سے چھوڑ دیتے ہیں، یہ بات اُم سلیمؓ نے بطور معذرت کہی اپنی اس بات کی صراحتاً ذکر کرنے کی وجہ سے جو انہوں نے حضور ﷺ کی موجودگی میں کہی۔ جیسا کہ عورتوں کی فطرت انہیں ایسی بات کسی اور کے سامنے کرنے کی اجازت نہیں دیتی، کیونکہ اس میں عورت کی منی کے نکلنے سے باخبر ہونا ہے جو اس کی مردوں کی طرف شہوت کی شدت پر دلالت کرنے والی ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے ہمارے لئے کہ حق کے بیان کرنے سے شرم نہیں کی جائے گی اور حضرت اِم سلیمؓ کا سوال بھی حق ہی کے متعلق ہے کہ جس کی طرف سخت ضرورت پیش آتی ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے بہترین عورتیں انصار کی عورتیں ہیں کہ شرم وحیاء ان کے لئے دین میں سمجھ حاصل کرنے کے واسطے رکاوٹ نہیں بنتی۔اس روایت کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔مراد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ ہے کہ میں بھی حق کے متعلق سوال کرنے سے شرم محسوس نہیں کرتی۔

فهل على المرءة من غسل :مِنْ ، کی زیادتی یہاں تاکید کیلئے ہے اى نوع من الغسل اور ایک نسخہ میں غسل

ہے۔

اذا احتلمت : یعنی منی کو اپنے کپڑے اور بدن میں دیکھے بیدار ہونے کے بعد اور اسی کے معنی میں ہمارے نزدیک مذی بھی ہے۔

ام سلمة وجهها : اُم سلیمؓ کے سوال سے شرم محسوس کرتے ہوئے۔ امام زہریؒ نے فرمایا ہے کہ **فغطت** کے بارے میں بعض نے کہا ہے کہ زینب کا کلام ہے جو ام سلمہؓ سے نقل کرنے والی ہیں۔ پس یہ حدیث مدرج ہوگی۔

اور بعض نے کہا ہے یہ ام سلمہ کا ہی کلام ہے لیکن یہاں انہوں نے التفات سے کام لیا ہے گویا کہ اپنی جان سے ایک اور جان تصور کر کے اس کی طرف تغطیہ کی نسبت کی ہے۔

وتحتلم : واؤ کے ساتھ۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ مصابیح کے بعض نسخوں میں ہمزہ کے ساتھ ہے اور صحیحین اور حمیدی کی کتاب اور جامع الاصول میں بغیر ہمزہ کے ہے۔

المراء ة ؟ : یعنی کیا عورت کیلئے منی ہوتی ہے اور وہ بھی مرد کی طرح نکلتی ہے۔

یہاں ابن حجرؒ نے ایک عجیب بات کہی ہے، غیر صحیح نسخہ پر اعتماد کرتے ہوئے جو مشکوٰۃ کا نسخہ ان کے پاس ہوگا جس میں روایت ہمزہ کے ساتھ ہے۔ پس کہا ہے : **ای اتقول ذلك وتحتلم المرء ة ؟** پھر مصنف پر یوں اعتراض کیا ہے کہ مصنف (صاحب مشکوٰۃ) نے ہمزہ کے ذکر کرنے میں صاحب مصابیح کی متابعت کی ہے حالانکہ صحیحین وغیرہ میں ہمزہ کے حذف کے ساتھ ہے اور یہ اعتراض یا تو قابل اعتبار اصل نسخہ کے نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے یا کسی حافظ (حدیث) سے سننے کے سبب اور یا ایسے نسخہ سے تصحیح کرنے کی وجہ سے جو بعض محدثین کے سامنے پڑھا گیا ہو۔

قال نعم ۔ تربت یمینك : **ای ما اصبت** اور یہ اصل میں کنایہ ہے۔ شدت فقر سے یا اخبار (خبر دیتا ہے) یا یہ دعا ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے **ترب الشی** کا معنی ہے کہ اس کو مٹی پہنچے (خاک آلودہ ہو) اور اس سے بددعا مراد نہیں ہوتی اور یہ بات اُم سلمہؓ کے اس بات سے محفوظ ہونے کی وجہ سے بطور تعجب کہی۔

فهم یشبهها ولدها : یعنی بعض اوقات میں اور یہ استدلال ہے اس بات پر کہ عورت کیلئے بھی مرد کی طرح منی ہے اور بچہ ان دونوں سے پیدا ہوتا ہے اس لئے کہ اگر عورت کی منی نہ ہو اور بچہ صرف مرد کی منی سے پیدا ہو تو پھر عورت کے مشابہ کیوں ہوتا ہے۔ علامہ طیبیؒ نے یہ فرمایا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ اگر عورت کیلئے منی نہ ہو تو پھر بچہ اس کے کس سبب سے مشابہ ہوتا ہے؟ اس لئے کہ مشابہت ان دونوں کے مزاج اصلی میں شرکت کی وجہ سے ہے جو مزاج اصلی خالق کائنات کی طرف سے مختلف شکلوں کے قبول کرنے کیلئے تیار کیا گیا ہے۔

۴۳۴ : **وزاد مسلم بروایة ام سلیم اِنَّ مَآءَ الرَّجُلِ غَلِیْظٌ اَبْیَضُ وَمَآءَ الْمَرْاَۃِ رَقِیْقٌ اَصْفَرُ فَمِنْ اَیِّهِمَا عَلَا اَوْ سَبَقَ یَکُوْنُ مِنْهُ الشَّبْهُ۔**

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۲۶/۱ حدیث رقم ۱۳۰ واخرجه مسلم فی الصحیح ۲۵۱/۱ حدیث (۳۲۔۳۱۳)

وأخرجه في السنن ۱/ ۱۱۵ حديث رقم ۱۹۷ ـ وأخرجه ماجة في السنن ۱/ ۱۹۷ حديث رقم ٦٠٠ وفيه بعض الزيادات۔

ترجمہ: ''اور امام مسلم نے اس حدیث میں ام سلیمؓ کی روایت کے اندر یہ الفاظ زائد نقل کیے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مرد کی منی گاڑھی اور سفید ہوتی ہے اور عورت کی منی پتلی اور زردی مائل ہوتی ہے۔ لہٰذا ان میں سے جس کی منی غالب ہو یا سبقت کر جائے تو بچہ اس کے مشابہ ہوتا ہے۔''

تشریح: **وزدا مسلم بروایة ام سلیم** :یعنی اُم سلیمؓ کی روایت، جو مسلم میں ہے اس میں زیادتی ہے اور وہ روایت یہ ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے کہا اے اللہ کے رسول عورت دیکھتی ہے خواب میں جو مرد دیکھتا ہے، پس وہ اپنے آپ پر مرد کی طرح کچھ دیکھتی ہے (یعنی منی کو) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا تو نے تو عورتوں کو رسوا کر دیا تیرا ہاتھ خاک آلودہ ہو اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: تم پر افسوس ہے کیا عورت اس کو دیکھتی ہے اور اس روایت میں یہ زیادتی بھی ہے (جو صاحب مشکوۃؒ نے ذکر کی ہے)

ان ماء الرجل :اِنّ اَنّ دونوں طرح یہاں پڑھ سکتے ہیں۔

وماء المرة :یہ منصوب ہے اور مرفوع بھی پڑھ سکتے ہیں۔

رقیق اصفر :یہ وصف اکثریت اور صحت کی حالت کے اعتبار سے ہے اس لئے کہ آدمی کی منی کبھی بیماری کے باعث پتلی ہو جاتی ہے اور جماع کی کثرت کے سبب سرخ ہو جاتی ہے اور عورت کی منی کبھی اس کی قوت کی وجہ سے سفید ہو جاتی ہے۔

فمن ایھما :ای ماء یبین منْ یہاں زائدہ ہے۔ علامہ طیبیؒ نے یہ فرمایا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ تقدیر عبارت یوں ہے **فالمنی من ایھما**۔

علا او سبق :یعنی دونوں میں جس کی منی میں ایک ساتھ رحم میں گرنے کی صورت میں غالب آ جائے یا ایک کی منی رحم کے اندر گرنے میں سبقت لے جائے دوسرے کے مقابلے میں، پس اَوْ یہاں تقسیم کے لئے تردید کے لئے نہیں۔

غسل کا سنت طریقہ

۴۳۵ :وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ بَدَأَ فَغَسَلَ يَدَيْهِ ثُمَّ يَتَوَضَّأُ كَمَا يَتَوَضَّأُ لِلصَّلَاةِ ثُمَّ يُدْخِلُ اَصَابِعَهٗ فِى الْمَآءِ فَيُخَلِّلُ بِهَا اُصُوْلَ شَعْرِهٖ ثُمَّ يَصُبُّ عَلٰى رَأْسِهٖ ثَلَاثَ غَرَفَاتٍ بِيَدِهٖ ثُمَّ يُفِيْضُ الْمَاءَ عَلٰى جِلْدِهٖ كُلِّهٖ متفق عليه وَفِى روايةٍ لِمُسْلِمٍ يَبْدَأُ فَيَغْسِلُ يَدَيْهِ قَبْلَ اَنْ يُّدْخِلَهَا الْاِنَاءَ ثُمَّ يُفْرِغُ بِيَمِيْنِهٖ عَلٰى شِمَالِهٖ فَيَغْسِلُ فَرْجَهٗ ثُمَّ يَتَوَضَّأُ۔

أخرجه البخاري في صحيحه ۱/ ۳٦٠ حديث رقم ۲٤۸ وذكر "جلده" بدل "جسده" واللفظ له۔ وأخرجه مسلم في صحيحه بحديث مطول ۱/ ۲٥۳ حديث رقم (۳٥ـ۳۱٦)۔ وأخرجه النسائي في السنن ۱/ ۱۳٤ حديث رقم ۲٤۷ ـ وأخرجه مالك في الموطأ ۱/ ٤٤ كتاب الطهارة حديث ٦۷ ـ وأخرجه نحوه أحمد في السنن ٦/ ۳۳٠۔ والرواية الثانية أخرجها

مسلم ۱/ ۲۵۳ حدیث رقم (۳۵ـ۳۱۶)۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب غسل جنابت کرتے تھے تو سب سے پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو گٹوں تک دھوتے تھے پھر وضو کرتے جس طرح نماز کے لئے وضو ہوتا ہے پھر انگلیوں کو تر کرنے کے لئے پانی میں ڈالتے۔ پھر انگلیوں کو نکال کر ان کی تری کے ساتھ بالوں کی جڑوں میں خلال کرتے۔ پھر دونوں ہاتھوں سے تین چلوں لے کر پانی کے اپنے سر پر ڈالتے اور پھر اپنے تمام جسم پر پانی بہاتے۔ (بخاری ومسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب آپ غسل شروع کرتے تو اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالتے۔ پھر اپنی شرمگاہ کو دھوتے اور پھر اس کے بعد وضو کرتے۔''

تشریح: **فغسل یدیه**: یعنی گٹوں تک ہاتھ دھوتے تین بار اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ ہاتھوں کا دھونا نیند سے بیدار ہونے کی وجہ سے تھا جیسا کہ آنے والی روایت سے معلوم ہوتا ہے اس کی کوئی وجہ (معلوم) نہیں ہوتی اس لئے کہ ہاتھوں کا شروع میں دھونا مطلقاً وضوء کی سنتوں میں سے ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ آنے والی روایت میں جو الفاظ ہیں: **ان یدخلهما الاناء** ان کی ابن حجرؒ کے دعویٰ پر دلالت بھی نہیں ہوتی اور باقی ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ جیسا کہ وضوء میں گزر چکا ہے یہ قابل رد ہے اس لئے کہ وضوء میں جو گزر چکا ہے کہ وہ عادت اکثری کے اعتبار سے ہے اور اس کے علاوہ اس بات میں یہ بھی وہم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی جنابت وہ احتلام کے باعث تھی حالانکہ طبرانیؒ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ کو کبھی بھی احتلام نہیں ہوا اور اسی طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام کو بھی۔

کما یتوضا للصلاۃ: یعنی کامل وضو۔ اگر آپ ﷺ ایسی جگہ کھڑے نہ ہوتے کہ جہاں پانی جمع ہوتا ہے ورنہ پیروں کے دھونے کو مؤخر فرما دیتے تھے جیسا کہ ابھی آئے گا اور حدیث کے ظاہر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سر کا بھی مسح کرتے تھے۔

ثم یدخل اصابعه فی الماء: تاکہ وہ تری لے لیں پھر آپ اس کو نکالتے۔

اصول شعرہ: شعر، عین کے فتحہ اور سکون کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں **اصول الشعر** ہے اور ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ڈاڑھی کے بال مراد ہیں لیکن ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ جس کے سر پر بال ہوں اس کے لئے پانی بہانے سے قبل خلال مسنون ہے۔ لیکن اس میں یہ بات ملحوظ رہے کہ خلال کرنا تو غسل کے مکملات میں سے ہے، پس **ثم یصب علی راسه** کا قول اس کے منافی ہوگا۔

کله: بایں طور کہ پانی کو دائیں طرف پر تین مرتبہ بہایا پھر تین مرتبہ بائیں طرف پر جیسا کہ دوسری روایت میں اسی طرح آیا ہے اور یہ ترتیب زیادہ صحیح ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ پہلے دونوں طرفوں پر بہاتے پھر سر پر۔

اگر غسل خانہ میں پانی جمع ہوجاتا ہو تو پاؤں آخر میں دھوئے جائیں

۴۳۶: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَتْ مَيْمُوْنَةُ وَضَعْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غُسْلًا فَسَتَرْتُهُ بِثَوْبٍ وَصَبَّ عَلٰى يَدَيْهِ فَغَسَلَهُمَا (ثُمَّ صَبَّ عَلٰى يَدَيْهِ فَغَسَلَهُمَا) ثُمَّ صَبَّ بِيَمِيْنِهٖ عَلٰى شِمَالِهٖ

فَغَسَلَ فَرْجَهٗ فَضَرَبَ بِيَدِهِ الْاَرْضَ فَمَسَحَهَا ثُمَّ غَسَلَهَا فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَغَسَلَ وَجْهَهٗ وَذِرَاعَيْهِ ثُمَّ صَبَّ عَلٰى رَأْسِهٖ وَاَفَاضَ عَلٰى جَسَدِهٖ ثُمَّ تَنَحّٰى فَغَسَلَ قَدَمَيْهِ فَنَاوَلْتُهٗ ثَوْبًا فَلَمْ يَأْخُذْهُ فَانْطَلَقَ وَهُوَ يَنْفُضُ يَدَيْهِ . (متفق عليه ولفظه للبخاری)

أخرجه البخاری فی الصحيح ۳۸۴/۱حديث رقم ۲۷۶ واللفظ له۔ وأخرجه مسلم فی الصحيح ۲۵۴/۱حديث (۳۷۔۳۱۷)۔ وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱۶۹/۱حديث رقم ۲۴۵۔والترمذی فی السنن ۱۷۳/۱حديث رقم ۱۰۳۔وأخرجه النسائی فی السنن۱۳۷/۱حديث رقم ۲۵۳۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱۹۰/۱حديث رقم ۵۷۳۔وأخرجه أحمد فی مسنده ۳۳۵/۶۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے لئے پانی رکھا اور کپڑا اڈال کر پردہ کیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھوں پر پانی ڈال کرانہیں دھویا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ صلی اللہ علیہ وسلم پر پانی ڈالا اور اپنی شرم گاہ کو دھویا اور پھر اپنا بایاں ہاتھ جس کے ساتھ شرم گاہ کو دھویا تھا زمین پر رگڑا اور اس کو صاف کیا۔ پھر مضمضہ کیا اور ناک میں پانی ڈالا۔ چہرہ دھویا اور دونوں بازوؤں کو مرفقین سمیت دھویا پھر اپنے سر پر پانی ڈالا اور تمام جسم پر پانی بہایا پھر غسل والی جگہ سے ہٹ کر دونوں پاؤں کو دھویا اس کے بعد میں نے بدن خشک کرنے کے لیے کپڑا دیا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کپڑا لینے سے انکار کر دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھوں کو جھاڑتے ہوئے وہاں سے چل پڑے اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم نے نقل کیا ہے اور الفاظ بخاری کے ہیں۔''

تشریح: قالت میمونة: یہ ابن عباسؓ کی خالہ اور امہات المؤمنین میں سے ہیں۔

غسلا : غین کے ضمہ اور سین کے سکون یا ضمہ کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے غین کے کسرہ اور سین کے سکون کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ غسل ضمہ کے ساتھ غسول اور مغتسل کی طرح ہے۔ مراد وہ پانی کہ جس سے نہایا جائے جیسا کہ اکل اس چیز کیلئے کہ جس کے ساتھ کھایا جائے اور غسل بھی **غسلت الشی غسلا** (فتحہ کے ساتھ) سے اسم ہے اور غِسل کسرہ کے ساتھ وہ چیز کہ جس کے ذریعے سر کو دھویا جائے جیسا کہ خطمی بوٹی وغیرہ، پس پانی کے لئے اس کو بطور استعارہ کے لیا گیا ہے۔

اور کسرہ کی روایت جیسا کہ خلخالیؒ نے گمان کیا ہے یہ محدثین کے ہاں غلطی ہے جیسا کہ تہذیب الاسماء میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔

فسترته بثوب :یعنی میں نے آپ کے لئے پردہ لگا دیا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی آڑ میں غسل فرما سکیں۔ میرک شاہؒ نے فرمایا کہ (ہ) ضمیر راجع ہے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور بخاری کی روایت میں ہے:

عن میمونه سترت النبی صلی اللہ علیہ وسلم وهو یغتسل۔

کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھپایا (یعنی پردہ کیا) اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غسل کر رہے تھے پھر باقی حدیث ذکر کی پس بعض نے جو یہ کہا ہے کہ ضمیر ماء کی طرف راجع ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔

ثم صب علی یدید فغسلهما: میرک شاہؒ نے کہا ہے کہ یہ جملہ بخاری میں نہیں ہے۔

فغسلها: بدبو کو زائل کرنے کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کیا۔

فغسل قدمیه: یعنی جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضوء کے وقت ان کو نہ دھویا ہوتا اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی تختے یا پتھر یا اونچی جگہ پر نہ تھے۔

فناولته ثوبا: یعنی میں نے کپڑا دینے کا ارادہ کیا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اعضاء وضوء کو صاف کرلیں۔

فلم یاخذه: یعنی کپڑے کو۔ یا اس لئے کہ نہ لینا یہ افضل تھا یا اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی میں تھے یا اس لئے کہ گرمی تھی اور تر رکھنا وہ مطلوب تھا، یا کپڑے میں کوئی شبہ تھا اور حدیث میں ان احتمالات کے ساتھ یہ صلاحیت نہیں کہ یہ تولیے وغیرہ کے ترکِ استعمال کی سنت پر دلیل بن سکے یا تولیے وغیرہ کے استعمال کرنے کی کراہت پر دلیل بن سکے۔ واللہ اعلم۔

وهو ینفض یدیه: یعنی ان کو حرکت دے رہے تھے جیسا کہ قوی آدمی کی عادت ہوتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ماء مستعمل کو دور کرنے کے لئے جھاڑ رہے تھے۔ حالانکہ وضو اور غسل میں اس سے روکا گیا ہے اس لئے کہ اس میں عبادت کے اثر کو مٹانا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ پانی جب تک عضو پر رہے وہ مستعمل نہیں ہوتا، پس پہلا مطلب زیادہ بہتر ہے ہمارے بعض علماء نے اسی طرح فرمایا ہے۔

اور قاضیؒ نے فرمایا ہے کہ ابن عباسؓ کی حدیث کے فوائد میں سے یہ بات ہے کہ بہتر یہ ہے کہ استنجاء کرنا مقدم ہو اگر چہ اس کو مؤخر کرنا بھی جائز ہے کیونکہ غسل یدین اور استنجاء دونوں دو مختلف طہارتیں ہیں، پس ان کے درمیان ترتیب واجب نہیں ہوگی اور بائیں کا استعمال کرنا اور اس کا زمین پر رگڑنا یہ یہ اس کے صاف کرنے اور ہاتھ پر جو لگا ہے اس کو زائل کرنے میں مبالغہ کرنا ہے اور غسل سے پہلے وضوء کرنے میں علماء کا اختلاف ہے داؤد ظاہری نے مطلقاً اس کو واجب قرار دیا ہے اور ایک جماعت کی یہ رائے ہے کہ جب وہ محدث (بے وضو ہو) یا اس کا فعل ان چیزوں میں سے ہو جو جنابت اور حدث کو واجب کرتا ہے تو پھر واجب ہے اور امام شافعی کا صحیح مذہب یہ ہے کہ وضو غسل میں داخل ہے، پس وہ غسل ان دونوں کو کافی ہے اور یہی امام مالکؒ کا قول ہے۔

ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ امام صاحبؒ کا بھی یہی قول ہے اور اس میں جمہور حضرات کی دلیل ہے کہ دونوں پاکیوں کا مقتضی ایک ہے، پس ان دونوں کیلئے ایک غسل ہی کافی ہو جائے گا جیسا کہ حیض اور جنابت میں اور پاؤں کے دھونے کو مؤخر کرنا غسل کے آخر تک یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا مذہب ہے اور امام شافعیؒ کا ایک قول بھی یہی ہے اور امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے ظاہر کی وجہ سے غسل رجلین کو مؤخر نہ کیا جائے گا ورنہ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں بھی پہلے پاؤں دھونے کی وضاحت نہیں ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا مذہب بھی مطلق نہیں ہے بلکہ اس تفصیل کے مطابق ہے جو ہم نے ذکر کی ہے۔

تنحّی: یعنی پاؤں دھونے کیلئے اپنی جگہ سے ہٹنا اور اعضاء کو خشک نہ کرنا اس لئے تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کپڑے کو نہیں پکڑا اور اس میں وہی احتمالات ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں اور اس میں نفض پانی کے جھٹکنے کا جواز بھی ہے اور بہتر یہ ہے کہ جھٹکنے کو چھوڑے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **اذا توضا تم فلا تنفضوا ایدیکم** کہ جب وضو کرو تو ہاتھوں کو نہ جھٹکو (جھاڑو) اور

بعض نے نفض کو چلتے میں ہاتھوں کے ہلانے پر محمول کیا ہے اور یہ تاویل بعید ہے۔
ملّا علی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ یہ تاویل اگرچہ بعید ہے لیکن نفض کو اس پر محمول کرنا دونوں حدیثوں میں تطبیق دینے کیلئے یہ بہتر ہے اس سے کہ اس کو ترک اولیٰ پر محمول کیا جائے۔

شرم والے مسائل میں اسلوب کنایہ افضل ہے

۴۳۷ :وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ اِنَّ امْرَأَةً مِّنَ الْاَ نْصَارِ سَأَلَتِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ غُسْلِهَا مِنَ الْمَحِيْضِ فَأَمَرَهَا كَيْفَ تَغْتَسِلُ ثُمَّ قَالَ خُذِیْ فِرْصَةً مِّنْ مِّسْكٍ فَتَطَهَّرِیْ بِهَا قَالَتْ كَيْفَ اَتَطَهَّرُ بِهَا فَقَالَ تَطَهَّرِیْ بِهَا قَالَتْ كَيْفَ اَتَطَهَّرُ بِهَاقَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ تَطَهَّرِیْ بِهَا فَاجْتَذَبْتُهَا اِلَیَّ فَقُلْتُ تَبْتَغِیْ بِهَا اَثَرَالدَّمِ . (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی الصحیح ١/٤١٤ حدیث رقم ٣١٤ـ وأخرجه مسلم فی صحیحه ١/٢٦٠ حدیث رقم (٦٠ـ٣٣٢) وأخرجه أبو داؤد نحوه فی السنن ١/٢٢٢ حدیث رقم ٣١٥ وأخرجه النسائی فی السنن ١/١٣٥ حدیث رقم ٢٥١ـ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ١/٢١٠ حدیث رقم ٦٤٢ـ

ترجمہ: ”حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ ایک روز ایک انصاری خاتون نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے حیض کے غسل کے بارے میں دریافت کیا کہ میں حیض سے طہارت حاصل کرنے کے لئے کس طرح غسل کروں۔ پھر آپ ﷺ نے اس کو حیض کے غسل کرنے کا حکم دیا کہ کس طرح حیض سے غسل کیا جائے۔ یعنی غسل کا طریقہ آپ ﷺ نے بیان کیا اور پھر ارشاد فرمایا کہ مشک سے تر اور آلود کپڑے کا ایک ٹکڑا لے کر اس سے طہارت حاصل کرو اس عورت نے عرض کیا کہ اس سے کس طرح طہارت حاصل کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا بس تم اس سے طہارت حاصل کرو۔ اس عورت نے پھر پوچھا کہ میں اس سے کس طرح طہارت حاصل کروں آپ ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ۔ اس سے طہارت حاصل کرو۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ان الفاظ کو تکرار کے ساتھ سن کر اس عورت کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کو میں نے سمجھایا کہ تم اس مشک سے آلود کپڑے کو خون کی جگہ یعنی شرم گاہ پر رکھ لو۔ (بخاری ومسلم)“

راویٔ حدیث:

ربیع بنت معوذ۔ یہ ربیع ”معوذ“ کی بیٹی ہیں صحابیہ ہیں انصار میں سے ہیں بڑی۔ ”نجار“ سے تعلق رکھتی ہیں۔ قدر وعظمت والی ہیں۔ یہ ان خواتین میں سے ہیں جو بیعت رضوان میں شریک تھیں۔ ان کی حدیث مدینہ اور بصرہ والوں کے یہاں رائج ہے۔ ”ربیع“ راء کے پیش بائے موحدہ کے فتحہ اور دو نقطوں والی یاء مکسور کی تشدید کے ساتھ ہے۔
ربیع بنت معوذ بن عفراء کے بارے میں ملا قاری رحمہ اللہ مؤلف رحمہ اللہ نے بھی کچھ بھی تحریر نہیں فرمایا۔

تشریح: سالت رسول اللہ: سید جمال الدینؒ کے نسخہ میں نبی اللہ ہے اور سید عفیف الدین کازرونی کی اصل میں النبی ہے۔

المحيض: یہ مصدر میمی ہے یعنی حیض کے ختم ہونے کی وجہ سے۔

فامرها كيف تغتسل :یعنی غسل کا وہی طریقہ جو پہلے گزرا یعنی مردوں اور عورتوں کے درمیان اور اسی طرح جنبی، حائضہ اورنفاس والی عورتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

ثم قال :یعنی غسل کے تعلیم ارشادفرمانے کے بعد۔

فرصة:فاء کے کسرہ کے ساتھ)روئی یا اون کا ٹکڑا یا وہ چھوٹا سا کپڑا جس سے عورت حیض کے خون کوصاف کرتی ہے اور یہ **فرصت الشيء اذا قطعته** سے ماخوذ ہے،یعنی کاٹنا۔

مسك (میم کے فتحہ کے ساتھ)اس کا معنی ہے کھال اور ایک نسخہ میں میم کے کسرہ کے ساتھ ہے اور مسک (مشک)مشہور ومعروف خوشبو ہے۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ **من مسك فرصة** کی صفت ہے اگر منْ حرف جر کا متعلق خاص لفظ مقدر مانا جائے تو پھر معنی ہوگا: **مطيبة من مسك** کہ مشک میں (بھگوئے ہوئے) کپڑے کا ٹکڑا اور یہ تفسیر صحاح کی روایت کے موافق ہے کہ جس میں روایت یوں **فرصة ممسكة** کہ خوشبولگا ہوا کپڑے کا ٹکڑا اور بعض نے کہا ہے کہ یہی اکثر کی روایت ہے اور شرح السنۃ میں اس کی یوں وضاحت مذکور ہے: **خذي قطعة من صوف مطيبة من مسك**۔

علامہ قتیبی نے اس کا انکار کیا ہے(اور دلیل یہ دی ہے) کہ وہ لوگ اتنے مالدار نہیں تھے کہ مشک ان کو اس طرح دستیاب ہو کہ وہ اس کو حقیر سمجھ کر حیض سے پاکی حاصل کرنے میں استعمال کریں پس اس بناء پر محدثین نے کہا ہے کہ روایت میم کے فتحہ (**من مسك**)کے ساتھ ہے یعنی کھال کا ٹکڑا جس پر اون ہو۔

اور اگر منْ حرف جر کا متعلق عام ہو **اى كائنة من مسك** پس اس صورت میں واجب ہے یہ کہ کہا جائے جیسا کہ الفائق (**في غريب الحديث و الاثر**)میں ہے کہ وہ روئی یا اُون کا پرانا ٹکڑا کہ جس کو اکثر مرتبہ اس میں استعمال کیا گیا ہو اور نئے ٹکڑے کو استعمال نہ کرے کیونکہ وہ کہیں اور کام آجائے گا (بننے وغیرہ میں)اور اس لئے بھی کہ پرانا ٹکڑا اس کے لئے زیادہ مناسب وبہتر ہے۔علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے یہ قول زیادہ مضبوط اور احسن ہے اور ان کی حالت کے بھی زیادہ مشابہ ہے اور اگر یہ معنی ہوتا ہے کہ خوشبو لگے ہوئے کپڑے کے ٹکڑے کو لے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو طہارت کے وقت خون کے دور کرنے کیلئے اس طرح کرنے کا حکم دیا اور اگر بوکو زائل کرنے کے لئے حکم دیتے تو پھر خون کے ازالہ کے بعد حکم دیتے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ بعض رواۃ نے **فرصة ممسكة** سنا اور اس سے خوشبو(مشک)لگا ہوا ٹکڑا سمجھے پھر اس کو معناً اس طرح **فرصة من مسك** روایت کردیا۔

فتطهري بها :ابن الملکؒ نے فرمایا ہے **اى فتطيبي بالفرحة** یعنی اس خوشبو لگے ہوئے ٹکڑے کو وہاں استعمال کر جہاں خون پہنچا ہوتا کہ وہ جگہ بھی خوشبودار ہوجائے۔

ابن حجرؒ نے محدثین کے دونوں قولوں کو ملاتے ہوئے یوں کہا ہے کہ صحیح ہے کہ تقدیر عبارت یہ ہو: **فرصة كائنة من مسك** اور یہ اکمل درجہ ہے اس لئے کہ اس پر حضرت عائشہ کا قول بھی دلالت کرتا ہے: **فتطهري بها اى تتبعي بها اثر الدم**

کہ خون کے نشانات تلاش کر کے اس پر اس کو استعمال کرو اور یہ تتبع وہ خوشبو لگے ہوئے ٹکڑے ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے نہ کہ عین مشک کے ساتھ۔

(ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے) ابن حجرؒ کا یہ وہم ہے اس لئے کہ جن حضرات نے **فرصة كائنة من مسك** کی تقدیر کو مانا ہے وہ مَسک سے (بفتح المیم) صرف کھال کا ٹکڑا ہی مراد لیتے ہیں نہ کہ مسک میم کے کسرہ کے ساتھ جو کہ مشک کے معنی میں آتا ہے اس لئے کہ جمہور محدثین نے تو مُشک لگے ہوئے ٹکڑے والے معنی کو بھی بعید سمجھا ہے عین مشک کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ محدثین نے فرمایا ہے کہ اگر مشک لگا ہوا کپڑا مراد ہوتا تو حضور ﷺ تطیبی ارشاد فرماتے۔

كيف اتطهر بها ؟ :اور ایک نسخہ میں اطّھر دو شدوں کے ساتھ ہے اور اسی طرح دوسرے مقام میں۔

قال سبحان الله :اس جملہ میں تعجب کا معنی ہے اصل میں یہ سبحان اللہ۔ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے کے لئے ہے اللہ تعالیٰ کی ایجاد کی ہوئی مصنوعات اور عجیب وغریب مخلوقات سے قابل تعجب چیز دیکھنے کے وقت۔ پھر اس کا استعمال ہر اس چیز میں ہونے لگا کہ جس سے تعجب ہو اور یہاں معنی یہ ہے کہ کیسے اتنی واضح وظاہر بات مخفی ہو سکتی ہے کہ جس کو سمجھنے کے لئے کسی فکر کی ضرورت نہیں ہے یا کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

فاحتذبتها الى :اور ایک نسخہ میں ذال سے پہلے باء ہے، معنی ہیں میں نے اس کو اپنی طرف قریب کیا۔

فقلت : اى لها سرا کہ میں نے آہستہ سے کہا۔

اثر الدم :ہمزہ کے کسرہ اور ثاء کے سکون کے ساتھ اور ہمزہ اور ثاء کے فتحہ بھی منقول ہے یعنی اس ٹکڑے کو شرمگاہ پر رکھ دے اور اسی طرح جہاں خون لگا ہے وہاں بھی رکھ صفائی حاصل کرنے کے لئے یا بدبو کو دور کرنے کے لئے۔

غسل میں عورت کے لئے سر کے بالوں کو کھولنا ضروری نہیں

۴۳۸ : وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّىَ امْرَأَةٌ اَشُدُّ ضَفْرَ رَأْسِىْ اَفَاَنْقُضُهٗ لِغُسْلِ الْجَنَابَةِ فَقَالَ لَا اِنَّمَا يَكْفِيْكِ اَنْ تَحْثِىَ عَلٰى رَأْسِكِ ثَلَاثَ حَثَيَاتٍ ثُمَّ تُفِيْضِيْنَ عَلَيْكِ الْمَاءَ فَتَطْهُرِيْنَ. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في الصحيح ۲۵۹/۱ حديث رقم (۵۸۔۳۳۰) وأخرجه أبوداؤد في السنن ۱۷۳/۱ حديث رقم ۲۵۱۔ وأخرجه الترمذي في السنن ۱۷۵/۱ حديث رقم ۱۰۵۔ والنسائي في السنن ۱۳۱/۱ حديث رقم ۲۴۱۔ وأخرجه ابن ماجة في السنن ۱۹۸/۱ حديث رقم ۶۰۳۔ وأخرجه أحمد نحوه في المسند ۳۱۴/۶۔۳۱۵۔

ترجمہ:''حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ میں ایک عورت ہوں اپنے سر کے بالوں کو مضبوط گوندھتی ہوں کیا غسل جنابت میں انہیں کھولا کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں بالوں کو کھولنے کی ضرورت نہیں بلکہ تمہارے لئے یہی کافی ہے کہ پانی کے تین چلو لے کر اپنے سر پر ڈال لیا کرو اور پھر تمام جسم پر پانی بہا لیا کرو اس طرح تم پاک ہو جاؤ گی۔''

تشریح: **اشد** :ہمزہ کے فتحہ اور شین کے ضمہ کے ساتھ۔ **ای احکم** ۔

ضفر راسي: سر کو گوندھنے اور بٹنے کے ساتھ ضفر ضاد کے فتحہ اور فاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ بالوں کا گوندھنا اور بعض کو بعض میں داخل کرنا اور **ضفیرة** مینڈھی کو کہتے ہیں۔

لغسل الجنابة ؟ : تا کہ پانی نیچے تک پہنچ جائے اور ایک روایت میں ہے **افانقضه للحیض و الجنابة**۔

فقال :لا: یعنی نہ کھول۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا کھولنا لازم نہیں۔ اصح بات یہ ہے کہ یہ حکم عورتوں کے ساتھ خاص ہے نہ کہ مردوں کے لئے وہ مرد اشراف میں سے ہوں یا غیر اشراف میں سے۔

ان تحثی: ثاء کے بعد یاء کے سکون کے ساتھ اس لئے کہ یہ مؤنث کو خطاب ہے اس کی نون نصب کی وجہ سے محذوف ہے اور اس میں یاء کا فتحہ پڑھنا جائز نہیں ہے اور **الحثی** کا معنی ہے گرانا۔ (ڈالنا۔ اڑانا) مراد بہانا ہے۔

حثیات :یعنی فتحوں کے ساتھ منقول ہے (**ای مرات**) اور ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے مقصود تین میں حصر نہیں ہے بلکہ پانی کو بالوں تک پہنچانا ہے، پس اگر بالوں کے ظاہر پر ایک مرتبہ پانی پہنچ گیا تو تین مرتبہ سنت ہوگا ورنہ زیادتی تین پر واجب ہوگی یہاں تک کہ پانی پہنچ جائے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ ظاہر اس حدیث سے یہ ہوتا ہے کہ تین بار کی تصریح آپ ﷺ نے اس لئے فرمائی کیونکہ اکثر گندھے ہوئے بالوں کے نیچے تک پانی نہیں پہنچتا اور بالوں کو مضبوطی سے گوندھنا (جیسا کہ گزرا) اس بات کیلئے مانع نہیں ہے، اس لئے کہ کبھی پانی نیچے تک پہنچ جاتا ہے بالوں کی قلت کی وجہ سے اس لئے کہ عرب والوں کے بال اکثر ہلکے ہوتے تھے۔

اور اس حدیث سے جو بات نکلتی ہے کہ مینڈیوں کو کھولنا واجب نہیں ہے۔ یہ محمول ہے اس بات پر کہ پانی مینڈیوں کے نیچے تک پہنچ جائے ورنہ (پانی کا پہنچانا) دوسری حدیث کی وجہ سے واجب ہوگا اور وہ حدیث یہ ہے: **اتحت کل شعرة جنابة** کہ ہر بال کے نیچے جنابت ہے اور یہی اکثر اہل علم کا مذہب ہے امام نخعی اور امام مالکؒ اس کے خلاف ہیں ان حضرات کے نزدیک مطلقاً مینڈیوں کو کھولنا واجب ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک صرف جنابت میں کھولنا واجب ہے نہ کہ حیض میں۔

ثم تفیضین علیك الماء فتطهرین :حمیدی کی کتاب میں اور مصابیح کے عام نسخوں میں اسی طرح ہے اور قیاس کے مطابق **ان تحتی** پر عطف کی وجہ سے نون حذف ہوا اور اسی طرح مصابیح کے بعض نسخوں میں ہے اور یہ بھی وجہ ہوسکتی ہے کہ تقدیر عبارت یوں ہو: **انت تفیضین**۔ اس صورت میں یہ جملہ کے جملہ پر عطف کے قبیل سے ہوگا۔ واللہ اعلم۔

رسول اللہ ﷺ کا وضو ایک مد اور غسل ایک صاع کے ساتھ ہوتا تھا

۴۳۹ :وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّأُ بِالْمُدِّ وَيَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ اِلٰى خَمْسَةِ اَمْدَادٍ . (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی الصحیح مع تقدیم وتأخیر ۱/ ۳۰٤حدیث رقم ۲۰۱ ـوأخرجه مسلم فی الصحیح ۱/ ۲۵۸حدیث

رقم (۵۱-۳۲۵)۔

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک مد کے ساتھ وضو کرتے تھے اور ایک صاع سے پانچ مدوں تک پانی کے ساتھ غسل کرتے تھے۔ (بخاری ومسلم)''

تشریح: الی خمسة امداد: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ مد وہ ایک رطل اور ثلث رطل بغدادی ہوتا ہے اور صاع وہ چار مد کا ہوتا ہے۔ یہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ باقی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مد دو رطل کا ہوتا ہے اور صاع ۸ رطل کا۔ اس میں دلیل نسائی شریف کی روایت ہے۔

پھر اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ وضوء اور غسل کے پانی میں کوئی معین مقدار شرط نہیں ہے، ہاں البتہ یہ مسنون ہے کہ وضوء کا پانی مد سے کم نہ ہو اور غسل کا پانی تقریباً صاع سے کم نہ ہو جیسا کہ خمسة امداد کا ارشاد اس پر دلالت کر رہا ہے اور مد اور صاع سے وزن مراد ہے نہ کہ کیل (پیمانہ)۔ (متفق علیہ)

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ایک حدیث میں سند حسن کے ساتھ یہ وارد ہے کہ حضور ﷺ نے ایسے برتن سے وضو کیا کہ جس میں دو تہائی مد کے بقدر پانی تھا اور طبرانی نے روایت نقل کی ہے کہ جس میں ایسے برتن سے وضو کرنے کا ذکر ہے کہ جس میں نصف مد کے بقدر پانی تھا۔ (ملا علی قاری علیہ رحمۃ الباری فرماتے ہیں) پس یہ متفق علیہ روایت آپ ﷺ کے احوال میں جو عادت اکثر تھی اس پر محمول ہوگی۔ (یعنی اکثر عادت یہی تھی جو اس روایت میں ذکر ہوئی)۔ واللہ اعلم۔

مرد اور عورت کا ایک ساتھ ایک برتن سے غسل کرنا

۴۴۰: وَعَنْ مُعَاذَةَ قَالَتْ قَالَتْ عَآئِشَةُ كُنْتُ اَغْتَسِلُ اَنَا وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اِنَاءٍ وَاحِدٍ بَيْنِىْ وَبَيْنَهٗ فَيُبَادِرُنِىْ حَتّٰى اَقُوْلَ دَعْ لِىْ دَعْ لِىْ قَالَتْ وَهُمَا جُنُبَانِ . (متفق عليه)

أخرجه البخارى فى الصحيح ولم يذكر "فيبادر فى --الخ-- ۳۶۳/۱حديث رقم ۲۵۰ـوأخرجه مسلم فى الصحيح ۲۵۷/۱حديث رقم (۴۶-۳۲۱)واللفظ له- أخرجه النسائى فى السنن ۱۳۰/۱حديث رقم ۲۳۹وأخرج أحمد فى المسند نحوه ۹۱/۶۔

ترجمہ: ''حضرت معاذہؒ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں اور رسول اللہ ﷺ ایک برتن سے جو ہم دونوں کے درمیان رکھا ہوتا اس سے غسل کرتے تھے اور آپ پانی لینے میں مجھ سے جلدی کرتے تھے تو میں کہا کرتی تھی کہ میرے لئے بھی پانی چھوڑ دیجئے حضرت معاذہؒ فرماتی ہیں کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دونوں جنابت کی حالت میں ہوتے تھے۔ (بخاری ومسلم)''

راویٔ حدیث:

معاذۃ بنت عبداللہ۔ یہ ''معاذہ'' ہیں۔ ''عبداللہ'' کی بیٹی اور عدویہ وصباء ہیں۔ بصرہ کی رہنے والی ہیں۔ حدیث کے باب میں ثقہ ہیں اور تیسرے طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے انہوں نے اور ان سے قتادہ رضی اللہ عنہ

وغیرہ نے روایت کی۔ ۳۳ھ میں انتقال فرمایا۔

تشریح: كنت اغتسل انا ورسول الله :رسول اللہ مرفوع ہے عطف کی بناء پر اور منصوب بھی ہوسکتا ہے مفعول معہ ہونے کی صورت میں۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ ضمیر کا ظاہر کرنا یہ عطف کو صحیح کرنے کیلئے ہے، پس اگر تو کہے کہ عطف کیسے صحیح ہوسکتا ہے حالانکہ یہ نہیں کہا جاسکتا : اغتسل رسول الله ﷺ۔ اس کا جواب دیا گیا ہے کہ یہاں متکلم کو غائب پر غلبہ دیا گیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: (اسكن انت وزوجك الجنة) میں مخاطب کو غائب پر غلبہ دیا گیا ہے۔ پس اگر یہ کہا جائے کہ آیت میں اس نکتہ کا بیان ہے کہ آدم علیہ السلام جنت میں ٹھہرنے میں بطور اصل کے ہیں۔ تو ہم جواب میں کہیں گے کہ ہمیشہ عورتیں شہوات کا محل ہوتی ہیں اور غسل کرنے کا سبب بنتی ہیں، پس وہ بھی اصل کے درجہ میں ہوگئیں۔

من اناء واحد بيني وبينه :علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ یعنی برتن وہ میرے اور آپ ﷺ کے درمیان رکھا ہوا تھا اور برتن کا منہ کھلا تھا، پس ہمارے ہاتھ اس میں پڑتے تھے اور ہم غسل کیلئے پانی لیتے تھے۔

فيبادرني :یعنی پانی لینے میں آپ ﷺ مجھ سے سبقت لے جاتے۔

اشرفؒ نے فرمایا ہے یہاں یہ معنی نہیں ہے کہ آپ ﷺ جلدی کرتے اور بعض پانی سے غسل کر لیتے اور باقی میرے لئے چھوڑ دیتے، پس میں اس سے غسل کرتی اس لئے کہ آپ ﷺ نے عورت کو (مرد کے) بچے ہوئے پانی سے غسل کرنے سے روکا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ دونوں ایک ساتھ چلو بھریں (اور غسل کریں)۔ جیسا کہ اگلے باب، باب مخابطة الجنب میں آئے گا بلکہ یہاں یہ معنی ہے کہ دونوں ایک ساتھ غسل کرتے۔

دع لي دع لي: یعنی اتنی مقدار بچا دیں جس سے میں اپنا غسل پورا کرسکوں اور تکرار یہ تاکید کیلئے ہے یا تعدید (شمار کیلئے) ہے۔

قالت : اى معاذة اور بعض نے کہا مراد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔

ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ پانی جس میں جنبی ہاتھ داخل کرتا ہے وہ طاھر مطہر ہے اور عورتیں مرد اس کے اندر برابر ہیں۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں اس امر کی دلیل ہے کہ جنبی کا ہاتھ کو پانی میں ڈبونا پانی کو اس کے مطہر ہونے سے نہیں نکالتا۔

(ملاّ علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ گذشتہ کلام میں یہ بات محل تامل ہے کہ ہاتھ دھونے سے قبل پانی میں ڈالنے کا علم اس روایت میں سے کہاں سے ثابت ہوتا ہے؟ اور اگر ہم اس کو مان بھی لیں تب بھی یہ چلّو بھرنے کے ارادے کے طور پر تھا۔

ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ ہمارے سب کے سب علماء کا ارشاد ہے کہ اگر محدث یا جنبی یا وہ حائضہ کہ جس نے اپنے ہاتھ کو پاک کیا ہے یہ برتن میں چلّو بھرنے (پانی لینے) کیلئے ہاتھ ڈالیں تو ضرورت کی وجہ سے پانی مستعمل نہیں ہوگا اور استدلال اس روایت سے کیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر محدث اپنے پاؤں یا سر کو داخل کرے تو ضرورت نہ ہونے کی وجہ پانی فاسد ہو جائے گا۔ (متفق علیہ)

سید جمال الدین محدثؒ نے فرمایا ہے کہ روایت کو متفق علیہ قرار دینا باعث تامل ہے اس لئے کہ بخاری میں یہ : **فيبادرني**

حتی اقول دع لی دع لی نہیں ہے۔ یہ امام مسلمؒ کا افراد ہے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ مسلم کی ایک روایت میں ہے:

کنت اغتسل انا و النبی ﷺ من اناء یسع ثلاثة امداد او قریبا من ذلک۔

کہ میں اور نبی پاک ﷺ ایسے برتن سے غسل کرتے کہ جس میں تین مد یا اس کے قریب قریب پانی آتا تھا۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ مسلم کی اس روایت سے اس سابقہ روایت کی تائید ہوتی ہے کہ جس میں دو تہائی مد یا نصف مد سے وضوء کا ذکر ہے۔ (واللہ اعلم)

الفصل الثانی:

عورتیں تخلیق میں مردوں کے مشابہ ہیں

۴۴۱: عَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الرَّجُلِ يَجِدُ الْبَلَلَ وَلَا يَذْكُرُ احْتِلَامًا قَالَ يَغْتَسِلُ وَعَنِ الرَّجُلِ يَرٰى اَنَّهٗ قَدِ احْتَلَمَ وَلَايَجِدُ بَلَلًا قَالَ لَاغُسْلَ عَلَيْهِ قَالَتْ اُمُّ سُلَيْمٍ هَلْ عَلَى الْمَرْاَةِ تَرٰى ذٰلِكَ غُسْلٌ قَالَ نَعَمْ اِنَّ النِّسَآءَ شَقَآئِقُ الرِّجَالِ (رواه الترمذی وابوداود وروی لدارمی وابن ماجة اِلٰی قَوْلِهٖ) لَا غُسْلَ عَلَيْهِ۔

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۱۶۱ حديث رقم ۱۳۶۔ والترمذی فی السنن ۱/۱۸۹ حديث رقم ۱۱۳۔ والدارمی إلی قوله ......لاغسل "۱/۲۵ حديث رقم ۷۶۵"۔ وابن ماجة فی السنن ۱/۲۰۰ حديث رقم ۶۱۲۔ وأخرجه أحمد كاملاً فی المسند ۶/۲۵۶۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا اس آدمی کے متعلق جو نیند سے بیدار ہونے کے بعد اپنے کپڑے پر منی کی رطوبت محسوس کرے اور اس کو خواب یاد نہ ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو غسل کرنا چاہئے اور آپ ﷺ سے اس شخص کے بارے میں بھی سوال کیا گیا کہ جس کو خواب یاد ہو مگر بیدار ہونے کے بعد منی کی رطوبت محسوس نہ کرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص پر غسل واجب نہیں۔ پھر حضرت ام سلیمؓ نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول۔ اگر عورت اس طرح کی رطوبت دیکھ لے تو کیا اس پر غسل واجب ہے۔ کیونکہ عورتیں بھی مردوں کے مثل ہیں۔ اس حدیث کو امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور امام دارمی اور امام ابن ماجہ نے اس حدیث کو یہاں تک روایت کیا ہے۔ لَا غُسْلَ عَلَيْهِ۔ کہ اس پر غسل واجب نہیں ہے۔''

تشریح: البلل: سے مراد منی ہے یا مذی، جب کہ بیدار ہو۔

یغتسل: یہ خبر ہے جو امر کے معنی میں ہے اور وہ وجوب کیلئے ہے۔

وعن الرجل یری: یاء کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ منقول ہے ای یظن۔

قال لا غسل علیه. یعنی اس پر غسل واجب نہیں ہے اس لئے کہ تری وہ علامت اور دلیل ہے اور نیند کا کوئی اعتبار نہیں ہے، پس مراد تری پر ہے برابر بات ہے کہ احتلام یاد ہو یا نہ ہو۔

نعم علیھا غسل :اور اس بات کو دوبارہ ذکر کرنا، حالانکہ حضور ﷺ نے اس میں صراحتاً حکم بیان فرما دیا یہ عورتوں کے احتلام کو بعید جاننے کی وجہ سے ہے اور جب حضور ﷺ حضرت اُم سلیم کا مقصود سمجھ گئے تو آپ ﷺ نے علت کو ذکر فرما دیا، پس فرمایا:

ان النساء :ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ یہ جملہ متانفہ ہے جو تعلیل کے معنی میں ہے۔

شقائق الرجال :یعنی طبائع اور خلقت میں مردوں کی مانند ہیں گویا کہ وہ عورتیں ان مردوں سے نکلی ہیں اور اس لئے بھی کہ حوا علیہا السلام آدم علیہ السلام سے پیدا ہوئیں اور آدمی کا شقیق اس کا حقیقی بھائی ہوتا ہے اس لئے کہ اس کے نسب سے اس کا نسب نکلتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نیند کے بعد تری دیکھنے کی صورت میں عورت پر بھی غسل واجب ہوتا ہے مرد کی طرح۔

علامہ خطابیؒ نے فرمایا ہے حدیث میں قیاس کا اثبات اور نظیر کو نظیر سے ملانے کا بیان ہے اور یہ کہ خطاب جب مذکور کے صیغہ کے ساتھ ہو تو یہ عورتوں کے لئے بھی خطاب ہوتا ہے سوائے چند جگہوں کے اور ظاہر حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تری کے دیکھنے سے غسل واجب ہوتا ہے، اگر چہ اس کے منی ہونے کا یقین نہ بھی ہو اور یہی تابعین میں سے ایک جماعت کا قول ہے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر علماء کا مذہب ہے اس شرط پر کہ غسل واجب نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ جان لے کہ یہ منی ہی کی تری ہے ان حضرات نے اس صورت میں بھی احتیاطاً غسل کرنا مستحب قرار دیا ہے (یعنی جب منی کی تری معلوم نہ ہو تب بھی احتیاطاً غسل کرے کیونکہ ممکن ہے کہ منہ پتلی ہو چکی ہو۔ مترجم) لیکن علماء کا اس بات پر اختلاف نہیں ہے کہ جب وہ تری نہ دیکھے تو اس پر غسل واجب نہیں اگر چہ نیند میں احتلام کو دیکھے۔

اسنادی حیثیت :اس کی سند میں عبداللہ بن عمر بن حفص عمری ہے۔ یحی بن سعید نے اس کو حدیث میں حافظے کے اعتبار سے ضعیف قرار دیا ہے۔ علامہ ترمذیؒ نے اسی طرح کہا۔ ترمذیؒ کی بات کو میرک شاہؒ نے نقل کیا ہے۔

اکسال سے غسل واجب ہو جاتا ہے

۴۴۲:وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا جَاوَزَ الْخِتَانُ الْخِتَانَ وَجَبَ الْغُسْلُ فَعَلْتُهُ أَنَا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاغْتَسَلْنَا . (رواه الترمذی وابن ماجة)

أخرجه الترمذی فی السنن ١/ ١٨٠ حدیث رقم ١٠٨۔ وقال حسن صحیح وأخرجه ابن ماجة بلفظ "اذا التقی....." فی سننه ١/ ١٩٩ حدیث رقم ٦٠٨۔ وأخرجه أحمد فی مسنده ٦/ ١٦١۔

ترجمہ:"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب دو ختنوں کا تجاوز ہو جائے یعنی حشفہ غائب ہو جائے تو مرد اور عورت دونوں پر غسل واجب ہو جائے گا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے اور رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیا اور پھر ہم نے غسل کیا۔ اس حدیث کو امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔"

تشریح:**اذا جاوز** : ای تعدی اور ایک روایت میں راء کے ساتھ ہے ای لاتقی۔

الختانُ :مرفوع ہے (الختانَ) منصوب ہے اور اس ختان سے مراد، مرد و عورت کی ختنہ کرنے کی جگہ ہے اور یہ اعم ہے

اس سے کہ وہ مختون ہو یا نہ ہو۔ اس لئے کہ مرد کے ختنہ کی جگہ کا عورت کی ختنہ کی جگہ میں تجاوز کرنے سے لطیف کنایہ ہے جماع سے اور جماع حشفہ کے چھپ جانے کو کہتے ہیں (حشفہ ذَکر کا سر) اگرچہ دبر ہی میں ہو۔

وجب الغسل :علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے بعض روایات کے اندر **اذا التقی الختانان** ہے۔ مظہرؒ نے فرمایا ہے: **ای اذا حاذی احدهما الاخر** یعنی ہر ایک دوسرے کے محاذی و برابر ہو جائے برابر بات ہے کہ وہ کہ وہ دونوں (ختانان) ملیں یا نہ ملیں۔ عرب کے محاورہ میں بولا جاتا ہے: **التقی الفارسان ای اذا تحاذیا وتقابلا** اور اس کا فائدہ اس مسئلہ میں ظاہر ہوگا کہ جب عضو خاص کو کپڑے وغیرہ میں لپیٹ کر داخل کرے، پس اس صورت میں بھی غسل واجب ہوگا۔

اشرفؒ نے فرمایا ہے کہ یہ معنی جَاوَزَ والی روایت میں زیادہ ظاہر ہے، پس بے شک مجاوزۃ کا لفظ اس پر دال ہے۔

فعلته :ضمیر جاوز کے مصدر کی طرف راجع ہے۔

فاغتسلنا :ظاہر حدیث یہی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقصود وہ غسل انزال کے بغیر ہے اور یہ کہ **الماء من الماء** والی حدیث کے مفہوم کیلئے یہ ناسخ ہے۔

اسنادی حیثیت :امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (سید جمال الدینؒ نے اس کو نقل کیا ہے)

ہر بال کے نیچے جنابت ہوتی ہے

۴۴۳ :وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحْتَ كُلِّ شَعْرَةٍ جَنَابَةٌ فَاغْسِلُوا الشَّعْرَ وَاَنْقُوا الْبَشَرَةَ . (رواه ابوداود والترمذی وابن ماجة وقال الترمذی هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَالْحَارِثُ بْنُ وَجِيْهٍ الرَّاوِی وَهُوَ شَيْخٌ لَيْسَ بِذٰلِكَ)۔

أخرجه أبو داؤد فی السنن ١/١٧١۔ حديث رقم ٢٤٨ وضعفه أخرجه الترمذی فی السنن ١/١٧٨ حديث ١٠٦۔ وابن ماجه فی السنن ١/١٩٦ حديث رقم ٥٩٧۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر بال کے نیچے جڑ میں جنابت ہوتی ہے۔ لہٰذا بالوں کو اچھی طرح دھویا کرو اور جسم کو پاک کیا کرو۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد امام ترمذی امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ کیونکہ اس حدیث کا ایک راوی حارث ابن وجیہ ایک بوڑھا شخص ہے وہ معتبر اور مقبول نہیں یعنی کبر سنی کی وجہ سے اور نسیان کے غلبہ کی وجہ سے اس کی روایت کا اعتبار نہیں۔ کیونکہ یہ ضعیف ہے۔''

اسنادی حیثیت : امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے کیونکہ اس حدیث کا ایک راوی حارث بن وجیہ ایک بوڑھا شخص ہے جو معتبر نہیں (مطلب یہ ہے کہ کبر سنی کے باعث اس پر نسیان کا غلبہ ہو گیا ہے اور اس کی روایت قابل اعتماد نہیں بلکہ ضعیف ہے)۔

تشریح: شعرۃ عین کے سکون اور فتحہ دونوں طرح منقول ہے۔

فاغسلوا الشعر : عین کے فتحہ اور سکون کے ساتھ **ای جمیعه** اگر ایک بال بھی دھونے سے باقی رہ گیا کہ اس تک پانی نہ پہنچا تو جنابت باقی رہے گی۔

وانقوا: یہ انقاء سے ہے۔

البشرة :بشرۃ ، باء کے ساتھ ہے۔ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ بشرہ سے مراد ظاہری جلد ہے یعنی ظاہری جلد کو میل سے صاف کرو۔پس اگر میل یعنی جیسے خشک گارا۔گوندھا ہوا آٹا اور موم وغیرہ پانی کے پہنچنے کو روکے تو جنابت ختم نہیں ہوگی اور باقی ڈاڑھی کا گنا پن جو وضوء میں کھال تک پانی پہنچنے کیلئے مانع ہے (اس کے باوجود وضوء صحیح ہوتا ہے) کیونکہ کھال تک پانی کا پہنچانا اس میں بڑی مشقت ہے اس لئے کہ وضوء ہر دن میں کئی مرتبہ کرنا پڑتا ہے لیکن غسل کا معاملہ اس کے خلاف ہے۔

وجیہ ،**فَعِیل** کے وزن پر ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ واؤ کے فتحہ اور جیم کے سکون اور یاء کے ساتھ ہے۔

شیخ :ای کبیر اور ان پر نسیان غالب آ گیا تھا۔

لیس بذٰلك :نہیں تھے اس مرتبہ میں کہ جس کی وجہ سے ان کو قابل اعتماد مانا جائے یعنی ان کی روایت قوی نہیں ہے۔ علامہ طیبیؒ نے یہی فرمایا ہے اور ظاہر یہی ہے کہ مصنفؒ کا **وھو شیخ** کہنا جرح کیلئے ہے اور یہ اصحاب جروح وتعدیل کے اس قول کے خلاف ہے کہ شیخ کا لفظ تعدیل کے مراتب میں سے ہے۔پس اس بنیاد پر امام ترمذیؒ کے قول پر ایک دوسرا اشکال بھی وارد ہوتا ہے۔اس لئے کہ اصحاب جروح وتعدیل کے ہاں بالاتفاق **لیس بذاك** الفاظ تعدیل میں سے نہیں ہے۔پس ان دو لفظوں کا شخص میں جمع کرنا دو متضاد باتوں کا جمع کرنا ہے (جو کہ صحیح نہیں)۔پس درست بات یہاں یہ ہے کہ مصنفؒ کا **وھو شیخ** والا قول یہ بھی جرح پر محمول ہوگا **لیس بذاك** کے ساتھ ذکر ہونے کے قرینہ کی وجہ سے اگر چہ وہ الفاظ تعدیل میں سے ہے اور اس لئے بھی کہ یہ لفظ جرح کی بھی خبر دینے والا ہے کیونکہ اگر چہ اصحاب جرح وتعدیل نے اس کو الفاظ تعدیل میں شمار کیا لیکن انہوں نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ یہ لفظ جرح کے قریب ہونے پر بھی مشعر ہے۔یا ہم یہ کہتے ہیں (جواب میں) کہ ایک شخص کا ثقہ ہونا دو چیزوں کی وجہ سے ہوتا ہے وہ ہے عدالت اور ضبط جیسا کہ اصول حدیث میں اس کا بیان ہے پس جب ایک شخص میں عدالت پائی جائے نہ کہ ضبط تو یہ جائز ہے کہ پہلی صفت (عدالت) کی وجہ سے اس کی تعدیل کی جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ دوسری صفت (عدم) ضبط کی وجہ سے اس کی جرح کی جائے ،پس جب معاملہ اس طرح ہے تو پھر دو متضاد باتوں کا شخص واحد میں جمع ہونا لازم نہ آیا۔سید جمال الدینؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

غسل میں غفلت کرنے پر وعید

۴۴۴:وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَكَ مَوْضِعَ شَعْرَةٍ مِنْ جَنَابَةٍ لَمْ يَغْسِلْهَا فُعِلَ بِهَا كَذَا وَكَذَا مِنَ النَّارِ قَالَ عَلِيٌّ فَمِنْ ثَمَّ عَادَيْتُ رَأْسِيْ فَمِنْ ثَمَّ عَادَيْتُ رَأْسِيْ فَمِنْ ثَمَّ عَادَيْتُ رَأْسِيْ ثَلَاثًا (رواه ابوداود واحمد والدارمی اِلَّا اَنَّهُمَا لَمْ يُكَرِّرَا فَمِنْ ثَمَّ عَادَيْتُ رَأْسِيْ)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۱۷۳حدیث رقم ۲۴۹۔وأحمدفی مسنده، ۱/۹٤۔وأخرجه الدارمی فی السنن ۱/۲۱۰حدیث رقم ۷۵۱۔وأخرجه ابن ماجة فی سننه ۱/۱۹٦حدیث رقم ۵۹۹۔

ترجمہ: ''حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے غسل جنابت میں ایک بال کے برابر بھی جگہ خشک چھوڑ دی اس کو نہ دھویا تو اس کو اس طرح آگ کا عذاب دیا جائے گا۔حضرت علیؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ اسی وجہ سے میں اپنے سر کا دشمن ہو گیا تین مرتبہ یہی ارشاد فرمایا۔کہ اسی وجہ سے میں نے اپنے سر سے دشمنی کی اور سر کا حلق کروایا اس حدیث کو امام ابوداوٗد امام احمد اور امام دارمی نے روایت کیا ہے۔مگر امام احمد اور امام دارمی نے یہ الفاظ مِنْ ثَمَّ عَادَیْتُ رَأسِی۔کہ اسی وجہ سے میں اپنے سر کا دشمن ہو گیا کو تکرار کے ساتھ ذکر نہیں کیا۔''

تشریح: من جنابة :یہ حضور ﷺ کے قول من ترك سے متعلق ہے ای من اجل غسل جنابة۔

لم یغسلها :یہ موضع شعرة کیلئے صفت واقع ہے اور ضمیر کا مؤنث لانا مضاف الیہ کے اعتبار سے ہے۔علامہ طیبیؒ کا یہی کہنا ہے۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ ضمیر مضاف الیہ کی طرف لوٹے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد:(اولحم خنزیر فانه رجس) میں اس صورت میں تقدیر عبارت ہو گی :لم یغسل تحتها۔

فعل :یہ مجہول کا صیغہ ہے اور نائب فاعل من ترك کی ضمیر ہے۔

کذا و کذا من النار :یہ دونوں عدد سے کنایہ ہیں یعنی اس کو کئی گنا عذاب دیا جائے گا۔علامہ طیبیؒ نے یہ فرمایا ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ یا تو اس قبیح ترین امر سے کنایہ ہے جو اس کے ساتھ برتا جائے گا یا یہ شدت وعید سے ابہام ہے۔

فمن ثم :یعنی اس وجہ سے کہ میں نے اس تہدید اور سخت وعید کو سن لیا۔

عادیت راسی :اس بات کے خوف کی وجہ سے کہ کہیں پانی میرے تمام بالوں تک پہنچنا رہ نہ جائے یعنی میں نے اپنے سر کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو ایک دشمن اپنے دشمن سے کرتا ہے اس کو کاٹ کر اور ختم کر کے پس میں نے بالوں کو بالکل صاف کر دیا اور دارمی نے روایت کی ہے اور اسی طرح امام ابوداوٗد نے اس حدیث کے آخر میں یہ نقل کیا ہے: انه یجز شعره کہ حضرت علیؓ اپنے بالوں کا حلق کرتے تھے اور بعض نے کہا ہے کہ عادیت راسی کا مطلب ہے عادیت شعری۔سید جمال الدینؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے حضرت ابوعبیدہؓ سے منقول ہے کہ عادیت راسی کا مطلب ہے کہ میں غسل کے وقت بالوں کو اٹھاتا ہوں (خوب اچھی طرح دھوتا ہوں)۔

فمن ثم عادیت راسی :یعنی میں اپنے سر کے ساتھ وہ معاملہ کرتا ہوں جو ایک دشمن دوسرے کی بیخ کنی اور جڑ سے ختم کرنے کے ساتھ کرتا ہے۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سر کا منڈوانا یہ سنت ہے اس لئے کہ نبی ﷺ نے اس فعل پر تقریر (سکوت) فرمایا ہے (جو کہ سنت کی علامت ہے) اور اس لئے بھی کہ حضرت علیؓ خلفاء راشدین میں سے ہیں ، جن کی سنت کی اتباع کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں یہاں یہ بات مخفی نہیں ہے کہ حضرت علیؓ کا فعل جب حضور ﷺ کی سنت کے، اور اسی طرح بقیہ خلفاء کی سنت کے مخالف ہے یعنی ان سے سر کا نہ منڈوانا ثابت ہے، سوائے حج کے احکام سے فراغت کے بعد تو پھر یہ حلق کرنا رخصت ہوگا نہ کہ سنت۔ واللہ اعلم۔ پھر اس مقام پر ابن حجرؒ نے بھی علامہ طیبیؒ کے کلام کو قابل تامل بتلایا ہے اور میری تقریر کے مثل لمبی تقریر کی ہے۔

ثلاثا : **ای قاله ثلاثا** تین مرتبہ کہنا تاکید کیلئے تھا۔ اگرچہ متن میں دو مرتبہ ذکر ہے (لیکن حضرت علیؓ نے تین مرتبہ کہا) مطلب یہ ہے کہ میری یہ سر کے بالوں سے عداوت کسی اور غرض (زینت اور تنعم) کی وجہ سے نہیں ہے۔ تو (گویا) اس میں حضرت علیؓ ظاہری طور پر متابعت کے چھوڑنے کا عذر بیان کر رہے ہیں اور اس کی وجہ وہ جماع کی کثرت ہے جو کہ کثرت غسل کو واجب کرتی ہے۔

لم یکررا فمن ثم عادیت راسی:

امام ابوداؤد اور دارمیؒ نے صرف ایک مرتبہ پر اکتفاء کیا اور باقی کو ثلاثا کے قول سے ذکر کیا اور یہ حدیث حسن ہے اور اس حدیث کی وجہ سے ترمذی کی سابقہ روایت قوی ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ اس روایت میں ضعف وہ ترمذی کی اسناد میں ہے نہ کہ ابوہریرہؓ اور ترمذی کی مسندوں میں۔

غسل سے وضو ہو جاتا ہے

۴۴۵: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَتَوَضَّأُ بَعْدَ الْغُسْلِ .

(رواه الترمذی وابوداود والنسائی وابن ماجة)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۱۷۹ حدیث رقم ۱۰۷۔ وأخرجه أبوداوٗد فی السنن بمعناه ۱/۱۷۳ حدیث رقم ۲۵۰ وأخرجه النسئی فی السنن ۱/۱۳۷ حدیث رقم ۲۵۲ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۱۹۱ حدیث رقم ۵۷۹۔ وأخرجه أحمد فی المسند ۶/۶۸۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ غسل کے بعد دوبارہ وضو نہیں کرتے تھے۔ اس حدیث کو امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **لا یتوضا بعد الغسل** : یعنی پہلے وضوء پر اکتفاء کرتے ہوئے جو غسل میں کرتے اور وہ سنت ہے یا پانی کے تمام اعضاء تک پہنچنے کی وجہ سے حدث اصغر کا اُٹھ جانا حدیث اکبر کے اُٹھ جانے کے ماتحت مندرج ہے اور یہ (حدث اصغر کا ارتفاع) رخصت ہے۔

وابو داؤد : لیکن امام ابوداؤدؒ نے اس کو معنیً روایت کیا ہے۔

میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ ابوداؤد کے الفاظ جو حضرت عائشہ ؓ سے منقول ہیں، وہ یہ ہیں:

کان رسول الله ﷺ یغتسل ویصلی الرکعتین وصلاة الغداة ولا اراه یحدث وضوء بعد الغسل۔

''حضور ﷺ غسل فرماتے پھر دو رکعت (فجر کی سنتیں) اداء فرماتے اور فجر کی نماز پڑھتے میرا نہیں خیال کہ آپ ﷺ غسل کے بعد نیا وضوء کرتے''۔ (نسائی، وابن ماجہ) ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ علماء نے کہا ہے کہ اس صحیح حدیث: **کان لا یتوضا بعد الغسل من الجنابة** کی وجہ سے دو وضوء اتفاقاً مشروع نہیں ہیں۔

پانی میں اگر پاک چیز مل جائے تو اس سے طہارت جائز ہے

۴۴۶: وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَغْسِلُ رَأْسَهٗ بِالْخِطْمِيِّ وَهُوَجُنُبٌ يَجْتَزِئُ بِذَالِكَ وَلَايَصُبُّ عَلَيْهِ الْمَآءَ. (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ١/١٧٦ حديث رقم ٢٥٦۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جنابت کی حالت میں غسل کے وقت خطمی سے سر کو دھو لیتے تھے اور اسی پر کفایت کرتے اور دوبارہ سر پر خالص پانی نہ ڈالتے تھے۔

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **الخطمی**: خاء کے کسرہ کے ساتھ یہ ایک معروف جڑی بوٹی ہے جس سے صفائی حاصل کی جاتی ہے۔

وهو جنب: یہ جملہ حالیہ ہے۔

یجتزی بذلك: ای یقتصر علی۔ علامہ طیبیؒ نے یہی فرمایا ہے یعنی اس پانی پر اکتفاء فرماتے جس کو آپ ﷺ اپنے سر پر خطمی کے اثر کو زائل کرنے کیلئے بہاتے اور نیا پانی دھونے کیلئے نہ لیتے جیسا کہ حمام وغیرہ میں لوگوں کی عادت ہے کہ میل کو خطمی وغیرہ سے زائل کرتے ہیں پھر نئے پانی کے ساتھ اس کو دھوتے ہیں۔

ولا یصب علیه: ای علی راسه۔

الماء: یعنی خالص پانی خطمی کو زائل کرنے کے لئے بلکہ اس کو اسی حالت پر ٹھنڈک حاصل کرنے کے ارادے سے چھوڑ دیتے تھے، پھر تمام بدن پر پانی بہاتے تھے تاکہ جنابت اُٹھ جائے اور سید جمال الدینؒ نے فرمایا ہے کہ الماء سے خالی پانی یعنی خالص پانی مراد ہے۔ آپ ﷺ صرف خطمی ملے ہوئے پانی پر اکتفاء فرماتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کی سند میں ایک آدمی مجہول ہے۔

حیاء اور پردہ پوشی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے

۴۴۷: وَعَنْ يَعْلٰى قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى رَجُلًا يَغْتَسِلُ بِالْبَرَازِ فَصَعِدَ الْمِنْبَرَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ سِتِّيْرٌ يُحِبُّ الْحَيَآءَ وَالتَّسَتُّرَ فَاِذَا اغْتَسَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَتِرْ (رواه ابوداود والنَّسَائِيُّ وَفِي رِوَايَتِهٖ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ سَتِّيْرٌ فَاِذَا اَرَادَ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّغْتَسِلَ فَلْيَتَوَارَ بِشَيْءٍ۔

أخرجه أبوداوٗد في السنن ٤/٣٠٢حديث رقم ٤٠١٢ـوأخرجه النسائي في السنن ١/٢٠٠حديث رقم ٤٠٦وأخرج أحمد في مسنده نحوه ٤/٢٢٤ـ

ترجمہ: ''حضرت یعلیٰؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو صحراء میں برہنہ حالت میں غسل کرتے ہوئے دیکھا۔ پھر آپ ﷺ وعظاً اور نصیحت کے لیے منبر پر جلوہ افروز ہوئے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بہت حیاء والا ہے۔ یعنی اپنے بندوں سے حیاء داروں کا سا معاملہ کرتا ہے وہ اس طرح کہ انہیں معاف کرتا ہے اور بہت پردہ پوش ہے یعنی اپنے بندوں کے عیوب اور گناہوں پر پردہ ڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ حیاء اور پردہ پوشی کو پسند کرتا ہے لہٰذا جب تم میں سے کوئی صحراء میں غسل کرے تو اس کو چاہئے کہ وہ پردہ کرلیا کرے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے اور نسائی کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ پردہ پوش ہے۔ لہٰذا جب تم میں سے کوئی غسل کا ارادہ کرے تو اس کو چاہئے کہ وہ کسی چیز کا پردہ کرلیا کرے۔''

یہ یعلی بن اُمیہ یا یعلی بن مرۃ ہیں اور یہ دونوں صحابی رسول ہیں۔ مصنفؒ نے ان کو اسماء الرجال میں ذکر کیا ہے۔ لیکن مصنف پر یہ ضروری تھا کہ وہ ان کو رضی اللہ عنہ سے مقید کرتے۔ واللہ اعلم۔

تشریح: **یغتسل**: یعنی بغیر سترہ کے۔

بالبراز: باء کے فتحہ کے ساتھ یعنی کھلی جگہ میں ننگا غسل کر رہا تھا۔

فصعد: عین کے کسرہ کے ساتھ ہے ای طلع۔

فحمد الله واثنى عليه: یہ عطف تفسیری ہے یا حمد بمعنی شکر کے ہے۔

ان الله حيي: دو یاؤں کے ساتھ پہلی مخففہ مکسورہ ہے، اور دوسری مشددہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کریم ہیں بندہ کے ساتھ حیاء والا معاملہ کرتے ہیں، معاف کرنے کے ساتھ اور درگذر کرکے۔

ستير: یہ **فعيل** کے وزن پر مبالغہ کیلئے ہے۔

الحياء: اس لئے کہ حیاء ایمان کا حصہ ہے۔

والتستر: یعنی وہ کہ جس کی حیاء متقاضی ہے اور ایک نسخہ میں (الستر ة) ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ قبیح امور کو چھوڑنے والے ہیں۔ عیوب اور قابل رسوائی باتوں پر پردہ ڈالنے والے ہیں، بندے سے حیاء اور پردے کو پسند کرتے ہیں اس لئے کہ یہ دونوں خصلتیں ایسی ہیں جو بندے کو اللہ تعالیٰ کے اخلاق کے ساتھ متصف ہونے تک پہنچاتی ہیں۔

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ جملہ تعریض کے طور پر ہے۔ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی یہ صفات اس لئے بیان کیں تاکہ اس آدمی کے اس فعل کی حقارت بیان کریں اور اس کو حیاء اور پردے والی صفات حاصل کرنے میں ترغیب دلائیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ حاملین عرش کی یوں صفت بیان کی اپنے اس ارشاد: ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ [الانعام:۹۲] میں مؤمنین کو ملائکہ مقربین کی صفات سے متصف ہونے پر ترغیب دلانے کیلئے۔

فليستتر: یعنی اپنے لئے وہ سترہ بنائے تاکہ اس کو کوئی نہ دیکھے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں غسل وغیرہ کرنے والے کیلئے ایسے محل کی طرف رہنمائی کرنا ہے کہ جہاں لوگ اس کو نہ دیکھ سکیں تا کہ دوبارہ اللہ سے حیاء کرتے ہوئے ایسا نہ کرے اور اسی وجہ سے ہمارے ائمہ نے فرمایا ہے کہ ستر کا خلوت میں بغیر ضرورت کے کھولنا حرام ہے اس لئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ سے حیاء کا چھوڑنا ہے اور میں ان پر یوں رد کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ پر تو کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے اس کے علم اور اطلاع کی طرف نسبت کرتے ہوئے مخفی اور غیر مخفی دونوں برابر ہیں۔ تو ائمہ نے میرے اس اشکال کا جواب یوں دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر چہ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے مگر وہ باپردہ کو ایسی حالت میں دیکھتا جو ادب کی متقاضی ہے تو ان دونوں میں بہت فرق ہے۔

امام ابوداؤدؒ نے اس پر خاموشی اختیار کی ہے۔ میرک شاہ نے اس کو نقل کیا ہے۔

فليتوار بشيء : یہ تواری سے امر ہے۔ پردہ کرنے کے معنی میں ہے۔ شئی سے مراد کپڑا یا دیوار یا پتھر یا درخت ہے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ننگے غسل کرنے والے حکم کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر وہ ایسی جگہ میں غسل کرے جو کہ خالی ہے اور وہاں ان لوگوں میں سے کسی کی نظر اس پر نہ پڑے کہ جن پر اس کے ستر کا دیکھنا حرام ہے تو یہ اس کیلئے جائز ہے لیکن افضل اس صورت میں بھی پردے کو اختیار کرنا ہے اور اگر ایسی جگہ میں کہ جہاں ان لوگوں کی نظر کہ جن پر اس کے ستر کا دیکھنا حرام ہے پڑتی ہو تو پھر اس پر ان سے پردہ کرنا واجب ہے اور یہ اجماع سے ثابت ہے۔

اور بعض حضرات کہ جن کا علم سے کوئی سروکار نہیں ان کو یہ وہم ہوا ہے کہ دیکھنے والے پر نظر کو جھکانا واجب ہے، پس پردہ کرنا لازم نہیں ہوگا یہ کلام ساقط ہے اس لئے کہ نظر کے جھکانے کا وجوب وہ ستر کے کھولنے کو جائز ومباح قرار نہیں دیتا اور اس کو اس مسئلہ پر قیاس نہ کیا جائے جو اجماع سے ثابت ہے کہ عورتوں کے لئے کھلے چہرے نکلنا جائز ہے اور مردوں پر آنکھوں کو پست رکھنا ضروری ہے (یہ قیاس صحیح نہیں چند وجوہ سے) پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ مشقت کی حاجت کی وجہ سے ہے جو راستوں میں چہرے کے ڈھانپنے میں ہوتی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ ان امور میں سے ہے کہ جس میں تسامح (چشم پوشی) برتی جاتی ہے ، بخلاف ننگے غسل کرنے کی صورت کہ اس میں ایسا تسامح نہی ہوتا۔ تسامح کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عورت کا چہرہ وہ ستر میں داخل نہیں ہے اسی وجہ سے مرد کیلئے فتنہ (شہوت) سے امن کی صورت میں دیکھنا مباح ہے، بخلاف ستر خاص (شرمگاہ) کے کہ اس کے دیکھنے کی اباحت کا کوئی بھی قائل نہیں ہے اور اسی طرح ناف اور گھٹنوں کے درمیان کا حصہ۔ ان حضرات کے نزدیک کہ جو اس کو بھی ستر کہتے ہیں، پس پورے ستر کا ڈھانپنا واجب ہے ایسی نظر کے پڑنے سے بچتے ہوئے کہ جس پر اس کا دیکھنا حرام ہے۔ پس نظر کا پڑنا اس کے پردہ نہ کرنے کی وجہ سے ہوگا تو یہ اس کا سبب بنا اور حرام میں سبب بننا اگر چہ وہ حرام کوئی دوسرا کرے یہ بھی حرام ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ:

اَلْمَآءُ مِنَ الْمَآءِ کا حکم منسوخ ہے

۴۴۸: وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ اِنَّمَا كَانَ الْمَآءُ مِنَ الْمَآءِ رُخْصَةً فِيْ اَوَّلِ الْاِسْلَامِ ثُمَّ نُهِيَ عَنْهَا .

(رواہ الترمذی وابوداود والدارمی)

أخرجه الترمذی فی السنن ١/١٨٣ حديث رقم ١١٠ وقال حسن صحيح ۔ وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ١/١٤٦ حديث رقم ٢١٤ ۔ والدارمی فی السنن ١/٢١٣ حديث رقم ٧٥٩ ۔

ترجمہ: ''حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ اَلْمَآءُ مِنَ الْمَآء والاحکم ابتداء اسلام میں آسانی کی وجہ سے تھا۔ بعد میں اس حکم کو منسوخ کر دیا گیا۔ اس حدیث کو امام ترمذی، ابوداؤد اور امام دارمی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: انما کان الماء : یعنی غسل کے واجب ہونے کا انحصار۔

من الماء : یعنی منی کے نکلنے کی وجہ سے تھا نہ کہ محض جماع کی وجہ سے۔

رخصة فی اول الاسلام : احکام کا مکلّف بنانے میں تدریج برتتے ہوئے اسی وجہ سے شروع اسلام میں شراب اور متعہ حلال تھا۔ پھر یہ دونوں حکم منسوخ کر دیئے گئے۔ حضرات صحابہ کرام سب سے پہلے توحید کے مکلّف بنائے گئے پھر کچھ مدت کے بعد ان پر وہ نماز فرض ہوئی کہ جس کا سورہ مزمل کے شروع میں ذکر ہے پھر بعد میں یہ سورہ مزمل کے آخری حصہ سے منسوخ ہو گئی (وہ ناسخ بنی) پھر کچھ مدت کے بعد صحابہ کرام پر نماز کو فرض قرار دیا گیا، پانچ نمازوں کے فرض ہونے کی صورت میں تو ان نمازوں نے پہلی تمام صورتوں کو منسوخ کر دیا پھر مدینہ جانے کے بعد رمضان کے روزے فرض ہوئے پھر اس کے بعد پے در پے فرائض اترے۔ ابن حجرؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

ثم : یعنی اہل اسلام کے مضبوط ہو جانے کے بعد۔

نهی : یہ مجہول کا صیغہ ہے۔

عنها : یعنی اس رخصت سے اور غسل فرض قرار دے دیا گیا اگرچہ انزال نہ بھی ہو۔

امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اسی پر اہل علم کا عمل بھی ہے۔ میرک شاہؒ نے اس کو نقل کیا ہے امام ابوداؤدؒ نے اس پر خاموشی اختیار کی ہے۔ (نقلہ میرک)

دارمی کی سند حسن ہے۔ ابن حجرؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

غسل جنابت میں جسم کا کوئی حصہ خشک رہ جائے تو؟

۴۴۹: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ اِنِّي اغْتَسَلْتُ مِنَ الْجَنَابَةِ وَصَلَّيْتُ الْفَجْرَ فَرَأَيْتُ قَدْرَمَوْضِعِ الظُّفُرِ لَمْ يُصِبْهُ الْمَآءُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوْ كُنْتَ مَسَحْتَ عَلَيْهِ بِيَدِكَ اَجْزَأَكَ ۔

(رواہ ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجة فی السنن ١/٢١٨ حديث رقم ٦٦٤ وفی الزوائد أنه ضعيف لضعف محمد بن عبيد الله ۔

ترجمہ: ''حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے غسل جنابت کیا اور صبح کی نماز پڑھ لی پھر میں نے دیکھا کہ بدن پر ناخن کے برابر جگہ خشک رہ گئی ہے وہاں پانی

نہیں پہنچا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم اس خشک جگہ پر اپنے تر ہاتھ سے مسح کر لیتے تو کافی ہو جاتا۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: فرایت :یعنی میں نے دیکھا اور جانا نماز کے پورا ہونے کے بعد۔

قدر موضع الظفر :الظفر ،فاء کے ضمہ اور سکون کے ساتھ ہے۔ یعنی میرے بدن سے ناخن کی مقدار جگہ۔

مسحت عليه بيدك :یعنی اس جگہ کو غسل خفیف کے ساتھ دھو دیتے یا تر ہاتھ اس پر گزار دیتے۔

اجزاك: ای کفاك اور باقی مسح جو کہ گیلے ہاتھ کا پہنچانا ہے وہ کافی نہیں ہے۔ علامہ طیبیؒ نے یہی ارشاد فرمایا ہے۔

تحقیق آپ کو یہ معلوم ہے کہ لَوْ شئ کے امتناع کیلئے آتا ہے غیر کے امتناع کی وجہ سے، پس معنی یہ ہوگا کہ تیرے لئے کافی نہیں ہے اس لئے کہ تو نے غسل کے زمانے میں اس جگہ پر پانی نہیں پھیرا اور اس میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غسل جدید ہوگا اور نماز قضاء کرے گا۔ غسل جدید سے مراد صرف اسی جگہ کا دھونا ہے۔

اس کے رجال ثقہ ہیں۔ (نقلہ میرک)

ابتداء اسلام میں احکام میں تبدیلی ہوتی رہی

۴۵۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَتِ الصَّلَاةُ خَمْسِيْنَ وَالْغُسْلُ مِنَ الْجَنَابَةِ سَبْعَ مَرَّاتٍ وَغَسْلُ الْبَوْلِ مِنَ الثَّوْبِ سَبْعَ مَرَّاتٍ فَلَمْ يَزَلْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَسْأَلُ حَتّٰى جُعِلَتِ الصَّلَاةُ خَمْسًا وَغُسْلُ الْجَنَابَةِ مَرَّةً وَغُسْلُ الثَّوْبِ مِنَ الْبَوْلِ مَرَّةً ۔ (رواه ابو داود)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ١/ ١٧١ حديث رقم ٢٤٧۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ابتداء میں پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں اور جنابت سے غسل سات مرتبہ تھا اور کپڑے سے پیشاب دھونا سات مرتبہ فرض ہوا تھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ متواتر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے رہے کہ ان میں تخفیف کر دی جائے یہاں تک کہ نمازیں پانچ کر دی گئیں اور غسل جنابت ایک مرتبہ اور کپڑے سے پیشاب کو دھونا ایک مرتبہ کر دیا گیا۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا۔''

تشریح: كانت الصلاة خمسين :علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ معراج کی رات میں پچاس نمازیں فرض ہوئیں تھیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ صحابہ نے پچاس نمازیں پڑھی تھیں اور وہ حدیث معراج مشہور ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ امم سابقہ پر پچاس نمازیں فرض ہونا مراد ہوں اور سی طرح اس کے بعد والا قول (والغسل من الجنابة سبع مرات وغسل البول من الثوب سبع مرات)''اور جنابت سے غسل سات مرتبہ تھا اور کپڑے سے پیشاب دھونا سات مرتبہ فرض ہوا تھا۔'' اور شاید کہ یہ بعض اُمتوں کے اعتبار سے ہے اس لئے کہ بعض اُمتوں پر پیشاب لگے ہوئے مقام کا کاٹنا واجب تھا۔

فلم يزل رسول الله ﷺ يسال :یعنی اپنے رب سے اُمت کے حق میں تخفیف مانگتے رہے بوجہ اس کثرت رحمت اور نرمی کے جو آپ کو عطاء ہوئی تھی۔

سید جمال الدینؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد حضور ﷺ کا اس رات میں بار بار سوال کرنا ہے۔ غور سے سمجھ لو اور ممکن ہے کہ سوال کا تکرار اس رات میں نماز کے حق میں ہو اور باقی معاملات میں سوال یا تو اسی رات میں ہوا یا اس کے علاوہ میں۔ واللہ اعلم۔

حتى جعلت الصلوٰة خمسا: مقدار کے اعتبار سے اور پچاس فضیلت کے دوگنا ہونے کے ساتھ۔

وغسل الجنابة مرة: فرضیت کے اعتبار سے باقی تین مرتبہ وہ سنت ہے۔

وغسل الثوب من البول مرة: ظاہر حدیث یہ امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق ہے کہ ایک بار دھونے سے پاکی حاصل ہو جاتی ہے، اس لئے کہ پانی وہ طہور پاک کرنے والا ہے، پس اس کو ایک مرتبہ استعمال کیا جائے گا تو پاکی حاصل ہو جائے گی (یعنی وہ چیز پاک ہو جائے گی) جیسا کہ بدن نجاست حکمیہ سے پاک ہو جاتا ہے۔

اور ہمارے علماء احناف نے غلبہ ظن کا اعتبار کیا ہے پھر غلبہ ظن کو تین مرتبہ دھونے کے ساتھ مقید کیا ہے اور ہر مرتبہ نچوڑنے کے ساتھ ظاہر الروایہ میں اس لئے کہ غلبہ ظن اکثر اس وقت حاصل ہو جاتا ہے اور تحقیق بعض نے کہا ہے کہ سات کے عدد تک مبالغہ کر کے دھوئے وسوسہ دور کرنے کے لئے۔

اور امام ابو یوسفؒ نے اور محمدؒ سے روایت ہے کہ اگر ناپاک کپڑے پر پانی بہہ جائے، پھر اس کا غلبہ ظن یہ ہو کہ وہ پاک ہو گیا ہے۔ تو پھر بغیر نچوڑنے کے جائز ہے کفایہ میں اسی طرح ہے۔ ابن الملکؒ نے اس کو شرح مجمع میں ذکر کیا ہے۔

اس کی سند حسن ہے جیسا کہ بعض حفاظ حدیث نے کہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ابوداؤدؒ نے اس کو ضعیف قرار نہیں دیا، پس اس سے استدلال ان کے نزدیک صحیح ہے۔ اگرچہ اس کی سند میں ایوب بن جابر ہے اور تحقیق علماء نے اس کو ضعیف قرار دینے میں اختلاف کیا ہے۔

بَابُ مُخَالَطَةِ الْجُنُبِ وَمَا يُبَاحُ لَهٗ

جنبی سے ملنے اور اُس کے لئے جو امور جائز ہیں ان کا بیان

یعنی یہ باب جنبی (ناپاک) آدمی کے ساتھ بیٹھنے اور کلام وغیرہ کے جواز کے بارے میں ہے۔ اجنب الرجل اس وقت کہا جاتا ہے جب آدمی جنبی ہو جائے اور "الجنابة" یہ اسم ہے اور اصل میں جنابت کا معنی ہے "بعد" (دوری) اس لئے کہ جنبی آدمی کو نماز کی جگہ (مسجد) کے قریب جانے سے اور اسی طرح بہت ساری عبادات کے کرنے سے روکا گیا ہے جب تک کہ وہ طہارت حاصل نہ کرے۔

الفصل الاول:

جنابت حکمی نجاست ہے

۴۵۱: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ لَقِیَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَاَنَا جُنُبٌ فَاَخَذَ بِیَدِیْ فَمَشَیْتُ مَعَهٗ حَتّٰی قَعَدَ فَانْسَلَلْتُ فَاَتَیْتُ الرَّحْلَ فَاغْتَسَلْتُ ثُمَّ جِئْتُ وَهُوَ قَاعِدٌ فَقَالَ اَیْنَ كُنْتَ یَا اَبَا هُرَیْرَةَ فَقُلْتُ لَهٗ فَقَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا یَنْجُسُ هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِیِّ وَلِمُسْلِمٍ مَعْنَاهُ وَزَادَ بَعْدَ قَوْلِهٖ فَقُلْتُ لَهٗ لَقِیْتَنِیْ وَاَنَا جُنُبٌ فَكَرِهْتُ اَنْ اُجَالِسَكَ حَتّٰی اَغْتَسِلَ وَكَذَا الْبُخَارِیُّ فِیْ رِوَایَةٍ اُخْرٰی۔

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱/۳۹۱حدیث رقم ۲۸۵۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۲۸۲حدیث (۳۷۱) وأخرجه أبوداؤد بمعناه ۱/۱۵۶حدیث رقم ۲۳۱۔وأخرجه الترمذی مختصرًا فی السنن ۱/۲۰۷حدیث رقم ۱۲۱ وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۱۴۵حدیث رقم ۲۶۹۔وأخرج ابن ماجة فی السنن ۱/۱۷۸حدیث رقم ۵۳۴۔ وأحمد فی مسنده ۲/۳۸۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میری ملاقات ہوئی اور اس وقت میں جنابت کی حالت میں تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور میں آپ کے ساتھ چلنے لگا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ گئے تو میں آہستہ سے چپکے کے ساتھ نکل کر گھر آیا اور غسل کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ مجھے دیکھ کر آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟ میں نے پوری صورت حال آپ کے سامنے ذکر کر دی کہ میں جنابت کی حالت میں تھا اس لئے میں چلا گیا تھا آپؐ نے ارشاد فرمایا سبحان اللہ۔ مؤمن ناپاک نہیں ہوتا اس روایت کے یہ الفاظ بخاری کے ہیں امام مسلم نے اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے اور حضرت ابوہریرہؓ کے مزید یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ میں چونکہ جنابت کی حالت میں تھا۔ اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ آپ کے پاس اس حالت میں بیٹھوں۔ جب تک کہ غسل نہ کرلوں۔ اسی طرح بخاری کی ایک دوسری روایت میں بھی یہی الفاظ منقول ہیں۔

تشریح: لقینی رسول الله ﷺ: حضرت ابوہریرہؓ نے یہاں ملاقات کی نسبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی ہے کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ حالت جنابت میں ملنے کے خواہاں نہ تھے (اس لئے یہ تعبیر اختیار فرمائی)۔

وانا جنب: یہ جملہ حالیہ ہے۔

فاخذ بیدی: مانوس کرنے کیلئے ہاتھ پکڑا اور یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت ابوہریرہؓ کی طرف توجہ کے کمال پر دلالت کرتی ہے اور باقی ابن حجرؒ کا یہاں یہ کہنا کہ ہاتھ کے پکڑنے میں یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ ٹیک لگانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہو یہ توجیہ (سیاق کلام سے) بعید ہے۔

فمشیت معه حتی قعد: اور میں نے اپنا ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے چھڑوالیا۔

فانسللت: نہایہ میں اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ میں وہاں سے بڑی آہستگی اور متانت سے چپکے سے نکل گیا۔ بعض

نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ میں پھر آیا۔ میں نکل گیا اور میں آپ ﷺ سے حیاء کرتے ہوئے اور آپ ﷺ کا ادب کرتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

فاتیت الرحل : یعنی اپنے ذاتی گھر میں جو وہاں تھا اور رحل سے مراد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ذاتی مکان ہے باقی گھر کو رحل کہا تو وہ اس لئے کہ اس کے گھر وہ رحال (کجاووں) کیلئے محل تھے اور مظہرؒ نے فرمایا ہے کہ: "**فاتیت الرحل**" کا معنی ہے کہ "**مابین الرحل**" یعنی کجاوے کے درمیان میں اور مراد وہ سامان ہے جو مسافر کے ساتھ ہوتا ہے اور "رحل" سے مراد وہ جگہ بھی ہوتی ہے کہ جس میں کوئی قوم سکونت اختیار کرے۔ علامہ طیبیؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

وھو قاعد : یہ جملہ مفعول مقدر سے حال واقع ہے۔

این کنت یا ابا ھریرۃ : ان کا اسلام لانے کے بعد نام صحیح مشہور قول کے مطابق عبداللہ ہے، اور ابو ہریرہ ان کی کنیت ہے جو حضور ﷺ نے رکھی تھی، جس وقت آپ ﷺ نے ان کو اپنے کپڑے میں کچھ اٹھائے ہوئے دیکھا تو آپ ﷺ نے فرمایا اے عبدالرحمان یہ کیا ہے؟ کہنے لگے یہ بلی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا "تو ابو ہریرہ (بلی کا باپ) ہے"۔

فقلت له : یعنی میں نے آپ ﷺ کو سارا ماجرا سنایا۔

فقال سبحان الله : یہ حضرت ابو ہریرہؓ کے مسئلہ سے واقف نہ ہونے پر تعجب کرتے ہوئے کہا۔

لا ینجس : جیم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ یعنی اس کی ذات نجس نہیں ہوئی اور یہ صرف مؤمن کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ کافر بھی اسی طرح ہے۔

اور باقی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ [التوبۃ:۲۸] "کہ مشرک ناپاک ہیں" تو اس سے ان کی اعتقادات میں نجاست مراد ہے نہ کہ اصل خلقت میں اور جو حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ کہ ان کی ذوات وہ خنزیر کی طرح ناپاک ونجس ہے اور اسی طرح جو حسنؒ سے مروی ہے کہ جو ان مشرکین سے مصافحہ کرے پس چاہیے کہ وہ وضو کرے۔ یہ دونوں روایتیں مشرکین سے دور رہنے اور ان سے بچنے میں مبالغہ کرنے پر محمول ہیں۔ ابن الملکؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

علامہ بغویؒ نے شرح السنۃ میں فرمایا ہے کہ اس حدیث سے جنبی کے ساتھ مصافحہ اور ملاقات کا جواز ثابت ہوتا ہے اور یہی اکثر علماء کا قول ہے اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جنبی اور حائضہ کا پسینہ پاک ہے۔ نیز اس حدیث میں جنبی کے لئے غسل کو مؤخر کرنے اور اپنی ضروریات میں سعی کرنے کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے۔

قاضیؒ نے فرمایا ہے کہ ممکن ہے کہ اس سے وہ لوگ دلیل پکڑیں جو یہ کہتے ہیں کہ حدث نجاست حکمیہ ہے اور جس پر وضوء اور غسل واجب ہو وہ "حکماً نجس" ہے۔ اور یہ بات اس لئے کہی ہے کہ اگر وہ حکماً ناپاک نہ ہوتا تو اس پر طہارت کا حکم کیوں وارد ہوتا۔ پس آپ ﷺ کے ارشاد "**لا ینجس**" کا مطلب یہ ہے کہ وہ حقیقۃً نجس نہیں ہوتا نہ کہ حکماً (یعنی حکماً نجس ہوتا ہے) یا ظاہراً نجس نہیں ہوتا یا باطناً نجس نہیں ہوتا بخلاف کافر کے کہ وہ اپنے ناپاک عقائد اور خبیث قسم کے اخلاق کی وجہ سے باطنی طور پر نجس ہوتا ہے۔

فقلت له : یعنی اس الفاظ کے بعد زیادتی ہے جو کہ مشتمل ہے اسی بات پر کہ جس کو پہلے ہم نے شرح میں ذکر کیا ہے۔

البخاری فی روایة اخریٰ :یعنی اسی زیادتی کو۔سید جمال الدینؒ نے فرمایا ہے کہ یہ بات محل کلام ہے اس لئے کہ "**حتی اغتسل**" والی عبارت بخاری شریف میں نہیں ہے۔

جنابت کی حالت میں سونے کا حکم

۴۵۲:وَعَنِ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ ذَكَرَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهٗ تُصِيْبُهُ الْجَنَابَةُ مِنَ اللَّيْلِ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَوَضَّأْ وَاغْسِلْ ذَكَرَكَ ثُمَّ نَمْ. (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی الصحیح ۳۹۳/۱حدیث ۲۹۰۔ومسلم فی صحیحه ۲۴۹/۱۔حدیث رقم (۲۵۔۳۰۵) وأخرجه النسائی فی السنن ۱۴۰/۱حدیث رقم ۲۶۰۔وأخرجه الدارمی بمعناه ۲۱۲/۱حدیث ۷۵۶وأخرجه مالك فی الموطأ ۴۷/۱ کتاب الطهارة حدیث ۷۶۔وأحمد فی مسنده ۶۴/۲۔

ترجمه: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے رات میں جنابت ہو جاتی ہے یعنی احتلام یا جماع کی وجہ سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔تو میں ایسی حالت میں کیا کروں ؟ آپ ﷺ نے فرمایا وضو کر کے اور عضو مخصوص کو دھو کر سو جایا کرو۔(بخاری ومسلم)

تشریح: **انه** :یہاں ضمیر یا تو حضرت عمرؓ کی طرف راجع ہے یا ضمیر شان ہے۔

تصيبة الجنابة من الليل :یعنی نیند کے غلبہ کی وجہ سے غسل کرنے میں سستی ہو جاتی ہے۔

واغسل ذكرك :یہ "توضا" پر عطف ہو رہا ہے۔اور اس میں اس اصولی قاعدہ کی دلیل ہے کہ "واؤ" مطلق جمع کے لئے آتی ہے اس لئے کہ غسل (ذکر کا ہونا) وہ وضوء سے مقدم ہوتا ہے اور باقی وضوء کو یہاں ذکر میں مقدم کرنا تو وہ اس کے اہتمام شان اور تبرک حاصل کرنے کی وجہ سے ہے۔علامہ طیبیؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔میرک شاہؒ نے علامہ طیبیؒ کے اس کلام کے بارے میں یہ کہا ہے کہ اس بات کے کہنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔(ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے) میرک شاہؒ کو شاید یہ وہم ہوا کہ علامہ طیبیؒ کے کلام میں غسل سے غُسل مراد ہے کہ جس سے یہ اشکال پیدا ہوا، حالانکہ غَسل سے "غَسل بفتح الغین" ہے جس سے "ذکر کا دھونا مراد ہے"۔اور "لان الغسل" میں الف لام مضاف الیہ کے عوض میں ہے **ای غسل الذکر**۔

اور علامہ طیبیؒ کا قول **وانما قدم** میں "ھو" ضمیر **مستتر** وضو کی طرف راجع ہے اس کو غور سے سمجھ لو۔

اور ذکر کا دھونا مسنون ہے اس پر نجاست ہونے کی وجہ سے نہ کہ گندگی کی وجہ سے جیسا کہ ابن حجرؒ نے اس کو ذکر کیا ہے اپنے مذہب (شافعی) کے مطابق (کہ منی پاک ہوتی ہے)

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں ہمارے مذہب (شافعی) کی صراحت موجود ہے کہ جنبی کیلئے مسنون ہے کہ جب وہ غسل کو سونے یا اور کسی حاجت وغیرہ کی وجہ سے مؤخر کرنے کا ارادہ کرے تو وہ شرعی وضوء کرے جیسا کہ ابھی آئے گا۔

ابن حجرؒ کی اس بات میں تامل ہے اس لئے کہ اس مسئلہ میں کوئی اختلاف معروف نہیں ہے تو پھر **وفيه التصريح لمذهبنا** کہنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔باقی جو اختلاف ہے وہ تو اس مسئلہ میں ہے کہ آیا وضوء عرفی پر اکتفا جائز ہے یا نہیں اور اگر ابن حجرؒ

کی مراد یہاں شرعی وضو کے ترک کی صورت میں کراہت ہو تو اس حدیث میں تو اس پر کوئی دلالت نہیں ہے چہ جائیکہ یہ کہنا کہ اس میں صراحت ہے۔ کیونکہ یہ بات (کراہت کا قول) مواظبت کے اثبات کا محتاج ہے یا اس سے ''نہی'' مقصود مراد لی جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنابت کی حالت میں طعام اور نوم کے لئے وضو کرتے تھے

۴۵۳: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا كَانَ جُنُبًا فَاَرَادَ اَنْ يَّاْكُلَ اَوْيَنَامَ تَوَضَّأَ وُضُوْءَهُ لِلصَّلٰوةِ۔ (متفق عليه)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۲٤۸ حديث رقم (۲۲۔۳۰۵) وأخرجه أحمد في المسند ٦/۱۲٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب جنابت کی حالت میں ہوتے تھے۔ تو کھانا کھانے یا سونے کا ارادہ کرتے تو جس طرح نماز کے لئے وضو ہوتا ہے اسی طرح وضو کر لیا کرتے تھے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: توضأ وضوء ہ للصلوۃ: یعنی شرعی وضو اور وضوء لغوی پر اکتفاء نہیں فرماتے تھے اور وضوء لغوی سے مراد ''منہ کا دھونا'' ہے۔

الفاظ مسلم کے ہیں۔ سید جمال الدینؒ نے سی طرح کہا ہے۔

دو مرتبہ جماع کرنے کے درمیان وضو کرنا

۴۵۴: وَعَنْ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ إِلْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَتٰى اَحَدُكُمْ اَهْلَهٗ ثُمَّ اَرَادَ اَنْ يَّعُوْدَ فَلْيَتَوَضَّأْ بَيْنَهُمَا وُضُوْءًا۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۲٤۹ حديث رقم (۲۷۔۳۰۵) وأخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/۱٤۹ حديث رقم ۲۲۰ وأخرجه الترمذي في السنن ۱/۲٦۱ حديث رقم ۱٤۱ وأخرجه النسائي في السنن ۱/۱٤۲ حديث رقم ۲٦۲۔ وابن ماجة ۱/۱۹۳ حديث رقم ۵۸۷۔ وأحمد في مسنده ۳/۲۱۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے صحبت کرے اور پھر دوبارہ صحبت کرنے کا ارادہ کرے۔ تو اس کو چاہئے کہ دونوں مرتبہ صحبت کے درمیان وضو کر لے۔ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: اذا اتی احدکم اھلہ: یعنی اپنی اہلیہ یا باندی کے پاس آئے یعنی جماع کرے۔

فلیتوضا بینھما: یعنی دو مرتبہ کے درمیان۔ ابن الملکؒ نے فرمایا ہے اس لئے کہ یہ تازگی کا سبب ہے اور نشاط اور لذت حاصل کرنے میں کثرت کا باعث ہے۔ اس حدیث میں اور حضرت عمر کی رضی اللہ عنہ روایت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جنبی کے لئے مستحب ہے کہ وہ اپنے ذکر کو دھوئے اور نماز جیسا وضوء کرے جب کہ وہ کھانے یا پینے یا دوسری مرتبہ جماع کرنے یا سونے کا ارادہ کرے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد کھانے اور پینے میں ہاتھوں کا دھونا ہے اور یہی جمہور کا مذہب ہے اس لئے یہی تفسیر نسائی کی روایت میں ہے۔ حلیمیؒ جو شافعیہ میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ اس سے مراد دوبارہ وطی کرنے میں شرمگاہ کا دھونا مراد ہے۔ ایک روایت کی وجہ سے جس میں یہ ہے: **ثم اراد ان یعود فلیغسل فرجه** ۔بعض نے کہا ہے کہ یہ بھی جمہور کا مذہب ہے۔

وضوءًا: طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہاں مصدر کو تاکید کیلئے لائے ہیں تاکہ یہ وہم نہ رہے کہ وضوء سے مراد وہ وضوء عرفی ہے۔ جیسا کہ کھانے کی صورت میں اور اسی بات کی تائید وہ سابقہ روایت: **توضا وضوء ه للصلوة** بھی کرتی ہے۔

علامہ طیبیؒ کی یہ بات محل تامل ہے اس لئے کہ ظاہر "وضوءًا" "نکرہ" لانے میں کسی بھی درجے کے وضوء کا بتلانا ہے (یعنی مطلق وضو)۔ پس یہ ضوء عرفی کو بھی شامل ہوگا، اس لئے کہ اصل "تنوین" میں "تنکیر" ہے نہ کہ "تعظیم"۔ ہاں زیادہ سے زیادہ یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ بعض روایات میں **وضوء للصلوۃ** کا قید موجود ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں اکمل کی طرف اشارہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ افضل ہے۔ پھر اس وضوء کرنے میں حکمت وہ "حدث" کو کم کرنا اور صفائی حاصل کرنا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ازواج سے شب باشی کرنے کے بعد ایک غسل کیا

۴۵۵: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم يَطُوْفُ عَلٰى نِسَآئِهٖ بِغُسْلٍ وَّاحِدٍ. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۲٤٩/١ حدیث (٢٨۔٣٠٩) أخرجه أبوداؤد فی السنن ١٤٨/١ حدیث رقم ٢١٨۔ وأخرجه الترمذی فی السنن ٢٥٩/١۔ حدیث رقم ١٤٠۔ والنسائی فی السنن ١٤٣/١ حدیث رقم ٢٦٤۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ١٩٤/١ حدیث رقم ٥٨٨۔ وأحمد فی مسنده ٢٢٥/٣۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ازواج سے وظیفہ زوجیت ادا کیا اور آخر میں ایک غسل کیا۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **کان النبی** صلی اللہ علیہ وسلم: یعنی کبھی کبھار۔

علی نسائه: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے جماع فرماتے۔

یغسل واحد: اگر یہ اشکال کیا جائے کہ کم از کم باری کی مدت وہ ایک رات ہر عورت کیلئے ہوتی ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات میں کیسے سب کے پاس تشریف لے گئے۔ تو اس کا جواب یا تو اس طرح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر باری مقرر کرنے کا وجوب یہ "مختلف فیہ" مسئلہ ہے۔

ابوسعید اصطخریؒ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر باری واجب نہ تھی بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو برابری کے ساتھ باری مقرر کرتے تھے، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تبرع اور اکرام تھا۔ لیکن اکثر حضرات کی رائے یہ ہے کہ باری آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب تھی اور باقی ایک رات میں سب کے پاس جانا وہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی رضامندی کے ساتھ تھا (فلا اشکال) اور باقی غسل واحد ہی پر صرف اکتفاء کرنا تو یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم درمیان میں وضوء فرماتے رہے ہوں یا وضوء کو چھوڑ دیا ہوں، بیان جواز کیلئے۔

سید جمال الدینؒ نے فرمایا ہے کہ بخاریؒ نے بھی اس کو روایت کیا ہے، مگر انہوں نے "**بغسل واحد**" کے الفاظ ذکر نہیں کیے ہیں لیکن وہ سیاق کلام سے البتہ سمجھے جاتے ہیں اور میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ بخاریؒ نے قتادہ سے اور قتادہ نے انسؓ سے نقل کیا کہ انسؓ فرماتے ہیں: **كان النبی ﷺ يدور على نسائه في الساعة الواحدة في الليل والنهار وهن احدى عشرة** ۔کہ "حضور ﷺ بسا اوقات رات اور دن میں سے کسی وقت اپنی ازواج کے پاس تشریف لے جاتے (یعنی جماع فرماتے) اور ازواج کی تعداد وہ گیارہ تھیں"۔ امام مسلمؒ نے عورتوں کی تعداد کو ذکر نہیں کیا ہے اور امام بخاریؒ نے غسل کو ذکر نہیں کیا ہے۔

اور حدیث میں احدی عشرۃ سے وہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن مراد ہیں جن سے ایک رات میں وطی کی گئی۔ تو گیارہ بیویوں میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی شامل ہیں حالانکہ وہ تو ازواج کے ساتھ نہ تھیں۔ مواہب اللدنیہ میں یہ مذکور ہے کہ کہ یہ آپ ﷺ کی وہ بیویاں ہیں کہ جن کے ساتھ آپ ﷺ نے ہم بستری فرمائی۔ اس میں اہل سیر کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اور اثر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ (وہ بیویاں یہ تھیں) خدیجہ، عائشہ، حفصہ، اُم حبیبہ، اُم سلمہ، سودہ، زینب، میمونہ، اُم المساکین، جویریہ، صفیہ رضی اللہ عنہن تو پھر زیادہ سے زیادہ اشکال کا یہی جواب دیا جاسکتا ہے کہ یہاں پر بیویوں کو باندیوں پر غلبہ دے کر یہ عدد ذکر کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور بخاریؒ شریف کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت انسؓ سے کہا گیا کہ کیا آپ ﷺ اس کی طاقت رکھتے تھے؟ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ ہم یہ بات کہا کرتے تھے کہ آپ ﷺ کو ۳۰ مردوں کی قوت ملی ہوئی ہے اور اسماعیلیؒ نے حضرت معاذؓ سے "قوۃ اربعین" (۴۰ مردوں کے برابر قوت) کو نقل کیا ہے۔ ابونعیم نے مجاہد سے اس میں یہ زیادتی بھی نقل کی ہے کہ مردوں سے مراد جنتی مرد ہیں (یعنی ۳۰ یا ۴۰ جنتی مردوں کی طاقت) اور ترمذی کے ایک حدیث کہ جس کو امام ترمذیؒ نے صحیح غریب کہا ہے اس میں یہ وارد ہے کہ ہر جنتی مرد کی طاقت وہ (دنیا کے) سو مردوں کے برابر ہے۔ تو آپ ﷺ کو ۴۰۰۰ مردوں کے برابر طاقت دی گئی تھی۔ اس مذکورہ تقریر سے وہ اشکال بھی ختم ہو گیا کہ جس میں یہ کہا جاتا ہے کہ کیا حضور ﷺ کو صرف ۴۰ مردوں کی طاقت ملی تھی حالانکہ سلیمان علیہ السلام کو ۱۰۰ یا ۱۰۰۰ مردوں کے برابر طاقت عطا ہوئی تھی جیسا کہ روایت میں وارد ہے اور باقی حضور ﷺ کی عامۃ الخلق سے وطی اور کم کھانے میں امتیازیت کی حکمت تو وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کیلئے امورِ عادیہ میں دونوں فضیلتوں کو جمع کرنے کا شرف عطا کیا تھا جیسا کہ امورِ شرعیہ میں اللہ نے آپ ﷺ کیلئے دونوں فضیلتوں کو جمع کر رکھا تھا۔ تا کہ آپ کی حالت مبارکہ دنیا و آخرت میں کامل ہو جائے، بلکہ یہ تو خارق عادت (عادت کے خلاف) کام تھا۔ اسلئے کہ اکثر ہی دیکھا گیا ہے کہ غذا کم ہوگی تو قوت جماع بھی اس میں کم ہوگی اور شاید کہ یہی حکمت (جو ابھی گزری) وہ چار عورتوں کے مباح قرار دینے میں بھی ہو۔

اور مذکورہ تقریر سے یہ بات بھی بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ آپ ﷺ اپنی قوت کے بقدر جماع کے معاملے میں انتہائی صبر کرنے والے تھے (کیونکہ قوت تو ۴۰۰۰ مردوں کے برابر اور ایک مرد چار عورتوں کو رکھ سکتا ہے تو آپ ﷺ ۱۶۰۰۰ بیویاں رکھ سکتے تھے۔ لیکن صرف ۱۱ پر اکتفاء فرمایا۔ مترجم) اور یہ بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ کو ۴۰ مردوں کے برابر کھانے کی بھی قوت عطا

ہوئی تھی اس لئے کہ جماع اور اکل میں تلازم ہے تو پھر یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھوک برداشت کرنے کے معاملے میں انتہائی صبر پر دلالت کرتا ہے اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رب کو کھلاتا بھی تھا اور پلاتا بھی تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے ربّ کے ساتھ حضوری ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقویت وتسلی کا باعث تھی اور اس حضوری میں کھانے پینے وغیرہ کا آپ کو شعور بھی نہیں ہوتا تھا (یعنی وہ تقرب کی کیفیات اپنے ماعدا سے مستغنی کر دیتی تھی۔ مترجم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اللہ کے ذکر میں رہتے تھے

۴۵۶: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ (رواه مسلم وحديث ابن عباس سنذكره فِيْ كِتَابِ الْاَطْعِمَةِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى)۔

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٢٨٢ حديث (١١٧-٣٧٣)۔ وأخرجه أبوداوٗد في السنن ١/٢٤ حديث ١٨۔ وأخرجه الترمذي في السنن ٥/٤٣٢ حديث رقم ٣٣٨٤۔ وأخرجه ابن ماجة في السنن ١/١١٠ حديث ٣٠٢۔ وأخرجه أحمد في المسند ٦/٧٠۔ وقد أخرجه البخاري تعليقًا في صحيحه ٢/١١٤ كتاب الاذان باب ١٩۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہتے تھے۔ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت جس کو صاحب مصابیح نے اس موقع پر نقل کیا ہے۔ ہم ان شاء اللہ اس کو کتاب الاطعمہ میں نقل کریں گے۔

تشریح: احیانہ: یہ ''حین'' کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے ''وقت''۔

اشرفؒ نے فرمایا ہے کہ ذکر کی دو قسمیں ہیں: ❶ قلبی اور ❷ لسانی۔ پہلی دونوں میں اعلیٰ ہے اور یہی اس حدیث میں مراد ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا﴾ [الاحزاب: ٤١] ''خدا کا بہت ذکر کیا کرو'' میں اور وہ ذکر قلبی یہ ہے کہ کسی حال میں اللہ تعالیٰ کو نہ بھولے (ہر دم استحضار میں رہے) اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دو قسموں سے وافر حصہ حاصل تھا مگر حالت جنابت اور بیت الخلاء میں جانے کے اوقات، پس اس حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اس قسم پر اکتفاء فرماتے کہ جس میں جنابت کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء سے نکلنے کے بعد غفرانک فرماتے۔ (یعنی ذکر قلبی ان اوقات میں بھی نہ رُکتا تھا)۔

امام بخاریؒ نے اس کو تعلیقاً نقل کیا ہے۔

اور ایک روایت میں ہے: کان یذکر اللہ علی کل احیانہ الا فی الجنابۃ۔ تو یہ روایت ذکر قرآنی پر محمول ہے اور وہ بات کہ جو صحیح روایت میں وارد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انی کرھت ان اذکر اللہ الا علی طھر او طھارۃ کہ ''میں نے اللہ کے ذکر کرنے کو طہارت کے نہ ہوتے ہوئے صحیح نہ سمجھا''۔ تو یہ روایت ذکر لسانی اور کراہت پر محمول ہے۔ اس لئے کہ ذکر لسانی طہارت کے نہ ہوتے ہوئے وہ خلاف افضل ہے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ کراہت اس وقت ہوگی کہ جب اس کو طہارت آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اور بعض شافعیہ نے یہاں عجیب بات کہی ہے کہ محض ذکر قلبی کہ اس میں کوئی ثواب نہیں ہے۔ تو ان حضرات کی اس بات کو ذکر قلبی کے مامور "بہ" ہونے پر محمول کیا جائے گا (یعنی ذکر قلبی کا حکم نہیں ہے) اور باقی اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضوری کی حیثیت سے تو اس میں تو ثواب ہے جو بھی ثواب ہو۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں۔ ابو یعلی نے حضرت عائشہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: **لفضل الذکر الخفی الذی لا یُسمعه الحفظة سبعون ضعفا ......** کہ البتہ ذکر خفی کی فضیلت وہ ذکر خفی کہ جس کو کراماً کاتبین بھی نہیں سن سکتے ستر گنا زیادہ ہے۔ جب قیامت کا دن ہوگا اور اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کو حساب کے لئے جمع کرے گا اور کراماً کاتبین آئیں گے اپنے لکھے ہوئے اور محفوظ کئے ہوئے (رجسٹروں) کے ساتھ آئیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو کہے گا کہ دیکھو اس بندے کی تمہارے پاس کوئی چیز باقی تو نہیں رہی؟ پس وہ کہیں گے جو ہمیں معلوم تھا اور جو ہم نے محفوظ کیا اس میں سے ہم نے کچھ نہیں چھوڑا سب کا سب شمار کر دیا ہے اور ہم نے اس کو لکھ دیا ہے۔ پس اللہ عزوجل ارشاد فرمائیں گے (اے میرے بندے) تیرے لیئے میرے پاس ایک نیکی ہے کہ جس کو تو بھی نہیں جانتا اور (آج) میں اس کا بدلہ دوں گا اور وہ ذکر خفی (ذکر قلبی) ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے بدور السافرہ میں اسی طرح نقل کیا ہے اور جامع صغیر کی روایت کے الفاظ یہ ہے:

الذکر الذی لا یسمعه الحفظة یزید علی الذکر الذی تسمعه الحفظة سبعین ضعفا۔

امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عائشہؓ سے اس کو نقل کیا ہے۔ پس یہ دونوں حدیثیں نقشبندیہ حضرات کیلئے ظاہری دلیلیں ہیں جو کہ اجلاء صوفیاء کا زبدہ (نچوڑ) ہیں۔ **قدس الله اسرارهم العلیه**۔ آمین

پس ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ اعلیٰ درجہ ذکر کا یہ ہے کہ جس میں دل اور لسان دونوں کو جمع کرنا ہو پھر دوسرا درجہ ذکر لسانی کا ہے پھر تیسرا ذکر قلبی کا۔ یہ ان کی غفلت پر محمول ہے اس لئے کہ اگر ابن حجرؒ کی ذکر سے مراد مطلق ذکر ہے، برابر بات ہے کہ شارع نے اس کا حکم دیا ہو یا نہ دیا ہو تو پھر یہ ہماری مذکورہ تقریر اور علماء ظاہر اور باطن کے اجماع سے مردود ہے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ حضور قلبی وہ خالی ذکر لسانی سے افضل ہے اور اگر ذکر سے وہ ذکر مراد ہو کہ جس کا حکم شارع نے دیا ہے تو پھر **:ان اللسانی اعلی من القلبی** کہنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اس وقت ذکر قلبی کا اعتبار نہیں ہوگا سب کا اس پر اتفاق ہے۔

وحدیث ابن عباس: یعنی وہ روایت کہ جو مصابیح میں اس جگہ مذکور ہے کہ جس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے اور وہ حدیث یہ ہے کہ حضور ﷺ کہیں نکلے اور حضور ﷺ کے پاس کھانا لایا گیا تو صحابہؓ نے وضوء کا ذکر کیا یعنی یہ پوچھا کہ کیا ہم وضوء کریں پھر کھانا کھائیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: **ارید ان اصلی فاتوضا** :(ہمزہ محذوف ہے جو استفہام انکاری کیلئے ہے) "یعنی میں نماز کا تو ارادہ نہیں رکھتا کہ میں وضوء کروں"۔

سنذکره فی کتاب الاطعمة: کیونکہ یہ حدیث وہاں ذکر کرنا زیادہ مناسب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

الفصل الثانی:

مرد عورت کے باقی ماندہ پانی سے وضو کرسکتا ہے

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اغْتَسَلَ بَعْضُ اَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ جَفْنَةٍ فَأَرَادَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّتَوَضَّأَ مِنْهُ فَقَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ كُنْتُ جُنُبًا فَقَالَ اِنَّ الْمَآءَ لَايُجْنِبُ (رواه الترمذی وابوداود وابن ماجة وروى الدارمی) **نَحْوَهٗ**۔

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۹٤حدیث ٦٥وقال حسن صحیح۔وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/٥٥حدیث ٦٨۔وأخرج النسائی نحوه فی السنن ۱/۱۷۳حدیث ۳۲٥۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۱۳۲حدیث رقم ۳۷۰وأخرج الدارمی نحوه ۱/۲۰۳حدیث ۷۳٤۔

ترجمہ : ''حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ کی کسی زوجہ مطہرہ نے ایک پانی کے بھرے ہوئے ٹب سے بھر بھر کر غسل جنابت کیا۔جب رسول اللہ ﷺ نے اس کے بعد اسی بچے ہوئے پانی سے وضو کرنے کا ارادہ کیا۔تو ان زوجہ مطہرہؓ نے فرمایا کہ اے اللہ کے رسول! میں نے اس سے غسل جنابت کیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا پانی تو جنبی نہیں ہوتا۔اس حدیث کو امام ترمذی' امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور امام دارمی نے بھی اسی طرح نقل کی ہے۔''

تشریح: بعض ازواج النبی ﷺ :ان سے مراد حضرت میمونہؓ ہیں جو کہ ابن عباسؓ کی خالہ ہیں۔

فی جفنة :یعنی بڑے قسم کے پیالے و برتن میں ہاتھ داخل کر کے پانی لے کر غسل کیا۔یہ تشریح اس لئے کی تا کہ **ان الماء لا یجنب** کے مطابق ہو جائے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے۔کہ ہاتھ کو برتن میں داخل کر کے اس سے چلو بھر بھر کے غسل کیا۔اور ابن حجرؒ نے اس جملہ کو اس پر محمول کیا نہ کہ حضرت میمونہؓ کے اس ٹب و برتن میں غسل کرنے پر جو کہ مالکیہ کی دلیل بنتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ماءِ مستعمل وہ مطہر ہی رہتا ہے۔(چلو بھر بھر کر لینے کی تشریح اس لئے کی) تا کہ آنے والا جواب :**ان الماء لا یجنب** اس کے مطابق ہو جائے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) یہ بات محل تامل ہے کیونکہ آنے والا جواب وہ پانی کے بارے میں دونوں احتمالوں کی صورت میں صحیح بنتا ہے ہاں البتہ مناسب یہ تھا کہ یوں اس کا جواب دیا جائے۔کہ(**فی جفنة** کی عبارت) دونوں باتوں کی محتمل ہے (چلو لے لے کر کیا یا اس برتن میں غسل کیا) پس چلو چلو لے کے غسل کرنے میں مالکیہ کی دلیل نہیں بن سکتی ان کی دلیل جب بنتی ہے کہ اگر حضرت میمونہ نے اس برتن میں غسل کیا ہوتا۔لیکن دلیل جب اس قسم کے احتمالات کو شامل ہو تو وہ کسی کیلئے بھی مستدل نہیں بن سکتی۔پس دونوں فریق کسی اور کی طرف متوجہ ہونگے۔یہ ساری تفصیل اس وقت ہے کہ جب مصابیح کی آنے والی روایت کے الفاظ سے قطع نظر کریں اور اگر اس روایت کو دیکھیں تو پھر یہ روایت بھی مالکیہ کی کسی صورت میں دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ اس میں واضح صراحت ہے کہ غسل وہ برتن سے پانی لے کر کیا نہ کہ اس برتن کے اندر اور یہ کہ اس کے بعد اس برتن میں کچھ

پانی بچ گیا اور اس بچے ہوئے پانی کی طہوریت یہ ماء مستعمل کی طہوریت کی مقتضی نہیں ہے۔

انی کنت جنبا :یعنی میں نے اس پانی سے غسل کیا ہے اور یہ میرے ہاتھوں کا بچا ہوا ہے۔"جنب" یہ مصدر ہے اور اس میں مذکر اور مؤنث دونوں برابر ہیں۔

"**یجنب**" یاء کے ضمہ اور نون کے کسرہ کے ساتھ ہے اور اس میں یاء کا فتحہ اور نون کا ضمہ بھی جائز ہے۔زعفرانی نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ وہ پانی جنبی نہیں ہوتا۔

علامہ تورپشتیؒ نے فرمایا ہے کہ پانی میں جب جنبی ہاتھ داخل کرے تو وہ جنبی نہیں ہوتا۔بعض کے ذہین میں بسا اوقات یہ بات پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ عضو کہ جس پر جنابت ہوتی ہے تمام احکام میں اس عضو کی طرح ہے کہ جس پر نجاست ہوتی ہے پس وہ جنبی عضو کے داخل کرنے سے پانی کی نجاست کا حکم لگتا ہے جیسا کہ نجس کے داخل کرنے سے نجاست کا حکم لگایا جاتا ہے۔تو آپ ﷺ نے ان کیلئے یہ حکم ارشاد فرمایا کہ معاملہ اس کے برخلاف ہے (یعنی جنبی عضو کے داخل کرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا)۔علامہ کا کلام مکمل ہوا۔

پس اگر تو یہ کہے کہ اس حدیث اور فصل ثالث کی حمید حمیری کی روایت میں کیسے تطبیق ہوگی کہ جس میں حضور ﷺ نے مرد کو عورت کے بچے ہوئے پانی سے غسل کرنے سے روکا ہے۔تو جواب میں میں کہتا ہے کہ یہ حدیث جواز پر دلالت کرتی ہے۔اور وہ حدیث ترک اولیٰ (مکروہ تنزیہی) پر۔علامہ طیبیؒ نے اسی طرح کہا ہے۔

امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔سید جمال الدینؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

۴۵۸:وَفِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ عَنْهُ عَنْ مَيْمُوْنَةَ بِلَفْظِ الْمَصَابِيْحِ.

ترجمہ : "اور شرح السنۃ میں مصابیح کے روایت کے مثل روایت منقول ہے۔"

راویٔ حدیث:

میمونہ۔یہ امّ المؤمنین میمونہ ہیں۔حارث کی بیٹی ہیں۔ہلالیہ عامریہ ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ان کا نام "برہ" تھا۔حضور ﷺ نے ان کا نام "میمونہ" رکھا۔پہلے جاہلیت میں "مسعود بن عمرو ثقفی" کے نکاح میں تھیں۔انہوں نے ان کو چھوڑ دیا تو ان سے "ابو رہم" نے نکاح کر لیا۔ابورہم کی وفات کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان سے نکاح کیا۔یہ نکاح ذیقعدہ میں عمرۃ القضا کے ساتویں سال مکہ سے دس میل دور "سرف" نام کے ایک مقام پر ہوا۔قدرت کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ ۶۱ ھ یا ۵۱ ھ میں اسی مقام پر جہاں آپ کا نکاح ہوا تھا'ان کا انتقال بھی ہوا۔سنہ وفات کے بارے میں اور بھی اقوال ہیں۔نمازِ جنازہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پڑھائی۔یہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زوجہ ام الفضل اور اسما بنت عمیس کی بہن ہیں۔یہ آپ ﷺ کی بیویوں میں آخری بیوی ہیں۔کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے ان کے بعد اور کوئی نکاح نہیں کیا۔ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔جن میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی ہیں۔

عرضِ مرتب: مرتب عرض کرتا ہے انکا کچھ ذکر خیر جلد ششم' کتاب النکاح' فصل ثالث کی حدیث کے تحت بھی آئے گا۔

تشریح: عن ميمونة بلفظ المصابيح: اوراس کی سند بھی صحیح ہے اوراس کے الفاظ یہ ہیں، حضرت میمونہ فرماتی ہیں: اجنبت انا ای صرت جنبا ورسول الله ﷺ فاغتسلت من جفنة وفضلت فيها فضلة فجاء النبی ﷺ ليغتسل منها فقلت انی قداغتسلت منها فاغتسل النبی عليه السلام ای منها وقال ان الماء ليس عليه جنابته۔

اورایک روایت میں ان الماء لا يجنب ہے۔

شرح السنۃ کے شارح ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے یہ گمان کیا تھا کہ پانی نجاست حقیقۃً کی طرح نجاست حکمیہ سے بھی ناپاک ہوجاتا ہے اس لئے کہ انہوں نے اپنا ہاتھ اس میں داخل کیا تھا، تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پانی پر نجاست حکمیہ نہیں آتی پس وہ مطہر ہونے سے نہیں نکلتا اس لئے کہ غسل کرنے والا برتن میں ہاتھ داخل کرنے سے ہاتھ کے اوپر سے جنابت ختم کرنے کی نیت نہیں کرتا۔

اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد: ان الماء لا يجنب یعنی پانی جنابت کے حکم کو نہیں لیتا اور اس جیسے فعل سے وہ ایسی حالت میں نہیں ہوجاتا، کہ اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

غسل کرنے کے بعد جنبی کے ساتھ لپٹنے میں کوئی حرج نہیں ہے

۴۵۹: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَغْتَسِلُ مِنَ الْجَنَابَةِ ثُمَّ يَسْتَدْفِئُ بِىْ قَبْلَ اَنْ اَغْتَسِلَ ۔ (رواه ابن ماجة وروى الترمذى نَحْوَهٗ وَفِىْ شَرْحِ السُّنَّةِ بِلَفْظِ الْمَصَابِيْحِ)

أخرجه ابن ماجة فى السنن ۱/۱۹۲ حديث رقم ۵۸۰۔ وأخرج الترمذى نحوه ۱/۲۱۰ حديث رقم ۱۲۳۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ غسل جنابت کرنے کے بعد میرے جسم کے ساتھ لپٹ کر گرمی حاصل کرتے تھے اور میں نے ابھی تک غسل نہیں کیا ہوتا تھا۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے بھی اسی کے مثل روایت نقل کی ہے اور شرح السنۃ میں مصابیح کے روایت کے مثل روایت منقول ہے۔

تشریح: ثم يستدفی بی: یعنی گرمی حاصل کرتے۔ يستدفی "دفاء ة" سے اور "دفاء ة" دال اور فاء کے فتحہ اور مد کے ساتھ ہے جس کا معنی ہے حرارت اور گرمی حاصل کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ اپنے اعضاء کو میرے اعضاء پر رکھتے بغیر کسی چیز کے پردے سے۔

سید جمال الدینؒ نے فرمایا ہے "یعنی مجھ سے حرارت کو طلب کرتے"۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ﴿لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ﴾ [النحل: ۵] "یعنی تمہارے لئے ان میں وہ چیز ہے کہ جس کے ذریعے تم گرمی حاصل کرتے ہو" اور اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جنبی کی ظاہری جلد وہ پاک ہے اس لئے کہ گرمی وحرارت کا حاصل کرنا وہ صرف کھال کو کھال سے ملانے سے حاصل ہوتا ہے۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح فرمایا ہے اور اس میں بحث ہے اور شاید کہ علامہ طیبیؒ کا وفیہ بحث سے مراد یہ ہو کہ "استدفاء" (گرمی وحرارت حاصل کرنا) وہ کپڑے کے ساتھ بھی تو ہوسکتا ہے۔ پس ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ اس میں جنبی کی طہارت کی

تصریح ہے یہ صحیح نہیں ہے۔

اس کی سند حسن ہے۔

ترمذیؒ نے فرمایا ہے یہ ایسی حدیث ہے کہ جس کی اسناد میں کوئی حرج نہیں ہے۔ سیدؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

وفی شرح السنة بلفظ المصابیح :اور شرح السنۃ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں ۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:
كان رسول الله ﷺ يجنب فيغتسل ثم يستدفى قبل ان اغتسل۔

بغیر وضو کے قرآن کی تلاوت جائز ہے

۴۶۰ :وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَخْرُجُ مِنَ الْخَلَاءِ فَيُقْرِئُنَا الْقُرْاٰنَ وَيَاْكُلُ مَعَنَا اللَّحْمَ وَلَمْ يَكُنْ يَحْجُبُهُ اَوْ يَحْجُزُهُ عَنِ الْقُرْاٰنِ شَيْءٌ لَيْسَ الْجَنَابَةَ۔ (رواه ابوداود والنسائی وروی ابن ماجة نحوه)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۱۵۵ حدیث ۲۲۹ ـ وأخرجه السائی فی السنن ۱/۱٤٤ حدیث رقم ۲٦٥ وأخرج ابن ماجة نحوه ۱/۱۹٥ حدیث رقم ٥۹٤ ـ ورواه الترمذی مختصرًا فی السنن ۱/۲۷۳ حدیث ۱٤٦ ـ وقال حسن صحیح ـ وأخرجه فی مسنده ۱/۸٤ ـ

ترجمہ : حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بیت الخلاء سے نکلنے کے بعد ہمیں قرآن پڑھاتے تھے اور اسی وقت ہمارے ساتھ گوشت کھا لیتے تھے۔ آپ ﷺ کو قرآن پڑھنے سے سوائے جنابت کے کوئی چیز نہیں روکتی تھی۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے اور امام ابن ماجہ نے بھی اسی کے مثل روایت نقل کی ہے۔

تشریح: **فیقرئنا** :''یاء'' کے ضمہ اور ''راء'' کے کسرہ کے ساتھ **ای یعلمنا۔**

ویاکل معنا اللحم :طیبیؒ نے فرمایا ہے۔ شاید کہ گوشت کے کھانے کو قرآن پاک کی قراءت سے ملانے میں ان دونوں کو جمع کرنے کے جواز کا بتلانا ہو۔ بغیر وضوء یا بغیر کلی کے جیسا کہ نماز میں (کہ نماز کیلئے بھی کھانے کے بعد وضوء یا کلی ضروری نہیں)۔

ولم یکن یحجبه او یحجزه :یہ شک راوی کی طرف سے ہے۔ معنی ہے ''**یمنعه**''

عن القرآن :چہ جائیکہ وہ کھانے وغیرہ سے روکے۔

شیء :یعنی **شیء من الاشیاء۔**

لیس :**ای ذلك ۔**

الجنابة :''جنابة'' یہاں منصوب ہے اور مراد ''**الا الجنابة**'' ہے۔ تورپشتیؒ نے فرمایا ہے کہ ''**لیس**'' ''**الا**'' کے معنی میں ہے تو کہے گا: **جاء نی القوم لیس زیدا**۔ ''**لیس**'' میں ضمیر اس کا اسم ہے۔ اور یہ اپنی خبر کو نصب دیتا ہے گویا کہ تو نے کہا ہے **لیس الجائي زیدا۔**

وروى ابن ماجة نحوه :یعنی اس کے ہم معنی روایت کی ہے اور صاحب تخریج المصابیح نے امام ترمذیؒ کی طرف بھی اس حدیث کی نسبت کی ہے اور کہا ہے کہ امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

اور بعض اہل لغت اسی حدیث کو ضعیف و کمزور قرار دیتے ہیں اس لئے کہ عبداللہ بن سلمہ جو حضرت علیؓ سے اس روایت کو نقل کرنے والے ہیں انہوں نے اس روایت کو بڑھاپے کے (حفظ کے تغیر) بعد نقل کیا ہے۔ سید جمال الدینؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے اور میرک شاہؒ نے تقریب التہذیب سے یہ بات نقل فرمائی ہے کہ عبداللہ بن سلمہ "لام" کی کسرہ کے ساتھ یہ مرادی ہیں اور کوفی ہیں، اور صدوق ہیں ان کے حفظ میں (آخر میں) تغیر آ گیا تھا طبقہ ثانیہ میں سے ہیں۔

جنبی اور حائض کے لئے قرآن کی تلاوت جائز نہیں

۴۶۱: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَقْرَءُ الْحَآئِضُ وَلَا الْجُنُبُ شَيْئًا مِنَ الْقُرْآنِ۔

(رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۲۳٦ حدیث رم ۱۳۱ وتکلم فیه۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۱۹٦ حدیث رقم ۵۹٦۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حیض والی عورت اور جنبی قرآن کریم کا کوئی حصہ بھی تلاوت نہیں کر سکتے۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **لا تقرأ** :ابن الملکؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ صیغہ "نہی" کا ہے اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں یہ "نفی" ہے، "نہی" کے معنی میں۔ پہلی صورت "لا تقرأ" ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ملانے کی صورت میں پڑھا جائے گا التقاء ساکنین کی وجہ سے اور دوسری صورت میں ہمزہ پر ضمہ ہوگا۔ ابن ضیاء نے شرح مجمع میں فرمایا ہے کہ یہ صیغہ "جزم" کے ساتھ ہے۔ اور "رفع" کے ساتھ بھی مروی ہے۔ اور خلجانی نے فرمایا ہے "لا" یہاں "نفی" کے لئے ہے۔ لیکن اکثر نسخوں میں یہ صیغہ "رفع" کے ساتھ "نفی" کیلئے ہے۔

الحائض :اور اسی طرح نفاس والی عورتیں۔

ولا الجنب :یہ زیادتی ہے تاکید کیلئے۔ اور ابن حجرؒ کے نسخہ میں **الجنب ولا الحائض** وارد ہے اور یہ "سہو" ہے صحیح نسخوں کے مخالف ہے۔

شیئا من القرآن :یعنی نہ ہی قلیل اور نہ ہی کثیر اور یہی امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ بسم اللہ الحمد للہ کو ذکر کے ارادے سے کہنے کی گنجائش ہے۔ امام مالکؒ نے حائضہ کیلئے تلاوت قرآن نسیان کے خوف کی وجہ سے جائز قرار دی ہے اور جنبی کیلئے آیت کا کچھ حصہ نہ کہ پوری آیت۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں ایک روایت امام مالک کی طرح اور اصح روایت ان میں سے وہ امام شافعیؒ کی طرح ہے جیسا کہ ابن الملکؒ نے اس کو ذکر کیا ہے۔ اور شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ علماء اس پر متفق ہیں کہ جنبی کیلئے تلاوتِ قرآن جائز نہیں ہے اور یہی ابن عباسؓ کا قول بھی ہی ہے۔ اور عطاءؒ فرماتے ہیں کہ حائضہ نہیں پڑھے گی مگر صرف آیت۔

ابن ماجہؒ نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور امام بخاری و ترمذیؒ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔اسی طرح امام بیہقی نے بھی اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔سید جمال الدینؒ نے صاحب تخریج المصابیح سے اس کو نقل کیا ہے۔لیکن اس حدیث کے متابع موجود ہیں جیسا کہ ابن ماجہ وغیرہ نے اس کو ذکر کیا ہے جو اس کے ضعف کی کمی کو پورا کرتے ہیں۔اور اسی وجہ سے امام منذریؒ نے اس کو حسن قرار دیا ہے اور اس کے ہم معنی جتنی بھی روایات ہیں ساری کی ساری ضعیف ہیں اور اسی وجہ سے ابن المنذر اور دارمی نے حضرت ابن عباسؓ اور بعض دوسرے حضرات کی روایت کو اختیار کیا ہے اور یہی مذہب امام احمد وغیرہ نے بھی اپنایا ہے۔کہ جنبی اور حائضہ کے لئے سارے قرآن کی تلاوت کرنا جائز ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جمہور حضرات اس مسئلہ میں حرمت کے قائل ہیں اس لئے حرمت ہی قرآنِ پاک کی تعظیم کے لائق ہے اور اس حرمت پر دلالت کے لئے وہ روایات کافی ہیں، جن میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے۔اگر چہ ساری کی ساری ضعیف ہی کیوں نہیں ہیں اس لئے کہ اس میں تعدد طرق ہے وہ ایک قسم کی قوت پیدا کر دیتا ہے اور حدیث ضعیف کو درجہ حسن لغیرہ تک پہنچا دیتا ہے اور حسن لغیرہ احکام میں حجت بن سکتی ہے۔پس حق بات یہاں پر وہ حرمت ہے۔اس لئے یہی حرمت ادلہ کے قواعد پر جاری ہونے والی ہے نہ کہ حلت اگر چہ حلت اصل ہے۔جیسا کہ ابن حجرؒ نے اس کو ذکر کیا ہے۔

جنبی اور حائض کے لئے مسجد عبور کرنے کا مسئلہ

۴۶۲: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَجِّهُوْا هٰذِهِ الْبُيُوْتَ عَنِ الْمَسْجِدِ فَاِنِّیْ لَآ اُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَّلَا جُنُبٍ۔ (رواہ ابو داود)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۱/۱۵۷ حدیث رقم ۲۳۲۔

ترجمہ : حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اپنے مکانوں کے دروازے مسجد کی طرف سے پھیر دو کیونکہ حیض والی عورت اور جنبی کے لئے مسجد میں داخل ہونا چاہئے وہاں ٹھہرنے کے لئے ہو یا گزرنے کے لئے ہو درست نہیں۔اس حدیث کو امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: بیوت "باء" کے کسرہ کے ساتھ بھی ہے اور ضمہ کے ساتھ بھی

عن المسجد: بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ لفظ جب "عن" کے ساتھ مستعمل ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے "ایک جانب سے دوسری جانب پھیرنا" اور "الی" کے ساتھ اگر استعمال ہو تو معنی ہوتا ہے "کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا"۔تو مطلب یہ ہے کہ ان گھروں نے دروازوں کو جو مسجد کی طرف کھلتے ہیں دوسری حرف پھیر دو، تا کہ جنبی اور حائضہ مسجد سے نہ گزریں۔امام مالکؒ کے قول کے مطابق (یہی ہے) اور امام شافعیؒ عبور کو جائز قرار دیتے ہیں نہ کہ ٹھہرنے کو اور امام احمدؒ دونوں کو جائز قرار دیتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مرور بھی حرام ہے۔ابن الملکؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ : **وجهوا** یہ "صرف" کے معنی کو شامل ہے کہا جاتا ہے: **وجه الیه ای اقبل** اور **وجه عنه ای صرف** اور اسم اشارہ کے ذکر کرنے میں اشارہ ہے بیوت کے حقیر ہونے کی طرف اور مساجد کی شان کی تعظیم کی طرف۔

فانی لا احل المسجد لحائض و لا جنب: یہ جملہ ''تعلیلیہ'' ہے۔اوراس وصف کا بیان ہے جو کہ حکم کی علت ہے۔ شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ جنبی اور حائضہ کے لئے مسجد میں ٹھہرنا جائز نہیں ہے اور یہی امام شافعیؒ اور مالکؒ اوراصحاب ابی حنیفہ کا مذہب ہے اورامام شافعیؒ نے مرور کو جائز قرار دیا ہے اور یہی امام مالکؒ کا مذہب ہے اورامام احمد اور مزنیؒ نے ٹھہرنے کو بھی جائز قرار دیا ہے۔اورقرآنِ پاک کی آیت: **عابری سبیل ان مسافرین** کے ساتھ کی ہے کہ جو جنبی ہو جائیں، پس تیمّم کریں اور نماز پڑھیں۔

امام ابوداوٗدؒ نے اس کوافلت بن خلیفہ کے طریق سے اس کو نقل کیا ہے جسرۃ بنت دجاجہ سے۔

امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ: **عند جسرة عجائب** کہ جسرہ بھی عجیب عجیب باتیں بیان کرتی ہیں اور بیہقی نے فرمایا ہے کہ جسرۃ قابلِ نظر ہیں (متکلم فیہا ہیں) اور علامہ خطابیؒ نے فرمایا ہے کہ علماء نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، اور علماء فرماتے ہیں کہ ''افلت'' جو اس حدیث کا راوی ہے وہ مجہول ہے۔اس کی حدیث قابل استدلال نہیں ہے اور علامہ نوویؒ نے اس حدیث کو احادیث ضعیفہ میں نقل کیا ہے۔سیدؒ نے صاحب تخریج سے اسی طرح نقل کیا ہے۔لیکن امام ابوداوٗدؒ نے اس کو ضعیف قرار نہیں دیا، پس یہ حدیث ان کے نزدیک قابلِ احتجاج ہے۔اوراسی وجہ سے ابن القطان وغیرہ نے اس کو حسن قرار دیا ہے، باوجود یہ کہ ان کو یہ علم تھا کہ اس کو ایک جماعت نے ضعیف قرار دیا ہے اور ابن ماجہ نے بھی اس کے ہم معنی روایت کی ہے اور اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا﴾ [النساء:٤٣] ''مؤمنو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو جب تک (ان الفاظ کو) جو منہ سے کہو سمجھنے (نہ) لگو نماز کے پاس نہ جاؤ (یہ آیت حرمت شراب کی آیت سے منسوخ ہے) اور جنابت کی حالت میں بھی (نماز کے پاس نہ جاؤ) جب تک کہ غسل (نہ) کر لو'' بھی اس کے موافق ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض دوسرے حضرات یہاں یوں تشریح فرماتے ہیں کہ: **لاتقربوا مواضع الصلٰوۃ** ''یعنی مساجد کے قریب نہ جاؤ ان حالتوں میں'' تو یہاں صرف مساجد مراد ہیں اس لئے کہ مساجد ہی نماز کے لئے ابتداءً اور دواماً بنائی گئیں ہیں بخلاف مساجد کے علاوہ کے (کیونکہ وہ ابتداء عبادت کے لئے نہیں بنائی گئیں)۔

امام مزنی، داوٗد، اور ابن المنذ روغیرہ حضرات کا مذہب یہ ہے کہ مطلقاً حائضہ اور جنبی کے لئے مسجد میں ٹھہرنا مباح ہے اور امام نوویؒ ان کے قول کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ اصل اشیاء میں حلت ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ جس نے حرمت ثابت کی ہے اس کے پاس کوئی صریح دلیل نہیں ہے۔امام نوویؒ فرماتے ہیں اور وہ حدیث کہ جس میں یہ ہے: **یا علی لا یحل لاحد یجنب فی ھذاالمسجد غیری وغیرك**۔کہ ''اے علی میرے، اور تیرے علاوہ کسی کو جنابت کی حالت میں مسجد میں داخل ہونا حلال نہیں ہے''۔تو یہ حدیث ضعیف ہے اگرچہ امام ترمذیؒ نے اس کو حسن غریب کہا ہے۔ہاں البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جنابت کی حالت میں مسجد میں ٹھہرنا جائز تھا۔جیسا کہ صاحب تلخیص نے فرمایا ہے۔

لیکن قفالؒ نے اس بات کی مخالفت کی ہے اور امام الحرمین وغیرہ نے اس کو غلط قرار دیا ہے۔اس کے باوجود حدیث مذکور سے استدلال کیا ہے، اور کہا ہے کہ یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے پس شاید کہ امام ترمذیؒ کے نزدیک یہ حدیث اس درجہ قوت کو پہنچی ہو جو اس کے حسن ہونے کی متقاضی بنی لیکن جب حضرت علیؓ اس معاملے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہو گئے تو پھر یہ

حضور ﷺ کی خصوصیت نہ رہی۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس بات میں بحث ہے اس لئے کہ ممکن ہے کہ یہ حضور ﷺ کی خصوصیت ہو اور اس کے باوجود حضور ﷺ جس کو چاہیں اس خصوصیت کے ساتھ خاص فرمائیں تو یہ مطلق اختصاص سے بھی زیادہ خاص ہے۔ واللہ اعلم۔

تصویر کی ممانعت

۴۶۳: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَدْخُلُ الْمَلَآئِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ صُوْرَةٌ وَلَا كَلْبٌ وَلَا جُنُبٌ۔ (رواہ ابوداود والنسائی)

أخرجه أبوداؤد فى السنن ١/١٥٣ حديث رقم ٢٢٧ ـ والنسائى فى السنن ١/١٤١ حديث رقم ٢٦١ ـ وأخرجه ابن ماجة فى السنن ٢/١٢٠٣ حديث ٣٦٥٠ وأخرجه أحمد فى مسنده ١/٨٣ ـ وأخرجه الدارمى فى السنن ١/٣٦٩ حديث رقم ٢٦٦٣ ـ

ترجمہ : حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جس گھر میں تصویر یا کتا یا جنبی آدمی ہو اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **لاتدخل** : یہ مؤنث اور مذکر دونوں طرح مروی ہے۔

الملائکة : ''لام'' یہاں پر عہد ذہنی کے لئے ہے یعنی وہ فرشتے کہ جو رحمت اور برکت لے کر اُترتے ہیں اور زیارت کے لئے اور ذکر کو سننے کیلئے ان فرشتوں سے کراماً کاتبین مراد نہیں ہیں کیونکہ وہ مکلفین سے کسی حال میں بھی پلک جھپکنے کی مقدار بھی جدا نہیں ہوتے۔

بیتا فیه صورة : یعنی کسی حیوان کی تصویر ہو جو کسی اونچی جگہ پر ہو جیسے کہ دیوار اور چھت نہ کہ وہ تصویر جو قالین اور قدموں کی جگہ میں ہو۔ پس بے شک ذی روح کی تصویر میں عدم رخصت وارد ہے تصویر کی حرمت کی وجہ سے اور بتوں والے گھر سے اس کی مشابہت کی وجہ سے بخلاف اس صورت کے کہ جو ذی روح کی نہ ہو اور اسی طرح وہ تصویر کہ جس کے بدن مشاہد سے وہ حصے مفقود ہوں کہ جن کے بغیر حیات ممکن نہیں ہوتی جیسے کہ سر (یعنی اگر تصویر میں سر نہ ہو تو وہ بھی اس حکم میں داخل نہیں) پس یہ دونوں تصویریں ملائکہ کے دخول کو نہیں روکتیں اس لئے کہ اس میں کوئی ممنوعیت کسی اعتبار سے بھی نہیں ہے اور اسی طرح بخلاف اس تصویر کے کہ جس کا دوام حلال ہے اگرچہ اس کا شروع میں رکھنا حرام ہے جیسا کہ وہ صورت جو اس چیز پر ہو کہ جس کو روندا جاتا ہو یا اس پر ٹیک لگائی جاتی ہو۔ پس بے شک یہ تصویر بھی ملائکہ کے دخول کو نہیں روکتی جیسا کہ شارحین نے نقل کیا ہے اور اسی طرح یہ حکم اس صورت کو بھی شامل ہے جو ان دراہم پر ہو جو بلادِ کفار سے لائے گئے ہوں۔ پس جس کے پاس ان میں سے کچھ ہو۔ تو یہ فرشتوں کے دخول کو روکنے والی ہے اگرچہ ان دراہم کا پاس رکھنا حلال ہے بلکہ اگر ان دراہم کو اپنے پاس رکھے اگرچہ عمامہ ہی میں کیوں نہ رکھے (تو جائز ہے) اس لئے کہ مقصود ان دراہم کی ذات ہے نہ کہ وہ صورت جو اس پر ہے اور اس لئے بھی کہ مسلمان ہمیشہ ان کو اپنے پاس رکھتے ہیں اور سلف و خلف میں سے کسی ایک نے بھی اس پر انکار نہیں کیا ہے لیکن مناسب یہ ہے کہ منع دخول

ملائکہ اس کو صرف اس محل پر بند رکھا جائے کہ جس میں صرف دنانیر ہوں اور یہ بات حدیث کے الفاظ سے ماخوذ ہوتی ہے۔ خوب سمجھ لو اور مناسب یہ ہے کہ اسی طرح کھیلنے والی گڑیوں کو بھی مستثنیٰ کر دیا جائے ان بچیوں کے لئے جو ابھی تک بالغ نہ ہوئی ہوں۔ حضرت عائشہؓ کی حدیث کی وجہ سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان گڑیوں کے بارے میں تقریر (خاموشی) کی وجہ سے (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے پاس جو گڑیا تھیں اس پر خاموشی فرمائی منع نہیں فرمایا چنانچہ یہ تقریر اجازت کی دلیل ہے)۔

ولا کلب :اس لئے کہ کتا نجس ہے اور ملائکہ پاک ہیں پس وہ گھر کہ جس میں کتا ہے بیت الخلاء یعنی بول و براز کی جگہ کے مشابہ ہو گا لیکن شکاری کتا اور کھیتی اور ریوڑ کی حفاظت کے لئے جو کتا ہوتا ہے اس کو رکھنا شرعاً جائز ہے ضرورت کی وجہ سے۔

ولا جنب :یعنی وہ جنبی کہ جو غسل کو سستی کی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے، یہاں تک کہ اس پر نماز کا وقت گزر جاتا ہے۔ کیونکہ یہ شریعت کو ہلکا سمجھنے والا ہے نہ کہ اس سے ہر جنبی مراد ہے۔ پس بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک غسل کے ساتھ تمام عورتوں کے پاس تشریف لے جاتے تھے (یعنی صرف آخر میں فارغ ہو کر غسل کرتے تھے) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنبی ہونے کی حالت میں (بسا اوقات) رات کو سو جاتے تھے۔ طلوع فجر تک حتیٰ کہ رمضان میں بھی اور وہ جنبی نہیں۔ جو زنا کی وجہ سے جنبی ہوا ہو اس لئے مراد وہی جب ہے کہ جس کا ذکر آئندہ حدیث میں **والجنب الا ان یتوضا** ''جنبی جب تک کہ وضو نہ کرلے'' سے آ رہا ہے۔

ابن ماجہ نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ تینوں حضرات نے اس سند کے ساتھ مرفوع نقل کیا ہے۔ عبداللہ بن یحییٰ عن علی کرم اللہ وجہہ۔ امام بخاریؒ نے فرمایا عبداللہ بن یحییٰ حضرمی عن ابیہ عن علیؓ، والی سند یہ قابل نظر ہے۔ طبریؒ نے فرمایا کہ ابو حاتم نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ سیدؒ نے صاحب تخریج سے اس کو نقل کیا ہے۔ میرک شاہؒ نے فرمایا ہے شیخین نے ابو طلحہ زید بن سہل انصاری کی حدیث کی تخریج کی ہے وہ فرماتے ہیں:

سمعت رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم يقول لا تدخل الملئكة بيتا فيه كلب ولا صورة۔

کافر کے بدن کے قریب رحمت کا فرشتہ نہیں آتا

۴۶۴ :وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم ثَلاَ ثَةٌ لَا تَقْرَبُهُمُ الْمَلَائِكَةُ جِيفَةُ الْكَافِرِ وَالْمُتَضَمِّخُ بِالْخَلُوْقِ وَالْجُنُبُ اِلَّا اَنْ يَتَوَضَّأَ۔ (رواہ ابو داود)

أخرجه أبو داؤد في السنن ٤/٤٠٤ حديث رقم ٤١٨٠۔

ترجمہ : حضرت عمار بن یاسرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین آدمی ایسے ہیں کہ رحمت کے ملائکہ ان کے قریب نہیں آتے کافر کا بدن، خلوق خوشبو لگانے والا، جنبی جب تک کہ وضو نہ کرلے۔ (ابوداؤد)

تشریح: لا تقربهم :یہ صیغہ مذکر اور مؤنث دونوں طرح مروی ہے۔

الملائكة :یعنی ملائکہ رحمت۔

جيفة الكافر :یعنی کافر کا جسم جو کہ بمنزلہ مردار کے ہے اس لئے کہ وہ نجاست سے احتراز نہیں کرتا جیسے کہ شراب، خنزیر

خون وغیرہ۔ چاہے وہ زندہ ہو یا مردہ دونوں باتیں برابر ہیں۔

المتضمخ : یعنی ملنے والا۔

بالخلوق : ''خاء'' کے فتحہ کے ساتھ ہے اور یہ ایسی خوشبو ہے کہ جس کا رنگ ہوتا ہے اور یہ زعفران وغیرہ سے بنائی جاتی ہے۔ اور اس پر سرخی زردی کے ساتھ غالب ہوتی ہے۔

بعض روایات میں اس کی اباحت وارد ہے اور دوسری بعض روایات میں نہی وارد ہے اور نہی والی روایت اکثر ہیں (لہٰذا وہ ناسخ ہونگی) اور یہ نہی مردوں کے ساتھ مختص ہے نہ کہ عورتوں کے ساتھ اور فرشتے ایسے آدمی کے قریب اس لئے نہیں آتے کہ یہ آدمی خواہشات کی اتباع میں انتہائی تجاوز کرنے والا ہے اور عورتوں کے ساتھ مشابہت کرنے والا ہے۔ یہ ابن الملکؒ نے فرمایا ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کے اندر اس بات کا بتلانا مقصود ہے کہ جو آدمی سنت کی مخالفت کرے اگرچہ ظاہر میں وہ تزین وآرائش کیئے ہوئے ہو اور خوشبو لگائے ہوئے ہو اور لوگوں کے ہاں بڑا معزز سمجھا جاتا ہو۔ پس یہ آدمی حقیقت میں ناپاک ہے کتے سے بھی زیادہ ذلیل وحقیر ہے۔

والجنب الا ان یتوضا : یہاں وضوء سے مراد وضوء متعارف ہے جیسا کہ گزر چکا ہے اور یہ سخت قسم کی ڈانٹ اور تنبیہ ہے غسل کو مؤخر کرنے کے بارے میں، تاکہ آدمی اس تأخیر کا عادی نہ بن جائے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں وضو سے غسل کرنا مراد ہو۔ ابن الملکؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

ملا علی قاری علیہ رحمۃ الباری فرماتے ہیں کہ یہاں اس احتمال کو مراد لینا تاویل بعید ہے۔

امام بوداؤدؒ نے اس روایت کو حسن بن حسن سے نقل کیا ہے۔ اور حسن بن حسن عمار بن یاسر سے نقل کرتے ہیں، حالانکہ حسن بن حسن کا سماع عمار بن یاسر سے ثابت نہیں ہے۔ سیدؒ نے صاحب تخریج سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ پس یہ حدیث منقطع ہوگی۔

وضو کے بغیر قرآن کو ہاتھ لگانا جائز نہیں

۴۶۵: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِیْ بَکْرِبْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِوبْنِ حَزْمٍ اَنَّ فِی الْکِتَابِ الَّذِیْ کَتَبَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِعَمْرِوبْنِ حَزْمٍ اَنْ لَّا یَمُسَّ الْقُرْآنَ اِلَّا طَاهِرٌ۔ (رواه مالك والدارقطنی)

أخرجه مالك فی الموطأ ۱۹۹/۱ کتاب القرآن حدیث رقم ۱۔ والدارقطنی فی السنن ۱۲۱/۱ باب فی نهی المحدث عن سرالقرآن حدیث رقم ۲۔ مرسل ورواته ثقات۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے روایت ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے جو ہدایت نامہ حضرت عمرو بن حزم کے لئے لکھا تھا اس میں یہ حکم بھی ذکر کیا گیا تھا کہ قرآن کریم کو صرف پاک لوگ ہاتھ لگا سکتے ہیں اس حدیث کو امام مالکؒ اور امام دارقطنی نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث :

عبداللہ بن ابی بکر۔ عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری ومدنی ہیں۔ مدینہ کے اونچے لوگوں میں سے

ہیں۔ تابعی ہیں انس بن مالک اور عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں اور ان سے زہری' مالک بن انس ثوری اور ابن عیینہ رضی اللہ عنہم روایت کرتے ہیں۔ ان سے بہت سی احادیث مروی ہیں۔ ایسے راوی ہیں جن کا صدق مسلّم ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ''ان کی حدیث شفاء ہے''۔ ۱۳۵ھ میں وفات پائی۔ ان کی ستر برس کی عمر ہوئی۔

تشریح: عن عبد الله بن ابن بكر بن محمد بن عمرو بن حزم :عبداللہ اپنے والد سے اور ان کے والد ان کے دادا سے اور ان کے دادا اپنے باپ عمرو بن حزم سے روایت کرتے ہیں اور یہی معروف ہے، حدیث اور فقہ کی کتب میں۔ بعض نے اس کے برخلاف اس کو حکیم بن حزام کے حوالے سے روایت کیا ہے۔ ابن حجرؒ نے اس کو اسی طرح ذکر کیا ہے۔

اور باقی محمد بن عمرو بن حزم انصاری یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ۱۰ ہجری کو نجران میں پیدا ہوئے اور ان کے والد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عامل تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے والد کو حکم دیا کہ ان کی کنیت ابو عبدالملک رکھیں اور محمد، یہ بڑے فقیہہ تھے۔ انہوں نے اپنے باپ سے اور عمرو بن العاص سے روایت کی ہے اور اہل مدینہ کی ایک جماعت نے ان سے روایت کی ہے حرّہ کی لڑائی میں قتل ہوئے۔ اس وقت ۵۳ سال ان کی عمر تھی اور ۶۳ ہجری میں یہ واقعہ ہوا۔

ان لا يمس القرآن :''سین'' کے فتحہ کے ساتھ یہ ''نہی'' کا صیغہ ہوگا۔ اور ''سین'' کے ضمہ کے ساتھ یہ ''نفی'' ہوگی ''نہی'' کے معنی میں یعنی جس میں قرآن لکھا ہوا ہو اس کو بغیر فاصلے کے نہ چھوئے۔

الا طاهر :بخلاف طاہر کے، جنبی اور محدث آدمی کے لئے تو جائز نہیں ہے کہ قرآن کو چھوئے مگر ایسے غلاف کے ساتھ جو قرآن سے جدا ہو اور آستین کے ساتھ چھونا مکروہ ہے۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد :﴿لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلْمُطَهَّرُونَ﴾ [الواقعہ:۷۹] ''اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں'' کے لئے بیان ہے کیونکہ لا يمسهٗ کی ضمیر یا تو قرآن کی طرف راجع ہے اور مراد لوگوں کو اس کے طہارت کے علاوہ چھونے سے روکنا ہے اور یا ضمیر ''لوح'' کی طرف راجع ہے اور اس صورت میں ''لا'' نافیہ ہوگا اور مطهرون کا معنیٰ ''ملائکہ'' سے کریں گے۔ پس بے شک حدیث نے اس آیت کے معنیٰ کو کھول دیا ہے کہ یہاں مراد وہ پہلا معنیٰ ہے اور اس معنیٰ کے لئے تائید وہ آیت بھی ہے کہ جس میں قرآن کو کریم کے ساتھ بطور مدح کے ذکر کیا ہے (انه لقرآن كريم) اور اسی طرح اس آیت کے ساتھ کہ جس میں قرآن کے لوح محفوظ میں ثابت ہونے کے ساتھ مدح ہے (فی کتٰب مكنون) پس حکم ﴿لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلْمُطَهَّرُونَ﴾ [الواقعہ:۷۹] ''اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں'' یہ مرتب ہوگا ان دو وصفوں پر جو قرآن پاک کے مناسب ہیں۔

صاحب تخریج فرماتے ہیں اس روایت کو ابوحاتم دارقطنی نے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم عن ابيه عن جده کی سند سے نقل کیا ہے اور امام مالکؒ نے موطا میں مرسلا اس کو نقل کیا ہے۔ پس مصنف کا و الدار قطنی کہنا محل تامل ہے۔ سیدؒ نے اسی طرح کہا ہے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس کو امام حاکم نے بھی نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ صحیح بخاری کی شرط پر اس کی سند ہے اور اس روایت کے شواہد موجود ہیں اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

عن عمرو بن حزم قال لما بعثنی رسول اللہ ﷺ الی الیمن قال لا تمس القرآن الا وانت طاھر۔

اور امام نوویؒ کا قول کہ یہ ضعیف ہے تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ کثرتِ شواہد اس روایت کو حسن لغیرہ بنا دیتے ہیں اور یہ حسن لغیرہ صحیح مذہب کے مطابق حجت ہے۔ دار قطنی اور بیہقی نے اس کو نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ صحیح الاسناد ہے اور حاکم نے بھی اس کو نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ **لا یمس القرآن الا طاھر**۔ یہ حسن غریب روایت ہے۔

اور اس روایت کے ساتھ ان لوگوں کا ردّ ہے کہ جو مطلقاً حلت کے قائل ہیں اور وہ ہم میں سے ایک بڑی جماعت ہے اور داؤدؒ اور حاکمؒ ہیں۔ اور ابن الرفعہؒ کا ماوردیؒ سے یہ نقل کرنا کہ ہمارے اصحاب میں سے جمہور اس پر ہیں یہ ان کی غلطی ہے پس اسے بچنا چاہیے۔

سلام کا جواب دینے کے لئے وضو کرنا

۴۶۶: وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ انْطَلَقْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ فِيْ حَاجَةٍ كَانَ مِنْ حَدِيْثِهٖ يَوْمَئِذٍ اَنْ قَالَ مَرَّ رَجُلٌ فِيْ سِكَّةٍ مِّنَ السِّكَكِ فَلَقِيَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَقَدْ خَرَجَ مِنْ غَائِطٍ اَوْبَوْلٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ حَتّٰى اِذَا كَادَ الرَّجُلُ اَنْ يَّتَوَارٰى فِي السِّكَّةِ ضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِيَدِهٖ عَلَى الْحَآئِطِ وَمَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهٗ ثُمَّ ضَرَبَ ضَرْبَةً اُخْرٰى فَمَسَحَ ذِرَاعَيْهِ ثُمَّ رَدَّ عَلَى الرَّجُلِ السَّلَامَ وَقَالَ اِنَّهٗ لَمْ يَمْنَعْنِيْ اَنْ اَرُدَّ عَلَيْكَ السَّلَامَ اِلَّا اَنِّيْ لَمْ اَكُنْ عَلٰى طُهْرٍ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۲۳٤/۱ حدیث رقم ۳۳۰ وقال: سمعت أحمد بن حنبل یقول روی محمد بن ثابت حدیثاً منکراً فی التیمم۔

ترجمہ: حضرت نافعؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ ایک مرتبہ قضائے حاجت کے لئے جا رہے تھے میں بھی ان کے ساتھ چلا گیا پہلے تو انہوں نے قضائے حاجت کی اور استنجاء کیا اس کے بعد انہوں نے اس دن یہ حدیث بیان کی کہ ایک آدمی کسی گلی میں جا رہا تھا اور رسول اللہ ﷺ غائط یا بول سے فارغ ہو کر تشریف لا رہے تھے۔ اس آدمی نے آپ ﷺ سے ملاقات کی اور سلام عرض کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ جب یہ شخص دوسرے کوچہ کی طرف مڑنے والا تھا۔ تب آپ ﷺ نے تیمم کے لئے اپنے دونوں ہاتھ دیوار پر مار کر منہ پر پھیرے پھر دوسری ضرب لگائی اور اپنے ہاتھوں کا کہنیوں تک مسح کیا اس کے بعد آدمی کے سلام کا جواب دیا اور ارشاد فرمایا مجھے تمہارے سلام کا جواب دینے سے کسی چیز نے نہیں روکا تھا۔ صرف اور صرف یہ بات تھی کہ میں بغیر وضو کے تھا۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: نافع: یعنی ابن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔

فی حاجة: یہ مضاف الیہ سے حال واقع ہے یعنی عبداللہ بن عمرؓ اور حاجةٍ کی تنوین یہ شیوع (یعنی عمومیت) کے لئے ہے شاید کہ مابعد والا اس کو قضائے حاجت کے ساتھ مقید کر دے۔

فقضى ابن عمر حاجة : یعنی انسانی ضرورت کو اور وہ بول و براز سے فراغت حاصل کرنا ہے جیسا کہ سیاقِ حدیث سے ظاہر ہوتا ہے جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قضائے حاجت کے متعلق ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں حاجت سے اور کوئی حاجت مراد ہو اور آنے والی بات کو بطور تلازم کے ذکر کر دیا۔

و كان من حديثه : یعنی ابن عمرؓ کے جملہ کلام میں سے جو انہوں نے بیان کیا یہ بات بھی تھی۔

يومئذ ان قال : یعنی ابن عمرؓ نے کہا اور ''ان'' اپنے مدخول کے سمیت مصدر کی تاویل میں ہے، یعنی اس وقت کے ان کے کلام میں یہ بات تھی۔

مر رجل : بعض نے کہا ہے کہ یہ مہاجر بن قنفذ بن عبد المطلب ہیں۔

وقد خرج من غائط او بول : یعنی فارغ ہوئے اس لئے کہ خروج وہ فراغت کے بعد ہی ہوتا ہے یا معنی یہ ہے کہ غائط اور بول کے محل سے نکلے۔

فلم يرد عليه : اى على الرجل: اور ایک نسخہ میں السلام ہے۔

ضرب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم : یہ ''اذا'' کا جواب ہے اور ''حتی'' وہ داخل ہے جملہ شرطیہ پر۔

بيديه على الحائط : طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ شاید اس دیوار پر غبار ہو اور تا کہ تیمم امام شافعیؒ کے نزدیک صحیح ہو جائے ورنہ یہ صورت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تو صحیح ہے ہی۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) اور علامہ طیبیؒ کے کلام کے آخر میں ایسی تکلیف دہ بات ہے جو کسی پر مخفی نہیں ہے۔

ثم رد على الرجل السلام : شرح السنۃ میں لکھا ہے اس حدیث میں یہ مسئلہ ثابت ہے کہ سلام کا جواب دینا اگرچہ واجب ہے پس آدمی پر اس حالت میں سلام کرنے والا اپنے حصے کو ضائع کرنے والا ہے، پس وہ جواب کا حقدار نہیں ہوگا اور اس حدیث میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ قضائے حاجت کی حالت میں کلام کرنا مکروہ ہے اور حضر میں سلام کا جواب دینے کے لئے تیمم کے مشروع ہونے کی دلیل اس حدیث میں ہے۔

(ملا علی قاریؒ) فرماتے ہیں۔ اس تشریح میں دو قسم کی بحثیں ہیں۔ اوّل یہ کہنا کہ وہ جواب کا مستحق نہیں یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ وہ جواب کا مستحق تھا اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب دیا اور تھوڑا سا فاصلہ سلام اور اس کے جواب میں مضر نہیں ہے۔ دوسری بحث یہ ہے کہ سلام اور کلام یہ دونوں فراغت کے بعد واقع ہوئے ہیں۔ پھر میں نے ابن حجر کو دیکھا اس مقام میں کہ انہوں نے شارح کا ایسے ہی تعاقب کیا ہے جیسے میں نے ذکر کیا ہے۔

لم يمنعني ان ارد عليك السلام الا انى لم اكن على طهر :

بعض شراح نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث اللہ کے ذکر کو وضوء یا تیمم کے ساتھ کرنے کے مستحب ہونے پر دلالت کرتی ہے اس لئے کہ سلام اصل میں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے کیونکہ یہاں مراد سلامتی ہے۔ ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں اور حضرت علیؓ کی اس حدیث میں کہ جس میں یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء سے نکلتے پس ہمیں قرآن سکھلاتے تھے۔ تطبیق یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصت کو اختیار کیا اُمت کے لئے آسانی پیدا کرتے ہوئے اور اس حدیث

میں عزیمت کا بیان ہے یعنی اُمت کو افضل عمل کی طرف رہنمائی کرنا مقصود ہے۔

اور مظہرؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ جو سلام کا جواب دینے سے کسی عذر کی وجہ سے قاصر ہو تو مستحب ہے کہ وہ اس سے عذر بیان کرے تا کہ کبر اور کسی دشمنی کی طرف اس کو منسوب نہ کیا جائے۔ نیز اس حدیث میں سلام کے جواب کے وجوب کی بھی دلیل ہے، اس لئے کہ کسی عذر کی وجہ سے تأخیر کرنا وہ اس کے وجوب کی خبر دیتا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ تیمّم کرنا جائز ہے ایسے عمل کے فوت ہونے کے خوف کی وجہ سے کہ جس کا کوئی خلیفہ نہ ہو جیسا کہ نمازِ جنازہ اور نمازِ عید۔ اور میں نے اپنے علماء میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ انہوں نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہو۔

ابوداؤدؒ کی سند یوں ہے محمد بن ثابت العبدی عن نافع عن ابن عمر اور امام بخاریؒ نے محمد بن ثابت کے اس حدیث کو مرفوع روایت کرنے کا انکار کیا ہے۔ امام بیہقی نے فرمایا ہے محمد بن ثابت کا مرفوع نقل کرنا منکر نہیں ہے اور امام خطابیؒ نے فرمایا ہے ابن عمر کی حدیث صحیح نہیں ہے اس لئے کہ محمد بن ثابت عبدی وہ انتہائی ضعیف راوی ہے اس کی روایت سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ اس تقریر کو سیدؒ نے صاحب تخریج سے نقل کیا ہے۔ پس ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ اس کی سند حسن ہے یہ ٹھیک نہیں ہے الا یہ کہ حسن سے حسن لغیرہ مراد لے لیں۔

پیشاب کرنے کی حالت میں سلام کا جواب نہ دیا جائے

۴۶۷: وَعَنِ الْمُهَاجِرِ بْنِ قُنْفُذٍ اَنَّهٗ اَتَی النَّبِیَّ ﷺ وَهُوَ یَبُوْلُ فَسَلَّمَ عَلَیْهِ فَلَمْ یَرُدَّ عَلَیْهِ حَتّٰی تَوَضَّاَ ثُمَّ اعْتَذَرَ اِلَیْهِ وَقَالَ اِنِّیْ کَرِهْتُ اَنْ اَذْکُرَ اللّٰهَ اِلَّا عَلٰی طُهْرٍ (رواه ابوداود وروی النسائی الی قوله حَتّٰی تَوَضَّاَ وَقَالَ فَلَمَّا تَوَضَّاَ رَدَّ عَلَیْهِ۔

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۲۳ حدیث رقم ۱۷۔ورواه النسائی فی السنن مختصرًا ۱/۳۷ حدیث رقم ۳۸ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۱۲۶ حدیث رقم ۳۵۰۔ وأحمد فی مسنده ۴/۳۴۵۔

ترجمہ: حضرت مہاجر بن قنفذؓ سے روایت ہے کہ یہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس وقت آپ ﷺ پیشاب کر رہے تھے انہوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں سلام عرض کیا آپ ﷺ نے جواب نہ دیا یہاں تک کہ آپ ﷺ نے وضو کیا اور پھر عذر داری کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اس بات کو مکروہ سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا نام وضو کے بغیر ذکر کروں۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور امام نسائی نے یہ روایت حتی تو ضا تک نقل کی ہے اور کہا ہے کہ جب آپ ﷺ نے وضو کر لیا تو سلام کا جواب دیا۔

راویٔ حدیث:

مہاجر بن قنفذ۔ یہ ''مہاجر'' ہیں جو ''قنفذ'' کے بیٹے۔ خاندانی لحاظ سے قریشی و تیمی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ''مہاجر'' اور ''قنفذ'' دونوں لقب ہیں۔ اصل نام ''عمرو بن خلف'' ہے۔ مسلمان ہوئے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ہجرت کر کے

پہنچے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ حقیقی مہاجر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے اور بصرہ میں رہ پڑے اور وہاں وفات پائی۔ ان سے ابو ساسان حضین بن المنذر رنے روایت کی۔ ''قنفذ'' میں قاف پر ضمہ' نون ساکن' فاء اور ذال معجمہ ہے۔ ''ساسان'' میں ہر دو سین پر نقطے ہیں اور حضین میں حاء مہملہ مضموم اور ضاد معجمہ مفتوح اور یاء کے بعد نون ہے۔

تشریح: **فسلم عليه** :ابن حجرؒ نے فرمایا ہے۔ یعنی مہاجرؓ نے فراغت کے بعد آپ ﷺ کو سلام کیا اس لئے کہ انسانی مروّت یہ فیصلہ دیتی ہے کہ جو قضائے حاجت کر رہا ہو اس سے کوئی بات نہ کرے چہ جائیکہ اس کو سلام کیا جائے اسی وجہ سے سلام کرنا اس حالت میں مکروہ ہے اس صورت میں سلام کرنے والا جواب کا بھی مستحق نہیں ہوتا چہ جائیکہ جواب نہ دینے پر عذر کیا جائے۔ پس آنے والا جو عذر ہے وہ دلیل ہے اس بات پر کہ مہاجرؓ نے جو سلام کیا تھا وہ حضور ﷺ کے قضائے حاجت سے فارغ ہونے کے بعد کیا تھا۔

حتى توضا :یعنی نبی پاک ﷺ نے ،اور ظاہر یہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کئی بار ہوا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ " توضا "کا معنی تطھر سے کیا جائے تو پھر یہ تیمّم کو بھی شامل ہو جائے گا ، پھر حضور ﷺ نے جواب نہ دینے کا یوں عذر بیان فرمایا۔

وقال :یہ عذر بیان کرنے کے لئے۔

انی کرهت ان اذكر الله :یہاں ذکر سے یا تو ذکر حقیقی مراد ہے یا ذکر مجازی اور ذکر مجازی سے مراد وہ قول ہے جو شرعاً مطلوب ہو یا وہ لفظ مراد ہے جو ذکر کے مشابہ ہو یا وہ لفظ ہے جو اصل میں ذکر ہو اگر چہ اس اسم کے مناسبات میں سے کسی دوسرے معنی کے لئے اس کو استعمال کیا جا رہا ہو ،اور اصل میں **السلام عليك** اس اسم (سلام) کی صفت کا اپنانا ہے۔ اور وہ سلامتی کا خیال رکھنا ہے جو سلامتی (متکلم کی طرف سے) مخاطب پر واقع ہو پھر اس معنی کو چھوڑ دیا گیا اور اس لفظ: **السلام عليك** کو مطلقاً **تحيّه** (سلام کرنے) میں استعمال کیا جانے لگا لفظی حقیقت سے غفلت برتتے ہوئے اور ارادۂ مقصودی کو بھلاتے ہوئے۔

الا على طهر :یعنی میں نے اسی وجہ سے اس کو مؤخر کیا تا کہ جواب دینا اکمل طریقہ سے ہو۔

امام داؤدؒ نے اس پر خاموشی اختیار کی ہے اور امام منذریؒ نے بھی۔ سیدؒ نے صاحب تخریج سے اس کو نقل کیا ہے اور امام نوویؒ نے الاذکار میں یہ فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کو امام ابو داؤدؒ، نسائی اور ابن ماجہ نے صحیح اسانید سے اس کو روایت کیا ہے۔ میرک شاہؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

فلما توضا رد عليه :اور یہی بات سابقہ روایت سے بھی سمجھی جاتی ہے۔

الفصل الثالث:

۴۶۸: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُجْنِبُ ثُمَّ يَنَامُ ثُمَّ يَنْتَبِهُ ثُمَّ يَنَامُ . (رواه احمد)

أخرجه أحمد في مسنده ٦/ ٢٩٨۔

ترجمہ : حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جنابت کی حالت میں سوجایا کرتے تھے۔ پھر بیدار ہوتے اور سوجاتے۔ اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: اس حدیث سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے یہاں رخصت پر عمل کیا اور بیان جواز کے لئے ایسا کیا۔
اس کی سند حسن ہے۔

استاذ شاگرد کو غفلت پر تنبیہ کر سکتا ہے

۴۶۹: وَعَنْ شُعْبَةَ قَالَ اِنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ كَانَ اِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ يُفْرِغُ بِيَدِهِ الْيُمْنٰى عَلٰى يَدِهِ الْيُسْرٰى سَبْعَ مَرَّاتٍ ثُمَّ يَغْسِلُ فَرْجَهٗ فَنَسِيَ مَرَّةً كَمْ اَفْرَغَ فَسَأَلَنِيْ فَقُلْتُ لَا اَدْرِيْ فَقَالَ لَا اُمَّ لَكَ وَمَا يَمْنَعُكَ اَنْ تَدْرِيَ ثُمَّ يَتَوَضَّأُ وُضُوْءَهٗ لِلصَّلٰوةِ ثُمَّ يَفِيْضُ عَلٰى جِلْدِهِ الْمَآءَ ثُمَّ يَقُوْلُ هٰكَذَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَتَطَهَّرُ. (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۱/۱۷۱ حديث رقم ۲۴۶۔

ترجمہ: حضرت شعبہؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ جب غسل جنابت کرتے۔ تو پہلے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر سات مرتبہ پانی ڈالتے تھے پھر اپنی شرم گاہ کو صاف کرتے تھے ایک مرتبہ بھول گئے کہ پانی کتنی مرتبہ ڈالا ہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے یاد نہیں کہ کتنی مرتبہ پانی ڈالا ہے۔ انہوں نے فرمایا تمہاری ماں مرے۔ تمہیں یاد رکھنے سے کس شئی نے روک دیا تھا پھر وضو کیا جس طرح نماز کے لئے وضو ہوتا ہے پھر اپنے تمام جسم پر پانی بہایا اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ بھی اسی طرح طہارت حاصل کرتے تھے۔

راویٔ حدیث:

شعبہ: یہ شعبہ بن دینار ہیں اور یہ حضرت ابن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ اور امام نسائیؒ نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے اور بعض دوسرے حضرات نے ان کو قوی بتلایا ہے۔ سیدؒ نے اسی طرح کہا ہے۔ اور مصنفؒ (صاحب مشکوٰۃؒ) نے ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

تشریح: **كان اذا اغتسل**: ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ جب غسل کا ارادہ کرتے اور ظاہر یہ ہے کہ کلام اس معنی کا محتاج نہیں ہے اس لئے کہ تقدیر عبارت یہاں یوں ہو سکتی ہے: **كان ابن عباس وقت اغتساله**۔

على يده اليسرى سبع مرار: اور ایک نسخہ میں **سبع مرات** ہے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ شاید کہ دھونا کسی نجاست کی وجہ سے تھا جو ان کی ہاتھ پر لگی ہوئی تھی اور سات مرتبہ دھونے کا سبب یہ ہے کہ ان کو اس کا منسوخ ہونا نہ پہنچا ہو اور اسی طرح امام احمد کو بھی نسخ نہیں پہنچا تھا، پس امام احمد بھی ہر نجاست کے سات مرتبہ دھونے کے قائل ہیں اور یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ ان کو نسخ پہنچا ہو لیکن ان کا مذہب یہ ہو کہ جب وجوب منسوخ ہو جائے تو اس مسئلہ میں استحباب تو رہتا ہی ہے جیسا کہ بعض نے کہا ہے اگرچہ صحیح مذہب یہ ہے کہ مطلق جواز باقی رہتا ہے نہ کہ خاص استحباب اور یہ عمل تحقیقی طور پر دوام کا فائدہ نہیں دیتا بلکہ یہ اس میں امر عرفی ہے کوئی امر وضعی (طے شدہ حکم) نہیں ہے۔ پس یہاں یہ اعتراض لازم نہیں آتا کہ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی عادت

تھی یہ کسی نجاست کے لگنے کی وجہ سے نہیں تھا۔

ثم يغسل فرجه: یعنی سات مرتبہ اور یہ سات مرتبہ پہلے عمل یعنی ہاتھوں کے دھونے سے معلوم ہوتا ہے۔

فقال ۔ لا ام لك: اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنیٰ ہے کہ تو ''لقیط'' ہے (یعنی تو گرا پڑا ملا تھا تیرا کوئی نسب نہیں) اور نہایہ میں لکھا ہوا ہے کہ **لا ابا لك** یہ اکثر مدح کے موقع پر مستعمل ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ تیرا کفایت کرنے والا تیرے نفس کے علاوہ کوئی اور نہ ہو اور کبھی مذمت کی جگہ میں ذکر کیا جاتا ہے جیسا کہ: **لا ام لك** کہا جاتا ہے اور کبھی تعجب کے موقع پر نظر لگنے کو دفع کرنے کے لئے جیسا کہ عرب حضرات کا قول ہے: **لله درك** اور اسی کے معنی میں یہ قول بھی ہے: **جد فی امرك وشمر**۔ اسلئے کہ جس کا والد ہو وہ اپنے بعض امور میں اس پر بھروسہ کرتا ہے۔ بعض نے کہا ہے: **لااب لك** اور **لا ام لك** میں فرق جو آیا ہے وہ اس لئے ہے کہ جب باپ مفقود ہو تو یہ دلالت کرتا ہے استقلال پر اور ماں کہ اس کی طرف شفقت اور نرمی منسوب ہوتی ہے اور یہاں حدیث میں جو آیا ہے یہ بطور مذمت کے واقع ہے اس لئے کہ اس کے بعد جو جملہ آرہا ہے وہ اس کی دلیل ہے۔

وما يمنعك ان تدرى: ''واؤ'' یہاں جملہ استفہامیہ کو جملہ دعائیہ پر عطف کرنے کے لئے ہے اور ان دونوں کے درمیان جامع چیز وہ دونوں کا انشائیہ ہونا ہے۔ علامہ طیبیؒ نے یہی فرمایا ہے۔

على جلد الماء: ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ جلد کا ذکر کیا ہے اس لئے کہ وہ اصل ہے ورنہ تو بالوں کا دھونا بھی تو واجب ہے۔

ثم يقول هكذا: ظاہر یہ ہے کہ یہ تمام گزری ہوئی باتوں کی طرف راجع ہے۔

كان رسول الله ﷺ يتطهر: یعنی منسوخ ہونے سے پہلے تک۔ یا اس میں صرف وضوء اور پانی کے بہانے کی طرف اشارہ ہے (تمام باتوں کی طرف نہیں ہے)۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے۔ اس حدیث میں یہ بات قابل غور ہے کہ اس حدیث کی ترجمۃ الباب سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی، الا یہ کہ (یہ کہا جائے کہ اس میں ان بعض احکام کا بیان ہے جو جنبی کے متعلق ہیں پس ان کی وجہ سے اس کو بھی بطور تلازم ذکر کر دیا اور اگر اس کو باب الغسل میں ذکر کرتے تو یہ زیادہ بہتر تھا)۔

امام ابوداؤدؒ نے اس پر خاموشی اختیار کی ہے۔

جماعین کے درمیان غسل نشاط کا ذریعہ ہے

۴۷۰: وَعَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ طَافَ ذَاتَ یَوْمٍ عَلٰی نِسَآئِهٖ یَغْتَسِلُ عِنْدَ هٰذِهٖ وَعِنْدَ هٰذِهٖ قَالَ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَا تَجْعَلُهٗ غُسْلًا وَّاحِدًا اٰخِرًا قَالَ هٰذَا اَزْکٰی وَاَطْیَبُ وَاَطْهَرُ۔ (رواه احمد وابوداود)

أخرجه أحمد فی مسنده ٦/٨۔ وأخرجه أبوداؤد فی السنن ١/١٤٩ حديث رقم ٢١٩ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ١/١٩٤ حديث رقم ٥٩٠۔

ترجمه : حضرت ابورافعؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن اپنی تمام ازواج سے وظیفہ زوجیت ادا کیا اور ہر جماع کے بعد علیحدہ علیحدہ غسل کیا حضرت ابورافعؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول آپ نے آخر میں ایک ہی غسل کیوں نہ کر لیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر جماع کے بعد غسل کرنا اچھی طرح پاک کرنا ہے اور نفس کے لئے نشاط پیدا کرنے والا ہے اور جسم کو صاف کرتا ہے اس حدیث کو امام احمد اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ابی رافع : یہ حضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے۔

طاف ذات یوم : ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ''ذات'' یہاں پر زائدہ ہے اور ظاہر یہ ہوتا ہے کہ ''ذات'' کی زیادتی مجاز کے وہم کو دور کرنے کے لئے ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ ایک دن میں۔

الا تجعله : یعنی اپنے غسل کو۔ ''اَلا'' یہ مخفف ہے ہمزہ یہاں استفہام کیلئے ہے اور ''لا'' نافیہ ہے۔ اور ایک نسخہ صحیح میں میں ''الاّ'' تشدید کے ساتھ ہے۔ پس یہ ''هلاّ'' کے معنی میں ہوگا جو تحضیض کے لئے ہوتا ہے (تحضیض کا معنی ہے ''ابھارنا'')۔

غسلا واحدا : ایک غسل کافی تھا۔

اخرا : یہ تاکید ہے ''توهم'' کو دور کرنے کے لئے ہے۔

هذا : یعنی تعدد غسل۔

ازکی : ای انمی۔ یہ تازگی کا سبب ہے اور مقصود میں زیادہ قوت دینے والا ہے۔

واطیب : یعنی یہ زیادہ لذت کا سبب ہے اور بدن کو ہلکا کرنے والا ہے۔

واطهر : یعنی یہ زیادہ صفائی کا باعث ہے اور احسن ہے۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ ''تطہیر'' یہ ظاہر کے لئے مناسب ہے اور تزکیہ اور تطییبِ باطن کے لئے۔ پس پہلا (تطہیر) یہ اخلاق ذمیمہ برے اخلاق کے زائل کرنے کے لئے ہے اور دوسرا وہ اوصافِ حمیدہ کے ساتھ مزّین ہونے کے لئے ہے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) علامہ طیبیؒ کی یہ تشریح صوفیاء کرام کے اشارات کے زیادہ مشابہ ہے۔

اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے یہ تینوں الفاظ ترادف کے قریب قریب ہیں ان کو تاکید کے لئے جمع کیا ہے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) یہ اپنے آپ کو تھکانے سے آرام میں رکھتا ہے اس لئے کہ تاسیس یہ تاکید سے اولی ہے اور یہ تحقیق وہ ہے جو تائید سے حاصل ہوتی ہے۔

(رواہ احمد، وابوداؤد) اور فرمایا ہے کہ انسؓ کی حدیث وہ اس سے زیادہ صحیح ہے۔ میرک شاہؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

فضل المرأة سے وضو منع ہے

۴۷۱: وَعَنِ الْحَكَمِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ يَّتَوَضَّأَ الرَّجُلُ بِفَضْلِ طُهُوْرِ الْمَرْأَةِ۔

(رواه ابوداود وابن ماجة والترمذی وَ زَادَ اَوْ قَالَ بِسُؤْرِهَا وَقَالَ هٰذا حديث حسن صحيح)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۱/۶۳ حديث رقم ۸۲۔وأخرج ابن ماجة نحوه ۱/۱۳۲ حديث رقم ۳۷۳ وأخرجه الترمذي في السنن ۱/۹۳ حديث رقم ٦٤ وقال حديث حسن وأخرجه أحمد في مسنده ٥/٦٦۔

ترجمہ: حضرت حکم بن عمروؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عورت کے غسل یا وضو کے باقی ماندہ پانی سے مرد کو وضو کرنے سے منع کیا ہے۔اس حدیث کو امام ابوداؤد امام ابن ماجہ اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے یہ الفاظ زیادہ نقل کئے ہیں: اَوْ قَالَ بِسُؤْرِهَا یا آپ نے فرمایا کہ عورت کے سؤر سے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی رحمہ اللہ علیہ نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

راویٔ حدیث:

الحکم بن عمرو الغفاری۔ یہ قبیلہ ''غفار'' کے نہیں ہیں بلکہ ثعلبہ کی اولاد میں سے ہیں جو ''غفار بن ملیل'' کے بھائی ہیں ملیل میم کے ضمہ اور لام اول کے فتحہ کے ساتھ ہے ان کا شمار علمائے بصرہ میں کیا جاتا ہے۔ان کی وفات مقام ''مرو'' میں واقع ہوئی اور بعض نے کہا ہے کہ بصرہ میں ۵۰ھ میں واقع ہوئی۔ بریدہ اسلمی اور حکم بن عمرو الغفاری دونوں مقام مرو میں ایک ہی جگہ دفن کئے گئے۔ان سے محدثین ایک جماعت محدثین نے روایت حدیث کی ہے۔''حکم'' کے پہلے دونوں حرف مفتوح ہیں۔

تشریح: **وعن الحکم**: ''حاء'' اور ''ک'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

ابن عمرو: یعنی ابن عمرو الغفاری، اور یہ غفاری نہیں ہیں بلکہ یہ ثعلبہ کی اولاد میں سے ہے جو غفار کا بھائی ہے ان سے ایک جماعت نے حدیث نقل کی ہے۔مصنفؒ نے ان کو صحابہ میں ذکر کیا ہے۔

بفضل طهور المرء ة: طہور ''طاء'' کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ ہے۔سید جمال الدینؒ نے فرمایا ہے یہ ''نہی'' نہی تنزیہی پر محمول ہے تاکہ یہ حدیث، حدیث سابق جو فصل ثانی میں گزر چکی ہے اس کے مخالف نہ ہو وہ حدیث یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس پانی سے غسل فرمایا کہ جو حضرت میمونہؓ کے غسل سے بچا ہوا تھا باوجود یہ کہ زوجہ مطہرہ نے بتلا بھی دیا تھا کہ یہ غسل سے بچا ہوا ہے اور حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ: **ان الماء لا یجنب** کہ پانی اس طرح سے ناپاک نہیں ہوتا۔اور اسی طرح وہ ''نہی'' جو آئندہ حدیث میں آرہی ہے۔

''سؤر'' ہمزہ کے ساتھ باقی ماندہ کو کہتے ہیں۔کبھی ہمزہ کو مخفف پڑھا جاتا ہے ابدال کرکے۔

امام بیہقی وغیرہ نے اس کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔

غسل خانہ میں پیشاب کرنے سے منع کیا گیا ہے

۴۷۲: وَعَنْ حُمَيْدِ الْحِمْيَرِيِّ قَالَ لَقِيْتُ رَجُلًا صَحِبَ النَّبِيَّ ﷺ اَرْبَعَ سِنِيْنَ كَمَا صَحِبَهُ اَبُوْهُرَيْرَةَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ تَغْتَسِلَ الْمَرْاَةُ بِفَضْلِ الرَّجُلِ اَوْ يَغْتَسِلَ الرَّجُلُ بِفَضْلِ الْمَرْاَةِ زَادَ مُسَدَّدٌ وَّلْيَغْتَرِفَا جَمِيْعًا رواه ابوداؤد والنسائی زاد احمد فِیْ اَوَّلِهٖ نَهٰى اَنْ يَمْتَشِطَ

اَحَدُنَا کُلَّ یَوْمٍ اَوْیَبُوْلَ فِیْ مُغْتَسَلٍ۔

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۶۳حدیث رقم ۸۱۔وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۱۳۰حدیث رقم ۲۳۸۔ وأخرجه أحمد فی مسنده ۴/۱۱۰۔

ترجمہ : حضرت حمید حمیریؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک شخص سے ملا جو حضرت ابوہریرہؓ کی طرح چار سال تک رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہ چکے تھے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا ہے کہ عورت مرد کے غسل سے بچے ہوئے پانی کے ساتھ غسل کرے۔ یا مرد عورت کے غسل سے بچے ہوئے پانی کے ساتھ غسل کرے اور اس حدیث میں مسدد راوی نے یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں: وَلْيَغْتَرِفَا جَمِيْعًا کہ دونوں ایک ساتھ چلو بھر کر غسل کریں تو جائز ہے۔اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔اور امام احمدؒ نے اس حدیث کے شروع میں یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے روزانہ کنگھی کرنے سے اور غسل خانہ میں پیشاب کرنے سے منع کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

حمید بن عبدالرحمٰن ۔ یہ حمید بن عبدالرحمٰن حمیری بصری ہیں۔بصرہ کے ائمہ اور ثقات علماء سے ہیں جلیل القدر قدمائے تابعین میں سے ہیں۔حضرت ابوہریرہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت حدیث کرتے ہیں۔''حمید'' تصغیر کے ساتھ ہے اور حمیری میں حاء مہملہ پر کسرہ اور یائے تحتانیہ پر فتحہ ہے۔

تشریح:وعن حمید : حُمَيْد تصغیر کے ساتھ ہے۔ الحمیری:''حاء'' کے کسرہ اور ''یاء'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ صاحب مشکوۃؒ فرماتے ہیں یہ حمید بن عبدالرحمان حمیری بصری ہیں۔بصرہ کے ثقہ اور ائمہ حضرات میں سے ہیں۔قدماء تابعین میں سے جلیل القدر تابعی ہیں۔ابوہریرہؓ اور ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں۔

لقیت رجلا : بعض نے کہا ہے کہ وہ حکم بن عمرو ہیں۔اور بعض نے کہا کہ یہ عبداللہ بن سرجس ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ عبداللہ بن مغفل ہیں۔میرک شاہؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

صحب النبی ﷺ اربع سنین کما صحبه ابوهریره:اس لئے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا وہ سات ہجری میں ہوا تھا۔ابن حجرؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

قال :یعنی صحابی نے فرمایا،اور صحابی کا مجہول ہونا یہ مضر نہیں ہے اس لئے کہ صحابہ سارے کے سارے عادل ہیں۔

زاد مسدد :مصنفؒ نے فرمایا ہے کہ یہ مسدد بن مسرھد بصری ہیں۔حماد بن زید اور ابوعوانہ وغیرہما سے انہوں نے حدیث سنی ہے اور ان سے امام بخاری اور ابوداؤد اور بہت سارے لوگوں نے روایت کی ہے۔۱۲۸ ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔ **مسدد** ''میم'' کے ضمہ ''سین'' کے فتحہ اور ''دال'' اولی کی تشدید اور فتحہ کے ساتھ منقول ہے اور **مسرھد** ''میم'' کے ضمہ اور ''سین'' کے فتحہ اور ''راء'' کے سکون اور ''ھاء'' کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے۔

ولیغترفا:''لام'' کے سکون اور کسرہ دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔

جمیعا:ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکٹھے غسل کریں اور باری باری کرنے کا بھی احتمال ہو سکتا ہے۔

نهى ان يمتشط احدنا: یعنی اپنے بالوں اور داڑھی میں کنگھی کرے۔

كل يوم: اس لئے کہ یہ اہل زینت کا شعار ہے اور سنت یہ ہے کہ کسی دن کنگھی کرے اور کسی دن چھوڑ دے یا "یوم" سے مراد یہاں وقت ہے۔

او يبول فى مغتسل: اس لئے کہ یہ شک اور وسوسے کے پیدا ہونے کا سبب ہے، پس یہ مکروہ ہوگا اور اس پر پہلے بات ہو چکی ہے۔

۴۷۳ : رَوَاهُ ابْنِ مَاجَةِ عَنْ عَبْدُاللهِ بْنُ سَرْجَسٍ ـ

ترجمہ : "اور امام ابن ماجہ نے یہ روایت حضرت عبداللہ بن سرجس سے نقل کی ہے اس کی سند حسن ہے۔"

تشریح: **عبد الله بن سرجس :** "سین" کے فتحہ اور "جیم" کے کسرہ کے ساتھ یہ منصرف ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ غیر منصرف ہے علیت اور عجمہ کی وجہ سے۔ ابن الملکؒ نے شرح مشارق میں اسی طرح فرمایا ہے اور اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔

بَابُ اَحْكَامِ الْمِيَاهِ

پانی کے احکام کا بیان

یعنی یہ باب پانی کی طہارت اور نجاست وغیرہ کے بارے میں ہے ماء کی جمع "میاہٌ" یہ دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ اس کا ہمزہ وہ "ھاء" سے بدلا ہوا ہے اور "میاہٌ" کی اصل "موہٌ" ہے اس لئے کہ اس کی ایک دوسری جمع وہ "اموہٌ" کے وزن پر آتی ہے اور ماء کی تصغیر "مویه" ہے۔ پس (مواہٌ میں) واؤ کو "یاء" سے بدل دیا گیا اس کے ماقبل کے مکسور ہونے کی وجہ سے۔

پانی میں پیشاب نہ کرو

۴۷۴ :وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَبُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ فِى الْمَاءِ الدَّآئِمِ الَّذِىْ لَايَجْرِىْ ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيْهِ (متفق عليه وفى رواية لِمسلم) قَالَ لَايَغْتَسِلُ اَحَدُكُمْ فِى الْمَاءِ الدَّآئِمِ وَ هُوَ جُنُبٌ قَالُوْا كَيْفَ يَفْعَلُ يَااَبَاهُرَيْرَةَ قَالَ يَتَنَاوَلُهٗ تَنَاوُلًا۔

أخرجه البخارى فى الصحيح ۳٤٦/۱حديث رقم ۲۳۹ـوأخرجه مسلم فى صحيحه ۲۳٥/۱ حديث (۹۰ـ۲۸۲) وأخرجه أبوداؤد فى السنن ٥٦/۱حديث رقم ٦۹ـوأخرجه الترمذى نحوه ۱۰۰/۱حديث رقم ٦۸ـوأخرجه النسائى فى السنن ٤٦/۱حديث وأخرجه الدارمى فى السنن ۲۰۲/۱حديث رقم ۷۳ـوأخرجه

أحمد ٢/٣٤٦۔

ترجمہ : حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرے ہوسکتا ہے کہ اس کو پھر اسی سے غسل کرنے کی ضرورت پڑ جائے۔ (بخاری ومسلم) اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ کہ تم میں سے کوئی آدمی کھڑے پانی میں غسل جنابت نہ کرے۔ لوگوں نے کہا اے ابو ہریرہ پھر کس طرح غسل کرے آپ نے فرمایا چلو سے پانی لے کر غسل کرے۔

تشریح: لا یبولن: یہ تشدید کے ساتھ تاکید کے واسطے ہے۔

في الماء الدائم: یعنی رُکا ہوا پانی یہ **دائم دام الشيء** سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے ٹھہرنا اور کھڑا ہونا۔

الذی لایجری: یہ دوسری صفت ہے "ماء" کی جو کہ پہلی کی تاکید کے لئے ہے یا یہ صفت کاشفہ (وضاحت کے لئے) ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ **الذی لایجری** سے وہ پانی مراد ہے جو تنکے وغیرہ کو بھی بہا کر نہ لے جاسکتا ہو اور جاری پانی کے معنی میں ماء کثیر بھی ہے اور وہ (دہ دردہ، یعنی ۱۰+۱۰) ہے ہمارے نزدیک اور قلتین کے بقدر ہے ان حضرات کے نزدیک جو اس کے قائل ہیں۔

ثم یغتسل فیه: "**یغتسل**" روایت میں مرفوع ہے یعنی پیشاب نہ کرے ماء دائم میں پھر وہ اس میں غسل کرنے لگ پڑے۔ پس **یغتسل** مبتدا محذوف (ھو) کی خبر ہے اور اس جملہ کا عطف "**لایبولن**" والے جملہ پر ہے۔

اور ابن مالک نحوی نے ذکر کیا ہے کہ "**یغتسل**" میں "جزم" پڑھنا جائز ہے **لایبولن** کے محل پر عطف کرتے ہوئے اور نصب پڑھنا بھی جائز ہے "ان" کو مقدر مان کر اور "**ثم**" کو "واؤ" کی جمع کا حکم دے کر۔ بہر حال "جزم" اس کی توجیہ ظاہر ہے۔ اور باقی تو وہ جائز نہیں ہے اس لئے کہ اگر نصب پڑھیں تو وہ تقاضا کرتی ہے کہ "منہی عنہ" وہ ان دونوں باتوں کو جمع کرنا ہے نہ کہ ان میں سے کسی ایک کا کرنا اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے بلکہ کھڑے پانی میں پیشاب کرنا منع ہے چاہے وہ اس میں یا اس سے غسل کرے یا نہ کرے۔ سیدؒ نے صاحب تخریج سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس بات میں نظر ہے اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہو: ﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ [البقرہ ٤٢] "اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور سچی بات کو جان بوجھ کر نہ چھپاؤ" یہاں "واؤ" جمع کے لئے ہے اور یہاں "**منهى عنه**" وہ دونوں باتیں ہیں اور افراد عرب کے قول کے بھی مخالف ہے کیونکہ عرب: **لا تاکل السمك تشرب اللبن** میں (جمع) مراد لیتے ہیں۔ میرک شاہؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

میرکؒ کی اس تقدیر میں یہ بات ملحوظ رہے کہ جب یہ جملہ دونوں باتوں کا محتمل ہے تو پھر نصب پر اس کو محمول نہیں کیا جائے گا معنی کے فاسد ہونے کی وجہ سے مگر دونوں احتمالوں میں سے ایک کے اعتبار کے ساتھ۔ اس کے ساتھ ساتھ تحقیقی بات یہ ہے کہ نصب وہ دونوں امور کے جمع کرنے سے منع کا فائدہ دیتی ہے اور باقی ان امور میں سے ہر ایک سے منع علیحدہ طور پر تو وہ کسی دوسری دلیل سے لیا جائے گا (جیسا کہ بعض روایات میں ہر ایک سے منع علیحدہ وارد ہے)۔

اور بیضاویؒ نے فرمایا ہے **ثم یغتسل** یہ صلہ پر عطف ہو رہا ہے اور اس طور سے حکم کا مرتب کرنا یہ دلالت کرتا ہے اس بات

پر کہ منع کا موجب وہ یہ ہے کہ پانی ناپاک ہو جائے گا پس اس سے غسل کرنا جائز نہیں ہوگا اور ''دائم'' سے تخصیص کرنے سے یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ جاری پانی وہ ناپاک نہیں ہوتا مگر تغیر کے ساتھ۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ قاضی بیضاویؒ کی یہ بات محل تامل ہے اس لئے کہ ''**یغتسل**'' کا **یجری** پر عطف انتہائی بعید ہے اس لئے کہ اس وقت تقدیر عبارت یہ ہوگی **نھی عن البول فی الماء الذی لایجری ثم الذی یغتسل فیہ**'' کہ اس پانی میں پیشاب کرنے سے روکا جو جاری نہیں پھر اس میں غسل کرنے سے'' اس معنی کے اندر ضعف ہے اور مراد کے خلاف کا ابہام ہے اس لئے کہ اس صورت میں ''نہی'' اپنی حقیقت یعنی حرمت پر نہیں ہوگی اس لئے کہ اس وقت '' **منھی عنہ**'' وہ غسل ہوگا پیشاب کرنے کے بعد نہ کہ صرف پیشاب کرنا بغیر غسل کے اور یہ ائمہ کے محمول کردہ قول کے خلاف ہے اور نیز اس بات کا فرض کرنا وہ کھڑے ہوئے تھوڑے سے پانی میں لازم آئے گا اس لئے کہ وہی پانی پیشاب کرنے سے متاثر ہوا ہے اگر چہ اس میں تغیر نہ بھی آئے (جو کہ صحیح نہیں)۔

اور قوی بات یہ ہے کہ اس کا عطف وہی ہوگا جو پہلے گزر چکا ہے اور ''ثم'' اپنی حالت پر رہے گا۔ پس ''منہی عنہ'' وہ دو چیزیں ہونگی۔ پانی میں مطلقاً پیشاب کرنا اس میں مطلقاً غسل کرنا اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں صراحۃً مسلم کی روایت میں ''نہی'' وارد ہے جیسا کہ ابھی آئے گا اور ان میں سے ہر ایک سے ''نہی'' کبھی وہ ''نہی تنزیہی'' ہوگی اور کبھی ''نہی تحریمی'' ہو گی۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ اس کا عطف ''**یبولن**'' پر ہے اور ''ثم'' یہاں ''واؤ'' کی طرح ہے عرب کے اس قول کی طرح: **لا تاکل السمك وتشرب اللبن یا یہ ثم** ''فاء'' کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح: ﴿وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ﴾ [طہ:۸۱] یعنی ''نہ ہو کسی ایک سے کھڑے پانی میں پیشاب کرنا پھر غسل کرنا''۔ ثم یہاں استبعاد یہ ہے یعنی عقلمند سے یہ بات بعید ہے کہ وہ ان دونوں امور کو جمع کرے۔ پس اگر تو یہ کہے کہ آپ **یغتسل** کو نصب دینے پر کیوں نہیں اعتماد کرتے یہاں تک کہ یہ معنی آپ کے لئے جاری ہو جائے۔

میں کہتا ہوں کہ معنی (رفع کی صورت میں) قوی ہے تو رفع مضر نہیں ہے کیونکہ یہ اس وقت **احضر الوغی** کی قبیل سے ہو گا (جو اگر چہ مرفوع ہے لیکن اصل میں **ان احضر الوغی** ہے)۔

وفی روایۃ مسلم: یعنی مسلم شریف کی دو روایتیں ہیں ایک جو متفق علیہ ہے اور دوسری یہ روایت۔ یہ علامہ طیبیؒ کا کہنا ہے۔

قال: لا یغتسل: یہ مجزوم ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مرفوع ہے۔

احدکم فی الماء الدائم وھو جنب: یہ ''نہی'' تھوڑے پانی کے بارے میں ہے۔ اس لئے کہ جنبی کے غسل کرنے سے وہ مستعمل ہو جائے گا پس اس وقت اس جنبی نے پانی کو لوگوں کے لئے خراب کر دیا کیونکہ اس کے غسل کے بعد وہ پانی غسل کرنے اور وضوء کے لئے صلاحیت نہیں رکھے گا۔ ابن الملکؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

اور قاضیؒ نے فرمایا ''نہی'' کو حال (**وھو جنب**) سے مقید کرنا دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ جب پانی کھڑا ہو اور اس کو غسل جنابت میں استعمال کیا جائے تو وہ اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہتا ورنہ اگر یہ معنی نہ کریں تو ''نہی'' مقید کا کوئی فائدہ نظر

نہیں آئے گا اور یہ پانی کی طہارت کے زائل ہونے کے ذریعے ہوگا (یعنی مستعمل ہو کر وہ طاہر بھی نہ ہو اور نہ ہی مطہر) جیسا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے یا طہوریت (مطہر ہونے) کے زوال کے ساتھ جیسا کہ امام شافعیؒ نے کہا ہے۔ اور اسی طرح امام محمدؒ کا بھی قول ہے اور اسی پر فتویٰ ہے یعنی یہ حدیث امام مالکؒ پر حجت ہے لیکن امام مالکؒ کی دلیل تو وہ آگے والی حدیث ہے۔

قال یتناوله تناولا: یعنی باہر کھڑے ہو کر چلو بھر بھر کر غسل کرے۔

شرح السنۃ میں مذکور ہے کہ کہ اس حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ جنبی آدمی جب پانی لینے کے لئے ہاتھ داخل کرے تو پانی کا حکم نہیں بدلتا اور اگر پانی میں ہاتھ داخل کیا تا کہ اس ہاتھ سے جنابت کو دھوئے تو پانی کا حکم بدل جائے گا اور اسی طرح ہمارے نزدیک بھی اس کا یہی حکم ہے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے: **وھو جنب** کی قید سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ اس پانی میں صفائی کے لئے غسل یا مسنون غسل مکروہ نہیں ہے غسل مسنون کی مثال جیسے "غسل جمعہ"۔

ظاہر یہ ہوتا ہے کہ یہاں یہ بات مراد نہیں ہے اس لئے کہ غسل مسنون میں علماء کا اختلاف ہے اس لئے کہ ہمارے پاس اس بارے میں یہ دلیل ہے کہ جو پانی غسل میں استعمال ہوتا ہے وہ طہور (مطہر) نہیں ہے، کیونکہ صفائی و ستھرائی وغیرہ کے لئے غسل استعمال شدہ پانی میں بھی گندگی کا ہونا موجود ہے۔

۴۷۵: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّبَالَ فِي الْمَآءِ الرَّاكِدِ۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في الصحيح ۱/۲۳۵ حديث رقم (۹۴-۲۸۱) وأخرجه أحمد في مسنده ۳/۳۵۰۔

ترجمہ: "حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے پانی میں پیشاب کرنے سے منع کیا ہے اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔"

تشریح: **ان یبال فی الماء الراکد**: اور یہ حکم اس لئے ہے کہ کھڑا پانی اگر وہ دو قلوں سے کم ہے تو وہ نجس ہو جاتا ہے اور اس سے غسل کرنا جائز نہیں ہے اور اگر قلتین ہوں تو شاید وہ نجاست کے گرنے سے متغیر ہو جائے تو پھر وہ تغیر کی وجہ سے ناپاک ہوگا اور اسی طرح جب نجاست انتہائی زیادہ ہو جائے اس لئے کہ اگر کھڑے پانی میں پیشاب کرنے کو جائز قرار دیا جائے تو ہر ایک اس میں پیشاب کرنا شروع ہو جائے گا، پس وہ پیشاب کی کثرت کی وجہ سے بدل جائے گا۔ ابن الملکؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

اور امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ "نہی" بعض پانیوں میں "نہی تحریمی" ہے اور بعض میں "نہی کراہت" کے لئے ہے، پس اگر پانی جاری ہو تو اس میں پیشاب کرنا حدیث کے مفہوم کی وجہ سے حرام نہیں ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ اس سے بھی اجتناب کرے اور اگر پانی قلیل جاری ہو تو بعض نے کہا ہے یہ مکروہ ہے اور راجح مذہب یہ ہے کہ یہ حرام ہے اس لئے کہ یہ پانی کو ناپاک کر دیتا ہے اور اگر **ماء کثیر راکد** (کھڑا) ہو تو ہمارے اصحاب نے فرمایا ہے کہ یہ مکروہ ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ حرام ہے تو یہ بات بعید نہیں ہوگی اس لئے کہ بسا اوقات یہ اس **ماء راکد کثیر** کے ناپاک ہونے کی طرف مؤدی ہوگا اجماع کے ساتھ۔

یا اس پانی کا ناپاک ہونا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے موافقین کے نزدیک، اس لئے ہے کہ وہ حوض کہ جس کا ایک کنارہ دوسرے کے حرکت کرنے سے حرکت کرے تو وہ نجاست کے گرنے سے ناپاک ہو جاتا ہے اور باقی وہ پانی جو کھڑا ہوا اور قلیل ہو تو ہمارے حضرات نے اس کو مطلقاً مکروہ کہا ہے۔ لیکن درست بات اور راجح مذہب یہ ہے کہ یہ بھی حرام ہے اس لئے کہ یہ اس کو ناپاک کر دیتا ہے اور ہمارے اصحاب اور دوسرے حضرات نے فرمایا ہے کہ پانی میں پائخانہ کرنا یہ پیشاب کے کرنے کی طرح ہے بلکہ زیادہ قبیح ہے۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے پانی میں قضائے حاجت کرنا رات کے وقت مطلقاً ممنوع ہے اس اندیشہ کی بناء پر کہ کہیں ''جن'' اس کو نقصان نہ پہنچا دیں۔ اس لئے کہ یہ بات کہی جاتی ہے کہ پانی رات کے وقت جنات کا ٹھکانہ ہوتا ہے۔

وضو کا پانی برکت کے لئے پینا

۴۷٦: وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ قَالَ ذَهَبَتْ بِيْ خَالَتِيْ اِلَى النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ ابْنَ اُخْتِيْ وَجِعٌ فَمَسَحَ رَأْسِيْ وَدَعَالِيْ بِالْبَرَكَةِ ثُمَّ تَوَضَّأَ فَشَرِبْتُ مِنْ وَضُوْئِهٖ ثُمَّ قُمْتُ خَلْفَ ظَهْرِهٖ فَنَظَرْتُ اِلٰى خَاتَمِ النُّبُوَّةِ بَيْنَ كَتِفَيْهِ مِثْلَ زِرِّ الْحَجَلَةِ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١/٢٩٦ حديث رقم ١٩٠۔

ترجمہ: حضرت سائب بن یزیدؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میری خالہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئیں۔ اور عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ میرا بھانجا بیمار ہے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ مبارک میرے سر پر پھیرا اور میرے لئے برکت کی دعاء کی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور میں نے آپ کے وضو کا پانی پی لیا اس کے بعد میں آپ کی پشت کے پیچھے کھڑا ہوا اور مہر نبوت کو دیکھنے لگا۔ جو آپ کے دونوں کندھوں کے درمیان تھی اور دلہن کے پلنگ کی گھنڈی کی طرح چمک رہی تھی۔ (بخاری و مسلم)

راویٔ حدیث:

السائب بن یزید۔ یہ سائب ابن یزید ہیں۔ ان کی کنیت ''ابوبکر کندی'' ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ''ازدی'' ہیں۔ بقول بعض ''ھذلی'' ہیں۔ ۲ھ میں پیدا ہوئے اور جب کہ ان کی عمر سات سال کی تھی اپنے والد ماجد کے ہمراہ حجۃ الوداع میں حاضر ہوئے۔ ان سے زہری اور محمد بن یوسف روایت کرتے ہیں۔ ۸۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

تشریح: قال ذھبت بی خالتی: یہاں ''باء'' تعدیہ کے لئے ہے ای اذھبتنی مجھے لے گئی۔

ان ابن اختی وجع: وجع ''جیم'' کے کسرہ کے ساتھ اس کا معنی ''مریض ہے''۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ''جیم'' کا فتحہ بھی جائز ہے ای ذووجع۔

فمسح راسی: یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا کہ شمائل میں مذکور ہے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں یہ احتمال ہو سکتا

ہے کہ درد سر میں ہو۔ پس آپ ﷺ نے سر پر ہاتھ مبارک پھیرا تا کہ یہ شفاء کا سبب بن جائے۔ پس ایسے ہی ہوا۔ حضرت سائب نے ۱۰۰ سال کی عمر پائی اور ایک بال بھی سفید نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی دانت گرا۔

ودعا لی :اور شمائل کے بعض نسخوں میں ''فاء'' ہے **فدعا لی**۔

بالبرکة :یعنی بڑھوتری اور خیر اور نعمتوں کی زیادتی کی۔

فشربت من وضوئه :''واؤ'' کے فتحہ کے ساتھ یعنی وضوء کا پانی۔

ملا علی قاری حنفی شمائل کی شرح میں فرماتے ہیں کہ یہ جائز ہے کہ یہاں وضوء سے وضوء کا بچا ہو پانی مراد ہو یعنی وہ پانی جو برتن میں وضوء سے فارغ ہونے کے بعد بچ گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں وہ پانی مراد ہو جو وضوء کے اعضاء سے جدا ہوا ہو اور یہ دوسرا مطلب زیادہ مناسب ہے، اس پینے والے کے لئے جو اس سے تبرّک حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس معنی کی بناء پر یہ حدیث دلیل ہوگی اس بات کی کہ ماء مستعمل وہ طاہر ہوتا ہے۔ اور جو اس کے خلاف ہے وہ اس کو تداوی (یعنی علاج کے طور پر) پر محمول کرے گا یا یہ کہے گا کہ یہ حضور ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے یا یہ پہلے کا حکم ہے اور ماء مستعمل کا ناپاک ہونا وہ اس کے بعد ہوا ہو۔ اس کو غور سے سمجھ لو اور فتویٰ یہ ہے کہ ماء مستعمل امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب میں طاہر ہے اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ کبھی یہ بھی جواب دیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کے اعضاء سے بہہ جانے والا پانی ان اعضاء کے شرف کی وجہ سے ناپاک نہیں ہوتا ہے اسی وجہ سے ہمارے اصحاب میں سے بہت ساروں نے آپ ﷺ کے فضلات کو طاہر کہا ہے اور اسی کو اختیار کیا ہے۔

فنظرت الی خاتم النبوة : **خاتم** ''تاء'' کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ منقول ہے اور بعض نے کہا ہے کہ فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ''مہر'' کے معنی میں ہے کہ جس سے مہر لگائی جائے اور ظاہر یہاں یہ ہے کہ خاتم سے یہاں مراد وہ اثر ہے جو مہر کے لگانے سے حاصل ہو نہ کہ وہ مہر (آلہ) اور خاتم نبوۃ کی طرف اضافت یا تو اس لئے ہے کہ آپ کی نبوت پر مہر لگا دی گئی ہے اس نبوت کی حفاظت کے لئے اور جو کچھ اس نبوت میں ہے اس کی حافظت کے لئے اور اس نبوت کے تمام ہونے کی دلالت کے لئے یا نبوت کی حفاظت میں مبالغے کے لئے اور یا اضافت اس لئے ہے کہ یہ علامت آپ ﷺ کی نبوت کے لئے۔

بین کتفیه :یہ خاتم سے حال ہے یا اس کی صفت ہے اور اس کی تائید ان بعض روایات سے ہوتی ہے کہ جس میں یہ الفاظ وارد ہیں: **الی الخاتم الذی بین کتفیه**: **کتفیه** ''کاف'' کے فتحہ اور ''تاء'' کے کسرہ کے ساتھ منقول ہے اور بعض نے کہا ہے ''اول'' کے کسرہ اور ''ثانی'' کے سکون کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ خاتم نبوت وہ ایسا نشان تھا جو آپ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان تھا اس کے ذریعے آپ ﷺ کی کتب سابقہ میں صفت بیان کی گئی تھی اور خاتم نبوت ایسی علامت تھی کہ جس کے ذریعے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ نبی ہے (آنے کے) بارے میں پہلی آسمانی کتابوں میں وعدہ کیا گیا تھا اور اس کے ذریعے خوشخبری سنائی گئی تھی۔ اور یہ خاتم نبوت آپ کی نبوت کو تکذیب وعیب سے بچاؤ کا ذریعہ ہے جیسا کہ وہ شئی کہ جس پر مہر ثبت کر کے اس کو محفوظ و مضبوط بنا دیا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ آپ کو خاتم النبوۃ سے اس لئے موسوم کیا جاتا ہے کہ اس میں اشارہ ہے نبوت و رسالت کے آپ پر ختم ہونے کی طرف۔ پس آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

اور عیسیٰ علیہ السلام نئی نبوت لے کر نہیں اُتریں گے بلکہ ہمارے نبی ﷺ کی شریعت پر عمل کرتے ہوئے اُتریں گے اور آپ کی

اُمت میں سے بعض کی اقتداء کریں گے اور عیسیٰ علیہ السلام کا ذمیوں کو قتل کرنا اور ان سے جزیہ قبول نہ کرنا یہ بھی ہماری ہی شریعت میں سے ہے اس لئے کہ جزیے کے لینے کی آپ علیہ السلام کے نزول کے ساتھ انتہاء بیان کی گی ہے عیسائیوں کے شبہ کے زائل ہونے کی وجہ سے جو شبہ قبول جزیہ کو جائز قرار دینے والا تھا (یعنی جزیہ کا حکم اس وقت تک ہوگا جب تک عیسیٰ علیہ السلام نازل نہیں ہوئے جب وہ نازل ہو جائیں گے تو ان کے سولی پر چڑھائے جانے کا شبہ ختم ہو جائے گا تو پھر یہ حکم بھی انتہاء کو پہنچ جائے گا)۔

بعض نے کہا ہے کہ خاتم النبوۃ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام رکھنا اسی وقت تمام ہوگا جب کہ خاتم کا ہونا صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی خصوصیت ہو اور جب یہ وارد ہو کہ ہر نبی کے لئے خاتم ہے تو پھر یہ نام رکھنا تام نہ ہوگا۔

اس بات کا یوں ردّ کیا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں یہ مخصوص خاتم ہے جو مخصوص جگہ میں تھی جو بقیہ انبیاء سے تمیز پر دلالت کرنے والی تھی اور انبیاء کی خواتیم ان کے دائیں ہاتھوں پر تھی جیسا کہ حاکم نے اس کو وھب بن منبہؒ سے روایت کیا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی خواتیم کا دل سے دور ہونا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتم کا دل کے قریب ہونا اس میں فرق کو بتلاتا ہے اور حدیث میں جو یہ آیا ہے: "**بين كتفيه**" تو اس سے مراد یہ ہے کہ تقریباً وہ خاتم نبوت کندھوں کے درمیان میں تھی، تاکہ یہ مسلم کی روایت کے منافی نہ ہو کہ جس میں یہ آتا ہے کہ وہ خاتم نبوت بائیں کندھے کے اُوپر والے حصے میں تھی۔ **عند نغض كتفه الايسر**۔ "**نغض**" نون کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ اور غین اور ضاد کے ساتھ مروی ہے جس کے بارے میں محدثین کے کئی اقوال ہیں۔

اعلى كتف: کندھے کے اُوپر والا حصہ یا کندھے کے کنارے کی جو پتلی ہڈی ہوتی ہے وہ مراد ہے یا وہ کہ جو حرکت کے وقت ظاہر ہوتی ہے۔ علامہ سہیلیؒ نے فرمایا ہے کہ خاتم نبوت کا بائیں کندھے کے اُوپر والے حصے میں ہونا ہی صحیح ہے اور علامہ سہیلیؒ کا اس سے اس روایت کے ردّ کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں **عند كتفه الايمن** دائیں کندھے کے قریب ہونے کا ذکر ہے اور پہلی روایت میں حکمت یہ ہے کہ محل دل کے اُوپر ہے۔ پس اس پر ختم نبوت کی مہر دِل کی طرف کسی بھی طریقے سے کسی چیز کے جانے کو ناممکن بنا دیتی ہے۔

مثل: یہ منصوب **بنزع الخافض** ہے **اى كمثل** ۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مرفوع ہے اس طرح کہ یہ "**هوَ**" محذوف کی خبر ہے اور شمائل کی روایت جس میں **فاذا هو مثل** ہے اس کی تائید کرتی ہے۔

زر الحجلة: ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ زرّ (زاء اور راء مشدد کے ساتھ) یہ ازرارؒ کا واحد ہے وہ گھنڈیاں جو مسہری پر لگائی جاتی ہیں (جو بٹن کی طرح گول ہوتی ہیں)۔ **الحجلة** "حاء" اور "جیم" کے ساتھ مراد وہ قبانما کمرہ جو کپڑے وغیرہ لگا کر بنایا جاتا ہے دلہن کے لئے۔ اور اس کے لئے بڑی بڑی گھنڈیاں ہوتی ہیں (تو گویا زر الحجلہ سے مراد یہ ہے کہ خاتم نبوت مسہری کی گھنڈی (بٹن) کی طرح گول تھی)۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اہل مکہ اب اس کو ناموسیہ کہتے ہیں۔ میرک شاہؒ فرماتے ہیں کہ یہ تشریح جمہور کے نزدیک ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ **رز الحجلة** ہے "راء" مقدم ہے "زاء" پر، اس کا مطلب ہے "انڈا" اور حجلہ سے مراد "چکور" ہے جو کہ ایک معروف پرندہ ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ خاتم نبوت چکور کے انڈے کی طرح تھی۔ ابن الملکؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

اور میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ علامہ خطابیؒ نے ذکر کیا ہے کہ یہ ''راء'' کے ''زاء'' پر تقدیم کے ساتھ مروی ہے اور ملا علی قاریؒ حنفی فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح بخاری میں ذکر کیا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ ''راء'' ''زاء'' سے پہلے ہے اور علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ ازرارٌ کا واحد ہے، مراد وہ گھنڈیاں ہیں جس سے دلہنوں کے لئے کپڑے اور پردے لگا کر مسہریاں باندھی جاتی ہیں اور یہ معنی بلاغت کے طریق سے بعید ہے، تشبیہ اور استعارہ میں قاصر ہے۔ پھر مزید یہ کہ یہ تشریح باب خاتم النبوۃ میں منقول روایات سے میل بھی نہیں کھاتی اور بعض نے کہا ہے کہ مراد چکور کا انڈا ہے اور یہ قول ان احادیث کے موافق ہے جو اس باب میں مروی ہیں سوائے اس بات کہ ''زر'' بمعنی انڈا کلام عرب میں نہیں پایا جاتا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ رزٌّ ہے جو ماخوذ ہے رزت الجرادة سے کہ ٹڈی کا انڈے دینے کے لئے دُم کو زمین میں چبھونا۔ یہ تشریح حدیث کے ساتھ زیادہ مشابہہ ہے مگر روایت اس کے لئے موید نہیں ہے۔

اور وہ روایت جو قول ثانی کے لئے موید ہے وہ، وہ روایت ہے کہ جس کو امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ **عن جابر بن سمرة كان خاتم رسول الله بين كتفيه غدة حمراء مثل بيضة الحمامة**۔ ''جابر بن سمرہ فرماتے ہیں کہ خاتم نبوت آپ کے دونوں کندھوں کے درمیان تھی جو سرخ غدود تھی کبوتری کے انڈے کی طرح''۔

بعض نے کہا ہے کہ بعض وجوہ کے اندر مشابہت کا ہونا وہ کافی ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی چیز ہو جو جسم سے ابھری ہوئی ہو اس کی ایک طرح سے مسہری کی گھنڈی سے مشابہت ہو۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں بعض روایات میں: **مثل زر الحجلة** کے مخالف تعبیرات وارد ہوئی ہیں جیسا کہ مسلم کی روایت میں **جمع عليه خيلان كانها الثآ ليل السود** ۔ یعنی وہ خاتم نبوت مٹھی کی طرح تھی کہ جس پر تل تھے گویا کہ وہ ابھرے ہوئے سیاہ مسے تھے اور مسلم ہی کی روایت میں: **كبيضة الحمامه** کا ذکر ہے ''کبوتری کے انڈے کی طرح''۔

اور صحیح حاکم کی روایت میں **شعر مجتمع** مذکور ہے ''بالوں کا مجموعہ''۔ اور بیہقی کی روایت میں **مثل السلعة** ذکر ہے جس کا معنی ہے ''کھال میں ابھری ہوئی گوشت کی گرہ یا کھال کے ساتھ لگا ہوا زائد گوشت''۔

اور شمائل ترمذی میں **بضعة ناشزة** مذکور ہے جس کا معنی ہے ''ابھرا ہوا گوشت کا ٹکڑا''۔

اور ابن عساکر کی روایت میں **مثل البندقه** ہے جس کا معنی ہے ''مٹی کا غلہ یا بیر جتنا پھل''۔

اور صحیح ترمذی کی روایت میں ہے: **كالتفاحة كاثر المحجم القابضة على اللحم** جس کا معنی ہے کہ ''خاتم نبوت وہ سیب کی طرح تھی جیسا کہ سینگی لگانے کے آلے کا اثر جس سے گوشت پکڑا جائے''۔

اور ابن ابی خیثمہ کی روایت میں ہے: **شامة خضراء محتفرة في اللحم** یعنی ''سبز قسم کا تل جو گڑھا ہوا تھا گوشت میں'' اور ایک دوسری روایت میں یوں ہے کہ وہ ''کالا سا تل تھا جو زردی مائل تھا اس کے ارد گرد تہہ بہ تہہ بال تھے جیسا کہ گھوڑے کی ایال''۔

اور قضاعی کی روایت میں **ثلاث شعرات مجتمعات**۔ کہ ''تین ملے ہوئے بال تھے''۔

اور ترمذی حکیم کی روایت میں یہ ہے کہ ''وہ کبوتری کی انڈے کی طرح تھی''۔ اس کے باطن میں یہ لکھا تھا: **الله وحده لا**

شریك له اور اس کے ظاہر میں یہ تھا: توجه حیث کنت فانك منصور کہ جہاں بھی جاؤ گے آپ کی مدد کی جائے گی۔
اور ابن عائذ کی روایت میں ہے کہ ''وہ نور تھا جو چمکتا تھا''۔
اور ابن ابی عاصم کی روایت میں ہے کہ ''وہ اس نقطے کی طرح تھی جو کبوتری کی چونچ کے نیچے ہوتا ہے''۔
اور تاریخ نیسابور میں مذکور ہے کہ ''وہ گوشت کے غلہ کی طرح تھا گوشت کے ساتھ اس میں لکھا ہوا تھا محمد رسول اللہ''۔
یہ مقدار میں اختلاف حقیقی نہیں ہے بلکہ ہر ایک نے تشبیہ دی ہے، اس چیز کے ساتھ جو اس کے لئے ظاہر ہوئی اور تمام کی تمام تشبیہات اس کی کیفیت کو ادا کرنے والی ہیں اور مراد اس سے وہ ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے گوشت کا ٹکڑا۔ جس نے بال کہا تو وہ اس لئے کہ اس کے ارد گرد تہہ بہ تہہ بال تھے جو جسم میں ابھرے ہوئے تھے کبوتری کے انڈے کے قریب قریب تھے اور ایک روایت میں جمع الکف ذکر ہے۔ جس کا معنی ہے کہ وہ مٹھی کی طرح تھی لیکن مٹھی سے چھوٹی تھی۔
اور کالمحجم یا کالشامة السوداء یا او الخضراء والی روایت اور مہر نبوت پر لکھائی کا ہونا جیسا کہ گزرا ان میں سے کوئی بات بھی ثابت نہیں ہے ابن حبان نے اس کی تصحیح کر کے غلطی کی ہے۔ اور اسی طرح جس نے یہاں کتابت کو ذکر کیا ہے بے شک اس پر مہر نبوت اس خاتم کے ساتھ مشتبہ ہوگئی کہ جو آپ کے ہاتھ میں ہوتی تھی جس سے آپ مہر لگاتے تھے۔
(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ ابن حجرؒ کا کتابت کو اس پر محمول کرنا انتہائی بعید ہے اور اقرب بات یہاں یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ کتابت معنوی ہو یا صوری لیکن اس کا ادراک وہ نوری بصیرت ہی کر سکتی تھی۔
پھر ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ بزار وغیرہ کے اندر جو حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ جس میں مہر نبوت کے رکھنے کے وقت اور کیسے رکھا گیا اور کس نے رکھا اس کی تصریح موجود ہے۔ حضرت ابو ذرؓ فرماتے ہیں میں نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ آپ اللہ کے نبی ہیں اور کس چیز کی وجہ سے آپ کو معلوم ہوا یہاں تک کہ آپ کو یقین ہو گیا؟ فرمایا: میرے پاس دو آنے والے آئے اور ایک روایت میں ہے کہ دو فرشتے آئے اور میں بطحاء (مقام) میں تھا پس ایک زمین میں اترا آیا اور دوسرا آسمان اور زمین کے درمیان رہا پس ایک نے دوسرے کو کہا کہ کیا یہ وہی ہیں؟ اس نے کہا ہے ہاں یہ وہی ہیں، پھر اس حدیث میں آگے یوں مذکور ہے، پھر ایک نے اپنے ساتھی کو کہا کہ ان کے پیٹ کو چیرو پس اس نے میرے پیٹ کو چیرا پس میرے دِل کو نکالا پس اس دل سے شیطان کے طمع کرنے کی جگہ اور جمے ہوئے خون کے ٹکڑے کو نکالا اور ان کو پھینک دیا۔ پس ایک نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا کہ ان کے پیٹ کو برتن کے دھونے کی طرح دھو دو اور ان کے دِل کو کپڑے کے دھونے کی طرح دھو دو (غسل الملاء۔ دوہری چادر جس کو اوڑھا جائے)۔ پس ایک نے اپنے ساتھی سے کہا کہ ان کے پیٹ کو سی دو اس نے میرے پیٹ کو سی دیا اور خاتم کو میرے کندھوں کے درمیان کر دیا جیسا کہ ابھی ہے اور وہ دونوں فرشتے چلے گئے اور گویا کہ میں نے یہ سارا معاملہ آنکھوں سے دیکھا ہے۔
اور مسند احمد میں روایت ہے جس کو حاکم نے صحیح قرار دیا ہے کہ انہوں نے میرے دِل کو نکالا پس اس کو چیرا پس ان دونوں نے اس سے دو سیاہ جمے ہوئے خون کے ٹکڑے نکالے، ان میں سے ایک نے کہا کہ پانی اور برف کو لاؤ پس اس کے ذریعے انہوں نے میرے پیٹ کو دھویا پھر اس نے کہا کہ پانی اور اولے لے کر آؤ پس اس کے ساتھ انہوں نے میرے دل کو دھویا پھر

اس نے کہا کہ سکینہ لے کر آؤ تو سکینہ کو میرے دِل میں زائد رکھا پھر ایک نے اپنے ساتھی سے کہا کہ پیٹ کوسی دو پس اس نے اس کوسی دیا اور اس پر ختم نبوت کی مہر لگا دی۔

اور اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قاضی عیاضؒ نے اپنے اس قول: **هذا الخاتم هو اثر شق الملكين بين كتفيه عليه الصلام والسلام** میں کوئی تعلق ذکر نہیں کیا اس لئے کہ ''بین'' یہ ''خاتم'' کے لئے ظرف ہے نہ کہ شق کے لئے۔ پس حاصل یہ ہے کہ مہر نبوت بالا جماع وہ دونوں کندھوں کے درمیان میں تھی اور شق صدر جب ہوا پھر صدر کوسی دیا گیا یہاں تک کہ وہ پہلے کی طرح ہو گیا اور مہر نبوت دونوں کندھوں کے درمیان واقع ہوئی تو گویا یہ مہر نبوت اس شق صدر کا اثر تھی اور ابونعیم نے روایت کی ہے کہ ولادت کے وقت یہ مہر لگائی گئی تھی اور بعض نے کہا کہ آپ ﷺ جب پیدا ہوئے تو مہر نبوت موجود تھی۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ متعدد بار مہر کے لگنے اور ہر بار زیادتِ اثر کو ماننے میں کوئی رکاوٹ معلوم نہیں ہوتی لہٰذا (تمام روایات صحیح ہیں)۔

قلّتین کا مسئلہ

۴۷۷: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْمَآءِ يَكُوْنُ فِي الْفَلَاةِ مِنَ الْاَرْضِ وَمَا يَنُوْبُهٗ مِنَ الدَّوَآبِّ وَالسِّبَاعِ فَقَالَ اِذَا كَانَ الْمَآءُ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحْمِلِ الْخَبَثَ۔

(رواه احمد وابو داود والترمذى والنسائى والدارمى وابن ماجة وفى اخرٰى لابى داود فَاِنَّهٗ لَايَنْجُسُ)

أخرجه أحمد فى مسنده ۲/ ۲۷۔ وأخرجه أبوداوٗد فى السنن ۱/ ۵۱ حديث رقم ۶۳۔ وأخرجه الترمذى فى السنن ۱/ ۹۷ حديث رقم ۶۷۔ وأخرجه النسائى فى السنن ۱/ ۴۶ حديث رقم ۵۲ عن عمر ابن أبيه۔ وأخرجه الدارمى فى السنن ۱/ ۲۰۲ حديث رقم ۷۳۲۔ وأخرجه ابن ماجة فى السنن ۱/ ۱۷۲ حديث رقم ۵۱۷۔

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے اس پانی کے متعلق دریافت کیا گیا جو جنگل میں زمین پر جمع ہو جاتا ہے اور اکثر اس پر جانور اور درندے آتے جاتے ہیں اور اس میں پیشاب بھی کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر وہ پانی دو مٹکوں کے برابر ہو تو پانی وقوع نجاست سے نجس نہیں ہوتا اس حدیث کو امام احمدؒ امام ابوداؤدؒ امام ترمذیؒ امام نسائیؒ امام دارمیؒ امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد کی ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے۔ **فانه لاينجس**۔ کہ وہ پانی ناپاک نہیں ہوتا۔

تشریح: **وما ينوبه**: اس کا بطور بیان کے ''ماء'' پر عطف ہے جیسے **اعجبنى زيد كرمه**۔ کہا جاتا ہے **ناب المكان ونابه** جب اس جگہ بار بار آئے۔

من الدواب والسباع: یہ (ما) کا بیان ہے علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں اس حدیث میں اس امر کی دلیل ہے کہ درندوں کا جوٹھا ناپاک ہے ورنہ صحابہؓ کے سوال کرنے اور حضور ﷺ کے جواب دینے کا کوئی مطلب نہیں ہوگا اور وہ اس لئے کہ عموماً درندوں کی عادت یہ ہے کہ جب پانی کے گھاٹوں میں آتے ہیں تو اس میں داخل ہوتے ہیں اور پیشاب کرتے ہیں اور بسا اوقات ان

کے اعضاء ان کے پیشاب اور لید وغیرہ سے خالی نہیں ہوتے ہیں۔علامہ طیبیؒ نے اس کو ذکر کیا ہے۔ پہلا ہمارا مذہب ہے اور دوسرا امام شافعیؒ کا۔

اذا کان الماء قلتین :بعض نے کہا ہے کہ ''قلہ'' وہ بڑا مٹکا ہے جس میں ۲۵۰ رطل بغدادی سما جائیں۔پس دو قلے وہ ۵۰۰ رطل ہوں گے اور بعض نے ۶۰۰ رطل بتائے ہیں۔اور ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ ''قلہ'' حجاز میں معروف ہے۔ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ شاید کہ وہ ''قلہ'' حجاز میں معروف ہو۔اور قاضیؒ فرماتے ہیں کہ ''قلۃ'' سے مراد وہ برتن ہے کہ جس کے ذریعے پانی لایا جائے۔اس کو قلہ اس لئے کہا گیا تھا کہ ہاتھ اس کو اٹھاتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ''قلۃ'' کہتے ہیں وہ بوجھ کہ جس کو اونٹ اٹھائے۔طیبیؒ نے اس کو ذکر کیا ہے اور ایک روایت میں **اربعین قلة غربا** یعنی چالیس ڈول وارد ہے اور یہ روایت اگرچہ صحیح نہیں ہے قابل شبہ کی وجہ سے ہے اور :**اذا بلغ الماء قلتین بقلال هجر** والی روایت صحیح نہ ہونے کے باوجود مجہولیت سے خالی نہیں ہے اور بعض حضرات نے حدیث ''قلتین'' کو جاری پانی پر محمول کیا ہے۔خوب سمجھ لو۔

اور اس حدیث کے ظاہر کو نجاست سے متغیر شدہ پانی میں چھوڑا گیا ہے اجماع کی وجہ سے اور اس روایت کی وجہ سے کہ جس میں یوں وارد ہے کہ پانی پاک ہے اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی ہے مگر جب اس کے ذائقے یا رنگ یا بُو پر نجاست غالب آجائے۔

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس مذکورہ حدیث **الاما غلب علی طعمه ولونه وريحه** کے الفاظ اتفاقاً ضعیف ہیں۔

اور حنفیہؒ میں سے امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ ''قلتین'' والی حدیث صحیح ہے اور اس کی اسناد ثابت ہیں اگرچہ ہم نے عمل کرنا اس پر چھوڑ دیا اس لئے کہ ہم نہیں جانتے کہ ''قلتان'' سے کیا مراد ہے اور اس لئے بھی کہ ''قلتین'' اور ''ثلاثا'' شک کے ساتھ مروی ہے۔

اور ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور جن لوگوں نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے ان میں حافظ ابن عبدالبر قاضی اسماعیل، ابن الحق اور ابوبکر بن عربی یہ سارے حضرات مالکیہ میں سے ہیں۔

اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ جرح تعدیل پر مقدم ہوتی ہے جیسا کہ نخبۃ الفکر میں مذکور ہے پس اس جرح کو بعض محدثین کی تصحیح دور نہیں کرتی ان محدثین میں سے کہ جس کو ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے اور ابن معینؒ سے پوچھا گیا اس حدیث کے بارے میں فرمایا: کہ یہ حدیث جید ہے اگرچہ ابن علیہ نے اس کو محفوظ نہیں کیا ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ وہ روایت کہ جس میں یہ قصہ مروی ہے کہ ایک حبشی زمزم کے کنویں میں گر کر مر گیا تو ابن عباسؓ نے اس کو نکالنے کا حکم دیا۔یہ روایت یا تو ضعیف ہے بلکہ باطل ہے جیسا کہ علامہ نوویؒ نے بیان کیا ہے اور یا یہ روایت محمول ہے اس بات پر کہ حبشی کے خون نے اس پانی کو بدل دیا تھا یا کنویں کے پانی کا نکالنا بطور استحباب تھا اس لئے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مشہور مذہب یہی ہے کہ پانی تھوڑا ہو یا زیادہ وہ سوائے تغیر کے ناپاک نہیں ہوتا جیسا کہ امام مالکؒ کا مذہب ہے۔اور اسی کو ہمارے اصحاب میں سے ایک جماعت نے اختیار کیا ہے اور اس مذہب میں لوگوں کے لئے بہت بڑی گنجائش موجود ہے جو کہ

مذکورہ ''قلتین'' والی روایت کے مخالف ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔

محقق ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ رہا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ تو اس کو دار قطنیؒ نے روایت کیا ہے۔ وہ روایت یوں ہے کہ سیرین فرماتے ہیں کہ حبشی زمزم کے کنویں میں گر گیا یعنی مر گیا، پس ابن عباسؓ نے حکم دیا، پس حبشی کو نکالا گیا اور کنویں کے بارے میں حکم دیا کہ اس کے پانی کو نکالا جائے، راوی کہتے ہیں کہ زمزم کا چشمہ ان پر غالب آ گیا جو رکن کی طرف سے آ رہا تھا، راوی کہتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس چشمے کو سوتی اور ریشمی کپڑوں سے بند کرنے کا حکم دیا، یہاں تک کہ سارے کنویں کو انہوں نے نکال لیا، پس جب نکال لیا تو دوبارہ (کھولنے کا حکم دیا) وہ چل پڑا۔ یہ مرسل روایت ہے اس لئے کہ ابن سیرینؒ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو نہیں دیکھا ہے اور ابن ابی شیبہ نے اس روایت کو عن منصور عن عطاء کی سند سے نقل کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے اور امام طحاویؒ نے اس کو یوں نقل کیا ہے: **عن صالح بن عبد الرحمان قال حدثنا سعيد بن منصور قال حدثنا هشيم قال حدثنا منصور عن عطاء ان حبشيا وقع في زمزم فمات فامر عبدالله بن زبير فنزح ماء ها فجعل الماء لا ينقطع فنظر فاذاعين تجرى من قبل الحجر الاسود ۔فقال ابن سيرين حسبكم** ۔اور یہ روایت بھی صحیح ہے جیسا کہ شیخ تقی الدین نے کتاب الامام میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

اور ابن عیینہ کا یہ قول کہ میں مکہ میں سات سال رہا میں نے نہیں دیکھا کسی چھوٹے کو اور نہ ہی کسی بڑے کو کہ ان میں سے کوئی اس حبشی کے زمزم میں گرنے والی حدیث کو جانتا پہچانتا ہو اور اسی طرح امام شافعیؒ کا قول کہ یہ واقعہ ابن عباسؓ سے معروف نہیں ہے اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے حالانکہ ابن عباسؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث: **الماء لا ينجسه شئى** روایت کرتے ہیں پھر روایت بھی کریں اور اس کو چھوڑ بھی دیں اور اگر ابن عباسؓ نے ایسے کیا بھی ہو تو پھر یا تو پانی پر نجاست کے ظاہر ہونے کی وجہ سے ایسا کیا ہو یا صفائی کی وجہ سے۔ ان دونوں قولوں کا ردّ یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کو معلوم نہ ہونا یہ اللہ تعالیٰ کے دین میں دلیل بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

اور ابن عباسؓ کی یہ روایت جس کا آپ کو علم ہے تو آپ (اے امام شافعیؒ) **مادون القلتين** کو نجاست کے گرنے سے ناپاک قرار دیتے ہیں۔ ایک دوسری دلیل کی وجہ سے جو آپ کے ہاں صحیح ہے، تو ابن عباسؓ سے **الماء لا ينجسه شئى** (جیسی مطلق روایت کو) بعید قرار نہیں دیتے (جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ **الماء لا ينجس شئى** یہ آپ کے بھی تو خلاف ہے تو پھر اس روایت کی طرح ''قلتین'' والی روایت کو بھی بعید سمجھنا چاہیے تھا)۔ اور حدیث زنجی کے سیاقِ کلام (**مات فامر بنزها**) سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اخراجِ ماء وہ موت کی وجہ سے تھا نہ کہ نجاست کی وجہ سے اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے نزدیک تو نجاست کی وجہ سے بھی نہیں نکالا جائے گا۔

پھر یہ کہ ابن عیینہ اور امام شافعیؒ کے درمیان اور اس حدیث کے درمیان تقریباً ۱۵۰ سال کا عرصہ ہے۔ پس جس نے اس واقعہ کو پایا یا جس نے اس کو ثابت کیا اس کا خبر دینا وہ بہتر ہے (اور قابلِ استدلال ہے) اس شخص کے مقابلہ میں کہ جس کو اس کا علم نہیں ہوا ہے۔

اور امام نوویؒ کا یہ قول کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ حدیث کوفہ پہنچ جائے اور اہل مکہ اس سے جاہل رہیں۔ یہ سند حدیث کے

واضح ہونے کے بعد اس کو بعید جاننا ہے اور یہ بات معارض ہے امام شافعیؒ کے قول کے جو انہوں نے امام احمدؒ سے کہی: انتم اعلم بالاخبار الصحیحة منا فاذا کان خبر صحیح فاعلمونی حتی اذهب الیه کوفیا کان او بصر یا او شامیا۔'' کہ تم صحیح احادیث کو ہم سے زیادہ جاننے والے ہو پس اگر کوئی صحیح ہو تو مجھے بتلایا کرو حتی کہ میں اس کو حاصل کرنے جاؤں وہ روایت کسی کوفی کے پاس ہو یا کسی بصری کے پاس یا کسی شامی کے پاس''۔ پس انہوں نے یہ کیوں نہیں کہا کہ کیسے یہ حدیث ان تک پہنچ جائے اور اہل حرمین اس سے جاہل رہیں؟

اور یہ بات اس لئے کہی کیونکہ صحابہ تمام بلاد میں پھیل گئے تھے خصوصاً عراق میں۔ عجلیؒ نے فرمایا ہے اپنی تاریخ میں کہ کوفہ میں ۱۵۰۰ صحابہ رہائش پذیر ہوئے اور قرقیسا شہر جو فرات کے کنارے پر ہے اس میں ۶۰۰ صحابہ رہتے تھے۔

لم یحمل الخبث: قاضیؒ نے فرمایا ہے کہ حدیث کا منطوق وہ اس بات پر دلالت کرتا کہ پانی جب قلتین تک پہنچ جائے تو وہ نجاست کی ملاقات سے ناپاک نہیں ہوتا، پس بے شک لم یحمل کا معنی ہے ''لم یقبل'' کہ وہ نجاست کو قبول نہیں کرتا۔ جیسا کہا جاتا ہے کہ: فلان لا یحمل ضیما یعنی جب اس کے قبول کرنے سے وہ رُک جائے اور یہ تفصیل اس وقت تک ہے کہ جب تک اس میں تغیر نہ واقع ہو پس اگر تغیر واقع ہو جائے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے۔

اور مفہوم حدیث وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اگر وہ قلتین سے کم ہو تو نجاست کی وجہ سے ناپاک ہو جائے گا اور یہ مفہوم حدیث خلق الماء طهورا والی حدیث میں تخصیص کر دیتی ہے ان حضرات کے نزدیک جو مفہوم کے ماننے کے قائل ہیں اور جن لوگوں نے مفہوم (مخالف) کا اعتبار نہیں کیا جیسا کہ امام مالکؒ تو اس نے اس حدیث کو عام قرار دیا ہے کہ پانی تھوڑا ہو یا زیادہ وہ سوائے تغیر کے ناپاک نہیں ہوتا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ لم یحمل میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ضعف کی وجہ سے اس کو اٹھا نہ سکے یا اپنی قوت کی وجہ سے اس کو قبول نہ کرے اور دوسری روایت (فانه لا یجس) کے ساتھ دوسرا معنی راجح ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں راجح ہونا وہ اس پر موقوف ہے کہ جب روایت بالمعنی نہ ہو اور شاذ روایت کو روایت بالمعنی پر محمول کرنا اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

اور یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ کسی راوی نے اس کو حدیث میں داخل کر دیا ہو جیسا کہ فاء تعلیلیه اس بات پر دال ہے۔

پس بیشک جب لم یحمل میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جسم کے اٹھانے کی قبیل سے ہو جیسا کہ کہا جاتا ہے: فلان لا یحمل الحجر یعنی فلان پتھر کے بوجھل ہونے کی وجہ سے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا اور یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ کسی معنوی شئ کے اٹھانے کی قبیل سے ہو جیسا کہ: فلان لا یحمل الغم یعنی وہ غم کو قبول نہیں کر سکتا اور اس پر صبر نہیں کر سکتا اور اسی کے قبیل سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا﴾ [الجمعه:٥] ''جن لوگوں (کے سر) پر تورات لدوائی گئی پھر انہوں نے اس (کے بار تعمیل) کو نہ اٹھایا'' بھی ہے جس کا معنیٰ ہے کہ انہوں نے اس کے احکام کو قبول نہیں کیا۔ تو راوی نے اپنی رائے اور فہم سے یہ علت اخذ کی: فانه لا ینجس۔

لیکن اس کے باوجود بھی ایک اور بات باقی رہ جاتی ہے، کہ قلتین کے ذکر کرنے کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہتا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا کوئی شافی کافی جواب نہیں ہے، ہاں اگر یہ کہا جائے کہ لم یحمل الخبث کا معنی یہ ہے کہ وہ واضح وصریح طور پر

نہیں بدلتا تو پھر یہ جملہ مالکیہ کے لئے دلیل بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور قلتین کے ذکر کرنے کا فائدہ اکثری بھی البتہ ظاہر ہو جائے گا۔

حدیث بیر بضاعہ

۴۷۸: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِالْخُدْ رِیِّ قَالَ قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَنَتَوَضَّأُ مِنْ بِئْرِ بُضَاعَۃَ وَھِیَ بِئْرٌ یُلْقٰی فِیْھَا الْحِیَضُ وَلُحُوْمُ الْکِلَابِ وَالنَّتْنُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّ الْمَآءَ طَھُوْرٌ لَّایُنَجِّسُہٗ شَیْءٌ۔

(رواہ احمدو الترمذی و ابو داود و النسائی)

أخرجه أحمد فی مسنده ۳۱/۳ وأخرجه الترمذی فی السنن ۹۵/۱ حدیث رقم ٦٦ ـ وقال حدیث حسن۔
وأخرجه أبو داوٗد فی السنن ۵۳/۱ حدیث رقم ٦٦ ـ والنسائی فی السنن ۱۷٤/۱ حدیث رقم ۳۲٦ ـ

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کیا ہم بیر بضاعہ کے کنوئیں سے وضو کر سکتے ہیں جب کہ اس کنوئیں میں حیض کے خون سے آلود کپڑے' کتوں کے گوشت اور اس کے علاوہ نجاست ڈالی جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس کنوئیں کا پانی پاک ہے۔ اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کر سکتی۔ اس حدیث کو امام احمدؒ، امام ترمذی، امام ابوداؤدؒ اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: بضاعہ ''باء'' کے ضمہ کے ساتھ مروی ہے اور کسرہ بھی اس میں جائز قرار دیا گیا ہے اور ''صاد'' کے ساتھ بصاعۃ بھی منقول ہے اور یہ ایک مشہور کنواں ہے مدینہ کے اندر۔ ابن الملکؒ نے اسی طرح کہا ہے۔

اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا علامہ تورپشتیؒ سے نقل کرتے ہوئے کہ ''بضاعہ'' یہ مدینہ منورہ میں بنی ساعدہ کے محلّہ کا نام ہے اور بنو ساعدہ یہ خزرج کی ایک شاخ ہے اور اہل لغت اس کو مضموم اور مکسور دونوں طرح پڑھتے ہیں اور حدیث میں جو محفوظ کیا گیا ہے وہ ضمہ کے ساتھ ہے۔

وھی بئر: ہمزہ کے ساتھ ''بئرٌ'' پڑھتے ہیں اور ہمزہ کو بدلا بھی جاتا ہے (پھر بیرٌ پڑھیں گے)۔

یلقی: اس صیغہ کے اندر تانیث اور تذکیر دونوں جائز ہیں۔

الحیض: ''حاء'' کے کسرہ اور ''یاء'' کے فتحہ کے ساتھ ''حیضۃ'' کی جمع ہے۔ اور حیضہ ''حاء'' کے کسرہ اور ''یاء'' کے سکون کے ساتھ ہے اور مراد اس سے وہ کپڑے کا ٹکڑا ہے جس کو عورت حیض کے خون میں استعمال کرتی ہے، یا جس کو لنگوٹ بنا کر باندھتی ہے۔

ولحوم الکلاب: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یلقی فیھا ...... کے معنی کی وجہ یہ ہے کہ یہ کنواں اس زمین کی ڈھلوان جگہ پر واقع تھا اور وہاں قافلوں کا پڑاؤ ہوتا رہتا تھا پس وہاں گندگیاں گھروں سے نکال کر ڈالی جاتی تو بارش ہونے کے بعد سیلاب ان کو بہا کر کنوئیں میں ڈال دیتا۔ پس کہنے والے نے اس کو اس طریقے سے کہا ہے کہ جس میں یہ ابہام ہوتا ہے کہ نجاسات وغیرہ کا ڈالنا لوگوں کی طرف سے ہوتا تھا دین کو اختیار کرنے میں کمی کی وجہ سے اور حالانکہ یہ ایسی بات ہے کہ جس کو کوئی مسلمان جائز قرار

نہیں دے سکتا، پس ان لوگوں کے بارے میں کیسے گمان کیا جائے گا جو تمام زمانوں میں افضل اور سب سے پاکیزہ تھے۔

والنتن: ''نون'' کے فتحہ اور ''تاء'' کے سکون کے ساتھ منقول ہے اور ''تاء'' کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے اور ''نتن'' بدبو کو کہتے ہیں اور مراد یہاں پر بدبودار چیز ہے جیسا کہ گندگی اور مردار وغیرہ۔

بعض نے کہا ہے کہ بارش وغیرہ کا پانی وہ راستوں اور گھروں سے گندگیاں بہا کر اس کنویں میں ڈال دیتا تھا اور اس کنویں کا پانی وہ بہت زیادہ تھا اور بہت زیادہ بہنے والا تھا وہ ان کو بہا لے جاتا (اور نجاسات اس پانی میں مؤثر نہ ہوتی تھیں)۔ پس صحابہؓ نے اس کنویں کی طہارت اور نجاست کے متعلق سوال کیا۔

فقال رسول اللہ ﷺ ان الماء: بعض نے کہا ہے کہ ''الف لام'' عہد خارجی کے لئے ہے۔ پس اس کی تاویل یہ ہو گی کہ بے شک وہ پانی کہ جس کے بارے میں تم سوال کرتے ہو اور وہ بئر یضاعه کا پانی ہے؟ پس اس صورت میں جواب مطابقی ہے نہ کہ عموم کلی جیسا کہ امام مالکؒ نے کہا ہے (یعنی وہ ان الماء...... میں ''الف لام'' کو عموم کا ہی قرار دیتے ہیں)۔

طھور: یعنی طاہر مطہر جیسا کہ مبالغے کا صیغہ اس کا فائدہ دیتا ہے کیونکہ وہ پانی باغات میں جاری تھا۔

لا ینجسه شئی: یعنی جب تک وہ متغیر نہ ہو کیونکہ ماء متغیر کے نجس ہونے پر اجماع واقع ہے۔ پس جو بعض روایات میں آیا ہے کہ بئر بضاعة کا پانی ایسا تھا جیسا کہ پانی میں مہندی ملائی گئی ہو تو یہ روایت محمول ہے اس پانی کے اصلی رنگ پر۔

اور شوافع حضرات بئر بضاعة کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کا پانی قلتین سے کئی گنا زیادہ تھا اس لئے یہ ابن عمرؓ کی حدیث کے خلاف نہیں ہوگا۔ امام ابوداوٗدؒ فرماتے ہیں میں نے اس میں اپنی چادر پھیلائی (ناپنے کے لئے) پس اس کی چوڑائی ۶ ذراع تھی۔

سیدؒ فرماتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے اور مصابیح میں مذکور ہے کہ حضور ﷺ سے اس مذکورہ سوال کے جواب میں یہ بھی مروی ہے۔ خلق الماء طھورا لا ینجسه شئی الاما غیر طعمه او ریحه: کہ پانی خلقۃً پاک کرنے کے لئے ہے اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی مگر جب اس کا ذائقہ اور بو کوئی چیز بدل ڈالے۔ مصابیح کے شارح ابن الملکؒ فرماتے ہیں۔ امام شافعیؒ نے رنگ کے تغیر کو ذائقے اور بو پر قیاس کیا ہے کہ جن کے بارے میں نص وارد ہے۔

ابن حجرؒ نے یہاں عجیب بات کہی ہے کہ۔ امام مالکؒ نے اس حدیث کو عموم کے ساتھ لیا ہے اور امام مالکؒ پر اس صورت میں قلتین والی حدیث کے مفہوم پر عمل کرنے کو لغو قرار دینا لازم آتا ہے حالانکہ اس بات کو جائز قرار دینے میں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

ملا علی قاری علیہ رحمۃ الباری فرماتے ہیں کہ ان کے لئے اس بارے میں دلیل ہے وہ یہ کہ وہ مفہوم مخالف کے ساتھ قائل نہیں ہیں جیسا کہ ہمارے ائمہ کا قول ہے۔ پھر امام مالکؒ کا قول اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول کہ پانی (وقوع نجاست سے) مطلقاً ناپاک ہو جاتا ہے ہاں اگر اتنا بڑا حوض ہے کہ جس کا ایک کنارہ دوسرے کنارے کے حرکت کرنے سے حرکت نہ کرے (تو پھر ناپاک نہیں ہوتا) یہ قول اس مذکورہ حدیث کے خلاف ہے اور حدیث قلتین کے منطوق کے بھی خلاف ہے لیکن یہ مخالفت قابلِ

ضرر نہیں ہے اس لئے کہ امام صاحب نے ان دونوں حدیثوں کی مخالفت نہیں کی ہے مگر اس حال میں کہ ان کے پاس کوئی ایسی دلیل ضرور ہوگی جو مخالفت کا مؤجب ہوگی اور تحقیق ''قلۃ'' کی علت پہلے گزر چکی ہے۔ اور اس حدیث کے عموم پر عمل کرنے سے رُکنے کی علت وہ امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان مشترک ہے۔

سمندر کے پانی اور میتۃ کا حکم

۴۷۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَأَلَ رَجُلٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نَرْكَبُ الْبُحْرَ وَنَحْمِلُ مَعَنَا الْقَلِیْلَ مِنَ الْمَآءِ فَاِنْ تَوَضَّأْنَا بِهٖ عَطِشْنَا اَفَنَتَوَضَّأُ بِمَآءِ الْبَحْرِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هُوَ الطَّهُوْرُ مَاؤُهٗ وَالْحِلُّ مَیْتَتُهٗ۔ (رواه مالك والترمذی وابو داود والنسائی وابن ماجة والدارمی)

أخرجه مالك فی الموطا ۱/۲۲ كتاب الطهارة ۱۲۔ والترمذی فی السنن ۱/۱۰۰ حدیث ۶۹ وقال حسن صحیح وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۵۰ حدیث رقم ۵۹ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۱۳۶ حدیث رقم ۳۸۶۔ وأخرجه الدارمی فی السنن ۱/۲۰۱ حدیث رقم ۷۲۹۔ وأخرجه أيضاً أبو داوٗد فی السنن ۱/۶۴ حدیث رقم ۸۳۔ وأحمد فی مسنده ۲/۳۶۱۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ ہم لوگ سمندر میں سفر کرتے ہیں اور میٹھا پانی ہمارے پاس تھوڑا ہوتا ہے۔ اگر ہم اس پانی کے ساتھ وضو کریں تو پھر ہم پیاسے رہ جائیں گے۔ تو کیا سمندر کے پانی کے ساتھ وضو کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا سمندر کا پانی پاک ہے اور اس کا میتۃ حلال ہے۔ اس حدیث کو امام مالک' امام ترمذی' امام ابوداؤد' امام نسائی' امام ابن ماجہ اور امام دارمی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **انا نرکب البحر**: یعنی کشتیوں پر سوار ہوتے ہیں۔

من الماء: یعنی میٹھا پانی۔

عطشنا: ''طاء'' کے کسرہ کے ساتھ۔

افنتوضا بماء البحر: ''بحر'' یہ ''بر'' خشکی کی ضد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یا ہم تیمّم کریں۔

الطهور ماءه: طہور سے مراد مطہر ہے اس لئے کہ انہوں نے پانی کے پاک کرنے (تطہیر) کے بارے میں سوال کیا تھا نہ کہ اس کی طہارت کے بارے میں اور میں کہتا ہوں کہ ''حصر'' یہاں مبالغے کیلئے ہے اور یہ حدیث دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ سمندر کے پانی سے وضوء کرنا جائز ہے اگرچہ اس کا ذائقہ اور رنگ بدل جائے۔ اسی طرح ابن الملکؒ نے فرمایا ہے اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سمندر کے پانی کا ذائقہ اور رنگ وہ فطرتی اور طبعی ہے نہ کہ اس وجہ سے کہ یہ کسی چیز کے گرنے سے بدل گئے ہوں جیسا کہ یہ ظاہر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ پانی کا دیر تک کھڑے رہنے سے جو تغیر آتا ہے وہ مضر نہیں ہے۔ علامہ طیبیؒ نے زجاجؒ سے نقل کر کے فرمایا ہے کہ بے شک طہور وہ پانی ہے کہ جس سے پاکی حاصل کی جائے اور یہ

بات اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ فی نفسہٖ طاہر نہ ہو اور غیر کو پاک کرنے والا نہ ہو (تو طہور وہ طاہر ہوگا اور مطہر ہوگا) اس لئے کہ ان حضرات کا فاعل کے صیغہ سے فعول یا فعیل (مبالغے کے صیغے) کی طرف عدول کرنا یہ معنی کی زیادتی کی وجہ سے ہوتا ہے اس لئے کہ مبانی (حروف) کا اختلاف معانی کے اختلاف کیلئے ہے جیسا کہ شَاکِر اور شَکُوْر کے اندر لیکن طہارت کی زیادتی کسی دوسرے طاہر کی بنسبت نہیں ہے جو اس سے زیادہ طاہر ہو بلکہ **ما يتطهر به** (یعنی جس سے پاکی حاصل کی جاتی ہے) اس کے اعتبار کرنے کے ساتھ ہے پس اسی میں طہارت اور تطہیر کا معنی ہے، بخلاف طاہر کے اگر چہ قیاس وہ طہارت کی زیادتی کا اعتبار کرتا ہے اس لئے کہ وہ فعل لازم ہے۔

اور شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ طہور سے مراد **مطهر** ہے اس لئے کہ صحابہؓ نے **تطهير** (پاک کرنے) کے بارے میں سوال کیا ہے۔

اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ طہور سے مراد وہ ہے کہ جس میں تطہیر بار بار ہو جیسا کہ **صبور**۔ پس ماء مستعمل سے وضوء جائز قرار دیا گیا ہے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) اور یہ احتمال ضعیف ہے مدِ مقابل کے خلاف دلیل نہیں بن سکتا۔

اور جب حضور ﷺ سے سمندر کے پانی کے بارے میں سوال کیا گیا اور حضور ﷺ نے ان کی پانی کے حکم کے بارے میں جہالت کو جانا تو سمندر کے شکار کے حکم نہ جاننے کو اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا (**والحل ميتته**) اور اس کے ساتھ چونکہ: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ [المائدہ:۳] "تم پر مرا ہوا جانور حرام ہے" کے اندر بھی عمومیت نظر آتی ہے اس لئے بطور رہنمائی و ہدایت کے جواب میں زیادتی فرمائی جیسا کہ اس حکیم کا حال ہوتا ہے جو بیماری اور دواء دونوں کو پہچانتا ہے۔

پس فرمایا (**والحل ميتته**) پس وہ میتہ جو مچھلی میں سے ہو وہ بالاتفاق حلال ہے اور اس کے علاوہ میں اختلاف ہے جو کتب فقہ میں مذکور ہے۔

سیدؒ نے فرمایا ہے یہ حدیث صحیح ہے اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی سند حسن ہے اور اسی سے ماخوذ ہے خبر صحیح کے ساتھ (خبر صحیح یہ ہے **من لم يطهره ماء البحر فلا طهره الله** کہ جس کو سمندر کے پانی نے پاک نہ کیا اُس کو اللہ پاک نہ کرے) کہ سمندر کے پانی سے پاکی حاصل کرنے میں کوئی کراہت نہیں ہے اگر چہ صحابہ کی ایک جماعت نے اس کو مکروہ جانا تھا اور **تحت البحر نار وتحت النار بحر حتى عد سبعة** والی روایت بالاتفاق ضعیف ہے دوسرا یہ کہ اگر صحیح بھی ہو تو پھر بھی وہ کراہت کی دلیل نہیں بن سکتی۔

"سمندر کے نیچے آگ ہے اور آگ کے نیچے سمندر اسی طرح سات درجے شمار کئے۔"

نبیذ تمر سے وضو کا حکم

۴۸۰: وَعَنْ اَبِیْ زَیْدٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ لَيْلَةَ الْجِنِّ مَافِیْ اِدَاوَتِكَ قَالَ قُلْتُ نَبِيْذٌ قَالَ تَمْرَةٌ طَيِّبَةٌ وَّمَآءٌ طَهُوْرٌ رَوَاهُ اَبُوْ دَاوٗدَ وَزَادَ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ فَتَوَضَّأَ

مِنْهُ وَقَالَ التِّرْمَذِيُّ وَ اَبُو زَيْدٍ مَجْهُولٌ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه أبوداؤد في السنن ١/٦٦حديث ٨٤۔وأحمد في مسنده ١/٤٥٠وأخرجه الترمذي في السنن ١/١٤٧حديث رقم ٨٨واللفظ له۔ وأخرجه ابن ماجة في السنن بالفاظ متقاربة ١/١٣٥حديث رقم ٣٨٤۔

ترجمه : ''حضرت ابو زید حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے لیلۃ الجن کے واقعہ میں پوچھا تھا تمہاری چھاگل میں کیا ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں میں نے کہا کہ نبیذ تمر ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کھجوریں پاک ہیں اور پانی پاک کرنے والا ہے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔ اور امام احمدؒ اور امام ترمذیؒ نے یہ الفاظ زیادہ نقل کئے ہیں: فَتَوَضَّأَ مِنْهُ کہ آپ نے اس سے وضو کیا اور امام ترمذی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ابوزید راوی مجہول ہے ہاں البتہ حضرت علقمہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ روایت صحیح طور پر نقل کرتے ہیں۔''

راویٔ حدیث:

ابو زید: کے حالات ذکر نہیں کئے۔ ابن امام لکھتے ہیں کہ قاضی ابوبکر بن عربی رضی اللہ عنہ نے شرح ترمذی میں ذکر کیا ہے کہ ابو زید حضرت عمر بن حریث رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ ان سے روایت کرنے والوں میں راشد بن کیسان عبسی کوفی اور ابو ورقا شامل ہیں۔ لہٰذا ابوزید رضی اللہ عنہ مجہول نہیں ہیں۔

تشریح: **وعن ابی زید** :صاحب مشکوٰۃؒ نے ان کا ذکر اسماء الرجال میں نہیں کیا ہے۔

لیلة الجن :یعنی اس رات میں کہ جس میں جن حضور ﷺ کو اپنی قوم کے پاس لے گئے تھے تا کہ ان سے دین سیکھیں اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے ساتھ تھے اور ایک روایت میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہونے کا ذکر ہے۔

مافی اداواتك :یعنی تیری چھاگل میں کیا چیز ہے۔ نہایہ میں لکھا ہے کہ ''اداوۃ'' کسرہ کے ساتھ ہے اور یہ چمڑے کے چھوٹے برتن کو کہتے ہیں۔

قلت نبیذ :اور مصابیح میں **نبیذ تمر** ہے۔ اور نبیذ وہ پانی ہے کہ جس میں پانی کو میٹھا کرنے کیلئے کھجوریں ڈالی جاتی ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ نبیذ سے مراد وہ کھجوریں یا کشمش ہیں جو پانی میں ڈالی جائیں تا کہ اس کی نمکینیت اور کڑواہٹ کو مٹھاس کی طرف بدل دے۔

قال تمرة طیبة وماء طهور :اور مصابیح میں یہ زیادتی آئی ہے **وتوضا منه** کہ آپ ﷺ نے اس پانی سے وضوء کیا اور اس حدیث میں دلیل ہے اس مسئلہ کی کہ نبیذ تمر سے وضوء کرنا جائز ہے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ امام شافعیؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں جب کہ وہ بدل جائے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ ابن ماجہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں ابن ابی شیبہؒ نے اس کو تفصیلاً روایت کیا ہے جس میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے پوچھا : **هل معك من وضوء قلت لا قال فما فی اداوتك قلت نبیذ تمر قال تمرة حلوة وماء طیب ثم توضا واقام الصلوٰة۔**

''پوچھا کیا تیرے پاس پانی ہے وضوء کیلئے؟ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا: تیری اس چھاگل میں کیا ہے؟ میں نے کہا: نبیذ تمر۔ فرمایا:

میٹھی کھجور اور پاکیزہ پانی ہے پھر آپ ﷺ نے وضوء فرمایا اور نماز پڑھائی''۔

پس صاحب مشکوٰۃ کیلئے ضروری تھا کہ فتوضا منه والی عبارت کو پہلے لاتے جیسا کہ مصابیح میں ہے پھر کہتے رواہ احمد والترمذی وروا ہ ابوداؤد انی طهورٍ تاکہ یہ وہم نہ ہوتا کہ یہ عبارت مصابیح میں نہیں ہے۔

وقال الترمذی ابوزید :یعنی وہ راوی کہ جو عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کررہا ہے۔

مجهول :ابن ہمامؒ نے فرمایا ہے یہ بات محل تامل ہے اس لئے کہ قاضی ابوبکر بن العربی نے شرح ترمذی میں ذکر کیا ہے کہ ابوزید وہ عمرو بن حریث کے آزاد کردہ غلام ہیں ان سے راشد بن کیسان عبسی کوفی نے روایت کی ہے اور ابوروق نے اور یہ بات راوی کو جہالت سے نکال دیتی ہے۔

سید جمال الدینؒ فرماتے ہیں سارے محدثین اس پر متفق ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں نبیذ تمر والی حدیث جو ابن مسعودؓ سے منقولی ہے اس کی ساری اسانید اہل نقل (علماء) کے ہاں کلام سے خالی نہیں۔سوائے اس کے (کہ یہ کہا جائے) کہ جب روایت مختلف طریقوں سے نقل کی جائے تو مجتہد کے گمان میں اس کا حق ہونا غالب ہوجاتا ہے خصوصاً ان حضرات کے نزدیک جو تمام مسلمانوں کو امورِ دینیہ کے بارے میں عادل سمجھتے ہیں۔

۴۸۱ :وصح عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَمْ اَكُنْ لَيْلَةَ الْجِنِّ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۔ (رواه مسلم)

ترجمه : ''ہاں البتہ حضرت علقمہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ میں لیلۃ الجن میں رسول اللہؐ کے ساتھ نہ تھا۔''
(رواہ مسلم)

راوئ حدیث:

علقمہ بن ابی علقمہ۔ یہ علقمہ مشہور تابعی ہیں۔ابوعلقمہ کے بیٹے ہیں۔ابوعلقمہ کا نام ''بلال'' ہے۔امّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ ہیں۔انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور اپنی والدہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں اور ان سے مالک بن انس اور سلیمان بن بلال رضی اللہ عنہم نے روایت کی ہے۔

تشریح:قال لم اكن ليلة الجن مع رسول الله ﷺ :

مطلب یہ ہے کہ جو اِن سے روایت کی گئی ہے وہ ثابت نہیں ہے اور اگر حدیث صحیح وثابت بھی ہو تو پس وہ پانی کھجوروں سے بدلا ہوا نہ تھا بلکہ وہ پینے کیلئے تیار کیا ہوا تھا کیونکہ عرب والے ایسے اس لئے کرتے تھے تاکہ پانی کی نمکینیت کھجوروں کے ڈالنے سے ختم ہوجائے۔پس وہ پانی ان کے مزاج کے زیادہ موافق اور زیادہ نافع ہوتا تھا۔ابن الملکؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ مؤلفؒ نے جو ذکر کیا ہے کہ علقمہ کی حدیث حضرت ابن مسعودؓ سے صحیح ہے پس یہ مؤلفؒ کی تحقیق پر محمول ہے۔لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ ان دونوں احادیث میں تطبیق ممکن ہے وہ اس طرح کہ حضرت ابن مسعود

"جنوں" سے ملنے اور ان کو اسلام کی طرف بلانے کے وقت ساتھ نہ تھے اور ابن مسعودؓ ساتھ گئے تھے لیکن آپ ﷺ نے ان کو ایک دائرے میں خط کھینچ کر بٹھا دیا تھا جیسا کہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ میں حضور ﷺ کے ساتھ وہاں تک گیا جہاں تک آپ ﷺ کا ارادہ تھا پھر آپ ﷺ نے ایک خط کھینچا اور اس میں مجھے بٹھا دیا اور فرمایا کہ اس سے نہ نکلنا پس میں نے رات گزاری یہاں تک کہ آپ ﷺ صبح کے قریب میرے پاس آئے۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ اس وقت ساتھ نہ تھے بعد میں آپ ﷺ کے ساتھ جا کر ملے اور یہ توجیہ زیادہ موافق ہے علقمہ عن ابن مسعود والی روایت کے بعض طرق کے کہ جس سے مصنفؒ نے استدلال کیا ہے۔ حضرت علقمہ فرماتے ہیں میں نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو کہا کہ آپ میں سے کوئی حضور ﷺ کے ساتھ لیلۃ الجن میں تھا فرمایا کہ نہیں، ساتھ تو کوئی نہیں تھا لیکن ہوا یوں کہ مکہ میں ہم نے ایک رات آپ ﷺ کو گم پایا پس ہم نے کہا کہ حضور ﷺ کے ساتھ کیا امر پیش آ گیا، کہیں آپ ﷺ کو بے خبری میں نقصان تو نہیں پہنچ گیا یا آپ ﷺ کو کوئی لے تو نہیں گیا ہے؟ پس اسی خیالات میں ہم نے برے حال میں رات گزاری، پس صبح کے قریب اچانک ہم نے دیکھا کہ آپ ﷺ حراء کی جانب سے آ رہے تھے۔ پھر آگے حدیث بیان کی۔

پس یہ حدیث مسلم کی روایت کہ جس میں لیلۃ الجن کے الفاظ ہیں اس کے منافی نہیں ہے اس لئے کہ "سحر" یعنی صبح کے قریب کا جو ذکر ہے وہ اسی رات کی صبح مراد ہے اور ابوزید وغیرہ کی ابن مسعودؓ سے روایت پر ترک عمل کی علت یہ قرار دینا کہ یہ حکم مکہ میں احکام کے مستحکم ہونے اور سورہ مائدہ کے نازل ہونے سے پہلے کئی سالوں کا واقعہ ہے (لہٰذا یہ بجا نہیں) یہ زیادہ بہتر ہے اس سے کہ ان احادیث کو رد کرنے میں اقدام کیا جائے۔

ابن ہمامؒ نے فرمایا باقی وہ روایت جو ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آپؓ سے لیلۃ الجن کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ ہم میں سے کوئی وہاں حاضر نہ تھا یہ روایت ابن ابی شیبہ کی روایت کے معارض ہے کہ جس میں یہ ہے کہ ابن مسعودؓ ساتھ تھے اور ابو حفص بن شاہین نے بھی ان سے روایت کی ہے کہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں لیلۃ الجن میں حضور ﷺ کے ساتھ تھا اور انہی سے روایت ہے کہ ابن مسعودؓ نے قبیلہ زط میں سے ایک جماعت کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ لوگ ان جنات کے زیادہ مشابہ ہیں کہ جن کو میں نے لیلۃ الجن میں دیکھا تھا۔ اور اثبات نفی پر مقدم ہوتا ہے۔

اور اگر ہم دونوں حدیثوں میں تطبیق دیں تو ہم کہتے ہیں کہ **ما شھد منا احد** سے مراد ہے **ما شھد منا احد غیری** کہ میرے علاوہ کوئی دوسرا حاضر نہ تھا اس میں کسی کی مشارکت کی نفی ہے اور اپنی خصوصیت کا اظہار ہے اور تحقیق صاحب احکام المرجان فی احکام الجان نے ذکر کیا ہے، کہ وہ احادیث جو جنات کے وفود کے بارے میں وارد ہیں ان سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ٦ مرتبہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ بقیع الغرقد میں کہ جہاں حضور ﷺ کے ساتھ ابن مسعودؓ حاضر تھے۔ دو مرتبہ مکہ میں اور چوتھی مرتبہ زبیر بن العوامؓ ساتھ تھے۔ پس اس تحقیق کی بنیاد پر نسخ کے بارے میں دعویٰ قطعی نہ ہوگا۔

خزانۃ الاکمل میں لکھا ہے کہ تمام مشروبات میں سے نبیذ تمر سے وضوء کرنا جائز ہے پانی کے نہ پائے جانے کی صورت میں اور تیمم بھی کرے گا اس کے ساتھ وضوء کر کے امام صاحبؒ کے نزدیک اور یہ امام محمدؒ کا مذہب ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ ہے کہ وضوء کرے گا تیمم نہ کرے گا اور ایک روایت یہ ہے کہ تیمم کرے گا وضوء نہ کرے گا اور اس کو امام ابو یوسفؒ

نے لیا ہے۔

اور نوح جو فقہ حنفی کے جامع ہیں۔فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قول سے رجوع کر لیا ہے۔

پھر خزانۃ الاکمل میں مصنفؒ نے کہا ہے کہ ہمارے مشائخ فرماتے ہیں کہ امام صاحبؒ سے جو مختلف جواب منقول ہیں نبیذ تمر سے وضوء کے بارے میں تو یہ سائل کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہے۔ایک بار آپؒ سے پوچھا گیا کہ اگر نبیذ میں پانی غالب ہو تو کیا حکم ہے تو فرمایا وضوء کرے گا۔اور ایک بار یوں پوچھا گیا کہ اگر مٹھاس غالب ہو تو پھر کیا حکم ہے؟ فرمایا تیمّم کرے گا وضوء نہ کرے گا اور ایک مرتبہ سائل نے یوں سوال کیا کہ جب آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ کونسی غالب ہے؟ تو پھر کیا کرے گا تو پھر فرمایا وضوء تیمّم دونوں کرے گا۔

پس ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ اس روایت سے نبیذ تمر سے وضوء کے جائز ہونے سے استدلال نہیں کیا جا سکتا اگرچہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سفیان ثوریؒ سفر میں پانی کے نہ ہونے کی صورت میں جواز کے قائل ہیں حالانکہ ان دونوں حضرات کو یہ خیال نہیں ہوا کہ یہ بات قرآنِ پاک کی آیت ﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا﴾ [المائدہ:٦] کی صراحت کے خلاف ہے۔آیت میں تو صرف یہ ہے کہ "پانی نہ ہو تو پھر تیمّم کرو"۔پس نبیذ سے وضوء کو جائز قرار دینا آیت کی مخالفت ہے۔حالانکہ ان حضرات کو چاہیے تھا کہ حدیث کے صحیح ہونے کی تقدیر پر حدیث میں ایسی تاویل کرتے کہ ہر آیت کے موافق ہو جاتی وہ تاویل یہ بھی ہو سکتی تھی کہ ان ڈالی ہوئی کھجوروں سے پانی میں ایسا تغیر رونما نہیں ہوتا تھا جو قابل ضرر ہو اور ابن مسعودؓ کا اس کو نبیذ سے موسوم کرنا وہ مجاز کے قبیل سے ہے یا اس سے مراد معنی لغوی ہے اور وہ یہ ہے کہ پانی میں کوئی چیز ڈالی جائے اگرچہ وہ اس میں تغیر نہ کرے۔

ابن حجرؒ کا یہ قول ان حضرات کے کلام پر قلت اطلاع کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اصل اور فصل کے اعتبار سے اور گویا کہ ابن ظفر نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ انہیں معلوم ہوا آیت کا معنی مگر انہی کو اپنی سست فہم اور قاصر عقل کے ساتھ۔پھر ابن حجرؒ کا ان دونوں بڑے اماموں کی طرف آیت کے صریح مضمون کی پرواہ نہ کرنے کی نسبت کرنا یہ ابن حجرؒ کی دین میں بے پروائی ہے اور اربابِ یقین پر جراءت کی کثرت ہے۔اللہ تعالیٰ ان کی سبقت قلم اور قدم کے پھسلنے سے درگذر کرے۔

پھر یہ جو بات کہی جاتی ہے کہ اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ حدث کو سوائے پانی کے اور کوئی چیز نہیں اٹھاتی یہ صحیح نہیں ہے بلکہ واضح طور پر غلط ہے اس لئے کہ ہمارا مذہب یہ ہے کہ اس کو اُٹھا دیتا ہے بلکہ ابو یعلی فرماتے ہیں کہ حدیث کا اٹھانا اور نجس و ناپاک کا زائل کرنا ہر مائع طاہر چیز کے ساتھ جائز ہے۔

بلی کے جوٹھے کا حکم

۴۸۲: وَعَنْ كَبْشَةَ بِنْتِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ وَكَانَتْ تَحْتَ ابْنِ اَبِیْ قَتَادَةَ اَنَّ اَبَا قَتَادَةَ دَخَلَ عَلَيْهَا فَسَكَبَتْ لَهٗ وَضُوْءً ا فَجَاءَ تْ هِرَّةٌ تَشْرَبُ مِنْهُ فَاَصْغٰى لَهَا الْاِنَاءَ حَتّٰى شَرِبَتْ قَالَتْ كَبْشَةُ فَرَاٰنِیْ اَنْظُرُ اِلَيْهِ فَقَالَ اَتَعْجَبِيْنَ يَا ابْنَةَ اَخِیْ قَالَتْ فَقُلْتُ نَعَمْ فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنَّهَا لَيْسَتْ بِنَجَسٍ اِنَّهَا مِنَ الطَّوَّافِيْنَ عَلَيْكُمْ اَوِ الطَّوَّافَاتِ۔

(رواہ مالک واحمد والترمذی وابوداود والنسائی وابن ماجۃ والدارمی)

أخرجه مالك في الموطأ ١/٢٢ حديث رقم ١٣ من كتاب الطهارة۔وأخرجه أحمد في مسنده ٥/٣٠٣۔وأخرجه الترمذي في السنن ١/١٥٣ حديث رقم ٩٢ وقال حسن صحيح وأخرجه أبوداؤد في السنن ١/٦٠ حديث رقم ٧٥۔ وأخرجه النسائي ١/٥٥ حديث رقم ٦٨۔وأخرجه ابن ماجة في السنن ١/١٣١ حديث رقم ٣٦٧۔ وأخرجه الدارمي في السنن ١/٢٠٣ حديث رقم ٧٣٦۔وأخرجه الشافعي في مسنده ص ٩۔

ترجمہ : حضرت کبشہ بنت کعب بن مالک جو کہ حضرت ابوقتادہ کے بیٹے کی بیوی تھیں ان سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت ابوقتادہؓ ان کے ہاں تشریف لائے اور میں نے ان کے وضو کے لئے ایک برتن میں پانی ڈالا اور رکھ دیا۔ایک بلی آ کر اس میں سے پانی پینے لگی۔حضرت ابوقتادہ نے برتن کو اس کی طرف جھکا دیا۔چنانچہ بلی نے پانی پی لیا۔کبشہ فرماتی ہیں کہ جب حضرت ابوقتادہ نے مجھے دیکھا کہ میں تعجب سے ان کی طرف دیکھ رہی ہوں۔تو انہوں نے کہا اے میری بھتیجی! کیا تمہیں اس پر تعجب ہو رہا ہے میں نے کہا جی ہاں۔حضرت ابوقتادہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ بلیاں نجس نہیں ہیں کیونکہ یہ بار بار تمہارے پاس آتی جاتی ہیں۔یا یہ فرمایا کہ آنے جانے والیوں میں سے ہیں۔اس حدیث کو امام مالکؒ 'امام احمد' امام ترمذی' امام ابوداؤد' امام نسائی' امام ابن ماجہ اور امام دارمی نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

کبشۃ بنت کعب۔یہ کبشہ ہیں۔کعب بن مالک کی بیٹی ہیں۔عبداللہ بن ابی قتادہ رضی اللہ عنہ کی بیوی ہیں'انصاریہ ہیں قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتی ہیں۔ان کی حدیث ''سور ہرہ'' کے بیان میں ہے۔انہوں نے ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے حدیث کا سماع کیا۔ان سے حمیدہ بنت عبید بن رفاعہ نے روایت حدیث کی ہے۔

تشریح:**وكانت تحت ابن ابی قتادہ** :ابوقتادہ یہ حارث بن ربعی انصاری ہیں حضور ﷺ کے شہسواروں میں سے ہیں اور ان کے بیٹے کا نام عبداللہ ہے۔مطلب یہ ہے کہ یہ ان کے بیٹے کی بیوی تھیں۔

فسکبت :یعنی حضرت کبشہؓ نے پانی بہایا۔ابہریؒ نے فرمایا ''تاء'' کے ضمہ کے ساتھ متکلم کا صیغہ ہے اور ''تاء'' کے سکون کے ساتھ مؤنث کا صیغہ پڑھنا بھی جائز ہے۔لیکن اکثر موجودہ صحیح نسخوں میں مؤنث کے صیغے کے ساتھ ہے اور مصابیح کی روایت متکلم کے صیغے کی تائید کرتی ہے۔

فقال اتعجبین :یعنی تو بلّی کے میرے وضوء کے پانی پینے سے تعجب کرتی ہے۔

یا ابنة اخی :یہ جملہ عرب والوں کی عادت کے مطابق ہے کہ ان میں سے بعض کو کہتے ہیں: **یا ابن اخی** اگرچہ وہ دونوں چچازاد ہوں،اور **یا اخان فلان** کہتے ہیں اگرچہ حقیقت میں اس کا بھائی نہ ہو (یعنی یہ محاورہ ہے) اور شریعت کے عرف میں یہ جائز ہے اس لئے کہ تمام مؤمن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ اس سے اسلام کی اخوت مراد ہے جیسا کہ گزر چکا ہے کہ یہ ان کی بہو تھیں۔یہ تعلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں منافات معدوم ہے بلکہ علت یہ ہے کہ وہ کبشہ کعب بن مالک کی بیٹی ہیں (اس لئے کہا **یا ابنة اخی**) اور ابوقتادہ بن

ربعی میں رِبْعِی ''راء'' کے کسرہ ''باء'' کے سکون اور ''عین'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

انها :یعنی بلی یا اس کا جوٹھا۔

لیست بنجس :نجس مصدر ہے۔جس میں مذکر اور مؤنث دونوں برابر ہیں۔اور اگر یہ ''جیم'' کے کسرہ کے ساتھ ہوتا تو **بنجسة** کہا جاتا اس لئے کہ یہ ہرۃ کی صفت ہے بعض شراح نے اسی طرح فرمایا ہے۔

اور کازرونی نے فرمایا ہے کہ بعض ائمہ نے کہا ہے کہ ''نجس'' جیم کے فتحہ کے ساتھ ہے اور نجس سے مراد ''نجاست'' ہے۔ پس تقدیر عبارت یہ ہوگی: **انها لیست بذات نجس** اور وہ جو ہم نے سنا اور مشائخ کے سامنے پڑھا وہ ''جیم'' کے کسرہ کے ساتھ ہے اور قیاس بھی اسی کا مقتضی ہے **ای لیست بنجسة** اور یہاں ''تاء'' اس لئے نہیں ملائی گئی کیونکہ یہ سور کے معنی میں ہے۔لیکن اکثر صحیح نسخوں میں پہلا معنی ہی راجح ہے (یعنی یہ مصدر ہے) پس یہی قابلِ اعتماد ہوگا اس لئے کہ ''نجس'' فتحہ کے ساتھ ،فقہاء کی اصطلاح میں عین نجاست کو کہتے ہیں اور کسرہ کے ساتھ ناپاک شدہ شئی مراد ہوتی ہے۔

انها :یہ جملہ مستانفہ ہے جس میں تعلیل کا معنی ہے **ای لانها**۔

من الطوافين :طائف خادم وہ جو تیری خدمت کرے نرمی کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلیوں کو گھر کے خدام اور مملوکین سے تشبیہ دی ہے جو گھر میں خدمت کیلئے آتے جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ [النور:۵۸] :''تم سب ایک دوسرے کے پاس بکثرت آنے جانے والے ہو''۔

بلی کو ان خدام کے ساتھ اس لئے ملایا کیونکہ یہ بھی تکلیف دینے والے جانوروں کو قتل کرتی ہے یا اس لئے کہ بلی کے ساتھ اچھا سلوک وہمدردی کرنے کا اجر وہ غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک وہمدردی کرنے کی طرح ہے اور یہ حدیث دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ بلی کا جوٹھا پاک ہے اور یہی امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ یہ مکروہ ہے۔ابن الملکؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔اور طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: **انها من الطوافين** حکم کو اس مناسب وصف پر مرتب کرتا ہے جو علیت کو بتلانے والا ہے۔پس اس بناء پر مناسب یہ ہے کہ بلی کا جوٹھا اس کے منہ کی نجاست کی تقدیر پر ضرورت کی وجہ سے معاف ہوگا جیسا کہ راستوں کا کیچڑ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول جو فصل ثالث میں ہے اس کی تائید کرتا ہے جیسا کہ ہم اس کو بیان کریں گے۔یہی مذہب امام ابوحامد الغزالی کے ہاں مختار ہے۔امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ احسن بات یہ ہے کہ معافی کو عام قرار دیا جائے۔

اور روضہ میں امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ بلی کا جوٹھا اس کی ذات کی طہارت کی وجہ سے پاک ہے اور مکروہ نہیں ہے اور اگر اس کا منہ ناپاک ہو پھر وہ ماء قلیل میں منہ ڈال دے تو اس میں تین وجہ بنیں گی: ❶ تفصیل (یعنی فاصلہ کا ہونا) اور یہی زیادہ صحیح ہے پس اگر بلی اتنا وقت غائب رہی کہ جس میں اس کا کسی ماء مطہر میں منہ ڈال سکنے کا احتمال ہو تو وہ چیز ❷ طاہر ہوگی ،ورنہ ❸ نجس۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے یہ جملہ مغائر (مخالف امور) کے عطف کے قبیل سے ہے صحابی نے بلی کیلئے برتن انڈیلنے کی علت دو مختلف اور متغائر امر قرار دیے ہیں۔

(ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں) یہ بات محل تامل ہے یہ بات لفظاً اور معنیً صحیح نہیں ہے۔ اور ابن حجرؒ کی عجائبات میں سے یہاں عجیب یہ ہے کہ انہوں نے علامہ طیبیؒ کے قول کو اپنے قول کے مقابل بنایا ہے اور علامہ کے قول کو اپنی اس عبارت ویصح...... سے ضعیف قرار دیا ہے۔ پس اے مخاطب تو غور کرلے تیرے لیئے مواضع زلل (پھسلنے کے مقامات) ظاہر ہو جائیں گے۔

ابن ہمامؒ نے فرمایا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ **سؤر الهرہ** یہ مکروہ تنزیہی ہے اور اس بارے میں یہی بات کافی ہے کہ بلی نجاست سے نہیں بچتی پس اس کا سؤر مکروہ ہوگا جیسا کہ اگر چھوٹا بچہ اپنا ہاتھ پانی میں ڈال دے (نجاست میں ڈالنے کے بعد) اور باقی نجاست، تو بالاتفاق اس کا ساقط ہونا علت طواف کے ذریعے ہے کہ جس میں نص **انها من الطوافين** وارد ہے۔ تو **انها من الطوافين** کا مطلب یہ ہے کہ وہ بلی تنگ تنگ جگہوں میں بھی داخل ہو جاتی ہے اور اس کے شدت اختلاط کے لازم ہونے کی وجہ سے برتنوں کا اس سے بچانا مشکل ہوتا ہے بلکہ اس کی ذات سے بچنا بھی مشکل ہوتا ہے اور وہ ضرورت جو اس کو لازم ہے اس نے اس کی نجاست کو گرا دیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اجازت چاہنے کو واجب قرار دیا ہے اور مملوکین یعنی غلاموں سے اس کو ساقط کیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ﴾ [النور:۵۸] یعنی جوان میں سے نابالغ اور غلام ہیں ان کے لئے تین اوقات کے علاوہ میں بغیر اجازت کے داخل ہونے کی اجازت ہے اور یہ اس علت طواف کی وجہ سے ہے جو بعد والے ارشاد **طوافون عليكم بعضكم على بعض** سے مستفاد ہے۔

اور امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے کہ بلی کا جوٹھا مکروہ نہیں ہے۔ اور اگر بلی نے چوہے کو کھایا ہو پھر فوراً پانی کو پیا ہو تو پانی ناپاک ہو جائے گا، اور اگر تھوڑی دیر ٹھہری رہی اور اپنے منہ کو اس نے چاٹ لیا اور پھر منہ ڈالا تو یہ مکروہ ہوگا اور شیخین کے ہاں یہ ناپاک نہیں ہوگا۔ امام محمدؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں اور اختلاف کی بناء وہ یہ ہے کہ آیا تطہیر وہ پانی کے بغیر ہو سکتی ہے یا نہیں۔ منیہ کی شرح میں اسی طرح ہے۔

عليكم: پس وہ بلے تمہارے کپڑوں اور ہاتھوں کو چھوتے ہیں اگر وہ ناپاک ہوتے تو البتہ میں تمہیں ان سے بچنے کا حکم دیتا پس یہ **انها ليست بنجس** کا بیان ہوگا۔ بعض شراح نے اسی طرح کہا ہے اور تحقیق ماقبل میں گزر چکی ہے۔

او الطوافات: یہ راوی کی طرف سے شک ہے۔ ابن الملکؒ نے اسی طرح کہا ہے۔

اور ازبار میں لکھا ہے کہ بلوں کو تشبیہ دی ہے طوافین مذکر کے ساتھ اور بلیوں کو طوافات مؤنث کے ساتھ اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے یہ شک کے لئے نہیں ہے کیونکہ بعض روایات میں ''واوَ'' وارد ہے، بلکہ ''اوْ'' تنوع کیلیئے ہے اور یہاں پر مذکر مؤنث دونوں کا بیان ہوگا۔

امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ سیدؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

اور دارقطنیؒ نے اس کو یوں روایت کیا ہے: **انها كانت تمر به عليه العلاة السلام فيصغى لها الاناء فتشرب منه ثم يتوضا بفضلها**۔ اس روایت کے راوی عبدربہ کو دارقطنی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ امام ابو یوسفؒ کی دلیل ہے۔ اور وہ یہ روایت ہے: **عن عبد ربه عن سعيد المقبرى عن ابيه عروة بن الزبير عن عائشه انها قالت كان رسول الله** ﷺ **تمر به الهرة فيصغى لها الاناء فتشرب منه ثم يتوضا بفضلها**۔ اور امام ابو یوسفؒ

عبدربہ کے بارے میں دارقطنی سے زیادہ جاننے والے ہیں کیونکہ ان کو عبدربہ کے شیخ کا حال معلوم ہے۔اور اس روایت کی صحت کیلئے شاہد وہ روایت ہے جو دارقطنیؒ، ابن ماجہ اور طحاوی نے حارث بن محمد عن عروۃ عن عائشہ کی سند سے نقل کی ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک برتن سے وضوء کرتے اور ہم سے پہلے بلی اس پانی کو پی جاتی تھی (یعنی اس کے جوٹھے پانی سے ہم وضوء کرتے)۔

اور اسی طرح اُس روایت کیلئے شاہد وہ سنن دارقطنی اور ابن ماجہ اور معجم طبرانی کی روایت ہے کہ جس میں یہ ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بلی کے بارے میں سوال کیا گیا؟ تو انہوں نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار مدینہ کی ایک جگہ جس کو بطحان کہتے ہیں اس کی طرف نکلے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انیس میرے لئے وضوء کا پانی رکھو، پس میں نے وضوء کیلئے پانی رکھا پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قضائے حاجت فرمائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم برتن کی طرف متوجہ ہوئے تو ایک بلا آ گیا اس نے برتن میں منہ ڈال دیا پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی دیر کے لئے توقف فرمایا یعنی رُک گئے یہاں تک کہ بلّے نے پانی پی لیا پھر میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا (اس کے بارے میں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے انس بے شک بلا (یا بلّی) گھر کے درندوں میں سے ہے یہ ہرگز کسی چیز کو گندا نہیں کرتی اور ہرگز کسی چیز کو ناپاک نہیں کرتی۔

اور اسی طرح وہ روایت جو صحیح ابن خزیمہ میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بلی ناپاک نہیں ہے۔بلّی گھر والوں میں سے بعض کی طرح ہے۔

اور سنن دارمی میں ہے: ھی کبعض متاع اھل البیت۔

اور باقی یہ حدیث: یغسل الاناء من ولوغ الکلب سبعا ومن ولوغ الھرۃ مرۃ (کہ کتے کے منہ ڈالنے سے سات مرتبہ اور بلی کے منہ ڈالنے سے ایک مرتبہ برتن کو دھوئے گا) یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ کے قول سے مدرج ہے (یعنی اس حدیث میں یہ قول حدیث کا حصہ بن گیا ہے)۔جیسا کہ اس کا مدرج ہونا امام بیہقی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔اگرچہ یہ بات امام طحاویؒ پر مخفی رہی ہے اسی وجہ سے انہوں نے کہا ہے کہ سؤر ہرہ مکروہ تحریمی ہے۔واللہ اعلم۔

اور باقی وہ روایت کہ جو لوگوں کے ہاں مشہور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کپڑے کا وہ حصہ کہ جس پر بلی سوگئی تھی کاٹ دیا اس روایت کی کوئی اصل نہیں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بلّی کا جوٹھا استعمال کیا

۴۸۳: وَعَنْ دَاوٗدَ بْنِ صَالِحِ بْنِ دِیْنَارٍ عَنْ اُمِّهٖ اَنَّ مَوْلَاتَهَا اَرْسَلَتْهَا بِهَرِیْسَةٍ اِلٰی عَائِشَةَ قَالَتْ فَوَجَدْتُّهَا تُصَلِّیْ فَاَشَارَتْ اِلَیَّ اَنْ ضَعِیْهَا فَجَآءَتْ هِرَّةٌ فَاَكَلَتْ مِنْهَا فَلَمَّا انْصَرَفَتْ عَائِشَةُ مِنْ صَلَاتِهَا اَكَلَتْ مِنْ حَیْثُ اَكَلَتِ الْهِرَّةُ فَقَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ اِنَّهَا لَیْسَتْ بِنَجَسٍ اِنَّهَا مِنَ الطَّوَّافِیْنَ عَلَیْكُمْ وَاِنِّیْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم یَتَوَضَّأُ بِفَضْلِهَا ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبو داؤد في [illegible] ۱/۶۱ حدیث رقم ۷۶۔

ترجمہ : حضرت داؤد بن صالحؒ اپنی والدہ ماجدہ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن ان کی آزاد کنندہ مالکہ نے ہریسہ دے کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت عالیہ میں بھیجا۔ ان کی والدہ فرماتی ہیں کہ میں نے وہاں پہنچ کر دیکھا کہ حضرت عائشہؓ نماز پڑھ رہی ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے اشارہ کیا کہ وہاں رکھ دو۔ چنانچہ میں نے ہریسہ کا برتن رکھ دیا۔ اتنے میں ایک بلی آئی اور اس نے اس میں سے کھانا شروع کر دیا۔ حضرت عائشہؓ جب نماز سے فارغ ہوئیں۔ تو ہریسہ کو بلی نے جہاں سے کھایا تھا۔ وہاں ہی سے انہوں نے بھی کھایا۔ پھر فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ بلی نجس نہیں ہے اور وہ تمہارے پاس کثرت سے آنے جانے والوں میں سے ہے اور میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سور ہرہ سے وضو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

راویٔ حدیث:

داؤد بن صالح ۔ یہ داؤد صالح بن دینار کے بیٹے ہیں۔ کھجوروں کے تاجر تھے اور انصار کے آزاد کردہ ہیں۔ مدینہ کے رہنے والے ہیں۔ سالم بن عبداللہ اور اپنے والد اور اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں۔

تشریح: **عن امه** :ان کا نام معلوم نہیں ہے۔ میرک شاہؒ نے اسی طرح کہا ہے۔

ان مولاتها :یعنی ان کی آزاد کرنے والی اور ان کا نام بھی معلوم نہیں ہے۔ میرک شاہؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

بهريسة : قاموس میں لکھا ہے کہ ہرس کہتے ہیں سخت کھانا اور بہت زیادہ کوٹنا اور اسی سے ہریس اور ہریسہ ہے (ہریسہ وہ کھانا کہ جو گوشت اور کوٹے ہوئے گیہوں سے ملا کر تیار کیا جاتا ہے)۔

فاشارت الی: ہاتھ کے ساتھ یا سر کے ساتھ اشارہ کیا۔

ان ضعيها :''ان'' مفسرہ ہے یا مصدر یہ ہے ای بوضعها۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ انْ قول کے معنی کے لئے مفسرہ ہے اشارہ میں اور اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کا اشارہ نماز میں جائز ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں اس لئے کہ یہ عمل کثیر نہیں ہے اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ ''اَنْ'' مفسرہ ہے اس لئے کہ اشارہ کلام ہے۔ یہ لغو بات ہے۔

فقالت :یہ یا تو سوال مقدر کا جواب ہے یا حقیقی طور پر سوال کا جواب ہے۔

انها من الطوافين عليكم :اس حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''اَوْ'' اس سے پہلی حدیث میں شک کے لئے ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں اقتصار ہو یا مذکر کا ذکر بطور غلبہ کے ذکر کیا ہے۔

وانی رایت رسول لله صلی اللہ علیہ وسلم **يتوضا بفضلها** :یعنی بلی کے پینے کے بعد برتن میں بچے ہوئے سے وضوء کرتے اور یہ ان حضرات کے مذہب کے مطابق کہ جو سؤر الہرة کو پاک کہتے ہیں بالکل ظاہر ہے اور باقی جو بلی کے جوٹھے کو مکروہ تنزیہی کہتے ہیں وہ اس کو رخصت یا بیان جواز پر محمول کرتے ہیں۔

رواه ابو داؤد :ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی سند حسن ہے۔ لیکن یہ بات قابلِ نظر ہے اس لئے کہ دار قطنی نے کہا ہے کہ اس روایت کو نقل کرنے میں عبدالعزیز بن محمد الدراوردی عن داؤد بن صالح عن عائشہؓ ان الفاظ کے ساتھ متفرد ہے۔ سیدؒ نے صاحب تخریج سے اسی طرح نقل کیا ہے اور احمد اور دار قطنی اور حاکم نے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک جگہ آپ کو ضیافت کیلئے

بلایا گیا تو آپ ﷺ نے اس کو قبول کرلیا اور دوسری جگہ بلایا گیا تو قبول نہیں کیا، پس جب آپ ﷺ سے پہلی کے قبول اور دوسری کے قبول نہ کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان دوسروں کے گھر میں کتا ہے، پس آپ ﷺ سے کہا گیا کہ اس پہلے والوں کے ہاں بلی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بلی ناپاک نہیں ہے۔علماء فرماتے ہیں بلی کا رکھنا اور اس کی تربیت کرنا ان احادیث پر عمل کرتے ہوئے مستحب ہے اور باقی وہ حدیث کہ جس میں یہ ہے کہ حب الهرة من الایمان یہ روایت موضوع ہے جیسا کہ محدثین کی ایک جماعت نے کہا ہے جیسا کہ علامہ صغانیؒ اور قابل تعجب جرجانیؒ اور تفتازانیؒ کا اس حدیث میں بحث کرنا قابل تعجب ہے۔اور ان کا اس بات میں مناظرہ کرنا کہ آیا حب الهرة میں اضافت مصدر کی فاعل کی طرف ہے یا مفعول کی طرف ہے۔ظاہر یہ ہوتا ہے کہ اضافت مصدر کی مفعول کی طرف ہے جیسا کہ میں نے اس کو ایک مستقل رسالہ میں بیان کیا ہے۔

وحشی جانوروں کے جوٹھے کا حکم

۴۸۴ :وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنَتَوَضَّأُ بِمَا اَفْضَلَتِ الْحُمُرُ قَالَ نَعَمْ وَبِمَا اَفْضَلَتِ السِّبَاعُ كُلُّهَا۔ (رواه فی شرح السنة)

رواه الشافعی فی مسنده ص۸۔شرح السنة ۲/ ۷۱ حدیث رقم ۲۸۷۔

ترجمہ : حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کیا ہم لوگ اس پانی سے وضو کر سکتے ہیں جس کو گدھوں نے جوٹھا کر دیا ہو۔آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اس پانی سے وضو کر سکتے ہو اور اس پانی سے بھی وضو کرنا جائز ہے جس کو درندوں نے جوٹھا کر دیا ہو۔اس حدیث کو شرح السنۃ میں روایت کیا گیا ہے۔اس حدیث سے سور حمار اور سور سباع سے وضو کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

تشریح: انتوضأ : یہ متکلم کا صیغہ ہے۔

بما :علامہ تورپشتی نے فرمایا ''ما'' کا کلمہ دونوں جگہوں میں ''الذی'' کے معنی میں ہے اور بعض نے اس کو ''مد'' کے ساتھ روایت کیا ہے۔اور میں اس کو غلطی ہی سمجھتا ہوں۔

افضلت الحمر :گھریلو یا جنگلی گدھے۔''حُمر'' ضمتین کے ساتھ ہے یعنی وہ جو انہوں نے پینے کے بعد باقی چھوڑ دیا ہو۔

وبما افضلت السباع كلها :ابن الملکؒ نے فرمایا ہے اور یہ حدیث دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ درندوں کا جوٹھا طاہر ہے اور یہی امام شافعیؒ کا مذہب ہے، مگر کتے اور خنزیر کا جوٹھا۔اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تمام درندوں کا جوٹھا ناپاک ہے اور تحقیق فصل کے شروع میں وہ حدیث گزر چکی ہے جو درندوں کے جوٹھے کے ناپاک ہونے پر دلالت کرتی ہے اور وہ حدیث صحیح ہے۔

امام شافعیؒ اپنی مسند میں اس روایت کو اس سند سے نقل کیا ہے : داؤد بن الحصين عن ابيه عن جابر اور بعض

روایات میں داؤد بن الحصین عن جابر ہے "اباہ" کا اس میں ذکر نہیں ہے اس طرح صاحب تخریج سے سیدؒ نے نقل کیا ہے۔

اور ابن ہمامؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث اور آگے آنے والی حدیث :سئل عبن الحياض......کو "ماء کثیر" پر محمول کیا جائے گا یا درندوں کے گوشت کے حرام ہونے سے پہلے کا حکم ہوگا۔ دوسرا یہ کہ دوسری حدیث عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کی وجہ سے معلول ہے جس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور پہلی حدیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے اور اس میں داؤد بن الحصین ہے جس کو ابن حبان نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن امام مالکؒ نے ان سے روایت کی ہے۔ اور باقی گدھے کا جوٹھا اور اسی طرح خچر کا جوٹھا، پس اس کا مطہر ہونا صحیح ترین قول کے مطابق مشکوک ہے اور شک کی وجہ وہ ادلہ کا اباحت اور حرمت میں تعارض کا ہونا ہے۔ پس خیبر کی حدیث جس میں ہانڈیوں کے الٹانے کا ذکر ہے اور بعض روایات کہ جس میں یہ مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے ایک منادی کو حکم دیا کہ وہ زور سے پکارے کہ جن دیگچیوں اور ہانڈیوں میں گدھوں کا گوشت پکا ہوا ہے اس کو انڈیل دیا جائے، بے شک یہ گندگی ہے۔ اس کو امام طحاوی اور بعض دوسرے حضرات نے روایت کیا، اس سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔

اور غالب بن ابجر کی حدیث کہ جس میں یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ان کو کہا: هل لك من مال؟ "کیا تیرے پاس کوئی مال ہے؟" کہنے لگے میرے پاس چند گدھوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے یہ جو کہا: ليس لى مال الاحميرات تو حمیرات میں رفع نصب دونوں جائز ہیں۔ پس حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جو موٹے گدھے ہیں اس میں سے کھاؤ۔ اس حدیث سے حلت ثابت ہو رہی ہے۔ اور صحابہ کا بھی اس کی طہارت اور نجاست میں اختلاف تھا۔ ابن عمرؓ سے اس کی نجاست منقول ہے اور ابن عباسؓ سے اس کی طہارت۔ یہ ساری تحقیق ابن ہمامؒ نے کی ہے۔

اگر پانی پاک چیز سے متغیر ہو تو اس سے طہارت جائز ہے

۴۸۵: وَعَنْ اُمِّ هَانِئٍ قَالَتْ اِغْتَسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ وَ مَيْمُوْنَةُ فِىْ قَصْعَةٍ فِيْهَا اَثَرُ الْعَجِيْنِ۔ (رواه النسائى وابن ماجة)

أخرجه النسائى فى السنن ١/ ١٣١ حديث رقم ٢٤٠۔ وابن ماجة فى السنن ١/ ١٣٤ حديث رقم ٣٧٨۔ وأخرجه أحمد فى مسنده ٦/ ٣٤٢۔

ترجمہ: "حضرت ام ہانیؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت میمونہؓ نے ایک ایسے برتن سے غسل کیا کہ جس کے پانی میں گوندھے ہوئے آٹے کا اثر موجود تھا۔ اس حدیث کو امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔"

راویٔ حدیث:

امّ ہانی۔ یہ ام ہانی ہیں۔ ان کا نام فاختہ ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ان کا نام عاتکہ تھا۔ ابو طالب کی بیٹی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ ہیں۔ فتح مکہ کے سال اسلام قبول کیا۔ آنحضرت ﷺ نے نبوت سے قبل ان کو پیغام نکاح دیا تھا اور ہبیرہ ابن ابو وہب رضی اللہ عنہ نے بھی پیام دیا تھا۔ ابو طالب نے ہبیرہ سے ان کا نکاح کر دیا تھا۔ لیکن بعد میں یہ مسلمان ہو گئیں اور اسلام کی وجہ

سے ان میں نکاح باقی نہ رہا۔ اب دوبارہ آپ ﷺ نے پیام دیا' تو انہوں نے کہا خدا کی قسم میں تو آپ کو پہلے سے پسند کرتی ہوں اب مسلمان ہونے کے بعد تو کیوں پسند نہ کروں گی۔ لیکن میں بچوں والی عورت ہوں' تو آپ ﷺ نے سکوت فرمایا۔ ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی' ان میں علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم بھی ہیں۔ محدثین کا اتفاق ہے کہ ''ہانی'' کے آخر میں ہمزہ ہے۔

تشریح: فی قصعه: ''قاف'' کے فتحہ کے ساتھ مراد بڑا برتن ہے۔

فیها اثر العجین: عجین گوندھا ہوا آٹا، اور اس گوندھے ہوئے آٹے کا اثر پانی میں اتنا زیادہ نہ تھا کہ جو پانی کو بدلنے والا ہو اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سے طہارت حاصل کرنا جائز ہے۔ امام شافعیؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ابن الملکؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ گوندھے ہوئے آٹے کا اثر پانی میں اتنا زیادہ نہ تھا کہ جو پانی میں تغیر کرنے والا ہو۔

رواه النسائی، وابن ماجة: سیدؒ نے فرمایا ہے اور ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں اس کو ذکر کیا ہے۔

الفصل الثالث:

۴۸۶: وَعَنْ يَحْيَى بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ قَالَ اِنَّ عُمَرَخَرَجَ فِيْ رَكْبٍ فِيْهِمْ عَمْرُو ابْنُ الْعَاصِ حَتّٰى وَرَدُوْا حَوْضًا فَقَالَ عَمْرٌو يَاصَاحِبَ الْحَوْضِ هَلْ تَرِدُ حَوْضَكَ السِّبَاعُ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَا صَاحِبَ الْحَوْضِ لَا تُخْبِرُنَا فَاِنَّا نَرِدُ عَلَى السِّبَاعِ وَتَرِدُ عَلَيْنَا (رواه مَالك) وزاد رزين قَال زاد بعض الرواة فِي قول عمر اِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَهَا مَا اَخَذَتْ فِيْ بُطُوْنِهَا وَمَا بَقِيَ فَهُوَ لَنَا طُهُوْرٌ وَشَرَابٌ.

أخرجه مالك في الموطأ ١/٢٣ حديث رقم ١٤ من كتاب الطهارة۔

ترجمہ: ''حضرت یحیٰی بن عبدالرحمٰنؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ ایک قافلہ کے ساتھ سفر میں نکلے اور اس قافلہ میں حضرت عمرو بن عاص بھی تھے۔ جب قافلہ ایک تالاب پر پہنچا۔ تو حضرت عمر بن عاصؓ نے تالاب کے مالک سے دریافت کیا کیا تمہارے اس تالاب پر درندے بھی پانی پینے کے لئے آتے ہیں۔ یہ سوال سن کر حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا اے تالاب کے مالک اس سوال کا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ ہم درندوں پر آتے ہیں اور درندے ہم پر آتے ہیں۔ اس حدیث کو امام مالکؒ نے روایت کیا ہے اور حضرت زرینؒ نے فرمایا کہ بعض راویوں نے حضرت عمرؓ کے اس قول میں یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ نے فرمایا کہ درندے جو اپنے پیٹ میں لے جائیں وہ ان کا ہے اور جو باقی بچ جائے وہ ہمارے پینے اور طہارت حاصل کرنے کے لئے ہے۔''

راویٔ حدیث:

یحیٰی بن عبدالرحمٰن۔ یہ ''یحیٰی'' ہیں عبدالرحمٰن بن حاطب بن ابی بلتعہ کے بیٹے ہیں اور مدنی ہیں۔ اپنے والد ابن زبیرؓ

ابن عمر اور عبدالرحمٰن بن حاطب اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے حدیث سنی۔ یہ اور ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔

تشریح: یاصاحب الحوض لاتخبرنا: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ تیرا ہم کو ان درندوں کے آنے اور نہ آنے کی خبر دینا برابر ہے، پس اگر تو برے حال کی خبر دے گا تو ہمارے نزدیک وہ جائز اور قابلِ گنجائش ہوگا۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہم ان درندوں کے آنے کی وجہ سے اس کے استعمال سے نہیں رکیں گے ان سے بچاؤ کے مشکل ہونے کی وجہ سے جو مقتضی ہے اس امر کو کہ پانی اپنی طہارت پر باقی رہے۔

فانا نرد على السباع وترد علينا: یعنی ہم درندوں سے ملتے رہتے ہیں اور وہ ہمارے پاس آتے ہیں۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ مطلب یہ ہے اس لئے کہ ہم ان کے باقی ماندہ کو استعمال کرنے کے لئے آتے ہیں اور وہ ہمارا باقی ماندہ استعمال کرتے ہیں۔

(ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ قوی بات یہ ہے کہ لا تخبرنا کو پانی کے ناپاک نہ ہونے اور پانی کے اپنی اصلی طہارت پر باقی رہنے کے ارادے پر محمول کیا جائے اور اس پر صحابی کا سوال کرنا بھی دلالت کرتا ہے ورنہ اگر یہ بات نہ ہو تو پھر سوال کرنا فضول ٹھہرے گا۔ پھر حضرت عمرؓ کا فانا نرد على السباع سے علت بیان کرنا اس میں اشارہ ہے کہ یہ حال سفر ضروریات میں سے ہے اور ہم بحث وتمحیص کے مکلّف نہیں ہیں۔ پس اگر ہم یہ بحث وتمحیص کا دروازہ اپنے آپ پر کھول لیں تو ہم بہت بڑی مشقت میں پڑ جائیں گے۔

اس کی سند صحیح ہے ابن حجرؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

۴۸۷: وَزَادَ رَزِيْنَ قَال زَادَ بَعْضِ الرَّوَاةِ فِيْ قَوْلُ عُمَرٍ اِنِّی سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَهَا مَا اَخَذَتْ فِيْ بُطُوْنِهَا وَمَا بَقِيَ فَهُوَ لَنَا طُهُوْرٌ وشَرَابٌ.

أخرجه مالك في الموطأ ۱/۲۳ حديث رقم ۱۴ من كتاب الطهارة۔

ترجمہ: ''اور حضرت زرینؒ نے فرمایا کہ بعض راویوں نے حضرت عمرؓ کے اس قول میں یہ الفاظ زائد نقل کئے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا کہ درندے جو اپنے پیٹ میں لے جائیں وہ ان کا ہے اور جو باقی بچ جائے وہ ہمارے پینے اور طہارت حاصل کرنے کے لئے ہے۔''

تشریح: وما بقى فهو لنا طهور وشراب: یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے اس پانی کو تقسیم کر دیا ہے پس جو انہوں نے پی لیا، وہ ان کا حق تھا اور جو بچ گیا پس وہ ہمارا حق ہے اور اس حدیث کی زیادتی کے صحیح ہونے کی صورت میں بھی یہ مذہب شافعیہ کے لئے دلیل صریح نہیں بن سکتی کیونکہ اس حدیث کو ابہام اور پانی کے ناپاک نہ ہونے پر محمول کیا جائے گا جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا۔

اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ یہ زیادتی جس کا معنی عنقریب ابن ماجہ کی حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں آئے گا اور اس کی سند صحیح ہے اور وہ سؤر السباع کے پاک ہونے میں صریح دلیل ہے الخ۔ یہ قول ابن حجرؒ کا صحیح نہیں ہے یہ دوسری حدیث (ابن ماجہ والی) کے سمجھنے سے غفلت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے کیونکہ اس حدیث میں کلاب (کتوں) کا بھی ذکر ہے جو بالاتفاق پانی کو ناپاک

کرنے والے ہیں، پس جو جواب وہ اس بارے میں دیں گے وہی ہمارا بھی اس حدیث کی طرف سے جواب ہوگا۔ اور اگر چہ یہ جواب دیں کہ کتے کے سؤر کا نجس ہونا دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے تو یہ جواب اس لئے قابلِ ردّ ہے کہ تقدیم وتاخیر کے لئے تاریخ کا علم ہونا چاہیے جو یہاں نہیں ہے اور باقی حضرت عمرو بن العاص کا اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول پر خاموش رہنا تو اس کی وجہ گزر چکی ہے اور احتمال کے ہوتے ہوئے اس سے استدلال صحیح نہیں ہے۔

پھر ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ حوض اور حیاض کے پانی کو ماءِ کثیر پر محمول کرنا یہ دلیل کا محتاج ہے۔ (ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) اس کی دلیل وہ دونوں دلیلوں کو جمع کرکے بنتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ حوض لغت اور عرف میں کہتے ہی ماءِ کثیر کو ہیں اور ابن حجرؒ کا یہ قول کہ بعض لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ وہ روایت درندوں کے گوشت کے حرام ہونے سے پہلے کی ہے یہ باطل ہے یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اشیاء کو حرام نہیں کیا گیا مگر آہستہ آہستہ جیسا کہ وہ آہستہ آہستہ ہی فرض کی گئیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد:

﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ [الانعام:١٤٥]

''تو کہہ دے کہ میں نہیں پاتا اس وحی میں کہ جو مجھ کو پہنچتی ہے کسی چیز کو حرام کھانے والے پر جو اس کو کھائے مگر وہ چیز جو مردار ہو یا بہتا ہوا خون یا سؤر کا گوشت کہ وہ ناپاک ہے یا ناجائز ذبیحہ جس پر اللہ کے علاوہ کسی کا نام پکارا جائے''۔

قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت محکم ہے کیونکہ یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو وحی آتی ہے اس میں سوائے ان چیزوں کے اور کوئی حرام نہیں ہے اور یہ کسی چیز کی حرمت کے کسی دوسری دلیل میں واقع ہونے کے منافی نہیں ہے۔

اور علامہ بغویؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ بعض اہل علم کا مذہب ہے کہ تحریم وہ انہی چیزوں میں بند ہے جو آیت میں مذکور ہیں یہ مذہب حضرت عائشہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے منقول ہے اور اکثر علماء کا مذہب یہ ہے کہ تحریم صرف انہی چیزوں کے ساتھ خاص نہیں ہے، پس کچھ چیزیں تو نص قرآن سے حرام ہیں اور کچھ کو سنت نے حرام قرار دیا ہے تو ان کا قبول کرنا بھی ضروری ہے۔

اور اختلاف الائمہ میں یہ مذکور ہے کہ علماء اس پر متفق ہیں کہ کچلیوں سے شکار کرنے والے تمام درندے حرام ہیں مگر امام مالکؒ وہ کراہت کے ساتھ اس کو مباح قرار دیتے ہیں۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لو۔

اور سئل عن الماء فی الفلاة وترده السباع والدواب؟ فقال اذا كان الماء قلتين۔ والی حدیث شوافع پر حجت الزامیہ ہے۔

۴۸۸: وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنِ الْحِيَاضِ الَّتِيْ بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ تَرِدُهَا السِّبَاعُ وَالْكِلَابُ وَالْحُمُرُ عَنِ الطُّهْرِ مِنْهَا فَقَالَ لَهَا مَا حَمَلَتْ فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَنَا مَا غَبَرَ طَهُوْرٌ۔ (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجة فی السنن ١/١٧٣ حديث رقم ٥١٩۔ وفی الزوائد اسناده ضعيف۔

ترجمہ : ''حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ان تالابوں کے متعلق سوال کیا گیا جو مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہیں اور ان تالابوں پر درندے کتے اور گدھے پانی پینے کے لئے آتے ہیں آیا ان کے باقی ماندہ پانی سے کسی چیز کو پاک کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو ان کے پیٹوں میں آ گیا وہ ان کا ہے اور جو باقی بچ گیا وہ ہمارے لئے پاک کرنے والا ہے۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: غبر: ''غین'' کے فتحہ کے ساتھ معنی ہے بقی۔

طھور : ''طاء'' کے فتحہ کے ساتھ اور یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور ان دونوں حدیثوں کی تاویل پہلے گزر چکی ہے۔
ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے۔

دھوپ میں گرم پانی سے غسل منع ہے

۴۸۹: وَعَنْ عُمَرَبْنِ الْخَطَّابِ قَالَ لَا تَغْتَسِلُوْا بِالْمَآءِ الْمُشَمَّسِ فَاِنَّهٗ يُوْرِثُ الْبَرَصَ. (رواه الدارقطنى)

أخرجه الدارقطنى فى سننه ۱/۳۹ حديث رقم ٤ باب الماء المسخن ـ

ترجمہ : ''حضرت عمر بن خطابؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا دھوپ میں گرم کیے ہوئے پانی سے غسل نہ کرو۔ کیونکہ اس سے برص کی بیماری پیدا ہوتی ہے۔ اس روایت کو امام دارقطنی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: لا تغتسلوا بالماء المشمس : اور اس کی صورت یہ ہے کہ پانی کو دھوپ میں گرم ہونے کے لئے رکھ دیا جائے اسی طرح بعض نے کہا ہے، اور حدیث کے ظاہر سے اطلاق ثابت ہوتا ہے پس رکھا ہوا ہو یا ویسے ہی دھوپ آ جائے دونوں صورتوں کو حدیث شامل ہے۔ اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ وہ پانی جو کسی تانبے وغیرہ کے بنے ہوئے برتن میں ہو اور وہ گرمی کے وقت گرم ہو جائے یعنی تم اپنے جسموں میں ایسے پانی کو استعمال نہ کرو چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔

فانه یورث البرص : یعنی طب کے اعتبار سے یہ برص کا باعث ہے جیسا کہ بعض اطباء نے ذکر کیا ہے۔ یہاں یہ بات جان لینی چاہیے کہ مذہب شافعیؒ میں اصح قول کے مطابق دھوپ میں گرم کیا ہوا پانی استعمال کرنا مکروہ ہے اور متاخرین شافعیہ کے ہاں عدم کراہت ہے اور یہی ائمہ ثلاثہ کا مذہب ہے اور آگ پر گرم کیا ہوا پانی بالاتفاق مکروہ نہیں ہے اور مجاہدؒ سے اس کی کراہت منقول ہے اور امام احمدؒ نے اس پانی کو مکروہ قرار دیا ہے جو نجاست پر گرم کیا گیا ہو۔

میرک شاہؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ پس ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ یہ صحیح سند سے منقول ہے، بیان کا محتاج ہے اور ان کا یہ کہنا کہ کسی صحابی سے حضرت عمرؓ کی اس بارے میں مخالفت منقول نہیں ہے پس یہ اجماع کی طرح ہے۔ اس بات کا محل تو تب تھا کہ جب انہوں نے یہ بات صحابہ کی موجودگی میں کہی ہو اور احتیاط کی وجہ سے نہی تنزیہی بھی نہیں ہوگی بعض اطباء کے کلام کی بنا پر حالانکہ تمام امورِ شرعیہ میں ان میں سے کسی کی بات کا بھی اعتبار نہیں ہوگا یہاں تک کہ چاند کے بارے میں بھی۔ حالانکہ ان جیسی تحقیق تو کسی اور کی نہیں ہے۔

اور قابل تعجب بات یہ ہے کہ شوافع نے حضرت عمرؓ کے اس اثر کو مرفوع کے حکم میں مانا ہے اور ایک ضعیف بلکہ موضوع

روایت سے اس کی تائید کی ہے اور وہ، وہ روایت ہے جس کی تخریج دار قطنی نے کی ہے اور اسی طرح ابو نعیم نے وہ روایت حضرت عائشہؓ سے نقل کی ہے۔ فرماتی ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دھوپ میں پانی گرم کیا فرمایا کہ اس طرح نہ کیا کرو یہ برص کا باعث ہے۔

پھر علی سبیل التنزل دونوں حدیثوں کو قبول کرنے میں فقہ شافعی میں کہاں سے مذکورہ شرائط لی گئی ہیں جو کہ ان دونوں حدیثوں کے ظاہر کے خلاف ہیں۔

اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اس بارے میں اطباء سے کچھ منقول نہیں ہے اور حضرت عمرؓ کی حدیث ضعیف ہے پس ثابت ہو گیا کہ دھوپ میں گرم کیئے ہوئے پانی میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

بَابُ تَطْهِيرِ النَّجَاسَاتِ

نجاستوں کے پاک کرنے کا باب

الفصل الاول:

کتے کے جوٹھے کا حکم

۴۹۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِیْ اِنَآءِ اَحَدِكُمْ فَلْيَغْسِلْهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ (متفق عليه وفی رواية لِمُسْلِمٍ قَالَ طُهُوْرُ اِنَآءِ اَحَدِكُمْ اِذَاوَلَغَ فِيْهِ الْكَلْبُ اَنْ يَغْسِلَهٗ سَبْعَ مَرَّاتٍ اُولَاهُنَّ بِالتُّرَابِ)۔

أخرجه البخاری فی الصحيح ١/٢٧٤ حديث رقم ١٧٢۔ وأخرجه مسلم فی الصحيح ١/٢٣٤ حديث (٩٠۔٢٧٩) وأخرجه النسائی فی السنن ١/٥٢ رقم ٦٣۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ١/١٢٠ حديث ٣٦٤ وأخرجه مالك فی الموطأ ١/٣٤ حديث رقم ٣٥ من كتاب الطهارة۔ وأخرجه أحمد فی مسنده ٢/٢٤٥ ورواية "طهور أحدكم ......" أخرجها مسلم فی الصحيح ١/٢٣٤۔ حديث رقم (٩١۔٢٧٩) وأخرجه أبو داوٗد فی السنن ١/٥٧ حديث رقم ٧١۔

ترجمه حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تمہارے برتن سے کتا پانی پی لے تو اس برتن کو سات مرتبہ دھو لینا چاہئے۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں الفاظ اس طرح ہیں کہ جب تمہارے برتن میں منہ ڈال دے تو اس کو پاک کرنے کی ضرورت یہ ہے کہ اس کو سات مرتبہ دھویا جائے اور پہلی مرتبہ مٹی کے ساتھ مانجا جائے۔

تشریح: اذا شرب الكلب فی اناء احدكم : شرب "ولغ" کے معنی کو شامل ہے پس اس کی طرح یہ متعدی ہو

گا۔نہایہ میں لکھا ہے ولغ الکلب کا معنی یہ ہے کہ جب کتا زبان سے پیئے۔

سبع مرات: اس میں امام مالک کی دلیل ہے بغیر مٹی کے سات مرتبہ برتن کو دھونے کی لیکن بطور امر تعبدی کے ہے نہ کہ اس کے نجس ہونے کی وجہ سے۔

وفی روایۃ لمسلم قال۔ طھور: طھور ''طاء'' کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ ہے۔نووی نے فرمایا ہے کہ مشہور اس میں ''طاء'' کے ضمہ کے ساتھ ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ فتحہ کے ساتھ ہے اس میں دو لغتیں ہیں۔سید نے اس کو نقل کیا ہے۔ابن الملک نے فرمایا ہے''طاء'' کے ضمہ کے ساتھ تطہر یا طہارت کے معنیٰ میں ہے۔

اناء احدکم اذا ولغ فیہ الکلب: طیبی نے فرمایا یہ مبتدا ہے اور ظرف اس کے لئے معمول ہے اور خبر (ان یغسلہ سبع مرات اولاھن بالتراب) یعنی سات کے ساتھ پہلی مرتبہ مٹی کے ساتھ مانجھے اور ایک دوسرے روایت میں ہے: احداھن بالتراب ابن حجر فرماتے ہیں اور یہ بھی صحیح روایت ہے جیسا کہ علامہ نووی نے اپنی ایک کتاب میں ذکر کیا ہے لیکن ایک دوسری جگہ یہ کہا ہے کہ اس روایت میں ایک ضعیف اور مجہول راوی ہے اور ایک صحیح روایت میں ہے: اولاھن او اخراھن بالتراب اور ''اَوْ'' اس میں شک کے لئے ہے جیسا کہ امام بیہقی وغیرہ نے اس کو بیان کیا ہے اور ایک دوسری روایت میں یہ بھی ہے: وعفروہ الثامنۃ بالتراب۔اس حدیث کے ظاہر کو امام احمد وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ ان روایات میں تعارض نہیں ہے کیونکہ ان میں تطبیق دینا ممکن ہے وہ اس طرح کہ: اولاھن بالتراب والی روایت اکمل صورت پر محمول ہے اس لئے کہ پہلی مرتبہ مٹی کا استعمال باقی کے بنسبت بالاتفاق زیادہ پسندیدہ ہے۔اور ساتویں مرتبہ والی روایت کو جواز پر محمول کیا جائے گا اور احداھن والی روایت یہ کافی ہونے پر محمول ہوگی۔

ابن الملک فرماتے ہیں پس طھورین (مٹی پانی) کا استعمال کرنا کتے کے منہ ڈالے ہوئے برتن وغیرہ میں واجب ہے اس لئے کہ اس کی نجاست تمام نجاستوں میں سب سے غلیظ ہے اور اگر دو کتوں نے منہ ڈالا یا ایک نے سات مرتبہ، پس صحیح مذہب یہ ہے کہ تمام کے لئے سات مرتبہ دھونا کافی ہے اور یہ سات مرتبہ کا مذہب امام شافعی کا ہے اور امام صاحب کے نزدیک کتے کے منہ ڈالے ہوئے برتن کو تین مرتبہ بغیر مانجھنے کے باقی تمام نجاستوں کی طرح دھویا جائے گا۔

اور شرح السنۃ میں مذکور ہے کہ اکثر محدثین کا مذہب ہے کہ جب کتا پانی یا کسی مائع چیز میں منہ ڈال دے تو سات مرتبہ اس برتن کو دھویا جائے گا ایک مرتبہ ان میں مٹی سے مانجھا جائے گا۔

اور شرح الکبیر میں امام مالک سے روایت ہے کہ کتے کے منہ ڈال کر پینے کے علاوہ برتن کو نہیں دھویا جائے کیونکہ ان کے نزدیک کتا پاک ہے اور اس کے منہ ڈالنے سے برتن کا دھونا یہ بطور امر تعبدی کے ہے۔

اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب فرماتے ہیں کہ اس کے اندر دھونے میں نہ کوئی عدد ہے اور نہ ہی اس میں مانجھنا ہے مٹی کے ساتھ بلکہ یہ باقی تمام نجاستوں کے دھونے کی طرح ہے۔

اور صحیح بخاری میں عطاء سے منقول ہے کہ عطاء انسانوں کے بالوں سے دھاگے اور رسی وغیرہ بنانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے اور اسی طرح کتوں کے جھوٹے میں اور ان کتوں کے مسجد میں گزرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے اور امام زہری

نے فرمایا ہے کہ جب کتا پانی میں منہ ڈال دے اور اس کے علاوہ کوئی پانی نہ ہو تو اس سے وضوء کیا جائے۔

اور سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ بعینہٖ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ہیں: ﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا﴾ [المائدہ:٦] تو یہ بھی پانی ہے اور اگر دل میں کچھ ملال ہو تو وضوء بھی کرے اور تیمم بھی کرے۔

اور ابن ہمامؒ نے فرمایا ہے کہ دار قطنی نے اعرج سے اور اعرج نے ابو ہریرہؓ سے حضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ کتے کے برتن میں منہ ڈالنے کی وجہ سے اس کو تین مرتبہ یا پانچ مرتبہ یا سات مرتبہ دھویا جائے گا اور ابن عدی نے اس کو مرفوعاً نقل کیا ہے روایت یوں ہے: **اذا ولغ الكلب فى اناء احدهم فليهريقه وليغسله ثلاث مرات** اور دار قطنی نے صحیح سند کے ساتھ عطاءؒ سے حضرت ابو ہریرہؓ کی موقوف روایت نقل کی ہے: **انه كان اذا ولغ فى الاناء اهرقه ثم غسله ثلاث مرات** اس صورت میں یہ سات والی حدیث کے معارض ہے لہٰذا سات والی روایت اس سے پہلے شمار کی جائے گی اس لئے کہ سات مرتبہ دھونے والی روایت میں تقدم کی دلالت موجود ہے کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ کتوں کے معاملے میں شروع شروع میں بڑی سختی تھی یہاں تک کہ ان کو مار ڈالنے کا حکم دیا گیا اور ان کے جھوٹے میں سختی کا ہونا بھی اسی وقت کے مناسب تھا اور مارنے وغیرہ کا تو نسخ ثابت ہو چکا ہے پس جب دوسری چیز (جھوٹے میں سختی) کے معارض کوئی دلیل ہوگی تو اس سختی والی روایت کو پہلے مانیں گے، پس سات مرتبہ دھونے کا حکم یہ ابتداء اسلام پر محمول ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی جواب ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے عمل کا سات والی روایت کے خلاف ہونا حالانکہ وہ سات والی روای کے راوی ہیں یہ دلیل اس بارے میں کافی ہے کیونکہ یہ بات محال ہے کہ راوی اپنی رائے کی وجہ سے قطعی روایت کو چھوڑ دے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خبر واحد کا ظنی ہونا وہ راوی کے علاوہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے ہے باقی راوی کی نسبت کرتے ہوئے کہ جس راوی نے اس کو حضور ﷺ کے منہ مبارک سے سنا ہے وہ قطعی ہے یہاں تک کہ اس کی وجہ سے کتاب اللہ کا نسخ جائز ہے جبکہ وہ اپنے معنی میں قطعی الدلالت ہو پس اس سے یہ لازم آیا کہ وہ اس روایت کو نہیں چھوڑ سکتے مگر اس صورت میں کہ ان کو ناسخ کا علم ہو اس لئے کہ قطعی روایت کو قطع کی وجہ سے چھوڑا جاتا ہے، پس ان حضرات کا یہ قول باطل ہو گیا کہ حضرت ابو ہریرہ ؓ کا سات والی روایت کو چھوڑنا اس ناسخ کی بناء پر تھا جو ان کے اپنے اجتہاد سے تھا جو کہ غلطی کا بھی محتمل ہے اور جب تو نے یہ جان لیا تو (اب ہم کہتے ہیں) کہ ابو ہریرہؓ کا چھوڑنا وہ بمنزلہ ناسخ کے روایت کرنے کے ہے یقینی طور پر، پس وہ سات والا امر ضروری طور پر منسوخ ہوگا۔

مسجد کو پاک کرنے کا طریقہ

۴۹۱: **وَعَنْهُ قَالَ قَامَ اَعْرَابِيٌّ فَبَالَ فِي الْمَسْجِدِ فَتَنَاوَلَهُ النَّاسُ فَقَالَ لَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ دَعُوْهُ وَهَرِيْقُوْا عَلٰى بَوْلِهٖ سَجْلًا مِّنْ مَّآءٍ اَوْذَنُوْبًا مِّنْ مَاءٍ فَاِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ.** (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۳۲۳/۱حدیث رقم ۲۲۰۔وأخرج أبوداوٗد نحوه۲۶۳/۱حدیث رقم ۳۸۰۔ وكذلك الترمذی فی السنن ۲۷۵/۱حدیث رقم ۱۴۷۔وأخرجه النسائی فی السنن ۴۸/۱ حدیث ۵۶ وكذلك ابن ماجة فی السنن ۱۷۶/۱ حدیث ۵۲۹ وقد رواه الثلاثة اما مطولاًواما مختصرًا وقدرواه ابن ماجة عن أبی هريرة كرواية أنس الانية۔ وأخرجه أحمد فی المسند ۲۳۹/۲۔

ترجمہ : حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک روز ایک دیہاتی نے مسجد میں کھڑے ہو کر پیشاب کر دیا لوگ اس کو روکنے لگے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کو چھوڑ دو اور پانی کا ایک ڈول لا کر اس کے پیشاب پر بہا دو اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تمہیں آسانی کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے نہ کہ تنگی کرنے کے لئے اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قام اعرابی :اور یہ ذوالخویصرہ تمیمی ہیں۔

فتناوله الناس :یعنی لوگ ان کو گالیاں اور برا بھلا کہنے لگے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اس کو تکلیف دینے میں پڑ گئے اور ابن لملکؒ نے فرمایا ہے کہ لوگوں نے اس کو مارنے کے لئے پکڑ لیا لیکن اظہر بات یہ ہے کہ صحابہ نے اس کو اس سے ڈانٹا اور منع کیا بغیر مارنے اور تکلیف دینے کے جیسا کہ آئندہ حدیث میں آ رہا ہے۔

فقال لهم النبی ﷺ دعوه :یعنی یہ معذور ہے اس کو چھوڑ دو اس لئے کہ یہ قریب الاسلام ہونے اور حضور ﷺ سے دور رہنے کی وجہ سے یہ بات نہیں جانتا کہ مسجد میں پیشاب کرنا جائز نہیں ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ حضور ﷺ نے چھوڑنے کا اس لئے حکم دیا تا کہ نجاست کئی جگہ پر نہ پھیلے اور بعض نے اس میں حکمت یہ بتائی ہے کہ اگر اس کو روکتے تو پیشاب کے رُکنے کی وجہ سے اس کو تکلیف ہو سکتی تھی۔

وهريقوا :اور ایک نسخہ کے اندر **اهريقوا** ''ہمزہ'' کے بعد ''ھاء'' کے سکون کے ساتھ ہے یہ **اهراق يهريق** (ھاء کے سکون کے ساتھ) **اهراقًا** سے ہے **اهراقًا** ،**اسطاعًا** کی طرح ہے اور اصل میں یہ صیغہ ''اراق'' تھا ہمزہ کو ھاء سے بدل دیا گیا اور ھاء کو عین کلمہ کی حرکت کے جانے سے عوض بنا دیا، پس وہ گویا نفس کلمہ میں سے ہوگئی پھر اس پر ہمزہ کو داخل کر دیا گیا۔ اس کا معنی ''بہانا''۔

سجلا ''سین'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ مراد ''ڈول'' ہے۔

من ماء او ذنوبا : **ذنوب** ''ذال'' کے فتحہ کے ساتھ ہے اور اس کا معنی بھی ''ڈول'' ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ ظاہر یہ ہوتا ہے کہ یہ جملہ راوی کے کلام میں سے ہے اور میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ یہ راوی کی طرف سے شک ہے اور یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ حضور ﷺ کا کلام ہو، پس پھر **سجلا من ماء او ذنوبا** سے اختیار دینا مراد ہوگا کیونکہ ''سجل'' اور ''ذنوب'' میں فرق ہے لیکن پہلی بات زیادہ قوی ہے اور ابن الملکؒ دوسری بات کی طرف مائل ہوئے ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ان کو بھرے ہوئے ڈول یا نہ بھرے ہوئے ڈول بہانے میں اختیار دیا (یعنی ڈول بھر کر پھینک دو یا بھرا ہوا نہ کم ہو پھینک دو تمہیں اختیار ہے)۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ ''سجل'' اس ڈول کو کہتے ہیں کہ جس میں پانی ہو کم ہو یا زیادہ ہو اور یہ مذکر ہے اور ذنوب مؤنث ہے اور مراد اس سے وہ ڈول ہے کہ جو بھرا ہوا ہو۔

من ماء :دونوں جگہوں میں **من ماء** زیادتی اور تاکید کے لئے وارد ہے۔ اس لئے کہ ''سجل'' اور ''ذنوب'' نہیں استعمال ہوتے مگر اس ڈول کے معنی میں کہ جس میں پانی ہو۔ اور بعض نے کہا ہے ''من'' یہاں بیانیہ ہے کیونکہ اس ڈول میں احتمال تھا کہ پانی ہو یا اور کوئی مائع چیز ہو (تو ''من ماء'' سے بیان ہوگیا) اور یہ قول ان لوگوں کے مذہب کے مطابق ہے جو پانی کے علاوہ تطہیر

کے قائل ہیں۔

ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ امام غزالی نے منخول میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ شوافع کا اس خبر سے اپنے مذہب پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ یہاں پانی کو خاص کرنے سے غرض یہ ہے کہ پانی عموم وجود کے ساتھ خاص ہے اور مقصود اس حدیث سے مسجد کو جلدی سے صاف کرنا ہے یہاں اس بات کا بیان نہیں ہے کہ اس کو کس چیز سے پاک کیا جائے گا۔

اور مظہرؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ پانی جب نجاست پر گرتا ہے کثرت اور غلبے کے طریقے سے تو وہ اس کو پاک کر دیتا ہے اور اس حدیث میں اس امر کی بھی دلیل ہے کہ نجاست کے دھونے میں استعمال ہونے والے پانی طاہر ہیں جب کہ ان میں نجاست کی وجہ سے تغیر نہ ہوا گر چہ وہ پانی مطہر پاک کرنے والے نہیں ہیں (لیکن وہ طاہر ضرور ہے) کیونکہ اگر اس کا اعتبار نہ ہوتا تو پھر وہ پانی جو پیشاب پر بہایا گیا ہو وہ نفس پیشاب سے بھی زیادہ مسجد کو ناپاک کرنے والا ہوگا۔

اور ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ زمین نجاست سے اس وقت تک پاک نہ ہوگی جب تک کہ اس کو کھودا نہ جائے، پس اگر وہ ایسی زمین تھی کہ اس پر دھوپ پڑتی تھی اور وہ خشک ہوگئی یا نجاست کا اثر زمین میں سے چلا گیا تو پھر وہ زمین بغیر کھودنے اور بغیر پانی کے بہانے کے پاک ہو جائے گی۔

ابن ہمامؒ نے فرمایا ہے کہ صاحبؒ ہدایہ کا یہ کہنا: **فجفت بالشمس** یہ اتفاقی واقعہ ہے اس لئے کہ خشک ہونا جیسے دھوپ سے ہوتا ہے ایسے ہی ہوا سے ہوتا ہے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مراد یہاں پر اس کے اثر کے ختم ہونے سے رنگ یا بو کا ختم ہونا ہے۔

اور شرح السنہ میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ زمین پر جب نجاست لگ جائے تو وہ خشک ہونے سے پاک نہیں ہوتی اور زمین کی کھدائی کرنا اور مٹی کا اٹھانا یہ واجب نہیں ہے جبکہ اس پر پانی بہا دیا جائے۔ علامہ طیبیؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث میں اس بات کی دلالت نہیں ہے کہ زمین خشک ہونے سے پاک نہیں ہوتی۔ ابن عمرؓ کی صحیح روایت میں آتا ہے: **کنت غربا ابیت فی المسجد وکانت الکلاب تبول وتقبل وتدبر فی المسجد فلم یکونوا یرشون شیأ من ذلك۔** ''ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں ابھی کنوارہ تھا اور میں رات مسجد میں گزارتا تھا اور کتے مسجد میں پیشاب کرتے اور آتے جاتے رہتے تھے، پس صحابہ کرام اس کی وجہ سے اس زمین پر کوئی پانی وغیرہ نہیں بہاتے تھے۔'' پس اگر زمین کے خشک ہونے سے پاک ہونے کا اعتبار نہ ہوتا تو پھر یہ تو نجاست کو مسجد میں باقی رکھنے کے مترادف ہے حالانکہ ان کو یہ بھی علم تھا کہ وہ یقینی طور پر اس پر نماز اداء کریں گے اس لئے کہ پاک رکھنا ضروری تھا کیونکہ مسجد چھوٹی تھی اور گھر میں بھی کوئی نماز کے لئے نہیں رہتا تھا سارے مسجد میں آتے تھے اور نجاست بھی بہت ساری جگہوں پر ہوتی تھی جیسا کہ فرمایا: **تبول وتقبل وتدبر** کیونکہ یہ جملہ استعمال میں تکرار کا فائدہ دیتا ہے جو ان کتوں سے ہوتا تھا یا اس لئے کہ یہ مسجد کو ناپاک حالت میں باقی رکھنا ہے جو کہ مسجد کو صاف پاک رکھنے کے امر کے منافی ہے، پس خشک ہونے سے زمین کا پاک ہونا ثابت ہو گیا۔

بخلاف آپ ﷺ کے پانی بہانے کے امر کے (جو اس مذکورہ حدیث میں ہے) وہ اس لئے تھا کہ یہ واقعہ دن میں پیش آیا

اور ممکن ہے کہ زمین نماز کے وقت سے پہلے خشک نہ ہوسکتی ہو اس لئے پانی بہانے کا حکم دیا، بخلاف رات کی مدت میں یا اس لئے یہ ارشاد فرمایا کہ اس وقت نماز کا وقت تھا یا اس وقت دونوں طہارتوں میں سے اکمل کا ارادہ فرمایا جو اس وقت آسانی سے میسر تھی۔ خوب سمجھ لو۔

اور جب پانی سے زمین کو پاک کرنے کا ارادہ کرے تو اس پر تین مرتبہ پانی بہائے اور پاک کپڑے سے ہر بار خشک کرے اور اسی طرح اگر زمین پر بہت زیادہ پانی بہا دیا اور نجاست کا رنگ اور نہ ہی اس کی بو ظاہر ہوئی تو پھر بھی زمین پاک ہو جائے گی۔ ابن ہمامؒ کا کلام ختم ہوا۔

اور ابن حجرؒ نے اس حدیث (کانت الکلاب تبول وتقبل وتدبر......) کے عجیب قسم کے جوابات، عجیب وغریب عبارات کے ساتھ دیے ہیں ان کو یہاں ذکر کرنے میں حرج نہیں ہے۔

فرماتے ہیں اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ حدیث: کانت الکلاب تبول وتقبل وتدبر فی السجد کے اندر فی المسجد میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ یہ تبول سے متعلق ہے اور یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ یہ صرف تقبل سے متعلق ہو (یعنی کتے پیشاب کرتے اور اس کے بعد مسجد میں آتے جاتے) پس یہ حدیث اس احتمال کی بناء پر خصم کے لئے دلیل صریح نہیں ہوگی اور اگر یہ مان بھی لیں کہ ''فی المسجد'' کا تعلق سب سے ہے جیسا کہ یہی قاعدہ ہے تو پھر پانی نہ پھینکنے میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ محل نجاست مخفی تھی معلوم نہ تھی اور اگر یہ بھی مان لیں تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ کتوں کے قتل کرنے سے پہلے کا حکم ہے اور اگر یہ بھی مان لیں کہ یہ بعد ہی کا حکم ہے تو پھر پانی کا نہ پھینکنا یہ طہارت کو مستلزم نہیں بلکہ یہ معافی کو مستلزم ہے لہٰذا اس میں زمین کے خشک ہونے سے اس کے پاک ہونے کے قائلین ہیں، کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے۔

اور شرح مشارق میں ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے امام شافعیؒ نے ناپاک زمین کے کثرت سے پانی بہانے سے پاک ہونے پر دلیل پکڑی ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ پانی کا بہانا اس کی بو سے سکون حاصل کرنے کے لئے ہو نہ کہ تطہیر کے لئے بلکہ تطہیر زمین کے خشک ہونے سے حاصل ہو جاتی ہے اس حدیث کی وجہ سے زکاۃ الارض یبسها زمین کی پاکی اس کا خشک ہونا ہے۔

یا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں یہ مروی ہے کہ اس جگہ میں (جہاں اس دیہاتی نے پیشاب کیا) پانی کے گزرنے کا سوراخ وراستہ تھا، پس اس صورت میں پانی اس پر جاری ہوگا۔

لیکن علامہ زرکشیؒ نے فرمایا ہے کہ زکاۃ الرض یبسها والی حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے یہ تو محمد بن الحنفیہ کا قول ہے ابن جریر نے اس کو تہذیب الاثار میں نقل کیا ہے اور سیوطیؒ نے فرمایا ہے کہ ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں ان سے روایت کی ہے اور اسی طرح ابن ابی شیبہ نے ابوجعفر سے اور ابوقلابہ سے بھی ان کے قول کو نقل کیا ہے اور ابوجعفر سے مراد الباقر ابو الصادق ہے۔

فانما بعثتم: جب وہ مبعوث کے پیروکار تھے تو ان کو بعث کے ساتھ موصوف کیا گیا۔ (میسرین) یہ حال ہے۔

ولم تبعثوا معسرین :یہ پچھلے جملہ پر بطریق طرد وعکس کے عطف ہے یسرو (آسانی) میں مبالغہ کرتے ہوئے علامہ طیبیؒ نے یہ فرمایا ہے اے اُمت محمدیہ! تم پر آسانی لازم ہے۔[طرد وعکس کا معنی ہے کہ جامع مانع انداز سے یہ ماقبل والے جملے پر عطف ہے]

مساجد عبادت کے لئے ہیں

۴۹۲:وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ فِی الْمَسْجِدِ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ اِذْ جَاءَ اَعْرَابِیٌّ فَقَامَ یَبُوْلُ فِی الْمَسْجِدِ فَقَالَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ مَہْ مَہْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَا تُزْرِمُوْہُ دَعُوْہُ فَتَرَکُوْہُ حَتّٰی بَالَ ثُمَّ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ دَعَاہُ فَقَالَ لَہٗ اِنَّ ھٰذِہِ الْمَسَاجِدَ لَا تَصْلُحُ لِشَیْءٍ مِنْ ھٰذَا الْبَوْلِ وَالْقَذَرِ اِنَّمَا ھِیَ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَالصَّلٰوۃِ وَقِرَاءَ ۃِ الْقُرْاٰنِ اَوْ کَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ قَالَ وَاَمَرَ رَجُلًا مِّنَ الْقَوْمِ فَجَآءَ بِدَلْوٍ مِنْ مَآءٍ فَشَنَّہٗ عَلَیْہِ . (متفق علیہ)

أخرجه البخاری مختصرًا فی صحیحه ۱/۳۲۲حدیث رقم ۲۱۹۔ أخرجه مسلم بلفظه فی الصحیح ۱/۲۳۶حدیث رقم (۹۹۔۲۸۴)۔والترمذی فی السنن ۱/۲۷۶حدیث رقم ۱۴۸ذکر اسناده الی أنس ثم قال نحو حدیث أبی هریرة والنسائی نحوه فی السنن ۱/۴۸حدیث ۵۳۔۵۴۔ والدارمی مختصرًا ۱/۲۰۵حدیث ۷۴۰۔وأحمد فی مسنده ۳/۱۱۰۔

ترجمہ حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک دیہاتی آیا اور مسجد میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر صحابہ کرام نے کہا: ٹھہر جا! ٹھہر جا! یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس کا پیشاب نہ روکو۔ بلکہ اس کا پیشاب رک گیا تو اس کو تکلیف ہوگی۔ جب وہ اعرابی پیشاب سے فارغ ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو بلایا اور انتہائی مشفقانہ انداز سے اس کی اصلاح کی کہ یہ مساجد پیشاب اور گندگی وغیرہ کے لئے نہیں ہیں بلکہ مسجدیں تو اللہ تعالیٰ کے ذکر' نماز اور قرآن کی تلاوت کے لئے ہیں یا آپ ﷺ نے اس کے مثل اور الفاظ فرمائے۔ راوی کو اس میں شک ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حاضرین مجلس میں سے ایک آدمی کو حکم دیا۔ اس نے ایک ڈول پانی لا کر اس پیشاب پر بہا دیا۔

تشریح: مه :''میم'' کے فتحہ اور ''ھاء'' کے سکون کے ساتھ یہ اسم فعل ہے۔ جو ''اکفف'' کے معنی میں ہے اس کو مکرر ذکر کرنے میں تاکید ہے اور تہدید میں زیادتی مقصود ہے مه مه کو جب ملا کر پڑھا جائے تو مؤنث پڑھیں گے۔ کہا جاتا ہے: مهمهت به ای زجرته۔

فقال رسول الله ﷺ لا تزرمو :یہ ''تاء'' کے ضمہ ''زاء'' کے سکون اور ''راء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے معنی یہ ہے کہ تم اس آدمی پر اس کے پیشاب کو نہ کاٹو کیونکہ پیشاب رُکے گا تو اس کو تکلیف ہوگی یا نجاست ایک جگہ کی بجائے مسجد کے اندر کئی جگہوں میں پھیل جائے گی۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے: زرم البول کا مطلب یہ ہے کہ سبب پیشاب بند ہو جائے اور ''ازرم'' یہ

متعدی ہوگا کہ دوسرا پیشاب کرنے سے روکے۔

ثم ان رسول ﷺ دعاہ: یعنی دیہاتی کو بلایا تا کہ اس کو مسجد کے حقوق جو ضروری ہیں وہ اچھے اور لطیف انداز سے سکھلا دیں۔

ان ھذہ المساجد: یہ اشارہ تعظیم کے لئے ہے اور مساجد جمع کے ساتھ اس لئے لائے ہیں تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ یہ حکم صرف آپ ﷺ کی مسجد کے ساتھ خاص ہے باقی مساجد کے لئے نہیں ہے۔

لشی من ھذا البول: یہ اشارہ تحقیر کے لئے ہے۔

والقذرہ: ''ذال'' کے فتحہ کے ساتھ وہ چیز کہ جس سے طبیعت گھن کھائے اور نفرت کرے جیسا کی نجاستیں اور بدبودار اشیاء اور اس کا بول کے بعد ذکر کرنا یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے ابن الملکؒ نے یہ فرمایا ہے۔

اور ایک نسخہ میں ''ذال'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

او کما قال رسول اللہ ﷺ: یہ شک راوی کی طرف سے ہے اور یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو اس پر دلالت کرے کہ شک حضرت انسؓ کی طرف سے ہے جیسا کہ ابن حجرؒ نے وہم کیا ہے یعنی مطلب اس کا یہ ہے کہ یہ قول یا اس کے فعل کے مشابہہ بات کہی۔

فسنہ: ''سین'' کے ساتھ اور ایک نسخہ میں ''شین'' کے ساتھ ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے: **سنت الماء علی وجھی** کا معنی یہ ہے کہ جب تو پانی کو بغیر بکھیرنے کے ڈالے، پس جب تو بکھیر کے ڈالے تو اس میں ''شین'' کے ساتھ **شنت الماء** پڑھیں گے جیسا کہ صحاح میں ہے۔ اور اسی طرح نہایہ اور قاموس میں ہے اور یہ مقام پہلے معنی کے مناسب ہے۔

(متفق علیہ): سید جمال الدینؒ نے فرمایا کہ اس میں نظر و تامل ہے اس لئے کہ صاحب تخریج المصابیح نے اس حدیث کو مسلم کی طرف منسوب کیا ہے نہ کہ بخاری کی طرف۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں اور اسی حدیث کے معنی میں پہلی گزری ہوئی حدیث بھی ہے جو کہ بخاری کی روایت ہے گویا مذکورہ روایت الفاظ کے اعتبار سے مسلم کی روایت ہے اور معنی میں بخاری کی بھی ہے۔

دَمِ حیض سے طہارت کس طرح حاصل کی جائے؟

۴۹۳: وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ اَبِیْ بَكْرٍ قَالَتْ سَأَلَتِ امْرَأَةٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَأَيْتَ اِحْدَانَا اِذَا اَصَابَ ثَوْبَهَا الدَّمُ مِنَ الْحَيْضَةِ كَيْفَ تَصْنَعُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَصَابَ ثَوْبَ اِحْدَاكُنَّ الدَّمُ مِنَ الْحَيْضَةِ فَلْتَقْرُصْهُ ثُمَّ لِتَنْضَحْهُ بِمَآءٍ ثُمَّ لِتُصَلِّ فِيْهِ. (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱/۴۱۰حدیث رقم ۳۰۷۔ وأخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۲۴۰حدیث (۱۱۰۔۲۹۱) وأخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۲۵۵حدیث رقم ۳۶۱۔وأخرجه الترمذی فی السنن ۱/۲۵۴ حدیث ۲۹۵۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۱۷۸حدیث رقم ۵۳۶۔ وأخرجه أحمد فی المسند ۶/۱۴۲۔

ترجمہ: حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ پوچھا کہ اے اللہ کے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتائیے کہ اگر ہم میں سے کسی خاتون کے کپڑے پر حیض کا خون لگ جائے۔ تو پھر وہ عورت کیا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی عورت کے کپڑے پر دم حیض لگ جائے تو پہلے اس کو کھرچ لے اور پھر پانی سے دھولے۔ پھر اس کپڑے میں نماز پڑھے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **وعن اسماء بنت ابی بکر قالت: سالت امرء ة رسول الله ﷺ**: اور امام شافعیؒ کی روایت میں ہے **عن سفیان بن عیینه عن هشام** اس روایت میں یہ ہے کہ حضرت اسماءؓ ہی سائلہ تھیں اور امام نوویؒ نے یہاں عجیب بات کہی ہے اور اس روایت کو بلا کسی دلیل کے ضعیف قرار دیا ہے حالانکہ یہ روایت صحیح الاسناد ہے اور یہ کوئی بعید نہیں ہے کہ راوی اپنی ذات کو مبہم رکھے جیسا کہ ابو سعید خدریؓ کی حدیث میں ہے جس میں فاتحہ کے ساتھ دَم کرنے کا ذکر ہے (اس میں بھی انہوں نے اپنے کو مبہم رکھا ہے) اسی طرح میرک شاہؒ نے شیخ ابن حجرؒ سے نقل کیا ہے۔

ارایت احدانا: یہاں مضاف محذوف ہے **ای اخبرنی فی حال احدانا**۔

اذا اصاب ثوبها الدم من الحیضة : **الحیضه** ''حاء'' کے کسرہ کے ساتھ یعنی حیض کا خون۔ صاحب تخریج نے فرمایا ہے کہ یہ ''حاء'' کے فتحہ کے ساتھ ہے اس کا معنی ہے حیض۔ اور کسرہ کے ساتھ وہ کپڑا کہ جس کو حیض میں عورت لنگوٹ بناتی ہے اور حدیث کے اندر دونوں کا احتمال ہے اور مشہور روایت میں کسرہ کے ساتھ ہے اسی طرح سیدؒ نے ذکر کیا ہے۔

ابن الملکؒ نے فرمایا ہے یہ ''حاء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے مراد کپڑا ہے اور کبھی یہ حیض سے اسم ہوتا ہے اور کبھی حیض کی کسی نوع کا نام ہوتا ہے اور ان دونوں کے درمیان سابقہ قرائن سے فرق کیا جائے گا اور حیضہ فتحہ کے ساتھ ''مرۃ'' کے معنی میں ہے سائلہ کی مراد یہ ہے کہ اس کو حیض کے خون میں سے کچھ لگ جاتا ہے۔

کیف تصنع: یہ استخبار سے متعلق ہے **ای اخبرنا کیف نصنع احدانا**۔

اذا اصاب ثوب احداکن الدم من الحیغه: ثوب کا ذکر یہاں تقید کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ واقع کی موافقت کی وجہ سے ہے پس حکم ''ثوب'' اور ''غیر ثوب'' میں مختلف نہیں ہوگا۔

فلتقرصه: ''راء'' کے ضمہ اور ''صاد'' کے ساتھ ہے۔

ثم لتنضحه: ''لام'' کے کسرہ اور سکون کے ساتھ اور ''ضاد'' کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ۔ شمس العلوم میں مذکور ہے کہ **نضح** فتحہ کے ساتھ اور **ینضح** فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے یعنی ''پانی کا چھڑکنا''۔ نہایہ میں لکھا ہے کہ ''قرص'' کہتے ہیں انگلیوں اور ناخنوں کے سروں سے مَلنا اور ساتھ پانی بھی بہانا یہاں تک کہ اس کا اثر چلا جائے اور یہ خون کے دھونے میں ابلغ ہے اور نضح کا استعمال پانی کو آہستہ آہستہ بہانے میں ہوتا ہے اور یہی یہاں مراد ہے۔ علامہ طیبیؒ نے یہی کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کھرچنا اس لئے ہے کہ پانی کا چھڑکاؤ خون کے اثر کے باقی رہنے کے ساتھ مزید نجاست میں اضافہ کرتا ہے۔ اس لئے کہا کہ اس کو کھرچو پھر دھولو۔

اور ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنے ہاتھ کے ذریعے سختی کے ساتھ دھونے سے پہلے صاف کرو یہاں تک کہ وہ خون جو لگا ہوا ہے وہ بکھر جائے پھر اس کو دھوؤ پانی کے ساتھ اس طرح کہ اس پر تھوڑا تھوڑا کر کے پانی بہاؤ یہاں

تک کہ اس حیض کے خون کا اثر چلا جائے نجاست کو زائل کرنے کیلئے تخفیف کرتے ہوئے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس بات کی تائید ایک دوسری روایت سے بھی ہوئی ہے جس کے یہ الفاظ ہیں: حتیه ثم اقرصیه۔ لیکن اس سے وہ صورت مستثنیٰ ہوگی کہ جب اس کا زائل کرنا مشکل ہو حضور ﷺ کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ آپ ﷺ سے خون کے اثر کے باقی رہنے کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پانی تیرے لئے کافی ہے اس کا اثر تیرے لیے مضر نہیں ہے۔ یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے لیکن ایک جماعت کے اس روایت کو نقل کرنے سے وہ درجہ قوت میں چلی گئی۔

روایت یہ ہے کہ حضور ﷺ سے ایک عورت نے حیض کے خون کے بارے میں سوال کیا کہ وہ اس کو دھوتی ہیں لیکن اس کا اثر باقی رہتا ہے فرمایا یہ تیرے لئے کافی ہے اس کا اثر تیرے لئے مضر نہیں ہے۔

ثم لتصل فيه :یعنی اس کپڑے میں کیونکہ دھونے کے بعد اس میں کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کہ خون کے رنگ کا زائل کرنا مشکل ہوتا ہے۔

علامہ خطابی نے فرمایا ہے اس حدیث میں دلیل ہے کہ نجاست کو زائل کرنے کے لئے پانی ہی متعین ہے اس لئے کہ حضور ﷺ نے دَمِ حیض کو اسی کے ذریعے زائل کرنے کا حکم دیا اور نجاستوں کے درمیان اجماعاً کوئی فرق نہیں ہے اور اس بات میں یہ ملحوظ رہے کہ یہاں پانی کی تعین بطریق حصر نہیں ہے بلکہ اس کا ذکر بطور واقعی اکثری کے ہے یعنی اکثر اور اغلب ازالہ پانی ہی سے کیا جاتا ہے یا اس پر وہ چیز قیاس کریں گے جو اس کے معنی میں ہے یعنی مائع مزیل۔

منی سے طہارت کا حکم

۴۹۴:وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ قَالَ سَأَلْتُ عَآئِشَةَ عَنِ الْمَنِيِّ يُصِيبُ الثَّوْبَ فَقَالَتْ كُنْتُ اَغْسِلُهُ مِنْ ثَوْبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَيَخْرُجُ اِلَى الصَّلَاةِ وَاَثَرُ الْغَسْلِ فِيْ ثَوْبِهِ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخارى فى صحيحه ۳۳۲/۱حديث رقم ۲۳۰۔وأخرجه مسلم فى صحيحه ۲۳۹/۱حديث (۱۰۸۔۲۸۹)۔وأخرج أبوداؤد نحوه ۲۶۰/۱حديث رقم ۳۰۳وكذلك النسائى فى السنن ۱۵۶/۱حديث ۲۹۵۔ وأخرجه ابن ماجة فى السنن ۱۷۸/۱حديث رقم ۵۳۶۔ وأخرجه أحمد فى المسند ۱۴۲/۶۔

ترجمہ : حضرت سلیمان بن یسارؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے کپڑے پر لگی ہوئی منی کے بارے میں مسئلہ پوچھا۔ تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے کپڑے سے منی کو دھویا کرتی تھی چنانچہ جب آپ ﷺ نماز کے لئے تشریف لے جاتے تھے تو اس کپڑے پر دھونے سے رطوبت کا نشان باقی ہوتا تھا۔

(بخاری و مسلم)

راویٔ حدیث:

سلیمان بن یسار۔ یہ سلیمان بن یسار ہیں۔ ان کی کنیت ''ابوایوب'' ہے۔ یہ میمونہ زوجہ نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ

ہیں۔ان کے بھائی عطاء بن یسار ہیں۔اہل مدینہ سے ہیں۔بڑے درجہ کے تابعین میں سے ہیں۔یہ فقیہ' فاضل' قابل اعتماد' عابد' پرہیز گار اور حجۃ تھے (یعنی ان کی طرف کسی قول کا منسوب ہونا مستقل دلیل تھی) فقہائے سبعہ میں سے ہیں۔۱۰۷ھ میں ان کا انتقال ہوا جب کہ ان کی عمر تہتر سال کی تھی۔

تشریح: عن المنی یصیب الثوب :یہ جملہ یصیب الثوب حال اور صفت دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔

واغسله من ثوب رسول الله...... :ابن الملک ؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں منی کے ناپاک ہونے کی دلیل ہے اور یہی امام ابوحنیفہ ؒ اور امام مالک ؒ کا مذہب ہے۔

ملا علی قاری ؒ فرماتے ہیں۔شاید کہ امام شافعی اور امام احمد اس دھونے کو گندگی سے پاکی حاصل کرنے پر محمول کرتے ہیں پس یہ نظافت کے قبیل سے ہوگا اور اس کو نسیان پر محمول کرنا انتہائی بعید ہے حالانکہ "کنت" کا لفظ جو تکرار اور دوام پر وضعاً یا عرفاً دلالت کرتا ہے وہ اس نسیان کے قول کے خلاف ہے۔

اور ابن حجر ؒ نے یہاں عجیب بات کی ہے کہ ہمارے نزدیک حضرت عائشہ ؓ کا دھونا احتیاط پر محمول ہے کیونکہ منی ہمارے نزدیک پاک ہے کیونکہ اس جیسی بات (کہ یہ نسیان پر محمول ہے) سیدہ عائشہ ؓ کے حق میں نہیں کہی جا سکتی۔غور سے سمجھ لو۔

۴۹۵ :وَعَنِ الْاَسْوَدِ وَهَمَّامٍ عَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اَفْرُكُ الْمَنِيَّ مِنْ ثَوْبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٢٣٨/١ حديث (١٠٦-٢٨٨)-وعن همام أخرجه أبوداؤد ٢٥٩/١ حديث ٣٧١- وعن الأسود أخرجه أيضاً ٢٦٠/١ حديث ٣٧٢ وأخرجه الترمذي فقط عن همام ١٩٨/١ حديث ١١٦-وأخرجه النسائي عن همام ١٥٦/١ حديث ٢٩٨- وعن الأسود أيضاً ١٥٦/١ حديث رقم ٣٠٠-وأخرجه ابن ماجة في السنن ١٧١/١ عن همام الحديث ٥٣٧ وعن الأسود الحديث ٥٣٩- وأحمد في مسنده عن الأسود ٢١٣/٦ وعن همام ١٣٥/٦-

ترجمه : "حضرت اسود اور حضرت ہمام ؒ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے کپڑے سے خشک منی کو کھرچ دیا کرتی تھی۔اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔"

راویٔ حدیث:

ہمام بن الحارث۔یہ ہمام ہیں۔حارث کے بیٹے ہیں' نخعی اور تابعی ہیں۔ابن مسعود ؓ اور عائشہ ؓ اور دوسرے صحابہ ؓ سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے ابراہیم نخعی نے روایت کی۔

الاسود۔یہ "اسود بن ہلال محاربی" ہیں عمر معاذ اور ابن مسعود ؓ سے روایت کرتے تھے اور سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے۔۸۴ھ میں وفات ہوئی۔امام طیبی ؒ فرماتے ہیں: اسود نخعی ہیں۔ابراہیم نخعی کے ماموں ہیں آنحضرت ﷺ کا زمانہ پایا' لیکن زیارت کی سعادت حاصل نہ کر سکے البتہ خلفائے راشدین کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔

تشریح: وهمام :تشدید کے ساتھ ابن حارث نخعی ہیں اور یہ تابعی ہیں۔طیبی ؒ نے اس طرح ذکر کیا ہے اور صاحب

مشکوٰۃ نے یہ زیادتی نقل فرمائی ہیں کہ انہوں نے حضرت ابن مسعودؓ حضرت عائشہؓ وغیرہما صحابہ سے روایت سنی ہے ان سے ابراہیم نخعی نے روایت کی ہے۔

افرك :''راء'' کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ دونوں منقول ہے۔ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ فرک کہتے ہیں ملنا رگڑنا یہاں تک کہ کپڑے سے اثر چلا جائے۔ شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ منی طاہر ہے اور اصحاب رائے کے نزدیک ناپاک ہے''تر'' کو ان کے نزدیک دھویا جائے گا اور خشک کو رگڑا جائے گا اور جن حضرات نے منی کو پاک کہا ہے انہوں نے یہ کہا ہے کہ دھونے والی حدیث وہ فرک کی روایت کے خلاف نہیں ہے اور دھونا وہ بطور استحباب اور نظافت کے ہے یعنی یہ کپڑے کو رینٹ اور نجاست سے دھونے کی طرح ہے اور دو حدیثیں جب ان دونوں کا استعمال ممکن ہو تو ان دونوں کو تناقض پر محمول کرنا جائز نہیں ہے۔

شوافع حضرات کی دلیل کا خلاصہ اس مذکورہ حدیث سے یہ ہے کہ اگر منی ناپاک ہوتی تو پھر کھرچنا اس کے لئے کافی نہ تھا۔

اور حنفیہ کی دلیل صحیح ابی عوانہ میں حضرت عائشہ کی روایت ہے فرماتی ہیں: **كنت افرك المنى من ثوب رسول الله ﷺ اذا كان يبسا وامسحه او اغسله** (اس میں حمیدیؒ نے شک کیا ہے) **اذا كان رطبا** اور دارقطنی نے **واغسله** نقل کیا ہے بغیر شک کے اور یہ حضرت عائشہ کا فعل ہے (کہ جب منی خشک ہوتی تو رگڑ دیتی تر ہوتی تو دھودیتیں) اور ظاہر یہ ہے کہ حضور ﷺ کو بھی اس کا علم تھا خصوصاً جب یہ فعل حضرت عائشہؓ سے متعدد بار صادر ہوا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ حضور ﷺ کی کپڑے کی طہارت اور اس کے حال کے بارے میں تحقیق کرنے کی طرف توجہ بھی ہوئی تھی، تو پس اگر منی طاہر ہوتی تو حضور ﷺ حضرت عائشہ ؓ کو بغیر ضرورت کے پانی ضائع کرنے سے روک دیتے۔

اور تحقیق دارقطنی نے حضرت عمار بن یاسرؓ سے روایت کی ہے فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ میرے پاس آئے اور میں کنوئیں سے ڈول نکال کر چھاگل کو بھر رہا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا اے عمار! کیا کر رہے ہو؟ میں نے کہا اے اللہ کے رسول میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں ناک کی ریزش (رینٹ) کے لگنے کی وجہ سے کپڑے کو دھو رہا ہوں فرمایا اے عمار کپڑے کو پانچ چیزوں کے لگنے کی وجہ سے دھویا جائے گا: ① پائخانہ، ② پیشاب، ③ قئی، ④ خون اور ⑤ منی۔ اے عمار! تیرے ناک کی ریزش (بلغم کھنکار وغیرہ) اور تیرے آنسو اور وہ پانی جو تیرے اس چمڑے کے برتن میں ہے یہ سارے برابر ہیں۔

اور باقی حضرت ابن عباسؓ کی روایت کہ حضور ﷺ سے منی کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ تو تھوک اور ناک کی رینٹ کی طرح ہے تیرے لئے یہ کافی ہے کہ تو اس کو کسی چھوٹے سے کپڑے سے پونچھ دے یا اذخر گھاس کے ساتھ پونچھ دے۔ اس روایت کو اگر صحیح مان لیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس روایت کے معارض ہے جو ہم نے پہلے بیان کی اور اس روایت کو ترجیح ہوگی کیونکہ مُحرِم مبیح پر مقدم ہوتی ہے۔ یہ ابن ہمامؒ کے کلام کا خلاصہ ہے۔

۴۹۶ : **وبرواية عَلْقَمَةَ وَالْاَسْوَدُ عَنْ عَآئِشَةَ نَحْوَهٗ ثُمَّ يُصَلِّي فِيْهِ۔**

ترجمہ : ''اور حضرت علقمہؒ اور حضرت اسود کی روایت کی طرح ایک روایت نقل کی ہے اور اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ پھر آپ اس کپڑے میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے''۔

وبرواية علقمة والاسود عن عائشه نحوه :یعنی مسلم کی روایت کی طرح ہے اور اس کے ہم معنی ہے نحوه یہ مرفوع ہے اس طرح کہ یہ مبتدا ہے اور جار مجرور خبر مقدم ہے اور عن عائشہ یہ بروایہ سے متعلق ہے۔

تشریح: ثم يصلى فيه :یعنی اس کپڑے میں اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے فيصلى فيه اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے فرماتی ہیں: كنت افرك المنى من ثوب رسول الله ﷺ وهو يصلى فيه۔

اور امام نوویؒ نے یہاں عجیب بات کی ہے انہوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور ابن حجرؒ نے اس بات سے معذرت کرتے ہوئے کہا ہے کہ امام نوویؒ نے گویا اس حدیث کو دیکھا نہیں ہے۔

شیر خوار بچے کے پیشاب کا حکم

۴۹۷: وَعَنْ اُمِّ قَيْسٍ بِنْتِ مِحْصَنٍ اَنَّهَا اَتَتْ بِابْنٍ لَهَا صَغِيْرٍ لَمْ يَاْكُلِ الطَّعَامَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَاَجْلَسَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِىْ حِجْرِهٖ فَبَالَ عَلٰى ثَوْبِهٖ فَدَعَا بِمَآءٍ فَنَضَحَهٗ وَلَمْ يَغْسِلْهُ. (متفق عليه)

أخرجه البخارى فى الصحيح ۳۲۶/۱ حديث رقم ۲۲۳۔وأخرجه مسلم فى الصحيح ۲۳۸/۱ حديث (۱۰۳۔۲۸۷)۔وأخرجه أبوداوٗد فى السنن ۲۶۱/۱ حديث رقم ۳۷۴۔والترمذى فى السنن ۱۰۴/۱ حديث رقم ۷۱۔ وأخرجه النسائي فى السنن ۱۵۷/۱ حديث رقم ۳۰۲ وأخرجه ابن ماجة فى السنن ۱۷۴/۱ حديث رقم ۵۲۴۔ وأخرجه الدارمى فى السنن ۲۰۶/۱ حديث رقم ۷۴۱۔وأخرجه مالك فى الموطا فى كتاب الطهارة الحديث ۱۱۰۔ ۶۴/۱ وأحمد فى مسنده ۳۵۰/۶۔

ترجمہ: ”حضرت ام قیس بنت محصن سے روایت ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بچے کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئیں۔ جس نے ابھی تک کھانا شروع نہیں کیا تھا بلکہ شیر خوار تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس بچہ کو اپنی گود میں بٹھایا۔ اس نے آپ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا آپ ﷺ نے پانی منگوایا اور کپڑوں پر بہا دیا اور اچھی طرح مل کر نہیں دھویا۔“ (بخاری ومسلم)

راویٔ حدیث:

امّ قیس بنت محصن ۔ یہ ”ام قیس“ محصن کی بیٹی ہیں۔ (محصن میں میم مکسور حاء ساکن اور نون ہے) بنو اسد میں سے ہیں۔ عکاشہ بن محصن اسدی کی بہن ہیں بہت پہلے مکہ میں مسلمان ہو چکی تھیں۔ آنحضرت ﷺ سے بیعت ہوئیں۔ پھر مدینہ کی جانب ہجرت کی۔ اھ یہی وہ صحابیہ ہیں جو اس حدیث :من كانت هجرته لدنيا يصيبها أو امرأة تيزوجها کا سبب بنیں۔ چنانچہ جب انہوں نے ہجرت کی تو ان صاحب نے بھی ہجرت کی جو مہاجر ”ام قیس“ کہلاتے ہیں۔

تشریح: بابن لها صغير :یہ خبر کے ساتھ ”ابن“ کی صفت ہے۔

لم ياكل الطعام :یعنی وہ چیز کہ جس کو غذا کے طور پر استعمال کیا جائے دودھ کے علاوہ۔

فى حجره :”حاء“ کے کسرہ کے ساتھ ہے اور فتحہ بھی دیا جاتا ہے۔ شرح مشارق میں لکھا ہے کہ یہ ”حاء“ کے فتحہ اور کسرہ

کے ساتھ ہے مراد کپڑا اور گود ہے اور جب اس کے ساتھ مصدر مراد ہو پس اس صورت میں فتحہ ہوگا نہ کہ اس کے علاوہ اور کوئی۔ اور اگر اسم مراد ہو تو پھر کسرہ ہوگا نہ کہ اس کے علاوہ اور کوئی۔

فنضحه : یعنی پانی کو کپڑے پر بہایا یہاں تک کہ وہ اس پر غالب آ گیا۔

ولم يغسله : یعنی چھڑکنے اور مَلنے کے ساتھ دھونے میں مبالغہ نہیں کیا اس لئے کہ چھوٹا لڑکا وہ کھانا نہیں کھاتا تھا، پس اس کے پیشاب میں ایسی بدبو نہیں تھی کہ اس کو زائل کرنے میں مبالغہ کرنا پڑتا اور یہاں **لم يغسله** سے راوی نے یہ مراد نہیں لیا کہ انہوں نے ایک مرتبہ بھی نہیں دھویا بلکہ مراد یہاں پر یہ ہے کہ ان دونوں غسلین (دھونوں) میں فرق بیان کرنا ہے اور اس پر تنبیہ کرنا ہے کہ یہ دھونا دھونے سے کم ہوگا، پس ایک کو غسل اور دوسرے کو نضح سے تعبیر کیا اور لبابہ بنت الحارث والی روایت جو آئندہ آ رہی ہے وہ نضح کی علت کو ''اُم قیس'' والی اس مذکورہ روایت میں بیان کرتی ہے۔

اور راویہ کا یہ کہنا: **لم يأكل الطعام** یہ ایسی بات ہے کہ جس کو راویہ نے اپنی طرف سے گمان کیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے ہمارے بعض علماء نے اسی طرح فرمایا ہے۔

اور قاضیؒ نے فرمایا ہے کہ ''نضح'' سے مراد پانی کا چھڑکنا ہے اس طریقے سے کہ پانی پیشاب کے بہنے کی تمام جگہوں تک پہنچ جائے بغیر جاری ہونے کے اور ''غسل'' کہتے ہیں پیشاب سے متاثرہ جگہوں پر پانی کا بہانا۔

اور بچے اور بچی کے پیشاب میں فرق کرنے والی چیز وہ ہے کہ بچی کا پیشاب رطوبت کے غلبے کی وجہ سے اور اس کے مزاج میں برودت کے پائے جانے کی وجہ سے زیادہ گاڑھا اور بدبودار ہوتا ہے، پس اس کے زائل کرنے میں زیادہ مبالغے کی ضرورت ہے، بخلاف بچے کے پیشاب کے۔

اور خطابی نے فرمایا ہے۔ بچے کے پیشاب میں نضح کو جن لوگوں نے جائز قرار دیا ہے وہ جائز قرار دینا اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس کا پیشاب نجس نہیں ہوتا ہے بلکہ تخفیف کی وجہ سے ہے اور یہی صحیح ہے اور جس نے کہا ہے کہ ''بول الصبی'' طاہر ہے اس نے غلطی کی ہے۔

اور اس حدیث میں بچوں کو اہل فضل وکمال (علماء وفقہاء) کی طرف برکت حاصل کرنے کے لئے لے جانے کے مستحب ہونے کی دلیل ہے وہ بچے ابھی ولادت کی حالت میں ہوں یعنی چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں اور اس حدیث میں حسنِ معاشرت اور نرمی اور بچوں وغیرہ کے ساتھ تواضع کرنے کی ترغیب ہے۔ طیبیؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

مردار کی کھال کا حکم

۴۹۸: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا دُبِغَ الْاِهَابُ فَقَدْ طَهُرَ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فى صحيحه ۲۷۷/۱ حديث رقم (۱۰۵۔۳٦٦)۔ وأخرجه أبوداؤد فى السنن ۳٦۷/٤ حديث ٤۱۲۳۔ وأخرجه الترمذى فى السنن ۱۹۳/٤ حديث رقم ۱۷۲۸ وأخرجه النسائى فى السنن ۱۷۳/۷ حديث

۴۲۴۱۔ أخرجه ابن ماجة فى السنن۲/۹۳حديث رقم ۳۶۰۹وأخرجه مالك فى الموطا ۲/۴۹۸الحديث ۱۷ من كتاب الصيد۔وأخرجه الدارمى فى السنن ۲/۱۱۷حديث ۱۹۸۵۔أخرجه أحمد فى المسند۱/المسند ۱/۲۱۹۔

ترجمہ : ''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب چمڑے کو دباغت دی جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے۔اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''اھاب''ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے اور اس سے مراد وہ کھال ہے کہ جس کو دباغت نہ دی گئی ہو۔جلد غیر مدبوغ کو اہاب اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ زندہ کے لئے غلاف ہے اور اس کے جسم کی حفاظت کا سبب ہے جیسا کہ کھال کو عرب زبان میں ''مسك''بھی کہتے ہیں۔اس کے اپنے اندر والی چیز کو روکنے کی وجہ سے اور یہ کلام بطور تمثیل کے ذکر ہے۔

ابن الملکؒ نے فرمایا ہے یہ حدیث اپنے عموم کے ساتھ امام مالکؒ کے خلاف حجت ہے۔امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مردار کی کھال دباغت کے ساتھ پاک نہیں ہوتی اور اسی طرح یہ حدیث اپنے عموم کے ساتھ امام شافعیؒ کے خلاف دلیل ہے وہ کہتے ہیں کہ کتے کے کھال دباغت سے پاک نہیں ہوتی اور اس حدیث کے عموم سے آدمی کی کھال کا استثناء ہے بوجہ انسانیت کی تکریم کے اور خنزیر کی کھال کا استثناء ہے اس کی ذات کے نجس ہونے کی وجہ سے۔

اشرفؒ نے فرمایا ہے حضرت ابن عباسؓ کی''اہاب'' کے بارے میں حدیث کے اندر اور حضرت سودہؓ کی حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ کھال کا ظاہر اور باطن دباغت سے پاک ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا استعمال تر چیزوں میں بھی جائز ہے اور اس کے اوپر نماز پڑھنا بھی جائز ہے۔

ابن ہمامؒ نے فرمایا ہے کہ اس باب میں وہ حدیث بھی ہے جس کی تخریج دارقطنی نے کی۔ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: **استمتعوا بجلود المیتة اذا ھی دبغت ترابا کان او رمادا اوملحا او ماکان بعد ان یظھر صلاحه۔** ''کہ تم مردار کی کھالوں سے فائدہ حاصل کرو جب کہ اس کو دباغت دی گئی ہو وہ دباغت مٹی سے ہو یا راکھ سے یا نمک سے یا جو بھی ہو بعد اس کے اس کا صاف صحیح ہونا ظاہر ہو جائے یعنی جب وہ خشک ہو جائے اور اس کے اندر سے بدبو اور فساد نکل جائے''۔

۴۹۹ :وَعَنْهُ قَالَ تُصُدِّقَ عَلٰى مَوْلَاةٍ لِمَيْمُوْنَةَ بِشَاةٍ فَمَاتَتْ فَمَرَّبِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ هَلَّا اَخَذْتُمْ اِهَابَهَا فَدَ بَغْتُمُوْهُ فَانْتَفَعْتُمْ بِهٖ قَالُوْا اِنَّهَا مَيْتَةٌ فَقَالَ اِنَّمَا حُرِّمَ اَكْلُهَا۔ (متفق علیه)

أخرجه البخارى فى صحيحه ۱/۳۵۵حديث رقم ۱۴۹۲۔وأخرجه مسلم فى صحيحه ۱/۲۷۶حديث (۱۰۰۔۳۶۳) وأخرجه أبوداوٗد فى السنن ۴/۳۶۵حديث رقم ۴۱۲۰۔وأخرجه النسائى فى السنن ۷/۱۷۲حديث ۴۲۳۶وأخرجه ابن ماجة فى السنن ۲/۱۱۹۳حديث رقم۲/۱۱۹۳حديث رقم ۳۶۱۰۔وأخرجه الدارمى فى السنن ۲/۱۱۸حديث ۱۹۸۸۔ وأخرجه مالك فى الموطا ۲/۴۹۸الحديث ۱۶ من كتاب الصيد۔

ترجمہ : ''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت میمونہؓ کی آزاد کردہ باندی کو ایک بکری

صدقہ کی گئی۔ اتفاق سے وہ بکری مرگئی۔ رسول اللہ ﷺ اس بکری کے پاس سے گزرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم لوگوں نے اس کی کھال کیوں نہ اتار لی۔ اس کو دباغت دے کر اس سے فائدہ حاصل کرتے لوگوں نے عرض کیا یہ تو مردار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا صرف اس کا کھانا حرام ہے۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: **تصدق** : یہ مجہول کا صیغہ ہے ای **دفعت صدقه**۔

بشاة : یہ ''تصدق'' سے متعلق ہے۔

هلا : یہ تخصیض کے لئے ہے ای **لم لا**۔

میته : یعنی یہ ذبح نہیں کی ہوئی اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو کھال دباغت سے پاک ہوتی ہے وہ ذبح کرنے سے پاک ہو جاتی ہے جیسا کہ ہمارے علماء نے فرمایا ہے۔

فقال انما حرم اکلها : امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ ''**انما حرم**'' کو ہم نے دو طرح سے روایت کیا ہے: ① **حرم**: ''حاء'' کے فتحہ اور ''راء'' کا ضمہ۔ ② **حرِم**: ''حاء'' کا ضمہ اور ''راء'' مشددہ۔ سیدؒ نے اس کو نقل کیا ہے اور دوسری طرح اکثر نسخوں میں ہے اور آیت کے ساتھ مطابقت بھی اس میں زیادہ ظاہر ہے (**حرمت علیکم المیتة والدم**) الخ۔

ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ **حرم اکلها** سے مراد ہے مردار کا کھانا اور باقی اس کی کھال تو وہ دباغت سے پاک ہو جاتی ہے اور اس کو استعمال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کا استعمال تر چیزوں میں جائز ہے اور اس کے پانی سے وضوء کرنا اور اس کو پہن کر یا اوڑھ کر نماز پڑھنا اور اس کے اوپر نماز پڑھنا سب جائز ہے۔

اور شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں دلیل ہے ان لوگوں کے لئے جو اس بات کی طرف گئے ہیں کہ جانور کی وہ چیزیں جن کو کھایا نہیں جاتا مردار ہونے کی صورت میں اس سے نفع اٹھانا حرام نہیں ہے جیسے بال، دانت، سینگ وغیرہ اور علماء فرماتے ہیں کہ ان چیزوں کے اندر حیات نہیں ہوتی اس لئے حیوان کے مرنے سے یہ ناپاک نہیں ہوتیں اور علماء نے ہاتھی کے دانتوں کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ عاج (ہاتھی دانت) کی بیع میں کوئی حرج نہیں ہے۔

نہایہ میں لکھا ہے کہ بعض نے کہا ہے کہ ''عاج'' وہ ایسی شئی کو کہتے ہیں جو سمندری کچھوے کی کمر کی ہڈی سے بنائی جائے۔ اور ''عاج'' ہاتھی دانت کو بھی کہتے ہیں اور صاحب قاموس نے عاج کے بارے میں دوسرے معنی پر اقتصار کیا ہے اور قاموس میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت ثوبان کے لئے فرمایا: **اشتر لفاطمة سوارين من عاج** کہ فاطمہ کے لئے عاج کے دو کنگن خرید لاؤ۔

۵۰۰: وَعَنْ سَوْدَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ مَاتَتْ لَنَا شَاةٌ فَدَبَغْنَا مُسْكَهَا ثُمَّ مَازِلْنَا نُنْبِذُ فِيْهِ حَتّٰى صَارَ شَنًّا۔ (رواه البخاري)

أخرجه البخاري في صحيحه ٥٦٩/١١ حديث رقم ٦٦٨٦۔ وأخرجه النسائي في السنن ١٧٣/٧ حديث رقم ٤٢٤٠۔ وأخرجه أحمد في مسنده ٤٢٩/٦۔

ترجمه : ''حضرت سودہؓ جو کہ رسول اللہ ﷺ کی زوجہ مطہرہ ہیں ان سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ ہماری ایک بکری مرگئی

تھی ہم نے اس کی کھال اتار کر اس کو دباغت دی۔ اس میں ہمیشہ ہم نبیذ بناتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ پرانی ہو کر مشک ہوگئی۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

سودۃ۔ یہ سودۃ بنت زمعہ امّ المؤمنین ہیں۔ شروع زمانہ میں اسلام لے آئی تھیں اور اپنے چچا کے بیٹے سکران عمرو کے نکاح تھیں۔ جب ان کے شوہر کا انتقال ہوا تو ان سے رسول اللہ ﷺ نے نکاح کر لیا اور ان کے ساتھ مکہ میں خلوت ہوئی۔ یہ نکاح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے وفات کے بعد اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح سے پہلے ہوا۔ انہوں نے مدینہ ہجرت فرمائی۔ جب بوڑھی ہوگئیں تو آپ ﷺ نے چاہا کہ ان کو طلاق دے دیں تو آنحضرت ﷺ سے انہوں نے درخواست کی آپ ان کو طلاق نہ دیں اور سودہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری کا دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا' آپ ﷺ نے ان کو اپنے نکاح میں رکھا۔ ماہ شوال ۵۴ھ میں مدینہ میں انتقال کیا۔

تشریح: وعن سودة زوج النبی ﷺ: زوج النبی کہنا زیادہ فصیح ہے۔ زوجہ کے مراد ہونے پر قرینہ کے قیام کے وقت۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ [البقرة:۳۵] ''تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو'' (یہاں بھی زوج سے زوجہ مراد ہے قرینہ مذکر کے مقابلہ میں ذکر ہونا ہے)۔

مسك: ''میم'' کے فتحہ کے ساتھ ہے ای جلدها

اور کھال کو ''مسک'' اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ پانی وغیرہ جو اس کے اندر ہے اس کو گرنے سے روکتی ہے۔

مازلنا: ''زاء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ (ننبذ): ''باء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَآءٍ﴾ [الانفال:۵۸] ''تو (ان کا عہد) انہیں کی طرف پھینک دو (اور) برابر (کا جواب دو)'' اور سیدؒ کی اصل میں واقع ہوا ضمہ کے ساتھ، تو وہ قلم کی غلطی ہے یعنی لکھنے میں غلطی واقع ہوئی ہے۔

یعنی ہم اس میں پانی کو ڈالتے تھے۔ اور ابن الملکؒ نے فرمایا ہے اور ابن حجرؒ نے بھی ان کی پیروی کی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس میں کھجوروں سے نقیع بناتے تھے تاکہ پانی میٹھا ہو جائے (نقیع پانی میں کھجوریں ڈالنا) تو ان دونوں حضرات نے گویا نبذ کے ظاہر کو لے کر یہ معنی کیا ہے اور یہ لازم نہیں ہے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ: النبذ طرحك الشي امامك او وراءك او عام کہ نبذ کہتے ہیں کسی چیز کا سامنے یا پیچھے پھینکنا یا ''نبذ'' کا معنی پھینکنا عام ہے اور نبذ سے مراد پھینکا ہوا اور انگور یا کھجور کی نچوڑی ہوئی شراب۔

شنا: ''شین'' کے فتحہ اور ''نون'' کے ساتھ اس کا معنی ہے کہ پرانا مشکیزہ ہو گیا۔

اور بعض نے کہا ہے ''شن'' اس مشکیزے کو کہتے ہیں جس کا استعمال کرنا ممکن نہ رہا ہو۔ اور تورپشتی نے فرمایا ہے ''شنانٌ'' پرانے مشکیزوں کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع ''شن'' اور ''شنہ'' ہے اور پرانے مشکیزے پانی کو زیادہ ٹھنڈا کرتے ہیں نئے مشکیزوں کی بنسبت۔

حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً یہ روایت منقول ہے کہ: **طهور كل اديم دباغه** کہ ہر چمڑے کی دباغت اس کی طہارت ہے۔ابوبکرؒ نے غیلانیات میں اس کی تخریج کی ہے جیسا کہ علامہ سیوطیؒ نے اس کو جامع صغیر میں ذکر کیا ہے۔پس ابن حجرؒ کی یہ تعبیر کہ یہ صحیح حدیث ہے درست نہیں ہے۔الّا یہ کہ صحیح سے صحیح المعنی مراد لیا جائے لیکن یہ بھی اصطلاح محدثین کے خلاف ہے اس لئے کہ موضوع روایت بھی کبھی صحیح المعنی ہوتی ہے۔واللہ اعلم۔

الفصل الاول:

شیر خوار لڑکے اور لڑکی کے پیشاب میں فرق

۵۰۱ :عَنْ لُبَابَةَ بِنْتِ الْحَارِثِ قَالَتْ كَانَ الْحُسَيْنُ بْنُ عَلِيٍّ فِيْ حِجْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَبَالَ عَلٰى ثَوْبِهٖ فَقُلْتُ اِلْبَسْ ثَوْبًا وَّاَعْطِنِيْ اِزَارَكَ حَتّٰى اَغْسِلَهٗ فَقَالَ اِنَّمَا يُغْسَلُ مِنْ بَوْلِ الْاُنْثٰى وَيُنْضَحُ مِنْ بَوْلِ الذَّكَرِ (رواه احمد وابوداود وابن ماجة وفى روايةٍ لِاَبِىْ داود والنسائى عَنْ اَبِى السَّمْحِ قَالَ يُغْسَلُ مِنْ بَوْلِ الْجَارِيَةِ وَ يُرَشُّ مِنْ بَوْلِ الْغُلَامِ .)

أخرجه أبوداؤد فى السنن ۲٦۱/۱حديث رقم ۳۷۵۔وأخرجه ابن ماجة فى السنن ۱۷٤/۱حديث ۵۲۲۔ وأخرجه أحمد فى المسند ۳۳۹/٦۔

ترجمہ : ''حضرت لبابہ بنت حارثؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ حسین بن علیؓ نے رسول اللہ ﷺ کی گود میں بیٹھ کر آپ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا میں نے عرض کیا کہ آپ دوسرا کپڑا پہن کر یہ تہبند مجھے دیدیں تاکہ میں اس کو دھو ڈالوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ لڑکی کا پیشاب دھویا جاتا ہے۔لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑک دینا کافی ہے۔
اس حدیث کو امام احمدؒ، امام ابوداؤدؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

ام الفضل۔یہ ام الفضل لبابہ ہیں۔یہ خاتون ''حارث'' کی بیٹی اور خاندانی اعتبار سے بنو عامر سے ہیں۔حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبد المطلب کی بیوی اور ان کی اکثر اولاد کی ماں ہیں۔امّ المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی بہن ہیں۔کہا جاتا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد سب عورتوں سے پہلے یہی اسلام لائیں۔آنحضرت ﷺ سے بہت سی حدیثیں روایت کرتی ہیں۔

تشریح:البس ثوبا: البس ''باء'' کے فتحہ کے ساتھ ہے یعنی آپ قمیص یا اور کوئی دوسرا ازار باندھ لیں۔

انما يغسل:یعنی کپڑے کو ملنے کے ساتھ مبالغے کے طریقے سے دھونا، پانی بہا کر (یہ لڑکی کے پیشاب میں ہوتا ہے)۔

وينضح من بول الذكر:امام طحاویؒ نے فرمایا کہ ''بول الصبی'' میں نضح کے لفظ سے ''صب'' پانی کا بہانا مراد ہے کیونکہ هشام بن عروه عن ابيه عن عائشةؓ کی روایت میں یوں آیا ہے حضرت عائشہ فرماتی ہیں حضور ﷺ کے پاس ایک بچے کو لایا گیا اس بچے نے آپ ﷺ پر پیشاب کر دیا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس پر پانی بہاؤ۔امام طحاویؒ فرماتے ہیں اس حدیث

سے بچے کے پیشاب کا حکم معلوم ہوگیا کہ اس میں غَسل (دھونا) ہے ہاں البتہ بول الصبی میں پانی کا صرف بہانا ہی کافی ہو جاتا ہے یعنی نچوڑنے کی ضرورت نہیں ہے اور بچی کے پیشاب کا بھی حکم معلوم ہو گیا ہے کہ اس کو بھی دھونا ہے لیکن اس میں صرف پانی کا بہانا کافی نہیں ہے اس لئے کہ بچے کا پیشاب مخرج کے تنگ ہونے کی وجہ سے ایک جگہ میں ہوتا ہے اور بچی کا پیشاب مخرج کے کشادہ ہونے کی وجہ سے کئی جگہوں میں پھیل جاتا ہے۔

امام ابوداؤدؒ نے اس پر خاموشی اختیار فرمائی ہے اور امام منذریؒ نے بھی۔ سیدؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ جس کو امام ترمذیؒ نے حسن قرار دیا ہے: **ينضح من بول الصبي ويغسل من بول الجارية۔**

۵۰۲ :وَفِیْ رِوَايَةٍ لِاَبِیْ دَاوٗدَ وَالنِّسَائِیْ عَنْ اَبِی السَّمْحِ قَالَ يُغْسَلُ مِنْ بَوْلِ الْجَارِيَةِ وَ يُرَشُّ مِنْ بَوْلِ الْغُلَامِ۔(رواه احمد وابوداود وابن ماجة)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۲٦۱/۱حديث رقم ۳۷۵۔وأخرجه ابن ماجة في السنن ۱۷٤/۱حديث ۵۲۲۔ وأخرجه أحمد في المسند ۳۳۹/٦۔

ترجمہ : ''اور ابوداؤد ونسائی کی ایک روایت میں حضرت ابوسمح سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لڑکی کا پیشاب دھویا جاتا ہے اور لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکا جاتا ہے۔''

راویٔ حدیث:

ابوالسمح ۔ یہ ابوالسمح ہیں اور ان کا نام ''ایاد'' تھا۔ آنحضور ﷺ کے خادم تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے اپنی کنیت ہی سے زیادہ مشہور ہیں ''ایاد'' کسرۂ ہمزہ اور تخفیف یاء کے ساتھ ہے' ان کے انتقال کا مقام معلوم نہیں ہوسکا۔

تشریح:وفي رواية لابي داؤد والنسائي :والنسائیؒ مرفوع ہے ابن ماجہ پر عطف کی وجہ سے۔ میرک شاہؒ نے اسی طرح فرمایا ہے اور باقی تمام صحیح نسخوں میں ''جر'' کے ساتھ ہے اور یہی ظاہر ہے لیکن ''جر'' اس وقت صحیح ہوگی جب کہ نسائی شریف میں دو روایتیں ہوں جیسا کہ یہ بات مخفی نہیں ہے۔ پس اس صورت میں اگر نسائی کی دوسری روایت تھی مسند احمد وغیرہ کی طرح تو پھر صاحب مشکوٰۃؒ کے لئے یہ مناسب تھا کہ نسائی کا حوالہ پہلے ان دوسروں کے ساتھ بھی ذکر کرتے جیسا کہ ابوداؤد کا دو مرتبہ ذکر کیا ہے اور اگر امام نسائیؒ کی صرف ایک ہی روایت ہے ابی داؤد کی دوسری روایت کی طرح تو پھر رفع متعین ہوگا لیکن یہ رفع ابن ماجہ پر عطف کی وجہ سے نہیں ہوگا فصل بالاجنبی کے پائے جانے کی وجہ سے، بلکہ یہ مبتدا ہوگا اس اس کی خبر ''**كذلك**'' ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئُوْنَ .... ﴾ [المائدہ:٦٩] ''جو لوگ خدا پر اور روز آخرت پر ایمان لائیں گے اور عمل نیک کریں گے خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہودی یا ستارہ پرست یا عیسائی'' میں ''**صابئون**'' مرفوع ہے۔ واللہ اعلم۔

اور باقی ابن حجرؒ کا مصنف کے قول والنسائی کے بعد وابن ماجۃ وسندھما صحیح کہنا اس کی صحت اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں۔

عن ابی السمح: ان کا نام اِیاد ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کا نام ان کی کنیت ہے اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم ہیں۔ سیدؒ نے اس طرح فرمایا ہے۔

اور صاحب مشکوٰۃؒ نے فرمایا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اور اِیاد ہمزہ کے کسرہ اور ''یاء'' کی تخفیف کے ساتھ ہے اور یہ معلوم نہیں ہے کہ ان کی وفات کہاں ہوئی۔

یغسل من بول الجاریة ویرش من بول الغلام: میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ ابوالسمح کی روایت جو ابوداؤد میں ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

کنت اخدم النبی ﷺ وکان اذا اراد ان یغتسل قال ولنی فاولیه قفای فاستربه فاتی بحسن اوحسین فبال علی صدر یعنی موضعه من الثیاب فجئت اغسله فقال یغسل من بول الجاریة ویرش من بول الغلام۔'' فرماتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتا تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غسل فرمانے کا ارادہ ہوتا تو مجھے فرماتے کہ میرے لئے آڑ کرو پس میں ان کی طرف پشت کر کے پردہ کر دیتا۔ ایک مرتبہ حسن یا حسین رضی اللہ عنہما کو لایا گیا تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے پر پیشاب کر دیا پس میں کپڑے کو دھونے کے لئے آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بچی کے پیشاب کو دھویا جائے گا اور بچے کے پیشاب پر پانی چھڑکا جائے گا۔''

ابن الملکؒ نے فرمایا ہے: **یرش من بول الغلام** کا معنی یہ ہے کہ پانی اتنا چھڑکا جائے کہ پانی پیشاب سے زیادہ ہو جائے اور بعض نے کہا ہے کہ پانی اتنا ہو جائے کہ پیشاب کے برابر ہو اور حدیث کے ظاہر میں اس بات پر دلالت موجود ہے کہ بچے بچی کے پیشاب کے دھونے میں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ بچے کا پیشاب پتلا اور سفید ہوتا ہے اور بچی کا پیشاب زرد اور گاڑھا ہوتا ہے اور اس کی فرج کی رطوبت کے ملنے سے جو کہ نجس ہے اس پیشاب کی نجاست اور بڑھ جاتی ہے اور اس لئے بھی کہ مردوں کا مزاج عورتوں کے مقابلے میں زیادہ قوی ہوتا ہے اور عورتوں کے مزاج میں نرمی غالب ہوتی ہے۔ پس جو فضلات ان سے خارج ہوتے ہیں ان کو دھونے کی بھی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ نیز بچوں کے حق میں تخفیف کی ضرورت بھی ہے اس لئے کہ عام عادت یہی ہے کہ مجالس میں بچوں کو لایا جاتا ہے نہ کہ لڑکیوں کو۔

اور اس حدیث میں اشارہ ہے حضرت علی بن ابی طالب اور عطاء اور حسن بصری اور امام شافعیؒ و امام احمدؒ کے قول کی طرف۔

باقی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ ''بول الصبی'' اور ''بول الجاریہ'' کو دھویا جائے گا جیسا کہ دوسری ساری نجاسات غیر مرئیہ کو دھویا جاتا ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں اور یہی امام مالکؒ کا مذہب ہے اور امام احمدؒ نے فرمایا ہے کہ بچے کا پیشاب جب کہ وہ کھانا نہیں کھاتا، پاک ہے۔

راستے کی گندگی کا حکم

۵۰۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وَطِئَ اَحَدُکُمْ بِنَعْلِهِ الْاَذٰی فَاِنَّ التُّرَابَ لَهٗ طَهُوْرٌ۔ (رواہ ابوداود ولِاِبْنِ ماجة مَعْنَاهُ)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ۱/ ۲۲۷ حديث ۳۸۵۔

ترجمہ : ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی اپنے جوتوں کے ساتھ گندگی پر چلے تو مٹی اس کو پاک کر دینے والی ہے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور امام ابن ماجہ نے بھی اس کے مثل روایت نقل کی ہے۔''

تشریح: **اذا وطی** : ''طاء'' کے کسرہ اور اس کے بعد ہمزہ کے ساتھ ہے۔ **ای قرب مسح و اراس۔**

احدکم بنعله : اور اس کے معنی میں موزہ بھی ہے۔

الاذی : **ای النجاسة** مطلب یہ ہے کہ وہ ناپاک ہو جائے۔

له : یعنی تمہارے جوتے کیلئے اور ضمیر کو ''اذی'' کی طرف لوٹانے میں معنی کا فاسد ہونا لازم آتا ہے۔

طھور : **ای مطھر**۔ شرح السنۃ میں لکھا ہے اکثر اہل علم اس حدیث کے ظاہر کی طرف گئے ہیں اور انہوں نے فرمایا ہے کہ جب اکثر موزے یا جوتے کو نجاست لگ جائے، پس اس کو زمین کے ساتھ رگڑا یہاں تک کہ اکثر نجاست زائل ہوگئی تو وہ پاک ہو جائے گا اس میں نماز جائز ہے اور یہی امام شافعیؒ کا قول قدیم ہے اور قول جدید میں یہ ہے کہ دھونا بہر حال ضروری ہے پس وہ اس حدیث کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ خشک نجاست پر محمول ہے کہ جب چلنے سے وہ کپڑے کے ساتھ کچھ چمٹ جائے تو اس کو رگڑ کر مَل کر زائل کر دیا جائے جیسا کہ امام شافعیؒ نے حضرت اُم سلمہؓ کی آنے والی حدیث کی تاویل کی ہے کہ حضرت ام سلمہؓ کا سوال اس بارے میں تھا کہ اگر کپڑے کو کھینچا اس جگہ پر جہاں خشک گندگی ہو تو بسا اوقات اس میں سے کچھ کپڑے کے ساتھ چمٹ جاتی ہے، تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو جگہ اس کے بعد ہے وہ اس کو زائل کر دے گی۔ کیونکہ (یعنی یہ تاویل اس لئے کی ہے) اجماع اس بات پر منعقد ہے کہ جس چیز کو نجاست لگی ہو وہ دھونے کے علاوہ پاک نہیں ہوتی۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ان دونوں روایتوں کے درمیان بہت فرق ہے حضرت ام سلمہؓ کی روایت اپنے ظاہر کے اعتبار سے اجماع کے خلاف ہے اس لئے کہ کپڑا دھونے کے بغیر پاک نہیں ہوتا، بخلاف موزے کے کیونکہ تابعین میں سے ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ مَلنے اور رگڑنے سے موزہ پاک ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں کسی قسم کا کوئی طعن نہیں ہے اور ام سلمہؓ کی روایت میں طعن ہے اس لئے کہ اس روایت کی ایک راویہ ابراہیم کی ام ولد ہیں جو کہ مجہولہ ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ گویا ام سلمہؓ کی روایت کو کپڑے کی خشک نجاست پر پڑنے پر محمول کرتے ہیں اور یہ محی السنۃؒ کے اس قول کا ردّ ہے کہ یہ دونوں حدیثیں اسی توجیہ پر محمول ہیں (کہ موزہ یا کپڑا خشک نجاست پر پڑ جائے) اور حدیث ''**الخف**'' (یعنی ابو ہریرہؓ کی روایت کو تر پر محمول کرتے ہیں)۔

اور ظاہر یہ ہے کہ دونوں حدیثیں تر نجاست پر محمول ہیں، اس لئے کہ پہلی حدیث میں فرمایا: **طھورہ التراب** اور دوسری میں فرمایا: **یطھرہ ما بعدہ** اور تطہیر یعنی پاک کرنا نجاست کے بعد ہوتا ہے اور اس تاویل کی تائید فصل ثالث کی پہلی روایت بھی کرتی ہے اور یہ امر آسانی اور حرج کے دور کرنے پر مبنی ہے، علامہ طیبیؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

اور اس میں یہ بات ملحوظ رہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ظاہر الروایۃ میں یہ ہے کہ موزہ رگڑنے اور ملنے سے اس وقت تک پاک ہوتا ہے جب کہ نجاست اس پر خشک ہو جائے ، بخلاف اس کے کہ جب وہ تر ہو، ہاں البتہ امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے کہ تر سے بھی پاک ہو جاتا ہے کہ جب اس کو خوب مبالغے سے صاف کیا جائے اور جو نجاست لگی ہو وہ بھی جسم والی ہو جیسا کہ پائخانہ، لید اور منی وغیرہ اور اتنا صاف کیا جائے کہ نجاست کا اثر بھی باقی نہ رہے اور عموم بلوی کی وجہ سے اسی پر فتویٰ ہے اور اگر نجاست وہ جسم والی نہ ہو جیسا کہ شراب اور پیشاب وغیرہ تو وہ دھونے کے بغیر پاک نہ ہو گی ۔قاضی خانؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

حدیث باب کی سند میں ایک مجہول راوی ہے، صاحب تخریج سے سیدؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے ابن الہمامؒ کے حوالے سے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت حسن ہے اس میں کسی نے طعن نہیں کیا ہے، گویا وہ مجہول راوی ان کو معلوم ہے یا راوی کی جہالت کثرت طرق کے سبب اس کی مضرت کو اٹھا دیتی ہے اور ابوداؤدؒ کی ایک روایت میں یوں ہے: **اذا وطی احدکم الاذی بخفه فطهوره التراب**۔میرک شاہؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی سند حسن ہے۔

طویل دامن جو زمین پر لگے اس کا حکم

٥٠٤:وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ لَهَا امْرَأَةٌ اِنِّیْ اُطِیْلُ ذَیْلِیْ وَاَمْشِیْ فِی الْمَكَانِ الْقَذِرِ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یُطَهِّرُهٗ مَابَعْدَهٗ (رواه مالك واحمد والترمذی وابوداود والدارمی) **وَقَالَا الْمَرْاَةُ اُمُّ وَلَدٍ لِاِبْرَاهِیْمَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ)** ۔

أخرجه مالك فی الموطا ١/٢٤حديث قم ١٦من كتاب الطهارة ـوأخرجه أحمد فی مسنده ٦/٢٩٠وأخرجه الترمذی فی السنن ١/٢٦٦حديث رقم ١٤٣ـوأخرجه أبوداوٗد فی السنن ١/٢٦٦ـ حديث ٣٨٣وأخرجه ابن ماجة فی السنن ١/١٧٧حديث رقم ٥٣١وأخرجه الدارمی فی السنن ١/٢٠٦حديث رقم ٧٤٢ـ

ترجمہ : ''حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ ان سے ایک عورت نے پوچھا کہ میرا دامن طویل ہے اور میں (بسا اوقات) گندگی والی جگہ میں چلتی ہوں اور خیال ہوتا ہے کہ دامن کو گندگی لگ گئی ہو گی۔حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ وہ مابعد کی رگڑ سے پاک ہو جائے گا اس حدیث کو امام مالکؒ امام احمدؒ اور امام ترمذیؒ امام ابوداؤدؒ اور امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔امام ابوداؤد اور امام دارمی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ سوال کرنے والی عورت ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف کی ام ولد تھی۔''

تشریح: **قذر** سے مراد ''نجس'' ہے۔اور **قذر** ''ذال'' کے کسرہ کے ساتھ ہے یعنی نجاست والی جگہ میں چلتی ہوں۔

قال رسول الله ﷺ :یعنی اس سوال کے جواب میں فرمایا۔

یطهره مابعده :یعنی وہ جگہ جو اس ناپاک جگہ کے بعد ہے وہ اس کو پاک کر دے گی، دامن سے خشک نجاست جو چمٹی ہوتی ہے اس کے اترنے کے ذریعے۔ہمارے بعض علماء نے یہی تشریح فرمائی ہے اور یہ تاویل حدیث کے صحیح ہونے کی تقدیر پر تمام

کے نزدیک متعین ہے کیونکہ اس بات پر اجماع واقع ہے کہ کپڑے کو جب نجاست لگ جائے تو وہ دھونے کے بغیر پاک نہیں ہوتا، بخلاف موزے کے اس میں اختلاف ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور تطہیر کا اطلاق (مکان پر) یہ مجازی ہے اس کی نسبت اسنادیہ کی طرح۔

امام شافعیؒ نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔سیدؒ نے صاحب تخریج سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

امام ابوداؤدؒ اس پر خاموش رہے ہیں اور اسی طرح امام منذریؒ بھی (**قاله السيد عن التخريج**)۔

والدارمی وقالا : ای ابوداؤد والدارمی ۔اور ایک نسخہ میں **وقال (ای الدارمی)** ہے۔میرک شاہؒ فرماتے ہیں امام شافعیؒ نے بھی اسی طرح فرمایا ہے۔

المراء ة ام ولد لابراهيم بن عبد الرحمان بن عوف :صاحب ازہار نے''غوامض'' سے نقل کیا ہے کہ اس کا نام حمیدہ ہے۔سیدؒ نے اس کو ذکر کیا ہے اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ یہ بات گزر چکی ہے، کہ یہ راویہ مجہولہ ہیں اور اس کے باوجود حدیث حسن ہے۔ابن حجرؒ کا اس کو حسن کہنا صحیح نہیں ہے، الا یہ کہ یہ کہا جائے کہ حسن لغیرہ ہے، پس یہ موقوف ہوگا اس پر کہ اس کی کوئی دوسری ایسی سند ہو کہ جس میں یہ مجہولہ نہ ہو تو اس کی وجہ سے قوی ہوگی اور یہ معلوم نہیں ہے۔غور کر لیا جائے۔

درندے کی کھال پر بیٹھنے کا حکم

۵۰۵ :وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ لَبْسِ جُلُوْدِ السِّبَاعِ وَالرُّكُوْبِ عَلَيْهَا۔ (رواه ابوداود والنسائی)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ٤/٣٨٣ حديث رقم ٤١٣١ وهو حديث طويل ۔وأخرجه النسائی فی السنن ١٧٦/٧ حديث رقم ٤٢٥٥۔

ترجمہ : ''حضرت مقدام بن معدیکربؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جانوروں کی کھالوں کو پہننے سے اور ان پر بیٹھنے سے منع کیا ہے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام نسائیؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: وعن المقدام بن معديكرب :یہ''کندی'' ہیں، اور یہ اس وفد میں سے ایک ہیں جو کندہ سے آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تھے اور ان کا شمار اہل شام میں ہوتا ہے اور ان کی حدیث ان میں مشہور ہے۔علامہ طیبیؒ نے اس طرح فرمایا ہے۔اور ان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

عن لبس جلود السباع : لبس:''لام'' کے ضمہ کے ساتھ مصدر ہے۔ **لبسَ يلبس** سے جیسا کہ: **علم يعلم** بخلاف لبس کے وہ **لبس يلبس** سے (ضَرب یَضرب کی طرح) مصدر ہے اور ''لبس'' کا معنی ہے''خلط ملط کرنا التباس ہو جانا''۔

والركوب عليها :مظہرؒ نے فرمایا ہے اس''نہی'' میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ نہی تحریمی ہو اس لئے کہ درندوں کی کھال دباغت سے پہلے نجس ہوتی ہے اس کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے اور باقی دباغت کے بعد تو اگر اس پر بال ہوں تو بھی نجس ہوگی اس لئے کہ بال دباغت سے پاک نہیں ہوتے کیونکہ دباغت بالوں کو ان کی حالت سے نہیں بدلتی۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ نہی تنزیہی ہو جب کہ ہم یہ کہیں کہ بال دباغت سے پاک ہو جاتے ہیں جیسا کہ وسیط میں ہے تو نہی تنزیہی اس لئے ہے کیونکہ درندوں کی کھال کا پہننا اور اس پر سوار ہونا یہ ظالموں و مشرکوں کی عادت ہے اور امراء و اغنیاء کا عمل ہے یہ نیک پارسا لوگوں کیلئے مناسب نہیں ہے۔ (طیبی)

اور ابن الملکؒ نے یہ بات زیادہ فرمائی ہے کہ اس میں تکرار اور زینت ہے۔ زرکشیؒ نے فرمایا ہے اس حدیث کی بناء پر سنجاب (چوہے اور گلہری کے مشابہ ایک جانور جس کی دُم پر گھنے بال ہوتے ہیں اور اس کی کھالوں سے پوستین بناتے ہیں) اور وبر (وبر بلی سے چھوٹا اک جانور جس کی دُم اور کان چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں) وغیرہ کی پوستین حرام ہوگی کیونکہ اس کے جانور کو ذبح نہیں کیا جاتا بلکہ گلا گھونٹ کر مارا جاتا ہے جیسا کہ ہمیں معتمد لوگوں نے بتایا ہے اور اگر ذبح کرنا بھی ہم فرض کر لیں کہ انہوں نے ذبح کیا ہوگا تو پھر شکاری ذبح میں سے نہیں ہوگا (یعنی اس کا ذبیحہ حلال نہ ہوگا)۔

اور ابن حجرؒ نے امام زرکشی نے قول پر اضافہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ثقہ لوگوں کا خبر دینا اور شکاری کا اہل ذکاۃ میں سے نہ ہونا یہ اس وقت قابلِ اعتماد مانا جائے گا کہ جب حقیقت میں بھی اسی طرح ہو کہ ثقہ نے یہ خبر دی ہے کہ اس کو ذبح نہیں کیا گیا، اس کا شکاری اہل ذکاۃ میں سے نہیں ہے اور باقی ثقہ لوگوں کا اس حیوان کی جنس کے بارے میں یوں کہنا تو یہ قابلِ تقلید نہیں ہے۔

اس کی نظیر وہ مسئلہ ہے جو مشہور ہے اور ان کے بنے ہوئے کپڑے کے بارے میں کہ اونی کپڑے کو خنزیر کی چربی سے ڈھا جاتا ہے۔ ائمہ نے اس پر اعتماد نہیں کیا ہے بلکہ اصل پر عمل کرتے ہوئے اس کی طہارت کا فتویٰ دیا ہے، اسی طرح یہاں ہوگا بہتر بات یہ ہوگی کہ اس سے بچنا احتیاط کہلائے گا نہ کہ بچنا واجب ہے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ ابن حجرؒ کی نظیر بیان کرنے میں نظر ہے۔ اس لئے کہ پہلے مسئلہ میں ثقہ لوگوں نے خبر دی ہے کہ حیوان کی یہ جنس اپنے تمام افراد کے ساتھ اسی طرح ہے اور دوسرے مسئلہ میں صرف لوگوں کے درمیان اس کی شہرت ہے ثقہ یا اعتماد لوگوں کی قید نہیں ہے اور حصر کا بھی یہ فائدہ نہیں دیتا، تو پس اس میں سچا ہونے کا بھی احتمال ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ خاص اس عام کے ضمن میں داخل نہ ہو، اور اس کے ساتھ: **يخمر بشخم الخنزير** میں "**يخمر**" کا صیغہ تقلیل کا فائدہ دیتا ہے۔

اس کی سند میں بقیہ ہے اور وہ متکلم فیہ راوی ہے۔
پس ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ اس کی سند حسن ہے بلکہ صحیح ہے یہ ٹھیک نہیں ہے۔

۵۰۶: وَعَنْ اَبِی الْمَلِیْحِ بْنِ اُسَامَةَ عَنْ اَبِیْهِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنْ جُلُوْدِ السِّبَاعِ اَنْ تُفْتَرَشَ۔ (رواه احمد وابوداود والنسائی وزادالترمذی والدارمی)

أخرجه أحمد فی مسنده ٥/٧٤۔ وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ٤/٣٧٤ حدیث رقم ٤١٣٢۔ وأخرجه النسائی فی السنن ٧/١٧٦ حدیث رقم ٤٢٥٣۔ وأخرجه الترمذی بهذااللفظ ٤/٢١٢ حدیث ١٧٧١۔ ومع الزیادة ٤/٢١٢ حدیث ١٧٧٠ وأخرجه کذلك الدارمی فی السنن ٢/١١٧ حدیث رقم ١٩٨٣۔

ترجمہ: "حضرت ابوالملیح بن اسامہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے درندوں کی کھال کو

استعمال کرنے سے منع کیا ہے اس حدیث کو امام احمدؒ امام ابوداؤدؒ اور امام نسائی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی اور امام دارمی نے یہ الفاظ زیادہ نقل کیے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے بھی منع کیا ہے کہ درندوں کی کھال کو بچھونا بنایا جائے۔''

راویٔ حدیث:

ابو الملیح بن اسامہ۔ یہ ''ابوالملیح'' ہیں۔ نام عامر ہے۔ ''اسامہ'' کے بیٹے اور ہذلی وبصری ہیں۔ صحابہ کی ایک ان جماعت سے روایت کرتی ہے۔ ملیح میں میم پر زبر لام مکسور اور حاء مہملہ ہے۔ صاحب مشکوٰۃ نے ان کے والد کا نام صحابہ میں ذکر کیا نہ تابعین میں ذکر کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صحابی تھے۔

تشریح: وعن ابی الملیح : ملیح ''میم'' کے فتحہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ ہے ان کا نام عامر ہے۔ (نقله السيد عن التخريج) صاحب مشکوٰۃؒ نے فرمایا ہے یہ بصری ہیں ان سے صحابہ کی ایک جماعت نے روایت کی ہے۔

ابن اسامه : ابن اسامہ ہذلی مراد ہیں۔ (طیبی)

نھی : اور ایک نسخہ میں ہے انه نھی کے الفاظ ہیں۔

رواہ احمد : اس سند کے ساتھ عن سعید بن ابی عروبه عن قتادہ عن ابی الملیح عن ابیه، امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ عن ابیه ابن ابی عروبه کے علاوہ کسی اور نے کہا ہو (میرک شاہؒ نے صاحب تخریج سے اس کو نقل کیا ہے) اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے: نھی عن رکوب جلود النمار۔

وزاد الترمذی والدارمی ان تفترش : یعنی بچھایا جائے اور اس پر بیٹھا جائے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے پھر ان تفترش کی زیادتی ترمذی اور دارمی کے ساتھ خاص ہے، پس ابن حجرؒ کا اس زیادتی کو پہلے نفس حدیث سے ملانا پھر یہ کہنا ''رواہ احمد وابوداؤد والترمذی والدارمی'' یہ فحش قسم کی غلطی ہے اور ترمذیؒ نے بھی اس کو شعبہ کی حدیث سے نقل کیا: عن شعبة عن یزید وشك عن ابی الملیح عن النبی ﷺ مرس۔ امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ روایت اصح ہے۔ پس خلاصہ یہ نکلا کہ اس حدیث کو مرسل نقل کرنا یہ مسند نقل کرنے سے اصح ہے۔ سیدؒ نے صاحب تخریج سے اس کو نقل کیا ہے۔

۵۰۷: وَعَنْ اَبِی الْمَلِیْحِ اَنَّهٗ کَرِهَ ثَمَنَ جُلُوْدِ السِّبَاعِ ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ٤/ ٢١٢ من غير ذكر ثمن.

ترجمہ: ''حضرت ابوالملیح سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ درندوں کی کھالوں کی قیمت مکروہ ہے اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: عن ابی الملیح انه : یعنی ان رسول الله ﷺ ۔ ابن الملکؒ وغیرہ نے یہی تشریح کی ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ ضمیر ابوالملیح کی طرف راجع ہے۔

کرہ ثمن جلود السباع : یعنی درندوں کی کھالوں کی خرید وفروخت۔ ابن الملکؒ نے اسی طرح فرمایا ہے اور فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ مردار کی کھالوں کی بیع باطل ہے جب کہ وہ مذبوحہ اور دباغت نہ دی گئی ہوں اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ

ہمارے مذہب میں درندوں کی کھالوں کی بیع صحیح ہے دباغت کے بعد اگرچہ اس پر بال ہوں اور اس وقت اس کی قیمت میں کوئی کراہت نہیں ہے، پس اس کی قیمت کے مکروہ ہونے کا اطلاق (جو اس روایت میں ہے) اس کے علاوہ پر محمول ہے یا یہ ابوالملیح کا مذہب ہے۔

مظہرؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حکم دباغت سے پہلے ہے اس کی نجاست کی وجہ سے باقی دباغت کے بعد تو اس میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

رواہ : یہاں پر حوالہ نہیں ہے اور الترمذی یہاں پر ملایا گیا ہے۔ سیدؒ جمال الدینؒ فرماتے ہیں امام ترمذیؒ نے اس لفظ سے اس کو روایت کیا ہے "**کرہ جلود السباع**"۔ اور اس اثر کی سند جید ہے، صاحب تخریج نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ امام ترمذیؒ نے اس کو اپنی جامع ترمذی کے کتاب "اللباس" میں ذکر کیا ہے اور اس کی سند بہتر ہے اور جزریؒ نے فرمایا ہے کہ یہ اثر اس کی سند جید ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس کو کتاب اللباس میں **کرہ جلود السباع** کے ساتھ نقل کیا ہے۔

"اثر" محدثین کی اصطلاح میں موقوف روایت پر بولا جاتا ہے، پس صحیح یہ ہے کہ "انہ" میں ضمیر ابوالملیح کی طرف راجع ہے اسی وجہ سے "**وعنہ**" نہیں کہا اس میں اشارہ ہے کہ پہلی حدیث مرفوع ہے اور یہ موقوف ہے۔

۵۰۸: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُكَيْمٍ قَالَ اَتَانَا كِتَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنْ لَّاتَنْتَفِعُوْا مِنَ الْمَيْتَةِ بِاِهَابٍ وَّلَاعَصَبٍ ۔ (رواہ الترمذی وابوداود والنسائی وابن ماجة)

أخرجه الترمذی فی السنن ١٩٤/٤حديث رقم ١٧٢٩وقال حديث حسن ۔ وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ٣٧٠/٤حديث رقم ٤١٢٧والنسائی فی السنن ١٧٥/٧حديث رقم ٤٢٥١۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ١١٩٤/٢حديث رقم ٣٦١٣۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عکیم سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کا خط آیا اور اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ تم مردار کے چمڑے اور اس کے پٹھے سے فائدہ حاصل نہ کرو اس حدیث کو امام ترمذی، امام ابوداوٗد، امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔"

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن عکیم ۔ یہ عبداللہ بن عکیم جہنی ہیں۔ انہوں نے آنحضور ﷺ کا زمانہ پایا۔ بہت سے علماء رجال نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے مگر ان کے لئے آنحضور ﷺ کی رؤیت و روایت کا پایا جانا مشہور نہیں۔ صحیح یہی ہے کہ یہ تابعی ہیں۔ عمر، ابن مسعود اور حذیفہ رضی اللہ عنہم سے انہوں نے حدیث کو سنا۔ ان سے ایک گروہ روایت کرتا ہے۔ ان کی حدیث کوفہ والوں میں پائی جاتی ہے۔

وعن عبداللہ بن عکیم : "عکیم" تصغیر کے ساتھ ہے، اور یہ تابعی ہیں۔ صاحب مشکوٰۃؒ نے فرمایا ہے یہ قبیلہ جہینہ سے ہیں۔ حضور ﷺ کا زمانہ پایا اور ان کی روایت اور رؤیت (یعنی حضور ﷺ کی زیارت کرنا اس کا ثبوت نہیں ہے۔ بعض محدثین نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے، اور صحیح یہ ہے کہ یہ تابعی ہیں حضرت عمرؓ ابن مسعودؓ اور حذیفہؓ سے روایت سنی ہے اور ایک جماعت نے

ان سے روایت کی ہے اور ان کی حدیث اہل کوفہ میں مشہور ہے۔

تشریح: ان لا تنتفعوا : "اَنْ" یہ مفسرہ ہے یا مخففہ ہے۔

باھاب : دباغت سے پہلے، اور بعض نے کہا ہے کہ "اہاب" سے مراد کھال ہے اور یہ دباغت شدہ اور غیر دباغت شدہ دونوں کو شامل ہے، جیسا کہ **لو اخذتم اھابھا** میں اس کی تصریح کی گئی ہے اور قاموس میں لکھا ہے کہ "**اھاب** کتاب کی طرح ہے وہ کھال کہ جس کو دباغت نہ دی گئی ہے۔

عصب: یہ "عین" اور "صاد" کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

شرح مواہب الرحمان میں لکھا ہے کہ مردار کے پٹھے صحیح روایت کے مطابق نجس ہیں اس لئے کہ اس میں حیات ہوتی ہے، دلیل یہ ہے کہ، ان کے کاٹنے سے تکلیف ہوتی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ پٹھے پاک ہیں، اس لئے کہ وہ ایسی ہڈی ہے جو ملی ہوئی نہیں ہوتی۔

علامہ تورپشتی نے کہا ہے کہ بعض نے کہا ہے کہ یہ حدیث ان تمام احادیث کیلئے ناسخ ہے کہ جن میں دباغت کا ذکر ہے اس لئے کہ اس روایت کے بعض اطراف میں ہے: (**اتانا کتاب رسول الله ﷺ قبل موته بشهر**) اور مشہور ہونے کے اعتبار سے مساوی نہیں ہوسکتی۔ پھر ابن عکیم کی ملاقات بھی حضور ﷺ سے نہیں ہوئی ہے اور انہوں نے حکایت حال کو بیان کیا ہے اور اگر ملاقات بھی ثابت ہو جائے تو حق یہ ہے کہ اس کو دباغت سے پہلے انتفاع کی نہی پر محمول کیا جائے۔

امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ اس کے قائل تھے، پھر اس کو اس وجہ سے چھوڑ دیا کیونکہ اس کی سند میں اضطراب ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے: **قبل موته بشهرين** اور بعض میں **باربعين ليلة** اور امام بیہقی اور دوسرے حضرات نے فرمایا ہے یہ روایت مرسل ہے اور ابن عکیم کیلئے صحبت ثابت نہیں ہے۔ (**نقله السيد عن التخريج**)۔

۵۰۹: وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَمَرَاَنْ يُسْتَمْتَعَ بِجُلُوْدِ الْمَيْتَةِ اِذَا دُبِغَتْ . (رواه مالك وابوداود)

أخرجه مالك في الموطا ۴۹۸/۲ حديث رقم ۱۸ من كتاب الصيد ـ وأخرجه أبوداؤد في السنن ۳۶۸/۴ حديث ۴۱۲۴ ـ وأخرجه النسائي في السنن ۱۷۶/۷ ـ حديث رقم ۴۲۵۲ ـ وابن ماجة في السنن ۱۱۹۴/۲ حديث رقم ۳۶۱۲ ـ

ترجمہ: "حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ مردار کے چمڑے سے دباغت دینے کے بعد فائدہ حاصل کیا جائے اس حدیث کو امام مالک اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔"

امر ان يستمتع : یہ مجہول کا صیغہ ہے **اى بان يستمتع الناس**

تشریح: **رواه مالك وابوداؤد** : علامہ نوویؒ نے فرمایا اس کی سند جید ہے (**نقله السيد عن التخريج**)۔

اور اختلاف الائمہ میں یہ مذکور ہے کہ امام مالکؒ کی دو روایتوں میں سے سب سے ظاہر روایت یہ ہے کہ مردار کی کھال دباغت کی وجہ سے پاک ہو جاتی ہے، لیکن اس کھال کو صرف خشک چیزوں میں استعمال کیا جائے اور تمام مائع چیزوں میں صرف پانی۔

۵۱۰: وَعَنْ مَيْمُوْنَةَ قَالَتْ مَرَّعَلَى النَّبِيِّ ﷺ رِجَالٌ مِّنْ قُرَيْشٍ يَجُرُّوْنَ شَاةً لَّهُمْ مِثْلَ الْحِمَارِ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَوْاَخَذْتُمْ اِهَابَهَا قَالُوْا اِنَّهَا مَيْتَةٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُطَهِّرُهَا الْمَآءُ وَالْقُرَظُ ۔ (رواہ احمد وابوداود)

أخرجه أحمد في مسنده٦/٣٣٤۔وأخرجه أبوداوٗد في السنن ٤/٣٦٩حديث رقم ٤١٢٦ ۔وأخرجه النسائي في السنن ٧/١٧٤حديث رقم ٤٢٤٨ ۔

ترجمہ: ''حضرت میمونہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس قریش کے چند آدمی اپنی ایک مردار بکری کو گدھے کی طرح کھینچتے ہوئے گزرے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کاش کہ تم اس کی کھال کو اتار لیتے انہوں نے عرض کیا یہ تو مردار ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کو پانی اور کیکر کے پتے پاک کر دیتے ہیں اس حدیث کو امام احمد اور امام ابوداوٗد نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: لو اخذتم اھابھا: علامہ تورپشتی نے فرمایا ہے کہ ''لَوْ'' ''لیت'' کے معنی میں ہے، یعنی ''لَوْ'' یہ تمنی کیلئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کاش تم اس کی کھال کو لے لیتے۔ اور ''لیتَ'' اور ''لَوْ'' کے درمیان وصف جامع یہ ہے کہ دونوں تقدیر کے معنی ہوتے ہیں (یعنی مقدر ماننے کے اعتبار سے) اور اسی وجہ سے ''فاء'' کو ان کے جواب میں لایا جاتا ہے۔ اور مصابیح کے الفاظ یہ ہیں۔ **لو اخذتم اھابھا فدبغتموہ** پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہوگا: ﴿يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾ [النساء:۷۳] ''(افسوس کرتا اور) کہتا ہے کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو مقصد عظیم حاصل کرتا۔''

''**فدبغتموہ**'' یہ مشکوٰۃ میں نہیں ہے اور ابن حجر کو وہم ہوا ہے انہوں نے اس کو اس میں داخل کر دیا ہے اور اگر اس کو (**فد بغتموہ**) کو مان بھی لو تو ظاہر یہ ہے کہ ''فاء'' اس جگہ عطف کیلئے ہے نہ کہ جواب کیلئے، اور ''لَوْ'' جب تمنی کیلئے ہو تو پھر یہ جواب کو طلب نہیں کرتا اور معنی یہ ہے: **تمنیت اخذکم اھابھا فدباغھا**۔ اور مظہرؒ نے فرمایا ''لَوْ'' کا جواب محذوف ہے: **ای لو اخذتموو دبغتموہ لکان حسنا**۔ یا جواب ''**تطھر**'' ہے یا **حل لکم الانتفاع بہ**۔

یطھرھا لماء: ظاہر یہ ہے کہ دباغت میں پانی کا ہونا ضروری ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ شرط نہیں ہے اس لئے کہ دباغت دینا **احالہ** (تغیر) کی قبیل سے ہے نہ کہ **ازالہ** (زائل کرنے) کی قبیل سے، پس یہ حدیث محمول ہے استحباب پر یا طہارت کاملہ پر۔

والقرظ: قرظ ''قاف'' اور ''راء'' کے فتحہ کے ساتھ اس کے بعد ''ظاء'' ہے۔ درخت کے پتے اور ان پتوں کے ذریعے دباغت دی جاتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ''قرظ'' بلوط درخت کی چھال اور مطلب یہ ہے کہ ''قرظ'' پانی کے ساتھ کھال کو پاک کر دیتا ہے اور کھال ''قرظ'' کے ساتھ دباغت دینے سے بھی پاک ہو جاتی ہے۔

علامہ نوویؒ نے فرمایا ہے دونوں کی سندیں حسن ہیں۔ (**نقلہ السید عن التخریج**)۔

۵۱۱: وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْمُحَبِّقِ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ جَآءَ فِيْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ عَلٰى اَهْلِ بَيْتٍ فَاِذَا قِرْبَةٌ مُعَلَّقَةٌ فَسَأَلَ الْمَآءَ فَقَالُوْا لَهٗ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّهَا مَيْتَةٌ فَقَالَ دِبَاغُهَا طُهُوْرُهَا. (رواہ احمد وابوداود)

أخرجه أحمد في مسنده ٣/٤٧٦ ۔وأخرجه أبوداوٗد في السنن ٤/٣٦٨حديث رقم ٤١٢٥ ۔وأخرجه النسائي عن

عائشه رضى الله عنها فى السنن ۷/ ۱۷٤ حديث رقم ٤٢٤٤۔

ترجمہ: ''حضرت سلمہ بن محبق ؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ غزوہ تبوک میں ایک آدمی کے گھر تشریف لائے تو اچانک آپ کی نظر ایک لٹکی ہوئی مشک پر پڑی آپ نے پانی مانگا تو گھر والوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ یہ دباغت دی ہوئی مردار کی کھال ہے آپ نے فرمایا دباغت سے اس کو پاک کر دیا ہے۔ اس حدیث کو امام احمد اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: سلمة : یہ ہذلی ہیں، ان کا شمار اہل بصرہ میں ہوتا ہے۔

ابن المحبق : ''میم'' اور ''حاء'' کے ضمہ اور ''باء'' مشدد کے کسرہ کے ساتھ ہے اور کبھی فتحہ بھی دیا جاتا ہے اور جامع الاصول میں لکھا ہے ''المحبق باء مشددہ'' کے کسرہ کے ساتھ ہے اور محدثین اس کو فتحہ دیتے ہیں، لیکن کاشف عن حقائق السنن میں کسرہ کو صحیح قرار دیا ہے۔ (نقله السيد)

''تبوک'' غیر منصرف ہے علمیت اور وزن فعل کی وجہ سے اور اس کو منصرف بھی پڑھتے ہیں اس بنیاد پر کہ یہ فعول کے وزن پر ہے اور ابہریؒ نے فرمایا ہے یہ شام اور وادی القری کے درمیان ایک جگہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ غیر منصرف ہے علمیت اور تانیث کی وجہ سے اور اگر اس کو جگہ کا نام قرار دیا جائے تو منصرف پڑھنا جائز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تانیث بقعہ کے اعتبار سے ہے۔

طهور : ''طاء'' کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ ہے اى مطهرها۔ اشرفؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث دلیل ہے اس بات کی کہ دباغت کے دوران اور اس کے بعد پانی کا استعمال واجب نہیں ہے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ کے دونوں قولوں میں سے ایک قول یہ ہے۔

الفصل الثالث:

راستہ کی نجاست کا حکم

۵۱۲: عَنِ امْرَأَةٍ مِّنْ بَنِىْ عَبْدِالْاَشْهَلِ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لَنَا طَرِيْقًا اِلَى الْمَسْجِدِ مُنْتِنَةً فَكَيْفَ نَفْعَلُ اِذَا مُطِرْنَا قَالَتْ فَقَالَ اَلَيْسَ بَعْدَهَا طَرِيْقٌ؟ هِىَ اَطْيَبُ مِنْهَا قُلْتُ بَلٰى قَالَ فَهٰذِهٖ بِهٰذِهٖ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبو داؤد فى السنن ١/ ٣٦٦۔ حديث رقم ٣٨٤۔ وأخرجه ابن ماجة فى السنن ١/ ١٧٧ حديث رقم ٥٣٣۔

ترجمہ: ''بنو عبدالاشہل کی ایک عورت سے روایت ہے وہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا اے اللہ کے رسول ہمارا مسجد میں آنے کا راستہ گندا ہے جب بارش ہو جائے تو ہم کیا کریں وہ خاتون کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس راستہ کے بعد کوئی پاک صاف راستہ نہیں آتا میں نے عرض کیا جی ہاں اس کے بعد پاک راستہ ہوتا ہے تو آپ نے فرمایا یہ پاک راستہ اس ناپاک راستہ کے بدلے میں ہے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ان لنا طريقا الى المسجد منتنة :یعنی گندگی والا راستہ ہے،اور طریق مذکر بھی ہوتا ہے اور مؤنث بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس راستے میں مردار اور نجاستوں کا اثر ہوتا ہے۔

فكيف نفعل اذا مطرنا : یہ مجہول کا صیغہ ہے،یعنی جب بارش ہم پر پڑے اور ہم اس راستے سے گزریں جس میں نجاستیں پڑی ہوئی ہوں اور ہمارے کپڑوں کے کنارے اس زمین پر گھسٹتے جائیں تو ہم کیا کریں؟

هی اطيب منها؟ : اطیب سے مراد "اطہر" ہے، جو طاہر کے معنی میں ہے۔

قال فهذه بهذه :یعنی جو ناپا کی اُس راستے میں لگی ہے تو اس (دوسرے راستے) کی پاک مٹی پر کپڑے کا کھینچنا اس کو پاک کر دیتا ہے۔بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس حدیث اور ام سلمہؓ کی حدیث کا معنی قریب قریب ہے۔

علامہ خطابیؒ نے فرمایا ہے امام احمدؒ نے فرمایا اس حدیث کا یہ معنی نہیں ہے کہ جب کپڑے کو پیشاب لگ جائے پھر زمین پر گزرے اس کے بعد تو پاک زمین پر پڑنے سے وہ پاک ہو جائے گا،لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ایک جگہ پر سے گزرے پس وہ گندگی والی ہو پھر وہ دوسری جگہ پر سے گزرے جو اس سے صاف ہو پس یہ اس کے بدلے میں ہوگی، یہ مطلب نہیں کہ اس کو اس نجاست میں کچھ لگے بھی۔

اور امام مالکؒ سے روایت ہے کہ زمین کا بعض بعض کیلئے پاکی کا سبب ہے، وہ اس طرح کہ آدمی پہلے گندگی والی زمین کو روندے پھر خشک پاک زمین کو روندے تو اس صورت میں بعض بعض کے لئے پاک کرنے کا ذریعہ ہے اور باقی پیشاب وغیرہ کی طرح جو نجاست ہوتی ہے جو کپڑوں یا جسم کے کسی حصے میں لگ جائے تو ایسی نجاست کو سوائے دھونے کے بالاجماع کسی اور طرح پاک نہیں کیا جا سکتا۔علامہ طیبیؒ نے اس کو اسی طرح ذکر کیا ہے۔

ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے دونوں حدیثیں ایک دوسرے سے بعید ہیں نہ کہ یہ قول کہ حدیث ام سلمہ اور یہ حدیث قریب قریب ہیں۔ کیونکہ پہلی روایت مطلق ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کو یابس خشک نجاست کے ساتھ مقید کیا جائے ،اور باقی دوسری روایت تو وہ تر نجاست میں صریح ہے اور جو امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے کہا ہے اس حدیث کے بارے میں وہ بیمار کیلئے شفاء کا باعث نہیں ہے، بلکہ وہ تھکے ہوئے کے لئے کافی ہے۔اور امام شافعیؒ کی تاویل جو حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں گزری ہے وہ اس مقام میں مقصود سے انتہائی دور ہے اور اگر اس کو راستوں کے کیچڑ پر محمول کیا جائے کہ وہ پاک ہوتا ہے یا عموم بلوی کی وجہ سے معاف ہوتا ہے تو اس تشریح کیلئے بہترین وجہ ہوگی،لیکن یہ توجیہ **اليس بعدها**......کے مناسب نہیں ہوگی۔

پس خلاصۂ کلام یہاں پر وہ بات ہے جو علامہ خطابیؒ نے ان دونوں حدیثوں کی سندوں کے بارے میں کہی ہے (یعنی ام سلمہؓ کی روایت اور یہ روایت) کہ ان روایات میں کلام ہے اس لئے کہ ابراہیم کی امّ ولد اور بنی الاشہل کی عورت دونوں مجہول ہیں،ان دونوں کی حالت ثقہ ہونے میں اور عدالت میں واضح نہیں ہے، پس ان دونوں حدیثوں سے استدلال صحیح نہیں ہوگا۔

میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ امام ابوداؤدؒ کا اپنی سنن میں امام ترمذیؒ کا اپنی جامع ترمذی میں اس پر خاموش رہنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ دونوں حدیثیں ان حضرات کے نزدیک قابلِ استدلال ہیں۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں میں کہتا ہوں کہ ناطق صامت سے اقویٰ ہوتا ہے جیسا کہ منطوق مفہوم سے اقویٰ ہوتا ہے۔

اور ابن حجرؒ نے یہاں عجیب بات کہی ہے کہ بعض لوگوں نے یہ گمان کیا ہے اس عورت کی جہالت یہ اس کی حدیث کو ردّ کرنے کی متقاضی ہے یہ بات صحیح نہیں ہے اس لئے کہ وہ صحابیہ ہیں اور جہالت صحابی مضر نہیں ہے اس لئے کہ صحابہ سارے کے سارے عادل ہیں۔ پس ابن حجرؒ کا یہ قول حد اعتدال سے ہٹ کر ہے اس لئے کہ اگر اس عورت کا صحابیہ ہونا معلوم ہو جائے تو پھر ان کو مجہولہ تو نہ کہا جائے۔

۵۱۳: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كُنَّا نُصَلِّيْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا نَتَوَضَّأُ مِنَ الْمَوْطِئِ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی تعليقاً فی سننه ۱/۲۶۷ بعد الحديث ۱۴۳۔ وأخرجه أبو داؤد فی السنن ۱/۱۴۰ حديث رقم ۲۰۴ ولفظه "كنا لا نتوضأ من موطیٔ ولا نكف شعراً ولا ثوباً" وأخرجه ابن ماجة۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور زمین پر چلنے کی وجہ سے وضو نہیں کرتے تھے اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: من الموطیء: یعنی چلنے کی وجہ سے جو مٹی لگ جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ محمول ہے اس پر کہ جب وہ خشک ہو اور جب وہ تر ہو تو غسل واجب ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ محمول ہے اس راستے کے بارے میں کہ جس میں طہارت نجاست پر غالب ہو اصل طہارت پر عمل کرتے ہوئے اور وسوسہ کے چھوڑنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور اسی وجہ سے روایت میں آیا ہے کہ صحابہ کرام وضو کرتے اور ننگے پاؤں زمین پر چلتے، پھر نماز پڑھتے اور اپنے پاؤں کو نہ دھوتے تھے۔

اس حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ راستے کا کیچڑ عموم بلویٰ کی وجہ سے معاف ہے۔

حاکمؒ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

کتے کے مسجد میں داخل ہونے کا حکم

۵۱۴: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَتِ الْكِلَابُ تُقْبِلُ وَتُدْبِرُ فِي الْمَسْجِدِ فِيْ زَمَانِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرُشُّوْنَ شَيْئًا مِّنْ ذٰلِكَ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۱/۲۷۸ حديث رقم ۱۷۴۔ وأخرجه أبو داؤد فی حديث طويل ۱/۲۶۵ حديث رقم ۳۸۲۔ وكذلك فی مسنده ۲/۷۱۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجد میں کتے آتے جاتے تھے اور صحابہ کرام ان کے آنے جانے کی وجہ سے کچھ بھی نہ دھوتے تھے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔''

تقبل وتدبر: یہ اقبال اور ادبار سے ہے۔

تشریح: فی المسجد فی زمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: علامہ طیبیؒ نے فرمایا یہ کسی کسی وقت میں ہوتا تھا اور مسجد نبوی

کا دروازہ بھی نہ ہوتا تھا کہ جو ان کتوں کو گزرنے سے روک دے۔

یرش : ای یغسلون ۔

"رشٌّ" یہاں پانی بہانے کے معنی میں ہے یعنی ان کتوں کے آنے جانے کی وجہ سے ان جگہوں پر پانی نہیں بہاتے تھے۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح فرمایا ہے، اور یہ حدیث تفصیل کے ساتھ پہلے گزر چکی ہے اور اس کی تاویل بھی گزر چکی ہے۔

حلال جانوروں کے پیشاب کا حکم

۵۱۵: وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَابَأْسَ بِبَوْلِ مَايُؤْكَلُ لَحْمُهٗ۔

(رواه احمد و الدارقطنی)

أخرجه الدارقطنی ۱۲۸/۱ حديث رقم ۳ من باب نجاسة البول والأمر بالتنزه منه والحكم فی بول مايؤكل لحمه۔

ترجمہ: "حضرت براءؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا جائے ان کے پیشاب میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

تشریح: لاباس ببول مایو کل لحمه : امام نوویؒ نے روضہ میں یہ ارشاد فرمایا ہے ہمارے لئے حلال جانور کے پیشاب اور ان کی لید وغیرہ کے پاک ہونے کی دلیل موجود ہے اور وہ ابو سعید اصطخریؒ کا قول ہے اور رویانیؒ نے اس کو اختیار کیا ہے اور یہی مذہب امام مالک اور امام احمدؒ کا ہے۔ (طیبی)

اور ہمارے ائمہ میں سے امام محمدؒ کا بھی یہی قول ہے۔

۵۱۶: وَفِیْ روایة جابر قَالَ مَا اُكِلَ لَحْمُهٗ فَلَا بَاسَ بِبَوْلِهٖ۔ (رواه احمد و الدارقطنی)

أخرجه الدارقطنی ۱۲۸/۱ حديث رقم ۳ من باب نجاسة البول والأمر بالتنزه منه والحكم فی بول مايؤكل لحمه.

ترجمہ: "اور حضرت جابرؓ کی روایت میں اس طرح ہے کہ جس جانور کا گوشت کھایا جائے اس کے پیشاب میں کچھ حرج نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام احمد اور امام دارقطنی نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: امام ابو یوسفؒ نے اس کو حدیث عرینین کی وجہ سے تداوی پر محمول کیا ہے اور جمہور اس مسئلہ میں "**استنزهوا من البول فان عامة عذاب القبر منه**" کے عموم سے دلیل پکڑتے ہیں اس روایت کو حاکم نے ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہیں۔

بَابُ الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ

موزوں پر مسح کرنے کا بیان

اس باب کو وضوء اور غسل سے مؤخر ذکر کیا گیا جیسا کہ جزو کو کل سے یا نائب کو اصل سے مؤخر کیا جاتا ہے لیکن مسح علی خفین

کی نیابت وضوء کے ساتھ خاص ہے، جیسا کہ ابھی آئے گا اور مسح کہتے ہیں عضو پر تَر ہاتھ کا پہنچانا اور یہاں مسح علیٰ کے ساتھ متعدی ہے اس میں موضع مسح کی طرف اشارہ ہے اور وہ موزے کے اوپر والا حصہ ہے نہ کہ نیچے والا اور اندر والا جیسا کہ حدیث میں خلاف قیاس وارد ہے۔ اور خف (موزہ) کہتے ہیں جو ٹخنے کو ڈھانپ لے اور اس کے ساتھ سفر کی ضروریات ممکن ہوں اور خفین تثنیہ اس لئے ذکر کیا گیا کیونکہ ایک پر مسح کرنا کافی نہیں ہے اور یہ سنت سے ثابت ہے جیسا کہ آپ کو ابھی معلوم ہوگا۔

حسن بصریؒ نے فرمایا ہے کہ میں نے ستر صحابہ کو دیکھا کہ وہ موزوں پر مسح کو جائز سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ میں مسح علی الخفین کا اس وقت تک قائل نہ ہوا یہاں تک کہ میرے پاس روزِ روشن کی طرح دلائل نہ آگئے اور امام کرخیؒ فرماتے ہیں مجھے اس شخص پر کفر کا ڈر ہے جو مسح علی الخفین کو جائز نہیں سمجھتا اس لئے کہ اس میں وارد شدہ احادیث وآثار حد تواتر تک پہنچ چکے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جو موزوں پر مسح کو جائز نہیں سمجھتا وہ اہل بدعت اور اہل ہوا میں سے ہے۔ یہاں تک کہ حضرت انس بن مالکؓ کو اہل سنت والجماعت کی علامات کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ تو شیخین (ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) سے محبت کرے اور دونوں دامادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن تشنیع نہ کرے اور موزوں پر مسح کرے۔ اس کو خوب اچھی طرح سمجھ لو۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ کتاب اللہ سے بھی ثابت ہے "ایۃ الوضوء" کی دونوں قراءتوں کو دو حالتوں پر محمول کرنے کے ساتھ جن کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا ہے۔

پھر بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہ اس اُمت کی خصوصیات میں سے ہے اور ایسی رخصت ہے جو آسانی ونفع کی خاطر شروع کی گئی ہے تا کہ بندہ اس کے ساتھ اپنے ربّ کی کثرت سے عبادت کرنے پر اور اپنی معاشی ضروریات میں آنے جانے میں قادر ہو یا یہ رخصت اس حرج کو دور کرنے کیلئے ہے جو اس اُمت سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ [الحج:۷۸] "اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی" سے اٹھا لیا گیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث: **بعثت بالملة الحنيفية السمحاء** سے "کہ مجھے ملت اسلام دیکر مبعوث کیا گیا ہے جو کہ سہولت ونرمی والی ہے"۔

اور بہت ساری صحیح مشہور روایات اس آدمی کا ردّ ہیں جو امام مالکؒ سے مسح علی الخفین کے مطلقاً عدم جواز کو نقل کرتا ہے یا حضر میں عدم جواز کو نقل کرتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے موزوں پر مسح کرنا سفر وحضر میں ثابت ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کا حکم دینا اور اس میں رخصت دینا اور صحابہ وتابعین کا اس پر متفق ہونا ثابت ہے اور محقق حفاظِ حدیث میں سے ایک جماعت نے تصریح کی ہے کہ "مسح علی الخفین" کی روایات متواتر المعنیٰ ہیں اور بعض نے ان راویوں کو جمع کیا ہے جن سے یہ احادیث منقول ہیں تو ان کی تعداد ۲۰۰ تک پہنچی ہوئی ہے اور بعض علماء نے اس پر اجماع کا بھی دعویٰ کیا ہے، لیکن ابن المنذرؒ نے اس کا ردّ کیا ہے۔ ابن ہمامؒ کی ہدایہ کی شرح میں مذکور ہے کہ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ صحابہ میں سے سوائے حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابو ہریرۃؓ کے اور کسی سے "مسح علی الخفین" کا انکار ثابت ومروی نہیں ہے۔ باقی ابن عباسؓ اور ابو ہریرۃؓ تو ان سے حسن درجے کی روایات سے اس کے خلاف اور تمام صحابہؓ کی موافقت میں منقول ہے۔

اور باقی رہی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تو صحیح مسلم میں یہ روایت ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ کے علم کو حضرت علیؓ کی جانب پھیرا تھا

(یعنی ان سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے حضرت علیؓ کی طرف بھیج دیا تھا)۔ اور ایک روایت میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھ سے "مسح علی الخفین" کے بارے میں پوچھا گیا حالانکہ مجھے اس کا علم نہیں ہے۔

اور وہ روایت جو محمد بن مہاجر بغدادی نے حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے:

لان اقطع رجلي بالموسى احب الى من ان امسح على الخفين "کہ میں اپنے پاؤں استرے سے کاٹ دوں مجھے یہ زیادہ پسند ہے اس سے کہ میں موزوں پر مسح کروں" یہ روایت باطل ہے، محدثین نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

الفصل الاول:

مسح علی الخفین کی توقیت

۵۱۷ : عَنْ شُرَيْحِ بْنِ هَانِئٍ قَالَ سَأَلْتُ عَلِيَّ بْنَ اَبِيْ طَالِبٍ عَنِ الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ فَقَالَ جَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ لِلْمُسَافِرِ وَيَوْمًا وَلَيْلَةً لِلْمُقِيْمِ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فى صحيحة ۲۳۲/۱ حديث رقم (۸۵-۲۷٦)۔وأخرجه النسائى فى السنن ۸٤/۱ حديث رقم ۱۲۸ وأخرجه ابن ماجة فى السنن ۱۸۳/۱ حديث رقم ۵۵۲۔وأخرجه الدارمى فى السنن ۱۹۵/۱ حديث رقم ۷۱٤۔وأحمد في مسنده ۹٦/۱۔

ترجمہ: "حضرت شریح بن ہانیؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے مسح علی الخفین کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مسافر کے لئے تین دن اور تین راتیں اور مقیم کے لئے ایک دن اور ایک رات کی مدت مقرر کی ہے۔ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔"

تشریح: **عن شریح**: یہ تصغیر کے ساتھ ہے۔

ابن هانیء : ہمزہ کے ساتھ یہ فاعل کے وزن پر ہے انہوں نے حضور ﷺ کا زمانہ پایا ہے اور انہی کے نام کے ساتھ حضور ﷺ نے ان کے والد کی کنیت رکھی اور فرمایا کہ تو ابو شریح ہے، یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ صاحب مشکوٰۃؒ نے ان کو اسماء الرجال میں صحابہ کے عدد میں ذکر کیا ہے اور ابن الملکؒ نے تصریح کی ہے منار کی شرح میں کہ یہ تابعی ہیں تو گویا صاحب مشکوٰۃؒ نے مخضرمین کو صحابہ کے ساتھ ذکر کرنے میں ابن عبدالبر کی پیروی کی ہے۔

سالت علیؓ بن ابی طالب عن المسح: "خود نفس مسح یا مسح" کی مدت کے بارے میں سوال کیا **علی الخفین یا مسح علی الخفین** کے جواز کے بارے میں پوچھا، پہلی تشریح کے مطابق جواب سوال کے مطابق ہے اور دوسری صورت میں جواب سوال کو لازم ہے۔

ثلاثة ایام ولیالیھن للمسافر: جمہور حضرات کا مذہب یہ ہے کہ "مسح علی الخفین" کی مدت کی ابتداء مسح کے بعد حدث ہو جانے کے وقت سے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ مسح کے وقت سے مدت شروع ہو جاتی ہے اور اس حدیث کا ظاہر یہی ہے اور اسی وجہ سے امام نوویؒ نے کہا ہے کہ یہ دلیل کے اعتبار سے راجح ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ابتداء مدت پہننے کے وقت سے ہے۔

يوما وليلة للمقيم: یہ روایت امام مالکؒ کے خلاف دلیل ہے کیونکہ امام مالکؒ "مسح علی الخفین" کو مقیم کیلئے جائز نہیں سمجھتے اور مسافر کیلئے کوئی مدت مقرر نہیں کرتے۔

پھر جان لے اے مخاطب! کہ سفر لغت میں کہتے ہیں مسافت کے طے کرنے کو اور ہر قسم کے طے کرنے سے احکام میں تغیر نہیں آئے گا یعنی روزے کے افطار کا جواز اور نماز قصر پڑھنا اور تین دن اور تین رات موزوں پر مسح کرنا۔

پس حضور ﷺ نے تین دن مسح کرنے کی رخصت کو جنس مسافرین کیلئے عام قرار دیا ہے کیونکہ "المسافر" میں "لام" استغراق کیلئے ہے کسی معہود معین کے نہ ہونے کی وجہ سے اور عموم رخصت میں جنس کا ہونا ضروری ہے یہاں تک کہ ہر مسافر ہر سفر کے لئے تین دن تک مسح پر قادر مانا جائے گا۔ خلاصہ یہ نکلا کہ ہر مسافر تین دن تک مسح کر سکتا ہے، پس اگر سفر شرعی ان دنوں سے کم ہوتا تو مسافر ثابت ہوگا لیکن مسح اس کے لئے جائز نہ ہوگا تین دن تک حالانکہ ہر مسافر کیلئے یہ ثابت ہے اور اس لئے بھی کہ رخصت یقین کے ساتھ اٹھی ہوئی ہے، پس وہ شرعی سفر کے یقین کے بغیر ثابت نہ ہوگی اور وہ مقدار وہ ہے کہ جس کو ہم نے متعین کیا ہے اس لئے کہ اس سے زائد ہونے کا قائل کوئی بھی نہیں ہے۔

اور تین دن سے کم سفر والے کے لئے قصر کے ثبوت پر ابن عباسؓ کی حدیث دلالت کرتی ہے فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: **يا اهل مكة لاتقصروا في ادنى من اربع برد من مكة الى عسفان**۔ "اے مکہ والو! تم چار برد سے کم میں قصر نہ کرو یعنی مکہ سے عسفان تک (مکہ سے عسفان تک چار "برد" بن جاتے ہیں وہاں قصر کرلو)" یہ حدیث چار "برد" کے حصر کا فائدہ دیتی ہے۔ اور چار "برد" تین دنوں سے کم میں طے کرلیا جاتا ہے، اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے عبدالوہاب بن مجاہد (جو کہ اس میں ایک راوی ہے) اس کے ضعیف ہونے کی وجہ سے، پس تین دن سے کم میں قصر کا ہونا بلا دلیل باقی رہا۔ یہ ساری تحقیق ابن ہمامؒ نے ذکر کی ہے۔

وضو کے وقت موزے اُتارنے کی ضرورت نہیں

۵۱۸: وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ اَنَّهٗ غَزَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ غَزْوَةَ تَبُوْكَ قَالَ الْمُغِيْرَةُ فَتَبَرَّزَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قِبَلَ الْغَائِطِ فَحَمَلْتُ مَعَهٗ اِدَاوَةً قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَمَّا رَجَعَ اَخَذْتُ اُهْرِيْقُ عَلٰى يَدَيْهِ مِنَ الْاِدَاوَةِ فَغَسَلَ يَدَيْهِ وَوَجْهَهٗ وَعَلَيْهِ جُبَّةٌ مِنَ الْاِدَاوَةِ فَغَسَلَ يَدَيْهِ وَوَجْهَهٗ وَعَلَيْهِ جُبَّةٌ مِنْ صُوْفٍ ذَهَبَ يَحْسِرُ عَنْ ذِرَاعَيْهِ فَضَاقَ كُمُّ الْجُبَّةِ فَاَخْرَجَ يَدَيْهِ مِنْ تَحْتِ الْجُبَّةِ وَاَلْقَى الْجُبَّةَ عَلٰى مَنْكِبَيْهِ وَغَسَلَ ذِرَاعَيْهِ ثُمَّ مَسَحَ بِنَاصِيَتِهٖ وَعَلَى الْعَمَامَةِ ثُمَّ اَهْوَيْتُ لِاَنْزِعَ خُفَّيْهِ فَقَالَ دَعْهُمَا فَاِنِّيْ اَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا ثُمَّ رَكِبَ وَرَكِبْتُ فَانْتَهَيْنَا اِلَى الْقَوْمِ وَقَدْ قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ وَيُصَلِّيْ بِهِمْ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ وَقَدْ رَكَعَ بِهِمْ رَكْعَةً فَلَمَّا اَحَسَّ بِالنَّبِيِّ ﷺ ذَهَبَ يَتَاَخَّرُ فَاَوْمَا اِلَيْهِ فَاَدْرَكَ النَّبِيُّ ﷺ اِحْدَى الرَّكْعَتَيْنِ مَعَهٗ فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ النَّبِيُّ ﷺ وَقُمْتُ مَعَهٗ

فَرَكَعْنَا الرَّكْعَةَ الَّتِي سَبَقَتْنَا۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۳۱۷حديث رقم (۱۰۵-۲۷٤)۔وأخرجه البخاری مختصرا ومطولاً وأخرجه أبو داوٗد في السنن ۱/۱۰۳حديث ۱٤۹۔والنسائي في السنن ۱/۸۳حديث رقم ۱۲۵۔وأخرجه ابن ماجة في السنن ۱/۱۸۱حديث ۵٤۵،والدارمي في السنن۱/۱۹٤حديث رقم ۷۱۳۔وأخرجه أحمد في مسنده ٤/۲۵۱۔ واللفظ لمسلم۔

ترجمه: ''حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوہ تبوک میں شرکت کی۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسی دوران ایک دن رسول اللہ ﷺ فجر کے وقت قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے۔ میں بھی پانی کی چھاگل لے کر آپ کے ساتھ ہولیا۔ جب آپ ﷺ قضائے حاجت سے فارغ ہو کر واپس تشریف لائے اور وضو کرنے کے لیے بیٹھے۔تو میں نے آپ کے ہاتھوں پر پانی ڈالنا شروع کیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اور منہ دھوئے۔ آپ نے ایک اون کا جبہ پہنا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے آستین اوپر کرنی چاہی مگر آستین تنگ تھیں اوپر نہ ہوسکی۔ آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جبہ کے اندر سے نکال کر جبہ کو کندھوں پر ڈال لیا اور دونوں بازوؤں کو کہنیوں تک دھویا سر کے چوتھائی حصہ اور پگڑی پر مسح کیا۔ جب پاؤں دھونے کے لئے میں نے موزے اتارنے کا ارادہ کیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کو نہ اتارو بلکہ چھوڑ دو کیونکہ میں نے موزوں کو طہارت کی حالت میں پہنا ہے اور آپ نے دونوں موزوں پر مسح کیا پھر آپ ﷺ اور میں دونوں سوار ہو کر لوگوں کے پاس آئے تو نماز فجر کی جماعت شروع ہو چکی تھی اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نماز پڑھا رہے تھے اور ایک رکعت پڑھ چکے تھے جب ان کو رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کا احساس ہوا تو پیچھے ہٹنے لگے۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے ان کو اشارہ کیا کہ اپنی جگہ کھڑے رہو اور نماز پڑھاؤ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک رکعت ان کے ساتھ پڑھی جب عبدالرحمٰن بن عوف نے سلام پھیر لیا تو رسول اللہ ﷺ نے اور میں نے ایک رکعت کھڑے ہو کر پڑھ لی جو کہ رہ چکی تھی۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: تبوك: بعض نے کہا ہے کہ تبوک غیر منصرف ہے علمیت اور تانیث کی وجہ سے نہ کہ وزن فعل کی وجہ سے اگر یہ نام ہو جگہ کا تو اس کا منصرف پڑھنا جائز ہے یعنی تانیث ''بقعة'' اور ''بلدة'' کے اعتبار سے ہے اور یہ کہنا کہ **لا وزن الفعل** یہ قابلِ نظر ہے اور شاید کہ مراد یہ ہو کہ اس کا وزن ''فعول'' میں نہیں آتا لیکن یہ بات قاموس اور نہایہ کے مفہوم کے خلاف ہے۔

فتبرز رسول الله ﷺ: قاموس میں لکھا ہے کہ ''برز بروزًا'' کا معنی ہے کہ جب براز کی طرف نکلے جیسا کہ ''تبرز'' اور نہایہ میں لکھا ہے کہ ''براز'' فتحہ کے ساتھ فضاء واسیع کا نام ہے۔ اور عرب لوگ اس کے ذریعے قضاء حاجت کا کنایہ کرتے ہیں، جیسا کہ خلاء کے ساتھ قضائے حاجت کا کنایہ کرتے ہیں، کیونکہ وہ ان جگہوں میں قضائے حاجت کرتے تھے کہ جو جگہیں لوگوں سے خالی ہوتی تھیں۔ اور ''براز'' کسرہ کے ساتھ غائط (پائخانے) سے کنایہ ہے۔ ان تمام احتمالات کے باوجود ابن حجرؒ کے قول کے کوئی معنی نہیں ہیں انہوں نے اس جملے کی یوں وضاحت کی ہے: **اى خرج الى التبرز وهو قضاء الحاجة** بلکہ ''تبرز'' کا یہاں معنی ہے **خرج وذهب** یہ معنی تجرید کی بناء پر ہے آنے والے قول کی وجہ سے۔

قبل ''قاف'' کے کسرہ اور ''باء'' کے فتحہ کے ساتھ **اى جانبه لقضاء الحاجة** اور ''غائط'' زمین کی نشیبی جگہ کو کہتے ہیں۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اصل میں غائط پست زمین کو کہتے ہیں کہ جس میں آدمی قضائے حاجت کرتا ہے اور خارج (پائخانہ) کو غائط مجاورت کی وجہ سے کہتے ہیں اور اگر حقیقت مراد ہو تو واضح ہے، تقدیر عبارت یہ ہوگی: **خرج للتبرز نحو المكان المذكور** یا یہاں پر عبارت مراد ہے تو پھر تقدیر عبارت یہ ہوگی: **التبرز لاجل الغائط**۔

ابن حجرؒ کے اس کلام میں عبارت کی کمزوری کے ساتھ ساتھ **خرج التبرز لاجل الغائط** ان کی سابقہ عبارت کے منافی ہے کہ **قبل الغائط** کا قول یہ مجاورت کے مراد لینے کیلئے مانع ہے۔ غور کر لیجئے۔

معه اداوة : اداوة ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ، وضوء کا برتن یا چمڑے کا برتن (چھاگل) تا کہ اس سے وضوء کیا جائے اور حضور ﷺ کا نکلنا قضائے حاجت کیلئے تھا۔

قبل الفجر : اس میں دلیل ہے اس بات کی کہ اسبابِ عبادات کی تیاری میں جلدی کرنا ان عبادات کے اوقات کے داخل ہونے سے پہلے مستحب ہے۔

اهريق :ہمزہ کے ضمہ اور ''ہاء'' کے فتحہ اور سکون کے ساتھ ہے **ای اصب الماء**۔

علی یدیه من الادواة :اس حدیث میں طہارت کے اندر مدد لینے پر دلالت موجود ہے خصوصاً جب طہارت سے افادہ اور استفادہ مراد ہو۔

فغسل یدیه ووجهه :اس حدیث میں وضوء کے اندر کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کے عدم وجوب پر دلالت نہیں ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے گمان کیا ہے کیونکہ ذکر نہ کرنے میں یا تو یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ اختصار کی وجہ سے چھوڑ دیا ہو یا بھول گئے ہوں یا اس وجہ سے کہ یہ دونوں چہرے کی حد میں من وجہ داخل ہیں جیسا کہ انہوں نے اس بات کو اپنے محل میں ثابت کیا ہے اور احتمال کے ثابت ہونے کے ساتھ استدلال صحیح نہیں ہے۔

جبة من صوف :اس حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ اُون کا لباس پہننا مستحب ہے۔

ذهب : ای شرع واخذ اور یہ جملہ مستانفہ ہے اور یہ بات بعید نہیں ہے کہ یہ ضمیر مجرور سے حال واقع ہو۔

یحسر :''سین'' کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ ہے **ای یکشف کمیه**۔

فضاق کم الجبة :اس طرح کہ حضور ﷺ ''جبے'' کی آستین کے انتہائی تنگ ہونے کی وجہ سے اس کے بازو کو کہنیوں تک نہ چڑھا سکے۔

اس حدیث میں ردّ ہے ان بعض فقہاء کے اس اطلاق پر کہ اپنے ملک کے علاوہ کا لباس پہننا یہ مروّت انسانی کو گرا دیتا ہے اور اسی وجہ سے بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس بات کا محل اس شخص کے بارے میں ہے کہ جس نے اس کو کسی ضرورت کی وجہ سے نہ پہنا ہو یا سلف صالحین کی عدم تکلف اور عادات کی ہیئتوں میں ترکِ نظر کی اقتداء کا ارادہ نہ کیا ہو، پس بے شک یہ ایک نیا مسئلہ ہے، پس یہاں فقہاء نے مناط حکم عدم حاجت اور سلف کی پیروی نہ کرنے کے ارادے کو قرار دیا ورنہ تو صوفیاء نے فرمایا ہے کہ ارادہ ترک عادت ہے ہاں اگر اس لباس کو اس طرح سے بدلا کہ جس کے اندر عدم پرواہ تھی جو قلت جہاد پر دلالت کرنے والی ہے اور جس کے اندر قواعد عرفیہ اور امور شرعیہ میں سے کسی شئی کی بھی تقیید نہ تھی تو ایسے لباس کے پہننے والے کے بارے میں حکم لگایا

جائے مروّت (شرف انسانی) کے گرنے کے ساتھ اور عدالت کے نہ ہونے کے ساتھ جیسا کہ یہ بات اپنے محل میں ثابت ہے اور ان میں سے ایک چیز بازار میں کھانا ہے اور حدیث میں ہے کہ اصل ان چیزوں میں کہ جو مجوسیوں کے شہروں سے اور اسی طرح ان لوگوں کے شہروں سے جو نجاست کے ساتھ میلے کچیلے رہتے ہیں طہارت ہے جیسا کہ اُونی کپڑا اگر چہ مشہور یہ ہے کہ لوگ خنزیر کی چربی کے ساتھ اس کو تیار کرتے ہیں اور جیسا کہ پنیر اگر چہ کہا جاتا ہے کہ اس میں خنزیر کے نافے کو ڈالتے ہیں اور اس پر مسند احمدؒ کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ وہ حیرہ کے کپڑوں سے لوگوں کو روک دیں اس لئے کہ ان کپڑوں کو پیشاب کے ساتھ رنگا جاتا ہے، پس حضرت ابیؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپؓ ایسا نہ کریں تحقیق حضور ﷺ نے ان کپڑوں کو پہنا ہے اور حضور ﷺ کے ساتھ ہم نے بھی ان کپڑوں کو پہنا ہے اور خلال کی ایک روایت میں دوسرے طریق سے یوں آیا ہے کہ حضرت ابیؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا اے امیر المؤمنین! بلاشبہ نبی پاک ﷺ نے ان کپڑوں کو پہنا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اس کے مکان کا علم تھا اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ حرام ہوتا تو اپنے نبی پاک ﷺ کو اس سے روک دیتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا **صدقت**: آپ نے سچ فرمایا۔

اور طبرانی سند جید کے ساتھ روایت کیا ہے لیکن سند غریب ہے کہ حضور ﷺ کے پاس ایک غزوہ میں پنیر کا ٹکڑا لایا گیا، تو حضور ﷺ نے پوچھا کہ یہ کہاں بنایا گیا ہے؟ تو کہنے والے نے کہا فارس میں یعنی مجوس کی زمین میں اس وقت حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رکھو اس میں چھری کو اور کھاؤ، پس بعض نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ہمیں ڈر ہے کہ وہ مردار ہو، پس آپ ﷺ نے کہا اللہ کا نام لو اور کھاؤ۔

اور ترمذیؒ نے تخریج کی ہے کہ حضور ﷺ کو دو موزے ہدیئے میں دیئے گئے، پس آپ ﷺ نے ان کو پہنا اور یہ معلوم نہ تھا کہ وہ پاکیزہ کھال میں سے بنے تھے یا اس کے علاوہ سے اور حضرت سلمان کی حدیث میں پنیر' گھی اور گورخر (جنگلی گدھے) کے بارے میں سوال سے نہی واقع ہے حالانکہ یہ ساری چیزیں مجوسیوں کے شہروں سے آتی تھیں اور حضرت عمرؓ کے پاس پنیر کا تذکرہ ہوا اور یہ کہا گیا کہ اس میں مردار کے نافے کو ڈالا جاتا ہے (انافح انفحة کی جمع ہے بکری یا گائے وغیرہ کے معدے سے ایک مادہ نکال کر اس سے دودھ کا پنیر بناتے ہیں) فرمایا بسم اللہ پڑھو اور کھاؤ اور امام احمدؒ نے فرمایا ہے کہ مجوسیوں کے پنیر کے بارے میں یہ حدیث سب سے صحیح ہے۔

علی منکبیه: اس میں دلیل ہے اس بات کی کہ جبہ کے نیچے تہبند تھا یا قمیص تھی ورنہ تو ستر ظاہر ہو جاتا۔

ثم مسح بناصیته: اور یہ مقدر ہے ربع راس کے ساتھ کیونکہ ایک روایت میں یوں آیا ہے: **انه مسح علی مقدم راسه**۔

عمامه ''عین'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمہ میں مذکور ہے کہ عمامہ پر بغیر عذر کے سر کے علاوہ مسح کرنا جائز نہیں ہے ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ مسح علی العمامہ اس شرط پر جائز ہے کہ جب عمامے کا کچھ حصہ ٹھوڑی کے نیچے ہو۔

ابن حجرؒ نے فرمایا اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وضوء کے اندر مسح رأس میں پورے سر کا گھیرنا اور اسی طرح چوتھائی سر

کا گھیرنا واجب نہیں ہے اس لئے کہ ناصیہ اس سے بہت کم ہے۔ہم (حنفیہ) کہتے ہیں کہ ناصیہ کی مقدار چوتھائی سر ہے اور اگر ہم اس کے منع کی صحت کو بھی مان لیں تو پھر بھی واجب ہوگا کہ اس کو کسی معلوم مقدار کے ساتھ مقدر مانا جائے جیسا کہ ہمارے بعض ائمہ نے تین انگلیوں کے ساتھ مقدر مانا ہے اس لئے کہ یہ مقدار سب سے کم ہے اس میں سے کہ جس کے ساتھ حضور ﷺ نے بیان جواز کے لئے اکتفاء فرمایا باجودیکہ عادت شریف ہمیشہ تمام حالات میں استیعاب کی تھی، پس اگر اس سے کم مسح جائز ہوتا تو حضور ﷺ ایک مرتبہ اس کو بیان جواز کیلئے ضرور کرتے، پس یہاں یہ کہنا کہ جس پر مسح کا اطلاق ہو سکے وہ مسح ہے اگرچہ مقدار کم ہو یہ بات نصوص کے ظاہر کے خلاف ہے۔

اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ پورے سر کے گھیرنے کے قائلین کا یہاں یہ دعویٰ کرنا کہ مسح علی العمامہ کسی عذر کی بناء پر تھا یہ مردود ہے اس لئے کہ عذر احتمال کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا۔ابن حجرؒ کا یہ قول قابلِ ردّ ہے اس لئے کہ حضور ﷺ استیعاب پر ہمیشگی فرماتے تھے اور اس جگہ سر کے بعض حصے اور عمامے پر مسح کرنا استیعاب کی تکمیل کی وجہ سے تھا اور یہ ایسا قرینہ ہے جو عذر پر دلالت کر رہا ہے لیکن وہ بات اس وقت پوری ہوتی ہے جب کہ آپ ﷺ سے عمامے پر مسح کے علاوہ سر کے بعض حصے پر مسح واقع نہ ہوا ہو حالانکہ بعض سر پر مسح متعدد روایات سے ثابت ہے۔واللہ اعلم۔

امام محمدؒ نے موطا امام محمد میں فرمایا ہے: **اخبرنا مالك قال بلغني عن جابر انه سئل عن العمامة فقال لاحتى يمس الشعر الماء۔** ''کہ حضرت جابرؓ سے عمامے پر مسح کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا یہ جائز نہیں یہاں تک پانی بالوں کو چھولے۔ پھر امام محمدؒ نے فرمایا ہے: **واخبرنا مالك عن نافع قال رايت صفية ابنة ابى عبيد تتوضأ و تنزع خمارها ثم تمسح براسها۔ قال نافع وانا يومئذ صغير۔** ''نافعؒ فرماتے ہیں میں نے صفیہ بنت ابی عبید کو وضوء کرتے دیکھا انہوں مسح کے وقت دوپٹہ اتارا اور سر کا مسح کیا، نافعؒ فرماتے ہیں کہ میں اس وقت ابھی نابالغ تھا' چھوٹا تھا''۔امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ مسح علی العمامہ کا حکم پہلے تھا بعد میں متروک ہوگیا۔

ثم اهويت :یعنی قیام سے بیٹھنے کی طرف جھکنے کا ارادہ کیا اور بعض نے کہا ہے کہ ''اھواء'' کہتے ہیں ہاتھ کو کسی چیز کے پکڑنے کیلئے مائل کرنا۔ **اى انحنيت۔**

لا نزع خفيه :یہ گمان کرتے ہوئے کہ غسل رجلین مطلق احوال میں واجب ہے۔

فانى ادخلتهما طاهرتين:اور ایک روایت میں ہے: **فانى ادخلتهما وهما طاهرتان۔** شمنیؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں امام شافعیؒ کے اس مذہب کی دلیل نہیں ہے کہ موزے پہننے وقت مکمل طہارت شرط ہے اس لئے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ''میں نے ان میں سے ہر ایک کو پہننا ہے اس حال میں کہ پاؤں پاک تھے'' اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہتے ہیں: **دخلنا البلد ركبانا** ''یعنی ہم سے ہر ایک سوار ہونے کی حالت میں داخل ہوا''۔ یہ مطلب نہیں کہ ہم سارے کے سارے سوار تھے ہم میں سے ہر ایک کے داخل ہونے کے وقت۔خلاصہ یہ ہے امام شافعیؒ کے نزدیک موزے پہننے کے وقت طہارت کاملہ شرط ہے اور امام صاحبؒ کے نزدیک طہارت کاملہ حدث کے وقت شرط ہے اور اسی اصل کے اختلاف کی وجہ سے کئی فروعی مسائل میں اختلاف ہوا ہے جو کہ کتب فقہ میں مذکور ہے۔

فمسح علیھما: اور ابن حجرؒ کے ایک نسخے میں **فمسح بھما** ہے اور یہ صحیح نسخوں کے خلاف ہے۔

ائمہ نے مسح الخفین میں مقدار کفایت کے اندر اختلاف کیا ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں تین انگلیوں کے بقدر مسح کر لینا کافی ہے اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں اتنی مقدار کہ جس پر مسح کا اطلاق ہو سکے اور امام احمدؒ نے فرمایا ہے کہ اکثر حصے کا مسح کرے اور امام مالکؒ استیعاب کے قائل ہیں۔

شرع یتاخر: یعنی اپنی جگہ سے ہٹنے لگے تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے آ جائیں۔

فادرك النبی صلی اللہ علیہ وسلم احدی الرکعتین معه: یعنی دوسری رکعت میں حضرت عبدالرحمان بن عوف کی اقتداء کی اور اس حدیث میں افضل کے مفضول کی اقتداء کے جواز کی دلیل ہے جب کہ وہ مفضول ارکان صلوٰۃ کو جانتا ہو اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ امام کیلئے عصمت شرط نہیں روافض وشعیہ میں سے فرقہ امامیہ اس سے اختلاف کرتا ہے۔

قام النبی: بقیہ نماز کو ادا کرنے کیلئے کھڑے ہوئے۔

وقمت معه: یعنی میں بھی اٹھ گیا کیونکہ میں بھی مسبوق تھا۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے وہ مسئلہ اخذ ہوتا ہے جو ہمارے ائمہ نے بیان کیا ہے کہ مسبوق کیلئے امام کے سلام پھیرنے کے بعد اٹھنا جائز ہے پہلے نہیں پس اگر پہلے اٹھ گیا جدا ہونے کی نیت کے بغیر جان بوجھ کر تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی یا جہالت کی وجہ سے ایسا کیا یا بھول کر کیا تو نماز کا لوٹانا اس پر واجب ہوگا۔

اور ہمارے علماء احناف فرماتے ہیں کہ امام کے سلام پھیرنے سے پہلے مسبوق کا اٹھنا مکروہ تحریمی ہے الا یہ کہ اس کا پہلے اٹھنا اپنی نماز کو فاسد ہونے سے بچانے کی وجہ سے ہو جیسا کہ اسے ڈر ہو کہ اگر امام کے سلام پھیرنے کا میں انتظار کرتا ہوں تو میری نماز پوری ہونے سے پہلے سورج طلوع ہو جائے گا، پس اگر وہ امام کے تشہد کی مقدار بیٹھنے سے پہلے اٹھ گیا تو اب دیکھا یہ جائے گا کہ اس کی کتنی رکعتیں گئی ہیں؟ اگر وہ ایک رکعت کا مسبوق ہے تو اگر اس کی قراءت میں سے اتنی قراءت کہ جس کے ساتھ نماز ہو جاتی ہے امام کے تشہد سے فارغ ہونے کے بعد واقع ہو تو نماز اس کی ہو جائے گی ورنہ نماز فاسد ہوگی۔ اس لئے کہ امام کے تشہد سے فارغ ہونے سے پہلے اس کا قیام اور قراءت معتبر نہیں ہے اور یہ ایسا مسئلہ ہے کہ جاہل اس کو اس طرح کرتے ہیں اور لوگ اس مسئلے سے غافل ہیں۔ (یعنی لوگ جہالت کی بناء پر تشہد کی مقدار سے پہلے اٹھ جاتے ہیں)۔

فرکعنا الرکعة التی سبقتنا: ای فاتتنا امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ اصول میں یہ صیغہ ''سین'' ''فاء'' اور ''قاف'' کے فتحہ کے ساتھ ہے اور اس کے بعد ''تاء'' ساکنہ ہے ای **وجدت قبل حضورنا**۔ اور باقی عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کا اس نماز میں امامت پر باقی رہنا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک نماز میں امامت سے پیچھے ہٹ جانا جیسا کہ دوسری روایت میں آیا ہے تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے آ جائیں' تو ان دونوں واقعات میں فرق یہ ہے کہ عبدالرحمان بن عوفؓ کے واقعہ میں یہ بات ہے کہ وہ ایک رکعت پڑھ چکے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے آنے کو اس لئے اختیار نہیں فرمایا تا کہ لوگوں کی نماز میں خلل نہ پڑے، بخلاف حضرت ابوبکر صدیقؓ کے واقعے کے۔ ہاں البتہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے واقعہ میں یہ بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے نہ ہٹنے کا اشارہ کیا لیکن اس کے باوجود ابوبکر صدیقؓ ہٹ گئے اور عبدالرحمانؓ کو اشارہ کیا نہ ہٹنے کا تو وہ پیچھے نہ ہٹے۔ پس اس میں یا تو وہی بات کہی

جائے جو پہلے گزری کہ حضرت عبدالرحمانؓ کے ذہن میں یہ تھا کہ پیچھے ہٹنے میں لوگوں کو تکلیف ہوگی پس وہ پیچھے نہ ہٹے اور ابوبکر صدیقؓ کو معلوم تھا کہ پیچھے ہٹنے میں کوئی ضرر نہیں ہے اس لئے وہ پیچھے ہٹ گئے یا اس کے بارے یہ کہا جائے اور یہی احسن بات ہے وہ یہ کہ ابوبکر صدیقؓ نے یہ سمجھا کہ ادب کا راستہ امر کے پورا کرنے سے بہتر ہے، بخلاف عبدالرحمان بن عوفؓ کہ انہوں نے یہ سمجھا کہ امر کا پورا کرنا اولیٰ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پہلی صورت اکمل ہے اس لئے کہ کلام ایسے امر کے بارے میں ہے کہ قرائن سے معلوم ہو کہ وہ امر مامور کے حال کی رعایت کی وجہ سے ہے نہ کہ امر کے حال کی رعایت کی وجہ سے، پس امتثال امر میں امر کے ساتھ کمال ادب میں خلل کا وہم معلوم ہوتا ہے اگرچہ امتثال امر میں ایک قسم کا ادب موجود ہے (لیکن کمال ادب نہیں ہے) اور ادب کو ترجیح دینے میں امر کے حال کی رعایت کا اظہار ہے اور مامور کے حال سے من کل الوجوہ اعراض ہے پس ادب کی رعایت اولیٰ اور اکمل ہوگی۔

اور تحقیق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابوبکر صدیقؓ خوشی کی وجہ سے پیچھے ہٹنے سے اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے اور آگے ہونے سے رکنے میں مبالغے کی وجہ سے، اور ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد کہا تم نے اچھا عمل کیا نماز کو اپنے وقت پر پڑھو یعنی مستحب وقت کے داخل ہونے کے بعد امام کے انتظار کی وجہ سے مؤخر نہ کرو اور امام کے انتظار کا چھوڑنا اس وقت مستحب ہے جب کہ بہت وقت گزر جائے اور مقتدیوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کب آئے گا باقی اگر ان کو معلوم ہو جائے تو پھر انتظار مستحب ہے اور اگر امام کے رہنے کی جگہ قریب ہو تو اس کو نماز کا وقت بتلانا مستحب ہے۔

امام بخاریؒ نے اصل حدیث کو کتاب اللباس اور اس کے علاوہ بعض دوسری جگہوں میں ذکر کیا ہے اور المسح علی الناصیۃ کو اپنی کتاب میں ذکر نہیں کیا اور نہ مسح علی العمامۃ کو حضرت مغیرہ کی حدیث سے اور نہ ہی اپنی کتاب میں یہ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کا لوگوں کو اور حضور ﷺ کو نماز پڑھانے کا ذکر کیا ہے۔ میرک شاہؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

الفصل الثانی:

مسح علی الخفین مسافر کے لئے تین دن اور مقیم کے لئے ایک دن ہے

۵۱۹: وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ رَخَّصَ لِلْمُسَافِرِ ثَلَاثَةَ اَیَّامٍ وَلَیَالِیَهُنَّ وَلِلْمُقِیْمِ یَوْمًا وَلَیْلَةً اِذَا تَطَهَّرَ فَلَبِسَ خُفَّیْهِ اَنْ یَّمْسَحَ عَلَیْهِمَا.

(رواه الاَثْرَمُ فِیْ سُنَنِهٖ وَابْنُ خُزَیْمَةَ والدارقطني وقال الخطابي هو صحيح الاسناد هكذا في المنتقى)

أخرجه الدارقطني في السنن ١/١٩٤ الحديث الأول من باب في المسح على الخفين.....وأخرج ابن ماجة نحوه في السنن ١/١٨٤ حديث رقم ٥٥٦۔

ترجمہ: ''حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسح علی الخفین کی اجازت مسافر کو تین دن اور تین رات تک اور مقیم کو ایک دن اور ایک رات تک دی ہے جب کہ موزوں کو طہارت کے بعد پہنا ہو۔ اس حدیث کو اثرم نے اپنی سنن میں اور ابن خزیمہ نے اور امام دارقطنی نے روایت کیا ہے اور علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے اور

علامہ ابن تیمیہ کی کتاب المنتقیٰ میں بھی اسی طرح منقول ہے۔''

تشریح: **عن ابی بکرۃ** : بکرۃ ''تاء'' کے ساتھ ہے۔ صاحب مشکوٰۃؒ نے فرمایا ہے کہ یہ نفیع بن حارث ہیں۔ نفیع ''نون'' کے ضمہ اور ''تاء'' کے فتحہ اور ''یاء'' کے سکون کے ساتھ۔ بعض نے کہا ہے کہ طائف کی لڑائی میں چرخی کے ساتھ اترے تھے اور مسلمان ہوئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کنیت ابوبکرہ رکھی (بکرہ چرخی کو کہتے ہیں جس سے وزنی اشیاء کو اٹھایا جاتا ہے) اور آزاد کردیا پس یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موالی میں سے ہیں بصرہ میں رہائش پذیر ہوئے اور ۴۹ ہجری کو ان کی وفات ہوئی ان سے خلق کثیر نے روایت کی ہے۔

للمسافر ثلاثة ایام ولیالیهن وللمقیم یوما ولیلة:
اس میں اختلاف ہوا ہے کہ آیا مسح افضل ہے یا غسل؟ صحیح مذہب یہ ہے کہ اگر موزوں کو اس کی شرائط کے ساتھ پہنے ہوئے ہوں پس اس صورت میں مسح افضل ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل پہلے گزر چکا ہے۔

اذا تطهر فلبس خفیه: یعنی پاؤں کی طہارت کے بعد موزوں کو پہنا اور تعقیب شرط نہیں ہے ''فاء'' محض بعدیت کیلئے ہے پس ابن الملکؒ کا یہ کہنا کہ ''فاء'' تعقیب کیلئے ہے اس قول کا کوئی قائل نہیں ہے اور ان کا یہ کہنا اس جملے کی تشریح میں ای **لبس خفیه** بعد تمام الطہارۃ یہ ان کے اپنے مذہب کے خلاف ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔

ان یمسح علیهما: یہ رخص کا مفعول ہے۔

الاثرم: اثرم ہمزہ کے فتحہ اور ''ثاء'' کے سکون اور ''راء'' کے فتحہ کے ساتھ۔

ترمذی نے بھی اس کو نقل کیا ہے امام بخاریؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ سید جمال الدینؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

وقال الخطابی هو صحیح الاسناد هکذا فی المنتقی: منتقی یہ ابن تیمیہ حنبلی کی کتاب ہے اور خطابیؒ کے علاوہ نے یہ کہا ہے کہ یہ حسن الاسناد ہے دونوں صورتوں میں سے ہر ایک کی بنیاد پر یہ حدیث مسح کی مدت کے مقرر ہونے پر حجت ہے اور اسی پر اکثر علماء کا مذہب ہے۔ اور امام مالکؒ اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ مسح کی مدت مقرر نہیں ہے بلکہ مسافر و مقیم جب تک چاہیں مسح کر سکتے ہیں اس حدیث کی وجہ سے جو اس میں وارد ہے لیکن اس پر سارے متفق ہیں کہ وہ حدیث ضعیف اور مضطرب ہے اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا اور حضرت عمرؓ کا قول اس شخص کے لئے جس نے ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک مسح کیا تھا۔ **اصبت السنة** کہ تو سنت کو پہنچا ہے یعنی تیرا عمل سنت کے مطابق ہے یہ قول معارض ہے حضرت عمرؓ سے منقول شدہ اس صحیح روایت کے کہ جس میں توقیت کا ذکر ہے پس یا تو حضرت عمرؓ نے اُس سے رجوع کر لیا تھا جس وقت ان کو حدیث توقیت پہنچی ہوگی اور یا حضرت عمرؓ کا توقیت والا ارشاد ہی قابلِ اعتماد ہوگا اس لئے کہ وہی قول سنت صحیحہ کے موافق ہے اور اس کے ساتھ ساتھ **اصبت السنة** میں یہ احتمال بھی تو ہو سکتا ہے کہ نفس مسح مراد ہو اور اس سے ان لوگوں کا ردّ کرنا ہو جو مسح کے عدم جواز کے قائل ہیں۔

جنابت سے موزے اُتارے جائیں

۵۲۰: وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَاْمُرُنَا اِذَا كُنَّا سَفَرًا اَنْ لَّا نَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ وَلَيَالِيْهِنَّ اِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ وَلٰكِنْ مِّنْ غَائِطٍ وَبَوْلٍ وَّنَوْمٍ۔ (رواه الترمذی والنسائی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۱۵۹حديث رقم ۹۶وقال حديث حسن صحيح وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۸۳حديث رقم ۱۲۷۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۱۶۰حديث رقم ۴۷۸۔وأخرجه أحمد فی المسند ۲۳۹/۴/۴۔

ترجمہ: ''حضرت صفوان بن عسالؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم سفر میں ہوتے تھے تو رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیتے تھے کہ تین دن اور تین راتوں تک ہم قضائے حاجت اور نیند کے بعد موزے نہ اتاریں۔اس حدیث کو امام ترمذی اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: صفوان' سلمان کے وزن پر ہے اور یہ قبیلہ مراد سے ہیں اور کوفہ میں رہائش پذیر تھے اور ان کی حدیث اہل کوفہ میں مشہور ہے۔

ابن عسال: یہ ''عین'' کے ساتھ اور ''سین ولام'' کی تشدید کے ساتھ ہے۔

سفرا: ''فاء'' کے سکون کے ساتھ ''تنوین'' کی صورت میں یہ سافر کی جمع ہے ای **مسافرین** اور ایک روایت میں ہے **اذا کانوا مسافرین او سفرا** راوی کی طرف سے شک ہے۔

ان لا ننزع: یعنی ہمیں روکتے تھے موزے اتارنے سے اور یہ ہماری اس بات کی تائید ہے کہ جسے ہم نے صحیح قرار دیا ہے کہ مسح افضل ہے۔

الا من جنابة: یہ استثناء مفرغ ہے تقدیر عبارت یہ ہے: **ان لا ننزع خفافنا من حدث من الاحداث الا من جنابة** کیونکہ غسل کرنے والے کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ موزے پر مسح کرے بلکہ اس پر اتارنا واجب ہے اور پاؤں کو دھونا باقی اعضاء کی طرح واجب ہے۔

اور **الا من جنابة** کا قول جب جنابت کی صورت میں موزوں کو اتارنے کے اثبات کیلئے تھا تو (حرف استدراک) کے ذریعے ان حدثوں کو خارج کر دیا جن میں موزے کا اتارنا مشروع نہیں ہے کیونکہ موزے کے اتارنے کے وجوب کا اختصاص جنابت کے ساتھ ہے نہ کہ اس کے علاوہ دوسرے اسبابِ حدث سے اور اس کو علی وجہ التاکید ذکر کیا ہے۔

ولکن: یہ مقدر عبارت پر عطف ہے اس پر **الا من جنابة** دلالت کر رہا ہے۔

من غائط: یہ محذوف کے ساتھ متعلق ہے تقدیر عبارت یوں ہے: **فنحن ننزع من جنابة ولکن لا ننزع من غائط۔**

وبول ونوم: ''واؤ'' ان دونوں میں ''اَو'' کے معنی میں ہے یعنی بلکہ ہم وضو کریں گے اور ان پر ان میں سے کسی ایک کی

وجہ سے مسح کریں گے اور لا من جنابة بھی مروی ہے اور یہ زیادہ ظاہر ہے: ای یامرنا ان لاننزع خفافنا ثلاثة ایام ولیالیهن من حدث لا من جنابة فانه لا یامرنا ان ننزع ولکن یا مرنا ان لا ننزع من غائط۔ خلاصہ یہ ہے کہ "لکن" کا فائدہ یہ ہے کہ اس کا ماقبل مابعد کے مخالف ہوتا ہے نفی کی صورت میں ہو یا اثبات کی صورت میں تحقیقاً ہو یا تاویلاً پس تقدیر عبارت یہ ہوگی: امرنا رسول الله ﷺ اذا کنا سفرا ان ننزع خفافنا من الجنابة فی المدة المذکورة ولکن لا ننزعها فیها من غائط وبول ونوم وغیرها اور بعض حضرات نے اس روایت کو ردّ کرنے کا گمان کیا ہے، اس لئے کہ حدیث کا ظاہر عطف کے قاعدے کے منافی ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے زیادہ سے زیادہ اس میں یہ بات ہے کہ یہ کسی تاویل کا محتاج ہے یہاں تک کہ اس قاعدے کے موافق ہو جائے اور اس طرح یہ حدیث ردّ کی متقاضی نہیں ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

مسح علی الخفین کا محل کیا ہے؟

۵۲۱: وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ وَ ضَّأْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِيْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ فَمَسَحَ اَعْلَى الْخُفِّ وَاَسْفَلَهٗ (رواه ابوداود والترمذی وابن ماجة وقال الترمذی هذا الحديث مَعْلُولٌ وَسَأَلْتُ اَبَا زُرْعَةَ وَمُحَمَّدًا يَعْنِي الْبُخَارِيَّ عَنْ هذا الحديث فَقَالَ لَيْسَ بِصَحِيْحٍ وَكَذَا ضَعَّفَهٗ ابوداود)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱۱۶/۱ حدیث رقم ۱۶۵ وضعفه ۔ وأخرجه ابن ماجة ۱۸۳/۱ حدیث رقم ۵۵۰ وأخرجه الترمذی فی السنن ۱۹۲/۱ حدیث رقم ۹۷ وقال سالت أبا زرعة ومحمد بن إسماعیل عن هذا الحدیث فقالا لیس بصحیح ۔

ترجمہ: "حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے غزوہ تبوک کے سفر میں رسول اللہ ﷺ کو وضو کرایا تھا اور آپ ﷺ نے موزوں کے اعلیٰ اور اسفل دونوں پر مسح کیا تھا۔ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث معلول ہے اور میں نے اس حدیث کے بارے میں ابو زرعہ اور محمد بن اسماعیل بخاری سے پوچھا تو دونوں نے کہا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اور امام ابوداؤد نے بھی اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔"

اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث معلول ہے۔ نیز میں نے اس کے متعلق ابوزرہ اور محمد یعنی امام بخاریؒ سے پوچھا تو دونوں نے کہا کہ یہ حدیث صحیح نہیں اور ابوداؤد نے بھی اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

تشریح: **فی غزوة تبوك**: صحیح یہ ہے کہ یہ غیر منصرف ہے ای فی زمانها۔

فمسح اعلی الخف واسفله: اور اسی وجہ سے امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ موزے کے اوپر والے حصے کا مسح کرنا واجب ہے اور نیچے والے حصے کا مسح کرنا سنت ہے۔

اور اختلاف الائمہ میں یہ مذکور ہے کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سنت یہ ہے کہ موزے کے اوپر اور نیچے والے حصے پر مسح کیا

جائے اور امام احمدؒ نے فرمایا ہے سنت یہ ہے کہ صرف اوپر والے حصے پر مسح کرے اور اگر صرف اوپر والے حصے پر اکتفاء کرے تو یہ بھی جائز ہے بالاتفاق اور اگر صرف نیچے والے حصے پر اکتفاء کرے تو یہ بالاجماع جائز نہیں ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مشہور مذہب امام احمدؒ کی طرح ہے۔

اور ابن الملکؒ نے مصابیح کی شرح میں ذکر کیا ہے کہ شیخ امام بغویؒ نے فرمایا ہے کہ یہ مرسل روایت ہے اس کی اسناد حضرت مغیرہؓ کی طرف ثابت نہیں ہے اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ایک روایت میں ہے: **مسح اعلی خفیه خطوطا من الماء** ''کہ موزے کے اوپر والے حصے پر پانی سے خط کھینچتے ہوئے مسح کیا'' اور ایک روایت میں خطوطا بالاصابع مذکور ہے اور یہ ساری کی ساری روایات ضعیف ہیں اور صاحب نہایہ کا بعض روایات کو صحیح کہنا غلط ہے اور اسی طرح اسنویؒ کا اس کی تائید کرنا بھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہمارے مذہب پر استدلال ہوسکتا ہے کیونکہ ہمارے نزدیک اکمل صورت موزے کے مسح میں یہ ہے کہ اوپر اور نیچے والے حصے پر اور ایڑی پر اور پاؤں کے کنارے پر خط کھینچتے ہوئے مسح کرے اور یہ فضائل میں سے ہے اور فضائل میں حدیث ضعیف، مرسل، منقطع پر بالاتفاق عمل کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ علامہ نوویؒ نے کہا ہے اور ابن عمرؓ نے اس کو بیان کیا ہے جیسا کہ امام بیہقی اور بعض دوسرے حضرات نے اس کو روایت کیا ہے جس کو امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب نے لیا ہے۔ حضرات شوافع یہ کہتے ہیں کہ اکمل صورت مسح کے طریقے میں یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو کشادہ کر کے موزے کے اوپر اگلے حصے پر رکھے اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو ایڑی کے نیچے پھر ان دونوں کو پھیرے موزے پر، پس دائیں ہاتھ کی انگلیاں پنڈلی تک پہنچ جائیں گی اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے سروں تک نیچے سے۔

ظاہر یہ ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل کرنا اس کا محل اس وقت ہے جب کہ وہ صحیح حدیث اور حسن کے مخالف نہ ہو اور اس حدیث کی مخالف روایت جو اس حدیث کے بعد ہے وہ آرہی ہے اور اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی حدیث بھی اس بارے میں وارد ہے نیز حدیث ضعیف سے فضائلِ اعمال میں اس وقت عمل کیا جاتا ہے جب کہ وہ دوسرے ادلہ سے ثابت ہوں اور یہاں یہ حکم ابتدائی ہے باجود یہ کہ یہاں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جو اس کے ثواب اور فضیلت پر دلالت کرے۔ پس اس بات کو غور سے سمجھ لو اور پہلے تخت کو ثابت کرو پھر اس پر نقش ونگاری کرو۔

وقال الترمذی هذا حدیث معلول: ولید بن مسلم کے علاوہ ثور بن یزید سے اس کو کسی نے مسند نقل نہیں کیا ہے اسی طرح سید جمال الدینؒ نے ترمذیؒ سے نقل کیا ہے اور معلول روایت کتب اصول کے مطابق وہ روایت ہے کہ جس میں ایسا مخفی سبب ہے جو اس حدیث کے ردّ کو چاہتا ہو اور بعض نے کہا ہے کہ معلول روایت وہ ہے کہ جس میں ثقہ راوی کو مرفوع ہونے کا وہم ہوا ہو یا سند کے بدلنے کا یا زیادتی کا یا نقص جو معنی کو۔

فقال لیس بصحیح : اس لئے کہ ابن المبارکؒ نے اس روایت کو ثور بن اجار سے نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ حدیث کاتب مغیرہ سے مرسلا ہے حضرت مغیرہؓ کا انہوں نے تذکرہ نہیں کیا ہے۔ سید جمال الدینؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے امام ترمذیؒ سے۔

وکذا ضعفه ابو داؤد : اور اس کو ارسال کے ساتھ معلول قرار دیا ہے حاصل یہ ہے کہ یہ مرسل ہے مرفوع نہیں ہے۔

۵۲۲: وَعَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْسَحُ عَلَى الْخُفَّيْنِ عَلٰى ظَاهِرِهِمَا.

(رواه الترمذی وابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۱۱٤ حديث رقم ۱٦۱ ـ وأخرجه الترمذی فی السنن ۱/۱٦٥ حديث رقم ۹۸ وقال حديث حسن ـ

ترجمہ: ''حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موزوں کے ظاہر پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔اس حدیث کو امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: وعنہ: یعنی مفصل روایت حضرت مغیرہؓ سے۔

يمسح على الخفين على ظاهرهما: یعنی فرض محل کے ظاہر پر اور وہ پاؤں کا اگلا حصہ ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو دائیں موزہ کے اگلے حصہ پر رکھے اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں موزہ کے اگلے حصے پر رکھے اور پنڈلی کی طرف ٹخنوں کے اوپر تک کھینچے اور انگلیوں کو کشادہ رکھے یہ مسح کا طریق مسنون ہے اور اگر ایک انگلی سے تین مرتبہ مسح کرے ہر مرتبہ نئے پانی کے ساتھ نئی جگہ پر مسح کرے تو جائز ہے ورنہ جائز نہیں ہے اور خلاصہ میں لکھا ہے کہ اگر ہتھیلی کو رکھا اور اس کو کھینچا یا انگلیوں کے ساتھ کھینچا تو یہ تمام صورتیں اچھی ہیں سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ پوری ہاتھ کے ساتھ مسح کرے یہاں تک کہ انگلیوں کے ساتھ اور اگر ہتھیلی کے کنارے سے مسح کرے اور اسی طرح انگلیوں کے پوروں سے تو یہ بھی جائز ہے جبکہ ہاتھ کی تین انگلیوں کے مقدار تک پہنچ جائے اور بعض نے پاؤں کی تین انگلیوں کی مقدار بتلائی ہے اور یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے تمام کے نزدیک اس کے جائز ہونے پر اتفاق ہے اور ظاہر خفین سے مراد ان کا اوپر والا حصہ ہے جیسا کہ حضرت علیؓ کی روایت جو آئندہ آ رہی ہے اس پر دلالت کر رہی ہے، اسی طرح سید جمال الدینؒ نے فرمایا ہے۔

امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حسن روایت ہے۔

ابو ہمامؒ نے فرمایا ہے کہ اوسط طبرانی میں جریر بن یزید عن محمد بن منکدر عن جابر کے طریق سے روایت منقول ہے حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک آدمی کے پاس سے گزرے وہ وضوء کر رہا تھا اس نے اپنے موزوں کو دھویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پاؤں کے ساتھ چھیڑا اور فرمایا اس طرح یہ سنت نہیں ہے ہمیں تو اس طرح مسح کا حکم دیا گیا ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھوں کو موزوں پر گزارا۔اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مسح کر کے دکھلایا موزوں کے اگلے حصے سے پنڈلی تک اور انگلیوں کو کشادہ کیا۔اور شمنی میں ہے کہ ابن ابی شیبہ نے مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت کی ہے فرماتے ہیں:

رايت رسول الله ﷺ بال ثم توضا ومسح على خفيه؟ ووضع يده اليمنٰى على خفه الايمن ويده السيرى على خفه الايمن ثم مسح اعلاهما مسحة واحدة حتى انظر الى اصابع رسول الله ﷺ على الخفين۔''فرماتے ہیں میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب کیا پھر وضوء کیا اور موزوں پر مسح کیا اس طرح کہ دائیں ہاتھ کو دائیں موزے پر اور بائیں ہاتھ کو بائیں موزے پر رکھا پھر ایک بار ان موزوں کے ظاہری حصے پر مسح کیا یہاں تک گویا وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیاں موزوں پر تھیں''۔

مسح علی الجوربین کا مسئلہ

۵۲۳: وَعَنْهُ قَالَ تَوَضَّأَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَسَحَ عَلَى الْجَوْرَبَيْنِ وَالنَّعْلَيْنِ .

(رواه احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجة)

أخرجه أحمد فی المسند ۲۵۲/۴ أخرجه الترمذی فی السنن ۱۶۷/۱ حدیث رقم ۹۹ وقال حسن صحیح۔ وأخرجه أبوداؤد فی السنن ۱۱۲/۱ حدیث رقم ۱۵۹ وضعفه۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱۸۵/۱ حدیث رقم ۵۵۹

ترجمه: ''حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا اور نعلین کے ساتھ جوربین پر مسح کیا۔ اس حدیث کو امام احمدؒ اور امام ترمذی' امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: مسح علی الجوربین والنعلین: یعنی ان جوربین کے نعلین پر۔ جوربین پر مسح کرنا جائز ہے جب کہ ان جوربین سے پے در پے چلنا ممکن ہو ہمارے اصحاب میں سے ابن الملکؒ نے اسی طرح کہا ہے اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ والنعلین کا معنی یہ ہے کہ جوتوں کو جرابوں پر پہنے ہوئے تھے اور جوربین پر سلف میں سے ایک جماعت نے مسح کو جائز قرار دیا ہے اور فقہا اُمت میں سے بھی ایک جماعت نے یہ مذہب اختیار کیا ہے ان میں سے سفیان ثوری اور احمد اور اسحٰقؒ ہیں اور امام مالک بن انس اور امام اوزاعی اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ جوربین پر مسح کرنا جائز نہیں ہے۔

امام ترمذیؒ نے فرمایا حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اس روایت کو اس وجہ سے ردّ کیا گیا ہے کہ حضرت مغیرہؓ کی معروف روایت مسح علی الخفین کی ہے اور اس اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اس بات میں کوئی مانع نہیں ہے کہ حضرت مغیرہؓ دونوں حدیثوں کو نقل کریں اور مزید یہ کہ صحابہ کا فعل اس کی تائید کرتا ہے۔

امام ابوداؤدؒ نے فرمایا ہے اور جوربین پر حضرت علی، ابن مسعود، امامہ سہل بن سعد اور عمرو بن حریث رضوان اللہ علیہم اجمعین نے مسح کیا ہے اور حضرت عمرؓ اور ابن عباسؓ سے بھی یہی مروی ہے اور یہ جوربین اعم ہیں اس سے کہ وہ مجلدین ہوں اس طرح کہ اوپر نیچے والا حصہ چمڑے کا ہو یا منعلین ہوں اس طرح کہ صرف نیچے چمڑا ہو یا وہ گاڑھی ہوں اور پنڈلی پر جمی ہوئی ہوں امام ابویوسف اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے آخری قول کے مطابق اور اس پر فتویٰ ہے اور اسی طرح جرموقین پر مسح جائز ہے جرموق سے مراد وہ ہے جو سرد علاقوں میں موزوں کے اوپر پہنے جاتے ہیں اور جرموق فارسی معرب لفظ ہے اور امام شافعیؒ کے ایک قول میں اور امام مالکؒ کی ایک روایت کے مطابق جرموق پر مسح کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اکثر اس کی ضرورت نہیں ہوتی لہٰذا اس کے ساتھ رخصت متعلق نہیں ہوگی۔

اور ہماری دلیل وہ روایت ہے جس کو ابوداؤد اور ابن خزیمہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ عبدالرحمان بن عوفؓ نے بلالؓ سے سوال کیا حضور ﷺ کے وضوء کے بارے میں انہوں نے کہا کہ حضور ﷺ قضائے حاجت کیلئے نکلتے تو جب آپ ﷺ فارغ ہو جاتے تو میں آپ ﷺ کے پاس پانی لے کر آتا پس آپ ﷺ وضوء کرتے اور عمامہ اور

جرموقین پر مسح کرتے اور عقلی دلیل یہ ہے کہ جرموق اکثر موزے کے بغیر نہیں پہنا جاتا پس یہ اس موزے کے مشابہہ ہوگا جو دوتہہ والا ہو۔

امام ابوداؤدؒ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

الفصل الثالث:

مسح علی الخفین اللہ کا حکم ہے

۵۲۴: عَنِ الْمُغِيْرَةِ قَالَ مَسَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلَى الْخُفَّيْنِ فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ نَسِيْتَ قَالَ بَلْ أَنْتَ نَسِيْتَ بِهٰذَا اَمَرَنِیْ رَبِّیْ عَزَّوَجَلَّ۔ (رواه احمد وابوداود)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ١/١٠٨ حديث رقم ١٥٦ ـ وأحمد فی مسنده ٤/٢٥٣ ـ

ترجمہ: ''حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے موزوں پر مسح کیا۔ یہ دیکھ کر میں نے عرض کیا کہ آپ بھول گئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ تم بھول گئے ہو۔ میرے اللہ نے مجھے اس کا حکم دیا ہے اس حدیث کو امام احمدؒ اور امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: یا رسول اللہ نسیت؟ یہاں ہمزہ استفہام مقدر ہونے کا احتمال بھی ہوسکتا ہے اور مقدر نہ ہونے کے بھی احتمال ہوسکتا ہے۔

بل انت نسیت؟ یعنی میں تو شارع ہوں اور تو نے میری طرف نسیان کی نسبت کی ہے۔

بھذا امرنی ربی عزوجل: پس میرا یہ فعل عمدہ ہے یا مطلب یہ ہے کہ تو نے ترک ادب کیا میری طرف یقینی طور پر نسیان کی نسبت کر کے پس آپ ﷺ کے ارشاد بل نسیت کا معنی ہوگا اخطات اور یہ صنعت مشاکلت کے قبیل سے ہوگا اور بھذا امرنی ربی کے ارشاد سے ظاہر بھذا ای بالمسح مراد ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ مسح علی الخفین کتاب اللہ سے بھی ثابت ہے۔

دین عقل پر موقوف نہیں

۵۲۵: وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّهٗ قَالَ لَوْكَانَ الدِّيْنُ بِالرَّأْيِ لَكَانَ اَسْفَلُ الْخُفِّ اَوْلٰى بِالْمَسْحِ مِنْ اَعْلَاهُ وَقَدْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَمْسَحُ عَلٰى ظَاهِرِ خُفَّيْهِ۔ (رواه ابوداود لِلدَّارِمِيِّ معناه)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ١/١١٤ حديث رقم ١٦٢ ـ وأخرجه الدارمی بمعناه ١/١٩٥ حديث رقم ٧١٥ ـ

ترجمہ: ''حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ اگر دین رائے اور عقل پر موقوف ہوتا۔ تو موزوں کے ظاہر پر مسح کرنے کے بجائے اسفل پر مسح کرنا اولیٰ اور افضل ہوتا اور میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو موزوں کے ظاہر پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور امام داری نے بھی اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے۔''

تشریح: **وعن علي رضي الله عنه** : اکثر نسخوں میں اسی طرح ہے اور یہ سیدؒ کے نسخہ سے ساقط ہے۔

لو كان الدين بالراى : یعنی صرف عقل کے ساتھ ہوتا نہ کہ روایت اور نقل کے ساتھ۔

لكان اسفل الخف : یعنی موزے کا نچلا حصہ گندگیوں اور میلوں کے قریب ہونے کی وجہ سے اوپر والے حصے سے بہتر تھا اوپر والے حصے سے ان گندگیوں وغیرہ سے دور ہونے کی وجہ سے۔

وقد رايت رسول الله ﷺ يمسح على ظاهر خفيه : ظاہر سے مراد موزوں کا ظاہر ہے جیسا کہ سیاقِ کلام اس پر دلالت کر رہا ہے ورنہ ''اسفل خف'' پر بھی مسح جائز ہے کیونکہ ظاہر کا لفظ اس کو بھی شامل ہے اور اس لئے بھی کہ **لو كان الدين بالراى**..... والا قول ''اسفل خف'' کے مراد نہ ہونے پر صریح ہے پس بظاہر خفیہ سے موزوں کے اوپر والا حصہ ہے۔ پس جب تو اس کو جان چکا پس تو یہ سمجھ کہ عقل کامل وہ شریعت کے تابع ہے اس لئے کہ وہ حِکَم الٰہیہ کے پانے سے عاجز ہے پس اس عقل کامل پر عبودیت کے مقتضی کے سبب محض ماننا اور پیروی کرنا ضروری ہے اور کفار اور حکماء اور مبتدعین اور اہل ہوا میں سے جو بھی کوئی گمراہ ہوا ہے وہ صرف عقل کی پیروی کرنے سے اور نقل کی موافقت کو چھوڑنے سے گمراہ ہوا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا ہے اگر میں رائے سے کہتا تو میں پیشاب سے غسل کو واجب قرار دیتا یعنی اس لئے کہ وہ بالاتفاق نجس ہے اور منی کے نکلنے سے وضوء واجب قرار دیتا اس لئے کہ منی کی نجاست مختلف فیہ ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ میں وراثت میں مرد کو عورت کا نصف دیتا کیونکہ عورت مرد سے زیادہ کمزور ہے اور نہایہ میں مبسوط کے حوالے سے حضرت علیؓ کا قول مذکور ہے: **لو كان الدين بالراى لكان مسح باطن الخف اولى من ظاهره**'' کہ اگر دین رائے کا نام ہوتا تو پھر موزے کا باطن اس کے ظاہر سے مسح کی بجائے بہتر تھا'' اس لئے کہ باطن خف اکثر کسی گندگی وغیرہ کے لگنے سے خالی نہیں ہوتا پس وہ اس کے ہاتھ کو پہنچے گی۔ ابن ہمامؒ نے فرمایا ہے کہ اس اثر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک باطن سے مراد روندنے کی جگہ (یعنی تلوا ہے) نہ کہ وہ حصہ جو پاؤں کی کھال سے ملا ہوا ہو کیونکہ اس دوسرے معنی کو مقدر ماننے کی صورت میں اولویت ظاہر نہ ہوگی اگر چہ رائے کے ساتھ ہو بلکہ متبادر حضرت علیؓ کے قول سے اسفل (موزے کا نچلا حصہ مراد ہے) ہے اور یہی ان کے قول کے مطابق متعین ہے پس یہ حضرت علیؓ کے سابق قول کی تفسیر ہوگی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ اولویت کی وجہ یہ ہے کہ مقصود مسح سے طہارت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسفل خف تطہیر کا زیادہ محتاج ہے کیونکہ اس میں حقیقی اور حکمی نجاست جمع ہے اور حضرت علیؓ کے کلام میں اشارہ ہے ان لوگوں کے ردّ کی طرف جو پاؤں پر مسح کو جائز قرار دیتے ہیں اس لئے کہ اگر پاؤں پر مسح جائز ہوتا تو رائے کے مطابق مسح پاؤں کے اوپر والے حصے میں ہوتا نہ کہ نیچے والے پر، پس اس کو غور سے سمجھ لو۔

والدارمي معناه : الدارمی میں جار مجرور خبر مقدم ہے اور معناہ مبتدا ہے۔

بَابُ التَّيَمُّمِ

تیمّم کا باب

تیمّم کا لغوی معنی ہے ''ارادہ کرنا'' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ﴾[البقرہ:۲٦٧] '' اور ارادہ نہ کرو گندی چیز کا اس میں سے کہ اس کو تم خرچ کرو''۔ اور شریعت میں تیمّم کہتے ہیں مٹی یا جو چیز مٹی کے قائم مقام ہو اس کا ارادہ کرنا مخصوص طریقے سے اور قصد و ارادہ کے اس کے لغوی مفہوم میں معتبر ہونیکی وجہ سے اس کے اندر ہمارے نزدیک نیت واجب ہے، بخلاف اس کے اصل یعنی وضوء اور غسل کے کہ اس میں نیت واجب نہیں ہے۔ نیز غسل وہ طہارت حسیہ ہے پس اس میں نیت شرط نہیں ہوگی مگر اجر و ثواب کی خصوصیت کیلئے بخلاف تیمّم کے کیونکہ یہ طہارت حکمیہ ہے اور ظاہراً تیمّم میں خاک آلودہ ہونا ہوتا ہے پس اس میں نیت کی ضرورت ہوگی تاکہ یہ طہارت حقیقیہ کی طرح ہو جائے تیمّم کتاب اللہ، سنت رسول، اور اجماعِ اُمت سے ثابت ہے ائمہ کا اس کے فرض ہونے کے وقت میں اور فرضیت کی جگہ میں اور سبب میں اختلاف ہوا ہے اور اس پر علماء کا اجماع ہے کہ یہ چہرے اور ہاتھوں کے ساتھ خاص ہے اگرچہ حدث اکبر ہو اور بالا جماع یہ تیمّم اس اُمت کی خصوصیات میں سے۔

عرضِ مرتب:

وضو اصل ہے اور تیمّم اس کا خلیفہ ہے تو اس سے پہلے اصل کا بیان تھا اب یہاں سے اس کے خلیفہ کا بیان ہے۔ تیمّم لغت میں ارادہ کرنے کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں تیمّم کی تعریف یہ ہے کہ نیت کے ساتھ ایسی چیز پر جو زمین کی جنس ہو دو ضربیں لگانا ایک کے ساتھ چہرے کا مسح کرنا اور دوسری کے ساتھ ہاتھوں کا مسح کرنا۔

تیمّم کے نزول کا واقعہ:

تیمّم کا حکم ۵ ھ میں غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر نازل ہوا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے اور ہم لوگ مقام بیداء میں تھے کہ میرا ہار ٹوٹ کر گم ہو گیا۔ نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ لوگ میرا ہار تلاش کرنے میں مصروف تھے اور پانی بھی نہیں تھا لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہو گیا ہے اس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو رکنا پڑا۔ نماز کا بھی وقت ہے اور پانی بھی کسی کے پاس نہیں ہے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک میری گود میں تھا اور فرمانے لگے کہ تمہاری وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو رکنا پڑا اور سب پریشان ہیں نماز کا وقت ہے پانی کسی کے پاس نہیں ہے پھر اپنے ہاتھ سے میرے پہلو میں مارنے لگے مگر میں نے پوری کوشش کی کہ حرکت نہ ہو تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آرام میں خلل نہ آئے۔ جب آپ اٹھے تو اس وقت تیمّم کا حکم نازل ہو گیا! اور آخر میں اونٹ کے نیچے سے ہار بھی مل گیا۔

تیمّم کے جواز کی صورتیں:

① وضواور غسل کے لئے پانی کفایت کرنے والا نہ ہو۔ایک میل یا اس سے زیادہ دور ہو۔
② پانی تو موجود ہومگر کسی کی امانت ہو یا غصب شدہ ہو۔
③ پانی کی قیمت زیادہ ہو۔
④ پانی قیمت سے ملتا ہواور قیمت میسر نہ ہو۔
⑤ پانی کے استعمال سے مرض کے پیدا ہو جانے کا یا مرض کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔
⑥ سردی اس قدر شدید ہو کہ پانی کے استعمال سے کسی عضو کے ضائع ہو جانے کا یا مرض کے پیدا ہو جانے کا خطرہ ہو۔
⑦ پانی تک پہنچنے کے لئے کسی درندے یا دشمن کا خوف ہو یا عورت کو اپنی بے حرمتی کا خوف ہو۔
⑧ پانی کھانے اور پینے کی ضرورت کے لئے ہو اگر اس سے وضو کیا جائے تو پھر کھانے اور پینے کے لئے پانی میسر نہیں ہوتا۔
⑨ پانی کا کنواں تو موجود ہومگر اس سے پانی نکالنے کے لئے ڈول یا رسی موجود نہ ہو۔
⑩ وضو کرنے کی وجہ سے ایسی نماز کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہو جس کی قضاء نہیں ہے مثلاً عیدالفطر کی نماز' عیدالاضحیٰ کی نماز اور جنازہ۔
⑩ پانی کے بارے میں نسیان کا ہو جانا۔ ان سب صورتوں میں تیمّم جائز ہے۔

طریقہ تیمّم:

تیمّم کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے بسم اللہ پڑھ کر نیت کی جائے۔ پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو ایسی چیز پر رکھے جو مٹی کی جنس سے ہو۔ ہاتھوں کو اس پر ملے آگے اور پیچھے لے جانے کی صورت میں پھر ہاتھوں کو اٹھا کر جھاڑے پھر دونوں ہاتھ کے ساتھ چہرہ کا مسح کرے اس طرح کہ کوئی حصہ چہرے کا مسح سے خالی نہ رہے پھر اسی طرح دوسری ضرب لگائے پھر ہاتھوں کو اٹھا کر جھاڑے اور بائیں ہاتھ کی تین انگلیاں سوائے شہادت اور ابہام کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کے سرے پر رکھ کر پشت کی جانب مرفقین تک کھینچ لائے اس طرح کہ بائیں جانب ہتھیلی بھی لگ جائے اور مرفقین کا مسح بھی ہو جائے اور پھر باقی اصابع کو اور کف کو دوسری جانب رکھ کر اصابع تک کھینچ کر لایا جائے اسی طریقہ سے بائیں ہاتھ کا مسح بھی کیا جائے۔

مسائل تیمّم:

① تیمّم کے لئے نیت کرنا فرض ہے وہ اس طرح کہ ازالہ حدث کی نیت کی جائے یا جس چیز کے لئے تیمّم کیا جا رہا ہے اس کی نیت کی جائے مثلاً نماز کے لئے یا نماز جنازہ کے لئے یا تلاوت کے لئے علیٰ ہذا القیاس۔
② تیمّم کرتے وقت اعضاء تیمّم سے ایسی چیزوں کو دور کر دینا جو مٹی کے پہنچنے کے لئے مانع ہو۔
③ اگر انگشتری تنگ ہو تو اس کو تیمّم کے وقت اتارنا واجب ہے۔

④ اگر کوئی قرینہ اور علامت پانی کے قرب پر دلالت کرے تو تقریباً سو قدم تک اس کی تلاش واجب ہے۔

⑤ اگر کسی دوسرے انسان کے پاس پانی ہو اور اس سے ملنے کی توقع بھی ہو تو اس سے مانگنا واجب ہے۔

⑥ تیمم میں ترتیب کا لحاظ رکھنا سنت ہے یعنی پہلے چہرہ کا مسح کرے پھر ہاتھوں کا مسح کرنا۔

⑦ اگر کسی آدمی کو آخر وقت تک پانی ملنے کا یقین یا ظن غالب ہو تو اس کو آخر وقت تک انتظار کرنا مستحب ہے۔

⑧ جن امور کے لئے وضو فرض ہے ان کے لئے تیمم بھی فرض ہے اور جن امور کے لئے وضو سنت ہے ان کے لئے تیمم بھی سنت ہے۔

⑨ اگر کوئی آدمی جنابت کی حالت میں ہے اور اس کو مسجد میں داخل ہونا کسی وجہ سے ضروری ہے تو اس کے لئے دخول مسجد کے لئے تیمم ضروری ہے۔

⑩ جو آدمی فاقد الطہورین ہو تو وہ فی الحال تشبہ بالمصلین کرے اور بعد میں اس کی قضاء کرے۔

الفصل الاول:

اُمتِ محمدیہ کی خصوصیت

۵۲۶ :عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فُضِّلْنَا عَلَى النَّاسِ بِثَلَاثٍ جُعِلَتْ صُفُوْفُنَا كَصُفُوْفِ الْمَلَائِكَةِ وَجُعِلَتْ لَنَا الْاَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدًا وَجُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طُهُوْرًا اِذَا لَمْ نَجِدِ الْمَاءَ.(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ۱/۳۷۱حديث (٤-٥٢٢)۔وأخرج أحمد نحوه فی المسند ۵/۳۸۳۔

ترجمہ:''حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہمیں پہلی امتوں کے لوگوں پر تین چیزوں میں فضیلت دی گئی ہے:① ہماری صفیں ملائکہ کی صفوں کی طرح بنادی گئی ہیں۔② ہمارے لئے تمام زمین کو مسجد بنادیا گیا ہے۔③ زمین کی مٹی کو ہمارے لئے طہارت کا آلہ بنادیا گیا ہے۔جب ہمیں پانی میسر نہ ہو۔اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: فضلنا: یہ مجہول کا صیغہ ہے تشدید کے ساتھ۔

علی الناس :یعنی اللہ نے ہمیں تمام سابقہ امم پر فضیلت و برتری عطاء کی ہے۔

بثلاث :یعنی تین خصلتوں کی وجہ سے ان میں سے ایک بھی ان کے لئے نہیں تھی اس لئے کہ اُمم سابقہ نماز میں جس طرح اتفاق ہوتا کھڑے ہو جاتے تھے اور ان کیلئے نماز جائز نہ تھی مگر اپنے گرجا گھروں اور عبادت خانوں میں اور ان کے لئے تیمم بھی جائز نہ تھا اور اس حدیث سے اس اُمت کی خصوصیات صرف تین میں منحصر کرنا مقصود نہیں ہے اس لئے کہ آپ ﷺ پر اس اُمت کے خصائص درجہ بدرجہ نازل ہوتے تھے پس ہر وہ جو مناسب ہوتی تھی اس کے نازل ہونے کے وقت آپ ﷺ اس سے اُمت کو باخبر فرمادیتے۔

کصفوف الملئکة :یعنی ہمارا نماز کے لئے کھڑا ہونا۔بعض نے کہا ہے کہ اس سے لڑائی میں (دشمن کے مقابلہ میں

کھڑا ہونا مراد ہے اور بعض نے نماز میں کھڑا ہونا مراد لیا ہے اور بعض نے طاعت میں قیام مراد لیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا حال بیان فرمایا: ﴿وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ﴾ [صافات: ۱۶۵ - ۱۶۶] ''اور ہم صف باندھے رہتے ہیں۔ اور (اللہ کا) ذکر کرتے رہتے ہیں۔

وجعلت لنا الارض کلھا : ''کلھا'' یہ تاکید ہے تاکہ اس چیز کو بھی شامل ہو جائے جو زمین کے حکم میں ہے جیسا کہ پہاڑ وغیرہ۔

اذا لم نجد الماء : اور حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ مٹی کے علاوہ اور کوئی چیز طہور یعنی پاک کرنے کا ذریعہ نہیں ہے اور یہی ہمارے نزدیک معتبر ہے، بخلاف دوسرے ائمہ کے۔

غسل جنابت کے لئے تیمّم کا حکم

۵۲۷: وَعَنْ عِمْرَانَ قَالَ كُنَّا فِيْ سَفَرٍ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَصَلّٰى بِالنَّاسِ فَلَمَّا انْفَتَلَ مِنْ صَلَاتِهٖ اِذَا هُوَ بِرَجُلٍ مُعْتَزِلٍ لَمْ يُصَلِّ مَعَ الْقَوْمِ فَقَالَ مَامَنَعَكَ يَا فُلَانُ اَنْ تُصَلِّيَ مَعَ الْقَوْمِ قَالَ اَصَابَتْنِيْ جَنَابَةٌ وَلَامَاءَ قَالَ عَلَيْكَ بِالصَّعِيْدِ فَاِنَّهٗ يَكْفِيْكَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه من حدیث طویل ۱/۴۴۷ حدیث رقم ۳۴۴۔ وکذلك مسلم فی صحیحه ۱/۴۷۴ حدیث رقم (۳۱۲-۶۸۲)۔ وأخرجه النسائی بمعناه فی السنن ۱/۱۷۱ حدیث رقم ۳۲۱۔ وأحمد فی مسنده ۴/۴۳۴۔ والدارمی فی السنن ۱/۱۹۰ حدیث رقم ۷۴۳۔

ترجمہ: ''حضرت عمران ؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو نماز پڑھائی جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک آدمی علیحدہ بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے فلاں تم نے لوگوں کے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھی۔ کس چیز نے تمہیں اس سے منع کیا ہے اس نے عرض کیا۔ مجھے غسل جنابت کی ضرورت ہے اور پانی موجود نہیں ہے آپ ﷺ نے فرمایا ایسی صورت میں مٹی کے ساتھ تیمّم کر لیتے یہی تمہارے لئے کافی تھا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **وعن عمران** : یہ عمران بن حصین خزاعی کعبی ہیں یہ اور ان کے والد مسلمان ہوئے۔

اذا ھو برجل : ھو مبتدا ہے اور برجل اس کی خبر ہے۔

لم یصل مع القوم : یہ لما کا جواب ہے ای فلما انفتل فاجاہ رویۃ رجل معتزل غیر مصل۔

قال علیك بالصعید : علیک اسم فعل ہے بمعنی خذ والزم کے اور ''باء'' زائدہ ہے یا مطلب یہ ہے کہ تجھ پر پاک مٹی سے تیمّم لازم ہے اور صعید سے مراد امام شافعیؒ کے نزدیک تراب (مٹی) ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالکؒ کے نزدیک اس سے (وجہ الارض) جنس الارض مراد ہے خواہ وہ مٹی ہو یا نہ ہو اس لئے کہ صعد کہتے ہیں: **ما صعد علی الارض** یعنی جو زمین کے اوپر ہو اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے اس چیز کو مستثنیٰ کیا ہے کہ جو راکھ ہو جائے یا پگھل جائے۔

یکفیك : نماز کے صحیح ہونے کیلئے اور پانی کی جگہ یہ تیرے لئے کافی ہو جائے گی اور اس سے تجھے بے پرواہ کر دے گی۔

وضو اور غسل دونوں کے تیمّم کا ایک طریقہ ہے

۵۲۸:وَعَنْ عَمَّارٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ اِنِّيْ اَجْنَبْتُ فَلَمْ اُصِبِ الْمَآءَ فَقَالَ عَمَّارٌ لِعُمَرَ اَمَا تَذْكُرُ اَنَّا كُنَّا فِيْ سَفَرٍ اَنَا وَاَنْتَ فَاَمَّا اَنْتَ فَلَمْ تُصَلِّ وَاَمَّا اَنَا فَتَمَعَّكْتُ فَصَلَّيْتُ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْكَ هٰكَذَا فَضَرَبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِكَفَّيْهِ الْاَرْضَ وَنَفَخَ فِيْهِمَا ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهٗ وَكَفَّيْهِ (رواه البخاری ولِمُسْلِمٍ) نَحْوَهٗ وَفِيْهِ قَالَ اِنَّمَا يَكْفِيْكَ اَنْ تَضْرِبَ بِيَدَيْكَ الْاَرْضَ ثُمَّ تَنْفُخَ ثُمَّ تَمْسَحَ بِهِمَا وَجْهَكَ وَكَفَّيْكَ۔

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱/۴۴۳حدیث رقم ۳۳۸۔وأخرج أبوداوٗد نحوه فی السنن ۱/۲۲۸حدیث رقم ۳۲۲ وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۱۶۵حدیث ۳۱۲۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۱۸۸حدیث رقم ۵۶۹۔فی الصحیح ۱/۲۸۰حدیث (۱۱۲۔۳۶۸)۔

ترجمه:''حضرت عمارؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مجھے غسل کی ضرورت ہے اور مجھے پانی نہیں ملا۔اب میں کیا کروں۔حضرت عمارؓ نے یہ سن کر حضرت عمرؓ سے کہا۔کیا آپ کو یاد نہیں کہ میں اور آپ دونوں سفر میں تھے اور ہم دونوں کو غسل جنابت کی ضرورت پڑ گئی۔تو تم نے نماز نہیں پڑھی تھی۔لیکن میں نے تیمّم کے لئے زمین پر الٹ پلٹ کے نماز پڑھ لی تھی۔پھر یہ صورت حال میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے ذکر کی۔تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں اس طرح کر لینا کافی تھا۔چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے پھر ان کو جھاڑ کر چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کیا تھا۔اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے اسی طرح امام مسلم نے روایت کی جس کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے لئے کافی ہے کہ اپنے ہاتھوں کو زمین پر مارو۔پھر ان کو جھاڑ کر چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کرو۔''

تشریح:**فلم اصب الماء** :یہ باب افعال سے ہے یعنی میں نے پانی نہیں پایا اور حدیث کے بعض طرق میں آیا ہے جیسا کہ ابن حجرؒ نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جواب میں ارشاد فرمایا: **لا تصل حتی تجد الماء** کہ جب تک پانی نہ پاؤ نماز نہ پڑھو اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ جواب دینے سے خاموش رہے اس واقعہ کے صحیح طرح یاد نہ ہونے کی وجہ سے **(فقال عمار لعمر)** پھر حضرت عمار نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو واقعہ یاد دلایا۔

انا کنا فی سفر :اور مصابیح میں ہے **فی سریه** یعنی لشکر کے ایک دستے میں۔

انا و انت :یہ ''کنا'' کی ضمیر کی تاکید اور بیان ہے معنی یہ ہے **فاجتبنا کلنا**۔

فاما انت :یہ اجمال کی تفصیل ہے۔

فلم تصل :اس لئے نہیں پڑھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پانی ملنے کی اُمید تھی وقت کے نکلنے سے پہلے پہلے یا اس اعتقاد کی وجہ سے کہ تیمّم صرف حدث اصغر سے ہوتا ہے اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کا حکم معلوم نہ تھا اور نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت تک اس بارے میں سوال کرنے کا موقعہ ملا۔

اما انا فتمعکت :یعنی میں مٹی میں لوٹ پوٹ ہونے لگا یہ گمان کرتے ہوئے کہ جنابت میں پانی کی طرح مٹی کا تمام اعضاء تک پہنچانا واجب ہے۔

فذکرت ذلك :یعنی اپنا فعل یا حضرت عمرؓ کا نماز سے رکنا اور اپنا مٹی میں لت پت ہونا ذکر کیا۔

فضرب النبی صلی اللہ علیہ وسلم بکفیه الارض :یہ فعلی تعلیم تھی جو تعلیم قولی سے زیادہ دِل میں مؤثر ہوتی ہے۔

ونفخ فیهما :تاکہ مٹی کم ہو جائے اس لئے کہ مقصود تیمّم سے تطہیر ہے نہ کہ ایسی تبدیلی اعضاء میں کرنا جو نفرت دلانے کا باعث ہو جائے۔

ثم مسح بهما وجهه وکفیه :یہ حدیث دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ چہرے اور ہتھیلیوں کیلئے ایک ضرب کافی ہے اور یہی امام احمدؒ امام اوزاعی اور شوافع میں سے ایک جماعت کا مذہب ہے صحابہ اور تابعین میں ایک جماعت کی پیروی کرتے ہوئے اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تیمم دو ضربوں کے علاوہ جائز نہیں ہے ایک چہرے کے واسطے اور دوسری ہاتھوں کیلئے کہنیوں تک حضرت عمرؓ کی حدیث اس میں دلیل ہے جو باب مخالطة الجنب کے اخر میں گزر چکی ہے اور ابن ہمامؒ نے فرمایا ہے کہ کفین سے مراد ''ذراعان'' ہے جز کے لفظ کا کل پر اطلاق کرتے ہوئے۔

ذراع کسرہ کے ساتھ کہنی کے کنارے سے انگلی کے کنارے کا نام ہے جسے بازو کہتے ہیں قاموس میں اسی طرح ہے اور مراد یہاں پر اول ہے اور اس میں یہ بات مدِنظر رہے کہ یہ اطلاق حقیقۃً (کلامِ عرب) میں واقع ہے لہٰذا مجاز کے ارتکاب کی ضرورت نہیں ہے پس قاموس میں لکھا ہے کہ کف سے ہاتھ یا کوع (کلائی کا کنارہ) مراد ہے لیکن اس کے باوجود ضرب کے بعد مرتین کو مقدر ماننا پڑے گا تاکہ مذہب کے موافق تاویل پوری ہو جائے اور ابوداؤد اور حاکمؒ کی اس روایت کی وجہ سے بھی کہ جس میں یہ آتا ہے کہ :**التیمم ضربتان ضربه للوجه وضربة للیدین** اور اسی کو ائمہ ثلاثہ نے اختیار کیا ہے اگرچہ امام ابوداؤدؒ اس کو ضعف اور موقوف ہونے کے ساتھ معلوم ٹھہرایا ہے روایت پر عمل کرنے کی وجہ قیاس کی تائید بھی ہے کیونکہ تیمّم بدل ہے اور بدل میں اصل یہ ہوتا ہے کہ مبدل کے مشابہہ ہو، اور اس لئے بھی کہ اس پر عمل کرنا احوط ہے۔

اور اس مذکورہ روایت کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ضرب کی صورت سے مراد تعلیم دینا ہے نہ کہ تیمّم کے پورے طریقے اور محل کو بیان کرنا اور اس حدیث کا ظاہر بھی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیمّم میں ہاتھوں کے کلائیوں کے کناروں تک مسح پر اکتفاء کرتے تھے اور یہی امام شافعیؒ کا قول قدیم بھی ہے۔ علامہ نوویؒ نے فرمایا ہے کہ یہی سنت صحیحہ ظاہر کے زیادہ قریب ہے اور اسی وجہ سے علامہ خطابیؒ نے فرمایا ہے کہ کفین پر اقتصار کرنا روایت کے اعتبار سے سب سے صحیح ہے اور کہنیوں کے مسح کا وجوب اصول کے زیادہ مشابہہ ہے اور قیاس کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔

یعنی اس لئے کہ یہ بدل ہے پس یہ مبدل کے حکم میں ہوگا اور اسی بات سے ابن عمرؓ کی موقوف روایت بھی قوی ہو جاتی ہے کہ جس میں آیا ہے: **التيمم ضربتان ضربة للوجه وضربة لليدين الى المرفقين**۔ پھر واؤ کے ذریعے عطف سے ظاہر یہی ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کے مسح میں ترتیب شرط نہیں ہے جیسا کہ اصل (وضوء) میں ہمارا مذہب ہے اور صحیح یہ ہے کہ ترتیب کا تیمّم میں شرط ہونا شوافع کے ہاں وضوء پر قیاس کرتے ہوئے ہے کیونکہ وضوء اصل ہے۔

اور ہمارے مذہب کی تائید بخاری کی روایت سے ہوتی ہے: **انما يكفيك ان تقول بيديك هكذا ثم ضرب بيديه الارض مرة واحدة ثم نفضهما ثم مسح الشمال على اليمين وظاهر كفيه ثم وجهه**۔ یہ روایت عدم ترتیب میں واضح ہے اور ثم کو ''واؤ'' کے معنی میں لینے کا احتمال انتہائی بعید ہے۔

وفيه قال انما يكفيك......

ان دونوں حدیثوں میں تطبیق یہ ہے کہ حضور ﷺ نے بتلانے میں تاکید پیدا کرنے کیلئے اور اہتمام پر تشبیہ کیلئے تعلیم قولی اور فعلی دونوں کو جمع کیا تھا۔

اللہ کے ذکر کے لئے طہارت مستحب ہے

۵۲۹: وَعَنْ اَبِی الْجُهَيْمِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ الصِّمَّةِ قَالَ مَرَرْتُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ يَبُوْلُ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيَّ حَتّٰى قَامَ اِلٰى جِدَارٍ فَحَتَّهٗ بِعَصًا كَانَتْ مَعَهٗ ثُمَّ وَضَعَ يَدَيْهِ عَلَى الْجِدَارِ فَمَسَحَ وَجْهَهٗ وَذِرَاعَيْهِ ثُمَّ رَدَّ عَلَيَّ وَلَمْ اَجِدْ هٰذِهِ الرِّوَايَةَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ وَلَا فِيْ كِتَابِ الْحُمَيْدِيِّ وَلٰكِنْ ذَكَرَهٗ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ.

ليس موجودًا بهذا اللفظ بالصحيحين إنما الموجود الحديث الأتي ۔راجع حديث رقم ۵۳۵ وقد أخرجه الشافعي بهذا اللفظ في مسنده ص ۱۲۔

ترجمه: ''حضرت ابوجہیم بن حارث بن صمہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں رسول اللہ ﷺ کے قریب سے گزرا۔ آپ اس وقت پیشاب کر رہے تھے۔ میں نے آپ کو سلام کیا اور آپ نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا اور پیشاب سے فارغ ہو کر ایک دیوار کے پاس کھڑے ہوئے اور آپ کے پاس جو لاٹھی تھی اس کے ساتھ دیوار کھرچ کر اپنے دونوں ہاتھ اس پر مارے۔ پھر اپنے چہرہ اور دونوں ہاتھوں کا مسح کیا۔ پھر میرے سلام کا جواب دیا۔ صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ روایت نہ بخاری اور مسلم میں ملی ہے اور نہ ہی حمیدی کی کتاب میں۔ ہاں محی السنہ نے اس کو شرح السنۃ میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔''

اسنادی حیثیت: ہم کہتے ہیں کہ صاحب مشکوٰۃ کو یہ حدیث فصل اوّل میں بیان نہیں کرنی چاہئے تھی (اس لئے کہ یہ اُن کے اپنے ہی طے کردہ اصول کے خلاف ہے۔

راویٔ حدیث:

ابو جہیم ۔ جہیم تصغیر کے ساتھ ہے یعنی جیم کے پیش ہاء کے زبر اور یاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ حضرت وکیع کے تذکرہ کے مطابق تو یہ عبداللہ بن جہیم ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ عبداللہ ابن حارث بن الصمہ انصاری ہیں۔ ''صمہ'' صاد کے زیر اور میم کی تشدید کے ساتھ ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ میم مشدد نہیں بلکہ مخفف ہے۔

تشریح: ابن الحارث ابن الصمة : جامع الاصول وغیرہ میں ہے کہ یہ ''صاد'' کے کسرہ اور ''میم'' کے تشدید کے ساتھ ہے اور بعض نے ''میم'' کی تخفیف بتلائی ہے۔

مررت علی النبی ﷺ :لفظ مرور ''باء'' اور ''علی'' کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔

وھو :''ہاء'' کے ضمہ اور سکون دونوں طرح مروی ہے۔

فلم یرد :''دال'' کے فتحہ کے ساتھ ہی صحیح ہے۔

الی جدار : شاید یہ آپ ﷺ کے صحابہ میں سے کسی کی تھی اور حضور ﷺ کو ان کی رضا معلوم تھی یا یہ دیوار آپ ﷺ ہی کی تھی۔

فحته :''تاء'' کے ساتھ **ای حکه وخدشه**۔

بعصی کانت معه :یہ اس لئے کیا تا کہ مٹی حاصل ہو جائے افضل کا ارادہ کرتے ہوئے ثواب کی کثرت کو حاصل کرنے کے لئے یا گندگیوں اور تکلیف دہ چیزوں کو جو دیوار سے متعلق تھیں دور کرنے کیلئے کیا پس یہ روایت اس بارے میں نص نہ ہوئی کہ تیمم اس چیز سے صحیح نہ ہوگا کہ جس پر سے غبار ہاتھ کو نہ لگے۔

ثم وضع یدیه :اور ایک صحیح نسخہ میں یدہ مفرد کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں جنس مراد ہے۔

فمسح وجهه وذراعیه :''یعنی کہنیوں سمیت'' علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ ایک ضرب ہی کافی ہے اور یہی امام احمدؒ کا مذہب ہے اور ایک روایت امام مالکؒ کی اور امام شافعیؒ کا قول قدیم بھی یہی ہے۔

ثم رد علی :اس حدیث یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا ذکر طہارت میں کرنا مستحب ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طہارت پر دوام کیا جائے اور حضور ﷺ کا جواب دینے میں تأخیر کرنا اس میں یہ تعلیم دینا ہے کہ سلام کا جواب واجبات مطلقہ میں سے ہے اسی طرح بعض حضرات نے کہا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں یہ موقع ان مواقع میں سے ہے کہ جن کے بارے میں علماء فرماتے ہیں کہ اس میں سلام کے جواب کا مسلمان مستحق نہیں ہوتا، پس یہ حضور ﷺ کے عمدہ و اعلیٰ اخلاق میں سے ہے (کہ جواب واجب نہ تھا لیکن پھر بھی اہتمام سے جواب دیا)۔

ولا فی کتاب الحمیدی: پس یہ صاحب مصابیح پر اعتراض وارد ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو صحاح میں رکھا ہے جو کہ شیخین یا ان میں سے ایک لئے مختص ہے۔

ولکن ذکرہ :یعنی صاحب مصابیح نے اور ایک نسخہ میں **ذکرھا (ای الروایۃ)** ہے۔

فی شرح السنۃ :جو صاحب مصابیح کی تصنیفات میں سے ہے اور یہ روایت وہاں اس طریق سے ہے **عن الشافعی عن ابراھیم عن یحیی**......۔

گویا کہ صاحب مصابیح اس کتاب میں اس سے غافل ہو گئے ہیں اور غلطی سے اس کو پہلی فصل میں ذکر کر دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

الفصل الثانی:

جب تک پانی نہ ملے تیمّم ہوگا

۵۳۰:عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الصَّعِیْدَ الطَّیِّبَ وَضُوْءُ الْمُسْلِمِ وَاِنْ لَّمْ یَجِدِ الْمَآءَ عَشَرَ سِنِیْنَ فَاِذَا وَجَدَ الْمَاءَ فَلْیَمَسَّہٗ بَشَرَہٗ فَاِنَّ ذٰلِکَ خَیْرٌ .

(رواہ احمد والترمذی وابوداود وروی النسائی نحوہ الی قَولِہٖ عَشَرَسِنِیْنَ)

أخرجہ الامام أحمد فی المسند ۱۵۵/۵۔وأخرجہ الترمذی فی السنن ۲۱۱/۱ حدیث رقم ۱۲۴ وقال حدیث حسن صحیح ۔وأخرجہ أبوداوٗد فی السنن من حدیث طویل ۲۳۵/۱ حدیث رقم ۳۳۲۔وروی النسائی إلی قولہ "عشر سنین"فی السنن ۱۷۱/۱ حدیث ۳۲۲۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں۔کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پاک مٹی مسلمان کے لئے آلہ طہارت ہے۔اگر چہ وہ دس سال تک پانی نہ پائے اور جب پانی مل جائے تو بدن کو دھونا چاہئے۔کیونکہ یہ بہتر ہے۔اس حدیث کو امام احمدؒ امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور امام نسائی نے بھی اسی طرح کی روایت عشر سنین تک نقل کی ہے۔''

تشریح:**الصعید** :یعنی مٹی۔یا **وجہ الارض** (جنس ارض)۔

الطیب :یعنی طاہر اور مطہر۔

وضوء ''واؤ'' کے فتحہ کے ساتھ ہے اس لئے کہ مٹی پانی کے قائم مقام ہے نماز کی صحت میں۔

اور بعض نے کہا ہے ''واؤ'' کے ضمہ کے ساتھ ہے یعنی مخصوص طریقے سے پاک مٹی کا استعمال کرنا جیسا کہ مسلمان کا وضو کرنا پس یہ تشبیہ بلیغ ہے دونوں تقدیر کی بناء پر یہ حدیث اس بات کا فائدہ دیتی ہے کہ تیمّم رافع حدث ہے نہ کہ اس کو جائز قرار دینے والا جیسا کہ امام شافعیؒ نے کہا ہے اور ثمرۂ اختلاف ظاہر ہوگا اس بات سے کہ وہ ایک تیمّم سے جو چاہے نوافل اور فرائض پڑھے ہمارے نزدیک جب کہ امام شافعیؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

عشر سنین :''شین'' کے سکون کے ساتھ ہے اور مراد اس سے کثرت ہے نہ کہ وہ مدت جو مقدر ہے اس حدیث میں اس بات کی دلالت موجود ہے کہ خروج وقت وہ تیمّم کو توڑنے والا نہیں ہے بلکہ اس کا حکم وضوء کا حکم ہے جیسا کہ ہمارا مذہب ہے اور جو صحیح روایت میں ابن عمرؓ سے منقول ہے کہ ہر نماز کے لئے تیمّم کرے گا اگر چہ حدث لاحق نہ ہو یہ استحباب پر محمول ہے اور امام

بیہقی کا قول اس کے منافی نہیں ہے کہ صحابہ میں کوئی اس کا مخالف نہیں ہے بلکہ ابن عمرؓ کے قول کو ابن عباسؓ کا قول بھی مضبوط کرتا ہے اگرچہ اس کی سند کمزور ہے۔ من السنة ان لا يصلي بتيمم واحد الا فريضة واحدة ثم يجدد للثانية تيمما۔

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ صحابی کا قول من السنة کذا صحیح قول کے مطابق مرفوع روایت کے حکم میں ہوتا ہے۔اس کا محل اس بات میں ہے کہ جہاں رائے کی کوئی گنجائش نہ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اس کے مرفوع ہونے سے وہ سنت پر دلالت ہوتی ہے نہ کہ فرضیت پر ورنہ لازم آئے گا کہ ایک حدث دو طہارتوں کو واجب کرتا ہے اور شافعیہ میں سے صاحب افصاح کا یہ قول۔ کہ جو حضرات ایک تیمّم سے دو فرضوں کے قائل ہیں جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمدؒ اور اسی کو متولیؒ اور رویانیؒ نے اختیار کیا ہے ان کے مذہب کے مطابق یہ بات لازم آتی ہے کہ تیمّم وقت سے پہلے جائز ہے اس لئے کہ تیمّم دوسرے فرض کی بنسبت وقت سے پہلے واقع ہوا ہے اور یہ اجماع کے خلاف ہے یہ قول مردود ہے اس لئے کہ ہمارے نزدیک وقت کے داخل ہونے سے پہلے تیمّم جائز ہے کیونکہ تیمّم کا حکم وضوء کا حکم ہے۔

فاذا وجد الماء :یعنی اس حال میں کہ اس کے غسل کے لئے کافی ہو یا اس کے وضوء کے لئے اور اس کی پینے وغیرہ کی ضرورت سے زائد ہو اور وہ بندہ پانی کے استعمال پر قادر بھی ہو۔

فليمسه :''یاء'' کے ضمہ اور ''میم'' کے کسرہ کے ساتھ یہ امساس سے ہے۔

بشرته :یعنی پانی کو جلد تک پہنچائے مطلب یہ ہے کہ جب پانی دستیاب ہو تو اس کو چاہیے کہ وضوء کرے یا غسل کرے۔

فان ذلك خير : خیر یہ خیور سے ہے اور اس کا معنیٰ یہ نہیں ہے کہ پانی کے وجود کے وقت دونوں جائز ہیں لیکن وضوء زیادہ بہتر ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ وضوء واجب ہے پانی کے وجود کے وقت اور اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد : ﴿اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا﴾ [الفرقان : ٢٤] ''اس دن اہل جنت کا ٹھکانا بھی بہتر ہوگا اور مقام استراحت بھی عمدہ ہو گا'' ہے حالانکہ جہنمیوں کے لئے نہ کوئی بہتر ٹھکانا ہے اور نہ ہی کوئی اچھا (مطلب یہ ہے کہ یہاں اس حدیث میں خیر اسم تفضیل نہیں ہے ورنہ یہ لازم آئے گا کہ جنتیوں کا ٹھکانہ احسن اور خیر ہے اور جہنمیوں کا ان کے مقابلے میں ٹھکانہ ان جنتیوں سے کم درجے کا ہے حالانکہ یہ معنی باطل ہے) اس حدیث میں یہ توجیہ اس لئے کی ہے کہ دوسری روایت میں یہ وارد ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر سے کہا :التراب كافيك وان لم تجد الماء عشر حجج وان وجدت الماء فامسه جلدك۔ ''کہ مٹی تیرے لئے کافی ہے اگرچہ تو دس سال پانی نہ پائے اور اگر تو پانی پائے تو اس کو استعمال کر'' یہاں فامسه جلدك یہ امر وجوب کے لئے ہے۔

اور بھی احتمال ہے کہ خیر کا معنی یہ ہے کہ پانی کا پانا یہ اس کے نہ پانے سے بہتر ہے کیونکہ پانی بہت بڑی نعمت اور عظیم عطیہ ہے کیونکہ اس کے ذریعے طہارت حقیقیہ حسیّہ اور حکمیہ حاصل ہوتی ہیں اگرچہ نماز ان دونوں کے ساتھ صحیح ہے اور ان دونوں میں خیر کثیر ہے۔

علم کے بغیر مسئلہ بتانا درست نہیں

۵۳۱:وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجْنَا فِيْ سَفَرٍ فَاَصَابَ رَجُلاً مِّنَّا حَجَرٌ فَشَجَّهُ فِيْ رَأْسِهٖ فَاحْتَلَمَ فَسَأَلَ اَصْحَابَهٗ هَلْ تَجِدُوْنَ لِيْ رُخْصَةً فِي التَّيَمُّمِ قَالُوْا مَا نَجِدُ لَكَ رُخْصَةً وَاَنْتَ تَقْدِرُ عَلَى الْمَاءِ فَاغْتَسَلَ فَمَاتَ فَلَمَّا قَدِمْنَا عَلَى النَّبِيِّ ﷺ اُخْبِرَ بِذٰلِكَ قَالَ قَتَلُوْهُ قَتَلَهُمُ اللّٰهُ اَلَّا سَأَلُوْا اِذَا لَمْ يَعْلَمُوْا فَاِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ اِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْهِ اَنْ يَّتَيَمَّمَ وَيُعَصِّبَ عَلٰى جُرْحِهٖ خِرْقَةً ثُمَّ يَمْسَحُ عَلَيْهَا وَيَغْسِلَ سَائِرَ جَسَدِهٖ .(رواه ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۲۳۹حديث رقم ۳۳۶وأخرجه الدارقطنی فی السنن ۱/۱۸۸حديث رقم ۳ من باب جواز التيمم لصاحب الجرح۔

ترجمہ: ''حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ سفر میں جا رہے تھے کہ ہم میں سے ایک شخص کو پتھر لگا۔جس نے اس کے سر کو زخمی کر ڈالا۔اتفاق سے اس آدمی کو غسل کی ضرورت پڑ گئی چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں سے مسئلہ دریافت کیا کہ کیا اس صورت میں تمہارے نزدیک میرے لئے تیمّم کرنے کی اجازت اور رخصت ہے۔انہوں نے کہا کہ آپ پانی استعمال کرنے پر قادر ہیں لہٰذا آپ کے تیمّم کی کوئی رخصت نہیں ہے چنانچہ اس آدمی نے غسل کیا اور اس وجہ سے وہ فوت ہو گیا جب ہم لوگ سفر سے واپس آکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا۔آپ نے (انتہائی غم کے ساتھ) فرمایا کہ لوگوں نے اس کو قتل کر دیا اللہ انہیں مارے پھر فرمایا جو بات ان کو معلوم نہ تھی۔انہوں نے اس کو پوچھ کیوں نہ لیا۔کیونکہ جہالت کی بیماری کا علاج سوال ہے اور اس کے لئے تیمّم کافی تھا اور اپنے زخم پر ایک پٹی باندھ کر اس کے اوپر مسح کر لیتا اور پھر اپنا تمام بدن دھو لیتا۔اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **فشجه فی رأسه** :یعنی پتھر نے سر میں زخم کر دیا جیسے :**یجرح فی عراقیبها نصلی**۔''میرے تیر کا پیکان اس کی کونچوں میں زخم کر رہا ہے''اور اسی طرح **خرجنا فی سفر** کا ارشاد اور میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ یہ بات محل تامل ہے اور اس کی وجہ (واللہ اعلم) یہ ہے کہ **فی سفر** میں ''فی''تعدیت کے لئے نہیں ہے بلکہ ''فی''تعلیلہ ہے یعنی **خرجنا لارادة السفر** اور قوی بات یہ ہے کہ جار مجرور محل نصب میں ہے اس طرح کہ وہ حال واقع ہے ای **خرجنا مسافرین** پھر یہاں سر کا ذکر تاکید کی زیادتی کے لئے ہے کیونکہ شج وہ سر کا زخمی کرنا ہے پس اس کے اندر تجرید ہوتی ہے معنی یہ ہے: **جرحه فی راسه** ۔

فاحتلم :اور ایک روایت میں ہے **ثم احلتم** یعنی اس کو جنابت پہنچی اور وہ اس سے ڈر گیا کہ اگر غسل کرے گا تو پانی زخم کو پہنچے گا پس وہ اس کو نقصان دے گا۔

فسال اصحابه :یعنی ان میں سے جو اس کے گمان کے مطابق علماء تھے ان سے سوال کیا یا اصحاب رسول ﷺ میں سے کسی سے پوچھا۔اور پہلا معنی ظاہر ہے۔

هل تجدون لی رخصة :رخصت عزیمت کی ضد ہے۔

وانت تقدر علی الماء : یہ جملہ حال ہے ان مسئولین نے وجدان ماء کو حقیقت پر محمول کیا اور ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ وجدان ضرورت کے وقت فقدان (نہ ہونے) کے حکم میں ہوتا ہے۔

اخبر : یہ مجہول کا صیغہ ہے۔

قتلوہ : قتل کی نسبت ان کی طرف کی اس لئے کہ وہ اس کو اس بات کا مکلف بنانے کا سبب بنتی ہیں کہ اس نے سر میں زخم کے باوجود پانی استعمال کیا تا کہ یہ ان پر کامل قسم کا انکار ورد ہو۔

قتلھم اللہ : یعنی اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرے یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور ڈانٹ اور تہدید کے کہی اور اس حدیث سے یہ مسئلہ ماخوذ ہوتا ہے کہ، کہ مفتی پر نہ قصاص ہے اور نہ دیت ہے اگر چہ بغیر حق کے فتویٰ دے۔

الا سالوا اذا لم یعلموا : الاّ یہ ہمزہ کے فتحہ اور ''لام'' کی تشدید کے ساتھ ہے اور یہ حرف تحضیض ہے جو ماضی پر داخل ہے اور یہ ندامت کا فائدہ دیتا ہے اور ''اذا'' یہ ظرف ہے جس میں تعلیل کا معنی ہے اور اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جو ''اذ'' کے ساتھ مروی ہے اور یہی دونوں نسخوں میں سب سے صحیح ہے اور آنے والا فاء ما قبل کلام کے سبب سے ہے مطلب یہ ہے کہ:

فلم یسالوا ولم یتعلموا مالا یعلمون۔

فانما شفاء العی : **العی** ''عین'' کے کسرہ کے ساتھ اس کا معنی ہے ضبط کا نہ ہونا اور کلام وغیرہ میں متحیر ہونا (عاجز ہونا)۔

السؤال : بے شک جہالت کی بیماری سے شفایابی وہ صرف سیکھنے ہی میں ہے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بغیر علم کے فتویٰ دینے پر عیب دار ٹھہرایا اور وعید کا ان کو مستحق قرار دیا بایں طور کہ ان کے لیے بددعا کی اس لئے کہ وہ نص قرآنی میں غور وفکر کرنے سے کمی کرنے والے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ﴿مَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ حَرَجٍ﴾ [المائدۃ: ٦] ''نہیں ارادہ رکھتے اللہ تعالیٰ کہ وہ تم پر حرج کو ڈالے''۔

علی جرحہ: جیم کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

خرقۃ : تا کہ پانی اس تک نہ پہنچے۔

ویغسل سائر جسدہ : اور یہ حدیث تیمّم اور تمام بدن کو پانی کے ساتھ دھونے کے جمع کرنے پر دلالت کرتی ہے نہ کہ ان میں سے صرف ایک پر اکتفاء کرنے پر جیسا کہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔

اس بات کا جواب واللہ اعلم یہ ہے کہ حدیث ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ قیاس کے بھی مخالف ہے اور قیاس کی مخالفت یہ ہے کہ بدل اور مبدل منہ کو جمع کرنا۔

اور مسئلہ کا حاصل یہ ہے کہ اگر جان کے تلف ہونے کا خوف ہو پانی کے استعمال کرنے سے تو اس کے لئے بلا اختلاف تیمّم جائز ہے اور اگر مرض میں زیادتی کا خوف ہو یا شفایابی میں تاخیر کا موجب ہو تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالکؒ کے نزدیک یہ جائز ہے کہ وہ تیمّم کرے اور نماز پڑھے اور اعادہ نہ کرے گا اور یہی امام شافعیؒ کے مذہب میں راجح ہے۔

اور وہ شخص کہ جس کے کسی عضو پر کئی پھنسی یا زخم ہوں یا وہ ٹوٹا ہوا ہو اور اس نے اوپر پٹی چمٹائی ہوئی ہو اور پٹی کے ترک کی صورت میں اس کو تلف (ضیاع) کا ڈر ہو تو امام شافعیؒ کے نزدیک پٹی پر مسح کرے گا اور مسح کے ساتھ تیمّم بھی کرے گا اور راجح قول

کہ مطابق وہ قضاء نہیں کرے گا اگر اس نے پٹی طہارت پر باندھی ہو۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جب آدمی کے بدن کے کچھ حصے میں زخم یا پھوڑے پھنسی وغیرہ ہوں اور کچھ حصہ صحیح ہو۔ تو اب اگر اکثر صحیح ہو تو وہ اس کو دھوئے گا اور زخم پر مسح کرے گا اور اکثر زخمی ہو تو تیمّم کرے گا اور غسل اس سے ساقط ہو جائے گا اور امام احمدؒ فرماتے ہیں صحیح آدمی غسل کرے گا اور (زخمی آدمی) زخم کی وجہ سے تیمّم کرے گا۔

اسی طرح دار قطنی اور امام بیہقی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات ثابت نہیں ہے۔ ان کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے سید جمال الدینؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

۵۳۲: وَرَوَاهُ ابْنِ مَاجَةِ عَنِ عَطَاءِ بْنِ اَبِی رَبَاحٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ۔

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/ ۲۳۹حدیث رقم ۳۳٦وأخرجه الدارقطنی فی السنن ۱/ ۱۸۸حدیث رقم ۳ من باب جواز التیمم لصاحب الجرح۔

ترجمہ: ''اور امام ابن ماجہ نے اس روایت کو حضرت عطاء بن ابی رباح سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

عطاء بن ابی رباح۔ اسم گرامی عطا ہے۔ ابو رباح کے صاحبزادے ہیں۔ کنیت ''ابو محمد'' ہیں۔ ''رباح'' راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

حلیہ:

ان کے بال سخت گھنگریالے تھے۔۔ سیاہ فام تھے۔ بیٹھی ہوئی ناک' ہاتھ لنجے اور یک چشم تھے بعد میں نابینا بھی ہو گئے تھے۔

جلیل القدر فقیہ اور مکہ کے تابعین میں سے تھے۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ان کی وفات جس روز ہوئی انہوں نے اس شان کے ساتھ وفات پائی کہ اس روز لوگ دنیا کے ہر شخص سے زیادہ ان سے خوش تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ علم کے خزانے خدا جس کو چاہے تقسیم فرمائے۔ اگر علم کے ساتھ کسی کو خصوصیت ہوسکتی تو اس کا حق سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کو ہوتا۔ عطاء بن ابی رباح حبشی تھے۔ سلمہ بن کہیل نے فرمایا میں نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جس کے علم کی غرض صرف خدا کی ذات ہو' ہاں تین شخص ایسے ضرور تھے۔ عطاء طاؤس' مجاہد رحمہم اللہ۔ ۱۱۵ھ بعمر ۸۸ سال وفات پائی۔

روایت حدیث:

ابن عباس' ابوہریرہ' ابوسعید اور ان کے علاوہ دوسرے بہت سے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔

ورواه ابن ماجة عن عطاء بن ابی رباح عن ابن عباس : میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ امام ابوداؤدؒ نے اسی طرح

اس روایت کو عطاء بن ابی رباح عن ابن عباس کے طریق سے عطاء عن جابر کے طریق کے بعد نقل کیا ہے پس مجھے نہیں معلوم کہ ابن ماجہ کی تخریج کی تخصیص میں کیا وجہ ہے لگتا یہ ہے کہ صاحب مشکوٰۃؒ کو یہاں ذہول ہوا اور وہ ابوداؤد والے دوسرے طریق کو بھول گئے ہیں۔ واللہ الھادی۔

اور امام نوویؒ نے مجموعہ میں فرمایا ہے یہ حدیث بالاتفاق ضعیف ہے جیسا کہ یہ حدیث **انه عليه السلام امر عليا بالمسح على الجبائر**

اور امام نوویؒ کے علاوہ بعض دوسرے حضرات کا یہ کہنا کہ اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں یہ قول جمہور کے مخالف ہونے کے ساتھ ساتھ اس لئے قابلِ ردّ ہے کہ جرح وہ تعدیل سے مقدم ہوتی ہے (**كما في نخبة الاثر**)

اور ابن حجرؒ کا یہ دعویٰ کرنا کہ اس روایت کا ایک صحیح طریق ہے یہ غیر صحیح ہے کیونکہ یہ دعویٰ بیان و وضاحت کا محتاج ہے اور اس میں صرف احتمال کافی نہیں ہے اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ اسی وجہ سے امام ابوداؤدؒ نے اس پر خاموشی اختیار کی ہے یہ مردود ہے اس لئے کہ امام ابوداؤدؒ کی خاموشی دوسروں کے اس حدیث کو ضعیف قرار دینے کے مساوی نہیں ہو سکتی۔

اور انتہائی عجیب بات یہاں پر یہ ہے کہ بعض شافعیہ نے جبیرہ کے مسئلہ پر اس حدیث کے ساتھ استدلال کیا ہے حالانکہ یہ روایت اس پر بالکل صریح ہے (استدلال کرنے کی ضرورت ہی نہیں) اور تحقیق طبرانی نے ابوامامۃ سے حضور ﷺ کا یہ عمل نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ کو جب ابن قمیہ نے اُحد میں زخمی کیا تو میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ وضو کرتے تو پٹی کو اتار لیتے اور اس پر مسح کرتے۔

اور ابن ماجہ، بیہقی اور دارقطنی نے حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب میرے ہاتھ کا گٹا ٹوٹ گیا تو میں نے حضور ﷺ سے سوال کیا اس کے بارے میں تو آپ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں پٹی پر مسح کروں۔ امام بیہقی نے فرمایا ہے کہ ابن عمرؓ سے صحیح طریق سے یہ منقول ہے کہ انہوں نے پٹی پر مسح کیا اور صحابہ میں اس کا کوئی مخالف نہیں ہے اور دارقطنیؒ نے ابن عمرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ پٹی پر مسح کیا کرتے تھے اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا موقوف ہونا زیادہ صحیح ہے لیکن موقوف روایت اس مسئلہ میں مرفوع کے حکم میں ہے اس لئے کہ بدل کا مقرر کرنا یہ رائے سے نہیں ہوتا (تو مسح غسل کا بدل ہے تو لازم امر یہ ہے کہ صحابی نے حضور ﷺ سے یہ بات سنی ہوگی یا دیکھی ہوگی)۔

الفصل الثانی:

تیمّم کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز کے اعادہ کا حکم

۵۳۳: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ قَالَ خَرَجَ رَجُلَانِ فِیْ سَفَرٍ فَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ وَلَیْسَ مَعَهُمَا مَاءٌ فَتَیَمَّمَا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَصَلَّیَا ثُمَّ وَجَدَا الْمَاءَ فِی الْوَقْتِ فَاَعَادَ اَحَدُهُمَا الصَّلٰوةَ بِوُضُوْءٍ لَمْ یُعِدِ الْاٰخَرُ ثُمَّ اَتَیَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَذَکَرَا ذٰلِكَ فَقَالَ لِلَّذِیْ لَمْ یُعِدْ اَصَبْتَ السُّنَّةَ وَاَجْزَاَتْكَ صَلَاتُكَ

وَقَالَ لِلَّذِیْ تَوَضَّأَ وَاَعَادَلَكَ الْاَجْرُ مَرَّتَيْنِ ۔ (رواه ابوداود والدارمی وروی النسائی نحوه)

أخرجه ابوداؤد فی السنن ۱/۲۴۰حدیث رقم ۳۳۸۔ وأخرجه الدارمی فی السنن ۱/۱۹۰حدیث رقم ۷۴۴۔ وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۲۱۳حدیث رقم ۴۳۳۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ دوآدمی سفر کے لئے روانہ ہوئے۔ سفر کے دوران نماز کا وقت آگیا اوران کے پاس پانی نہیں تھا۔ چنانچہ دونوں نے پاک مٹی سے تیمّم کرلیا اور نماز پڑھ لی۔ آگے چل کر انہیں پانی مل گیا اور نماز کا وقت بھی باقی تھا۔ ان میں سے ایک نے وضو کر کے نماز کا اعادہ کرلیا اور دوسرے نے اعادہ نہ کیا۔ جب یہ دونوں واپس آکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا واقعہ ذکر کیا تو رسول اللہ ﷺ نے پورا واقعہ سن کر اس شخص سے کہا جس نے نماز کا اعادہ نہیں کیا تھا کہ تم نے سنت پر عمل کیا اور جس شخص نے وضو کر کے نماز کا اعادہ کیا تھا اس کو کہا کہ تمہارے لئے دُگنا اجر ہے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے اور امام نسائی نے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے امام نسائی اور امام ابوداؤد نے عطاء بن یسار سے مرسلاً بھی نقل کی ہے۔''

تشریح: **فتیمما صعیدا طیبا:** یعنی انہوں نے اس کا مخصوص طریقہ سے ارادہ کیا تو پھر اس صورت میں یہاں تیمّم کا لغوی معنی مراد ہے یا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے مٹی سے تیمّم کیا تو پھر اس سے شرعی معنی مراد ہوگا اور یہ منصوب بنزع الخافض ہوگا (یعنی حرف جر یہاں محذوف ہے ای فتیمما بالصعید)

ثم وجدا الماء فی الوقت: علماء کرام کا اس پر اجماع ہے کہ جب نماز سے فارغ ہو کر پانی پائے تو اس پر نماز کا اعادہ نہیں ہے اگر چہ وقت باقی ہو اور ائمہ کا اختلاف اس بارے میں ہوا ہے کہ جب وہ پانی کو نماز میں داخل ہونے کے بعد پائے تو جمہور کا مذہب یہ ہے کہ وہ نماز کو نہیں توڑے گا اور یہی صحیح مذہب ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ایک روایت امام احمدؒ سے یہ ہے کہ اس کا تیمّم باطل ہو جائے گا۔

فاعاد احدهما الصلوٰة بوضوء: یا اعادہ اس گمان سے کیا کہ پہلی نماز باطل ہوگئی یا احتیاط کی وجہ سے نماز لوٹائی۔

ولم یعد الاخر: اٰخر ''خاء'' کے فتحہ کے ساتھ ہے اور دوسرے ساتھی نے نماز اس لئے نہیں دھرائی کہ وہ صورت صحیح ہے (یعنی نماز پڑھی ہوئی ہے وہ صحیح ہے)

اصبت السنة: یعنی تو نے اس شریعت کو اختیار کیا جو سنت سے ثابت ہے۔

لك الاجر مرتین: یعنی تیرے لئے نماز کا اجر دو مرتبہ ہے بے شک وہ دونوں نمازیں صحیح ہیں اور ان کی صحت کی وجہ سے ان پر ثواب بھی مرتب ہوگا اور بے شک اللہ تعالیٰ نیک عمل کرنے والے کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: **دع ما یریبك الی مالا یریبك:** کہ چھوڑ اس چیز کو جو تجھے شک میں ڈالے اس چیز کی طرف جو تجھے شک میں نہ ڈالے۔

۵۳۴: وَقَدْ رَوٰى هُوَ وَاَبُوْ دَاوٗدَ اَيْضًا عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ مُرْسِلًا ۔

ترجمہ: ''اور نسائی اور ابوداؤد نے عطاء بن یسار سے مرسلاً بھی روایت کی ہے۔''

راویٔ حدیث:

عطاء بن یسار۔ یہ عطا ہیں یسار کے بیٹے۔ان کی کنیت ''ابو محمد'' ہے۔ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ ہیں۔ ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ ہیں اھ۔ مدینہ کے مشہور تابعین میں سے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بکثرت روایت کرتے ہیں۔ ۹۷ھ میں بعمر ۸۴ سال وفات ہوئی۔

وابوداؤد ایضا عن عطاء بن یسار مرسلا : یہ بات بخوبی جان لینی چاہیے کہ امام ابوداؤدؒ نے اس حدیث کو عبداللہ بن نافع عن اللیث بن سعد عن بکر بن سوادۃ عن عطاء بن یسار عن ابی سعید الخدریؓ کے طریق سے مرفوع نقل کیا ہے پھر امام ابوداؤدؒ نے فرمایا کہ عبداللہ بن نافع کے علاوہ دوسروں نے اس کو اس طرح نقل کیا ہے:عن اللیث عن عمیرۃ بن ابی ناجیه عن بکر بن ابی سوادۃ عن عطاء بن یسار عن النبی ﷺ۔فرماتے ہیں ابو سعیدؓ کا ذکر اس حدیث میں محفوظ نہیں ہے اور یہ روایت مرسل ہے۔

(ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں) لیکن امام حاکمؒ نے فرمایا ہے کہ متصل روایت وہ صحیح ہے اور شیخین کی شرائط کے مطابق ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

الفصل الثالث:

۵۳۵ :وَعَنْ اَبِی الْجُهَیْمِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ الصِّمَّةِ قَالَ اَقْبَلَ النَّبِیُّ ﷺ مِنْ نَحْوِ بِئْرِ جَمَلٍ فَلَقِیَهٗ رَجُلٌ فَسَلَّمَ عَلَیْهِ فَلَمْ یَرُدَّ النَّبِیُّ ﷺ حَتّٰی اَقْبَلَ عَلَی الْجِدَارِ فَمَسَحَ بِوَجْهِهٖ وَیَدَیْهِ ثُمَّ رَدَّ عَلَیْهِ السَّلَامَ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی السنن ۱/۴۴۱ حدیث رقم ۳۳۷۔ومسلم فی صحیحه ۱/۲۸۱ حدیث رقم (۱۱۴۔۳۶۹) وأخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۲۳۳ حدیث رقم ۳۲۹۔وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۱۶۵ حدیث رقم ۳۱۱۔ وأخرجه أحمد فی مسنده ۴/۱۶۹۔

ترجمہ: ''حضرت جہیم بن حارث بن صمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جمل کے کنوئیں کی طرف سے تشریف لائے راستہ میں ایک آدمی آپؐ کو ملا اور اس نے آپؐ کو سلام کیا رسول اللہ ﷺ نے ان کے سلام کا جواب نہ دیا اور ایک دیوار کے پاس تشریف لے گئے (اور آپ ﷺ نے مٹی پر ضرب لگائی) پھر آپ ﷺ نے چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کیا پھر سلام کا جواب دیا''۔(بخاری و مسلم)

تشریح: (بئر جمل): یہ جملہ اضافت کے ساتھ ہے :ای من جانب الموضع الذی یعرف بذاك یعنی اس جگہ سے تشریف لائے جس کو بئر جمل کہا جاتا ہے اور یہ مدینہ میں ایک معروف جگہ ہے جمل ''جیم'' اور ''میم'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

فلقیه رجل فسلم علیه : یہ آدمی ابوالجہم ہیں جو اس روایت کے راوی ہیں امام شافعیؒ نے اس روایت کے اعرج والے

طریق میں اس کو بیان کیا ہے جیسا کہ ابہریؒ نے ذکر کیا ہے اور پیچھے حدیث میں اس کی تصریح بھی گزر چکی ہے۔

حتی اقبل علی الجدار: اس روایت میں دیوار کو کھرچنے کا ذکر نہیں ہے۔

مناکب اور آباط تک مسح کرنا

۵۳۶: وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ یَاسِرٍ اَنَّہٗ کَانَ یُحَدِّثُ اَنَّھُمْ تَمَسَّحُوْا وَھُمْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ بِالصَّعِیْدِ لِصَلَاۃِ الْفَجْرِ فَضَرَبُوْا بِاَکُفِّھِمُ الصَّعِیْدَ ثُمَّ مَسَحُوْا بِوُجُوْھِھِمْ مَسْحَۃً وَاحِدَۃً ثُمَّ عَادُوْا فَضَرَبُوْا بِاَکُفِّھِمُ الصَّعِیْدَ مَرَّۃً اُخْرٰی فَمَسَحُوْا بِاَیْدِیْھِمْ کُلِّھَا اِلَی الْمَنَاکِبِ وَالْاٰبَاطِ مِنْ بُطُوْنِ اَیْدِیْھِمْ۔

(رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ١/٢٢٤ حديث رقم ٣١٨۔وأخرجه النسائي في السنن بحديث طويل ١/١٦٧ حديث رقم ٣١٤۔وأخرجه أحمد في مسنده ٤/٣٢٠۔

ترجمہ: ''حضرت عمار بن یاسرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ چند صحابہ کرام سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور فجر کی نماز کے لئے انہوں نے اس طرح تیمّم کیا کہ پہلے اپنے ہاتھوں کو مٹی پر مار کر اپنے چہروں کا مسح کیا۔ پھر دوسری ضرب کے ساتھ پورے ہاتھوں کا کندھوں اور بغلوں کے اندر تک ہاتھوں کے باطن کی طرف سے مسح کیا۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: مسحة واحدة: بطور استیعاب کے علماء کا اس پر اجماع ہے کہ تیمم کے مسح میں تکرار نہیں ہے۔

فمسحوا بایدیھم للھا الی المناکب والاباط: اباط یہ ابط کی جمع ہے۔

من بطون ایدیھم: منْ یہاں ابتداء کے لئے ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ وہ ہاتھوں کے باطنی حصوں سے مسح کی ابتداء کرتے نہ کہ ان کے ظاہری حصوں سے جیسا کہ فقہاء نے اس کو مستحبات میں ذکر کیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ابتداء سے مراد آلہ مسح ہے نہ کہ ابتدا الممسوح (یعنی محل مسح کی ابتداء) پس یہ تشریح اس باب کے موافق ہوگی اور یہی صواب کے زیادہ قریب ہے۔ امام بغویؒ نے معالم السنن میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ﴾ [المائدۃ:٦] کے تحت فرمایا ہے کہ امام زہریؒ اس بات کی طرف گئے ہیں کہ ہاتھوں کا مسح تیمّم میں کندھوں تک کیا جائے گا جیسا کہ حضرت عمارؓ سے روایت ہے: تیممنا الی المناکب۔ لیکن حضرت عمارؓ کی یہ روایت ان کے اپنے فعل کی حکایت ہے حضور ﷺ سے وہ اس کو نقل نہیں کر رہے جیسا کہ حضرت عمارؓ کی دوسری روایت میں: اجنبت فتمعکت کہ میں جنبی ہوا پس میں مٹی میں تیمّم کے لیے لوٹ پوٹ ہوا۔ تو جب انہوں نے حضور ﷺ سے سوال کیا تو حضور ﷺ نے چہرے اور ہتھیلیوں کے مسح کا حکم دیا۔

اور بیضاویؒ نے فرمایا ہے کہ ید نام ہے اس عضو کا جو کندھے تک ہو اور حضور ﷺ سے یہ روایت: تیمم ومسح یدیه الی مرفقیه اور تیمّم کو وضوء پر قیاس کرنا یہ دلیل ہے اس بات کی یہاں ایْدی سے مراد مرافق (کہنیوں سمیت) ہیں۔ امام بیضاویؒ کی قیاس سے مراد فرع کو اصل پر قیاس کرنا ہے۔ واللہ اعلم۔

بَابُ الْغُسْلِ الْمَسْنُوْنِ

غسل مسنون کا بیان

غسل فتحہ کے ساتھ یہ مصدر ہے اور غسل کسرہ کے ساتھ وہ چیز کہ جس کے ساتھ دھویا جائے اور غسل ضمہ کے ساتھ غسل مخصوص کو کہتے ہیں اور یہاں یہی مراد ہے۔

جمعہ کے لئے غسل

۵۳۷: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جَاءَ اَحَدُكُمُ الْجُمُعَةَ فَلْيَغْتَسِلْ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۳۵۶/۲ حديث رقم ۸۷۷۔ وأخرجه مسلم في صحيحه ۵۷۹/۲ حديث رقم (۱۔۸٤٤) وأخرجه أبوداؤد في السنن ۲٤۲/۱ حديث رقم ۳٤۰۔وأخرجه الترمذي في السنن رقم ۳٦٤/۲ حديث رقم ٤۹۲۔ولفظه اذا أتى۔ وأخرجه النسائي في السنن ۹۳/۳ حديث رقم ۱۳۷٦۔وأخرجه ابن ماجة في السنن ۳٤٦/۱ حديث رقم ۱۰۸۸۔وأخرجه الدارمي في السنن ٤۳۳/۱ حديث رقم ۱۵۳٦۔وأخرجه مالك في الموطأ ۱۰۲/۱ حديث رقم ۵ من كتاب الجمعة۔ وأخرجه أحمد في مسنده ۹/۲۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی جمعہ کے دن نماز پڑھنے کے لئے آئے تو اس کو چاہئے کہ غسل کر کے آئے''۔ (بخاری ومسلم)

احدکم: یہ صحیح قول کے مطابق مرفوع ہے۔

تشریح: **الجمعة** : جمعة ''میم'' کے ضمہ اور سکون کے ساتھ یہ مفعولیت کی بناء پر منصوب ہے: **ای اذا اراد احدکم ان یاتی الجمعة** جیسا کہ یہ لیث عن نافع کی روایت میں تصریح کے ساتھ واقع ہے **ای صلاتها** یعنی جمعہ کی نماز پڑھنے آئے۔

فلیغتسل: اور اس میں اشارہ ہے کہ غُسل نماز جمعہ کے لئے ہے نہ کہ جمعہ کے دن کے واسطے اور یہی صحیح بات ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا کہ ظاہر یہ کہ **الجمعة** فاعل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ﴿فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ﴾ [الاعراف: ۱۳۱] اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ﴿اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ [المنافقون: ۱۰] اور اس سے یہ معلوم ہوا کہ جمعہ کا غسل صبح سے پہلے صحیح نہیں ہے۔ میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ اس بات میں تامل ہے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے ''فاء'' یہاں تعقیب کے لئے ہے اور اس صورت میں یہ ظاہر گا کہ غسل آنے کے بعد ہوگا حالانکہ یہ مراد نہیں ہے پس صحیح یہ ہے کہ ''فاء'' جزاء کے لئے ہے ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ علامہ طیبیؒ کا کلام وہ دوسری روایت کی غفلت کی بناء

پر ہے اور وہ روایت یہ ہے :من اتی الجمعة من الرجال والنساء فليغتسل ومن لم ياتها فليس عليه غسل من الرجال والنساء اور اس روایت کی سند صحیح ہے پھر غسل کرنے کا امر وہ استحباب کی تاکید کے لئے ہے جمہور کے نزدیک اس دلیل کی بنا پر جو آگے آ رہی ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک غسل جمعہ واجب ہے اور یہی ظاہر یہ کا مذہب ہے۔

جمعہ کے دن غسل واجب ہے

۵۳۸:وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غُسْلُ يَوْمِ الْجُمُعَةِ وَاجِبٌ عَلٰی كُلِّ مُحْتَلِمٍ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی الصحيح ۳۸۲/۲حديث رقم ۸۹۵۔وأخرجه مسلم فی صحيحه ۵۸۰/۱حديث رقم (۵۔۸۴۶) وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۲۴۳/۱حديث رقم ۳۴۱۔وأخرجه النسائی فی السنن ۹۳/۳حديث رقم ۱۳۷۷۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۳۴۶/۱حديث رقم ۱۰۸۹۔وأخرجه مالك فی الموطا ۱۰۲/۱ حديث رقم ٤ من كتاب الجمعة۔وأخرجه الدارمی فی السنن ٤۳٤/۱ حديث رقم ۱۵۳۷۔وأخرجه أحمد فی مسنده ۶۰/۳۔

ترجمہ:''حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر بالغ پر جمعہ کے دن غسل واجب ہے''۔(بخاری ومسلم)

تشریح:غسل يوم الجمعة : یہ مظروف کی ظرف کی طرف اضافت کی قبیل سے ہے جیسا کہ:مكر الليل اور یوم کی اضافت کا جمعہ کی طرف ہونا نہ کہ اس کے وقت کی طرف اس سے یہ بات ماخوذ ہوتی ہے کہ غسل جمعہ کا وقت جمعہ کی طلوع فجر کے بعد داخل ہوتا ہے، پس اس سے پہلے غسل جائز نہ ہوگا امام اوزاعیؒ اور بعض فقہاء اس سے اختلاف کرتے ہیں اور ان میں سے بعض ہمارے علماء ہیں اور یہ غسل جمعہ کے لئے آنے پر موقوف نہیں ہے۔امام مالکؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

واجب: ای ثابت۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کو چھوڑا جائے یہ مطلب نہیں ہے کہ غسل کو چھوڑنے والا گنہگار ہوگا امام مالکؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔بعض حضرات نے کہا ہے یہ حدیث اور اسی طرح دوسری احادیث استحباب کی تاکید کے لئے ہیں جیسا کہ یہ محاورہ بولا جاتا ہے :رعاية فلان علينا واجبة''کہ فلاں کی رعایت ہم پر واجب ہے۔''

على كل محتلم: ای بالغ۔یعنی وہ بالغ جو احتلام کے زمانے کو پانے والا ہو۔اور غسل جمعہ کا سبب یہ ہے کہ لوگ خدمت میں مشغول رہتے تھے اور اُونی کپڑے اور کام کاج والے کپڑے پہنتے تھے اور مسجد نبوی وہ تنگ تھی اور چھت بھی اس کی قریب تھی، پس جب صحابہ کرامؓ کو پسینہ آتا تو بعض کو بعض سے تکلیف ہوتی خصوصاً ان حضرات کے علاقوں میں کہ جہاں گرمی انتہائی زیادہ محسوس ہوتی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے غسل کرنے کو وجوبی الفاظ کے ساتھ مستحب قرار دیا تاکہ یہ تعبیر اس امر کے پورا کرنے میں زیادتی رغبت کا سبب بنے۔

غسل جمعہ حق ہے

۵۳۹:وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَقٌّ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ اَنْ يَغْتَسِلَ فِيْ كُلِّ سَبْعَةِ اَيَّامٍ يَوْمًا يَغْسِلُ فِيْهِ رَأْسَهٗ وَجَسَدَهٗ. (متفق عليه)

أخرجه البخارى فى الصحيح ٢/٣٨٢حديث رقم ٨٩٧۔وأخرجه مسلم فى صحيحه ٢/٥٨٢حديث رقم (٩۔٨٤٩) وأخرجه أحمد فى مسنده ٢/٣٤٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان پر حق اور لائق ہے کہ ہر ہفتہ میں ایک دن غسل کرے۔اس دن اپنا سر اور تمام جسم دھوئے۔'' (بخاری ومسلم)

في كل سبعة ايام :اس سے مراد غسل جمعہ ہے جیسا کہ دوسری روایت نے اس کو بیان کیا ہے۔

تشریح: **يغسل فيه راسه** : اولاً۔

وجسده : یعنی تمام بدن کو اور اس سے آنکھوں کا اندرونی حصہ مستثنیٰ ہے اور یہ جملہ **يغتسل** کا بیان ہے اور اس میں حکم کی علت کے بیان کی خبر دینا ہے اس لئے کہ سر اور جسم وہ اکثر میل وغیرہ کا محل ہوتے ہیں اور غسل جمعہ میں دائیں طرف سے شروع کرنا اور وضوء کو مقدم کرنا یہ مستحب ہے اور باقی کلی اور ناک میں پانی ڈالنا تو یہ وضوء میں سنت ہیں اور غسل میں ہمارے نزدیک فرض ہیں۔

الفصل الثانی:

جمعہ کے دن غسل افضل ہے

۵۴۰:وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ تَوَضَّأَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَبِهَا وَنِعِمَتْ وَمَنِ اغْتَسَلَ فَالْغُسْلُ اَفْضَلُ ۔ (رواه احمد وابوداود والترمذى والنسائى والدارمى)

أخرجه أحمد فى المسند ٥/١٦۔وأخرجه أبوداوٗد فى السنن ١/٢٥١حديث رقم ٣٥٤۔وأخرجه الترمذى فى السنن ٢/٣٦٩حديث رقم ٤٩٧وقال حديث حسن ۔وأخرجه النسائى فى السنن ٣/٩٤حديث رقم ١٣٨٠وأخرجه الدارمى فى السنن ١/٤٣٤حديث رقم ١٥٤٠۔

ترجمہ: ''حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے جمعہ کے دن وضو کر لیا تو اس نے بہت اچھا کیا کہ فرض ادا ہو گیا اور جس نے غسل کیا تو اس نے افضل کام کیا۔
اس حدیث کو امام احمد' امام ابوداوٗد' امام ترمذی' امام نسائی اور امام دارمی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **وعن سمرة** : ''سین'' کے فتحہ اور ''میم'' کے ضمہ کے ساتھ۔

ابن جندب :''جیم'' اور ''دال'' کے ضمہ اور فتحہ دونوں طرح منقول ہے۔

نعمت میں مختار بات یہ ہے کہ **نعمت** ''نون'' کے کسرہ اور ''عین'' کے سکون کے ساتھ ہے اور ''نون'' کا فتحہ اور ''عین'' کا کسرہ بھی جائز ہے اور یہ ایسا کلام ہے کہ جو کسی امر کے جائز قرار دینے اور اچھا قرار دینے کے لئے بولا جاتا ہے اور تقدیر عبارت یوں ہوگی: **و نعمت تلك الفعلة هي** اور بعض نے کہا ہے کہ **فبها** میں ''ھاء'' ضمیر سنت کی طرف راجع ہے اگرچہ سنت کا ذکر لفظاً اور نہ ہی معناً پہلے ہوا ہے لیکن حال کے قرینہ کی بناء پر یہ حکماً مراد ہوگا اور ''باء'' یہ مقدر کے ساتھ متعلق ہے اور اصمعیؒ سے مروی ہے کہ اس کی تقدیر عبارت یہ ہے: **فبا لسنة اخذ و نعمت الخصلة هی** بعض نے کہا ہے کہ اس میں نظر ہے اس لئے کہ یہ سنت پر عمل کرنے والا اس وقت ہوگا جب وہ غسل کرے اور جب وہ وضوء کرے تو اس وقت تو یہ صرف فرض کو اداء کرنے والا ہے لہٰذا بہتر تعبیر یہ ہے: **فبالشريعه او الرخصة او الفعلة او الخصلة** ۔

اور بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے **فبالرخصة اخذ**...... اس لئے کہ **الفعلة** یا **الخصلة** یہ مبہم ہیں اور شریعت وہ عام ہے اور تمام کو شامل ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ تقدیر عبارت یہ ہے: **فبالرخصة اخذ و نعمت السنة التی ترکها ای الغسل** یعنی جس نے صرف وضوء کیا تو اس نے رخصت پر عمل کیا اور بہترین سنت کو چھوڑ دیا ہے یعنی غسل کو۔ یہ توجیہ اگرچہ معنیٰ کے اعتبار سے قوی ہے لیکن ضمیروں کے مرجع کے اختلاف کی وجہ سے لفظاً ضعیف ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ دوسری ضمیر کے مرجع پر کوئی چیز دلالت بھی نہیں کرتی۔ پس بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ تقدیر عبارت یوں ہے: **فبالفرضية اخذ و نعمت الفرضية هی** یا یوں کہا جائے: **بخصلة النظافة اخذ و نعمت الخصلة هی**۔

و من اغتسل: یعنی نماز جمعہ کے لئے اور اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ غُسل جمعہ وہ درست نہیں ہوتا مگر فرض سے پہلے ابن حجرؒ نے اس کو ذکر کیا ہے اور ابن حجرؒ کی یہ روایت محل تامل ہے۔

فالغسل افضل: اس لئے کہ یہ اکمل قسم کی تطہیر ہے اور یہ حدیث اس بات میں بالکل واضح ہے کہ غسل یوم الجمعہ وہ سنت ہے واجب نہیں ہے اور مسلم کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: **من توضا فاحسن الوضوء ثم اتی الجمعة فلنا واستمع وانصت غفرله مابينه وبين الجمعة وزيادة ثلاثة ايام**۔ ''کہ جس نے وضوء کیا اور اچھی طرح وضوء کیا پھر جمعہ کے لئے آیا پس وہ امام کے قریب ہوا اور اچھی طرح خطبہ سنے تو اس کے اور (اگلے) جمعے کے درمیان جو گناہ ہوں وہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور مزید تین دن۔'' (یعنی دس دن **الحسنة بعشر امثالها** کے قاعدے سے ملتے ہیں)۔

امام ترمذیؒ اور دوسرے بعض حضرات نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے اور ابو حاتم رازیؒ نے اس کی صحیح قرار دیا ہے اور شاید کہ یہ حدیث وجوب کے قائلین کو نہ پہنچی ہو اور باقی وجوب کی روایت کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ یہ اصح ہے لہٰذا دوسری روایات پر اس کو مقدم کیا جائے گا یہ بات صحیح نہیں ہے اس لئے کہ روایت کی اصحیت وہ اس کو مقدم کرنے کو نہیں چاہتی مگر اس مخالف روایت پر کہ اس کے اور اس کے درمیان تطبیق ممکن نہ ہو اور باقی جب دونوں (اصح اور صحیح) کے درمیان تطبیق ممکن ہو تو پھر اصح کی وجہ سے صحیح کو لغو قرار دینا جائز نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں کے درمیان جمع کرنا (تطبیق دینا) بھی متعین ہوگا پس اسی وجہ سے ہم نے اصح کی ایسی تاویل کی ہے جو صحیح کے موافق ہے نہ کہ اس کا عکس اس کے مشکل ہونے کی وجہ سے اس لئے کہ کلام میں اکثر وجوب کا اطلاق تاکید پر ہوتا ہے جیسا کہ آدمی اپنے ساتھی کو کہتا ہے: **حقك واجب**

اور باقی وضوء پر اقتصار کرنے کی مدح اور غسل کا اس سے افضل قرار دینا پس اس کا اطلاق مطلقاً غسل کو واجب ماننے کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔

مردہ کو غسل دینے والا غسل کرے

۵۴۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ غَسَّلَ مَیِّتًا فَلْیَغْتَسِلْ (رواه ابن ماجة وزاد احمد والترمذی وابوداود وَمَنْ حَمَلَهٗ فَلْیَتَوَضَّأْ)۔

أخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/ ٤٧٠ حدیث رقم ١٤٦٣ وبزیادة "من حمله فلیتوضا"۔ أخرجه أحمد فی مسنده ۲/ ٤٥٤ وأخرجه الترمذی فی السنن ۳/ ۳۱۸ حدیث رقم ۹۹۳ وحسنه وأخرجه أبوداؤد فی السنن ۳/ ٥١١ حدیث رقم ٣١٦١۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے کسی مردے کو غسل دیا ہو اس کو بعد میں خود بھی غسل کر لینا چاہئے۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ امام احمدؒ ، امام ترمذیؒ اور امام ابوداؤدؒ نے کچھ زیادتی کے ساتھ اس روایت کو نقل کیا ہے کہ جو شخص جنازہ کو اٹھانے کا ارادہ کرے اس کو وضو کر لینا چاہئے۔''

تشریح: من غسل: یہ صیغہ تخفیف اور تشدید دونوں طرح منقول ہے۔

میتا: میت یہ تشدید کے ساتھ ہے اور اس کو تخفیف کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔

فلیغتسل: اس ناپسند بو کو زائل کرنے کے لئے جو بوجہ غسل میت کے حاصل ہوتی ہے اور یہ امر استحباب کے لئے ہے اور یہی اکثر حضرات کا مذہب ہے اس صحیح روایت کی وجہ سے: **لیس علیکم فی میتکم غسل اذا غسلتموہ** ''کہ تم پر میت کو غسل دینے کے بعد غسل ضروری نہیں ہے'' اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ امر وجوب کے لئے ہے اس لئے کہ یہ آدمی اس بات سے مامون نہیں ہے کہ اس کو میت کے جسم پر پڑنے والے پانی کے چھینٹے پہنچ جائیں اور اس کو ان چھینٹوں کی جگہ کا علم نہ ہو پس اس پر بدن کا دھونا واجب ہوگا پس اگر ان چھینٹوں کے نہ پڑنے کا علم ہو تو غسل واجب نہیں ہے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) یہاں یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہ دلیل شک پر مبنی ہے جس سے وجوب کا فائدہ نہیں ہوتا نیز ماء مستعمل صحیح قول کے مطابق پاک ہے۔

امام ابوداؤدؒ نے فرمایا یہ روایت منسوخ ہے میں نے امام احمد بن حنبلؒ سے یہ بات سنی کہ جب ان سے میت کو غسل دینے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں وضوء کافی ہے اسی طرح التصحیح میں ہے۔

وزاد احمد والترمذی: اور امام ترمذیؒ نے اس زیادتی کو حسن قرار دیا ہے اور جمہور اس کو ضعیف قرار دیا ہے اور امام ترمذیؒ کے اس حدیث کو حسن قرار دینے پر انکار کیا ہے۔ اور امام بیہقی نے فرمایا ہے صحیح یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے اور ماوردیؒ نے فرمایا ہے کہ بعض حضرات نے اس روایت کو صحیح قرار دینے کے لئے اس روایت کے ۱۲۰ طریق تخریج کیئے ہیں۔ میرک شاہؒ

نے اس کو نقل کیا ہے۔

ومن حمله : مطلب یہ ہے کہ میت کو چھوا ہو یا جنازے کے اٹھانے کا ارادہ کیا ہو اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔

فلیتوضا : یعنی وہ آدمی جنازے کو اٹھاتے وقت وضوء کی حالت میں ہوتا کہ جنازے کے رکھنے کے وقت آسانی کے ساتھ جنازہ میں شریک ہو سکے اور یہ بھی جائز ہے کہ محض جنازہ اٹھانے کے لئے وضوء کرے کیونکہ یہ اٹھانا بھی عبادت ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ احتیاطاً وضوء کرے اس لئے کہ بسا اوقات جنازے کی دہشت کی شدت کی وجہ سے اور جنازے کے اٹھانے کے خوف کی وجہ سے اور اس کے وزنی ہونے کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ اس کی ریح خارج ہوگئی ہو اور اس کو معلوم نہ ہو۔ بہر حال تمام صورتوں میں امر یہاں پر بالاتفاق استحباب کے لئے ہے۔

چار چیزوں کی وجہ سے غسل کرنا

۵۴۲: وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَانَ يَغْتَسِلُ مِنْ اَرْبَعٍ مِنَ الْجَنَابَةِ وَيَوْمَ الْجُمُعَةِ وَمِنَ الْحِجَامَةِ وَمِنْ غُسْلِ الْمَيِّتِ . (رواه ابو داود)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ۱/۲٤۸ حديث رقم ۳٤۸ وأحمد في مسنده ٦/۱٥۲۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ چار چیزوں کی وجہ سے غسل کرنے کا حکم دیتے تھے: ① جنابت کی وجہ سے ② یوم جمعہ کی وجہ سے ③ حجامت کی وجہ سے نمبر ۴ مردہ کو غسل دینے کی وجہ سے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **کان یغتسل** : ای یری الغسل۔

من اربع : یعنی ان چار چیزوں میں غسل کا حکم دیتے تھے یہاں یہ مراد نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے میت کو غسل دیا پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے غسل کیا کیونکہ آپ ﷺ نے کبھی بھی کسی میت کو غسل نہیں دیا اور یہ حضرت ماعز والی روایت کی طرح ہے کہ جس میں یوں آتا ہے کہ: **انه رجم ماعزًا** کہ آپ ﷺ نے ماعز کو رجم کیا حالانکہ آپ ﷺ نے ماعز کو رجم نہیں کیا بلکہ رجم کرنے کا حکم دیا تھا تو یہاں بھی یہی مراد ہے کہ آپ ﷺ میت کو غسل دینے والے کو غسل کرنے کا حکم فرماتے تھے۔

اور **من الجنابة** کا یہ ارشاد حرف جر کے ادعادہ کے ساتھ بدل ہے **ای من اجلها** پس منْ یہاں تعلیلیہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ابتدائیہ ہے لیکن یہ بات تکلف بلکہ تعسف (یعنی ایسے معنی پر محمول کرنا ہے جس پر دلالت ظاہر نہیں ہے) سے خالی نہیں ہے پھر یہاں پر اس جملہ کے مابعد کو اس پر عطف کرنا کہ وہ بھی اس کی طرح واجب ہیں اس پر حدیث میں کوئی دلالت نہیں ہے اس لئے کہ ایک ساتھ ذکر ہونے کی دلالت وہ حجت نہیں ہے جیسا کہ علم الاصول میں یہ بات بیان کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ [الانعام: ۱٤۱] ''جب یہ چیزیں پھلیں تو ان کے پھل کھاؤ اور جس دن (پھل توڑو اور کھیتی) کاٹو تو خدا کا حق بھی اس میں سے ادا کرو۔'' یہاں اس آیت میں بالاجماع کھانا جائز ہے اور عشر دینا جس کا ذکر ﴿وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ میں ہے وہ واجب ہے۔

ويوم الجمعة : یہ جر کے ساتھ ہے اور ''جر'' ہی پہلے اور بعد والے ارشاد کے مناسب ہے اور اگر نصب صحیح ہو تو پھر یہ منصوب ہوگا حرف جر کے حذف کے ساتھ۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے ظاہر یہ ہے کہ اس کا عطف **من الجنابة** پر ہے لیکن جمعہ کے دِن سے غسل کا کوئی معنی معلوم نہیں ہے مگر یہ کہ ''من'' جو یہاں مقدر ہے عطف کے سبب اس کو تعلیل کے لئے مانیں (تو پھر معنی صحیح ہوگا) اور اسی تقریر سے ان حضرات کا ردّ ہو جاتا ہے کہ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ ''مِنْ'' کو یہاں پر اس لئے نہیں لائے کہ غسل کرنا وہ جمعے کے لئے ہے اور اس کی کرامت کے لئے ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس تشریح میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ جب غسل جمعہ کے لئے اور اس کی کرامت کے لئے ہوا تو یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ غسل یوم الجمعۃ کے سبب سے ہے لہٰذا ان دونوں باتوں میں تغائر ثابت نہ ہوا۔

(ملا علی قاری علیہ رحمۃ الباری فرماتے ہیں) اور ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ **من يوم الجمعة** کہنے کو اس لئے چھوڑا تا کہ اس میں اشارہ ہو اس بات کی طرف کہ غسل واحد جنابت اور غسل مسنون دونوں کے قائم مقام ہو جاتا ہے (علیحدہ غسل کی ضرورت نہیں)۔

ومن الحجامة : **حجامه** ''حاء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے یعنی سینگی لگوانے والے کے لئے اور سینگی لگوانے کے بعد غسل وہ گندگی وغیرہ کو دور کرنے کے لئے ہوگا اور اس وجہ سے کہ ہو سکتا ہے کہ اس پر سینگی لگواتے وقت کچھ چھینٹے خون کے پڑ گئے ہوں پس اس سے صفائی حاصل کرنا مستحب ہوگا۔

اور بعض شوافع کا یہاں پر یہ تردید بیان کرنا کہ آیا وہ غسل مجحوم (سینگی لگوانے والے) کے لئے ہے یا حاجم (لگانے والے) اور مجحوم دونوں کے لئے ہے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اس لئے کہ آپ ﷺ نے سینگی لگوانے کی وجہ سے غسل کیا ہے اس وجہ سے کہ آپ ﷺ نے کسی سے سینگی لگوائی اور یہاں یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ کسی کو آپ ﷺ نے سینگی لگائی ہو اس لئے کہ یہ بات آپ ﷺ سے منقول نہیں ہے اور نہ ہی یہ آپ ﷺ کی شان کے مناسب ہے۔ اس بات کو ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے اور اس میں بحث ہے غور کرلو۔

ومن غسل الميت : ابن حجر مکیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ بات اس میں بالکل واضح ہے کہ آپ ﷺ نے میت کو غسل دیا ہے اور اس کی وجہ سے غسل کیا ہے اور بعض حضرات نے اس کو بلا وجہ مستبعد شمار کیا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس کی بات کی سند وہ یہ ہے کہ اگر حضور ﷺ نے یہ کام کیا ہوتا تو البتہ یہ ضرور منقول ہوتا باقی یہ روایت تو یہ اس میں صریح نہیں ہے بلکہ اس کی محتمل ہے حالانکہ لفظ ''کان'' اکثر استمرار اور تکرار کے فائدے کے لئے ہوتا ہے اور یہ لفظ ''کان'' اپنی اصل کے ساتھ روایات اور آثار میں موجود نہیں ہے۔

پھر ابن حجرؒ نے عجیب بات کی ہے اور علامہ طیبیؒ پر ان کی رجم ماعز میں '' **امر برجمه** '' کی توجیہ پر اعتراض اٹھایا ہے اپنے اس قول کے ساتھ۔ کہتے ہیں علامہ طیبیؒ کی یہ بات حد درجہ کمزور ہے جو کہ مخفی نہیں ہے اس لئے عائشہؓ نا قلہ ہیں کہ آپ ﷺ نے میت کو غسل دینے کی وجہ سے غسل کیا پھر یہاں پر کونسی ایسی دلیل ہے کہ جس کی بناء اس کو امر پر محمول کریں بلکہ اس بات کی بناء پر فساد لازم آئے گا اگر اس کے وجود کا تصور کیا جائے اس لئے کہ اس صورت میں تقدیر عبارت یہ ہوگی : **ومن امر بغسل**

المیت اور یہ لغو کلام ہے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ ضعف اور فساد وہ سمجھ کی خرابی کی وجہ سے ظاہر ہوا ہے محل اسناد میں، پس علامہ طیبیؒ نے جب اس حدیث کے آخر پر غور کیا تو انہوں نے اس میں یہ بات دیکھی کہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا میت کو غسل دینے کا وہم ہوتا ہے اور ان کے نزدیک یہ صحیح نہ تھا تو انہوں نے حضرت عائشہؓ کے اس قول کو جو شروع میں ہے معنی مجازی پر محمول کیا معنی حقیقی کے متعذر رہونے کی وجہ سے، پس علامہ طیبیؒ نے یوں تشریح کی کہ یغتسل کا معنی ہے: **کان یامر الناس بالاغتسال من اربع** اور اسی وجہ سے انہوں نے اس کی نظیر رجم ماعز کو بنایا حالانکہ بالاتفاق رجم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے واقع نہیں ہوا تھا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "وامر" سے رجم ہوا تھا۔ پس اے مخاطب تو غور کرتا کہ تیرے لئے (معترض کے) پھسلنے کا مقام اور بے وقوفی کا محل ظاہر ہو جائے۔

میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ منقول نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میت کو کبھی غسل دیا ہو اور اس پر دلیل امام احمدؒ کی روایت ہے کہ جس میں یوں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **یغتسل**...... اور آگے ساری روایت ذکر کی۔

مسلمان ہونے کے وقت غسل کا حکم

۵۴۳: وَعَنْ قَيْسِ بْنِ عَاصِمٍ اَنَّهٗ اَسْلَمَ فَاَمَرَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّغْتَسِلَ بِمَاءٍ وَّسِدْرٍ۔

(رواه الترمذى وابوداود والنسائى)

أخرجه الترمذى فى السنن ٢/ ٥٠٢ حديث رقم ٦٠٥ وقال حديث حسن ـ وأخرجه أبو داوٗد فى السنن ١/ ٢٥١ حديث رقم ٣٥٥ ـ وأخرجه النسائى فى السنن ١/ ١٠٩ حديث ١٨٨ ـ وأخرجه أحمد فى المسند ٥/ ٦١ ـ

ترجمہ: "حضرت قیس بن عاصم کے بارے میں روایت کیا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا ہے کہ وہ پانی اور بیری کے پتوں سے غسل کریں۔ اس حدیث کو امام ترمذی، امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔"

راویٔ حدیث:

قیس بن عاصم۔ نام قیس تھا یہ عاصم کے بیٹے تھے۔ کنیت "ابوقبیصہ" تھی۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ مشہور یہ ہے کہ ان کی کنیت "ابوعلی" تھی۔ خاندانی اعتبار سے "تمیمی" ہیں۔ وفد تمیم کے ہمراہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ۹ھ میں اسلام قبول کیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ان پر پڑی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ "اہل وبر کے سردار ہیں"۔ عقلمند اور بردبار تھے۔ بردباری میں مشہور تھے۔ اہل بصرہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے حکیم اور دوسرے لوگ روایت کرتے ہیں۔

تشریح: **بماء وسدر**: اکثر ائمہ اس بات کی طرف گئے ہیں کہ جو آدمی مسلمان ہو اس کے لئے غسل کرنا اور کپڑے دھونا مستحب ہے جب کہ حالت کفر میں غسل لازم نہ ہوا ہو اور اس غسل سے مقصود اس محتمل نجاست سے تطہیر ہے جو اس کے اعضاء وغیرہ پر لگی ہو یعنی میل کچیل اور ناپسندیدہ بو باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہاں پانی میں بیری کے پتے ڈال کر غسل کرنے کا حکم دینا یہ صفائی حاصل کرنے میں بطور مبالغے کے ہے اس لئے کہ ایسا پانی جسم کو پاک صاف کر دیتا ہے اور اس کا غسل کرنا وہ شہادتین کے کہنے

سے مؤخر ہوگا اصح قول کے مطابق اور امام مالکؒ اور احمدؒ فرماتے ہیں اگر چہ جنبی نہ ہو غسل واجب ہوگا اور باقی جب وہ مسلمان ہوا اور تحقیق اس نے حالت کفر میں جماع کیا ہو یا اس کو احتلام ہوا ہو تو اس پر غسل کرنا فرض ہوگا اگر چہ حالت کفر میں اس نے غسل کیا ہو امام شافعیؒ کے نزدیک اس لئے کہ اس میں نیت کا وہ محتاج ہوگا اور نیت وہ عبادت ہے جو کافر سے صحیح نہیں ہو سکتی اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حالت کفر میں اس کا غسل کر لینا کافی ہے۔ اور اسی طرح سر کا منڈانا تو مسلم کے لئے غسل سے پہلے سنت ہے نہ کہ غسل کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد: الق عنك شعر الكفر واغتسل کی وجہ سے ''کہ تو کفر کی حالت میں رکھے ہوئے بال اتار دے اور غسل کر''۔

وابو داؤد: اور امام ابوداؤدؒ نے اس پر خاموشی اختیار کی ہے، اور منذریؒ نے بھی اس کو ضعیف قرار نہیں دیا ہے۔

والنسائی اور اس کی سند صحیح ہے۔

یوم جمعہ کے لئے غسل واجب نہیں

۵۴۴: عَنْ عِكْرِمَةَ قَالَ اِنَّ اُنَاسًا مِنْ اَهْلِ الْعِرَاقِ جَاءُوْا فَقَالُوْا يَا ابْنَ عَبَّاسٍ اَتَرَى الْغُسْلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَاجِبًا قَالَ لَاوَلٰكِنَّهٗ اَطْهَرُ وَخَيْرٌ لِّمَنِ اغْتَسَلَ وَمَنْ لَمْ يَغْتَسِلْ فَلَيْسَ عَلَيْهِ بِوَاجِبٍ وَسَأُخْبِرُكُمْ كَيْفَ بَدْءُ الْغُسْلِ كَانَ النَّاسُ مَجْهُوْدِيْنَ يَلْبَسُوْنَ الصُّوْفَ وَيَعْمَلُوْنَ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ وَكَانَ مَسْجِدُهُمْ ضَيِّقًا مُقَارِبَ السَّقْفِ اِنَّمَا هُوَ عَرِيْشٌ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فِيْ يَوْمٍ حَارٍّ وَعَرِقَ النَّاسُ فِيْ ذٰلِكَ الصُّوْفِ حَتّٰى صَارَتْ مِنْهُمْ رِيَاحٌ آذٰى بِذٰلِكَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا فَلَمَّا وَجَدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم تِلْكَ الرِّيَاحَ قَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِذَا كَانَ هٰذَا الْيَوْمُ فَاغْتَسِلُوْا وَلْيَمَسَّ اَحَدُكُمْ اَفْضَلَ مَايَجِدُ مِنْ دُهْنِهٖ وَطِيْبِهٖ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ ثُمَّ جَاءَ اللّٰهُ بِالْخَيْرِ وَلَبِسُوْا غَيْرَ الصُّوْفِ وَكُفُّوا الْعَمَلَ وَوُسِعَ مَسْجِدُهُمْ وَ ذَهَبَ بَعْضُ الَّذِيْ كَانَ يُؤْذِيْ بَعْضُهُمْ بَعْضًا مِنَ الْعِرَقِ. (رواه ابوداود)

أخرجه أبو داؤد في السنن ۱/ ۲۵۱ حديث رقم ۳۵۳۔

ترجمہ: ''حضرت عکرمہؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ عراق کے چند آدمی آئے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا۔ کیا آپ کی رائے کے مطابق جمعہ کے دن غسل کرنا واجب ہے؟ انہوں نے فرمایا نہیں مگر جمعہ کے دن غسل کرنا زیادہ صفائی اور طہارت ہے جو شخص غسل کر لے اس کے لئے بہتر ہے اور جو آدمی غسل نہ کرے اس کے لئے واجب نہیں ہے اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ جمعہ کے دن غسل کی ابتداء کیسے ہوئی۔ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ لوگ غریب تھے اور اون کا لباس پہنتے تھے اور اپنی پیٹھ پر بوجھ اٹھانے کا کام کرتے تھے ان کی مسجد تنگ تھی چھت پست تھی۔ کھجور کی شاخوں کی تھی ایک روز جب جمعہ کے دن سخت گرمی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے۔ شدید گرمی کی وجہ سے لوگ اون کے موٹے لباس میں پسینہ سے تر ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس کی وجہ سے لوگوں میں رائحہ کریہہ پھیلی۔ جس کی وجہ سے لوگ اذیت محسوس کرنے

لگے جب رسول اللہ ﷺ کو رائحہ کریہہ کا احساس ہوا تو پھر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ جمعہ کے روز غسل کر لیا کرو اور تم میں سے جس کو تیل اور خوشبو میسر ہو اس کو استعمال کر کے آیا کرے حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو مال کی وسعت اور کشادگی عطا کی۔ تو لوگوں نے اون کا لباس چھوڑ کر دیگر عمدہ قسم کے ملبوسات استعمال کرنے شروع کر دیے اور محنت ومشقت والے کاموں سے بھی نجات ہوگئی اور لوگوں کو پسینہ کی وجہ سے جو رائحہ کریہہ کی اذیت تھی وہ بھی ختم ہوگئی اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔''

عن عکرمه: یہ ابن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام تھے یہ اصل میں بربر سے ہیں اور مکہ کے فقہاء اور تابعین میں سے ہیں۔ ابن عباسؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے انہوں نے روایت کی ہے اور ان سے آگے بہت سارے لوگوں نے روایت نقل کی ہے۔ ۱۰۷ میں ان کا انتقال ہوا اس وقت ان کی عمر ۸۳ سال تھی بعض نے سعید بن جبیر سے کہا کہ کیا آپ سے بڑا بھی کوئی عالم ہے فرمایا کہ عکرمہ۔

ناسا: اور ایک نسخہ میں اناسًا ہے۔

من اهل العراق: عراق عبادان سے موصل تک لمبائی میں اور قادسیہ سے حلوان تک چوڑائی کے علاقوں کو کہتے ہیں اور عراقان کوفہ اور بصرہ کو کہتے ہیں قاموس میں اسی طرح ہے۔

یا ابن عباس: ان لوگوں نے عربوں کی عادت کے مطابق بات کی ہے عرب حضرات میں اکابر ومشائخ سے بات کرنے میں ادب کا اتنا اہتمام نہیں ہوتا۔

لکنه اطهر: یعنی یہ طہارت کے اعتبار سے اکمل اور ثواب کے اعتبار سے افضل ہے اس لئے کہ سنت میں اس کا حکم وارد ہے۔

فلیس علی بواجب: یہ دلیل ہے مقدر جواب کیلئے تقدیر عبارت یہ ہے: **فلا باس اذ لیس الغسل فیه واجبا۔**

ساخبرکم ''سین'' یہاں تاکید کے لئے ہے نہ کہ استقبال کے لئے۔

بدء الغسل: **بدء** ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے یعنی غسل جمعہ کی مشروعیت کی ابتداء کا سبب یا جمعہ کی وجہ سے اس کا سنت ہونا۔

کان الناس: یہ جملہ مستانفہ ہے اور الناس سے مراد صحابہ ہیں کیونکہ لوگ حقیقت میں وہی ہیں۔

مجهودین: کہا جاتا ہے **جهد الرجل فهو مجهود** جب کہ آدمی مشقت کو پائے نہایہ میں اسی طرح ہے اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے یعنی ان پر جہد اور مشقت ان کے دنیاوی معاملے میں مسلط تھی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کے لئے احوال میں سے جو سب سے کامل اور سب سے بہتر تھا اس کو پسند کیا اور وہ دنیا سے اور اس کی روکنے والی اشیاء سے بچنا ہے مگر اس قدر کہ جس کے کیئے بغیر چارہ کار نہ ہو کیونکہ اس پر کوئی ناجائز امر مرتب نہیں ہوتا (یعنی بقدر ضرورت وہ دنیا میں مشغول ہوتے تھے)

وکان مسجدهم: یعنی حضور ﷺ کی مسجد اور باقی ''**مسجدهم**'' کہنا اس وجہ سے کہ صحابہ کرام اس میں نماز پڑھتے تھے۔

ضيقا : طول اور عرض کے اعتبار سے تنگ تھی۔

مقارب السقف : چھت کے بلند نہ ہونے کی وجہ سے پس وہ اس کے علاوہ (قریب) ہوگی۔

انما هو عريش : یعنی مسجد کی چھت وہ انگور کی بیل کی طرح تھی یعنی مقصود اس سے سایہ حاصل کرنا تھا اگر چہ وہ کھڑے ہونے والے کے سر کے اوپر ہو۔

اذا كان هذا اليوم : یہ جنس کی طرف اشارہ ہے یا مراد اس طرح کا دِن ہے۔

وليمس ''لام'' کے سکون کے ساتھ ہے اور کسرہ بھی جائز ہے اور ''میم'' اور ''سین'' کے فتحہ کے ساتھ۔

ابن حجرؒ نے یہاں عجیب بات کہی ہے کہ یہ عام کا خاص پر عطف ہے اس لئے کہ حضور ﷺ نے بظاہر اس سے صرف تیل مراد نہیں لیا ہے بلکہ خوشبودار تیل مراد لیا ہے، پس اگر ان کی بات کو تسلیم بھی کر لیں تو پھر بھی یہ **عطف العام علی الخاص** کے قبیل سے نہیں ہے جیسا کہ یہ بات مخفی نہیں ہے۔

پھر ابن حجرؒ نے فرمایا اور یہ روایت اس صحیح حدیث کی طرح ہے کہ جس میں یہ آتا ہے کہ حضور ﷺ ناخنوں کو کاٹتے اور لبوں کو کترواتے تھے جمعے کے دِن نماز جمعہ کی طرف جانے سے پہلے اور ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی اس کے مخالف روایت باطل ہے۔

ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ یہ کلام خلافِ ادب کا موہم ہے کیونکہ ان کی مراد اس سے اگر روایت کی سند ہے تو ان پر ان کا بیان ضروری تھا اور اگر اس سے معنی روایت مراد ہے تو پھر اس حدیث اور اس کے علاوہ دوسری احادیث سے اس کے بطلان پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ اس حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ یہ کام اسی دن میں کیئے جاتے تھے اگر چہ جمہور نے اس کو قبل الصلوٰۃ کے ساتھ مقید کیا ہے کیونکہ ان کے ہاں اس کی کوئی عقلی یا نقلی دلیل ہوگی لیکن جمہور کا کلام ان کے خلاف حجت نہیں ہوگا۔

قال ابن عباس : اس کو کلام کے لمبا ہونے کی وجہ سے دوبارہ ذکر کیا۔

ثم جاء الله بخير : خیر سے مراد یا مال ہے یا فراخی عیش ہے یہ اول قصے پر عطف ہے اور اول قصہ سے مراد **كان الناس** ہے یا **كيف بدء الغسل** کی عبارت ہے ابن عباسؓ نے یہاں ''ثم'' کو ذکر کیا کیونکہ یہ **تراخي في الزمان** پر دلالت کرتا ہے اس لئے کہ صحابہ ایک لمبی مدت تک اسی مشقت کی حالت میں رہے اور فتوحات وہ حضور ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں حاصل ہونا شروع ہوئیں اور بعض نے کہا ہے کہ ''ثم'' یہاں **تراخي في الرتبة** پر بھی دلالت کرتا ہے اسی وجہ سے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے محنت و مشقت کے احوال وہ اسلام کے عدم ظہور کو بتلاتے ہیں، بخلاف ان کی وسعت کے احوال کہ وہ ظہور اسلام کی خبر دیتے ہیں۔ اور اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غنیٰ فقر سے بہتر ہے کہ شکر صبر سے افضل ہو جائے کیونکہ جمہور حضرات اس کے خلاف ہیں۔

و كفوا : تخفیف کے ساتھ مجہول کا صیغہ ہے۔

العمل : یہ مفعول ثانی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی کفایت فرمادی خدام وغیرہ عطاء کر کے۔

ووسع مسجدهم : تمام جانبوں سے اس میں توسیع ہوئی ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی عمر کے آخر میں

اس کے اندر توسیع فرمائی تھی۔

من العرق : یہ بعض کے لئے بیان ہے یا یہ تعلیل کے لئے ہے اگر اس حکم سے بعض کو تعبیر کرنا ہو وہ بعض کہ جس سے اکثر مراد ہوتے ہیں جیسا کہ اخبار میں ظاہری طور پر احتیاط ہی ہوتی ہے کیونکہ بسا اوقات بعض لوگ اس پسینے وغیرہ کو دور نہیں کرتے، پس اس سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے لیکن تکلیف دینے والوں کو اس کا شعور نہیں ہوتا۔

پھر ابن عباسؓ کے کلام سے ظاہراً مقصود یہ ہے کہ غسل جمعہ وہ شروع اسلام میں واجب تھا ناپسندیدہ بو کے اس وقت کثرت سے تکلیف دینے کی وجہ سے پھر جب اس میں خفت آ گئی تو اس کا وجوب منسوخ ہو گیا، پس اگر یہ بات صحیح ہو تو اس سے تمام گزشتہ روایات میں تطبیق ہو جاتی ہے۔

بَابُ الْحَيْضِ

حیض کا بیان

غسل مسنون کے ذکر سے فارغ ہونے کے بعد اب ان چیزوں کا بیان کر رہے ہیں جو فرض غسل کو واجب کرتی ہیں کیونکہ انقطاع حیض وہ غسل کے وجوب کا سبب ہے اور حیض لغت میں ''حَاضَ'' سے مصدر ہے جس کا معنیٰ ہے ''بہنا'' اور شریعت میں حیض کہتے ہیں اس خون کو کہ جس کو عورت کا رحم پھینکتا ہے ایسی عورت جو کہ بیماری اور چھوٹے پن سے سلامتی والی ہو اور حیض کا حکم یہ ہے کہ یہ روزہ، نماز وغیرہ سے روک دیتا ہے اور روزے کی قضاء بعد میں کی جائے گی نہ کہ نماز کی اور اس باب میں اصل وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ﴾ ''اور تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔'' ہے اور اسی طرح حضور ﷺ کا یہ ارشاد: ((هذا شيء كتبه الله على بنات ادم)) کہ'' حیض یہ وہ چیز ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں پر لکھ دیا ہے۔''

رواہ الشیخان : اور اس حدیث کے عموم کی بناء پر امام بخاریؒ نے ان لوگوں کا رد کیا جنھوں نے یہ کہا ہے کہ سب سے پہلے حیض بنی اسرائیل کی عورتوں پر بھیجا گیا۔

ابن الرفعہ نے فرمایا ہے کہ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ جب ہماری ماں حواء علیہا السلام نے گندم کے درخت کو توڑا اور اس کو خون آلود کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ضرور بضرور تجھ کو بھی خون آلود کروں گا جیسے تو نے اس درخت کو کیا پھر اللہ تعالیٰ نے اماں حواء علیہا السلام کو حیض میں مبتلا کر دیا اور حواء علیہا السلام کی تمام بیٹیوں کو بھی قیامت تک۔

الفصل الاول:

یہودی حیض کی حالت میں عورت کو علیحدہ کر دیتے تھے

۵۴۵ : عَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنَّ الْيَهُوْدَ كَانُوْا اِذَا حَاضَتِ الْمَرْاَةُ فِيْهِمْ لَمْ يُؤَاكِلُوْهَا وَلَمْ يُجَامِعُوْهُنَّ فِي

الْبُیُوْتِ فَسَأَلَ اَصْحَابُ النَّبِیِّ ﷺ النَّبِیَّ ﷺ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ الْاٰیَةُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِصْنَعُوْا کُلَّ شَیْءٍ اِلَّا النِّکَاحَ فَبَلَغَ ذٰلِکَ الْیَھُوْدَ فَقَالُوْا مَا یُرِیْدُ ھٰذَا الرَّجُلُ اَنْ یَدَعَ مِنْ اَمْرِنَا شَیْئًا اِلَّا خَالَفَنَا فِیْهِ فَجَاءَ اُسَیْدُ ابْنُ حُضَیْرٍ وَعَبَّادُ بْنُ بِشْرٍ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ الْیَھُوْدَ تَقُوْلُ کَذَا وَکَذَا اَفَلَا نُجَامِعُھُنَّ فَتَغَیَّرَ وَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ حَتّٰی ظَنَنَّا اَنْ قَدْ وَجَدَ عَلَیْھِمَا فَخَرَجَا فَاسْتَقْبَلَتْھُمَا ھَدِیَّةٌ مِنْ لَبَنٍ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَاَرْسَلَ فِیْ اٰثَارِھِمَا فَسَقَاھُمَا فَعَرَفَا اَنَّهٗ لَمْ یَجِدْ عَلَیْھِمَا۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی الصحیح ۱/۲٤٦ حدیث رقم (۱٦۔۳۰۲)وأخرجه ابوداوٗد فی السنن ۱/۱۷۷ حدیث رقم ۲۵۸۔وأخرجه الترمذی فی السنن ۵/۱۹۹ حدیث رقم ۲۹۷۷۔وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۱۵۲ حدیث رقم ۲۸۸۔وأخرجه الدارمی مختصرًا ۱/۲٦۱ حدیث رقم ۱۰۵۳۔وأخرجه أحمد فی مسنده ۳/۱۳۲۔

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہود میں جب کسی عورت کو حیض آ جاتا تھا تو وہ لوگ نہ ان کے ساتھ کھاتے پیتے تھے اور نہ گھروں میں اس کے ساتھ میل جول رکھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے صحابہ کرام نے اس کے متعلق مسئلہ دریافت کیا کہ (حائضہ کے متعلق تو یہودیوں کا یہ عمل ہے ہم کیا کریں؟) ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل کی۔ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ....... کہ یہ لوگ آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں اس آیت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنی عورتوں کے ساتھ حیض کی حالت میں جو چاہو کرو سوائے جماع کے۔ یہ خبر جب یہودیوں کو پہنچی تو انہوں نے کہا یہ شخص ہمارے جس دینی کام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس میں ضرور ہماری مخالفت کرتے ہیں یہودیوں کی یہ بات سن کر حضرت اسید بن حضیرؓ اور حضرت عباد بن بشرؓ دربار رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ یہودی ایسا اور ایسا کہہ رہے ہیں کیا ہم ان کی مخالفت میں حیض کی حالت میں اپنی عورتوں کے ساتھ جماع نہ کیا کریں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کے چہرہ انور کا رنگ متغیر ہو گیا اور ہمیں یہ خیال ہوا کہ آپ ﷺ ان دونوں پر ناراض ہو گئے ہیں چنانچہ یہ دونوں حضرات نکل کر چلے گئے ان کے جانے کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس کہیں ہدیہ میں دودھ آ گیا آپ ﷺ نے ان دونوں کے پیچھے کسی کو بھیجا کہ بلا کر لاؤ دودھ پینے کے بعد ان کو معلوم ہو گیا کہ آپ ہم سے ناراض نہیں ہوئے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ان الیھود : یہود یہ یہودی کی جمع ہے جیسا کہ روم اور رومی اور اس کی اصل یہودیین تھا پھر ''یاء'' نسبت کو حذف کر دیا گیا اسی طرح بعض نے کہا ہے اور اس بات میں تامل ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہود وہ ایک قبیلہ ہے ان کے دادا یہود جو یوسف علیہ السلام کے بھائی تھے ان کے نام پر اس قبیلے کا نام یہود رکھ دیا گیا اور یہودی ان کی طرف منسوب ہے یعنی ان میں سے ایک آدمی۔

کانو : ابن حجرؒ نے ان الیھود کے الفاظ کو حدیث سے ساقط کیا ہے اور ''کانوا'' میں ضمیر ناس کے لئے مانی ہے یہ بات لفظاً اور معنیً دونوں طرح غلط ہے۔

اذا حاضت المرأة : اس میں ابن سیرینؒ کا ردّ ہے کیونکہ انہوں نے حاضت المرءة وطمثت کہنے کو ناپسند کیا ہے جیسا کہ ابن حجرؒ نے ان سے نقل کیا ہے اور انہی کے معنی میں عرکت ونفست ہے اور حضرت عائشہؓ کا "عراك" کے ذکر کرنے سے روکنا تو یہ ایک صحابی کا مذہب ہے اور اس لئے کہ عورتیں اس بات کو ذکر کرنے سے حیاء محسوس کرتی ہیں۔

فیهم : مسلم شریف اور جامع الاصول میں اسی طرح ہے اور شرح المصابیح اور شرح السنۃ میں منهم مذکور ہے۔

لم يؤا كلوها : یہ ہمزہ کے ساتھ ہے اور ہمزہ کو "واؤ" سے بھی بدلا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ "واؤ" سے بدلنا یہ اس میں ایک لغت ہے۔

ولم يجامعوهن : یعنی نہ ان عورتوں کے ساتھ رہتے اور نہ ان سے ملتے۔

في البيوت : "باء" کے کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ مروی ہے اور ضمیر کو (لم يجامعوهن میں) جمع کے ساتھ لائے ہیں اس لئے کہ حاضت المرءة میں مرءة سے مراد جنس ہے پس پہلے مفرد کے ساتھ تعبیر کیا پھر جمع کے ساتھ بطریق تفنن لفظ اور معنی کی رعایت رکھتے ہوئے۔

ويسئلونك عن المحيض : یعنی حیض کے زمانے کا حکم۔

الاية : آیت تینوں وجہوں کے ساتھ ہے پوری آیت یوں ہے: ﴿قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ﴾ [البقرہ:۲۲۲] "کہہ دو وہ تو نجاست ہے سو ایام حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو۔" ازھار میں مذکور ہے کہ پہلے محیض سے مراد بالاتفاق خون ہے قل هو اذى کے ارشاد کی وجہ سے اور دوسرے محیض کے بارے میں تین اقوال ہیں:

① پہلے کی طرح خون مراد ہے۔ ② زمانۂ حیض مراد ہے۔ ③ مکان حیض مراد ہے اور مکان حیض سے شرمگاہ مراد ہے اور یہی قول جمہور مفسرین اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا بھی ہے۔

پھر اذًى سے مراد وہ چیز کہ جس کے ساتھ انسان کو تکلیف ہو بعض حضرات نے کہا ہے کہ حیض کو اذى اس کہا گیا ہے کیونکہ اس کا ناپسند قسم کا رنگ ہوتا ہے اور یہ بدبُو دار ہوتا ہے اور یہ ایسی نجاست ہے جو تکلیف دینے والی ہے اور عبادت کے لئے مانع ہے۔ علامہ خطابیؒ و بغویؒ فرماتے ہیں کہ تنکیر یہاں پر قلت کے لئے ہے یعنی اذى يسير مطلب یہ ہے کہ یہ ایسی ہلکی نجاست ہے جو اپنے محل کے علاوہ اور کسی کی طرف متعدی اور متجاوز نہیں ہوتی کہ اس کی وجہ سے عورت سے بچا جائے اور اس کو گھر سے نکال دیا جائے جیسا کہ یہودی اور مجوسی کرتے ہیں۔ سیدؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ حیض ایسی تکلیف دہ چیز ہے کہ جو خاوند کے لئے صرف جماع کی صورت میں تکلیف دہ ہے نہ کہ کھانے پینے اور ایک ساتھ بیٹھنے اور لیٹنے میں۔ پس عورتوں سے دور رہو ایام خاص میں یعنی مکان حیض سے دور رہو اور مکانِ حیض سے مراد فرج (شرمگاہ) ہے یا شرمگاہ کے جوار گرد ہے یعنی ناف سے لے کر گھٹنے تک احتیاطاً اس سے بھی دور رہو۔

فقال رسول الله ﷺ : فاعتزلوا جو آیت میں مذکور ہے اس کو یوں بیان کیا کہ اس کے افراد میں سے بعض پر اس کو بند کر دیا۔

كل شيء : یعنی آپس میں کھانا پینا چھونا اور ایک ساتھ لیٹنا۔

الا النكاح : یعنی جماع۔ اور نکاح وطی (ہم بستری) میں حقیقت ہے اور بعض نے کہا کہ نکاح عقد میں حقیقت ہے پس یہ سبب کے مسبّب پر اطلاق کی قبیل سے ہوگا اور یہ جملہ مذکورہ آیت کی تفسیر اور **فاعتزلوا** کا بیان بنے گا کیونکہ اعتزال وہ تو کھانے اور لیٹنے وغیرہ سے بچنے کو بھی شامل ہے اور یہ حدیث اپنے ظاہر کے اعتبار سے **ما تحت الازار** سے انتفاع کے جواز پر دلالت کر رہی ہے۔ اور یہی قول امام احمد، امام ابو یوسف، امام محمد بن حسن اور امام شافعیؒ (اپنے قدیم قول میں) اور بعض مالکیہ کا ہے۔ اور جمہور حضرات کی دلیل وہ ابوداؤد شریف کی آئندہ آنے والی روایت ہے، خوب سمجھ لو۔

تمام ائمہ اس پر متفق ہیں کہ حائضہ سے وطی کرنا حرام ہے جس آدمی نے حالت حیض میں جانتے ہوئے وطی کی تو وہ گنہگار ہو گا اور جس نے اس کو حلال سمجھا تو وہ کافر ہوگا کیونکہ نص قرآنی سے اس کی حرمت ثابت ہے اور اکثر علماء کے نزدیک حرمت اس وقت تک نہ اٹھے گی جب تک کہ خون نہ ختم ہو جائے اور وہ غسل نہ کرے۔

ما يريد هذا الرجل : الرجل سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ اور ان یہود نے اس طرح تعبیر اس لئے کیا کیونکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے منکر تھے۔

الا خالفنا فيه : **اى الاحال مخالفته ايانا فيه** مطلب یہ ہے کہ وہ (نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے امور میں سے کسی امر کو نہیں چھوڑتے مگر اس حال میں کہ وہ مخالفت کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ﴿لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾ [الكهف: ٤٩] ''نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے اور نہ بڑی بات کو (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے'' اور اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد : **((اللهم لا تدع لنا ذنبا الاغفرته.))**

فجاء اسيد بن حضير : **اسيد حضير** دونوں مصغر ہیں، یہ انصاری ہیں اور قبیلہ اوس سے ہیں۔ مصعب بن عمیرؓ کے ہاتھ پر حضرت سعد بن معاذؓ سے پہلے مسلمان ہوئے اور بیعت ثانیہ میں حاضر ہوئے تھے بدر اور اس کے بعد ہونے والے غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے۔

وعباد بن بشر : انصار میں بنی عبدالاشہل میں سے ہیں یہ بھی سعد بن معاذؓ سے پہلے حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے بدر اور اُحد اور اسی طرح تمام غزوات میں شریک ہوئے۔

ان اليهود تقول كذا و كذا : **كذ و كذا** سے ظاہری طور پر یہود کے مبالغہ کلام کی طرف اشارہ ہے اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے (کہ یہود کے اس قول کی طرف اشارہ ہے) کہ حائضہ کے ساتھ میل جول یہ ضرر کا سبب ہے۔

فلا : **اى افلا** جیسا کہ ایک نسخہ میں اسی طرح ہے۔

نجامعهن : یعنی ہم بھی علیحدہ رہیں۔ تقدیر عبارت یوں ہے : **الا نعتزلهن فلا نجتمع معهن فى الاكل والشرب والبيوت** ۔ مقصود اس بات سے موافقت تھی ان کی تالیف کے لئے۔ اور بعض نے کہا کہ انہوں نے یہ بات اس ضرر کے مرتب ہونے کے خوف کی وجہ سے کہی جس کو یہودی ذکر کرتے تھے۔

فخرجا : چہرے کے تغیر میں زیادتی سے ڈرتے ہوئے یا غصے سے ڈرتے ہوئے وہاں سے نکل گئے۔

فاستقبلتهما هدية : یعنی ایک آدمی ان دونوں کو ملا جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ہدیہ لا رہا تھا، یہاں پر اسناد مجازی ہے۔

من لبن: منْ بیانیہ ہے۔

فی اثارھما اور ایک نسخہ میں **اثرِھما** ہمزہ اور ''ثاء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ **اثرِھما** دو فتحوں کے ساتھ ہے یعنی ان کے پیچھے ایک آدمی کو بھیجا جوان کو بلا کر لے آیا۔

فسقاھما: ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے ہوئے دودھ پلایا۔

فعرفا انه لم يجد عليهما: یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر ناراض نہیں ہوئے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ وہ مستمر نہیں رہا بلکہ وہ ختم ہو گیا ہے، اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمدہ واعلیٰ اخلاق کی ایک مثال ہے۔

مرد اور عورت جنابت کی حالت میں ایک برتن سے غسل کر سکتے ہیں

۵۴۶: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اَغْتَسِلُ اَنَا وَالنَّبِيُّ ﷺ مِنْ اِنَاءٍ وَاحِدٍ وَكِلَانَا جُنُبٌ وَكَانَ يَأْمُرُنِيْ فَاَتَّزِرُ فَيُبَاشِرُنِيْ وَاَنَا حَائِضٌ وَكَانَ يُخْرِجُ رَأْسَهٗ اِلَيَّ وَهُوَ مُعْتَكِفٌ فَاَغْسِلُهٗ وَاَنَا حَائِضٌ.

(متفق عليه)

أخرجه البخاري في االصحيح ۱/۴۰۳ حديث رقم (۲۹۹-۳۰۰-۲۰۱۱)۔وأخرجه مسلمفي روايات متفرقة وهي في ۱/۲۴۳ (۵-۲۹۶)و۱/۲۴۴ حديث رقم (۸-۲۹۷)۔ واللفظ للبخاري مع تفرق الأحاديث۔وكذلك أخرج هذا الحديث متفرقاً في عدة روايات فقد أخرج النسائي أوله ۱/۲۰۱ حديث ۴۱۱ وآخره ۱/۱۹۳ حديث ۳۸۸۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں جنابت کی حالت میں ایک برتن سے غسل کر لیا کرتے تھے اور بعض اوقات میں ایام میں ہوتی تو آپ مجھے تہبند باندھنے کا حکم دیتے تھے۔ تو میں تہبند باندھ لیتی۔ تو آپ اپنا جسم مجھ سے لگا کر سو جایا کرتے تھے اور بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کی حالت میں ہوتے تھے اور اپنا سر مبارک مسجد سے باہر نکالتے۔ تو میں ایام حیض کی حالت میں آپ کا سر دھو دیا کرتی تھی۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: اغتسل انا والنبیُّ: والنبیُّ یہ عطف کی وجہ سے مرفوع ہے اور عطف ضمیر فصل کی وجہ سے ہے اور یہاں نصب بھی مروی ہے تو اس صورت میں یہ مفعول معہ ہوگا اور ایک نسخہ میں رسول اللہ ہے اس میں بھی یہی دونوں وجہیں ہونگی۔

من اناء واحد: یہ عربوں کی عادت کی بنا پر تھا عرب حضرات ایک بڑا برتن پانی سے بھر کر رکھتے تھے پھر باری باری چلّو لے لے کر اس پانی کو استعمال کرتے تھے۔

وکلانا: ''واؤ'' حال کے لئے ہے۔

جنب: جنب مفرد ذکر کرنا لفظ ''کلا'' کے اعتبار سے ہے اور یہ اپنے معنی کی وجہ سے تثنیہ سے زیادہ فصیح ہے۔

یامرنی: یعنی مجھے کپڑوں کے باندھ لینے کا حکم کرتے اذیت کی جگہ (شرمگاہ) سے بچتے ہوئے۔

فاتزر: شراح حدیث نے لکھا ہے کہ صحیح و درست یہ ہے کہ اصل میں یہ **فأئتزر** دو ہمزوں کے ساتھ ہے ورنہ قاعدہ مقررہ وہ تو یہ ہے کہ ہمزہ ثانیہ ہمزتین کے جمع ہونے کی صورت میں اپنے ماقبل کی حرکت کی جنس سے بدل جاتا ہے جیسا کہ **اُدمُ علماء**

نے کہا ہے کہ ہمزہ کا ادغام ''تاء'' میں جائز نہیں ہے۔ ابوموسیٰ رحمہ اللہ کا یہ کہنا ہے کہ اس لفظ کے اندر بعض راویوں سے تحریف و تصحیف ہوئی ہے۔ سیدؒ نے ازھار سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

مفصل میں لکھا ہے کہ فاتزر کو غلط کہنے والے کا قول بھی غلط ہے اور کرمانیؒ نے فرمایا ہے فاتزر حضرت عائشہؓ کے ارشاد میں حجت ہے کیونکہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا عرب کے فصیح لوگوں میں شمار ہوتی ہیں۔ پس اس کو خطاء کہنے والا بذاتِ خود مخطی ہے اور ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ یہ سماع پر مقصور ہے اور اسی سے ابن محیصن کی یہ قراءت ہے: (فليؤد الذی اتمن) ہمزہ وصلی اور تائے مشددہ مضمومہ کے ساتھ الامانة مصدر سے ابھریؒ نے اس کو ذکر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ازار کو میں اپنے وسط میں باندھ لوں۔

اور یہ حدیث مافوق الازار سے استمتاع کے جواز پر دلالت کرتی ہے نہ کہ ماتحت الازار سے، اور یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا قول جدید ہے اور شاید کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد وہ رخصت پر مبنی ہو اور فعل عزیمت پر اُمت کو تعلیم کے لئے کیونکہ اسی میں زیادہ احتیاط ہے اس لئے کہ جو چراگاہ کے ارد گرد چرتا ہے اس کے بارے میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ عنقریب اس میں واقع ہو جائے گا۔

فيباشرني: یعنی میرے ساتھ لیٹتے اور مجھے چھوتے اور ازار کے اوپر اپنی جلد کو میری جلد سے ملاتے۔

وانا حائض: یہ جملہ حالیہ ہے اور حائض بغیر ''ھاء'' کے ہے کیونکہ یہ صرف مؤنث کے ساتھ خاص ہے اور کبھی اس کے ساتھ ''ھاء'' بھی ملائی جاتی ہے۔

يخرج راسه الى وهو معتكف فى المسجد: اس طرح کہ حجرہ کا دروازہ مسجد کی طرف کھلا ہوا ہوتا، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے حجرہ کی طرف سر نکال لیتے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حجرہ میں ہوتی تھیں اور یہ حدیث دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ معتکف جب اپنے اعضاء میں سے کچھ مسجد سے باہر نکال دے تو اس کا اعتکاف باطل نہیں ہوتا۔

الفاظ بخاری کے ہیں۔ (قالہ السیدؒ)

حائض کا جوٹھا استعمال کرنا جائز ہے

۵۴۷: وَعَنْهَا قَالَتْ كُنْتُ اَشْرَبُ وَاَنَا حَائِضٌ ثُمَّ اُنَاوِلُهُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَيَضَعُ فَاهُ عَلٰى مَوْضِعِ فِیَّ فَيَشْرَبُ وَاَتَعَرَّقُ الْعَرْقَ وَاَنَا حَائِضٌ ثُمَّ اُنَاوِلُهُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَيَضَعُ فَاهُ عَلٰى مَوْضِعِ فِیَّ. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ۲۴۵/۱ حديث رقم (۱۴۔۳۰۰) وأخرجه أبوداوٗد فی ۔ السنن ۱۷۸/۱ حديث رقم ۲۵۹ وأخرجه النسائی فی السنن ۱۴۹/۱ حديث رقم ۲۸۲۔ ونحوه أخرجه ابن ماجة ۲۱۱/۱ حديث رقم ۶۴۳۔ وأحمد فی مسنده ۱۲۷/۶۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے' وہ فرماتی ہیں کہ میں حائض ہوتی تھی اور پانی پی کر وہی برتن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا کرتی تھی اور آپ اسی جگہ سے جہاں میرا منہ لگا تھا منہ لگا کر پی لیتے تھے اور کبھی میں حائض ہونے کی حالت میں

ہڈی سے گوشت نوچ کر کھاتی۔ پھر وہی ہڈی رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو دیدیتی آپ اسی جگہ پر منہ لگا کر گوشت کو نوچتے جہاں سے میں نے منہ رکھ کر نوچا تھا۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: انا وله النبی صلی اللہ علیہ وسلم : یعنی وہ برتن کہ جس سے میں پانی پیتی تھی وہ میں حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو دے دیتی۔ جیسا کہ سیاقِ حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

علی موضع فی فیشرب: اور اس میں حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی یہود سے مخالفت کی انتہاء ہے ان سے بغض کی وجہ سے اور عائشہؓ سے موافقت کی انتہاء ہے ان سے محبت کی وجہ سے۔

العرق: ''عین'' کے فتحہ اور ''راء'' کے سکون کے ساتھ یعنی میں ہڈی سے گوشت کو نوچتی اور عرق وہ ہڈی ہے کہ جس سے زیادہ گوشت نوچ لیا گیا ہو اور ابھی کچھ اس پر باقی ہو اور یہاں پر وہ ہڈی مراد ہے کہ جس پر گوشت ہو اور یہ بات دلالت کرتی ہے اس پر کہ حائضہ کے ساتھ کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا جائز ہے اور نیز اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ حائضہ کے اعضاء یعنی ہاتھ پاؤں منہ وغیرہ وہ ناپاک نہیں ہیں اور باقی جو امام ابو یوسفؒ کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ حائضہ کا بدن وہ نجس ہے وہ صحیح نہیں۔

ثم اناوله النبی ﷺ اس میں حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے کمال تواضع اور پاکیزگی نفس کی طرف اشارہ ہے۔

حائض کی گود میں سہارا لے کر قرآن کی تلاوت جائز ہے

۵۴۸: وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَّكِئُ فِي حِجْرِي وَاَنَا حَائِضٌ ثُمَّ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ .

(متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١/ ٤٠١ حديث رقم ٢٩٧۔ ومسلم في صحيحه ١/ ٢٤٦ حديث رقم (١٥۔٣٠١) وأخرجه أبوداؤد في السنن ١/ ١٧٨ حديث رقم ٢٦٠۔ وأخرج النسائي في السنن نحوه ١/ ١٤٧ حديث رقم ٢٧٤۔ وأخرجه ابن ماجة في السنن ١/ ٢٠٨ حديث رقم ٦٣٤۔

ترجمه: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں حیض کی حالت میں ہوتی تھی اور رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ میری گود میں سہارا لے کر قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: حجری: ''حاء'' کے کسرہ کے ساتھ اور فتحہ کے ساتھ بھی مروی ہے یعنی میرے ساتھ ٹیک لگاتے اور بیٹھنے میں میری گود پر سہارا لیتے۔

ثم یقراء القرآن: اس حدیث میں اس امر پر دلالت ہے کہ حائضہ ظاہری طور پر طاہرہ ہے اور حکمی طور پر نجس ہے۔

عورت حیض کی حالت میں مسجد کے اندر سے چیز لے سکتی ہے

۵۴۹: وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ لِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاوِلِيْنِي الْخُمْرَةَ مِنَ الْمَسْجِدِ فَقُلْتُ اِنِّيْ حَائِضٌ فَقَالَ اِنَّ حَيْضَتَكِ لَيْسَتْ فِيْ يَدِكِ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۲٤۲/۱ حدیث رقم (۱۱-۲۹۸)وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱۷۹/۱ حدیث رقم ۲٦۱-وأخرجه الترمذی فی السنن ۲٤۱/۱ حدیث رقم ۱۳٤-وأخرجه النسائی فی السنن ۱٤٦/۱ حدیث رقم ۲۷۱- وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۲۰۷/۱ حدیث رقم ٦۳۲-وأخرجه الدارمی فی السنن ۲۱۸/۱ حدیث رقم ۷۷۱-وأخرجه أحمد فی مسنده ٦/٤٥-

ترجمه: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ مسجد سے یہ چھوٹی چٹائی اٹھا کر مجھے دے دو۔ میں نے عرض کیا میں تو حائض ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تیرے ہاتھ میں تو حیض نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: قال لی: یہاں 'یاء'' کو مفتوح پڑھنا ساکن پڑھنے سے افصح ہے۔

الخمرة: ''خاء'' کے ضمہ کے ساتھ، چھوٹا قالین چھوٹا بوریا جو کھجور کی شاخوں سے بنایا جاتا ہے پھر دھاگوں کے ساتھ اس کو مزین کیا جاتا ہے اور یہ تخمیر ڈھانپنے سے ماخوذ ہے کیونکہ سجدے کی جگہ کو ڈھانپتا ہے یا نمازی کے چہرے کو زمین سے ڈھانپ لیتا ہے۔

من المسجد: بعض نے کہا ہے کہ یہ **قال لی النبی** ﷺ سے حال واقع ہے، پس اس صورت میں وہ بوریا حجرہ میں ہوگا اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ خمرہ سے حال ہے اس صورت میں پہلے کے برعکس ہوگا اور یہی ظاہر معلوم ہوتا ہے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے **من المسجد** یہ **ناولینی** سے متعلق ہے اور اس وقت اس میں یہ احتمال ہوگا کہ مراد اس جملے سے یہ ہے کہ مسجد میں داخل ہو اور اس بورے کو پکڑ اور اس کو مجھے دے دے بغیر مسجد میں ٹھہرنے کے اور اس میں کسی قسم کا کوئی تردد نہیں کہ یہ حائضہ کے لئے حلال ہے جب کہ خون سے مسجد کے گندا ہونے کا خوف نہ ہو یا مطلب یہ ہے کہ اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کو مسجد سے پکڑ پھر مجھے دے دے اور یہ بھی پہلی صورت کی وجہ سے جائز ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ: **من المسجد** یہ **قال لی النبی** سے متعلق ہے لیکن یہ بعید ہے۔

(ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے) کہ اس سے بھی زیادہ بعید ابن حجرؒ کی وہ بات ہے جو انہوں نے شروع میں کہی ہے وہ یہ ہے کہ شرعاً اور عرفاً یہ تشریح بعید ہے کیونکہ ہمارے مذہب میں مطلقاً حائضہ مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی۔

ان حیضتك: ''حاء'' کے کسرہ کے ساتھ وہ حالت کہ جو حائضہ پر ہوتی ہے یعنی اس پر حیض کا آنا اور خاوند کا اس سے اجتناب کرنا اور یہ فتحہ کے ساتھ بھی مروی ہے، مراد ایک حیض۔

لیست فی یدك: یعنی تیرا ہاتھ نجس نہیں ہے اس لئے کہ اس میں حیض نہیں ہے اور اس بات سے ابن حجرؒ کی اس بات کا جو انہوں نے پہلے کہی تھی واضح رد معلوم ہوتا ہے۔

شرح السنۃ میں مذکور ہے اس حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ حائضہ کے لئے جائز ہے کہ وہ مسجد سے کوئی چیز پکڑے وروہ شخص کہ جس نے قسم کھائی کہ وہ گھر میں یا مسجد میں داخل نہیں ہوگا تو وہ اپنے جسم کے بعض حصے کے داخل کرنے سے حانث

نہیں ہوگا۔ قتادہؒ نے فرمایا ہے کہ جنبی مسجد سے کوئی چیز لے سکتا ہے جب کہ اس میں داخل نہ ہو۔

حیض والی عورت کا پورا جسم نجس نہیں ہوتا

۵۵۰: وَعَنْ مَيْمُوْنَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ فِيْ مِرْطٍ بَعْضُهٗ عَلَيَّ وَبَعْضُهٗ عَلَيْهِ وَاَنَا حَائِضٌ . (متفق عليه)

هذا الحديث غير موجود فى الصحيحين ولا فى أحدهما ـ وقدأخرجه ابن ماجة فى السنن ٢١٤/١ حديث رقم ٦٥٣ وأحمد فى المسند ٣٣٠/٦ ولكن أخرج البخارى فى صحيحه ٤٨٨/١ حديث ٣٧٩ مالفظه "كان رسول الله ا يصلى وأنا حذاء ه وربما أصابنى ثوبه اذا سجد"۔ وكذلك أخرجه مسلم فى صحيحه ٣٦٧/١ حديث رقم (٢٧٣ـ٥١٣) وأخرج أبوداوٗد عن ميمونة أن النبى ا صلى وعليه مرط وعلى بعض أزواجه منه وهى حائض وهو يصلى وهو عليه ٢٥٨/١ حديث رقم ٣٦٩ ـ وأخرج مسلم عن عائشه "كان النبى ا يصلى من الليل وأنا إلىٰ جنبه وأنا حائض وعلى مرط وعليه بعضه إلى جنبه" ٣٦٧/١ حديث (٢٧٤ـ٥١٤)۔

ترجمه: ''حضرت میمونہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی چادر میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے کہ جس کا کچھ حصہ تو آپ کے اوپر ہوتا تھا اور کچھ حصہ مجھ پر ہوتا تھا اور میں حائض ہوتی تھی۔'' (بخاری، مسلم)

تشریح: مرط ''میم'' کے کسرہ اور ''راء'' کے سکون کے ساتھ اون یا ریشم کی چادر جس کو ازار کے طور پر باندھا جاتا ہے اور بسا اوقات عورت اس کو اپنے سر پر ڈال لیتی ہے اور اس کو عورت دوپٹے کے طور پر اوڑھتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ چادر کے مشابہہ ہوتی ہے۔

وبعضه عليه: یعنی مرط کا بعض حصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کندھے پر ڈالا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔

وانا حائض: اس میں لیٹی ہوتی تھیں اور یہ حدیث دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ حائضہ کے اعضاء ظاہر ہوتے ہیں ورنہ نماز ایسی چادر میں پڑھنا کہ اس کا بعض حصہ نجاست پر ہو اور بعض حصہ نمازی کے ساتھ متصل ہو تو اس حال میں نماز جائز نہ ہوگی۔

متفق عليه: سید جمال الدینؒ نے فرمایا ہے کہ یہ بات محلِ نظر ہے اس لئے کہ صاحب تخریج نے کہا ہے کہ میں نے اس کو صحیحین میں اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک میں اور نہ ہی کتاب حمیدی میں ان الفاظ کے ساتھ پایا البتہ کتاب الصلوٰۃ میں بخاری شریف کے الفاظ حضرت میمونہؓ کی حدیث میں اس طرح ہیں: **قالت كان رسول الله يصلى وانا حذاء ه وانا حائض وربما اصابنى ثوبه اذا سجد** اور مسلمؒ نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے اس کے ہم معنیٰ نقل کیا ہے اور ابوداؤدؒ نے اس طرح روایت کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: **ان النبى ﷺ صلى وعليه مرط وعلى بعض ازواجه منه وهى حائض۔ والله اعلم**

الفصل الثانی:

حیض کی حالت میں وطی کرنا کفر ہے

۵۵۱: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ اَتٰی حَائِضًا اَوِامْرَاَةً فِیْ دُبُرِهَا اَوْکَاهِنًا فَقَدْ کَفَرَبِمَا اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ (رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی وفی روایتهما) فَصَدَّقَهٗ بِمَا یَقُوْلُ فَقَدْ کَفَرَ وَ قَالَ الترمذی لَانَعْرِفُ هٰذَا الْحَدِیْثَ اِلَّامِنْ حَکِیْمٍ الْاَثْرَمِ عَنْ اَبِیْ تَمِیْمَةَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ۔

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۲٤۲حدیث قم ۱۳۵۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۲۰۹حدیث رقم ٦۳۹ والدارمی فی السنن ۱/۲۷۵حدیث رقم ۱۱۳٦۔وکذلك أخرجه أبوداوٗد فی السنن بمعناه مع تقدیم وتاخیر ٤/۲۲۵ حدیث رقم ۳۹۰٤۔وأحمد فی مسنده ۲/٤۰۸۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے حیض کی حالت میں عورت سے جماع کیا۔ یا وطی فی الدبر کی۔ یا کسی کاہن کے پاس غیب کی باتیں دریافت کرنے کے لئے گیا تو اس شخص نے رسول اللہ ﷺ پر نازل شدہ دین کا کفر کیا۔ اس حدیث کو امام ترمذی امام ابن ماجہ اور امام دارمی نے روایت کیا ہے۔''

اسنادی حیثیت: ابن ماجہ اور دارمی کی روایتوں میں اتنے الفاظ مزید ہیں کہ کاہن کے کہے ہوئے کی اس نے تصدیق کی تو وہ کافر ہے اور امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ ہمیں یہ حدیث معلوم نہیں سوائے اس سند کے' کہ اسے حکیم اثرم نے ابوتمیمہ سے نقل کیا ہے اور وہ ابوہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں۔

تشریح: من اتی حائضا: یعنی اس سے جماع کرے اور یہ منکوحہ اور باندی اور ان کے علاوہ کو شامل ہے اور اسی طرح ارشاد (او امرء ة فی دبرھا) مطلقاً برابر بات ہے کہ وہ حائضہ ہو یا اس کے علاوہ ہو۔

او کاھنا: علامہ طیبیؒ نے فرمایا اتی لفظ مشترک ہے یہاں پر مجامعت کرنے اور کاہن کے پاس آنے کے درمیان میں۔ (یعنی دونوں کا فعل یہاں پر آتی ہے)۔ ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں بہتر یہ ہے کہ یہاں پر فعل مقدر مان لیں اور وہ ہے: او صدق پس یہ علفتها تبنا وماء باردا کی قبیل سے ہوگا یا یوں کہا جائے: من اتی حائضا او امرء ة بالجماع او کاھنا بالتصدیق۔

فقد کفر بما انزل علی محمد: یعنی اگر اس کو حلال سمجھا اور باقی یہ کہ حدیث میں حضور ﷺ نے یہ تفصیل بیان نہیں فرمائی (کہ کفر اس وقت لازم آئے گا کہ جب یہ عقیدہ رکھے کہ یہ حلال ہے) تاکہ یہ بات وعید میں کامل درجے کو پہنچ جائے اور روکنے اور ڈرانے کا یہ بڑا ذریعہ ہو۔

ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں یہ تاویل کی جائے گی کہ اس سے حلال سمجھنے والا اور کاہن کی تصدیق کرنے والا مراد ہے ورنہ اگر وہ حلال نہ سمجھے اور تصدیق نہ کرے تو وہ فاسق ہوگا، پس اس صورت میں کفر سے مراد کفرانِ نعمت (نعمت کی

ناشکری ہوگی یا اس پر کفر کا اطلاق اس لئے ہے کہ یہ افعال کفار کے ہیں کہ جن کی عادت ہی اللہ کی نافرمانی کرنے کی ہے اور کاہن سے مراد وہ آدمی ہے کہ جو مستقبل میں ہونے والے امور کی خبر دیتا ہے یا ان اشیاء کی جو صحائف میں لکھی ہوئی ہوتی ہیں جنات کی جھوٹی باتوں میں سے جو کہ فرشتوں سے چرا لیتے ہیں زمین والوں کی عمروں اور رزقوں اور حوادثات کے حوالے سے، پس وہ جن کاہنوں کے پاس آتے ہیں پس وہ ہر بات میں سو جھوٹ ملاتے ہیں پھر وہ کاھن اس کے بارے میں لوگوں کو خبر دیتے ہیں اور اسی کے معنی میں وہ آدمی بھی داخل ہے جو ریت اور کنکریوں وغیرہ سے حساب لگاتا ہے یا ستاروں میں دیکھ کر۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں ایک خوفناک قسم کی وعید ہے اس طرح کہ حضور ﷺ نے صرف کفر پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ اس چیز کو ملایا کہ جو محمد ﷺ پر نازل ہوا اور علم کے ساتھ بطور تجرید کے تصریح کی اور ما انزل سے مراد کتاب وسنت ہے یعنی جو ان کاموں کا ارتکاب کرے گا، پس وہ محمد ﷺ کے دین سے بری ہے اور عورت کی دبر کی تخصیص میں اس بات کی دلالت ہے کہ مرد کی دبر میں فعل قبیح کا ارتکاب اس سے بھی زیادہ برا ہے اور کاہن کو اس (او امرء ۃ فی دبرھا) سے مؤخر ذکر کرنے میں اھون (ہلکے) سے اغلظ (جو اس سے بھی غلیظ اور سخت ہے) کی طرف ترقی ہے۔

اور ابن حجر مکیؒ نے فرمایا ہے کہ: من اتی حائضا میں کفر یہ استحلا (حلال جاننا) پر محمول ہے اور دوسرے جملے میں اپنی بیوی اور لونڈی کی طرف نسبت کرتے ہوئے کفر کفرانِ نعمت پر محمول ہے کیونکہ اس بارے میں اختلاف مشہور ہے پس اس کی حرمت پر اجماع نہیں پایا گیا چہ جائیکہ اس کا علم ضروری طور پر ہو۔ اور جو چیز اس طرح ہو تو اس کا حلال جاننا وہ کفر نہیں کہلائے گا نیز یہ حدیث بھی ضعیف ہے اور تیسرے جملے میں کفر اس وقت ہوگا کہ جب وہ کاہن کو عالم الغیب سمجھے۔

فصدقه بما یقول فقد کفر: اور اسی کے ساتھ پہلی روایت کو بھی مقید کیا جائے گا پس اس سے وہ آدمی نکل جائے گا جو کاہن کے پاس آئے اس لئے تا کہ اس کا جھوٹ ظاہر ہو جائے یا جس پر وہ کاہن ہے اس سے استہزاء کرنے کے لئے اس کے پاس آیا۔

سید جمال الدینؒ نے فرمایا ہے کہ امام بخاریؒ نے اس حدیث کو اس کی سند کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے۔

حیض کی حالت میں استمتاع مافوق الازار جائز ہے

۵۵۲: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا يَحِلُّ لِيْ مِنَ امْرَأَتِيْ وَهِيَ حَائِضٌ قَالَ مَافَوْقَ الْإِزَارِ وَالتَّعَفُّفُ عَنْ ذٰلِكَ اَفْضَلُ۔ (رواه رزين وقال محی السنة اسناده ليس بقوی)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ١/١٤٦ وقال ليس هو بالقوی۔

ترجمہ: ”حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ جب میری بیوی حائض ہو تو میرے لئے کیا کیا جائز ہے آپ ﷺ نے فرمایا مافوق الازار استمتاع جائز ہے اور اس سے بھی بچنا بہت ہی بہتر ہے۔ اس حدیث کو رزین نے روایت کیا ہے اور امام محی السنہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند قوی نہیں ہے۔“

اسنادی حیثیت: محی السنہ کہتے ہیں کہ اس حدیث مبارکہ کی سند صحیح نہیں۔

تشریح:مایحل لی: یعنی کونسی جگہ میرے لئے مباح ہے۔

من امرء تی: یعنی اس کے اعضاء میں سے۔

افضل :اس لئے کہ اس سے نہ بچنا بسا اوقات معصیت کی طرف لے جاتا ہے۔

وقال محیی السنة :یعنی صاحب المصابیح۔

اسناده :رزینؒ کی اسناد یا اس حدیث کی اسناد۔

لیس بقوی : امام ابوداوٗدؒ نے بھی اس کو نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کی اسناد قوی نہیں ہے اور ابن حجرؒ نے یہاں ان حضرات سے تفرد اختیار کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد وہ جید ہے سوائے **والتعفف افضل** کے ارشاد کے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ حدیث کا حکم بھی ضعیف ہے کیونکہ پہلے یہ بات حدیث کے حوالے سے گزر چکی ہے کہ ازار باندھ کر اس کے اوپر مباشرت جائز ہے اگر بچنا افضل ہوتا تو حضور ﷺ اس کے زیادہ حقدار تھے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس بات میں کچھ بحث ہے اس لئے کہ کہا جاتا ہے کہ تعفف (اس حالت میں پرہیز کرنا) آپ ﷺ کے علاوہ کے لئے افضل ہے یا آپ ﷺ کا فعل وہ بیان جواز کے لئے تھا باوجودیکہ آپ ﷺ کے اندر کمال عصمت کی وجہ سے عفت کی قوت تھی اور اسی وجہ سے بعض شوافع نے یہ مذہب اختیار کیا اور اس کو امام نوویؒ نے مستحسن قرار دیا ہے اپنے مجموعہ میں۔اگر آدمی کو اپنے نفس پر ہم بستری نہ کرنے کا وثوق واعتماد ہو شہوت کی کمی یا تقویٰ کی کثرت کی وجہ سے تو اس آدمی پر ناف اور گھٹنے کے درمیان تمتع حرام نہیں ہے ورنہ حرام ہے۔

حالت حیض میں جماع کرنے پر صدقہ کرو

۵۵۳:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وَقَعَ الرَّجُلُ بِاَهْلِهٖ وَهِيَ حَائِضٌ فَلْيَتَصَدَّقْ بِنِصْفِ دِيْنَارٍ . (رواه الترمذی وابوداود والنسائی والدارمی وابن ماجة)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۲٤٤حدیث رقم ۱۳٦۔وأخرجه أبوداوٗدفی السنن۱/۱۸۳حدیث رقم ۲٦٦۔وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۱۵۳حدیث رقم ۲۸۹۔وأخرجه الدارمی فی السنن ۱/۲۷۱حدیث رقم ۱۱۱۳۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن۱/۲۱۰حدیث رقم ٦٤۰ذکر "بدینار أو بنصف دینار"وأخرجه أحمد فی المسند۱/۲۷۲۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے حیض کی حالت میں جماع کرلے تو اس کو نصف دینار صدقہ کر دینا چاہئے۔اس حدیث کو امام ترمذی' امام ابوداوٗد' امام نسائی' امام دارمی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح:**فلیتصدق بنصف دینار** : علامہ خطابیؒ نے فرمایا ہے کہ اکثر علماء کا ارشاد ہے کہ اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہے یہ آدمی صرف اللہ سے استغفار کرے گا اور علماء نے اس حدیث کو مرسل یا ابن عباس ؓ پر موقوف گمان کیا ہے اور ان کے

نزدیک یہ روایت مرفوع متصل صحیح نہیں ہے۔

پھر تو جان لے کر حائضہ کے ساتھ فرج میں وطی کرنا جان بوجھ کر بالاتفاق حرام ہے، پس اگر اس نے وطی کی تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالکؒ کا اور امام شافعیؒ کا قول جدید جو ان کے مذہب میں راجح ہے اور امام احمدؒ کی دو روایتوں میں سے ایک روایت یہ ہے کہ یہ آدمی اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرے گا اور اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہے لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ اگر خون کے آنے میں مباشرت کرے تو ایک دینار صدقہ کر دے اور خون کے نہ ہونے کی صورت میں وطی کرنے سے نصف دینار دینا مستحب ہے اور امام شافعیؒ کے ایک قول میں مذکورہ حکم واجب کے درجے میں ہے۔

ابن ہمامؒ نے فرمایا ہے کہ عورت کے پاس مرد حالت حیض میں نہیں آئے گا اور اگر عورت کے پاس اس حالت میں آئے یا اس کو حلال سمجھ کر آئے تو وہ کافر ہو جائے گا یا حرمت کو جانتے ہوئے اس نے ایسا کیا تو وہ کبیرہ کا مرتکب ہوا اب اس پر توبہ واجب ہے اور وہ دینار یا نصف دینار بطور استحباب کے صدقہ کرے گا اور بعض نے کہا ہے کہ ایک دینار اس صورت میں دے گا کہ جب حیض کے شروع میں ہم بستری کی اور نصف دینار اس صورت میں دے گا جب کہ اس نے ہم بستری حیض کے آخر میں کی ہو گویا کہ اس قول کے کہنے والے کی رائے یہ ہے کہ ایک نوع میں قلیل اور کثیر کے درمیان تخییر نہیں ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں قوی بات یہ ہے کہ اس قائل نے اس تفصیل کو حضرت ابن عباسؓ کی آئندہ آنے والی حدیث سے لیا ہے۔ پھر ابن الہمامؒ نے یہ فرمایا ہے کہ اسی طرح حکم اس صورت میں ہے کہ جب عورت نے کہا کہ مجھے حیض آیا ہے اور شوہر نے اس کو جھٹلایا تو شوہر کی تکذیب پر عمل نہیں ہوگا بلکہ حرمت عورت کے بتلانے سے ثابت ہو جائے گا۔

منذریؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں متن، سند، مرفوع موقوف مرسل اور معضل ہونے میں اضطراب واقع ہوا ہے سیدؒ نے صاحب تخریج سے اسی طرح نقل کیا ہے اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ اس کی سند حسن ہے غیر مستحسن معلوم ہوتا ہے۔

اور میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ یہ تو اسناد کا اضطراب تھا باقی متن میں اضطراب تو دینار یا نصف دینار شک کے ساتھ مروی ہے اور **يتصدق بدينار فان لم يجد فبنصف دينار** بھی مروی ہے اور ایک روایت میں خون کے آنے اور ختم ہونے میں وطی کرنے کے درمیان فرق کا بیان ہے اور ایک روایت میں پانچ دینار کے صدقے کا حکم مروی ہے **يتصدق بخمس دينار** اور ایک روایت میں **بنصف دينار** مروی ہے اور ایک روایت میں یوں ہے کہ جب خون سرخ ہو تو ایک دینار اور جب زرد ہو تو نصف دینار۔

اور سند حسن کے ساتھ یہ روایت مروی ہے کہ حضرت عمرؓ کی ایک بیوی تھی جو مردوں کو ناپسند سمجھتی تھی اور جب بھی حضرت عمرؓ اس سے وطی کا ارادہ کرتے تو وہ حیض کے آنے کا بہانہ کرتی تو حضرت عمرؓ کو یہ گمان ہوا کہ یہ جھوٹی ہے تو حضرت عمرؓ نے اس سے ہم بستری کر ڈالی، پس اس کو اس بارے میں سچا پایا اس کے بعد حضرت عمر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ دینار صدقہ کرنے کا حکم دیا۔

۵۵۴: وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا كَانَ دَمًا اَحْمَرَ فَدِيْنَارٌ وَ اِذَا كَانَ دَمًا اَصْفَرَ فَنِصْفُ دِيْنَارٍ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۲٤٥ حدیث رقم ۱۳۷ ـ وأخرج الدارمی نحوه ۱/۲۷۱ حدیث رقم ۱۱۱۱ ـ

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر حیض کی حالت میں خون کا رنگ سرخ ہو اور اس حالت میں اگر کوئی جماع کرے تو ایک دینار صدقہ کرے اور اگر خون کا رنگ زرد ہو تو نصف دینار صدقہ کرے۔''

اذا کان: یعنی حیض اور نفاس کو بھی اسی پر قیاس کیا گیا ہے۔

دما احمر فدینار: یعنی اس حالت میں جماع کرنے والے پر ایک دینار ہے اور یہ اس لئے ہے کیونکہ کم سے کم مقدار جو شرمگاہ سے متعلقہ ہے وہ دس درہم ہیں (یعنی کم از کم مہر وہ دس درہم ہوتا ہے) اور دس درہم کا ایک دینار ہوتا ہے ابن الملکؒ نے اسی طرح فرمایا ہے لیکن ان کی بات قابلِ نظر ہے۔

اذا کان دما اصفر فنصف دینار: اس لئے کہ زردی وہ سرخی اور سفیدی کے درمیان دائر ہوتی ہے سفیدی کو دیکھتے ہوئے تو کوئی چیز واجب نہ ہونی چاہیے اور سرخی کو دیکھتے ہوئے پورا ایک دینار واجب ہونا چاہیے، پس دونوں کی رعایت کی وجہ سے نصف دینار واجب ہوگا ابن الملکؒ نے اسی طرح کہا ہے۔

اور قوی بات یہ ہے کہ یہ محض امر تعبدی ہے عقل کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے، واللہ اعلم۔ اور اس حدیث کی سب سے قریب تر وہ تشریح ہے جو بعض علماء نے کی ہے کہ خون کے آنے اور ختم ہونے میں کفارہ کے اندر اختلاف کی حکمت یہ ہے کہ شروع میں چونکہ اس کو جماع کئے ہوئے اتنا وقت نہیں گزرتا پس اس میں اس کو معذور نہیں جانا جائے گا، بخلاف آخر حیض میں کہ زیادہ وقت گزرنے کے سبب اس میں تخفیف برتی جائے گی۔

ابن حجرؒ نے فرمایا کہ ایک ضعیف حدیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے حالت حیض میں ہم بستری کرنے والے کو ایک غلام آزاد کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اور غلام کی قیمت وہ ایک دینار تھی۔ لیکن یہ بات انتہائی بعید ہے۔ ابن حجرؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اسی طرح اس کے مثل وہ شخص ہے کہ جس نے جان بوجھ کر جمعہ کو بلا عذر چھوڑ دیا تو اس کے لئے ایک دینار صدقہ کرنا مسنون ہے یا کسی عذر کی وجہ چھوڑا تو پھر نصف دینار صدقہ کرنا مسنون ہے ایک حدیث کی وجہ سے لیکن وہ حدیث ضعیف مضطرب منقطع ہے۔

اور حاکمؒ کو اس کو صحیح کرنا یہ ان کے تساہل کی بناء پر ہے اور بدرهم یا نصفه أو صاع حنطة ومد او نصفه بھی مروی ہے۔ محدثین ان تمام کے ضعف پر متفق ہیں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ جب یہ بالاتفاق ضعیف ہے تو پھر یہ کہنا کہ دینار یا نصف دینار مسنون ہے یہ سمجھ سے بالاتر ہے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس کے بعض طرق صحیح ہیں اگر حاکمؒ کا یہ کہنا کہ شیخین کی شرائط پر صحیح ہے یہ قول مردود ہے اور باقی تمام کا یہ کہنا کہ یہ بالاتفاق ضعیف ہے، پس یہ قول اس طریق (صحیح) کے علاوہ پر محمول ہے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ ابن حجرؒ کا اتفاقاً کا قول اس بات کو ماننے سے انکار کر رہا ہے۔ واللہ اعلم۔

الفصل الثالث:

حالتِ حیض میں مافوق الازار استمتاع جائز ہے

۵۵۵: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ قَالَ اِنَّ رَجُلاً سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ مَايَحِلُّ لِیْ مِنَ امْرَ اَتِیْ وَهِیَ حَائِضٌ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَشُدُّ عَلَيْهَا اِزَارَهَا ثُمَّ شَأْنُكَ بِاَعْلَاهَا ۔ (رواه مالك والدارمى مرسلا)

أخرجه مالك فى الموطا ۱/۵۷ حديث ۹۳ من كتاب الطهارة ـ وأخرجه الدارمى فى السنن ۱/۲۵۸ حديث ۱۰۳۲ ـ

ترجمہ: ''حضرت زید بن اسلمؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ میرے لئے میری بیوی سے حیض کی حالت میں کیا جائز ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ اس کے جسم پر اس کا تہبند مضبوط باندھ لو۔ پھر تہبند کے اوپر تمہارا کام ہے۔ اس حدیث کو امام مالکؒ اور امام دارمیؒ نے مرسل روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

زید بن اسلم ۔ یہ زید بن اسلم ہیں ان کی کنیت ''ابواسامہ'' ہے یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب کے آزاد کردہ ہیں۔ مدنی مشہور جلیل القدر کبار تابعین میں سے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ ان کے والد صحابی تھے۔ صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کرتے ہیں۔ ان سے سفیان ثوری، ایوب سختیانی، مالک اور ابن عیینہ رحمہم اللہ احادیث نقل کرتے ہیں ۱۳۶ھ میں وفات پائی۔

تشریح: من امرء تی : اور اسی طرح باندی کا حکم بھی۔

تشد عليها ازارها : اِزار ''تاء'' کے فتحہ ''سین'' اور ''دال'' کے ضمہ کے ساتھ یہ خبر امر کے معنی میں ہے یا اس سے مجازاً انشاء مراد لیا جائے یا اَنْ کو مقدر مان کر مصدر کی تاویل کی جائے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ منصوب ہوگا اَنْ کو محذوف مان کر۔

پس اگر تو کہے کہ ما یحل کے سوال کے جواب میں یہ کیسے درست ہوسکتا ہے تو میں کہتا ہوں (ثم شانك باعلاها) گویا کہ کہا گیا ہے کہ تیرے لئے مافوق الازار حلال ہے اور شانك منصوب ہوگا فعل کو مستتر ماننے کے ساتھ اور مبتدا ہونے کی بناء پر اس کا رفع بھی جائز ہے اور اس کی خبر محذوف ہوگی تقدیر عبارت یوں ہوگی : مباح او جائز ۔

رواه مالك والدارمى مرسلا : ارسال کہتے ہیں تابعی کا صحابی کے ذکر کو حذف کرنا اور یہ ہمارے نزدیک حجت ہے مطلقاً اور شافعیہ کے نزدیک اس جگہ مرسل حجت ہے کیونکہ اس کی تائید وہ پہلی روایات سے بھی ہوتی ہے جو اس کے ہم معنی ہیں لہٰذا ان کی وجہ سے اس میں قوت پیدا ہوگی۔

اور طبرانیؒ نے اُمِ سلمہ سے یہ روایت نقل کی ہے فرماتی ہیں: كان رسول الله ﷺ يتقى سورة الدم ثلاثا ثم يباشر بعد ذلك۔ ''کہ حضور ﷺ خون کی تیزی کے تین دِنوں میں پرہیز کرتے تھے، پھر اس کے بعد مباشرت کر لیتے ستر پر کپڑے وغیرہ کو ڈال دیتے''۔ ابن حجرؒ نے فرمایا یعنی ناف اور گھٹنے کے درمیان میں اور قوی بات یہاں یہ ظاہر ہوتی ہے کہ حیض کی کم از کم مدت تین روز ہے۔

حیض کے اثرات

۵۵۶: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ إِذَا حِضْتُ نَزَلْتُ عَنِ الْمِثَالِ عَلَى الْحَصِيرِ فَلَمْ نَقْرُبْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَمْ نَدْنُ مِنْهُ حَتّٰى نَطْهُرَ. (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/۱۸۶ حديث رقم ۲۷۱۔ في المخطوطة يقرب۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ جب میں حالت حیض میں ہوتی تو بستر سے اتر کر بوریا پر آ جاتی تھی۔ جب تک طہارت حاصل نہیں ہو جاتی تھی نہ رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قریب جاتے اور نہ ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے قریب جاتی تھیں۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **فلم يقرب:** ''یاء'' کے فتحہ اور ''راء'' کے ضمہ کے ساتھ۔

رسول الله: رفع کے ساتھ۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں **اى منها** یعنی حضرت عائشہؓ کے قریب نہیں آتے اور یہ ایک صحیح نسخہ میں موجود ہے اور اس کے اندر متکلم سے غائب کی طرف التفات ہے اور یہ ممکن ہے کہ یہاں یوں تقدیر عبارت ہو: **مني او منا** اور منا متعین ہوگا آگے آنے والے ارشاد میں ''نون'' والے نسخہ کی بناء پر۔

ولم ندن: **اى عائشه او واحدة من ازواجه عليه السلام۔**

حتى نطهر: یہ صیغہ ''تاء'' کے ساتھ ہے صحیح ترین قول کے مطابق اور یہ مشکوٰۃ کے اصل صحیح موجودہ نسخوں میں اسی طرح ہے اور سید جمال الدینؒ کے نسخہ کے حاشیئے میں اس طرح ہے **فلم نقرب** (نون اور راء کے فتحہ کے ساتھ) **رسول الله** ﷺ (رسول اللہ یہ منصوب ہے) **ولم ندن** (پہلے نون کے فتحہ اور دوسرے کے ضمہ کے ساتھ) **حتى نطهر** (نطهر نون کے ساتھ جمع متکلم کا صیغہ ہے) اس پر خط کھینچ کر **صح** ...... کو لکھا ہوا ہے اور اس پر لفظ نسخہ یا اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں لگا ہوا اور میرک شاہؒ نے اس کے حاشیے میں لکھا ہے کہ اسی طرح ابوداؤد کے اصل نسخے میں ہے اور قاموس میں مذکور ہے کہ: **قرب منه** کرم کی طرح ہے اور **قرب سمع** کی طرح ہے پس بعض نسخوں میں جو ''نون'' کے ساتھ اور ''راء'' کے ساتھ ذکر ہے وہ غلط ہے۔

یہ روایت سابقہ روایات کے خلاف ہے اور شاید یہ روایت ان کی وجہ سے منسوخ ہے ہاں اگر یہاں قریب ہونے کو وطی اور ہم بستری پر محمول کیا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ [البقرة:۲۲۲] ''ان سے مقاربت نہ کرو ہاں! جب پاک ہو جائیں'' کیونکہ زوجین میں سے ہر ایک ہم بستری کے وقت ایک دوسرے کے قریب ہوتا ہے (تو پھر یہ حدیث بھی معمول بہا ہوگی)۔

امام بیہقی نے ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ وہ حالت حیض میں اپنی بیوی کے بستر سے جدا ہو جاتے تھے پس یہ بات ان کی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا تک پہنچ گئی انہوں نے ابن عباسؓ کو یہ پیغام بھیجا کہ آپ حضور ﷺ کی سنت سے اعراض کرتے ہیں خدا کی قسم حضور پاک ﷺ تو اپنی ازواج میں سے جو حائضہ ہوتیں ان کے ساتھ بھی سو جاتے تھے اور حضور ﷺ اور ان کی اس بیوی کے درمیان اس قدر قرب ہوتا کہ جو گھٹنوں میں تجاوز کر جائے۔ (یعنی وطی تو نہ کرتے لیکن وطی کے قریب قریب

ہی معاملہ ہوتا)۔

اور باقی وہ بات جو ابن حجرؒ نے کی ہے اس حدیث میں کہ یہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حالت تھی یعنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدہ ہوتیں اس خوف سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کسی ایسی چیز کو سونگھ لیں یا دیکھ لیں جو آپ کو ناپسند لگے یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو خود میل جول کے لئے بلاتے تھے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے حضرت عائشہؓ کے اس قول کی وجہ سے فلم یقرب غائب کے صیغے کے ساتھ اور یہی اصل مشکوۃ کا نسخہ ہے۔

بَابُ الْمُسْتَحَاضَةِ

مستحاضہ کا بیان

استحاضہ شریعت میں ایام حیض اور اس کی مدت کے علاوہ عورت کے رحم سے خون کے نکلنے کو کہتے ہیں اور استحاضہ کا حکم یہ ہے کہ وہ نماز، روزہ اور ہم بستری وغیرہ کو منع نہیں کرتا۔ امام احمدؒ ہم بستری میں اختلاف کرتے ہیں۔

الفصل الاول:

استحاضہ نماز کے لئے مانع نہیں ہے

۵۵۷: عَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ جَآءَ تْ فَاطِمَةُ بِنْتُ اَبِیْ حُبَیْشٍ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِنِّیَ امْرَاَةٌ اُسْتَحَاضُ فَلَا اَطْهُرُ اَفَاَدَعُ الصَّلٰوةَ فَقَالَ لَا اِنَّمَا ذٰلِكِ عِرْقٌ وَلَيْسَ بِحَيْضٍ فَاِذَا اَقْبَلَتْ حَيْضَتُكِ فَدَعِي الصَّلَاةَ وَاِذَا اَدْبَرَتْ فَاغْسِلِيْ عَنْكِ الدَّمَ ثُمَّ صَلِّيْ. (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۳۳۱/۱ حديث رقم ۲۲۸۔وأخرجه مسلم فی صحيحه ۲٦۲/۱ حديث رقم (٦۲۔۳۳۳) أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱۹٤/۱ حديث رقم ۲۸۲ وأخرجه الترمذی فی السنن ۲۱۷/۱ حديث رقم ۱۲۵ وأخرجه النسائی فی السنن ۱۸٤/۱ حديث رقم ۳۵۹۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۲۰۳/۱ حديث رقم ٦۲۱ وأخرجه الدارمی فی السنن ۲۱۹/۱ حديث رقم ۸۸٤۔وأخرجه أحمد فی مسنده ۱۹٤/٦۔

ترجمہ: ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ حضرت فاطمہ بنت ابی حبیشؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! میں ایک ایسی خاتون ہوں کہ مجھے مسلسل دم استحاضہ جاری رہتا ہے میں کسی وقت پاک نہیں رہتی تو کیا میں نماز ترک کردوں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا نہیں۔ یہ تو ایک رگ کا خون ہے۔ دم حیض تو نہیں ہے لہٰذا جب تمہیں حیض آنے لگے تو نماز چھوڑ دو اور جب حیض ختم ہو جائے تو خون صاف کر کے اور غسل کر کے نماز پڑھو۔“

(بخاری و مسلم)

تشریح: فاطمة بنت ابی حبیش: حبیش ''حاء'' کے ضمہ ''باء'' کے فتحہ اور ''یاء'' کے سکون اور اس کے بعد ''شین'' کے ساتھ ابو حبیش یہ عبدالمطلب بن اسد بن عبدالعزی بن قصی بن کلاب کے بیٹے ہیں۔

تا کہ وہ ان سے اپنے دین کے بارے میں سوال کرے۔

استحاض: ہمزہ کے ضمہ اور ''تاء'' کے فتحہ کے ساتھ اور یہ کلمہ صیغہ مجہول کے ساتھ وارد ہے کہا جاتا ہے: **استحیضت المرء ة فی مستحاضة** جب کہ عورت کا خون مستمر ہو جائے ایام حیض کے بعد یا ایام نفاس کے بعد۔

افادع الصلوٰة: ہمزہ استفہام کے ساتھ یعنی کیا میں نماز کو چھوڑ دوں جب تک استحاضہ میرے ساتھ رہے اگر چہ مدت طویل ہو جائے۔

انما ذلك: ''کاف'' کے کسرہ کے ساتھ یہ فاطمہ کو خطاب ہے۔ اور اس کو فتحہ بھی دیا جاتا ہے جب کہ خطاب عام مراد ہو یعنی وہ کہ جس کی تم شکایت کرتی ہو۔

عرق: یعنی یہ رگ کا خون ہے جو پھٹ گئی ہے اور اس سے خون نکلا ہے یا اس کا سبب وہ رگ ہے کہ جس کا منہ رحم کے قریب ہوتا ہے۔

ولیس: یعنی وہ خون کہ جو اس رگ سے نکلتا ہے۔

بحیض: بے شک حیض کا خون ایسا خون ہے کہ قوت مولدہ اپنے خالق کے حکم سے جنین کی وجہ سے اس کو جدا کر دیتی ہے اور اس کو رحم کی طرف اس خون کے بہنے کی جگہوں میں پھینک دیتی ہے اور وہ خون اس میں جمع ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اس کا نام حیض رکھا جاتا ہے عرب حضرات کا قول ہے: **استحوض الماء** یعنی جب پانی جمع ہو جائے پس جب زیادہ ہو جاتا ہے اور بھر جاتا ہے اور رحم میں کوئی بچہ بھی نہ ہو یا ہو لیکن خون زیادہ ہو اس سے جس کو وہ برداشت کر سکتا ہو تو وہ خون بہہ پڑتا ہے اور ایک روایت میں ہے: **لیس بالحیضة**۔ اس لئے کہ حیض اس رگ سے نکلتا ہے جو رحم کی گہرائی میں ہوتی ہے پھر وہ اس میں جمع ہو جاتا ہے پھر اگر جنین (بچہ ہو) ہو پیٹ کے اندر تو وہ حیض اس کی غذا ہے اور رحم سے کوئی چیز نہیں نکلتی اور اگر پیٹ میں بچہ نہ ہو تو وہ صحت کے اوقات میں اکثر عادت کے مطابق نکلتا ہے اور یہ استحاضہ اس رگ سے نکلتا ہے جو رحم کے قریب ہوتی ہے۔

فاذا اقبلت حیضك: حیضہ کسرہ کے ساتھ یہ حیض کا نام ہے اور فتحہ والی روایت اس کی تائید کرتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ حالت ہے کہ جس میں عورت کو حیض آتا ہے اور وہ عورت اس کو پہچانتی ہے پس یہ عادت کی طرف لوٹانا ہوگا اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ حالت ہے کہ جس میں حیض کے خون کے رنگ اور گاڑھے پن میں شدت ہوتی ہے اور اس تشریح کی تائید وہ حضرت عروہ کی روایت ہے جو فصل ثانی کی پہلی روایت ہے اور اس سے مراد وہ عورت ہوگی جو ایام حیض کو نہ پہچانتی ہو پس: **فاذا اقبلت حیضك** میں تمیز کی طرف لوٹانے کا بیان ہوگا۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے **تمیز بالالوان** کا مطلقاً اعتبار نہیں کیا، اور باقی ائمہ نے مبتدأ مستحاضہ کے حق میں تمیز بالالوان کا اعتبار کیا ہے اور ائمہ کا اس بات میں اختلاف ہے جب عادت اور تمیز میں تعارض ہو۔ پس امام مالکؒ اور امام احمدؒ اور ہمارے اصحاب میں سے اکثر نے اس صورت میں تمیز بالالوان کا

اعتبار کیا ہے اور عادت کو نظر انداز کیا ہے اور ابن خیران نے اس کے برعکس نقل کیا ہے۔

اور پہلا فریق یہ کہتا ہے کہ حضرت عروہ کی حدیث اور یہ حدیث جس سے ہم نے استدلال کیا ہے وہ صحیح ہے، پس اسی کو لینا وہ زیادہ اولی ہے۔ واللہ اعلم۔ یعنی جب تیرے حیض کے ایام ہوں۔

واذا ادبرت: یعنی جب تیرا حیض چلا جائے اور وہ ایام عادت سے متجاوز ہو جائے۔

فاغسلی عنك الدم: یعنی استحاضہ کے خون کے اثر کو دھو دو اور ایک مرتبہ غسل کرو اور شاید کہ صرف خون کے دھونے پر اکتفاء کرنا اور حیض کے ختم ہونے کی صورت میں غسل کا ذکر نہ کرنا وہ اس وجہ سے ہے کہ انقطاع حیض کے بعد غسل کرنا اس کا دین میں سے ہونا وہ پہلے سے معلوم تھا۔

ثم صلی: امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ مستحاضہ عورت اپنی شرمگاہ کو ہر نماز کے لئے دھوئے گی اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر نماز کے وقت میں شرمگاہ کو دھوئے گی اور شرمگاہ کو کسی کپڑے سے باندھے گی اور وضوء کرے گی یا نماز کے اداء کرنے میں جلدی کرے گی اس حال میں کہ وہ نماز میں خون کے جاری ہونے میں معذور ہو۔ ابن الملکؒ نے اسی طرح کہا ہے اور سراجیہ میں لکھا ہے کہ مستحاضہ پر ہر نماز کے وقت کے لئے استنجاء واجب نہیں ہے۔

الفصل الثانی:

دم استحاضہ رگ کا خون ہے

۵۵۸: عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ اَبِیْ حُبَيْشٍ كَانَتْ تُسْتَحَاضُ فَقَالَ لَهَا النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ دَمُ الْحَيْضِ فَاِنَّهٗ دَمٌ اَسْوَدُ يُعْرَفُ فَاِذَا كَانَ ذٰلِكَ فَاَمْسِكِیْ عَنِ الصَّلٰوةِ فَاِذَا كَانَ الْاٰخَرُ فَتَوَضَّئِیْ وَصَلِّیْ فَاِنَّمَا هُوَ عِرْقٌ . (رواه ابوداود والنسائی)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۱/۱۹۷ حديث رقم ۲۸۶ ۔وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۱۸۵ حديث رقم ۳۶۲۔

ترجمہ: ''حضرت عروہ بن زبیرؒ حضرت فاطمہ بنت ابی حبیشؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہیں استحاضہ کا خون آتا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ جب خون آئے اور اس کا رنگ سیاہ ہو تو اس وقت نماز پڑھنے سے رک جاؤ اور جب اس خون کا رنگ سیاہ کے علاوہ کوئی اور ہو تو اس وقت وضو کر کے نماز پڑھو کیونکہ یہ حیض نہیں بلکہ رگ کا خون ہے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔''

راوئ حدیث:

عروۃ بن الزبیر۔ نام عروہ حضرت زبیر بن العوام کے صاحبزادے ہیں۔ کنیت ''ابوعبداللہ'' ہے۔ کبار تابعین میں سے ہیں۔ خاندان قریش کی شاخ ''بنو اسد'' میں سے ہیں۔ ۲۲ھ میں تولد ہوئے۔ اپنے والد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور والدہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے حدیث کی سماعت کی۔ اس کے علاوہ اپنی خالہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی حدیث کی

سماعت کی۔ ان سے ان کے بیٹے ہشام اور امام زہری وغیرہ نے روایت کی ہے۔ بڑے طبقہ کے تابعین میں سے ہیں۔ مدینہ میں سات مشہور فقیہ تھے ان سے ایک یہ بھی ہیں۔ ابوالزناد کا قول ہے کہ مدینہ میں ہمارے ان فقہا میں سے جن کے قول پر معاملہ ختم ہو جاتا ہے' ان میں سے سعید بن المسیب اور عروہ بن الزبیر ہیں اور کچھ اور حضرات کا بھی انہوں نے نام لیا۔ ابن شہاب نے فرمایا عروہ ایسا سمندر ہیں جو کبھی پایاب نہیں ہوتا۔

تشریح: ''حبیش'' حبش کی تصغیر ہے۔

دم اسود: یہ اکثریت کے اعتبار سے ہے ورنہ کبھی وہ خون سرخ وغیرہ بھی ہوتا ہے۔

یعرف: بعض نے کہا کہ یہ خطاب کے صیغہ کے ساتھ ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ غائب مجہول کا صیغہ ہے **یعرفُ** اس لئے کہ اگر یہاں صیغہ مخاطب مراد ہوتا تو یوں کہا جاتا **تعرفین** مؤنث مخاطب کے صیغے کے ساتھ **ای تعرفه النساء** پس بے شک مستحاضہ عورت جب تمیز والی ہو (یعنی رنگوں کے ساتھ تمیز کرتی ہو) اس طرح کہ بعض ایام میں کالا خون دیکھتی ہو اور بعض ایام میں سرخ یا زرد ہو پس کالا خون حیض ہے بشرطیکہ ایک دِن اور رات سے کم نہ ہو اور پندرہ دِن سے زائد نہ ہو اسی طرح امام شافعیؒ نے اپنے مذہب کے مطابق لکھا ہے۔

اور ہمارے نزدیک حدیث کو صحیح ماننے کی صورت میں یہ حدیث محمول ہے اس بات پر کہ جب تمیز عادت کے موافق ہو جائے۔

ذلك: ''کاف'' کے کسرہ کے ساتھ یعنی حیض کا خون۔ فصل کے طویل ہونے کی وجہ سے اس کا اعادہ کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: ﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة: ۸۹] ''اور جب خدا کے ہاں سے ان کے پاس کتاب آئی جو ان کی آسمانی کتاب کی بھی تصدیق کرتی ہے اور وہ پہلے (ہمیشہ) کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے تو جس چیز کو وہ خوب پہچانتے تھے جب ان کے پاس آ پہنچی تو اس سے کافر ہو گئے پس کافروں پر خدا کی لعنت۔''

اور حضور ﷺ کا یہ ارشاد: **فانه دم اسود** یہ استئناف بیانی ہے اور خون کے دَم حیض ہونے پر متفرع ہے اور یہ جملہ جواب مذکور کے لئے تعلیل (علت کا بیان) بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا نہ جواب مذکور کے لئے اور نہ مقدر کے لئے جیسا کہ ابن حجرؒ نے اس کو ثابت کیا ہے۔ پس غور سے سمجھ لو۔

فتوضیء: یعنی غسل کے بعد ہر فرض نماز کے لئے۔

وصلی: اور عفیف کازرونی کے نسخہ میں **ثم صلی** ہے اور **ثم صلی** یہ امام شافعیؒ کے مذہب کے منافی ہے کہ مستحاضہ اور اس جیسے دوسرے معذورین کیلئے وضوء اور نماز میں موالات ہے (یعنی معذور وضوء کے بعد فوراً نماز اداء کرے تو یہاں 'ثم'' جو تراخی کے لئے آتا ہے اس بات کو ردّ کرتا ہے)۔

عرق: یعنی رحم کے منہ میں واقع رگ سے نکلتا ہے پس اس میں حیض کی گندگی نہیں ہوتی، پس یہ نماز سے مانع نہیں ہوگا۔

ابن ہمامؒ نے ہدایہ کی شرح میں لکھا ہے کہ ابن ماجہؒ نے حضرت عائشہؓ سے سند کے ساتھ روایت نقل کی ہے: **جاءت**

فاطمة بنت ابی حبیش الی النبی ﷺ فقالت انی امرءة استحاض فلا اطهر افادع الصلوٰة؟ فقال لا اجتنبی ایام محیضك ثم اغتسلی وتوضیء لکل صلوة ثم صلی وان قطر الدم علی الحصیر۔اورامام ابوداوُدؒ نے اس کی بھی تخریج کی ہے اوران دونوں کی سند میں **حبیب بن ابی ثابت عن عروة المزنی عن عائشه** مذکور ہے اورابن ماجہؒ نے عروۃ بن الزبیر کی وضاحت کی ہے ابوالقاسم بن عساکر نے اس روایت کو **عروة المزنی عن عائشه** کی سند میں ذکر کیا ہے۔عروۃ بن الزبیر عن عائشہ والی سند میں اس کو ذکر نہیں کیا۔

اورابوداوُدؒ نے فرمایا ہے کہ یحییٰ بن سعید نے اس حدیث کوضعیف قرار دیا ہے اورابن المدینیؒ نے فرمایا ہے کہ حبیب بن ابی ثابت نے عروہ بن زبیر کونہیں دیکھا ہے اور یہ حدیث بخاری میں ابن معاویہ عن ہشام بن عروہ عن ابیہ کی سند سے ہے اوراس میں **وان قطر الدم علی الحصیر** کی زیادہ نہیں ہے۔

پس ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ اس کی سند صحیح ہے یہ ٹھیک نہیں ہے۔

مستحاضہ لنگوٹ باندھ لے

۵۵۹:وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ اِنَّ امْرَأَةً كَانَتْ تُهْرَاقُ الدَّمَ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَاسْتَفْتَتْ لَهَا اُمُّ سَلَمَةَ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِتَنْظُرْ عَدَدَ اللَّيَالِيْ وَالْاَيَّامِ الَّتِيْ كَانَتْ تَحِيْضُهُنَّ مِنَ الشَّهْرِ قَبْلَ اَنْ يُصِيْبَهَا الَّذِيْ اَصَابَهَا فَلْتَتْرُكِ الصَّلَاةَ قَدْرَ ذٰلِكَ مِنَ الشَّهْرِ فَاِذَا خَلَّفَتْ ذٰلِكَ فَلْتَغْتَسِلْ ثُمَّ لِتَسْتَثْفِرْ بِثَوْبٍ ثُمَّ لِتُصَلِّ . (رواه مالك وابوداود والدارمی وروی النسائی معناه)

أخرجه مالك فی الموطا ٦٢/١حديث رقم ١٠٥من كتاب الطهارة ـوأخرجه الشافعی فی مسنده ص٣١١ـ وأحمد فی مسنده ٢٩٣/٦ـوأخرج ابن ماجة نحوه فی السنن ٢٠٤/١حديث رقم ٦٢٣ـوأخرجه الدارقطنی فی السنن ٢١٧/١حديث رقم ٥٧من كتاب الحيض۔ وأخرج أبوداوٗد فی السنن ١٨٧/١حديث رقم ٢٧٤ـ وأخرجه الدارمی فی السنن ٢٢١/١حديث رقم ٧٨٠ـوالنسائی فی السنن ١١٩/١حديث رقم ٢٠٨ـ

ترجمه: ''حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک عورت کواستحاضہ کا خون آتا تھا۔چنانچہ حضرت ام سلمہؓ نے اس کے متعلق آپ ﷺ سے مسئلہ پوچھا۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کو چاہئے کہ وہ غوروفکر کرے کہ استحاضہ سے پہلے اس کوحیض کتنے دن اوررات آتا تھا۔جب یہ معلوم ہوجائے تو ہرمہینہ میں اتنے دن نماز ترک کردے جب وہ دن گزر جائیں تو غسل کرلے اورلنگوٹی باندھ کر نماز پڑھ لیا کرے۔اس حدیث کوامام مالکؒ،امام ابوداوٗدؒ،امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے اورامام نسائیؒ نے بھی اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے۔''

تشریح: تهراق : ''تا'' کے ضمہ اور''ھا'' کے فتحہ کے ساتھ اور''ھاء'' کوساکن بھی پڑھ سکتے ہیں۔ ای تصیت **تهراق** میں ضمیر مرأۃ کی طرف راجع ہے اور **الدم** منصوب ہے جیسا کہ **الحسن الوجه** میں **الوجه** منصوب ہے مفعول کے مشابہہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ **الوجه** ''لام'' کی زیادتی کی تقدیر پرمعرفہ ہے یا اس کا تمیز ہونا کوفیین کے مذہب کے مطابق ہے

(جو تمیز کے معرفہ اور نکرہ دونوں طرح ہونے کے قائل ہیں) یا یہاں تقدیر عبارت تهريق الدم ہے یہ بطور جواب کے ہے اس سوال کے کہ اگر یوں کہا جاتا: مما تهريق (تو جواب تهريق الدم) پس یہ مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہوگا یا اس لئے کہ تهراق اصل میں تهريق معلوم کا صیغہ ہے۔ ''راء'' کے کسرہ کو فتحہ سے بدل دیا گیا اور ''یاء'' کو ''الف'' سے ان لوگوں کی لغت کی بناء پر جو ناصية میں ناصاة کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ابوموسیٰ نے فرمایا کہ یہ صیغہ اسی طرح مجہول کے صیغے کے ساتھ وارد ہے معلوم کے صیغہ سے وارد نہیں ہے۔ صاحب نہایہ نے فرمایا ہے تهراق الدم کا معنی ہے: صيرت ذات هراقة الدم بعض نے کہا ہے الدمُ کو مرفوع پڑھنا بھی جائز ہے اس وقت یہ تهراق کی ضمیر سے بدل واقع ہوگا ای يصب دمها اور الدم میں الف لام مضاف الیہ کے عوض میں ہے مطلب اس کا یہ ہے کہ عورت حضور ﷺ کے زمانہ میں استحاضہ والی ہوگئی۔

على عهد رسول الله ﷺ اور یہ عورت معتادہ تھی۔

قال لتنظر: یعنی غور فکر کرے اور پہچانے۔

عدد الليالي و الايام: عدَدَ یہ مفعول بہ کی وجہ سے منصوب ہے۔

التی كانت: یہ لیالی اور ایام کی صفت ہے۔

تحيضهن: تحيضهن یہ مفعول بہ کو مفعول فیہ کی جگہ میں ذکر کرنے کے قبیل سے ہے ای تحيض فيهن

من الشهر: یہ هن کا بیان ہے یا ایام و لیالی کا۔

فلتترك الصلوة قدر ذلك: یعنی اپنے حیض کی عادت کے بقدر۔

فاذا خلفت ذلك: خلفت یہ تشدید کے ساتھ ہے یعنی جب وہ اپنے حیض کے ایام سے گزر جائے اور ایام استحاضہ میں داخل ہو جائے۔

فلتغتسل: یعنی حیض کے ختم ہونے کی وجہ سے غسل کرے اور ''لام'فاء'' کے بعد تمام موجودہ نسخوں میں ساکن ہے اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ''لام'' امر میں ''فاء'' کے بعد جیسا کہ یہاں ہے سکون اور کسرہ اور اسی طرح فتحہ بھی جائز ہے، لیکن یہ بات ضعیف اور کمزور ہے۔

ثم لتستثفر: لام کے کسرہ کے ساتھ۔

بثوب: استثفار کہتے ہیں لنگوٹ باندھنے کو اس طرح کہ اپنی شرمگاہ اور دبر کو باندھے کسی کپڑے کے ساتھ کپڑے میں سے ایک کنارے کو پشت کی طرف سے اپنے وسط میں باندھے اور اسی طرح آگے کی جانب سے۔

اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ استثفار کہتے ہیں کہ عورت خون کی جگہ پر کپڑے کو رکھ کر کمر سے باندھ دے تا کہ خون کے بہنے کو روک سکے اور اسی سے ثفر الدابة یعنی وہ کپڑا کہ جو جانور کی دُم کے نیچے باندھا جاتا ہے۔ پس مستحاضہ جب نماز پڑھے گی تو جس قدر اس کی بساط میں ہوگا اتنا وہ خون کے روکنے اور بندھ کرنے میں کوشش و علاج کرے گی۔ پس جب اس کے بعد بھی خون آ جائے تو اس کی نماز صحیح ہے اور اس پر کوئی اعادہ نہیں ہے اور اسی طرح یہ حکم سلسل البول والے کا بھی ہے اور استحاضہ والی عورت کے لئے مسجد میں اعتکاف کرنا اور طواف کرنا جائز ہے۔

اور ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ مستحاضہ پر لنگوٹ باندھنا واجب ہے۔ لیکن یہ بات قابلِ نظر ہے، اس لئے کہ ظاہر حدیث سے احتیاطاً استحباب معلوم ہوتا ہے۔

اور امام شافعیؒ امام احمد ابن ماجہ دار قطنی اور بیہقی نے صحیح اسانید کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے۔ میرکؒ نے یہ کہا ہے۔

مستحاضہ ایامِ عادت کے بعد ہر نماز کے لیے وضو کرے

۵۶۰: وَعَنْ عَدِيِّ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ يَحْيَى بْنُ مَعِيْنٍ جَدُّ عَدِيٍّ اِسْمُهٗ دِيْنَارٌ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ فِي الْمُسْتَحَاضَةِ تَدَعُ الصَّلٰوةَ اَيَّامَ اَقْرَائِهَا الَّتِيْ كَانَتْ تَحِيْضُ فِيْهَا ثُمَّ تَغْتَسِلُ وَتَتَوَضَّأُ عِنْدَ كُلِّ صَلٰوةٍ وَّ تَصُوْمُ وَتُصَلِّيْ۔ (رواہ الترمذی وابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۲۰۸ حدیث رقم ۲۹۷۔ وأخرجه الترمذی فی السنن ۱/۲۲۰ حدیث رقم ۱۲۶۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۲۰٤ حدیث رقم ٦۲٥۔ وأخرجه الدارمی فی السنن ۱/۲۲۳ حدیث رقم ۷۹۳۔

ترجمہ: ''حضرت عدی بن ثابت سے منقول ہے کہ ان کے والد اپنے والد یعنی یحییٰ بن معین سے روایت کرتے ہیں جو کہ عدی کے دادا ہیں اور ان کا نام دینار ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ایک مستحاضہ کے بارے میں فرمایا کہ جن دنوں میں اس کو عادت کے موافق حیض آتا تھا تو وہ ان دنوں میں اپنے ایام عادت کے مطابق نماز ترک کر دے۔ پھر اس کے بعد غسل کرے اور ہر نماز کیلئے جدید وضو کرے اور نماز، روزہ جاری رکھے۔ اس حدیث کو امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

عدی بن ثابت۔ نام عدی۔ ثابت کے بیٹے ہیں۔ انصاری کوفی ہیں۔ ثقہ راوی ہیں۔ ان پر اہل تشیع میں سے ہونے کی تہمت ہے۔ انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ان کے دادا سے روایت کی ہے۔ ''ترمذی'' رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی روایت ''باب العطاس'' میں ذکر کی ہے۔ عدی بن ثابت سے ''ابو الیقظان'' نے روایت کی۔ ترمذی نے بیان کیا کہ میں نے محمد بن اسماعیل یعنی (بخاری رحمۃ اللہ علیہ) سے دریافت کیا کہ ''عدی بن ثابت'' کے دادا کون ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ میں تو ان کا نام نہیں جانتا، لیکن یحییٰ بن معین ذکر کرتے ہیں کہ ان کا نام ''دینار'' ہے۔ کہا گیا ہے کہ ''ثابت'' ان کے دادا کا نام ہے۔

تشریح: **یحیٰی بن معین:** مَعین ''میم'' کے فتحہ کے ساتھ ہے یہ اپنے زمانے کے امام الحفاظ تھے۔

اسمہ دینار: اور بعض نے کہا ہے کہ ثابت ان کے دادا ہیں نہ کہ ان کے باپ اور وہ قیس بن حطیم کے بیٹے ہیں۔

ایام اقرائھا: اقراء یہ قرء کی جمع ہے اور یہ حیض اور طہر میں مشترک ہے اور یہاں قرء سے حیض مراد ہے کلام سابق اور لاحق کی وجہ سے اور اس سے یہ بات بھی اخذ ہوتی ہے کہ قرء یہ حیض میں حقیقت ہے جیسا کہ ہمارا مذہب ہے امام شافعیؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

ثم: یعنی عادت کے مطابق حیض کے زمانے سے فارغ ہونے کے بعد۔

تغتسل: یعنی حیض کی وجہ سے ایک بار۔

وتتوضا عند کل صلوٰة: اور ایک روایت میں **لوقت کل صلوة** اور **عند کل** یہ **تتوضا** سے متعلق ہے نہ کہ **تغتسل** سے۔

وتصوم: روزہ نفلی ہو یا فرضی۔

وتصلی: روزے کو نماز پر مقدم کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ روزہ اس باب میں نماز سے اہم ہے اسی وجہ سے ایام حیض کے بعد روزے کی قضاء کی جاتی ہے نہ کہ نماز کی۔

رواه الترمذی وابو داؤد: اور امام ابوداوٗدؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ میں نے اس حدیث کے بارے میں امام بخاریؒ سے دریافت کیا تو امام بخاریؒ نے اس طریق کے علاوہ اور کسی طریق سے اس کو نہ پہچانا لیکن امام ترمذیؒ نے اس کو روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور امام ابوداوٗد نے حضور ﷺ کے اس ارشاد کو صحیح قرار دیا ہے کہ جس میں آپ ﷺ نے بنت ابی جیش کو کہا: **توضی لکل صلوٰة** امام ابوداوٗدؒ نے غسل کا ذکر نہیں کیا ہے پس یہ حدیث دلالت کرے گی اس بات پر کہ غسل لکلِ صلوۃ واجب نہیں ہے۔

اور امام نوویؒ نے فرمایا ہے اپنے مجموعہ میں کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث کہ حضور ﷺ نے بنت ابی جیش سے فرمایا جب کہ وہ مستحاضہ ہوگئی تھی۔ **تدع الصلوٰة ایام اقرائها ثم تغتسل وتتوضا لکل صلوٰة**۔ یہ بالاتفاق تمام محدثین کے نزدیک ضعیف ہے اور وہ احادیث جو سنن ابی داوٗد اور بیہقی وغیرہ میں وارد ہیں کہ حضور ﷺ نے غسل لکل صلوٰۃ کا حکم دیا ان روایات میں سے کوئی بھی ثابت نہیں ہے اور جو روایت ثابت ہے وہ یہ ہے: **فاغتسلی ثم صلی** ''پس وہ ہر نماز کے وقت غسل کرتی تھیں'' امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ روایت میں یہ نہیں ہے کہ، کہ حضور ﷺ نے ان کو غسل لکلِ صلوۃ کا حکم دیا ہو بلکہ بنت ابی جیشؓ ایسا تطوعاً کرتی تھیں اور اس میں ان کے لئے وسعت و گنجائش تھی اور مناسب ہے کہ غسل مستحب ہو واجب کہنے والوں کے اختلاف سے نکلتے ہوئے۔ ابن حجرؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

مستحاضہ کے لئے دو چیزوں کا حکم

۵۶۱: وَعَنْ حَمْنَةَ بِنْتِ جَحْشٍ قَالَتْ كُنْتُ اُسْتَحَاضُ حَيْضَةً كَثِيْرَةً شَدِيْدَةً فَاَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ اَسْتَفْتِيْهِ وَاُخْبِرُهٗ فَوَجَدْتُهٗ فِيْ بَيْتِ اُخْتِيْ زَيْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ اُسْتَحَاضُ حَيْضَةً كَثِيْرَةً شَدِيْدَةً فَمَا تَاْمُرُنِيْ فِيْهَا قَدْ مَنَعَتْنِي الصَّلَاةَ وَالصِّيَامَ قَالَ اَنْعَتُ لَكِ الْكُرْسُفَ فَاِنَّهٗ يُذْهِبُ الدَّمَ قَالَتْ هُوَ اَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ قَالَ فَتَلَجَّمِيْ قَالَتْ هُوَ اَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ قَالَ فَاتَّخِذِيْ ثَوْبًا قَالَتْ هُوَ اَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ اِنَّمَا اَثُجُّ ثَجًّا فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ سَاٰمُرُكِ بِاَمْرَيْنِ اَيُّهُمَا صَنَعْتِ اَجْزَاَ عَنْكِ مِنَ الْاٰخَرِ وَاِنْ قَوِيْتِ عَلَيْهِمَا فَاَنْتِ اَعْلَمُ قَالَ لَهَا اِنَّمَا هٰذِهٖ رَكْضَةٌ مِّنْ رَكَضَاتِ الشَّيْطَانِ

فَتَحَيَّضِىْ سِتَّةَ اَيَّامٍ اَوْسَبْعَةَ اَيَّامٍ فِىْ عِلْمِ اللّٰهِ ثُمَّ اغْتَسِلِىْ حتّٰى اِذَا رَأَيْتِ اَنَّكِ قَدْطَهُرْتِ وَاسْتَنْقَأْتِ فَصَلِّىْ ثَلَاثًا وَعِشْرِيْنَ لَيْلَةً اَوْ اَرْبَعًا وَعِشْرِيْنَ لَيْلَةً وَاَيَّامَهَا وَصُوْمِىْ فَاِنَّ ذٰلِكَ يُجْزِئُكِ وَكَذٰلِكَ فَافْعَلِىْ كُلَّ شَهْرٍ كَمَا تَحِيْضُ النِّسَاءُ وكَمَا يَطْهُرْنَ مِيْقَاتَ حَيْضِهِنَّ وَطُهْرِهِنَّ وَاِنْ قَوِيْتِ عَلٰى اَنْ تُؤَخِّرِيْنَ الظُّهْرَ وَتُعَجِّلِيْنَ الْعَصْرَ فَتَغْتَسِلِيْنَ وَتَجْمَعِيْنَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ وَتُؤَخِّرِيْنَ الْمَغْرِبَ وَتُعَجِّلِيْنَ الْعِشَاءَ ثُمَّ تَغْتَسِلِيْنَ وَتَجْمَعِيْنَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ فَافْعَلِىْ وَتَغْتَسِلِيْنَ مَعَ الْفَجْرِ فَافْعَلِىْ وَصُوْمِىْ اِنْ قَدَرْتِ عَلٰى ذٰلِكَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَهٰذَا اَعْجَبُ الْاَمْرَيْنِ اِلَىَّ . (رواه احمد وابوداود والترمذى)

أخرجه أحمد فى مسنده ٦/٤٣٩ـوأخرجه أبوداوٗد فى السنن ١/١٩٩حديث رقم ٢٨٧ـوأخرجه الترمذى فى السنن ١/٢٢حديث رقم ١٢٨وقال حسن صحيح وأخرجه ابن ماجة بالمعنى فى حديثين فى سننه الأول ١/٢٠٢حديث رقم ٦٢٢والثانى ١/٢٠٥حديث رقم ٦٢٧ـ

ترجمہ: ''حضرت حمنہ بنت جحشؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ مجھے بہت زیادہ استحاضہ کا خون آتا تھا اس لئے رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ تاکہ آپ ﷺ کو اس کی خبر دوں اور اس کے بارے میں مسئلہ پوچھوں چنانچہ میں اپنی بہن زینب بنت جحش کے گھر میں رسول اللہ ﷺ سے ملی اور عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ مجھے استحاضہ کا خون بہت زیادہ آتا ہے۔ جس نے مجھے نماز' روزہ سے بھی روک رکھا ہے۔ اس کے متعلق آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں تمہارے کرسف یعنی روئی کو بیان کرتا ہوں۔ کیونکہ وہ خون کو لے جاتی ہے۔ حضرت حمنہؓ نے کہا وہ زیادہ ہے اس سے نہیں رکے گا آپ ﷺ نے فرمایا پھر روئی لگام کی طرح رکھ کر اوپر لنگوٹ باندھ لو۔ حضرت حمنہؓ نے کہا وہ زیادہ ہے اس سے نہیں رکے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو پھر لنگوٹ کے نیچے ایک اور کپڑا رکھ لو۔ حضرت حمنہؓ نے کہا کہ وہ زیادہ ہے اس سے بھی نہیں رکے گا۔ کیونکہ خون بارش کی دھار کی طرح آتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا پھر میں تمہیں دو چیزوں کا حکم دیتا ہوں ان میں سے تم جس کو بھی اختیار کر لو گی۔ دوسرے کی ضرورت نہیں رہے گی اور اگر تمہیں دونوں پر عمل کی طاقت ہے تو پھر تم خود سمجھ دار ہو یہ زیادہ اجر اور ثواب کا ذریعہ ہے لہٰذا تم اپنی حالت کے مطابق جو چاہو کرو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمنہؓ سے فرمایا استحاضہ شیطان کی لاتوں میں سے ایک لات مارنا ہے لہٰذا تم ہر ماہ چھ یا سات دن تک ایام حیض قرار دے دو اور غیب کا علم اللہ کو ہے۔ اس کے بعد غسل کر لو اور جب تمہیں یقین ہو جائے کہ صاف ہو گئی ہو تو تیئس (۲۳) رات دن جب کہ ایام حیض سات ہوں یا چوبیس (۲۴) رات دن جب کہ ایام حیض چھ ہوں نماز پڑھتی رہا کرو اور رمضان کے روزے بھی رکھتی رہا کرو۔ چنانچہ عورتیں جس طرح اپنی اپنی مدت حیض میں ہوتی ہیں اور پھر وقت پر پاک ہوتی ہیں تم بھی ہر مہینہ اسی طرح کرتی رہا کرو اور تمہارے لئے یہ کافی ہو گا اور اگر تمہارے اندر اتنی طاقت ہو کہ ظہر کا وقت اخیر کر کے اس میں غسل کر لو اور عصر کو جلدی کر کے دونوں کو جمع کر لو اور پھر مغرب کا وقت اخیر کر کے اس میں غسل کر لو اور عشاء کو جلدی کر کے دونوں کو جمع کر لو اور فجر کے لئے علیحدہ غسل کر لو۔ تو اسی طرح کر لیا کرو اور روزے بھی رکھ لیا کرو۔ اگر تمہارے اندر اس کی ہمت اور قدرت ہو تو

پھر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان دو چیزوں میں سے دوسرا امر مجھے زیادہ پسند ہے۔اس حدیث کو امام احمدؒ ' امام ابو داوُدؒ اور امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

حمنة۔ یہ حمنہ''جحش'' کی بیٹی ہیں اور ام المؤمنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی بہن ہیں۔قبیلہ اسد سے تعلق رکھتی ہیں۔پہلے مصعب بن عمر رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں پھر جب مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جنگ احد میں شہید ہو گئے اس کے بعد طلحہ بن عبید اللہ نے ان سے نکاح کر لیا تھا۔''حمنہ'' میں حائے مہملہ' میم کے بعد میم ساکن اور پھر نون اور حاء ہے۔''جحش'' جیم کے فتحہ' حاء مہملہ کے سکون اور شین معجمہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: **وعن حمنة:** ''حاء'' کے فتحہ اور ''میم'' کے سکون اور اس کے بعد ''نون'' اور ''ھاء''۔

بنت جحش: ''جیم'' مفتوحہ اور ''حاء'' ساکنہ اور اس کے بعد ''شین'' کے ساتھ۔

كنت استحاض حيضة : حیضۃ ''حاء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے نہ کہ اس کے علاوہ۔علامہ تورپشتیؒ نے فرمایا ہے ''حاء'' کے فتحہ کے ساتھ یہ مرہ واحد کے لئے ہے اور یہاں حیضاً نہیں کہا تا کہ یہ حالت حیض کے ایام میں سے تمام حالتوں میں سے شدت اور کثرت اور استمرار میں جدا ہو جائے۔

كثيرة: مقدار میں۔

شديدة: کیفیت میں،اور اس کے اندر حیض کا دَم استحاضہ پر اطلاق تغلیباً ہے۔

استفتيه و اخبره : ''واؤ'' مطلق جمع کے لئے ہے ورنہ حق تو یہ تھا کہ عبارت مذکورہ یوں ہوتی **فاخبره و استفيه۔**

اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ **واخبره** یہ عطف تفسیر ہے اس بات کے بیان کرنے کے لئے کہ **استفتاء عن الشئی** کا مطلب ہے اس بارے میں اللہ کے حکم کے بیان کو طلب کرنے کی خبر دینا اور یہ ایسی بات ہے جو مخفی ہوتی ہے اسی وجہ سے **استفتيه** کے بعد **واخبره** کے ذکر کرنے کی طرف صحابیہ محتاج ہوئیں۔پس یہ بات تمام عجائب میں سے ایک انوکھی قسم کی عجیب بات معلوم ہوتی ہے جیسا کہ عقلمندوں پر یہ مخفی نہیں ہے اور اس سے بھی انوکھی ابن حجرؒ کی یہ بات ہے کہ اس کے بعد انہوں نے یہ کہا ہے کہ مذکورہ تقریر سے یہ قاعدہ ختم ہو جاتا ہے کہ ''واؤ'' مطلق جمع کے لئے ہے۔

انی استحاض حيضة كثيرة شديدة : یعنی میرا خون حیض کے خون سے بھی تیز جاری ہوتا ہے اور کثرتِ وقت اور خون کے اعتبار سے ہے۔

قد منعتنی: یہ استئناف ہے،جس چیز نے سوال کی طرف مجبور کیا اس کا بیان ہے اور ابن حجرؒ نے اس کوفی کے مجرور سے جملہ حالیہ بنایا ہے۔

الصلاة و الصيام : ان کے گمان کے مطابق۔

لك الكرسف: یعنی روئی،اس لئے کہ خون کو لے جانے والی ہے یعنی اس کے ذریعے خون کے قطرات کو ختم کرنے کا علاج کرو۔بعض حضرات نے آپ ﷺ کے قول **انعت** میں یہ کہا ہے کہ اس میں اشارہ ہے روئی کے اثر کی اچھائی اور روئی کے

اس کام کی صلاحیت رکھنے کی طرف اس لئے کہ لفظ نعت اکثر کسی چیز کے اچھے وصف کے بیان کرنے کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔

فانه يذهب الدم: یعنی خون کے شرمگاہ کے ظاہری حصے تک آنے کو روکتا ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ کرسف استعمال کرو شاید کہ اس کے ذریعے تمہارا خون ختم ہو جائے۔

قال فتلجمي: یعنی کپڑے کو لگام کی طرح باندھو جیسا کہ لنگوٹ۔

فاتخذی ثوبا: یعنی تہہ بتہ کپڑے کو رکھ لو۔

اثج: ''ثاء'' کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

ثجا: یہ ثج الماء و الدم سے ماخوذ ہے اور یہ لازم اور متعدی ہوتا ہے ای انصب لازمی ہونے کی صورت میں اور اصبه متعدی ہونے کی صورت میں۔ پس متعدی ہونے کی صورت میں تقدیر عبارت یہ ہے: اثج الدم اور پہلی صورت میں ثج کی نسبت اپنی ذات کی طرف کرنا یہ مبالغے کے لئے ہے یعنی ينسيل دمی سيلانا فاحشا اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ﴿مَآءً ثَجَّاجًا﴾ [النباء: ١٤] ''یعنی بہت زیادہ بہنے والا پانی''۔

اجزأعنك من الاخر: کہا جاتا ہے: اجزأت عنك کہ یہ تیرے لئے کافی ہے تجھے یہ بے نیاز کر دے گا، پس منْ یہاں بدل کے معنی میں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا﴾ [آل عمران: ١٠] ''(اس دن) نہ تو ان کا مال ہی خدا (کے عذاب) سے ان کو بچا سکے گا اور ان کی اولاد ہی (کچھ کام آئے گی)'' اور اسی طرح حضور ﷺ کے اس ارشاد میں: ولا ينفع ذا الجد منك الجد، پس ابن حجرؒ کا یہاں یہ کہنا کہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے منْ ''عن'' کے معنی میں ہے اور باقی عَنْ کو ذکر کرنے سے عدول کرنا وہ پے در پے عنكَ اور عَنْ کے ثقیل ہونے کی وجہ سے ہے (یعنی عبارت یوں ہوتی عنك عن الاخر اور یہ ثقل ہے)۔ ان کا اس میں اس کو ظاہر کہنا غیر ظاہر ہے اور اس قول کا سبب غفلت ہے کہ اس غفلت کی وجہ سے انہوں نے ایسی بات کہی۔

انما هذه: یعنی یہ ''بہنا'' یا یہ ''بیماری''۔ اور مصابیح کے اندر انما هی ہے۔

ركضة: یعنی ایک بار مارنا۔ اور رکضة اصل میں کہتے ہیں دوڑنے کی حالت میں یا اس کے علاوہ زمین پر پاؤں کو مارنا اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ﴾۔ [ص: ٤٢] ''(ہم نے کہا زمین پر) لات مارو''۔

من ركضات الشيطان: مقصود اس سے شیطان کا ضرر پہنچانا اور خرابی پیدا کرنا ہے اور شیطان کی طرف اس کی اضافت اس لئے ہے کہ اس کی وجہ سے شیطان کو اس عورت پر تلبیس ڈالنے کا راستہ مل جاتا ہے اس کے دین کے معاملے میں اس کے طہر کے وقت اور اس کی نماز اور روزے کے وقت یہاں تک کہ شیطان نے اس عورت کو اس بارے میں نسیان میں ڈال دیا گویا یہ شیطان کی طرف سے لات مارنا ہے یا اس عورت کے مخبوط اور متحیر ہونے کی حالت میں مبتلا ہونا یہ شیطان کے لات مارنے میں سے ہے۔

فتحيضی: یعنی نماز روزہ وغیرہ سے اپنے ایام حیض میں بیٹھی رہ اور اپنے آپ کو حائضہ شمار کر۔

ستة ايام او سبعة ايام: بعض نے کہا ہے کہ ''اَوْ'' شک راوی کی وجہ سے ہے حضور ﷺ نے ان دونوں عددوں میں سے ایک کو اس عورت کی قوم کی عورتوں کی عادت کے اعتبار سے ذکر کیا اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ ''اَوْ'' یہاں اختیار دینے کے لئے ہے کہ ان دونوں عددوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرے کیونکہ ظاہر عرف میں اتنے ہی ایام حیض کے ہوتے ہیں، اور عورتوں کے احوال میں یہی غالب ہے۔

اور امام نوویؒ نے فرمایا کہ ''اَوْ'' تقسیم کے لئے ہے یعنی چھ دِن، اگر چھ دِن اس کی عادت ہو یا سات دِن اگر سات دِن کی اس کی عادت ہو اور یہ اس صورت میں ہے کہ عورت معتادہ ہو نہ کہ مبتداء، یا شاید اس عورت نے شکایت کی ہو کہ اسے معلوم نہیں کہ اس کی عادت چھ دِن ہے یا سات دِن ہے۔ پس حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ چھ دِن ہیں اگر تجھے عادت یاد نہ ہو یا سات دِن اگر تجھے یاد ہو کہ میری عادت یہ ہے یا شاید اس عورت کی عادت ان دونوں دِنوں میں بدلتی رہتی ہو پس فرمایا چھ دِن والے مہینے میں چھ دِن اور سات والے مہینے میں سات دِن۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ''اَوْ'' نوع کے بیان کرنے کے لئے ہے اس عورت کی حالت کو اس کے مثل عورتوں کی حالت پر اعتبار کرتے ہوئے جو عورتیں عمر میں اس کے برابر ہیں اور جو مزاج میں اس کے ساتھ شریک ہیں قرابت کی وجہ سے یا ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے پس اگر اس کے مثل عورتوں کی عادت چھ دِن ہو تو پھر چھ دِن تیری بھی عادت ہوگی اور اگر سات دِن ہیں تو پھر تو بھی سات حیض کے شمار کر۔ اور شاید کہ یہ حکم مبتداء ہ اور متحیرہ مسحاضہ کے لئے ہے۔

اور بعض نے کہا ہے اور یہی اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورت متعادہ تھی اور اپنی عادت بھول چکی تھی کہ وہ چھ دِن ہیں یا سات دِن، پس حضور ﷺ نے اس کو حکم دیا کہ وہ غور وفکر کرے اور ان دونوں عددوں میں سے جو اس کے ہاں یقینی ہوں اس کو اختیار کر لے۔ اس پر دلیل وہ حضور ﷺ کا اس کے بعد والا ارشاد ہے۔

فى علم الله: یعنی تیرے اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا اور اس کا معنی شک والے قول کی بناء پر یہ ہے کہ تو ان دِنوں کو حیض شمار کر اس علم کے مطابق کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے اور اس کو ہمارے لئے شریعت بنایا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے **فى حكم الله، وفى كتاب الله۔**

اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اس بارے میں جو اللہ تعالیٰ نے تجھے بتلایا ہے عورتوں کی عادات میں سے چھ دِن یا سات دِن۔

اور تخییر والے قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے تیرے معاملے میں جانا ہے چھ دِن یا سات دِن۔ یہ شراح کے کلام کا خلاصہ ہے۔

اور ہمارے ائمہ میں سے ابن ہمامؒ نے ہدایہ کی شرح میں فرمایا ہے کہ طہر کی کم از کم مدت وہ پندرہ دِن ہے اور زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے، اس لئے کہ طہر بسا اوقات سال دو سال تک بھی ممتد ہو جاتا ہے اور کبھی عورت کو بالکل بھی حیض نہیں آتا، پس اکثر طہر کی مدت مقرر کرنا ممکن نہیں ہے مگر یہ کہ خون کا آنا مستمر ہو جائے اور وہ رُکے نہ تو اس صورت میں عادت کے مقرر کرنے کی ضرورت ہوگی۔ پھر یا تو وہ عورت ﴿۱﴾ مستحاضہ ہی بالغ ہوئی ہو۔ ﴿۲﴾ یا وہ بالغ ہوئی دس دِن خون کے آنے کے ساتھ مثلاً دس دن

خون دیکھا اور سولہ دن پاک رہی پھر خون مسلسل جاری ہو گیا۔ ③ یا وہ عورت عادت والی تھی تو اس کو خون دائمی طور پر جاری ہو گیا اور وہ اپنے ایامِ حیض، تعداد اور اس کے اول اور اخر کو اور اس کے دور کو وہ بھول گئی۔ پس پہلی عورت اس کا حیض ہر مہینے میں دس دِن ہو گا اور باقی طہر ہو گا کسی مہینے میں ۲۰ دِن اور کسی میں ۱۹ دِن۔ اور دوسری عورت کے بارے میں ابوعصمہ اور قاضی ابوحازم کا مذہب یہ ہے کہ اس عورت کا حیض وہ ہو گا جو اس نے دیکھا اور اس کا طہر وہ ہو گا جس کو اس نے دیکھا پس وہ اپنی عدت ۳ سال ۳۰ دِن گزارے گی اور باقی تیسری عورت پس اس پر واجب ہے کہ وہ غور وفکر کرے اور اپنی اکبر رائے پر عمل کرے پس اگر اس کی کوئی غالب رائے نہ ہو تو یہ عورت محیرہ ہے تو اس پر حیض یا طہر کا حکم متعین کر کے نہیں لگایا جا سکتا بلکہ یہ عورت احکام کے حق میں احوط پر عمل پیرا ہو گی، پس وہ امور جن سے حائضہ اجتناب کرتی ہے اس سے یہ بھی اجتناب کرے گی یعنی قراءت اور قرآنِ پاک کا چھونا اور خاوند سے ہم بستری وغیرہ۔ اور ہر نماز کے لئے غسل کرے گی پس اس کے ذریعے فرض اور نفل پڑھے گی اور صرف اتنی قراءت کرے گی کہ جو نماز کے جواز کے لئے کافی ہو۔

اور بعض نے کہا ہے کہ قراءت وہ فاتحہ اور سورت ہے کیونکہ یہ دونوں واجب ہیں اور اگر یہ عورت حج کرے تو طواف زیارت کرے گی کیونکہ طوافِ زیارت وہ رُکن ہے پھر طوافِ زیارت کو دس دِن کے بعد لوٹائے گی پھر طواف صدر کرے گی اس لئے کہ وہ واجب ہے اور یہ عورت رمضان کے روزے رکھے گی پھر ۲۵ یوم کی وہ قضاء کرے گی اس احتمال کی وجہ سے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ مہینے کے شروع میں دس (۱۰) دِن اور آخر میں ۵ دِن حیض والی ہو یا اس کے برعکس ہو پھر یہ بھی احتمال ہے کہ قضاء میں دس دِن یہ حیض والی ہو پس پندرہ (۱۵) دِن یقینی طور پر محفوظ رہے اور اس کی عِدت کی مقدار کے بارے میں فتویٰ یہ ہے کہ وہ دو مہینے ہو گی۔

انك قد طهرت: اس طرح کہ تو سفیدی کو دیکھ لے۔

و استنقات: مغرب میں لکھا ہے کہ استنقاء کہتے ہیں بدن کو صاف کرنے میں مبالغہ کرنا اور اسی سے حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے: **اذا رایت انك طهرت و استنقیت** اور ہمزہ کا ثبوت اس میں خطاء پر مبنی ہے۔ (ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) **و استنقأت** تمام نسخوں میں ہمزہ کے ساتھ ضبط کیا ہوا ہے پس صاحب مغرب کی یہ بہت بڑی جرأت ہے کہ انہوں دو ضابط حفاظ (امام ترمذی، امام بوداوٗد) کی طرف غلطی کی نسبت کی ہے حالانکہ اس کو شاذ پر محمول کرنا بھی ممکن تھا اس لئے کہ ''یاء'' حروفِ ابدال میں سے ہے اور کلامِ عرب میں **شئمة** ہمزہ کے ساتھ آیا ہے **شیْمه** کے بدل میں بطور شاذ ہونے کے جیسا کہ شافیہ میں آیا ہے اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اگر زوزنی اجمعیؒ کے حوالے سے کسی دیہاتی کا اس طرح کا قول نقل کرتا جو دیہاتی ایڑیوں پر پیشاب کرتا ہے تو یہ لوگ (اہلِ لغت) اس کو اپنے سروں پر رکھتے اور یہ نقل جو صحیح و معتمد سند کے ساتھ منقول ہے ان کے نزدیک خطاء پر مبنی ہے۔

ہائے افسوس صد افسوس ان کی اس فہم وفراست پر۔ اور اللہ ہی اپنے دین کا والی وناصر ہے۔

فصلی ثلاثا و عشرین لیلة: یعنی و ایامها۔ اگر مدتِ حیض سات دِن ہو۔

او اربعا وعشرین لیلة و ایامها: اگر حیض کی مدّت چھ دِن ہو۔

و صومی: رمضان اور اس کے علاوہ ہر مہینے میں سے اسی طرح۔

فان ذلك: یعنی جو تیرے لئے نماز اور روزے کے حق میں ایام کو مقرر کیا گیا ہے۔

یجزئك : ای یکفیك۔ کہا جاتا ہے **اجزانی الشیء ای کفانی** اور ''یاء'' کے ساتھ بھی یہ مروی ہے نہایہ میں اسی طرح ہے۔

کما تحیض النساء: یعنی وہ عورتیں جو تیری طرح ہیں عادت کے بھلانے میں۔

و کما یطھرن: اور ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ تو اپنے حیض کی مقدار شمار کر جتنی عورتوں کی عادت ہوتی ہے چھ دِن یا سات دِن اور اسی طرح اپنے طہر کی مقدار اتنی شمار کر جو عورتوں کی عادت ہوتی ہے ۲۳ یا ۲۴ دِن۔

میقات حیضھن وطھرھن : یہ ظرفیت کی بناء پر منصوب ہے یعنی اگر ان کے حیض کا وقت مہینے کے شروع میں ہے تو تیرے حیض کی مدّت بھی اسی وقت میں ہوگی۔

اور اے مخاطب تو اس سے بخوبی واقف ہوگا کہ مذکورہ تقریر یہ امام شافعیؒ کے مذہب پر مبنی ہے کہ جو مماثلت بالنساء کو معتبر سمجھتے ہیں۔

وان قویت یہاں سے وہ امر ثانی کا بیان ہے **ھذا اعجب الامرین الی** کا ارشاد اس پر دلیل ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس امر کو ان کی قوت کے ساتھ معلق کرنا یہ اس سے پہلے ارشاد : **وان قویت علیھما** کے منافی نہیں ہے اس لئے کہ **وان قویت علیھما** اس بات کے بیان کرنے کے لئے ہے کہ جب تو ان دونوں پر قوت رکھتی ہے تو ان میں سے جو چاہے اختیار کر سکتی ہے اور یہ **وان قویت علی** ...... اس بات کے بیان کرنے کے لئے ہے کہ جب تو ان دونوں پر قوت رکھتی ہے تو، تو اس امر کو اختیار کر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سب سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمنہ رضی اللہ عنہا کو دونوں امرین میں اختیار دے دیا اس معنی کے ساتھ کہ اگر تو امرَیْنَ کی طاقت رکھتی ہوا اپنے حال اور قوت کو جانتے ہوئے تو پس ان دونوں میں سے جس کو چاہے تو اختیار کر اور ان دونوں میں سے ایک کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا اور حضرت حمنہؓ کے ہر نماز کے وقت غسل کرنے سے عجز کو دیکھا تو فرمایا اگر تو اس کی قوت نہیں رکھتی تو اس کو چھوڑ دے اور اگر تو اس کی طاقت رکھتی ہے کہ......(آگے وہ ساری روایت بیان کی)

اس تقریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ اس سے بھی عاجز ہو جاتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بھی زیادہ سہولت و آسانی کی طرف راہنمائی کرتے جو اس کی طاقت میں ہوتی اور یہی خطابیؒ کے ارشاد کا مطلب ہے، خطابیؒ نے فرمایا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ حمنہؓ پر کلام طویل ہو گیا ہے اور **غسل لکل صلوۃ** کے حکم نے اس کو مشقت میں ڈال دیا ہے (اور یہ اس کو برداشت نہیں کر رہی) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو نمازوں کو ایک غسل کے ساتھ جمع کرنے کا حکم دیا جیسا کہ مسافر کے لئے جمع بین الصلوٰتین کی رخصت دی گئی ہے۔

اور ایسی عورت پر ہر نماز کے وقت غسل کو واجب قرار دینے کا مذہب حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ، ابن الزبیرؓ اور بعض علماء کا مذہب ہے اور ابن عباسؓ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی عورت ایک غسل کے ساتھ دو نمازوں کو جمع کرے گی۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ ابن عباسؓ کا مذہب اس حدیث کے زیادہ مشابہ ہے اور حضرت علیؓ کا مذہب فقہ کے زیادہ

قریب اور زیادہ مناسب ہے۔ (یہ شراح کا کلام تھا)

اور حدیث کے ظاہر سے تخییر معلوم ہوتی ہے اسی وجہ سے ہمارے ائمہ میں سے امام طحاویؒ نے فرمایا ہے کہ ان میں سے ہر ایک امر کو ایک جماعت نے اختیار کیا ہے اور یہ ہمارے (حنفیہ) کے نزدیک منسوخ ہے یا دونوں صورتوں میں غسل کا حکم دینا علاج پر محمول ہے خون کی قوت اور کثرت کو زائل کرنے کے لئے اور امام طحاویؒ نے مشکلات الاثار میں اس کی بڑی عمدہ تفصیل بیان فرمائی ہے۔

فتغسلين وتجمعين: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ ان **توخرين وتعجلين** وغیرہ میں ''نون'' کا اثبات ''اَنْ'' مصدریہ کے تمام جگہوں میں ہوتے ہوئے یہ احادیث کی کتابوں میں ثابت شدہ روایات سے منقول ہے حالانکہ اس کی توجیہ کرنا انتہائی مشکل ہے مگر یہ کہا جائے کہ ''اَنْ'' یہ مخففہ من المثقلہ ہے اور ضمیرِ شان یہاں مقدر ہے۔

اور ابن حجرؒ نے یہ فرمایا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ ''اَنْ'' مصدریہ ہے لیکن یہاں یہ نصب نہیں دیتا ''ما'' مصدریہ پر اس کو محمول کرتے ہوئے اور اسی سے ابن مجاہدؒ کی قراءت ہے: ﴿لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ [البقرۃ:۲۳۳] جیسا کہ ''ما'' مصدریہ کبھی وہ نصب دیتا ہے کہ اس کو ''اَنْ'' مصدریہ پر محمول کرتے ہیں اور اس سے یہ روایت ہے **كما تكونوا يولى عليكم** اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ''اَنْ'' مخففہ من المثقلہ ہو۔

لیکن مغنی سے جو بات سمجھ میں آتی ہے کہ ''اَنْ'' کی شرط یہ ہے کہ وہ فعل یقین یا جو اس کے قائم مقام ہو اس کے بعد واقع ہو، پس حضور ﷺ کے اس ارشاد: **وان قويت على.....** کو **ان علمت من نفسك اوظننت منها القوة والقدرة على ذلك** کے معنی پر محمول کیا جائے گا۔

الظهر والعصر: یہ جار کے ساتھ بدل واقع ہے اور ان کا رفع اور نصب بھی جائز ہے۔

فافعلي: یہ تاکید ہے اور جملہ شرطیہ تمام باتوں کے اعتبار سے ہے۔

ان قدرت على ذلك: یہ شرط اول سے بدل ہے اور یہ بات امام خطابیؒ کے قول کو مضبوط کرتی ہے۔

هذا: اى امر الاستحاضة۔

اعجب الامرين الى: ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ امرین سے مراد سفر اور استحاضہ ہے اور ظاہر یہ ہے کہ اس میں آخری امر کی طرف اشارہ ہے اور وہ امرِ آخر ایک غسل کے ساتھ دو نمازوں کو جمع کرنا ہے اس لئے کہ اس میں اس عورت کے لئے آسانی ہے اور امر اول سے مراد ہر نماز کے لئے غسل کرنا ہے اور **اعجب** کا معنی ہے **احب واسهل**۔ پسندیدہ اور آسان۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

الفصل الثالث:

۵۶۲ : عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ قَالَتْ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ اَبِىْ حُبَيْشٍ اُسْتُحِيْضَتْ مُنْذُ كَذَا وَكَذَا فَلَمْ تُصَلِّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سُبْحَانَ اللّٰهِ اِنَّ هٰذَامِنَ الشَّيْطَانِ

لِتَجْلِسْ فِيْ مِرْكَنٍ فَإِذَا رَأَتْ صَفَارَةً فَوْقَ الْمَاءِ فَلْتَغْتَسِلْ لِلظُّهْرِ وَالْعَصْرِ غُسْلًا وَّاحِدًا وَتَغْتَسِلُ لِلْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ غُسْلًا وَّاحِدًا وَّتَغْتَسِلُ لِلْفَجْرِ غُسْلًا وَّاحِدًا وَّتَوَضَّأُ فِيْمَا بَيْنَ ذٰلِكَ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/ ۲۰۷ حديث رقم ۲۹٦۔

ترجمہ: ''حضرت اسماء بنت عمیسؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول فاطمہ بنت ابی حبیشؓ کو اتنی مدت سے استحاضہ آ رہا ہے اور اس دم حیض کے خیال سے نماز' روزہ ترک کر دیا ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ۔ نماز' روزہ کو ترک کرنا تو شیطانی اثر ہے اس کو چاہئے کہ ایک ٹب میں پانی بھر کر اس میں بیٹھ جائے۔ جس وقت پانی پر زردی معلوم ہونے لگے تو ظہر اور عصر کے لئے ایک غسل کرے۔ مغرب اور عشاء کے لئے ایک غسل کرلے اور فجر کے لئے علیحدہ ایک غسل کرلے اور جب ضرورت ہو تو درمیان میں وضو کرلے۔ اس روایت کو امام ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

اسماء بنت عمیس: یہ ''اسماء عمیس'' مشور صحابیہ ہیں۔ انہوں نے اپنے شوہر حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ حبشہ ہجرت کی تھی۔ وہیں آپ سے محمد' عبداللہ اور عون پیدا ہوئے۔ پھر مدینہ کو ہجرت کی جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو ان سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نکاح کیا اور آپ سے محمد پیدا ہوئے۔ پھر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات ہو گئی تو آپ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ابی طالب نے نکاح کر لیا اور آپ سے یحییٰ پیدا ہوئے۔ ان سے بہت سے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم نے روایات کی ہیں۔ جن میں عبداللہ بن جعفر' عمر بن خطاب' عبداللہ بن عباس' ابوموسیٰ اشعری اور عبداللہ بن شداد رضی اللہ عنہم سرفہرست ہیں۔

تشریح: ''عمیس'' تصغیر کے ساتھ عین مہملہ مضموم میم مفتوح یاء ساکن اور سین مہملہ کے ساتھ ہے۔

اسما بنت عمیس: عُمَیْس یہ تصغیر کے ساتھ ہے۔

فلم تصل: اس گمان کی بناء پر کہ استحاضہ مانع صلوٰۃ ہے حیض کی طرح۔

سبحان الله: اس بات پر تعجب کرتے ہوئے یہ کہا کہ وہ محض اپنے گمان کی وجہ سے نماز چھوڑ رہی ہے اور اس نے حضور ﷺ سے مراجعت بھی نہیں کی ہے، یا ان صحابہ ہی سے رجوع کر لیتی جو فتویٰ دینے میں معروف ہیں۔

ان هذا: یعنی اس مدّت میں نماز کا چھوڑنا یا استحاضہ۔

من الشیطان: کہ اس شیطان نے اسماء بنت عمیس کو یہ بات کہہ کر بھٹکا دیا کہ استحاضہ حیض کی طرح ہے۔

فوق الماء: اس طرح کہ سورج زرد ہو جائے اور عصر کا وقت قریب ہو جائے پس اس وقت پانی کے اوپر سورج کی شعاع کے ساتھ زردی کے مشابہہ دیکھے اس لئے کہ سورج کی شعاع اس وقت بدل جاتی ہے اور ماند پڑ جاتی ہے پس وہ زردی مائل ہو جاتی ہے اور کامل زردی وہ صرف سورج کے غروب ہونے سے پہلے ہوتی ہے۔ اور اوقاتِ صلوٰۃ والی حدیث کے اندر جو اس طرح آیا ہے: **العصر مالم تصفر الشمس** تو اس کا معنی یہ ہے کہ جب سورج پورا زرد ہو گیا۔

وتوضا: دو "تاؤں" میں سے ایک "تاء" محذوف ہے۔

بین ذلك: یعنی جب تجھے عصر اور عشاء کے لئے وضوء کی ضرورت ہو۔

۵۶۳: وَقَالَ رَوٰی مُجَاهِدٌ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ لَمَّا اشْتَدَّ عَلَیْهَا الْغُسْلُ اَمَرَهَا اَنْ تَجْمَعَ بَیْنَ الصَّلَاتَیْنِ.

ترجمہ: "اس کو مجاہد نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ جب ان پر (فاطمہ بنت ابی حبیش پر ہر نماز کے لئے غسل کرنا) دشوار ہوگیا تو آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنے کا حکم فرمایا۔"

راوئ حدیث:

مجاہد بن جبر۔ یہ "مجاہد" ہیں۔ "جبر" کے بیٹے ہیں' ابوالحجاج کنیت ہے۔ "بنومخزوم" میں سے عبداللہ بن السائب کے آزاد کردہ ہیں اور مکہ کے تابعین میں دوسرے طبقہ کے تابعی اور مکہ کے قراء اور فقہا میں سے ہیں اور مکہ کے اہل شہرت لوگوں میں سے ہیں اور معروف سرکردہ شخص ہیں۔ قراءت اور تفسیر کے امام ہیں۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔ ۱۰۰ھ میں انتقال فرمایا۔ "جبر" میں جیم پر زبر اور باء موحدہ ساکن ہے۔

تشریح: ان تجمع بین الصلوتین: یعنی حکمی طور پر جمع کرے جیسا کہ نماز کے مؤخر کرنے اور مقدم کرنے کی بحث گزر چکی ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ امام نوویؒ کے کلام میں یہ مذکور ہے کہ یہ تمام کی تمام باتیں ثابت نہیں ہے اور یہ کہ اس کی وجہ سے ہمارے اس مذہب پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ وہ ہر فرض کے لئے وضوء کرے گی اور اس پر غسل لازم نہ ہوگا۔

الفصل الاول:

نماز گناہوں کے لئے کفارہ ہے

۵۶۴ : عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ اِلَى الْجُمُعَةِ وَرَمَضَانُ اِلٰى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ لِّمَا بَيْنَهُنَّ اِذَا اجْتُنِبَتِ الْكَبَائِرُ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۲۰۹/۱ حدیث رقم (۱۶۔۲۳۳)۔وأخرجه الترمذی فی السنن من غیر رمضان ۴۱۸/۱ حدیث رقم ۴۱۸۔وأخرجه أحمد فی مسنده ۳۵۹/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا پانچ نمازیں اور جمعہ سے جمعہ تک اور رمضان سے رمضان تک درمیان کے گناہوں کے لیے کفارہ ہے۔جبکہ کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو۔

تشریح: "الصلوات الخمس" یعنی (پانچوں نمازیں) ایک دوسرے تک۔

"والجمعة" میم کے ضمہ اور سکون کے ساتھ، مراد جمعہ کی نماز ہے۔

"الی الجمعة" طیبی کا قول ہے کہ الی مصدر سے متعلق ہے، یعنی (ایک جمعہ جو دوسرے) جمعہ پر جا کر ختم ہوتا ہے اور اس کا ظاہری معنی انضمام ہے۔

"ورمضان" کی بھی ترکیب اور معنی یہی ہیں۔جب کہ "رمضان" سے مراد "روزہ" ہے۔

"مکفرات لمابینهن" یہ سارے جملے کی خبر ہے، اس کے درمیان والی عبارت اسم فاعل کے لئے معمول ہے۔طیبی کا یہی خیال ہے۔جب کہ مصابیح میں "تکفیر" کا معنی ہے "ڈھانپ لینا" جب کہ یہاں مراد "مٹا دینا" ہے۔ "اذا اجتنبت

الکبائر" مجہول کے صیغہ کے ساتھ، یہ شرط ہے، جس کی جزا ماقبل کا مدلول ہے۔ ہمارا یوں کہنا کہ ایک نماز دوسری نماز تک (دونوں نمازوں کے درمیانی وقت کے لئے) کفارہ ہے، اور یہ نہ کہنا کہ پانچوں نمازیں کفارہ ہیں، یہ اگلی حدیث کی وجہ سے ہے۔ طیبی کا یہی قول ہے۔ یعنی جب نمازی اور روزہ دار کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرے گا (تو یہ نمازیں کفارہ ہوں گی) لیکن اگر وہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرے گا تو کوئی چیز معاف نہیں ہوگی، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِن تَجْتَنِبُوا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّـَٔاتِكُمْ﴾ [النساء: ٣١] "یعنی اگر تم منع کردہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرو گے تو ہم تمہاری برائیوں کو مٹا دیں گے"۔ یہ قول ابن الملک کا ہے اور یہ قول ضعیف ہے اگرچہ علامہ توریشتی اور حمیدی کا بھی یہی قول ہے اور شرح المشارق میں ان دونوں حضرات سے یہی منقول ہے۔ یہ قول معتزلہ کی جانب منسوب ہے، جیسا کہ شرح العقائد میں ہے۔ صحیح قول امام نووی کا ہے کہ اگرچہ اس حدیث میں مذکورہ احتمال بھی ہے، لیکن یہ احتمال مراد نہیں ہے، کیونکہ سیاق حدیث اس کے مخالف ہے، بلکہ مطلب اور مراد یہ ہے کہ دونوں نمازیں درمیانی اوقات میں کئے گئے صغیرہ گناہوں کے لئے کفارہ ہیں مگر کبیرہ گناہ توبہ سے ہی معاف ہوں گے۔ ہاں اللہ اپنے فضل سے کبیرہ گناہوں کو بھی معاف فرما سکتے ہیں۔ یہی اہلسنّت کا مذہب ہے۔

اس سلسلے میں ابن حجر کا منازعہ بھی صحیح نہیں، جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں۔ شیخ کلاباذی کا کہنا ہے کہ آیت میں کبائر سے مراد "شرک" ہو سکتا ہے، باقی جمع کا صیغہ اس کی انواع کے اعتبار سے لایا گیا ہے یعنی یہودیوں کا شرک، نصرانیوں کا شرک، مجوسیوں کا شرک وغیرہ۔ یا پھر یہ جمع خطاب کی موافقت کے لئے لائی گئی ہے، کیونکہ خطاب جمع کے صیغوں کے ساتھ چل رہا ہے، مطلب یہ کہ ایک کبیرہ جب دوسرے کبیرہ سے مل جاتا ہے تو "کبائر" بن جاتے ہیں۔

اس صورت میں یہاں "ان شاء" کا لفظ مقدر ماننا پڑے گا، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَآءُ﴾ [النساء: ٤٨] "اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے" میں ہے اور ظاہر ہے کہ اس آیت سے مراد اور معنی معروف "کبائر" ہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم کبائر سے اجتناب کرو گے تو ہم طاعات کی وجہ سے تمہارے چھوٹے گناہ مٹا دیں گے، جیسا کہ صحیح احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ میرک کا قول ہے کہ یہاں حدیث میں "اِن" کی جگہ "اذا" کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ عام طور میں مسلمان اجتناب ہی کرتا ہے۔

"اِن" صرف ظرفیت کے لئے آتا ہے، اس صورت میں "اذا اجتنبت الکبائر" کا معنی یہ ہوگا: "نمازوں کے درمیانی اوقات میں گناہوں سے اجتناب اور خروج کے وقت"، اس لئے کہ اس جملے سے مراد یہ ہے کہ کبیرہ گناہ معاف نہیں ہوتے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس حدیث کے افادات میں سے یہ ہے کہ کبیرہ گناہ نماز، روزے اور حج سے معاف نہیں ہوتے، یہ تو صرف سچی توبہ سے معاف ہوتے ہیں۔ ابن عبدالبر نے ایک لمبی چوڑی تمہید باندھنے کے بعد اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، پھر فرمایا کہ یہ جہل ہے اور مرجیہ کے مسلک کی موافقت ہے، کیونکہ ان لوگوں کا خیال ہے کہ ایمان کے ہوتے ہوئے گناہوں کا کوئی نقصان نہیں۔ مرجیہ کے مذہب کے بطلان پر امت کا اجماع ہے۔ پھر فرمایا کہ اگر ان کے اس خیال کو درست مان لیا جائے تو پھر توبہ کا کوئی مطلب ہی نہیں بنتا، حالانکہ مسلمانوں کا توبہ کے فرض ہونے پر اجماع ہے اور فروض بغیر قصد کے درست نہیں ہو سکتے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ حدیث میں یہ جو صغیرہ گناہوں کی معافی کا ذکر ہے تو یہ اہل سنت کا مذہب ہے، کیونکہ

کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے۔الا من رحم اللہ اور یہ کہ کبیرہ گناہ کسی بھی عمل سے معاف نہیں ہوتے۔ابن المنذر وغیرہ سے جو منقول ہے کہ کچھ احادیث (گناہوں کی معافی کے سلسلہ میں) عام ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا فضل بھی وسیع ہے تو ان احادیث کا بھی یہی مطلب ہوگا اور کچھ نہیں۔امام نووی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص کبیرہ گناہوں سے باز آ جائے تو ہمیں امید ہے کہ اس کے کبائر میں تخفیف یعنی عذاب میں کمی واقع ہو جائے گی۔اس کلام میں تکفیر کا لفظ نہیں ہے، کیونکہ تکفیر کا معنی ہوتا ہے سرے سے گناہ کا اثر ہی ختم کر دینا نہ کہ عذاب میں تخفیف کرنا۔(رواہ مسلم) میرک کا قول کہ یہ مسلم شریف کے الفاظ ہیں۔ اسے امام ترمذیؒ نے بھی نقل کیا ہے لیکن انہوں نے ''رمضان'' کا ذکر نہیں کیا۔

پانچ نمازوں کی مثال

۵۶۵ :وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرَأَيْتُمْ لَوْاَنَّ نَهْرًا بِبَابِ اَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ فِيْهِ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسًا هَلْ يَبْقٰى مِنْ دَرَنِهٖ شَيْءٌ قَالُوْا لَا يَبْقٰى مِنْ دَرَنِهٖ شَيْءٌ قَالَ فَذٰلِكَ مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ يَمْحُو اللّٰهُ بِهِنَّ الْخَطَايَا ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخارى فى صحيحه ١١/٢حديث رقم ٥٢٨۔وأخرجه مسلم فى صحيحه ٤٦٢/١حديث رقم (٢٨٣۔٦٦٧) وأخرجه الترمذى فى السنن ١٣٩/٥حديث رقم ٢٨٦٨۔وأخرجه النسائى فى السنن ٢٣٠/١حديث رقم ٤٦٢۔ وأخرجه الدارمى فى السنن ٢٨٣/١حديث رقم ١١٨٣۔ وأخرج أحمد فى مسنده ٣٧٩/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی کے دروازے کے سامنے سے نہر چل رہی ہو اور وہ روزانہ اس میں پانچ مرتبہ غسل کرے۔کیا اس کے جسم پر ذرہ برابر کوئی میل کچیل باقی رہ سکتی ہے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ نہیں۔یعنی میل کچیل بالکل باقی نہیں رہے گی۔تو آپ ﷺ نے فرمایا یہی مثال ہے پانچ نمازوں کی۔کہ اللہ تعالیٰ اسی طرح ان کی وجہ سے سب گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔
(بخاری ومسلم)

تشریح: ''وعنه'' یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے منقول ہے۔

''قال قال رسول الله ﷺ ارأیتم'' یعنی مجھے بتاؤ۔

''لو'' یعنی اگر ایسا ہو۔

''ان نهرا'' ہاء کے فتحہ اور سکون کے ساتھ، یعنی کوئی بہتی ہوئی نہر۔

''بباب احدکم'' یعنی مثال کے طور پر۔

''یغتسل'' ایک نسخے میں ہے ''ثم یغتسل'' یعنی تم میں سے کوئی شخص۔

''فیه'' یعنی اس نہر میں، ''فیه'' کا لفظ ''منه'' سے زیادہ بلیغ ہے۔

''کل یوم'' یعنی شب و روز، حالانکہ یہاں من کل الوجوہ تشبیہ ضروری نہیں۔

"خمسا" یعنی پانچ بار۔

"هل يبقى من درنه شيء" دال کے فتحہ کے ساتھ، یعنی میل کچیل، یہاں بقول ابن الملک "مِن" زائدہ ہے، جب کہ ابن حجر کا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ "مِن" بیانیہ ہے، جب کہ یہ تبعیضیہ بھی ہوسکتا ہے۔

"قالوا: لايبقى من درنه شيء" صرف "لا" کہہ کر اکتفا نہیں کیا بلکہ تاکید کے طور پر ایک پورے جملے سے نفی کی ہے۔

"قال: فذلك" امام طیبی کا قول ہے کہ فاء جزائیہ ہے، یعنی جب تم نے اس بات کا اقرار کرلیا اور اسے درست مان لیا تو۔ یعنی مذکورہ نہر بقول ابن الملک، جب کہ ظاہراً یہ اشارہ مذکورہ نہر میں پانچ مرتبہ غسل کی جانب ہے۔

"مثل الصلٰوت الخمس" اس کی طہارت کفارہ کی طرح ہے۔ یہ تشبیہ بالعکس دراصل معقول کی تشبیہ محسوس سے مبالغۃً ہے، جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ: "انما البيع مثل الربا" (میں تشبیہ بالعکس ہے)۔ "يمحوا الله بهن الخطايا" یعنی نمازوں کے ذریعے، مکفرات میں نسب مجازی ہے۔

"الخطايا" یعنی صغیرہ گناہ، وجہ الشبہ کی وجہ سے یہ جملہ مبنی ہے، اور وہ اس طرح کہ گناہ میل کی طرح ہیں، کیونکہ گناہوں سے ظاہر و باطن میلا کچیلا ہوجاتا ہے اور نماز ظاہری اور باطنی میل کچیل کو اتار دیتی ہے، جیسا کہ نہر ظاہری میل کا خاتمہ کرتی ہے۔ یہ آگے آنے والی آیت سے اقتباس ہے۔

میرک کا قول ہے کہ اسے امام ترمذی اور نسائی ؒ نے بھی نقل کیا ہے۔

نماز سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں

۵۶۶: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا اَصَابَ مِنَ امْرَأَةٍ قُبْلَةً فَاَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَاَخْبَرَهُ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَاَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ فَقَالَ الرَّجُلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلِيْ هٰذَا قَالَ لِجَمِيْعِ اُمَّتِيْ كُلِّهِمْ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ اُمَّتِيْ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخارى فى صحيحه ۸/۲ حديث رقم ۵۲۶ وأخرجه مسلم فى صحيحه ۲۱۱۵/۴ حديث رقم (۳۹-۲۷۶۳) وأخرجه الترمذى فى السنن ۲۷۲/۵ حديث رقم ۳۱۱۵۔ وأخرجه أحمد فى مسنده ۳۸۵/۱-۳۸۶۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے کسی غیر عورت کا بوسہ لے لیا۔ پھر احساسِ ندامت سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر واقعہ کی خبر دی۔ (رسول اللہ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ وحی کے منتظر رہے اسی دوران اس آدمی نے نماز پڑھی) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:۔ وَاَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ کہ نماز قائم کرو دن کے دو کناروں میں اور رات کی گھڑیوں میں کیونکہ نمازیں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں۔ ایک دوسری روایت میں اس طرح مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں سے جو شخص بھی اس آیت پر عمل کرے اس کے لئے یہی حکم ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: "وعن ابن مسعود قال: ان رجلا اصاب من امرأة"۔
یہ عبارت "قبلة" سے حال ہے۔ طیبی کا قول ہے کہ اس شخص کا نام "ابوالیسر" بفتحتین ہے۔ امام ترمذیؒ نے ان سے یہ روایت یوں نقل کی ہے کہ "میرے پاس ایک عورت کھجوریں خریدنے آئی، میں نے اس سے کہا گھر میں اس سے عمدہ کھجوریں موجود ہیں، چنانچہ وہ عورت میرے ساتھ گھر میں داخل ہوگئی، وہ میرے دل کو بھا گئی، چنانچہ میں نے اس کا بوسہ لے لیا"۔
میں کہتا ہوں کہ یہ ایک اجنبی کی ایک اجنبیہ سے نامبارک خلوت تھی۔ ابن الملک کا قول ہے کہ اس عورت نے کہا اللہ سے ڈرو، چنانچہ انہیں (صحابی کو) ندامت ہوئی۔
"فاتی النبی ﷺ" اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ﴾ [النساء: ٦٤] "اور یہ لوگ جب اپنے حق میں ظلم کر بیٹھتے تھے" پر عمل کرتے ہوئے (نبی پاک ﷺ کے پاس آگئے)۔
"فاخبرہ" یعنی آ کر واقعہ کی خبر دی۔ ابن الملک کا قول ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا اللہ کے حکم کا انتظار کرو، پھر اس شخص نے عصر کی نماز پڑھی۔
"فانزل اللہ تعالیٰ" طیبی کا قول ہے کہ "فانزل" میں فاء تقدیر عبارت پر عطف کے لئے ہے یعنی اس شخص نے رسول اللہ ﷺ کو واقعہ کی خبر دی تو آپ ﷺ خاموش ہو گئے، پھر اس آدمی نے نماز پڑھی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی، اس پر آگے آنے والی حدیث دلالت کرتی ہے۔
"واقم الصلوة طرفی النهار" ایک قول کے مطابق فجر اور ظہر ایک طرف ہیں۔ عصر اور مغرب ایک طرف ہیں۔ مغرب کی نماز کو طرف میں شامل غلبہ یا مجازِ مجاورت کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ اسی طرح ظاہر کو طرف بنانا بھی مجاز سے خالی نہیں۔
"وزلفا" یعنی ساعات۔
"من اللیل" یعنی عشاء کی نماز۔ ایک قول کے مطابق طرفی النهار سے مراد صبح وشام ہیں۔ چنانچہ فجر کی نماز صبح کی نماز ہے، اور ظہر وعصر شام کی نمازیں ہیں۔ کیونکہ زوال کے بعد کا وقت "عشاء" ہی کہلاتا ہے۔ "وزلفا من اللیل" سے پہلے احتمال کی بناء پر عشاء جب کہ دوسرے احتمال کی بناء پر مغرب اور عشاء دونوں مراد ہے اور یہی ظاہر اور اکثر لوگوں کی تفسیر ہے۔ "زلفة" رات کے ایک حصہ کو کہا جاتا ہے، یعنی رات کا وہ حصہ جو دن کے قریب قریب ہو، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ﴾ [التکویر: ١٣] "اور جب بہشت قریب لائی جائے گی"۔
"ان الحسنات" یعنی جیسے نمازیں، کیونکہ لفظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے کہ نہ سبب کے خصوص کا۔ "یذھبن" ای یکفرن یعنی مٹا دیتی ہیں۔
"السیئات" یعنی چھوٹے گناہوں کو کیونکہ یہ آیت بوسہ اور خلوت کے بارے میں وارد ہوئی ہے نیز یہ کہ اس پر اجماع امت ہے۔
"فقال الرجل" یعنی سائل نے کہا۔
"یارسول اللہ! الی" یاء کے سکون اور فتحہ کے ساتھ۔

''هذا؟'' طیبی کا قول ہے کہ ''هذا'' مبتدا ہے اور ''ولی'' اس کی خبر ہے، ہمزہ استفہامیہ برائے ارادۂ تخصیص ہے۔ یعنی یہ حکم میرے لئے خاص ہے یا تمام مسلمانوں کے لئے ہے؟

''قال: لجميع امتی كلهم'' یہ تاکید کے بعد تاکید ہے' تاکہ موجودین اور معدومین سب کو شامل ہو جائے۔ یعنی سب کے لئے ہے اور تو ان سب میں سے ہے۔ طیبی کا کہنا ہے کہ مبہم ظاہر سے اولیٰ ہوتا ہے۔

''وفی رواية'' یعنی شیخین کی ایک روایت میں ہے جو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے' جیسا کہ مصنف کے لفظ ''متفق علیہ'' کو مؤخر کرنے سے ثابت ہو رہا ہے۔

''لمن عمل بها'' یعنی اس آیت سے کہ جو برائی کے بعد اچھائی کرے (تو اس کے لئے یہی حکم ہے)، یہ قید پہلی روایت سے مراد ہے کیونکہ نیکیوں کا برائیوں کو لے جانا سے برائی کے وجود کا تقاضا کرتا ہے۔

''من امتی'' ظاہر ہے کہ یہ اس امت کی خصوصیات اور رحمٰن کی برکات میں سے ایک برکت ہے۔

گناہ کے ارتکاب کے بعد فکر مند ہونا

۵۶۷ :وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ اَصَبْتُ حَدًّا فَاَقِمْهُ عَلَیَّ قَالَ وَلَمْ يَسْأَلْهُ عَنْهُ وَحَضَرَتِ الصَّلٰوةُ فَصَلّٰى مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ فَلَمَّا قَضَى النَّبِیُّ ﷺ الصَّلٰوةَ قَامَ الرَّجُلُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ أَصَبْتُ حَدًّا فَاَقِمْ فِیَّ كِتَابَ اللّٰهِ قَالَ اَلَيْسَ قَدْ صَلَّيْتَ مَعَنَا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاِنَّ اللّٰهَ قَدْ غَفَرَلَكَ ذَنْبَكَ اَوْحَدَّكَ . (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۱۳۳/۱۲ حديث رقم ۶۸۲۳۔ وأخرجه مسلم فی صحيحه ۲۱۱۷/۴ حديث رقم (۴۵۔۲۷۶۵)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول مجھ سے ایسا فعل سرزد ہو گیا ہے جس کی وجہ سے حد واجب ہے۔ اس لئے آپ ﷺ میرے اوپر حد جاری کریں۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس حد کے متعلق کچھ دریافت نہیں کیا اور نماز کا وقت ہو گیا۔ اس آدمی نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو گئے۔ تو وہ آدمی کھڑا ہوا اور پھر عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول! مجھ سے ایسا فعل سرزد ہو گیا ہے جس پر حد واجب ہے۔ اس لئے آپ ﷺ مجھ پر اللہ کا حکم جاری کریں آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے ابھی ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟ اس نے عرض کیا جی ہاں پڑھی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہاری خطا یا فرمایا حد معاف کر دی ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ''وعن انس قال: جاء رجل'' اس میں قضیہ کے تعدد اور اتحاد دونوں کا احتمال ہے۔

انی'' یاء کے سکون اور فتحہ کے ساتھ۔

''اصبت حدا'' یعنی حد کا موجب (سزا) یعنی مضاف محذوف ہے۔ بقول طیبی اس عبارت کا مطلب ہے کہ میں نے

ایسا کام کیا جس کی وجہ سے میں حد کا سزاوار ہوا۔ جب کہ ابن الملک کے خیال کے مطابق یہاں سبب کو مسبب کا نام دے دیا گیا ہے۔

''فاقمه'' یعنی حد قائم کر دیجئے، مراد اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

''علیّ قال'' یعنی راوی (انس رضی اللہ عنہ) نے کہا

''ولم یسأله عنه'' ایک نسخہ میں ''ولم یسأل عنهٗ'' ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موجب حد کے بارے میں نہیں پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ طیبی نے کہا ہے کہ ایک قول کے مطابق (اس وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں پوچھا کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے ذریعہ اس کے گناہ اور اس کی مغفرت کو جانتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منہ پھیر لیا۔

''قام الرجل فقال: یا رسول الله! انی اصبت حدا فاقم فیّ'' یعنی میرے حق کے بارے میں ''کتاب اللہ'' یعنی کتاب وسنت میں (مذکور) اللہ کا حکم مطلب یہ ہے کہ میرے بارے میں جو حد وغیرہ ثابت ہو رہی ہے وہ قائم کریں۔ دونوں اسلوبوں کے تغایر میں ذکاء و بلاغت کی انتہا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گناہ سے حد کے علاوہ کوئی اور چیز بطور سزا سمجھی اور خاموشی اختیار کی تو تعبیر ایسے جملے سے کی جو حد اور غیر حد دونوں کو شامل ہے، جیسا کہ ابن حجر وغیرہ نے ذکر کیا ہے

''قال: الیس قد صلیت معنا؟ قال نعم'' یہ اس روایت کی نفی کرتی ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول اور مشہور ہے اللہ تعالیٰ کے قول: ''الست بربکم'' کے بارے میں کہ اگر اس کا جواب ''نعم'' سے دیتے تو وہ کافر ہو جاتے۔

''قال: فان الله قد غفر لك ذنبك او حدك'' بقول میرک یہ شک راوی کی جانب سے ہے، یعنی تیری حد کا سبب' جیسا کہ سید کا قول ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ اس کا ظاہر مشکل ہے کیونکہ حد کا موجب کبیرہ کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً یہ بات فرما دی ہے اس شخص کا گناہ نماز پڑھنے سے معاف ہو گیا ہے۔ اس میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ مذکورہ بالا شخص ہی بقیہ روایات میں ہو اور اس نے حد سے وہ عقوبت مراد لی ہو جو تعزیر کو شامل ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی اور شخص ہو۔ حد سے مراد حد کی حقیقت ہے اور گناہوں کی مغفرت کا سبب توبہ ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کیوں نہیں؟ تو وہ اس وجہ سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عذر کی نوعیت معلوم تھی، اس لئے پوچھا بھی نہیں تا کہ اس پر حد قائم نہ ہو۔ اس لئے کہ اگر وہ بتا دیتے تو حد قائم کرنا واجب ہو جاتا اگر وہ توبہ بھی کر لیتے، کیونکہ ڈاکو کے سوا کسی کی حد توبہ سے ساقط نہیں ہوتی۔ اسی طرح ذمی زنا کے بعد مسلمان ہو جائے تو اس کی حد بھی توبہ سے ساقط ہو جاتی ہے۔ بہر حال حدیث میں اس بات کی تصریح نہیں ہے کہ نماز کبیرہ گناہوں کے لئے کفارہ ہے۔ بلکہ اس کو فرض کر بھی لیا جائے تو سابقہ اجماع کی وجہ سے اس کی کوئی نہ کوئی تاویل کرنی ہی پڑے گی۔

قاضی کا کہنا ہے کہ مذکورہ بالا حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ صغیرہ گناہ نیکیوں سے معاف ہو جاتے ہیں نیز اسی طرح وہ کبیرہ گناہ جو مخفی اور پوشیدہ ہوں (ان کے لئے بھی حسنات کفارہ بن جاتی ہیں)۔ جیسا کہ حدیث نبوی ہے: ''اتبع السیئة الحسنة تمحها'' یعنی برائی کے بعد نیکی کرو، نیکی برائی کو مٹا دے گی''۔ بظاہر اور امام حاکم کی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی حد توبہ کے بغیر ساقط نہیں ہو سکتی۔ کیا حد توبہ سے ساقط ہو جاتی ہے؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک ساقط نہیں ہوتی، جب کہ اس شخص کی خطا مخفی خطا کے حکم میں ہے اس لئے انہوں نے اس کی وضاحت نہیں کی، اس لئے

اس کی حدنماز سے ساقط ہوگئی۔ میرک نے ازہار سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ جب آپ اس سے قبل اس پر اجماع بھی پڑھ چکے ہیں۔ طیبی کا کہنا ہے کہ یہاں انابت الی اللہ اور اپنے کیے پر ندامت بھی اس میں شامل ہے۔ یعنی انہوں نے گناہ کا اعتراف کیا اور حد قائم کرنے کی درخواست دی۔ ابن الملک کا قول ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کبیرہ گناہ کا معاف ہونا نماز کی ادائیگی سے حکماً اِن کے ساتھ خاص ہو۔

امام مسلم نے "ولم یساله عنه" کے الفاظ ذکر نہیں کیے۔

سب سے افضل عمل کونسا ہے؟

۵۶۸: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ سَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ اَیُّ الْاَعْمَالِ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ قَالَ الصَّلٰوةُ لِوَقْتِهَا قُلْتُ ثُمَّ اَیٌّ قَالَ بِرُّ الْوَالِدَيْنِ قُلْتُ ثُمَّ اَیٌّ قَالَ الْجِهَادُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنِیْ بِهِنَّ وَلَوِاسْتَزَدْتُّهٗ لَزَادَنِیْ. (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۹/۲حدیث رقم ۵۲۷۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ۹۰/۱حدیث رقم (۱۳۹۔۸۵) وأخرج الترمذی مثله فی السنن ۳۲۵/۱حدیث ۱۷۳۔وأخرجه النسائی فی السنن ۲۹۲/۱حدیث رقم ۶۱۰وأخرج أحمد فی مسنده ۴۰۹/۱۔۴۰۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کو کونسا عمل سب سے زیادہ پسند ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا وقت پر نماز پڑھنا۔ میں نے کہا پھر کونسا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ میں نے عرض کیا پھر کونسا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے یہی باتیں بیان فرمائی تھیں۔ اگر میں اس سے زیادہ پوچھتا تو آپ ﷺ اس سے زیادہ بتاتے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: "**وعن ابن مسعود قال: سالت النبی ﷺ ای: الاعمال احب الی الله تعالیٰ؟ قال: الصلاة لوقتها**" اس جیسی مثالوں میں لام ایسے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾ [الطلاق : ۱] میں ہے، "یعنی وہ عورتیں جنہیں عدت درپیش ہو" اور اہل عرب کے قول "لقیته لثلاث" کا مطلب ہے کہ وہ بقیہ مہینوں کا استقبال وانتظار کریں۔ یہاں وہ لام مراد نہیں جو اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ [الاسرأ:۷۸] میں ہے، یہ وقت کے تکرار سے بچنے کے لئے وقت کے معنی میں ہے، یہ طیبی کا قول ہے اور مزید یہ بھی ہے کہ یہاں اظہر یہ ہے کہ لام "فی" کے معنی میں ہے اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نماز اداء ہو قضا نہ ہو۔ قاموس میں ہے کہ لام تین معنی کے لئے آتا ہے۔ ان میں سے ایک "فی" ہے جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ میں لام "فی" کے معنی میں ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام طیبی کا کلام نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس میں ایک اعتراض ہے کیونکہ پہلی دو صورتوں میں تو لام کو استقبال کے معنی کے لئے مانا جاسکتا ہے کیونکہ طلاق اور ملاقات عدت وثلاث کے بعد ہوتی ہے، لہٰذا استقبال کو مقدر ماننا پڑے گا

،جبکہ یہاں یہ معنی درست نہیں، لہٰذا یہ بات طے ہوگئی کہ یہاں لام ''فی'' کے معنی میں ہے۔ابن الملک کے خیال کے مطابق اس عبارت کا مطلب ہے کہ یہاں نماز کو اول وقت میں ادا کرنا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات اگر چہ حدیث سے مفہوم نہیں ہو رہی لیکن اسے نمازوں کے اول اوقات پر محمول کیا جائے گا۔حدیث میں علماء کے اس قول کی دلیل موجود ہے کہ شہادتین کے بعد افضل عبادت نماز ہے۔اس کی موافقت ''الصلاۃ خیر موضوع'' والی حدیث سے بھی ہوتی ہے، یعنی عبادت کے لئے نماز ایک بہترین عمل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے وضع کیا ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو سکے۔''قلت ثم ای'' یعنی پھر کونسی عبادت افضل ہے؟ طیبی کا قول ہے کہ یہاں ثم تراخی رتبہ کے لئے ہے نہ کہ تراخی زماں کے لئے۔یعنی پھر نماز کے بعد کونسی عبادت افضل ہے۔''قال بر الوالدین'' یعنی (اگر دونوں نہ ہوں تو) کسی ایک کی خدمت۔اس میں اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ [الاسراء:۲۳] کی جانب اشارہ ہے۔اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جو شخص پانچ وقت کی نماز پڑھے اور نماز کے بعد والدین کی مغفرت کے لئے دعا کرے تو (گویا) اس نے اللہ کا حق اور اپنے والدین کا حق ادا کر دیا۔''قلت ثم ای؟ قال: الجهاد فی سبیل الله''۔تورپشتی کا قول ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں کون سے اعمال افضل و محبوب ہیں، اس بارے میں مختلف احادیث وارد ہوئی ہیں۔مذکورہ حدیث میں تو نماز کا ذکر ہے۔حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے (کسی نے پوچھا) کون سا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا ''اللہ پر ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ'' ان تمام روایات و احادیث میں تطبیق و توفیق کی صورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے موقع محل یا اس شخص کی رغبت کے پیش نظر جواب دیا یا پھر یہ کہ سائل کے لئے جو مناسب اور بہتر تھا' لیکن اس شخص پر مخفی تھا' وہ جواب دیا ہے۔جیسا کہ کوئی آدمی کہتا ہے فلاں چیز سب سے بہتر ہے' تو اس میں یہ بتانا مقصود نہیں ہوتا کہ یہ تمام اشیاء سے افضل ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ اس وقت اور اس موقعہ کے لحاظ سے یہ چیز سب سے بہتر ہے۔جیسا کہ خاموشی کے موقع پر کہا جاتا ہے کہ خاموشی سے بہتر کوئی چیز نہیں اور دوسرے مقام پر کہا جاتا ہے کہ بولنے سے اعلیٰ کوئی چیز نہیں۔(طیبی)۔''قال'' یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''حدثنی'' یعنی (یہ چیزیں) مجھ سے نبی پاک ﷺ نے بیان فرمائیں۔''بهن'' یعنی یہ تین چیزیں۔''ولو استزدته'' یعنی اگر میں سوال میں اضافہ کرتا ''لزادنی'' تو آپ ﷺ جواب میں اضافہ فرما دیتے۔''متفق علیه''۔میرک کا کہنا ہے کہ ابوداؤد، نسائی، دارقطنی، حاکم، ابن خزیمہ، ابن حبان اور بیہقی نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ کسی نے نبی پاک ﷺ سے پوچھا کون سا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا ''نماز اول وقت میں''۔حاکم اور بیہقی نے اپنی خلافیات میں کہا ہے کہ صحیحین کی شرط پر یہ روایت صحیح ہے۔

نماز کفر اور ایمان کے درمیان فرق ہے

۵۶۹ :وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ . (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی الصحیح ۸۸/۱ حدیث رقم (۱۳۴-۸۲) ولفظه "بین الرجل والشرك والكفر ترك الصلاة" وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۵۸/۵ حدیث رقم ۴۶۷۸ ولفظه كلفظ المشكاة۔ وأخرجه الترمذی فی السنن ۱۴/۵ حدیث رقم ۲۶۱۸۔ولیس فی أصل سنن النسائی إلا أن الشیخ عند الفتاح أبو غرة وضعه فی الحاشية و رقمه برقم ۲۳۲/۱۴۶۴ وهو زیادة من نسخة لدبه ۔ وأخرجه ابن ماجة بلفظه فی السنن ۳۴۲/۱ حدیث رقم

١٠٧٨ وأخرجه أحمد في مسنده ٣/ ٣٧٠۔ وقد رواه هؤلاء بالفاظ مختلفة (راجع المرقاة)۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نماز کو چھوڑنا بندہ مؤمن اور کفر کے درمیان فرق ہے۔اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''وعن جابر قال: قال رسول الله ﷺ: "بين العبد" یعنی مسلمان بندے ''وبين الكفر'' اور کفر (یعنی کفر کے قریب قریب) کے درمیان۔ابن حجر رحمہ اللہ کا قول ہے کہ بے نمازی کو کفر سے منسوب کرنا درست نہیں، کیونکہ اس سے بے نمازی کا کافر ہونا لازم آئے گا۔ابن حجر کا اس تقریر پر نازاں ہونا غرائب میں سے ہے اور فرمایا کہ اگر میری اس بات کو شارحین سمجھ لیں تو نہ وہ تاویل کریں اور نہ ہی بحث وتمحیص میں پڑیں۔''ترك الصلاة'' یہ مبتدا مؤخر ہے۔ابن الملک کا قول ہے کہ بین کا متعلق محذوف ہے، اس کی تقدیری عبارت: تركها وصلة بينه وبينه ہے۔بعض علماء کا قول ہے کہ جب کسی چیز کو کسی چیز (کسی شخص کو کسی شخص سے وغیرہ وغیرہ) سے جوڑنا مقصود ہو تو یوں کہا جاتا ہے ''هو بينهما''۔امام طیبی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ ''ترك الصلاة'' مبتدا ہے اور ظرفِ مقدم اس کی خبر ہے۔ظاہر ہے کہ نماز ہی کفر و بندے کے درمیان ایک حجاب ہے۔چنانچہ قاضی صاحب کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی تاویل یوں کی جاسکتی ہے کہ ترکِ صلوٰۃ کا مطلب ہے کہ جس نے نماز چھوڑ دی اس نے وہ حد توڑ دی جو کفر و بندے کے درمیان واقع ہے اور وہ کفر کے قریب پہنچ گیا۔یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ نماز کفر و بندے کے درمیان وُصلہ (جوڑ) ہے۔مطلب یہ ہے کہ جو شخص نماز چھوڑ دے گا تو یہ نماز کا چھوڑنا اسے کفر تک پہنچا دے گا۔ایک قول کے مطابق اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں کلام خلاف ظاہر ہے، کیونکہ یہاں ظاہر یہ تھا کہ یوں کہا جاتا: ''بين الايمان والكفر'' یا ''بين المؤمن والكافر''، لیکن یہاں ''مؤمن'' کی جگہ ''عبد'' کا لفظ کردیا کیونکہ عبودیت کا مطلب ہے کہ اللہ کے لئے اپنے مولا کے آگے جھک جانا اور اس کی نعمتوں کا شکر کرنا اور ''کفر'' کو ''کافر'' کی جگہ رکھ کر کافر کو اصل کفر قرار دے دیا۔گویا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیا کہ مؤمن اور کافر کے درمیان فرق ''ترکِ اداءِ شکر'' ہے، اس میں کفر کفران کے معنی میں ہوگا اور شرح السنۃ میں ہے: جان بوجھ کر تارکِ صلوٰۃِ مکتوبہ کافر ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس نے نماز چھوڑ دی اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ نماز چھوڑنا کفر ہے۔عبداللہ بن شقیق کا قول ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز کے علاوہ کسی چیز کے چھوڑنے کو کفر شمار نہیں کرتے تھے۔بعض علماء کا قول ہے کہ یہ حدیث انکار کرتے ہوئے نماز چھوڑنے پر محمول ہے یا پھر زجر وعید پر محمول ہے۔حماد بن زید، مکحول، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کا کہنا ہے کہ تارکِ صلاۃ مرتد کی طرح ہے لیکن دین سے خارج نہیں ہوتا، اُسے قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ قید کر دیا جائے گا یہاں تک کہ نماز پڑھنا شروع کر دے۔امام زہری رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

میرے خیال کے مطابق سب سے اچھی رائے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ہے، کیونکہ ان کے علاوہ باقی حضرات کے اقوال ضعیف ہیں۔پھر اس حدیث کی تاویلات میں سے یہ بھی ہے کہ نماز کو جائز سمجھ کر چھوڑنا کفر تک پہنچا دیتا ہے، کیونکہ معصیت کفر تک پہنچا دیتی ہے۔یا یہ خدشہ ہے کہ تارکِ صلوٰۃ کافر ہو کر مرے گا یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس نے نماز چھوڑ کر کافروں جیسا کام کیا۔''رواه مسلم'': میرک کا قول ہے کہ چاروں کتب نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور یہ الفاظ ابن ماجہ کے ہیں۔جب کہ مسلم شریف کے الفاظ کچھ یوں ہیں: ''بين الرجل وبين الشرك والكفر ترك الصلاة''۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے

منقول روایت کے الفاظ یوں ہیں: ''بین الرجل وبین الکفر ترك الصلاۃ''۔ ''ابوداؤد اور نسائی کے الفاظ کچھ یوں ہیں: ''لیس بین العبد وبین الکفر الا ترك الصلاۃ''۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کی نقل کردہ روایت کے الفاظ ''بین الکفر والایمان ترك الصلاۃ'' ہیں۔

الفصل الثانی:

نماز پڑھنا بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے

۵۷۰: عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ ﷺ خَمْسُ صَلَوَاتٍ اِفْتَرَضَهُنَّ اللّٰهُ تَعَالٰى مَنْ اَحْسَنَ وُضُوْئَهُنَّ وَصَلَّاهُنَّ لِوَقْتِهِنَّ وَاَتَمَّ رُكُوْعَهُنَّ وَخُشُوْعَهُنَّ كَانَ لَهٗ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ اَنْ يَّغْفِرَلَهٗ وَمَنْ لَّمْ يَفْعَلْ فَلَيْسَ لَهٗ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ اِنْ شَاءَ غَفَرَلَهٗ وَاِنْ شَاءَ عَذَّبَهٗ.

(رواہ احمد ابوداود وروی مالك والنسائی)

أخرجه أحمد فی مسنده ٥ /٣١٧۔وأخرجه أبوداؤد فی السنن ١/ ٢٩٥ حديث رقم ٤٢٥۔وأخرج نحوه : مالك فی الموطا١/ ١٣٢ الحديث ١٤ من كتاب صلاة الليل ۔والنسائی فی السنن ١/ ٢٣٠ حديث رقم ٤٦١۔وابن ماجة فی السنن ١/ ٤٤٩ حديث رقم ١٤٠١۔والدارمی فی السنن ١/ ٤٤٦ حديث رقم ١٥٧٧۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس آدمی نے پانچ نمازوں کے لئے جن کو اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے۔ اچھی طرح وضو کر کے ان کو وقت پر پڑھا۔ رکوع اور خشوع کی پوری رعایت رکھی تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور اللہ کا ذمہ ہے کہ اس کے گناہ بخش دے گا اور جس نے ایسا نہ کیا اللہ تعالیٰ کی کوئی ذمہ داری نہیں چاہے تو معاف کر دے اور چاہے تو سزا دے۔ اس حدیث کو امام احمدؒ اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے امام مالکؒ اور امام نسائی نے بھی اس کے مثل روایت کیا ہے۔

تشریح: ''عن عبادة بن الصامت قال: قال رسول الله ﷺ خمس صلوات'' یہ عبارت مبتدا ہے ''افترضهن الله تعالٰی'' یہ مبتدا کی صفت اور ایک قول کے مطابق خبر ہے ''من احسن'' یہ مبتدا کی خبر کے لئے شرط یا خبر کے بعد خبر ہے۔ ''وضوء هن'' یعنی وضو کے فرائض اور اس کی سنتوں کا لحاظ کرتے ہوئے۔ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے تو بڑی دور کی بات کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہاں وضو کے ''احسن'' ہونے سے مراد یہ ہے کہ اسے ارکان و شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے ادا کیا جائے، چنانچہ ''احسان وضوٗ'' سے مراد اس کی تصحیح ہوگی، کیونکہ احسان اصل فعل سے ایک زائد امر ہوتا ہے۔ ''وصلاهن لوقتهن'' یعنی ان کے مناسب اوقات میں ادا کرے۔ امام طیبی رحمہ اللہ کے خیال کے مطابق اس سے مراد ہے نماز کو اول وقت میں ادا کرنا ہے۔ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے انوکھی بات کرتے ہوئے فرمایا کہ اس حدیث میں نمازوں کو اول وقت میں ادا کرنے کی کوئی دلیل نہیں بلکہ مراد یہاں ''لوقتهن'' کے لام سے یہ سمجھ میں آ رہا ہے کہ نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کرنا شرط ہے اور اگرچہ اول وقت نہ ہو۔

''واتم رکوعهن'' یعنی شرائط اور سنن فعلیہ اور قولیہ کا لحاظ کرتے ہوئے۔ ''وخشوعهن'' ابن الملک کا کہنا ہے کہ خشوع کا مطلب حضور قلب اور اطمینان ہے۔ سید صاحب کا قول ہے کہ خشوع کا عطف رکوع پر یا تو تاکید اور تقریر کے لئے ہے۔ شیخ زمخشری نے کشاف میں اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ [البقرہ:٤٣] کے تحت لکھا ہے کہ رکوع عاجزی وانکساری کا نام ہے۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مطلب یہ ہوگا کہ وہ عاجزی کو عاجزی کے بعد پورا کریں، یعنی مزید عاجزی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ [یوسف: ٨٦] میں بث اور حزن کا تکرار دکھ اور حالت زار کی شدت کے باعث ہے۔ یا پھر رکوع سے مراد ارکانِ رکوع ہیں۔ یعنی جو شخص رکوع کے ارکان کو کامل طریقے سے ادا کرے۔ رکوع کو خاص طور پر تغلیباً ذکر کیا۔ جیسا کہ پوری رکعت کو رکوع کی وجہ سے ''رکعت'' کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رکوع ہماری خصوصیات میں سے ہے، کیونکہ ہم سے پہلی قوموں کی نمازوں میں رکوع نہیں ہوا کرتا تھا۔ وہ الگ بحث ہے کہ اس میں بھی اختلاف ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ رکوع کی ادائیگی میں تساہل سے کام لیتے تھے اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ رکوع مقدمہ اور وسیلہ کی طرح ہے یا اس وجہ سے خاص طور پر ذکر کیا کہ یہ دیگر ارکان کے درمیان واسطہ ہے۔ چنانچہ اس میں اس بات کی طرف تنبیہ ہے کہ باقی تمام ارکان بھی مساوات کے طور پر ادا ہونے چاہئیں اور خشوع سے مراد یہ ہے کہ جوارح کھیل کود سے باز رہیں اور دل تمام تر خیالات میں مشغولیت سے دور رہے اور وہ اس وقت ہوسکتا ہے کہ جب دل قراءت واذکار میں گم ہوجائے اور ہاں تمام ارکان کی وضع میں کوئی نہ کوئی حکمت ہے جیسا کہ قیام رب کی تعظیم واجلال کی خاطر وضع کیا گیا، رکوع ظاہری وباطنی عاجزی کی خاطر اور سجدہ غایت تذلل اور انکساری کی انتہا کی خاطر وضع کیا گیا کیونکہ پیشانی سب سے اعلیٰ ہے اور اسے ایسے مقام پر رکھ دیا جاتا ہے جو سب سے ادنیٰ ہے یعنی پاؤں رکھنے کی جگہ۔ ''كان له على الله عهد'' یعنی اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا ایک وعدہ ہے۔ عہد کا مطلب ہوتا ہے حالاً فحالاً کسی چیز کی رعایت وحفاظت کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ عہد بندوں کے ساتھ بطور مجاز کے ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نماز قائم کرنے والوں کے ساتھ یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں عذاب نہیں دے گا اور وعدہ میں چونکہ خلف نہیں ہوتا اور عہد میں خلف ہوتا ہے تو عہد میں توثیق زیادہ ہے، اس لئے عہد کا لفظ استعمال کیا۔ ''ان يغفر له'' یا تو یہ جملہ محذوفۃ المبتدا عہد کی صفت ہے یا پھر عہد سے بدل ہے۔ عہد سے مراد ہے عقد ایمان اور میثاق اور مغفرت سے مراد صغیرہ گناہوں کی معافی ہے۔ ''ومن لم يفعل'' یعنی مطلقاً یا جس نے احسان یعنی عمدگی کو ترک کردیا ''فليس له على الله عهد ان شاء غفر له'' تو یہ اللہ کا فضل ہوگا۔ ''وان شاء عذبه'' یعنی اگر عذاب دے تو یہ اس کا عدل ہوگا۔ یہاں مغفرت کو مقدم کرکے اس بات کی جانب اشارہ کردیا کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے اور تارک صلوٰۃ یا تارک خشوع وخضوع کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑنا یہ معافی کی تجویز ہے اور شرفا ہمیشہ وعدہ کی پاسداری کرتے ہیں اور وعید میں مسامحت سے کام لیتے ہیں اور احادیث سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ضروری نہیں کہ وہ لازماً نافرمان کو عذاب دے جیسا کہ وہ فرمانبردار کو ثواب دینے کا پابند ہے۔ سید صاحب نے ازہار سے یوں ہی نقل کیا ہے اور حق بات وہ ہے جس پر اہل سنت والجماعت ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر مخلوق کے لئے کوئی چیز بھی واجب وضروری نہیں، بلکہ اسے تو یہ بھی حق ہے کہ وہ فرمانبرداروں، بچوں اور پاگلوں کو عذاب دے اور فاسقوں کو ثواب دے۔ ہاں یہاں کافر مستثنیٰ ہیں باری تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ﴾ [النساء:١١٦] خلف الوعید کی مزید تحقیق کے لئے القول السدید میں رجوع فرمائیے۔ ''رواہ احمد

وابوداود" یہ الفاظ ابوداود کے ہیں: "وروى مالك والنسائي" میرک کا کہنا ہے کہ ابن ماجہ میں بھی اسی طرح ہے۔ "نحوه" یعنی اسی کے ہم معنیٰ روایت امام مالک ونسائی رحمہما اللہ نے بھی نقل کی ہے۔

چار اعمال پر جنت کی بشارت

۵۷۱ :وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَلُّوْا خَمْسَكُمْ وَصُوْمُوْا شَهْرَكُمْ وَاَدُّوْا زَكٰوةَ اَمْوَالِكُمْ وَاَطِيْعُوْا ذَا اَمْرِكُمْ تَدْخُلُوْا جَنَّةَ رَبِّكُمْ۔ (رواه احمدو الترمذی)

أخرجه أحمد فی المسند ٥/٢٥١ ـ وأخرجه الترمذی فی السنن ٢/٥١٦ حدیث رقم ٦١٦ وقال حسن صحیح ـ

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا پانچ وقت کی نماز ادا کرو۔ اپنے مہینے رمضان المبارک کے روزے رکھو۔ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرو اور اپنے حکمران کی اطاعت کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: "وعن ابی امامة قال: قال رسول الله ﷺ "صلوا خمسكم": خمسکم میں خمس کو کُم کی طرف مضاف کرنا اس لئے ہے تاکہ عمل ثواب کے مقابل ہو جائے جیسا کہ جنة ربكم میں ہے اور دوسری وجہ یہ ہے تاکہ رب اور بندے کے درمیان خرید و فروخت کا معاملہ طے پا جائے جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ﴾ [التوبة : ١١١] "خدا نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں" یہ علامہ طیبی کا قول ہے۔ علامہ طیبی مزید فرماتے ہیں کہ اس اضافت اور مابعد والی اضافات میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان خصوصیات کے ساتھ یہ اعمال کرنے والے اپنی ان خصوصیات کی وجہ دیگر سے امتوں سے ممتاز ہیں اور بندوں کو مخاطب کر کے اعمال کی ادائیگی کی رغبت دلانا مقصود ہے اور یہ بتلانا مقصود ہے کہ اس اضافت عملیہ کے مقابلے میں ایک اضافت فضلیہ ہے جو کہ اضافت عملیہ سے افضل واتم ہے اور وہ ہے جنت، جو کہ ربوبیت کے وصف کی جانب مضاف اور اُمت کی مزید تربیت اور دوسری امتوں سے منفرد دی جانے والی نعمتوں کی جانب مشیر ہے۔ "وصوموا شهر كم" یعنی جو صرف تمہارے ساتھ خاص ہے یعنی رمضان کے روزے۔ روزوں کو مبہم اس وجہ سے رکھا تاکہ جب ان کے لئے کوئی حد مقرر کی جائے تو کسی شک اور تردد کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ "وادو زكاة اموالكم" جو کہ تمہاری ملکیت ہیں۔ زکوٰۃ کو روزے کے بعد ذکر کرنے میں شاید یہ حکمت ہے کہ زکوٰۃ روزوں کے بعد فرض ہوئی۔ باقی اکثر آیات واحادیث میں ان دونوں کو اکٹھا اور مقترن ذکر اس وجہ سے کیا کہ ان میں سے افضل وہ ہے جو بدنی عبادت اور پھر اس عبادت کا درجہ ہے جو مالی ہو۔ یہاں ادو زكاتكم نہیں فرمایا، اس میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ زکوٰۃ کا وجوب مطلق نہیں بلکہ اموالِ نامیہ اور سال کو پہنچ جانے والے سائمہ نصاب سے متعلق ہے اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی جانب بھی اشارہ ہے کہ مال کی زکوٰۃ نفس پر بڑی شاق اور بھاری ہے، کیونکہ مال سے محبت زیادہ ہوتی ہے۔ بسا اوقات تو بہت سے لوگ مال کو بچاتے بچاتے جان گنوا بیٹھتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے "وآتی المال علی حبه" کہہ کر مسلمانوں کی مدح فرمائی ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ مفسرین نے یہاں اپنا اپنا اظہار خیال کیا ہے۔ "واطیعوا ذا امرکم" یعنی خلیفہ و بادشاہ وغیرہ

جو بھی حکمران ہو۔ یا پھر یہاں مراد علماء ہیں یا یہ حکم عام ہے یعنی جو بھی تمہارے امور کا نگران ہو چاہے وہ ظالم و جابر بادشاہ ہو یا کوئی اور آمر و نواب۔ مگر اس میں اس بات کا لحاظ رہے کہ خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔ یہاں ''ذا امرکم'' فرمایا ''امیرکم'' نہیں فرمایا اس لئے کہ یہ عرفاً خاص سمجھا جاتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تا کہ یہ کلام باری تعالیٰ کے کلام: ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ [النساء: ٥٩] ''مؤمنو! خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہے ان کی بھی'' کے موافق ہو جائے۔ ''تدخلوا جنة ربكم'' یہ عبارت تمام سابقہ اوامر کا جواب ہے، مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا کام کرنے والے لوگ عذاب کا سامنا کئے بغیر جنت میں داخل ہوں گے، اس لئے کہ غالب یہی ہے کہ جو شخص مذکورہ امور سرانجام دے گا وہ صالحین میں شمار ہوگا (اور صالحین کو عذاب کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا)۔ جنت میں داخلے سے مراد یہ کہ تمہیں تمہارے اعمال کے مناسب اور جنت کے درجات عطا کئے جائیں گے، اس لئے کہ فی الحقیقت جنت میں داخل رب کے فضل سے ہوگا اور درجات کی بلندی اطاعت کے حساب سے ملے گی۔ ''رواه احمد والترمذی''۔ امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ میرک نے اسے نقل کیا ہے۔

اولاد کو نماز کا حکم دو

۵۷۲: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مُرُوْا اَوْلَادَكُمْ بِالصَّلٰوةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ اَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِيْنَ وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ.

(رواه ابوداود و كذا رواه في شرح السنة)

أخرجه أبوداؤد في السنن ١/٣٣٤ حديث ٤٩٥ ـ وأخرج الترمذي إلى "......عشر سنين" في السنن ٢/٢٥٩ حديث رقم ٤٠٨ وقال حسن صحيح۔

ترجمہ: حضرت عمروؓ بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جب تمہاری اولاد سات سال کی ہو جائے تو نماز پڑھنے کا حکم دو اور جب دس سال کے ہو جائیں تو نماز چھوڑنے پر انہیں مارو نیز ان کے بستر الگ کر دو'' اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے اسی طرح شرح السنہ (میں عمرو بن شعیب سے اور مصابیح میں سبرہ بن معبد) سے یہ روایت نقل کی گئی ہے۔

تشریح: ''وعن عمرو بن شعيب عن ابيه'': یعنی محمد ''عن جده'' یعنی عبداللہ بن عمرو بن العاص سے، ''قال: قال رسول الله ﷺ'': ''مروا'' یہ امر سے امر کا صیغہ ہے، اس کا ہمزہ تخفیف کے باعث حذف کر دیا گیا ہے، پھر ہمزہ وصل بے استغناء بھی تخفیف کے پیش نظر ہے، پھر فاء کلمہ کو اس کی حرکت دی گئی کیونکہ ابتدا بالسکون محال ہے، ''اولادکم'' اس میں مذکر و مؤنث سب شامل ہیں، ''بالصلاة'' اس تعلق آنے والی شرائط کے ساتھ ہے، ''وهم ابناء سبع سنين'' تا کہ ان کی عادت بن جائے اور وہ نماز سے مانوس ہو جائیں، یہ جملہ حالیہ ہے، ''واضربوهم عليها'' یعنی نماز چھوڑنے پر ''وهم ابناء عشر سنين'' کیونکہ اس وقت وہ بالغ ہو چکا ہوگا یا قریب البلوغ ہوگا، ''وفرقوا'' یہ تفریق سے امر کا صیغہ ہے، ''بينهم'' یعنی

ظاہر ہے کہ یہ تفریق لڑکیوں اور لڑکوں کے درمیان ہوگی، اس کی تائید بعض علماء کے قول سے بھی ہوتی ہے، اور دو مرد یا عورتیں ایک ہی بستر میں سوسکتی ہیں بشرطیکہ ان کا ستر اس طرح ڈھانپا ہوا ہو کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مس ہونے سے مامون و محفوظ ہو۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمارے ائمہ کرام اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''دس سال کے بعد بہنوں اور بھائیوں کے درمیان تفریق کر دینا واجب ہے''، چنانچہ دو لڑکوں کا ایک ہی بستر میں سونا جائز نہیں۔ ظاہر ہے کہ حافظ ابن حجر کی یہ بات درست نہیں کہ دو لڑکے ایک بستر میں نہیں سوسکتے، کیونکہ ائمہ کرام کی عبارت سے یہ مفہوم نہیں ہو رہی۔ ''في المضاجع'' یعنی بیڈ (Bed)۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ جب لڑکا اور لڑکی دس برس کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں تو غالب یہی ہے کہ انہیں شہوت آنا شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں دو حکموں (نماز کا حکم اور دس سال کے بعد بستر الگ الگ کرنے کا حکم) کو ادب سکھانے کے لئے جمع کر دیا تا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بھی حفاظت ہو جائے، کیونکہ نماز تمام عبادات کی اصل ہے اور ساتھ ہی معاشرتی تعلیم بھی دے دی تا کہ بچے تہمت کے مقام سے بچ جائیں اور اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ کاموں کا ارتکاب بھی نہ کر سکیں۔ ''رواه ابوداود و كذا رواه في شرح السنة عنه'' میرک کا قول ہے کہ اس روایت کو امام ابوداود اور امام حاکم نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند کے علاوہ سند سے نقل کیا ہے، یہ الفاظ ابوداود کے ہیں، اور اسے امام ترمذی اور ابن خزیمہ نے عبدالملک بن الربیع بن سبرۃ الجہنی عن ابیہ عن جدہ کی روایت سے نقل کیا ہے لیکن اس میں ''وفرقوا......'' والی عبارت نہیں ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، جب کہ امام مسلم کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صحیح اور مسلم کی شرائط پر ہے۔

۵۷۳: وَفِي الْمَصَابِيْحِ عَنْ سَبْرَةَ بْنَ مَعْبَدٍ۔

أخرجه أبوداؤد في السنن ۳۳۴/۱ حديث ۴۹۵۔ وأخرج الترمذي إلى "......عشر سنين" في السنن ۲۵۹/۲ حديث رقم ۴۰۸ وقال حسن صحيح۔

ترجمہ: ''اور مصابیح میں سبرہ بن معبد سے یہ روایت نقل کی گئی ہے۔''

تشریح: ''وفي المصابيح، عن سبرة'' باء کے سکون ''ابن معبد'' امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت امام ابوداؤد نے بھی ان سے نقل کی ہے، لیکن اس کے الفاظ کچھ یوں ہیں: ''مروا الصبي بالصلاة اذا بلغ سبع سنين و اذا بلغ عشر سنين فاضربوه عليها''۔ ''جب لڑکا سات سال کا ہو جائے تو اس کو نماز پڑھنے کی تاکید کرو اور جب دس سال کا ہو جائے تو نماز نہ پڑھنے پر اس کو مارو۔'' اس روایت میں تفریق کا حکم نہیں ہے۔

نماز سے منافق کی جان اور مال محفوظ ہو جاتے ہیں

۵۷۴: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْعَهْدُ الَّذِيْ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ۔ (رواه احمد والترمذي والنسائي وابن ماجة)

أخرجه أحمد في المسند ۳۴۶/۵۔ وأخرجه الترمذي في السنن ۱۵/۵ حديث رقم ۲۶۲۱ وقال حسن صحيح

غريب وأخرجه النسائي في السنن ١/ ٢٣١ حديث رقم ٤٦٣ ـ وأخرجه ابن ماجة في سننه ١/ ٣٤٢ حديث ١٠٧٩ ـ

ترجمہ: ''حضرت بریدہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہمارے اور ان کے درمیان جو عہد ہے وہ نماز ہے لہٰذا جس نے نماز کو چھوڑ دیا اس نے کفر کیا۔ اس حدیث کو امام احمدؒ امام ترمذیؒ امام نسائیؒ اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔''

''**وعن بريدة قال: قال رسول الله ﷺ العهد**'': یعنی قسم سے پکا کیا ہوا عہد و پیمان ''**الذى بيننا**'' یعنی مسلم کمیونٹی ''**وبينهم الصلاة**'' قاضی صاحب کا قول ہے کہ یہ ضمیر غائب منافقین کے موجب سزا ہونے کو ثابت کرنے کے لئے استعمال کی گئی ہے، مطلب یہ ہے کہ احکام اسلام کی بجا آوری اور مسلمانوں سے مشابہت نماز کی ادائیگی لزومِ جماعت اور ظاہری احکام پر عمل کرنے میں ہے، جب کوئی شخص یہی چھوڑ دے تو اس میں اور کافر میں کوئی فرق نہیں۔ تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس بات کی تائید رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے جو آپ ﷺ نے اس وقت فرمایا جب منافقین کے قتل کے بارے میں اجازت طلب کی گئی کہ ''میں تمہیں نمازیوں کے قتل سے روکتا ہوں''۔ ''**فمن تركها فقد كفر**'' یعنی اس نے (نماز چھوڑ کر) کفر کا اظہار کیا اور کافروں والے کام کا ارتکاب کیا، کیونکہ اعتقادی منافق کافر ہوتا ہے، پس اسے کافر نہیں کہا جائے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''**وبينهم**'' میں غائب کی ضمیر عام ہے اور شامل ہے ان تمام لوگوں کو جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پہ بیعت کی، چاہے وہ منافق ہو یا نہ ہو، اس پر اس باب کی ایک دوسری روایت دلالت کرتی ہے کہ جس میں آپ علیہ السلام نے ابو درداء رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ ''جان بوجھ کر فرض نماز ترک نہ کرنا، جس نے جان بوجھ کر فرض نماز ترک کی تو وہ ذمہ سے بری ہے''۔ حاصل یہ ہے کہ یہاں ترکِ صلوٰۃ کے گناہ کا بڑا ہونا بتانا مقصود ہے، جب کہ کفر کا فتویٰ ایک تاویل ہے۔ ''**رواه احمد**'' میرک کا کہنا ہے کہ اس کو امام ابوداؤد (نے بھی نقل کیا ہے) ''**والترمذى**'' اور امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ روایت حسن صحیح ہے۔ ''**والنسائى وابن ماجه**'' میرک کا قول ہے کہ اس روایت کو ابن حبان نے صحیح میں اور حاکم نے المستدرک میں نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے اور ہم اس کی علت کو نہیں جانتے۔

الفصل الثالث:

نماز سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں

۵۷۵: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ عَالَجْتُ امْرَاَةً فِیْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ وَاِنِّیْ اَصَبْتُ مِنْهَا مَا دُوْنَ اَنْ اَمَسَّهَا فَاَنَا هٰذَا فَاقْضِ فِیْ مَاشِئْتَ فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ لَقَدْ سَتَرَكَ اللّٰهُ لَوْ سَتَرْتَ عَلٰى نَفْسِكَ قَالَ وَلَمْ يَرُدَّ النَّبِیُّ ﷺ شَيْئًا فَقَامَ الرَّجُلُ فَانْطَلَقَ فَاَتْبَعَهُ النَّبِیُّ ﷺ رَجُلًا فَدَعَاهُ وَتَلَا عَلَيْهِ هٰذِهِ الْاٰيَةَ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذَّاكِرِيْنَ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْقَوْمِ يَانَبِيَّ اللّٰهِ هٰذَا لَهٗ

خَاصَّةً؟فَقَالَ بَلْ لِلنَّاسِ كَافَّةً . (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢١١٦ حديث رقم (٤٢-٢٧٦٣)۔وأخرجه أبوداوٗد في السنن ٤/٦١١ حديث رقم ٤٤٢٨۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ مدینہ کے کنارے میں نے ایک عورت کو اپنے گلے سے لگا کر سوائے جماع کے سب کچھ کر لیا ہے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں آپ جو چاہیں میرے بارے میں فیصلہ کریں حضرت عمرؓ نے اس آدمی سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری پردہ پوشی کی تھی اگر تم بھی اپنے عیب پر پردہ ڈال لیتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چنانچہ وہ آدمی اٹھ کر چلا گیا پھر آپ ﷺ نے اسے بلانے کے لئے ایک آدمی بھیجا جو اسے بلا کر لے آیا آپ ﷺ نے اس کے سامنے یہ آیت کریمہ تلاوت کی: اَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذَّاكِرِيْنَ۔ کہ دن کے دونوں کناروں اور رات کی کچھ گھڑیوں میں نماز پڑھا کرو کیونکہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں اور یہ نصیحت نصیحت ماننے والوں کے لئے ہے۔ حاضرین مجلس میں سے ایک آدمی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ یہ حکم صرف اسی آدمی کے لئے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ سب آدمیوں کے لیے یہی حکم ہے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''**عن عبدالله بن مسعود قال: جاء رجل الى النبي ﷺ فقال: يارسول الله! انى عالجت امرأة**'': یعنی میں نے اس سے دل لگی کی اور اس کے ساتھ میں نے وہ کچھ کیا جو مرد و عورت باہم کرتے ہیں' لیکن میں نے اس کے ساتھ جماع نہیں کیا، یہ علامہ طیبی کا قول ہے۔ ''**في اقصى المدينة**'' یعنی مسجد نبوی سے دور نشیبی علاقہ میں جا کر یہ حرکت تا کہ میں جماع کرنے میں کامیاب ہو سکوں ''**واني اصبت منها ما دون ان امسها**'' اس میں ''ما'' موصولہ ہے، یعنی وہ کام کیا جو مس سے تجاوز کر چکا تھا یعنی جماع، ''**فانا هذا ، فاقض**'' اس میں سبیہ ہے، یعنی یہ میں آپ کے سامنے حاضر اور آپ کے حکم کا منتظر ہوں لہٰذا آپ فیصلہ فرما دیجئے ''**فيّ**'' یعنی میرے حق میں ''**ماشئت**'' یعنی جو آپ اب میرے لئے چاہتے ہیں، یہ عبارت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے سامنے تسلیم خم اور عاجزی و انکساری سے کنایہ ہے ''**فقال له عمر: لقد سترك الله لوسترت على نفسك**'' یعنی تو اچھا ہوگا، اس میں حرف ''لَو'' تمنی کے لئے ہے۔ باقی رہا ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ قول کہ یہاں حرفِ لو تحضیضیہ ہے یعنی تو نے اپنے گناہ پر پردہ کیوں نہ ڈالا؟ تو یہ لغت میں غیر معروف ہے ''**قال**'' یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''**ولم يرد**'' دالِ مشددہ کے فتحہ کے ساتھ، اس پر ضمہ اور کسرہ بھی جائز ہے ''**النبي ﷺ**'' یعنی اس آدمی پر یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ''**شيئا**'' کوئی بات نہیں فرمائی، کیونکہ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار تھا اور یہ بھی امید تھی کہ اس کی سزا میں کمی ہوگی ''**فقام الرجل، فانطلق**'' یعنی وہ یہ سمجھ کر چلا گیا کہ رسول اللہ ﷺ جو خاموش ہیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی حکم نازل ہوگا، اور میرے ذمہ تو اطلاع تھی، پھر اگر معافی کا حکم آ گیا تو شکر کروں گا ورنہ واپس آ کر حکم کی تکمیل کروں گا اور یہ موقع محل کے مناسب تھا، ورنہ تو صریح اجازت کے بغیر جانا خلافِ ادب تصور کیا جاتا ہے۔ باقی علامہ ابن حجر رحمہ

اللہ کا قول کہ اس صحابی کے اس طرح جانے کو بھاگنا تصور کیا گیا ہے تو یہ ٹھیک نہیں، کیونکہ انہوں نے خود آکر اعتراف کیا ہے تو بھاگنا ممکن نہیں، اگر اس نے اپنے آپ پر جھوٹ بھی بولا ہو تو پھر وہ وہاں سے چل نکلا ہو تو اس سے بھی حد ساقط ہو جاتی ہے: ''فاتبعه النبی ﷺ''یعنی اس کے پیچھے بھیجا ''رجلا'' تاکہ وہ اسے بلا لائے ''فدعاه''یعنی وہ صحابی جانے والے صحابی کو بلا لائے ''وتلا'' نبی پاک ﷺ نے ''علیه''یعنی سائل کے سامنے ''هذه الآیة:''واقم الصلوٰة'' یہ عبارت بدل ہے آیت سے ''طرفی النهار''یعنی طرف اول میں صبح اور ظہر وعصر یا صرف عصر طرف آخر میں ''وزلفا''یعنی رات کی وہ ساعات جو دن کے قریب ہوں ''من اللیل''اس میں ''من'' بیانیہ ہے یعنی مغرب اور عشاء کی نمازیں ''ان الحسنات''یعنی نمازیں اور تمام اطاعات ''یذهبن السیئات''یعنی یہ چھوٹے گناہوں کو مٹا دیتی ہیں اور کبیرہ گناہوں میں تخفیف پیدا کر دیتی ہیں۔''ذلك'' یعنی مذکورہ بالا چیزیں، یعنی اس آیت میں جن عظیم احسانات کا ذکر ہے، ''ذکرٰی''یعنی تذکیر وموعظت ''للذاکرین''یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو ''فقام رجل من القوم''ایک قول کے مطابق عمر بن خطابؓ اور ایک قول کے مطابق معاذ بن جبل ''یا نبی الله'' یہاں ''رسول اللہ'' کی جگہ نبی اللہ کہنے میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ نبی پاک ﷺ جس بات کی خبر دے رہے ہیں وہ اپنے پاس سے نہیں کہہ رہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی بات لوگوں تک پہنچا رہے ہیں ''هذا''یعنی یہ حکم ''له''یعنی سائل کے لئے ''خاصة''یعنی اس کے ساتھ مختص ہے یا عام لوگوں کے لئے ہے؟ ''فقال: بل للناس کافة''یعنی یہ حکم عام اور سائل عوام الناس میں سے ہے یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس حکم میں سب سے پہلے داخل ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے یہ حکم نازل ہوا ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ ہمیشہ اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ سبب کے خصوص کا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا سیاق اور اس فصل کے آغاز والی حدیث کا سیاق آپس میں متغایر ہیں، لہٰذا یہ ممکن ہے کہ یہ دو واقعے ہوں جن کا سابقہ دو آدمیوں سے پڑا ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آیت دو بار نازل ہوئی ہو۔ باقی رہا دوسری مرتبہ میں رسول اللہ ﷺ کا خاموش رہنا تو وہ اس وجہ سے تھا کہ آپ ﷺ کو حکم تو معلوم تھا مگر خاموشی اس وجہ سے اختیار کی کہ شاید کوئی نئی چیز نازل ہو جائے۔

اور ہاں واقعات کے تعدد سے آیت کے نزول کا تکرار بھی لازم نہیں آتا، اور حدیث میں بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں ہے کہ جس سے یہ سمجھ میں آتا ہو کہ یہ آیت دوبارہ نازل ہوئی ہے، بلکہ آپ ﷺ نے تو یہ آیت بطور دلیل اور تمسک کے پڑھی تھی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خاموشی کسی اور وجہ سے ہو۔ چنانچہ جب وہ آدمی چل نکلا تو آپ علیہ السلام نے اس شخص کو بلایا تو اس آدمی نے خوف زدہ ہو کر اپنا مدعیٰ بیان کیا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا خاموش ہونا اور فوری گفتگو نہ کرنا اس بات کی جانب اشارہ ہو کہ امت فیصلہ جلد بازی سے کام نہ لے۔ (رواہ مسلم)

نماز سے گناہ معاف ہونے کی مثال

۵۷۶ :وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ خَرَجَ زَمَنَ الشِّتَآءِ وَالْوَرَقُ یَتَهَافَتُ فَاَخَذَ بِغُصْنَیْنِ مِنْ شَجَرَةٍ قَالَ فَجَعَلَ ذٰلِكَ الْوَرَقُ یَتَهَافَتُ قَالَ فَقَالَ یَا اَبَا ذَرٍّ قُلْتُ لَبَّیْكَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنَّ الْعَبْدَ الْمُسْلِمَ

لَيُصَلِّي الصَّلَاةَ يُرِيدُ بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ فَتَهَافَتَ عَنْهُ ذُنُوبُهُ كَمَا تَهَافَتُ هٰذَا الْوَرَقُ عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ .

(رواه احمد)

أخرجه أحمد في المسند ۵/۱۷۹۔

ترجمہ: ''حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سردیوں کے موسم میں جب کہ درختوں سے پتے گرنے کا موسم تھا باہر تشریف لے گئے آپ ﷺ نے ایک درخت کی دو شاخیں پکڑیں۔ راوی کہتے ہیں آپ ﷺ نے ان دونوں کو حرکت دی تو پتے گرنے لگے آپ ﷺ نے فرمایا اے ابوذرؓ! میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ میں حاضر ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا جب مؤمن بندہ خالصۃً اللہ کی رضا کے لئے نماز پڑھتا ہے تو اس کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جس طرح اس درخت سے یہ پتے گر رہے ہیں۔ اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''وعن ابی ذر، ان النبی ﷺ خرج زمن الشتاء'': یعنی موسم سرما میں یا اس موسم کے قریب یعنی خزاں میں ''والورق'' یعنی جنس پتہ جات ''یتهافت'' یعنی مسلسل گر رہے تھے ''فاخذ بغصنين من شجرة'' یعنی مباح شجر یا رسول اللہ ﷺ کے مملوکہ اشجار میں سے یا اس شخص کے درختوں میں سے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کو یہ گمان تھا کہ وہ اس کی اجازت دے دے گا اور اس میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ یہ دونوں ٹہنیاں متصل ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جدا جدا ہوں ''قال'' یعنی ابوذر رضی اللہ عنہ ''فجعل ذاك'' اصل میں یہ لفظ ذالك تھا ''الورق يتهافت'' یعنی دونوں ٹہنیوں سے پتے لگاتار اور مسلسل گرنے لگے، کیونکہ کہ جب انہیں پکڑا جاتا ہے یا انہیں جھاڑا جاتا ہے تو درخت کی بہ نسبت پتے تیزی سے گرنے لگتے ہیں ''قال'' صحیح نسخہ میں عبارت یوں ہی ہے یعنی ابوذر نے فرمایا: ''فقال النبی ﷺ: یا اباذر! قلت'' ایک نسخہ کے مطابق یہ لفظ فقلت ہے ''لبيك'' یعنی میں حاضر میں حاضر، یا میں خادم میں خادم، یہ لفظ لب بالمكان سے ماخوذ ہے جس میں کوئی کھڑا ہوا اور تثنیہ کثرت کو بیان کرنے کے لئے ہے ''یارسول الله!'' ایک نسخہ میں حرفِ ندا نہیں ہے تو اس وقت یہ حذف قربت کے باعث ہوگا ''قال: ان العبد المسلم ليصلی الصلاة'' یعنی تمام ارکان و شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے ''یرید بها وجه الله'' یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی رضامندی ملحوظِ خاطر ہو۔ یہ جملہ ضمیر فاعل یا ضمیر مفعول سے حال ہے، یعنی وہ عبادت خالص اللہ تعالیٰ کے لئے یوں ہو کہ اس میں کسی قسم کی ریا اور دکھلاوا نہ ہو، اسی طرح اس میں اپنی ذات مقدم نہ ہو اور نہ ہی دنیاوی و اخروی کوئی غرض ہو بلکہ مقصد صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہو اور بس! ''فتهافت'' ایک تاء کے حذف کے ساتھ ''عنه ذنوبه كما تهافت'' ماضی کے صیغہ کے ساتھ۔ ایک صحیح نسخہ کے مطابق ''یتهافت'' مضارع مذکر کا صیغہ ہے، اصل میں یہ لفظ مؤنث ہی استعمال ہوتا ہے، کیونکہ ''هذا الورق'' میں پتوں کی جنس مراد ہے، یعنی یہ پتے ''عن هذه الشجرة'' یعنی اس درخت کی ٹہنیوں سے ''رواه احمد'': میرک کا کہنا ہے کہ اس کی اسناد حسن ہیں۔

خصوصی نماز

۵۷۷ :وَعَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ صَلّٰى سَجْدَتَيْنِ لَايَسْهُوْ فِيْهِمَا

غَفَرَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ۔ (رواه احمد)

أخرجه أحمد فی المسند ٥/١٩٤۔

ترجمہ: حضرت زید بن خالد جہنیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے دو رکعت نماز پڑھی کہ ان دو رکعتوں میں غفلت نہ کی تو اللہ تعالیٰ اس کے پہلے گناہ معاف فرما دے گا۔ اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: "وعن زید بن خالد الجهنی": ان کا تعلق قبیلہ جہینہ سے ہے اور وہ مدینہ میں آئے اور وہیں انتقال ہوا، ان سے عطاء بن یسار وغیرہ نے نقل کیا ہے، یہ بقول علامہ طیبی کے ہے۔ "قال: قال رسول الله ﷺ من صلی سجدتین" امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سجدہ کا غلبہ تمام دیگر ارکان پر یوں ہی ہے جیسے رکعت کا غلبہ دیگر ارکان پر ہے۔ "لایسهو" یعنی غفلت نہ کرے "فیهما" امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس کا دل حاضر ہو یا وہ یوں عبادت کر رہا ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے "غفر الله له ما تقدم من ذنبه" یعنی یہ معافی صغیرہ گناہوں کے ساتھ مقید ہے اگرچہ بظاہر اس میں کبیرہ گناہ بھی شامل ہیں۔ "رواہ احمد" میرک کا کہنا ہے کہ اس روایت کو امام ابوداود رحمہ اللہ نے یوں روایت کیا ہے: من توضا فاحسن وضوئه ثم صلی رکعتین لایسهو بینهما غفرله ماتقدم من ذنبه"۔ یہاں بینهما کا مطلب ہے یعنی دونوں رکعتوں کے افعال کے درمیان کوئی بھول اور سہو نہ ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بے نماز فرعونؔ اور ہامانؔ کے ساتھ ہوگا

٥٧٨: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهٗ ذَكَرَ الصَّلَاةَ يَوْمًا فَقَالَ مَنْ حَافَظَ عَلَيْهَا كَانَتْ لَهٗ نُوْرًا وَبُرْهَانًا وَنَجَاةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ لَمْ يُحَافِظْ عَلَيْهَا لَمْ تَكُنْ لَهٗ نُوْرًا وَلَا بُرْهَانًا وَلَا نَجَاةً وَكَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ قَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَاُبَيِّ بْنِ خَلَفٍ

(رواه احمد والدارمی والبیهقی فی شعب الایمان)

أخرجه أحمد فی مسنده ٢/١٦٩۔ والدارمی فی السنن ٢/٣٩٠ حدیث رقم ٢٧٢١۔ وأخرجه البیهقی فی شعب الایمان ٣/٤٦ حدیث رقم ٢٨٢٣۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے نماز کی فضیلت کا ذکر کیا چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو آدمی نماز پابندی سے پڑھتا ہے تو یہ نماز اس کے لئے قیامت کے دن روشن دلیل اور نجات ہوگی اور جس نے نماز پابندی کے ساتھ ادا نہ کی تو اس کے لئے قیامت کے دن روشن دلیل اور نجات نہیں ہوگی اور وہ قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔ اس حدیث کو امام احمد اور امام داری نے روایت کیا ہے اور امام بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: "وعن عبدالله بن عمرو بن العاص": جمہور اس بات پر قائم ہیں کہ "عاص" یاء کے ساتھ ہے اور یہی

اہلِ عرب کے ہاں فصیح ہے، بقول علامہ کرمانی اکثر کتب میں یاء محذوف ہے، جب کہ صحیح نسخہ کے مطابق یہ بغیر یاء کے ہے اور اس لفظ میں یا لفظاً وخطاً وکتابۃً حذف ہے اور یہ لفظ یوں ہی مبنی ہے، جیسا کہ ''المتعال'' میں، یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کی اصل عوص یا العیص ہے، جیسا کہ قاموس سے یوں ہی سمجھ میں آتا ہے۔ واللہ اعلم۔ ''عن النبی ﷺ انه'' یعنی نبی پاک ﷺ نے ''ذکر الصلاۃ یومًا'' امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یعنی نبی پاک ﷺ نے نماز کی فضیلت وشرف ذکر کرنے کا ارادہ کیا ''فقال'' یہ فاء تفسیر کے لئے ''من حافظ علیها'' یعنی فرائض، سنن وآداب کی رعایت کے ساتھ ساتھ اس پر دوام واستمرار بھی کرے، ''کانت'' یعنی اس کی نماز اور اس پر محافظت ومداومت ''له نورا وبرهانا'' بقول علامہ طیبی اس کی تشریح پیچھے گذر چکی ہے، یا پھر اس کا معنی یہ ہو سکتا ہے کہ یہ نماز اس کے لئے نور ہوگی جو اسے سوال سے بے نیاز کر دے گی اور برہان ودلیل ہوگی اس کی محافظت پر تمام طاعات وعبادات پر، یہ ترتیب ذکری تبدیلی کے لئے ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے اس کے نورِ ایمان میں اضافہ ہوگا اور اس کے کمالِ عرفان پر واضح نشانی ہوگی ''ونجاة'' یعنی یہ نماز نجات والی ہوگی یا یہ کہ یہ نماز بذات خود نجات ہوگی اور یہ مبالغۃً ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے ''زید عدل''۔ ''یوم القیامة'' اس لئے کہ عبادات میں سب سے پہلا سوال نماز کے بارے میں ہوگا، اور اسی طرح یہ نماز قبر میں اس کے لئے نور، برھان اور نجات کا باعث ہوگی، جیسا کہ دیگر احادیث میں وارد ہوا ہے کہ جو شخص مر گیا تو اس کے لئے قیامت قائم ہوگئی ''ومن لم یحافظ علیها'' یعنی جو نماز کی شرائط وارکان کا خیال نہ رکھے، پس جو شخص کلی طور پر بالکل ہی چھوڑ دے تو اس کے لئے یہ محرومیت بطریق اولیٰ ہوگی۔ ''لم تکن له نور ولا برهانا ولانجاة، وکان یوم القیامة'' قیامت کے دن اس کا حشر، قید یا عذاب بہر حال ''مع قارون'' ہوگا جس نے اپنے کو بھلائی کی راہ میں خرچ کرنے سے روکے رکھا ''وفرعون وهامان'' وہ وزراء جنہوں نے اس کی معصیت میں اضافہ کیا ''وابی بن خلف'' نبی کریم ﷺ کا دشمن جسے رسول پاک ﷺ نے احد کے دن اپنے ہاتھ سے قتل کیا، اور وہ مشرک تھا۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ جس نے نماز کی حفاظت کی تو وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوگا۔ ''رواه احمد والدارمی'' یعنی ان دونوں نے اپنی مسندوں میں نقل کیا ہے ''والبیهقی فی شعب الایمان'' اس میں جار مجرور خبر سے متعلق ہے۔ میرک نے منذری سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس روایت کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور امام طبرانی نے اوسط اور صغیر میں نقل کیا ہے اور امام احمد کی سند جید ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بے نمازی کو کافر سمجھتے

۵۷۹ : وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ شَقِيْقٍ قَالَ كَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَايَرَوْنَ شَيْئًا مِّنَ الْاَعْمَالِ تَرْكُهٗ كُفْرٌ غَيْرَ الصَّلَاةِ . (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥/١٥ حديث رقم ٢٦٢٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن شقیق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کے صحابہؓ تمام اعمال میں سے صرف نماز ہی ایک ایسا عمل تھا جس کے ترک کرنے والے کو کافر سمجھتے تھے۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن شقیق ۔عبداللہ بن شقیق کی کنیت ''ابوعبدالرحمٰن'' ہے۔بنوعقیل میں سے ہیں۔آپ کا وطن بصرہ ہے۔مشہور قابل اعتماد(ثقہ) تابعین میں سے ہیں۔حضرت عثمان حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث کی سماعت کی اور جریری نے ان سے روایت کی۔

تشریح: ''قال: كان اصحاب رسول الله ﷺ لايرون ''يرون' رأی سے ماخوذ ہے یعنی یہ نہیں سمجھتے تھے ''شيئا'' یہ مفعول ہے ''من الأعمال'' یہ اس کی صفت ہے ''تركه كفر'' یہ جملہ بھی صفت ہے ''غير الصلاة'' یہ استثناء ہے اور مستثنیٰ منہ وہ ضمیر ہے جو شیئاً کی جانب راجع ہے، یہ بقول علامہ طیبی کے ہے۔ضمیر سے مراد نماز کا ترک ہے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے خیال کے مطابق شیئا کی صفت کوئی اور چیز بھی ہوسکتی ہے مگر یہ بعید از قیاس ہی نہیں بلکہ غیر مفید بھی ہے۔حدیث میں حصر اس بات کی طرف دال ہے کہ ان کے ہاں نماز کا ترک کرنا مزید بڑا گناہ اور کفر کی قربت کا باعث تھا۔''رواه الترمذی''۔

بے نمازی سے اللہ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے

۵۸۰ وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ اَوْصَانِيْ خَلِيْلِيْ اَنْ لَّا تُشْرِكَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَاِنْ قُطِعْتَ وَحُرِّقْتَ وَلَا تَتْرُكَ صَلَاةً مَكْتُوْبَةً مُتَعَمِّدًا فَمَنْ تَرَكَهَا مُتَعَمِّدًا فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ الذِّمَّةُ وَلَا تَشْرَبَ الْخَمْرَ فَاِنَّهَا مِفْتَاحُ كُلِّ شَرٍّ. (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجة فی السنن ۲/۱۳۳۹ حديث رقم ۳۴۰۔

ترجمہ: حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میرے دوست یعنی رسول اللہ ﷺ نے مجھے یہ وصیت فرمائی تھی کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنانا اگرچہ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر کے جلا کیوں نہ دیا جائے اور جان بوجھ کر فرض نماز نہ چھوڑنا کیونکہ جس نے نماز جان بوجھ کر چھوڑی تو اس سے ذمہ داری ختم ہوگئی اور شراب نہ پینا کیونکہ یہ ہر برائی کی چابی ہے۔اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''وعن ابی الدرداء قال: اوصانی خلیلی ''امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں چونکہ یہ روایت وصیت میں انتہا اور اخلاق کی طہارت میں جامع ہے تو اسی کے پیش نظر حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے ''رسول اللہ ﷺ'' کی بجائے ''خلیلی'' کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس میں لطف و کرم اور شفقت کی انتہا کا بھی اظہار ہے ''ان لاتشرك'' جزم و یقین کے ساتھ، اس میں اَن مفسرہ ہے کیونکہ اوصی میں قول کا معنی پایا جاتا ہے اور اس میں حرفِ لا نہی کے لئے ہے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اصل میں عبارت یوں تھی: قال اوصیك بأن لاتشرك ،اس میں اَن مفسرہ ہے، کیونکہ اوصی میں قول کا معنی پایا جاتا ہے اور حرفِ لا نافیہ ہے۔''بالله شيئا'' یعنی دل و زبان سے اللہ کے ساتھ شریک نہ کرنا اگرچہ مجبوری کی حالت میں ہو، یہ بات بالافضل ہے۔اس سے وہ اعتراض بھی جاتا رہا کہ جس میں کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب قتل اور جلائے جانے کے خوف کی

حالت میں کلمہ شرک کہنا جائز نہیں تو دیگر احوال میں کب جائز ہوگا؟ کیونکہ ہم اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرتے کہ یہ صورت اس حدیث میں داخل ہے، کیونکہ کلمہ شرک کا تلفظ باعث شرک نہیں ہوتا جیسا کہ کلمہ کفر حالت اکراہ میں باعث کفر نہیں ہوتا، چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ یہ اس مسئلے کی صریح دلیل ہے،''وان قطعت'' تخفیف اور تشدید دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے''وحرقت'' صرف تشدید کے ساتھ''ولاتترك صلٰوة مكتوبة'' کیونکہ یہ ام العبادات ہی نہیں بلکہ سیئات کی راہ میں رکاوٹ بھی ہے''فمن تركها متعمدا'' اس میں خطا، نسیان، نوم، ضرورت اور عدمِ قدرت سے احتراز ہے''فقد برئت منه الذمة'' بقول علامہ طیبی یہ تغلیظاً کفر سے کنایہ ہے، یا پھر اس میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ ایسا شخص قتل اور تعزیر سے مامون ومحفوظ رہے گا''ولا تشرب الخمر'' التقاءِ ساکنین کی وجہ سے باء کے کسرہ کے ساتھ ''فانها مفتاح كل شر'' یہ اس عقل کو بھی لے جاتی ہے جو تمام بھلائیوں کی بنیاد ہے، اسی وجہ سے شراب کو ام الخبائث کہا گیا ہے''رواه ابن ماجة''، بقولِ میرک اسے امام بیہقی رحمہ اللہ نے بھی نقل کیا ہے۔

بَابُ الْمَوَاقِيْتِ

نمازوں کے اوقات کا بیان

جو کہ نماز کی شرائط میں سے ہے اور یہ میقات کی جمع ہے، جس کا معنیٰ ہوتا ہے''وقت معین''۔(ابن ہمام)

عرضِ مرتب:

مواقیت۔ایک قول کے مطابق میقات کی جمع ہے دوسرے قول کے مطابق مواقیت۔ وقت کی جمع ہے خلاف قیاس۔معنی دونوں کا ایک ہے۔بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ مطلق وقت کو زمانہ کہتے ہیں اور جو وقت کسی خاص عمل اور فعل کے لئے مقدر ہو اس کو میقات کہتے ہیں۔

پانچ اوقات کی حکمت:

جب انسان رات کو سوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتوں کا شکر یہ ادا کرنے سے قاصر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی تلافی کے لئے فجر کی نماز فرض کردی۔پھر انسان اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوتوں سے کسب معاش کرتا ہے اور دن کی روشنی میں اعمال کرتا ہے اور رزق حلال کماتا ہے اس نعمت کے شکریہ کے لئے نماز ظہر فرض کی گئی۔پھر انسان عموماً قیلولہ کرتا ہے، اس کی وجہ سے عبادت اور ذکر میں کوتاہی ہوئی اس کے ازالہ کے لئے نماز عصر فرض کردی گئی تاکہ اس کوتاہی کا تدارک ہوسکے۔عصر کے وقت انسان کی مصروفیت اور مشغولیت بہت زیادہ ہوجاتی ہے انسان غفلت کا شکار ہوجاتا ہے۔ان تقصیرات کے ازالہ کے لئے نماز مغرب فرض کی گئی۔پھر جب انسان آفات سے بچ کر اپنے حسن انجام تک پہنچ گیا تو بطور شکر عشاء کی نماز فرض کردی گئی۔

اَلفصلُ الاوّل:

پانچ نمازوں کے اوقات

۵۸۱ :عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَقْتُ الظُّهْرِ اِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ وَكَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطُوْلِهٖ مَالَمْ يَحْضُرِ الْعَصْرُ وَوَقْتُ الْعَصْرِ مَالَمْ تَصْفَرَّ الشَّمْسُ وَوَقْتُ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ مَالَمْ يَغِبِ الشَّفَقُ وَوَقْتُ صَلَاةِ الْعِشَاءِ اِلٰى نِصْفِ اللَّيْلِ الْاَوْسَطِ وَوَقْتُ صَلَاةِ الصُّبْحِ مِنْ طُلُوْعِ الْفَجْرِ مَالَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ فَاِذَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ فَاَمْسِكْ عَنِ الصَّلٰوةِ فَاِنَّهَا تَطْلُعُ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ . (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فى صحيحه ٤٢٨/١ حديث رقم (١٧٣-٦١٢) وأخرجه أبوداوٗد مختصرا فى السنن ٢٨٠/١ حديث رقم ٣٩٦ـ وكذلك النسائى فى السنن ٢٦٠/١ حديث رقم ٥٢٢ـ وأيضاً أحمد فى مسنده ٢١٣/٢

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ظہر کا وقت زوال شمس سے شروع ہوتا ہے اور اس کا آخری وقت اس وقت تک رہتا ہے کہ آدمی کا سایہ اس کے طول کے برابر ہو جائے اور عصر کا وقت اس وقت تک رہتا ہے جب تک کہ سورج زرد نہ ہو جائے اور مغرب کی نماز کا وقت اس وقت تک رہتا ہے جب تک کہ شفق غائب نہ ہو جائے اور عشاء کی نماز کا وقت نصف لیل تک رہتا ہے اور نماز فجر کا وقت طلوع فجر سے لے کر طلوع شمس تک رہتا ہے جب سورج طلوع ہو جائے تو نماز سے باز رہو کیونکہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان سے طلوع ہوتا ہے۔اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''**عن عبدالله بن عمرو**'' واو کے ساتھ ''**قال قال رسول الله ﷺ وقت الظهر**'' اس کو ظہر اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ پہلی نماز ہے جو ظاہر کر کے (یعنی روشنی میں) پڑھی جاتی ہے یا پھر اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی ادائیگی بوقت ظہر ہوتی ہے۔مراد اولِ وقت ہے۔''**اذا زالت الشمس**'' یعنی جب وسطِ آسمان اور خط استواء سے مغرب کی جانب جھک جائے اور وہ یوں کہ استواء کا سایہ مشرق کی جانب ظاہر ہونے لگے ''**و کان**'' یعنی ہو جائے ''**ظل الرجل کطوله**'' یعنی اس کے قریب قریب۔امام طیبی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ یہ روایت مسلم شریف اور حمیدی کی کتاب میں تو مذکور ہے لیکن مصابیح میں مذکور نہیں ہے سوائے ''**مالم یحضر العصر**'' کے، تو اس صورت میں مصابیح کی عبارت پر تو کوئی اعتراض ہوتا ہی نہیں، باقی جو عبارت مشکوٰۃ میں ہے تو اس سلسلہ میں امام ابہری کا کہنا ہے کہ **مالم یحضر** بیان اور تاکید ہے **و کان** کے لئے الخ۔پھر سایہ سے مراد سایہ حادث ہے یا پھر مطلق سایہ، اسی کے مناسب **مالم یحضر العصر** کا جملہ ہے یعنی عصر کا وقت اور وہ آدمی کی لمبائی کے بقدر ظل حادث کا وقت ہوتا ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ایک انوکھی بات کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہاں سایہ سے مراد فیءالزوال ہی ہے اور یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ یہی انتہاءِ نقص میں غالب اور زیادتی کے حصول میں ابتدا ہے، اسی وجہ سے رسول پاک ﷺ نے اسی پر اقتصار کیا ہے، ورنہ تو بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں سرے سے سایہ ہوتا ہی نہیں جیسے مکہ اور

صنعاء وغیرہ۔علاقہ جات کے اختلاف کے باعث سایہ استواء کی مقدار میں بھی اختلاف ہے، اسی وجہ سے طول بلد اور عرض کے اختلاف کی وجہ سے فقہاء کا اس کی تفصیل میں اختلاف ہے جیسا کہ اہل مواقیت کا اس میں اختلاف ہے۔ابن الملک کا کہنا ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اِن دونوں کے اوقات میں کوئی فاصلہ مشترک نہیں، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ظہر کو آخر وقت تک مؤخر کیا جاسکتا ہے۔ جب کہ امام مالک کا خیال ہے کہ سایہ کے اضافہ کی جگہ سے جب اس چیز کا سایہ اس کے مثل ہوجائے تو چار رکعت کے بقدر وقت ان میں مشترک ہے۔امام طیبی رحمہ اللہ کا فرمانا ہے کہ یعنی ظہر اور عصر کے درمیان، کیونکہ جبریل علیہ السلام نے عصر کی نماز پہلے دن پڑھائی اور دوسرے دن اسی وقت میں ظہر کی نماز پڑھائی، اسی حدیث کی بناء پر امام شافعی رحمہ اللہ نے ایسے وقت میں جب کہ ہر شے کا سایہ اس کے مثل ہو چکا ہو تو ظہر کی تاخیر آخر وقت تک اور عصر کی تعجیل اول وقت تک کی تاویل کر لی ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ وقت چار رکعتوں کی بقدر وقت میں پھیلا ہوا نہیں ہے، لہٰذا کسی تاویل کی ضرورت درکار تھی اور مذکورہ بالا تاویل بقیہ نمازوں پر قیاس کرتے ہوئے اولیٰ ہے۔اس کی مزید تحقیق آگے آئے گی۔

''ووقت العصر'' یعنی عصر کا وقت اس وقت داخل ہوجاتا ہے کہ جب انسان کا سایہ اس کے طول کے برابر ہوجائے اور بلا کراہت جاری وساری رہتا ہے **''مالم تصفر''** راءِ مشددہ کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ **''الشمس''** اس سے مراد وقت اختیار ہے، کیونکہ صحیحین میں نبی پاک ﷺ سے روایت ہے کہ جس نے سورج غروب ہونے سے قبل عصر کی نماز کی ایک رکعت بھی پالی تو گویا اس نے عصر کی نماز پالی۔مسلم شریف کی روایت کے الفاظ کچھ یوں ہیں: **مالم تصفر الشمس وسقط قرنها الاول۔**
ابن الملک کا کہنا ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دال ہے کہ نمازِ عصر وقت اصفرار تک مؤخر کرنا مکروہ ہے۔

''ووقت صلاۃ المغرب'' کچھ مقامات پر لفظ صلاۃ کو حذف کر دیا اور کچھ جگہ ذکر کر دیا' اس میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ انہیں دونوں طرح بولنا جائز ہے **''ما لم یغب''** مصابیح میں **مالم یسقط** کے الفاظ ہیں **''الشفق''** یہ وہ سرخی ہے جو امام شافعی' امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے مذہب کے مطابق سورج غروب ہونے کے بعد آتی ہے اور یہی روایت منقول ہے ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے اسی پر فتویٰ ہے، جب کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے خیال کے مطابق یہ وہ سفیدی ہے جو سرخی کے بعد رونما ہوتی ہے اور یہی خیال ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اور شیخ عبد العزیز اور امام اوزاعی رحمہ اللہ کا بھی یہی کہنا ہے، یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مغرب کا وقت شفق کے ڈھل جانے تک باقی رہتا ہے، اگر کچھ شفق ڈھل جائے تو عشاء کی نماز کا وقت داخل نہیں ہوتا جیسا کہ سورج کچھ غروب ہوجائے تو مغرب کی نماز کا وقت شروع نہیں ہوتا۔ابن الملک کے بقول مغرب کی نماز کو آخر وقت تک مؤخر کرنے میں اتنی کراہت نہیں جتنی کہ عصر کو مؤخر کرنے میں کراہت ہے۔امام طیبی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ: **مالم یسقط الشفق** میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ مغرب کا وقت غروب شفق تک جاری وساری رہتا ہے اور یہی قدیم مذہب ہے امام شافعی رحمہ اللہ کا اور امام ثوری، احمد، اسحاق اور اصحابِ رائے کا بھی یہی خیال ہے۔جب کہ امام مالک، امام اوزاعی، ابن المبارک اور امام شافعی رحمہ اللہ کا جدید قول یہ ہے کہ مغرب کا وقت نہایت تنگ ہے، کیونکہ جبرائیل علیہ السلام نے دونوں مغرب کی نماز ایک ہی وقت میں پڑھائی تھی اور یہ وقت صرف وضوء' اذان' اقامت اور درمیانے درجے کی پانچ رکعات کے برابر ہے اور بس!

اس بات پر اجماع ہے کہ سورج غروب ہونے کے ساتھ مغرب کی نماز کا وقت شروع ہوجاتا ہے، گویا کہ یہاں مغرب

کے لفظ پر ہی اکتفا کیا گیا ہے اور اس کے وقت آغاز میں کوئی امتداد نہیں، بخلاف شیعہ حضرات کے، انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ستاروں کے گتھ متھ ہونے کے وقت مغرب کی نماز ادا کی، یہ روایت باطل ہے۔ صحیح روایت میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''میری امت اس وقت تک فطرت پر قائم رہے گی جب تک کہ وہ اشتباک نجوم تک مغرب کو مؤخر نہ کرے گی''۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے مغرب کی نماز کی تاخیر بھی منقول ہے' لیکن یہ صرف جواز پر مبنی ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کچھ علماء سے یہ بات نقل کی ہے کہ مغرب کی نماز کو اول وقت سے مؤخر کرنا مکروہ ہے، جب کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا خیال بھی کچھ یوں ہی ہے۔ اور یہی دلیل ہے ان کے خلاف امام شافعی رحمہ اللہ کے قولِ جدید کو اختیار کرنے اور اس کی تصحیح کی۔

''**ووقت صلاة العشاء**'' یعنی بالاجماع شفق کے فوراً بعد ''**الی نصف اللیل الاوسط**'' یہاں بھی مراد وقت اختیار ہے، کیونکہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ عشاء کی نماز کا وقت صبح صادق کے طلوع ہونے تک ہے، جیسا حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نیند میں کوئی تفریط نہیں، تفریط تو بیداری میں ہے کہ ایک نماز کو اتنا مؤخر کیا جائے کہ دوسری نماز کا وقت شروع ہو جائے'' یہ حدیث صبح میں خاص جب کہ دیگر اوقات میں عموم پر ہی ہے، یہ باتیں امام طیبی رحمہ اللہ کی نقل کردہ ہیں۔ امام ابہری رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ اس روایت سے ابوسعید اصطخری نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ عشاء کی نماز کا وقت نصف شب تک ہے، جب کہ دیگر علماء کے خیال کے مطابق یہ حدیث وقت اختیار پر محمول ہے، رہی بات وقت جواز کی تو وہ طلوع فجر تک ہے، مزید فرمایا کہ **الاوسط** صفت ہے **اللیل** کی یعنی درمیانے درجے کی رات جو نہ تو زیادہ طویل ہو اور نہ ہی زیادہ مختصر، لہٰذا درمیانے درجے کی رات کا نصف' مختصر رات کے نصف کی بہ نسبت زیادہ ہوگا جب کہ طویل رات کی بہ نسبت کم ہوگا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ **الاوسط** صفت ہے **النصف** کی' یعنی رات کا کل نصف، یہی تمام فقہاء کی قطعی رائے ہے۔ پہلا قول اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ عشاء کی نماز مختصر رات میں چھ گھنٹے تک مؤخر کی جاسکتی ہے اور یہ رات کی دو تہائی ہوگی، اور لمبی رات میں سات گھنٹے مؤخر کی جاسکتی ہے اور یہ رات کا ثلث ہوگا اور اس کا عکس احری اور الیق ہے۔ یعنی مشقت سے بچنے کے لئے۔ امام ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر میری امت پر شاق نہ گذرتا تو میں اسے یہ حکم دیتا کہ عشاء کی نماز کو ثلث لیل یا نصف لیل تک مؤخر کرو'' اور امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ ثلثِ لیل سے مراد گرمیوں کی رات کا ثلث اور سردیوں کی رات کا نصف ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

''**ووقت صلاة الصبح من طلوع الفجر**'' یعنی صبحِ صادق سے ''**مالم تطلع الشمس**'' یعنی سورج کا کچھ حصہ ''**فاذا طلعت**'' یعنی طلوع ہونے لگے ''**فامسك عن الصلٰوة**'' یعنی چھوڑ دو (نماز سے رک جاؤ) ''**فانها**'' یعنی سورج ''**تطلع بین قرنی الشیطان**'' یعنی شیطان کے سر کے دو اطراف کے بیچ میں سے، اور وہ اس وجہ سے کہ شیطان طلوعِ شمس کے وقت کا منتظر رہتا ہے، پھر جو لوگ سورج کو سجدہ کرتے ہیں ان کا استقبال کرنے کے لئے وہ سورج کی جانب منہ کر کے کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ جو لوگ سورج کو سجدہ کر رہے ہیں ان کی عبادت گویا شیطان کی عبادت بن جائے، چنانچہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس وقت میں نماز ادا کرنے سے روک دیا، تاکہ شیطان کی عبادت کے اوقات اور بندوں کی عبادت میں تمیز ہو جائے۔ اس وقت میں عبادت سے روکنے میں اس بات کا احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ کہیں اس وقت عبادت شیطان کی عبادت کے مشابہ نہ

ہو جائے۔ شیطان کے سینگوں سے مراد کیا ہے؟ اس بارے میں ایک قول کے مطابق شیطان کے وہ دو گروہ ہیں جو شب و روز آتے جاتے ہیں، جب کہ ایک قول کے مطابق شیطان کے وہ دو لشکر ہیں جو شیطان اس وقت لوگوں کو ورغلانے کے لئے بھیجتا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ صرف سینگوں والے جانوروں سے تشبیہ ہے، کیونکہ جانوروں کو کسی چیز کی سمجھ نہیں ہوتی اور شیطان بھی حق کو سمجھنے سے عاری ہے۔ امام طیبی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ مختار پہلا قول ہے "رواہ مسلم"۔ میرک کا کہنا ہے کہ اس روایت کو امام ابوداود اور امام نسائی نے بھی نقل کیا ہے لیکن انہوں نے "فاذا طلعت الشمس...... "عبارت ذکر نہیں کی۔

اوقاتِ صلوٰۃ کے بارے میں مسائل

۵۸۲ : وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ اِنَّ رَجُلاً سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ وَقْتِ الصَّلاَةِ فَقَالَ لَهٗ صَلِّ مَعَنَا هٰذَيْنِ يَعْنِي الْيَوْمَيْنِ فَلَمَّا زَالَتِ الشَّمْسُ اَمَرَ بِلَالاً فَاَذَّنَ ثُمَّ اَمَرَهٗ فَاَقَامَ الظُّهْرَ ثُمَّ اَمَرَهٗ فَاَقَامَ الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ بَيْضَاءُ نَقِيَّةٌ ثُمَّ اَمَرَهٗ فَاَقَامَ الْمَغْرِبَ حِيْنَ غَابَتِ الشَّمْسُ ثُمَّ اَمَرَهٗ فَاَقَامَ الْعِشَاءَ حِيْنَ غَابَ الشَّفَقُ ثُمَّ اَمَرَهٗ فَاَقَامَ الْفَجْرَ حِيْنَ طَلَعَ الْفَجْرُ فَلَمَّا اَنْ كَانَ الْيَوْمُ الثَّانِيْ اَمَرَهٗ فَاَبْرَدَ بِالظُّهْرِ فَاَبْرَدَ بِهَا فَاَنْعَمَ اَنْ يُبْرِدَ بِهَا وَصَلَّى الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ اَخَّرَهَا فَوْقَ الَّذِيْ كَانَ وَصَلَّى الْمَغْرِبَ قَبْلَ اَنْ يَغِيْبَ الشَّفَقُ وَصَلَّى الْعِشَاءَ بَعْدَ مَا ذَهَبَ ثُلُثُ اللَّيْلِ وَصَلَّى الْفَجْرَ فَاَسْفَرَ بِهَا ثُمَّ قَالَ اَيْنَ السَّائِلُ عَنْ وَقْتِ الصَّلاَةِ فَقَالَ الرَّجُلُ اَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَقْتُ صَلَاتِكُمْ بَيْنَ مَارَأَيْتُمْ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٤٢٨ حديث رقم (١٧٦-٦١٣) وأخرجه النسائي في السنن ١/٢٥٨ حديث ٥١٩ وأخرجه أحمد في المسند ٥/٣٤٩۔

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے نماز کے وقت کے بارے میں سوال کیا کہ نماز کے وقت کی ابتداء اور انتہاء کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان دو دنوں میں تم ہمارے ساتھ نماز پڑھو چنانچہ جب سورج ڈھل گیا تو آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا۔ حضرت بلالؓ نے اذان دی۔ پھر آپ ﷺ نے انہیں تکبیر کہنے کا حکم دیا انہوں نے نماز ظہر کی تکبیر کہی اور آپ ﷺ نے نماز پڑھائی۔ پھر آپ ﷺ نے عصر کی اقامت کا حکم دیا جب کہ سورج بلند سفید اور صاف تھا۔ پھر مغرب کی اقامت کا حکم دیا جب کہ سورج غروب ہو گیا تھا پھر عشاء کی اقامت کا حکم دیا جب کہ شفق غائب ہو گئی تھی پھر فجر ظاہر ہوتے ہی آپ ﷺ نے اقامت کا حکم دیا پہلے دن آپ ﷺ نے تمام نمازیں اول وقت میں پڑھا کر دکھائیں پھر جب دوسرا دن ہوا تو آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو ظہر ٹھنڈا کر کے اذان دینے کا حکم دیا اور اچھی طرح ٹھنڈا کر کے ظہر کی نماز کو ادا کیا اور عصر کی نماز اس وقت پڑھائی جب کہ سورج بلند تھا لیکن گزشتہ کل کے وقت سے دیر کر کے نماز پڑھائی اور عشاء کی نماز ثلث لیل گزر جانے تک پڑھائی اور فجر کی نماز اچھی طرح روشنی ہو جانے کے وقت پڑھائی اور اس کے بعد فرمایا کہ نمازوں کے اوقات دریافت کرنے والا آدمی کہاں ہے تو اس آدمی نے کہا

اے اللہ کے رسول ﷺ میں حاضر ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری نمازوں کے اوقات ان اوقات کے درمیان ہیں جو تم دیکھ چکے ہو۔ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''عن بریدۃ'' یعنی ابن الحصیب، ان کا تعلق قبیلہ بنو اسلم سے ہے، یہ بدر میں تو شریک نہیں ہوئے تھے لیکن بیعت رضوان میں شریک تھے، خراسان میں غازی بن کر گئے اور ان کا انتقال مرو مقام پر ہوا، جہاں ان کے پیشرو بھی موجود تھے، یہ امام طیبی رحمہ اللہ کا قول ہے، ''قال: ان رجلا سأل رسول اللہ ﷺ عن وقت الصلاۃ'' یعنی پانچوں نمازوں کے اوقات کیا ہیں؟ ''فقال له: صل معنا هذين يعني اليومين'' یعنی دو دن ہمارے ساتھ نمازیں پڑھو تا کہ تمہیں بالمشاہدہ تمام نمازوں کے اول اوقات اور آخر اوقات معلوم ہو جائیں اور یہ بھی پتہ چل جائے کہ فضیلت والا اور بہتر وقت کون سا ہے اور ''فلما زالت الشمس'' یعنی حد استواء سے ڈھل گیا ''امر بلالا'' یعنی بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم دیا ''فاذن ثم امرہ'' یعنی اقامت کا حکم دیا، یہاں ثم حرفِ عطف استعمال کیا گیا کیونکہ اذان و اقامت کے درمیان کچھ دیر کی مہلت ہوتی ہے تا کہ لوگ جمع ہو جائیں اور سنت ادا کی جا سکیں ''فاقام الظھر'' یہ منصوب بنزع الخافض ہے، یعنی ظہر کے لئے ''ثم امر فاقام العصر'' یعنی عصر کی نماز کے لئے اقامت کے الفاظ استعمال کئے اور وقت کے الفاظ نہیں کئے، کیونکہ وقت تو ظاہر ہو چکا تھا اور اس میں اذان بھی دی جا چکی تھی اور اس کے بعد والی نمازوں میں بھی یہی صورت ہے ''والشمس مرتفعۃ'' یہ جملہ حالیہ ہے یعنی عصر کی نماز اول وقت میں ادا کی ''بیضاء'' رفع کے ساتھ یا تو صفت ہے یا دوسری خبر ہے یعنی وہ ایسی سفیدی تھی کہ جس میں زردی مخلوط نہ تھی ''نقیۃ'' یعنی زردی سے پاک وصاف ''ثم امرہ فاقام المغرب'' یعنی مغرب کی نماز کے لئے ''حین غابت الشمس'' یعنی جب اس کا غائب (غروب) ہونا یقینی ہو گیا ''ثم امرہ فاقام العشاء حین غاب الشفق، ثم امرہ فاقام الفجر'' یعنی فجر کی نماز کے لئے ''حین طلع الفجر'' یعنی صبح صادق ''فلما ان'' یہ اَن زائدہ ہے ''کان'' تامہ ہے یعنی وجد کے معنی میں ''الیوم الثانی'' یعنی اس کا اکثر حصہ ''امرہ'' یہ لما کا جواب ہے یعنی ٹھنڈا کرنے کا حکم دیا ''فابرد بالظھر'' امر کے صیغہ کے ساتھ یعنی پھر فرمایا کہ ظہر کو ٹھنڈا کر، ایک نسخہ میں فابرد امر کا صیغہ ہے، یعنی پھر ابراد کا حکم دیا، تو اس وقت یہ حکم کی تاکید اور تفسیر ہو جائے گی ''فابرد'' یعنی بلال نے ''بھا'' یعنی ظہر کی نماز کو ''فانعم'' یعنی انہوں نے اچھی طرح وقت کو ٹھنڈا ہونے دیا ''ان یبرد بھا'' کہا جاتا ہے احسن الی فلان وانعم یعنی اس کے ساتھ خوب اچھی طرح سے احسان کا معاملہ کرو، مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ظہر کی نماز کے لئے وقت کو خوب ٹھنڈا ہونے دیا اور اول وقت سے کافی تاخیر کر دی کہ یہاں تک کہ گرمی کی شدت ٹوٹ گئی۔ الفائق کے مطابق ابراد کا مطلب دخول فی البرد ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے اظھرنا اور اس میں باء تعدیہ کے لئے ہے' یعنی ظہر کی نماز کو ٹھنڈک میں داخل کر دو۔ علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ امام طیبی کے خیال کے مطابق ابراد کا مطلب ہے کہ زوالِ فے خوب ہو جائے اور گرمی کی شدت ٹوٹ جائے تو یہ برد ہے ''وصلی العصر والشمس مرتفعۃ۔ اخرھا'' تشدید کے ساتھ، یعنی عصر کی نماز کے دوسرے دن میں ''فوق الذی'' یعنی وہ تاخیر ''کان'' یہ وجد کے معنی میں ہے ''فی الیوم الاول'' وہ یوں کہ جب ہر چیز کا سایہ ایک مثل کے برابر ہو گیا' جیسا کہ دوسری روایات میں اس کی تفصیل موجود ہے، یا پھر یوں فرض کر لیا جائے کہ گذشتہ دن ظہر کی نماز کو اس وجہ سے مؤخر کیا کہ کل کی عصر ظہر سے تو مؤخر تھی مگر اپنے وقت سے مؤخر نہ تھی ''وصلی المغرب قبل ان یغیب الشفق'' یعنی آخر وقت میں ادا کی، یہ حدیث امام شافعی اور امام مالک رحمہ اللہ کی

مغرب کے وقت کے تنگ ہونے پر دلیل ہے"وصلی العشاء بعد ما ذهب ثلث الليل "شاید کہ رات کے آخری حصے تک مؤخر نہیں کیا، اور یہ وقت جواز ہے، کیونکہ اس سے غیر کے حق میں کراہت لازم آتی ہے اور اس سے جہاں ساری رات جاگنے کا حرج لازم آتا ہے وہاں عشاء کی نماز سے قبل سونے کی کراہت بھی لازم آتی ہے"وصلی الفجر فاسفر بها"یعنی وقت اسفار جب آ گیا تب فجر کی نماز ادا کی، بھا میں باء تعدیہ کے لئے ہے یعنی جب صبح خوب روشن ہوگئی۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یعنی فجر کی نماز کو فجرِ ثانی تک مؤخر کیا۔ ذکرہ میرک۔ انہوں نے مزید آگے چل کر یوں لکھا ہے کہ اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فجر کی نماز کو فجرِ اول کے وقت ادا کرنا جائز ہے۔"ثم قال: این السائل عن وقت الصلاۃ؟ فقال الرجل: انا" یعنی سائل نے کہا میں ہوں، یا یوں کہا کہ میں سائل ہوں، یا یوں کہا میں ہوں یہاں، ظاہر ہے کہ پہلا جواب سوال کے بالکل مطابق ہے "یارسول الله، قال: وقت صلاتكم "ہوسکتا ہے کہ جمع کی ضمیر لا کر اس بات کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہو کہ یہ حکم عام ہے "بين مارأيتم "یعنی یہ درمیانہ وقت ہے، اس میں جلدی کر کے نہ تو افراط سے کام لیا جائے اور نہ ہی تاخیر کر کے تفریط سے کام لیا جائے۔ قالہ ابن الملک۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ میں نے اپنے فعل سے نمازوں کے اول و آخر اوقات بیان کر دیئے ہیں اور نماز جس طرح اول وقت میں جائز ہے اسی طرح درمیانے اور آخری وقت میں بھی جائز ہے، یہاں آخر وقت سے مراد آخری وقت اختیار ہے نہ آخری وقت جواز، کیونکہ ظہر کی نماز وقت کے مکمل ٹھنڈا ہو جانے کے بعد عصر کا وقت داخل ہونے سے پہلے پہلے بھی جائز ہے، اور عصر کی نماز سورج غروب ہونے تک مؤخر کرنا جائز ہے، اور مغرب کی نماز کو ایک قول کے مطابق شفق کے غروب ہونے تک مؤخر کرنا جائز ہے، اور عشاء کی نماز کو طلوعِ فجر سے پہلے تک مؤخر کرنا جائز ہے، اور فجر کی نماز کو اسفار کے بعد سورج طلوع ہونے تک مؤخر کرنا جائز ہے۔ قالہ الطیبی۔ مغرب کی نماز کو آخر وقت جواز میں ادا کرنے میں کچھ نظر ہے۔"رواه مسلم "امام ترمذی رحمہ اللہ نے العلل میں بخاری سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ ذکرہ میرک۔

الفصل الثانی:

امامتِ جبرائیل علیہ السلام

۵۸۳ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَمَّنِیْ جِبْرِيْلُ عِنْدَ الْبَيْتِ مَرَّتَيْنِ فَصَلّٰى بِيَ الظُّهْرَ حِيْنَ زَالَتِ الشَّمْسُ وَكَانَتْ قَدْرَ الشِّرَاكِ وَصَلّٰى بِيَ الْعَصْرَ حِيْنَ صَارَ ظِلُّ كُلِّ شَيْءٍ مِثْلَهٗ وَصَلّٰى بِيَ الْمَغْرِبَ حِيْنَ اَفْطَرَ الصَّائِمُ وَصَلّٰى بِيَ الْعِشَاءَ حِيْنَ غَابَ الشَّفَقُ وَصَلّٰى بِيَ الْفَجْرَ حِيْنَ حَرُمَ الطَّعَامُ وَالشَّرَابُ عَلَى الصَّائِمِ فَلَمَّا كَانَ الْغَدُ صَلّٰى بِيَ الظُّهْرَ حِيْنَ كَانَ ظِلُّهٗ مِثْلَهٗ وَصَلّٰى بِيَ الْعَصْرَ حِيْنَ كَانَ ظِلُّهٗ مِثْلَيْهِ وَصَلّٰى بِيَ الْمَغْرِبَ حِيْنَ اَفْطَرَ الصَّائِمُ وَصَلّٰى بِيَ الْعِشَاءَ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ وَصَلّٰى بِيَ الْفَجْرَ فَاَسْفَرَ ثُمَّ الْتَفَتَ اِلَيَّ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ هٰذَا وَقْتُ الْاَنْبِيَاءِ

مِنْ قَبْلِكَ وَالْوَقْتُ مَابَيْنَ هٰذَيْنِ الْوَقْتَيْنِ۔ (رواہ ابوداود والترمذی)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۲۷۴/۱ حدیث رم ۳۹۳۔وأخرجه الترمذی فی السنن ۲۷۸/۱ حدیث رقم ۱۴۹ وقال حدیث حسن صحیح وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۲۱۹/۱ حدیث رقم ۶۶۷۔وأخرجه أحمد فی مسنده ۳۳۳/۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ حضرت جرائیل علیہ السلام نے امام بن کر بیت اللہ کے نزدیک مجھے دومرتبہ نماز پڑھائی یعنی دودن۔ پہلے دن جب سورج کا زوال ہوگیا اور سایہ تسمے کے مثل تھا تو مجھے ظہر کی نماز پڑھائی اور جس وقت ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہوگیا تو مجھے عصر کی نماز پڑھائی اور جس وقت روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے اس وقت مجھے مغرب کی نماز پڑھائی اور جس وقت شفق غائب ہوگئی تو مجھے عشاء کی نماز پڑھائی اور جس وقت روزہ دار کے لیے کھانا پینا حرام ہوجاتا ہے تو مجھے فجر کی نماز پڑھائی اور جب دوسرا دن ہوا تو انہوں نے مجھے ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب کہ سایہ ہر چیز کا اس کے برابر ہوگیا اور مجھے عصر کی نماز اس وقت پڑھائی جب ہر چیز کا سایہ اس کے دومثل ہوگیا نماز مغرب اس وقت پڑھائی جب کہ روزہ دار افطار کرتا ہے پھر عشاء کی نماز اس وقت پڑھائی جب رات کا تیسرا حصہ گزرگیا اور فجر کی نماز اس وقت پڑھائی جب کہ اچھی طرح روشنی ہوگئی۔ پھر حضرت جرائیلؑ نے میری طرف متوجہ ہوکر کہا کہ یہ وقت آپ ﷺ سے پہلے نبیوں کی نماز کا ہے اور نماز ان دووقتوں کے درمیان ہے۔اس حدیث کو امام ابوداودؒ اور امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''عن ابن عباس قال:قال رسول الله ﷺ امنی ''میم کی تشدید کے ساتھ''جبریل ''جیم کے کسرہ،فتحہ اور یاء کے ساتھ،اور جبرئیل ہمزہ اور باء کے اضافہ کے ساتھ بھی درست ہے یعنی جبریل میرے امام بنے''عندالبیت''یعنی کعبہ کے پاس،امام شافعی رحمہ اللہ نے الام میں عند باب الکعبة نقل کیا ہے،جب کہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے عند باب البیت نقل کیا ہے''مرتین''یعنی دودن نماز پڑھائی تاکہ وہ مجھے نماز کی کیفیت اور اس کے اوقات کے بارے میں بتائیں ''فصلی بی''باء مصاحبت اور معیت کے لئے یعنی میرے ساتھ نماز پڑھی''الظهر''ایک قول کے مطابق ظہر سے آغاز کیا، حالانکہ نمازیں تو رات کو فرض ہوئی تھیں،اور قیاس اسی بات کا تقاضا کرتا ہے کہ سب سے پہلے فرض ہونے والی نماز فجر کی ہے، اس لئے کہ صبح کے اول میں خفاء ہے،اگر تفصیل فجر کی نماز کے بارے میں واقع ہوتی تو اس میں وہ ظہور نہ ہوتا جو ظہر کے وقت میں ہے،جب کہ اس میں اس بات کی جانب بھی اشارہ ہے کہ یہ دین تمام دیگر ادیان پر ظاہر ہوجائے گا اور چھا جائے گا اور یہ ظہر کی نماز تمام نمازوں سے ظاہر ہے،لیکن وجوب کی ادائیگی کیفیت کے علم پر موقوف ہے،اور کیفیت کا علم دوپہر ہی میں واقع ہوتا ہے تو سب سے پہلے فرض ہونے والی نماز ظہر کی ہوئی''حین زالت الشمس و کانت''کانت کی ضمیر شمس کی جانب راجع ہے،جب کہ اس سے مراد فےء زوال ہے،کیونکہ سورج کی ڈھلوان کا سبب فے زوال ہے،پس روایت میں بیان جواز بھی یہی ہے اور فے ایک قدر مشترک اور ایک سایہ ہے جو زوال کے بعد آتا ہے۔ابن السکیت کا قول ہے کہ ظل وہ ہوتا ہے جسے سورج نسخ کردے اور فے وہ ہوتا ہے جو سورج کو نسخ کردے،امام نووی رحمہ اللہ نے امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ ظل اور فے دو الگ الگ چیزیں ہیں،اس لئے کہ ظل صبح وشام کو شامل ہے اور اس کی اصل ستر (پردہ) ہے،یوں

کہا جاتا ہے: فلان في ظللك، جب کہ فے زوال کے بعد آتا ہے، اس لئے کہ یہ فاء من جانب الی جانب سے ماخوذ ہے یعنی فاء رجع کے معنی میں ہے اور فے رجوع کے معنی میں، اور یہ بات بھی معلوم ہوگئی ہے کہ ظل یعنی ستر عدمی نہیں بلکہ وجودی ہے جس کا ابدان وغیرہ میں فائدہ بھی ہے، باقی رہی وہ بات کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ وہ چیز ہے جسے سورج نسخ کر دیتا ہے یا یہ کہ یہ کوئی عدمی چیز ہے تو یہ درست نہیں، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جنت میں بھی سایہ ہوگا جیسا کہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے باوجودیکہ وہاں سورج ہی نہیں ہوگا، جب سورج نہیں ہوگا تو فے بھی نہیں ہوگا ''قدر الشراك'' مصابیح میں ہے کہ فے وہ سایہ ہے جو کمی سے اضافے کی جانب راجع ہو اور وہ زوال کے بعد شراک کی طرح ہو یعنی شراک النعل (جوتے کے تسمے) کی طرح، یہ بھی ایک اندازہ ہی ہے کیونکہ زوالِ شمس کا اندازہ صرف مشرق کی جانب جانے والے سائے سے ہی ہوتا ہے، زمانوں اور مکانوں کے مختلف ہونے سے سایہ بھی مختلف ہوتا رہتا ہے، چنانچہ ہر وہ شہر جو خط استوا سے اور معدل النہار سے قریب ہوگا تو اس میں سایہ بھی مختصر ہوگا اور ہر وہ شہر جو ان دونوں سے دور ہوگا وہاں سایہ بھی طویل ہوگا، کذا ذکرہ ابن الملک۔ جب کہ امام طیبی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ یہ وضاحت مکہ جیسے شہروں میں ہوگی کہ جہاں سایہ کم ہوتا ہے، چنانچہ دن میں جب سورج عینِ کعبہ کے اوپر ہو تو اس کے اطراف میں سایہ دکھائی نہیں دیتا۔

مطلب یہ ہے کہ ظہر کا وقت اس وقت شروع ہوگا جب کہ زوال کے بعد سایہ بڑھنا شروع ہو جائے ''**وصلی بی العصر حین صار ظل کل شیء مثله**'' یعنی بقول علامہ طیبی ظلِ زوال کے بعد، ابن الملک کے بقول اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہر چیز کا سایہ اس کے مثل سے کچھ نہ کچھ بڑھ جائے، جب کہ اس قول میں بحث ہے، ظاہر یہ ہے کہ ظل سے مراد ظل حادث ہے۔ ''**وصلی بی المغرب حین افطر الصائم**'' یعنی جب سورج غروب ہو جاتا ہے اور روزہ افطار کرنے کا وقت داخل ہو جاتا ہے اور رات شروع ہو جاتی ہے جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ج﴾ [البقرۃ:۱۸۷] ''اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو'' ایک روایت میں ہے: حین وجبت الشمس وافطر الصائم یہ عطف تفسیری ہے، کیونکہ سورج جب ڈھل کر غروب ہو جاتا ہے تو افطار کا وقت داخل ہو جاتا ہے، ساتھ ساتھ اس میں اس بات کی جانب بھی اشارہ ہے کہ روزہ کی افطاری نمازِ مغرب سے قبل ہونی چاہیے ''**وصلی بی العشاء حین غاب الشفق**'' یعنی شفقِ احمر مشہور قول کے مطابق ''**وصلی بی الفجر حین حرم الطعام والشراب علی الصائم**'' یعنی طلوع فجرِ ثانی کے آغاز کے وقت جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ [البقرۃ: ۱۸۷] ''اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے''۔ ''**فلما کان الغد**'' یعنی اگلے دن ''**صلی بی الظهر حین کان ظله**'' یعنی ہر چیز کا سایہ ''**مثله**'' یعنی اس کے لگ بھگ یعنی فے کے علاوہ۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ ظلِ زوال کے بعد مراد نہیں، تاکہ اس سے ظہر وعصر کا وقت واحد میں ہونا لازم نہ آئے۔ یہ قول توار دِ خاطر کے موافق ہے اور یہ تاویل قاضی کی تاویل سے بہتر ہے جو انہوں نے اس باب کی پہلی حدیث میں کی تھی۔

ایک روایت میں ہے جب کہ ہر شے کا سایہ اس کے مثل ہو جیسے گذشتہ کل کی عصر کا وقت یعنی نمازِ ظہر سے اس وقت فارغ ہوئے جس وقت کہ پہلے دن عصر کی نماز کا وقت شروع ہوا تھا، امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث اور اس کی تشریح سے اشکال بھی جاتا رہا کہ جس سے کچھ لوگوں نے دونوں نمازوں کا ایک ہی وقت ہونے کا خیال کیا ہے، اس کی دلیل مسلم شریف

کی وہ خبر ہے کہ جس میں فرمایا: وقت الظهر ما لم يحضر العصر۔ ''وصلى بى العصر حين كان ظله'' يعني ظل الشيء ''مثليه'' یعنی ظلِ استواء کے علاوہ ''وصلى بى المغرب حين افطر الصائم، وصلى بى العشاء الى ثلث الليل'' یعنی ثلث لیل کے اختتام پر۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں الی کو مع کے معنی میں لینا چاہئے، اس کی تائید ایک دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں فرمایا: ثم صلى العشاء الأخيرة حين ذهب ثلث الليل۔ یا پھر الی کو فی کے معنی میں لیا جائے جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ [النساء: ٨٧] ''وہ قیامت کے دن تم سب کو ضرور جمع کرے گا'' میں ہے: ''وصلى بى الفجر فأسفر'' یعنی خوب روشن کر کے یا اس وقت جب کہ وقت اسفار داخل ہو گیا ''ثم التفت'' یعنی جبریل علیہ السلام نے دیکھا: ''الى فقال يا محمد هذا'' یعنی مذکورہ اوقات خمسہ، یا پھر یہ اشارہ صرف اسفار کی طرف تھا ''وقت الانبياء من قبلك'' کیونکہ اوقات خمسہ کی حفاظت بہت مشکل ہے، یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو سایوں کی بخوبی رعایت رکھتا ہو اور نمازوں کے اوقات کا منتظر رہتا ہو۔ قالہ ابن الملک۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ انبیاء کا وقت باعتبار توزیع و تقسیم کے ہے سوائے عشاء کے، کیونکہ پانچوں نمازوں کا مجموعہ ہماری خصوصیات میں سے ہے جب دیگر امتیں عشاء میں متفرق رہی ہیں۔

امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں، ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں اور بیہقی نے اپنی سنن میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صلاۃ العتمۃ (دیر سے پڑھی جانے والی نماز) کو اتنا مؤخر کیا کہ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ نماز ہو چکی ہے، پھر رسول اللہ ﷺ نکلے اور فرمایا اس نماز کو دیر سے پڑھو کیونکہ تمہیں اس نماز کے ذریعے فضیلت دی گئی ہے اور تم سے قبل کسی امت نے یہ نماز نہیں پڑھی۔

امام طحاوی رحمہ اللہ نے عبید اللہ بن محمد سے اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ آدم علیہ السلام کی جب فجر کے وقت توبہ قبول کی گئی تو انہوں نے دو رکعتیں ادا کیں تو صبح ہو گئی۔ اسحاق علیہ السلام نے ظہر کے وقت فدیہ دیا تو چار رکعت ادا کیں اور ظہر ہو گئی۔ عزیر علیہ السلام کو بھیجا گیا پھر جب ان سے پوچھا گیا کہ کتنا ٹھہرے؟ تو فرمایا ایک دن! پھر سورج کو دیکھ کر فرمایا دن کا کچھ حصہ، پھر انہوں نے چار رکعات ادا کیں تو عصر ہو گئی۔ داؤد علیہ السلام کی جب مغفرت کی گئی تو انہوں نے چار رکعت کی نیت باندھی اور کھڑے ہوئے، تیسری رکعت میں اس قدر جہد کی اور روئے کہ تھک گئے اور چوتھی رکعت ادا نہ کر سکے (جب کہ یہ خلافِ اولیٰ ہے) تو یہ مغرب ہو گئی۔ جب کہ عشاء کی نماز سب سے پہلے ادا کرنے والے شخص حضرت محمد ﷺ ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ هذا وقت الانبياء من قبلك کی یہ تشریح ہے۔ اس سے تمام وہ اشکالات جاتے رہے جن کا اظہار امام بیضاوی اور امام ابوداؤد کی روایت اور دیگر لوگوں کے خیالات سے ہوتا ہے کہ عشاء کی نماز سابقہ انبیاء بطورِ نفل ادا کرتے تھے، تہجد کی طرح ان پر فرض نہ تھی۔ کیونکہ تہجد نبی پاک ﷺ پر تو فرض تھی مگر ہم پر نہیں اور ہاں هذا وقت الانبياء من قبلك میں وقتِ اسفار کی جانب بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ تمام انبیاء اور امم ماضیہ اس وقت میں مشترک ہیں۔

حق بات یہ ہے کہ درست بات قاضی صاحب کی ہے کیونکہ پہلی حدیث سابقہ انبیاء کی نفی پر دلالت نہیں کرتی، اس سے تو صرف امم سابقہ کی نفی سمجھ میں آتی ہے، جب کہ دوسری حدیث اس بات پر دال ہے کہ نبی پاک ﷺ سب سے پہلے وہ نبی ہیں جنہوں نے اپنی امت کی معیت میں عشاء کی نماز ادا کی لہٰذا اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ دیگر انبیاء نے عشاء کی نماز ادا

نہیں کی۔زیادہ سے زیادہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ :اول من شرع صلاۃ العشاء ھو نبینا ﷺ۔ظاہری بات ہے ایک نبی نے جب کسی نماز کو شروع کیا تو دیگر انبیاء ان کی اتباع میں اس نماز کو ادا کرتے رہے،لہٰذا اس میں اس تقسیم کی جانب بھی کوئی اشارہ نہیں جس کا وہم کیا جارہا ہے اور ہاں طحاوی شریف کی روایت اور ابوداؤد کی روایت مقصود کی صراحت میں باہم متفاوت ہیں''والوقت ''یعنی وہ مجوزہ وقت جس میں کوئی حرج نہیں''مابین ''جب کہ ایک روایت میں فیما بین ''ھذین الوقتین'' ہے چنانچہ نماز اول وقت کی طرح وسطِ وقت اور آخر وقت میں بھی جائز ہے۔میرک کا قول ہے کہ زوالِ شمس سے مراد یہ ہے کہ ایک چیز کا سایہ اول نہار سے مغرب تک کثیر الجہت ہو پھر اس میں دھیرے دھیرے کمی واقع ہونا شروع ہو جائے یہاں تک کہ ایک وقت میں آکر ایک جگہ پر رک جائے،پھر جب وہ سایہ مشرق کی جانب ڈھلنا شروع ہو جائے تو یہ ظہر کا اولِ وقت ہے،پھر ظلِ زوال کے بعد جب ہر چیز کا سایہ ایک مثل کے برابر ہو جائے تو عصر کا وقت داخل ہو جائے گا۔باقی رہی یہ بات کہ اولا صلی العصر حین صار ظل کل شیء مثلہ تو اس سے مراد بعد ظل الزوال ہے اور ثانیاً صلی بی الظھر حین کان ظلہ مثلہ اس سے بعد ظل الزوال مراد نہیں،تاکہ دونوں نمازوں کا ایک ہی وقت میں جمع ہونا لازم نہ آئے۔الوقت مابین ھذین الوقتین میں الف لام عہدی ہے یعنی نماز پڑھنے کا اول وقت اور آخر وقت اور ان کا درمیانی وقت جیسا کہ پیچھے میں یہ بات گذر چکی ہے۔

باقی رہی یہ بات جو میرک نے کہی کہ جب سایہ آکر رک جائے تو یہ درست نہیں،کیونکہ سورج کی گردش میں وقفہ نہیں ہوتا جیسا کہ اس کی مزید تشریح آگے آئے گی۔واللہ اعلم۔''رواہ ابوداؤد والترمذی''بقول میرک امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے اور ان کے علاوہ دیگر لوگوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔اس روایت کو امام نسائی رحمہ اللہ نے بھی نقل کیا ہے جس میں انہوں نے اس بات کا اضافہ کیا ہے کہ نبی پاک ﷺ جبریل علیہ السلام کے پیچھے تھے اور لوگ نبی پاک ﷺ کے پیچھے تھے تمام اوقات میں،یعنی نبی پاک ﷺ لوگوں سے آگے تھے تاکہ جبریل علیہ السلام کے کئے جانے والے اعمال ان تک پہنچائیں، درحقیقت وہ لوگ جبریل علیہ السلام کے مقتدی تھے نہ کہ آنحضرت ﷺ کے،لیکن ابن اسحٰق کی ایک روایت میں ہے کہ جبریل علیہ السلام نبی پاک ﷺ کو اور آپ ﷺ صحابہ کرام کو نماز پڑھا رہے تھے،اس سے مقتدی کی اقتداء کا صحیح ہونا ظاہر ہوتا ہے،کیونکہ صحابہ کرام تو جبریل علیہ السلام کو نہیں دیکھ رہے تھے ورنہ تو انہی کی اقتدا کرتے اور ظاہری بات یہ بھی ہے کہ جبریل علیہ السلام کی امامت حقیقت پر مبنی نہ تھی بلکہ مجازی طور پر تھی،جس میں جبریل علیہ السلام ارکان کی ادائیگی کی کیفیت اور ان کی کمیت کی جانب اشارہ کررہے تھے جیسا کہ ہمارے ہاں سکھانے والے کرتے ہیں،اور دیگر لوگ بھی نماز میں نہ تھے اور وہ کسی اور کے قولی اشارہ جات سے تعلیم حاصل کررہے تھے۔

الفصل الثّالث:

نماز کو اوّل وقت میں ادا کرنا مستحب ہے

۵۸۴ :عَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِالْعَزِيْزِ اَخَّرَ الْعَصْرَ شَيْئًا فَقَالَ لَهٗ عُرْوَةُ اَمَا اِنَّ جِبْرِيْلَ قَدْ

نَزَلَ فَصَلّٰی اَمَامَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ اِعْلَمْ مَا تَقُوْلُ يَاعُرْوَةُ فَقَالَ سَمِعْتُ بَشِيْرَ بْنَ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ يَّقُوْلُ سَمِعْتُ اَبَا مَسْعُوْدٍ يَّقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ نَزَلَ جِبْرِيْلُ فَاَمَّنِیْ فَصَلَّيْتُ مَعَهٗ ثُمَّ صَلَّيْتُ مَعَهٗ ثُمَّ صَلَّيْتُ مَعَهٗ ثُمَّ صَلَّيْتُ مَعَهٗ ثُمَّ صَلَّيْتُ مَعَهٗ يَحْسَبُ بِاَصَابِعِهٖ خَمْسَ صَلَوَاتٍ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ٦/٣٠٥حديث رقم ٣٢٢١ـوأخرجه مسلم فی صحيحه ١/٤٢٨حديث رقم (١٦٦ـ٦١٠) وأخرجه النسائی فی السنن ١/٢٤٥حديث رقم ٤٩٤ـ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ١/٢٢٠حديث ٦٦٨ـ

ترجمه: حضرت ابن شہابؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک دن عصر کی نماز وقت مستحب سے تاخیر کر کے پڑھی حضرت عروہؓ نے جب یہ دیکھا تو کہا یہ سمجھ لیجئے حضرت جبرائیل نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑے ہو کر اول وقت میں نماز پڑھائی تھی۔ حضرت عمر نے فرمایا اے عروہ ذرا سوچ سمجھ کر کہو کیا کہتے ہو؟ عروہ نے کہا کہ میں نے حضرت ابو مسعودؓ کے صاحبزادے حضرت بشیر سے سنا وہ کہتے تھے کہ میں نے حضرت ابو مسعودؓ سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جبرائیلؑ میرے امام بنے اور میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی۔ پھر میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی پھر میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی پھر میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، پھر میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی۔ پانچ نمازیں آپ ﷺ نے انگلیوں پر شمار کر کے بتائیں۔

تشریح: ''عن ابن شهاب'' یعنی زہری سے ''ان عمر بن عبدالعزیز'' پانچویں خلیفہ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ شمار نہیں کیا جائیگا کیونکہ ایک تو ان کی مدت پوری نہیں دوسرا ان کی حکومت کامل نہیں ''اخر العصر شيئا'' یعنی کچھ وقت کی تاخیر کی، ہوسکتا ہے کہ وقت مختار سے تاخیر محل انکار میں طریق اخبار کی وجہ سے کی ہو ''فقال له عروة'' یعنی ابن زبیر ''اما'' تخفیف کے ساتھ، مالکی کا کہنا ہے کہ اَما حرفِ استفتاح ہے جو اَلا کے مرتبہ میں ہوتا ہے اور کبھی یہ بمعنی حقًا ہوتا ہے جب کہ اَلا اس میں مشارک نہیں ''ان جبريل قد نزل فصلی امام رسول الله ﷺ'' امام کے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اور ایک قول کے مطابق فتحہ کے ساتھ۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مسلم شریف کی شرح میں ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ضبط ہے، جب کہ جامع الاصول میں کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ مقید ہے، فتحہ کی صورت میں ظرف ہوگا اور کسرہ کی صورت میں یا تو فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہوگا یعنی اصل عبارت یہ ہوگی: اعنی امام رسول الله ﷺ یا پھر کان محذوف کی خبر ہوگی جیسا کہ اول ما خلق الله القلم (اول کے رفع کے ساتھ اور قلم کے نصب کے ساتھ) میں بات گذر چکی ہے اور جیسا کہ امام ابہری کا فرمان ہے۔ شیخ مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حال ہے۔ شیخ محی الدین فرماتے ہیں کہ اسے کسرہ کے ساتھ ہی پڑھا جائے تا کہ جس حدیث میں فامنی ہے اس کے ساتھ مطابقت ہوجائے ''فقال له عمر: اعلم'' یہ علم سے امر کا صیغہ ہے اور ایک قول کے مطابق یہ اعلام سے ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اَعلم متکلم کا صیغہ ہو مگر پہلا قول راجح ہے ''ماتقول يا عروة!'' کہا گیا ہے کہ یہ قول انکار پر تنبیہ ہے، پھر جملہ اما کے ساتھ کے ساتھ کہہ رہے ہو جو کہ از قبیل قسم ہے یعنی جو تم کہہ رہے ہو اس میں غور تو کرو۔ قالہ

الطیبی۔ گویا حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے عروہ کے قول صلی امام رسول الله ﷺ کو بعید خیال کیا' کیونکہ امامت کے لائق اور حقدار نبی پاک ﷺ تھے اور ظاہر ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے عروہ کی طرف جبریل علیہ السلام کے اس آنے کی خبر کو بغیر اسناد کے بعید از قیاس تصور کیا، گویا حضرت عمر بن العزیزؒ نے عروہ پر غصے کا اظہار کر کے جانب اشارہ دیا کہ روایات نقل کرنے میں مزید احتیاط کرو تا کہ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولنے سے احتراز کیا جا سکے۔ اسی وجہ سے ان کے والد زبیر سے منقول ہے کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ روایات بہت کم کیوں بیان کرتے ہو حالانکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے سفر و حضر اور مکہ و مدینہ کے ساتھی تھے؟ تو جواب میں انہوں نے فرمایا کہ مجھے تمام حدیثیں یاد ہیں مگر میں کذب کی وعید میں داخل ہونے سے خوف کھاتا ہوں، کیونکہ بعض روایات میں تعمد کی قید بھی نہیں ہے، اسی طرح عمر بن عبدالعزیزؒ نے عروہ سے اس قول میں احتیاط سے کام لینے کو کہا کیونکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے زمانہ کے سربراہ اور افضل ترین شخص تھے جیسا کہ ایک حدیث میں ان کے بارے میں منقول ہے: ''**فقال**'' یعنی عروہ نے فرمایا: ''**سمعت بشير بن ابی مسعود يقول سمعت ابا مسعود يقول سمعت رسول الله ﷺ يقول نزل جبريل فأمني فصليت معه، ثم صليت معه، ثم صليت معه، ثم صليت معه**'' امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عروہ کے حدیث ذکر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں اس بارے میں مجھے کچھ پتہ نہ ہو حالانکہ میں بشیر ابن ابی مسعود کے ساتھ رہا ہوں اور میں نے ان سے سنا ہے اور انہوں نے ابو مسعود (صحابی) سے اور انہوں نے رسول ﷺ سے سنا ہے، چنانچہ مجھے نماز کی کیفیت، اوقات اور ارکان کے بارے میں علم ہے۔ اگر اعتراضاً کہا جائے کہ اس حدیث میں تو نماز کے اوقات کا بیان ہی نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ مخاطب کو نماز کے اوقات کے بارے میں علم تھا اس لئے انہوں نے اس کو مبہم رکھا اور جابر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایات میں اوقات کی تفصیل موجود ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو بات مجھے سمجھ آئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بیانِ اوقات سے انکار نہیں کیا تھا انہوں نے تو جبریل کی امامت کو بہت بڑا امر خیال کیا تھا، کیونکہ نمازوں کے اوقات سے تو ہر شخص واقف ہوتا ہے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نمازوں کے اوقات سے کیسے غافل ہو سکتے تھے ''**يحسب**'' سین کے ضمہ اور یاء تحتانیہ کے ساتھ اور ایک قول کے مطابق نون کے ساتھ ''**باصابعه خمس صلوات**'' امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نون کے ساتھ یہ یقول کی ضمیر فاعل سے حال ہے یعنی اس صورت میں اصل عبارت یہ ہوگی: **يقول هو ذلك القول ونحن نحسب بعقد اصابعه** کہ وہ یہ بات کہہ رہے تھے اور ہم انگلیوں پر شمار کر رہے تھے، یہ بات راوی کے ضبط اور اتقان پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے تمام احوال کو ضبط میں رکھا۔ میرک کا کہنا ہے کہ درست وہی سماع ہے جو بخاری مسلم اور مشکوۃ شریف سے ہے یعنی یحسب یاءِ تحتانیہ کے ساتھ اور ظاہر ہے کہ شمار کرنے والے بھی رسول اللہ ﷺ ہی تھے یعنی آپ ﷺ فرما رہے تھے اور انگلیوں کے ساتھ شمار کر رہے تھے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر روایت کی تائید ہو تو یہ زیادہ واضح بات ہے: (متفق علیہ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنے گورنروں کو نماز کی پابندی کا حکم

۵۸۵ :وَعَنْ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اَنَّهٗ كَتَبَ اِلٰى عُمَّالِهٖ اَنَّ اَهَمَّ اُمُوْرِكُمْ عِنْدِى الصَّلَاةُ مَنْ حَفِظَهَا وَ حَافَظَ عَلَيْهَا حَفِظَ دِيْنَهٗ وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا اَضْيَعُ ثُمَّ كَتَبَ اَنْ صَلُّوا الظُّهْرَ اِذَا كَانَ الْفَيْءُ ذِرَاعًا اِلٰى اَنْ يَكُوْنَ ظِلُّ اَحَدِكُمْ مِثْلَهٗ وَالْعَصْرُ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ بَيْضَاءُ نَقِيَّةٌ قَدْرَ مَا يَسِيْرُ الرَّاكِبُ فَرْسَخَيْنِ اَوْ ثَلَاثَةً قَبْلَ مَغِيْبِ الشَّمْسِ وَالْمَغْرِبَ اِذَا غَابَتِ الشَّمْسُ وَالْعِشَاءَ اِذَا غَابَ الشَّفَقُ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ فَمَنْ نَامَ فَلَا نَامَتْ عَيْنُهٗ وَالصُّبْحُ وَالنُّجُوْمُ بَادِيَةٌ مُشْتَبِكَةٌ ۔ (رواه مالك)

أخرجه مالك في الموطأ ١/٦ حديث رقم ٦ في كتاب وقوت الصلاة۔

ترجمہ: حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے گورنروں کو یہ پیغام لکھ کر بھیجا تھا کہ تمہارے اہم کاموں میں سے عظیم الشان کام میرے نزدیک نماز کو ادا کرنا ہے نیز جس نے نماز کی حفاظت کی اور اس پر نگرانی رکھی یعنی پابندی سے ادا کرتا رہا۔ تو گویا اس نے اپنے دین کے باقی امور کی حفاظت کی اور جس نے اس کو ضائع کر دیا وہ نماز کے علاوہ دیگر امور کو بہت زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا اور پھر یہ لکھا کہ ظہر کی نماز اس وقت پڑھو جب کہ سایہ زوال کے بعد ایک گز سے لے کر ایک مثل تک ہو جائے اور عصر کی نماز اس وقت پڑھو جب کہ سورج بلند اور سفید رہے اور سورج غروب ہونے میں اتنا وقت باقی رہے کہ کوئی آدمی سورج غروب ہونے سے پہلے دو یا تین میل سفر کر سکے اور مغرب کی نماز سورج غروب ہونے کے بعد پڑھا کرو اور عشاء کی نماز شفق غائب ہونے سے لے کر ثلث لیل تک پڑھا کرو اور جو آدمی عشاء کی نماز سے پہلے سو جائے تو اللہ اس کی آنکھوں کو سونا نصیب نہ کرے یہ بددعا تین مرتبہ کی اور صبح کی نماز ایسے وقت پڑھو جب کہ ستارے چمک رہے ہوں۔ اس حدیث کو امام مالکؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''وعن عمر بن الخطاب'' رضی اللہ عنہ ''انه كتب الى عماله'' یہ عامل کی جمع ہے یعنی امراء ''ان'' ہمزہ کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ''اهم امور كم عندى'' یعنی میرے درست اور صحیح خیال کے مطابق ''الصلاة'' کتاب وسنت کی دلیل کے ساتھ یعنی جو نماز کے بارے میں احکام ہیں، نماز کے لئے سعی وکوشش کا ذکر ہے اور جو لوگوں کو نماز کی طرف بلانے کی باتیں ہیں ''من حفظها'' کہ وہ تمام شرائط وارکان کا لحاظ کرتے ہوئے ادا کرے ''وحافظ عليها'' یعنی اس پر مداومت اور ہمیشگی اختیار کرے اور شہرت، ریا، غرور اور عجب کے ذریعے اسے ضائع نہ کرے ''حفظ دينه'' یعنی وہ دین کے باقی امور کی بھی حفاظت کرے گا، اس لئے کہ نماز دین کا ستون ہے، برائیوں سے روکتی ہے، مؤمن وکافر اور مطیع وعاصی کے درمیان فرق ہے، رب اور بندے کے درمیان مناجات وسرگوشی ہے اور مؤمن کی معراج ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ نماز کی محافظت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں سہو نہ ہو، نماز کو اس کے وقت میں ادا کیا جائے، ارکان اور رکوع وسجود کا خیال رکھا جائے، اہتمام سے ادا کیا جائے، استقامت اور دوام سے اسے مضبوط کیا جائے جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ [الأحقاف: ١٣] ''جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے پھر وہ (اس پر) قائم رہے''۔ ''ومن ضيعها'' یعنی نماز

کو سرے سے چھوڑ ہی دیا یا اس کے کچھ واجبات کو ترک کر دیا "فھو لما سواھا" یعنی نماز کے علاوہ دیگر واجبات و مستحاب کو "أضیع" یعنی بطریق اولیٰ ضائع کرے گا کیونکہ نماز ام العبادات اور رأس الطاعات ہونے کے ساتھ ساتھ گناہوں کو مٹانے والی بھی ہے "ثم کتب" یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے: "أن" یہ بأن کے معنی میں ہے: "صلوا الظھر أن کان الفیء ذراعا" یہ اَن مصدریہ اور وقت محذوف ہے، اصل عبارت یہ ہے: وقت کون الفیء قدر ذراع اور یہ مختص بالمحل ہے کیونکہ فے کی مقدار مکانوں اور زمانوں کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے "الی ان یکون" یعنی اس کا وقت چلتا رہے گا تا آنکہ "ظل احدکم مثله" یعنی فے زوال کے علاوہ "والعصر" نصب کے ساتھ ظہر پر عطف ہے: "والشمس مرتفعة بیضاء نقیة" یہ حال ہے "قدر مایسیر الراکب" یہ مرتفعة کے لئے ظرف ہے یعنی وہ اتنا بلند ہو کہ سوار چل سکے "فرسخین" مغرب تک "او ثلاثة" یعنی تین فرسخ۔ فرسخ بارہ مراحل کا ہوتا ہے اور اس کا ثلث ایک میل ہے "قبل مغیب الشمس، والمغرب" نصب کے ساتھ "اذا غابت الشمس، والعشاء" نصب کے ساتھ "اذا غاب الشفق" یعنی شفق احمر اور یہ وقت جاری و ساری رہے گا "الی ثلث اللیل، فمن نام" یعنی عشاء سے قبل جیسا کہ بقول علامہ سیوطی مسند بزار میں ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص مطلقاً نماز کے وقت خصوصاً عشاء کی نماز کے وقت حقیقتاً یا مجازاً یوں سویا کہ اس سے سہواً نماز کا وقت جاتا رہا "فلانامت عینه" جو شخص عشاء کی نماز کی ادائیگی سے قبل سہواً سو جائے تو یہ اس کے استراحت کی نفی کے ساتھ دعا ہے۔ قالہ الطیبی۔ "ومن نام" یعنی سستی اور بلاوجہ "فلانامت عینه، ومن نام فلانامت عینه" یہ تکرار تاکید کے لئے ہے یا پھر احوالِ نائم کے اختلاف کے اعتبار سے ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ نماز سے قبل سونا حرام ہے، ہمارے ہاں یہ فضیلت کی نفی پر محمول ہے کہ کیونکہ حضرت عمرؓ کبھی نماز کے وقت سے پہلے سو جاتے تھے اور کبھی نماز کا وقت داخل ہونے کے بعد۔ دوسری صورت اگر سونے والے کو یہ شک یا گمان ہو کہ اس کے سونے سے اس کی نماز جاتی رہے گی تو اس کا سونا جائز نہیں، ہاں اگر کسی معتمد جگانے والے کا انتظام ہو کہ جاگ کر مکمل نماز وقت کے اندر اندر ادا کر لی جائیگی تو سونا جائز ہے، جب کہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ پہلی صورت میں بھی سونا جائز ہے۔ کچھ دیگر لوگوں کا کہنا ہے کہ مطلقاً سونے میں کوئی حرمت نہیں، اس لئے کہ نماز سے قبل انسان نماز کا مکلّف نہیں ہوتا اور یہی ہمارا مذہب ہے۔ دوسرے قول میں ذکر کی گئی تفصیل ہمارے قواعد کے مطابق ہے۔ "والصبح" نصب کے ساتھ "والنجوم" رفع کے ساتھ "بادیة" یاء کے ساتھ، یہ ظاھرة کے معنی میں ہے "مشتبكة" یعنی خلط ملط ہوں "رواہ مالك"۔

نمازِ ظہر کا سایہ کے گھٹنے بڑھنے سے اندازہ

۵۸۶: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كَانَ قَدْرُ صَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظُّهْرَ فِي الصَّيْفِ ثَلَاثَةَ اَقْدَامٍ اِلٰى خَمْسَةِ اَقْدَامٍ وَفِي الشِّتَاءِ خَمْسَةَ اَقْدَامٍ اِلٰى سَبْعَةِ اَقْدَامٍ۔ (رواہ ابوداود والنسائی)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۲۸۳ حدیث رقم ۴۰۰۔ وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۲۵۰ حدیث رقم ۵۰۳۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ظہر کا اندازہ گرمیوں میں

تین قدم سے پانچ قدم تک اور موسم سرما میں پانچ قدم سے سات قدم تک تھا۔اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''وعن ابن مسعود قال: کان قدر صلاۃ رسول الله ﷺ الظهر '' جر کے ساتھ صلاۃ سے بدل ہونے کی بناء پر یا پھر نصب کے ساتھ جب کہ اعنی کو مقدر مانا جائے ''فی الصیف ثلاثة اقدام'' یعنی فے سے ''الی خمسة اقدام، وفی الشتاء خمسة اقدام الی سبعة اقدام'' امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مختلف علاقہ جات میں یہ حکم بھی مختلف ہے کیونکہ سایہ کا طویل ہونا یا مختصر ہونا یہ آسمان میں ارتفاعِ شمس کے حساب سے ہوتا ہے، جہاں سورج قریب ہوگا وہاں سایہ بھی مختصر ہوگا اور اسی طرح اس کا عکس۔اسی لئے سردیوں کا سایہ ہمیشہ تمام مقامات پر گرمیوں کے سایہ سے طویل ہوتا ہے، جب کہ رسول اللہ ﷺ کی نمازیں مکہ اور مدینہ میں ہوتی تھی جن کا شمار اقلیم ثانی میں ہوتا ہے، چنانچہ ذکر کیا جاتا ہے کہ مارچ کے مہینہ میں گرمیوں کے آغاز میں سایہ تین قدم اور کچھ ہوتا ہے، اور اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب گرمی سخت ہوگی تو اس وقت نماز وقت معین سے مؤخر ہوگی اور اس وقت پانچ قدم ہوں گے۔باقی رہا سردیوں کا سایہ تو اس بارے میں یہ کہتے ہیں کہ وہ اکتوبر میں پورے پانچ قدم ہوگا یا پھر پانچ قدم اور کچھ مزید جب کہ دسمبر میں پورے سات قدم یا پھر سات قدم اور کچھ مزید۔چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول اس اندازے پر اسی علاقہ پر محمول ہوگا نہ کہ تمام علاقہ جات پر جو کہ اقلیم ثانی سے خارج ہیں۔''رواہ ابوداود والنسائی'' اور اس کی سند حسن ہے۔

تاج الدین سبکی فرماتے ہیں کہ امام ابوداود کی حدیث کے معنی میں اضطراب ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ سردیوں میں اتنی نماز مؤخر کرتے تھے کہ سایہ تین قدم باقی رہ جاتا تھا، جب کہ ابوداؤد اور نسائی شریف کی روایت میں یوں میں ہے: فی الصیف ثلاثة اقدام وفی الشتاء خمسة اقدام، میرے خیال کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ گرمیوں میں نصف وقت کے بعد پڑھتے تھے اور سردیوں میں اول وقت میں اور ابراد کی حد بھی اسی سے ماخوذ ہے۔ظاہر یہ ہے کہ ابراد کی کوئی حد نہیں، یہ حد بلاد کے مختلف ہونے سے مختلف ہوتی ہے اور شاید کہ وہ کہنا چاہ رہے ہوں کہ یہ ابراد نصف وقت سے تجاوز نہ کر جائے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

بَابُ تَعْجِیْلِ الصَّلٰوۃِ

نماز جلدی پڑھنے کا بیان

ایک نسخہ میں الصلوات کی بجائے الصلاۃ کا لفظ ہے، اس سے مراد جنسِ صلاۃِ مکتوبہ ہے، یعنی نماز میں اصل تعجیل اور مبادرت ہے، کیونکہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: وسارعوا الی مغفرة من ربکم اور فرمایا: فاستبقوا الخیرات مگر شریعت نے کچھ حکمت کے تقاضوں کے پیش نظر اس میں تاخیر کی تخصیص کی ہے۔

الفصل الاول:

نماز کے مستحب اوقات کا بیان

۵۸۷ :عَنْ سَيَّارِ بْنِ سَلَامَةَ قَالَ دَخَلْتُ اَنَاوَاَبِيْ عَلٰى اَبِيْ بَرْزَةَ الْاَسْلَمِيِّ فَقَالَ لَهٗ اَبِيْ كَيْفَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّي الْمَكْتُوْبَةَ فَقَالَ كَانَ يُصَلِّي الْهَجِيْرَ الَّتِيْ تَدْعُوْنَهَا الْاُوْلٰى حِيْنَ تَدْحَضُ الشَّمْسُ وَيُصَلِّي الْعَصْرَ ثُمَّ يَرْجِعُ اَحَدُنَا اِلٰى رَحْلِهٖ فِيْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ وَالشَّمْسُ حَيَّةٌ وَنَسِيْتُ مَاقَالَ فِي الْمَغْرِبِ وَكَانَ يَسْتَحِبُّ اَنْ يُؤَخِّرَ الْعِشَاءَ الَّتِيْ تَدْعُوْنَهَا الْعَتَمَةَ وَكَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَالْحَدِيْثَ بَعْدَهَا وَكَانَ يَنْفَتِلُ مِنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ حِيْنَ يَعْرِفُ الرَّجُلُ جَلِيْسَهٗ يَقْرَءُ بِالسِّتِّيْنَ اِلَى الْمِائَةِ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَلَا يُبَالِيْ بِتَاْخِيْرِ الْعِشَاءِ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ وَلَايُحِبُّ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَالْحَدِيْثَ بَعْدَهَا۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی الصحیح ٢٦/٢حدیث رقم ٤٠٥۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ٤٤٧/١حدیث رقم (٢٣٥۔٦٤٧) واللفظ للبخاری ۔وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ٢٨١/١حدیث رقم ٣٩٨۔وأخرجه النسائی فی السنن ٢٤٦/١حدیث رقم ٤٩٥۔وأخرج ابن ماجة فی السنن أوله ٢٢١/١حدیث رقم ٦٧٤۔وأخرجه الدارمی فی السنن ٣٣٨/١۔ حدیث رقم ١٣٠٠۔وأحمد فی مسنده ٤٢٠/٤۔

ترجمہ: حضرت سیار بن سلامہؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے والد حضرت ابو برزہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے میرے والد نے ان سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ فرض نماز کس طرح پڑھتے تھے یعنی کس کس وقت پڑھتے تھے؟ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز جس کو تم پہلی نماز کہتے ہو سورج کے زوال کے وقت پڑھتے تھے اور عصر کی نماز اس وقت پڑھتے تھے کہ اگر ہم میں سے کوئی نماز پڑھ کر مدینہ کے کنارے اپنے گھر جا کر واپس آ جاتا تھا تو سورج ابھی روشن ہوتا تھا۔ حضرت سیار فرماتے ہیں کہ حضرت ابو برزہؓ نے نماز مغرب کے بارے میں جو کچھ بتایا میں وہ بھول گیا اور عشاء کی نماز جس کو تم عتمہ کہتے ہو رسول اکرم ﷺ تاخیر سے پڑھنے کو بہتر سمجھتے تھے اور عشاء کی نماز سے پہلے سونے کو اور عشاء کے بعد دنیاوی باتیں کرنے کو ناپسند کرتے تھے اور جس وقت فجر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوتے تھے تو ہر شخص اپنے پاس بیٹھنے والے کو پہچان لیتا تھا اور نماز میں ساٹھ (۶۰) آیات سے لے کر سو (۱۰۰) آیات تک تلاوت کر لیتے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اکرم ﷺ ثلث لیل تک تاخیر کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے تھے اور عشاء کی نماز سے پہلے سونے کو اور عشاء کی نماز کے بعد باتیں کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ (بخاری ومسلم)

راویٔ حدیث:

سیار بن سلامۃ ۔ یہ سیار بن سلامہ ہیں ان کی کنیت ''ابوالمنہال'' ہے۔ بصری وتمیمی ہیں۔ مشہور تابعین سے ہیں۔ سیار

بروزن ''طیار'' ہے۔ حضرت ابوہریرہ اور ابوالعالیہ رضی اللہ عنہم سے حدیث کو سنا۔ ان سے عوف اور شعبہ رضی اللہ عنہم روایت کرتے ہیں۔

تشریح: ''قال دخلت انا وابی علی ابی برزة'' باءِ موحدہ کے فتحہ کے ساتھ ''الاسلمی'' وہ نضلہ بن عبید ہیں ''فقال له ابی کیف کان یصلی رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم یصلی المکتوبة؟'' یعنی فرض نمازیں اوقات کے اعتبار سے ''فقال: کان یصلی الھجیر'' النھایہ میں ہے کہ ہجیر اور ہاجرہ کا معنی ہوتا ہے نصف نہار میں گرمی کا شدت اختیار کرنا ''التی تدعونھا'' یعنی جنہیں نام دیا جاتا ہے۔ الفائق میں ہے مؤنث کا صیغہ ہجیر کی صفت کی وجہ سے استعمال کیا اور ایک قول کے مطابق بعض اہلِ عرب کی لغت کے مطابق ہجیر ظہر کی نماز کو کہتے ہیں اور اس کی ہجیر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہاجرہ (دوپہر کی گرمی/زوالِ آفتاب کے وقت) پڑھی جاتی ہے ''الاولی'' النھایہ میں اس کو اُولیٰ کہنے کی وجہ یہ مذکور ہے کہ یہ پہلی نماز ہے جو روشنی میں پڑھی جاتی ہے۔ قاضی صاحب کا کہنا ہے کہ اس کو اولیٰ عرفاً دن کی پہلی نماز ہونے کی وجہ سے کہا گیا ہے ''حین تدحض الشمس'' حاء کے فتحہ کے ساتھ دحضت رحله سے ماخوذ ہے یعنی جب وسطِ آسمان سے مغرب کی جانب ڈھلنا شروع ہو جائے کیونکہ جب سورج زوال پذیر ہونا شروع ہو جائے تو گویا وہ دحض کر دیا جاتا ہے یعنی دھکیل دیا جاتا ہے۔ ابن الملک کا کہنا ہے کہ راوی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہجیر، اولی اور ظہر ایک ہی نماز کے مختلف نام ہیں۔ ''ویصلی العصر ثم یرجع'' یعنی نماز کے بعد ''احدنا الی رحله'' یعنی اپنے ٹھکانے پر ''فی اقصی المدینة'' یہ رحلہ کی صفت ہے، فعل کے لئے ظرف نہیں یعنی چاہے وہ مدینہ کے آخری کونے میں رہتا ہو ''والشمس حیة'' یہ جملہ حالیہ ہے یعنی صاف اور تغیر اور زردی کے بغیر، کیونکہ جب کسی چیز کی قوت میں کمی آجائے تو گویا وہ مر چکی ہوتی ہے۔ مفاتیح میں فرمایا کہ حیاۃ الشمس اس کے رنگ، قوت، روشنی اور شدت حرارت سے مستعار ہے۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گویا سورج کے غائب ہونے کو اس کی موت سے تعبیر کیا ''ونسیت'' یعنی ظاہر یہی ہے کہ سیار نے فرمایا، جب کہ مصابیح میں ہے کہ عوف نے فرمایا، ایک قول کے مطابق یہ راوی ہیں، ابوبرزہ سے اور وہ سہو ہے کیونکہ وہ سیار سے نقل کرنے والے ہیں ''ماقال'' یعنی ابوبرزہ نے جو کہا۔ قالہ الطیبی وابن حجر۔ جب کہ مصابیح میں ہے کہ اس قول کا قائل سیار کا ہونا مناسب ہے ''فی المغرب'' یعنی نمازِ مغرب کے بارے میں ''وکان'' یعنی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم، اور یہ کان یصلی پر عطف ہے ''ویستحب'' یاء کے فتحہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ ''ان یؤخر'' معروف اور مجہول دونوں طرح ''العشاء التی تدعونھا العتمة'' خلیل فرماتے ہیں کہ عتمہ وہ تاریکی ہوتی ہے جو شفق کے غائب ہونے کے بعد آتی ہے، ذکرہ الطیبی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں توصیف کے وہی فوائد ہیں جو ظہر میں گذر چکے ہیں اور یہ اَعرابیوں کو عشاء کہنے سے نہیں بلکہ عتمہ کہنے سے سمجھ آتی تھی، اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ عشاء کی نماز کا نام ہی عتمہ ہے کیونکہ یہ ہمارے نزدیک مسلم شریف کی خبر کی وجہ مکروہ ہے جس میں فرمایا کہ تمہاری نماز کے نام پر اَعرابی غالب نہ آجائیں آگاہ رہو یہ عشاء ہے۔ جب کہ ایک حدیث میں اس کو عتمہ کا نام بھی دیا گیا ہے کہ جس میں فرمایا: لو تعلمون مافی الصبح والعتمة تو یہ بیانِ جواز ہے اور یہ کہ مسلم شریف میں حدیث میں جو نہی ہے وہ تنزیہی ہے یا پھر یہ ان لوگوں سے خطاب ہے جو عشاء کے نام سے ناواقف ہیں اور اس نماز کو عشاءِ اخیرہ کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں، باقی رہا امام اصمعی کا اس سلسلے میں انکار میں تو وہ غلط ہے حالانکہ صحیح احادیث میں یہ نام مذکور ہے۔

بعض احادیث کی رو سے عشاء کی نماز کو ثلث لیل یا نصف لیل تک مؤخر کرنا مستحب ہے ''وکان'' یعنی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم

"یکرہ النوم قبلھا" فوت ہوجانے کے خوف سے "والحدیث بعدھا" یعنی دنیاوی باتیں نہیں کرتے تھے تاکہ دن کا اختتام اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے نام پر ہوجائے، کیونکہ نیند موت کی بہن ہے۔ شرح السنۃ میں ہے اکثر علماء کا قول یہی نقل کیا گیا ہے کہ عشاء کی نماز سے قبل سونا مکروہ ہے، جب کہ بعض حضرات نے اس کی رخصت بھی دی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما عشاء کی نماز سے قبل کچھ دیر کے لئے سوجایا کرتے تھے، جب کہ کچھ لوگوں نے صرف ماہِ رمضان میں اجازت دی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر نیند کا غلبہ ہو تو سونے میں کوئی کراہت نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ نماز کے فوت ہوجانے کا خوف نہ ہو۔ باقی رہی گفتگو تو اسے بہت سے لوگوں نے ناپسند کیا ہے، چنانچہ سعید بن مسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک عشاء کی نماز سے پہلے سونا عشاء کے بعد لہو ولعب میں مشغول ہونے سے بہتر ہے، کچھ لوگوں نے علمی گفتگو کی اجازت دی ہے، جس میں گھر کے کام کاج اور اہل وعیال کے ساتھ بات چیت اور مہمانوں کے ساتھ میل جول بھی شامل ہے۔ امام احمد نے مسند میں، اور بزار اور طبرانی نے شداد بن اوس سے نقل کیا ہے کہ رسولِ پاک ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے عشاء کی نماز کے بعد ایک شعر بھی پڑھ لیا تو اس کی اس رات کی نماز قبول نہ ہوگی"، اس میں مذموم اشعار کی تخصیص ہے۔ مسند احمد کی حدیث میں ہے "قصہ گوئی صرف مسافر اور نمازی کے لئے ہوسکتی ہے"۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بطال کی سیرت اور عنترہ وغیرہ جیسی جھوٹی کہانیوں کو پڑھنا حرام ہے، باقی رہی بھلائی کی باتیں اور کسی عذر کی وجہ سے کوئی بات کرنا تو اس میں کوئی کراہت نہیں "وکان ینفتل" یعنی پھر جاتے تھے یا گھوم جاتے تھے مقتدیوں کی جانب "من صلاۃ الغداۃ" یعنی فجر کی نماز "حین یعرف الرجل جلیسہ" یعنی ہم نشین "ویقرأ" یعنی صبح میں "بالستین" یعنی آیات، اس میں باء زائدہ ہے اور ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ اس مقدار میں رسول اللہ ﷺ نماز میں آیات کی تلاوت فرماتے تھے اور کبھی اس میں اضافہ بھی کر لیتے تھے "الی المائۃ" ابن الملک کا کہنا ہے کہ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کے زیادہ مناسب ہے۔

"وفی روایۃ" یعنی شیخین کی روایت میں ہے: "ولایبالی بتأخیر العشاء الی ثلث اللیل" بلکہ مستحب ہے جیسا کہ پیچھے گذر چکا "ولایحب النوم قبلھا والحدیث بعدھا، متفق علیہ" میرک کا کہنا ہے کہ اس روایت کو ابوداود، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔

جماعت کی کثرت مقصود ہے

۵۸۸: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ سَأَلْنَا جَابِرَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ عَنْ صَلَاةِ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ كَانَ يُصَلِّي الظُّهْرَ بِالْهَاجِرَةِ وَالْعَصْرَ وَالشَّمْسُ حَيَّةٌ وَالْمَغْرِبَ إِذَا وَجَبَتْ وَالْعِشَاءَ إِذَا أَكْثَرَ النَّاسُ عَجَّلَ وَإِذَا قَلُّوْا أَخَّرَ وَالصُّبْحَ بِغَلَسٍ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۲۷حدیث رقم ۵۶۵۔وأخرجه مسلم فی الصحیح ۱/۴٤٦حدیث رقم (۲۳۳۔٦٤٦) أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۲۸۱حدیث رقم ۳۹۷۔وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۲٦٤ حدیث رقم ۵۲۷الأنه لم یذکر صلاۃ القبر۔ وأخرجه الدارمی فی السنن ۱/۲۸٤حدیث رقم۱۱۸٤۔وأخرجه

أحمد فی المسند ۳/۹٦۹۔

ترجمہ: حضرت محمد بن عمرو بن حسن بن علی سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت جابر بن عبداللہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز دوپہر کے وقت یعنی سورج کے زوال کے بعد پڑھتے تھے اور عصر کی نماز اس وقت پڑھتے تھے جبکہ سورج روشن ہوتا تھا اور مغرب کی نماز غروب شمس کے بعد پڑھتے تھے اور عشاء کی نماز میں جب لوگ کثرت سے آ جاتے تو جلدی پڑھ لیتے تھے اور جب لوگ کم ہوتے تو تاخیر سے پڑھتے تھے اور صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھ لیتے تھے۔ (بخاری ومسلم)

راویٔ حدیث:

محمد بن عمرو۔ یہ محمد ہیں۔ عمرو بن الحسن بن علی بن ابی طالب کے بیٹے۔ تابعی ہیں۔ انہوں نے جابر بن عبداللہ سے روایت کی۔ میرک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ روای تھے اور چوتھے درجہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

تشریح: ''**وعن محمد بن عمرو بن الحسن بن علی**'' مصنف فرماتے ہیں کہ یہ تابعی ہیں، انہوں نے جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، میرک کا کہنا ہے کہ یہ چوتھے طبقے کے ثقہ راویوں میں سے ہیں: ''**قال سألنا جابر بن عبدالله عن صلاة النبی**'' یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازوں کے اوقات کے بارے میں ''**فقال**'' یعنی جابر رضی اللہ عنہ نے ''**کان**'' یعنی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ''**یصلی الظهر بالهاجرة**'' یعنی سخت گرمی میں یعنی نصفِ نہار کے بعد اور ایک قول کے مطابق یعنی اول وقت میں ''**والعصر**'' یعنی عصر کی نماز پڑھتے تھے ''**والشمس حية**'' یعنی جب اس کی روشنی باقی ہوتی تھی ''**والمغرب**'' نصب کے ساتھ عطف ہے ظہر پر یا عصر پر ''**اذا وجبت**'' یعنی جب سورج چھپ جاتا۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ سیاق سے یہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: **حتی توارت بالحجاب** یہ ان سے **والشمس حية** والے قول میں نقل کرنے غفلت ہوئی ہے۔ صاحب فائق کا کہنا ہے کہ وجوب کا اصلی معنی ہے سقوط جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: **فاذا وجبت جنوبها**، مطلب یہ ہے کہ جب سورج مکمل چھپ جائے ''**والعشاء**'' نصب کے ساتھ جیسا کہ گذر چکا ''**اذا کثر الناس عجل، واذا قلوا أخر**'' امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ دونوں شرطیہ جملے محلِ نصب میں فاعل سے حال ہیں، اصل عبارت یہ ہوگی: **یصلی العشاء معجلا اذا کثر الناس ومؤخرا اذا قلوا** کہ جب لوگوں کی تعداد زیادہ ہو تو عشاء کی نماز جلدی پڑھی جائے گی اور جب تعداد کم ہو تو دیر سے پڑھی جائے گی، یا اس میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مفعول سے حال ہوں اور راجع مقدر یعنی **عجلها او اخرها** اور مقدر **معجلة ومؤخرة** ہوگا ''**والصبح**'' نصب کے ساتھ ''**بغلس**'' الغلس غین اور لام کے فتحہ کے ساتھ شب کے آخری پہر کی تاریکی جس کے ساتھ صبح کی روشنی بھی مل جائے ''**متفق علیه**'' میرک کا کہنا ہے کہ اس روایت کو امام ابوداؤد اور نسائی نے بھی نقل کیا ہے۔

گرمی سے بچنے کے لئے کپڑے پر سجدہ جائز ہے

۵۸۹: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنَّا اِذَا صَلَّيْنَا خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالظَّهَائِرِ سَجَدْنَا عَلٰی

ثِيَابِنَا اِتِّقَاءَ الْحَرِّ ۔ (متفق عليه ولفظه للبخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۲۲/۲ حديث رقم ۵۴۲ ۔وأخرجه مسلم فی صحيحه ۴۳۳/۱ حديث رقم (۱۹۱۔۶۲۰) وأخرجه الترمذی فی السنن ۴۷۹/۲ حديث رقم ۵۸۴ وأخرجه النسائی فی السنن ۲۱۶/۲ حديث رقم ۱۱۱۶ ۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۳۲۹/۱ حديث رقم ۱۰۳۳ ۔

''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے ظہر کی نماز پڑھتے ہوئے گرمی سے بچنے کے لئے اپنے کپڑوں پر سجدہ کرلیا کرتے تھے۔'' (بخاری ومسلم) اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔

تشریح: ''وعن انس قال کنا اذا صلینا خلف النبی ﷺ بالظهائر'' باء زائدہ ہے اور یہ ظہیرۃ کی جمع ہے جو کہ الظهيرة من النار سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد ظہر ہے اور جمع لانے میں روزانہ کی ظہر کی طرف اشارہ ہے ''سجدنا علی ثیابنا'' اکثر فقہاء کا کہنا ہے کہ یہ پہنے ہوئے کپڑے تھے، امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کی تاویل ان کپڑوں سے کی ہے جن پر نماز پڑھی جاتی ہے، کیوں حدیث خباب کی وجہ سے جس کپڑے کو پہنا ہوا ہو اس پر سجدہ کرنا جائز نہیں ''اتقاء الحر'' یہ مفعول لہ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ابراد کے منافی نہیں۔ پگڑی کے بندھ اور دوسرے کسی پہنے ہوئے کپڑے پر سجدہ کرنا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مکروہ ہے، یہ کراہت ضرورت کے وقت ختم ہوجاتی ہے۔ بہر صورت یہ حدیث شیعہ حضرات کے خلاف دلیل ہے ''متفق علیه ولفظه للبخاری'' میرک کا کہنا ہے کہ چاروں کتابوں میں یہ روایت مذکور ہے۔

زمین پر سورج کے اثرات

۵۹۰ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَاَبْرِدُوْا بِالصَّلَاةِ وفِیْ رواية للبخاری عَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ بِالظُّهْرِ فَاِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ وَاشْتَكَتِ النَّارُ اِلٰى رَبِّهَا فَقَالَتْ رَبِّ اَكَلَ بَعْضِیْ بَعْضًا فَاَذِنَ لَهَا بِنَفَسَيْنِ نَفَسٌ فِی الشِّتَاءِ وَنَفَسٌ فِی الصَّيْفِ اَشَدُّ مَا تَجِدُوْنَ مِنَ الْحَرِّ وَاَشَدُّ مَا تَجِدُوْنَ مِنَ الزَّمْهَرِيْرِ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۱۸/۲ حديثان رقم ۵۳۶۔۵۳۷ ۔وأخره مسلم فی صحيحه ۴۳۱/۱ و۴۳۲۔ حديث رقم (۱۸۵۔۶۱۸) و (۱۸۶۔۶۱۷)۔وأخرج أبوداؤد أوله فی السنن ۲۸۴/۱ حديث رقم ۴۰۲۔ وكذلك الترمذی فی السنن ۲۹۵/۱ حديث رقم ۱۵۷ ۔وكذلك النسائی فی السنن ۲۴۸/۱ حديث رقم ۵۰۰۔ وأيضًا ابن ماجة فی السنن ۲۲۲/۱ حديث رقم ۶۷۸ ۔وأخرجه مالك فی الموطا ۱۶/۱ حديث رقم ۲۸ من كتاب وقوت الصلاة ۔والدارمی فی السنن ۲۹۶/۱ حديث رقم ۱۲۰۸ وأحمد فی المسند ۲۶۶/۲۔

ترجمه: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب گرمی کی شدت ہو تو نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو اور بخاری کی ایک روایت میں حضرت ابوسعیدؓ سے منقول ہے کہ ظہر کی نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھا کرو۔ یعنی ابوسعید خدریؓ کی روایت میں صلوٰۃ کے بجائے ظہر کا لفظ ہے کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی بھاپ میں سے ہے اور جہنم کی آگ نے اپنے رب تعالیٰ سے شکایت کی کہ اے میرے پروردگار میرے بعض نے بعض کو کھالیا ہے۔ چنانچہ اللہ

تعالیٰ نے جہنم کو دو سانس لینے کی اجازت دے دی۔ ایک سانس وہ موسم سرما میں لیتی ہے اور ایک سانس وہ موسم گرما میں لیتی ہے موسم گرما میں جس وقت تمہیں گرمی کی شدت معلوم ہوتی ہے۔ تو اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ وہ ایک سانس گرمی اور ایک سانس سردی میں لیتی ہے۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: ''وعن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ اذا اشتد الحر فابردوا بالصلاة'' یعنی ظہر کی نماز کو۔

۵۹۱ : وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ فَاَشَدُّ مَا تَجِدُوْنَ مِنَ الْحَرِّ فَمِنْ سَمُوْمِهَا وَاَشَدُّ مَا تَجِدُوْنَ مِنَ الْبَرْدِ فَمِنْ زَمْهَرِيْرِهَا.

أخرجه البخاری فی صحيحه ١٨/٢ حديثان رقم ٥٣٦-٥٣٧-وأخره مسلم فی صحيحه ٤٣١/١ و٤٣٢- حديث رقم (١٨٥-٦١٨) و (١٨٦-٦١٧)-وأخرج أبوداوٗد أوله فی السنن ٢٨٤/١ حديث رقم ٤٠٢- وكذلك الترمذی فی السنن ٢٩٥/١ حديث رقم ١٥٧-وكذلك النسائی فی السنن ٢٤٨/١ حديث رقم ٥٠٠- وأيضا ابن ماجة فی السنن ٢٢٢/١ حديث رقم ٦٧٨-وأخرجه مالك فی الموطا ١٦/١ حديث رقم ٢٨ من كتاب وقوت الصلاة-والدارمی فی السنن ٢٩٦/١ حديث رقم ١٢٠٨ وأحمد فی المسند ٢٦٦/٢-

ترجمہ: ''اور بخاری کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ جب تم گرمی کی شدت محسوس کرتے ہو تو اس کا سبب جہنم کا گرم سانس ہوتا ہے اور جس وقت تم سردی کی شدت محسوس کرتے ہو تو اس کا سبب جہنم کا ٹھنڈا سانس ہوتا ہے۔''

تشریح: ''وفی رواية للبخاری عن ابی سعيد بالظهر'' یعنی اسے ٹھنڈے وقت میں داخل کر دو، اس میں تعدیہ کے لئے ہے اور امر ندب کے لئے ''فان شدة الحر من فيح جهنم'' فاء پھر یا پھر حاء یعنی گرمی جہنم کے سانس کہ وجہ سے یا اس کی حرارت کی وجہ یا اس کے جوش کی وجہ سے ہوتی ہے۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فيح جهنم کا معنی ہے جہنم کی گرمی پھیلاؤ اور اس کا انتشار۔ کیونکہ فیح کا معنی ہوتا ہے وسعت، ایک قول کے مطابق اس میں یاء اصل میں واو تھی اور یہ فاح يفوح فهو فيح سے ماخوذ ہے جیسا کہ هان يهون فهو هين پھر اس میں تخفیف کر لی گئی۔ ابن الملک کا قول ہے کہ ظہر کی نماز کو گرمی کی شدت میں ٹھنڈا کیا جانا ایک قول کے مطابق مستحب ہے اس شخص کے لئے جو طالب جماعت ہو (اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے)، جب کہ ایک قول یہ ہے کہ تعجیل اولیٰ ہے حدیث خباب کی وجہ سے کہ جس کے الفاظ یوں ہیں: شكونا الی رسول الله ﷺ حر الرمضاء فی جباهنا واكفنا ولم يشكنا یعنی ہم مسلسل شکایت کرتے رہے مگر ہمیں تاخیر کی اجازت نہ ملی۔ اور معوّل پہلی حدیث ہے اور آخری وقت تک تاخیر کسی عارض کے پیش نہ آنے تک مقید ہے ''واشتكت النار الی ربها'' یہ پہلے جملے کا بیان ہے اگر چہ مبیّن اور مبیَّن کے درمیان واو داخل ہوگئی ہے جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ میں ہے: وان من الحجارة لما يتفجر ۔''فقالت: رب! اكل بعضی بعضا'' تورپشتی فرماتے ہیں کہ پہلی حدیث میں انہوں نے یہ ذکر کیا ہے گرمی کی شدت فیح جہنم کی وجہ سے ہوتی ہے تو اس میں حقیقت اور مجاز دونوں کا احتمال تھا تو اس کی وضاحت یوں کی کہ ''فاذن لها بنفسين'' یعنی لها' فيها کے معنی میں ہے ''نفس فی الشتاء ونفس فی الصيف'' یعنی مراد حقیقت ہے اور کچھ نہیں، پھر اس بات پر بھی تنبیہ کر دی کہ ایک سانس سے گرمی کی شدت پیدا ہوتی ہے اور دوسرے سانس سے سردی کی شدت

پیدا ہوتی ہے کہ: ''اشد ماتجدون من الحر، واشد ماتجدون من الزمهرير'' یعنی سردی۔قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ آگ کا شکایت کرنا اس کی کثرت' جوش اور اس کے اجزاء کے اژدحام سے مجاز ہے کہ آگ کو تنگی محسوس ہونے لگتی ہے اور ہر جزء دوسرے جز میں فنا ہونے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔

پھر نفس بدل ہونے کی بناء پر مجرور ہے۔ابہری کا کہنا ہے کہ اس پر رفع بھی جائز ہے اور اشد صحیح قول کی بناء پر مرفوع ہے۔سید جمال الدین فرماتے ہیں کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی اصل عبارت یہ ہے: ذلك اشد ماتجدون یا پھر یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جس پر قرینہ آنے والی روایت ہے۔امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بخاری کی روایت کے لئے یہ اولیٰ ہے۔سید صاحب فرماتے ہیں کہ اسے بدل ہونے کی بناء پر دال کے کسرہ کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے۔ابن الملک کا کہنا ہے کہ کچھ لوگوں نے اشد میں نفسين کی صفت یا بدل ہونے کی بناء پر نصب بھی نقل کیا ہے، اور یہ کہ نفسين مجرور ہے اور فرمایا کہ کچھ لوگوں نے اشد میں نصب بھی نقل کیا ہے اور یہ احتمال اس وقت ہے جب کہ اعنی کو محذوف مانا جائے، بہرصورت ما یا تو موصولہ ہوگی یا موصوفہ، اور من الحر اور من الزمهرير اس کا بیان ہے ''متفق عليه'' میرک کا کہنا کہ اسے چاروں اصحاب نے نقل کیا ہے۔

''وفي رواية للبخاري فاشد ماتجدون من الحر فمن سمومها'' سین کے فتحہ کے ساتھ ''واشد ماتجدون من البرد فمن زمهريرها''، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آگ میں گرمی کی شدت بھی ہے اور سردی کی شدت بھی اور ایک قول کے مطابق یہ دونوں جہنم کے طبقے ہیں۔ابن الملک کا کہنا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ ہے کہ وہ گرمی کے زمانہ میں فیح کے آثار ظاہر کر دیتا ہے اور سردی میں زمهرير کے آثار، تاکہ گرمی کی شدت اور سردی کی شدت سے پناہ مانگی جائے، لیکن اگر اس کا الٹ ہو جاتا کہ گرمی میں زمهرير کے آثار ظاہر ہوتے اور سردی میں فیح کے تو کوئی فائدہ نہ ہوتا۔باقی بعض اوقات (چند لحظہ) کی گرمیوں سردی اور سردیوں کی گرمی' تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ حرارت کسی اور موقع کے لئے محفوظ کر لیتے ہیں اور پھر وہ تدریجاً لوگوں کے بدنوں اور درختوں کی نشو ونما کے لئے بھیج دی جاتی ہے۔اسی طرح سردی بھی۔

۵۹۲ :وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ حَيَّةٌ فَيَذْهَبُ الذَّاهِبُ اِلَى الْعَوَالِيْ فَيَاْتِيْهِمْ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ وَبَعْضُ الْعَوَالِيْ مِنَ الْمَدِيْنَةِ عَلٰى اَرْبَعَةِ اَمْيَالٍ اَوْنَحْوَهُ . (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢٨/٢ حديث رقم ٥٥٠۔وأخرجه مسلم في الصحيح ٤٣٣/١ حديث رقم (١٩٢۔٦٢١) ولم يذكر "وبعض العوالي......"وأخرجه أبو داوٗد في السنن ٢٨٥/١ حديث رقم ٤٠٤۔واتبعه بحديث عن الزهري ٢٨٦/١ حديث رقم ٤٠٥"والعوالي على ميلين أو ثلاثة قال : واحسبه قال : أو أربعة "۔ وأخرجه النسائي في السنن ٢٥٢/١ حديث رقم ٥٠٧۔وابن ماجة في السنن ٢٢٣/١ حديث رقم ٦٨٢۔وأخرج مالك نحوه في الموطا ٩/١ حديث رقم ١٠ و ١١ من كتاب وقوت الصلاة ۔والدارمي في السنن ٢٩٧/١ حديث رقم ١٢٠٨۔

ترجمہ:''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عصر کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے جبکہ

سورج بلند اور روشن ہوتا تھا۔ اگر کوئی آدمی جانے والا عوالی جا کر واپس آ جایا کرتا تھا اور سورج ابھی بلند ہوتا تھا اور بعض عوالی مدینہ سے (تقریباً) چار میل کے فاصلے پر ہیں۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: ''وعن انس قال: كان رسول الله صلى الله يصلى العصر والشمس مرتفعة حية فيذهب'' یعنی متوجہ ہو جائے ''الذاهب'' یعنی عصر کے بعد ''الى العوالى'' یہ عالیہ کی جمع ہے، یہ مدینہ کے فراز کے معروف علاقہ جات ہیں، قالہ ابن الملک۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ ایک مقام ہے جو مدینہ سے ایک فرسخ دور واقع ہے، ایک قول کے مطابق یہ مدینہ کی ایک بستی کا نام ہے جو مدینہ سے چار میل کی مسافت پر ہے ''فياتيهم'' یعنی وہ واپس آ جاتے یعنی اہل مدینہ، قالہ ابن الملک۔ ظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اہلِ عوالی تک پہنچ جاتے تھے ''والشمس مرتفعة'' یعنی ابھی زرد نہیں ہوتا تھا ''وبعض العوالى من المدينة''، ظاہراً مصنف کے ذکر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا کلام ہے، حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ یہ یا تو زہری کا کلام ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کر رہے ہیں اور یہ کلام مدرج ہے۔ عبدالرزاق نے اپنی روایت میں یوں وضاحت کی ہے: قال الزهرى والعوالى من المدينه على ميلين او ثلاثة اميال او نحو ذالك، چنانچہ یہ اختصار مخل اور مقصود کے خلاف موہوم ہے، عبارت یوں ہونی چاہئے تھی: وعن الزهرى عن انس پھر فرماتے: قال الزهرى: وبعض العوالى الخ، میرک شاہ کی یہی تحقیق ہے ''على اربعة اميال'' یعنی مدینہ کی جہت سے، باقی رہی نجد کی جانب سے عوالی کی مسافت تو وہ آٹھ میل ہے اور یہی مطلب ہے اس روایت کا کہ جس میں فرمایا: ادناها على اربعة اميال واقصاها على ثمانية اميال، اور میل فرسخ کا ثلث ہے اور فرسخ بارہ ہزار مراحل سے عبارت ہے اور مرحلہ تین قدموں سے ''او نحوه'' یعنی بقدرِ مذکور یعنی لگ بھگ چار میل ''متفق عليه'' اس میں نظر ہے کیونکہ حدیث کا جملہ کہ وبعض العوالى...... یہ بخاری کی انفرادیت ہے بقولِ میرک اور میرک صاحب مزید فرماتے ہیں کہ اس روایت کو امام ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔

منافق کی نماز

۵۹۳ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تِلْكَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ يَجْلِسُ يَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتّٰى اِذَا اصْفَرَّتْ وَكَانَتْ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ قَامَ فَنَقَرَ اَرْبَعًا لَايَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْهَا اِلَّا قَلِيْلاً. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فى صحيحه ١/٤٣٤ حديث رقم (١٩٥-٦٢٢)- وأخرجه أبو داؤد فى السنن ١/٢٨٨ حديث رقم ٤١٣ وأخرجه الترمذى فى السنن ١/٣٠١ حديث رقم ١٦٠ - وأخرجه النسائى فى السنن ١/٢٥٤ حديث رقم ٥١١ وأخرجه أحمد فى مسنده ٣/١٤٩-

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عصر کی نماز جو آخر وقت میں پڑھی جاتی ہے' وہ منافق کی نماز ہے کہ وہ بیٹھا ہوا سورج کو دیکھتا رہتا ہے جب سورج زرد ہو کر شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہو جاتا ہے تو جلدی سے اٹھ کر چار ٹھونگے مار لیتا ہے اور اللہ کا ذکر بھی اس نماز میں تھوڑا کرتا ہے اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''وعنه ''یعنی حضرت انس سے ہی''قال قال رسول الله ﷺ تلك صلاة المنافق ''،ابن الملک کا کہنا ہے کہ حکماً مذکور کی جانب اشارہ ہے یعنی عصر کی نماز اصفرار تک مؤخر کردی جائے''یجلس '' حال ہے''یرقب الشمس '' یعنی اس کے نور کا منتظر رہتا ہے''حتی اذا اصفرت '' یعنی سورج،ابن حجر نے عجیب بات کہی ہے کہ اس میں حتی زائدہ ہے یعنی وہ وقت اصفرار کو دیکھتا رہتا ہے''وکانت الشمس بین قرنی الشیطان ''یعنی غروب کے قریب قریب ہو جاتا ہے ''قام ''یعنی نماز کی جانب''فنقر اربعًا ''یعنی جلدی جلدی چار ٹھونگے مار کے چار رکعتیں پوری کر لیتا ہے،نقر کا معنی ہوتا ہے نماز میں جلدی کرنا اور ایک قول کے مطابق یہ قراءت سے ماخوذ ہے اور اس کی تائید اگلے جملے سے بھی ہوتی ہے:''لایذکر الله فیها ''یعنی عدم اعتقاد اور اخلاص سے خالی ہونے کی وجہ سے ذکر نہیں کرتا''الا قلیلا '' ظاہراً یہ منفصل ہے یعنی لیکن وقت مختصر ہونے کی بناء پر کچھ تھوڑا بہت اللہ تعالیٰ کا ذکر کر لیتا ہے اور بس!امام طیبی فرماتے ہیں کہ تلك سے ذہن میں مخصوص نماز کی جانب اشارہ ہے اور خبر ذہن میں موجود چیزوں کا بیان ہے۔ ویجلس...... یہ جملہ استنافیہ ہے جو کہ سابقہ جملے کا بیان ہے اور اذا شرطیہ ہے اور قام اسکی جزا ہے اور شرطیہ استنافیہ ہے اور فنقر یہ نقر الطائر الحبة نقرا سے ماخوذ ہے،جس کا معنی ہوتا ہے ٹھونگا مارنا،باقی رہی یہ بات کہ اس میں چار ٹھونگوں کا ذکر ہے تو یہ باعتبار رکعات ہے نہ کہ باعتبار سجدہ جات۔ یہاں عصر کی نماز کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہ صلوٰۃ الوسطیٰ ہے اور ایک قول کے مطابق یہ نماز اس وقت آتی ہے جب لوگ اپنے کاموں سے تھک ہار چکے ہوتے ہیں۔مظہر کا کہنا ہے کہ جس نے عصر کی نماز اصفرار کے وقت تک مؤخر کی تو اس نے منافقین کی مشابہت اختیار کی کیونکہ منافقین صحت صلاۃ کا اعتقاد نہیں رکھتے بلکہ وہ تو سختی سے بچنے کے نماز پڑھتے ہیں اور تاخیر کی پرواہ نہیں کرتے کیونکہ نہ تو انہیں فضیلت درکار ہوتی ہے اور نہ ہی ثواب۔مسلمان کے ذمے لازم ہے کہ وہ منافقین کی مخالفت کرے''رواہ مسلم ''بقول میرک اس روایت کو امام ابوداؤد،ترمذی اور نسائی نے بھی نقل کیا ہے۔

جس نے عصر کی نماز چھوڑ دی اس کا گھر اجڑ گیا

۵۹۴:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِیْ تَفُوْتُهُ صَلَاةُ الْعَصْرِ فَكَاَنَّمَا وُتِرَ اَهْلُهٗ وَمَالُهٗ . (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۳۰/۲حدیث رقم ۵۲۲۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ۴۳۵/۱حدیث رقم (۲۰۰۔۶۲۶) وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۲۹۰/۱حدیث رقم ۴۱۴۔وأخرجه الترمذی فی السنن ۳۳۰/۱ حدیث رقم ۱۷۵۔وأخرجه الدارمی فی السنن ۳۰۵/۱حدیث رقم ۱۲۳۰۔وأخرجه مالك فی الموطا ۱۱/۱ حدیث رقم ۲۱من کتاب وقوت الصلاة ۔وأحمد فی مسنده ۸/۲۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی کی عصر کی نماز فوت ہوگئی تو گویا اس کا مال اور اس کی اہل واولاد سب ہلاک ہوگئے۔''

تشریح: ''وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ الذی تفوته '' یعنی بغیر اختیار کے''صلاة العصر '' یعنی آخر وقت سے اور ایک قول کے مطابق وقت مختار سے''فکانما وتر ''مفعول ہونے کی بناء پر یعنی اس سے چھین لیا گیا اور

لے لیا گیا''اهله و ماله'' دونوں کے نصب اور دونوں کے رفع کے ساتھ یعنی سرے سے وہ ضائع ہو گئے یا پھر ان میں نقصان ہو گیا۔سید صاحب فرماتے ہیں کہ اسے نصب کے ساتھ وتر کے لئے مفعولِ ثانی ہونے کی بناء پر نقل کیا گیا ہے اور وتر میں نائب فاعل مضمر ہے جو کہ الذی تفوته پر عائد ہے،مطلب یہ ہوگا کہ اس کے گھر والوں اور اس کے مال کو یہ مصیبت پہنچی،جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:ولن يتركم اعمالكم یا پھر یہ سلب کے معنی ہیں اور دو مفعولوں کی جانب متعدی ہے،وتر کو اخذ کے معنی میں ہونے کی بناء پر اسے مرفوع بھی پڑھا گیا ہے،اس صورت میں اہلہ ومالہ نائب فاعل ہوں گے۔الفائق میں اس کا مطلب یہ لکھا ہوا ہے کہ اس کے اہل و مال خراب ہو گئے اور چھن گئے اور یہ وترت فلانا سے ماخوذ ہے اور یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی قریبی رشتہ کو قتل کر دیا جائے اور اسے کوئی نقصان پہنچا دیا جائے اور اس میں کمی کر دی جائے اور اسی سے ماخوذ ہے باری تعالیٰ کا فرمان:ولن يتركم اعمالكم......۔

یعنی اس کے اہل و مال کا نقصان ہو گیا وہ بغیر اہل و مال کے اکیلا اور تنہا رہ گیا،کہا جاتا ہے:وتره حقه یعنی اس کے حق میں کمی ہو گئی،ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ عصر کی نماز کے فوت ہو جانے کا خسارہ اہل و مال کے جاتے رہنے سے زیادہ ہے،بہتر یہ ہے کہ اس کا مطلب یوں بیان کیا جائے کہ انسان کو عصر کی نماز کے فوت ہونے سے یوں ڈرنا چاہئے جیسے اپنے اہل و مال کے فوت ہونے وہ ڈرتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ عصر کے ساتھ باقی نمازوں کو بھی ساتھ ملایا جا سکتا ہے،نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کا نام لے کر دیگر نمازوں پر بھی تنبیہ کر دی ہے،عصر کے نام کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہ صلاۃ الوسطیٰ ہے،اس کا چھوڑنا باقی نمازوں کے چھوڑنے سے زیادہ قبیح ہے،یہ بات تو متعین ہے اس میں کوئی دوسری رائے نہیں،اگر اس میں احتیاط کی بناء پر کوئی دوسرا احتمال بھی بیان کیا جائے تو ہم اسے مناسب نہیں سمجھتے۔کہا جاتا ہے کہ قرآن وحدیث میں اس نماز کا ذکر خاص طور پر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ یہ خرید و فروخت کا وقت ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس میں باری تعالیٰ کے فرمان:﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ......﴾ [النور: ۳۷] ''(یعنی ایسے) لوگ جن کو خدا کے ذکر اور نماز پڑھنے اور زکوۃ دینے سے نہ سوداگری غافل کرتی ہے نہ خرید و فروخت۔''کی جانب بھی اشارہ ہے۔(متفق علیہ)

عصر کی نماز چھوڑنے سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں

۵۹۵ :وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ تَرَكَ صَلَاةَ الْعَصْرِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ. (رواہ البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۳۱/۲ حدیث رقم ۵۵۳۔وأخرجه النسائی فی السنن ۲۳٦/۱ حدیث رقم ٤٧٤ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۲۲۷/۱ رقم ٦٩٤۔وأخرجه أحمد فی المسند ۳٤٩/٥۔۳۵۰۔

ترجمہ:''حضرت بریدہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے عصر کی نماز چھوڑ دی۔گویا اس کے تمام اعمال ضائع ہو گئے۔اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح:''وعن بريدة قال:قال رسول الله ﷺ من ترك صلاة العصر''یعنی جان بوجھ کر،اسی وجہ سے من فاتته نہیں کہا''حبط''اور ایک صحیح نسخہ کے مطابق فقد حبط ہے''عمله''یعنی اس کے سارے دن کے اعمال رائیگاں ہو جائیں گے کیونکہ صلاۃ الوسطیٰ کو چھوڑ کر ایک بہت بڑے ثواب سے محروم رہا،بقول ابن الملک حبوط یعنی بطلان وضیاع سے تعبیر

کرنا تہدیداً وتنبیہاً ہے، یعنی ایسا تو نہیں ہوگا کہ اس کے سابقہ اعمال ضائع ہو جائیں یہ تو اس شخص کے ضائع ہوں گے جو مرتد ہو کر مرے، کیونکہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرة: ۲۱۷] ''اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر (کر کافر ہو) جائے گا اور کافر ہی مرے گا تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں برباد ہو جائیں گے اور یہی لوگ دوزخ (میں جانے) والے ہیں جس میں ہمیشہ رہیں گے'' بلکہ اس روایت کو اسی دن کے اعمال کے سلب ہو جانے پر ہی محمول کیا جائے گا، خاص یہ وہ وقت ہے جب کہ بندوں کے اعمال باری تعالیٰ کی جانب اُٹھائے جاتے ہیں۔ معتزلہ کے خلاف اہل سنت کے پاس بیشمار دلائل ہیں لیکن یہاں ان کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ قالہ الطیبی۔ یعنی معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ کبائر کے ارتکاب سے اعمال صالحہ سلب ہو جاتے ہیں، باقی رہا مرتد ہونا تو وہ مطلقاً سلب اعمال کا سبب ہے احناف کے نزدیک، یہاں تک کہ اس نے اگر حج بھی کیا ہوگا تو اس کا بھی اعادہ کرنا پڑے گا۔ (صحیح بخاری)

نمازِ مغرب اوّل وقت میں مستحب ہے

۵۹۶ : وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ كُنَّا نُصَلِّي الْمَغْرِبَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَنْصَرِفُ اَحَدُنَا وَاِنَّهٗ لَيُبْصِرُ مَوَاقِعَ نَبْلِهٖ . (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/ ۴۰ حديث رقم ۵۵۹۔ وأخرجه مسلم في صحيحه ۱/ ۴۴۱ حديث رقم (۲۱۷۔ ۶۳۷) وأخرجه ابن ماجة في السنن ۱/ ۲۲۴ حديث رقم ۶۸۷۔ وأخرجه أحمد في مسنده ۴/ ۱۴۲۔

ترجمہ: ''حضرت رافع بن خدیج ؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مغرب کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہم میں سے کوئی آدمی اپنے تیر گرنے کی جگہ کو دیکھ سکتا تھا۔''

(بخاری ومسلم)

تشریح: ''وعن رافع بن خدیج'' انصاری اوسی ہیں، غزوۂ بدر صغری میں شریک نہ ہوئے، احد میں مشارکت ثابت ہے، جہاں انہیں یک تیر بھی لگا، یہ زخم عبدالملک بن مروان کے زمانے میں خراب ہو گیا جس کی وجہ سے ان کی موت واقع ہوگئی، ''قال کنا نصلی المغرب مع رسول الله'' یعنی جماعت کے ساتھ ''فینصرف احدنا'' یعنی نماز سے ''وانه'' یعنی اس حال میں کہ ہم میں سے کوئی ایک ''لیبصر'' یعنی انصراف کے بعد یعنی نماز سے فراغت کے بعد ''مواقع نبله'' نون کے فتحہ اور باءِ موحدہ کے کسرہ کے ساتھ یعنی وہ جگہ جہاں تیر گرتا ہے، امام طیبی فرماتے ہیں کہ یعنی مغرب اول وقت میں پڑھی جاتی تھی (اور اتنی روشنی ہوتی تھی کہ) اگر تیر پھینکا جائے تو وہ نظر آتا تھا کہ وہ کہاں گرا ہے؟ میرا خیال ہے کہ فقہاء کا تعجیلِ مغرب میں کوئی اختلاف نہیں ''متفق علیه''، بقول میرک اس روایت کو امام احمد اور اور امام ابوداؤد نے بھی نقل کیا ہے۔

عشاء کی نماز ثلث لیل تک پڑھی جائے

۵۹۷ :وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانُوْا يُصَلُّوْنَ الْعَتَمَةَ فِيْمَا بَيْنَ اَنْ يَّغِيْبَ الشَّفَقُ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ الْاَوَّلِ.

(متفق علیه)

أخرجه البخاري في الصحيح من حديث طويل ٢/٣٤٧ حديث رقم ٨٦٤۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرات صحابہ کرامؓ عتمہ یعنی عشاء کی نماز شفق کے غائب ہونے کے بعد سے اول ثلث لیل تک پڑھتے تھے۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: ''وعن عائشة قالت: كانوا'' یعنی نبی پاک ﷺ اور ان کے اصحاب ''يصلون العتمة'' یعنی نمازِ عشاء۔ابن الملک فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا عشاء کی نماز کو عتمہ کہنا شاید ورودِ نہی سے قبل کا ہے، یا پھر نہی والا قول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تک پہنچا نہیں ہوگا اور یہی ظاہر ہے۔فتدبر۔''فیما بین'' یعنی اس وقت کے درمیان جو''ان یغیب الشفق'' یعنی شفق کے بعد، ومابعد الشفق کو ضروری ہونے کے باوجود آئندہ آنے والے جملے کی وجہ سے حذف کیا ''الی ثلث اللیل الاول'' جر کے ساتھ ثلث کی صفت ہے اور یہی آخری وقت اختیار ہے۔امام طیبی فرماتے ہیں کہ وہ ظاہراً عبارت میں یوں کہنا چاہتی ہیں کہ عشاء کا وقت مغیب شفق اور ثلث لیل کے درمیان ہے، اور اس کی توجیہ یہ ہے کہ مغیب شفق کے کچھ اجزا کو مقدر مانا جائے تا کہ ان دونوں کے درمیانی وقت کی تخصیص ہو جائے اور الی ثلث اللیل کو یصلون کی ضمیر فاعل سے حال بنایا جائے گا، مطلب یہ ہوگا کہ یہ اس وقت کے درمیان نماز پڑھتے تھے کہ جو ثلثِ لیل پر جا کر منتہی ہوتا ہے۔اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عشاء کی نماز غیوب شفق کے دوران واقع ہو جاتی تھی اور یہ درست بھی نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ غیوبت شفق کے متحقق ہونے کے بعد عشاء کی نماز ادا کرتے تھے''متفق علیه''، میرک فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے متفق علیہ ہونے میں نظر ہے، کیونکہ یہ حدیث نقل کرنے میں بخاری منفرد ہیں، ہاں نسائی نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔

نمازِ فجر کو غلس میں پڑھنا

۵۹۸ :وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيُصَلِّى الصُّبْحَ فَتَنْصَرِفُ النِّسَآءُ مُتَلَفِّعَاتٍ بِمُرُوْطِهِنَّ مَايُعْرَفْنَ مِنَ الْغَلَسِ . (متفق علیه)

أخرجه البخاري في الصحيح ٢/٣٤٩ حديث رقم ٨٦٧۔وأخرجه مسلم في صحيحه ١/٤٤٦ حديث (٢٣٢۔٦٤٥) وأخرجه أبوداوٗد في السنن ١/٢٩٣ حديث رقم ٤٢٣۔وأخرجه الترمذي في السنن ١/٢٨٧ حديث ١٥٣۔والنسائي ١/٢٧١ حديث رقم ٥٤٦ وأخرجه ابن ماجة في السنن ١/٢٢٠ حديث رقم ٦٦٩۔ وأخرجه الدارمي في السنن ١/٣٠٠ حديث رقم ١٢١٦ ولم يذكر "من الغلس" وأخرجه مالك في الموطأ ١/٥ حديث رقم ٤ من كتاب وقوت الصلاة ۔وأخرجه أحمد في مسنده ٦/١٧٨۔١٧٩۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز پڑھ کر فارغ ہو جاتے تو وہ عورتیں جو آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتی تھیں چادروں میں لپٹی ہوئی واپس چلی جاتی تھیں اور اندھیرے کی وجہ سے انہیں کوئی نہیں پہچان سکتا تھا۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: ''وعنها'' یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے ''قالت کان رسول الله ﷺ لیصلی الصبح'' ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس میں لام ابتدائیہ ہے، اس پر خبر داخل ہو جاتی ہے اور یہ کوفیین کے ہاں جائز ہے اور جبکہ بصریوں کے ہاں اس وقت جائز ہے جب کہ مبتدا محذوف ہو یعنی اصل عبارت یہ ہوگی: لهو یصلی ''فتنصرف النساء'' یعنی وہ عورتیں جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز ادا کرتی تھیں اور اس زمانے میں حفاظت کامل تھی اور عورتوں کے آنے جانے میں کوئی خطرہ اور فتنہ لاحق نہ تھا، جب فتنے شروع ہوئے تو علماء نے عورتوں کو مساجد میں جانے سے روک دیا۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر نبی پاک ﷺ کو آپ علیہ السلام کے جانے کے بعد عورتوں کو لاحق ہونے والے فتنوں کا علم ہو جاتا تو وہ بنی اسرائیل کی عورتوں کی طرح (اس امت کی عورتوں کو بھی) مساجد میں جانے سے روک دیتے ''ملتفعات'' نصب کے ساتھ حال ہونے کی بناء پر یعنی اپنے چہرے اور بدن چھپاتے ہوئے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ تلفع کا معنی ہوتا ہے شدت لفاع یعنی چہرے کو خوب اچھی طرح چھپالینا ''بمروطهن'' مرط کسرہ کے ساتھ اون یا سلک کی وہ چادر جس سے پردہ پوشی حاصل کی جاتی ہے اور ایک قول کے مطابق جلباب یعنی کرتا اور ایک قول کے مطابق ملحفه یعنی عورت کے اوڑھنے کی ایک چادر ''مایعرفن'' یہ ما نافیہ ہے، یعنی کوئی پہچانی نہیں جاتی تھی۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ عورتیں بھی آپس میں ایک دوسرے کو نہیں پہچانتی تھیں ''من الغلس'' یہ من ابتدائیہ ہے اور لاجل کے معنی میں ہے، قاله الطیبی۔ غلس یعنی رات کے آخری پہر کی تاریکی، پھر اس لفظ کے استعمال میں گنجائش آگئی اور صبح کے بعد آنے والی روشنی پر بولا جانے لگا اور ایک قول کے مطابق یہ غلس المسجد سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے کہ وہ عورتیں تاریکی اور روشنی نہ ہونے کے باعث نہیں پہچانی جاتی تھیں، کیونکہ مسجد میں روشنی صرف سورج طلوع ہونے کے بعد ہی ہوتی تھی ''متفق علیه''، میرک فرماتے ہیں کہ اسے چاروں ائمہ نے نقل کیا ہے۔

۵۹۹: وَعَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ وَ زَیْدَ بْنَ ثَابِتٍ تَسَحَّرَا فَلَمَّا فَرَغَا مِنْ سَحُوْرِهِمَا قَامَ نَبِیُّ اللّٰهِ ﷺ اِلَی الصَّلٰوةِ فَصَلّٰی قُلْنَا لِاَنَسٍ کَمْ کَانَ بَیْنَ فَرَاغِهِمَا مِنْ سَحُوْرِهِمَا وَ دُخُوْلِهِمَا فِی الصَّلٰوةِ قَالَ قَدْرَ مَا یَقْرَءُ الرَّجُلُ خَمْسِیْنَ اٰیَةً. (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/ ۵٤ حدیث رقم ۵۷٦۔ وأخرجه أحمد فی مسنده ۳/ ۱۷۰۔

ترجمہ: حضرت قتادہؓ حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور زید بن ثابت نے سحری کھائی۔ سحری سے فراغت کے بعد رسول اللہ ﷺ نماز کے لئے کھڑے ہوئے اور نماز پڑھی۔ حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت انسؓ سے پوچھا کہ ان دونوں کے سحری سے فارغ ہونے اور نماز شروع کرنے کے درمیان کتنا وقت ہوتا ہے؟ تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اتنے وقت کا وقفہ تھا کہ جس میں کوئی آدمی پچاس آیات تلاوت کر لے۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت

کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

قتادۃ بن دعامۃ۔ یہ قتادۃ ہیں۔ دعامہ کے بیٹے ہیں۔ ان کی کنیت ''ابوالخطاب السدوسی'' ہے۔ نابینا اور قوی الحافظہ ہیں۔ بصرہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار تابعین کے تیسرے طبقہ میں ہوتا ہے۔ بکر بن عبداللہ مزنی کا ارشاد ہے کہ ''جس کا جی چاہے کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ قوی الحافظہ شخص کی زیارت کرے تو وہ قتادہ کو دیکھئے۔ ہمیں آج تک کوئی شخص ان سے زیادہ قوت حفظ کا مالک نہیں ملا''۔ خود قتادہ کہتے ہیں کہ جو بات بھی میرے کان میں پڑتی ہے اس کو میرا قلب محفوظ کر لیتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ کوئی قول بغیر اس کے مطابق عمل کے مقبول نہیں اس لیے جس کا عمل اچھا ہو گا اسی کا قول خدا کے یہاں مقبول ہو گا۔ عبداللہ ابن سرجس اور انس اور دیگر بہت سے حضرات سے روایت کی۔ ان سے ایوب، شعبہ اور ابوعوانہ وغیرہ نے احادیث کی روایت کی ہے۔ انتقال ۱۰۷ھ میں ہوا۔

تشریح: قالہ الطیبی۔ ''عن انس، ان نبی اللہ'' ایک نسخہ میں یوں ہے: ان النبی صلی اللہ عیہ وسلم وزید بن ثابت تسحرا یعنی سحری کھاتے: ''فلما فرغا من سحورھما'' سین کے فتحہ کے ساتھ اس چیز کا نام ہے جس سے سحری کی جاتی ہے، ایک قول کے مطابق ضمہ کے ساتھ مصدر ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ السحو رسین کے فتحہ کے ساتھ ھو المحفوظ یعنی راویوں کی طرف سے اور اگر اس پر ضمہ دے دیا جائے تو بھی جائز ہے جیسے وَضوء اور وُضوء ''قام نبی اللہ'' ایک نسخہ میں یوں ہے: قام النبی ﷺ ''الی الصلاۃ'' یعنی معینہ نماز کے لیے اور یہاں مراد فجر کی نماز ہے ''فصلی'' یعنی امام بن کر اور زید بن ثابت ساتھ تھے ''قلنا لانس: کم کان'' یعنی کتنی مقدار تھی؟ ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اگلا جملہ ہے یعنی کتنا زمانہ تھا؟ ''بین فراغھما من سحورھما ودخولھما فی الصلاۃ؟ قال: قدر'' نصب کے ساتھ اس کی خبر مقدر ہو گی یعنی اصل عبارت یہ ہو گی: کان مابینھما قدر اور اس میں رفع بھی جائز ہے کہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی اصل عبارت یہ تھی: ''الفاصلۃ قدر مایقرأ الرجل خمسین آیۃ'' تورپشتی فرماتے ہیں کہ یہ اندازہ عام مسلمانوں کا نہیں بلکہ رسولِ پاک ﷺ کا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اطلاع دی تھی اور آپ علیہ السلام معصوم عن الخطا تھے، نقلہ الطیبی۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص صبح کے وقت کے دخول کے بارے میں ماہر اور اسے علم نجوم کے واسطے سے اس کا یقین بھی ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ نماز کو بھی اس مقدار سے مؤخر کرے۔ میرا خیال ہے کہ یقین کہاں ہو سکتا ہے حالانکہ امورِ دین میں بھی خطا کا احتمال ہوتا ہے، اسی وجہ سے فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو چاند کے بارے میں علم بھی ہو تو تب بھی روزہ اور افطار کا اندازہ کرنا درست نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ ''رواہ البخاری'' اور بقولِ میرک اس روایت کو امام نسائی و امام احمد نے بھی نقل کیا ہے۔

برے حکمران نماز میں سستی کرتے ہیں

۶۰۰: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَیْفَ اَنْتَ اِذَا کَانَتْ عَلَیْكَ

أُمَرَاءُ يُمِيْتُوْنَ الصَّلَاةَ اَوْ يُؤَخِّرُوْنَهَا عَنْ وَقْتِهَا قُلْتُ فَمَا تَأْمُرُنِىْ قَالَ صَلِّى الصَّلَاةَ لِوَقْتِهَا فَاِنْ اَدْرَكْتَهَا مَعَهُمْ فَصَلِّ فَاِنَّهَا لَكَ نَافِلَةٌ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فى صحيحه ٤٤٨/١ حديث رقم (٢٣٨-٦٤٨) وأخرجه أبوداؤد فى السنن ٢٩٩/١ حديث رقم ٤٣١۔ وأخرجه الترمذى فى السنن ٣٢٢/١ حديث رقم ١٧٦۔وأخرج النسائى نحوه فى السنن ١١٣/٢ حديث رقم ٨٥٩۔وأخرجه ابن ماجة فى السنن ٣٩٨/١ حديث رقم ١٢٥٦۔وأخرجه الدارمى فى السنن ٣٠٤/١ حديث رقم ١٢٢٨ وأخرجه أحمد فى المسند ١٦٩/٥۔

ترجمہ: ’’حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے کہا اس وقت تم کیا کرو گے جب تمہارے حکمران نماز کو ضائع کر دیں گے یا وقت سے تاخیر کر دیں گے؟ میں نے عرض کیا ایسے وقت کے لئے آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس صورت میں تم اپنی نماز پڑھ لو اور پھر ان کے ساتھ بھی نماز پڑھ لو یہ نماز تمہارے لئے نفل ہو جائے گی۔ اس حدیث مبارکہ کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔‘‘

تشریح: ’’**وعن ابی ذر قال قال رسول الله ﷺ كيف انت**‘‘ یعنی تمہارا کیا حال ہوگا اور کیا معاملہ ہوگا؟ ’’**اذا كانت عليك امراء**‘‘ یہ امیر کی جمع ہے، اور امراء الف تانیث کی وجہ سے غیر منصرف ہے یعنی تم پر مسلط کئے گئے امراء ’’**يميتون الصلاة**‘‘ یعنی اسے مؤخر کرنے لگیں ’’**او يؤخرونها**‘‘ یعنی نماز کو ’’**عن وقتها**‘‘ یعنی وقت مختار سے، او کے ذریعے ظاہر کیا جانے والا یہ شک راوی کی جانب سے ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابوذر کا شک محل بحث ہے، امام طیبی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یعنی تمہارا کیا حال ہوگا جب تم یہ دیکھو گے کہ تمہارے امراء و حاکم نماز میں سستی کرنے لگے ہیں اور وقت سے مؤخر کرنے لگے ہیں، اور تم ان کی مخالفت بھی نہ کر سکتے ہو گے، اگر تم ان کے ساتھ نماز پڑھنا چاہو گے تو تم فضیلت سے ہاتھ دھو بیٹھو گے، اگر ان کی مخالفت کرو گے تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے اور علیک' کان کی خبر ہے یعنی امراء تم پر مسلط و قاہر ہوں گے۔ اس حدیث میں یہ اخبار غیب ہے، اور ایسا بنو امیہ کے دور میں ہوا، تو یہ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہوا ’’**قلت: فما**‘‘ ایک نسخہ میں ہے **فماذا**۔ ’’**تأمرني؟**‘‘ یعنی میرے لئے اس وقت کیا کرنے کا حکم ہے؟ ’’**صل الصلاة لوقتها**‘‘ یعنی وقت مستحب میں میں نماز پڑھو ’’**فان ادركتها**‘‘ کہ تو اس میں حاضر ہو جائے ’’**معهم، فصل**‘‘ (ان کے ساتھ بھی نماز پڑھو لو)' مشکوٰۃ شریف کے صحیح نسخوں میں یوں ہی ہے، میرک نے تصحیح کے بارے میں نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ مصابیح کے اکثر نسخوں میں فصلہ ھاءِ سکتہ کی بناء پر ہے اور صحیح نسخوں میں **فصلها** ہی ثابت ہے یعنی نماز ادا کر لو۔

مصابیح کے بعض شراح نے **فصل هكذا**، بعض نے **فصلها** اور بعض نے **فصله** نقل کیا ہے یعنی فرض ادا کر لو یا جو تم پا لو یا یہ ہاءِ سکتہ ہے اور ہمارے اور بعض شوافع کے نزدیک یہ حکم ظہر اور عشاء پر محمول ہے، کیونکہ فجر اور عصر کے بعد نوافل نہیں ہوتے اور مغرب کا اعادہ ہمارے ہاں نہیں ہو سکتا، کیونکہ نفل تین رکعت نہیں ہو سکتے اگرچہ اس کے ساتھ ایک رکعت اور بھی ملائی جائے پھر بھی جائز نہیں کیونکہ اس میں امام کی مخالفت لازم آ جائیگی، شوافع کے ہاں اس وجہ سے ناجائز ہے کہ جفت بن جائے گا (یعنی کل چھ رکعتیں ہو جائیں گی) پس اگر اعادہ کرے گا تو یہ مکروہ ہوگا، ظاہر حدیث چونکہ مطلق ہے اس لئے کراہت مرتفع ہو جائیگی کیونکہ

ضرورات، محظورات کو رفع کر دیتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ نماز پڑھ لو اور اس میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ وہ دوبارہ پڑھتے وقت اعادہ کی نیت کر لے یا نفل کی نیت کر لے، چنانچہ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ جماعت کے ساتھ نماز کا اعادہ سنت ہے اور اس سے روکنے والے کے خلاف یہ حدیث دلیل ہے، یہ قول درست نہیں، بلکہ یہ حدیث تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ دوبارہ ادائیگی بطورِ نفل ہوگی نہ کہ بطورِ قضا اور اعادہ۔ ''فانها لك نافلة'' یعنی تیرے لئے اس میں بھلائی کا فائدہ ہے اور ان کے لئے اجر کا نقصان ''رواہ مسلم'' اور بقول میرک اصحابِ ستہ چاروں ائمہ نے اسے نقل کیا ہے۔

سورج کے طلوع اور غروب کے وقت نماز پڑھنے کا حکم

۱۰۱ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصُّبْحِ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ اَدْرَكَ الصُّبْحَ وَمَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الْعَصْرِ قَبْلَ اَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ اَدْرَكَ الْعَصْرَ. (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۵٦ حدیث رقم ۵۷۹۔ وأخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۴۲۴حدیث (۱٦۳۔۶۰۸) وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۲۸۸ حدیث رقم ۴۱۲۔ وأخرجه الترمذی فی السنن بمعناه ۲/۴۰۲ حدیث رقم ۵۲۴۔وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۲۵۷حدیث رقم ۵۱۷۔وبمعناه ابن ماجة ۱/۳۵٦ حدیث رقم ۱۱۲۲ وأخرجه مالك فی الموطأ ۱/٦ حدیث رقم ۵۔ وأخرجه أحمدفی مسنده ۲/۲۵۴۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس آدمی نے سورج طلوع ہونے سے پہلے فجر کی نماز کی ایک رکعت پالی تو اس نے فجر کی نماز کو پالیا اور جس آدمی نے غروب آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت پالی تو اس نے عصر کو پالیا۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ''**وعن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من ادرك ركعة**'' امام بغوی فرماتے ہیں کہ رکعة سے مراد اس کے رکوع اور سجود ہیں اور یہ فرمانا بطورِ تغلیب ہے۔ ''**من الصبح**'' یعنی فجر کی نماز ''**قبل ان تطلع الشمس فقد ادرك الصبح**'' ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ اس نے فجر کا وقت پالیا، پس اگر وہ پہلے نماز کا اہل نہیں تھا پھر وہ اہل ہو گیا، اگر ایک رکعت کے بقدر بھی وقت بچ گیا تو وہ نماز اس کے ذمہ لازم ہوگئی، ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے نماز کی فضیلت پالی ''**ومن ادرك ركعة من العصر قبل ان تغرب الشمس فقد ادرك العصر**'' امام نووی نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ طلوعِ شمس کے ساتھ ہی صبح کی نماز باطل ہو جاتی ہے، کیونکہ نہی عن الصلاۃ کا وقت داخل ہو گیا ہے، بخلاف غروبِ شمس کے، اور یہ حدیث ان کے خلاف دلیل ہے، اور اس کا جواب یہ ہے کہ صدر الشریعۃ نے کتب اصولِ فقہ سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ جزءِ مقارن وجوبِ صلوٰۃ کی ادائیگی کے لئے سبب ہوتا ہے اور عصر کا آخری وقت، وقت ناقص ہے، کیونکہ وہ سورج کی عبادت کا وقت ہے لہٰذا اس وقت میں نماز بھی ناقص واجب ہوئی، پس جب وہ ادا کرے گا تو وہ ویسی ہی ادا کرے گا جیسی واجب ہوئی تھی، پھر اگر درمیان میں غروبِ شمس کی وجہ سے فساد آجائے تو اس سے نماز فاسد نہیں

ہوگی۔ جب کہ فجر کا تمام وقت' وقت کامل ہے، کیونکہ سورج کے طلوع سے قبل اس کی عبادت نہیں کی جاتی تو سورج طلوع ہوتے وقت نماز بھی کامل ہی واجب ہوئی، لیکن جب نماز کے طلوعِ شمس کی وجہ سے فساد آ گیا تو اس سے نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ نماز جیسی واجب ہوئی تھی ویسی نہیں ادا کر رہا۔ اگر یہاں یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ معرضِ نص میں تعلیل ہے تو اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ جب اس حدیث اور اوقاتِ ثلاثہ میں نہی عن الصلوٰۃ والی روایت میں تعارض آ گیا تو ہم نے ضابطہ کے مطابق قیاس کی جانب رجوع کیا اور قیاس نمازِ عصر میں اس حدیث کو ترجیح دیتا ہے اور فجر میں حدیث نہی کو ترجیح دیتا ہے۔ دیگر باقی نمازیں اوقاتِ ثلاثہ مکروہہ میں حدیثِ نہی کی وجہ سے جائز نہیں ہیں، کیونکہ اس حدیث کے معارض کوئی روایت نہیں ہے۔ "متفق علیه" میرک فرماتے ہیں کہ اسے چاروں ائمہ نے نقل کیا ہے۔

۶۰۲: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَدْرَكَ اَحَدُكُمْ سَجْدَةً مِّنْ صَلَاةِ الْعَصْرِ قَبْلَ اَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَلْيُتِمَّ صَلَاتَهٗ وَاِذَا اَدْرَكَ سَجْدَةً مِّنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَلْيُتِمَّ صَلَاتَهٗ.

(رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۳۷ حدیث ۵۵٦۔ وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۲۵۷ حدیث رقم ۵۱۷ وأحمد فی مسنده ۲/۳۹۹۔ وأخرجه مسلم عن عائشة فی صحیحه بالفاظ متقاربة ۱/۴۲۴ حدیث (۱٦٤۔٦۰۹)۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تم میں سے کوئی آدمی سورج غروب ہونے سے قبل عصر کی ایک رکعت پالے تو اس کو نماز پوری کر لینی چاہئے اور اگر طلوعِ شمس سے قبل فجر کی ایک رکعت پالے تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنی نماز پوری کر لے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔"

تشریح: "وعنه" یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے "قال قال رسول الله ﷺ اذا ادرك احدكم سجدة" یعنی مطلقاً ایک رکعت' یہ اطلاق البعض علی الکل کے قبیل سے ہے یا پھر رکعت کو سجدہ اس وجہ سے کہا کہ رکعت سجدہ سے مکمل ہوتی ہے "من صلاة العصر قبل ان تغرب الشمس فليتم صلاته" یعنی وہ باقی بھی پوری کر لے "واذا ادرك سجدة من صلاة الصبح قبل ان تطلع الشمس فليتم صلاته" یعنی ہمارے ہاں قضا کرے یعنی اسے دوبارہ پڑھے "رواه البخاری" اسی طرح بقول میرک اس روایت کو امام احمد اور امام نسائی نے بھی نقل کیا ہے۔ اس حدیث اور ماقبل والی حدیث کا تعلق عنوانِ باب غیر ظاہر ہے، انہیں یہاں استطراداً نقل کیا ہے یا پھر ان روایات میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ جو شخص نماز کو آخری وقت تک مؤخر کر دے تو وہ نماز قضا نہیں ہوگی اور یہ روایات اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ بہر حال نمازوں کو جلد پڑھنا چاہیئے تاکہ ان کی ادائیگی بروقت ہو جائے۔

نسیان اور نوم کی وجہ سے نماز رہ جانے کا کفارہ

۶۰۳: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَسِيَ صَلَاةً اَوْنَامَ عَنْهَا فَكَفَّارَتُهَا اَنْ يُّصَلِّيَهَا اِذَا ذَكَرَهَا وَفِيْ رِوَايَةٍ لَا كَفَّارَةَ لَهَا اِلَّا ذٰلِكَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/ ۷۰حدیث رقم ۵۹۷ولم یفصل بین الروایتین وزاد الأیة﴿واقم الصلاة لذکری﴾ وأخرجه مسلم فی صحیحه ۱/ ۴۷۷حدیث رقم (۳۱۵ـ۶۸۴)والروایة الثانیة نفس المصدر حدیث (۳۱۴ـ۶۸۴) وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/ ۳۰۷حدیث رقم ۴۴۲ـوأخرجه الترمذی فی السنن ۱/ ۳۳۵ حدیث رقم ۱۷۸ـ (الروایة الأولی)وأخرج النسائی النسیان فقط من الروایة الأولی ۱/ ۲۹۳حدیث رقم ۶۱۳ـ وکذلك ابن ماجة ۱/ ۲۲۷حدیث رقم ۶۹۶ـوأخرجه الدارمی فی السنن ۱/ ۳۰۵حدیث رقم ۱۲۲۹ـوأخرجه أحمد فی مسنده ۳/ ۱۰۰ـ

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا جوشخص نماز پڑھنی بھول جائے یانماز کے وقت سوجائے تو اس کا کفارہ یہی ہے کہ جب یاد آئے تو پڑھ لے اور ایک دوسری روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ اس نماز کو پڑھ لینے کے علاوہ اس کا کوئی اور کفارہ نہیں ہے۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: ''**وعن انس قال قال رسول الله ﷺ من نسی صلاة**''یعنی بھول کر چھوڑ دے''**اونام عنها**'' یہاں نَامَ، غَفَلَ کے معنی میں ہے یعنی وہ نیند کی حالت میں نماز سے غافل رہا، قالہ الطیبی۔ یا نماز سے غافل ہوکر سوگیا ''**فکفارتها**'' یہ اصلِ لغت میں فعّالة کے وزن پر مبالغہ کے لئے آتا ہے، پھر یہ کسی ایسے فعل یا خصلت کا نام بن گیا جس کی غلطی کا کفارہ دیا جاتا ہو یعنی اس کے گناہ کو چھپایا اور مٹایا جاتا ہو''**ان یصلیها اذا ذکرها**''یعنی نسیان اور نیند کے بعد، ایک قول کے مطابق یہاں نسیان کا غلبہ تھا اس لئے ذکر کے لفظ سے تعبیر کرکے ایسے معنی بیان کردیئے جو استیقاظ کو بھی شامل ہیں، ظاہراًیوں کہنا چاہیئے تھا کہ نیند چونکہ عام طور پر نسیان طاری کرتی ہے اس لئے اس کے ان دونوں (نینداورنسیان) کے مقابلے میں ذکر کا لفظ استعمال کیا۔مظہر کا کہنا ہے کہ کا قضاء کے علاوہ کوئی کفارہ نہیں اور نہ ہی نسیان نماز کے دوگنے ہونے کو لازم کرتا ہے اور نہ اس میں صدقہ وغیرہ بطور کفارہ دینا پڑتا ہے جیسا کہ روزہ چھوڑنے پر دیا جاتا ہے، یعنی رمضان کا روزہ جب بلا عذر چھوڑ دیا جائے تو کفارہ دیا جاتا ہے اور جس طرح محرم نسک حج میں کوئی چھوڑ دے تو اسے دم، طعام اور روزے رکھنا پڑتے ہیں۔ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو نماز فوت ہوجائے اور پھر یاد آجائے تو اسے مؤخر نہ کیا جائے۔ ''**وفی روایة لاکفارة لها الا ذلك**'' امام طیبی فرماتے ہیں کہ مصنف یہ کہنا چاہتے ہیں ایک دوسری روایت میں اس عبارت کا اضافہ ہے نہ کہ یہ روایت سابقہ روایت پر بدل ہے، کیونکہ اسم اشارہ' مشارالیہ کا تقاضا کرتا ہے اور وہ حدیث کا یہ جملہ ہے: "**ان یصلیها اذا ذکرها**''، روایت کو دوبارہ ذکر کرنے میں تاکید اور حصر کی جانب اشارہ ہے تاکہ اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ نماز کا کفارہ قضاء کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔میرک کا کہنا ہے کہ اس میں تامل ہے، میں کہتا ہوں کہ اصول کی جانب مراجعت سے اس کی وجہ ظاہر ہوجائے گی۔ ''**متفق علیه**''یعنی دونوں روایتیں دونوں حضرات نے نقل کی ہیں۔میرک کا کہنا ہے کہ اس روایت کو ایک جماعت یعنی اصحابِ صحاحِ ستہ نے نقل کیا ہے۔

نیند کی وجہ سے نماز کا رہ جانا کوتاہی نہیں

۶۰۴ :وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَیْسَ فِی النَّوْمِ تَفْرِیْطٌ اِنَّمَا التَّفْرِیْطُ فِی الْیَقْظَةِ

فَإِذَا نَسِيَ اَحَدُكُمْ صَلَاةً اَوْنَامَ عَنْهَا فَلْيُصَلِّهَا إِذَاذَكَرَهَا فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ وَاَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِيْ .(رواه مسلم)

أخرجه مسلم عن أبي قتادة من حديث طويل في صحيحه ١/٤٧٢ حديث رقم (٣١١ـ٦٨١) ولم يذكر فيه قوله تعالى : ﴿وَاَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِيْ﴾ ـ وأخرجه أبوداوٗد بنحوه ١/٣٠٤ حديث رقم ٤٣٧ ـ وأخرجه الترمذى في السنن ١/٣٣٤ـ حديث رقم ١٧٧ ـ وأخرجه النسائى فى السنن ١/٢٩٤ حديث رقم ٦١٥ ـ ولفظ المشكاة له الا أنه لم يذكر الأية ـ الأية ـ وأخرجه ابن ماجة ١/٢٢٨ حديث رقم ٦٩٨ ـ وأخرجه أحمد في المسند ٥/٢٩٨ ـ

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نیند کی وجہ سے نماز کا رہ جانا کوتاہی نہیں بلکہ کوتاہی تو بیداری میں ہوتی ہے۔ لہٰذا جب تم میں سے کوئی نماز بھول جائے یا سو جائے اور نماز رہ جائے۔ جب یاد آئے نماز پڑھ لے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِيْ۔ میری یاد کے وقت نماز پڑھ لیا کرو۔

تشریح: ''وعن ابی قتادة قال قال رسول الله ﷺ ليس في النوم'' یعنی حالت نوم میں ''تفریط'' یعنی کمی جو تاخیر صلاۃ میں نائم کی جانب منسوب ہو ''انما التفريط'' یعنی پائی جاتی ہے ''في اليقظة'' یعنی بیداری کے وقت میں کہ: ''فاذا نسى احدكم صلاة او نام عنها، فليصلها اذا ذكرها'' یعنی نسیان یا نوم کے بعد ''فان الله تعالىٰ قال واقم الصلاة لذكرى'' اس میں لام وقتیہ ہے، امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں بہت سی وجوہات وتاویلات کا احتمال ہے، لیکن ضروری ہے کہ اس آیت کا کوئی ایسا مطلب نکالا جائے جو حدیث کے موافق ہو کیوں یہ حدیث صحیح ہے۔ تو اس صورت میں عبارت یہ ہوگی: ''اقم الصلاة لذكرها يعنى وقت ذكرها'' فرمایا کیونکہ جب اس نے نماز کو یاد کیا تو گویا اس نے اللہ کو یاد کیا یعنی جب ہمیں یاد کرو تو نماز کو قائم کرو۔ فرمایا کہ یا پھر یہاں مضاف مقدر ہے اور اصل میں یوں ہے لذکر صلاتی یا پھر لفظ اللہ کی ضمیر کو صلاۃ کی ضمیر کہ جگہ پر شرافت اور خصوصیت کی بناء پر رکھا گیا اور یہ بات للذکرٰی والی قراءت کی تائید کرتی ہے اور اسے ابن شہاب نے سعید بن میسّب نقل کیا ہے، جیسا کہ امام نسائی اور امام مسلم نے ابن شہاب سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اسے للذکرٰی پڑھا ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں آیت استدلالاً نقل نہیں کی گئی بلکہ امتثال امر کے لئے نقل کی گئی ہے اور وہ اس طرح کہ جب اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام سے ان کے معصوم عن الذنب ہونے کے باوجود یوں کلام کیا ہے اور ان کی جانب تفریط کو منسوب کیا ہے تو جو لوگ معصوم نہیں ہیں ان کے لئے یہ خطاب بطریق اولیٰ ہوگا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے۔ ''رواه مسلم'' ۔میرک فرماتے ہیں کہ اس روایت کو امام ابوداؤد نے بھی نقل کیا ہے۔

الفصل الثانی:

تین چیزوں میں دیر نہ کرو

۶۰۵ :عَنْ عَلِيٍّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا عَلِيُّ ثَلَاثٌ لَّا تُؤَخِّرْهَا الصَّلٰوةُ إِذَا اَتَتْ

وَالْجَنَازَةُ اِذَا حَضَرَتْ وَالْاَيِّمُ اِذَا وَجَدْتَّ لَهَا كُفُوًا۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ١/ ٣٢٠ حديث رقم ١٧١ وقال حديث غريب حسن ـ وأخرجه أحمد في مسنده ١/ ١٠٥ ـ

ترجمہ: ''حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے علی تین چیزوں میں تاخیر نہ کرنا۔ ① ایک نماز ادا کرنے میں جب وقت ہو جائے۔ ② دوم جنازہ میں جب تیار ہو جائے۔ ③ سوم بے خاوند عورت کے نکاح میں جب کہ اس کا کفول جائے۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''**عن علی رضی الله عنه ان النبی ﷺ قال یا علی! ثلاث**'' یعنی مہمات میں سے اور یہ ابتداء انتباہ ہے، مطلب یہ ہے کہ تین چیزیں نماز، جنازہ اور عورت، اسی وجہ سے عدد کو ذکر کیا ''**لاتؤخرها**'' کیونکہ ان کی تاخیر میں آفات ہیں، لہٰذا اس میں جلدی کرو اور یہ چیزیں: یا**العجلة من الشیطان** والی حدیث سے مستثنیٰ ہیں ''**الصلاة**'' رفع کے ساتھ یعنی ان میں سے ایک یا وہ، یہ ربط بعد العطف ہے اور ایک قول کے مطابق یہ ضمیر سے بدل ہونے بناء پر منصوب ہے یعنی یہاں **اعنی** مقدر ہے ''**اذا اتت**'' یعنی تائین اور قصر کے ساتھ یعنی جب ان کا وقت مختار آجائے اور ایک نسخہ میں مد اور نون کے ساتھ ہے۔ امام تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکثر نسخوں میں اتت دو تاؤں کے ساتھ ہے اور یہی اکثر محدثین کے ہاں ہے اور یہ تصحیف ہے، اہلِ اتقان کے ہاں اسے آنت یعنی حانت کے وزن پر محفوظ کیا گیا ہے، عرب یوں کہتے ہیں: **أنى یأنى آنى اذا حان**، ذکرہ الطیبی۔ اس میں بحث ہے کیونکہ ظاہرا یوں کہا جائے گا کہ یہ **آن یئین اینا** سے ماخوذ ہے، ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ حانت کے وزن پر **آن یئین اینا** سے ماخوذ ہے اور یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب وقت داخل ہو جائے، ایک قول کے مطابق یہ **أنى یأنى** سے ماخوذ ہے اور حانت کے معنی میں ہے۔ امام ابہری فرماتے ہیں کہ یہ ''اذا انت'' تھا جو ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ **أنى یأنى** سے ماخوذ ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس کی تائید باری تعالیٰ کے فرمان ﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ﴾ [الحدید: ١٦] ''ابھی تک مؤمنوں کے لئے اس کا وقت نہیں آیا'' سے ہوتی ہے۔ میرک نے ازہار سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ مشہور یہی ہے کہ یہ اتیان سے ماخوذ ہے، ایک قول کے مطابق یہ تصحیف ہے جب کہ محفوظ آنت بروزنِ حانت و بمعنی حانت ہی ہے۔ شرح السنۃ میں ہے کہ یہ **أنى یأنى أینا** سے ماخوذ اور حان کے معنی میں ہے ''**والجنازة**'' مذکورہ دونوں وجہوں اور جیم کسرہ و فتحہ کے ساتھ اس میں دولغتیں ہیں جو نعش اور میت کو کہا جاتا ہے، ایک قول کے مطابق جیم کا کسرہ اور نون کا فتحہ ہے، جب کہ صحیح یہی ہے کہ یہ میت اور نعش کو کہا جاتا ہے۔ ''**اذا حضرت**'' اشرف کا کہنا ہے کہ امام طیبی نے نقل کیا ہے کہ نمازِ جنازہ اوقاتِ مکروہ میں نہیں ہو سکتی، جب کہ ہمارا مذہب بھی یہی ہے الا یہ کہ جنازہ طلوع، غروب اور استواء کے وقت لایا جائے باقی جب ان اوقات سے قبل جنازہ لایا جائے اور اِن اوقات میں اس پر نماز ادا کی جائے تو پھر یہ مکروہ ہے اور سجدہ تلاوت کا بھی یہ حکم ہے، صبح کی نماز سے قبل اور بعد اور عصر کی نماز کے بعد کوئی کراہت نہیں ہے۔ ''**والایم**'' یعنی یاءِ مکسورہ کی تشدید کے ساتھ یعنی کنواری عورت اگرچہ باکرہ ہو ''**اذا وجدت**'' تو پائے یا وہ پائے ''**لها کفوًا**'' امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایّم وہ عورت ہوتی ہے جس کا شوہر نہ ہو یا وہ مرد ہوتا ہے جس کی بیوی نہ ہو چاہے وہ ثیبہ ہو یا باکرہ۔ کفوٗ سے مراد مثل ہے۔ نکاح میں یہ ہونا چاہئے مرد و عورت اسلام، آزادی، نیکی،

نسب، حسن، کسب اور عمل میں مساوی ہوں" رواہ الترمذی" بقولِ میرک اس کے راوی ثقہ ہیں۔

ابتداء وقت میں نماز پڑھنا اللہ کی رضا ہے

۶۰۶: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْوَقْتُ الْاَوَّلُ مِنَ الصَّلَاةِ رِضْوَانُ اللّٰهِ وَالْوَقْتُ الْاٰخِرُ عَفْوُ اللّٰهِ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۳۲۱ حدیث رقم ۱۷۲ وقال حدیث غریب۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نماز کو شروع وقت میں ادا کرنا اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب ہے اور آخر وقت میں ادا کرنا اللہ تعالیٰ کی معافی کا سبب ہے۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔"

تشریح: "وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الوقت الاول" ابن الملک کے بقول اس میں تعجیل مراد ہے، اس سے کچھ اوقات مختص ہیں، یا پھر اول وقت مختار مراد ہے۔ "من الصلاۃ" بقولِ طیبی یہ وقت کے لئے بیان ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ من تبعیضیہ ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے من اوقات الصلاۃ "رضوان اللہ" راء کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ یعنی اللہ تعالیٰ کی کامل رضا کا سبب، کیونکہ اس میں مبادرت الی الخیرات اور مسارعت الی الطاعات کی جانب اشارہ ہے، یہ عبارت یا تو حذفِ مضاف کی خبر ہے یعنی وقت اول اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جانب عجلت کا باعث ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی جانب مؤدی ہے۔ یا پھر یہ مبالغہ پر محمول ہے کہ وقت اول عینِ رضائے الٰہی کا باعث ہے۔ "والوقت الآخر" یعنی یوں کہ اس سے خروجِ وقت کا احتمال ہو جائے یا پھر اس سے مراد وقت کراہت ہے جیسا کہ عصر کی نماز وقت اصفرار میں اور عشاء کی نماز نصف شب کے بعد "عفو اللہ"، شرح السنۃ میں امام شافعی رحمہ اللہ کا فرمان یوں نقل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی محسنین کے لئے اور معافی ہو سکتا ہے کہ مقصرین کے لئے ہو۔ نقلہ الطیبی۔

میں کہتا ہوں شاید کہ رحمت متوسطین کے لئے ہو، پھر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ایک روایت کے الفاظ یوں نقل کئے ہیں "ووسطہ رحمۃ اللہ" یعنی نماز کو وسطِ وقت تک مؤخر کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے بندوں پر کہ اس نے اسے مباح قرار دیا اور وقت اول میں نماز کی ادائیگی کو واجب قرار نہیں دیا، پھر اس تقسیم کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وقت اول' تمام وقت کا ثلث اوّل ہوتا ہے، اسی طرح باقیوں پر بھی قیاس کر لو کیونکہ یہ بڑی مفید چیز ہے۔ امام ابن الملک فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک صبح کی نماز کو اسفار تک مؤخر کرنا، عصر کو سورج کی رنگت کی تبدیلی تک مؤخر کرنا اور عشاء کی نماز کو ثلث لیل تک مؤخر کرنا افضل ہے کیونکہ ان نمازوں کے مؤخر کرنے میں انتظار کی فضیلت ہے اور جماعت کی تکثیر کا فائدہ ہے اور عفو کا ایک معنی فضل (زائد) بھی آتا ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ [البقرۃ: ۲۱۹] "یعنی جو تمہارے اور تمہارے اہل خانہ کے قوتِ لایموت سے زائد ہو وہ خرچ کر دو" مطلب یہ ہے کہ آخر وقت میں بڑے فضائل ہیں۔

اول وقت سے مراد وقت مختار یا مطلق وقت ہے، لیکن کچھ احادیث میں یہ وقت مختص ہے۔ "رواہ الترمذی" اور فرمایا

کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔اس کی سند میں عبداللہ بن عمر العمری ہیں جو اگلی حدیث میں بھی آئیں گے، قالہ میرک۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت تمام طرق سے ضعیف ہے، اگر کسی نے اس کو حسن کہا ہے تو یہ حسن لغیرہ پر محمول ہے۔

سب سے افضل عمل نماز ہے

۶۰۷:وَعَنْ اُمِّ فَرْوَةَ قَالَتْ سُئِلَ النَّبِیُّ ﷺ اَیُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ قَالَ الصَّلَاةُ لِاَوَّلِ وَقْتِهَا . (رواہ احمدوالترمذی وابوداود وَقَالَ الترمذی) لَایُرْوَی الْحَدِیْثُ اِلَّا مِنْ حَدِیْثِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ الْعُمَرِیِّ وَهُوَ لَیْسَ بِالْقَوِیِّ عِنْدَ اَهْلِ الْحَدِیْثِ ۔

أخرجه أحمد فی مسنده ۳۷۴/۶وأخرجه الترمذی فی السنن ۳۱۹/۱حدیث رقم ۱۷۰۔وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۲۹۶/۱حدیث رقم ۴۲۶۔

ترجمہ: حضرت ام فروہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ثواب کے اعتبار سے کونسا عمل افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نماز کو اس کے اول وقت میں پڑھنا۔اس حدیث کو امام احمد، امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صرف عبداللہ بن عمر عمری سے روایت کی جاتی ہے اور وہ محدثین کے نزدیک مضبوط نہیں ہے۔

تشریح: ''وعن ام فروۃ'' انصاریہ، یہ ان عورتوں میں سے ہیں جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے دست اقدس پر بیعت کی اور یہ وہ ام فروہ نہیں جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ ہیں اور ایک قول کے مطابق یہ دونوں ایک ہی ہیں تو اس وقت یہ انصاریہ نہیں ہوں گی، ذکرہ الطیبی۔''قالت سئل النبی ﷺ ای الاعمال افضل'' یعنی ثواب کے اعتبار سے ''قال الصلاۃ لأول وقتها'' ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہاں لام بمعنی فی ہے، جب کہ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لام تاکید یہ ہے، ایسا نہیں جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ قدمت لحیاتی میں ہے یہاں لام وقتیہ ہے کیوں یہاں وقت مذکور ہے اور نہ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ: ﴿فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾ [الطلاق: ۱] میں ہے یعنی عدت سے پہلے، کیونکہ یہاں اول کا ذکر ہے گویا یہ تاکید ہے''رواہ احمد والترمذی وابوداود''۔

''وقال الترمذی: لایروی الحدیث'' یعنی یہ حدیث ''الا من حدیث عبداللہ بن عمر العمري'' یعنی بقول میرک ابن حفص بن عاصم بن خطاب ''وهو لیس بالقوی'' دیگر لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، اسے ابن الملک نے نقل کیا ہے ''عند اهل الحدیث'' میرک کا کہنا ہے کہ ائمہ اربعہ نے اسے نقل کیا اور امام مسلم نے اسے موقوفاً نقل کیا ہے اور اس میں یحییٰ بن سعید کے حافظہ سے متعلق بحث کی گئی ہے۔

اوّل وقت میں نماز افضل ہے

۶۰۸ :وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا صَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةً لِوَقْتِهَا الْاٰخِرِ مَرَّتَیْنِ

حَتّٰی قَبَضَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۳۲۸حدیث رقم ۳۲۸وقال لیس إسناده بمتصل وهو حسن غریب ۔وأخرجه أحمد فی مسنده ۶/۹۲۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی نماز بھی آخر وقت میں دومرتبہ بھی نہیں پڑھی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح قبض کرلی۔اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''وعن عائشة رضی الله عنها قالت ماصلی رسول الله صلاة لوقتها الآخر مرتین'' شاید کہ انہوں جبریل علیہ السلام کے پڑھی جانے والی نماز شمار نہیں کی کیونکہ وہ بطورِ تعلیم تھی اور آپ علیہ السلام کی نماز سائل کے ساتھ' یہ بھی تعلیم کے لئے تھی ''حتی قبضه الله تعالٰی'' یعنی تمام نمازوں کے اوقات وقت اختیار میں تھے مگر جن روایات میں آخر وقت تک مؤخر کرنے کا بیان ہے تو وہ بیانِ جواز کے لئے اور نادر ہے ''رواہ الترمذی'' اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے اور اس کی سند متصل نہیں ہیں، قالہ میرک۔ یہ جائے تامل ہے۔

مغرب کی نماز کے لئے ستاروں کا انتظار نہیں کرنا چاہیے

۶۰۹ :وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَا یَزَالُ اُمَّتِیْ بِخَیْرٍ اَوْ قَالَ عَلَی الْفِطْرَۃِ مَالَمْ یُؤَخِّرُوا الْمَغْرِبَ اِلٰی اَنْ تَشْتَبِكَ النُّجُوْمُ ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۲۹۱ حدیث رقم ۴۱۸۔

ترجمہ: حضرت ابوایوبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ اگر میری امت کے لوگ نماز مغرب کو اتنی تاخیر سے نہ پڑھیں کہ ستارے جگ مگانے لگیں تو ہمیشہ خیر یا فرمایا فطرت اسلام پر رہیں گے۔اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا اور امام دارمیؒ نے اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''وعن ابی ایوب'' یعنی انصاری ''قال قال رسول الله ﷺ لایزال'' نیچے دونقطوں والی یاء اور ایک قول کے مطابق اوپر دونقطوں کے ساتھ ''امتی بخیر او قال علی الفطرة'' یعنی سنت مستمرہ ودائمہ یا وہ اسلام جس کے ارکان و متممات میں کوئی ردوبدل نہ ہوا ہو، یہ شک راوی کی جانب سے ہے ''مالم یؤخروا المغرب الی ان تشتبك النجوم'' یعنی بقول ابن الملک مکڑی کے جالے کی طرح گنجلک ہوجائیں یعنی تمام ستارے ظاہر ہوجائیں اور ایک دوسرے میں خلط ملط ہوجائیں، یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ صرف طلوع ہونے میں کوئی کراہت نہیں۔امام طیبی فرماتے ہیں کہ اپنے کثرتِ ظہور کی وجہ سے خلط ملط ہوجائیں، شرح السنۃ میں ہے اہل علم صحابہ اور تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں نے مغرب میں تعجیل کو پسند کیا ہے، باقی جن روایات واحادیث صحیحہ میں تاخیر کا بیان ہے تو وہ بیانِ جواز پر محمول ہے ''رواہ ابوداود'' اور اس کی سند میں محمد بن اسحاق صاحب مغازی ہیں، بقولِ میرک تحدیث کی صراحت کی وجہ سے ان کی حدیث صحیح ہے۔

۶۱۰ :وَرَوَاہُ الدَّارِمِیُّ عَنِ الْعَبَّاسِ۔

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۲۹۱ حدیث رقم ۴۱۸۔

ترجمه: ''اور امام دارمیؒ نے اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''ورواه'' اور ایک نسخہ صحیحہ میں یوں ہے: ''وروی الدارمی عن العباس''۔

نمازِ عشاء کو تہائی رات تک مؤخر کرنا

۶۱۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِیْ لَاَمَرْتُهُمْ اَنْ يُّؤَخِّرُوا الْعِشَآءَ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ اَوْنِصْفِهٖ۔ (رواه احمد والترمذی وابن ماجة)

أخرجه أحمد فی المسند ۲/۳۵۰ وذکر معه السواك ۔وأخرجه الترمذی فی السنن ۱/۳۱۰ حدیث رقم ۱۶۷ وقال حدیث حسن صحیح۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۲۲٦ حدیث رقم ٦۹۱۔

ترجمه: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر مجھے اپنی امت پر مشقت کا ڈر نہ ہوتا تو ان کو یہ حکم دیتا کہ عشاء کی نماز کو ثلث لیل تک یا نصف لیل تک تاخیر کر کے پڑھیں۔اس حدیث کو امام احمدؒ امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''وعن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ لولا ان اشق علی امتی'' یعنی امت پر مشقت کی ناپسندیدگی نہ ہوتی تو ''لامرتهم'' یعنی وجوبی طور پر ''أن یؤخروا العشاء الی ثلث اللیل'' یعنی گرمیوں میں ''او نصفه'' یعنی سردیوں میں۔میرک فرماتے ہیں کہ یہ تنویع پر محمول ہے اور یہی ظاہر ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں شک ہو راوی کی جانب سے ''رواه احمد والترمذی'' اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، نقلہ میرک'' وابن ماجه''۔

نمازِ عشاء کو تاخیر کے ساتھ پڑھنے کا حکم

۶۱۲: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْتِمُوْا بِهٰذَا الصَّلَاةِ فَاِنَّكُمْ قَدْ فُضِّلْتُمْ بِهَا عَلٰى سَائِرِ الْاُمَمِ وَلَمْ تُصَلِّهَا اُمَّةٌ قَبْلَكُمْ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۲۹۲ حدیث رقم ۴۲۱ ۔وأخرجه أحمد فی المسند ۵/۲۳۷۔

ترجمه: ''حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم عشاء کی نماز کو دیر سے پڑھو۔کیونکہ تمہیں دوسری امتوں پر اس نماز کی وجہ سے فضیلت دی گئی ہے اور تم سے پہلے کسی امت نے اس نماز کو نہیں پڑھا اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''وعن معاذ بن جبل قال قال رسول الله ﷺ اعتموا'' بابِ افعال سے ''بهذه الصلوٰة'' یعنی عشاء کی نماز اور باء تعدیہ کے لئے یعنی اس نماز کو تاریکی میں داخل کر دیا پھر یہ باء تعدیہ کے لئے ہے یعنی یہ نماز پڑھتے ہوئے تاریکی میں داخل ہو جاؤ، یہ جار مجرور حال ہے، امام طیبی فرماتے ہیں کہ اہل عرب یوں کہتے ہیں اعتم الرجل، یہ جملہ اس وقت

بولا جاتا ہے جب کوئی شخص رات کی تاریکی میں داخل ہو جائے۔ امام خلیل فرماتے ہیں کہ اس سے رات کی وہ تاریکی مراد ہے جو شفق کے چھپ جانے کے بعد آئے، یعنی عشاء کی نماز کو ظلمت کے داخل ہونے کے بعد اور جب یہ ثابت ہو جائے شفق غروب ہو گیا ہے اس وقت ادا کرو، اس میں اتنی جلدی نہ کرو کہ وقت داخل ہونے سے پہلے ہی ادا کر بیٹھو، یہ حدیث اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ تاخیر افضل ہے بلکہ یہ حدیث اول وقت کے بیان کے لئے ہے۔ فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ: **اعتم الرجل ای قری ضیفه فی اللیل اذا اخر** سے ماخوذ ہو یعنی جس کے معنی تاخیر کے ہیں، اس صورت میں یہ حدیث تاخیر کے افضل ہونے پر دال ہوگی اور یہ تاخیر ثلث لیل یا نصف لیل تک مقید ہے۔ "**فانکم قد فضلتم بها علی سائر الامم**" امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ جملہ اس بات پر دال ہے کہ سابقہ شرائع بھی ہماری ہی شرائع ہیں جب تک کہ ان کے نسخ پر کوئی دلیل قائم نہ ہو جائے۔ "**ولم تصلها امة قبلکم**" اس قول اور حدیث جبریل کے قول **هذا وقت الانبیاء من قبلك** میں تطبیق یہ ہے کہ عشاء کی نماز سابقہ انبیاء بطورِ نفل اور اضافی نماز پڑھتے تھے، ان کی امتوں پر یہ فرض نہ تھی جیسا کہ تہجد، کیوں تہجد آپ علیہ السلام پر تو فرض تھی لیکن امت پر نہیں، بخلاف دیگر اوقات کے، قالہ الطیبی۔ میرک فرماتے ہیں کہ اس میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ اس طرح نماز نہیں پڑھتے تھے جس طرح تم لوگ اسے مؤخر کر کے لوگوں کے جمع ہونے کا انتظار کر کے اہتمام کے ساتھ پڑھتے ہو "**رواه ابوداود**" اور بقول میرک اس پر سکوت اختیار کیا ہے۔

عشاء کی نماز تیسری تاریخ کا چاند غروب ہونے کے وقت پڑھی جائے

۶۱۳: وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ اَنَا اَعْلَمُ بِوَقْتِ هٰذِهِ الصَّلَاةِ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ الْاٰخِرَةِ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّيْهَا لِسُقُوْطِ الْقَمَرِ لِثَالِثَةٍ۔ (رواه ابوداود والدارمی)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۲۹۱حدیث رقم ۴۱۹وأخرجه الدارمی فی السنن ۱/۲۹۸۔حدیث رقم ۱۲۱۱وأخرجه الترمذی فی السنن ۱/۳۰۶حدیث رقم ۱۶۵۔وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۲۶٤حدیث رقم ۵۲۹وأخرجه أحمد فی مسنده ٤/۲۷۰۔

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں اس نماز یعنی عشاء کی نماز کے وقت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ اس نماز کو تیسری تاریخ کا چاند غروب ہو جانے کے وقت پڑھتے تھے۔ اس حدیث کو امام ابو داؤد اور امام دارمی نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

نعمان بن بشیر۔ یہ نعمان ہیں۔ بشیر رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں۔ کنیت ابو عبداللہ ہے انصار میں سے ہیں۔ مسلمانانِ انصار میں ہجرت کے بعد سب سے پہلے یہی پیدا ہوئے۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے وقت ان کی عمر ۸ سال ۷ ماہ تھی۔ یہ خود اور ان کے والدین صحابی ہیں۔ کوفہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں کوفہ کے والی (حاکم) تھے پھر "حمص" کے حاکم بنا دیئے گئے۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے لیے لوگوں کو مائل کرنا شروع کر دیا۔ اہل حمص

نے ان کو تلاش کر کے ۶۴ھ میں قتل کر دیا۔ ان سے ایک جماعت نے جن میں ان کے بیٹے محمد اور شعبی شامل ہیں' روایت کی۔ ''نعمان'' نون کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: ''وعن النعمان'' نون کے ضمہ کے ساتھ ''ابن بشیر'' رضی اللہ تعالیٰ عنہما ''قال انا اعلم بوقت هذه الصلاة'' یہ تحدیث نعمت کے قبیل سے ہے کہ انہوں نے اس بارے میں اپنے علم کے اضافے کو بتایا حالانکہ سامعین کو ان کی مرویات پر اعتماد تھا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جملہ کا اضافہ ان اکابر صحابہ کی وفات بعد کیا گیا ہو جو اس بارے میں اِن سے زیادہ علم رکھتے تھے ''صلاة العشاء'' جر کے ساتھ بدل ہے، ایک قول کے مطابق اعنی کو مقدر مانتے ہوئے یہ منصوب ہے ''الآخرة'' ایک نسخہ میں یہ صلاۃ کی صفت ہے ''کان رسول الله ﷺ یصلیها لسقوط القمر'' یعنی غروب کے وقت یا سقوطِ غروب کے وقت ''لثالثة'' یعنی مہینے کی تیسری شب کو۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ سقوط القمر سے بدل ہے یعنی بوقت غروب، اس میں بحث ہے، ظاہر یہی ہے کہ سقوط القمر سے متعلق ہے، اس کی تائید اس نسخے سے ہوتی ہے جس میں لیلۃ ثالثۃ نصب کے ساتھ ہے۔ میرک نے ازہار سے نقل کیا ہے کہ لیل کی اضافت ثالثہ کی جانب عشیہ کی تاویل سے ہوگی تاکہ اضافۃ الموصوف الی الصفۃ لازم نہ آئے البتہ کوفیین کے رائے کے مطابق اس میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غالباً اس شب چاند کا سقوط شفق احمر کی غیوبت کے قریب قریب ہوتا ہے، اس حدیث میں امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کی خاص طور پر تصریح ہے کہ عشاء سمیت تمام نمازوں میں تعجیل افضل ہے اور یہاں یہ بات بھی ہے کہ یہ قول غیر محرر ہے، کیونکہ دوسری میں غیوبتِ شفق کے قریب قریب سورج کا سقوط ہوتا ہے نہ کہ تیسری شب میں۔ فتدبر۔ کیونکہ یہ تو امرِ مشاہد ہے: ''رواه ابوداود والدارمی'' اور میرک کا کہنا ہے کہ اس روایت کو امام ترمذی اور نسائی نے بھی نقل کیا ہے اور امام ابوداود اور امام منذری نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے اور امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند عمدہ اور صحیح ہے۔

نمازِ فجر کو اسفار میں پڑھنا افضل ہے

۶۱۴: وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَسْفِرُوْا بِالْفَجْرِ فَاِنَّهٗ اَعْظَمُ لِلْاَجْرِ (رواه الترمذی وابوداود والدارمی) وَلَيْسَ عِنْدَ النَّسَائِيِّ فَاِنَّهٗ اَعْظَمُ لِلْاَجْرِ۔

أخرجه الترمذی فی السنن ۲۸۹/۱ حدیث رقم ۱۵۴ وقال حسن صحیح ۔وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۲۹۴/۱ حدیث ۴۲۴ وذکر "اصبحوا" بدل "اسفروا" وأخرجه الدارمی فی السنن ۳۰۰/۱ حدیث رقم ۱۲۱۷۔ أخرجه النسائی فی السنن ۲۷۲/۱ حدیث رقم ۵۴۸ ولم یذکر "فانه أعظم للأجر" الا أنه أورده فی طریق أخری وذکره ۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن بلفظ "أصبحوا" ۲۲۱/۱ حدیث رقم ۶۷۲ ۔وأخرجه أحمد فی مسنده ۱۴۲/۴۔

ترجمہ: ''حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فجر کو روشنی میں پڑھو کیونکہ اس میں اجر و ثواب زیادہ ہے اس حدیث کو امام ترمذی' امام ابوداوٗد' امام دارمی نے روایت کیا ہے اور نسائی کی روایت میں فَاِنَّهٗ اَعْظَمُ لِلْاَجْرِ الفاظ نہیں ہیں۔''

تشریح: "وعن رافع بن خدیج قال قال رسول الله ﷺ اسفروا بالفجر "یعنی اسے وقت اسفار میں ادا کرو یا پھر یہ کہ اسے اسفار تک طویل کرو اور امام طحاوی نے اسی کو مختار قرار دیا ہے" فانه اعظم للاجر "میرک کا کہنا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسے اسفار میں ادا کرو اور ایک قول کے مطابق اسے اسفار تک طوالت دو اور اسفار صبح کی روشنی کو کہا جاتا ہے، یہ تاویل تغلیس اور اسفار کے سلسلہ میں وارد احادیث کو جمع کرنے کی بہترین تاویل ہے۔ صاحب الازہار کا کہنا ہے کہ شارحین نے اسی کو اختیار کیا ہے جب کہ مذہب یہ نہیں ہے۔ شرح السنۃ میں ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اسے طلوع فجر کے تیقن اور زوالِ شک پر محمول کیا ہے اور اس کی تائید دیگر طرق سے آنے والی اس روایت سے ہوتی ہے، جس میں اسفروا کی جگہ اصبحوا کے الفاظ ہیں۔ کچھ لوگوں نے اسے حدیث ابن مسعود کی وجہ سے دیگر نسخوں پر محمول کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک بار فجر کی نماز اسفار میں ادا کی پھر وفات تک دوبارہ اسفار میں نمازِ فجر ادا نہیں کی۔ خطابی کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور اسے امام ابوداود نے ذکر کیا ہے، کچھ لوگوں نے اس حدیث کو تاریک راتوں پر محمول کیا ہے اور کچھ نے چاندنی راتوں پر، کیونکہ اس میں صبح خوب روشن نہیں ہوتی، کچھ لوگوں نے اسے چھوٹی راتوں پر محمول کیا ہے تاکہ سونے والے بھی نماز کو پا سکیں۔ معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے یمن کی جانب بھیجا تو فرمایا کہ سردیوں میں فجر تغلیس میں ادا کرو اور جس قدر لوگ برداشت کر سکیں اسی قدر قراءت طویل کرو اور جب گرمی کا موسم ہو تو فجر کو اسفار میں ادا کرو، کیونکہ رات جب چھوٹی ہو اور لوگ سو رہے ہوں تو انہیں مہلت دو تا آنکہ وہ بھی نماز کو پالیں، یہ بات شیخ نے شرح السنۃ میں نقل کی ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اسفار کی تاویل فجر کے تیقن کے ساتھ کرنا تا آنکہ طلوع شمس کا شک واقع نہ ہو، یہ کوئی بات نہیں، کیونکہ جب تک واضح نہ ہو جائے اس وقت تک نماز کی صحت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا چہ جائیکہ اجر و ثواب زیادہ ہو حالانکہ کچھ روایات اس کے منافی ہیں جن میں اسفروا بالفجر فکلما اسفرتم فهو اعظم للاجر کے الفاظ ہیں۔ واللہ اعلم۔ "رواه الترمذی وابوداو والدارمی" کچھ نسخوں میں "والنسائی" کے الفاظ ہیں اور یہی ظاہر ہے، لیکن یہ نسخہ مصححہ کے خلاف ہے، میرک کا کہنا ہے کہ اس روایت کو امام نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے "وليس عندالنسائی: فانه اعظم للاجر"۔

الفصل الثالث:

عصر کی نماز میں تعجیل کرنا

۶۱۵ : عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ قَالَ كُنَّا نُصَلِّي الْعَصْرَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ثُمَّ تُنْحَرُ الْجَزُوْرُ فَتُقْسَمُ عَشَرَ قِسَمٍ ثُمَّ تُطْبَخُ فَتُؤْكَلُ لَحْمًا نَضِيجًا قَبْلَ مَغِيبِ الشَّمْسِ . (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ١٢٨/٥ حديث رقم ٢٤٨٥ ـ وأخرجه مسلم فی صحيحه ٤٣٥/١ حديث (١٩٨ ـ ٦٢٥) وأحمد فی مسنده ١٤٣/٤ ـ

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیج ؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز عصر پڑھ کر

اونٹوں کو ذبح کیا کرتے تھے اور پھر ان کو دس حصوں میں تقسیم کیا جاتا۔ اس کے بعد اس کو پکایا جاتا اور پھر ہم سورج غروب ہونے سے قبل کھا کر فارغ ہو جاتے تھے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ''عن رافع بن خدیج قال کنا نصلی العصر مع رسول اللہ ﷺ'' یعنی اکثر یا کبھی کبھار ''ثم تنحر'' تانیث کے ساتھ، تذکیر بھی ہو سکتی ہے۔ نحر سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اونٹ وغیرہ جن جانوروں کی گردن لمبی ہو ان میں نحر سنت ہے اور اس میں ذبح بھی جائز ہے ''الجزور'' اونٹ یا اونٹنی، مگر لفظ مؤنث ہی استعمال ہوتا ہے، چنانچہ اہل عرب کہتے ہیں: هذه الجزور اگرچہ مراد مذکر ہی ہو، قالہ الطیبی۔ اس بناء پر یہ بات تو طے ہوگئی کہ تانیث تنحر ہے ''فتقسم'' تانیث کے ساتھ، باقی جن نسخوں میں مذکر واقع ہے تو وہ درست نہیں، اس پر پہلے بات ہو چکی ہے ''عشر قسم'' یہ بیانِ واقع ہے ''ثم تطبخ'' ایک نسخہ میں ثم نطبخ نون کے ساتھ باب نصر ومنع سے ہے ''فنأكل لحما نضيجا'' یعنی بھونا ہوا ''قبل مغيب الشمس'' امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تقسیم کی دس کے ساتھ تخصیص کرنا، پکانے کو بھوننے کے ساتھ مختص کرنا اور تنحر کا نصلی پر عطف سے زمانہ کے طوالت بتانے کی جانب اشارہ ہے اور یہ کہ نماز اولِ وقت میں ادا ہوتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات گرمیوں کی ہے۔ ابن ہمام نے شرح الہدایہ میں لکھا ہے کہ جب عصر کی نماز تغیر شمس سے قبل ادا کر لی جائے تو غروب تک اس عمل کی انجام دہی کا امکان ہو سکتا ہے اور جب پکانے والے ماہرین رؤساء کے ساتھ ہوں تو ایسا کام بعید از قیاس نہیں۔ (متفق علیہ)

عشاء میں تاخیر کا واقعہ

۶۱۶: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ مَكَثْنَا ذَاتَ لَيْلَةٍ نَنْتَظِرُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةَ الْعِشَاءِ الْاٰخِرَةِ فَخَرَجَ اِلَيْنَا حِيْنَ ذَهَبَ ثُلُثُ اللَّيْلِ اَوْ بَعْدَهٗ فَلَا نَدْرِیْ اَشَیْءٌ شَغَلَهٗ فِیْ اَهْلِهٖ اَوْ غَيْرُ ذٰلِكَ فَقَالَ حِيْنَ خَرَجَ اِنَّكُمْ لَتَنْتَظِرُوْنَ صَلَاةً مَا يَنْتَظِرُهَا اَهْلُ دِيْنٍ غَيْرُكُمْ وَلَوْلَا اَنْ يَّثْقُلَ عَلٰی اُمَّتِیْ لَصَلَّيْتُ بِهِمْ هٰذِهِ السَّاعَةَ ثُمَّ اَمَرَ الْمُؤَذِّنَ فَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَصَلّٰی ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۴۴۲ حدیث رقم (۲۲۰-۶۳۹) وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۲۹۲ حدیث رقم ۴۲۰ وأخرجه فی السنن ۱/۲۶۷ حدیث رقم ۵۳۷۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک رات ہم لوگ عشاء کی نماز کیلئے بہت دیر تک بیٹھے رہے اور رسول اللہ ﷺ کا انتظار کرتے رہے رسول اللہ ﷺ ثلث لیل گزرنے کے بعد یا اس سے بھی تاخیر کے ساتھ تشریف لائے اور ہم کو یہ معلوم نہیں کہ آپ ﷺ گھر کے کسی کام میں مصروف تھے۔ یا اس کے علاوہ کوئی اور عذر تھا رسول اللہ ﷺ نے آتے ہی ارشاد فرمایا کہ تم لوگ نماز کا انتظار کر رہے تھے اور نماز کا انتظار تم لوگ ہی کرتے ہو تمہارے علاوہ کسی اور دین والے نے نماز کا انتظار نہیں کیا اور اگر مجھے اپنی امت پر ثقل گرانی کا خوف نہ ہوتا تو میں اس نماز کو اسی وقت ہمیشہ پڑھا کرتا۔ پھر آپ ﷺ نے مؤذن کو حکم دیا تکبیر کہنے کا اور آپ ﷺ نے نماز پڑھائی۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''وعن عبدالله بن عمر قال مكثنا'' کاف کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ یعنی ہم مسجد میں ٹھہرے ''ذات ليلة'' یعنی ایک شب ''ننتظر رسول الله ﷺ صلاة العشاء'' یہ ننتظر کے لئے ظرف ہے یعنی ہم عشاء کی نماز کے لئے رسول اللہ ﷺ کے منتظر تھے ''الاخرة'' جر کے ساتھ یہ صفت ہے اور ہوسکتا ہے کہ اس کی تانیث مرادف عشاء یعنی عتمہ کی وجہ سے ہو اور اس پر نصب کا بھی احتمال ہے جب کہ صلوۃ کی صفت ہو یا اعنی مقدر ہو۔ ''فخرج الينا حين ذهب'' یعنی گذر گیا ''ثلث الليل او بعده'' یہ حین ذھب پر عطف اور ''أو'' راوی کا شک ہے ''فلاندرى أشىء'' ایک نسخہ میں ای شیء ہے ''شغله فى اهله'' یعنی نماز کی عام تقدیم سے ''او غير ذلك'' کہ آنحضرت ﷺ نے بہت سے لوگوں کو شب کے پہلے پہر میں جگا کر عبادت (نماز کے انتظار) میں مشغول رکھنا چاہا ہو۔ غیر پر رفع ہو تو یہ شیء پر عطف ہوگا اور اگر جر ہو تو یہ اهله پر عطف ہوگا اور ایک نسخہ میں عبارت یوں ہے: او فی غير ذلك ''فقال حين خرج'' یعنی حجرہ مبارک سے ''انكم لتنظرون صلاة ما ينتظرها اهل دين غيركم'' بدل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے اور استثناء ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور قول اول مختار ہے یعنی تمام نمازوں میں سے اس نماز کا انتظار کرنا تمہاری خصوصیات میں سے ہے، تو تم جتنا اس کا انتظار کرو گے اتنا ہی اجر زیادہ ملے گا، جب کہ وہ وقت آرام کرنے کا ہوتا ہے، تو جتنی زیادہ مشقت ہوگی ثواب بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ غافلین میں ذاکر ایسا ہی ہے جیسا کہ بے صبروں میں صابر، اور اس سے وہ اعتراض بھی جاتا رہا جو ابن حجر نے وارد کیا ہے کہ اس حدیث میں تاخیر کی فضیلت پر کوئی دلیل نہیں کیونکہ نماز کے انتظار کا ثواب ہر نماز کو شامل ہے اور یہ حدیث کچھ دیگر لوگوں کے اس خیال کے خلاف بھی دلیل ہے کہ عشاء میں جماعت 'عصر میں جماعت سے افضل ہے اگرچہ عصر کی فضیلت صلوٰۃ وسطی ہونے کی بناء پر زیادہ ہے اور اس کی تردید آگے والے جملے سے بھی ہوتی ہے ''ولولا ان يثقل على امتى لصليت بهم'' یعنی ہمیشہ ''هذه الساعة''۔ امام طیبی کا اس یہ مطلب بیان فرماتے ہیں کہ میں اِس نماز کا اسی وقت میں ادا کرنا لازم قرار دیتا، ''ثم أمر المؤذن فأقام وصلى'' یعنی لوگوں کو نماز پڑھائی۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ اہل علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ عشاء کی تقدیم افضل ہے یا تاخیر؟ تو جو تاخیر کو افضل قرار دیتا ہے وہ اس حدیث سے استدلال کرتا ہے اور جو تقدیم کو افضل قرار دیتا ہے وہ اس بات سے استدلال کرتا ہے کہ عام طور پر رسول اللہ ﷺ سے اس کی تقدیم ثابت ہے، باقی رہی کبھی کبار اس کی تاخیر تو وہ بیانِ جواز یا عذر پر محمول ہے۔

میں کہتا ہوں کہ دوسری دلیل میں کچھ نظر ہے، کیونکہ جب نبی علیہ السلام عام عادت سے ہٹ کر تاخیر کا عذر بیان کر دیا تو اس میں بیان جواز یا عذر کا کوئی مطلب نہیں رہتا جب کہ یہ بات بھی پکی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے یہ تاخیر قصداً تھی' کسی عذر کی وجہ سے نہ تھی اور صحابی کا تردد والا اس بات پر صریح نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ کو کوئی عذر تھا یا نہیں تھا۔ باقی رہی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی بات کہ اس حدیث میں تاخیر کے افضل ہونے کی کوئی دلیل نہیں تو یہ محض تاویل غیر معقول ہے۔ واللہ اعلم۔ پھر فرمایا اس حدیث میں مذکور تاخیر وقت اختیار (نصف لیل یا ثلث لیل) سے باہر نہ ہو۔ (مسلم)

رسول اللہ ﷺ نماز میں تخفیف کرتے تھے

۶۱۷: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي الصَّلَوَاتِ نَحْوًا مِّن

صَلَاتِكُمْ وَكَانَ يُؤَخِّرُ الْعَتَمَةَ بَعْدَ صَلَاتِكُمْ شَيْئًا وَكَانَ يُخَفِّفُ الصَّلَاةَ. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فى صحيحه ١/٤٤٥ حديث رقم (٢٢٧-٦٤٣)۔ وأخرجه أحمد فى المسند ٥/١٠٥۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تمہاری نمازوں کے قریب قریب اوقات میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ مگر عشاء کی نماز تمہاری نماز سے کچھ تاخیر کر کے پڑھا کرتے تھے اور نماز میں تخفیف کرتے تھے۔

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''وعن جابر بن سمرة قال كان رسول الله ﷺ يصلى الصلوات نحوا'' یعنی لگ بھگ ''من صلاتكم'' یعنی ان عمومی اوقات میں ''وكان يؤخر العتمة'' یعنی عشاء کو، شاید یہ حدیث ورودِ نہی سے قبل کی ہے یا پھر تعریفاً یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ یہ لفظ ان کے ہاں مشہور تھا ''بعد صلاتكم'' عمومی وقت میں ''شيئا'' کچھ دیر یا زیادہ دیر ''وكان يخفف الصلاة'' حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یعنی جب امام ہو، اور یہ اغلب ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ سے یہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے بھی لمبی نماز پڑھائی ہے اور مغرب کی نماز میں سورۂ اعراف پڑھی ہے، میں کہتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ کی نماز طوالت کے باوجود مختصر لگتی تھی بخلاف دیگر لوگوں کے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (مسلم)

نماز کا انتظار نماز کے حکم میں ہے

٦١٨: وَعَنْ اَبِىْ سَعِيْدٍ قَالَ صَلَّيْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةَ الْعَتَمَةِ فَلَمْ يَخْرُجْ حَتّٰى مَضٰى نَحْوٌ مِنْ شَطْرِ اللَّيْلِ فَقَالَ خُذُوْا مَقَاعِدَكُمْ فَاَخَذْنَا مَقَاعِدَنَا فَقَالَ اِنَّ النَّاسَ قَدْ صَلَّوْا وَاَخَذُوْا مَضَاجِعَهُمْ وَاِنَّكُمْ لَنْ تَزَالُوْا فِىْ صَلَاةٍ مَا انْتَظَرْتُمُ الصَّلَاةَ وَلَوْلَا ضُعْفُ الضَّعِيْفِ وَسُقْمُ السَّقِيْمِ لَاَخَّرْتُ هٰذِهِ الصَّلٰوةَ اِلٰى شَطْرِ اللَّيْلِ۔ (رواه ابوداود والنسائى)

أخرجه أبو داوٗد فى السنن ١/٢٩٣ حديث رقم ٤٢٢۔ أخرجه النسائى فى السنن ١/٢٦٨ حديث رقم ٥٣٨ وابن ماجة فى السنن ١/٢٢٦ حديث رقم ٦٩٣۔ وأخرجه أحمد فى مسنده ٣/٥۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی۔ اتفاق سے اس دن یہ واقعہ پیش آیا کہ آپ ﷺ تقریباً نصف لیل کے قریب تک تشریف نہ لائے۔ آپ ﷺ نے آمد کے بعد فرمایا تم لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہنا۔ چنانچہ ہم لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے رہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دوسرے لوگوں نے نماز پڑھ کر اپنے اپنے بستر سنبھال لئے اور جب تک تم نماز کے انتظار میں رہو گے۔ تمہارا یہ تمام وقت نماز میں شمار ہوگا اور اگر مجھے ضعیفوں کی کمزوری اور مریضوں کی بیماری کا خیال نہ ہوتا تو میں ہمیشہ کے لئے اس نماز کو نصف لیل تک تاخیر کر کے پڑھتا۔ اس حدیث کو امام ابوداوٗد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''وعن ابى سعيد قال: صلينا'' یعنی ہم نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا چاہی ''مع رسول الله

ﷺ صلاۃ العتمۃ'' یعنی عشاء کی نماز''فلم یخرج حتی مضی نحو'' یعنی قریب قریب''من شطر اللیل'' یعنی نصف شب''فقال'' یعنی پھر نکلے تو فرمایا''خذوا مقاعدکم'' یعنی بیٹھے رہو، ابن حجر کی یہ تشریح کہ اصطفوا للصلاۃ یہ درست نہیں، کیونکہ حدیث میں اس پر کوئی دلالت نہیں''فاخذنا مقاعدنا'' یعنی ہم اپنی جگہوں سے نہیں ہلے''فقال ان الناس'' یعنی بقول ابن حجر باقی لوگ، کیوں آگے ایک حدیث آرہا ہے: لاینتظرھا احد غیرکم۔ اس میں بحث ہے کیونکہ یہ حدیث اہلِ غیر دین لوگوں پر محمول ہے، اور مراد وہ لوگ ہیں جو مسجد نبوی کے اہل نہیں ہیں''قد صلوا'' لام کے فتحہ کے ساتھ ''وأخذوا مضاجعھم'' یعنی اپنے بستر وآرامگاہیں یعنی وہ سوچکے''وانکم لن تزالوا فی صلاۃ'' یعنی حکماً وثواباً ''ماانتظرتھم الصلاۃ'' کیونکہ نماز سے مقصود اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور عبادت کا انتظار بھی عبادت ہی ہوتا ہے''ولولا ضعف الضعیف'' یقین اور بدن کی جہت سے''وسقم السقیم'' سین کے ضمہ اور قاف کے سکون اور دونوں کے فتحہ کے ساتھ ''لأخرت'' یعنی ہمیشہ''ھذہ الصلاۃ'' یعنی عشاء کی نماز کو''الی شطر اللیل'' یعنی نصف شب یا اس کے لگ بھگ یعنی ثلث لیل، جیسا کہ پیچھے گذر چکا۔ (رواہ ابوداؤد والنسائي)

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عصر کی نماز تاخیر سے ہوتی تھی

۶۱۹: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَشَدَّ تَعْجِيْلًا لِلظُّهْرِ مِنكُمْ وَاَنْتُمْ اَشَدُّ تَعْجِيْلًا لِلْعَصْرِ مِنْهُ. (رواہ احمد والترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۳۰۲ حديث رقم ۱۶۱۔ وأخرجه أحمد فی مسنده ۶/۲۸۹۔

ترجمہ: ''حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز تم سے زیادہ جلدی پڑھتے تھے اور تم لوگ عصر کی نماز پڑھنے میں رسول اللہ ﷺ سے جلدی کرتے ہو۔ اس حدیث کو امام احمد اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''وعن ام سلمة قالت كان رسول الله ﷺ اشد تعجيلا للظهر منكم وانتم اشد تعجيلا للعصر منه'' امام طیبی فرماتے ہیں کہ شاید صحابہ کرام مخالفت کے انکار کے لئے ایسا جملہ کہا۔ میرا خیال ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ لوگوں کو ہے۔ بہر حال یہ حدیث عصر کی نماز کی تاخیر کے مستحب ہونے پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ ہمارا (حنفیہ کا) مذہب ہے۔ (رواہ احمد والترمذی)

موسم کی وجہ سے نماز میں تاخیر اور تعجیل ہوسکتی ہے

۶۲۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ الْحَرُّ اَبْرَدَ بِالصَّلَاةِ وَاِذَا كَانَ الْبَرْدُ عَجَّلَ. (رواہ النسائی)

أخرجه النسائی فی السنن ۱/۲۴۸ حديث رقم ۴۹۹۔

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ موسم گرما میں نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھتے تھے اور موسم سرما میں جلدی پڑھتے تھے۔ اس حدیث کو امام نسائی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''وعن انس قال كان رسول الله ﷺ اذا كان الحر ابرد بالصلاة'' یعنی ظہر کی نماز کو اور یہ جمعہ کو بھی شامل ہے جیسا کہ بخاری شریف کی روایت میں ہے ''واذا كان البرد عجل'' یعنی جلدی نماز ادا کرتے تھے، یہ ان تمام احادیث متعارضہ کو جامع ہے جن میں ظاہر اظہر کی تعجیل اور تاخیر مذکور ہے، باقی سخت گرمی میں ظہر کو جلدی پڑھنا تو امام بیہقی فرماتے ہیں کہ یہ منسوخ ہے۔ (رواه النسائي)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے بعد حکمران نمازوں میں تاخیر کرینگے

۶۲۱: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّهَا سَتَكُوْنُ عَلَيْكُمْ بَعْدِيْ اُمَرَاءُ يَشْغَلُهُمْ اَشْيَاءُ عَنِ الصَّلَاةِ لِوَقْتِهَا حَتّٰى يَذْهَبَ وَقْتُهَا فَصَلُّوا الصَّلَاةَ لِوَقْتِهَا فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُصَلِّيْ مَعَهُمْ قَالَ نَعَمْ. (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۱/۳۰۱ حديث رقم ۴۳۳ وفيه زيادة "نعم إن شئت"۔ وأخرجه أحمد في مسنده ۶/۷۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھ سے کہ میرے بعد عنقریب تم پر ایسے حکمران ہوں گے جنہیں دنیا کے امور وقت پر نماز پڑھنے سے روکیں گے یہاں تک کہ نماز کا وقت خارج ہو جائے گا۔ لہٰذا تم لوگ اپنی نمازیں وقت پر پڑھتے رہنا۔ ایک آدمی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول پھر ان کے ساتھ بھی نماز پڑھیں۔ فرمایا ہاں ان کے ساتھ بھی نماز پڑھو۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''وعن عبادة بن الصامت قال قال لی رسول الله ﷺ انها'' یہ ضمیر قصہ ہے اور مابعد اس کی تفسیر ہے ''ستكون عليكم بعد امراء'' امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس کی تشریح فصل اول میں گذر چکی ہے ''يشغلهم'' یاء اور تاء اور غین کے فتحہ کے ساتھ، ایک نسخہ میں یاء یا تاء کے ضمہ اور غین کے کسرہ کے ساتھ ہے ''اشياء'' یعنی امور ''عن الصلاة'' یعنی جنس نماز ''لوقتها'' یعنی وقت مختار سے ''حتى يذهب وقتها'' یعنی اور مکروہ وقت داخل ہو جائے گا ''فصلوا'' یعنی تم لوگ ''الصلاة لوقتها'' یعنی اگرچہ تنہا، لیکن اس طرح پڑھو کہ کوئی فتنہ فساد نہ کھڑا ہو جائے ''فقال رجل: يارسول الله! اصلي'' ہمزہ استفہام کو حذف کرنے کے ساتھ ''معهم؟'' یعنی اگر میں ان کے ساتھ پالوں تو ''قال: نعم'' کیونکہ اسی میں خیر اور دفعۃ خیر سے نماز پڑھنے پر مواخذہ ہوگا

۶۲۲: وَعَنْ قَبِيْصَةَ بْنِ وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَكُوْنُ عَلَيْكُمْ اُمَرَاءُ مِنْ بَعْدِيْ يُؤَخِّرُوْنَ الصَّلَاةَ فَهِيَ لَكُمْ وَهِيَ عَلَيْهِمْ فَصَلُّوْا مَعَهُمْ مَاصَلُّوا الْقِبْلَةَ. (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۱/۳۰۱ حديث رقم ۴۳۴۔

ترجمہ: حضرت قبیصہ بن وقاصؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ میرے بعد تمہارے

ایسے حکمران ہوں گے جو نماز کو تاخیر سے پڑھیں گے اور وہ نماز تمہارے لئے فائدہ مند ہوگی اور ان کے لئے وبال ہوگی۔ لہٰذا جب تک وہ قبلہ کی طرف نماز پڑھتے رہیں تم بھی ان کے ساتھ نماز پڑھتے رہنا۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

قبیصہ بن وقاص: یہ قبیصہ ہیں، وقاص سلمی کے بیٹے ہیں۔ بصرہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ان کا شمار اہل بصرہ میں ہے۔ ان سے صالح بن عبید نے روایت کی۔ مشکوٰۃ شریف میں غالباً ان سے صرف یہی ایک روایت منقول ہے۔

نوٹ: ''قبیصہ بن وقاص سے بطور مصنف الاکمال (غالباً) نہیں بلکہ (یقیناً) ایک یہی روایت منقول ہے۔ دوسرے قبیصہ۔ قبیصہ بن وقاص نہیں بلکہ قبیصہ بن ہلب ہیں جن سے ''نماز میں ہاتھ باندھنے کا بیان'' کے تحت حدیث آئی ہے۔ (حافظ)

تشریح: ''وعن قبیصة بن وقاص قال: قال رسول اللہ ﷺ انها'' ایک نسخہ میں یوں ہی ہے: ''یکون علیکم امراء من بعدی یؤخرون الصلاۃ'' یعنی ان کے وقت مختار سے ''فھی لکم وھی علیھم'' یعنی وقت سے تاخیر کی گئی نماز تمہارے لئے نافع ہے کیونکہ تمہاری یہ تاخیر ضرورت کے پیش نظر ان کے تابع ہو کر ہوگی اور یہ ان کے لیے مضر ہے، کیونکہ وہ عدمِ تاخیر پر قادر ہوں گے، وہ تو آخرت کو چھوڑ کر دنیا کے کاموں میں مشغول ہو چکے ہوں گے۔ امام طیبی رحمہ اللہ نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جب تم اول وقت میں نماز ادا کر لو تو پھر ان کے ساتھ بھی پڑھ لو اور یہ تمہارے لئے فائدہ مند ہوگا اور نماز کی مضرت اور اس کا وبال ان کے سر ہوگا کیونکہ انہوں نے نماز کو مؤخر کیا، جیسا کہ اس کی تفصیل فصل اول کی تیرہویں روایت میں گذر چکی ہے۔ ''فصلوا'' لام کے ضمہ کے ساتھ ''معھم'' یعنی امراء کے ساتھ ''ماصلوا'' لام کے فتحہ کے ساتھ ''القبلة'' یعنی جب تک وہ قبلہ (قبلہ اسلام یعنی کعبہ) کی جانب منہ کر کے نماز پڑھتے رہیں، ''رواہ ابو داؤد''۔

لوگوں کے ساتھ بھلائی کرو اور ان کی برائی سے بچو

۶۲۳: وَعَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَدِيِّ بْنِ الْخِيَارِ اَنَّهُ دَخَلَ عَلٰى عُثْمَانَ وَهُوَ مَحْصُوْرٌ فَقَالَ اِنَّكَ اِمَامُ عَامَّةٍ وَنَزَلَ بِكَ مَاتَرٰى وَيُصَلِّيْ لَنَا اِمَامُ فِتْنَةٍ فَنَتَحَرَّجُ فَقَالَ الصَّلَاةُ اَحْسَنُ مَا يَعْمَلُ النَّاسُ فَاِذَا اَحْسَنَ النَّاسُ فَاَحْسِنْ مَعَهُمْ وَاِذَا اَسَاءُوْا فَاجْتَنِبْ اِسَاءَتَهُمْ. (رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/ ١٨٨ حديث رقم ٦٩٥۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عدی بن خیارؓ سے روایت ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جب کہ وہ اپنے گھر کے اندر محصور تھے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ ہم سب کے امام اور امیر ہیں اور آپ پر جو مصائب نازل ہیں آپ انکو دیکھ رہے ہیں اور ہمیں فتنہ اور فساد والا ایک امام نماز پڑھاتا ہے۔ جس کے پیچھے نماز پڑھنا ہم گناہ سمجھتے ہیں یہ سن کر حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ نماز لوگوں کے تمام اعمال میں سے افضل عمل ہے۔ لہٰذا جب لوگ نیکی اور خیر کا کام کریں تو تم بھی ان کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرو اور اگر وہ برائی کریں تو تم ان کی برائیوں سے بچو۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا

ہے۔

تشریح: "وعن عبيد الله بن عدى بن الخيار " بقول مؤلف ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے، امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قرشی زہری ہیں اور ایک قول کے مطابق ثقفی ہیں "انه دخل على عثمان وهو " یعنی عثمان رضی اللہ عنہ "محصور " یعنی اپنے گھر میں محبوس تھے، مصر سے آنے والے اہل فتنہ نے ان کو خلافت کے دست بردار یا قتل کرنے کے لئے ان کا محاصرہ کیا ہوا تھا، کیونکہ ان کا یہ گمان تھا کہ انہوں نے محمد بن ابی بکر کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا وغیرہ وغیرہ جب کہ وہ اس سے بری تھے۔ "فقال " یعنی عبید اللہ "انك امام عامة " یعنی آپ خلیفہ اور مسلمانوں کے امام ہیں کیونکہ اہل شوریٰ وغیرہ کا ان کی امامت پر اجماع تھا "ونزل بك ماترى " یعنی مصیبتیں "ويصلى بنا امام فتنة " یعنی ہمیں اس فتنہ کی وجہ سے آپ کے علاوہ لوگ امامت کرواتے ہیں۔ امام طیبی فرماتے ہیں اس سے مراد کنانہ بن بشر ہے، "ونتحرج " یعنی ہم امام الفتنۃ کے ساتھ نماز پڑھنے سے گریز کرتے ہیں، امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد گناہ سے بچنا ہے "فقال " یعنی حضرت عثمان نے "الصلاة احسن ما يعمل الناس " یعنی مسلمانوں کا بہترین کام نماز ہے "فاذا احسن الناس فاحسن معهم واذا اساؤا فاجتنب اساء تهم " یعنی ان کے ساتھ نماز پڑھنا ان کے ساتھ احسان کرنے کے درجہ میں نہیں آتا۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ امام الفتنۃ سے فتنہ کے آثار اور امیر المؤمنین کا ان کے گھر میں محصور ہونا مراد ہے، اور امامت عامہ سے مراد امامت کبریٰ یعنی خلافت ہے، امام الفتنۃ سے مراد امامت صغریٰ ہے جو کہ صرف نماز کی امامت ہے، امام عامہ کے مقابلہ میں امام فتنہ لانے میں ان کی امامت کی حقیت اور اس پر لوگوں کے اجماع اور مخالفین کے باطل ہونے کی جانب اشارہ ہے، پھر امیر المؤمنین کے انصاف کو بھی دیکھو کہ انہوں نے کیسا جواب دیا کہ اچھے کاموں میں ان کی متابعت اور برے کاموں میں ان سے اجتناب کا حکم دیا اور اس کو پھر عام بھی رکھا کہ الناس کی جگہ ضمائر استعمال کیں، اور اس حدیث میں اس بات کی دلیل بھی موجود ہے کہ فجار اور فرقہ باغیہ کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔

بَابُ فَضَائِلِ الصَّلٰوةِ

نماز کے فضائل کا بیان

ایک نسخہ میں اسی طرح، اس میں تنوین اور سکون دونوں کا احتمال ہے، ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ باب نماز کی فضیلتوں اور ان کے اوقات کے متممات کے بیان میں ہے اور ایک نسخہ میں: فضل الصلوات یا فضیلة الصلوات ہے، جب کہ ایک نسخہ میں فی فضل الصلوات فی مواقیتها یعنی فی کے اضافہ کے ساتھ، اور مصابیح میں صرف فصل کا لفظ منقول ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس فصل کو ماقبل فصل سے علیحدہ ذکر اس وجہ سے کیا کہ اس کی احادیث کا تعلق دوسری جنس ہے۔

الفصل الاول:

نمازِ فجر اور عصر کی فضیلت

۶۲۴: عَنْ عُمَارَةَ بْنِ رُوَيْبَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَنْ يَلِجَ النَّارَ اَحَدٌ صَلّٰى قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا يَعْنِى الْفَجْرَ وَالْعَصْرَ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فى صحيحه ١/٤٤٠ حديث رقم (٢١٣-٦٣٤)۔وأخرجه أبوداؤد فى السنن ١/٢٩٧ حديث رقم ٤٢٧۔ وأخرجه النسائى فى السنن ١/٢٣٥ حديث رقم ٤٧١۔ولم يذكر "يعنى الفجر والعصر"۔ وأخرجه أحمد فى المسند ٤/١٣٦۔

ترجمہ: ''حضرت عمارہ بن رویبہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ وہ آدمی ہرگز جہنم میں نہیں جائے گا جس نے طلوعِ شمس اور غروبِ شمس سے پہلی نماز پڑھی یعنی عصر اور فجر کی۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

عمارہ بن رویبہ۔ یہ عمارہ بن رویبہ ثقفی ہیں۔ طبقۂ صحابہ میں سے ہیں۔ ان کا شمار کوفیوں میں ہے۔ ابوبکر وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں۔ عمارہ عین کے پیش اور میم غیر مشدد کے ساتھ ہے۔

تشریح: ''رویبہ'' تصغیر کے ساتھ ہے۔ ''رویبہ'' کے بارے میں میرک رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ یہ کلمہ مہموز نہیں ہے اور طیبی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ مہموز ہے۔

''**عن عمارة**'' عین کے ضمہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ ''**ابن رويبة**'' میرک فرماتے ہیں کہ یہ غیر مہموز ہے، امام طیبی فرماتے ہیں کہ ہمزہ کے ساتھ ہے، اور وہ ثقفی ہیں، ان کا شمار کوفیین میں ہوتا ہے ''**قال سمعت رسول الله** ﷺ **يقول لن يلج** ''یعنی ہرگز داخل نہیں ہوسکتا ''**النار احد**'' یعنی سرے سے عذاب کے لئے، یا ہمیشہ کے لئے، کیونکہ صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کچھ مسلمانوں کو قیامت کے دن لایا جائے گا ان کی نمازیں بھی ہوں گی، روزے بھی ہوں گے جب کہ اس پر لوگوں کے بوجھ ہوں گے چنانچہ لوگ اس کے اعمال لے جائیں گے، سوائے روزہ کے' کہ اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے، جب اس کا کوئی عمل بھی باقی نہیں رہے گا تو لوگوں کی برائیاں بھی اس پر ڈال دی جائیں گی اور پھر اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

''**وصلى قبل طلوع الشمس وقبل غروبها يعنى الفجر والعصر**'' یعنی اس کی ادائیگی پر دوام اختیار کرو، امام طیبی فرماتے ہیں حرف لن نفی کی تاکید کے لئے ہے، مغنی فرماتے ہیں کہ زمخشری کا یہی مذہب ہے جیسا کہ کشاف میں منقول ہے، جیسا کہ انموذج میں ان کی رائے یہ ہے کہ ''من'' نفی کے دوام کے لئے ہوتا ہے اور اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ فرمان باری تعالیٰ: ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ [مریم: ۷۱] میں دخول کے معنی نہیں ہے' جیسا کہ امام طیبی سے منقول ہے اور اس میں بحث ہے کیونکہ یہ ورود عام' دخول مطلق یعنی مرور کے معنی میں ہے، اسی وجہ سے بعض احادیث میں اس کا استثناء یوں مذکور ہے **الا تحلة القسم**۔ یہاں دو نمازوں کو خاص طور پر ذکر اس وجہ سے کیا کہ صبح کے وقت بڑی مزیدار نیند آ رہی ہوتی ہے اور عصر کے وقت

انسان کاروبار میں مشغول ہوتا ہے، لہٰذا جو شخص باوجود مشاغل کے ان نمازوں کا خیال رکھے گا تو وہ باقی نمازوں کا بھی خیال رکھے گا، اور نماز فحاشی اور منکرات سے روکتی ہے، اور یہ کہ وقت' وقت مشہود ہیں کہ ان اوقات میں شب وروز کے فرشتوں کی ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی ہیں اور وہ بندوں کے اعمال لے کر جاتے ہیں، تو یہ نمازیں ان اوقات میں کفارہ بن جاتی ہیں اور انسان کی مغفرت ہوجاتی ہے اور وہ جنت میں داخل ہوجاتا ہے"رواہ مسلم" بقولِ میرک اس روایت کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے بھی نقل کیا ہے۔

صلوٰۃ البردین

۶۲۵: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلَّی الْبُرْدَیْنِ دَخَلَ الْجَنَّۃَ.

(متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٥٢حديث رقم ٥٧٤۔وأخرجه مسلم في صحيحه ١/٤٤٠حديث رقم (٢١٥۔٦٣٥) وأخرجه الدارمي في السنن ١/٣٩١حديث رقم ١٤٢٥وأخرجه أحمد في مسنده ٤/٨٠۔

ترجمہ: "حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں جو شخص ٹھنڈے وقت کی دونمازیں پڑھتا رہا وہ جنت میں داخل ہوگا۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "وعن ابی موسٰی قال قال رسول الله ﷺ من صلی البردین" یعنی صبح وشام کی نمازیں، ان کو بردین اس وجہ سے کہا کہ ان میں دن کے وسط کی بہ نسبت ہوائیں ٹھنڈی ہوتی ہیں، اس سے مراد صبح وعصر کی نمازیں ہیں، کیونکہ یہی دونمازیں دن کے دونوں اطراف میں ادا کی جاتی ہیں، یا پھر اس سے مراد صبح وعشاء کی نمازیں ہیں کیونکہ یہی پہلی اور آخری نمازیں ہیں، ان کی تخصیص کی وجہ پیچھے گذر چکی ہے، چنانچہ یہ نمازیں دن بھر میں ہونے والے گناہوں کیلئے کفارہ بن جاتی ہیں "دخل الجنة" یعنی دخول اولی کے طور پر "متفق علیه"۔

کراماً کاتبین کی ڈیوٹی

۶۲۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یَتَعَاقَبُوْنَ فِیْکُمْ مَلَائِکَۃٌ بِاللَّیْلِ وَمَلَائِکَۃٌ بِالنَّهَارِ وَیَجْتَمِعُوْنَ فِیْ صَلَاۃِ الْفَجْرِ وَصَلَاۃِ الْعَصْرِ ثُمَّ یَعْرُجُ الَّذِیْنَ بَاتُوْا فِیْکُمْ فَیَسْأَلُهُمْ رَبُّهُمْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِهِمْ کَیْفَ تَرَکْتُمْ عِبَادِیْ فَیَقُوْلُوْنَ تَرَکْنَاهُمْ وَهُمْ یُصَلُّوْنَ وَاَتَیْنَاهُمْ وَهُمْ یُصَلُّوْنَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٣٣حديث رقم ٥٥٥۔وأخرجه مسلم في صحيحه ١/٤٣٩حديث رقم (٢١٠۔٦٣٢)وأخرجه النسائي في السنن ١/٢٤٠حديث رقم ٤٨٥۔وأخرجه مالك في الموطأ ١/١٧٠حديث رقم ٨٢من كتاب قصر الصلاة في السفر وأخرجه أحمد في مسنده ٢/٢٥٧۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تمہارے پاس ملائکہ رات اور

دن کے وقت آتے رہتے ہیں۔ فجر اور عصر کی نماز میں سب جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر جن فرشتوں نے رات تمہارے اندر گزاری ہے وہ آسمان پر چڑھ جاتے ہیں۔تو اللہ تعالیٰ جاننے کے باوجود بندوں کے احوال اور اعمال کے بارے میں سوال کرتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا ہے وہ عرض کرتے ہیں۔ ہم نے ان بندوں کو نماز پڑھتے ہوئے چھوڑا ہے اور جب ہم ان کے پاس پہنچے تھے تو اس وقت بھی نماز پڑھ رہے تھے۔(بخاری ومسلم)

تشریح: ''وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ یتعاقبون فیکم'' یعنی ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اور اس کا قیاس تعاقب ہے کیونکہ اس کا فاعل مابعد میں مذکور ہے''ملائکۃ باللیل'' یہ یا تو یتعاقبون کی ضمیر سے بدل ہے یا مبتدا ہے یا اس کا فاعل ہے اور واو اس کی علامت ہے''وملائکۃ بالنھار'' اور یہ وہ فرشتے ہیں جو بندوں کے اعمال لکھتے ہیں، ایک قول کے مطابق کوئی اور فرشتے ہیں، امام نووی فرماتے ہیں ایک قول کے مطابق واو علامت فاعل ہے، یہ بنو حارث کی لغت ہے اور اس سلسلے میں اہل عرب کا ایک قول بھی نقل کرتے ہیں: اکلونی البراغیث ، امام اخفش نے اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا﴾ [الأنبياء: ٣] کو بھی اسی پر محمول کیا، اکثر نحویوں کا کہنا ہے کہ یہ اسم ضمیر سے بدل ہے یعنی اصل عبارت یوں ہے: یتعاقبون فی نزولھم، چنانچہ دن کے فرشتے فجر سے پہلے نازل ہوتے ہیں اور عصر کے بعد واپس چلے جاتے ہیں اور رات کے فرشتے عصر سے پہلے نازل ہوتے ہیں اور فجر کے بعد واپس چلے جاتے ہیں، اسی وجہ سے فرمایا ''ویجتمعون فی صلاۃ الفجر'' یعنی پہلا ''وصلاۃ العصر'' یعنی آخری اور فرشتوں کا ان اوقات میں جمع ہونا اللہ تعالیٰ کا لطف وکرم ہے اور تاکہ یہ فرشتے لوگوں کی بھلائیوں پر گواہ بن جائیں، ایک قول کے مطابق ان نمازوں کی تخصیص اس وجہ سے کی گئی ہے کہ ان اوقات میں مشغولیت اور غفلت کے باوجود عبادت کرنا زیادہ خلوص پر دلالت کرتا ہے، ایک قول کے مطابق اس میں اس بات کی ترغیب ہے کہ لوگوں کو ان اوقات میں طاعت پر مواظبت اختیار کرنی چاہئے''ثم یعرج الذین باتوا فیکم'' یہ بتا رہے ہیں کہ رات کے فرشتے صبح تک مسلسل لوگوں کی حفاظت پر گامزن رہتے ہیں اور دن کے فرشتے رات تک اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے ہیں''فیسألھم ربھم وھو اعلم بھم'' یعنی بھم' منھم کے معنی میں ہے۔ایک قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے سوال کرنا عاملین کی عبادت پر فخر کے لئے ہوتا ہے یا پھر یہ توبیخ ہوتی ہے ان فرشتوں پر جنہوں نے کہا تھا: **اتجعل برفیھا من یفسد فیھا۔** ''کیف ترکتم عبادی'' یعنی کس حال میں تم انہیں چھوڑ کے آئے ہو، میرک کا کہنا ہے کہ یہاں سوال کا رات والے فرشتوں پر اکتفا کرنا ایک کی مثال دے کر دوسرے کو سمجھانا مقصود ہے، یا پھر یہ اس وجہ سے ہے کہ جو حکم دن کے فرشتوں کا ہے وہی حکم رات کے فرشتوں کا بھی ہے، یا پھر یہ اس وجہ سے ہے کہ رات کو زیادہ تر گناہ کا شائبہ ہوتا ہے، تو جو لوگ رات کو گناہ نہیں کریں گے تو وہ دن کو بطریقِ اولیٰ نہیں کریں گے، یا پھر معنی اعم کی بناء پر ایسا کہا گیا ہے اور اس کی تائید نسائی شریف کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ جس میں یوں ہے: ثم یعرج الذین کانوا فیکم، یا پھر یہ اقتصار راوی پر محمول ہے اور اس پر ابن خزیمہ کی روایت پر بھی دلالت کرتی ہے، کیونکہ اس میں دونوں گروہوں کی سوالوں کی تصریح ہے:''**فیقولون تزکناھم وھم یصلون**'' یعنی صبح کی نماز پڑھتے ہوئے اور یہ جملہ حال ہے''واتیناھم'' یہ وجنناھم اور نزلنا علیھم کے معنی میں ہے''وھم یصلون'' یعنی عصر کی نماز''متفق علیہ'' بقولِ میرک اس روایت کو امام نسائی اور امام احمد نے بھی نقل کیا ہے۔

فجر کی نماز پڑھنے والا اللہ کی حفاظت میں ہوتا ہے

۶۲۷: وَعَنْ جُنْدُبِ الْقَسْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ صَلّٰى صَلَاةَ الصُّبْحِ فَهُوَ فِيْ ذِمَّةِ اللّٰهِ فَلَا يَطْلُبَنَّكُمُ اللّٰهُ مِنْ ذِمَّتِهِ بِشَيْءٍ فَإِنَّهٗ مَنْ يَطْلُبْهُ مِنْ ذِمَّتِهِ بِشَيْءٍ يُدْرِكْهُ ثُمَّ يَكُبَّهٗ عَلٰى وَجْهِهِ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ (رواہ مسلم) وَفِيْ بَعْضِ نُسَخِ الْمَصَابِيْحِ الْقُشَيْرِيِّ بَدَلَ الْقَسْرِيِّ۔

أخرجه مسلم في الصحيح ۴۵۴/۱ حديث رقم (۲۶۲-۶۵۷) وأخرجه أحمد في المسند ۳۱۲/۴ بمعناه۔
وأخرج الترمذي أوله عن أبي هريرة رضي الله عنه ۴۰۴/۴ حديث رقم ۲۱۶۴۔

ترجمہ: ''حضرت جندب قسریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے صبح کی نماز پڑھی وہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری میں ہے۔ لہٰذا ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے اس عہد کے متعلق کچھ مواخذہ کرے۔ کیونکہ جس سے اللہ نے اپنے عہد کے بارے میں مواخذہ کیا اس کو پکڑ کر جہنم میں اوندھے منہ ڈال دے گا۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے اور مصابیح کے بعض نسخوں میں قسری کے بجائے قشیری کا لفظ ہے۔''

راویٔ حدیث:

جندب قسری: مرتب عرض کرتا ہے مؤلف وشارح علیہ الرحمۃ نے ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا۔ بظاہر یہ جندب بن عبداللہ بجلی ہیں جندب بن عبداللہ کے حالات جلد اول' حدیث: ۲۳۵ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

تشریح: ''وعن جندب'' دونوں کے ضمہ اور دال کے فتحہ کے ساتھ ''القسری'' قاف کے فتحہ اور سین مہملہ کے سکون کے ساتھ، امام نووی نے اسی طرح ہی تصحیح کی ہے اور اسی طرح مشکوٰۃ کے تصحیح شدہ نسخوں میں بھی اسی طرح ہے۔ تورپشتی فرماتے ہیں کہ مصابیح کے تمام نسخوں میں القشری قاف اور شین معجمہ کے ضمہ کے ساتھ ہی مذکور ہے اور امام طیبی نے نقل کیا ہے کہ یہ غلط ہے ''قال قال رسول الله ﷺ صلاة الصبح'' یعنی اخلاص کے ساتھ ''فهو في ذمة الله'' یعنی وہ دنیا وآخرت میں اللہ کے عہد وامان میں ہوگا اور یہ وہ امان نہیں جو کلمہ توحید سے ثابت ہو چکا ہے ''فلايطلبنكم الله'' یعنی یہ لايؤاخذكم کے معنی میں ہے اور یہ لا ارينك کے قبیل سے ہے اور اس سے لوگوں کو ایسا سوال کرنے سے منع کرنا مقصود ہے جو اللہ سے ان کے مطالبہ کو ثابت کرے ''من ذمته'' یہ من بمعنی لاجل ہے اور ذمتہ میں ضمیر یا تو اللہ کی جانب راجع ہے یا پھر لمن کی جانب، اور مضاف محذوف ہے اور اصل عبارت یہ ہے لاجل ترک ذمتہ ''بشيء'' یعنی کچھ بھی، یا پھر یہ بابیانیہ اور جار مجرور شی ء سے حال ہے۔ مصابیح میں یوں ہے بشيء من ذمته۔ ایک قول کے مطابق ذمہ سے مراد وہ نماز ہے جو موجب امان ہے یعنی صبح کی نماز کو مت چھوڑو کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ اور تمہارے درمیان ہونے والا عہد نہ ٹوٹ جائے اور اس سلسلے میں تمہارا مؤاخذہ کیا جائے ''فانه'' یہ ضمیر شان ہے فاء تعلیل نہی کے لئے ہے ''من يطلبه'' یقیناً یعنی اللہ تعالیٰ ''من ذمته'' یعنی اس کے ذمہ کی وجہ سے ''بشيء'' اگرچہ تھوڑا ہو ''يدركه'' یقیناً یعنی اللہ تعالیٰ، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی نہیں بھاگ سکتا ''ثم يكبه'' رفع کے

ساتھ، اصل میں یوں تھا: هو یکبه۔ "علی وجهه" فتحہ کے ساتھ علی یدرکہ پر عطف ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہ ضمہ کے ساتھ ہو "فی نار جهنم" معنیٰ یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کے لیت ولعل سے کام نہ لو اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ تمہیں پکڑ کر جہنم میں ڈال دے گا۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ فجر کی نماز کی تخصیص اس وجہ سے کی کہ فجر کی نماز کی ادائیگی میں تکلف ہے اور اس کا کرنا ایمان کی علامت ہے اور جو یہ نماز خلوص دل سے ادا کرے تو وہ اللہ کے ذمہ میں ہوگا "رواه مسلم" بقول میرک اس روایت کو امام ترمذی نے بھی نقل کیا ہے۔ "وفي بعض نسخ المصابيح القشيري" قاف کے ضمہ اور معجمہ کے فتحہ کے ساتھ اور وہ مرفوع ہے اور اعرابِ حکائی ہونے کی بناء پر مجرور ہے اور نسخہ میں القشر ی ہے "بدل القسري" اور اس کا ضبط پیچھے گذر چکا ہے۔

صفِ اوّل کی فضیلت

۶۲۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَوْ یَعْلَمُ النَّاسُ مَافِی النِّدَآءِ وَالصَّفِّ الْاَوَّلِ ثُمَّ لَمْ یَجِدُوْا اِلَّا اَنْ یَّسْتَهِمُوْا عَلَیْهِ لَاسْتَهَمُوْا وَلَوْ یَعْلَمُوْنَ مَا فِی التَّهْجِیْرِ لَاسْتَبَقُوْا اِلَیْهِ وَلَوْ یَعْلَمُوْنَ مَا فِی الْعَتَمَةِ وَالصُّبْحِ لَاَتَوْهُمَا وَلَوْحَبْوًا ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۹۶/۲حدیث رقم ۶۱۵ ۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ۳۲۵/۱حدیث رقم (۱۲۹۔۴۳۷)وأخرجه النسائی فی السنن ۲۶۹/۱حدیث رقم ۵۴۰ ۔وأخرجه مالك فی الموطأ ۱۳۱/۱حدیث رقم ۶ من کتاب صلاة الجماعة ۔وأخرجه أحمد فی المسند ۲۳۶/۲۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر لوگوں کو اذان دینے کا اور صف اول میں نماز پڑھنے کا ثواب معلوم ہو جائے تو پھر اس کو حاصل کرنے کے لئے اگر قرعہ اندازی کرنا پڑے تو قرعہ اندازی کریں گے اور اگر لوگوں کو ظہر کی نماز کے لئے جلدی آنے کا ثواب معلوم ہو جائے تو اس نماز کے لیے دوڑ کر آئینگے اور اگر نماز عشاء اور فجر کی فضیلت معلوم ہو جائے تو ان دونوں نمازوں میں شرکت کے لیے گھٹنوں کے بل چل کر آئینگے۔"

(بخاری ومسلم)

تشریح: "وعن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ لو یعلم الناس" یعنی اگر تم جانو، مضارع میں استمرارِ علم کی جانب اشارہ ہے، یعنی حاضر دماغ ہونا چاہئے "مافی النداء" یعنی اذان واقامت میں کیا اجر وثواب ہے، یعلم کے مفعول کو مطلق رکھا اور یہ بیان نہیں کیا کہ اس کی فضیلت کیا ہے؟ ایسا مبالغہ کے فائدہ کے پیش نظر کہا گیا ہے، اور یہ کہ اس کا اجر وثواب الفاظ میں نہیں آسکتا جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ: فغشیهم من الیم ماغشیهم میں ہے، یعنی جو زیادہ سبقت کرے گا وہ زیادہ حصہ لے جائے گا، کیونکہ ایسا قابلِ فخر کاموں میں ہی ہوتا ہے خاص طور پر جب کہ انہیں حصر میں بیان کیا جائے "والصف الاول" یعنی وہ صف جس کے آگے کوئی دوسری صف نہ ہو، چنانچہ اس میں کعبہ کے پیچھے کھڑے ہونے والوں کی تمام جہات شامل ہیں، بلکہ بسا اوقات جو طرف کعبہ سے زیادہ قریب ہوا سے ترجیح ہوتی ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک

اولیٰ وہ صف ہے جو امام سے ملی ہوئی ہو اگر چہ اس کے درمیان کوئی چیز حائل ہو جیسے ساریہ یا منبر۔

صف اول کو اذان کے بعد ذکر کرنے میں اس بات پر دلالت ہے کہ پہلے وہ کام کئے جائیں جو مقصود تک پہنچانے والے اور رب کے سامنے کھڑا ہونے کا باعث ہیں "ثم لم یجدوا" یعنی اذان اور صف اول کو پانے کے لئے "الا ان یستھموا" یعنی قرعہ اندازی کریں "علیه" یعنی اس میں سبقت حاصل کرنے کے لئے۔ استہام کا معنی ہوتا ہے قرعہ، ایک قول کے مطابق اس کو سہام اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ سہام (تیر) ہیں اور ان پر نام لکھے جاتے ہیں، پس جس کا سہم (تیر) واقع ہو جائے تو وہ اپنے حصہ کے حصول میں کامیاب ہو گیا اور بالاستہام کا تقدیری معنی ہے اپنا حصہ قرعہ کے ذریعے تلاش کرنا "لااستھموا" اذان اور صف اول کے لئے جھگڑنا شروع کر دیتے، یہاں تک اذان اور صف اول میں جگہ قرعہ کے ذریعے حاصل کی جاتی، پھر مؤذنہ کو ثم کی تراخی کے ساتھ رتبہ کے پیش نظر ذکر کیا، بعض لوگوں نے یہ خیال بھی ذکر کیا ہے کہ یہاں نداء سے مراد اقامت بھی ہو سکتی ہے جبکہ مضاف مقدر ہو اور یہی مابعد کے اوفق اور بہتر ہے یعنی اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ حضورِ اقامت، تکبیر تحریمہ کے پانے اور صف اول میں کھڑا ہونے کا کیا ثواب ہے؟ اور یہاں ثم اس امر کی تعظیم اور لوگوں کی اس سے دوری کو بتانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے "ولو یعلمون مافی التھجیر" یعنی طاعات کی جانب مسارعت میں کیا فضیلت وکرامت ہے "لااستبقوا" یعنی دوڑیں لگاتے "الیه"۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ صف اول کی ترغیب سے فارغ ہو کر اول وقت کو پانے کی ترغیب بیان کی، اور اسی وجہ سے ضروری ہے کہ تھجیر کی تشریح تبکیر سے کی جائے، جیسا کہ نہایہ میں بہت سے لوگوں کا یہ خیال منقول ہے۔ تہجیر کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کی عظمت و بڑائی کو سمجھنا اور اس کی مبادرت و مسارعت کرنا اور یہ لغت حجاز یہ ہے جس سے مراد وقت صلاۃ کی جانب مبادرت مراد ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ التجھر' السیر فی الھاجرۃ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے سخت گرمی میں ظہر و جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لئے جانا، اکثر لوگوں نے اس کی تشریح تبکیر سے کی یعنی نماز کے وقت میں نماز کی جانب جانا، پھر کچھ لوگوں نے اسے جمعہ کے ساتھ خاص کیا ہے اور کچھ ہر نماز کے ساتھ اسے عام رکھا ہے، مراد پہلا قول ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ مہجر کی مثال ایسے ہی جیسے بدنہ کی ہدی دینا۔ قاضی صاحب کا کہنا ہے کہ ابراد کا حکم تہجیر اور کڑکتی دھوپ میں جمعہ کی جانب جانے کے حکم کے منافی نہیں کیونکہ یہ امر تو سنت ہے اور ابراد کی رخصت ہے جیسا کہ بہت سے اصحاب اس طرف گئے ہیں، یا پھر ابراد سے مراد وہ تھوڑی سی تاخیر ہے جس سے تہجیر نہ نکل جائے، کیونکہ ہاجرہ کا لفظ عصر کے قریب وقت تک پر بولا جاتا ہے: "ولو یعلمون مافی العتمة" یعنی عشاء کی نماز "والصبح" یعنی فجر کی نماز، ان دونوں کو خاص اس وجہ سے کیا کہ یہ نیند، غفلت اور سستی کا وقت ہوتا ہے، ان اوقات پر اس وجہ سے ابھارا کیوں ان اوقات میں زیادہ تر نماز کے فوت ہو جانے کا گمان ہوتا ہے "لاتوھما ولو حبوا"۔ "یعنی اگر چہ تم گھسٹ گھسٹ کر آتے"۔ حبوا کا معنی ہوتا ہے بچے کی طرح پاؤں اور ہاتھوں کے سہاروں پر یا سرین کے سہارے چلنا۔ ایک قول کے مطابق تقدیری عبارت: ولو کانوا حابین ہے "متفق علیه"، بقول میرک اس روایت کو امام احمد نے بھی نقل کیا ہے۔

فجر اور عشاء کی نماز منافق پر بھاری ہوتی ہے

۶۲۹: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ صَلٰوةٌ اَثْقَلَ عَلَى الْمُنَافِقِيْنَ مِنَ الْفَجْرِ وَالْعِشَاءِ وَلَوْ يَعْلَمُوْنَ مَا فِيْهِمَا لَاَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْوًا ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه من حدیث له زیاده ۱۴۱/۲ حدیث رقم ۶۵۷۔وأخرجه مسلم فی صحیحه بنفس زیادة البخاری ۴۵۱/۱ حدیث رقم (۲۵۲۔۶۵۱) وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۲۶۱/۱ حدیث رقم ۷۹۷۔

ترجمه: ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ منافقین پر عشاء اور فجر سے زیادہ بھاری اور کوئی نماز نہیں ہوتی اگر وہ ان دونوں کے ثواب کو جان لیں تو گھٹنوں کے بل چل کر ان دونوں نمازوں میں شرکت کے لئے آئیں گے۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: ''وعنه'' یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ''قال قال رسول الله ﷺ لیس صلاة اثقل'' نصب کے ساتھ لیس کی خبر ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لیس یا لا کے معنی میں ہے جیسا کہ سیبویہ نے اس طرح اشارہ کیا ہے یا پھر یہ فعل ناسخ ہے، اس وقت اس کے اسم ہونے کا جواز ہے جو کہ اصل میں مبتدا نکرہ ہے کیوں کہ یہ نفی کے بعد واقع ہے، اور اس میں لیس کے عام نفی کے لئے استعمال ہونے کی بھی دلیل ہے اور اس کے استثناء ہونے کی تائید باری تعالیٰ کے فرمان: ﴿ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ﴾ [الغاشية: ٦] ''اور خاردار جھاڑ کے سوا ان کے لئے کوئی کھانا نہیں (ہوگا)'' سے بھی ہوتی ہے۔

مغنی میں ہے کہ: لست لستما ولیسوا ولیست کی دلیل کی وجہ درست بات دوسری ہے، اور آس کا اسم مرفوع اور خبر منصوب ہوتی ہے، کہا گیا ہے کچھ مقامات پر ایسا نہیں ہوتا جیسا ایک مقام وہ ہے کہ جب مستثنیٰ کا ناصب الا کے مرتبہ میں ہو جیسے اتونی لیس زیدا۔ جب کہ صحیح یہ ہے کہ یہ ناسخ ہے اور اس کا اسم ضمیر ہے جو کہ بعض مفہوم مذکورہ کی جانب راجع ہے اور اس کو مستتر رکھنا بھی واجب ہے، لہٰذا وہ منصوب کے ساتھ ہی آئیگی اور یہ مسئلہ سیبویہ کے خیالات کے مطابق ہے اور وہ یوں کہ وہ حماد بن سلمہ کے کتابت حدیث کے لئے تشریف لائے تو انہوں نے ان کے آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان سنا: لیس من أصحابی احد الا ولوشئت لاخذت علیه لیس ابا الدرداء تو سیبویہ نے فرمایا کہ لیس ابو الدرداء ہونا چاہئے، تو حماد بن سلمہ نے چیخ مار کر کہا کہ سیبویہ تو غلطی پر ہے اور لیس برائے استثناء ہے، پھر سیبویہ یہ کہتے ہوئے وہاں چل نکلے کہ میں ایسے شخص سے علم حاصل کروں گا کہ جو غلطی نہ کرے اور اخفش وغیرہ کے پاس چلے گئے اور ظاہر ہے کہ حماد نے اسے استثناء اس وجہ سے کہا تھا کہ اس کے بعد نصب ہے۔ ''علی المنافقین'' انہیں خاص طور پر اس وجہ سے ذکر کیا کہ عبادت میں سستی ان کی طبیعت ہے اور یہ لوگ نماز صرف ریا اور شہرت کے لئے پڑھتے تھے، یہاں ان کا ذکر کرکے ان کے تشبہ سے بچانا اور ڈرانا مقصود ہے اور ساتھ ساتھ اس میں اس بات کی جانب بھی اشارہ ہے کہ مخلصین اس کے خلاف ہوتے ہیں ''من الفجر والعشاء'' ابن الملک اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ عشاء کا وقت استراحت ہوتا ہے اور گرمیوں میں فجر کا وقت مزے کی نیند کا ہوتا ہے اور سردیوں میں ٹھنڈ لگ رہی

ہوتی ہے ”ولو یعلمون مافیهما“ کہ کیا اجر وثواب ہے ”لأتوهما ولو حبوا، متفق علیه“ بقول میرک اس روایت کو امام احمد نے بھی نقل کیا ہے۔

فجر اور عشاء کی نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھنا پوری رات کے قیام کے برابر ہے

۶۳۰: وَعَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ فِيْ جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّمَا قَامَ نِصْفَ اللَّيْلِ وَمَنْ صَلَّى الصُّبْحَ فِيْ جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّمَا صَلَّى اللَّيْلَ كُلَّهٗ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۴۵۴ حدیث رقم (۲۶۰-۶۵۶) وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۳۷۶ حدیث رقم ۵۵۵۔ وأخرجه الترمذی فی السنن ۱/۴۳۳ حدیث رقم ۲۲۱۔ ولفظه "من شهد......"۔ وأخرجه الدارمی فی السنن ۱/۳۰۳ حدیث رقم ۱۲۲۴ وأحمد فی مسنده ۱/۵۸۔

ترجمہ: ”حضرت عثمان غنیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس انسان نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھ لی وہ ایسا ہے کہ گویا اس نے آدھی رات عبادت میں گزار لی اور جس آدمی نے فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھ لی گویا اس نے پوری رات نماز پڑھ لی اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔“

تشریح: ”وعن عثمان رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من صلی العشاء فی جماعة فکأنما قام نصف اللیل“ یعنی نصفِ اول یعنی گویا اس نے نماز وذکر کے ساتھ نصف شب بیداری کی، خاص طور پر جب کہ اس نے تاریک رات میں مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کی ہو یا وہاں بیٹھ کر نماز کا انتظار کیا ہو، کیونکہ وہاں جا کر اس نے اعتکاف کی نیت کر کے فضیلت بھی حاصل کی ہوگی اور یہ کمالِ اخلاص، خوف الٰہی اور امیدِ باری تعالیٰ کی دلیل ہے: ”ومن صلی الصبح في جماعة فکأنما صلی اللیل“ یہاں نماز کے ساتھ اور ماقبل میں قام کے ساتھ بطورِ تفنن تعبیر کیا اور ساتھ ہی اس بات کی جانب بھی اشارہ کر دیا کہ رات کی نماز کو قیام کہتے ہیں ”کله“ یعنی اس دوسرے نصف کو ساتھ ملانے کے ساتھ گویا اس نے شب کا دوسرا حصہ بھی عبادت کی، یا پھر یہ اشارہ ہے اس بات کی جانب کہ صبح کا قیام صلاۃ العشاء کے قیام سے افضل ہے، کیونکہ یہ قیام باعث مشقت اور شیطان پر بھاری ہوتا ہے کیونکہ نیند سے بیدار ہونا نیند میں مشغولیت سے زیادہ مشکل ہوتا ہے، کیونکہ اس میں سستی ہے اور یہ مجاہدہ شیطان پر بہت بھاری ہوتا ہے ”رواه مسلم“ بقول میرک اس روایت کو امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے بھی نقل کیا ہے۔

شرعی اصطلاح کی حفاظت اور رعایت کرو

۶۳۱: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَغْلِبَنَّكُمُ الْاَعْرَابُ عَلٰى اسْمِ صَلَاتِكُمُ الْمَغْرِبَ قَالَ وَيَقُوْلُ الْاَعْرَابُ هِيَ الْعِشَاءُ۔

الحدیث هوفی المصابیح حدیثان ۔الأول : "لا یغلبنکم الاعراب علی اسم صلاتکم المغرب ۔قال : وتقول

الاعراب هى العشاء "۔ أخرجه عن عبدالله بن مغفل : البخارى فى صحيحه ۲/۴۳۔حديث رقم ۵۶۳۔وأحمد فى المسند ۵/۵۵۔والثانى : "لايغلبنكم الاعراب على اسم صلاتكم العشاء فانها فى كتاب الله تعالىٰ العشاء فانها تعتم بحلاب الابل"۔ أخرجه عن ابن عمر : مسلم فى صحيحه ۱/۴۴۵حديث رقم (۲۲۹۔۶۴۴) وأخرجه النسائى فى السنن ۱/۲۷۰۔حديث رقم ۵۴۱۔وأخرجه ابن ماجةفى السنن ۱/۲۳۰حديث رقم ۷۰۴۔ وأحمد فى المسند ۲/۱۰۔

ترجمه: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا دیہاتی لوگ نماز مغرب کا نام لینے میں تم پر غالب نہ آ جائیں راوی کہتے ہیں کہ دیہاتی لوگ مغرب کوعشاء کہتے تھے۔''

تشریح: ''**وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ لايغلبنكم**'' تذکیر اور تانیث دونوں کے ساتھ ''**الاعراب**'' دیہاتی باشندے اوراس سے مراد جاہلیت کے دیہاتی ہیں''**على اسم صلاتكم**'' کہا جاتا ہے:**غلبته على الشيء اخذته منه** یعنی کسی چیز پر غالب ہوگیا یعنی اس سے کچھ حصہ لے لیا''**المغرب**'' اس پر رفع خبر ہونے کی بناء پر جائز ہے یعنی مبتدا محذوف (ھی) اور اعنی کو مقدر مانیں تو پھر منصوب ہوگا اور صفت یا بدل ہونے کی بناء پر مجرور ہوگا اور یہی اولیٰ ہے''**قال ويقول**'' تذکیر اور تانیث دونوں کے ساتھ''**الاعراب: هي**'' یعنی مغرب''**العشاء**'' یعنی عشاء کا مغرب پر زیادہ استعمال نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ نام اس پر غالب آ جائے اس لئے اسے مغرب ہی کا نام دو اور ظاہراً نہی دیہاتیوں کے لئے اور حقیقۃً صحابہ کرام کے لئے ہے۔

۶۳۲: وَقَالَ لَايَغْلِبَنَّكُمُ الْاَعْرَابُ عَلَى اسْمِ صَلَاتِكُمُ الْعِشَاءَ فَاِنَّهَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ الْعِشَاءُ فَاِنَّهَا تُعْتِمُ بِحِلَابِ الْاِبِلِ . (رواه مسلم)

ترجمه: ''پھر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نماز عشاء کا نام لینے میں دیہاتی لوگ تم پر غالب نہ آ جائیں اس نماز کا نام اللہ تعالیٰ کی کتاب میں عشاء ہے اور دیہاتی لوگ اونٹنیوں کا دودھ نکالنے کی وجہ سے اس نماز میں تاخیر کرتے تھے۔''

''**وقال لايغلبنكم**'' دونوں طریقوں سے''**الاعراب على اسم صلاتكم العشاء**'' تینوں وجہوں کے ساتھ، مطلب یہ ہے کہ ان کی عادت کو نہ اپناؤ کیونکہ وہ عشاء کو عتمہ کا نام دے کر عشاء کا نام چھین رہے ہیں حالانکہ یہ نام اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے نام سے دیہاتیوں کے نام کی جانب عدولی مناسب نہیں، ہوسکتا ہے کہ عشاء کے لفظ کے استعمال کا حکم دینے میں بتانا مقصود ہو کہ عتمہ کا معنی ہوتا ہے سخت تاریکی جب کہ نماز نہایت روشنی کا نام ہے، لہٰذا مناسب نہیں کہ نماز کو اس کی نقیض کا نام دیدیا جائے اور آنے والے جملے''**فانها فى كتاب الله**'' میں فاءِ علت نہی کے لئے ہے اور''**فانها تعتم**'' میں علت تسمیہ کے لئے یعنی کتاب اللہ میں اس کا نام عشاء ہے،فرمان ہے:﴿ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ﴾ [النور: ۵۸] اور وہ لوگ عتمہ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ تاریکی میں ادا کی جاتی ہے''**بحلاب الابل**'' کیونکہ عرب غیبوبتِ شفق کے بعد جب تاریکی خوب چھا جاتی تھی تو اس وقت اونٹ دوہا کرتے تھے اور اس وقت کو عتمہ کا نام دیتے تھے، جب کہ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ لوگ دودھ دوہنے کو تاریکی تک مؤخر رکھتے تھے اور اس وقت کو عتمہ کا نام دیتے تھے اور یہ تسمیۃ الشیء باسم وقتہ کے قبیل سے ہے

یعنی عشاء کے لئے یہ لفظ نہ بولو کہیں ایسا نہ ہو ان کی اصطلاح کتاب اللہ پر غالب آجائے اور بقول ابن الملک لانھا تعتم مجہول روایت کیا گیا ہے اور دونوں ضمیریں نماز کے لئے ہیں اور اعراب کو سمجھانے کے لئے کہا گیا ہے۔ سید صاحب فرماتے ہیں کہ ایک روایت کی وجہ تعتم معروف ہے اور مجہول بھی ہوسکتا ہے اور ضمیر نماز کی جانب راجع ہوگی۔

اصح اور اوضح یہ ہے کہ یہ معروف کا صیغہ ہے اور بحلا بھا میں باء سببیہ ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ حدیث ابو ہریرہ میں عتمہ کا لفظ ہے وہ صلاۃ العشاء کے بارے میں قرآنی آیت کے نزول سے قبل کی ہے، اس میں بحث ہے کیونکہ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے آیت کا نزول حدیث کے ورود سے پہلے ہے اور توجیہہ یہ ہے اسلام کے آغاز میں یہ جائز تھا، پھر جب اس کا اطلاق عام ہوگیا اور لوگوں کی زبانوں پر یہ نام چل نکلا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادیا تاکہ جاہلیت کی زبان غالب نہ آجائے یعنی پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جو آنحضرت ﷺ سے اسی طرح نقل کردیا جس طرح انہوں نے سنا تھا۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ اس کے جواب میں دو توجیہات ہیں، پہلی توجیہہ یہ ہے کہ عتمہ کا استعمال مکروہ ہے اور اس میں نہی تنزیہی ہے، دوسری توجیہہ یہ ہے کہ عتمہ سے خطاب اس شخص کے لئے جسے عشاء کا پتہ نہیں تھا کیونکہ یہ لفظ عرب میں رائج تھا بلکہ وہ لوگ مغرب کو عشاء کا نام دیتے تھے "رواہ مسلم" میرک فرماتے ہیں کہ اس میں نظر ہے کیونکہ پہلا جملہ بخاری شریف میں عبداللہ بن مغفل المزنی کی حدیث میں نبی پاک ﷺ سے مروی ہے۔ صاحب التخریج کا کہنا ہے کہ میں نے اسے بخاری کے علاوہ کسی جگہ نہیں دیکھا، شیخ جزری فرماتے ہیں کہ بخاری نے اسے عبداللہ بن مغفل کی حدیث میں نقل کیا ہے، باقی رہا دوسرا جملہ تو مسلم کا افراد ہے اور صاحب مشکوٰۃ کے توہم کا منشا یہ ہے کہ محی السنۃ رحمہ اللہ نے مصابیح نے میں دونوں احادیث یکے بعد دیگرے نقل کی ہیں اور دوسری روایت کے بارے میں فرمایا ہے کہ اسے ابن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے، چنانچہ مصنف کا گمان ہے کہ وہ ایک ہی حدیث ہے جو ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے پھر اس میں کچھ تغیر وتبدل واقع ہوگیا ہے۔ واللہ اعلم۔ پھر میرک کا کہنا ہے کہ اس روایت کو امام نسائی، ابن ماجہ اور احمد نے بھی نقل کیا ہے۔

صلوٰۃ وسطیٰ

۶۳۳: وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَوْمَ الْخَنْدَقِ حَبَسُوْنَا عَنْ صَلَاةِ الْوُسْطٰى صَلَاةِ الْعَصْرِ مَلَأَ اللّٰهُ بُيُوْتَهُمْ وَقُبُوْرَهُمْ نَارًا ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۹۵/۸ حديث رقم ۴۵۳۳ وأخرجه مسلم في صحيحه ۴۳۷/۱ حديث رقم (۲۰۵ـ۶۲۷) وأخرجه أبوداوٗد في السنن ۲۸۷/۱ حديث رقم ۴۰۹ـ وأخرج الترمذي في السنن بنحوه ۲۰۲/۱ حديث رقم ۲۹۸۴ـ وأخرج النسائي شطره الأول في السنن ۲۳۶/۱ حديث رقم ۴۷۳ـ وأخرجه ابن ماجة مع تقديم وتاخير في السنن ۲۲۴/۱ـ حديث رقم ۶۸۴ـ والدارمي في السنن ۳۰۶/۱ حديث رقم ۱۲۳۲ـ وأخرجه أحمد في المسند ۱۴۴/۱ـ

ترجمہ: "حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ خندق کے دن فرمایا تھا کہ کفار نے ہمیں صلوٰۃ وسطیٰ یعنی عصر کی نماز پڑھنے سے روکا ہے اللہ تعالیٰ ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھردے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: ''وعن علی رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال یوم الخندق'' اور وہ یوم احزاب ہے، ایک قول کے مطابق یہ ذی قعدہ ۴ ہجری کا واقعہ اور اسی کو امام بخاری نے ترجیح دی ہے، ولی عراقی فرماتے ہیں کہ یہی مشہور ہے، جب کہ ایک قول یہ ہے کہ یہ ۵ ہجری کا واقعہ ہے اور یہی اکثر لوگوں کی رائے ہے، اس غزوہ کو خندق کا نام اس وجہ سے دیا گیا اس میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور آنحضرت ﷺ کے حکم سے مدینہ کے اردگرد خندق کھودی گئی تھی، یہ اہل فارس کے مکروں میں سے ہے نہ کہ اہل عرب کے مکروں میں سے، اور مسلمانوں کی ترغیب کے لئے اس میں آنحضرت ﷺ نے بنفس نفیس کام کیا کیوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خندق کھودتے ہوئے سخت مشکلات، پریشانیوں، بھوک اور پیاس کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اس کی کھدائی میں مختلف اقوال کے مطابق بیس راتیں یا پندرہ دن یا ایک ماہ کا عرصہ لگا۔ اس کو احزاب اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں مشرکین قریش، غطفان، اور دیگر لوگ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں جمع تھے اور وہ تین ہزار تھے ''حبسونا'' امام طیبی فرماتے ہیں کہ بخاری اور مصابیح کے کچھ نسخوں میں یوں ہی ہے یعنی جب ہم خندق کھودنے میں مصروف تھے تو ہمیں اس کھدائی نے مشغول کئے رکھا ''عن صلاۃ الوسطی'' امام طیبی فرماتے ہیں کہ یعنی ہم صلاۃ وسطیٰ کی ادائیگی نہ کر سکے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کوفیوں کے اضافۃ الصفۃ الی الموصوف کے قبیل سے ہے اور بصری یہاں محذوف مانتے ہیں یعنی وہ اصل عبارت یوں نکالتے ہیں: عن الصلاۃ الوسطی ای عن فعلھا. ''صلاۃ العصر'' جر کے ساتھ صلاۃ الوسطیٰ سے بدل ہے یا اس کے لئے عطف بیان ہے، بقول ابن الملک اکثر صحابہ کرام کا یہی مذہب ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ احادیث صحیحہ کے تقاضے کے مطابق اس سے مراد عصر کی نماز ہے اور یہی مختار ہے۔ ماوردی فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس سے فجر کی نماز مراد ہونے کی تصریح کی ہے جب کہ احادیث میں اس کے اس سے عصر کی نماز ہونے پر واضح اشارات ہیں، یہ امام شافعی کا مذہب بھی یہی ہوگا کہ اس سے عصر کی نماز مراد ہے کیونکہ انہی کا فرمان ہے کہ اگر میرا مذہب حدیث کے مخالف ہو تو میرے مذہب کو دیوار پر دے مارو۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اکثر صحابہ کرام، تابعین، امام ابوحنیفہ، امام احمد اور امام داؤد کا یہی مذہب ہے اور حدیث اس میں نص ہے۔ ایک قول کے مطابق صبح کی نماز مراد ہے، کچھ صحابہ کرام، کچھ تابعین اور امام مالک اور امام شافعی کا مشہور مذہب یہی ہے، جب کہ ایک کے مطابق اس سے مراد ظہر اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد مغرب اور ایک قول کے مطابق عشاء ہے۔ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے تمام نمازوں میں لیلۃ القدر اور جمعہ کے دن قبولیت کی گھڑی کی طرح مخفی رکھا ہے۔

اور ہاں یہ صلاۃ الوسطیٰ سے مراد چاشت کی نماز، تہجد کی نماز، اوابین، جمعہ کی نماز، عید کی نماز اور جنازہ کے اقوال بھی ملتے ہیں۔ امام بخاری نے صلاۃ العصر کے بعد حتی غربت الشمس کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے اور یہ اضافہ معارض نہیں کیونکہ مسلم شریف میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں الی احمرار الشمس او اصفرارھا کا اضافہ موجود ہے، اس لئے کہ رکاوٹ نے اگرچہ وقت کو ختم کر دیا لیکن نماز تو مغرب کے بعد بھی ادا کی جا سکتی تھی کیونکہ اتنا وقت تو بچا نہیں تھا کہ جس میں طہارت وغیرہ حاصل کی جا سکتی اور اس کی تائید بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے جو ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے جب سورج غروب ہونے کے قریب تھا تو تشریف لائے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ کی قسم میں نے نماز نہیں پڑھی، چنانچہ وادی بطحان میں اترے، آپ نے وضوء کیا اور صحابہ نے بھی وضو کیا اور سورج غروب ہونے کے بعد مغرب کی نماز ادا کی، اس روایت کا قصہ

یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عصر کے علاوہ کسی اور نماز میں ایسا کرنے کو نہیں کہا۔

ترمذی شریف میں ہے چار نمازوں کا ذکر ہے اور یہ معارض نہیں کیونکہ یہ واقعہ کئی دن تک چلتا رہا، اور **اسناد الحبس الیھم** سے اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ تاخیر قتل وقتال میں مشغولیت کی بناء پر ہوئی اور کفار نماز کے مانع تھے۔ علماء فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ اس مشغولیت کی وجہ سے نماز بھول گئے ہوں، جب کہ یہ احتمال بھی موجود ہے ایسا جان بوجھ کر کیا ہو اور مشغولیت اس پر مزید اثر انداز ہوگئی ہو، کیونکہ یہ صلاۃ الخوف کے نزول سے قبل کا قصہ ہے ''**ملأ الله**'' ان کے لئے بددعا کی، یہ خبر کی صورت میں تاکید اذکر کیا اور اس بات کی جانب بھی اشارہ کر دیا کہ یہ جلد قبول ہونے والی دعاؤں میں سے ہے، اور ماضی کے ساتھ اس وجہ سے تعبیر کیا کہ اس کی قبولیت یقینی تھی، گویا اِدھر سے بددعا کی اور اُدھر سے قبول ہوگئی اسی وجہ سے کہا جاتا ہے: **غفر الله لفلان** کہنا **اللھم اغفرله** سے بہتر ہے ''**بیوتھم**'' باء کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ ''**وقبورھم نارا**'' امام طیبی اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا وآخرت میں آگ کو ان کے ساتھ لازم کر دیا اور دنیا میں بھی عذاب دیا اور آخرت میں بھی، ایک قول یہ ہے عذابِ دنیا سے گھروں کا انہدام، اموال کا چھننا اور اولاد کا مرنا مراد ہے جبکہ آخرت کے عذاب سے مراد قبروں میں آگ کا ملنا ہے۔ یا پھر گھروں میں آگ کا آنے کا اسلوب ابواب المشاکلہ کے قبیل سے ہے یا پھر یہ استعارہ ہے اور نار سے مراد فتنہ ہے ''**متفق علیه**'' بقول میرک اس روایت کو امام احمد نے بھی نقل کیا ہے۔

الفصل الثانی:

۶۳۴: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ وَسَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةُ الْوُسْطٰى صَلَاةُ الْعَصْرِ . (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ١/ ٣٤٠ حدیث رقم ١٨٢ ـ وقال حسن صحیح ـ وأخرجه أحمد فی المسند ٥/ ٧ـ

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد عصر کی نماز ہے اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''**عن ابن مسعود وسمرة بن جندب**'' جیم اور دال کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ ''**قالا قال رسول الله** ﷺ **صلاة الوسطی صلاة العصر**'' کیونکہ یہ شب روز کی نمازوں میں درمیانی نماز ہے اور اس وقت مارکیٹیں لگتی ہیں، اس میں مشغولیت کے زیادہ ترکمانات ہوتے ہیں اس لئے اسے خاص طور سے ذکر کیا ''**رواه الترمذی**'' اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، قالہ میرک۔

فجر کی نماز فرشتوں کی حاضری کا وقت ہے

۶۳۵: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا تَشْهَدُهٗ مَلَائِكَةُ اللَّيْلِ وَمَلَائِكَةُ النَّهَارِ . (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥/ ٢٨٢ حدیث رقم ٣١٣٥ وقال حدیث حسن صحیح وأخرجه ابن ماجة فی السنن

۱/۲۲۰ حدیث رقم ٦٧٠ـ وأخرجه أحمد فی مسنده ٤٧٤/٢ـ

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے اس قول کے بارے میں فرمایا: اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا۔ (یعنی فجر کی نماز حاضر ہونے کا وقت ہیں) کہ رات اور دن کے فرشتے فجر کے نماز کے وقت جمع ہوجاتے ہیں اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''وعن ابی هريرة عن النبی ﷺ فی قوله تعالٰی ان قرآن الفجر ''یعنی فجر کی نماز، اس کو قرآن قراءت کی وجہ سے کہا کیونکہ قرآن نماز کا ایک رکن ہے، جیسا کہ رکوع کی وجہ سے رکعت کو رکعت کہا جاتا ہے، اور فجر کا وقت رات کا آخری حصہ اور دن کا ابتدائی حصہ ہوتا ہے، اور اسے فجر کا نام دے کر فجر میں طولِ قراءت پر ابھارنا مقصود ہے، قالہ الطیبی 'مکان مشھودا'' یہ محضورا کے معنی میں ہے''قال تشهده'' تانیث وتذکیر دونوں کے ساتھ یعنی اس میں حاضر ہوتے ہیں''ملائكة الليل وملائكة النهار '' یہ استئناف مبین ہے''رواه الترمذی'' یوں کہنا چاہئے تھا کہ ان دونوں روایتوں کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس روایت کی سند حسن ہے۔

الفصل الثالث:

۶۳۶: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ وَعَائِشَةَ قَالَا اَلصَّلٰوةُ الْوُسْطٰى صَلَاةُ الظُّهْرِ (رواه مالك عَنْ زَيْدٍ والترمذی وَعَنْهُمَا تَعْلِيقًا).

أخرجه مالك عن زيد بن ثابت فی الموطأ ١٣٩/١ الحديث ٢٧ فی كتاب صلاة الجماعة ـ وأخرجه الترمذی عنهما تعليقًا ٣٤٢/١ بعد حديث رقم ١٨٢ـ

ترجمہ: ''حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے دونوں فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ وسطی سے مراد ظہر کی نماز ہے اس روایت کو امام مالکؒ نے صرف حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے حضرت زید اور حضرت عائشہؓ دونوں سے بغیر سند کے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''عن زيد بن ثابت وعائشة ''یعنی موقوفاً ''قالا الصلاة الوسطى صلاة الظهر '' کیونکہ یہ دن کے دونوں اطراف کے وسط میں ہے''رواه مالك عن زيد ''یعنی تنہا''والترمذی عنهما ''یعنی زید وعائشہ رضی اللہ عنہما دونوں سے ''تعلیقا''تعلیق کا لفظ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں مبداء اسناد سے ایک یا دو راویوں کو حذف کر دیا جائے، جیسے یوں کہا جائے: قال ابن عباس کذا، کچھ لوگوں نے اس لفظ کو کلِ اسناد کے حذف میں بھی استعمال کیا ہے جیسے یوں کہا جائے: قال عليه الصلاة والسلام كذا۔

۶۳۷: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّى الظُّهْرَ بِالْهَاجِرَةِ وَلَمْ يَكُنْ يُصَلِّى صَلَاةً اَشَدَّ عَلٰى اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنْهَا فَنَزَلَتْ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقَالَ اِنَّ قَبْلَهَا صَلَاتَيْنِ وَبَعْدَهَا صَلَاتَيْنِ ـ (رواه احمد وابوداود)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ١/٢٨٨ حدیث رقم ٤١١ ـ وأخرجه أحمد فی المسند ٥/١٨٣ ـ

ترجمہ: ''حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز سورج زائل ہوتے ہی پڑھ لیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر ان تمام نمازوں میں جن کو وہ پڑھتے تھے ظہر کی نماز سے زیادہ سخت کوئی نماز نہ تھی اس پر قرآن کی آیت نازل ہوئی: حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی ۔ کہ تم سب نمازوں کی حفاظت کرو خصوصاً درمیانی نماز کی حضرت زیدؓ فرمایا کرتے تھے ۔ کہ ظہر کی نماز سے پہلے بھی دو نمازیں ہیں اور ظہر کی نماز کے بعد بھی دو نمازیں ہیں اس حدیث کو امام احمدؒ اور امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔''

''**وعن زید بن ثابت قال کان رسول الله** صلی اللہ علیہ وسلم **یصلی الظهر بالهاجرة**'' یعنی شدت گرمی میں زوال کے بعد ''**ولم یکن یصلی صلاة اشد**'' یعنی سخت اور مشکل ''**علی اصحاب رسول الله** صلی اللہ علیہ وسلم **منها**'' اسی وجہ سے وہ لوگ کپڑوں پر سجدہ کرتے تھے حالانکہ ان کی عادت تھی کہ وہ زمین پر سجدہ کرتے تھے اور یہ خشوع، خضوع، عاجزی عبادت میں رب کے سامنے زیادہ تذلل پر دلالت کرتا ہے ''**فنزلت حافظوا علی الصلوات والصلاة الوسطی**'' امام طیبی اس کا یہ مطلب بیان فرماتے ہے کہ اپنے آپ پر بوجھل ہونے کے باوجود اسے ضائع نہ کرنا چاہئے کیوں یہ صلاۃ الوسطی اور فضیلت والی نماز ہے اور درمیانہ کام افضل ہوتا ہے۔ ایک قول کے مطابق اس کی فضیلت اس وجہ سے ہے کہ یہ پہلی وہ نماز کو ادا کی گئی حالانکہ نمازیں رات کو فرض ہوئی تھیں، یہ مزید اعتناء کی دلیل ہے ''**وقال**'' یعنی راوی زید یا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کہ بہتر پہلا قول ہے بقول سید ''**ان قبلها صلاتین**'' یعنی ایک نماز دن کی اور ایک رات کی ''**وبعدها صلاتین**'' یعنی یوں یہ دن کے درمیان واقع ہوئی اور ظاہر ہے کہ ظہر کے بارے میں نازل ہونے والی اس آیت کے سلسلہ میں صحابی کا یہ اجتہاد گمان پر مبنی ہے لہٰذا یہ اجتہاد نبی علیہ السلام کی اس حدیث کے منافی نہیں جس میں عصر کی نماز کا ذکر ہے ''**رواه احمد وابوداوٗد**''۔

۶۳۸: وَعَنْ مَالِكٍ بَلَغَهٗ اَنَّ عَلِيَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ وَعَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَبَّاسٍ كَانَا يَقُوْلَانِ الصَّلٰوةُ الْوُسْطٰی صَلَاةُ الصُّبْحِ۔ (رواه فِی الْمُوَطَّا)

أخرجه مالك فی الموطأ بلاغا ١/١٣٩ حدیث رقم ٢٨ من کتاب صلاة الجماعة وأخرجه الترمذی تعليقًا فی سننه ١/٣٤٢ بعد الحدیث ١٨٢ عن ابن عمر وعن ابن عباس۔

ترجمہ: ''حضرت امام مالکؒ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت علیؓ بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس دونوں فرمایا کرتے تھے کہ صلوٰۃ وسطی سے مراد صبح کی نماز ہے اس حدیث کو امام مالکؒ نے مؤطا امام مالکؒ میں نقل کیا ہے۔''

تشریح: ''**وعن مالك بلغه**'' یعنی ان تک یہ بات پہنچی ہے ''**ان علی بن ابی طالب وعبدالله بن عباس کانا یقولان: الصلاة الوسطی صلاة الصبح**'' کیونکہ یہ دن کی دو نمازوں اور رات کی دو نمازوں کے درمیان واقع ہے یا پھر فجر کی تخصیص کی وجہ یہ ہے یہ ایسے وقت میں پڑھی جاتی ہے جب کہ لوگ مزے کی نیند سو رہے ہوتے ہیں تو محافظت کے پیش نظر اسے خاص طور پر ذکر کیا اور ہوسکتا ہے کہ یہ بھی ان کا اجتہاد ہو اور ساتھ میں یہ بات ہے کہ یہ روایت انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

جانب منسوب نہیں کی یا پھر یہ انہوں نے احتمال ذکر کیا "رواہ" یعنی امام مالک نے نقل کیا ہے "فی الموطا" ہمزہ کے ساتھ اور ایک قول کے مطابق الف کے ساتھ اور اس پہ کہ کلام اتنا مخل ہے کہ اسے امام مالک نے بلغه کہہ کر نقل کیا اور یہ کہ یہ مسئلہ کتنا مشکل ہے وہ کسی پر مخفی نہیں۔ مصنف کو پہلے یوں کہنا چاہئے تھا: عن علی وابن عباس...... پھر یوں کہنا چاہے تھا: رواه المالك فی المؤطأ لاغا، کیونکہ امام مالک مخرجین میں سے ہیں راویوں میں سے نہیں۔

۶۳۹: وَرَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَابْنُ عُمَرَ تَعْلِيقًا ـ

أخرجه مالك في الموطأ بلاغا ۱/۱۳۹ حديث رقم ۲۸ من كتاب صلاة الجماعة وأخرجه الترمذي تعليقًا في سننه ۱/۳٤۲ بعد الحديث ۱۸۲ عن ابن عمر وعن ابن عباس۔

ترجمه: "اور امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بغیر سند کے نقل کیا ہے۔"

فجر کی نماز پڑھنے والا ایمان کا پرچم اُٹھانے والا ہے

۶۴۰: وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ غَدَا اِلٰى صَلَاةِ الصُّبْحِ غَدَا بِرَايَةِ الْاِيْمَانِ وَمَنْ غَدَا اِلَى السُّوْقِ غَدَا بِرَايَةِ اِبْلِيْسَ (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجة في السنن ۲/۷۵۱ حديث رقم ۲۲۳٤ ـ وفي الزوائد ـ في إسناده عبس بن ميمون متفق على تضعيفه ـ

ترجمه: "حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو آدمی فجر کی نماز کے لئے جاتا ہے گویا وہ ایمان کا پرچم لے کر چلتا ہے اور جو آدمی صبح بازار جاتا ہے گویا وہ شیطان کا پرچم لے کر چلتا ہے اس حدیث کو امام ابن ماجہؒ نے ذکر کیا ہے۔"

تشریح: "وعن سلمان قال سمعت رسول الله ﷺ يقول من غدا" یعنی جس صبح میں گیا "الى صلاة الصبح غدا براية الايمان" یعنی اپنے علَم وجھنڈے کے ساتھ، اس کی الف یاء سے منقلب ہے جیسا کہ قاموس میں ہے "ومن غدا الى السوق غدا براية ابليس" امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ حزب اللہ اور حزب الشیطان کی تمثیل بیان کی گئی ہے، چنانچہ جو شخص صبح اٹھتے ہی مسجد جائے تو گویا اس نے ایمانی علامات اور شعائر اسلام کی نشانیوں کو ظاہر کیا اور مخالفین کی توہین کی اور اسی سلسلہ میں ایک روایت ہے کہ جس میں فرمایا: فذالکم الرباط اور جو شخص صبح اٹھتے ہی بازار کی جانب چل نکلے تو شیطان کے گروہ کا ممبر ہے جو شیطان کے جھنڈوں کو بلند کئے ہوئے ہے اور اس نے دین کی توہین کی۔ غدا میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ بازاروں میں جانا ممنوع نہیں، چنانچہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت میں طلبِ حلال، عبادت کے لئے قوت لایموت اور سوال سے بچنے کے لئے روزی کمانے نکل جائے تو وہ بھی حزب اللہ میں شامل ہوگا "رواه ابن ماجة" اور اس کی سند حسن ہے۔

بَابُ الْاَذَانِ

اذان کا بیان

یعنی اذان کی مشروعیت، کیفیت اور کمیت کے بیان میں، اذان کا معنی ہے آگاہ کرنا، باقی یہ جو معروف اذان ہے تو یہ تاذین سے ماخوذ ہے جیسا کہ سلام تسلیم سے ماخوذ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بھی آگاہ کرنے کے معنی میں ہے، چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ﴾ [التوبة: ۳] اور فرمایا: ﴿فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ﴾ [الاعراف: ٤٤] حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کا لغوی معنی آگاہ کرنا ہے اور شرعی معنی وہ مخصوص الفاظ ہیں جو نماز کی خبر دیتے ہیں، اور اسی سے وہ اذان بھی ماخوذ ہے جو نماز کے علاوہ کے لئے مسنون ہے جیسا کہ نومولود کے دائیں کان میں اذان دینا اور بائیں میں اقامت کہنا اور غم اور دیگر پریشانی کے مواقع پر اذان دینا بھی مسنون ہے جیسا کہ دیلمی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت نقل کی ہے کہ ان کو نبی پاک ﷺ نے پریشان دیکھا تو فرمایا اے ابن ابی طالب میں تجھے غمگین دیکھ رہا ہوں، اپنے اہل خانہ میں سے کسی کو یہ حکم دو کہ وہ تیرے کان میں اذان دے دیں کیونکہ اس سے غم ختم ہو جاتا ہے، حضرت علی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کا تجربہ کیا تو میں نے ایسا ہی پایا اور کہا جاتا ہے کہ حضرت علی سے جس نے بھی یہ روایت نقل کی اس نے یہی کہا ہے کہ انہوں نے اس کا تجربہ کیا تو ایسا ہی پایا۔

دیلمی نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی انسان یا جانور بد خلق ہو جائے تو اس کے کان میں اذان دو۔ اذان فرائض کی سنت ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ واجب ہے اس لئے کہ امام محمد فرماتے ہیں کہ اگر کسی شہر کے لوگ ترکِ اذان پر متفق ہو جائیں تو میں ان سے قتال کروں گا اگر کوئی ایک اسے چھوڑ دے تو میں اسے ماروں گا اور قید کر دوں گا۔ میں جواباً کہتا ہوں کہ یہ قول وجوب پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ ان کا یہ بھی فرمان ہے کہ اگر کسی علاقہ کے لوگ کسی سنت کو چھوڑ دیں تو میں ان سے قتال کروں گا اور کوئی ایک چھوڑ دے تو میں اسے ماروں گا۔

عرضِ مرتب:

اذان شعائر اسلام میں سے ہے۔ اذان لغت میں اعلان کرنے کو اور خبر دینے کو کہتے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں اذان کی تعریف یہ ہے کہ چند مخصوص الفاظ کے ساتھ مخصوص اوقات میں نماز کے وقت کی خبر دینا۔

اِس سے وہ اذان خارج ہوگئی جو دیگر اشیاء کے لئے ہوتی ہے مثلاً

نمبر ①: بچے کے کان میں اذان دینا۔ نمبر ②: غمزدہ کے کان میں اذان دینا۔

نمبر ③: مرگی کے مریض کے کان میں اذان دینا۔ نمبر ④: شدید غصہ میں مبتلا کے کان میں اذان دینا۔

نمبر ⑤: جس کی عادات خراب ہوں اس کے کان میں اذان دینا۔

الفصل الاول:

اذان دینے کا طریقہ

۶۴۱: عَنْ اَنَسٍ قَالَ ذَكَرُوا النَّارَ وَالنَّاقُوْسَ فَذَكَرُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى فَاُمِرَ بِلَالٌ اَنْ يَّشْفَعَ الْاَذَانَ وَاَنْ يُّوْتِرَ الْاِقَامَةَ قَالَ اِسْمَاعِيْلُ فَذَكَرْتُهٗ لِاَيُّوْبَ فَقَالَ اِلَّا الْاِقَامَةَ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۷۷/۲حدیث رقم ۶۰۳۔وأخرجه مسلم فی الصحیح ۔۲۸۶/۱حدیث رقم (۳۷۸-۳) واللفظ للبخاری ۔وأخرج أبوداؤد شطره الثانی فی السنن ۳۴۹/۱حدیث رقم ۵۰۸و کذلك الترمذی فی السنن ۳۶۹/۱ حدیث رقم ۱۹۳۔والنسائی فی السنن ۳/۲حدیث رقم ۶۲۷۔ وابن ماجة فی سننه ۲۴۱/۱ حدیث رقم ۷۲۹۔وأخرجه الدارمی فی السنن ۲۹۰/۱حدیث رقم ۱۱۹۴۔وأحمد فی المسند ۱۰۳/۳کلهم أخرجوا شطره الثانی ۔

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے اذان کے حکم سے پہلے نماز کا وقت بیان کرنے کے لیے آگ اور ناقوس کا ذکر کیا یعنی لوگوں نے یہود اور نصاریٰ کو ذکر کیا پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ اذان کے کلمات جفت کے ساتھ کہیں اور اقامت کے کلمات ایتار کے ساتھ کہیں حضرت اسمٰعیلؒ جو اس حدیث کے راوی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کا ذکر حضرت ایوب کے سامنے کیا جو اس حدیث کے دوسرے راوی ہیں انہوں نے فرمایا قد قامت الصلوٰۃ دومرتبہ کہنے چاہیں۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: ''عن انس قال ذکروا'' یعنی صحابہ کرام نے نماز کا وقت یاد دلانے کے لئے ''النار والناقوس'' یعنی کچھ نے آگ جلانے کا کہا اور کچھ نے ناقوس بجانے کا، ناقوس ایک طویل لکڑی ہے جسے نصاریٰ وغیرہ نمازوں کے اوقات کے لئے بجاتے تھے ''فذکروا'' یعنی صحابہ کرام نے ''الیھود والنصارٰی'' یعنی ان سے تشبہ کا، کہا گیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ آگ اور ناقوس تو ان کی نشانیاں ہیں۔ مشہور ہے کہ یہود ایک سینگ کو پھونکا کرتے تھے اور اس کا ذکر بھی اذان کی احادیث میں موجود ہے، جب کہ آگ کا ذکر صرف حدیث انس میں ہی ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ دونوں کام کرتے ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے ان میں بھی دو فریق ہوں، ایک فریق آگ جلاتا ہو اور ایک سینگ پھونکتا ہو۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ پہلے کا ذکر وصف کے معنی میں ہو اور ثانی میں فاء سببیہ ہو یعنی انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے یہ ذکر کیا کہ نماز کے وقت آگ جلا دی جائے کیونکہ آگ ظاہر ہو جاتی ہے اور ناقوس بجا دیا جائے کیونکہ اس کی آواز ہوتی ہے اور ایسا یہود و نصاریٰ کے ذکر کی وجہ سے ہو۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لائے اور مسجد بنائی تو صحابہؓ سے اس بارے میں مشورہ کیا کہ نماز کے وقت پر لوگوں کو کیسے آگاہ کیا جائے تو کچھ صحابہ کرامؓ نے آگ اور ناقوس کا ذکر کیا اور کچھ نے کہا کہ آگ یہودیوں کی نشانی ہے اور ناقوس نصاریٰ کی علامت تو اگر ہم ان علامات میں سے کسی کو اختیار کریں گے تو ان کے اوقات کے ساتھ ہمارے اوقات کا التباس لازم آئے گا، چنانچہ بغیر کسی فیصلہ پر پہنچے اجلاس برخاست ہوگیا، چنانچہ پھر عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے خواب دیکھا کہ

ایک شخص اللہ اکبر اللہ اکبر...... کہہ کر لوگوں کو نماز کے لئے منادی کر رہا ہے تو انہوں نے یہ خواب آنحضرت ﷺ کے سامنے بیان کیا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا یہ خواب حق ہے، بلال کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور دونوں اذان دو کیونکہ بلال کی آواز تجھ سے زیادہ بلند ہے، پھر جب انہوں نے اذان دی تو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنی تو وہ بھی نبی پاک ﷺ کے پاس تشریف لائے اور عرض کیا اس اللہ کی قسم جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر بھیجا ہے میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا ہے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: **فللہ الحمد**۔ مروی ہے کہ اس شب گیارہ صحابہ کرام نے اذان خواب میں دیکھی ''**فامر بلال**'' مجہول کے ساتھ یعنی آنحضرت ﷺ نے حکم دیا ''**ان یشفع الاذان**'' یعنی بقول طیبی اذان کے الفاظ دہرا کر پڑھو یعنی ہر جملے کو دو دو بار کہو سوائے آخری کلمہ کے بقول ابن الملک ''**وان یؤتر الاقامۃ**'' یعنی اقامت کے کلمات ایک ایک دفعہ پڑھے جائیں سوائے ابتدائی اور آخری تکبیرات کے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اقامت کے فرادی فرادی ہونے پر دلیل ہے اور یہ اکثر اہل علم صحابہ کرام، تابعین، امام زہری، امام مالک، امام شافعی، امام اوزاعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ کا مذہب ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے ہم خیال علماء کی دلیل آگے چل کر آئے گی ''**قال اسماعیل**'' یعنی بقول میرک ابن علیہ، ''**قال القی**'' یعنی کہلوایا ''**علی رسول اللہ ﷺ التأذین ھو بنفسہ**'' امام طیبی فرماتے ہیں کہ مجھے ایک ایک کلمہ کی تلقین کی یعنی ابو محذورہ اس حالت کی تصویر ہیں اسی وجہ سے ماضی سے مضارع کی جانب عدول کر کے یوں کہا: **ثم تعود فتقول**۔ ظاہرا یہ امر سے مضارع کی جانب عدول ہے کیونکہ یوں فرمایا ''**فقال: قل**'' اور اس کا بیان ان ہے، پھر **تعود** کا عطف **قل** پر ہے نہ کہ **القی** پر ''**اللہ اکبر**'' راء کے سکون اور رفع کے ساتھ، نہایۃ اور غریبین میں ہے کہ اذان اور نماز میں اکبر کی راء سماعاً وموقوفاً ساکن ہے اس پر کوئی اعراب نہیں جیسا کہ حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح پر کوئی اعراب نہیں۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مؤذن کے لئے مسنون یہ ہے کہ وہ ہر ہر کلمہ پر وقف کرے کیوں موقوفاً اسی طرح مروی ہے، اگرچہ ملانا خلافِ سنت ہے، اکثر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ راء پر ضمہ ہے جب کہ مبرد نے فتحہ کو مختار کہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فتحہ اخف ہے اور اسم الجلالۃ کی تفخیم کو لازم ہے جیسا کہ **الم اللہ** میں اس کی تحقیق ثابت ہو چکی ہے، ورنہ قاعدہ مشہورہ تو یہی ہے کہ ساکن کو جب بھی کوئی حرکت دی جائے گی تو اسے کسرہ دیا جائے گا جیسا کہ: **لم یکن الذین** اور **وقل اللھم** میں ہے ''**اللہ اکبر**'' یعنی وہ بہت بڑا ہے اور اتنا بڑا کہ اس کی کبریائی اور عظمت بیان ہی نہیں کی جا سکتی اور اس کے لئے مناسب نہیں کہ اسے اس کے شایانِ شان صفات کے علاوہ صفات کی جانب منسوب کیا جائے۔ غریبین میں اس کا معنی اللہ کبیر بیان کیا گیا ہے۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ افعل کا وزن کبھی اپنے متعلقات سے ہٹ کر اضافہ اور مبالغہ کو بیان کرتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے فلان یعطی ویمنع یعنی اس میں دونوں صفات کی حقیقت موجود ہے، یہاں مبالغہ کا صیغہ لانے کا فائدہ یہ ہے کہ موصوف اس وصف میں منفرد ہے اور اس وصف میں اس کا کوئی شریک نہیں، اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات کو بھی اسی پر محمول کیا جائے گا جیسے اعلم وغیرہ۔ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ افعل اور فعیل کا وزن اللہ تعالیٰ کی صفات میں برابر استعمال ہوتا ہے کیونکہ اکبر سے دوسروں کی بہ نسبت اس کی صفت میں اضافہ مراد نہیں کیونکہ اصلِ کبریاء میں اس کا کوئی مساوی نہیں، چنانچہ افعل، فعیل کے معنی میں ہوگا۔ لیکن مغرب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بڑا ہے اور کبیر سے اس کی تفسیر کرنا ضعیف ہے اور ہو سکتا ہے کہ کبیر اور اکبر دونوں کا معنی صفاتاً ایک ہی ہو اس طور پر کہ مسند الیہ کبیر سے مراد

کبیر یا دوسروں کی جانب نسبت کرتے ہوئے اور وہ اس طرح کہ اللہ کے علاوہ جو بھی ہے وہ کبیر ہے اور اکبر سے بھی یہی مراد ہے۔ اکبر میں جب یہ معنی اظہر ہے تو تحریمہ کے وقت بھی اللہ اکبر کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا "اللہ اکبر، اللہ اکبر" یعنی چار بار تکبیر، اللہ اکبر سے آغاز اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی تمام صفاتِ کمالیہ کو ثابت کرنا مقصود ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ تمام بلند مقامات پر مستحب ہے، اور غالب یہی ہے کہ اذان بھی بلند مقام دی جاتی ہے اور چار مرتبہ اس کے تکرار میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ یہ حکم چاروں جہات جاری وساری ہے اور چاروں طبیعتوں سے پیدا ہونے والی شہوات سے پاکی کا باعث ہے۔ "اشهد" میں وضاحت اور بیان کرتا ہوں "ان لا اله الا الله" یعنی کائنات میں معبودِ برحق کوئی نہیں "الا الله، اشهد ان لا اله الا الله، اشهد ان محمدا رسول الله، ثم تعود" یعنی ان کلمات کو دہرایا "فتقول" دونوں میں مخاطب کی ضمیر کے ساتھ اور یہ دونوں فعل امر کے معنی میں ہیں "اشهد ان لا اله الا الله، اشهد ان لا اله الا الله، اشهد ان محمدا رسول الله، اشهد ان محمدا رسول الله"۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ ترجیع کی جانب اشارہ ہے اور ترجیع کا معنی ہوتا ہے ایک بار شہادت کے دونوں کلموں کو آہستہ پڑھنے کے بعد انہیں بلند آواز سے پڑھنا، امام شافعی کے ہاں یہ سنت ہے، بخلاف امام ابوحنیفہ کے یعنی وہ اسے تعلیم پر محمول کرتے ہیں اور سامعین نے اسے ترجیع سمجھ لیا یعنی اصل میں یوں تھا: قل اشهد ان لا اله الا الله مرتين واشهد ان محمدا رسول الله مرتين۔ ہمارے کچھ علماء کہتے ہیں کہ جو لوگ ترجیع کو مسنون قرار نہیں دیتے وہ حدیث ابومحذورہ کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ ابومحذورہ ان کلمات میں آواز کو بلند نہیں کر رہے تھے حالانکہ یہ کلمات ایمان کا علم اور توحید کا منارہ ہیں تو آنحضرت ﷺ نے انہیں بلند آواز سے دوبارہ کہنے کو کہا "حی على الصلاة" حی اسم فعل بمعنی امر ہے اور اس کی یاء پر فتحہ ماقبل سکون کی وجہ سے ہے "حی علیَ الصلاة" امام طیبی اس کا معنی یہ بیان فرماتے ہیں کہ اٹھو اور جلدی سے چلو اور اسی سے حدیث ابن مسعود ہے کہ: اذا ذكر الصالحون فحيع العمر۔ یعنی شروع ہو جاؤ اور جلدی سے اس کا ذکر کرو اور یہ دو کلمے تھے انہیں ایک کر لیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب "حی" کہا گیا کہ متوجہ ہو جاؤ تو کہا گیا کس چیز کی جانب؟ تو جواب دیا گیا کہ علی الصلاۃ یعنی نماز پر، اسی طرح کی تشریح کشاف میں هيت لك کے ذیل میں مذکور ہے "حی على الفلاح، حی على الفلاح" یعنی ہر مکروہ سے خالی اور ہر مراد کی کامیابی۔ کہا گیا ہے کہ فلاح کا معنی بقاء ہے یعنی اس کام کی جانب متوجہ ہو جاؤ جو عذاب سے چھٹکارہ کا اور ثواب الٰہی کا سبب اور جنت میں بقاء کا باعث ہے، وہ یا تو مطلقاً نماز ہے یا پھر وہ نماز ہے جو جماعت کے ساتھ پڑھی گئی ہو "الله اكبر، الله اكبر" یہ تکرار اقتصاراً ہے "لا اله الا الله" اختصاراً کلمہ توحید کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اختتام کر دیا تا کہ ابتداء اور انتہا میں موافقت ہو جائے اور ساتھ ہی اس بات کی جانب بھی اشارہ کر دیا کہ اول وآخر اللہ ہی ہے "رواه مسلم" بقول میرک اسے ائمہ اربعہ اور امام احمد نے نقل کیا ہے۔

کلماتِ اذان

۶۴۲: وَعَنْ اَبِیْ مَحْذُوْرَةَ قَالَ اَلْقٰی عَلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ التَّاْذِیْنَ هُوَ بِنَفْسِهٖ فَقَالَ قُلْ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا

رَّسُوْلُ اللّٰهِ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ثُمَّ تَعُوْدُ فَتَقُوْلُ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ . (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في الصحيح ۱/۲۸۷ حديث رقم (۶-۳۷۹) وأوله "الله اكبر الله اكبر" مرتين۔ وأخرجه أبو داؤد في السنن بهذا اللفظ ۱/۳۴۳ حديث رقم ۵۰۳۔ وأخرجه النسائي في السنن ۲/۵ حديث رقم ۶۳۲۔ وأخرجه ابن ماجة في السنن ۱/۲۳۴ حديث رقم ۷۰۸۔

ترجمہ: حضرت ابومحذورہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اذان کی تعلیم دی بغیر کسی واسطے کے خود بخود چنانچہ آپ نے فرمایا اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہو چار مرتبہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دو مرتبہ کہو اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہو دو مرتبہ اور پھر شہادتین میں ترجیع کا حکم دیا حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ دو مرتبہ کہا حَيِّ عَلَى الفَلَاحِ دو مرتبہ کہا آخر میں اَللّٰهُ اَكْبَر دو مرتبہ کہا اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ابومحذورۃ: یہ ''ابومحذورہ'' ہیں۔ ان کا نام ''سمرہ'' ہے مغیرۃ کے بیٹے ہیں۔ مغیرہ میں میم مکسور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا نام ''اوس بن مغیر'' ہے۔ میرک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ان کا نام سمرہ یا سلمہ بن مغیرہ ہے۔ مرتب عرض کرتا ہے کہ مرقات اور ''الاکمال'' کے نسخہ میں ''مغیرۃ'' ہے۔ جبکہ علامہ طاہر پٹنی رحمۃ اللہ علیہ نے بغیر تائے مدودہ کے یعنی ''مغیر'' نقل کیا ہے اور ان کی کنیت ابومحمد ذکر کی ہے۔ (المغنی فی ضبط أسماء الرجال، ص ۲۳۷) یہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے مکہ میں مؤذن تھے۔ ۵۹ھ میں انتقال فرمایا۔ انہوں نے ہجرت نہیں کی اور وفات تک مکہ ہی میں مقیم رہے۔

تشریح: صحیح مسلم میں ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی پاک ﷺ نے انہیں یہ اذان سکھائی: الله اكبر الله اكبر، اشهد ان لا اله الا الله اشهد ان لا اله الا الله، اشهد ان محمدا رسول الله، اشهد ان محمدا رسول الله، دو دفعہ، پھر اعادہ کرتے ہوئے کہا اشهد ان لا اله الا الله دو دفعہ، اشهد ان محمدا رسول الله دو دفعہ، حی علی الصلاة دو دفعہ، حی علی الفلاح دو دفعہ۔ اسحاق نے اللہ اکبر اللہ اکبر، لا اله الا الله کا اضافہ کیا ہے۔

امام نووی شرح المسلم میں فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم شریف کی روایت میں یوں ہی مذکور ہے، اکثر اصول میں اذان کے آغاز میں الله اكبر الله اكبر دو دفعہ ہی ہے اور مسلم کے علاوہ دیگر لوگوں نے اسے چار بار نقل کیا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ امام نسائی اور امام ابوداود نے شروع والی تکبیرات چار دفعہ نقل کی ہیں اور ان احادیث کی اسناد صحیح ہیں۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم کے فارسی کے بعض طرق میں تکبیرات چار دفعہ منقول ہیں۔ ترجیع کا مذہب امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد اور جمہور علماء کا ہے، تثنیہ کے امام مالک قائل ہیں اور وہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں، اور یہ کہ اہل مدینہ کا اسی پر عمل تھا جب کہ وہ سنت کو سب سے زیادہ سمجھنے والے لوگ تھے، جمہور کہتے ہیں کہ اگر اضافہ ثقہ راویوں کی جانب سے

ہوتو یہ مقبول ہے، اور تربیع کا عمل اہل مکہ کا ہے اور یہیں پر مختلف موسموں میں مسلمانوں کے اجتماعات وغیرہ ہوتے ہیں اور یہ کہ اس پر کسی صحابی کا انکار مذکور نہیں ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ امام طبرانی نے مجمع الاوسط میں ابومحذورہ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے حرفاً حرفاً اذان کے کلمات رسول اللہ ﷺ کہلوائے اور وہ اللہ اکبر اللہ...... تھے اور اس میں ترجیع کا ذکر نہیں ہے، اور قانون ہے کہ اذا تعارض تساقط، تو پھر حدیث ابن عمر اور عبداللہ بن زید ہی تعارض سے خالی ہیں۔

حدیث میں اگر کوئی چیز مذکور نہ ہو تو اسے معارض شمار نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ حافظہ کی بات ہے اور ثقہ راوی کا اضافہ قابل قبول ہوتا ہے، ہاں اگر نفی کی تصریح تو ہو پھر معارض ہوگا اور یہ بھی ہے کہ مثبت' نافی پر مقدم ہوتی ہے۔ گویا مصنف نے ابومحذورہ کی روایت تعارضاً نقل کی ہے اور اسی وجہ سے فرمایا کہ ابن وعمر اور ابن زید کی روایات معارضہ سے محفوظ ہیں ورنہ وہ بھی تو معارضہ سے خالی نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی وجہ سے شہادتین میں ترجیع امام شافعی کے ہاں سنت ہے، جب کہ امام ابوحنیفہؒ کے ہاں سنت نہیں، کیونکہ روایات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بلالِ حبشی اور ابن ام مکتوم نے موت تک اذان میں ترجیع نہیں کی، ہم اس حدیث کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ ابومحذورہ کو آنحضرت ﷺ کا اذان کی تلقین کرنا ان کے اسلام لانے کے بعد تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے کلمہ شہادت کا تکرار کیا تاکہ ان کے دل میں جم جائے، اور ابومحذورہ نے یہ سمجھا کہ شاید یہ اذان کا حصہ ہے۔ خلاصہ ہے کہ تاویل تساقط سے اولیٰ ہے اور وہی تاویل اولیٰ ہے جو ہمارے علماء کی کردہ ہے۔ واللہ اعلم۔

الفصل الثّانی:

۶۴۳: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ الْاَذَانُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مَرَّتَيْنِ وَالْإِقَامَةُ مَرَّةً مَرَّةً غَيْرَ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ. (رواہ ابوداود والنسائی والدارمی)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ١/ ٣٥٠ حديث رقم ٥١٠ ـ وأخرجه النسائي في السنن ٢/ ٣ حديث رقم ٦٢٨ وأخرجه الدارمي في السنن ١/ ٢٩٠ حديث رقم ١١٩٣ ـ وأخرجه أحمد في المسند ٢/ ٨٥ـ

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اذان کے کلمات دو دو مرتبہ اور اقامت کے کلمات ایک ایک مرتبہ کہے جاتے تھے البتہ اقامت میں قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ کا لفظ دو مرتبہ کہا جاتا تھا اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام نسائیؒ اور امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''عن ابن عمر قال كان الاذان'' یعنی اس کے الفاظ و جملے ''علی عهد رسول الله ﷺ'' یعنی آپ کے عہد میں عہد کو علیٰ کے ساتھ اس کے معنی کے ظہور کی وجہ سے کیا، قالہ الطیبی ''مرتين مرتين'' جمہور کے ہاں یہ اول اذان کی تکبیرات کے تکرار کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ وہ چار ہیں بخلاف امام مالک کے اور آخر کی تہلیل بھی اس میں شامل نہیں کیونکہ وہ اکیلی ہے اور یہ حدیث بظاہر ترجیع کے منافی ہے ''والاقامة'' یعنی اس کے کلماتِ مفیدہ ''مرة مرة، غير انه'' یعنی مؤذن ''كان يقول'' یعنی اقامت میں ''قد قامت الصلاة قد قامت الصلاة'' یعنی دوبار، مطلب یہ ہے کہ نماز کھڑا

ہونے کے قریب ہوگئی۔ نہایہ میں ہے اس کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ نماز والے کھڑے ہوگئے یا کھڑا ہونے کے قریب قریب ہوگئے، ایک قول کے مطابق اسے ماضی سے تعبیر قریب الوقوع ہونے کی وجہ سے کیا گیا گویا کہ یہ کام ہوگیا، اور اس سے اول و آخری تکبیر کا بھی استثنا ہونا چاہئے کیونکہ وہ بھی بغیر اختلاف کے مرتین مرتین ہیں "رواہ ابو داود" بقول میرک اور اس پر خاموشی اختیار کی ہے "والنسائی والدارمی"۔

اذان اور اقامت کے کلمات

۶۴۴: وَعَنْ اَبِیْ مَحْذُوْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلَّمَهُ الْاَذَانَ تِسْعَ عَشَرَةَ كَلِمَةً وَالْاِقَامَةَ سَبْعَ عَشَرَةَ كَلِمَةً۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداود والنسائی والدارمی وابن ماجۃ)

أخرجه أحمد فی المسند ۴۰۹/۳ وذكر الاذان ـ وأخرجه الترمذی فی السنن ۳۶۷/۱ حدیث رقم ۱۹۲ ـ وقال حسن صحیح ـ وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۳۴۲/۱ حدیث رقم ۵۰۲ ـ وذكر الاذان ثمه الاقامة ـ وأخرجه النسائی فی السنن ۴/۲ حدیث رقم ۶۳۰ ـ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۲۳۵/۱ حدیث رقم ۷۰۹ ـ وأخرجه الدارمی فی السنن ۲۹۲/۱ حدیث رقم ۱۱۹۷ ـ

ترجمہ: "حضرت ابو محذورہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اذان کے انیس کلمات اور اقامت کے سترہ کلمات سکھلائے اس حدیث کو امام احمدؒ، امام ترمذیؒ، امام ابوداؤدؒ، امام نسائیؒ، امام دارمیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔"

تشریح: "وعن ابی محذورة ان النبی ﷺ علمه الاذان تسع عشرة" شین کے سکون اور کسرہ کے ساتھ یعنی ترجیع کے ساتھ اور "کلمة" سے مراد جملہ مفید ہے "والاقامة" اذان پر عطف کی وجہ سے منصوب ہے یعنی اصل عبارت یوں ہے: علمه لاقامة "سبع عشرة" دونوں وجھوں کے ساتھ "کلمة" ابن الملک اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ یہاں ترجیع نہیں لئے اس سے دو کلموں کو حذف کر دیا گیا اور اقامت کا اضافہ شفعا ہے جس کی تفصیل یہ ہے: اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر، چار کلمے، تین تاکیدیں ہیں، اور اشہد ان لا الہ الا اللہ دوبار، دوسری تاکید ہے، اور اسی طرح اشہد ان محمدا رسول اللہ دوبار، حی علی الصلاۃ دوبار، حی علی الفلاح دوبار، قد قامت الصلاۃ دوبار، اللہ اکبر اللہ اکبر دو کلمے اور لا الہ الا اللہ ایک کلمہ۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے، امام مالک کے ہاں اقامت کے گیارہ کلمات ہیں، کیونکہ ان کے ہاں ہر کلمہ ایک بار ہی ہے سوائے کلمہ تکبیر کے اور اقامت اسی طرح ہے جیسے ابن عمر اور انس رضی اللہ عنہم سے منقول ہے، امام طیبی نے بھی یوں ہی نقل کیا ہے "رواہ احمد والترمذی" اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے "وابوداؤد والنسائی والدارمی وابن ماجة"۔

فجر کی اذان میں اَلصَّلٰوةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہا جائے

۶۴۵: وَعَنْهُ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلِّمْنِیْ سُنَّةَ الْاَذَانِ قَالَ فَمَسَحَ مُقَدَّمَ رَأْسِهٖ قَالَ تَقُوْلُ اَللّٰهُ

اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ تَرْفَعُ بِهَا صَوْتَكَ ثُمَّ تَقُوْلُ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ تَخْفِضُ بِهَا صَوْتَكَ ثُمَّ تَرْفَعُ صَوْتَكَ بِالشَّهَادَةِ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ فَاِنْ كَانَ صَلَاةُ الصُّبْحِ قُلْتَ اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ اَلصَّلٰوةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۱/ ۳٤٠حديث رقم ٥٠٠ ـ وأخرجه النسائي في السنن ۲/ ۷حديث رقم ٦٣٣ ـ

ترجمہ: حضرت ابومحذورہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا اے اللہ کے رسول مجھے اذان کا طریقہ بتلائیں راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابومحذورہؓ کی پیشانی پر اپنا ہاتھ مبارک پھیرا اور پھر فرمایا کہو اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اوران کلمات کے ساتھ اپنی آواز بلند کرو اور پھر کہو اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔انہیں آہستہ کہہ کر پھر بلند آواز سے شہادت کے کلمات کہو۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ ۔ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ۔ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ۔ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ۔ اگر فجر کی اذان ہو تو اس کے بعد اَلصَّلٰوةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ ۔اَلصَّلٰوةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ۔ کہو اس کے بعد کہو اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''وعنه'' یعنی ابومحذورہ سے ''قال قلت یا رسول الله! علمنی سنة الاذان'' یعنی شریعت میں اس کا طریقہ ''قال'' یعنی راوی ''فمسح'' یعنی نبی پاک ﷺ نے ''مقدم رأسه'' یعنی آنحضرت ﷺ کا سر مبارک۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ یہ علی الراس تھا کیونکہ عادۃً علی الرأس کہا جاتا ہے نہ کہ یمسح علی الراس اور یہ کہ ایسا اصاغر اکابر کے لئے کرتے ہیں نہ کہ اس کا عکس، ظاہرا یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک اتفاقی فعل تھا اور راوی نے اس قضیہ کو من وعن نقل کر دیا ہے، یا پھر سر سے مراد ابومحذورہ کا سر ہے اور اس کی تائید نسخہ صحیحہ سے ہوتی ہے جسمیں یوں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے میرے سر کو چھوا یعنی تبرک کے طور پر سر پر ہاتھ رکھا تاکہ برکت دماغ وغیرہ تک پہنچ جائے، اور جو اسے بتایا جائے اور لکھوایا جائے وہ یاد کر لے ''قال تقول'' ان مقدر ہے یعنی اصل میں یوں تھا الاذان قو لک، ایک یہ ہے کہ یہاں مطلق فعل بول کر مجاز احدث مراد ہے یا پھر یہ خبر امر کے معنی میں ہے یعنی یوں کہو ''الله اکبر، الله اکبر، الله اکبر، الله اکبر، ترفع بها صوتك'' یہ جملہ حالیہ یا استینا فیہ مبینہ ہے ''ثم تقول: اشهد ان لا اله الا الله، اشهد ان لا اله الا الله، اشهد ان محمدا رسول الله، اشهد ان محمدا رسول الله، تخفض بها صوتك ثم ترفع صوتك بالشهادة'' بظاہر یہ سابقہ تاویلات کے منافی ہے، اس کی بہترین توجیہہ یہ ہے کہ ترجیح ان اکثر روایات کو ہے جن میں ترجیع نہیں ہے۔ واللہ اعلم اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حدیث ابومحذورہ پہلے کی اور دیگر احادیث بعد کی ہیں، اس لئے حدیث ابومحذورہ منسوخ ہے ''اشهد ان لا

اله الا الله، اشهد ان لا اله الا الله، اشهد ان محمدا رسول الله، اشهد ان محمدا رسول الله، حی علی الصلاة، حی علی الصلاة، حی علی الفلاح، حی علی الفلاح، فان کان ''یعنی وقت یا جس کے لئے اذان دی جارہی ہے'' **صلاة الصبح** ''نصب کے ساتھ یعنی اس کا وقت، اور ایک قول کے مطابق رفع کے ساتھ ہے، اس وقت کان تامہ ہوگا'' **قلت** ''یعنی اس کی اذان میں'' **الصلوٰة خیر من النوم، الصلاة خیر من النوم** ''یعنی نماز کی لذت اہل ذوق اور اصحاب شوق کے ہاں نیند کی لذت سے بہتر ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسی قبیل سے ہو جس میں اہل عرب یوں کہتے: **العسل احلی من الخل** '' کہ شہد سرکہ سے زیادہ میٹھا ہوتا ہے'' باقی رہا ابن حجر کا یہ کہنا کہ اس روایت سے فجر میں اذان میں ان الفاظ کے اضافے کی اباحت معلوم ہوتی ہے اور یہی دیگر علماء کی طرح ہمارا بھی مذہب ہے بخلاف ابوحنیفہ کے'' تو یہ درست نہیں اور یہ بات انہوں نے اپنے مذہب کے بارے میں معلومات کی کمی کی بناء پر کہی ہے'' **الله اکبر، الله اکبر، لا اله الا الله، رواه ابو داوٗد** ''اور اس روایت کو امام نسائی نے بھی نقل کیا ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے' اسے میرک نے نقل کیا ہے، ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس کی اسناد صحیح ہیں۔

تثویب کا حکم

۶۴۶: وَعَنْ بِلَالٍ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تُثَوِّبَنَّ فِیْ شَیْءٍ مِّنَ الصَّلٰوةِ اِلَّا فِیْ صَلٰوةِ الْفَجْرِ (رَوَاهُ الترمذی و ابن ماجة وَقَالَ الترمذی اَبُوْ اِسْرَائِیْلَ الرَّاوِیْ لَیْسَ هُوَ بِذَالِكَ الْقَوِیُّ عِنْدَ اَهْلِ الْحَدِیْثِ)۔

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۳۷۸ حدیث رقم ۱۹۸ ـ وقال أبو إسرائیل إسماعیل بن اسحاق هو بذاك القوی عند أهل الحدیث ـ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۲۳۷ حدیث رقم ۷۱۵ ولفظه "أمرنی رسول اللّٰه أن أثوب فی الفجر و نهانی أن أثوب فی العشاء"

ترجمہ: حضرت بلالؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ فجر کی نماز کے علاوہ اور نماز میں تثویب نہ کرو اس حدیث کو امام ترمذی اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے راوی اسرائیل محدثین کے نزدیک قوی نہیں ہے۔

راویٔ حدیث:

بلال بن رباح۔ یہ بلال بن رباح حضرت ''ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ'' کے آزاد کردہ ہیں۔ شروع زمانہ میں اسلام لے آئے۔ یہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے مکہ میں اپنے اسلام کو ظاہر کیا۔ غزوۂ بدر میں اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے اور آخر زمانہ میں شام رہنے لگے اور ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان سے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ بعمر تریسٹھ برس ۲۰ھ میں دمشق میں انتقال کیا اور ''باب الصغیر'' میں دفن ہوئے ایک قول یہ ہے کہ ''حلب'' میں انتقال ہوا اور ''باب الاربعین'' میں دفن ہوئے۔ صاحب کشاف کہتے ہیں کہ پہلا قول صحیح ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو

اہل مکہ نے اسلام قبول کرنے کی بناء پر سخت اذیتیں پہنچائی تھیں بلال رضی اللہ عنہ کو شدید تکالیف میں مبتلا کرنے میں "امیہ بن خلف جمحی" بذات خود حصہ لیتا تھا۔ یہ خدا کی تقدیر تھی کہ یہ ملعون حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہی کے ہاتھ سے بدر کے دن قتل ہوا۔ جابر کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہمارے سردار ہیں اور ہمارے سردار یعنی بلال رضی اللہ عنہ کو آزاد کرنے والے ہیں۔

تشریح: "وعن بلال قال: قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاتثوبن فی شيء من الصلوات" تثویب کا لغوی معنی ہوتا ہے آگاہی کے بعد آگاہ کرنا "الا فی صلاۃ الفجر" الفائق میں ہے کہ تصویب کا لفظ اصل میں اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص کپڑے سے اشارہ کر کے مدد کا طلب گار ہو، گویا اسکی یہ طلب دعا اور انذار بن جاتی ہے، پھر اس لفظ کا استعمال بہت زیادہ ہونے لگا یہاں تک کہ دعا کو بھی تثویب کہنے لگ گئے۔ ایک قول کے مطابق تثویب کا معنی بار دعا کرنا اور یہ باب تفعیل سے ماخوذ ہے اور ثاب یعنی رجع کے معنی میں ہے اور اسی وجہ سے مؤذن کے الفاظ "الصلوٰۃ خیر من النوم" کو تثویب کہا جاتا ہے، النہایہ میں یہ اضافہ ہے کہ مؤذن جب حی علی الصلاۃ کہے تو اس نے لوگوں کو نماز کے لئے بلایا پھر جب اس کے بعد الصلاۃ خیر من النوم کہے تو گویا اس نے ایسا کلام کیا جس کا معنی ہے کہ نماز کے لئے جلدی آؤ اور ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ لوگ نیند سے نماز کی جانب رجوع کریں۔ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ تثویب فجر کے ساتھ خاص ہے باقی نمازوں میں مکروہ ہے۔ ابن عمر سے منقول ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو فجر کے علاوہ نماز کے تثویب کرتے ہوئے سنا تو انہوں نے اپنے ساتھی سے فرمایا اٹھو اس بدعتی کے پاس سے دور ہو جاؤ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اس کا انکار منقول ہے کہ انہوں نے یوں فرمایا کہ اس بدعتی کو مسجد سے نکال دو۔ باقی رہی اذان اور اقامت کے درمیان والی تثویب تو یہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہ تھی۔

متاخرین نے تمام نمازوں میں تثویب کو مستحب قرار دیا ہے "رواہ الترمذی وابن ماجۃ وقال الترمذی: ابو اسرائیل الراوی لیس ھو بذاك القوی عند اھل الحدیث" ایک قول کے مطابق وہ رافضی اور شاتم صحابہ وعثمان غنی رضی اللہ عنہ ہے، ابن مہدی نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ہمارے ائمہ کا اس حدیث سے استدلال نہ کرتے ہوئے یہ کہنا کہ فجر کے علاوہ دیگر نمازوں میں تثویب مکروہ ہے یہ ضعیف ہے، یہ حدیث کراہت میں مستدل نہیں ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث میں منقول ہے: من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو رد۔

اذان میں غلطی سے بچو

۶۴۷: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ لِبِلَالٍ اِذَا اَذَّنْتَ فَتَرَسَّلْ وَاِذَا اَقَمْتَ فَاحْدُرْ وَاجْعَلْ بَيْنَ اَذَانِكَ وَاِقَامَتِكَ قَدْرَ مَا يَفْرُغُ الْاٰكِلُ مِنْ اَكْلِهٖ وَالشَّارِبُ مِنْ شُرْبِهٖ وَالْمُعْتَصِرُ اِذَا دَخَلَ لِقَضَاءِ حَاجَتِهٖ وَلَا تَقُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوْنِيْ (رواه الترمذی وَقَالَ لَانَعْرِفُهٗ اِلَّامِنْ حَدِيْثِ عَبْدِالْمُنْعِمِ وَهُوَ اِسْنَادٌ مَجْهُوْلٌ)۔

أخرجه الترمذي في السنن ۱/۳۷۳ حديث رقم ۱۹۵ وقال في إسناده مجهول ۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جب تم اذان کہو تو

ٹھہر ٹھہر کر کہا کرو اور جب اقامت کہو تو جلدی جلدی کہا کرو اذان اور تکبیر کے درمیان اتنا وقفہ کیا کرو کہ کھانے والا اپنے کھانے سے اور پینے والا اپنے پینے سے اور قضاء حاجت کو جانے والا اپنے حاجت سے فارغ ہو جائے اور نماز کے لئے اس وقت تک کھڑے نہ ہو جاؤ جب کہ مجھے آتا ہوا نہ دیکھو اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ ہم اس حدیث کو سوائے عبدالمنعم کے کسی اور سے نہیں پہچانتے اور اس کی سند مجہول ہے۔

تشریح: ''**وعن جابر ان رسول الله ﷺ قال لبلال اذا اذنت فترسل**'' یعنی ٹھہر ٹھہر کر اذان دے اور تمام کلمات کے درمیان کچھ سانس لے کر فاصلہ کر لیا کر۔ النہایہ میں اس کا مطلب یہ لکھا ہوا ہے کہ آہستگی کام لے جلدی سے نہیں۔ چنانچہ اہل عرب کہتے ہیں ترسل فلان فی کلامہ ومشیتہ، یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ وہ جلدی نہ کر رہا ہو اور اسی کو ترسیل کہا جاتا ہے۔ الفائق میں ہے کہ ترسل کی حقیقت طلب الرسل ہے اور اس کا معنی ہوتا سکون اور اطمینان۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ اذان میں آہستگی سے اس طرح کام لو کہ تمام کلمات واضح اور صاف سنائی دیں اور فضول لمبا بھی نہ کرو کہ حد سے ہی تجاوز کر جاؤ، اسی وجہ سے مؤذنین کو اذان میں غلطیاں کرنے پر متنبہ کیا جاتا ہے، کیونکہ بہت سی غلطیاں کفر تک لے جاتی ہیں جیسے اشہد کے ہمزہ کو اتنا طویل کرنا کہ وہ استفہام بن جائے اور اکبر کی باء کو لمبا کرنا کہ وہ کبر کی جمع بن جائے جس کا معنی ہوتا طبل، اسی طرح الہ پر وقف اور اللہ سے ابتداء وغیرہ وغیرہ، کچھ غلطیاں اس میں لحن خفی ہیں جیسے محمد کی دال کا ادغام رسول اللہ کی راء میں نہ کرنا، اور اللہ، الصلاۃ اور الفلاح کے الف کو خوب لمبا کرنا، اللہ کے الف کو ھاء سے بدل دینا، الصلاۃ کی ھاء کا تلفظ نہ کرنا کیونکہ یہ جہنم کی دعوت بن جاتی ہے۔

رہی بات کفریات کی تو اکبر کے ہمزہ کو لمبا کرنے سے یہ استفہام بن جاتا ہے اس لئے کفر ہے، اور اللہ سے ابتداء کفریات میں سے نہیں بلکہ الہ پر وقف لغو ہے، محمد کی دال یعنی دال کی تنوین کا ادغام مراد ہے ورنہ دال کا ادغام لحن جلی میں سے ہے، باقی رہا ان کا یہ کہنا کہ اللہ کا الف اور اس کے مابعد الف کو لمبا کرنے کا مسئلہ تو یہ درست نہیں کیونکہ اس میں قصر، توسط اور حالت وقف میں تین الف کے بقدر لمبا کرنا جائز ہے۔ الف کو ہمزہ سے بدلنے والی جملہ ان کی عبارت کی مسامحت ہے ''**واذا اقمت فاحدر**'' دال کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ یعنی جلدی جلدی الفاظ تلفظ کرو اور گڈمڈ کئے بغیر الفاظ کی ادائیگی کرو اور درمیان میں وقف نہ کرو ''**واجعل بين اذانك واقامتك**'' یعنی کچھ وقت ''**قدر ما يفرغ الآكل من اكله**'' کہا گیا ہے کہ یہ حکم عشاء کی نماز کا ہے کیونکہ اس کے وقت میں گنجائش ہوتی ہے ''**والشارب من شربه**'' تین نقطوں والی شین کے ساتھ اور اس پر مشہور ضمہ ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ گویا یہ حکم مغرب کا ہے کیونکہ اس میں وقت تنگ ہوتا ہے۔

ان کا یہ کلام امام شافعی رحمہ اللہ کے قول پر اور مغرب کے وقت کی تنگی پر مبنی ہے، ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ فرمانا چاہا ہے کہ جو لوگ حقیقتاً یا حکماً نماز پڑھنے کا ارادہ کر چکے ہیں، اگر وہ کسی چھوٹے موٹے کام میں مشغول ہیں تو وہ فارغ ہو جائیں اور یہ حکم کسی خاص نماز ساتھ مختص نہیں ''**والمعتصر**'' یعنی جو بول و براز کے لئے نکلا ہوا ہے وہ فارغ ہو جائے اور استنجا وغیرہ کر لے، وحشت سے بچنے کے لئے کنائی الفاظ استعمال کئے اور یہ لفظ عصر یا معصر سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہوتا ہے ٹھکانہ، ایک قول کے مطابق اس سے حاقن مراد ہے اور حاقن کا معنی ہوتا ہے وہ چیز جو بول و براز کے لئے تکلیف دہ ہو ''**اذا دخل**'' یعنی بیت الخلاء

میں ''لقضاء حاجته'' یعنی صبر کرو یہاں تک کہ وہ وضو کر لے اور نماز کے لئے تیار ہو جائے۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ حکم گویا فجر، ظہر اور عصر کے لئے ہے کیونکہ ان کے اوقات متقارب ہیں ''ولا تقوموا'' یعنی نماز کے لئے جب مؤذن اقامت کہے ''حتی ترونی'' یعنی مسجد میں کیونکہ امام کی آمد سے قبل قیام باعث تھکن اور بلا فائدہ ہے، جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے اور شاید کہ نبی علیہ السلام حجرہ سے اقامت شروع ہونے کے بعد نکلتے تھے، اور محراب میں اس وقت داخل ہوتے تھے جب کہ اقامت کہنے والا حی علی الصلاۃ پر پہنچ جاتا تھا، اسی وجہ سے ہمارے ائمہ کرام نے فرمایا ہے کہ امام اور مقتدی تمام لوگ حی علی الصلاۃ کے وقت کھڑے ہوں اور قد قامت الصلاۃ کے وقت نماز شروع کر دی جائے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ حجرہ سے اس وقت نکلتے تھے جب کہ اقامت کہنے والا اقامت سے فارغ ہو چکا ہوتا تھا، پھر آپ لوگوں کو قیام کا حکم فرماتے تھے کیوں یہی قیام کا وقت ہے، اسی وجہ سے ہمارے اصحاب کا خیال ہے کہ مقتدی حضرات اس وقت کھڑے ہوں جب کہ اقامت کہنے والا پوری اقامت کہہ چکے۔

یہ حکم آپ علیہ السلام تک حدیث کی صحت کے مرفوع ہونے پر موقوف ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ نہی مؤذنین کے لئے ہو یعنی تم اقامت کے لئے اس وقت تک کھڑے نہ ہو جب تک کہ مجھے دیکھ نہ لو کہ میں حجرہ سے نکل چکا ہوں ''رواه الترمذی وقال لانعرفه الا من حديث عبدالمنعم وهو'' یعنی اس کی اسناد ''اسناد مجهول'' ایک صحیح نسخہ میں واسناده مجهول، لیکن ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام حاکم وغیرہ نے اذان کی ترسیل اور اقامت کے ادراج کے حکم کو صحیح قرار دیا ہے اور شیخین نے ایک یوں نقل کی ہے کہ تم کھڑے نہ ہو تا آنکہ مجھے دیکھ لو۔

جو اذان کہے وہی اقامت کہے

۶۴۸: وَعَنْ زِيَادِ بْنِ الْحَارِثِ الصُّدَائِيِّ قَالَ اَمَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اُذِّنْ فِيْ صَلٰوةِ الْفَجْرِ فَاَذَّنْتُ فَاَرَادَ بِلَالٌ اَنْ يُقِيْمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَخَاصُدَاءٍ قَدْ اَذَّنَ وَمَنْ اَذَّنَ فَهُوَ يُقِيْمُ. (رواه الترمذی وابوداود وابن ماجة)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۳۸۳ حديث رقم ۱۹۹ وضعفه۔ وأخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۳۵۲ حديث ۵۱۴۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۲۳۷ حديث رقم ۷۱۷۔ وأخرجه أحمد فی المسند ۴/۱۶۹۔

ترجمہ: ''حضرت زید بن حارث صدائیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فجر کی نماز کے لئے اذان کہنے کا حکم دیا چنانچہ میں نے اذان کہی پھر حضرت بلالؓ نے اقامت کہنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صدائی کے بھائی نے اذان کہی ہے جو اذان کہے وہی اقامت کہے اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام ابوداوٗدؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

زیاد بن الحارث۔ زیاد "حارث صدائی" کے بیٹے ہیں۔ بنو حارث بن کعب کے حلیف تھے۔ آنحضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی اور آپ ﷺ کے یہاں مؤذن بھی رہے۔ ان کا شمار بصریوں میں ہے۔ "صدائی" "صداء" کی طرف منسوب ہے یمن کے ایک محلّہ کا نام ہے صدائی۔ میں صاد مہملہ پر پیش ہے اور دال مہملہ پر تشدید نہیں ہے اور الف کے بعد ہمزہ ہے۔

تشریح: "قال امرنی رسول الله ﷺ ان أذن" یہ اَن مفسرہ ہے، کیونکہ امر میں قول کے معنی ہیں "فی صلاۃ الفجر فاذنت" شاید کہ بلال اس وقت موجود نہیں ہوں گے اور پھر آ گئے ہوں گے "فأراد بلال ان یقیم" حسب عادت "فقال رسول الله ﷺ ان اخا صداء قد أذن، ومن أذن فھو یقیم" یعنی اقامت وہی کہے، کوئی اور کہے تو مکروہ ہے، یہی مذہب امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مکروہ نہیں کیونکہ ابن ام مکتوم سے منقول ہے کہ کبھی وہ اذان دیتے تھے اور بلال اقامت کہتے تھے اور کبھی اس کا الٹ ہوتا تھا، یہ حدیث اس موقع پر محمول ہے جب کہ کسی اور کے اقامت کہنے سے کسی وحشت کا خوف ہو، قالہ ابن الملک "رواہ الترمذی وابوداود وابن ماجۃ" میرک کہتے ہیں کہ امام ترمذی نے اسے افریقی کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے، حازمی نے اسے حسن، عقیلی اور ابن الجوزی نے اسے قوی قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اگرچہ اس کی اسناد میں ضعف موجود ہے مگر پھر بھی بہتر ہے، جیسا کہ امام بیہقی وغیرہ نے حدیث: ان بلالا اذن فقال عبداللہ بن زید یارسول اللہ! انی اری الرؤیا ویؤذن بلال قال اقم انت " کہ بلال نے اذان دی تو عبداللہ بن زید نے کہا کہ یارسول اللہ! میں بلال کو خواب میں اذان دیتے دیکھا ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا تم اقامت کہو" اس حدیث کے اسناد میں بھی یہی راوی ہیں اور اس کے متن میں بھی اختلاف ہے بخلاف دوسری حدیث کے کہ وہ مؤخر ہونے کے باوجود اقوم اسناداً ہے اور یہ کہ آخر الامرین پر عمل کرنا اولیٰ ہے اور حازمی وغیرہ نے صدائی کی اس حدیث میں سند کو حسن قرار دیا ہے۔

الفصل الثالث:

شروع میں الصلوٰۃ جامعۃ کے ساتھ اعلان ہوتا تھا

۶۴۹: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ الْمُسْلِمُوْنَ حِيْنَ قَدِمُوا الْمَدِيْنَةَ يَجْتَمِعُوْنَ فَيَتَحَيَّنُوْنَ لِلصَّلَاةِ وَلَيْسَ يُنَادِيْ بِهَا اَحَدٌ فَتَكَلَّمُوْا يَوْمًا فِيْ ذٰلِكَ فَقَالَ بَعْضُهُمْ اِتَّخِذُوْا مِثْلَ نَاقُوْسِ النَّصَارٰى وَقَالَ بَعْضُهُمْ قَرْنًا مِثْلَ قَرْنِ الْيَهُوْدِ فَقَالَ عُمَرُ اَوَلَا تَبْعَثُوْنَ رَجُلًا يُّنَادِيْ بِالصَّلٰوةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَا بِلَالُ قُمْ فَنَادِ بِالصَّلَاةِ . (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه، ۷۷/۲ حدیث رقم ٦٠٤ ـ وأخرجه مسلم فی صحیحه ۲۸٥/۱ حدیث (۱ـ۳۷۷) وأخرجه الترمذی فی السنن ۳٦۲/۱ حدیث رقم ۱۹۰ ـ وأخرجه النسائی فی السنن ۲/۲ حدیث رقم ۱ ـ وأخرجه أحمد فی

مسنده ۱۴۸/۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ مسلمان جب مدینہ منورہ میں آئے۔تو نماز کے لئے وقت مقرر کرنے کے لئے جمع ہوئے۔کیونکہ نماز کے لئے کوئی آدمی بلانے والا نہیں تھا۔ایک مرتبہ جب اس مسئلہ کے متعلق گفتگو ہوئی تو بعض لوگوں نے کہا کہ نصاریٰ کی طرح ناقوس بنالیا جائے اور بعض نے کہا کہ یہود کی طرح سینگ بنالیا جائے یہ تمام تجاویز سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔کیوں نہ مقرر کر دیا جائے کسی آدمی کو جو نماز کے لئے اعلان کرے۔پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔اے بلال! تم نماز کے لئے اعلان کر دیا کرو۔(بخاری ومسلم)

تشریح: ''عن ابن عمر قال كان المسلمون حين قدموا المدينة يجتمعون'' یعنی مسجد میں ''فيجتمعون''یعنی نماز میں حاضر ہونے کے لئے نماز کے وقت کا اندازہ اور تخمینہ لگاتے تھے''للصلاة''یعنی نماز با جماعت پانے کے لئے،تنازع فعلین کے طریقہ پر یہ دونوں سے متعلق ہے''وليس ينادى بها''یعنی نماز کے لئے کوئی منادی نہ تھا ''احد فتكلموا يوما في ذالك''یعنی اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے''فقال بعضهم اتخذوا''صیغہ امر کے ساتھ''مثل ناقوس النصارى، وقال بعضهم قرنا''یعنی بلکہ سینگ بجاؤ''مثل قرن اليهود''، کچھ نے کہا کہ بعض یہودیوں کی طرح آگ جلاؤ، پس دونوں حدیثوں میں کوئی منافات نہیں''فقال عمر اولاتبعثون''واو عاطفہ بر مقدر ہے یعنی اصل عبارت یہ ہے تقولون بموافقة اليهود والنصارى ولاتبعثون کہ تم لوگ یہود ونصاریٰ کی موافقت کی باتیں کرتے ہو اور کسی کو بھیجتے نہیں، ہمزہ پہلے جملے کے انکار کے لئے اور دوسرے جملے کی تقریر اور مضبوطی کے لئے ہے یعنی بھیجو''رجلا ينادى بالصلاة فقال رسول الله ﷺ يا بلال قم فناد بالصلاة''یعنی الصلاة جامعة کی آواز لگاؤ، کیونکہ ابوسعید نے ایک مرسل روایت نقل کی ہے کہ حضرت بلال الصلاة جامعه کہہ کر آواز لگاتے تھے پھر اذان مشروع ہوگئی، مسلم کی شرح میں قاضی عیاض سے منقول ہے کہ ظاہرا یہ نماز کا وقت آجانے کی خبر اور اطلاع ہے، شرعی اور موصوف اذان نہیں۔امام نووی فرماتے ہیں کہ یہی درست ہے تاکہ اس روایت اور عبداللہ بن زید کی روایت (انه راى الاذان فى المنام) میں تطبیق ہو جائے اور یہ کسی دوسری مجلس کی بات ہے کہ جس میں نماز کے لئے آگاہ کرنا طے ہوا، پھر عبداللہ بن زید نے خواب دیکھا، پھر نبی پاک ﷺ کا اسے مشروع قرار دینا یا تو وحی سے ہے یا پھر آنحضرت ﷺ کا اجتہاد ہے اور یہ بات جمہور کہتے ہیں کیونکہ اس بات پر اتفاق ہے کہ صرف خواب پر عمل نہیں ہوسکتا۔واللہ اعلم۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انبیاء کے علاوہ کسی اور کے خواب پر کسی حکم کو مشروع نہیں کیا جاسکتا بلکہ اجتہاد یا وحی سے مشروع کیا جاسکتا ہے اور اس کی تائید عبدالرزاق اور مراسیل میں مذکور ابوداؤد کی روایت سے ہوتی ہے جو کہ بعض اکابر تابعین کے واسطے سے منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب اذان سنی تو آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تاکہ آپ علیہ السلام کو بتائیں تو انہوں نے پایا کہ وحی اس بارے میں نازل ہو چکی ہے، چنانچہ شرف صرف حضرت بلال کی اذان کو ہے اور نبی علیہ السلام نے فرمایا یہی وحی ہے، یہ روایت داودی کی اس روایت سے زیادہ صحیح ہے کہ جبریل اس خواب سے آٹھ یوم قبل یہ اذان لے کر نازل ہوئے تھے، سہیلی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس بات میں کیا حکمت ہے کہ اذان کی بنیاد تو صحابہ کے خواب پر ہے باقی

احکام کی نہیں، اوران کا یہ کہنا کہ یہ سچا خواب تھا کہ آنحضرت ﷺ نے معراج کی شب یہ اذان کا یہ معاملہ دیکھا تھا، چنانچہ بزار نے علی رضی اللہ سے نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اذان سکھانا چاہی تو جبریل براق لے کر آئے، پھر جب پردے ہٹ گئے، تو ایک فرشتہ نکلا، آپ نے جبریل سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ انہوں نے اس سے قبل اسے نہیں دیکھا، تو فرشتے نے کہا اللہ اکبر، اللہ اکبر تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے بندے نے سچ کہا میں بڑا ہوں میں بڑا ہوں اور اسی طرح باقی اذان بھی ذکر کی۔ سہیلی فرماتے ہیں کہ یہ وحی سے قوی ہے، پھر اذان کو مدینہ تک مؤخر کیا گیا اور لوگوں کو نماز کے وقت کے بارے میں آگاہ کرنا چاہا تو وحی عبداللہ بن زید کے خواب تک رکی رہی، پھر جب انہوں نے خواب دیکھ لیا تو آپ ﷺ نے جو دیکھا تھا اس سے موافقت ہوگئی، اسی وجہ سے فرمایا تھا کہ یہ خواب ان شاء اللہ برحق ہے، اس وقت معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی وہ مراد جو میں آسمانوں میں دیکھ آیا ہوں وہی زمین میں سنت ہے ''متفق علیه''۔

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کا خواب

۶۵۰: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَبْدِ رَبِّهٖ قَالَ لَمَّا اَمَرَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالنَّاقُوْسِ يُعْمَلُ لِيُضْرَبَ بِهٖ لِلنَّاسِ لِجَمْعِ الصَّلَاةِ طَا فَ بِهٖ وَاَنَا نَائِمٌ رَجُلٌ يَحْمِلُ نَاقُوْسًا فِيْ يَدِهٖ فَقُلْتُ يَا عَبْدَاللّٰهِ اَتَبِيْعُ النَّاقُوْسَ قَالَ وَمَا تَصْنَعُ بِهٖ قُلْتُ نَدْعُوْبِهٖ اِلَى الصَّلَاةِ قَالَ اَفَلَا اَدُلُّكَ عَلٰى مَا هُوَ خَيْرٌ مِنْ ذٰلِكَ فَقُلْتُ لَهٗ بَلٰى قَالَ فَقَالَ تَقُوْلُ اَللّٰهُ اَكْبَرُاِلٰى اٰخِرِهٖ وَكَذَا الْاِقَامَةُ فَلَمَّا اَصْبَحْتُ اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَاَخْبَرْتُهٗ بِمَا رَاَيْتُ فَقَالَ اِنَّهَا لَرُؤْيَا حَقٌّ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى فَقُمْ مَعَ بِلَا لٍ فَاَلْقِ عَلَيْهِ مَارَاَيْتَ فَلْيُؤَذِّ نْ بِهٖ فَاِنَّهٗ اَ نْدٰى صَوْتًا مِنْكَ فَقُمْتُ مَعَ بِلَالٍ فَجَعَلْتُ اُلْقِيْهِ عَلَيْهِ وَيُؤَذِّنُ بِهٖ قَالَ فَسَمِعَ بِذٰلِكَ عُمَرُبْنُ الْخَطَّابِ وَهُوَ فِيْ بَيْتِهٖ فَخَرَجَ يَجُرُّرِدَاءَ هٗ يَقُوْلُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ فَقَدْ رَاَيْتُ مِثْلَ مَا اُرِيَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ (رواه ابو داود والدارمی وابن ماجة الا انه لم يذكر الاقامة وقال الترمذی هذا حديث صحيح) لٰكِنَّهٗ لَمْ يُصَرِّحْ قِصَّةَ النَّاقُوْسِ.

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۳۳۷حديث رقم ۴۹۹۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۲۳۲حديث رقم ۷۰۶وأخرجه الدارمی فی السنن ۱/۲۸۶حديث رقم ۱۱۸۷۔وأحمد فی مسنده ۴/۴۳۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ناقوس بنانے کا حکم دیا۔ تا کہ نماز باجماعت کے لئے لوگوں کو حاضر ہونے کے لئے اس کو بجایا جائے۔ تو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی اپنے ہاتھ میں ناقوس لے کر جارہا ہے۔ میں نے اس آدمی سے کہا۔ بندہ خدا کیا تم اس ناقوس کو فروخت کرو گے ۔اس آدمی نے کہا تم اس کو کیا کرو گے۔ میں نے کہا ہم اس کو بجا کر لوگوں کو نماز باجماعت کے لئے بلایا کرینگے۔اس نے کہا کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز نہ بتادوں۔ میں نے کہا ہاں ضرور بتاؤ۔اس نے کہا کہو۔اللہ اکبر...... پوری اذان بتائی اور

اسی طرح پوری اقامت بھی بتائی۔ جب صبح ہوئی تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور جو کچھ خواب میں دیکھا وہ آپ ﷺ کے سامنے بیان کر دیا آپ ﷺ نے فرمایا۔ ان شاء اللہ خواب سچا ہے اب تم بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑے ہو کر جو کچھ آپ نے خواب میں دیکھا وہ ان کو سکھا دو کیونکہ ان کی آواز تم سے بلند ہے چنانچہ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑے ہو کر ان کو بتا تا گیا اور وہ اذان کہتے رہے۔ حدیث کے راوی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب اذان کی آواز سنی تو جلدی سے چادر گھسیٹتے ہوئے گھر سے نکلے اور یہ کہتے ہوئے حاضر خدمت ہوئے کہ اے اللہ کے رسول ﷺ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دیکر بھیجا ہے میں نے بھی ایسا خواب دیکھا ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا الحمد اللہ۔ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ امام دارمی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے مگر امام ابن ماجہؒ نے اقامت کا ذکر نہیں کیا اور امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث صحیح ہے مگر امام ترمذی نے ناقوس کے قصہ کی تصریح نہیں کی۔

تشریح: ''وعن عبدالله بن زيد'' ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ابن ثعلبہ ہیں ''ابن عبدربه'' رضی اللہ عنہ، انصاری، الخزرجی، ستر صحابہ کرام کے ساتھ وہ بھی عقبہ میں شریک ہوئے اور غزوہ بدر کے ساتھ ساتھ دیگر غزوات میں بھی شریک ہوئے اور ان کے والدین بھی صحابی ہیں، جیسا کہ التقریب میں مذکور ہے ''قال لما امر رسول الله ﷺ بالناقوس'' شاید کہ اس سے مراد اس کا حکم دینا ہے ''یعمل'' حال ہے، اور مجہول ہے جیسا کہ اگلا جملہ مجہول ہے ''لیضرب به'' یعنی بجایا جائے ''للناس'' یعنی انہیں حاضر کرنے کے لئے اور ایک نسخہ میں لیضرب به الناس ہے یعنی کوئی ایک بجائے ''لجمع الصلاة'' یعنی نماز باجماعت ادا کرنے کے لئے ''طاف بی'' یہ لما کا جواب ہے، یعنی میرے پاس سے گذرا ''وانا نائم'' یہ مفعول سے حال ہے، جوہری فرماتے ہیں کہ طیف الخیال کا مطلب ہوتا ہے نیند میں کسی چیز کا آنا ''رجل'' حدیث میں یہ فاعل ہے اور یہ خیال ہے اور ظاہرا اس کی تقدیری عبارت یہ ہے: جاء نی رجل فی عالم الخیال کہ خیال کے عالم میں ایک شخص آیا ''یحمل ناقوسا فی یده'' یہ جملہ رجل کے لئے صفت ہے ''فقلت یا عبدالله! اتبیع الناقوس؟ قال وماتصنع به؟'' یہ ما استفہامیہ ہے ''قلت ندعو'' یعنی لوگوں کو ''به'' یعنی اسے بجا کر اور اس کی آواز نکال کر ''الی الصلاة'' یعنی نماز باجماعت کے لئے، الف لام عہدی ہے اور مضاف الیہ سے بدل ہے ''قال'' اور ایک نسخہ میں فقال ہے ''افلا ادلك علی ماهو خیر من ذلك؟ فقلت له بلی، قال'' یعنی راوی خواب دیکھنے والا ''فقال'' یعنی دکھائی دینے والا ''تقول الله اكبر الی آخره'' یعنی پوری اذان سابقہ کیفیت کے ساتھ ''وكذا'' یعنی اذان کی طرح ''الاقامة'' بظاہر یہ ہمارے مذہب کی تائید ہے یعنی وہ بھی انہیں سکھا دی اور ایک روایت میں ہے کہ اذان کی تعلیم کے بعد کچھ توقف کیا پھر کہا کہ پھر تم جب نماز کے لئے کھڑے ہو تو یوں کہو اللہ اکبر اللہ اکبر یعنی پوری اقامت بتلائی ''فلما اصبحت اتیت رسول الله ﷺ فاخبرته بما رأیت'' یعنی خواب میں جو دیکھا ''فقال انها'' یہ تیرا خواب ''لرؤیا حق'' یعنی درست، حق، سچ اور وحی کے مطابق یا اجتہاد کے موافق ہوگا ''ان شاء الله'' تعالیٰ، یہ یا تو تبرک کے لئے یا تعلیق کے لئے ''فقم مع بلال، فالق'' ہمزہ کے فتحہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ یعنی کہلواؤ ''علیه مارأیت فلیؤذن'' اور ایک نسخہ فیؤذن ہے ''به'' یعنی جو اسے کہلوایا جائے ''فانه'' یعنی بلال ''اندی'' یعنی بلند ''صوتا منك''۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ نداء ندادی سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے رطوبت، اہل عرب

کہتے ہیں صوت ندی یعنی بلند آواز، آواز کے لئے نداء کا لفظ اس بات سے کنایہ ہے کہ جس کے منہ میں رطوبت زیادہ ہوگی اس کا کلام عمدہ ہوگا، اور سخاوت کو بھی ندی سے تعبیر کرتے ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے فلان اندی کفا من فلان یعنی فلاں فلاں سے زیادہ سخی ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مؤذن بلند اور خوبصورت آواز والا ہونا چاہئے "فقمت مع بلال، فجعلت القيه عليه" یعنی میں اسے کہلوانے لگا "ويؤذن به، قال فسمع بذلك" یعنی اذان کی آواز "عمر بن الخطاب رضى الله عنه وهو فى بيته" یہ جملہ حالیہ ہے "فخرج" یعنی جلدی سے اور ایک روایت میں فخرج کی جگہ فجعل ہے "يجر رداء ه" یعنی اپنے پیچھے کو "يقول يارسول الله! والذى بعثك بالحق لقد رأيت مثل ما أرى" شاید کہ یہ جملہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سابقہ خواب بیان کئے جانے کے بعد کہا یا پھر آپ رضی اللہ عنہ کا کشف ہے، ظاہر عبارت سے تو یہی معلوم ہوتا ہے "فقال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فلله" یعنی کسی اور کے لئے نہیں "الحمد" کہ اس نے حق کو واضح اور ظاہر کر دیا اور بیان میں نور کا اضافہ کر دیا "رواه ابوداود والدارمى وابن ماجة، الا انه" یعنی ابن ماجہ نے "لم يذكر الاقامة، وقال الترمذي هذا حديث صحيح، لكنه" امام ترمذی نے "لم يصرح قصة الناقوس" اور امام احمد نے عبداللہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں نے خواب دیکھنے والے کی طرح خواب دیکھا، اگر میں کہوں کہ میں سویا ہوا نہیں تھا تو میں سچا ہوں گا، میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس پر دو سبز چادریں ہیں، اس نے روبقبلہ کیا اور اللہ اکبر سے آخر تک اذان کہہ دی، ابن ماجہ کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ یہ خواب سردیوں کی رات کا ہے، مجمع الاوسط میں طبرانی سے منقول ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا تھا، امام غزالی نے نقل کیا ہے کہ یہ خواب لگ بھگ دس لوگوں نے دیکھا تھا، روایات میں اس بات کی تصریح ہے کہ اذان کی مشروعیت ہجرت سے قبل ہوئی' ان میں سے ایک روایت بھی درست نہیں، مسند الحارث میں ہے کہ سب سے پہلے جبریل علیہ السلام نے آسمانِ دنیا پر اذان دی، پھر یہ اذان حضرت بلال اور عمر رضی اللہ عنہ نے سن لی، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے میں سبقت لے گئے اور جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا عمر سبقت لے گئے اور ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ بیداری کی حالت میں ہی سنا ہوگا اور سابقہ حدیث اسے رد کرتی ہے۔

سوئے ہوئے لوگوں کو نماز کے لئے جگانا

۶۵۱: وَعَنْ اَبِىْ بَكْرَةَ قَالَ خَرَجْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِصَلَاةِ الصُّبْحِ فَكَانَ لَايَمُرُّ بِرَجُلٍ اِلَّا نَادَاهُ بِالصَّلَاةِ اَوْ حَرَّكَهُ بِرِجْلِهِ ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبو داوٗد فى السنن ٢/ ٤٩ حديث رقم ١٢٦٤ ـ

ترجمہ: "حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صبح کی نماز کے لئے نکلا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس کے پاس سے گزرتے تھے۔ یا تو اس کو آواز دیتے تھے اور اس کا پاؤں پکڑ کر ہلا دیتے تھے۔ اس حدیث کو

امام ابوداوُدؒ نے روایت کیا ہے۔"

تشریح: "وعن ابی بکرۃ" وہ نفیع بن حارث ثقفی ہیں "قال خرجت مع النبی" اور ایک نسخہ میں رسول اللہ کے الفاظ ہیں: "لصلاۃ الصبح فکان" اور ایک نسخہ میں واو کے ساتھ ہے "لایمر برجل الا ناداہ بالصلاۃ" ابن حجرؒ اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ میں اسے ایک دو لفظ سکھا دیتا تھا، اس میں اذان کی ترغیب ہے، کیونکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بذاتِ خود نماز کے لئے آواز لگانے میں دلچسپی لی تو اس میں مزید ترغیب ثابت ہوگئی، اور بہر حال اس سے میرے خیال کے مطابق تثویب ثابت ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی مناسبت ماقبل باب سے صرف نداء کے لحاظ سے ہے "او حرکہ برجلہ" حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب وہ نیند وغیرہ میں مشغول ہو، اس حدیث میں اس بات کی بھی ترغیب ہے کہ سونے والوں کو بھی نماز کے لئے جگا لیا جائے، اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ بلا کراہت پاؤں کو ہلانا جائز ہے، بعض حمقاء نے یہ جو کہا ہے کہ اس میں سونے والے کی تحقیر اور اہانت ہے تو یہ محض وہم اور خام خیالی ہے "رواہ ابوداود"۔

اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ صبح کی اذان میں کہا جائے

۶۵۲: وَعَنْ مَالِكٍ بَلَغَهُ اَنَّ الْمُؤَذِّ نَ جَاءَ عُمَرَيُؤَذِّنُهُ لِصَلَاةِ الصُّبْحِ فَوَجَدَهُ نَائِمًا فَقَالَ الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ فَاَمَرَهُ عُمَرُاَنْ يَجْعَلَهَا فِيْ نِدَاءِ الصُّبْحِ ۔ (رواہ موطأ)

أخرجه مالك فی الموطأ ۷۲/۱ حدیث رقم ۸ من كتاب الصلاة ـ

ترجمہ: "حضرت امام مالکؒ کے بارے میں منقول ہے کہ جب ان کو یہ خبر پہنچی کہ مؤذن حضرت عمرؓ کے پاس آ کر صبح کی نماز کے لئے اطلاع دیتا تھا چنانچہ ایک دن مؤذن نے حضرت عمرؓ کو سویا ہوا پایا۔ تو اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوم کہا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ جملہ صبح کی اذان میں کہا جائے۔ اس حدیث کو امام مالکؒ نے موطا میں روایت کیا ہے۔"

تشریح: "وعن مالك بلغه" ایک نسخہ میں بلغنی ہے "ان المؤذن جاء عمر یؤذنه" ہمزہ کے ساتھ، اصل میں ایذان تھا، پھر ہمزہ کو بدل دیا گیا اور یہ اعلام یعنی آگاہ کرنے کے معنی میں ہے۔ میرک فرماتے ہیں کہ یہ تخفیف کے ساتھ یعلمہ کے معنی میں ہے "لصلاۃ الصبح فوجدہ نائما فقال: الصلاة خیر من النوم، فأمرہ عمر أن یجعلها" یعنی یہ جملہ "فی نداء الصبح" یعنی صرف صبح کی اذان میں اور اذان کے علاوہ کسی اور چیز میں نہیں۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جملہ اپنے پاس سے بنالیا گیا ہے اور بدعت ہے، بلکہ سنت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ ہے اور اس پر فصل ثانی میں مذکورہ حدیث ابو محذورہ صاف دلالت کرتی ہے، گویا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے الصلاۃ خیر من النوم کے الفاظ کو غیر مشروع مقامات پر استعمال کرنے سے منع کیا ہے اور اس میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ یہ موافقات کے قبیل سے ہو جیسا کہ ابھی حدیث ابن عمر میں گذرا کہ تم کسی بندے کو کیوں نہیں بھیجتے کہ وہ نماز کے لئے بلائے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے بلال! اٹھو اور نماز کے لئے منادی کرو۔

میں کہتا ہوں کہ یہ دوسرا احتمال بعید ہے، کیونکہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مؤذن کا حضرت عمر کے پاس آنا ان کے ایامِ

خلافت میں تھا، اور یہ موافقت کے منافی ہے، لیکن اس سے صرف اصلِ تثویب مطلقاً ماخوذ ہے جیسا کہ متاخرین نے اس کی تصریح کی ہے، یا پھر یہ فجر کے ساتھ خاص ہے کیونکہ وہ نیند کا وقت ہوتا ہے، ساتھ میں اس میں قیلولہ کا بھی احتمال ہے، یا پھر یہ حکم صرف خلیفۃ المسلمین، قاضی اور امام کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی رائے ہے، پھر سابقہ موافقت کہ انہوں نے پہلے مؤذن کو حکم دیا اور پھر نبی پاک ﷺ نے اسے مستحسن قرار دیا، یا پھر امر به سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کا اَمر آنحضرت ﷺ کے امر کا باعث بن گیا۔

باقی رہا یہ احتمال کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک ابو محذورہ کی سابقہ روایت نہیں پہنچی تھی، اس لئے انہوں نے اجتہاداً یہ حکم دیا اور پھر یہ اجتہاد ہی نص کے موافق ہوگیا جیسا کہ ذات العرق میں ہوا، اور یہ احتمال کہ یہ روایت ان تک پہنچی تھی لیکن وہ بھول گئے تھے، پھر جب انہوں نے مؤذن سے یہ الفاظ سنے تو انہیں یاد آگیا اور انہیں اس کا حکم دیدیا تو یہ دونوں احتمال مردود ہیں، کیونکہ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ یہ الفاظ آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بھی اور آپ علیہ السلام کی وفات کے بعد بھی متروک تھے یعنی استعمال نہ ہوتے تھے۔ پھر میں نے دیکھا ہے کہ پہلی تاویل طبرانی کی اس روایت سے معول ہے جو انہوں نے معجم الکبیر میں حفص بن عمر عن بلال نقل کی ہے کہ بلال آنحضرت ﷺ کے پاس اذان دینے آئے تو آپ آرام فرما تھے، تو بلال نے کہا الصلاۃ خیر من النوم، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ کتنے اچھے جملے ہیں انہیں اذان میں شامل کرلو "رواہ" یعنی امام مالک نے "فی الموطأ" مصنف پر اس قسم کا اعتراض پہلے بھی گذر چکا ہے۔

بوقتِ اذان کانوں میں اُنگلیاں داخل کرنا مسنون ہے

۶۵۳: وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ سَعْدِ بْنِ عَمَّارِ بْنِ سَعْدٍ مُؤَذِّنِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ حَدَّثَنِيْ اَبِيْ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِلَالًا اَنْ يَجْعَلَ اِصْبَعَيْهِ فِيْ اُذُنَيْهِ وَقَالَ اِنَّهٗ اَرْفَعُ لِصَوْتِكَ . (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۲۳۶ حدیث رقم ۷۱۰۔

ترجمہ: "حضرت عبدالرحمٰن بن سعد بن عمار بن سعدؓ رسول اللہ ﷺ کے مؤذن فرماتے ہیں کہ مجھ سے میرے والد سعد نے اور انہوں نے اپنے والد عمار سے اور انہوں نے سعد کے دادا سے جن کا نام بھی سعد تھا سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا تھا کہ وہ اذان کے وقت اپنی دونوں انگلیاں کانوں میں داخل کرلیا کریں۔ کیونکہ اس سے آواز زیادہ بلند ہو جاتی ہے۔"

راویٔ حدیث:

عبدالرحمٰن بن سعد بن عمار بن سعد۔ یہ قرظی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں مسجد قباء کے مؤذن تھے اور آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد مسجد نبوی میں حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ مرتب عرض کرتا ہے کہ ان کا ذکر

''الاکمال'' میں ہمیں نہیں مل سکا۔

تشریح: ''مؤذن رسول الله ﷺ'' جر کے ساتھ سعد سے بدل ہے اور اس پر رفع اور نصب بھی جائز ہے ''قال'' یعنی عبدالرحمٰن نے ''حدثنی ابی عن ابیه عن جده'' یعنی میرے دادا نے ''ان رسول الله ﷺ امر بلالا ان یجعل اصبعیه'' یعنی شہادت کی دونوں انگلیاں ''فی اذنیه'' یعنی کانوں کے سوراخوں میں ''وقال انه'' یعنی ان کو کانوں میں رکھنا ''ارفع لصوتك'' یعنی بہ نسبت اس کے کہ انہیں کانوں میں نہ رکھا جائے۔ امام طیبی رحمہ اللہ نے اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ جب کانوں کے سوراخوں میں انگلیاں ڈال لی جائیں تو صرف بلند آواز ہی سنائی دیتی ہے، تو انگلیاں کانوں میں ڈالنے والا شخص ظاہر ہے کہ پھر بلند آواز نکالے گا۔ کہنے والوں نے کہا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بہرا اذان دے سکتا ہے کیونکہ اس کی آواز تو مزید بلند ہوگی۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اقامت کے وقت کانوں میں انگلیاں ڈالنا مسنون نہیں، کیونکہ وہاں آواز بلند کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ سامعین حاضر ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر مؤذن صرف اپنے لئے اذان دے رہا ہو اور کسی دوسرے کو سنانا مقصود نہ ہو تب بھی کانوں میں انگلیاں دینا مسنون نہیں۔ وھو محتمل۔ بہتر احتمال یہ ہے کہ بہرحال مسنون ہے کیونکہ اذان میں آواز کی بلندی ہی تو مقصود ہے، جیسا کہ ایک مطلق حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ مؤذن کی آواز جو کوئی جن وانس وغیرہ سنے گا تو وہ قیامت کے دن اس کے لئے گواہی دے گا ''رواه ابن ماجة'' اور اس روایت کو امام احمد اور امام ترمذی نے بھی نقل کیا ہے اور اس بات کو صحیح قرار دیا ہے کہ یہ کام حضرت بلال نے آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں کیا تھا۔

بَابُ فَضْلِ الْاَذَانِ وَاِجَابَةِ الْمُؤَذِّنِ

اذان اور اذان کا جواب دینے کی فضیلت کا بیان

اذان پر عطف ہے۔

الفصل الاول:

قیامت کے دن مؤذن کی گردن طویل ہوگی

۶۵۴: عَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْمُؤَذِّنُوْنَ اَطْوَلُ النَّاسِ اَعْنَاقًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ١/ ٢٩٠ حدیث رقم (١٤_٣٨٧)_وأخرجه ابن ماجة فی السنن ١/ ٢٤٠ حدیث رقم ٧٢٥_وأخرجه أحمد فی مسنده ٤/ ٩٥_

ترجمہ: ''حضرت معاویہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن سب لوگوں سے زیادہ بلند گردن والے مؤذن ہونگے اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''**عن معاویة قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: المؤذنون اطول الناس اعناقا**'' ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ''**یوم القیامة**'' کثرت اعمال کی وجہ سے، اہل عرب کہتے ہیں: **لفلان عنق من الخیر** یعنی فلاں کی گردن خیر کا ایک حصہ ہے، اور ایک قول کے مطابق کثرت امید کی وجہ سے، اس لئے کہ جب کوئی شخص کسی چیز کی امید کرتا ہے تو اس کو گردن لمبی کر کر کے دیکھتا اور لوگ اسے دیکھ کر حیران پریشان ہوتے رہتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انہیں جنت میں داخلے کی اجازت مل جائے گی، ایک قول کے مطابق اطول الناس اعناقا کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ سے زیادہ قریب ہوں گے، کیوں لمبی گردن عام طور پر لمبے قد پر دلالت کرتی ہے، اور صرف گردن کا لمبا ہونا مطلوب نہیں ہوتا بلکہ یہ اس بات کی دلالت ہوتی ہے کہ یہ شخص تمام لوگوں سے ممتاز اور اس کی شان بلند ہے، اور ایک قول کے مطابق گردن کا لمبا ہونا اس بات سے کنایہ ہے کہ پست ہونے کی وجہ سے جو دیکھنے میں دشواری پیش آتی ہے وہ نہیں ہوگی۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انہیں پسینہ میں شرابور نہیں ہوں گے، کیونکہ قیامت کے دن لوگ اپنے اعمال کے بقدر پسینہ میں ڈوبے ہوئے ہوں گے، حاصل یہ ہے کہ یہاں صرف طولِ قامت کا وصف بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ مکروہات سے نجات مقصود ہے۔ ایک یہ بھی ہے کہ وہ لوگ اس دن سردار ہوں گے، اور اہل عرب سرداری کو گردن کی لمبائی سے موصوف کرتے تھے، جیسا کہ رؤس، نواصی اور صدور کے الفاظ سرداری کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اعناق سے مراد جماعات ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے **جاء عنق من الناس** یعنی لوگوں کی ایک جماعت آئی۔ حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ مؤذن جمع ہوں گے تو ان کی تعداد کثیر ہو جائیگی، کیونکہ جس نے ان کی پکار کو قبول کیا ہوگا وہ بھی انہی کے ساتھ ہو جائے گا، لہٰذا طوالت کثرت سے مجاز ہے، کیونکہ اگر کوئی جماعت اپنے کسی مقصد کے لئے چل نکلے تو زمین میں ان کی بڑای طوالت ہوتی ہے اور ہاں ایک قول یہ بھی ہے کہ طولِ عنق فرحت و سرور اور درجات کی بلندی سے کنایہ ہے جیسا کہ گردن کی پستی غم و دکھ سے کنایہ ہوتی ہے۔ میرک فرماتے ہیں کہ میرے خیال کے مطابق طولِ عنق سے مراد ان کی استقامت، طمانینت قلوب اور ان کی کرامت کا اظہار ہے اور یہ کہ وہ لوگ ذلت و رسوائی والے مقام پر مجرموں کی طرح گردنیں جھکائے نہیں کھڑے ہوں گے اور یہ بدلہ ہوگا اس بات کا کہ انہوں نے دنیا میں اذان میں اپنی گردنیں بلند کی تھیں۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے اعناق کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ اعناقا اسراعا کے معنی میں ہے اور اعنق سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے جلدی کرنا۔ شیخ جزری فرماتے ہیں کہ اس کو اِعناقا (ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ) ضبط کرنا ایک مبالغہ ہے کیونکہ مصدر ہے اور اس کا معنی ہوگا جلدی جنت میں جانا، لیکن یہ بات روایت کے معنی کے خلاف ہے ''**رواہ مسلم**''۔

شیطان اذان کی آواز سے بھاگتا ہے

۶۵۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلَاةِ اَدْبَرَ الشَّیْطَانُ لَهٗ ضُرَاطٌ حَتّٰی لَایَسْمَعَ التَّاْذِیْنَ فَاِذَا قُضِیَ النِّدَاءُ اَقْبَلَ حَتّٰی اِذَا ثُوِّبَ بِالصَّلَاةِ اَدْبَرَ حَتّٰی اِذَا قُضِیَ التَّثْرِیْبُ

اَقْبَلَ حَتّٰی یَخْطُرَ بَیْنَ الْمَرْءِ وَنَفْسِهٖ یَقُوْلُ اُذْکُرْ کَذَا اُذْکُرْ کَذَا لِمَا لَمْ یَکُنْ یَذْکُرُ حَتّٰی یَظَلَّ الرَّجُلُ لَا یَدْرِیْ کَمْ صَلّٰی . (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٨٤حديث رقم ٦٠٨۔ وأخرجه مسلم في صحيحه ١/٢٩١حديث رقم (١٩۔٣٨٩) أخرجه أبوداوٗد في السنن ١/٣٥٥حديث رقم ٥١٦۔والنسائي في السنن ٢/٢١حديث رقم ١٢٠٤۔وأخرجه مالك في الموطأ ١/٦٩حديث رقم ٦من كتاب الصلاة ۔وأخرجه أحمد في المسند ٢/٣١٣۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب نماز کے لئے اذان دی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر گوز مارتا ہوا بھاگ جاتا ہے تاکہ اذان نہ سن سکے جب اذان ختم ہو جاتی ہے پھر واپس آ جاتا ہے اور جس وقت اقامت ہوتی ہے پھر پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتا ہے جب اقامت ختم ہو جاتی ہے پھر واپس آ جاتا ہے تاکہ انسان اور اس کے دل کے درمیان وسوسے پیدا کرے چنانچہ نمازی سے کہتا ہے فلاں چیز یاد کر فلاں معاملہ یاد کر جو چیزیں نمازی کو یاد نہیں ہوتی وہ یاد دلاتا ہے یہاں تک کہ انسان کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس نے کتنی نماز پڑھی ہے۔

(بخاری و مسلم)

تشریح: ''وعن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ اذا نودی للصلاة'' یعنی اذان کے ساتھ ''أدبر الشيطان'' یعنی اذان کی جگہ سے ''له ضراط'' طاءِ معجمہ کے ضمہ کے ساتھ غراب کے وزن پر اور یہ وہ آواز ہے جو انسان وغیرہ کی دبر سے خارج ہوتی ہے، اور ایسا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اذان شیطان پر بہت بھاری ہوتی ہے جیسا کہ گدھے پر زیادہ بوجھ کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے ''حتی لايسمع التأذين'' یہ ادبارہ کی تعلیل ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ انسان آواز وغیرہ نکال کر اپنے آپ کو مصروف کر لیتا ہے تاکہ وہ خود بھی اذان کی آواز نہ سن سکے اور دوسرے بھی نہ سن سکیں اور پھر اس آواز وغیرہ کو قباحت کی وجہ سے گوز کا نام دے دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ روایت حقیقت پر محمول ہے کیونکہ شیاطین بھی کھاتے پیتے ہیں جیسا کہ بہت سی اخبار و احادیث میں وارد ہے، اللہ کے خوف کی وجہ سے ایسا ہونا کوئی ممتنع بھی نہیں، یا پھر اس سے مراد شیطان کا اللہ تعالیٰ کے ذکر کو گھٹیا سمجھنا مقصود ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے ضرط بہ فلان یعنی جب وہ کسی کو حقیر سمجھے تو اس وقت یہ جملہ بولا جاتا ہے، ذکرہ ابن الملک۔ ''فاذا قضي'' مجہول ہے، بقولِ ابہری یہ معروف ہے، ابن حجر نے اس کی تشریح حتی اذا قضي سے کی ہے ''حتی'' یہ حتی اور مابعد والے حتی جملہ شرطیہ پر داخل ہیں، انہیں تعلیلیہ قرار نہ دینا غلطی ہے، کیونکہ صحیح جملہ فاذا قضي ہی ہے جیسا کہ تصحیح شدہ نسخوں میں ہے ''النداء'' یعنی مؤذن اس سے فارغ ہو جاتا ہے ''أقبل'' یعنی شیطان ''حتی اذا ثوب بالصلاة'' یہ تثویب سے ہے اور اس کا معنی ہوتا ہے آگاہی کے بعد آگاہ کرنا اور اس سے مراد اقامت ہے ''ادبر'' تاکہ کوئی اقامت نہ سن سکے ''حتی اذا قضي التثويب، اقبل'' یعنی شیطان ''حتی يخطر'' یاء کے فتحہ اور طاء کے ضمہ وکسرہ کے ساتھ اور یہ حتی تعلیلیہ ہے ''بين المرء ونفسه'' یعنی اس کے دل میں، مطلب یہ ہے کہ یہاں تک کہ وہ واپس آ جاتا ہے اور دل کی بات و(وساوس) میں پردہ ڈال دیتا ہے اور یوں وہ لوگ نماز کے لئے نہیں آ پاتے۔ الاساس میں ہے کہ خطر الرجل برمحه کا جملہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ

وہ دوصفوں میں کے درمیان چل رہا ہو اور اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ ہوتی ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے۔ امام ابہری فرماتے ہیں کہ **یخطر** طاء کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہوگا وسوسہ ڈالنا اور **خطر البعیر بذنبہ** سے ماخوذ ہوگا اور ضمہ کے ساتھ **یدنو منہ** (قریب ہونے) کے معنی میں ہوگا۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کسرہ کے ساتھ اس کا معنی چہرہ ہوتا ہے اور حائل ہونے کا ذکر کرنے والی اسناد اس کے منافی نہیں کیونکہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہے، چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴾ [الانفال: ٢٤] ''اور جان رکھو کہ خدا آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہ تم سب اسکے روبرو جمع کئے جاؤ گے۔'' کیونکہ اہل سنت کے ہاں یہ نسبت حقیقی ہے، اور پہلا معنی اس لحاظ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے موقعہ دیتے ہیں تاکہ وہ بندوں کو آزمائش میں مبتلا کر سکے اور یہ بھی ہے کہ پہلا معنی شیطان کی جانب منسوب ہے کیونکہ یہ مقام شر ہے اور اسی وجہ سے قلبہ کی تفسیر بنفسہ سے کی گئی ہے، اور دوسرا معنی مقام اطلاق کے لحاظ سے ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: **اللہ خالق کل شیءٍ** اور ادب کے پیش نظر یوں نہیں کہا جاتا: **خالق الکلب و الخنزیر** اور یہی مطلب ہے اس حدیث کا خیر تیرے ہاتھ سے اور شر تیری طرف سے نہیں، حالانکہ یقیناً ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوتی ہے ''**یقول**'' رفع کے ساتھ استیناف مبین ہے اور ایک قول کے مطابق **یخطر** سے بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے ''**اذکر کذا، اذکر کذا**'' یہ نماز کے علاوہ چیزوں سے کنایہ ہے ''**لما لم یکن یذکر**'' یعنی ایسی ایسی باتیں یاد کرواتا ہے جو نماز شروع کرنے سے پہلے انسان کو یاد نہیں آرہی ہوتیں جیسے مال وحساب اور بیع وشراء وغیرہ ''**حتی**'' امام طیبی فرماتے ہیں حتی کا تکرار اس حدیث میں پانچ بار ہے اور آخری دونوں حتی ''کی'' کے معنی میں ہیں، دوسرا اور تیسرا حتی جملہ شرطیہ پر داخل ہیں، تعلیلیہ نہیں، یہ بھی ابن حجر کا سہو ہے جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں ''**یظل الرجل**'' ظاء کے فتحہ کے ساتھ ظلول سے ماخوذ ہے یعنی تاکہ اتنے وساوس ڈالے کہ ''**لایدری: کم صلی؟**'' یعنی وہ شک میں پڑ جائے ''**متفق علیہ**''۔

جہاں تک مؤذن کی آواز پہنچتی ہے ہر چیز اس کے لیے شہادت دیتی ہے

٦٥٦: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَسْمَعُ مَدٰی صَوْتِ الْمُؤَذِّنِ جِنٌّ وَلَا اِنْسٌ وَلَا شَیْءٌ اِلَّا شَهِدَ لَهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٨٧/٢حدیث رقم ٦٠٩۔وأخرجه النسائی فی السنن ١٢/٢حدیث رقم ٦٤٤۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ٢٣٩/١حدیث رقم ٧٢٣۔وأخرجه مالك فی الموطأ ٦٩/١حدیث رقم ٤من کتاب الصلاة وأحمد فی المسند ٣٥/٣۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤذن کی آواز کی انتہا کو جو بھی سنتا ہے چاہے انسان ہو یا جن اور یا جو بھی چیز ہو وہ سب قیامت کے دن مؤذن کے حق میں گواہی دیں گے ۔اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''وعن ابی سعید الخدری قال قال رسول الله ﷺ لایسمع مدی صوت المؤذن''یعنی اس کی انتہاء اور اس سے مراد صرف اذان کی آواز ہے اگرچہ الفاظ سمجھ میں نہ آرہے ہوں''جن و لا انس'' سیاق نفی میں نکرہ ہیں تاکہ مردہ وزندہ سب کو شامل ہوجائے، قالہ ابن الملک۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ جن کے لفظ کو مقدم کرنا ترقی من الادنیٰ الی الاعلیٰ کے قبیل سے ہے لیکن یہ تشریح آنے والے جملے و لاشیء کے لئے مناسب نہیں کیونکہ لفظِ جن سے مراد جن وملائکہ ہیں، اور اسے مقدم کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی کثرت ہے یا پھر اس وجہ سے کہ بعض جنات کو انسانون پر فضیلت حاصل ہے''و لاشیء''یعنی نباتات، حیوانات اور جمادات، یہ عطف العام علی الخاص کے قبیل سے، اور صحیح یہ ہے کہ جمادات، نباتات اور حیوانات کو بھی علم وادراک ہوتا ہے اور وہ تسبیح کرتے ہیں جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ: ﴿وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ: ٧٤] اور ﴿ وَاِنۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ﴾ [الاسراء: ٤٤] اور حدیث: **یقول الجبل للجبل هل مر بك احد ذكر الله فاذا قال نعم استبشر** سے یہی سمجھ میں آتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں کہ اہل سنت کا یہی مذہب ہے اور اس پر بھیڑیوں، گائے اور دیگر جانوروں وغیرہ کا کلام کرنے بھی دلالت کرتا ہے جو بہت سی احادیث وآثار سے ثابت ہے، اہل مشاہدہ واسرار کے کشف بھی اس پر شاہد ہیں، لہٰذا ابن حجر کی اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان میں فہم وسمع پیدا کردیتا ہے یہاں تک کہ وہ اذان کو سننے اور سمجھنے لگتے ہیں''الا شهد له يوم القيامة''ابن حجر فرماتے ہیں کہ وہ زبانِ حال سے اس کی فضیلت اور بلندی درجہ کی گواہی دیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو ان کی زبانوں، ہاتھوں اور پاؤں سے گواہی دلوا کر ذلیل و رسوا کرے گا۔

معتمد عقیدہ یہی ہے کہ اعضاء کی گواہی زبانِ حال سے نہیں زبانِ قال سے ہوگی، کیونکہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَالُوۡا لِجُلُوۡدِهِمۡ لِمَ شَهِدۡتُّمۡ عَلَيۡنَا‌ؕ قَالُوۡۤا اَنۡطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِىۡۤ اَنۡطَقَ كُلَّ شَىۡءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ﴾ [فصلت: ٢١] ''اور وہ اپنے چمڑوں (یعنی اعضاء) سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی؟ وہ کہیں گے کہ جس خدا نے سب چیزوں کو نطق بخشا اسی نے ہم کو بھی گویائی دی اور اسی نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے'' اور اسی طرح: ﴿يَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا﴾ [الزلزلہ: ١] کہ ہر چیز بول بول کر گواہی دے گی، خاص طور پر آخرت میں' کیونکہ وہاں تو عجیب عجیب کام ہوں گے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ لوگوں نے کتنے ذہول اور غفلت سے کام لیتے ہوئے کتنی عجیب عجیب باتیں کی ہیں کہ شارع کی ہر بات کو اس کے ظاہر پر ہی محمول کیا جائے گا جب تک کہ اس کے خلاف کوئی قرینہ نہ آجائے اور یہاں کوئی قرینہ نہیں۔ ہائے بھولنے والو! پاک ہے وہ ذات جو بھولنے والی نہیں۔ اس حدیث میں اس بات کی بھی ترغیب ہے کہ مؤذن کو آواز بلند کرنی چاہیئے تاکہ اس کی گواہیاں بھی زیادہ ہوجائیں۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ غایت مع حصول الکفایۃ کا یوں بیان کیا کہ **لایسمع صوت المؤذن**، اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ آخری وہ چیز جس کے پاس مؤذن کی آواز پہنچے تو اس کی گواہی دے گی جیسا کہ اس سے پہلے والی چیزیں اس کی گواہی دیں گے۔ اس میں اس بات کی بھی ترغیب ہے کہ مؤذن اپنی اذان میں جہاں تک ہوسکے آواز بلند کرے، اور گواہی سے یہاں مراد یہ ہے کہ وہ چیزیں قیامت کے دن اس کی فضیلت اور درجات کی بلندی کا پرچار کریں گی ورنہ تو اللہ تعالیٰ کو گواہی کی کیا ضرورت؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ جو گواہی لیں گے وہ کسی کو رسوا اور

ذلیل کرنے کے لئے ہوگی، یا پھر گواہی شرفاء کے تکمیل سرور کے لئے ہوگی۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ جو ذات پست آوازوں پر گواہ ہے وہ ذات بلند آوازوں پر بھی گواہ ہے ''رواہ البخاری'' بقول میرک اس روایت کو امام نسائی، ابن ماجہ اور امام احمد بن حنبل نے نقل کیا ہے۔

اذان کا جواب کس طرح دینا چاہئے

۶۵۷: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا يَقُوْلُ ثُمَّ صَلُّوْا عَلَيَّ فَاِنَّهٗ مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ صَلَاةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ بِهَا عَشْرًا ثُمَّ سَلُوا اللّٰهَ لِيَ الْوَسِيْلَةَ فَاِنَّهَا مَنْزِلَةٌ فِي الْجَنَّةِ لَا تَنْبَغِيْ اِلَّا لِعَبْدٍ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ وَاَرْجُوْ اَنْ اَكُوْنَ اَنَا هُوَ فَمَنْ سَأَلَ لِيَ الْوَسِيْلَةَ حَلَّتْ عَلَيْهِ الشَّفَاعَةُ . (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۲۸۸/۱ حديث رقم (۱۱-۳۸٤) وأخرجه أبوداؤد في السنن ۳۰۹/۱ حديث رقم ۵۲۳- وأخرجه الترمذي في السنن ۵٤۷/۵ حديث رقم ۳٦۱٤- وأخرجه النسائي في السنن ۲۵/۲ حديث رقم ٦۷۸- وأحمد في مسنده ۱٦۸/۲-

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم مؤذن کی آواز سنو تو اس کے جواب میں اس کے الفاظ کو دہراؤ اور اذان کے بعد مجھ پر درود بھیجو تو اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے پھر میرے لیے وسیلہ کی دعا کرو وسیلہ جنت کا ایک اعلیٰ درجہ ہے جو اللہ کے بندوں میں سے صرف ایک بندہ کو ملے گا اور مجھے امید ہے وہ بندہ خاص میں ہوں گا لہٰذا جو آدمی میرے لیے وسیلہ کی دعا کرے گا اس کے لیے میری شفاعت لازم ہوگی اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''عن عبدالله بن عمرو بن العاص قال قال رسول الله ﷺ اذا سمعتم المؤذن'' یعنی اس کی آواز اور اذان ''فقولوا مثل ما يقول'' یعنی سوائے حیعلتین (حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح) کے کیونکہ اس کا بیان آگے آئے گا اور اسی طرح سوائے الصلاۃ خیر من النوم کے، کیونکہ اس کا جواب صدقت وبررت وبالحق نطقت سے دیا جاتا ہے، بررت راء کے کسرہ کے ساتھ اولیٰ ہے، جب کہ ایک قول فتحہ کا بھی ہے یعنی ذابر (خیر کثیر) کے معنی میں ہے ''ثم صلوا علي'' یعنی اذان سے فارغ ہونے کے بعد ''فانه'' یعنی شان یہ ہے ''من صلى علي صلاة'' ایک بار ''صلى الله عليه'' عطاء کرتا ہے ''بها عشرا'' یعنی رحمت اور ایک روایت میں یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس پر دس رحمتیں نازل کرتے ہیں، بہت سی روایات میں تو اس سے بھی زیادہ تعداد ہے، باقی آج کل جو مؤذن اذان سے قبل صلاۃ وسلام پڑھتے ہیں وہ اصلاً تو سنت ہے مگر کیفیت کے اعتبار سے بدعت ہے کیونکہ مسجد میں اذکار سمیت کسی بھی چیز کے لئے آواز بلند کرنا مکروہ ہے خصوصاً مسجد حرام میں، کیونکہ اس سے طواف کرنے والے، نماز پڑھنے والے اور معتکفین کو خلل ہوتا ہے ''ثم سلوا الله'' یہ سائل سے امر ہے، سائل میں ہمزہ منقول بھی ہے، محذوف بھی اور استغناء بھی، یا پھر یہ سال (الف کے ساتھ)

سے ماخوذ ہے، پھر اس الف کو ہمزہ، واو یا یاء سے بدل دیا گیا "لی الوسیلة" تورپشتی فرماتے ہیں کہ اصل میں اس کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کا سہارا لینا، اس کے قریب جانا اور وسائل جمع کرنا، اور جنت میں وسیلہ کا سوال اس وجہ سے کیا کہ جو شخص یہاں پہنچ جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہوتا ہے اور اسے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے، اور یہ درجہ تمام بلند درجات سے مخصوص ہے، کہا گیا ہے یہ ایسا درجہ ہے جس سے ملاقات تک پہنچا جاتا ہے۔ باقی رہا وہ وسیلہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اذان کے بعد کی دعا میں مروی تو اس بارے میں کچھ علماء کا خیال ہے کہ اس سے مراد شفاعت ہے اور اس کی توثیق حدیث کے آخری جملہ حلت له شفاعتی سے ہوتی ہے، یہ بات حافظ ابن حجر نے نقل کی ہے لیکن اس میں کچھ کلام ہے "فانها" یعنی وسیلہ "منزله في الجنة" یعنی جنت کی منازل میں ایک بلند و عالی منزل ہے جیسا کہ دوسری حدیث سے ثابت ہے "ولا تنبغي" آسان نہیں، ممکن نہیں اور مناسب نہیں "الا لعبد" یعنی کسی ایک کے لئے بھی اور ایک روایت میں والا لعبد مؤمن ہے "من عباد الله" یعنی سب کے سب "وارجو" یہ تواضعاً فرمایا کیونکہ جب مخلوق میں سب سے بہتر ہیں تو ان کا مرتبہ بھی تو سب سے بلند ہی ہوگا، قالہ ابن الملک "أن أكون أنا هو" ایک قول کے مطابق یہ کان کی خبر ہے اور یہ جملہ وضع الضمير موضع اسم الاشارہ کے قبیل سے ہے "فمن سأل لي" یعنی یہ لاجلی کے معنی میں ہے۔ ابن حجر کا اس کا معنی لی سے کرنا اصل کتاب سے غفلت کی علامت ہے کیونکہ صحیح نسخوں میں یہ بات ثابت شدہ ہے۔ "الوسيلة" اس سوال کی کیفیت کا بیان آگے آئے گا "حلت عليه الشفاعة" یعنی حلال ہو جائے گی اور حرام نہیں رہے گی، اور ایک روایت میں حلت له الشفاعة ہے، ابن الملک فرماتے ہیں کہ یعنی واجب ہو جائے گی، تو اس صورت میں یہ علیٰ لام کے معنی میں ہوگا جیسا کہ ایک روایت میں، اور ایک قول کے مطابق یہ حلول سے ماخوذ اور نزول کے معنی میں ہے یعنی وہ اس بات کا مستحق ہو جائے گا کہ میں اس کے لئے دعا کے بدلے شفاعت کروں "رواه مسلم" اور بقول میرک اس روایت امام ابوداود، امام ترمذی اور امام نسائی نے بھی نقل کیا ہے۔

۶۵۸: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ فَقَالَ اَحَدُكُمُ اللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ ثُمَّ قَالَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ قَالَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ قَالَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ثُمَّ قَالَ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ قَالَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ثُمَّ قَالَ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ قَالَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ قَالَ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ ثُمَّ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مِنْ قَلْبِهٖ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في الصحيح ۱/۲۸۹ حديث رقم (۱۲۔۳۸۵)۔ وأخرجه أبو داوٗد في السنن حديث رقم ۵۲۸۔

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب مؤذن اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہے تو تم میں سے ہر آدمی اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہے پھر جب مؤذن اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے تو تم میں سے بھی ہر شخص اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے پھر جب مؤذن اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہے تو تم میں سے ہر آدمی اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہے پھر جب مؤذن حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ کہے تو تم میں سے ہر آدمی لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ

کہے پھر جب مؤذن حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کہے تو تم میں سے ہر آدمی لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کہے پھر جب مؤذن اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہے تو تم میں سے ہر آدمی اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہے پھر جب مؤذن لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہے تو تم سے ہر آدمی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہے جس آدمی نے صدق دل سے اس طرح جواب دیا وہ جنت میں داخل ہوگا۔اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''**وعن عمر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا قال المؤذن**'' یہ جملہ شرطیہ ہے،اس کی جزاء **دخل الجنۃ** ہے''**اللہ اکبر، اللہ اکبر، فقال احدکم**'' یہ فعل شرط پر عطف ہے''**اللہ اکبر، اللہ اکبر**'' چار دفعہ ذکر نہ کر کے دو پر ہی اکتفاء کیا،اس وجہ آگے آنے والے جملوں میں دو کی بجائے ایک پر ہی اکتفا کیا''**ثم قال**'' یہ پہلے قال پر عطف ہے۔امام طیبی فرماتے ہیں کہ ثم کے ساتھ معطوفات حرفِ شرط کے ساتھ مقدر ہوتے ہیں یعنی جب مؤذن کہے''**اشھد ان لا الہ الا اللہ قال**''یعنی تم کہو، یہ حذف اختصاراً ہے''**اشھد ان لا الہ الا اللہ، ثم قال**''یعنی جب مؤذن کہے''**اشھد ان محمدا رسول اللہ قال**''یعنی تو سامع کہے''**اشھد ان محمدا رسول اللہ، ثم قال**'' یعنی جب مؤذن کہے''**حی علی الصلاۃ، قال**''یعنی جواب دینے والا کہے''**لاحول ولاقوۃ الا باللہ**''یعنی کوئی طاعات کے موانع سے کوئی چھٹکارہ اور طاعات کی ادائیگی کی حرکت کی توفیق نہیں ہے مگر اسی کی جانب سے،قالہ المظہر ۔امام طیبی رحمہ اللہ اس کی تشریح یوں فرماتے ہیں کہ مکروہات سے چھٹکارہ اور حیلہ اور اطاعت کی قوت اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ممکن ہے۔امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ حال انسان کے نفس اور جسم میں تغیرات کا نام ہے،اور حول ان احوال میں کسی ایک حال کی قوت کا نام ہے اور **لاحول ولا قوۃ الا باللہ** بھی اسی سے ماخوذ ہے۔

اس کی بہتر تشریح وہی ہے جو آنحضرت ﷺ سے مرفوعا منقول ہے کہ معصیت سے اللہ تعالیٰ کی عصمت کے ذریعے ہی بچا جاسکتا ہے اور اطاعت کی قوت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی مدد سے ہے''**ثم قال حی علی الفلاح، قال: لاحول ولا قوۃ الا باللہ**''امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب انسان حیعلتین سے دعا کرتا ہے تو گویا اس سے کہا جاتا ہے کہ اپنے چہرے اور شرار سے ہدایت پر عاجلا اور فلاح پر آجلا متوجہ ہو جا اور اس کا جواب یہ ملتا ہے کہ یہ تو بہت بڑا کام ہے اور یہی زمین وآسمان پر پیش کی جانے والی امانت ہے، وہ تو نہیں اٹھا سکے، میں اپنی کمزوری اور ضعف کے باوجود کیسے اٹھا سکتا ہوں؟ لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی طرف سے دی جانے والی قوت میرے شاملِ حال ہوئی تو ہوسکتا ہے میں یہ کام سرانجام دے سکوں۔امام نووی فرماتے ہیں کہ اذان کا جواب انہی الفاظ کے ساتھ دینا سوائے حیعلتین کے مستحب ہے، حیعلتین میں **لاحول ولا قوۃ الا باللہ** کہا جائے گا،اور یہ جواب ہر پاک وناپاک شخص کے لئے مستحب ہے،ہاں اگر کوئی مانع ہو تو الگ بات ہے، جیسے کوئی بیت الخلاء میں ہو یا کوئی جماع میں مصروف ہو، یا نماز پڑھ رہا ہو وغیرہ وغیرہ، جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو جائے تو وہ مؤذن کے الفاظ کو دہرائے گا۔قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ ہر مؤذن کی اذان کا جواب دیا جائے گا یا صرف پہلے مؤذن کی اذان کا تو اس بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے''**ثم قال اللہ اکبر، اللہ اکبر، قال اللہ اکبر اللہ اکبر، ثم قال لا الہ الا اللہ، قال لا الہ الا اللہ من قبلہ**'' یہ قید سب کے ساتھ ہے یا آخری جملے کے ساتھ اور یہی ظاہر ہے''**دخل الجنۃ**''،امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں

کہ مستقبل کی جگہ ماضی کے صیغے تحقق موعود کی وجہ سے استعمال کیے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اتی امر اللہاور ونادی اصحاب الجنۃ جیسے جملوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ جنت میں دخولِ اولی کے ساتھ جنت میں جانے والوں کے ساتھ داخل ہوگا ورنہ تو ہر مؤمن یقیناً جنت میں جائے گا اگر چہ اس کو اپنے جرائم کے حساب سے عذاب کا سامنا کرنا پڑے، مگر وہ شخص جوان جملوں کو اعتقاد، اخلاص اور دل کی کامل حقیقت کے ساتھ ادا کرے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ جنت میں تب داخل ہوگا جب کہ دخولِ جنت سے کوئی چیز مانع نہ ہو، یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ وہ جنت میں داخلے کا مستحق ہوگا اور یہ کلمات اس کے جنت میں داخلے کا باعث بنیں گے، یا پھر یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ وہ یہ جملے کہہ کر دنیا کے معنوی جنت میں داخل ہوگیا اور یہ شہادت مشاہدہ عظمیٰ سے منسلک ہے۔ اسی وجہ سے بعض عارفین نے باری تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتٰنِ ﴾[الرحمن: ٤٦] ''اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے لئے دو باغ ہیں'' کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس سے مراد ایک باغ دنیا کا ہے اور ایک آخرت کا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ الجنۃ میں الف لام عہدی ہو یعنی وہ اذان کا جواب دینے کی وجہ سے وعدہ کی گئی جنت میں داخل ہوگا'' رواہ مسلم ''بقول میرک اس روایت کو امام ابوداود اور امام نسائی نے بھی نقل کیا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ حیعلۃ (حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح) کی سماعت کے وقت حوقلہ (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) کہنا اگر چہ ظاہر کے مخالف ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ سے تو یوں مروی ہے کہ جو مؤذن کہے وہی تم کہو، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس کی تفسیر میں ایک روایت موجود ہے جو مسلم شریف میں مذکور ہے تو اس حدیث کو سوائے ان دو جملوں کے عام پر محمول کیا جائے گا اور مذکورہ بالا حدیث کی تعلیل یہ ہوگی کہ انہی الفاظ کو دہرانا استہزاء کے مشابہ ہے، کچھ احادیث میں صراحتاً یہ بات مذکور ہے جیسا کہ مسند ابی یعلیٰ میں ابو امامہ نے آنحضرت ﷺ سے نقل کیا ہے کہ جب منادی نماز کے لئے نداء کرے تو آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اور دعا قبول ہوتی ہے۔ تو جس شخص پر دکھ اور پریشانی نازل ہوئی تو منادی کی نداء کا یوں جواب دے کہ جب وہ تکبیر کہے تو یہ بھی تکبیر کہے، اور جب وہ شہادت دے تو یہ بھی شہادت دے اور جب وہ حی علی الصلاۃ کہے تو یہ بھی حی علی الصلاۃ کہے اور جب وہ حی علی الفلاح کہے تو یہ بھی حی علی الفلاح کہے، پھر یہ دعا کرے اللھم رب ھذہ الدعوۃ الحق المستجابۃ المستجاب لھا دعوۃ الحق، و کلمۃ التقوی احینا علیھا و امتنا علیھا و ابعثنا علیھا واجعلنا من خیار اھلھا محیانا ومماتنا، پھر اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت مانگے۔

امام طبرانی نے کتاب الدعاء میں عبداللہ بن احمد بن حنبل کی سند سے اور حاکم نے ابویعلیٰ کی روایت سے ملتی جلتی روایت نقل کر کے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے، لیکن ابو عائذ کے ضعف کی وجہ سے اس میں نظر ہے، کبھی کبھار اس حدیث کے بارے میں یوں کہا جاتا ہے یہ ضعیف ہونے کے باوجود حسن ہے۔ یہاں اتنی بحث ہی کافی ہے۔ بہر حال یہ روایت اس بات کا فائدہ دیتی ہے کہ پہلی روایت کا عموم معتبر ہے، ہم نے مشائخ سلوک کو دیکھا ہے کہ وہ ان دونوں روایات پر عمل کرتے تھے، کہ وہ اپنے لئے دعا کرتے پھر لاحول پڑھتے تاکہ دونوں حدیثوں پر عمل ہوجائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابو امامہ کی حدیث میں اس بات کی تخصیص ہے کہ یہ جملے مؤذن سے پہلے نہیں بلکہ اس کے جملہ ختم کرتے ہی کہنا چاہئے۔

اذان کے بعد کی دُعا

۶۵۹: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَالَ حِيْنَ يَسْمَعُ النِّدَاءَ اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلٰوةِ الْقَآئِمَةِ اٰتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَانِ الَّذِىْ وَعَدْتَّهٗ حَلَّتْ لَهٗ شَفَاعَتِىْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/ ٩٤ حديث رقم ٦١٤ ـ وأخرجه أبوداوٗد في السنن ١/ ٣٦٢ حديث رقم ٥٢٩ ـ وأخرجه الترمذي في السنن ١/ ٤١٣ حديث رقم ٢١١ ـ وأخرجه النسائي في السنن ١/ ٢٦ حديث رقم ٦٨٠ ـ وأخرجه ابن ماجة في السنن ١/ ٢٣٩ حديث رقم ٧٢٢ ـ

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے اذان سن کر یہ دعا پڑھی تو قیامت کے دن اس کی شفاعت مجھ پر لازم ہے۔اے اللہ۔ جو ربّ ہے اس کامل دعوت یعنی اذان کا اور قائم ہونے والی نماز کا اور دیدے محمد ﷺ کو وسیلہ اور درجہ اور انہیں پہنچا مقام محمود پر جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''وعن جابر قال قال رسول الله ﷺ من قال حين يسمع النداء''یعنی اذان سنے اور دیدے ''اللّٰھم رب ھذه الدعوة التامة''یعنی کامل وفاضل۔تورپشتی فرماتے ہیں کہ دعوت کو تامہ کے ساتھ موصوف اس وجہ سے کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جانب بلایا جارہا ہے، یہ چیزیں اور اس سے ملتی جلتی چیزیں صفت کمال اور تام کے ساتھ موصوف ہونے کا حق رکھتی ہیں اور اس کے علاوہ دنیا کے دیگر امور نقص اور فساد کے لائق ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کو تمام کے ساتھ موصوف اس وجہ سے کیا کہ بہت سے نسخوں میں یہ محو ہے، ایک قول کے مطابق التامۃ کا معنی ہے الزام الحجۃ اور جواب کو قبول کرنا اور مدعوالیہ کی جانب مسارعت اختیار کرنا۔اذان کو دعوت اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ نماز اور ذکر کی جانب بلاتی ہے''والصلاة القائمة''یعنی بقول طیبی صلاۃ دائمہ جو کسی ملت میں نہ تو بدلی اور نہ ہی منسوخ ہوئی ہے، ابن الملک نماز کو قائمہ کہنے کی وجہ سے یہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ قیامت تک قائم کی جاتی رہے گی یا پھر اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے''آت''یعنی دے''محمدا الوسيلة''یعنی بلند مقام اور عالی مرتبہ، والدرجۃ الرفیعۃ کی زیادتی جو لوگوں کی زبانوں پر مشہور ہے، امام سخاوی فرماتے ہیں کہ میں نے روایات میں ایسا کچھ نہیں دیکھا''وابعثه''یعنی پہنچادے''مقاما محمودا''یعنی مقامِ شفاعت''الذی وعدته''یہ موصول یا تو بدل اور محلاً منصوب ہے اور اعنی کو مقدر مانتے ہوئے مدح ہونے کی بناء پر منصوب ہے، یا پھر ھو کو مقدر مانتے ہوئے مرفوع ہے اور یہ نکرہ کی صفت نہیں ہوسکتی اور مقام کو نکرہ تفخیماً رکھا گیا ہے یعنی ایسا مقام کہ جس سے اولین وآخرین رشک کریں، محمودا یعنی تمام لوگ اس کی تعریف کریں۔اشرف کا کہنا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ جس کے بارے میں فرمایا:﴿عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ [الاسراء: ٧٩]''اور قریب ہے کہ خدا تم کو مقام محمود میں داخل کرے۔''ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ایسا مقام ہے جس پر اولین وآخرین آپ

کی تعریف کریں گے اور جس کے آپ کو تمام مخلوق پر شرف حاصل ہوگا، اس مقام پر جو کچھ آپ علیہ السلام مانگیں گے وہ عطا ہوگا، جس کی شفاعت کریں گے وہ قبول ہوگی اور ہر شخص آپ کے جھنڈے کے نیچے ہوگا۔ ابن حبان کی روایت میں **المقام المحمود** مذکور ہے، امام بیہقی نے ایک روایت میں **انك لاتخلف الميعاد** کا بھی اضافہ کیا ہے۔ باقی رہا **یا ارحم الراحمین** کا اضافہ تو اس کا کتب حدیث میں کوئی وجود نہیں۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو یہ مقام عطا کرنے کا وعدہ کیا ہوا ہے لیکن پھر بھی اس بارے میں دعا کر کے آپ علیہ السلام کی شرافت کا اظہار، مرتبے کی بلندی اور شفاعت کی امید بتانا مقصود ہے۔ ''**حلت**'' یعنی واجب اور ثابت ہوگی ''**شفاعتي يوم القيامة**'' اس میں حسنِ خاتمہ کی جانب اشارہ ہے ''**رواه البخاري**''، بقول میرک اسے ائمہ اربعہ نے نقل کیا ہے۔

اذان شعائر اسلام میں سے ہے

۶۶۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم يُغِيرُ اِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ وَكَانَ يَسْمَعُ الْاَذَانَ فَاِنْ سَمِعَ اَذَانًا اَمْسَكَ وَاِلَّا اَغَارَ فَسَمِعَ رَجُلٌ يَقُوْلُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم عَلَى الْفِطْرَةِ ثُمَّ قَالَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم خَرَجْتَ مِنَ النَّارِ فَنَظَرُوْا اِلَيْهِ فَاِذَا هُوَ رَاعِيْ مِعْزًى. (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٢٨٨حديث رقم (٩-٣٨٢)-وأخرجه الترمذي في السنن ٤/١٤٠حديث رقم ١٦١٨- وأخرج أوله إلى عند لفظ والاغار -أبو داوٗد في السنن ٣/٩٨حديث رقم ٢٦٣٤-والدارمي في السنن ٢/٢٨٧-حديث رقم ٢٤٤٥-وأخرج البخاري أوله ضمن حديث طويل في صحيحه ٢/٨٩حديث رقم ٦١٠-

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی جگہ لشکر لے کر جاتے تو طلوع فجر کے وقت ان پر حملہ کرتے تھے اور فجر ہونے پر اذان فجر کا انتظار کرتے تھے۔ اگر اذان کی آواز آ جاتی تو آپ حملہ نہیں کرتے تھے اور اگر آواز نہیں سنائی دیتی تھی تو حملہ کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ لشکر لے کر گئے تو فجر کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہتے سنا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم جہنم کی آگ سے نکل گئے۔ صحابہ کرام نے چاروں طرف پھر کر دیکھا کہ اذان دینے والا کون ہے تو وہ بکریوں کا چرواہا تھا۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''**وعن انس قال كان النبي صلی اللہ علیہ وسلم يغير**'' یہ اغارۃ سے ماخوذ ہے ''**اذا طلع الفجر**'' تاکہ یہ پتہ چل جائے کہ یہ مسلمان ہیں کافر اور اس میں اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا﴾[العادیات: ۳] ''پھر صبح کو چھاپہ مارتے ہیں'' سے اقتباس ہے، امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مضارع کا صیغہ استمرار پر دلالت کرتا ہے یعنی آپ علیہ السلام کی عادت تھی۔ اغارۃ کا معنی ہوتا ہے قوم کو غفلت میں چھوڑ کر چلے جانا اور یہ رات ہی کو ہوسکتا ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ صبح تک یہ تاخیر اذان سننے کے لئے ہو جیسا کہ میرک نے نقل کیا ہے اور اس کے ذیل میں لکھا ہے کہ میرے خیال کے مطابق یہاں استمرار کان کی وجہ سے ہے نہ کہ فعل مضارع کی وجہ سے۔ واللہ اعلم۔ ''**وكان يستمع الاذان**'' یعنی سننا چاہتے تھے تاکہ اذان سے ان کے احوال معلوم

ہو جائیں ''فان سمع اذانا'' ضمیر کی جگہ اسم ظاہر رکھنے میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ یہ حق ہے اور یہ اہل خانہ کا خیال رکھنے کی علامات میں سے ہے ''أمسك'' یعنی نکلنے سے ''والا'' یعنی اگر اذان نہ سنتے ''أغار'' یہ اغارت سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہوتا ہے اچکنا، کہا گیا ہے کہ آپ علیہ السلام کا اذان سننے کو چاہنا اور اس کا انتظار کرنا اس خوف سے تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں کوئی مؤمن ہو اور اسے اسی حال میں غافل چھوڑ کر چلے جائیں۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کفار کے ساتھ دعوت وانذار سے قبل لڑائی کرنا جائز ہے، مگر پھر بھی دعوت مستحب ہے، جیسا کہ امام ثوری، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق کا مذہب ہے، لیکن امام مالک دعوت سے قبل قتال کے قائل نہیں جیسا کہ ابن الملک نے ذکر کیا ہے۔ ''فسمع'' یہ فاء فصیحہ ہے یعنی جب آپ کی عادت سننے کی تھی تو سنا ''رجلا يقول الله اكبر الله اكبر فقال رسول الله ﷺ على الفطرة'' یعنی تو یا وہ دین پر، یا سنت پر، یا اسلام پر ہے کیونکہ اذان صرف مسلمانوں کے لئے ہی دی جاتی ہے ''ثم قال اشهد ان لا اله الا الله فقال رسول الله ﷺ خرجت'' یعنی توحید کے ذریعے ''من النار'' یعنی اس وجہ سے کہ تو نے یہ جملہ کہہ کر شرک ترک کر دیا یہ تو تھی ابن الملک کی بات، امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اس فطرت کے استمرار اور شرک کے سلسلہ میں عدم تصرف کی جانب اشارہ ہے، باقی رہا اس کو ماضی کے صیغوں سے تعبیر کرنا تو وہ اس کے وقوع کے قطعی اور یقینی ہونے کے باعث اور یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان برحق ہے اسلئے ماضی کے صیغوں سے تعبیر کیا ''فنظروا'' یعنی صحابہ کرام نے ''اليه'' یعنی اس آدمی کی طرف ''فاذا هو'' یعنی مؤذن ''راعي معزى'' میم کے کسرہ کے ساتھ معز (بھیڑ) کے معنی میں اور یہ اسم جنس ہے، ''رواه مسلم'' سید صاحب فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے حدیث کے آغاز لے کر والا اغار تک نقل کیا ہے۔

اذان کے بعد مختلف دُعائیں پڑھی جاسکتی ہیں

۶۶۱: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ حِیْنَ یَسْمَعُ الْمُؤَذِّنَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِیْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ رَضِیْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا غُفِرَلَهٗ ذَنْبُهٗ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ۱/ ۲۹۰حديث رقم (۱۳-۳۸٦)وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/ ۳٦۰حديث رقم ۵۲۵۔ وأخرجه الترمذی فی السنن ۱/ ٤۱۱حديث رقم ۲۱۰۔وأخرجه النسائی فی السنن ۲/ ۲٦حديث رقم ٦۷۹۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/ ۲۳۸حديث رقم ۷۲۱۔وأخرجه أحمد فی المسند ۱/ ۱۸۱۔

ترجمه: ''حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو آدمی مؤذن کی اذان سن کر یہ کہے: اشہد...... کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ اس کا کوئی شریک ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں اور میں اللہ کے رب ہونے محمد ﷺ کے رسول ہونے اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوں۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''وعن سعد بن ابی وقاص قال قال رسول الله ﷺ من قال حین یسمع المؤذن ''یعنی اس کی آواز، اس کی اذان یا اس کے اقوال۔ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد پہلی یا آخری شہادت کا سننا مراد ہو یعنی اذان کے آخر میں لا الٰہ الا اللہ ہے اور یہی زیادہ مناسب ہے اور یہاں **یسمع** کا معنی **یجیب** ہو تو یہ مقصود کے لئے زیادہ صراحت ہے، اور ظاہر ہے کہ مذکورہ ثواب اذان کا مکمل جواب دینے پر ہی مرتب ہوگا اور یہ شہادت اس وجہ سے بھی ہو سکتی ہے کہ بسا اوقات دوران نماز کی جملے کا جواب دینا رہ جاتا ہے ''أشهد ان لا اله الا الله وحده ''یعنی وہ اپنی وحدانیت میں منفرد ہے ''لاشریك ''یعنی ذات وصفات میں ''وان محمدا عبده ''اس کی تقدیم عبودیت کے اظہار اور بندے کی عاجزی کے پیش نظر ہے ''ورسوله ''یہ تحدیث بالنعمۃ ہے اور ان دونوں جملوں میں یہود ونصاریٰ کے رد کی جانب اشارہ ہے اور ان میں اضافت اختصاص کے لئے ہے اور مراد وہ فردِ واحد وکامل ہے جو ان صفات کے ساتھ موصوف ہو ''رضیت بالله ربا ''تمیز ہے یعنی اپنے رب کی ربوبیت اور اس کی تقدیر کامل پر، کیونکہ رضا بالقضاء ایک وسیع باب ہے، اور ایک حال کے مطابق یہ حال ہے اس وقت اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ مربی، مالک، آقا اور مصلح ہے ''وبمحمد رسولا ''یعنی ان تمام چیزوں پر راضی ہوں جو وہ لیکر آئے ہیں اور جو انہوں نے اعتقادی امور وغیرہ ہم تک پہنچائے ہیں ''وبالاسلام ''یعنی احکامِ اسلامیہ چاہے وہ اوامر ہوں یا نواہی ''دینا ''یعنی اعتقاداً یا انقیاداً۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ جملہ مستانفہ ہے گویا کہ یوں کہا گیا کہ سبب شہادت کیا ہے؟ تو جواب دیا کہ میری اللہ پر رضامندی۔ باقی جو ابن حجر نے وبالاسلام کی تقدیم اور وبمحمد رسولا کی تاخیر کا تذکرہ کیا ہے تو وہ تصحیح شدہ اور درایت کے قریب قریب اصل کتاب کے سراسر مخالف ہے، کیونکہ اسلام کا حصول شہادتین کے بعد ہی ہو سکتا ہے ''غفرله ذنبا ''یعنی صغیرہ گناہ اور اس میں خبر اور دعا دونوں کا احتمال ہے اور پہلی مراد معول ہے ''رواه مسلم ''اور چاروں ائمہ نے۔ عجیب بات یہ ہے کہ حاکم نے بھی اسے مستدرک میں نقل کیا ہے اور اس سے عجیب اس پر ذہبی کی تقریر ہے، صحیح مسلم میں یہ روایت انہی الفاظ کے ساتھ ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شاید امام حاکم نے مسلم شریف کی سند کے علاوہ کسی اور سند سے نقل کی ہے، لہٰذا ان کے راویوں کی ذرا جانچ پڑتال کرنی چاہئے تاکہ بات واضح ہو جائے۔ بیہقی نے یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے: **من سمع المؤذن یؤذن فقال رضیت بالله ربا وبالاسلام دینا وبمحمد علیه الصلاة والسلام نبیا والقرآن اماما والكعبة قبلة اشهد ان لا اله الا الله وحده لاشریك له واشهد ان محمدا عبده ورسول، اللهم اكتب شهادتی هذه فی علیین واشهد علیها ملائكتك المقربین وانبیائك المرسلین وعبادك الصالحین واختم علیها بآمین، واجعل لی عندك عهدا توفنیه یوم القیامة انك لاتخلف المیعاد، ندرت الیه بطاقة من تحت العرش فیها امانة من النار۔**

اذان اور اقامت کے درمیان نفل کا حکم

۶۶۲: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ كُلِّ اَذَانَيْنِ صَلَاةٌ

بَيْنَ كُلِّ اَذَانَيْنِ صَلَاةٌ ثُمَّ قَالَ فِي الثَّالِثَةِ لِمَنْ شَاءَ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١١٠/٢ حديث رقم ٦٢٧ ـ وأخرجه مسلم في صحيحه ٥٧٣/١ حديث (٣٠٤ ـ ٨٣٨) وأخرجه أبوداؤد في السنن ٥٩/٢ حديث رقم ١٢٨٣ ـ وأخرجه الترمذي في السنن ٣٥١/١ حديث رقم ١٨٥ ـ وأخرجه في السنن ٢٨/٢ حديث رقم ٦٨١ ـ وأخرجه ابن ماجة في السنن ٣٦٨/١ حديث رقم ١١٦٢ ـ وأخرجه الدارمي في السنن ٣٩٧/١ حديث رقم ١٤٤٠ وأحمد في مسنده ٨٦/٤ ولم يذكر ثلاث مرات۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے پھر تیسری دفعہ فرمایا کہ یہ نماز ہر اس آدمی کے لیے ہے جو نماز پڑھنا چاہے۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: ''وعن عبدالله بن مغفل قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم بين كل اذانين'' غالبًا ان اور اقامت مراد ہے یا پھر بین اعلامین مراد ہے ''صلاة'' امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اذان کے نام کو اقامت پر غالب کر کے دونوں کو ایک ہی نام دیدیا۔ امام خطابی فرماتے ہیں کہ ایک کا نام دوسرے کو دے دینا کوئی نئی بات نہیں جیسا کہ سیرۃ العمرین عام طور پر بولا جاتا ہے اور اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ نام دونوں کے لئے حقیقت ہو کیونکہ اذان کا لغوی معنی ہوتا ہے آگاہی دینا، چنانچہ اذان وقت کی آمد کی اطلاع ہے اور اقامت فعل صلاۃ میں حاضری کی اطلاع ''بين كل اذانين صلاة'' ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ تکرار تاکید اور نوافل کی ترغیب کے باعث ہے۔ مظہر کا کہنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو دونوں اذانوں کے درمیان نوافل کی ترغیب اس وجہ سے دی کہ اس وقت دعا قبول ہوتی ہے کیونکہ یہ وقت بڑا عظیم ہے، جب وقت عظیم ہے تو عبادت کا ثواب بھی عظیم ہی ملے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ ترغیب مبادرت الی العبادۃ، مسارعت الی الطاعۃ، مخلص اور منافق کے درمیان فرق اور فرائض کی ادائیگی کے لئے کامل تیاری کے پیش نظر ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اذان اور اقامت کے درمیان نماز پڑھنا مسنون ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے مغرب کی اذان کے بعد نوافل کو مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام دو اذانوں کے درمیان دو رکعتیں ہیں سوائے مغرب کی نماز کے، ہمارے بعض علماء نے بھی یہی ذکر کیا ہے۔ ''ثم قال في الثالثة لمن شاء'' تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ مؤذن کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے، قالہ ابن الملک۔ ظاہراً یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ رکعات مستحب ہیں واجب نہیں ''متفق عليه'' بقول میرک چاروں ائمہ نے بھی نقل کیا ہے۔

الفصل الثانی:

امام مقتدی کی نماز کا ضامن ہوتا ہے

۶۶۳: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ وَالْمُؤَذِّنُ مُؤْتَمَنٌ اَللّٰهُمَّ

اَرْشِدِ الْاَئِمَّةَ وَاغْفِرْ لِلْمُؤَذِّنِيْنَ . (رواہ احمدوابوداود والترمذی والشافعی وفی اخرٰی لہ بلفظ المصابیح)

أخرجه أحمد في مسنده ٢/ ٤٦١ ـوأخرجه أبوداوٗد في السنن ١/ ٣٥٦حديث رقم ٥١٧ ـوأخرجه الترمذي في السنن ١/ ٤٠٢حديث رقم ٢٠٧ ـوأخرجه الشافعي في مسنده ص ٥٦بهذا اللفظ ـوأخرجه بلفظ المصابيح "الأئمة ضمناء ......"ص ٣٣ ـ

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ امام ضامن ہوتا ہے اور مؤذن امانت دار ہوتا ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا فرمائی ''اے اللہ اماموں کو ہدایت دے اور مؤذنوں کو معاف کردے'' اس حدیث کو امام احمدؒ امام ابوداؤدؒ امام ترمذی اور امام شافعیؒ نے روایت کیا ہے اور امام شافعیؒ کی ایک دوسری روایت مصابیح کے لفظ کے مطابق روایت کی ہے۔''

تشریح: ''عن ابی ھریرة قال: قال رسول الله ﷺ الامام ضامن ''یعنی مقتدیوں کی نماز مکمل کروانے کا ذمہ دار اوران کے قیام وقراءت وغیرہ کا متحمل ہے، یہاں ضمان غرامت یعنی تاوان کے معنی میں نہیں بلکہ حفظ ورعایت کے معنی میں ہے جیسا کہ ہمارے علماء نے اس کی وضاحت کی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ضمان سے قراءت کا جہری اور سری ہونا مراد ہے یا پھر دعا کی ضمانت مراد ہے کہ وہ عام ہو امام کے ساتھ خاص نہ ہو، سوائے ان دعاؤں کے جن کے بارے میں نص وارد ہے جیسے دونوں سجدوں کے درمیان کی دعا رب اغفرلی وغیرہ، یا پھر اسے مسبوق کی قراءت، بھولنے والے کی بھول یا فرض کفایہ کے سقوط پر محمول کیا جائے گا ''والمؤذن مؤتمن'' قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ امام جماعت کی نماز کا ذمہ دار ہے، چنانچہ ان کی قراءت کو یا تو مطلقاً اس وقت پر محمول کیا جائے جب کہ مقتدی پر قراءت واجب نہ ہو یا پھر جب کہ مقتدی مسبوق ہوں اور امام مقتدیوں کے فرائض، سنن اور رکعات کی تعداد کا ذمہ دار ہے اور اسے رب اور مقتدیوں کے درمیان سفیر کا درجہ حاصل ہے، اور اسی پر اعتماد ہوگا کیونکہ مقتدیوں کی درستگی کا دارومدار امام کی نماز پر ہی موقوف ہوگا۔ مؤذن اوقات کا پاسبان ہوتا ہے، لوگ اس کی آواز پر نماز روزے اور دیگر امور میں اعتماد کرتے ہیں۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ مؤذن مؤتمن اس وجہ سے ہے کہ وہ لوگوں کی نمازوں کا خیال رکھنے والے ہوتے ہیں، اور یہی مؤمنین کی نمازوں کے صحت وفساد اور کمال ونقصان کے ذمہ دار ہوتے ہیں، لہٰذا اگر وہ اپنی ذمہ داری کا پورا پورا خیال رکھیں گے تو انہیں ثواب بھی زیادہ ہوگا، اور اسی طرح غیر ذمہ داری کا ثبوت دینے کی صورت میں عذاب بھی اسی طرح ہوگا، یا پھر ضمان سے مراد دعا ہے، اور یہ کہ مؤذنین امین ہیں، کیوں کہ لوگ ان پر نماز وغیرہ کے سلسلہ میں اعتماد کرتے ہیں یا پھر انہیں مؤتمن اس وجہ سے کہا کہ وہ اذان کے لئے بلند مقامات پر چڑھتے ہیں اس لئے انہیں دوسروں کے گھروں میں جھانکنا نہیں چاہئے اس لئے کہ وہ امین ہیں ''اللھم ارشد الأئمة واغفر للمؤذنين'' مصابیح کے الفاظ یوں ہیں: أرشد الله الأئمة وغفر للمؤمنين۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دعا ہے جو خبر کی صورت میں مبالغۃً ذکر کی گئی ہے، اور ماضی سے تعبیر قبولیت کی واثق امید کی وجہ سے ہے، گویا کہ یہ دعا قبول ہوگئی اور آنحضرت ﷺ نے اس کی خبر دے دی، اور اس کا معنی یہ ہے کہ مؤذنوں کے ارشاد کا یہاں معنی یہ ہے کہ انہیں اتنا علم دے کہ وہ اپنی امانت صحیح طرح سے ادا کرسکیں اور اپنی ذمہ داری پوری کرسکیں، اور مؤذنین کی مغفرت کر کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ان سے وقت کی تقدیم وتاخیر میں کوئی

غلطی یا سہو ہو گیا ہو۔ اشرف کا کہنا ہے کہ **الامام ضامن والمؤذن مؤتمن** سے اذان کی امامت پر فضیلت معلوم ہوتی ہے کیونکہ امین، ضامن سے افضل ہوتا ہے۔ مذکور ہے کہ یہ امین (مؤذن) صرف وقت کا مکلّف ہے جب کہ ضامن (امام) ارکانِ صلاۃ اور رب کے سامنے سفارت کا مکلّف ہے، تو تم خود بتاؤ کہ کون افضل ہوا؟ اور مؤذن افضل ہو بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ امامت میں خلافت نبی علیہ السلام کی ہے اور مؤذنی میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اور مزید یہ کہ ارشاد کا معنی ہوتا ہے ایسی رہنمائی کرنا جو مغفرت تک پہنچانے والی ہو یعنی اسے پہلے گناہ صادر ہو چکا ہو، قالہ الطیبی اور ہمارا مذہب بھی یہی ہے اور شوافع میں سے بھی ایک گروہ ہمارے ساتھ ہے "**رواہ احمد وابوداود**" امام نووی رحمہ اللہ نے یہ حدیث احادیث ضعفیہ میں ذکر کی ہے، قالہ میرک۔ "**والترمذی**" امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوزرعہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حدیث ابوصالح جو انہوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی وہ حدیث ابی صالح عن عائشہ سے زیادہ صحیح ہے۔ فرمایا کہ میں نے محمد بن اسماعیل کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حدیث ابی صالح عن عائشہ اصح ہے۔ علی بن المدینی نے ذکر کیا ہے کہ حدیث ابوہریرہ اور حدیث عائشہ اس سلسلہ میں ثابت ہی نہیں ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور اسی سے ہمارے اصحاب میں سے ایک جماعت نے استدلال کیا ہے، جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے الام میں اس کی تصریح کی ہے کہ اذان امامت سے افضل ہے اور اس کے الفاظ یوں ہیں: اذان محبوب ہے کیونکہ حدیث میں ہے اے اللہ! مؤذنوں کی مغفرت فرما، میں امامت کو ضمان اور امام کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ناپسند سمجھتا ہوں، اس روایت کے ضعیف ہونے کے باوجود اس سے استدلال اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جسے ابن حبان اور عقیلی نے صحیح قرار دیا ہے اگرچہ ابن المدینی نے اسے معلول قرار دیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ائمہ کی اصل ضامن ہونا نہیں اور نہ مؤذنوں کا امین ہونا، پس اللہ تعالیٰ نے ائمہ کی رہنمائی کر دی ہے اور مؤذنوں کی بخشش کر دی ہے۔

اور یہاں یہ ملحوظ رہے کہ رہنمائی کی دعا مغفرت کی دعا سے افضل ہے، کیونکہ معافی گناہ کو مستلزم ہے اور رہنمائی حق تک پہنچنے کو۔ امام ماوردی نے ان جملوں میں توجیہہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپ علیہ السلام کا امام کے لئے رہنمائی کی دعا کرنا تقصیر کے خوف کی وجہ سے ہے اور مؤذن کے لئے رہنمائی کی دعا کرنا اس وجہ سے ہے کہ آپ علیہ السلام کو علم تھا کہ ان کا حال سلامت ہوتا ہے۔ باقی رہی وہ روایت جو اذان کی فضیلت کے بارے میں گذر چکی ہے اور آ رہی ہے جیسا مسند احمد کی حدیث کہ اگر لوگوں کو پتہ چل جائے کہ مؤذنی میں کیا ہے تو یہ لوگ تلواریں سونت لیں، تو یہ حدیث اذان کے افضل ہونے پر دلالت نہیں کرتی، بخلاف ابن حجر کے وہم کے۔ باقی حاکم کی وہ حدیث جسے انہوں نے خود اور ابن شاہین نے صحیح قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بہترین بندے وہ ہیں جو شمس وقمر، ستاروں اور سایوں کا خیال اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے رکھتے ہیں، تو اس میں مؤذن کی خصوصیت کو بیان کرنا مقصود نہیں جیسا کہ ابن حجر کا خیال ہے اور باقی وہ روایت جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اگر میں اپنی خلافت کے ساتھ اذان دے سکتا ہوتا تو میں یقیناً دیتا، تو اس سے مراد اذان اور امامت کو جمع کرنا ہے، لہٰذا اس میں بھی اذان کے افضل ہونے کا کوئی اشارہ نہیں یہ حدیث تو صحیحین کی اس خبر پر دلالت کرتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چاہیے

کہ تم میں سے کوئی ایک اذان دے اور تم میں سے بڑا امامت کروائے۔نسائی شریف کی حدیث یوں ہے کہ تم میں سے امامت وہ کروائے جو قرآن کی کثرت سے تلاوت کرتا ہو۔ابن عدی کی حدیث یوں ہے کہ تم میں سے جو خوبصورت ہو وہ امامت کروائے کیونکہ اس میں زیادہ گمان ہے کہ وہ اچھے اخلاق والا بھی ہوگا۔لہٰذا خیار سے مراد صلحاء،اور قراءت سے مراد علماء ہیں اور علماء انبیاء کے بعد سب سے افضل ہیں اور امامت کی افضلیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حقوقِ امامت مشکل ہیں لہٰذا ان کا ثواب بھی زیادہ ہوگا، یہ تمام بحث اس وقت ہے کہ مؤذن اپنے تمام حقوق ادا کرے اور امام اپنے تمام حقوق ادا کرے،ورنہ جو اپنے حقوق پوری طرح ادا کرتا ہوگا وہ دوسرے سے افضل ہوگا،کیونکہ یہ بحث مطلقاً نہیں بلکہ ذمہ داریوں کی ادائیگی پر منحصر ہے۔تعجب تو حافظ ابن حجر پر ہوتا ہے کہ انہوں نے کیسی عجیب عجیب باتیں تحریر کی ہیں''والشافعي''امام شافعی رحمہ اللہ کے نام کو ان کے بلند مرتبہ اور ثقہ ہونے کے باوجود سابقہ مصادر سے مؤخر کرنا اس وجہ سے ہے کہ وہ کتب مشہور ہیں اور انہیں مقبولیتِ عامہ حاصل ہے۔کیا آپ نہیں دیکھتے کہ امام بخاری اور امام مسلم عِیَالِیَا کو بھی ان پر ترجیح دی جاتی ہے یہاں تک انہیں ان کے استاذ امام مالک پر بھی ترجیح دی جاتی ہے، یہ صرف اور صرف ان کی کتب قوتِ صحت اور ان کی مقبولیت عامہ کی وجہ سے ہے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہیں اِن کے استاذ یا دادا استاذ ہونے کے باوجود مؤخر کرنے میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ ان کی اور روایت بھی ہے،اسی وجہ سے فرمایا:''وفي اخرى''یعنی ایک اور روایت''له''یعنی امام شافعی رحمہ اللہ کی''بلفظ:المصابیح'' اور وہ یوں ہے کہ:الائمة ضمناء والمؤذنون امناء فارشد الله الائمة وغفر للمؤذنين۔ابن الملک فرماتے ہیں کہ ضمناء یہ ضمین کی جمع اور ضامن کے معنی میں ہے، جب کہ امناء' امین کی جمع ہے۔ابن حجر کا مصابیح کے الفاظ وهو فأرشد الله......کی تفسیر کرنا ان کی تقصیر ہے۔

اذان دینے کی فضیلت

۶۶۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَذَّنَ سَبْعَ سِنِيْنَ مُحْتَسِبًا كُتِبَ لَهٗ بَرَاءَةٌ مِنَ النَّارِ ۔ (رواالترمذی وابوداود وابن ماجة)

أخرجه الترمذی فی السنن ١/ ٤٠٠ حديث رقم ٢٠٦ وقال حديث غريب وتكلم فی سنده ـوأخرجه ابن ماجة فی السنن ١/ ٢٤٠ حديث رقم ٧٢٧ـ

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' کہ جو آدمی سات سال ثواب کی نیت سے اذان دے تو اس کے لیے جہنم سے نجات لکھ دی جاتی ہے''اس حدیث کو امام ترمذی' امام ابو داؤد' امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح:''وعن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ من اذن سبع سنين''یہ کثرت کے مراتب کا اقل عدد ہے''محتسبا''یہ حال ہے یعنی ثواب کا طلبگار بن کر۔نہ کہ اُجرت کا طالب بن کر۔الفائق میں ہے کہ الاحتساب' الحسب سے ماخوذ ہے جیسا کہ الاعتداد' العد سے ماخوذ ہے۔احتسب العمل کا جملہ اس شخص کے لئے بولتے ہیں جس

نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت کی ہو کیونکہ اس وقت عمل مقید ہو جاتا ہے، تو جب وہ فعل ادا کر رہا ہوتا تو وہ مقید ہوتا ہے اور الحسبة' الاحتساب کا اسم ہے جیسے العدة' الاعتداد کا اسم ہے اور اسی سے حدیث ابن عمرؓ ہے کہ اے لوگو! اپنے اعمال کا حساب کرو، کیونکہ جو شخص اپنے اعمال کا احتساب کرے گا تو اس کے عمل کا اجر بھی لکھا جائے اور حساب کرنے کا اجر بھی "کتب له براءة" مد کے ساتھ یعنی خلاصی "من النار، رواه الترمذی"۔ بقول میرک امام نووی نے اس روایت کو ضعیف احادیث میں ذکر کیا ہے، ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے جیسا کہ دیگر کچھ لوگوں نے بھی اسی جانب اشارہ کیا ہے، گویا کہ ابن حجر نے دوسرے لوگوں کے اقوال کی وجہ سے سند میں غور نہیں کیا اور اسی پر اعتماد کرتے ہوئے حکم لگا دیا "وابن ماجة" اور ایک نسخہ میں "وابوداود"، میرک فرماتے ہیں کہ اس نسخہ میں کچھ تامل ہے، کیونکہ یہ حدیث سنن ابی داود میں نہیں ہے۔ امام طبرانی نے نقل کیا ہے کہ مؤذن محتسب (حساب کیا ہوا) ہوتا ہے، جیسا کہ شہید کو جب کہ مر جائے تو اس کے خون سمیت دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کی قبر میں کیڑے نہیں آتے۔

اکیلا آدمی بھی نماز کے لیے اذان دے

۶۶۵: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَعْجَبُ رَبُّكَ مِنْ رَاعِيْ غَنَمٍ فِيْ رَأْسِ شَظِيَّةٍ لِلْجَبَلِ يُؤَذِّنُ بِالصَّلَاةِ وَيُصَلِّيْ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اُنْظُرُوْا اِلٰى عَبْدِيْ هٰذَا يُؤَذِّنُ وَيُقِيْمُ الصَّلَاةَ يَخَافُ مِنِّيْ قَدْ غَفَرْتُ لِعَبْدِيْ وَاَدْخَلْتُهُ الْجَنَّةَ۔ (رواه ابوداود والنسائی)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۲/۹ حدیث رقم ۱۲۰۳ وأخرجه النسائی فی السنن ۲/۲۰ حدیث رقم ٦٦٦ وأخرجه أحمد فی مسنده ٤/١٥٧۔

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "تمہارا رب خوش ہوتا ہے پہاڑ کی چوٹی پر بکریاں چرانے والے سے جو نماز کے لیے اذان دیتا ہے اور نماز پڑھتا ہے چنانچہ اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ میرے اس بندہ کو دیکھو وہ اذان کہتا ہے اور پابندی کے ساتھ نماز پڑھتا ہے اور مجھ سے ڈرتا ہے میں نے اپنے بندے کے گناہ معاف کر دیے اور میں اس کو جنت میں داخل کرونگا" اس حدیث کو امام ابوداوٗدؒ اور امام نسائیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: "وعن عقبة بن عامر قال قال رسول الله ﷺ: يعجب ربك" یعنی راضی ہوتا ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے تعجب محال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر اشیاء کے اسباب مخفی نہیں، اور تعجب ہمیشہ سبب کے مخفی ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، لہٰذا اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ بڑی بات ہے اور ایک قول کے مطابق اس کا معنی رضا ہے، یہ خطاب یا تو راوی سے ہے، یا پھر کسی صحابی وغیرہ سے، جب کہ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ خطاب ہر سامع کے لئے عام ہے، کیونکہ یہ کام بڑا عظیم ہے تاکہ تعجب کا معنی مزید مضبوط ہو جائے "فی رأس شظية للجبل" شینِ معجمہ کے فتحہ، ظاءِ معجمہ کے کسرہ، یاءِ تحتانیہ کی تشدید کے ساتھ یعنی پہاڑ کی چوٹی کا ایک ٹکڑا، اور ایک قول کے مطابق پہاڑ سے نکلی ہوئی ایک بہت بڑی چٹان مراد ہے "يؤذن بالصلاة ويصلی" ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس کی اذان کا فائدہ فرشتوں اور جنوں کو نماز کے وقت کے بارے میں

آ گاہ کرنا ہے، کیونکہ ان پر بھی تو نماز فرض ہے، یہاں اقامت کا تذکرہ نہیں کیونکہ وہ تو قیامِ صلاۃ کے لئے ہوتی ہے۔
یہ مذہب کے خلاف ہے کیونکہ افضل ان دونوں کو جمع کرنا ہے، اولیٰ یہ ہے کہ تاذین سے مراد عام آ گاہی ہو، یا پھر یہاں اقامت کو مقدر مانا جائے گا، کیونکہ آگے روایت میں ویقیم کے الفاظ آ رہے ہیں۔ چرواہے کی اس اذان میں کچھ مزید بھی فوائد ہیں جیسا کہ سننے والی تمام چیزوں کا اس کی توحید اور سنت کی اتباع پر گواہی دینا، مسلمانوں کے جماعت کے ساتھ مشابہت وغیرہ وغیرہ۔ ایک قول یہ بھی اگر وہ اذان اور اقامت کا اہتمام کرے تو فرشتے اس کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور اس کو جماعت کا ثواب مل جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ ''فیقول الله عزوجل'' یعنی فرشتوں سے اور ارواحِ مقربین سے ''انظروا الی عبدي هذا'' فرشتوں کو تعجب کے بعد مزید تعجب اہمیت کے پیش نظر دلایا جا رہا ہے اور اسی طرح عبد کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف کی، یہ بھی تعجب ہے، اور هذا سے اشارہ ہے تعظیم علی التعظیم کی طرف۔ ''یؤذن ویقیم الصلاة'' یہ منصوب بنزع الخافض ہے، اصل میں للصلاۃ تھا اور تنازع فعلین کے قبیل سے ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نماز کی محافظت اور اس پر مداومت ہے ''یخاف مني'' یعنی یہ کام وہ مجھ سے ڈرتے ہوئے سرانجام دے رہا ہے کسی کو دکھانے کے لئے نہیں، یہ تو تھی ابن الملک کی بات، امام طیبی فرماتے ہیں کہ بظاہر یہ جملہ استنافیہ ہے اگر چہ اس میں حال ہونے کا بھی احتمال ہے، گویا کہ اس میں عبودیت کی علت اور تمام لوگوں سے کنارہ کشی بتلادی ہے۔ باقی حافظ ابن حجر کا یہ کہنا کہ: ولذا اثر الشظية بالرعی فیها، والمعز برعايتها لان الاعين لاتتشوف اليها تشوفها للضأن تو حدیث میں اس کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ غنم کا لفظ ان دونوں سے اعم ہے، اور بقول ابن الملک اس حدیث میں منفرد کی اذان واقامت کا جواز ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ یہ استحباب کی دلیل ہے ''قد غفرت لعبدي'' کیونکہ اچھائیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں ''وادخلته الجنة'' کیونکہ وہ دارالجزاء ہے ''رواه ابوداود والنسائي'' بقول میرک اس روایت کو امام احمد نے بھی نقل کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

تین آدمیوں کی فضیلت

٦٦٦: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثَةٌ عَلٰى كُثْبَانِ الْمِسْكِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَبْدٌ اَدّٰى حَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ مَوْلَاهُ وَرَجُلٌ اَمَّ قَوْمًا وَهُمْ بِهٖ رَاضُوْنَ وَرَجُلٌ يُنَادِيْ بِالصَّلٰوةِ الْخَمْسِ كُلَّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ۔

(رواه الترمذی وقال هذاحديث غريب)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٣١٢ حديث رقم ١٩٨٦ وقال حسن غريب ۔وأخرجه أحمد فی مسنده ٢٥/٢٦۔ مع تقديم و تاخير ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''قیامت کے دن تین افراد کستوری کی ٹیلوں پر ہونگے ایک وہ غلام کہ جو اللہ تعالیٰ کے حقوق کو ادا کر کے اپنے آقا کے حقوق کو ادا کرے دوسرا وہ آدمی جو لوگوں کی امامت کروائے اور لوگ اس سے خوش ہوں۔ تیسرا وہ آدمی جو رات اور دن میں پانچ نمازوں کے لیے اذان کہتا ہے۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: ''وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ ثلاثۃ'' یعنی بندے ''علی کثبان المسک یوم القیامۃ'' ابن ہمام فرماتے ہیں کہ امام احمد، امام ترمذی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً اس حدیث کے الفاظ یوں نقل کئے ہیں: ''ثلاثۃ علی کثبان المسک'' اراہ یوم القیامۃ کہ تین قسم کے لوگ قیامت کے دن مشک ٹیلوں پر ہوں گے، ایک روایت میں یغطبھم الا ولون والآخرون اضافہ ہے، یعنی ان اولین وآخرین ان پر رشک کر رہے ہوں گے۔ کثبان ضمہ کے ساتھ کثیب کی جمع ہے جس کا معنی ہوتا ہے زمیں سے ابھری ہوئی ریت کی چھوٹی سی پہاڑی۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں ثواب کو مشک کے ٹیلے سے تعبیر ان کی بلندی، نمایاں پن اور لوگوں کے ان کی خوشبو سے لطف اندوزی کی وجہ سے کیا کیونکہ ان کے اعمال دیگر لوگوں کے اعمال سے متجاوز ہوں گے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسی کی اتباع کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ پہلی بات حقیقت پر محمول ہے، بلکہ اگر ہم یوم القیامۃ سے الدار الآخرۃ لیں تو یہ بات یقینی اور متعین ہے ''عبد'' سے مراد قن ہے تا کہ اس میں اَمہ (باندی) بھی داخل ہو جائے ساتھ میں یہ بات بھی ہے کہ ابن حزم ظاہری نے اس کا اطلاق دونوں معنوں (غلام اور آزاد) پر کیا ہے اور اس کے معنی کی مملوک سے تاویل ہے ''أدی حق اللہ'' یعنی اپنے مولیٰ حقیقی کا ''وحق مولاہ'' یعنی مجازی مولا ''ورجل ام قوما'' یعنی نماز بھی پڑھے اور امامت بھی کرے، کچھ لوگوں نے صرف غالب الوقوع (امامت) پر محمول کیا، یا پھر اس سے مراد اہلِ محلّہ کی امامت ہے، اسی وجہ سے فرمایا ''وھم بہ راضون'' مقتدیوں کی رضامندی امام کے ثواب میں اضافہ کا باعث ہے، یا اس وجہ سے کہ مقتدیوں کا راضی ہونا اس کے حال کی اصلاح کی دلیل ہے، یہاں امام کو مقتدیوں کی رضامندی سے موصوف کیا نہ کہ مؤذن کو اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر امام کی نماز صحیح نہ ہوگی تو مقتدیوں کی نماز بھی صحیح نہ ہوگی بخلاف مؤذن کے، پھر رضامندی سے تعبیر کی وجہ یہ ہے اکثر امام علماء ہوتے ہیں ''ورجل ینادي'' یعنی اذان دے اور تعلیم کرے ''بالصلوات الخمس'' حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مضارع کا صیغہ لا کر سامع کے ذہن میں استحضار اور اس کے انوکھے پن کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔

ظاہر ہے کہ مضارع کا صیغہ لانا استمرار کے فائدے کے پیش نظر ہے، اسی وجہ سے الصلوات الخمس کو جمع کے صیغہ کے ساتھ مقید کیا، اور اس میں مؤذن کے مرتبہ کی کمی کی جانب بھی اشارہ ہے جیسا کہ اس کی تاخیر سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے، عبد کو مقدم کرنا اس کے منافی نہیں کیونکہ مقام تعجب اسی کا مقتضی تھا، اسی وجہ سے ایک دوسرے مقام پر اس کی تخصیص یوں کی کہ اس کے لئے دوگنا اجر ہے، لہٰذا اس بات میں کوئی تعجب نہیں (غلام کی) یہ حیثیت امام اور مؤذن دونوں سے ثواب کے لحاظ سے زیادہ ہے ''کل یوم'' یعنی فی کل یوم (یعنی فی محذوف ہے) جیسا کہ ایک روایت میں ہے۔ ''ولیلۃ'' یعنی ہمیشہ، کیونکہ یہ جملہ نماز، اذان اور قاصر اور متعدی کے نفعوں کو جامع ہے۔ امام ابن الملک فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کو یہ اجر دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے دنیا میں عبادت کی تکلیف پر صبر کیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ تمام لوگوں میں سے چن کر ان کی عظمت شان اور نیک کارناموں کی وجہ سے انہیں قیامت کے میدان میں انفاسِ معطرہ اور مشک کے ٹیلوں میں مقام دے کر ان کا اکرام کیا: ''رواہ الترمذی، وقال ھذا حدیث غریب''۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس روایت کو امام طبرانی نے الاوسط اور الصغیر میں مناسب اسناد سے نقل کیا ہے، اور اس کے الفاظ

یوں ہیں: قال ﷺ لایھولھم الفزع الاکبر، ولاینالھم الحساب، وھم علی کثب من مسك حتی یفرغ حساب الخلائق: رجل قرأ القرآن ابتغاء وجه الله وأم به قوما وھم به راضون، وداع یدعوا الی الصلاۃ ابتغاء وجه الله عزوجل، وعبد احسن فیما بینه وبین ربه وفیما بینه وبین موالیه یعنی انہیں قیامت کی ہولنا کی کا سامنا نہیں کرنا ہوگا، نہ ان سے حساب لیا جائے گا، وہ مشک کے ٹیلوں پر ہوں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے حساب سے فارغ ہوجائے گا (اور وہ لوگ یہ ہوں گے) وہ آدمی جس نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے قرآن مجید پڑھا اور لوگوں کی امامت اس حال میں کروائی کہ لوگ اس سے راضی تھے، اور وہ داعی جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے نماز کی دعوت دے اور وہ غلام جو اپنے اور رب کے درمیان اور اپنے اور آقا کے درمیان کے معاملات کو احسن طریقے سے سرانجام دے۔ اس روایت کو الکبیر میں بھی نقل کیا اور اس کے الفاظ یوں ہیں: عن ابن عمر قال: لو لم اسمع من رسول الله ﷺ الا مرۃ ومرۃ ومرۃ حتی عد سبع مرات لماحدثت به، سمعت رسول الله ﷺ یقول: ثلاثة علی کثبان المسك یوم القیامة، لایھولھم الفزع الاکبر ولایفزعون حین یفزع الناس: رجل علم القرآن فقام به یطلب وجه الله وماعنده، ورجل ینادی فی کل یوم ولیلة بخمس صلوات یطلب به وجه الله وما عنده، ومملوك لم یمعنه رق الدنیا عن طاعة ربه، یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر میں رسول اللہ ﷺ سے بار ہا یہ بات نہ سنی ہوتی تو میں کبھی بیان نہ کرتا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن تین آدمی مشک کے ٹیلوں پر ہوں گے، قیامت کی ہولنا کی سے وہ نہیں گھبرائیں گے اور جب لوگ افراتفری میں ہوں گے تو انہیں کوئی افراتفری نہیں ہوگی، ایک وہ آدمی ہے جس نے قرآن مجید سیکھا اور اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے' اسے حاصل کرنے کی کوشش کی، اور دوسرا وہ آدمی شب وروز لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے' اسے حاصل کرنے کے لئے نماز کی دعوت دیتا ہے اور تیسرا وہ غلام ہے جسے دنیا کی غلامی اس کے رب کی اطاعت سے مانع نہ ہو۔

مؤذن کی فضیلت

۶۶۷: وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمُؤَذِّنُ یُغْفَرُلَهٗ مَدٰی صَوْتِهٖ وَیَشْھَدُ لَهٗ کُلُّ رَطْبٍ وَّیَابِسٍ وَشَاھِدُ الصَّلَاةِ یُکْتَبُ لَهٗ خَمْسٌ وَّعِشْرُوْنَ صَلَاةً وَّیُکَفَّرُ عَنْهُ مَابَیْنَھُمَا (رواہ احمد وابوداود وابن ماجه و روی النسائی) اِلٰی قَوْلِهٖ کُلَّ رَطْبٍ وَّیَابِسٍ وَقَالَ وَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِمَنْ صَلّٰی۔

أخرجه أحمد فی مسنده ۲/ ۴۱۱۔وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/ ۳۵۳حدیث رقم ۵۱۵۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/ ۲۴۰ حدیث رقم ۷۲۴۔وأخرجه النسائی إلی قوله "کل رطب یابس" فی السنن ۲/ ۱۲ حدیث ۲۴۸۔

ترجمه: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اذان دینے والے کی مغفرت اس کی آواز کی انتہاء کے مطابق کی جاتی ہے ہر تر اور خشک چیز اور نماز کے لئے آنے والے لوگ گواہ ہوجاتے ہیں اور اس کے لیے پچیس نمازوں کا ثواب لکھ دیا جاتا ہے اور دو نمازوں کے درمیان جو گناہ ہوتے ہیں وہ معاف کئے جاتے

ہیں اس حدیث کو امام احمدؒ، امام ابوداؤدؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے اور امام نسائیؒ نے اس حدیث کو : كُلِّ رَطْبٍ وَيَابِسٍ تک نقل کیا ہے اور یہ الفاظ زیادہ نقل کیے ہیں کہ اسے نماز پڑھنے والے کے برابر ثواب ملے گا۔

تشریح: ''وعن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ المؤذن يغفرله مدى صوته'' میم اور دال کے فتحہ کے ساتھ یعنی آواز کی انتہا مراد ہے جیسا کہ النہایہ میں ہے، ایک یہ بھی ہے کہ یہ مبالغہ ہے یعنی اس کی مغفرت بڑی طویل وعریض ہوگی، یعنی اللہ تعالیٰ اس کی تفصیلی مغفرت فرمائیں گے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر اس کے گناہ اتنے ہوں کہ اگر انہیں جسم مل جائے تو جہاں تک اس کی آواز پہنچتی ہے وہاں تک ان کے جسم پھیلے ہوئے ہوں تب بھی اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمادیں گے، پہلا احتمال ہوتو مدی ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہوگا اور دوسرا احتمال ہوتو نائب فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہوگا۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدی صوتہ کا معنی ہے وہ جگہ جہاں آواز ختم ہوتی ہو یعنی اگر وہاں وہاں تک بھی اس مؤذن کے گناہ پھیلے ہوئے ہوں تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمادیں گے، اس وقت یہ کلام تمثیل ہوگی۔ ایک معنی یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس کی مغفرت اس کی اذان کی آواز سن کر نماز کے لئے آنے والوں کی وجہ سے ہوگی، یعنی گویا اس کی آواز مغفرت کا باعث ہوگی۔ ایک تشریح یہ بھی ہے کہ اس کی شفاعت سے اس کی آواز کی انتہا تک تمام لوگوں کی بخشش کی جائے گی، ایک معنی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ یغفر، یستغفر کے معنی میں ہے، مطلب یہ ہوگا کہ تمام وہ لوگ جو اس کی آواز سنیں گے وہ اس کے لئے مغفرت کی دعا کریں گے'' ویشهد له كل رطب'' رطب سے ہر بڑھنے والا جسم مراد ہے'' ویابس ''یعنی جمادات جن تک اس کی آواز پہنچے گی، رطب ویابس کی یہ شہادت حقیقت پر محمول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو نطق کی صلاحیت دینے پر قادر ہے یا پھر مجاز بھی محمول ہوسکتا ہے اور ایسا پھر مبالغۃ ہوگا جیسا کہ ابن الملک کا خیال ہے'' وشاهد الصلاة ''یعنی نماز میں حاضر ہونے والا وہ شخص جو نماز کے وقت سے غافل تھا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اس کی اذان سے جماعت میں حاضر ہونے والا شخص مراد ہے۔ اس وقت یہ قید غالبی ہوگی ورنہ تو جماعت میں حاضر ہونے والوں کی فضیلت تو آگے حدیث میں آئے گی، چاہے وہ اذان سن کر آئیں یا بغیر اذان کے۔ اسی وجہ سے امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا المؤذن يغفرله پر عطف ہے اور مراد وہ شخص ہے جو نماز میں حاضر ہو'' یکتب له ''یعنی حاضر ہونے والے کے لئے'' خمس وعشرون ''یعنی پچیس نمازوں کا ثواب'' صلاة '' کہا گیا ہے کہ اگر اس کا عطف کل رطب پر ہوتو اس کا معنی یہ ہوگا کہ مؤذن کی اذان سن کر آنے والے ایک شخص کی وجہ سے مؤذن کے کھاتے میں پچیس نمازوں کا ثواب لکھا جائے گا۔ پہلی بات کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے' جس میں فرمایا کہ جماعت کی نماز اکیلے کی نماز سے ستائیس درجے افضل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ایک صحیح روایت میں خمس وعشرین صلاۃ کا ذکر ہے اور یہ مطابقت کے لئے ظاہر ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ روایات کا اختلاف حالات ومقامات کے اختلاف کی وجہ سے ہو۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ دوسرے قول کی تائید آگے آنے والی روایت سے ہوتی ہے کہ مؤذن کے لئے جتنے لوگ اس کی اذان سن کر آئے ہیں' ان سب کی نمازوں کے برابر ثواب لکھا جاتا ہے، اسی وجہ سے اس جملہ کا عطف المؤذن يغفرله پر کر کے یہ بتادیا کہ مؤذن کے لئے دہرا اجر ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ شاهد الصلاة کا عطف كل رطب پر یہ عطف الخاص علی العام ہے کیونکہ مبتدا ہے، جیسا کہ امام طیبی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار

کیا ہے اور پھر اس میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ یکتب کی ضمیر شاھد کی جانب راجع ہو اور یہی الفاظ اور سیاق کے لحاظ سے اقرب ہے، یا یہ ضمیر مؤذن کی جانب راجع ہے اور یہ معنی سیاق کے لحاظ سے قریب ہے "ویکفر عنه" شاہد یا مؤذن "مابینهما" دونوں نمازوں کا دوران، جسمیں وہ مؤذن اور نمازی حاضر ہوئے ہیں یا ایک اذان سے دوسری اذان کا درمیان مراد ہے اور مغفرت صغیرہ گناہوں کی ہوگی "رواہ احمد" ابن ہمام فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اذان میں کتنا ثواب ہے تو تلواریں لیکر لڑنے کو آجائیں، اور صحیح سندوں کے ساتھ ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ مؤذن کی اذان کے منتہیٰ تک اس کی بخشش کی جاتی ہے اور اس کے لیے تمام رطب ویابس مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ بزار نے ان سے سنا اور یوں نقل کیا کہ مؤذن کی آذان کا جواب ہر رطب ویابس دیتے ہیں "وابوداود" ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ابن خزیمہ نے بھی یہ روایت نقل کی ہے اور ان دونوں کے الفاظ یجیب کی جگہ یشھد له ہیں۔ امام نسائی نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس بات کا اضافہ کیا ہے کہ مؤذن کو اس کے ساتھ پڑھنے والے تمام نمازیوں کے برابر ثواب ملے گا، امام طبرانی نے بھی اس سے ملتی جلتی روایت نقل کی ہے اور الاوسط میں وہ یوں فرماتے ہیں کہ رحمٰن یہ مؤذن کے سر پر ہوتا ہے اور یہ کہ اس کی جہاں تک آواز جاتی وہاں تک اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے، آگے جا کر فرمایا کہ مؤذنین اور تلبیہ پڑھنے والے اس حال میں اپنی قبروں سے نکلیں گے کہ مؤذن اذان دے رہا ہوگا اور ملبی تلبیہ پڑھ رہا ہوگا "وابن ماجة" یعنی پوری حدیث انہوں نے نقل کی ہے "وروی النسائي الى قوله كل رطب ويابس وقال" یعنی امام نسائی نے اپنی روایت میں فرمایا "وله" یعنی مؤذن کے لئے "مثل اجر من صلی" یعنی جو لوگ اس کی اذان کی وجہ سے آئیں۔

تنخواہ کے بغیر اذان دی جائے

٦٦٨: وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِی الْعَاصِ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِجْعَلْنِیْ اِمَامَ قَوْمِیْ قَالَ اَنْتَ اِمَامُهُمْ وَاقْتَدِ بِاَضْعَفِهِمْ وَاتَّخِذْ مُؤَذِنًا لَايَاْ خُذُعَلٰى اَذَانِهٖ اَجْرًا .

(رواہ احمد وابوداود والنسائی)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ١/٣٦٣حديث رقم ٥٣١۔وأخرجه النسائی فی السنن ٢/٢٣حديث رقم ٦٧٢۔ وأحمد فی مسنده ٤/٢١٧۔وأخرج مسلم بمعنی القسم الأول فی الصحيح ١/٣٤١حديث (١٨٦۔٣٦٨) وأخرجه ابن ماجة فی موضعين ۔القسم الثانی فی ١/٢٣٦حديث رقم ٧١٤والثانی فی ١/٣١٦حديثين رقم ٩٨٧۔٩٨٨۔

ترجمہ: "حضرت عثمان بن ابی عاصؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ مجھے میری قوم کا امام مقرر کر دیں آپ نے فرمایا کہ تم ان کے امام ہو مگر یہ یاد رکھو کہ نماز پڑھانے میں تم نے کمزور اور ضعیف لوگوں کی اقتداء یعنی رعایت کرنی ہے اور ایسا مؤذن مقرر کر جو اذان کہنے کی تنخواہ نہ لے اس حدیث کو امام احمدؒ 'امام ابوداوٗدؒ اور امام نسائیؒ نے روایت کیا ہے۔"

تشریح: ''وعن عثمان بن ابی العاص قال: قلت یارسول اللہ! اجعلني امام قومي قال: انت امامھم'' یعنی میں نے تمہیں ان کا امام بنا دیا، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یوں فرمایا تو ایسا ہی ہے جیسا تو نے کہا، اس صورت میں یہ دوام کے لئے ہوگا، قالہ ابن الملک، جب کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت جہاں ان کی امامت کو ثابت کرتی ہے وہاں ان کی امامت کے لئے اہلیت پر بھی دلالت کرتی ہے' ام بھم کی تاویل کی وجہ سے، اسی وجہ سے عطف کرتے ہوئے فرمایا ''واقتد بأضعفھم'' یعنی مقتدیوں میں سے ضعیف کا لحاظ کرتے ہوئے نماز کو مختصر کرو مگر یوں کہ نماز کا کوئی رکن نہ چھوٹنے پائے، مراد یہ ہے کہ قراءت اور تسبیحات میں تخفیف کردو تاکہ لوگ اکتا نہ جائیں اور یہ قول بھی ہے کہ نماز میں جلدی نہ کرو تاکہ کمزور لوگ بھی نماز میں شریک ہو جائیں اور اتنا لمبا بھی نہ کرو کہ ان پر بوجھ بن جائے، قالہ ابن الملک، جب کہ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اقتد جملہ انشائیہ ہے اور اس کا عطف انت امامھم پر امھم کی تاویل کے ساتھ ہے، جملہ اسمیہ سے عدول اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کیا کہ ان کی امامت ثابت ہے اور اس کی خبر دی جا رہی ہے یعنی جس طرح کمزور لوگ تیری اقتداء میں نماز پڑھتے ہیں تو تو بھی ان کی کمزوری کا خیال کر اور قیام وقراءت میں تخفیف سے کام لے۔ کچھ لوگوں نے یہاں مقتدی کو مقتدی بنانے کی کوشش کی اور یہ بڑی عجیب بات ہے۔ امام تورپشتی فرماتے ہیں کہ اقتداء کا لفظ امر مخثوث علیہ کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے کیونکہ مقتدی کی شان یہ ہے کہ وہ مقتدیٰ بہ کے تابع رہے اور اس کے خلاف کرنے سے گریز کرے، چنانچہ قوم کی مراعات کو اقتداء سے تعبیر کردیا ''واتخذ مؤذنا'' یہ امر استحبابی ہے ''لایأخذ علی أذانه أجرا'' ابن ہمام فرماتے ہیں کہ امام ابوداود نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ تم میں سے بہتر آدمی اذان دے اور تم میں قاری امامت کروائے، اس سے معلوم ہوا کہ مؤذن کا عالم باعمل ہونا مستحب ہے، کیونکہ فاسق تو بہتر نہیں ہوتا، کیونکہ ایک قول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فاسق کو جاہل کے بہ نسبت زیادہ عذاب ہوگا، جیسا کہ صحیح احادیث بھی اس پر شاہد ہیں، پھر یہ کہ اس کے شریف اور بہتر ہونے میں اس بات کو عمل دخل ہے کہ وہ اذان کی اجرت نہ لیتا ہو کیونکہ اجرت نہ تو مؤذن کے لئے جائز ہے اور نہ ہی امام کے لئے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر امام ومؤذن اجرت کی شرط نہ لگائیں، لیکن لوگ ان کے احوال دیکھ کر وقتاً فوقتاً کچھ جمع کر کے ان کو دے دیں تو بہتر ہے، اس معنی کے لحاظ سے ان کے لئے کوئی چیز لینا جائز نہیں لیکن قوم کو چاہئے کہ وہ ان کا خیال رکھیں۔ فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ مؤذن اگر نمازوں کے اوقات سے باخبر نہ ہو تو وہ مؤذنین کے اجر کا حقدار نہیں۔

اجرت نہ لینے والی بات تو ٹھیک ہے اور اولیٰ بھی یہی ہے کہ اجرت نہ لی جائے، لیکن قاضی خان کے قول کو اس صورت پر محمول کیا جائے گا کہ جب مؤذن بے وقت اذان دیتا ہو، کیونکہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نابینا ہونے کے باوجود مؤذن تھے اور مؤذن کے خیار اور اشراف میں سے ہونے کے لئے ایک چیز یہ بھی ہے کہ وہ اذان میں غلطی نہ کرتا ہو، جب کہ آواز کا عمدہ ہونا مطلوب تو ہے لیکن لازم نہیں۔ کچھ لوگوں نے اس حدیث سے یہ اخذ کیا ہے کہ اذان پر اجرت لینا منع ہے، اور اس بات پر کوئی دلیل نہیں کہ افضلیت پر عمل کرنے کے لئے اسے اجرت لینے سے روکا جائے جیسا کہ امام طیبی نے فرمایا ہے۔ امام خطابی فرماتے ہیں کہ اکثر علماء کے مذہب کے مطابق اذان پر اجرت لینا مکروہ ہے۔ امام حسن فرماتے ہیں کہ مجھے ڈر ہے کہ اگر وہ اجرت لے تو اس کی نماز میں اخلاص نہ رہے، امام شافعی رحمہ اللہ نے اسے مکروہ سمجھتے ہوئے فرمایا کہ اس کا وظیفہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خمس میں

سے مقرر کیا جائے گا کیونکہ یہ مصالح مسلمین کا ایک حصہ ہے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی متقی اذان دینے والا ہو تو حاکم وقت کے لئے جائز نہیں کہ وہ بیت المال میں سے کسی کو اذان کی اجرت دے۔مظہر فرماتے ہیں کہ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ امامت حاکم کی اجازت سے ہونی چاہیئے (یعنی تنخواہ پر رکھا جانے والا امام مراد ہے) اور امام کے لئے مستحب ہے کہ وہ نماز میں ضعیفوں کی رعایت رکھتے ہوئے تخفیف سے کام لے۔ایک حدیث میں ہے کہ جو کوئی امامت کروائے اسے چاہیئے کہ تخفیف کرے کیونکہ ان میں بیمار بھی ہوتے ہیں مریض بھی اور حاجت مند بھی''رواہ احمد وابوداود والنسائي'' اور حاکم نے بھی مستدرک میں اسے نقل کیا ہے اور امام مسلم نے ان میں سے پہلی فصل، جب کہ ابن ماجہ نے دو فصلیں دو مقامات پر اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے آخری فصل نقل کی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے جیسا کہ میرک نے نقل کیا ہے اور ترمذی شریف کی خبر میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانے میں یہی تھا کہ مؤذن اذان پر اجرت نہ لے۔

مغرب کی اذان کے وقت کی دُعا

۶۷۹: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ عَلَّمَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ اَقُوْلَ عِنْدَ اَذَانِ الْمَغْرِبِ اَللّٰهُمَّ هٰذَا اِقْبَالُ لَيْلِكَ وَاِدْبَارُ نَهَارِكَ وَاَصْوَاتُ دُعَائِكَ فَاغْفِرْلِيْ. (رواہ ابوداود والبیهقی فِیْ الدعوات الکبیر)

أخرجه أبوداود فی السنن ۳۶۲/۱ حدیث رقم ۵۳۰۔ وأخرجه الترمذی فی السنن ۵۳٦/۵ حدیث رقم ۳۵۸۹۔ وقال حدیث غریب۔

ترجمہ: ''حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی تھی کہ میں مغرب کی اذان کے وقت یہ دعا پڑھ لیا کروں: اَللّٰهُمَّ هٰذَا اِقْبَالُ لَيْلِكَ وَاِدْبَارُ نَهَارِكَ وَاَصْوَاتُ دُعَائِكَ فَاغْفِرْلِيْ۔''اے اللہ یہ وقت ہے تیری رات کے آنے کا اور تیرے دن کے جانے کا اور مؤذن کی آوازوں کا لہٰذا تو میری مغفرت فرما''۔اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام بیہقیؒ نے دعوات الکبیر میں روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''وعن ام سلمة قالت: علمني رسول الله ﷺ ان اقول عند اذان المغرب'' بظاہر یہ اذان کے جواب کے بعد یا درمیان میں ہوگا''اللهم هذا'' مافی الذہن کی جانب اشارہ ہے، اور یہ مبہم ہے اس کی تفسیر ایک خبر میں ہے، امام طیبی نے یہی فرمایا ہے اور ابن حجر نے بھی انہی کی اتباع کی ہے، جب کہ ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ و اصوات کی وجہ سے اذان کی جانب اشارہ ہے''اقبال ليلك'' یعنی یہ اذان یا یہ کہ تیری رات کا آنا''وادبار نهارك'' یعنی اُفق میں ''واصوات دعاتك'' یعنی آفاق میں' یہ داع کی جمع ہے، اور مؤذن مراد ہے''فاغفرلي'' اس مبارک وقت اور معزز آواز کی بدولت، اور اسی سے مغفرت کی تفریع اور اس حدیث کی باب سے مناسبت ظاہر ہوتی ہے کیونکہ یہ اس بات پر دلالت کر رہی کہ اذان کا وقت دعا کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے جو اپنی شرح میں تکلّفات سے کام لیا ہے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔یہاں مغرب کو خاص کرنے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہ نماز دن و رات کے اطراف کے درمیان واقع ہوتی ہے، اور طرفی النہار مغفرتِ سابقہ ولاحقہ کا تقاضہ کرتے ہیں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی اندازہ ہو۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ صبح کی اذان

کے وقت بھی دعا قبول ہوتی ہے۔ پھر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے امورِ توقیفیہ میں شمار کیا ہے، لیکن یہ درست نہیں کیونکہ ادلہ شرعیہ سے اس کی توجیہہ کرنا ممنوع نہیں، امت کا ادعیہ مصنوعہ کی اصلاً قبولیت پر اتفاق ہے تو جس دعا کے الفاظ نبوی زبان سے صادر شدہ ہوں وہ کیسے قبول نہیں ہوگی، پھر محذوراتِ لفظیہ، محذوراتِ معنویہ اور اسماء الٰہیہ پر قیاس یہ تمام باتیں اصولی قواعد کے خلاف ہیں "**رواہ ابو داود**" اور امام ترمذی اور حاکم نے بھی المستدرک میں نقل کیا اور امام ذہبی نے اس کی صحت کا اقرار کیا ہے، قالہ میرک، جب کہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس روایت کو امام نسائی وطبرانی نے بھی نقل کیا ہے "**والبیھقي في الدعوات**" یعنی کتاب الدعوات "**الکبیر**" یہ مضاف مقدر کی صفت ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس روایت کی سند حسن ہے اور ایک روایت میں یوں ہے: **بعد دعاتك وصلوات ملائكتك اسالك ان تغفرلي۔**

اقامت کا جواب

٦٧٠: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَوْ بَعْضِ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنَّ بِلَالًا اَخَذَ فِی الْاِقَامَةِ فَلَمَّا اَنْ قَالَ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَقَامَهَا اللّٰهُ وَاَدَامَهَا وَ قَالَ فِیْ سَائِرِ الْاِقَامَةِ كَنَحْوِ حَدِیْثِ عُمَرَ فِی الْاَذَانِ۔ (رواہ ابو داود)

أخرجه أبو داؤد في السنن ١/ ٣٦٠ حديث رقم ٥٢٨۔

ترجمہ: حضرت ابو امامہؓ یا رسول اللہ ﷺ کے کوئی اور صحابی فرماتے ہیں کہ حضرت بلالؓ نے اقامت کہنی شروع کی۔ جب انہوں نے **قَدْقَامَتِ الصَّلَاة** کہا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا: **اَقَامَهَا اللّٰهُ وَاَدَامَهَا** کہ اللہ نماز کو قائم ودائم رکھے اور باقی کلمات کا جواب اسی طرح دیا جس طرح حضرت عمرؓ کی حدیث اذان میں ذکر کر دیا گیا ہے ۔اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: "**وعن ابی امامة أو بعض اصحاب رسول الله ﷺ قال ان بلالا أخذ**" یعنی شروع ہوئے "**فی الاقامة، فلما**" یہ شرطیہ ہے بقول ابن الملک "**ان قال قد قامت الصلاة**" امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ فعل کا تقاضہ کرتا ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے: **فلما انتهى الى ان قال**۔ قال کے بارے میں اہلِ علم کا اختلاف ہے کہ یہ فعل لازم ہے کہ متعدی، اگر متعدی ہو تو یہ مفعول بہ ہوگا اور اگر لازم ہو تو مصدر ہوگا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اسی کی پیروی کی ہے۔ ظاہر بات یہ ہے کہ لما ظرف فیہ ہے اور اَن زائدہ للتاکید ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ﴾ [یوسف: ٩٦] "اور جب خوشخبری دینے والا آ پہنچا" میں ہے اور جیسا کہ صاحب کشاف وغیرہ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَلَمَّا جَآءَ تْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ ......﴾ [ھود: ٧٧] کے بارے میں فرمایا ہے "**قال رسول الله ﷺ اقامها الله**" یعنی نماز کو اللہ نے ہی ثابت کیا ہے "**وادامها**" اور مزید معروف کیا اور مجھے نماز کے قابل بنایا "**وقال**" یعنی نبی پاک ﷺ نے "**فی سائر الاقامة**" یعنی تمام کلماتِ اقامت میں سوائے **قدقامت الصلاة**، یا پھر اس سے مراد بقیہ کلمات ہیں یعنی اقامت کہنے والے کے جملے دہراتے رہے سوائے حیعلتین (حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح)

کے کیونکہ اس کے جواب میں لاحول ولاقوۃ الا باللہ فرمایا "کنحو حدیث عمر" یعنی وہ اسی طرح کہا جس طرح مؤذن کہتا ہے، اور جیسا کہ اس کی تفصیل اس باب کی پہلی فصل کی پانچویں حدیث میں گذر چکی ہے "فی الاذن" یعنی سوائے حیعلتین کے مؤذن کی موافقت کی، اور موافقت کا احتمال اس وجہ سے ہے کہ اس سلسلے میں حدیث وارد ہے "رواہ ابو داود" میرک فرماتے ہیں کہ اس کی حدیث میں ایک مجہول شخص ہے، لیکن صحابی کی جہالت کا نقصان نہیں ہوتا کیونکہ الصحابۃ کلھم عدول۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد صحابی کے علاوہ کوئی اور شخص ہو اور اس کی تائید حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں انہوں نے فرمایا کہ اس میں ایک روای مجہول ہے، لیکن فضائل کی احادیث میں اس کا کوئی نقصان نہیں۔

اذان اور اقامت کے درمیان دُعا قبول ہوتی ہے

۶۷۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُرَدُّ الدُّعَاءُ بَيْنَ الْاَذَانِ وَالْاِقَامَةِ۔

(رواہ ابوداود والترمذی)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۳۵۸حديث رقم ۵۲۱ ـوأخرجه الترمذی فی السنن ۱/۴۱۵حديث رقم ۲۱۲۔ وقال حسن صحيح ـوأخرجه أحمد فی المسند ۳/۱۱۹۔

ترجمہ: "حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اذان اور اقامت کے درمیان دعا رد نہیں کی جاتی۔ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔"

تشریح: "وعن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایرد الدعا بین الاذان والاقامۃ" یعنی تو پھر دعا کرو جیسا کہ ایک روایت میں ہے اور یہ وقت کی شرافت کے باعث ہے "رواہ ابوداود والترمذی" اور فرمایا یہ کہ حدیث حسن ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے اور امام ترمذی نے ایک حسن روایت یوں نقل کی ہے: "الدعا لایرد بین الاذان والاقامۃ" صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم کیا کہیں؟ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی عافیت مانگو۔

قبولیتِ دُعا کے تین اوقات

۶۷۲: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم ثِنْتَانِ لَا تُرَدَّانِ اَوْ قَلَّمَا تُرَدَّانِ الدُّعَاءُ عِنْدَ النِّدَاءِ وَعِنْدَ الْبَأْسِ حِيْنَ يَلْحَمُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا وَفِی رواية وَتَحْتَ الْمَطَرِ (رواہ ابوداود والدارمی) اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يَذْكُرْ وَتَحْتَ الْمَطَرِ۔

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۳/۴۵حديث رقم ۲۵۴۰والرواية الثانية ۳/۴۶ـولفظها 'و'وقت المطر'۔ وأخرجه الدارمی فی السنن ۱/۲۹۳حديث رقم ۱۲۰۰۔

ترجمہ: حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دو دعائیں رد نہیں کی جاتیں یا یہ کہ فرمایا کم رد کی جاتی ہیں ایک وہ دعا جو اذان ہونے کے بعد مانگی جائے دوسری وہ دعا جو کفار کے ساتھ جنگ

کے وقت مانگی جائے جس وقت شدت کی جنگ جاری ہو اور ایک دوسرے کو کاٹ رہا ہو اور ایک دوسری روایت میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ دعا جو بارش میں کھڑے ہو کر مانگی جائے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے مگر امام دارمیؒ کے روایت میں تَحتَ المَطر کا ذکر نہیں ہے۔

تشریح: ''وعن سهل بن سعد'' رضی اللہ عنہ، کیونکہ بقول ابن حجر وہ صحابی ہیں ''قال قال رسول الله ﷺ ثنتان'' یعنی دو دعائیں ''لاترذان، او قلما تردان'' مغنی فرماتے ہیں کہ ما زائدہ ہی نہیں کافہ بھی ہے ''الدعاء عند النداء'' یعنی اذان کے دوران یا بعد ''وعند البأس'' شدت اور کفار کے ساتھ جنگ کے وقت ''حين'' یہ وعند الباس سے بدل ہے یا بیان ہے ''یلحم'' یاء اور حاء کے فتحہ کے ساتھ یعنی قتال ہو رہا ہو ''بعضهم بعضا'' گویا کہ مقتول کو لحم (گوشت) سے تعبیر کیا اور ایک نسخہ میں یاء کے ضمہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور یختلط کے معنی میں ہے اور لحم کو لحم اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس کے اجزاء آپس میں خلط ملط ہوتے ہیں۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ الغریبین میں ہے کہ الحم الرجل یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ میدانِ کارزار میں اس کی بس ہو جائے اور اسے بھاگنے کی کوئی راہ نہ ملے اور لحم کا لفظ اس وقت بولتے ہیں جب وہ قتل ہو جائے۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ لحمہ کا معنی ہوتا ہے کوئی چیز دوسری کے ساتھ یوں چمٹ جائے جیسے گوشت ہڈی کے ساتھ چمٹا ہوا ہوتا ہے، حاصل یہ ہے کہ جب کوئی قتل ہو جاتا ہے تو وہ گوشت کا ایک ڈھیر بن جاتا ہے اس لئے اسے لحم سے تعبیر کیا ''وفي رواية'' یعنی وعند الباس یلحم بعضهم بعضا کی جگہ کیونکہ ابوداود کی ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں: ساعتان يفتح فيهما ابواب السماء وقلما ترد على داع دعوته: عند حضور النداء، ووقت المطر کہ دو گھڑیاں ایسی ہیں کہ جن میں آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اور بہت کم کسی کی دعا رد ہوتی ہے ایک اذان کے وقت اور دوسری بارش کے وقت، جب کہ ابوداؤد کی ایک روایت مصنف کی اس روایت کے مطابق ہے، واللہ اعلم، قالہ میرک۔ اور ''وتحت المطر'' یعنی بوقت بارش، امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عوارف المعارف میں آنحضرت ﷺ سے منقول ہے کہ آپ علیہ السلام بارش کا استقبال کرتے اور اس سے تبرک حاصل کرتے ہوئے حدیث عهد بربه فرماتے ''رواه ابوداود والدارمي الا انه'' یعنی امام دارمی نے: ''وتحت المطر'' ذکر نہیں کیا۔

مؤذن کا ثواب کس طرح حاصل کیا جائے؟

۶۷۳: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ الْمُؤَذِّنِيْنَ يَفْضُلُوْنَنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْ كَمَا يَقُوْلُوْنَ فَإِذَا انْتَهَيْتَ فَسَلْ تُعْطَ۔ (رواه ابو داود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۱/ ۳۶۰ حديث رقم ۵۲۴۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک صحابی نے عرض کیا ''اے اللہ کے رسولؐ! اذان دینے والے ہم سے فضیلت میں بڑھ جاتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم بھی مؤذن کے الفاظ کی طرح جواب دو۔ جب جواب سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ سے مانگو عطا کیا جائے گا۔ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: "وعن عبداللہ بن عمرو" یعنی ان سے مروی ہے "قال رجل یارسول اللہ! ان المؤذنین یفضلوننا" یاء کے فتحہ اور ضاد کے ضمہ کے ساتھ یعنی وہ لوگ اذان کی وجہ سے ہم سے فضیلت میں آگے بڑھ گئے، اور ظاہر ہے کہ یہ خبر ہے یعنی ہم کیا کریں کہ ہم بھی فضیلت میں ان تک پہنچ جائیں؟ "فقال رسول اللہ ﷺ قل کما یقولون" یعنی سوائے حیعلتین کے جیسا کہ پہلے گذر چکا' تو تمہیں بھی وہی ثواب مل جائے گا' قالہ ابن الملک، یعنی اذان اور اس کا جواب ثواب میں برابر ہے پھر جواب پر مزید اضافہ کرتے ہوئے فرمایا "فاذا انتهیت" یعنی جب جواب دے چکو "فسل" نقل کے ساتھ یعنی اللہ تعالیٰ سے جو چاہو مانگو "تعط" یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول کرے گا اور تمہاری ضرورت پوری کرے گا" رواہ ابوداود" اور خاموشی اختیار کرلی، امام منذری رحمہ اللہ نے اس روایت کو ثابت کیا اور امام نسائی رحمہ اللہ نے الیوم واللیلۃ میں اور ابن حبان نے الصحیح میں اس روایت کو نقل کیا ہے، قالہ میرک۔ امام طبرانی نے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یوں ہیں: من سمع المؤذن فقال مایقول فله مثل اجره۔ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ امام طبرانی نے الاوسط میں اور امام احمد نے آنحضرت ﷺ سے نقل کیا ہے کہ جو شخص منادی کے نداء کے وقت یوں کہے: اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلاة النافعة صل علی محمد وارض عنی رضا لاتسخط بعده تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرماتے ہیں، امام طبرانی نے الکبیر میں یوں نقل کیا ہے کہ جو شخص اذان سنے تو کہے: اشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له وان محمدا عبده ورسوله، اللّٰهم صل على محمد وبلغه درجة الوسيلة عندك واجعلنا في شفاعته يوم القيامة تو اس کے شفاعت واجب ہوگئی۔

الفصل الثالث:

اذان کے وقت شیطان دُور بھاگ جاتا ہے

۶۷۴: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ الشَّيْطَانَ اِذَا سَمِعَ النِّدَاءَ بِالصَّلَاةِ ذَهَبَ حَتّٰى يَكُوْنَ مَكَانَ الرَّوْحَاءِ قَالَ الرَّاوِيْ وَالرَّوْحَاءُ مِنَ الْمَدِيْنَةِ عَلٰى سِتَّةٍ وَثَلَاثِيْنَ مِيْلاً۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/ ۲۹۰ حديث رقم (۱۵۔۳۸۸)۔

ترجمہ: "حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب شیطان نماز کی اذان سنتا ہے تو بھاگ جاتا ہے یہاں تک کہ مقام روحاء تک پہنچ جاتا ہے راوی کہتے ہیں روحاء مدینہ سے چھتیس میل کے فاصلے پر ہے اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کی ہے۔"

تشریح: "عن جابر قال سمعت النبی ﷺ یقول ان الشیطان" اس سے مراد تمام شیطان یا ان کا سردار ہے "اذا سمع النداء بالصلاۃ ذھب" کیونکہ اسے اذان، اقامت اور بھلائی کے لئے جمع ہونا اچھا نہیں لگتا "حتی یکون مکان الروحاء" یعنی شیطان دو مکانوں کی مسافت کے بقدر دور بھاگ جاتا ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے: یکون

الشیطان مثل الروحاء فی البعد جیسا کہ امام طیبی کا خیال ہے ''قال الراوی'' اس سے مراد ابوسفیان طلحہ بن نافع مکی راوی ہیں جنہوں نے جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے جیسا کہ اس کی تصریح مسلم شریف کی روایت میں موجود ہے، نقلہ میرک، ''والروحاء من المدینة'' یعنی مکہ کی جانب ''علی ستة وثلاثین میلا'' یعنی بارہ فرسخ ''رواہ مسلم''۔

۶۷۵: وَعَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ اِنِّیْ لَعِنْدَ مُعَاوِیَةَ اِذْ اَذَّنَ مُؤَذِّنُهٗ فَقَالَ مَعَاوِیَةُ كَمَا قَالَ مُؤَذِّنُهٗ حَتّٰی اِذَا قَالَ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوةِ قَالَ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ فَلَمَّا قَالَ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ قَالَ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ وَقَالَ بَعْدَ ذٰلِكَ مَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ ثُمَّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ ذٰلِكَ. (رواہ احمد)

أخرجه النسائی فی السنن ۲/۲۵ حدیث رقم ۶۷۷ـ وأحمد فی مسنده ۴/۹۱ـ۹۲ـ

ترجمہ: حضرت علقمہ بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت معاویہؓ کی خدمت میں موجود تھا جب ان کے مؤذن نے اذان دی جس طرح مؤذن کہتا تھا حضرت معاویہؓ اسی طرح کہتے رہے جب مؤذن نے حَیَّ عَلَی الصَّلٰوةِ کہا تو حضرت معاویہؓ نے لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہا جب مؤذن نے حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کہا تو حضرت معاویہؓ نے لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ کہا اور اس کے بعد مؤذن جو کہتا رہا حضرت معاویہؓ بھی وہی کہتے رہے پھر حضرت معاویہؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح کہتے ہوئے سنا ہے اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

علقمہ بن وقاص۔ یہ علقمہ بن وقاص لیثی ہیں۔ آنحضور ﷺ کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وفد کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اور غزوۂ خندق میں شریک ہوئے۔ عبدالملک بن مروان کے دور حکومت میں مدینہ کے اندر وفات پائی۔ ان سے ان کے پوتے عمرو اور محمد بن ابراہیم تیمی روایت کرتے ہیں۔

عرض مرتب: حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاصابة'' میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اھ

تشریح: قاله الطیبی: ''قال انی لعند معاویة'' یعنی ابن ابی سفیان ''اذ'' ذال کے سکون کے ساتھ ''اذن مؤذنه'' یعنی ان کے مؤذن خاص یا ان کی مسجد کے مؤذن ''فقال معاویة کما قال مؤذنه حتی اذا قال حی علی الصلاہ'' ہاءِ وقف کے ساتھ ''قال'' یعنی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ''لا حول ولا قوۃ الا باللہ'' اس کا معنی پیچھے گذر چکا ہے ''فلما قال'' یعنی ان کے مؤذن نے ''حی علی الفلاح، قال'' یعنی امیر معاویہ نے ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم'' بقول طیبی روایات میں یہ اضافہ اضافہ نادرہ ہے ''وقال بعد ذلك ما قال المؤذن'' یعنی جیسے مؤذن کہتا رہا ''ثم قال'' یعنی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ نے فرمایا ''سمعت رسول اللہ ﷺ قال ذلك'' یعنی کہا یا حکم دیا ''رواہ احمد'' ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس روایت کو امام نسائی نے بھی نقل کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے۔

۶۷۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَامَ بِلَالٌ يُنَادِیْ فَلَمَّا سَكَتَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ مِثْلَ هٰذَا يَقِيْنًا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (رواہ النسائی)

أخرجه النسائي في السنن ٢/ ٢٤ حديث رقم ٦٧٤۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ حضرت بلالؓ کھڑے ہوئے اور اذان کہنے لگے جب وہ خاموش ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے اس طرح دل کے یقین کے ساتھ جواب دیا تو وہ جنت میں داخل ہوگا اس حدیث کو امام نسائیؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''**وعن ابی هريرة قال كنا مع رسول الله** صلی اللہ علیہ وسلم **فقام بلال ينادی**'' یعنی اذان دینے لگے ''**فلما سکت**'' یعنی فارغ ہوئے ''**قال رسول الله** صلی اللہ علیہ وسلم **من قال مثل هذا**'' یہ جملے مجیب بن کر یا مؤذن بن کر یا مطلقاً کہے ''**يقينا**'' یعنی دل کے اخلاص کے ساتھ ''**دخل الجنة**'' یعنی وہ جنت میں داخلے کا حقدار ہے یا نجات پانے والوں کے ساتھ جنت میں جائے گا ''**رواه النسائي**'' اور ابن حبان نے الصحیح میں اور امام حاکم نے بھی نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہیں، ذکرہ میرک۔

۶۷۷: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَمِعَ الْمُؤَذِّنَ يَتَشَهَّدُ قَالَ وَاَنَا وَاَنَا. (رواہ ابوداود)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ١/ ٣٦١۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مؤذن کو شہادتین کہتے ہوئے سنتے تو فرماتے اور میں بھی اور میں بھی اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ''**وعن عائشة قالت كان النبی** صلی اللہ علیہ وسلم **اذا سمع المؤذن**'' یعنی اس کی آواز ''**يتشهد**'' حال ہے ''**قال وانا وانا**'' عامل کے مقدر ہونے کی وجہ سے یہ مؤذن کے قول پر عطف ہے یعنی میں گواہ ہوں، تشہد تاء اور یاء دونوں کے ساتھ ہے، امام طیبی کے بقول اس کا معنی میں کہ میں شہادتین کی جانب راجع ہوں اور ظاہرا اس کا معنی یہ ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ تکرار تاکید کے لئے ہو، اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی امت کی طرح اپنی نبوت کی گواہی کے مکلف تھے جیسا کہ میرک نے طیبی سے نقل کیا ہے اور پھر کہا ہے کہ اس میں تامل ہے۔ اہل علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ آپ علیہ السلام کی گواہی بھی ہماری طرح تھی یا وہ یوں کہتے تھے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں، جب کہ صحیح یہ ہے کہ ان کی گواہی بھی ہماری گواہی کی طرح تھی جیسا کہ امام مالک نے موطا میں نقل کیا ہے اور اس کی تائید مسلم شریف کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤذن کے جواب میں **واشهد ان محمدا رسول الله**...... فرمایا، پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح سنا ہے، تو ان دونوں روایات میں تطبیق یوں ہوگی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی یہ جملہ کہتے اور کبھی وہ جملہ، تا کہ امت کے لئے صحیح سنت ثابت ہو جائے اور ظاہر ہے کہ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے کیونکہ آپ علیہ السلام ہی نے تو فرمایا تھا کہ مؤذن جیسے جملے کہو اور تشبیہ ہمیشہ حقیقت لفظیہ پر محمول

ہوتی ہے، آپ علیہ السلام یوں بھی کہہ سکتے تھے: وانا اشھد ان لا الٰہ الا اللہ، وانا اشھد ان محمدا رسول اللہ" رواہ ابوداود" میرک فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ انہی کے ہیں اور اس روایت کو ابن حبان نے صحیح کہا ہے اور امام حاکم نے اس حدیث کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔

۶۷۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَاَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَذَّنَ ثِنْتَیْ عَشَرَۃَ سَنَۃً وَجَبَتْ لَہُ الْجَنَّۃُ وَ کُتِبَ لَہٗ بِتَأْذِیْنِہٖ فِیْ کُلِّ یَوْمٍ سِتُّوْنَ حَسَنَۃً وَلِکُلِّ اِقَامَۃٍ ثَلَاثُوْنَ حَسَنَۃً۔ (رواہ ابن ماجۃ)

أخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/ ۲۴۱ حدیث رقم ۷۲۸۔ وأخرجه الدارقطنی فی السنن ۱/ ۲۴۰ حدیث رقم ۲۳ من باب ذکر الاقامة واختلاف الروايات فيها من كتاب الصلاة۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا" جو آدمی بارہ سال تک اذان دے اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے اور اس کی اذان کے بدلے میں ہر روز ساٹھ نیکیاں اور ہر اقامت کے بدلے میں تیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔"

تشریح: "وعن ابن عمر ان رسول اللہ ﷺ قال من اذن ثنتی عشرۃ" شین کے سکون اور کسرہ کے ساتھ "ستۃ" ہو سکتا ہے کہ یہ مقدار اس زمانے میں مشروعیت اذان کے حساب سے ہو "وجبت لہ الجنۃ" یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور اس کی رحمت کا مصداق ہے "وکتب لہ بتأذینہ" یعنی صرف اذان کی وجہ سے نہ کہ نماز کو ساتھ ملا کر "فی کل یوم" یعنی ہر اذان کی وجہ سے جیسا کہ اگلا قرینہ اس پر دال ہے یا پھر اس سے مراد اقامت ہے "ستون حسنۃ" یہاں پر یا تو کچھ محذوف ہے یا پھر اصل عبارت یوں ہے: کتب لہ بسبب تاذینہ کل مرۃ فی کل یوم، شرح السنۃ سے میرک نے یوں ہی نقل کیا ہے اور اس کے تحت میں لکھا ہے کہ اس میں تامل ہے لیکن ہمیں اس کی وجہ نہیں مل سکی "ولکل اقامۃ" یعنی ہر روز "ثلاثون حسنۃ" اس کی وجہ التصنیف فی التضعیف ہو سکتی ہے کہ اقامت صرف حاضرین کے ساتھ مختص ہوتی ہے جب کہ اذان عام ہے، یا پھر اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اقامت میں آسانی ہے اور اذان میں بلند جگہ پر چڑھنے اور آواز کو بلند کرنے کی مشقت ہے اور اجر ہمیشہ مشقت کے بقدر ہی ملتا ہے اور اس کی وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اذان کے الفاظ زیادہ اور اقامت کے کم ہوتے جیسا کہ کچھ لوگوں کا مذہب ہے۔ واللہ اعلم۔ باقی رہا علامہ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ ظاہر ہے کہ ساٹھ نیکیوں کا ثواب ہر اذان کی وجہ سے اور تیس نیکیوں کا ثواب ہر اقامت کی وجہ سے اس مدت کے ساتھ خاص ہے (یعنی بارہ سال کی مدت جو حدیث میں مذکور ہے) اگر ان بارہ سالوں کے علاوہ اذان دے گا تو اس کو یہ ثواب نہیں ملے گا تو یہ ان کا خیال غیر ظاہر ہے کیونکہ شرط کی جزاء وجبت کے جملے پر پوری ہو گئی ہے۔ یہاں کتبت کا معنی اثبت یعنی اس کی اذان و اقامت کے ساتھ اس کے لئے ثابت ہو جاتا ہے، کیونکہ اصل ثواب کے حصول میں مداومت اور عدمِ مداومت کا کوئی فرق نہیں۔ پھر یہ ثواب کلماتِ اذان و اقامت کے ثواب کے علاوہ ہے کیونکہ وہ ثواب تو ہر اس شخص کو ملے گا جو کہے یا سن کر اس کا جواب دے گا' لہٰذا اس صورت میں مؤذن کی کوئی خصوصیت بنتی نہیں" رواہ ابن ماجۃ" اسے دارقطنی اور حاکم نے بھی نقل کیا ہے اور حاکم نے کہا ہے کہ یہ روایت صحیح اور بخاری کی شرائط پر ہے، یہ بات میرک نے امام منذری سے نقل کی ہے۔

۶۷۹: وَعَنْهُ قَالَ كُنَّا نُؤْمَرُ بِالدُّعَاءِ عِنْدَاذَانِ الْمَغْرِبِ۔ (رواه البيهقي فِي الدَّعوَاتِ الْكَبِيْرِ)

شعب الایمان فی المشکاۃ سماہ باب تاخیر الاذان والمصابیح سماہ فصل۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں مغرب کی اذان کے وقت دعا مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔''

تشریح: ''وعنہ'' یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ''قال کنا نؤمر بالدعاء عند اذان المغرب'' امام طیبی فرماتے ہیں کہ شاید یہ دعا وہی ہو جو حدیث ام سلمہ میں بیان ہوئی ہے ''رواہ البیھقي فی الدعوات الکبیر'' اور اسی طرح امام طبرانی نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

فائدہ: امام نووی رحمہ اللہ نے اس بات پر یقین کا اظہار کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں ایک بار اذان دی ہے اور استدلال ترمذی شریف کی روایت سے کیا ہے اور اس کا رد یہ ہے کہ امام احمد بن المسند میں ترمذی کے واسطے سے روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے: فامر بلال فاذن کہ بلال کو حکم دیا گیا تو انہوں نے اذان دی، اس سے معلوم ہوا کہ ترمذی کی روایت میں اختصار ہے اگرچہ یہاں اذن فیھا امر بلالا بالاذان کا معنی ایسے ہی جیسے کہا جاتا ہے: کبنی الأمیر المدینۃ، امام دارقطنی نے یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے فامر بلالا فاذن کہ بلال کو حکم دیا تو انہوں نے اذان دی، امام سہیلی فرماتے ہیں کہ مجمل محتمل مفصل پر محمول ہوتا ہے یعنی اگر مجمل میں کچھ احتمالات ہوں تو مفصل سے اس کا کوئی ایک احتمال متعین ہو جاتا ہے۔

بَابٌ

رفع کے ساتھ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور اصل عبارت یہ ہے کہ ھو ھذا۔ ایک قول کے مطابق وقف کی وجہ سے ساکن ہے۔ مصابیح میں ہے کہ یہ اس کا بدل فصل ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس فصل کو الگ سے بیان اس وجہ سے کیا کہ اس کے تمام احادیث صحیح تو ہیں لیکن سابقہ باب کے صحاح کے مناسب نہیں۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ باب سابقہ دونوں ابواب کا تتمہ ہے۔

الفصل الاول:

وقت سے پہلے اذان دینے کا بیان

۶۸۰: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ بِلَالاً يُنَادِیْ بِلَيْلٍ فَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يُنَادِیَ ابْنُ اُمِّ مَكْتُوْمٍ قَالَ وَكَانَ ابْنُ اُمِّ مَكْتُوْمٍ رَجُلٌ اَعْمٰى لَا يُنَادِیْ حَتّٰى يُقَالَ لَهٗ اَصْبَحْتَ اَصْبَحْتَ . (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ۹۹/۲ حديث رقم ۶۱۷۔ وأخرجه مسلم في صحيحه ۷۶۸/۲ حديث رقم

(٣٦-١٠٩٢) وأخرجه النسائي في السنن ١٠/٢حديث رقم ٦٣٧ـوأخرجه مالك في الموطأ ٧٤/١حديث رقم ١٥من كتاب الصلاة وأخرجه أحمد في المسند ٦٢/٢ـ

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا حضرت بلالؓ رات کے وقت اذان دیتے ہیں پس تم کھاؤ اور پیئو۔ یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم اذان دیدیں اور حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نابینا آدمی تھے۔ جب تک ان سے کوئی یہ نہ کہتا تھا کہ تم نے صبح کردی ہے۔ صبح کردی ہے وہ اذان نہ کہتے تھے۔''

(بخاری ومسلم)

تشریح: ''**عن ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ ان بلالا ينادى**'' ینادیٰ یذکر کے معنی میں ہے، ابن الملک فرماتے ہیں کہ یؤذن کے معنی میں ہے۔ ''**بليل**'' یعنی تہجد یا سحری کے لئے، کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فجر سے قبل اذان دینے سے منع فرمایا، اگرچہ اس روایت کے ضعف کا قول بھی موجود ہے ''**فكلوا واشربوا حتى ينادى ابن ام مكتوم**'' ان کا نام عبداللہ بن قیس ہے اور یہ طلوعِ فجر صادق کے بعد اذان دیتے تھے جیسا کہ ابن الملک کا قول ہے ''**قال**'' یعنی ابن عمر ''**وكان ابن ام مكتوم رجلا اعمى، لاينادى**'' یعنی اذان نہیں دیتے تھے صبح کے لئے ''**حتى يقال له اصبحت اصبحت**'' یہ تکرار تاکیداً ہے یعنی وقت داخل ہوگیا یا صبح ہونے کو ہے یعنی جب اہل معرفت کے ہاں صبح کا وقوع یقینی ہوجاتا ''**متفق عليه**'' بقولِ میرک اس روایت کو امام ترمذی اور امام نسائی نے بھی نقل کیا ہے۔ یہ روایت اس روایت کے منافی نہیں جس میں فرمایا کہ ابن ام مکتومؓ رات کو اذان دیتے ہیں اس لئے کھاتے پیتے رہو تا آنکہ بلال اذان دیں، کیونکہ اگر اس روایت کو درست مان بھی لیا جائے تو یہ باری پر محمول ہوگی جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک اذان دوسری اذان کی تقریر ہو اور وقت ان دونوں کے مابین تقسیم شدہ ہو۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ابن ام مکتوم اذان اس وقت دیتے تھے جب ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ صبح ہوگئی ہے'اس سے معلوم ہوا کہ ان کی اذان فجر کے بعد ہوتی تھی جب کہ دوسری روایت کے مطابق کہ جب ابن ام مکتوم اذان دیں تو کھاتے پیتے رہو'اس سے معلوم ہوا کہ ان کی اذان فجر سے کچھ دیر قبل یا فجر کے ساتھ ہی ہوتی تھی تو اس اشکال کا دفعیہ یہ ہے کہ ان دونوں میں احتمال کی وجہ سے یہ بات تو متعین ہوگئی کہ ان میں تاویل کی ضرورت ہے، اسی وجہ سے ہمارے اصحاب فرماتے ہیں کہ اذان ثانی میں مسنون یہ ہے کہ وہ فجر کے بعد ہو اور اس کی وجہ پیچھے ذکر کی گئی خبر ہے کہ ان دونوں کی اذانوں کے درمیان صرف اتنا فرق ہوتا تھا کہ ایک اذان دیکر اترتے تھے تو دوسرے اذان کے لئے چڑھ جاتے تھے۔ ہمارے علماء اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ بلال فجر سے قبل اذان دیتے تھے اور کچھ دیر دعا وغیرہ کے لئے رک جاتے تھے، پھر طلوعِ فجر کا انتظار کرتے رہتے تھے جب فجر طلوع ہونے لگتی تھی تو اتر آتے تھے اور آکر ابن ام مکتوم کو بتادیتے تھے، پھر ابن ام مکتوم جلدی چڑھ جاتے اور طلوع فجر کے آغاز میں ہی اذان دے دیتے تھے۔ الشمنی میں امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا قول مذکور ہے کہ صرف فجر کی اذان فجر کا وقت داخل ہونے سے قبل رات کو ہی دی جاسکتی ہے کیونکہ صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ بلال رات کو اذان دیتے ہیں لہٰذا تم کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ تم ابن ام مکتوم کی اذان سن لو۔ ہماری دلیل مسلم شریف کی وہ روایت ہے جو حضرت

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی اذان سنتے تو دو رکعت ادا کرتے اور اس پر مداومت تھی، وجہ استدلال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اذانِ اول کو کافی نہ سمجھتے تھے اور ایک وہ روایت بھی ہے جو کہ امام طحاوی اور امام بیہقی نے عبدالکریم الجزری سے انہوں نے نافع سے انہوں نے حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی اذان سنتے تو اُٹھ جاتے اور فجر کی دو رکعتیں ادا کرتے، پھر مسجد کی جانب نکل جاتے اور کھانے کو حرام قرار دے دیتے اور اذان نہیں دی جاتی تھی مگر جب صبح ہو جاتی تھی، اور عبدالکریم الجزری کے بارے میں ابن معین اور ابن المدینی کا قول ہے کہ وہ ثقہ ہیں اور امام ثوری فرماتے ہیں کہ میں نے ان جیسا کوئی راوی نہیں دیکھا۔

۶۸۱: وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَمْنَعَنَّكُمْ مِنْ سُحُوْرِكُمْ اَذَانُ بِلَالٍ وَلَا الْفَجْرُ الْمُسْتَطِيْلُ وَلٰكِنَّ الْفَجْرَ الْمُسْتَطِيْرَ فِي الْاُفُقِ. (رواہ مسلم ولفظه للترمذی)

أخرجه بمعناه مسلم فی صحیحه ۲/ ۷۷۰ حدیث رقم (۴۳۔۱۰۹۴) وکذلك أبوداوٗد فی السنن ۲/ ۷۵۹ حدیث رقم ۲۳۴۶۔ وأخرجه الترمذی فی السنن ۳/ ۸۶ حدیث رقم ۷۰۶ واللفظ له۔

ترجمہ: ''حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلال کی اذان تمہیں تمہاری سحری کھانے سے نہ روکے اور نہ فجر کاذب البتہ افق پر پھیلی ہوئی فجر نمودار ہو جائے تو کھانا پینا بند کر دو اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے اور الفاظ امام ترمذیؒ کے ہے۔''

تشریح: ''وعن سمرة بن جندب'' ضمہ کے ساتھ اور دوسرے کے فتحہ کے ساتھ ''قال قال رسول الله لا یمنعنکم'' تاکید کے ساتھ، اصل صحیح میں لا یمنعکم نفی یا نہی کے ساتھ ہے ''من سحور کم'' سین کے ضمہ کے ساتھ مصدر ہے، یعنی یہ تسحر کم کے معنی میں ہے، اگر اس پر فتحہ ہو تو یہ اسم ہوگا یعنی جو تم میں سے سحری کرے اور سحری وہ کھانا ہوتا ہے جو روزہ رکھنے کے لئے صبح کے وقت کھایا جاتا ہے۔ ''اذن بلال'' یعنی کیونکہ رات کو اذان دیتے ہیں جیسا کہ پیچھے گذر چکا ''ولا الفجر المستطیل'' یعنی تمہیں وہ صبح بھی نہ روکے جو کہ آسمان کی جانب چڑھتی ہے، اور عرب اسے ذنب السرحان کا نام دیتے ہیں اور اس کے طلوع ہونے کے ساتھ صبح داخل نہیں ہوتی۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ فجر کاذب ہے جو کہ آسمان کی طرف لمبائی کے طور پر طلوع ہوتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے اور اس کے غائب ہونے کے کچھ دیر بعد فجر صادق ظاہر ہوتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اسے یہاں بیان کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ اس کے بعد جو وقت ہوتا ہے وہ رات کا حصہ ہوتا ہے اور یہ کہ بلال کبھی کبھار اس کے بعد بھی اذان دے دیتے تھے حالانکہ ان کی اذان رات کو ہوا کرتی تھی۔

ظاہر ہے کہ جب باری تعالیٰ نے فرمایا: ''من الفجر'' تو مجمل تھا، اس کی تشریح نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی کہ اس سے مستطیر مراد ہے نہ کہ مستطیل ''ولکن'' تخفیف اور تشدید کے ساتھ ''الفجر'' رفع اور نصب کے ساتھ ''المستطیر'' یہ اس کی صفت ہے یعنی پھیلی ہوئی لمبی چوڑی ''فی الافق'' یعنی اطرافِ آسمان میں۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ یعنی وہ روشنی جو افق مشرقی میں پھیلی ہوئی ہو اور مسلسل اس کے روشنی میں اضافہ ہوتا جائے، یہاں کسی مانع کے نہ ہونے کے باوجود عشاء کی نماز کو ذکر نہ کرنا اس وجہ سے ہے کہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں سے امید ہے کہ اِس نماز کو اس وقت سے مؤخر نہیں کریں گے کیونکہ اس وقت کے

بعد یہ مکروہ ہے یا پھر اس وجہ سے کہ یہ حکم پہلے سے معلوم تھا" رواہ مسلم" یعنی اس کے ہم معنی روایت جیسا کہ میرک کا کہنا ہے اور اس روایت کو امام احمد نے بھی نقل کیا ہے:"**ولفظه للترمذی**" اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے جیسا کہ میرک نے نقل کیا ہے۔
حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انسب یہ ہے کہ اس روایت کو امام مسلم وترمذی نے نقل کیا ہے اور الفاظ امام ترمذی کے ہیں۔
میرا خیال ہے کہ اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ وہ یوں کہنا چاہتے ہیں کہ اس روایت کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور اسی کے ہم معنی روایت امام مسلم نے نقل کی ہے، جب کہ مصنف نے اس کو الٹا کر بیان کر دیا کیونکہ یہی فصل اول کے زیادہ مناسب تھا اور اعتراض بھی رفع دفع ہو گئے۔

سفر میں اذان کہنے کا مسئلہ

٦٨٢: وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا وَابْنُ عَمٍّ لِّيْ فَقَالَ اِذَا سَافَرْتُمَا فَاَذِّنَا وَاَقِيْمَا وَلْيَؤُمَّكُمَا اَكْبَرُكُمَا۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٢/١١٠حدیث رقم ٦٢٨۔ومسلم فی صحیحه ١/٤٦٥حدیث رقم (٢٩٢۔٦٧٤) وأخرجه الترمذی فی السنن بلفظه١/٣٩٩حدیث رقم ٢٠٥۔وأبو داؤد فی السنن ١/٣٩٥ حدیث رقم ٥٨٩،والنسائی فی السنن ٢/٩ حدیث رقم ٦٣٦۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ١/٣١٣حدیث رقم۔ وأخرجه أحمد فی المسند ٥/٥٣ كلهم بالفاظ متقاربة۔

ترجمہ: "حضرت مالک بن حویرث سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے چچا کا بیٹا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم سفر پر جاؤ تو اذان اور اقامت کہا کرو اور تم میں سے بڑا امامت کروائے اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔"

راویٔ حدیث:

مالک بن الحویرث۔ نام مالک حویرث کے بیٹے اور بنولیث کے شخص ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیس روز قیام پذیر رہے اور پھر بصرہ میں سکونت اختیار کر لی۔ ان سے ان کے صاحبزادے عبداللہ اور ابوقلابہ رضی اللہ عنہم وغیرہ نے روایت کی۔ ۹۴ھ میں بمقام بصرہ انتقال فرمایا۔

تشریح: "**قال اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا و ابن عم لی**" رفع کے ساتھ عطف ہے، اور اگر نصب ہو تو یہ مفعول معہ ہوگا "**فقال**" یعنی ہم سے فرمایا:"**اذا سافرتما فاذنا فاقیما**" یعنی فرض نماز کے لئے اور صحیح نسخہ کے مطابق یوں ہیں "**واقیما**" یعنی تم میں سے ایک اذان واقامت دے اور اگر تم برابر ہو تو اختیار بھی تمہیں ہی حاصل ہے "**ولیؤمکما اکبر کما**" یعنی بلحاظ عمر، کیونکہ ظاہر ہے کہ اس کا اسلام بھی مقدم ہوگا یا اس کا رتبہ عالی ہوگا کیونکہ غالب یہی ہے کہ وہ احکام کو بھی زیادہ جانتا ہوگا، بہرحال مراد تم دونوں میں سے افضل ہے، حافظ ابن حجر نے اسی پر اقتصار کیا ہے اور اس میں امامت کے افضل ہونے پر بھی اشارہ موجود ہے۔ امام ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اذان اکبر اور افضل کے ساتھ مختص نہیں

بخلاف امامت کے کیونکہ اس میں مستحب یہ ہے کہ امامت وہ شخص کروائے جو عمر یا رتبہ کے لحاظ سے افضل ہو۔ میرک نے ازھار سے نقل کیا ہے کہ امام داود نے آنحضرت ﷺ کے قول "فاذنا و اقیما" سے اذان و اقامت کے فرض عین ہونے پر استدلال کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ قول بالا جماع باطل ہونا چاہئے کیونکہ اگر یہ فرض عین ہوتے تو آنحضرت ﷺ اور تمام صحابہ کرام ہر نماز کے لئے اسے ادا کرتے، اور اگر انہوں نے ایسا کیا ہوتو یہ منقول بھی ہوتا۔ پھر فرمایا کہ امام احمد اور دیگر لوگوں نے آنحضرت ﷺ کے قول: **"فلیؤذن لکم احدکم"** اذان و اقامت کے فرض کفایہ ہونے پر استدلال کیا ہے یعنی اس بناء پر امر وجوب کے لئے ہے اور یہ ظاہر ہے۔ پھر فرمایا کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اکثر لوگوں کے ہاں یہ دونوں سنت ہیں جیسا کہ حدیث الاغارہ میں پیچھے گذر چکا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ظاہرا یہ حدیث اذان و اقامت کے فرض ہونے پر دلالت کرتی ہے نہ کہ سنت ہونے پر، کیونکہ یہ شعائر اسلام میں سے ہے اور ان کے چھوڑنے سے انتقام جواز نکلتا ہے۔ پھر فرمایا کہ حدیث مسیء میں نبی پاک ﷺ کا یہ قول کہ: **"اذا اردت الصلاة فاحسن الوضوء ثم استقبل القبلة و کبر"** تو اس میں اذان کا حکم نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ حدیث تمام شرائط کے عدم استیعاب کے باوجود ترکِ سترِ عورت کی طرح ابوداود کے خلاف حجت نہیں چہ جائیکہ امام احمد کے خلاف حجت ہو، کیونکہ بالا جماع اذان نہ تو شرائط میں سے ہے اور نہ ہی ارکان میں سے ہے، اسی لئے اگر کسی وجہ سے نماز کا اعادہ کیا جارہا ہوتو وہاں اذان کا اعادہ نہیں کیا جاتا جب کہ داود کے علاوہ دیگر لوگوں کے ہاں غیر کی اذان بھی کافی ہے۔ پھر فرمایا کہ اس کی ایک دلیل نبی پاک ﷺ کی یہ حدیث بھی ہے جس میں فرمایا: **"اذا کان احدکم بارض فلاة فدخل علیه وقت الصلاة فان صلی بلا اذان ولا اقامة صلی وحده وان صلی باقامة صلی معه ملك وان صلی باذان واقامة صلی خلفه صف من الملائکة اولهم بالمشرق وآخرهم بالمغرب"** کہ اگر تم میں سے کوئی ارضِ فلاۃ میں ہوتو اور وہاں نماز کا وقت ہو جائے تو اگر وہ اذان اور اقامت کے بغیر نماز پڑھے گا تو وہ اکیلا ہی نماز پڑھے گا، اگر صرف اقامت کے ساتھ پڑھے گا تو اس کے ساتھ ایک فرشتہ بھی نماز پڑھے گا اور اگر اذان اور اقامت دونوں کے ساتھ نماز پڑھے گا تو اس کے پیچھے فرشتوں کی صف نماز پڑھے گی جو کہ مشرق سے شروع ہوگی اور مغرب میں ختم ہوگی"۔ یہ روایت فقہاء نے ذکر کی ہے۔

ابن ہمام نے صاحب ہدایہ کے قول کہ اذان سنت ہے کے ذیل میں فرمایا ہے کہ یہ عام فقہاء کا قول ہے اور اقامت کے بارے میں بھی یہی قول ہے، ہمارے کچھ مشائخ کرام کے ہاں واجب ہے کیونکہ امام محمد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اگر کسی شہر کے تمام لوگ اسکے ترک پر متفق ہو جائیں تو ہم ان سے قتال کریں گے، میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں کہ ان سے قتال اس وجہ سے ہوگا کہ انہوں نے مجتمع ہو کر دین کے ایک شعار کو ہلکا سمجھ کر ترک کیا کیونکہ اذان شعائر دین میں سے ہے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو قید کیا جائے، کوڑے لگائے جائیں گے جب کہ ان سے قتال نہیں کیا جائے گا۔ بظاہر ایک وجہ سے ان دونوں کلاموں میں کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ قتال امتناع اور عدمِ قہر کے وقت ہوتا ہے جب کہ ضرب وحبس قہر کے وقت

ہوتی ہے، یعنی جب وہ لوگ اذان کا حکم ماننے سے منکر ہو جائیں تو ان سے قتال جائز ہے، پس جب قتال ہوگا تو لازمی سے بات ہے کہ مار دھاڑ بھی ہوگی اور قید بھی اور ہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا ایک بار بھی نہ چھوڑنا وجوب کی دلیل ہے، لہٰذا اس طرح اذان کو واجب ماننا چاہئے اور اس سے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ فرض کفایہ ہے ورنہ تو اگر کسی شہر کے لوگ بالا جماع اسے چھوڑ دیں تو وہ گنہگار نہ ہوں جب کہ کوئی اور اسے ادا کرتا رہے اور نہ انہیں مارا جائے اور نہ ہی قید کیا جائے۔

میں کہتا ہوں کہ اس سے مراد فرض کفایہ کا ظاہر نہ ہونا تمام شہروں کی جانب نسبت کرتے ہوئے ہے، ورنہ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ایک شہر میں ایک شخص اذان دے دے تو باقیوں سے وجوب ساقط ہو جاتا ہے، پھر فرمایا کہ الدرایہ میں علی بن الجعد نے امام ابوحنیفہ اور امام یوسف رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ اگر لوگ حضر میں ظہر اور عصر کی نماز کی نماز اذان اور اقامت کے بغیر ادا کرلیں تو انہوں نے سنت کو چھوڑ دیا اور وہ لوگ گنہگار رہوں گے، اس سے اگرچہ وجوب ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ہوسکتا ہے کہ یہ گناہ اس وقت ہو جب اذان اور اقامت دونوں کو چھوڑ دیا جائے اور واجب کا مطلب یہ ہوا کہ ان دونوں کا اکٹھا نہ چھوڑا جائے، لیکن ضروری ہے کہ اس قول کو اذان کے واجب ہونے پر محمول نہ کیا جائے کیونکہ اس کی دلیل پیچھے گذر چکی ہے۔ ''رواہ البخاری''

میرک فرماتے ہیں کہ اس روایت کو ایک جماعت نے نقل کیا ہے اور ان سب کے معنی قریب قریب ہیں اور کچھ لوگوں نے اس میں ایک قصہ بھی ذکر کیا ہے جیسا کہ شیخ جزری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔

۶۸۳: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ لَنَارَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ وَاِذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوةُ فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ اَحَدُكُمْ ثُمَّ لِيَؤُمَّكُمْ اَكْبَرُكُمْ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه٢/١١١حديث رقم ٦٣١۔وأخرجه الدارمي في السنن ١/٣١٨حديث رقم ١٢٥٣۔ وأخرجه أحمد في المسند ٥/٥٣مع تقديم وتاخير۔

ترجمہ: حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فرمایا کہ تم مجھے جس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو اسی طرح تم بھی نماز پڑھا کرو جب نماز کا وقت ہو جائے تم میں سے کوئی اذان دیدیا کرے اور جو بڑا ہو وہ نماز پڑھا دیا کرے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ''وعنه'' یعنی مالک سے روایت ہے کہ **''قال قال لنا رسول الله ﷺ صلوا کما رأیتمونی اصلی''** یعنی شرائط، ارکان یا ان میں سے جو اعم ہے اس کا خیال رکھتے ہوئے **''واذا حضرت الصلاۃ''** یعنی اس کا وقت **''فلیؤذن لکم احدکم ثم لیؤمکم''** لام کے سکون اور کسرہ کے ساتھ ''اکبر کم'' علم اور عمر کے لحاظ سے، یہاں علم سے مراد نماز اور اس کے متعلقہ احکام کا علم ہے اور عمر سے مراد اسلام کی عمر ہے کیونکہ جس نے اسلام میں لمبا عرصہ گذارا ہوگا اس کے پاس احکامات کا علم بھی زیادہ ہوگا، یہ روایت امامت کے افضلیت پر دلالت کرنے والی روایات میں سب سے ظاہر روایت ہونے کے ساتھ ساتھ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے منازعہ کے خلاف بھی ہے۔ ''متفق علیہ'' سید صاحب فرماتے ہیں کہ امام مسلم نے **''صلوا کما رأیتمونی اصلی''** کا ذکر نہیں کیا۔ مصنف کا متفق علیہ کہنا محل بحث ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے غالب، محل شاہد اس سے متعلقہ حکم پر محمول کیا جائے گا اور اسی پر اس کے وجوب اور مستحب ہونے کا فیصلہ بھی ہوگا۔ واللہ اعلم۔

اگر فجر کی نماز قضاء ہو جائے تو کس طرح پڑھی جائے

۶۸۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ حِیْنَ قَفَلَ مِنْ غَزْوَةِ خَیْبَرَ سَارَ لَیْلَةً حَتّٰی اِذَا اَدْرَكَهُ الْكَرٰی عَرَّسَ وَقَالَ لِبِلَالٍ اِكْلَاْ لَنَا اللَّیْلَ فَصَلّٰی بِلَالٌ مَا قُدِّرَلَهٗ وَنَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَاَصْحَابُهٗ فَلَمَّا تَقَارَبَ الْفَجْرُ اِسْتَنَدَ بِلَالٌ اِلٰی رَاحِلَتِهٖ مُوْجِهَ الْفَجْرِ فَغَلَبَتْ بِلَالًا عَیْنَاهُ وَهُوَ مُسْتَنِدٌ اِلٰی رَاحِلَتِهٖ فَلَمْ یَسْتَیْقِظْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَلَا بِلَالٌ وَلَا اَحَدٌ مِّنْ اَصْحَابِهٖ حَتّٰی ضَرَبَتْهُمُ الشَّمْسُ فَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَوَّلَهُمْ اِسْتِیْقَاظًا فَفَزِعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ اَیْ بَلَالٌ فَقَالَ بِلَالٌ اَخَذَ بِنَفْسِی الَّذِیْ اَخَذَ بِنَفْسِكَ قَالَ اقْتَادُوْا فَاقْتَادُوْا رَوَاحِلَهُمْ شَیْئًا ثُمَّ تَوَضَّأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَاَمَرَ بِلَالًا وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ فَصَلّٰی بِهِمُ الصُّبْحَ فَلَمَّا قَضَی الصَّلَاةَ قَالَ مَنْ نَسِیَ الصَّلَاةَ فَلْیُصَلِّهَا اِذَا ذَكَرَهَا فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ وَاَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِیْ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ۱/۴۷۱ حديث رقم (۳۰۹۔۶۸۰) وأخرج النسائی آخره فی السنن ۱/۲۹۵ حديث رقم ۶۱۸۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۲۲۷ حديث رقم ۶۹۷۔ وقد مرنحوه عن أبی قتادة حديث رقم (۶۰۴)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب غزوہ خیبر سے واپس لوٹے رات بھر سفر کرتے رہے یہاں تک کہ آپ پر غنودگی طاری ہونے لگی تو آپ آرام کرنے کے لیے آخری رات ایک جگہ میں اترے اور حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ تم ہماری چوکیداری کرتے رہنا یہ فرما کر اور صحابہ کرام سو گئے حضرت بلالؓ سے جس قدر نفل نماز ہو سکی پڑھی جب صبح صادق قریب ہوئی تو حضرت بلالؓ اپنے کجاوہ کے ساتھ تکیہ لگا کر جدھر سے مشرق طلوع ہوتی ہے اس طرف رخ کر کے بیٹھ گئے اور حضرت بلالؓ کجاوہ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے کہ وہ بھی سو گئے رسول اللہ ﷺ حضرت بلالؓ اور صحابہؓ میں سے کوئی بھی بیدار نہ ہوا یہاں تک کہ جب ان پر دھوپ آ گئی تو اس کی گرمی کی وجہ سے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ بیدار ہوئے اور آپ نے گھبرا کر فرمایا بلالؓ یہ کیا ہوا حضرت بلال نے عرض کیا کہ مجھے بھی اسی چیز نے پکڑ لیا جس نے آپ کو پکڑ لیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہاں سے روانہ ہو جاؤ چنانچہ لوگ اپنی سواریاں لے کر تھوڑی دور تک چلے گئے پھر حضور ﷺ نے وضو کیا اور حضرت بلالؓ کو اقامت کہنے کا حکم دیا چنانچہ انہوں نے نماز کے لیے اقامت کہی اور رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ کو صبح کی نماز پڑھائی جب آپ نماز سے فارغ ہو گئے تو فرمایا جو آدمی نماز پڑھنا بھول جائے تو جب نماز یاد آتی ہے تو فوراً اسے پڑھ لے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِیْ ''کہ میری یاد کے وقت نماز پڑھ لو''۔ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''وعن ابی هريرة قال ان رسول الله ﷺ حين قفل'' یعنی مدینہ واپس تشریف لائے، اسی وجہ سے گاڑی کو قافلہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے واپس مڑنا ہی ہوتا ہے ''من غزوة خيبر'' محرم سات ہجری میں، آنحضرت ﷺ نے وہاں دس سے زائد راتیں قیام کر کے کفار کا محاصرہ کیا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی اور خیبر مدینہ سے تین ابراد کے

فاصلہ پر واقع ہے''سار لیلة حتی اذا ادرکه الکری'' دونوں کے فتحہ کے ساتھ اور اس سے مراد اونگھ ہے، ایک قول کے مطابق اس سے مراد نیند ہے''عرس'' یہ تعریس سے ماخوذ ہے یعنی شب کے آخری پہر میں کچھ دیر آرام کے لئے پڑاؤ ڈالا'' وقال لبلال: اکلأ'' یعنی حفاظت اور چوکیداری کے فرائض سرانجام دو''لنا اللیل'' یعنی رات کے آخر تک تاکہ ہم صبح کو جاگ جائیں ''فصلی بلال ما قدرله'' یعنی انہوں نے نماز اور چوکیداری کی عبادت کو جمع کر دیا، یا پھر انہوں نے تہجد ادا کی'' ونام رسول الله ﷺ و اصحابه'' ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ نام کی ضمیر مرفوع متصل پر عطف ہے اور ایک نسخہ میں عبارت یوں ہے ''نام ونام اصحابه الخ'' اور یہ اعراب مصابیح کے الفاظ کے لحاظ سے ہے کیونکہ اس کے الفاظ یوں ہیں'' ونام اصحابه'' باقی رہی مشکوۃ شریف کی عبارت تو اس میں یہ رسول اللہ ﷺ پر عطف ہے اور مفعول معہ ہونے کی بناء پر اس پر نصب بھی جائز ہے''فلما تقارب الفجر استند بلال الی راحلته'' کیونکہ بے خوابی اور جگراتا اور کثرت صلاۃ کی تھکن غالب آ گئی تھی ''موجه الفجر'' یعنی تاکہ وہ دیکھتے رہیں کہ جب صبح ہو جائے تو وہ دیگر لوگوں کو بھی جگا سکیں اور موجہ جیم کے کسرہ کے ساتھ کیونکہ یہ فعل لازم ہے، اسی وجہ سے امام طیبی رحمہ اللہ نے اس کی تشریح ''متوجہ الفجر'' سے کی ہے یعنی جائے فجر۔ ایک نسخہ میں جیم کے فتحہ کے ساتھ ہے جب کہ اس کو فعلِ متعدی مانا جائے اور موجہ سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں۔''فغلبت بلالا عیناہ'' امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ نیند سے عبارت ہے، گویا کہ بلال کی آنکھیں بلال پر غالب آ کر نیند پر غالب آ گئیں، حاصل یہ ہے کہ وہ بلا اختیار سو گئے''وھو مستند الی راحلته'' یہ جملہ حالیہ ہے جو اس بات کا فائدہ دے رہا ہے کہ غلبہ نیند کی وجہ سے چت نہ لیٹ سکے۔''فلم یستیقظ رسول الله ﷺ ولا بلال ولا احد من اصحابه حتی ضربتهم الشمس'' یعنی سورج کی تپش ان تک آ پہنچی''فکان رسول الله ﷺ اولھم استیقاظا'' امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے دیگر لوگوں سے پہلے جاگنے میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ پاکیزہ نفوس پر اگر کسی وقت کوئی بشری تقاضا غالب بھی آ جائے تو پھر بھی ان سے جلد زائل ہونے کے امکانات ہوتے ہیں اور جو جتنا زیادہ پاکیزہ ہوگا اس سے اتنی ہی جلدی وہ تقاضا اور رکاوٹ جاتی رہے گی۔''ففزع رسول الله ﷺ'' یعنی بیداری سے کیونکہ ان کی فجر کی نماز جو فوت ہو گئی تھی۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یعنی آپ ﷺ کو انتباہ ہو گیا گویا یہ انتباہ گھبراہٹ اور خوف کا تھا کیونکہ جو کہ متنبہ ہوتا ہے لازماً وہ کسی نہ کسی گھبراہٹ میں ہوتا ہے''فقال: ای بلال'' یہاں عتاب یا تو محذوف ہے یا مقدر، یعنی تم کیوں سوئے؟ ہماری نماز فوت ہو گئی''فقال بلال'' یعنی عذر خواہی کرتے ہوئے''اخذ نفسی الذی اخذ بنفسك'' یعنی جس طرح نیند میں آپ فوت ہو گئے تھے اسی طرح میں بھی فوت ہو گیا تھا، یہ بات میرک نے امام طیبی سے نقل کی ہے اور فرمایا کہ اس میں تامل یا نظر ہے اور ظاہر یہ ہے کہ اس کا معنی یوں کیا جائے کہ مجھ پر بھی وہ نیند غالب آ گئی تھی جو آپ پر آ گئی تھی، یعنی میری نیند اضطراری تھی' اختیاری نہ تھی تاکہ یہ عذر درست ہو جائے، یہاں تقدیر کا کوئی جھگڑا نہیں جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے۔ امام طیبی رحمہ اللہ کے کلام میں باری تعالیٰ کے فرمان: ﴿اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا﴾ [الزمر: ٤٢] ''خدا لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں انکی روحیں سوتے میں (قبض کر لیتا ہے)'' کی جانب اشارہ ہے۔''اقتادو'' یہ اقتیاد سے امر ہے، یوں کہا جاتا ہے: قاد البعیر واقتادہ، یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کہ اونٹ کی رسّی کو کھینچا جائے۔ مراد یہ

ہے کہ یہاں سے اپنی سواریوں کو چلتا کرو''فاقتادوا'' ماضی کا صیغہ بمعنی ساقوا یعنی وہ لے چلے''رواحلھم شیئا'' کچھ وقت یا کچھ دور۔یعنی آپ ﷺ نے فرمایا اپنی سواریاں لے چلوتو صحابہ کرام وہاں سے کچھ مسافت تک اپنی سواریاں لے گئے۔باقی رہی یہ بات کہ آپ ﷺ نے اُسی جگہ فجر کی نماز کیوں نہ قضا کی تو وہ اس وجہ سے کہ وہ ایسی جگہ تھی جہاں شیطان غالب تھا یا پھر اس کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہاں شیطان رہتا تھا جیسا کہ ایک روایت میں یوں فرمایا کہ ہمیں اس وادی سے لے چلو کیونکہ یہاں شیطان ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے قضاء کو مؤخر اس وجہ سے کیا تا کہ مکروہ وقت نکل جائے، چنانچہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جولوگ ممنوع اوقات میں فوت شدہ نماز کو قضا کرنے کے قائل ہیں اور ان کثرت ہے تو ایسے لوگوں کا کہنا ہے کہ اس جگہ سے کوچ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس جگہ کی وجہ سے انہیں اس غفلت کا سامنا کرنا پڑا۔ نبی پاک ﷺ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا اپنے ان مقامات سے کوچ کرو جہاں سے تمہیں غفلت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ایک روایت میں ہے کہ تم میں سے ہر ایک اپنی سواری کا سر (لگام) پکڑے کیوں جس جگہ ہم حاضر ہوئے ہیں وہاں شیطان ہے، امام ابن الملک نے ایسا ہی ذکر کیا ہے اور شرح السنۃ میں بھی ایسا ہی ہے۔

پھر امام طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ اگر بطور اعتراض کے یوں کہا جائے کہ یہ ذہول (سستی) آپ ﷺ سے کیسے صادر ہوگئی اور نماز کے وقت میں کیوں سوئے رہے حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے پوچھا تھا کہ کیا آپ ﷺ وتروں سے قبل سو رہے ہیں تو آپ علیہ السلام نے جواب دیا تھا کہ میری آنکھیں سو جاتی ہیں مگر میرا دل نہیں سوتا؟ تو اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ اس میں دو وجہیں ہیں، ان میں سے صحیح وجہ تو یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی منافات نہیں، کیونکہ دل باطنی امور کا ادراک کرتا ہے جیسا کہ لذت اور درد وغیرہ، جب کہ وہ حسیات کا ادراک نہیں کرتا جیسے فجر کا طلوع ہونا وغیرہ، یہ باتیں آنکھ سے ادراک کی جاتی ہیں، تو اس صورت میں یہ ہے کہ آپ علیہ السلام کی آنکھیں سو رہی تھیں جب کہ دل جاگ رہا تھا۔دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ علیہ السلام کی دو حالتیں تھیں، ایک حالت یہ تھی کہ کبھی کبھار آپ علیہ السلام کا دل مبارک سو جاتا تھا اور ایسا شاذ و نادر ہوتا تھا اور دوسری حالت یہ تھی کہ دل نہیں سوتا تھا جب کہ اس موقعہ پر دل پر نیند غالب آگئی تھی، لیکن یہ توجیہہ ضعیف ہے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شارح کی یہ بات غیر معقول ہے۔

سید صاحب نے امام طیبی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ میں کہتا ہوں کہ دوسری توجیہہ اولیٰ ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ چت لیٹے اور سو گئے یہاں تک کہ خراٹے لینے لگے، چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی، تو آپ ﷺ نے وضو نہیں کیا اور نماز پڑھائی اور اس کی تعلیل نبی پاک ﷺ کے اس فرمان سے کی ہے کہ میری آنکھیں سوتی ہیں اور میرا دل نہیں سوتا۔میں کہتا ہوں کہ امام طیبی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس قصہ میں وضو کیا تو یہ اس بات کی دلیل ہوئی کہ نبی پاک ﷺ کی نیند کبھی کبھار ناقض ہوتی تھی، جب کہ کبھی ناقض للوضوء نہیں ہوتی تھی، اور یہ مختلف احوال پر محمول ہے۔جب کہ اس میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ آپ علیہ السلام کا وضوء تجدید کے لئے تھا یا پھر یہاں ناقض للوضوء کوئی اور چیز تھی اور جہاں احتمالات آجائیں وہاں استدلالات جاتے رہتے ہیں۔واللہ اعلم بالحال۔

پھر امام طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث کی تاویل یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ یہ نسیان سنت بتانے کے لئے تھا یعنی آپ

ﷺ کی نینداور ظاہری اطاعت سے ذہول میں حکمت یہ تھی تا کہ امت دلیل فعلی جو کہ دلیل قولی سے اقویٰ ہوتی ہے' سے نماز کی قضاء کا حکم جان لے۔ باقی رہا کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ آپ ﷺ کا دل جاگ رہا تھا اور آپ ﷺ کو وقت کے نکلنے کا علم تھا لیکن شریعت کی کسی مصلحت کے پیش نظر آپ علیہ السلام نے خاموشی اختیار کی تو یہ قول مردود اور باطل ہے۔

"ثم توضا رسول الله ﷺ وامر بلالا فاقام الصلاة" یعنی انہوں نے نماز کے لئے اقامت کہی۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہاں اذان اس وجہ سے نہیں دی کہ لوگ موجود تھے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات ہمارے مذہب کے خلاف ہے کہ اگر لوگ موجود ہوں تب بھی اقامت کہنا اولیٰ ہے، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اسے بیانِ جواز پر محمول کیا جائے، جب کہ یہاں اذان کی نفی پر کوئی دلیل بھی موجود نہیں ہے۔ جب کہ فصل ثالث کے آغاز میں آگے ایک حدیث آئے گی کہ آپ ﷺ نے اذان اور اقامت دونوں کو جمع کیا، مطلب یہ ہوا کہ حضرت بلال نے اذان کے بعد اقامت کہی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ فوت شدہ نماز کے لئے اذان نہیں دی جاتی جیسا کہ قولِ جدید کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے، لیکن اہل شوافع کے مختار امام شافعی رحمہ اللہ کا قدیم مذہب ہے کہ قضاء نماز کے لئے اذان دی جائیگی جیسا کہ اس سلسلہ میں صحیحین کی روایت موجود ہے کہ پھر بلالؓ نے نماز کے لئے اذان دی پھر رسول اللہ ﷺ نے دو رکعت ادا کیں، پھر فجر کی نماز ادا کی اور اسی طرح کیا جس طرح کہ روزانہ کیا جاتا تھا اور اس کی دوسری دلیل یہ بھی کہ آپ ﷺ نے پہلے دو رکعتیں ادا کیں، کیونکہ اقامت اور فرض نماز وں کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہوتا، اور راوی کا قول "کما کان ......" جب کہ ابوداود کی روایت میں عمرو بن امیہ اور عمران بن حصین سے منقول ہے کہ یہاں اذان اور اقامت دونوں کو جمع کیا گیا، اس سے یہ احتمال بھی جاتا رہا کہ یہاں اقامت سے مراد اذان ہے، چنانچہ مسلم کا اس پر اقتصار کرنا اقتصار ہے اور ایک خبر میں ہے کہ خندق کے دن جب آنحضرت ﷺ کو نمازوں سے روک لیا گیا تو آپ علیہ السلام نے بلال کو حکم دیا تو انہوں تمام فوت شدہ نمازوں کے لئے اقامت کہی، یہ حدیث مذکورہ حدیث کے معارض نہیں، کیونکہ یہ روایت اس روایت سے زیادہ صحیح اور متاخر ہونے کے ساتھ ساتھ اس روایت میں اضافہ بھی ہے، کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے خندق کی لڑائی میں بلال کو حکم دیا تو انہوں نے اذان دی اور پھر اقامت کہی، اور یہ کہ اس روایت کا منقطع ہونا بھی کوئی مضر نہیں کیونکہ منقطع روایت تقویت کی صلاحیت رکھتی ہے۔

خندق کی فوت شدہ نمازوں کے بارے میں مذکور دونوں روایتوں کو جمع بھی کیا جا سکتا ہے کہ اذان اور اقامت کو پہلی فوت شدہ نمازوں میں جمع کیا گیا تھا اور باقی نمازوں میں صرف اقامت پر اقتصار کیا گیا تھا جیسا کہ ہمارے علماء نے ذکر کیا ہے۔

"فصلی بهم الصبح" یعنی بطور قضاء کے "فلما قضی الصلاة" یعنی نماز سے فارغ ہو گئے تو "قال من نسی الصلاة" نسیان کے معنی میں نیند بھی آتی ہے، یا پھر یہ مراد ہے کہ جس نے نیند میں یا بھولے سے نماز چھوڑ دی، اسی لئے ایک روایت "او نام عنها" کے الفاظ کو ملا لیا گیا ہے اور یہی یہاں مناسب ہے "فلیصلها اذا ذکرها" کیونکہ تاخیر میں آفات ہیں، اس حدیث کا ظاہر قضاء اور اداء نمازوں میں ترتیب پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ ہمارے علماء کا کہنا ہے: "فان الله تعالیٰ قال: واقم الصلاة لذکری" ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ اضافۃ المصدر الی المفعول کے قبیل سے ہے اور لام بمعنی وقت ہے یعنی بھول کے بعد جب میری نماز یاد آئے۔ (مسلم)

۶۸۵: وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا تَقُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوْنِىْ قَدْ خَرَجْتُ. (متفق علیه)

أخرجه البخاري فی الصحيح ۲/۱۱۹خديث رقم ۶۳۷ولم يذكر قدخرجت۔وأخرجه مسلم فی صحيحه ۱/۴۲۲ط حديث رقم (۱۵۶۔۶۰۴)۔ وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۳۶۸حديث رقم ۵۳۹۔وأخرجه الترمذی تعليقًا فی السنن ۲/۳۹۵بعد حديث رقم ۵۱۷۔وأخرجه النسائی فی السنن ۲/۸۱حديث رقم ۷۹۰۔وأخرجه الدارمی فی السنن ۱/۳۲۲۔حديث رقم ۱۲۶۱۔وأخرجه أحمد فی المسند ۵/۲۹۶۔

ترجمه: ''حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب نماز کے لیے اقامت کہی جائے تو جب تک مجھے حجرہ سے نکلتا ہوا نہ دیکھو نماز کے لیے کھڑے نہ ہو جاؤ۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: ''**وعن ابی قتادة قال قال رسول الله ﷺ اذا اقیمت الصلاة**'' یعنی جب مؤذن نماز کے لئے اقامت کہے، یہ سبب' مسبّب کے قائم مقام ہے ''**فلاتقوموا حتی ترونی قد خرجت**'' یعنی حجرہ مبارکہ سے۔ شرح السنۃ میں ہے کہ یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ امام کے باہر نکلنے سے قبل اقامت کہنا جائز ہے: **نقله الطیبی و ابن الملك**۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں آپ ﷺ کے باہر آنے کی کوئی علامت وغیرہ بھی مراد ہوسکتی ہے جیسا کہ دروازے کا کھلنا، پردہ ہٹنا اور جوتوں کی آواز سننا وغیرہ۔ باقی رہی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی یہ بات کہ امام کو دیکھ کر اقامت کہنا اس کے حاضر ہونے کا تقاضہ نہیں کرتا، کیونکہ آپ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں اقامت کہی جاتی تھی پھر آپ علیہ السلام جب اقامت ختم ہو جاتی یا اقامت کے بعد تشریف لاتے تھے، یہ باتیں بعید از قیاس ہیں، گذشتہ روایات میں موقع کی مناسبت کے لحاظ سے اس موضوع پر کچھ باتیں گذر چکی ہیں۔ ''متفق علیہ'' میرک فرماتے ہیں کہ اس میں نظر ہے کیونکہ ''**قد خرجت**'' کے الفاظ مسلم کا افراد ہیں، میں کہتا ہوں کہ یہ تاکید کے قبیل سے ہے اور یہ ایسی تاکید ہے جس کے بغیر بھی گذارا چل سکتا ہے، چنانچہ الفاظ بخاری کے اور معنی مسلم کا بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔

نماز کے لیے دوڑ کر نہ آؤ

۶۸۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا تَأْتُوْهَا تَسْعَوْنَ وَاْتُوْهَا تَمْشُوْنَ وَعَلَيْكُمُ السَّكِيْنَةُ فَمَا اَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوْا وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوْا (متفق علیه وفی روایة لمسلم) فَاِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا كَانَ يَعْمِدُ اِلَى الصَّلَاةِ فَهُوَ فِی الصَّلٰوةِ۔

أخرجه البخاری فی صحيحه۲/۳۹۰حديث رقم ۹۰۸۔وأخرجه مسلم فی صحيحه ۱/۴۲۰حديث رقم (۱۵۱۔۶۰۲) ۔وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۳۸۴حديث رقم ۵۷۲۔وأخرجه الترمذی فی السنن ۲/۱۴۸۔ حديث رقم ۳۲۷۔وأخرجه النسائی فی السنن ۲/۱۱۴حديث رقم ۸۶۱۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۲۵۵حديث رقم ۷۷۵۔وأخرجه الامام مالك فی الموطأ ۱/۶۸حديث رقم ۴من كتاب الصلاة وأخرجه

أحمد في المسند ٢/ ٢٣٧۔

ترجمه: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب نماز کی تکبیر ہو جائے تو تم لوگ جماعت میں شامل ہونے کے لئے دوڑ کر نہ آؤ بلکہ وقار اور سکون کے ساتھ اپنی چال کے مطابق آؤ جس قدر نماز امام کے ساتھ مل جائے تو پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے اس کو بعد میں پورا کرو۔ (بخاری ومسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں الفاظ اس طرح ہیں ''اس لئے کہ جب تم میں سے کوئی نماز کے لئے ارادہ کر لیتا ہے تو وہ نماز ہی میں شمار ہوتا ہے''

تشریح: ''وعن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ اذا اقيمت الصلاة فلاتأتوها تسعون'' یہ حال ہے یعنی نماز کی جانب دوڑ کر مت آؤ اگر چہ تمہیں نماز کے فوت ہو جانے کا خوف ہو جیسا کہ ہمارے بعض علماء کا کہنا ہے، جب کہ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿فَاسْعَوْا﴾ [الجمعة: ٩] کے منافی ہے، کیونکہ ہم کہہ چکے ہیں کہ آیت میں سعی سے مراد قصد ہے جیسا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ''وذروا البيع'' دلالت کرتا ہے، یعنی آخرت کے کاموں میں لگ جاؤ اور دنیا کے کام ترک کر دو۔ حسن فرماتے ہیں کہ سعی صرف پاؤں پر منحصر نہیں، سعی نیت اور دل سے بھی ہوتی ہے۔

یعنی کامل سعی یا صرف سعی پاؤں پر منحصر نہیں بلکہ اس کا مدار مقصد کو پانے میں اخلاص کے حصول پر ہے، ممنوع صرف وہ دوڑ ہے جس سے انسان کی حالت غیر ہو جائے اور حال درست نہ رہے، اسی وجہ سے فرمایا: ''واتوها تمشون'' یعنی سکون واطمینان سے جو کہ اطاعت وفرمانبرداری کا مدار ہیں، کیونکہ عبادت کا مقصد معبود کے سامنے حضور ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ نہی بلیغ ہے کیونکہ دوڑ سے ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے جو ادب کے خلاف ہوتی ہے، اور یہ دوڑ وقار اور سکون کے منافی ہوتی ہے، اسی وجہ سے بعد میں خود ہی فرما دیا کہ تم چلتا ہوا ہونے کی حالت میں آؤ کیوں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ [الفرقان: ٦٣] ''اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں'' اور ظاہر ہے کہ نبی پاک ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ جب نماز کھڑی ہو جائے تو دوڑو مت، کیونکہ یہ بات ظاہر کے معارض ہے، کیونکہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا﴾ [الجمعة: ٩] ''جب جمعہ کے دن نماز کے لئے اذان دی جائے'' چنانچہ معلوم ہوا کہ سعی کے دو معنی ہیں ایک معنی دوڑ کر آنا اور یہ مکروہ ہے اور دوسرا معنی ہے چل کر سکون واطمینان سے آنا اور یہ مستحب ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ سعی کا معنی کام میں کوشش اور محنت سے کام لینا اور اسی سے ہے باری تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ [النجم: ٣٩] ''اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے'' اور سورۃ الجمعہ میں جو فاسعوا ہے وہ امضوا کے معنی میں ہے جیسا کہ یوں بھی پڑھا گیا ہے یا پھر اقصدوا کے معنی میں ہے، جیسا کہ حسن کا قول ہے۔

میرک نے ازہار سے نقل کیا ہے کہ اگر آپ بطور اعتراض کے یوں کہیں کہ حدیث کا یہ جملہ تم دوڑ کر نہ آؤ اور چل کر آؤ اس کا مطلب ایسے ہی ہوا جیسے کوئی یوں کہے گھوڑے کا گوشت مت کھاؤ لیکن حیوان کا گوشت کھاؤ، تو ایسے جملے ضعیف ہوا کرتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ ہم ایسے جملوں کے ضعف کو تسلیم نہیں کرتے، کیونکہ یہاں دوسرے جملے میں حیوان سے مراد گھوڑے کے

علاوہ کسی دوسرے جانور کا گوشت ہے، لیکن اگر اسے ضعیف مان بھی لیا جائے تو حدیث میں قید موجود ہے، چنانچہ فرمایا: "وعلیکم بالسکینۃ" جب کہ دوڑ کبھی مشیاً ہوتی ہے، جیسا فرمایا: ﴿فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ﴾ اور کبھی عدواً ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ رَجُلٌ یَّسْعٰی﴾ [یٰسٓ: ۲۰] "اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا" اور کبھی یہ سعی عملاً ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی﴾ [النجم: ۳۹] "اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے" پھر یہ کہ جس شخص کو تکبیر اولیٰ فوت ہو جانے کا خوف ہو تو ایک قول کے مطابق وہ دوڑ لگا سکتا ہے، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بقیع میں اقامت سنی تو وہ مسجد کی جانب دوڑ پڑے، جب کہ ایک قول یہ ہے کہ چلنے کی رفتار میں ذرا تیزی پیدا کر لے، جب کہ کچھ لوگوں نے اس حدیث کی وجہ سے وقار کے ساتھ چلنے کو پسندیدہ قرار دیا ہے کیونکہ جس نے نماز کا ارادہ کر لیا گویا وہ نماز میں ہی ہے، اور یہ اس وقت ہے جب کہ انسان سے کوئی کمی واقع نہ ہو۔

عام چال اور دوڑ کے درمیان کی رفتار مراد لے لی جائے تو دونوں فضیلتیں حاصل ہو جائیں گی، کیوں کہ باری تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ﴾ [آل عمران: ۱۳۳] "اور اپنے پروردگار کی بخشش اور بہشت کی طرف لپکو" ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص جمعہ میں دوسری رکعت کا رکوع دوڑ کے بغیر نہ پا سکتا ہو تو وہ دوڑ لگا سکتا ہے، کیونکہ دوڑ مقصد کو پانے کا وسیلہ ہے، جب مقصد واجب ہوا تو اس کا وسیلہ بھی واجب ہوا۔

اسی طرح اگر امام سلام پھیرنے کے قریب ہو اور دوڑ کے بغیر نہ پہنچا جا سکتا ہو تو دوڑ لگائی جا سکتی ہے اور فاسعوا سے بھی یہی معنی مراد ہے۔ لفظ سکینۃ مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اصل عبارت یہ ہے: الزموا السکینۃ، جیسا کہ ابن الملک کا خیال ہے۔ ایک نسخہ میں ابتداء کی وجہ سے رفع بھی مذکور ہے، بعض روایات میں سکینہ اور وقار دونوں کو جمع کیا گیا ہے، تو ایک قول کے مطابق دونوں کا معنی ایک ہی ہے، جب کہ حق بات یہ ہے کہ سکینہ کا معنی ہوتا ہے حرکات کو روک لینا، تھم جانا اور فضولیات سے اجتناب کرنا اور وقار کا معنی ہوتا ہے دیکھنے میں سنجیدہ، نظریں جھکائے ہوئے، پست آواز اور دائیں بائیں دیکھے بغیر چلنا۔ ظاہراً سکینۃ سے مراد قلبی سکون، دل کا حضور اور خشوع وخضوع وغیرہ مراد ہے اور وقار سے مراد چلتے ہوئے غیر مناسب حرکتوں سے باز آنا ہے۔ "فما ادرکتم فصلوا" یہ فاء جزائیہ ہے اور شرط محذوف ہے یعنی اصل عبارت یہ ہے: اذا بینت لکم ماھو اولٰی بکم فما ادرکتم فصلوا۔ لیکن ثواب پورا پورا ہی ملے گا، اس حدیث کے مطلق ہونے کی وجہ سے کچھ علماء نے یہ بات اخذ کی ہے کہ امام کے سلام پھیرنے سے پہلے پہلے جو بھی چیز امام کے ساتھ مل جائے تو مقتدی کو جماعت کی نماز یعنی ستائیس نمازوں کا ثواب مل جاتا ہے، لیکن جو شخص شروع سے نماز میں شریک ہے اسے بدرجہ اولی اور اکمل ثواب ملے گا" وما فاتکم فاتموا" اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی کو امام کے ساتھ نماز کا جو حصہ ملا ہے وہ مقتدی کی نماز کا ابتدائی حصہ ہوگا کیونکہ اتمام کا معنی ہوتا کچھ کام کا ہو جانا اور باقی کو مکمل کرنا اور بقول ابن الملک امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کا یہی مذہب ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ حضرت علی اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہما کا بھی یہی مذہب ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی سوائے قراءت کے یہی مذہب ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ میں سے اکثر لوگوں کا یہی مذہب ہے۔ جب کہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ نماز کا جو حصہ امام کے ساتھ ملا ہے وہ مقتدی کی نماز کا بھی آخری حصہ ہے کیونکہ ایک

روایت میں مافاتکم فاقضوا کے الفاظ ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں قضاء کی غیر متاتی ہے، لہٰذا اتمام والی روایت کو ہمارے مذہب کے موافق محمول کرنا متعین ہوگیا، "متفق علیہ"۔

"وفي رواية لمسلم: فان احدكم" یہ جملہ وعلیکم السکینۃ کی تعلیل ہے "اذا کان یعمد" میم کے کسرہ کے ساتھ یقصد کے معنی میں ہے: "الی الصلاۃ فھو فی صلاۃ" یعنی حکماً، ثواباً اور قصداً۔ ایک نسخہ میں فی صلاۃ کی بجائے فی الصلاۃ کے الفاظ ہیں جیسا کہ مصابیح میں ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ جب کوئی نماز کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ نماز ہی میں ہوتا ہے کیونکہ شے کے مقدمات شے کا حصہ ہوتے ہیں اور یہ اس وقت ہے جب کہ وہ اس میں تاخیر سے کام نہ لے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کچھ تاخیر واقع ہو بھی جائے تو ارادہ کی وجہ سے یہ کمی معاف ہو جائے گی کیونکہ یہ ایسے ہی ہوگا جیسا کہ غلطی کے بعد توبہ کرنا۔

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الثَّانِيْ

[اس باب میں دوسری فصل نہیں ہے]

"وھذا الباب" یعنی صاحب مشکوٰۃ کی تبویب کی بہ نسبت، ورنہ مصابیح میں تو یہ فصل ہے (باب نہیں) "خال عن الفصل الثانی" اس لئے کہ صاحب مصابیح کو اس فصل کے مناسب صحیح احادیث ملی ہی نہیں۔ واللہ اعلم۔

الفصل الثالث:

جس جگہ شیطان کے اثرات ہوں وہاں سے بھاگنا چاہئے

۶۸۷: عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ قَالَ عَرَّسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَيْلَةً بِطَرِيْقِ مَكَّةَ وَوَكَّلَ بِلَالًا اَنْ يُّوْقِظَهُمْ لِلصَّلَاةِ فَرَقَدَ بِلَالٌ وَرَقَدُوْا حَتّٰى اسْتَيْقَظُوْا وَقَدْ طَلَعَتْ عَلَيْهِمُ الشَّمْسُ فَاسْتَيْقَظَ الْقَوْمُ فَقَدْ فَزِعُوْا فَاَمَرَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ يَّرْكَبُوْا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْ ذٰلِكَ الْوَادِيْ وَقَالَ اِنَّ هٰذَا وَادٍ بِهٖ شَيْطَانٌ فَرَكِبُوْا حَتّٰى خَرَجُوْا مِنْ ذٰلِكَ الْوَادِيْ ثُمَّ اَمَرَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ يَّنْزِلُوْا وَاَنْ يَّتَوَضَّؤُا وَاَمَرَ بِلَالًا اَنْ يُّنَادِيَ لِلصَّلَاةِ اَوْ يُقِيْمَ فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالنَّاسِ ثُمَّ انْصَرَفَ وَقَدْ رَاٰى مِنْ فَزَعِهِمْ فَقَالَ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ قَبَضَ اَرْوَاحَنَا وَلَوْشَاءَ لَرَدَّهَا اِلَيْنَا فِيْ حِيْنٍ غَيْرِ هٰذَا فَاِذَا رَقَدَ اَحَدُكُمْ عَنِ الصَّلٰوةِ اَوْ نَسِيَهَا ثُمَّ فَزِعَ اِلَيْهَا فَلْيُصَلِّهَا كَمَا يُصَلِّيْهَا فِيْ وَقْتِهَا ثُمَّ الْتَفَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِلٰى اَبِيْ بَكْرِ الصِّدِّيْقِ فَقَالَ اِنَّ الشَّيْطَانَ اَتٰى بِلَالًا وَهُوَ قَائِمٌ يُّصَلِّيْ فَاَضْجَعَهٗ ثُمَّ لَمْ

يَزَلْ يُهْدِئُهُ كَمَا يُهْدِءُ الصَّبِيَّ حَتّٰى نَامَ ثُمَّ دَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِلَالاً فَاَخْبَرَ بِلَالٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مِثْلَ الَّذِيْ اَخْبَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَبَابَكْرٍ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ.(رواه مالك مرسلا)

أخرجه مالك مرسلا في الموطأ ١/ ١٤ حديث رقم ٢٦ من كتاب وقوت الصلاة۔

ترجمہ: حضرت زید بن اسلمؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ کے راستوں میں ایک رات کو رات کے آخری حصہ میں آرام کیلئے ٹھہرے اور حضرت بلال کو حکم دیا کہ ان کو نماز کے لیے بیدار کرے اور جب سب لوگ سو گئے تو حضرت بلالؓ کو بھی نیند آ گئی تمام لوگ اس وقت بیدار ہوئے جب کہ سورج طلوع ہو چکا تھا اور سب لوگ گھبرا گئے رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ سوار ہو کر اس وادی سے باہر نکل جائیں اور فرمایا یہ کیسی وادی ہے کہ جس پر شیطان مسلط ہے چنانچہ سب لوگ سوار ہو کر اس وادی سے نکل آئے آگے ایک جگہ پہنچ کر رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ یہاں اتر جاؤ اور وضو کرو اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ نماز کے لئے اذان اور اقامت کہیں پھر آپ نے لوگوں کو نماز پڑھائی جب نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کو گھبرایا ہوا دیکھا تو فرمایا ''اے لوگوں اللہ تعالیٰ نے نیند کی حالت میں ہماری روحیں قبض کر لیں تھیں اگر وہ چاہتا تو ہماری روحوں کو دوسرے وقت واپس کر دیتا لہٰذا اگر تم میں سے کوئی نماز کے وقت غفلت سے سو جائے یا نماز پڑھنی بھول جائے اور گھبرائے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس نماز کو پڑھ لے جس طرح وہ اس کو اس کے وقت پر پڑھتا تھا پھر آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ بلالؓ کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے کہ شیطان ان کے پاس آیا اور انہیں ٹیک لگانے پر مجبور کر دیا اور جس طرح بچوں کو تھپکی دی جاتی ہے شیطان انہیں تھپکی لگا تا رہا یہاں تک کہ بلال سو گئے پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو بلایا اور حضرت بلالؓ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس طرح بیان کیا جس طرح رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے بیان کیا تھا حضرت ابوبکرؓ نے حضرت بلالؓ کا بیان سن کر فرمایا میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول اللہ ﷺ ہیں اس روایت کو امام مالکؒ نے مرسل ذکر کیا ہے۔

تشریح: ''عن زید بن اسلم'' بقول علامہ طیبی تابعی ہیں، عمر بن خطاب کے آزاد کردہ غلام ہیں ''قال عرس رسول الله ﷺ ليلة'' اس میں یا تو تجرید ہے یا تاکید، کیونکہ تعریس کا معنی ہوتا ہے رات کو یا رات کے آخری حصہ میں پڑاؤ ڈالنا'' بطريق مكة'' ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ یہ وہ پہلے والا قصہ نہیں، کیونکہ وہ قصہ مدینہ اور خیبر کے درمیان کا تھا اور یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان کا واقعہ ہے ''ووكل بلالا'' یعنی حکم دیا ''ان يوقظهم للصلاة'' یعنی فجر کی نماز کے لئے، بلال کو یہاں تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ وہ مؤذن ہیں جو وقت کا خوب خیال رکھتے تھے ''فرقد بلال'' یعنی کافی دیر تک جاگنے کے بعد اور پھر نیند کا غلبہ ہو گیا ''ورقدوا'' یعنی نبی پاک ﷺ اور ان کے صحابہ کرام بلال رضی اللہ عنہ پر اعتماد کرتے ہوئے سو گئے ''حتى استيقظوا'' یعنی سب کے سب، اور سب سے پہلے ان میں سے سب سے افضل شخص جاگے ''وقد طلعت عليهم الشمس'' یہ جملہ حالیہ ہے ''فاستيقظ القوم'' امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس جملہ کے تکرار سے آگے آنے جملے میں بعد اور دوری پیدا کرنا مقصود ہے ''فقد فزعوا'' یعنی صبح کی نماز کے فوت ہو جانے کی وجہ سے ''فامرهم رسول الله ﷺ ان يركبوا'' یعنی کوچ کریں' حتى يخرجوا من ذلك الوادي وقال ان هذا واد به شيطان'' یعنی شیطان مسلط ہے یا

شیطان حاوی ہے "فرکبوا" یعنی چل نکلے "حتی خرجوا من ذالك الوادی، ثم امرهم رسول الله ﷺ ان ینزلوا وان یتوضأوا وامر بلالا ان ینادی" یعنی اذان دیں یا لوگوں کو آگاہ کریں "للصلاة او یقیم" یعنی اذان کے بعد، یہ اَو شک کے لئے ہے، یا مطلق جمع کے لئے ہے جیسا کہ کوفیین، اخفش اور جرمی کے مذہب کے مطابق واو مطلق جمع کے لئے آتی ہے، جیسا کہ مغنی نے نقل کیا ہے، اس کی تائید ابن ہمام کی ذکر کردہ بات سے بھی ہوتی ہے کہ ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بلال کو اذان اور اقامت کا حکم دیا۔ میں کہتا ہوں کہ بلاشبہ اذان اور اقامت کو جمع کرنا افضل ہے، لہٰذا اس روایت کو اس جمع پر محمول کرنا اولیٰ واکمل ہے، جیسا کہ فصل اول میں اس پر بحث ہو چکی ہے۔ "فصلی رسول الله ﷺ بالناس" یعنی فجر کی نماز جماعت کے ساتھ قضا کی "ثم انصرف" یعنی نماز سے فارغ ہوئے "وقد رأی من فزعهم" یعنی کچھ لوگوں کو گھبرایا ہوا دیکھا یا کچھ لوگوں پر خوف اور ہیبت باری تعالیٰ کے آثار دیکھے کیونکہ ان سے نیند کی وجہ سے نماز قضا ہو گئی تھی۔ باقی رہا ابن حجر کا شیئا کثیرا کہنا اور یہ کہنا کہ سیاق سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے تو یہ بات نہ سیاق سے ظاہر ہوتی ہے اور نہ ہی سباق سے "فقال" ان سے تسلی اور تسکین کے طور پر فرمایا "یا ایها الناس ان الله قبض ارواحنا" جیسا کہ اس پر باری تعالیٰ کا فرمان: "الله یتوفی الانفس حین موتها والتی لم تمت فی منامها" دلالت کرتا ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس میں گھبرا جانے والے لوگوں کے لئے تسلی کا سامان ہے اور یہ کہ یہ غفلت اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوئی تھی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بقدیر کا مسئلہ ہے، اور نیند کی وجہ سے نماز کا چھوٹ جانا، خاص کر کے اس وقت جب کہ بلال رضی اللہ عنہ کو لوگوں کے جگانے کا پابند کیا گیا ہو کوئی بڑی بات نہیں لیکن اس کے باوجود ان کا گھبرانا قابل تحسین ہے "ولو شاء" یعنی اگر وہ اس وقت سے پہلے ہمیں ہماری روحیں واپس کرنا چاہتا: "لردها الینا فی حین غیر هذا" جر کے ساتھ یہ صفت ہے اور ایک قول کے مطابق مستثنیٰ ہونے کے بناء پر منصوب ہے یعنی اصل عبارت غیر هذا الحین ہے، اس حین میں طلوع شمس سے قبل کا وقت بھی مراد ہو سکتا ہے، اور یہی ظاہر ہے، اس صورت میں روح کا قبض ہونا اور واپس آنا دونوں مجازا ہوں گے اور اس میں قیامت کے دن کا بھی احتمال ہے۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ موتِ حقیقی کی جانب اشارہ ہے جس کی تنبیہ باری تعالیٰ کے فرمان: "فیمسك التی قضی علیها الموت" میں موجود ہے اور ان الله قبض ارواحنا سے مجازی موت کی جانب اشارہ ہے جیسا کہ باری تعالیٰ کے فرمان: "ویرسل الاخری" میں ہے، یعنی وہ لوگ نیند میں مرتے نہیں۔ "فاذا رقد احدکم" یعنی غافل اور سست ہو کر "عن الصلاة او نسیها" ہو سکتا ہے کہ یہ شک راوی کی جانب سے ہو یا پھر حدیث میں یوں ہی مذکور ہو مطلب یہ ہے کہ نیند کی وجہ سے نماز سے غافل ہو جائے یا کسی اور وجہ سے بھول جائے، قالہ الطیبی۔ بظاہر لفظی اور معنوی تنویع ہے، کیونکہ اگر یہ راوی کی جانب سے شک ہوتا تو راوی یوں کہتا او نسی تا کہ رقد کا بدل ہو جائے یا پھر یوں کہتا: نسی احدکم الصلاة تا کہ سارے جملے سے بدل ہو جاتا اور اس کی ایک وجہ گذشتہ روایت بھی ہے کہ جس میں فرمایا تھا: من نسی عن صلاة او نام عنها۔ باقی رہا ابن حجر کا یہ کہنا کہ یہ اَو تنویع کے لئے ہے شک کے لئے نہیں بخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے اس کو شک کے لئے خیال کیا ہے، کیونکہ نسیان نیند کے خلاف ہے، لہٰذا یہ نفعا مناسب نہیں "ثم فزع الیها" امام طیبی فرماتے ہیں کہ فزع کے معنی میں التجأ کے معنی کی تضمین کی گئی ہے اس لئے اسے الی کے ذریعے متعدی کیا گیا ہے یعنی اصل عبارت یوں ہے: التجأ الی

الصلاۃ فزعا یعنی جو مجبوراً نماز کی ادائیگی نہ کر سکے، جیسا کہ باری تعالیٰ کا فرمان ہے: "ففروا الی الله" یعنی ماسوی اللہ کی جانب دوڑو "فلیصلها" یعنی جب قضا کرے "کما کان یصلیها فی وقتها" اور ظاہر ہے کہ جہری نمازوں میں جہر کرے گا اور سری میں سر، بخلاف ہمارے بعض علماء کے، ان کا کہنا ہے کہ بہر حال قضاء نمازوں میں سراً تلاوت کی جائیگی۔ "ثم التفت رسول الله ﷺ" یعنی لوگوں سے "الی ابی بکر الصدیق" کیونکہ تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ وہ اس قافلہ میں سردار تھے اور آپ علیہ السلام کے دوست تھے، ان کی جانب متوجہ ہونا مکمل توجہ اور خصوصیت کا باعث تھا "فقال ان الشیطان" یعنی اس وادی کا شیطان، یا بلال کا شیطان، یا بڑا شیطان "اتی بلالا وهو قائم یصلی فاضجعه" یعنی سہارا لگا دیا جیسا کہ سابقہ حدیث میں گذر چکا ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس قصہ میں وہ چت لیٹ گئے ہوں اور یہ کچھ پتہ نہیں کون سا قصہ پہلے کا ہے اور کونسا بعد کا "ثم لم یزل یهدئه" یہ اھداء سے ماخوذ ہے یعنی سکون اور نیند میں رہے۔ النہایہ میں ہے کہ ھدو کا معنی ہوتا ہے اپنے آپ کو چلنے کی حرکات اور راستے میں گھومنے پھرنے سے روکنا "کما یهدأ الصبی" مبنی للمفعول۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اہل عرب یوں کہتے ہیں: اهدأت الصبی وسکنته یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ تھپیڑا دے کر بچے کو سلایا جائے تا آنکہ وہ سکون میں آجائے اور سو جائے "حتی نام"۔

اگر اعتراض کے طور پر یوں کہا جائے کہ نبی علیہ السلام کے فرمان ان الله قبض ارواحنا اور حضرت بلال کے قول اخذ بنفسی الذی اخذ بنفسك میں یہ غفلت ابتداءً اللہ تعالیٰ کی جانب اور پھر شیطان کی جانب کیوں منسوب کی گئی؟ میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں کہ یہ مسئلہ خلق الافعال سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے نیند اور نسیان کو ان لوگوں میں پیدا کرنے کا ارادہ کیا چنانچہ شیطان نے اس سے موقعہ پا کر غفلت اور نیند کا غلبہ کر دیا۔

"ثم دعا رسول الله ﷺ بلالا فاخبر بلال رسول الله ﷺ مثل الذی اخبر رسول الله ﷺ ابا بکر فقال ابوبکر اشهد انك رسول الله"۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں معجزہ کا اظہار ہے، اسی وجہ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کی شہادت دی اور تصدیق کی "رواہ مالک" یعنی موطا میں "مرسلاً" جیسا کہ پیچھے گذر چکا کہ زید تابعی ہیں۔

مؤذن کے ذمہ دو امانتیں ہیں

۶۸۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَصْلَتَانِ فِىْ اَعْنَاقِ الْمُؤَذِّنِيْنَ لِلْمُسْلِمِيْنَ صِيَامُهُمْ وَصَلَاتُهُمْ . (ابن ماجه)

أخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۲۳۶ حدیث رقم ۷۱۲ وفی الزوائد إسناده ضعیف۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمر ؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ کہ مسلمانوں کی دو چیزیں مؤذنوں کی گردن میں لٹکی ہوئی ہیں۔ ایک ان کے روزے اور دوسری ان کی نمازیں۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔"

تشریح: یعنی انکے ذمہ ثابت ہیں۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ: **معلقتان،** **خصلتان** کی صفت ہے اور "**للمسلمین**" خبر ہے اور "**صیامھم و صلاتھم**" دونوں خصلتوں کا بیان ہے یا یہ جملہ بدل ہے اس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے" اور اس کی سند حسن ہے۔ خطیب نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے، سب سے پہلے جنت میں انبیاء داخل ہوں گے، پھر بیت اللہ کے مؤذن، پھر بیت المقدس کے مؤذن، پھر مسجد نبوی کے مؤذن پھر دیگر تمام مؤذنین، راوی کہتے ہیں کہ مؤذن البیت سے مراد حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ تمام احوال میں ان کے طریقہ کار پر محمول ہے۔

بَابُ الْمَسَاجِدِ وَمَوَاضِعِ الصَّلٰوةِ

مساجد اور نماز کی جگہوں کا بیان

عرضِ مرتب:

اس باب میں ایک تو مساجد کا بیان ہے اور دوسرے ان مقامات اور جگہوں کا بیان ہے۔ کہ جہاں نماز پڑھنی جائز ہے اور جہاں نماز پڑھنی مکروہ ہے۔

مسجد کی فضیلت اور جلالت شان میں کثرت سے احادیث منقول ہیں اس مقام پر چند احادیث ذکر کی گئی ہیں صاحب مشکوٰۃ نے جن احادیث کو ذکر کیا ہے وہ تو ان شاء اللہ اپنے مقام پر آجائیں گی اور اس کے علاوہ چند احادیث درج ذیل ہیں۔

حدیث [1]: حضرت ابوذر غفاریؓ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اے بیٹے مسجد تمہارا گھر ہونی چاہئے۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ مسجد متقی لوگوں کا گھر ہے اور جس کا گھر مسجد ہو۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ رحمت، برکت اور پل صراط سے آسانی کے ساتھ گزرنے کی ضمانت ہے۔ **حدیث [2]:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی آدمی مسجد میں اپنا ٹھکانہ پکڑتا ہے نماز کے لئے یا کسی اور عبادت کے لئے تو اللہ تعالیٰ اس کو رحمت اور شفقت کی نظر سے دیکھتا ہے جس طرح کہ گھر سے غائب آدمی مدت مدید کے بعد جب واپس آتا ہے تو گھر والے اس کے ساتھ شفقت اور محبت کا سلوک کرتے ہیں۔ **حدیث [3]:** حضرت عبد اللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس چیز کی ہدایت کی جاتی تھی کہ مسجد شیطان سے حفاظت کے لئے مضبوط قلعہ ہے۔ **حدیث [4]:** حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ مساجد زمین پر اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں اور جو آدمی مسجد میں جاتا ہے وہ گویا کہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کرتا ہے اور جس کی زیارت کی جائے وہ اپنے زائر کا اکرام کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ مسجد میں آنے والے بندوں کا اعزاز اور اکرام کرتا ہے ان کو اپنی رحمتوں، برکتوں اور سعادتوں سے مالا مال کرکے واپس کرتا ہے۔

الفصل الاول:

خانہ کعبہ کے اندر نماز پڑھنے کا حکم

٦٨٩: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا دَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْبَيْتَ دَعَا فِيْ نَوَاحِيْهِ كُلِّهَا وَلَمْ يُصَلِّ حَتّٰى خَرَجَ مِنْهُ فَلَمَّا خَرَجَ رَكَعَ رَكْعَتَيْنِ فِيْ قُبُلِ الْكَعْبَةِ وَقَالَ هٰذِهِ الْقِبْلَةُ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱/۱ ٥٠ حدیث رقم ۳۹۸۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور اس کے چاروں کونوں میں دعا کی اور نماز نہیں پڑھی پھر اس سے باہر آ گئے اور خانہ کعبہ سے نکل کر بیت اللہ کے سامنے دو رکعت نماز پڑھی اور فرمایا کہ یہی قبلہ ہے اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: یہ تعمیم بعد التخصیص یا عطف تفسیری ہے۔ مسجد کا لغوی معنی ہوتا ہے جائے سجدہ اور شرعی معنی ہوتا ہے وہ جگہ جو نماز کے لئے وقف کر دی گئی ہو۔ ایک قول یہ ہے کہ ساری زمین مسجد ہے، کیونکہ ایک خبر میں ہے کہ میرے لئے ساری زمین مسجد بنا دی گئی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مسجد سے مراد وہ جگہ ہے جہاں دیگر لوگوں سے بچ بچا کے نماز ادا کی جاتی ہو، کیونکہ دیگر مذاہب میں اپنے اپنے کنیسہ وغیرہ کے علاوہ کسی اور جگہ نماز ادا نہیں کر سکتے تھے۔ جیسا کہ مسند بزار کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ دیگر انبیاء اپنے محراب کے علاوہ کسی دوسری جگہ نماز ادا نہیں کر سکتے تھے۔ ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے کہ ابوذر نے اپنے بیٹے سے کہا کہ بیٹا! مسجد تیرا گھر ہونا چاہئے کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مسجدیں متقین کا گھر ہوتی ہیں تو جو شخص مسجد کو اپنا گھر بنا لے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے روح، رحمت اور پل صراط سے جنت تک (کی تمام چیزوں کا) ضامن ہو جاتا ہے۔ اعمش نے عبدالرحمٰن بن معقل سے نقل کیا ہے کہ ہم لوگ یوں کہا کرتے تھے کہ مسجد شیطان سے حفاظت کا قلعہ ہے۔ ابن عمرؓ سے منقول ہے کہ مسجدیں زمین میں اللہ تعالیٰ کا گھر ہیں، اور مزور (زیارت کی جانے والی جگہ) پر حق ہے کہ وہ زیارت کرنے والے کا اکرام کرے۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ابوداود اور ابن خزیمہ کی روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں کوے کی طرح ٹھونگ مارنے اور مسجد کو اونٹ کی طرح مقام (ٹھکانہ بنانے) سے منع فرمایا اور نسائی شریف کی روایت کہ انسان کو چاہئے کہ وہ نماز کے لئے یوں مقام بنائے جیسے اونٹ اپنے لئے مقام بناتا ہے، ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ اس روایت کا مدار تمیم بن محمود پر ہے اور امام بخاریؒ نے اس میں غور و فکر کا اظہار کیا ہے۔ ابن حباب نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اگر اس روایت کو درست تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس سے مراد یہ ہوگا کہ نہی مسجد میں کسی مقام کو نماز اور ذکر کے علاوہ کے لئے ٹھکانہ بنانے پر محمول ہوگی، اور اس کا استدلال ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص مسجد میں نماز اور ذکر کے لئے ٹھکانہ بناتا ہے تو اللہ تعالیٰ یوں خوش ہوتے ہیں جیسے کوئی گمشدہ شخص اپنے اہل خانہ کے پاس واپس آ جائے۔ یہاں تبشبش (خوش ہونے) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف رحمت اور محبت سے دیکھتے ہیں۔

ظاہراً یہی معلوم ہوتا ہے کہ نہی مسجد میں کسی خاص مقام کو ٹھکانہ بنانے سے ہے، اگر چہ وہ ذکر و نماز کے لئے ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اس صورت میں ریاء کا شبہ ہوتا ہے، جب کہ فضائل مسجد کو نماز و ذکر کے لئے مسکن بنانے پر محمول ہیں نہ کہ کسی اور دنیاوی اور ذاتی غرض کے لئے۔

یعنی کعبہ میں جو کہ اللہ تعالیٰ کا گھر، تمام مساجد کا قبلہ اور تمام مساجد سے افضل ہے۔ ایک قول کے مطابق بیت اللہ عرش عظیم سے بھی افضل ہے۔ "دعا فی نواحیه کلها ولم یصل حتی خرج منه" امام طیبی فرماتے ہیں کہ عام فقہاء کعبہ کے اندر حدیث ابن عمر کی وجہ سے نوافل کے جواز کے قائل ہیں، جب کہ فرائض کی بابت اختلاف ہے، چنانچہ جمہور جواز کے قائل ہیں، جب کہ امام مالک اور امام احمد نے منع فرمایا ہے۔ محمد بن جریر سے منقول ہے کہ حدیث ابن عباس کی وجہ سے فرض اور نفل بیت اللہ میں جائز نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان کے استدلال میں ذرا نظر ہے کیونکہ عدمِ صلوۃ سے عدمِ جواز کا لزوم نہیں ہوتا۔ باقی امام مالک اور امام احمد کا فرائض سے منع کرنا اور نفل سے منع نہ کرنا تو وہ باری تعالیٰ کے فرمان: "فولوا وجوهكم شطره" کی وجہ سے ہے یعنی اس کی جانب منہ کرو، تو جو شخص اس کے اندر نماز پڑھے گا تو یقیناً اس نے کچھ حصہ کو پیٹھ کی ہوئی ہوگی۔ نبی پاک ﷺ سے بیت اللہ کے اندر فرض ادا کرنا ثابت نہیں، اگر چہ نوافل کی ادائیگی ثابت ہے کیونکہ نوافل میں جو گنجائش ہوتی ہے وہ فرائض میں نہیں ہوتی۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علماءِ حدیث کا حضرت بلال کی حدیث سے استدلال پر اجماع ہے کیونکہ وہ مثبت بھی اور اس میں اضافہ بھی ہے اور صلاۃ سے مراد معین صلاۃ یعنی نماز ہے نہ کہ لغوی معنی کے لحاظ سے دعا وغیرہ اور اس کی تائید ابن عمرؓ کے قول سے بھی ہوتی ہے کہ میں یہ بات پوچھنا بھول گیا تھا کہ کتنی نماز ادا کی۔ باقی رہی اسامہ کی نفی تو اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ دعا وغیرہ میں مشغول ہو گئے ہوں اور انہیں نبی پاک ﷺ کی نماز کا خیال نہ رہا ہو اور ہاں بلالؓ سے جو بات ثابت ہے وہ تحقیق شدہ ہے۔

"فلما خرج رکع" یعنی رکع' صلی کے معنی میں ہے "رکعتین فی قبل الكعبة" دونوں کے ضمہ اور دوسرے کے سکون کے ساتھ یعنی اس کے آگے، اور قُبل' دُبر کی ضد ہے مطلب یہ ہے کہ قبلہ کی جانب منہ کر کے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ہے کعبہ کے سامنے، استقبال قبلہ کا معنی ہے اس طرف کیا جس طرف کعبہ کا دروازہ ہے۔ دوسری بات کی تائید میں ابن عمر کی روایت سے ہوتی ہے کہ آپ علیہ السلام نے کعبہ کے منہ کے سامنے دو رکعتیں ادا کیں اور یہ روایت صحیح ہے اور ہاں اس بارے میں اختلاف ہے کہ جو شخص کعبہ کی زیارت کر کے باہر نکلے تو اس کے لئے آپ علیہ السلام کی اقتداء کرتے ہوئے دو رکعت نفل ادا کرنا مسنون ہیں یا نہیں؟ کیونکہ یہاں یہ احتمال بھی ہے کہ آپ علیہ السلام نے تو کعبہ کے سامنے دو رکعت اس وجہ سے ادا کیں تا کہ عین کعبہ میں قبلہ کے انحصار کی وضاحت ہو جائے، جیسا کہ راوی کے قول سے یہ بات واضح ہو رہی ہے "وقال هذه" یعنی کعبہ، مراد وہ ٹکڑا ہے جہاں کعبہ کی عمارت ہے "القبلة" اس کو قبلہ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ نمازی اس کا مقابلہ (سامنا) کرتے ہیں، یعنی قبلہ وہ ہے جس کی جانب اشارہ کیا جا رہا ہے لہٰذا ہمیشہ کعبہ کی جانب نماز ادا کرو۔ ابن حجر رحمہ اللہ اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ کعبہ ہی قبلہ ہے اور کوئی نہیں، جیسا کہ قرآن مجید سے بھی مسجد حرام کو قبلہ بنانے کو کہا گیا ہے نہ مسجد کے ارد گرد کو اور نہ سارے حرم کو۔ امام بیہقی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ: بیت اللہ قبلہ ہے اہل مسجد کے لئے، اور مسجد قبلہ ہے اہل

حرم کے لئے اور حرم قبلہ ہے ساری زمین والوں کے لئے اور پھر یہ کہا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے، ہمارے مذہب کے مطابق امام بیہقی کا یہ قول ضعیف ہے، باقی رہا داخلین کا یہ فعل کہ وہ داخل ہونے کے بعد طواف کرتے ہیں تو اس قول کی بھی کوئی اصل نہیں، بلکہ ان کے حق میں تاکید سے یہ بات ثابت ہے کہ جب وہ مسجد میں داخل ہوں تو پہلے طواف کریں اور پھر دوبارہ داخل ہوں اور یہاں ایک دوسرا احتمال بھی ہے نبی علیہ السلام نے امام کے مقام اور استقبال کعبہ کے بارے میں سنت کے بارے میں تعلیم دی ہے نہ کہ ارکان اور اطرافِ ثلاثہ کے بارے میں، اگرچہ کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے، قالہ الطیبی۔ میرا خیال ہے کہ یہ ساری بحث اس وقت ہوتی جب کہ آپ علیہ السلام نے وہاں فرض نماز با جماعت ادا کی ہوتی۔ ''رواہ البخاری'' کہا گیا ہے کہ امام بخاری کی روایت میں مرسل ہونے کا احتمال ہے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما دخول مکہ کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ تھے، جب کہ یہاں اختلافِ زمان اور تعددِ دخولِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا احتمال بھی موجود ہے یا پھر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کاتب نے اس راوی کا نام حذف کر دیا ہے جس سے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نقل کیا ہے، یا پھر یہ کہ ابن عباس دخول کعبہ کے وقت ساتھ تھے مگر انہیں نماز کا خیال نہ رہا جیسا کہ امام طیبی رحمہ اللہ کا خیال ہے۔ میرک فرماتے ہیں کہ بہرحال اس میں غور و خوض اور تامل کی ضرورت ہے۔ واللہ اعلم۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بلال رضی اللہ عنہ کی روایت کو ترجیح دی جائیگی کیونکہ وہ مثبت ہے اور یہ روایت نافی ہے اور مثبت مقدم ہوتی ہے اور اس کو مقدم کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے راوی زیادہ ہیں اور کثرتِ رواۃ' روایت میں ترجیح کا فائدہ دیتی ہے اور اس میں کوئی اضطراب بھی نہیں، امام احمد نے المسند میں اور ابن حبان نے الصحیح میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا وہ فرماتے ہیں کہ مجھے اسامہ بن زیدؓ نے بتایا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کے دو ستونوں کے درمیان نماز ادا کی۔ امام دارقطنی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں داخل ہوئے اور وہاں دو رکعت نفل ادا کئے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ خبر اعل بالا رسال ہے کیونکہ یہ ان کے بھائی فضل سے منقول ہے، جیسا کہ امام طبرانی نے معجم میں مشاہدہ و مشافہت سے نہیں بلکہ کسی اور راوی سے نقل کی ہے، اور یوں ان لوگوں کا اعتراض ختم ہو گیا جنہوں نے یہ کہا تھا کہ یہ روایت مرسل ہے۔

٦٩٠: وَرَوَاهُ مُسْلِمٌ عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ۔

أخرجه مسلم في صحيحه ٢ / ٩٦٨ حديث رقم (٣٩٥ ـ ١٣٣٠) وأخرجه النسائي في السنن ٥ / ٢٢٠ حديث رقم ٢٩١٧ وأحمد في المسند ٥ / ٢٠١

ترجمہ: ''اور امام مسلمؒ نے اس روایت کو ابن عباس سے اور انہوں نے اسامہ بن زیدؓ سے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

اسامہ بن زید۔ یہ اسامہ ہیں ان کے والد کا نام زید بن حارثہ قضاعی ہے اور ان کی والدہ ''ام ایمن'' ہیں۔ ان کا نام برکہ تھا۔ اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گود میں پالا تھا یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد جناب عبداللہ بن عبدالمطلب کی کنیز تھیں اسامہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام (حضرت زید) کے بیٹے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب اور محبوب کے بیٹے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

اور وہیں بعد شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وفات ہوئی اور ایک قول یہ ہے کہ ۵۴ھ میں وفات ہوئی۔ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک یہی صحیح ہیں ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔

تشریح: یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے "عن اسامة بن زید" میرک فرماتے ہیں کہ اسی طرح روایت امام نسائی نے بھی نقل کی ہے۔"

کعبہ کے ستون

۶۹۱: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم دَخَلَ الْكَعْبَةَ هُوَ وَاُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ وَعُثْمَانُ بْنُ طَلْحَةَ الْحَجَبِيُّ وَبِلَالُ بْنُ رِبَاحٍ فَاَغْلَقَهَا عَلَيْهِ وَمَكَثَ فِيْهَا فَسَأَلْتُ بِلَالًا حِيْنَ خَرَجَ مَاذَا صَنَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ جَعَلَ عَمُوْدًا عَنْ يَسَارِهٖ وَعَمُوْدَيْنِ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَثَلَاثَةَ اَعْمِدَةٍ وَرَاءَهٗ وَكَانَ الْبَيْتُ يَوْمَئِذٍ عَلٰى سِتَّةِ اَعْمِدَةٍ ثُمَّ صَلّٰى ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی الصحيح ۵۷۸/۱حديث رقم ۵۰۵۔وأخرجه مسلم فی صحيحه ۹۶۶/۲حديث (۳۸۸۔۱۳۲۹) وبين الروايتين اختلاف فقد ذكر البخاری "عمودًا من يساره وعمودين عن يمينه"بينما ذكر مسلم "عمودين عن يساره وعمودًا عن يمينه" وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۵۲۴/۲حديث رقم ۲۳ـ۲ـ وأخرجه النسائی فی السنن۶۳/۲ـحديث رقم ۷۴۹وزاده "وجعل بينه وبين الجدار نحوًا من ثلاثة أذرع"وأخرجه مالك فی الموطأ ۳۹۱/۱حديث رقم ۱۹۳من كتاب الحج ـوأحمد فی مسنده ۱۱۳/۲ـ

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسامہ بن زیدؓ، عثمان بن طلحہ جحمی اور بلال بن رباح خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوئے اندر سے دروازہ بند کر لیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دیر اندر رہے حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے بلال سے پوچھا جب کہ وہ باہر آ گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ کے اندر کیا کیا حضرت بلالؓ نے فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی کہ ایک ستون آپ کے بائیں طرف سے تھا اور دو ستون دائیں طرف تھے اور تین ستون پیچھے کی طرف تھے اس وقت خانہ کعبہ کے اندر چھ ستون تھے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: دخل الكعبة هو واسامة بن زيد: اسامۃُ عطف کی بناء پر مرفوع ہے اور حضرت اسامہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوبین میں سے ہیں۔

وعثمان بن طلحة الحجبی: "حاجب" کہتے ہیں دربان کو اس کی جمع حَجَبَۃُ آتی ہے، یہاں اس سے بیت اللہ کو کھولنے والا مراد ہے۔

وبلال بن رباح: رباح "راء" کے فتح کے ساتھ ہے اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن تھے۔

فاغلقها : ای الكعبة: مطلب یہ ہے کہ کعبے کے دروازے کو بند کر دیا اور اس کا فاعل بلال ہے کیونکہ (لفظاً) وہی زیادہ قریب ہے یا عثمان بن طلحہ فاعل ہے اس لئے کہ وہی اس کے زیادہ مناسب ہے۔

علیه: ای علی النبی ﷺ اور ایک روایت میں **علیهم** ہے اور یہی ظاہر معلوم ہوتا ہے۔ ابن الملکؒ نے اسی طرح فرمایا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں پر فاعل نبی ﷺ ہوں امر کے معنی میں (یعنی حضور ﷺ نے بند کرنے کا حکم دیا) اور آنے والا جملہ بھی اس کے مناسب ہے۔

ومکث فیها: **مکث** ''کاف'' کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ مروی ہے یعنی حضور ﷺ نے کعبہ میں کچھ دیر توقف فرمایا اور دعا میں مشغول رہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے دروازے کو بند کرنے کا اس لئے حکم دیا تا کہ آپ ﷺ کے پاس زیادہ لوگ نہ جمع ہو جائیں۔ پھر میں نے ابھریؒ کے کلام کو دیکھا کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ **اغلقها** میں فاعل کی ضمیر عثمان بن طلحہ کی طرح لوٹ رہی ہے جیسا کہ مسلم شریف کی ایک روایت میں اس کی تصریح بھی موجود ہے اور ایک روایت میں **فاغلقاها** (تشدید کے ساتھ) ہے اس وقت ''ھا'' ضمیر عثمان اور بلال کی طرف لوٹے گی، اور بخاری اور مسلم کی ایک روایت میں **فاغلقوا** مذکور ہے ان تمام روایات میں تطبیق یوں ہوگی کہ عثمان بن طلحہ ہی حقیقۃً بند کرنے والے تھے باقی حضرات بلالؓ کا ساتھ ملانا تو وہ شاید اس لئے ہو کہ انہوں نے دروازہ بند کرنے میں ان کی مدد کی ہو اور باقی جمع کا صیغہ اس اعتبار سے ہے کہ باقی حضرات نے اس کو بند کرنے کا کہا تھا اور تطبیق کی اصل صورت یہ ہے کہ یہ حضرت اسامہ کی مدد اور حضور ﷺ کے اَمر کے ساتھ ایسے ہوا۔ واللہ اعلم

اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے بھیڑ اور کسی تکلیف کے واقع ہونے کے خوف کی وجہ سے دروازے کو بند کرنے کا حکم دیا، اور تا کہ یہ آپ ﷺ کے قلب کیلئے زیادہ سکون اور خشوع کا سبب بنے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ پھر میں نے علامہ نوویؒ کو دیکھا کہ انہوں نے بھی اسی طرح وضاحت کی ہے۔

اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ آپ ﷺ نے دروازے کو بند کرنے کا حکم اس لئے دیا کیونکہ کعبے کی دیواروں میں سے کسی ایک کی طرف نماز میں منہ کرنا واجب ہے۔ پس یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ اگر آپ ﷺ دروازے کی جانب منہ کر کے نماز پڑھتے اس حال میں کہ وہ کھلا ہوتا اور اس کی چوکھٹ دو تہائی ذراع کے برابر اونچی نہ ہوتی تو نماز صحیح نہ ہوتی اس لئے کہ اس صورت میں کعبہ میں سے کسی چیز کی طرف استقبال نہ ہوتا (اھ)۔ یہ عجیب وغریب قسم کی تعلیل اور تفریع ہے اور صحیح بخاری میں بعض رواۃ سے یہ مروی ہے کہ آپ ﷺ نے دروازے کو بند کرنے کا اس لئے حکم دیا تا کہ بیت اللہ میں سے کسی چیز کی طرف استدبار نہ ہو۔ لیکن یہ بات اس وجہ سے قابلِ ردّ ہے کہ جب دروازہ بند ہو گیا تو وہ ایسے ہو گیا جیسا کہ بیت اللہ کی دیوار۔

پھر جب ابن الزبیرؓ نے کعبہ کو گرا دیا تو ستونوں کو رکھا اور ان پر پردے ڈال دیئے تا کہ استقبال کرنے والے استقبال کر سکیں اور طواف کرنے والے طواف کر سکیں اور تحقیق ابن عباسؓ نے ابن الزبیرؓ سے کہا کہ اگر تو کعبے کو گرانا ہی چاہتے ہو پس لوگوں کو اس طرح نہ چھوڑو کہ ان کے لئے کوئی قبلہ نہ ہو یعنی قبلہ کی کوئی علامت نہ ہو۔ پس اس ارشاد میں اس بات کی کوئی دلالت نہیں ہے کہ ان دونوں حضرات کے نزدیک بیت اللہ کی زمین (یعنی وہ ٹکڑا) بیت اللہ کی طرح نہیں ہے جیسا کہ ابن حجرؒ نے اس کو سمجھا ہے اس لئے کہ خارج سے ''ھواء'' (فضائے) کعبہ کی طرف استقبال کے جواز پر اجماع ہے اور اسی وجہ سے حضرت جابرؓ نے فر[illegible] صلوا [illegible] اضعفا کہ مواضع کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو اور داخل اور خارج میں کوئی فرق نہیں ہے بخلاف

امام شافعیؒ کہ وہ "ھواء" کعبہ کی طرف استقبال کو خارج والے کیلئے صحیح قرار دیتے ہیں نہ کہ داخل کیلئے۔

عمودا عن یسارہ وعمودین عن یمینہ :اور بعض روایات میں یوں وارد ہے **جعل عمودین عن یسارہ وعمودا عن یمینہ**۔ ان میں تطبیق متعدد بار دخول مان لینے کی صورت میں تو ظاہر ہے اور اگر متعدد مرتبہ دخول نہ مانو تو اس صورت میں ایک کو موقف صلوٰۃ اور دوسرے کو موقف دُعاء پر محمول کریں گے۔ واللہ اعلم۔

وثلاثۃ اعمدۃ وراءہ :ای خلفہ اور بعض نے کہا ہے قدامہ یعنی تین ستون آگے کی طرف تھے۔

وکان البیت یومئذ علی ستۃ اعمدۃ :اور آج کل تین ستونوں پر ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا کہ یہ واقعہ حجاج کے عبد اللہ بن الزبیر کی لڑائی میں کعبہ کو گرانے اور تعمیر کرنے سے پہلے کا ہے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ مشہور یہ ہے کہ حجاج بن یوسف نے فقط خانہ کعبہ کے شمالی گوشہ کی دیوار کو بدلا تھا۔

ثم صلی :یعنی مغربی دیوار کی طرف منہ کرتے ہوئے جو اس مشرقی دیوار کے مقابل ہے کہ جس کے اندر دروازہ ہے ان دونوں کے درمیان تقریباً تین ذراع کا فرق ہے۔

امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ حضرت بلالؓ کی روایت جو مثبت ہے حضور ﷺ کے کعبہ کے اندر نماز پڑھنے کے بارے میں اس کے اور حضرت اسامہؓ کی روایت کے درمیان کہ جس میں نماز پڑھنے کی نفی ہے تطبیق یوں ہے کہ تمام محدثین کا حضرت بلالؓ کی روایت کو لینے میں اجماع ہے کیونکہ حضرت بلال کی روایت مثبت ہے اور اس میں ایک اَمر کی زیادتی ہے لہٰذا اسی کو ترجیح دینا واجب ہے اور باقی حضرت اسامہؓ کا نفی کرنا تو اس میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ جب یہ حضرات کعبہ میں داخل ہوئے اور انہوں نے دروازہ بند کرلیا اور دُعا میں مشغول ہو گئے پس حضرت اسامہؓ نے حضور ﷺ کو دُعا کرتے دیکھا تو اسامہ رضی اللہ عنہ بھی بیت اللہ کے کسی ایک کونے میں دُعا کرنا شروع ہو گئے اور حضور ﷺ دوسرے کونے میں تھے اور حضور ﷺ کے قریب حضرت بلالؓ تھے پھر جب حضور ﷺ نے نماز اداء کی تو حضرت بلالؓ چونکہ قریب تھے انہوں نے تو اس کو دیکھا لیکن حضرت اسامہؓ نے حضور ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا دور ہونے کی وجہ سے، نیز اس کے ساتھ ساتھ جب نماز بھی ہلکی پڑھی ہو اور حضرت اسامہؓ دروازہ بند کرنے اور دُعا میں مشغول رہے ہوں (تو پھر اس میں قوی امکان ہے کہ حضرت اسامہؓ نے نہیں دیکھا ہوگا) لہٰذا اگر وہ اپنے گمان پر عمل کرتے ہوئے اس کی نفی کریں تو یہ ان کے لیے جائز ہوگا۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ حضور ﷺ بیت اللہ میں دو مرتبہ داخل ہوئے ہوں ایک بار نماز پڑھی ہو اور دوسری بار دُعا کی ہو نماز نہ پڑھی ہو پس اس صورت میں احادیث کے درمیان تضاد نہ ہوگا۔ کرمانیؒ کی شرح میں اسی طرح منقول ہے۔

میرک شاہ نے فرمایا ہے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ متعدد بار داخل ہونے کا احتمال یہ جمہور کے اس مذہب کے خلاف ہے کہ حضور ﷺ کا ہجرت کے بعد کعبۃ المکرّمہ میں داخل ہونا صرف ایک ہی بار واقع ہوا ہے اور ابن حبانؒ نے فرمایا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ ان دونوں حدیثوں کو دو مختلف مرتبہ داخل ہونے پر محمول کرلیں ان میں سے ایک مرتبہ دخول فتح مکہ میں ہوا اس میں حضور ﷺ نے کعبہ کے اندر نماز پڑھی اور دوسری بار آپ ﷺ عید الاضحیٰ (یوم النحر) میں داخل ہوئے اور آپ ﷺ نے اس میں نماز نہ

پڑھی۔علامہ سہیلیؒ نے کہا ہے کہ دونوں مرتبہ آپ ﷺ حجۃ الوداع میں داخل ہوئے ایک مرتبہ یوم النحر میں داخل ہوئے اور نماز نہ پڑھی پھر اگلے دِن داخل ہوئے اور نماز پڑھی، دار قطنی نے اس کو اسنادِ حسن کے ساتھ ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔

اور بعض حضرات نے حضرت اسامہؓ کی نفی کو اس پر محمول کیا ہے کہ وہ چلے گئے تھے (جیسا کہ ابن المنذر نے اس کو روایت کیا ہے) تاکہ حضور ﷺ کے پاس وہ پانی کا ڈول لے کر آئے کہ اس سے ان صورتوں (تصویروں) کو مٹایا جائے جو کعبہ میں تھیں، پس نماز کا واقعہ ان کی عدم موجودگی میں ہوا۔ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ امام رازیؒ کی تفسیر میں یہ واقع ہوا ہے کہ انہوں نے حضرت بلالؓ کی حدیث میں اس طرح تنازع کیا ہے کہ جس سے ان کا اس حدیث کو ردّ کرنا معلوم ہوتا ہے اور علامہ طیبیؒ کا بھی کلام امام رازیؒ کی طرح ہے اور علامہ طیبیؒ کا یہ گمان کرنا کہ دونوں حدیثوں میں تعارض ہے پس اس کو نسخ پر محمول کیا جائے گا۔ یہ انتہائی خفیف بات ہے کیونکہ دار قطنی کی روایت ماقبل میں گزر چکی ہے کہ آخری عمل وہ نماز کا تھا (یعنی دوسری بار داخل ہونے کے وقت نماز پڑھی تھی) پس یہ نفی والی روایت کیلئے ناسخ ہوگی۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں اس میں قابل تامل بات یہ ہے کہ اخبار میں نسخ نہیں ہوتا تو شاید ابن حجرؒ کی مراد نسخ سے وہ نسخ ہے جو اس حکم کے ساتھ متعلق ہے جو آپ ﷺ کے فعل کی صورت میں جواز پر اور عدم فعل کی صورت میں نفی پر مرتب ہے اور تحقیق یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ بالفرض والتقدیر نماز نہ بھی پڑھی ہو تو یہ جواز کی نفی پر دلالت نہیں کرتا۔ اس کو خوب سمجھ لو۔

اور آپ ﷺ کے کعبہ میں داخل ہونے اور اس میں نماز پڑھنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ کعبہ میں داخل ہونا مسنون ہے اور بیہقی کی روایت اس کی تائید بھی کرتی ہے اور امام بیہقیؒ نے فرمایا ہے کہ اس روایت میں ایک راوی ایسا ہے جو قوی نہیں اور ابن ابی شیبہ نے اس کو مجاھدؒ کا قول قرار دیا ہے وہ روایت یہ ہے: **من دخل البیت دخل فی حسنة وخرج من سیئته وخرج مغفورًا**۔ جو بیت اللہ میں داخل ہوا وہ نیکی میں داخل ہوا اور بُرائی سے نکل گیا اور بخشا بخشایا نکلا۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے، پس اے مخاطب اگر تو کہے کہ بعض نے کعبہ کے اندر داخل ہونے کو مکروہ گمان کیا ہے اس حدیث کی بناء پر۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے آج ایسا کام کیا ہے کہ اگر آئندہ مجھے موقع ملا تو میں اس کو اختیار نہیں کروں گا حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں نے کہا وہ کیا ہے اے اللہ کے رسول! فرمایا میں بیت اللہ میں داخل ہوا ہوں اور مجھے ڈر ہے کہ میرے بعد کوئی آنے والا آئے اور وہ یوں کہتا ہوں کہ میں نے حج تو کر لیا ہے لیکن بیت اللہ میں داخل نہیں ہوا۔ حالانکہ بیت اللہ میں داخل ہونا ہم پر فرض نہیں کیا گیا ہم پر تو صرف اس کا طواف فرض کیا گیا ہے۔

تو میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث اگرچہ ترمذیؒ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے مگر اس کی اسناد میں ایک ضعیف راوی ہے دوسرا یہ کہ مطلق کراہت کیلئے اس میں کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ اس میں اُس شخص کیلئے کراہت ہے کہ جو یہ وہم کرتا ہے کہ دخولِ کعبہ حج کے پورا ہونے کا حصہ ہے اور ہم بھی یہی کہتے ہیں۔

اور علامہ زرکشیؒ فرماتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ بیت اللہ میں کئی مرتبہ داخل ہو ایک بار داخل ہو تو چار رکعات پڑھے اور کبھی داخل ہو تو دو رکعتیں پڑھے اور کبھی صرف دُعا کرے اس میں روایات کے اختلاف کی بناء پر اور محققین نے اس اختلاف روایات کو کئی مرتبہ داخل ہونے پر محمول کیا ہے اور چاہیئے کہ اس میں داخل ہونے والا بھیڑ اور مزاحمت سے جس قدر ہو بچے، پس بیشک

اس دور میں اکثر داخل ہونے والے ایسے ہیں کہ جن کا نفع ان کے خسارے سے کم ہے اور ان کی فرمانبرداری ان کی نافرمانی سے کم ہے اور تحقیق علامہ ابن العربیؒ نے فرمایا ہے تمام تعریفیں اس ذات کیلئے ہیں جس نے حجر (خانہ کعبہ کا شمالی گوشہ جو حطیم میں داخل ہے) کو کعبہ شریفہ سے نکال کر ہماری بڑھاپے کے ضعف سے کفایت کی۔ پس تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا جب انہوں نے کعبہ میں داخل ہونے کے بارے میں سوال کیا، کہ اس گوشے میں نماز پڑھ کیونکہ کعبہ کا حصہ ہے اور جب کعبہ میں داخل ہو پس چاہیئے کہ ادب اور خشوع وخضوع سے داخل ہو اور داخل ہونے میں دائیں پاؤں کو مقدم کرے اور مسجد میں داخل ہونے کی جو دُعائیں منقول ہیں وہ پڑھے اور اس کے ساتھ اس آیت کو بھی زیادہ کرے: ﴿رَّبِّ اَدْخِلْنِی مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِی مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّی مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا﴾ [الاسرا: ۸۰] ''اور کہو کے اے پروردگار مجھے (مدینے میں) اچھی طرح داخل کرنا اور (مکے سے) اچھی طرح نکالیو اور اپنے ہاں سے زور وقوت کو میرا مددگار بنائیو۔'' اور کعبہ کی چھت کی طرف نہ دیکھے اور اسی طرح جو اس میں زینت ہے اس کو بھی نہ دیکھے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے فرماتی ہیں تعجب ہے مسلمان آدمی پر کہ جب وہ کعبہ میں داخل ہوتا ہے کیسے وہ اپنی نظر چھت کی جانب پھیرتا ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بزرگی کے باوجود حضور ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے اپنی نظر مبارک کو سجدہ کی جگہ سے نہیں ہٹایا یہاں تک کہ آپ ﷺ کعبہ سے باہر تشریف لے آئے۔ حاکمؒ نے اس کی تصحیح کی ہے اور ذہبیؒ نے اس کا تعاقب کیا ہے اور اس کو منکر قرار دیا ہے۔

متفق علیه: اور نسائیؒ نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ میرکؒ نے اسی طرح کہا ہے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے اور صحیحین میں ہے **انه جعل عمودین عن یساره وعمودا عن یمینه وثلاثة اعمدة وراءه** اور بخاری کی ایک روایت میں **عمودا عن یساره وعمودا عن یمینه** ہے۔ امام بیہقیؒ نے فرمایا کہ یہ صحیح ہے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مشکوٰۃ کا اس روایت کی نسبت یہ کہنا کہ اس کو شیخین نے نقل کیا ہے اس میں نظر ہے اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے: **ثم صلی وبینه وبین القبلة ثلاثة اذرع**۔ کہ آپ ﷺ نے نماز اس طرح پڑھی کہ آپ ﷺ کے اور کعبہ کی سامنے والی دیوار کا فاصلہ تین ذراع تھا اور بخاری کی ایک روایت میں ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ جب وہ بیت اللہ میں داخل ہوئے تو سامنے کی طرف بڑھتے یہاں تک کہ اس میں داخل ہو جاتے اور دروازے کو اپنے پیچھے کر لیتے پس تھوڑا چلتے یہاں تک کہ جب ان کے اور سامنے والی دیوار میں تین ذراع کا فاصلہ رہ جاتا تو پھر نماز پڑھتے اور اس جگہ کی تلاش کرتے تھے کہ جس کے بارے میں حضرت بلالؓ نے بتلایا تھا کہ حضور ﷺ نے اس میں نماز پڑھی تھی اور صحیحین میں ہے کہ حضرت بلالؓ نے ان کو خبر دی تھی جس میں یہ فرمایا تھا کہ حضور ﷺ نے اگلے حصے کے دو ستونوں کے درمیان نماز پڑھی اور دروازے کو پیچھے کیا اور چہرے کو اس طرف کیا کہ جس کی طرف داخل ہوتے وقت منہ کیا تھا آپ ﷺ کے اور دیوار کی درمیان تین ذراع کا فاصلہ تھا۔

اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے یہ عثمان بن طلحہ ان کا تعلق بنوعبدالدار سے ہے اور بنی عبدالدار تک بیت اللہ کی خدمت پہنچنے کا سبب یہ تھا کہ قبیلہ جرہم نے جب بیت اللہ کی حرمت کو ہلکا سمجھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو وہاں سے نکال دیا پھر قبیلہ خزاعہ اس خدمت کا

والی بنا پھر ان کے بعد قصیٰ بن کلاب بیت اللہ کی دربانی اور مکہ کے امور کا والی بنا پھر اس نے اپنے بیٹے عبدالدار کو بیت اللہ کی خدمت، اور جھنڈا، اور دارالندوۃ دے دیا (دارالندوہ قریش کے معززین اور سردار لوگوں کے جمع ہونے کیلئے جو گھر بنایا گیا تھا اس کو کہتے ہیں اور اس میں وہ اجتماعی مسائل کے حل کیلئے جمع ہوتے تھے اور دارالندوۃ کو دارالندوہ اس لئے کہتے تھے کہ اس میں قریش کے معززین کا اجتماع ہوتا تھا) اور اپنے دوسرے بیٹے عبدمناف کو رفادہ اور سقایہ کا انتظام دے دیا (رفادہ' وہ مال جو قریش ایامِ جاہلیت میں حاجیوں پر خرچ کرنے کیلئے اکٹھا کرتے تھے اور سقایہ سے مراد حاجیوں کو پانی پلانا) پھر عبدالدار نے بیت اللہ کی خدمت کی ذمہ داری اپنے بیٹے عثمان کو دے دی پھر یہ دربانی وخدمت اس عثمان کی اولاد میں رہی یہاں تک کہ عثمان بن طلحہ جس کا ذکر اس حدیث میں ہے وہ اس دربانی کا والی بنا، عثمان بن طلحہ فرماتے ہیں کہ ہم کعبہ کو پیر اور جمعرات کو کھولتے تھے پس حضور ﷺ ایک دِن تشریف لائے آپ ﷺ لوگوں کے ساتھ بیت اللہ میں داخل ہونا چاہتے تھے پس میں نے کچھ نازیبا الفاظ کہے اور حضور ﷺ نے میری اس حرکت پر بردباری کا مظاہرہ کیا پھر فرمایا اے عثمان! اے عثمان! عنقریب اس چابی کو میرے ہاتھ میں دیکھے گا میں جہاں چاہوں گا اس کو رکھوں گا میں نے کہا تب تو قریش ہلاک ہو جائیں گے اور ذلیل ہو جائیں گے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا بلکہ وہ معزز بنیں گے اور پھر آپ ﷺ کعبہ میں داخل ہو گئے لیکن یہ بات میرے دِل میں اُتر گئی اور مجھے یہ گمان ہو گیا کہ معاملہ اسی طرح ہوگا جیسے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے میں نے اسلام لانے کا ارادہ کیا تو میری قوم اس پر مجھ سے سختی سے پیش آئی اور انہوں نے مجھے سختی سے ڈانٹ کر اس سے روک دیا۔ پھر جب آپ ﷺ ذیقعد ۷ھ میں عمرۃ القضاء کیلئے تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے میرے دِل کو بدل ڈالا اور اسلام کو میرے دِل میں ڈال دیا لیکن میرے لئے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضری کا ارادہ نہ بنا یہاں تک کہ آپ ﷺ مدینہ لوٹ گئے پھر میرا نکلنے کا ارادہ بنا پس میں رات کے وقت چلا راستے میں خالد بن ولیدؓ سے ملاقات ہوئی پس وہ بھی ہمارے ساتھ ہو گئے پھر ہم عمرو بن العاص کو ملے وہ بھی ہمارے ساتھ ہو گئے پس ہم مدینہ پہنچے، پس میں نے آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی پھر میں آپ ﷺ کے پاس ہی ٹھہرا یہاں تک رمضان ۹ھ کو فتح مکہ میں آپ ﷺ کے ساتھ نکلا آپ ﷺ جب مکہ میں داخل ہوئے تو فرمایا اے عثمان! چابی لے آؤ میں چابی لے آیا حضور ﷺ نے مجھ سے چابی لے لی پھر مجھے دے دی اور فرمایا اے بنوطلحہ! ہمیشہ ہمیشہ اس کو تم اپنے پاس رکھو سوائے ظالم کے اور کوئی تم سے اس چابی کو نہیں چھینے گا۔

اور ابن عباسؓ فرماتے ہیں جب حضور ﷺ نے چابی عثمان بن طلحہ سے لے لی پھر جب دوبارہ دینا چاہی تو حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہو اس کو سقایہ کے ساتھ میرے لیے جمع کر دیں تو عثمان بن طلحہؓ نے اپنا ہاتھ روک لیا اس ڈر سے کہ کہیں عباسؓ کو نہ دے دیں حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو چابی مجھے دے دے حضرت عباسؓ نے فرمایا یہ لیں اللہ کے رسول' اللہ کی امانت کے ساتھ۔ حضور ﷺ نے چابی لے لی اور دروازے کو کھولا اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام یہ آیات لے کر تشریف لائے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا﴾ [النساء ۵۸] ''کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانت اداء کرو'' پھر وفات تک عثمان بن طلحہؓ بیت اللہ کے کھولنے اور دربانی کے والی رہے پھر یہ ان کے چچازاد بھائی شیبہ بن عثمان کو دے دی گئی پس یہ دربانی پھر بنوشیبہ میں باقی رہی۔

مسجد حرام کی ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے

۶۹۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةٌ فِیْ مَسْجِدِیْ هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ صَلَاةٍ فِيْمَا سِوَاهُ اِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۶۳/۳ حدیث رقم ۱۱۹۰۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ۱۰۱۲/۲ حدیث رقم (۵۰۵۔۱۳۹۴) وبین الروایتین اختلاف وأخرجه الترمذی فی السنن ۱۴۷/۲ حدیث رقم ۳۲۵۔وأخرجه النسائی مطولًا فی السنن ۳۵/۲ حدیث رقم ۶۹۴۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۴۵۰/۱ حدیث رقم ۱۴۰۴۔وأخرجه مالك فی الموطأ ۱۹۶/۱ حدیث رقم ۹ من کتاب القبلة۔وأخرجه الدارمی فی السنن ۳۸۸/۱ حدیث رقم ۱۴۱۸ وفی الباب عن ابن عمر۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری اس مسجد میں نماز پڑھنا دوسری مسجدوں میں ہزار نمازیں پڑھنے سے بہتر ہے سوائے مسجد حرام کے'' (بخاری و مسلم)

تشریح: صلاۃ: یہ تنکیر وحدت کیلئے ہے ای صلاۃ واحدۃ۔

فی مسجدی هذا: یعنی مدینہ کی مسجد نہ کہ مسجد قباء۔ امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ: مطلب **فی مسجدی هذا** کا یہ ہے کہ نماز وہاں اداء کرنے کا اہتمام کرے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں مسجد تھی نہ کہ اس جگہ میں جو بعد میں مسجد میں زیادہ کی گئی کیونکہ اجر کا بڑھنا وہ پہلے کے ساتھ خاص ہے اور امام سبکی وغیرہ نے اس بات میں امام نوویؒ کی موافقت اختیار کی ہے اور ابن تیمیہ نے اس پر اعتراض کیا ہے اور اس پر طویل کلام کیا ہے اور محبّ طبریؒ نے بھی اور ان دونوں نے اس مقام پر آثار واحادیث کو ذکر کیا ہے کہ جن سے اپنے مؤقف پر استدلال کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک دلیل یہ بھی ہے کہ مسجد الحرام کے بارے میں یہ بات مسلم ہے کہ وہاں اجر کا بڑھنا وہ اس جگہ کے ساتھ خاص نہیں ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھی۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ حدیث میں صرف اشارہ ہے ان مساجد کو اس حکم سے نکالنے کا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ تیسری دلیل اس بارے میں یہ ہے کہ امام مالکؒ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے عدم خصوصیت کے ساتھ جواب دیا اور یہ اشارہ فرمایا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے اس چیز کے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوگا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے زمین کو سمیٹ دیا گیا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کو جو آئندہ ہوگی جان لیا اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو خلفائے راشدینؓ صحابہ کی موجودگی میں اس پر زیادتی کرنے کو جائز نہ سمجھتے اور خلفائے راشدینؓ پر صحابہ میں سے کسی نے انکار بھی نہیں کیا اور اس پر ایک دلیل حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے جو تاریخ مدینہ میں منقول ہے کہ حضرت عمرؓ جب مسجد نبوی میں توسیع سے فارغ ہوئے تو فرمایا: **لو انتهی الی الجبانة وفی روایة الی ذی الحلیفه لکان مسجد رسول الله** صلی اللہ علیہ وسلم کہ کاش میں اس توسیع میں جبانہ یا ذوالحلیفہ تک پہنچتا (تو البتہ ساری کی ساری مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوتی)، اور اس لئے بھی کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے اس مسجد میں جو بھی زیادتی کی گئی تو وہ ساری کی ساری میری مسجد ہی ہوگا اور ایک روایت میں ہے کہ اگر میری مسجد صنعاء تک

بنائی گئی تو وہ ساری کی ساری میری مسجد ہوگی۔ یہ سارا کلام ابن حجرؒ کی کتاب **الجوهر المنظم فی زيادة القبر المكرم** سے بطورِ خلاصہ کے ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

خير من الف صلوة فيما سواه الا المسجد الحرام : کیونکہ مسجد الحرام میں نماز وہ میری اس مسجد میں ہزار نمازوں سے افضل ہے۔ ابن الملکؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ بعض نے کہا ہے کہ استثناء میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ میری مسجد میں نماز پڑھنا وہ مسجد الحرام میں ہزار نمازوں سے بڑھ کر نہیں ہے بلکہ اس سے کم ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں یہ مراد لیا جائے کہ مسجد حرام میں نماز افضل ہے اور مساوات کا بھی احتمال ہے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ وہ حدیث جو فصل ثانی کے آخر میں آرہی ہے وہ دونوں طرف کے احتمالوں کو ردّ کرتی ہے اس میں یوں منقول ہے : **صلاة فی مسجدی بخمسين الف صلٰوة و صلٰوة فی المسجد احرام بمائة الف صلٰوة**۔ ابن ماجہ نے اس کو روایت کیا ہے۔

متفق عليه : اور نسائی نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ (**قاله ميرك**) ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے مالکیہ نے مدینہ کی مکہ پر افضلیت کو سمجھا ہے اور انہوں نے **الا المسجد الحرام** کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ بے شک مسجد المدینہ میں نماز پڑھنا یہ افضل ہے مکہ کی مسجد (مسجد حرام) میں نماز پڑھنے سے ہزار سے کم۔ (یعنی باقی مساجد کے مقابلے میں ہزار اور مسجد الحرام کے مقابلے میں ہزار سے کم) حالانکہ یہ مالکیہ کی بقیہ احادیث سے غفلت کی وجہ سے ہے وہ احادیث ان کے اس سمجھے ہوئے معنی کو باطل قرار دینے والی ہیں بلکہ اس جملے کا معنی یہ ہے کہ مسجد الحرام میں نماز پڑھنا مسجد نبوی کے مقابلے میں کئی گنا زیادتی اجر کا سبب ہے۔ جیسا کہ مسندِ احمد بزار اور صحیح ابن حبان کی روایت میں اس کی تصریح موجود ہے روایت کی سند یوں ہے حماد بن زید عن حبیب المعلّم عن عطاء عن عبداللہ بن الزبیر۔ عبداللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: **صلاة فی مسجدی هذا افضل من الف صلٰوة فی غيره من المساجد الا المسجد الحرام و صلاة فی المسجد الحرام افضل من الصلٰوة فی مسجدی هذا بمائة الف صلوة**۔ کہ میری اس مسجد میں نماز پڑھنا باقی مساجد کی بنسبت ہزار نمازوں سے افضل ہے مگر مسجد حرام اور مسجد حرام میں نماز پڑھنا میری اس مسجد میں نماز پڑھنے کی بنسبت ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔

اور اس روایت کی اسناد شیخین کی شرط پر ہے اور اس لئے بھی کہ مالکیہ کے ائمہ میں سے ابن عبدالبر نے اس کی تصحیح کی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث تنازع کے وقت حجت ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ حدیث ثابت ہے اس میں کسی کیلئے طعن کی گنجائش نہیں ہے سوائے اس بے جا کلام کرنے والے کیلئے کہ جس پر حبیب معلم کے بارے میں کلام کرنے پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ تحقیق امام احمدؒ حبیب کی مدح اور توثیق فرمایا کرتے تھے اور ابن مھوی اور یزید بن زریع اور حماد بن زید اور عبدالوھاب ثقفی وغیرھم اس سے روایت کرتے تھے اور یہ سارے کے سارے ائمہ ہیں اور ایسے علماء میں سے ہیں کہ جن کی اقتداء کی جاتی ہے اور حدیث کے باقی راوی سارے کے سارے ثقہ ہیں اور ائمہ میں سے ہیں اور بعض نے اس روایت کو معلول قرار دیا ہے عطاءؒ پر کے اختلاف کی وجہ سے کیونکہ بعض نے عطاءؒ سے یہ روایت یوں نقل کی ہے عن عطاء عن ابی الزبیر اور بعض دوسرے حضرات نے یوں نقل کی ہے عن عطاء عن بن عمر اور بعض نے یوں عن عطاء عن جابر اور بعض علماء اس طرح کے اختلاف کو بھی علت شمار کرتے ہیں حالانکہ ایسی بات

نہیں ہے کیونکہ اس میں یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عطاءؒ نے ان تمام سے روایت سنی ہو بلکہ واقع میں ایسا ہی ہے جیسے کہ آگے آرہا ہے اور واجب ہے کہ جو حدیث عدول نے نقل کی ہو اس کو ردّ نہ کیا جائے الآیہ کہ ردّ پر کوئی دلیل قائم ہو جائے اور بزارؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث عطاءؒ سے مروی ہے اور اس حدیث میں عطاء پر اختلاف پایا جاتا ہے اور ہمیں معلوم نہیں کہ کسی نے یہ کہا ہو کہ وہ نماز سو ہزار (لاکھ) سے افضل ہے سوائے ابن الزبیر کے (یعنی **بمائۃ الف** کے الفاظ ابن الزبیر سے منقول ہیں) اور تحقیق ربیع بن صبیح نے حبیب معلم کی متابعت کی ہے پس اس کو عطاء بن زبیر سے نقل کیا ہے اور عبدالملک بن ابی سلیمان نے عطاء عن ابن عمرؓ سے روایت کی ہے اور ابن جریج نے عطاء عن ابی سلمۃ عن ابی ہریرہ کی سند سے روایت کی ہے۔ یہ ابن عبدالبر کا کلام تھا اور اس کلام کا حسن زیادتی کا محتاج نہیں ہے اور اسی وجہ سے امام ذہبیؒ نے فرمایا ہے **اسنادہ صالح** کہ اس حدیث کی سند صالح ہے۔

اور ابن ماجہ میں سند کے ساتھ (جس سند کے بعض راویوں میں ضعف ہے) یہ روایت منقول ہے: **صلاۃ فی مسجدی ھذا افضل من الف صلوۃ فیما سواہ وصلاۃ فی المسجد الحرام افضل من مائۃ الف صلوۃ فیما سواہ** اور ابن عبدالبر کی روایت کہ جس کی سند کے بارے میں انہوں نے کہا ہے: **رجال اسنادہ علماء احلاء** کہ اس سند کے راوی سارے کے سارے بڑے چوٹی کے علماء ہیں اور ابن عبدالبر کی روایت کے الفاظ ابن ماجہ کی روایت کی طرح ہیں اور ابن زنجویہ نے اس کو ان الفاظ سے نقل کیا ہے: **الا المسجد الحرام فانھا تعدل مائۃ الف صلٰوۃ فی مسجد المدینۃ** اور بزار کی روایت میں یوں ہے: **فضل الصلٰوۃ فی المسجد الحرام علی غیرہ مائۃ الف صلٰوۃ وفی مسجدی الف صلوۃ وفی مسجد بیت المقدس خمسمائہ صلٰوۃ** اور ابن ماجہ کی روایت میں یوں ہے: **صلٰوۃ الرجل فی بیتہ بصلاۃ وصلاتہ فی مسجد القبائل بخمس وعشرین صلاۃ وصلاتہ فی المسجد الاقصٰی ومسجد المدینۃ بخمسین الف صلوۃ وصلاتہ فی مسجد الحرام بمائہ الف صلوۃ۔** کہ گھر میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب ایک نماز کا اور محلے کی مسجد میں ۲۵ نمازوں کا اور مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی میں ۵۰ ہزار اور مسجد الحرام میں ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ہے اور طبرانی کی روایت میں: **صلاۃ فی مسجدی ھذا بعشرہ الاف صلاۃ وصلوۃ فی المسجد الحرام بعشرۃ امثالھا بمائہ الف صلوۃ وصلوۃ الرجل فی بیت المقدس بالف صلوۃ وصلوۃ الرجل فی بیتہ حیث لا یراہ افضل من ذلک کلہ۔** ''کہ میری اس مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب دس ہزار نمازوں کے بقدر ہے اور مسجد الحرام میں اس کے دس گنا یعنی ایک لاکھ کا ثواب ہے اور بیت المقدس میں ایک ہزار کا ثواب ہے اور آدمی کا اپنے گھر میں اس طرح نماز پڑھنا کہ اس کو کوئی دیکھ نہ رہا ہو وہ ان تمام سے افضل ہے''۔

ملا علی قاری علیہ رحمۃ الباری فرماتے ہیں میں کہتا ہوں کہ **صلاۃ الرجل فی بیتہ** کو پہلے تو فرض پر محمول کیا جائے گا اور دوسرے درجے میں اس کو نفل پر محمول کریں گے تاکہ دونوں باتوں میں تعارض نہ ہو یا اس کو عذر پر محمول کریں گے۔

اور عمرؓ سے صحیح طریقے سے روایت مروی ہے ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت ایسی سند کے ساتھ مروی ہے جو صحت میں سورج کی طرح واضح ہے روایت یہ ہے: **صلاۃ فی المسجد الحرام افضل من مائۃ الف صلٰوۃ فی مسجد النبی ﷺ** اور عبداللہ بن زبیرؓ سے صحیح روایت میں یوں آیا ہے: **الصلاۃ فی المسجد الحرام تفضل علی مسجد النبی ﷺ**

بمائة ضعف۔

ابن عبدالبرؒ اور ابن حزمؒ نے فرمایا ہے کہ یہ دو جلیل القدر صحابی جب مسجد حرام کی مسجد نبوی پر فضیلت کو بتا رہے ہیں اور صحابہ میں سے کسی نے بھی ان کی مخالفت نہیں کی ہے تو گویا یہ اس مسئلے میں اجماع کی طرح ہو گیا۔

اور حسن بصریؒ کے ایک رسالہ میں یوں ہے جو انہوں نے اس زاہد آدمی کے نام لکھا جو مکہ سے باہر جانے کا ارادہ کیئے ہوئے تھا قال: **قال رسول الله ﷺ من صلی فی المسجد الحرام**...... کہ جس نے مسجد حرام میں دو رکعتیں پڑھیں گویا اس نے میری مسجد میں ہزار نمازیں پڑھیں اور میری مسجد میں نماز پڑھنا اس کے علاوہ دوسرے شہروں میں ہزار نمازیں پڑھنے سے افضل ہے۔

جب تو اس بارے میں غور کرے تو تجھے اس بات کا ضعیف ہونا معلوم ہو گا جو اس روایت: **صلاة بالمسجد الحرام افضل من مائة الف صلوٰة** کی بناء پر کی گئی ہے کہ مسجد الحرام میں ایک نماز پڑھنا یہ (۵۵) سال (۶) ماہ اور (۲۰) راتوں کی عمر کے ثواب کو پہنچ جاتا ہے اور پانچ نمازیں مسجد الحرام میں پڑھنا یہ (۲۷۷) سال (۷) ماہ (۱۰) راتوں کو پہنچ جاتا ہے۔

اور اسی طرح اس بات کا بھی ضعیف ہونا معلوم ہو جاتا ہے کہ مسجد حرام میں نماز پڑھنا ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے جیسا کہ وارد ہوا۔ لہٰذا مسجد حرام میں نماز پڑھنا جماعت کے ساتھ ۲۷ لاکھ نمازوں کے برابر ہے اور مسجد حرام میں پانچ نمازیں پڑھنا ایک کروڑ پچیس لاکھ نمازوں کے برابر ہے اور آدمی کا ان تین مساجد کے علاوہ ہر سو سال شمسی میں ایک لاکھ اسّی ہزار نمازوں کے برابر ہے (یعنی سو سال میں اس کی نمازوں کا حساب ایک لاکھ اسّی ہزار ہے) اور ہر ہزار سال میں اٹھارہ لاکھ نمازوں کا حساب بنتا ہے۔ پس خلاصہ یہ نکلا کہ مسجد حرام کی ایک نماز جو جماعت سے اداء کی جائے اس کا ثواب اس شخص کی نماز سے بڑھ جاتا جس نے اپنے شہر میں اکیلے نماز پڑھی یہاں تک کہ اس کو نوح علیہ السلام کی عمر بھی دوگنا کر کے دی جائے (پھر بھی یہ اپنے شہر میں اکیلا نماز پڑھنے والا مسجد حرام کی ایک نماز کا مقابلہ نہیں کر سکتا) اور یہ فائدہ ایک منزل طے کرنے کے برابر ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں یہ ساری کی ساری بات پہلے کی طرح صحیح روایت سے غفلت کی بناء پر ہے صحیح روایت یہ ہے کہ مکہ میں ایک نماز افضل ہے مسجد نبوی میں ایک لاکھ نمازیں پڑھنے سے۔ ورنہ تو نیکیاں اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہیں اتنی زیادہ کہ جن کی کوئی حد نہ ہو۔

پھر روایات میں جو اَجر کے بڑھنے میں اختلافات ہیں اس سے ان کے درمیان کوئی تضاد و تنافی پیدا نہیں ہوتی کیونکہ اس میں یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ کم اجر والی روایت زیادہ اجر والی روایت سے پہلے کی ہو پھر اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرما کر آہستہ آہستہ اَجر بڑھا دیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ اعداد کا تفاوت احوال کے تفاوت کی وجہ سے ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک نیکی کا اَجر ۱۰ گنا، ۷۰ گنا اور ۷۰۰ گنا تک ہوتا ہے یہاں تک اس مقدار تک کہ جس کی کوئی انتہاء نہیں ہے (یعنی کبھی ۱۰ گنا کبھی وہی نیکی ۷۰ گنا اور کبھی ۷۰۰ تک الی مالانھایۃ)۔

اور حدیث میں آیا ہے ایک گھڑی کا تفکر سال کی عبادت سے افضل ہے ابن حجرؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے اور امام خطابیؒ نے فرمایا ہے کہ فاکھانیؒ نے ان الفاظ: **فکر ساعة خیر من عبادة سنة** کو سری سقطیؒ کے کلام میں سے شمار کیا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں میں کہتا ہوں جامع صغیر میں سیوطیؒ نے ذکر کیا ہے کہ **فکرۃ ساعة خیر من عبادۃ ستین سنة** اس روایت کو ابوالشیخ نے العظمۃ میں ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

اور علماءِ کرام کا اس اَجر کے بڑھنے کے محل میں اختلاف ہوا ہے یعنی مسجد المکہ میں نماز کا اَجر ایک لاکھ ہے تو وہ کونسی جگہ ہے۔اس میں چار اقوال ہیں:

① وہ حرم ہے۔

② مسجد الجماعہ جس جگہ نماز نماز جماعت سے پڑھی جائے اور یہی ہمارے اصحاب (حنفیہ) کے کلام سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور بعض شافعیہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اس لئے کہ ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ فضیلت وہ فرائض کے ساتھ خاص ہے نہ کہ نوافل کے ساتھ کیونکہ نوافل پڑھنا گھر میں افضل ہے پس انہوں نے گھر کے حکم کو مسجد کے حکم کے علاوہ بتایا ہے۔ابن حجر عسقلانیؒ نے فرمایا ہے کہ افضل صلوٰۃ المرء والی حدیث کو اس کے عموم پر باقی رکھنا ممکن ہے پس نفل نماز مکہ یا مدینہ کے گھر میں پڑھنا اَجر میں پڑھی ہوئی ہوگی اس نفل نماز کے مقابلے میں جو ان دونوں جگہ کے علاوہ اور کسی جگہ کے گھر میں پڑھی جائے اگر چہ گھروں میں مطلقاً نفل نماز پڑھنا افضل ہے۔

③ اس سے مراد مکہ ہے اور بعض حضرات نے اسی کو اختیار کیا ہے،ابن ماجہ کی حدیث کی بناء پر **صلاۃ بمکة بمائة الف۔** مکہ کی نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔

④ وہ کعبہ ہے،لیکن یہ قول انتہائی بعید ہے۔بعض نے کہا ہے کہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حرم کی تمام نیکیوں میں سے ہر نیکی ایک لاکھ کے برابر ہے۔اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ حرم کی ہر نیکی مطلقاً ایک لاکھ نیکیوں کے برابر ہے لیکن جماعت سے نماز پڑھنا مسجد الحرام میں وہ اس سے بھی زیادہ ہے اسی وجہ سے حضور ﷺ نے فرمایا : **بمائه الف صلاۃ فی مسجدی۔** ''**بمائه الف حسنة**'' نہیں فرمایا اور حضور ﷺ کی مسجد میں نماز پڑھنا ہزار نمازوں کے برابر ہے ہر نماز دس نیکیوں کے ساتھ ہوگی پس حضور ﷺ کی مسجد میں نماز پڑھنے کا اَجر دس ہزار نیکیوں کے برابر ہوگا اور یہ بھی احتمال ہے کہ بعض نیکیوں کو بعض کے ساتھ ملحق کیا جائے گا۔ یا یہ خاص ہوگا اس نماز کے ساتھ جو صرف کعبہ میں پڑھی جائے ایک روایت کی وجہ سے جس میں **اِلاّ الکعبة** ہے اور نسائی کی ایک روایت میں **الا المسجد و الکعبه** ہے اور مسلم کی ایک روایت میں **الا مسجد الکعبة۔**

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے پھر اَجر کا دو چند ہونا یہ صرف فرض کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ نفل کو بھی شامل ہے بعض حنفیہ اور مالکیہ وغیرہ کو اس سے اختلاف ہے اگر چہ نفل کا اَجر فرض سے کم ہوگا کیونکہ فرض نفل سے ۷۰ درجے زیادہ ہوتا ہے اور یہ بات نفل کے گھر میں پڑھنے کے ثواب کی زیادتی کے منافی نہیں ہے (یعنی گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے) حتی کہ کعبہ میں نفل پڑھنے سے گھر میں پڑھنا افضل ہے۔اس حدیث صحیح کی بناء پر کہ جس میں ارشادِ نبوی ہے :**افضل صلاۃ المرء فی بیته الا المکتوبة۔** اس لئے کہ سنت کا اتباع وہ اَجر کے دو چند ہونے سے بھی فوقیت رکھتا ہے اسی وجہ سے امام سبکیؒ نے فرمایا ہے کہ ظہر کی نماز یوم النحر (عید الاضحیٰ) میں منیٰ میں پڑھنا افضل ہے مکہ میں مسجد الحرام میں نماز پڑھنے سے اگر چہ اَجر کا دو چند ہونا اور بڑھنا وہ صرف مسجد

الحرام کے ساتھ خاص ہے کیونکہ یہ بات پہلے ثابت ہو چکی ہے کہ اتباعِ سنت پہ عمل کی فضیلت سے بڑھ کر ہے (یعنی ایک طرف اتباعِ سنت ہے اور دوسری جانب ایک لاکھ نمازوں کا ثواب تو اصل وہ اتباعِ سنت ہے اور یہی اولیٰ و افضل ہے) اور راجح قول کے مطابق یہ بڑھوتری (مضاعفت) صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ پھر جو **مائة الف یا بالف صلوٰۃ** کی زیادتی ہے وہ صرف اَجر میں ہے نہ کہ اِجزاء میں (یعنی یہ نہیں کہ ایک نماز پڑھنے سے ایک لاکھ نمازیں اداء ہو گئیں لہٰذا قضا شدہ نمازیں اداء ہو گئیں) یہ مسئلہ متفق علیہ ہے، پس ان تینوں مساجد میں سے کسی ایک میں نماز پڑھنا وہ صرف ایک ہی نماز کی طرف سے کافی ہوگا، اجماعاً ایک سے زیادہ کی طرف سے کافی نہ ہوگا۔

اور یہ جو مشہور ہے عوام الناس میں کہ جس نے کعبہ کے اندر چار رکعت نماز پڑھ لی تو اس کی عمر بھر کی قضاء ہو گی یہ باطل ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ پھر یہ اَجر کی زیادتی صرف نماز ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام نیکیوں کو یہ بات عام ہے اور اسی طرح حسن بصریؒ نے وضاحت کی ہے فرمایا ہے: **صوم یوم بمکہ بمائة الف......** کہ مکہ میں ایک روزہ رکھنا ایک لاکھ روزوں کے برابر ہے اور ایک درہم کا صدقہ کرنا ایک لاکھ درہموں کے صدقہ کے برابر ہے اور ہر نیکی ایک لاکھ کے برابر ہے۔

اور ایک حدیث میں آیا ہے جس حدیث کی سند حسن ہے بخلاف ان لوگوں کے کہ جنہوں نے اس کو ضعیف قرار دیا: **ان حسنات الحرم کل حسنة بمائة الف حسنة** اور ابن ماجہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ: **من ادرك شهر رمضان بمكه فصامه وقام فيه ما تيسر كتب له مائه الف شهر رمضان فيما سواه وكتب له بكل يوم وليلة عتق رقبه وفي كل يوم حمل فرسين في سبيل الله:** ”کہ جس نے مکہ میں رمضان پایا پس اس نے روزے رکھے اور نمازیں اور نفلیں پڑھی جو اس کے لئے میسر ہو تو اس کے لئے مکہ کے علاوہ ایک لاکھ رمضان کا ثواب لکھا گیا اور ہر دِن ورات میں ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ملا اور ہر دِن میں دو گھوڑے سامان سے لادے ہوئے اللہ کے راستے میں صدقہ کرنے کا ثواب ملا“۔

اور بزار کی روایت میں ہے **رمضان بمکه افضل من الف رمضان بغير مكة۔** ”مکہ کا رمضان دیگر جگہوں کے رمضان کی نسبت ایک لاکھ گنا فضیلت والا ہے۔“

اور علماء کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ جیسے نیکیاں دو چند ہوتی ہیں مکہ میں اسی طرح برائیاں بھی دو چند ہوتی ہیں ان علماء میں ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور مجاہدؒ اور احمد بن حنبلؒ ہیں۔ یہ اس لئے کہ اس میں اس شہر کی عظمت و تعظیم ہے پھر بعض نے یہ کہا ہے کہ برائیوں کا دو چند ہونا یہ حرم میں نیکیوں کے دو چند ہونے کی طرح ہے، اور بعض نے کہا ہے نہیں بلکہ خارج حرم کی طرح دو چند ہوتی ہیں۔

اور جمہور حضرات اس مسئلہ میں قرآن کے عموم کو اختیار کرتے ہیں اور اس سے استدلال کرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ [الانعام: ۱۶۰] ”اور جو برائی لائے گا اسے سزا ویسی ہی ملے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا“ کہ برائی کا بدلہ اسی کے مثل ہوگا۔

اور بعض متاخرین نے سیئات کے دو چند ہونے کے قول کو اس پر محمول کیا ہے کہ اس دو چند ہونے سے مراد کیفیت میں دو چند ہونا ہے نہ کہ مقدار میں، پس بے شک بُرائی کا بدلہ بُرائی ہی ہے لیکن سیئات مختلف ہوتی ہیں اس لئے کہ وہ شخص جو بادشاہ کی

نافرمانی کرے اس کے ملک کی خاص جگہ میں (یعنی دارالخلافہ میں) ہر آدمی اس شخص کی طرح نہیں ہو سکتا جو اس کے شہر میں سے کسی کنارے میں اس کی نافرمانی کرے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس محمول کرنے میں بھی نزاع لوٹ آتا ہے اس لئے کہ ایسی بڑی برائی جو اگرچہ ایک ہی ہو لیکن ایک لاکھ کے بقدر ہو اس کے اور اس بُرائی کے درمیان جو ایک لاکھ بُرائیوں کے برابر ہو عدد کے اعتبار سے کیا فرق ہے؟ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جس کی نیکیاں اس کی بُرائیوں پر زیادہ ہو گئیں وہ جنت میں داخل ہو جائے گا اور جس کی برائیاں نیکیوں سے زیادہ ہو جائیں وہ جہنم میں داخل ہو گا اور جس کی برائیاں اور نیکیاں برابر ہو جائیں تو وہ اہل اعراف میں سے ہو گا۔

اور جو آیت حرم کی تعظیم پر دلالت کرتی ہے اور جس سے حرم میں بُرائی کرنے کے گناہ کا بڑا ہونا معلوم ہوتا ہے وہ آیت یہ ہے: ﴿وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [الحج: ۲۰] ''کہ جو حرم میں ظلم کے ساتھ الحاد کا ارادہ کریں تو ہم اس کو دردناک عذاب چکھائیں گے''۔ پس اس آیت سے ایک جماعت نے یہ مذہب اختیار کیا جیسا کہ ابن مسعودؓ کہ حرم کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ اس میں بُرائی کے ارادے پر بھی سزا دی جائے گی اگرچہ وہ اس بُرائی کا ارتکاب نہ کرے۔

اور مالکیہ نے **المدینة خیر من مکه** کی حدیث سے مدینہ کے افضل ہونے پر دلیل پکڑی ہے حالانکہ یہ ان کی دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ یہ حدیث ضعیف ہے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہ حدیث مرفوع ہے ابن عبدالبر وغیرہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے اور یہ روایت: **اللھم اخرجتنی من احب البقاع الیّ فاسکنی احب البقاع الیك۔** ''اے اللہ! تو نے مجھے اس جگہ سے نکالا ہے جو میرے نزدیک سب جگہوں سے محبوب ہے، پس مجھے اس جگہ سکونت عطا فرما جو تیرے ہاں سب سے زیادہ محبوب ہو۔'' مرسل ضعیف ہے اور بعض نے کہا ہے یہ موضوع روایت ہے۔

اور یہ حدیث **اللھم اجعل بالمدینة ضعفی ما بمکه من البرکه۔** ''اے اللہ مدینہ میں مکہ سے دو چند برکت عطاء فرما'' یہ فضیلت مدینہ پر دلالت کرتی ہے نہ کہ افضلیت پر اور مکہ کی فضیلت پر کئی احادیث صحیحہ وارد ہوئی ہیں۔

① **واللہ انك لخیر ارض اللہ واحب ارض اللہ الی اللہ۔** ''خدا کی قسم! بے شک اے ارض مکہ تو سب سے بہتر زمین ہے اور اللہ کے ہاں سب سے زیادہ محبوب ہے۔

② **ما اطیبك واحبك الی ولولا ان قومی اخرجونی منك ما سکنت غیرك** ۔''تو کس قدر پاکیزہ ہے اور کس قدر تو مجھے محبوب ہے اور اگر میری قوم مجھے یہاں سے نہ نکالتی تو میں تیرے سوا کہیں بھی سکونت اختیار نہ کرتا''۔

③ وہ حدیث کہ جس میں حضور ﷺ نے صحابہؓ کیلئے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا: **ای بلد تعلمونه اعظم جرمة قالوا لا الا بلدنا۔** ''کہ کونسا شہر ایسا ہے جس کو تم جانتے ہو جو حرمت کے اعتبار سے سب سے زیادہ بڑا ہوا ہے؟ تو صحابہ نے عرض کیا کوئی نہیں سوائے ہمارے اس شہر (مکہ) کے''۔

اور ایک روایت میں ہے کہ ابن عمرؓ اور جابرؓ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ حضور ﷺ نے لوگوں سے سوال کیا کہ کونسا شہر حرمت میں بڑا ہوا ہے صحابہ نے جواب میں فرمایا کہ وہ مکہ ہے اور اس پر صحابہ کا اجماع ہے کہ مکۃ المکرمہ سب سے افضل شہر ہے اور حضور ﷺ نے ان کی اس بارے میں تقریر فرمائی ہے۔ اس کو خوب اچھی طرح سمجھ لو۔

اور قاضی عیاضؒ وغیرہ نے اس زمین کے ٹکڑے کو جو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اعضاء شریف سے ملا ہوا ہے سب سے افضل قرار دیا ہے حتیٰ کہ کعبہ شریفہ سے بھی افضل قرار دیا ہے اور اس پر اجماع نقل کیا ہے اور یہ کہ اختلاف اس ٹکڑے کے علاوہ میں ہے۔ یہ بہرحال تمام سے افضل ہے اور ابو عقیل حنبلی سے نقل کیا ہے کہ وہ ٹکڑا عرش سے بھی افضل ہے۔

اور فاکھانیؒ نے تصریح کی ہے کہ یہ ٹکڑا تمام آسمانوں سے افضل ہے اور فرمایا ہے بلکہ ظاہر متعین بات یہ ہے کہ روئے زمین آسمانوں سے افضل ہے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زمین کے اندر موجود ہونے کی وجہ سے اور اس بات کو بعض نے اکثر علماء سے حکایت کیا ہے اس لئے کہ اسی زمین سے انبیاء کو پیدا کیا گیا اور اسی میں وہ مدفون ہوئے۔

اور علامہ نوویؒ اور جمہور حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ آسمان زمین سے افضل ہے، زمین سے مراد وہ زمین جو اس ٹکڑے کے علاوہ ہے جو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اعضاء شریف سے ملا ہوا ہے اور اختلاف کا محل وہ کعبہ کے علاوہ ہے، پس کعبہ باقی تمام مدینہ سے بالاتفاق افضل ہے سوائے آپکی قبر مقدس کے اور اس جگہ کے کہ جس میں آپکی ذات مبارکہ ہے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر درود و سلام نازل ہو جب تک صبح آتی رہے رات جاتی رہے۔

تین مساجد کے علاوہ سفر کرنا منع ہے

۶۹۳: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی وَمَسْجِدِیْ هٰذَا۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في الصحيح ۳/۷۰ حديث رقم ۱۱۹۷۔ وأخرجه مسلم في صحيحه ۲/۹۷۵ حديث رقم (۱۵ ۴ ـ ۸۲۷) وأخرجه الترمذي في السنن ۲/۱۴۸ حديث رقم ۳۲۱۔ وأخرجه السنائي في السنن ۲/۳۷۔ حديث رقم ۷۰۰۔ وأخرجه ابن ماجة في السنن ۱/۴۵۲ حديث رقم ۱۴۰۹ وأحمد في المسند ۳/۷۔ وأخرجه عن أبي هريرة رضي الله عنه أبو داؤد في السنن ۲/۵۲۹ حديث رقم ۲۰۳۲۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا تین مساجد کے علاوہ تم اپنے کجاوہ نہ باندھو مسجد حرام' مسجد اقصیٰ' اور میری مسجد''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **لا تشد الرحال**: رِحال ''رحل'' کی جمع ہے کجاوے کو کہتے ہیں اور مراد اس سے کجاوہ باندھنے کی فضیلت کی نفی کرنا ہے۔

الا الی ثلثة مساجد: بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ نفی ''نہی'' کے معنی میں ہے ای **لا تشدوا الی غیرها** کہ ان تین مساجد کے علاوہ سفر نہ کرو اس لئے کہ ان کے علاوہ جو مساجد ہیں وہ رتبہ میں برابر ہیں ان کی فضیلت میں کوئی تفاوت نہیں ہے لہٰذا یہ سفر کرنا ضائع اور فضول ہوگا اور شرح مسلم للنووی میں مذکور ہے کہ ابو محمدؒ نے فرمایا ہے کہ ان تین مساجد کے علاوہ کی طرف سفر کرنا حرام ہے اور یہ بات ان کی غلط ہے، اور احیاء میں لکھا ہے کہ بعض علماء نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ مقاماتِ مقدسہ قبور الصحابہ اور متبرک جگہیں) اور علماء و صلحاء کی قبور کی زیارت کرنا منع ہے اور جو بات میرے لئے یہاں پر واضح

ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ معاملہ اس طرح نہیں ہے بلکہ زیارتِ قبور کا تو حکم دیا گیا ہے دلیل یہ حدیث ہے : **کنت نهیتکم عن زیارة القبور الا فذوروها** اور حدیث میں جو ''نہی'' وارد ہے ان تین مساجد کے علاوہ دوسری مساجد کی طرف سفر کرنے سے ہے تو وہ اس لئے کہ مساجد ان تین کے علاوہ برابر و متماثل ہیں بلکہ کوئی بھی شہر ایسا نہیں کہ جس میں کوئی مسجد نہ ہو، پس پھر کسی دوسری مسجد کی طرف سفر کرنے کا کوئی معنی نہ ہوگا اور باقی مقاماتِ مقدسہ پس وہ برابر نہیں ہوتے بلکہ ان کی زیارت کی برکت وہ ان متبرک مقامات میں مدفون حضرات کے اللہ کے ہاں درجات کے بقدر ہے۔ پھر کاش مجھے معلوم ہو کہ یہ کہنے والا کیا انبیاء کی قبور کی زیارت کیلئے سفر کرنے سے بھی روکتا ہے جیسے ابراہیم، موسیٰ اور یحییٰ علیہم السلام جیسے انبیاء کی قبور کی زیارت سے منع کرنا اور ان جیسی قبور کی زیارت سے منع کرنا انتہائی محال بات ہے اور جب انبیاء کی قبور کی اجازت دی گئی ہے اور اس کو جائز قرار دیا گیا ہے تو اولیاء بھی انہی کے معنی میں ہیں، پس اگر اولیاء کی قبور کی زیارت کی غرض سے سفر ہو تو اس میں کوئی بعید بات معلوم نہیں ہوتی جیسا کہ علماء کی زیارت ان کے زندہ ہونے کی حالت میں مقاصد میں سے ہے (تو اسی طرح ان کے مرنے کے بعد بھی زیارت نفع سے خالی نہ ہوگی)۔

مسجد الحرام : یہ بدلیت کی بناء پر مجرور ہے اور بعض نے رفع اور نصب بھی دیا ہے اور ان کی وجہ ظاہر ہے۔

والمسجد الاقصیٰ : مسجد کے ساتھ الاقصیٰ کی صفت اس لئے ہے کہ یہ مسجدِ حرام سے دور ہے اور شاید اس کے مسجد نبوی پر وجوداً مقدم ہونے کی وجہ سے ذکر میں بھی مقدم کر دیا ہے۔

ومسجدی هذا: مراد اس سے مدینہ کی مسجد ہے اور ان تینوں مساجد کی خصوصیت اس لئے ہے کہ ان کو انبیاء علیہم السلام نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اور یہ ان کی مساجد تھیں۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قدیم میں ان کا ذکر علی وجہ التعظیم والتکریم کیا ہے اور اس میں اس قول کے راجح ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جس میں یہ کہا گیا ہے: ﴿ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى ﴾ [التوبة: ۱۰۸] میں مسجد سے مراد مسجد نبوی ہے پھر مسجد قباء وہ مسجدِ نبوی کے تابع ہے یا اس کے ساتھ ملحق ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس میں پیروی کرتے ہوئے کیونکہ آگے روایت اس بارے میں آرہی ہے اور شاید کہ مسجد قباء کے ذکر کو اس لئے چھوڑا کہ عموماً اس کی طرف سفر نہیں کیا جاتا۔ (**قاله میرك**)

رِيَاضُ الْجَنَّةِ

۶۹۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَا بَيْنَ بَيْتِیْ وَمِنْبَرِیْ رَوْضَةٌ مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ وَمِنْبَرِیْ عَلٰى حَوْضِیْ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۳/۷۰ حدیث رقم ۱۱۹۶۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ۲/۱۰۱۱ حدیث رقم (۵۰۲۔۱۳۹۱) وأخرجه الترمذی فی السنن ۵/۶۷۵ حدیث رقم ۳۹۱۵۔وأخرجه أحمد فی المسند ۲/۲۳۶۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''میرے گھر اور منبر کے

درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر حوض پر ہے۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: ما بین بیتی ومنبری: یہاں ''بیت'' سے مراد آپ ﷺ کے رہنے کا گھر ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد آپ ﷺ کی قبر ہے کیونکہ دوسری حدیث میں آیا ہے ما بین قبری ومنبری۔ لیکن ان دونوں باتوں کے درمیان کوئی منافات وتضاد نہیں کیونکہ آپ ﷺ کی قبر آپ ﷺ کے گھر ہی میں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد محراب ہے کیونکہ وہ منبر اور گھر کے درمیان میں ہے اس لئے کہ آپ ﷺ کے حجرے کا دروازہ مسجد کی طرف کھلتا تھا اور طبرانی کی ایک روایت میں: ما بین حجرتی ومصلای کے الفاظ مذکور ہیں۔

روضة من رياض الجنة: بعض نے کہا ہے کہ اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ نماز اور ذکر اس جگہ میں جنت کے باغوں میں سے ایک باغ کی طرف لے جانے والی ہیں اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: الجنة تحت ظلال السيوف۔ ''کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے'' اور اسی طرح حدیث میں آتا ہے: الجنة تحت اقدام الامهات ''کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے''۔ تو اس سے مراد یہ ہے کہ ماں سے نیکی اور صلہ رحمی کرنا یہ جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ جب تم جنت کے باغوں میں سے گزرو تو خوب چرو۔ صحابہؓ نے کہا اللہ کے رسولؐ! جنت کے باغ کیا ہیں؟ تو فرمایا مساجد اور ایک روایت میں ہے: حلق الذکر ''کہ ذکر کے حلقے''۔

علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ اس مبارک ٹکڑے کو باغ اس لئے کہا گیا کہ آپ ﷺ کی قبر کی زیارت کرنے والے اور آپ ﷺ کی مسجد کو آباد کرنے والے ملائکہ، جنات اور انسانوں میں سے ہمیشہ اللہ سبحانہ کے ذکر اور عبادت پر گھٹنے ٹیکے رہتے ہیں ایک گروہ جب چلا جاتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا گروہ آجاتا ہے۔ جیسا کہ ذکر کے حلقوں کو ریاض الجنہ کہا۔

ومنبری علی حوضی: یعنی حوض کے کنارے پر، پس جو اس منبر کے قریب حاضر ہوا میری کلام کو سننے کیلئے یا اس اثر سے برکت حاصل کرنے کیلئے تو وہ حوض میں بھی حاضر ہوگا اور حضور ﷺ نے اس حدیث میں تشبیہ بیان فرمائی ہے اس بات کی کہ منبر یہ زنگ آلودہ دِلوں کیلئے جہالت کے میدان میں پانی کے گھاٹ کی مانند ہے جیسا کہ حوض کوثر قیامت کی گرمی میں پیاسے جگروں کیلئے گھاٹ ہے اور یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ اس سے ایسی چیز مراد لی جائے کہ جس کی طرف ہماری عقول راہنمائی حاصل نہیں کرسکتی۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

اور امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ حدیث اپنے ظاہر پر باقی ہے اور یہ جنت کا ٹکڑا ہے جو وہاں سے لایا گیا ہے اور عنقریب (قیامت میں) واپس لوٹ جائے گا اور یہ باقی زمین کی طرح فناء اور ختم نہیں ہوگا اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے یہی اکثر حضرات کا مذہب ہے اور یہ اب بھی حقیقۃً جنت کا ٹکڑا ہے اگرچہ بھوک و پیاس وغیرہ اس میں ختم نہیں ہوتی کیونکہ یہ دارالدنیا کی صفت کے ساتھ متصف ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے منبر کو پہلی حالت پر لوٹا دیں گے پھر اس کو حوض پر نصب کر دیں گے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے اور یہ بھی اولیٰ اور بہتر ہے اس لئے کہ اصل یہی ہے کہ جس قدر ممکن ہو لفظ کو اس کے ظاہر پر باقی رکھا جائے۔ واللہ اعلم

ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ یہ روایت یوں بھی مروی ہے: ومنبری علی ترعة حوضی۔ نہایہ میں ہے کہ ترعہ کہتے

ہیں اس باغ کو جو خاص طور پر اونچی جگہ پر ہو اور بعض نے کہا ہے کہ ترعۃ کہتے ہیں سیڑھی کے پایہ کو، اور بعض نے کہا دروازے کو کہتے ہیں، اور بعض نے کہا ہے کہ ترعۃ الحوض سے مراد پانی کے اس کی طرف آنے کا دھانہ یعنی حوض کا دھانہ، پھر فرمایا اور یہ حدیث دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ آپ ﷺ کیلئے آخرت میں منبر ہوگا اور یہ بھی جائز ہے کہ اس سے دنیا میں آپ ﷺ کا منبر مراد لیا جائے تو پھر اس میں تشبیہ ہوگی اس بات کی کہ آپ ﷺ کا فیض حاصل کرنا اس چھلکتے ہوئے بلند حوض سے ہے (کہ جس پر آپ ﷺ کا منبر ہے، مراد اس علم الٰہی سے فیض ہے) اور اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ منبر اور حوض دونوں میں سے ہر ایک دوسرے سے متعلق ہے لہٰذا منبر سے نصیحت حاصل کیئے بغیر حوض کوثر سے سیرابی کی اُمید نہیں ہوسکتی۔

اور ابن حزمؒ نے فرمایا ہے کہ بعض غبی لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ ٹکڑا جنت سے لایا گیا ہے اور یہ ارضِ جنت میں سے ہے اور یہ کہ سیحان اور جیحان اور فرات اور نیل وہ دریا ہیں جو جنت سے اتارے گئے ہیں۔ یہ باطل ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جنت کی تعریف میں یوں فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۝ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ﴾ [طٰہٰ: ۱۱۸] ''کہ جنت میں تمہارے لیے یہ آرام ہے کہ تم نہ بھوکے رہو گے اور نہ ننگے ہو گے اور نہ یہاں پیاسے ہو گے اور نہ دھوپ میں تپو گے'' اور یہ ساری صفات نہ تو اس ٹکڑے میں موجود ہیں اور نہ ہی ان تمام نہروں کے اندر لہٰذا یہاں یہی کہنا صحیح ہوگا کہ اس کو جو یہ کہا گیا کہ روضة من رياض الجنة، یہ اس کی فضیلت کی وجہ سے کہا ہے اور ان نہروں کی جو جنت کی طرف اضافت کی گئی ہے وہ ان کے پاکیزہ اور بابرکت ہونے کی وجہ سے ہے جیسا کہ تو ایک خوشگوار اور اچھے دِن کے بارے میں کہتا ہے: هذا من ايام الجنة کہ یہ دِن تو جنت کے دِنوں میں سے ہے اور جیسا کہ ضان (بھیڑ کے بچے) کو کہا جاتا ہے کہ یہ جنت کے چوپاؤں میں سے ہے اور تحقیق حدیث میں بھی آیا ہے کہ حلق الذکر (ذِکر کے حلقے) جنت کے باغوں میں سے ہیں۔

ابن حجرؒ نے اس بارے میں ابن حزمؒ کا تعاقب کیا ہے کہ یہ آیت اس بارے میں دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ جب یہ مبارک ٹکڑا زمین کی طرف اُتار دیا گیا تو پھر اس کو دنیاوی احکامات دے دیئے گئے اسی وجہ سے اگر اس کے اندر داخل ہونے والے نے قسم کھالی کہ وہ جنت میں داخل ہو گیا تو وہ حانث ہو جائے گا اور اس میں جو ہوگا اس کو پیاس و بھوک وغیرہ بھی عارض ہوں گی اور محض اس چیز کے سبب ہونے سے اس کا جنت میں سے ہونا سلب نہیں ہوگا اور باقی اس ٹکڑے کے جنت میں سے ہونے کے باوجود اس کے اندر ان اوصاف (بھوک پیاس وغیرہ ہونا) کے نہ پائے جانے میں فائدہ یہ ہے کہ اس میں حضور ﷺ کی مسجد کو انتہائی شرف سے نوازنا ہے کہ اس مسجد میں ایک ٹکڑا ایسا بھی ہے کہ جو عین جنت کی زمین میں سے ہے۔ جیسا کہ صحیح روایت میں مروی ہے کہ حجر اسود اور مقامِ ابراہیم میں جو پتھر ہے وہ دونوں جنت کے یاقوت ہیں اور اگر ان کے نور کو ختم نہ کیا تو یہ دونوں پتھر مشرق اور مغرب کو روشن کر دیتے اور ابن عباسؓ سے صحیح روایت میں وارد ہے اور اس طرح کی بات رائے سے نہیں ہوسکتی لہٰذا یہ مرفوع کے حکم میں ہوگی وہ روایت یہ ہے کہ حجر اسود سفید یاقوت کی حالت میں جنت سے اُترا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو کالا کر دیا کہ اہلِ دنیا جنت کی زینت کو نہ دیکھ سکیں (یعنی اس لئے کہ جنت پر ایمان غیبی رہے مشاہداتی نہ بن جائے) اور اس کو اللہ تعالیٰ نے کعبہ کے وجود سے پہلے کعبہ کی جگہ میں اُتارا تھا تا کہ آدم علیہ السلام اس کے ساتھ مانوس ہو جائیں اور فرشتوں کی ایک جماعت سے اس کی پہرہ داری کروائی تا کہ انسان اس کی طرف نہ دیکھ سکیں اس لئے کہ یہ جنت میں سے ہے اور جس نے

جنت کو دیکھا وہ اس میں داخل ہوگا۔ پس جیسے یہ دونوں جنت میں سے ہیں اور ابن حزمؒ کیلئے اس کی تاویل کرنا ممکن نہیں ہے تو اسی طرح اس ٹکڑے کو بھی کہ جس کے بارے میں بات کر رہے ہیں جنت میں سے مان لیا جائے اور ابن حزمؒ نے جو ان انھار کے بارے میں گمان کیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے صحیح احادیث میں وارد ہیں کہ یہ انھار (سیحان، جیحان، نیل، فرات) حقیقۃً جنت سے اُتاری گئی ہیں۔ لیکن جب ان کو دنیا میں اُتارا گیا تو ان کو دنیاوی صفات بھی حاصل ہوگئیں۔

اور ابن حزمؒ کا **کما تقول فی الیوم الطیب**...... کہنا اس میں ان کے لئے اپنے مدعی کی کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ مذکورہ مثال اور ان جیسی دوسری مثالوں میں جیسے حدیث میں آیا ہے: **الجنة تحت ظلال السیوف** کے اندر حقیقت مراد لینا محال ہے بخلاف اس ٹکڑے کے کہ جس میں ہماری بحث ہے (اس میں حقیقت مراد لینا محال نہیں ہے)۔

(**متفق علیه**) اور ابوداؤد نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ (قال میرک)

مسجد قباء کی فضیلت

۶۹۵: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتِيْ مَسْجِدَ قُبَاءٍ كُلَّ سَبْتٍ مَاشِيًا وَرَاكِبًا فَيُصَلِّيْ فِيْهِ رَكْعَتَيْنِ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۶۹/۳ حديث رقم ۱۱۹۳ ولم يذكر "فيصلي فيه ركعتين" وأخرجه في ۱۱۹٤ ذكر الصلاة إلا أنه لم يذكر "كل سبت" وأخرجه مسلم في الصحيح ۱۰۱٦/۲ حديث رقم (۵۱٦۔۱۳۹۹) ولم يذكر "كل سبت"۔ وفي الحديث (۵۲۱۔۱۳۹۹) ولم يذكر الصلاة ۔ والله أعلم۔ وأخرجه أبوداؤد في السنن ۵۳۳/۲ حديث رقم ۲۰٤۰ ۔ وأخرجه النسائي في السنن مختصرًا ۳۷/۲ حديث رقم ٦۹۸ ۔ وكذلك مالك في الموطأ ۱٦۷/۱ حديث رقم ۷۱ من كتاب قصر الصلاة في السفر۔ وأحمد في السمند ٤/۲ ۔ (۲) الترمذي ۱٤۵۲ حديث رقم ۳۲٤ ۔ وابن ماجة والنسائي نحوه۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے یہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر ہفتہ کو پیدل یا سواری پر مسجد قباء تشریف لے جاتے تھے اور اس میں دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: **مسجد قباء**: یہ ''مد'' کے ساتھ منصرف پڑھا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ غیر منصرف ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بغیر ''مد'' کے ہے اور قباء مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک بستی کا نام ہے اور بعض حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ اصحاب صفہ اس مسجد میں ہوتے تھے۔ (**کل سبت ما شیا وراکبا**) یہ دونوں حال حال مترادفہ ہیں اور ''واؤ'' یہاں پڑاؤ کے معنی میں ہے یعنی کبھی پیادہ اور کبھی سواری پر۔ (**فیصلی فیه رکعتیں**) یعنی تحیۃ المسجد یا اس کے علاوہ جو تحیۃ المسجد کے قائم مقام ہو۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا کہ اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ مساجد اور صلحاء کی جگہوں کا تقرب مستحب ہے اور دوسرا یہ کہ ہفتے والے دِن زیارت کرنا مستحب ہے۔

متفق علیه: ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طریق سے مروی ہے کہ مسجد قباء میں ایک نماز ایک عمرہ کے برابر

ہے اور ایک روایت میں ہے کہ جس نے وضوء کیا پس اس کو اس کے کمال تک پہنچایا پھر مسجد قباء میں آیا اور اس میں دو رکعتیں پڑھیں تو اس کیلئے ایک عمرے کے اَجر کے برابر ہے اور ایک دوسری روایت میں بھی یہ مضمون اس طرح ہے کہ جس نے وضوء کیا پس وضوء کو اچھی طرح کیا پھر مسجدِ قباء میں داخل ہوا پس اس میں چار رکعات اداء کیں تو یہ چار رکعات ایک عمرے کے برابر ہیں۔

دو رکعت اور چار رکعات والی حدیث میں تطبیق یوں ہے کہ پہلے عمرے کا ثواب چار رکعت پر مرتب کیا گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر آسانی کرتے ہوئے فضل فرمایا اور اس کو دو رکعتوں پر مرتب کیا اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے صحیح روایت میں آیا ہے فرماتے ہیں میں البتہ مسجدِ قباء میں دو رکعتیں پڑھوں یہ مجھے زیادہ محبوب ہیں اس سے کہ میں بیت المقدس میں دو مرتبہ آؤں اگر ان لوگوں کو مسجدِ قباء میں (نماز وعبادت کے) اَجر کا پتہ چل جائے تو لوگ اس کی طرف اپنی سواریوں کو تھکا دیں (یعنی اتنی کثرت سے اور شوق وذوق سے آئیں)۔

اسی وجہ سے علماءِ کرام نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی مسجد کی زیارت کے ارادہ کرنے والے کیلئے حج اور عمرہ کے بدلے میں (جو مکہ میں ہوتے ہیں) دو امور عطا کیے ہیں کہ جن پر اسی ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ پس حج (کے عوض کے بارے میں) حضرت ابوامامہ کی روایت ہے جس کو ابن جوزی اور ابن نجار نے اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: **من خرج علی طھر لا یرید الا الصلوٰۃ فی مسجدی حتی یصلی فیه کان بمنزلة حجة۔** ''جو میری مسجد میں طہارت کی حالت میں صرف نماز کے ارادے سے آئے یہاں تک کہ اس میں نماز پڑھے تو یہ بمنزلہ حج کے ہے''۔ (تو گویا حضور ﷺ کی مسجد میں نماز پڑھنا حج کا عوض ٹھہرا) اور باقی عمرہ (کا بدل) پس مسجدِ قباء کی زیارت کیلئے جانا جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے **صلاۃ فی مسجد قباء کعمرۃ۔** کہ مسجدِ قباء میں نماز پڑھنا عمرے کے برابر ہے۔

مساجد اللہ عزوجل کو پسند ہیں اور بازار ناپسند

۶۹۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَحَبُّ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰهِ مَسَاجِدُهَا وَاَبْغَضُ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰهِ اَسْوَاقُهَا. (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۴۶۴ حدیث رقم (۲۸۸۔۶۷۱)۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہروں میں پسندیدہ مقامات مساجد ہیں اور ناپسندیدہ مقامات بازار ہیں اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: احب البلاد الی الله بلاد جمع ہے بلد کی اور اس سے مراد انسان کے رہنے کی جگہ/ٹھکانا ہے۔

مساجدھا، وابغض البلاد الی الله اسواقھا: اللہ تعالیٰ کے مساجد سے محبت کرنے سے مراد اہل مساجد کیلئے بھلائی وخیر کا ارادہ کرنا ہے اور بازاروں سے بغض سے مراد اس کے برخلاف کرنا ہے اور یہ بطریق اکثریت کے ہے ورنہ بعض اوقات مسجد میں غیبت وغیرہ کے ارادے سے جایا جاتا ہے اور کبھی بازار میں آدمی حلال کے طلب کیلئے داخل ہوتا ہے اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اے مخاطب تو ان لوگوں میں سے ہو جا کہ جو ہوتے تو بازار میں ہیں اور ان کا دل مسجد میں ہوتا ہے نہ کہ اس کے بالعکس

اور قلب اور قالب (جسم) کو مسجد میں جمع کرنا یہ اکمل ہے (یعنی جسم بھی اور روح دونوں حاضر ہوں)۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے مساجد اور اسواق کو بلاد سے موسوم کرنے میں شاید اس ارشادِ باری کی طرف اشارہ ہو ﴿وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ ......﴾ [الاعراف: ۵۸] اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں مضاف مراد لیا جائے ای بقاع البلاد اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مساجد اللہ تعالیٰ کے قرب حاصل کرنے کی جگہیں ہیں اور بازار شیاطین کے افعال کی جگہیں ہیں شیطانی افعال سے مراد حرص، طمع، خیانت، غفلت وغیرہ ہیں۔

اور تحقیق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ لا يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ [النور: ۳۶] "(وہ قندیل) ان گھروں میں (ہے) جن کے بارے میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے کہ بلند کیے جائیں اور وہاں خدا کے نام کا ذکر کیا جائے (اور) ان میں صبح و شام اسکی تسبیح کرتے رہیں" وہ ایسے گھروں میں (جا کر عبادت کرتے) ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کا ادب کیا جائے اور ان میں اللہ کا نام لیا جاوے اور حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مساجد متقین کا وطن ہیں۔

رواہ مسلم : اور ابن حبان نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ میرکؒ نے یہ ارشاد فرمایا ہے۔

مسجد تعمیر کرنے کی فضیلت

۶۹۷: وَعَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ بَنٰى لِلّٰهِ مَسْجِدًا بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱/۵۴۴حدیث رقم ۴۵۰۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۳۷۸حدیث رقم (۲۴۔۵۳۳) وأخرجه الترمذی فی السنن ۲/۱۳۴حدیث رقم ۳۱۸۔ وأخرجه النسائی فی السنن ۱/۳۱۔حدیث رقم ۶۸۸۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۲۴۳حدیث رقم ۷۳۶۔والدارمی فی السنن ۳۷۶حدیث رقم ۱۳۹۲وأحمد فی مسنده ۱/۷۰۔

ترجمہ: "حضرت عثمانؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو آدمی اللہ تعالیٰ کے لئے مسجد بناتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں مکان بنا دیتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: **من بنی لله مسجدا** : **ای معبدًا** یعنی عبادت کی جگہ، پس یہ کافروں کے معبد خانے کو بھی شامل ہوگا پس لِلّٰہِ کے الفاظ اس عبادت کی جگہ کو نکالنے کیلئے ہے جو غیر اللہ کے واسطے بنایا جائے۔ ابن الملکؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔ لیکن اظہر بات یہاں یہی معلوم ہوتی ہے کہ مسجد سے یہی مساجد المسلمین مراد لی جائیں اور لِلّٰہِ سے ان مساجد کو نکالنا مقصود ہوگا جو ریاء اور شہرت کے واسطے بنائی گئی ہوں اسی وجہ سے بعض حضرات نے یہ کہا ہے جس نے اپنی بنائی ہوئی تعمیر (مسجد، مدرسہ وغیرہ) پر اپنا نام لکھوایا تو یہ اس کے عدم اخلاص کی دلیل ہے اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ یہ بات اس آدمی کے بارے میں ظاہر ہے کہ جس نے اپنا نام لکھوانے سے دُعا یا ترحم کا ارادہ نہ کیا ہو (اگر دعا و ترحم مقصود ہو تو پھر کوئی حرج نہیں اور اس وعید میں وہ داخل نہیں)۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں ابن حجرؒ کی اس بات میں کچھ کلام ہے وہ اس لئے کہ دعا اور ترحم (رحم کی اپیل کرنا) اجمالاً اور مبہم

طریقے سے حاصل ہو جاتا ہے، پس نام کی تعیین کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بنی اللہ له بیتا: اور ایک نسخہ میں ''مثله'' کی زیادتی ہے۔ (**فی الجنة**) علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ **مسجدًا** میں تنکیر تقلیل کیلئے ہے اور ''بیتاً'' میں تنوین تکثیر اور تعظیم کیلئے ہے تا کہ یہ اس حدیث کے موافق ہو جائے جس میں یہ آیا ہے : **من بنی لله ولو لمفحص قطاة......** کہ جو اللہ کیلئے مسجد بنانے چاہے بٹیر کے گھونسلے کے برابر ہی کیوں نہ ہو......۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس لئے بھی یہاں تعلیل اور تکثیر ہے تا کہ مقدار اور کیفیت کے اعتبار سے ثواب کی زیادتی کی طرف اشارہ ہو جائے تا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد : ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا......﴾ [الانعام: ۱۶۰] ''اور جو برائی لائے گا اسے سزا ویسی ہی ملے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا'' کہ برائی کا بدلہ اسی کے مثل ہوگا۔ وارد نہ ہو۔ صاحبِ روضہ نے اپنے فتاویٰ میں فرمایا ہے کہ بیتاً سے مراد ایسا گھر کہ جس کو جنت کے تمام گھروں پر فضیلت حاصل ہو جیسا کہ مسجد کو تمام گھروں پر فضیلت ہوتی ہے اور ''مثله'' کا معنی یہ ہے کہ نام رکھنے میں وہ گھر ہے باقی صفات میں مثلاً اس کی شادگی وغیرہ تو وہ ایسی چیز ہے کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہے اور نہ کسی کان نے سُنی ہے اور نہ کسی دِل پر اس کا کھٹکا گزرا ہے۔ سیدؒ نے ازھار سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے اور شیخین کی ایک روایت میں ہے : **بنی اللہ له مثله فی الجنة** اور بخاری کی ایک روایت میں ہے : **من بنی مسجدا**۔ بکرؒ فرماتے ہیں میرا یہ گمان ہے کہ یوں فرمایا ہے : **یبتغی به وجه اللہ بنی اللہ له مثله فی الجنة**۔

اور احمدؒ نے یوں روایت نقل کی ہے : **من بنی لله مسجدا ولو کمفحص قطاة لبیضها بنی اللہ له بیتا فی الجنة**۔ ''کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے مسجد بنائی اگر چہ بٹیر کے گھونسلے کے برابر ہی کیوں نہ ہو جو اپنے آنڈے کیلئے بناتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بناتے ہیں''۔

اور ابن ماجہ میں صحیح سند سے یہ روایت مروی ہے: **من بنی لله مسجدا ولو کمفحص قطاة او اصغر بنی اللہ له بیتا فی الجنة** اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں بھی اس کی تخریج کی ہے اور ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں۔ ذہبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی سند جید ہے۔

مفحص القطاة ''مفحص'' میم کے فتحہ کے ساتھ ہے وہ جگہ جس کو بٹیرا اپنے پاؤں سے کھودتا ہے اور انڈا دینے کیلئے درست کرتا ہے یہ **فحص** سے ماخوذ ہے اس کا معنی کریدنا اور ''لَوْ'' یہاں تقلیل کیلئے ہے جیسا کہ ابن ہشام خضراوی نے اس کو اس کے معانی میں سے ثابت کیا ہے اور **اتقوا النار ولو بشق تمرة** کو اسی قبیل سے قرار دیا ہے اور زرکشیؒ نے فرمایا ہے کہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقلیل یہ ''لَوْ'' کے بعد والے جملے سے مستفاد ہے نہ کہ لفظ لَوْ سے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ قوی بات یہی ہے کہ تقلیل لَوْ کے مابعد سے مستفاد ہے لیکن لَوْ کی مدد کے ساتھ ہے کیونکہ لَوْ کے ساتھ جو کلام معنی کا فائدہ دیتا ہے وہ اس کے بغیر نہیں دیتا اور تقلیل یہاں پر مسجد میں تھوڑی سی زیادتی کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے تو یہاں پر لوگوں کو ترغیب دینے کی خاطر اس کے پورا کرنے والے کو اس کی ابتداء کرنے والے کے قائم مقام قرار دیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں پر مبالغہ مراد ہو۔

اور باقی (مثله) تو بعض نے کہا ہے کہ مثلیت کمیت کے اعتبار سے ہے اور زیادتی کیفیت کے اعتبار سے ہے، پس کتنے ہی ایسے گھر ہیں جو سینکڑوں قسم کے گھروں سے بہتر ہوتے ہیں اور اسی کے موافق ابن الجوزی کا بھی قول ہے کہ موافقت صرف اسم میں ہے نہ کہ مقدار میں یعنی اس کے لئے گھر بنایا جائے گا جیسا کہ اس نے گھر بنایا، پس اس نیکی کا بدلہ بناء (تعمیر) کی جنس میں لئے ہی ہوگا نہ کہ اس کے علاوہ لیکن دنیا کی تنگی اور آخرت کی وسعت کے اعتبار سے یقینی طور پر ان میں تفاوت ہوگا۔ اسی وجہ سے امام احمدؒ نے یہ روایت بھی نقل کی ہے: **بنى الله له فى الجنة افضل منه** اور طبرانی نے اس کو اَوْسع کے لفظ سے روایت کیا ہے اور افضلیت پر یہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے: **لموضع سوط احدكم فى الجنة خير من الدنيا وما فيها** کہ جنت میں ایک کوڑے کے برابر جگہ وہ دنیا اور جو کچھ دنیا کے اندر ہے اس تمام سے بہتر ہے۔

اور حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً یہ ارشاد منقول ہے: **من بنى لله مسجدا ولو كمفحص قطاة بنى الله له بيتا فى الجنة قلت يا رسول الله وهذه المساجد التى بطريق مكة قال وتلك** حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اللہ کی رضا کی خاطر مسجد بنوائی اگرچہ بٹیر کے گھونسلے کے برابر ہی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بنا دیتے ہیں، میں نے کہا اے اللہ کے رسول یہ جو مساجد مکہ کے راستے پر ہیں (آیا ان کا بھی یہی حکم ہے) فرمایا یہ بھی اسی کے حکم میں ہے اور **قطاة** (بٹیر) کو خاص اس لئے کیا کیونکہ وہ کشادہ زمین میں اپنے انڈا دینے کیلئے جگہ بناتا ہے نہ کہ درخت یا پہاڑ پر، بخلاف بقیہ پرندوں کے۔

مسجد میں جانے کی فضیلت

۶۹۸: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَنْ غَدَا اِلَى الْمَسْجِدِ اَوْ رَاحَ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهٗ نُزُلَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ كُلَّمَا غَدَا اَوْ رَاحَ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخارى فى صحيحه ١٤٨/٢ حديث رقم ٦٦٢۔ ومسلم فى صحيحه ٤٦٣/١ حديث رقم (٢٨٥۔٦٦٩) وأخرجه أحمد فى المسند ٥٠٨/٢۔۔٥٠٩۔

ترجمه: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو آدمی دن کے شروع حصہ میں یا دن کے آخری حصہ میں مسجد جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں اس کی مہمان نوازی کا سامان تیار کرتا ہے چاہے وہ صبح کو جائے یا شام کو۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: **من غدا الى المسجد:** یعنی جو طلوع فجر سے زوال تک گیا۔ (**اوراح**) یعنی زوال کے بعد (شام تک)۔ (**نزله**) نون کے ضمہ اور زاء کے ضمہ کے ساتھ ہے اور ''زاء'' کا سکون بھی مروی ہے۔ نزل کہتے ہیں جو کھانا مہمان کی مہمانی کیلئے آگے کیا جاتا ہے۔

من الجنة: علامہ سیوطیؒ نے فرمایا ہے حاشیہ بخاری میں نُزُل دو ضموں کے ساتھ وہ جگہ جو مہمان کیلئے تیار کی جاتی ہے اور نُزْل ''زاء'' کے سکون کے ساتھ جو آنے والے مہمان کیلئے ضیافت وغیرہ تیار کی جاتی ہے، پس مِنْ پہلے معنی کی صورت میں

تبعیض کیلئے ہے اور دوسرے معنی کی صورت میں بیان کیلئے ہے۔

کلما غدا او راح: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ نُزل وہ چیز جو آنے والے مہمان کیلئے تیار کیا جاتا ہے اور **کلما غدا** ظرف ہے اور اس کا جواب وہ ہے جس پر ماقبل والا کلام دلالت کر رہا ہے اور وہ اس میں عامل ہے اور معنی یہ ہیں: **کلما استمر غدوہ ورواحہ استمر اعداد نزلہ فی الجنۃ** اور **غدو** اور **رواح** حدیث میں بکرہ اور عشی کی طرح ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا﴾ [مریم: ٦٢] ''اوران کیلئے صبح وشام کھانا تیار ہوگا۔'' مراد اس سے دوام ہے۔

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں پس اس بناء پر حرکت برکت کا سبب ہے اور مسجد میں جانا موجب ثواب ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ طاعت کی طرف جانا یہ اللہ تعالیٰ کے ثواب اور بدلہ (مہمانی) دینے کی علامت ہو کیونکہ عبادات وہ امارات ہیں (نشانیاں ہیں) واجب کرنے والی نہیں ہیں۔

جو مسجد سے دُور ہو اس کو زیادہ ثواب ملتا ہے

٦٩٩: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَعْظَمُ النَّاسِ اَجْرًا فِی الصَّلَاةِ اَبْعَدُهُمْ فَاَبْعَدُهُمْ مَمْشًى وَالَّذِیْ یَنْتَظِرُ الصَّلَاةَ حَتّٰی یُصَلِّیَهَا مَعَ الْاِمَامِ اَعْظَمُ اَجْرًا مِنَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ ثُمَّ یَنَامُ. (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٣٧/٢ حديث رقم ٦٥١ـ وأخرجه مسلم في صحيحه ٤٦٠/١ حديث رقم (٢٧٧ـ٦٦٢)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا نماز کا سب سے زیادہ ثواب اس آدمی کو ملتا ہے جو دور سے چل کر مسجد میں آئے اور جو آدمی نماز کے انتظار میں رہتا ہے تا کہ امام کے ساتھ نماز پڑھے تو اس کا ثواب اس سے زیادہ ہوتا ہے جو اکیلا نماز پڑھ کر سو جائے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **فابعدھم**: ''فاءُ'' یہاں پر استمرار کیلئے ہے جیسا کہ حضور ﷺ کے اس قول میں **الا مثل فالا مثل**۔ علامہ طیبیؒ نے یوں فرمایا ہے:

ممشی: مصدر ہے یا اسم مکان ہے اسی طرح بعض نے کہا ہے اور دوسرا قول ظاہر ہے۔

حتی یصلیھا مع الامام اعظم اجرا من الذی لصلی: ای منفردا یعنی اکیلے پڑھ لے، ابن الملکؒ نے اسی طرح کہا ہے یا دوسرے امام کے ساتھ اول وقت میں پڑھ لے۔ یہ تشریح ابن حجر عسقلانیؒ نے فرمائی ہے۔

ثم ینام: یعنی امام کا انتظار نہ کرے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا یعنی جو نماز کو مؤخر کرتا کہ امام کے ساتھ نماز پڑھے یہ اَجر میں اس آدمی سے بڑا ہوا ہے کہ جو مستحب وقت میں نماز پڑھے اور امام کا انتظار نہ کرے اور اس میں یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہو کہ جو دوسری نماز کا انتظار کرتا ہے، پس یہ اَجر میں اس آدمی سے بڑا ہوا ہے جو نماز کا انتظار نہیں کرتا اور **ثم ینام** کے قول میں ایک قسم کی غرابت ہے اس لئے کہ حضور ﷺ نے نماز میں عدم انتظار کو نیند قرار دیا اور نماز کا انتظار کرنے والا اگر چہ سویا ہو وہ حقیقتاً بیدار ہے اور اس کے علاوہ جو ہے وہ سویا ہوا ہے اگر چہ وہ (ظاہراً) بیدار ہو اس لئے کہ یہ ان اوقات کو سونے والے کی طرح ضائع کر رہا ہے۔

جتنا گھر مسجد سے دُور ہوگا اتنا ہی ثواب زیادہ ہوگا

۷۰۰: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ خَلَتِ الْبِقَاعُ حَوْلَ الْمَسْجِدِ فَاَرَادَ بَنُوْ سَلِمَةَ اَنْ يَنْتَقِلُوْا قُرْبَ الْمَسْجِدِ فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ لَهُمْ بَلَغَنِيْ اَنَّكُمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَنْتَقِلُوْا قُرْبَ الْمَسْجِدِ قَالُوْا نَعَمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ اَرَدْنَا ذٰلِكَ فَقَالَ يَابَنِيْ سَلِمَةَ دِيَارَكُمْ تُكْتَبُ اٰثَارُكُمْ دِيَارَكُمْ تُكْتَبُ اٰثَارُكُمْ۔

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ۱/۴۶۲ حديث رقم (۲۸۰-۶۶۵)

ترجمه: حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی کے قریب کچھ مکان خالی ہوئے تو قبیلہ بنوسلمہ نے ارادہ کیا کہ وہ مسجد کے قریب آ جائیں۔ رسول اللہ ﷺ کو جب ان کے ارادہ کی خبر ملی۔ تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم لوگ مسجد کے قریب آ نا چاہتے ہو۔ انہوں نے عرض کیا۔ جی ہاں اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمارا یہی ارادہ ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے بنوسلمہ تم اپنے مکانوں میں رہو۔ تمہارے قدموں کے نشانات لکھے جاتے ہیں۔ تم اپنے مکانوں میں رہو تمہارے قدموں کے نشانات لکھے جاتے ہیں۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **خلت البقاع** : بقاع ''باء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے اور بعض کا اس کو ضمہ کے ساتھ ضبط کرنا یہ قلم کی غلطی ہے۔

فاراد بنو سلمة : سَلِمہ ''لام'' کے کسرہ کے ساتھ انصار کا ایک قبیلہ ہے ان کے اور مسجدِ نبوی کے درمیان کافی مسافت تھی۔

قرب المسجد : یہاں حرف ''جر'' محذوف ہے ای الی مکان بقربه۔

فبلغ ذلك النبی ﷺ : وحی کے ذریعے یا خبر کے ذریعے۔ (دیارکم) نصب کے ساتھ ہے اغراء (برانگیختہ کرنے) کے طریق پر ای الزموا دیارکم۔

تکتب : یہ جزم کے ساتھ مروی ہے اس بناء پر کہ یہ الزموا کا جواب ہے یا استئناف کی بناء پر مرفوع ہے یا حال ہے حکم کے بیان کیلئے۔

اثارکم : یہ اثر کی جمع ہے اور شی کا اثر اس چیز کا حاصل کرنا ہے جو اس کے وجود پر دلالت کرتی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ﴾ [یٰسٓ : ۱۲] یعنی اے بنی سلمہ! تمہارے قدموں کا اَجر بھی لکھا جاتا ہے۔ کہ ہر قدم پر ایک درجہ بلند ہوتا ہے، پس جب قدم زیادہ ہوں گے تو اَجر بھی زیادہ ہوگا۔

دیارکم تکتب اثارکم : تاکید کیلئے اس کو مکرّر ذکر کیا ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ بنوسلمہ یہ انصار کی ایک شاخ ہے اور ان کے علاوہ عرب میں سَلِمہَ (بکسر اللام) نہیں ہے ان کے گھر مسجد سے کافی فاصلہ پر تھے ان کو رات کی تاریکی اور بارشوں میں اور سخت سردی کے زمانے میں کافی مشقت پیش آتی تھی، پس انہوں نے ارادہ کیا کہ یہ مسجد کے قریب مکانوں میں منتقل ہو جائیں، پس آنحضرت ﷺ کو یہ بات ناپسند آئی کہ مدینہ کے اردا گرد سے آبادی ختم ہو جائے (جو خطرناک امر تھا) اس پر

آپ ﷺ نے ان کو ترغیب دی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس چلنے پر بھی اَجر ہے اور یہاں کتابت اثار سے مراد یا تو یہ ہے کہ اعمال کے صحیفوں میں لکھا جاتا ہے یعنی زیادہ قدم یہ اَجر کی زیادتی کا سبب ہیں یا اس سے یہ مراد ہے کہ اس واقعے کو کتب سِیرَ میں لکھا جائے گا یعنی تمہارے قصے اور عبادت میں مجاہدے کو سلف کی سِیرَ میں لکھا جائے گا تو پس یہ واقعہ اور مجاہدہ لوگوں کو کوشش اور محنت پر حرص دلائے گا (اور تم اس بات کا مصداق بنو گے) **من سن سنة**...... کہ جس نے کسی اچھے طریقے کو جاری کیا تو اس کو اس کا اَجر بھی ملے گا اور قیامت تک جو اس پر عمل کرے گا اس کا ثواب بھی اس کو ملے گا۔ (الحدیث)

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ علامہ طیبیؒ کے اس کلام میں اس بات کی تشبیہ ہے کہ حدیث میں حضور ﷺ کیلئے معجزے کا ثبوت ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ **تكتب اثار كم** کا جو تکرار ہے وہ تاکید کیلئے نہیں ہے بلکہ یہ دونوں کتابتوں کی بشارت دینا ہے۔

(**رواه مسلم**) میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ امام بخاریؒ نے بھی اس حدیث کے قریب المعنی روایت نقل کیا ہے لیکن حضرت انسؓ کے طریق سے نقل کی ہے نہ حضرت جابرؓ کے طریق سے۔

اور اس حدیث میں اور اس سے پہلے گزری ہوئی اس حدیث: **ان شوم الدار عدم سماعها للاذان** میں تعارض و منافی نہیں ہے اس لئے کہ نحوست اس حیثیت سے ہے کہ جب وہ گھر وقت یا جماعت کے فوت ہونے کا سبب بنے اور فضیلت وہ اس اعتبار سے ہے کہ جتنے زیادہ قدم ہوں گے اتنا زیادہ اَجر ہوگا، پس دونوں کی حیثیت مختلف ہوئی اور ابن العماد نے تصریح کی ہے کہ دور والا گھر افضل ہے اور دلیل میں ایک تو یہ روایت (جس کی تشریح چل رہی ہے) پیش کی ہے اور دوسری حضرت جابرؓ کی مسلم کی یہ روایت پیش کی ہے حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے گھر مسجدِ نبوی سے دور تھے پس ہم نے ارادہ کیا کہ ہم اپنے گھر بیچ کر مسجدِ نبوی کے قریب سکونت اختیار کرتے ہیں، پس ہمیں حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا پس ارشاد فرمایا: **ان لكم بكل خطوة درجة** ''کہ تمہارے لئے ہر قدم پر ایک درجہ ہے''۔

اور مسلم شریف ہی میں یہ روایت بھی ہے کہ ایک صحابیؓ کا گھر مسجدِ نبوی سے سب سے زیادہ دور تھا کسی نے ان کو کہا کہ آپ سواری پہ کیوں نہیں آتے (یعنی اتنا فاصلہ ہے تو سواری استعمال کر لیا کریں) تو اس صحابیؓ نے کہا مجھے یہ بات خوش نہیں کرتی کہ میرا گھر مسجد کے پڑوس میں ہو میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میرا مسجد کی طرف چل کے جانا اور گھر والوں کی طرف واپس لوٹنا بھی لکھا جائے تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے یہ سب کچھ جمع کر دیا ہے (یعنی تجھے ان سب کا ثواب ملے گا)۔

اور امام احمدؒ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ دور والے گھر کو قریب والے گھر پر ایسی فضیلت ہے جیسا کہ اللہ کے راستے کے شہسواروں کی گھر میں بیٹھنے والے پر۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مصداق وہ گھر ہے جو اپنی دوری کی وجہ سے اہم دینی اُمور کے فوت ہو جانے کا سبب نہ بنے جیسا کہ علم کا سیکھنا اور سکھانا، اور اسی طرح دوسرے فرائض کفایہ ورنہ قریبی گھر اس شخص کے حق میں افضل ہے جیسا کہ وہ شخص جو چلنے سے ضعیف ہو (اس کے لئے قریبی گھر بہتر ہے)۔

قیامت کے دن سات آدمی اللہ کے سایہ میں ہوں گے

۷۰۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سَبْعَةٌ یُّظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظِلِّهٖ یَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّا ظِلُّهٗ اِمَامٌ عَادِلٌ وَشَابٌّ نَشَأَفِیْ عِبَادَةِ اللّٰهِ وَرَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسْجِدِ اِذَا خَرَجَ مِنْهُ حَتّٰی یَعُوْدَ اِلَیْهِ وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِی اللّٰهِ اجْتَمَعَا عَلَیْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَیْهِ وَرَجُلٌ ذَکَرَ اللّٰهَ خَالِیًا فَفَاضَتْ عَیْنَاهُ وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتَ حَسَبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰهَ وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَاَخْفَاهَا حَتّٰی لَا تَعْلَمَ شِمَالُهٗ مَا تُنْفِقُ یَمِیْنُهٗ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه۲/۱۴۳حدیث رقم ٦٦٠وأخرجه مسلم فی صحیحه ۲/۷۱۵حدیث رقم (۹۱۔۱۰۳۱) ورد فی مسلم "لاتعلم یمینه ما تنفق شماله" وقدأشار ابن حجر فی فتح الباری وذکر أن الصواب "لاتعلم شماله ما تنفق یمینه" وأخرجه الترمذی فی السنن ۵۱٦/٤حدیث رقم ۲۳۹۱۔وأخرجه النسائی فی السنن ۲۲۲/۸حدیث رقم ۵۳۸۰وأخرجه مالك فی الموطأ ۹۵۳/۲حدیث رقم ١٤من کتاب الشعر۔وأخرجه أحمد فی المسند۴۳۹/۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے سایہ میں رکھے گا اور اس دن اللہ کے سایہ کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہوگا انصاف کرنے والا حاکم، وہ جوان جو اپنی جوانی میں عبادت کرے وہ آدمی جس کا دل مسجد سے معلق رہتا ہے جب مسجد سے نکلتا ہے یہاں تک کہ پھر دوبارہ مسجد میں لوٹ کر آ جائے۔ وہ آدمی جو آپس میں اللہ کے لئے محبت کرتے ہیں' محبت پر دونوں جمع ہوتے ہیں اور محبت پر جدا ہوتے ہیں وہ آدمی جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرتا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں اور وہ آدمی جس کو کسی حسین وجمیل خاتون نے برائی کی دعوت دی اور اس نے جواب میں کہہ دیا ہو کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور وہ آدمی جو پوشیدہ طور پر صدقہ کرے۔ اس کے بائیں ہاتھ کو علم نہ ہو کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: سبعة: ای اشخاص اس بات کا کوئی مفہوم مخالف نہیں ہے اس لئے کہ حدیث میں اس سے زیادہ کی بھی دلالت موجود ہے۔

یوم لاظل: یعنی نہ کسی کیلئے قدرت ہوگی اور نہ رحمت۔ (الا ظله) ابن الملکؒ نے شرح السنۃ میں فرمایا ہے کہ یظلهم اللہ کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی حفاظت اور رعایا میں (یعنی خاص لوگوں میں) داخل کر دیتا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اپنے سائے میں داخل کرنے سے مراد جیسا کہ بعض طرق میں آیا ہے اپنے عرش کے سائے میں داخل کرنا مراد ہے۔ لیکن اس توجیہ پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ اس دِن سورج سروں کے انتہائی قریب ہوگا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ عرش کے نیچے ہوگا اور جب وہ عرش کے نیچے ہوگا تو اس سے لازم آتا ہے کہ پھر وہاں کوئی سایہ نہ ہوگا اس لئے کہ سایہ نہیں ظاہر کرتا مگر سورج (یعنی سورج کے ہونے سے بھی سایہ بنتا ہے کسی رکاوٹ وغیرہ سے)۔

ابن حجرؒ نے اس بات کا یوں جواب دیا ہے کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ سایہ نہیں ظاہر کرتا مگر سورج (یعنی سورج کے بغیر بھی سایہ ہوتا ہے) اور فرمایا ہے کہ کیا تو نہیں دیکھتا کہ جنت میں سورج نہیں ہوگا اس کے باوجود حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جنت میں ایک ایسا درخت ہے کہ اگر سوار اس کے سائے میں اتنا اتنا دوڑتا رہے......پس جیسے یہ بات ممکن ہے کہ جنت میں سورج کے نہ ہونے کے باوجود سایہ ہو تو اسی طرح عرش میں سورج کے نہ ہونے کے باوجود سایہ ہو۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ سایہ یہ اس چیز کے ساتھ خاص نہیں ہے جو سورج کی روشنی میں رکاوٹ بننے سے ہو بلکہ یہ ہر نور و روشنی میں عام ہے جیسا کہ چاند کی روشنی دنیا میں اور جنت کے انوار آخرت میں۔ لیکن اس جواب کے عدمِ ظہور میں کوئی خفاء نہیں ہے۔ اور ممکن ہے کہ یہاں یہ کہا جائے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ آدمی نشیبی زمین سے (یعنی نیچے سے) عرش کے سائے تک بلند ہوگا (یعنی سورج نیچے اور یہ اوپر) یا عرش کا سایہ وہ سورج پر غالب ہوگا اس کی طرف نسبت کے ساتھ، پس سورج کیلئے حرارت کی تاثیر باقی نہ رہے گی اور اسی معنی میں یہ حدیث بھی آتی ہے (کہ جہنم کہے گی) کہ گزر جا اے مؤمن بے شک تیرے نور نے میرے شعلوں کو بجھا دیا ہے۔

علامہ راغبؒ نے فرمایا ہے کہ **ظل** یہ ضُحٰی کی ضد ہے اور یہ فیُ سے عام ہے اور **ظل** سے تعبیر کی جاتی ہے غلبے اور پناہ و قوت کی جیسے کہا جاتا ہے: **اظلنی ای حرسنی**۔ "یعنی اس نے مجھے اپنی حفاظت و نگرانی میں لے لیا"۔ **وجعلنی فی ظله ای فی عزه و منعته**۔ "اور اس نے مجھے اپنی پناہ و قوت میں کر دیا"۔

اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ **فی ظله** یہ تاکید و تقریر ہے اس لئے کہ **یظلهم** کے ارشاد میں اور کسی سائے کا احتمال نہیں ہے یعنی اللہ تعالیٰ انکی آخرت کی پریشانیوں اور مصیبتوں سے حفاظت کریں گے اور انکو اپنی رحمت کی چادر میں لے لیں گے۔

امام عادل: جو امراء وغیرہ میں سے مسلمانوں کے اُمور کے والی ہو یہ اللہ کے سائے میں اس لئے ہوگا کیونکہ دنیا میں لوگ اس کے سائے میں تھے، پس آخرت میں اس کے مثل پورا پورا بدلا دیا جائے گا اور ان سات میں سے سب سے پہلے **امام عادلٌ** کو ذکر کیا کیونکہ یہ سات میں سے افضل ہے اس لئے کہ لوگ سارے کے سارے امام عادل کے سائے میں ہوتے ہیں۔

فی عبادة الله: یعنی اللہ کی عبادت میں نشو و نما پائی نہ کہ معصیت میں، پس اس کو اللہ کے عرش کے سائے کا بدلہ دیا گیا بوجہ اس کے کہ اس نے ہمیشہ اپنے نفس کی اللہ کی مخالفت سے حفاظت کی تھی۔

ورجل قلبه معلق بالمسجد: اور ایک نسخہ میں **فی المسجد** ہے۔ ابن حجر عسقلانیؒ نے فرمایا ہے **معلق فی المسجد** اسی طرح صحیحین میں ہے۔ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعلیق سے ہے کیونکہ اس کے دِل کو قندیل کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اس میں اشارہ ہے کہ یہ ہمیشہ اپنے دِل کے ساتھ مسجد سے جڑا ہوا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ علاقہ سے مشتق ہے اور علاقہ کا معنی ہے شدید محبت اور اس پر احمدؒ کی روایت دلالت کرتی ہے **معلق بالمسجد** پس اپنے ربّ کی محبت اور اس کے گھر سے تعلق کی وجہ سے اس کو یہ بدلا دیا گیا کہ یہ اس کے عرش میں ہوگا۔

حتى يعود اليه: اس لئے کہ مؤمن مسجد میں ایسا ہے جیسا کہ مچھلی پانی میں اور منافق مسجد میں ایسا ہے جیسا کہ پرندہ پنجرے میں۔

اجتمعا عليه: یعنی اگر جمع ہوئے تو اللہ کی محبت میں جمع ہوئے۔ (**وتفرقا عليه**) یعنی اگر جدا ہوئے، مطلب یہ ہے کہ

حاضر ہونے میں اور غائب ہونے میں اللہ کی محبت کو سامنے رکھتے تھے۔ اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے **تفرقا علیه من مجلسهما**۔ اور بعض نے کہا ہے کہ جدائی سے مراد موت کے ساتھ جدائی ہے۔ اور ابن حجر عسقلانیؒ نے **اجتمعا علی ذلك وتفرقا علیه** کے قول کے بارے میں کہا ہے کہ کشمینی کی روایت میں **اجتمعا علیه** ہے پس ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کی اللہ کی مخالفت سے نگرانی وحفاظت کرتا تھا کیونکہ مؤمن' مؤمن کیلئے آئینہ ہے، پس ان دونوں کو اس کا بدلا یہ دیا گیا۔

ورجل ذکر الله خالیا : خالی ہو لوگوں سے یا ریاء سے یا ماسوی اللہ سے۔ (**ففاضت عیناه**) اس اسناد میں مبالغہ ہے جو کہ قاری پر مخفی نہیں ہے تو اللہ نے ملا اعلی پر اس کو بدلا سے نوازا ہے۔ (**دعته امرءة**) یعنی زنا کی طرف۔ (**ذات حسب**) ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ **حسب** وہ ہے کہ جس کو آدمی اپنے اباؤ اجداد کے مفاخر میں سے شمار کرے اور بعض نے کہا ہے کہ حسب سے مراد وہ عمدہ عادات ہیں جو اس کے اور اس کے آباء واجداد میں پائی جائیں۔ (**اخاف الله**) یعنی اللہ کی مخالفت اور اس کی سزا یا اس کی ناراضگی سے اور جو ڈر گیا وہ محفوظ رہ گیا۔ (**ورجل تصدق بصدقة فاخفاها**) ابن الملکؒ نے فرمایا ہے یہ نفلی صدقہ پر محمول ہے کیونکہ زکوۃ کا اعلان کرنا افضل ہے۔ (**حتی لا تعلم**) میم کے فتحہ کے ساتھ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ ضمہ کے ساتھ ہے۔ (**شماله**) بعض نے کہا ہے کہ اس میں حذف ہے **ای لا یعلم من بشماله**۔ اور بعض نے کہا کہ صدقہ کو مخفی انداز سے دینے میں مبالغہ بیان کرنا مقصود ہے اور یہ کہ اگر بائیاں ہاتھ جاننا بھی چاہے تو اسے معلوم نہ ہو اور جب اس آدمی نے اپنے عمل کو چھپانے میں اللہ کیلئے اس حد تک مبالغہ کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی فضیلت کو ظاہر کرنے کے ساتھ بدلا دیا۔ (**ما تنفق**) دونوں فعلوں میں تذکیر بھی جائز قرار دی ہے۔ (**یمینه**) اور مسلم کی روایت میں یوں واقع ہے: **لا تعلم یمینه ما تنفق شماله** اور محدثین کے نزدیک مقلوب ہے اور سہو ہے، علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے یوں نقل کیا ہے۔ (**متفق علیه**) اور ترمذی نے اس کو نقل کیا ہے اور نسائی نے۔ (قالہ میرک)

نماز کے بعد اُسی جگہ بیٹھنے کی فضیلت

۷۰۲: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةُ الرَّجُلِ فِي الْجَمَاعَةِ تَضْعُفُ عَلٰى صَلَاتِهٖ فِيْ بَيْتِهٖ وَفِيْ سُوْقِهٖ خَمْسًا وَعِشْرِيْنَ ضِعْفًا وَذٰلِكَ اَنَّهٗ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ ثُمَّ خَرَجَ اِلَى الْمَسْجِدِ لَايُخْرِجُهٗ اِلَّا الصَّلٰوةُ لَمْ يَخْطُ خُطْوَةً اِلَّا رُفِعَتْ لَهٗ بِهَادَرَجَةٌ وَحُطَّ عَنْهُ بِهَا خَطِيْئَةٌ فَاِذَا صَلّٰى لَمْ تَزَلِ الْمَلَائِكَةُ تُصَلِّيْ عَلَيْهِ مَادَامَ فِيْ مُصَلَّاهُ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ وَلَا يَزَالُ اَحَدُكُمْ فِيْ صَلَاةٍ مَا انْتَظَرَ الصَّلَاةَ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ اِذَا دَخَلَ الْمَسْجِدَ كَانَتِ الصَّلَاةُ تَحْبِسُهٗ وَزَادَ فِيْ دُعَاءِ الْمَلَائِكَةِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ اَللّٰهُمَّ تُبْ عَلَيْهِ مَالَمْ يُؤْذِفِيْهِ مَالَمْ يُحْدِثْ فِيْهِ. (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٣١/٢ حديث رقم ٦٤٧ـ وأخرجه مسلم في الصحيح ٤٥٩/١ حديث (٢٧٢ـ٦٤٩) وأخرجه أبوداوٗد في السنن ٣٧٨/١ حديث رقم ٥٥٩ـ وأخرج الترمذي أوله في السنن ٤٢١/١ حديث رقم ٢١٦ـ وأخرج ابن ماجة بعضه في السنن ٢٥٤/١ حديث رقم ٧٧٤ـ وأحمد في مسنده

۲/۲۵۲ كلهم بالفاظ متقاربة ومتفاوتة۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جماعت کے ساتھ آدمی کی نماز اس نماز سے جو گھر میں یا جو بازار میں پڑھی جائے پچیس درجہ فضیلت رکھتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی اچھی طرح وضو کرتا ہے اور صرف نماز ہی کے لئے آتا ہے تو وہ جو قدم اٹھاتا ہے اس کے ہر قدم کے عوض اس کے ثواب میں ایک درجہ بلند ہوتا ہے اور ایک گناہ معاف ہو جاتا ہے اور جب تک وہ نماز پڑھ کر اپنے مصلیٰ پر بیٹھا رہتا ہے فرشتے مسلسل اس کے لیے یہ دعا کرتے ہیں: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ کہ اے اللہ اس کی بخشش کر دے اور اے اللہ اس پر رحم کر اور جب تک تم میں سے کوئی نماز کے انتظار میں رہتا ہے تو اس کا وہ وقت نماز میں ہی شمار ہوتا ہے اور ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب کوئی آدمی مسجد میں گیا اور نماز ہی کی وجہ سے وہاں رک گیا تو فرشتوں کی دعا میں یہ الفاظ زیادہ ہوتے ہیں "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهٗ اَللّٰهُمَّ تُبْ عَلَيْهِ" اے اللہ اس کی بخشش فرما۔ اے اللہ اس کی توبہ قبول فرما اور یہ اس وقت تک رہتا ہے جب تک وہ کسی کو تکلیف نہ پہنچائے اور باوضو رہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **تضعف**: اس میں تشدید پڑھی گئی ہے اور تخفیف بھی جائز ہے ازھار میں اسی طرح مذکور ہے۔ **ای تزاد۔**

علی صلاته: کہا جاتا ہے **صغف الشئی اذا زاد وصنعفته واضعضتهٗ وضاعفته** ان سب کا ایک ہی معنی ہے۔ اسی طرح نہایہ میں ہے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ زیادتی کی اسناد یہ ثواب سے مجاز ہے یا یہاں مضاف مقدر مانا جائے گا۔ **ای ثواب صلاة الرجل......**

فی بیته وفی سوقه: یہ جار کے اعادہ کے ساتھ عطف ہے ابن حجرؒ نے فرمایا ہے **بل وفی المسجد ایضًا** کہ مسجد میں بھی پڑھے تو پھر یہی بات ہے جیسا کہ دوسرے ادلہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور بازار و گھر کو اس لئے خاص کیا کہ جب ان میں پڑھنے والے سے یہ ثواب وزیادتی فوت ہوگئی حالانکہ بازار و گھر میں آنے جانے کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے تو پھر ان جگہوں کے علاوہ میں تو بطریق اولی یہ فضیلت فوت ہوگی۔

(ملا علی قاری علیہ رحمۃ الباری فرماتے ہیں) لیکن اس بات میں بحث ہے ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کی تخصیص اس لئے کی کہ اکثر جماعت مسجد میں ہوتی ہے نہ کہ گھر اور بازار میں اور اسی وجہ سے زیادتی ثواب کی جو علت بیان کی ہے جو آگے آنے والی ہے اس میں **الی المسجد** کی قید ہے نہ کہ **بجماعة** کی۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا یہ اس نماز سے بڑا ہوا ہے (پچیس یا ستائیس درجے) جو گھر میں ہو یا بازار میں جماعت کے ساتھ ہو یا اکیلے ہو۔ ابن حجر عسقلانیؒ نے فرمایا ہے کہ میرے لئے جو بات یہاں پر ظاہر ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں پر مسجد میں جماعت کے مقابلے میں اکیلے نماز پڑھنا مراد ہے۔

خمسًا وعشرين ضعفا: **ای مثلا** اور ایک روایت میں ۲۷ ذکر ہے اس پر جماعت کی بحث میں تفصیلی کلام ہوگا۔ ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد کثرت ہے نہ کہ حصر۔ عسقلانیؒ نے فرمایا ہے **خمس وعشرين** اور اصیلی کی روایت میں **خمسا وعشرين** ہے اور **ضعفا** کا ارشاد تو اسی طرح ہم اس پر روایات میں مطلع ہوتے ہیں اور کرمانیؒ وغیرہ نے **خمسا**

وعشرین درجہ روایت کی ہے۔پس ضعفا کی درجہ یا صلاۃ کے ساتھ تاویل کی جائے گی۔

فاحسن الوضوء: یعنی فرائض اور سنن کو اکٹھے کرے۔(**الا الصلوٰۃ**) یعنی نماز جماعت سے پڑھنے کے ارادے سے نکلا نہ کہ اور کسی کام سے۔ یہ جملہ حالیہ مؤسسہ ہے نہ کہ مؤکدہ جیسا علامہ طیبیؒ نے کہا ہے کہ جملہ حالیہ ہے جیسا کہ تعلیل حکم کیلئے گویا کہ جب نماز کی اضافت اس آدمی کی طرف ہوئی جس کو الف لام جنسی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے تو اس رجل کامل کی نماز کہ جس کو کوئی امر دنیاوی اللہ کے گھر میں اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتا یہ فائدہ دے گی کہ اس کو کئی گنا بڑھا کر اجر دیا جائے کیونکہ اس جیسا آدمی نماز کی شرائط وارکان وآداب میں کسی قسم کی کمی نہ کرے گا۔پس جب اس نے وضوء کیا اور اچھی طرح کیا اور جب وہ نماز کی طرف نکلا تو اس میں بھی کسی قسم کی کوئی ایسی چیز نہیں ملی جو اس کو مکدر بنادے اور جب اس نے نماز پڑھی تو نکلنے میں جلدی نہیں کی اور جس کی یہ شان ہو تو وہ اس کے لائق ہے کہ اس کی نماز کا ثواب بڑھا کر اتنے درجات تک دیا جائے۔

لم یخط: یاء کے فتحہ اور طاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔(**خطوۃ**) خاء کے ضمہ کے ساتھ ہے اور فتحہ بھی جائز ہے اور علامہ جوھریؒ نے فرمایا ہے کہ **خطوہ** ضمہ کے ساتھ وہ جگہ جو دو قدموں کے درمیان میں ہے اور فتحہ کے ساتھ ایک بار قدم اٹھانا اور ھمریؒ نے یہاں یقین سے کہا ہے کہ یہ فتح کے ساتھ ہے اور قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ مسلم کی روایات میں ضمہ کے ساتھ ہے۔

الا رفعت له بها درجة: یعنی جب اس پر گناہ نہ ہوں۔(**وحط عنه لها خطيئة**) یعنی جب اس کے گناہ ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آدمی کیلئے یہ دونوں باتیں جمع ہوں اور یہی ظاہر معلوم ہوتا ہے اور اللہ کا فضل بڑا وسیع ہے۔(**الملائكة تصلى عليه**) یعنی اس کے لئے خیر کی دعا کرتے ہیں اور اس کے لئے گناہوں سے بخشش طالب کرتے ہیں۔(**اللهم صل عليه**) یہ جملہ **تصلى عليه** کے ارشاد کی وضاحت ہے اور اس میں فخامت (عظمت) ہے۔(**اللهم ارحمه**) طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ رحمت کی طلب مغفرت کی طلب کے بعد ہے اس لئے کہ ملائکہ کی صلاۃ ان کے لئے استغفار ہے۔(**لا يزال احدكم فى صلاة**) یعنی حکم اُخروی میں کہ جس کے ساتھ ثواب متعلق ہوتا ہے۔(**ما انتظر الصلوٰۃ**) **اى مادام ينتظرها** کیونکہ اعمال کے ثواب کا دارومدار نیت پر ہے بلکہ مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بڑی اور بہتر ہے۔

كانت الصلاة تحبسه: یعنی مسجد سے نکلنے سے سوائے نماز کے اور کوئی رکاوٹ نہ ہو اور مسلم کی ایک روایت میں ہے **لا يزال احدكم فى صلاة ما كانت الصلوٰۃ تحبسه**۔"یعنی اپنے گھر لوٹنے سے اس کو نماز کے علاوہ اور کوئی چیز نہ روکے"۔بعض کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک غلام نے اپنے آقا سے دخول مسجد کی اجازت لی تا کہ وہ نماز اداء کر سکے اس نے اجازت دے دی وہ آقا مسجد سے باہر کھڑا رہا اور اس کا انتظار کرتا رہا، غلام نے کافی دیر لگادی تو اس آقا نے کہا بھئی نکل آ۔تو اس غلام نے کہا کہ مجھے وہ نہیں چھوڑتا کہ میں نکلوں۔آقا نے کہا وہ کون ہے؟ غلام نے کہا وہ وہ ہے کہ جو تجھے نہیں چھوڑتا کہ تو اندر داخل ہو۔

اللهم تب عليه: یعنی اس کو توبہ کی توفیق دے دو یا اس کی توبہ کو قبول کرلو یا اس کو توبہ پر ثابت قدمی عطا فرمادیجئے معنی یہ ہے کہ فرشتے مسلسل اس کے لیے دعاؤں میں رہتے ہیں جب تک کہ یہ اپنی نماز کی جگہ میں رہے یا نماز کے انتظار میں رہے۔

مالم يؤذ فيه: یعنی مسلمانوں میں سے کسی کو اپنی زبان یا ہاتھ سے تکلیف نہ دے یہ حدث معنوی ہے اسی وجہ سے اس کے

بعد حدث ظاہری کو ذکر کیا ہے پس فرمایا ہے (مالم یحدث) یعنی حدث حقیقی یحدث ''حاء'' کے سکون اور ''دال'' کے کسرہ کے ساتھ ہے یعنی جب تک اپنے وضوء کو نہ باطل کرے کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں مروی ہے کہ جب انہوں نے یہ حدیث بیان کی تو حضر موت سے آئے ہوئے ایک آدمی نے کہا: ما الحدث یا ابا هریره؟ ''کہ حدث سے کیا مراد ہے اے ابو ہریرہ!'' تو فرمایا: (فساء (ریح بلا صوت) او ضراط (ریح مع صوت)۔ ابن الملکؒ نے اس کو نقل کیا ہے اور ترمذی کے بعض طرق میں اسی طرح اس حدیث میں واقع ہوا ہے۔

سائل کے استفسار کرنے میں شاید یہ وجہ ہو کہ ان کے ہاں حدث کا اطلاق اس کے علاوہ پر ہوتا ہو یا انہوں نے احداث بمعنی ابتداع (ایجاد) گمان کیا ہو اور یحدث میں دال تشدید کے ساتھ غلطی ہے۔ نہایہ میں اسی طرح ہے اور عسقلانیؒ نے فرمایا ہے مالم یؤذ بحدث اکثر حضرات کے ہاں فعل مجزوم کے ساتھ ہے بدلیت کی بناء پر اور استئناف کی بناء پر رفع بھی جائز ہے اور کشمیہنی کی روایت میں بحدث فیه جار مجرور کے ساتھ ہے جو یؤذ سے متعلق ہے اور مراد حدث سے ناقص وضوء ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے عام مراد ہے۔

ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد میں حدث گناہ ہے اور آدمی اس حدث کے ذریعے ملائکہ کی طلب مغفرت اور بابرکت دعاؤں سے محروم ہو جاتا ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اخراجِ ریح مسجد میں حرام نہیں ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے کیونکہ ملائکہ کو بھی انہی چیزوں سے تکلیف ہوتی ہے جن سے انسانوں کو ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں آئے گا۔

اور اس حدیث سے یہ مسئلہ ماخوذ ہوتا ہے کہ حدث اصغر اگرچہ ملائکہ کی دعاؤں کو روک دیتا ہے لیکن مسجد میں بیٹھنے کے جواز کیلئے مانع نہیں اور بعض حضرات نے اس میں اجماع کا دعویٰ کیا ہے لیکن دعویٰ اجماع محل نظر ہے، پس تحقیق ابن المسیبؒ اور حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ محدث جنبی کی طرح ہے مسجد میں گزر تو سکتا ہے لیکن مسجد میں بیٹھ نہیں سکتا اور اگر محدث مسجد میں اعتکاف یا نماز کے انتظار کیلئے بیٹھا یا ذِکر کیلئے بیٹھا تو یہ مستحب ہے ورنہ مباح ہے۔

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ اس حدیث کی وجہ سے مکروہ ہے: انما بنيت المساجد لذكر الله۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ مسجد میں بلا کراہت ہمارے نزدیک سونا جائز ہے اس لئے کہ اہل صفہ مسجد ہی میں ہمیشہ سوتے تھے اور بعض حضرات نے کہا کہ مقیم کیلئے مکروہ ہے نہ کہ مسافر کیلئے اور یہ امام مالکؒ اور احمدؒ کے مذہب کے قریب ہے اور سلف کی ایک جماعت نے فرمایا ہے کہ یہ مطلقاً مکروہ ہے اور یہ حدیث کہ حضور ﷺ صحابہؓ کے پاس تشریف لائے اور وہ سوئے ہوئے تھے تو فرمایا کہ انقلبوا اُٹھ جاؤ، پس یہ آدمی کیلئے سونے کی جگہ نہیں (یہ روایت ضعیف ہے) اس کی سند مجہول منقطع ہے۔ اور حضرت ابو ذرؓ کی یہ حدیث کہ حضور ﷺ نے مجھے مسجد میں سوتے ہوئے دیکھا تو پاؤں سے اٹھایا اور فرمایا میں تجھے اس میں سویا ہوا نہ دیکھوں۔ اس کی سند مجہول ہے اور اس میں ان کے لئے دلیل نہیں ہے۔

اور تطبیق ممکن ہے وہ اس طرح کہ جس کے لئے کوئی رہنے کی جگہ ہو اس کے لئے مکروہ ہے نہ کہ اس کے علاوہ دوسرے آدمی کیلئے کہ جس کا کوئی گھر نہ ہو۔

(متفق علیہ) بقول علامہ میرکؒ اس میں نظر ہے اس لئے کہ اللهم تب علیه بخاری میں نہیں ہے بلکہ شیخ ابن حجرؒ کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور علامہ جوزیؒ کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لا یزال احد کم یہ مسلم کے افراد میں سے ہے اور ابوداؤد اور ترمذی نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ غور سے سمجھ لو۔ واللہ اعلم۔

مسجد میں داخل ہونے اور خارج ہونے کی دُعا

۷۰۳: وَعَنْ اَبِیْ اُسَیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ اَحَدُکُمُ الْمَسْجِدَ فَلْیَقُلْ اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ وَاِذَا خَرَجَ فَلْیَقُلْ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ. (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ١/٤٩٤ حديث رقم (٦٨-٧١٣)۔ وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ١/٣١٧ حديث ٤٦٥ بالسئك عن أبی حميد أو عن أبی أسيد......وأخرجه النسائی عنهما فی السنن ٢/٥٣ حديث رقم ٧٢٩۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن عن أبی حميد ١/٢٥٤ حديث رقم ٧٧٢۔ والدارمی أخرجه عن أبی حميد أو عن أبی أسيد فی السنن ١/٣٧٧ حديث رقم ١٣٩٤۔ وأخرجه أحمد عنهما معافی المسند ٣/٤٩٧۔

ترجمہ: ''حضرت ابواسیدؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی آدمی مسجد میں داخل ہو تو اسے یہ دعا پڑھنی چاہئے: اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِیْ ...... اے اللہ اپنی رحمت کے دروازے میرے لئے کھول دے اور مسجد سے نکلتے وقت یہ دعا پڑھے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ۔ اللہ میں تجھ سے تیرا فضل مانگتا ہوں۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

ابواسید۔ یہ ''ابوسید'' مالک بن ربیعہ انصاری ساعدی کے بیٹے ہیں۔ تمام غزوات میں حاضر ہوئے ہیں۔ یہ اپنی کنیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان سے کثیر مخلوق نے روایت کی ہے۔ ان کی وفات ۶۰ھ میں ہوئی جب کہ ان کی عمر اٹھتر ۷۸ سال کی تھی اور بینائی زائل ہو چکی تھی اور بدریین صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کی وفات سب سے آخر میں ہوئی۔ اسید میں ہمزہ مضموم اور سین مہملہ مفتوح یاء ساکن اور دال مہملہ کیا گیا ہے کہ اسید میں ہمزہ مفتوح اور سین مہملہ مکسور ہے۔ صاحب ''المغنی'' نے پہلے ضبط کو اصح قرار دیا ہے۔ ابن حجر شرح شمائل میں لکھتے ہیں کہ ہمزہ مفتوح اور سین مہملہ مکسور ہے' نا کہ ہمزہ پر ضمہ اور سین مہملہ پر فتحہ' برخلاف بعض لوگوں کے۔

تشریح: وعن ابی اسید: اُسَید یہ مصغر ہے جیسا کہ شرح مسلم میں ہے اور مصنف کی اسماء الرجال میں ہے اور بعض نے کہا فتح اور کسرہ کے ساتھ ہے اور پہلا قول ٹھیک ہے، مغنی میں اسی طرح ہے اور ابن حجرؒ نے شمائل کی شرح میں لکھا ہے کہ فتح اور کسرہ کے ساتھ ہے نہ کہ ضمہ اور فتح کے ساتھ بخلاف ان لوگوں کے کہ جنہوں نے اس کو ضمہ اور فتح کے ساتھ گمان کیا ہے۔ اور طیبیؒ نے فرمایا ہے ابواسید یہ مالکؓ بن ربیعہ انصاری ساعدی ہیں۔

اللهم افتح لی ابواب رحمتك ......: علامہ طیبیؒ نے فرمایا کہ رحمت کو دخول کے ساتھ اور فضل کو خروج کے ساتھ خاص

کرنے میں شاید یہ راز ہو کہ جو مسجد میں داخل ہوگا تو وہ مشغول ہوگا ایسی چیز میں جو اس کو ثواب اور جنت کے قریب کرے، پس یہاں پر رحمت کا ذکر مناسب ہے اور جب نکلے گا تو حلال رزق کی تلاش کرے گا تو اس کے لئے فضل کا لفظ مناسب ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ [الجمعة : ١٠] ''تو اپنی اپنی راہ لو اور خدا کا فضل تلاش کرو۔''

رواہ مسلم: اور ابوداؤدؒ نے بھی اور یہ دونوں حضرات ابوحمید یا ابواسید سے نقل کرنے میں شک میں ہیں اور نسائی نے دونوں سے روایت کی ہے بغیر شک کے اور ابن ماجہ نے اکیلے ابوحمید سے، میرک شاہؒ نے صحیح سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

اور حاکم کی حدیث میں ہے اور اس کو اس نے صحیح قرار دیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو پس وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام کرے اور پھر یہ کہے: **اللھم اجرنی من الشیطان الرجیم۔** ''اے اللہ! مجھے شیطان مردود سے بچا''۔

اور ابن سنی کی ایک روایت میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی مسجد سے نکلنے کا ارادہ کرتا ہے تو ابلیس لعین کے لشکر والے ایک دوسرے کو بلاتے ہیں تو وہ کھینچے چلے آتے ہیں اور ایسے جمع ہو جاتے ہیں جیسا کہ شہد کی مکھی اپنی ملکہ یعسوب پر اکٹھی ہو جاتی ہیں، پس جب تم میں سے کوئی مسجد کے دروازے پر کھڑا ہو تو اس کو چاہیے کہ یہ کہے: **اللھم انی اعوذبك من ابلیس و جنودہ** ''اے اللہ! میں ابلیس اور اس کے لشکر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔'' جو آدمی یہ کہہ دے گا تو جنود ابلیس اسے کچھ ضرر نہ پہنچا سکے گا۔

تحیۃ المسجد

۷۰۴: وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا دَخَلَ اَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ يَّجْلِسَ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۵۳۷/۱ حدیث رقم ٤٤٤۔ وأخرجه مسلم فی صحیحه ٤٩٥/١ حدیث رقم (٦٩۔٧١٤) وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ٣١٨/١ حدیث رقم ٤٦٧۔ وذکر "سجدتین" بدل "رکعتین" وأخرجه الترمذی فی السنن ١٢٩/٢ حدیث رقم ٣١٦۔ وأخرجه النسائی فی السنن ٥٣/٢ حدیث رقم ٧٣٠۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ٣٢٤/١ حدیث رقم ٣٢٤۔ وأخرجه الدارمی فی السنن ٣٧٦/١ حدیث رقم ١٣٩٣۔ وأخرجه مالك فی الموطأ ١٦٢/١ حدیث رقم ٥٧ من کتاب قصر الصلاة فی السفر ۔ وأخرجه أحمد فی المسند ٢٩٥/٥۔

ترجمہ: ''حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی آدمی نماز میں داخل ہو تو اس کو چاہئے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ لے۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: فلیر کع: یہ امر استحباب کیلئے ہے نہ کہ وجوب کیلئے اہل ظواہر کا اس میں اختلاف ہے۔

ر کعتین: یعنی تحیۃ المسجد یا جو ان دو رکعتوں کے قائم مقام ہو فرض یا سنت نماز مکروہ اوقات کے علاوہ میں۔ ہمارے نزدیک یا طواف۔ (**قبل ان یجلس**) مسجد کی تعظیم کرتے ہوئے اور خطیب اس سے مستثنیٰ ہے۔

(**متفق علیه**) میرک شاہؒ نے فرمایا ہے کہ اصحاب سنن نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ اور صغانی کی مشارق میں یہ مذکور ہے کہ یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے اور صغانی نے وہاں (خ) کی علامت لگائی ہے، پس اس کو دو جگہوں میں وہم ہوا ہے۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) موقع اول سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے (صغانیؒ نے) اس حدیث کو ابو ہریرہؓ کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ یہ روایت حضرت ابوقتادہؓ کی طرف منسوب ہے۔

اور دوسرے سے یہ مراد ہے کہ انہوں نے صرف اس حدیث کی نسبت امام بخاری کی طرف کی ہے حالانکہ یہ روایت صحیحین کی طرف منسوب ہے اور جامع صغیر میں ہے کہ اس کو احمد بخاری، مسلم اور اصحاب اربعہ نے نقل کیا ہے حضرت ابوقتادہؓ سے اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے حضرت ابو ہریرہؓ سے۔ اور عقیلی، ابن عدی، بیہقی نے ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً ان الفاظ سے یہ روایت نقل کی ہے: **اذا دخل احدکم المسجد فلا یجلس حتی یرکع رکعتین واذا دخل احدکم بیته فلا یجلس حتی یرکع رکعتین فان الله جاعل له من رکعتیه فی بیته خیرا۔** ''کہ مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعات پڑھ اسی طرح جب گھر میں داخل ہو تو دو رکعات پڑھ، بے شک اللہ تعالیٰ اس کیلئے ان دو رکعات کے بدلے اس کے گھر میں بھلائی ڈالنے والے ہیں''۔

اور ایک روایت میں ہے: **اذا دخل احدکم المسجد فلا یجلس حتی یصلی رکعتین** ۔اور ایک روایت میں ہے: **اعطوا المساجد حقها......** ''کہ مساجد کو ان کا حق دو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ مساجد کا حق کیا ہے تو فرمایا کہ بیٹھنے سے قبل دو رکعات پڑھو''۔ اور یہ جو لوگ کرتے ہیں کہ پہلے آکر بیٹھ جاتے ہیں پھر بعد میں نماز کیلئے اُٹھتے ہیں یہ باطل ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ پھر حدیث سے ظاہراً یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نماز کا مستحب ہونا وہ بیٹھنے کے ارادہ رکھنے والے کے ساتھ خاص ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ جلوس کی قید اتفاقی ہے اکثریت کی بناء پر ایسا کہہ دیا۔

اور جو آدمی بے وضوء کی حالت میں داخل ہو یا مکروہ اوقات میں داخل ہو تو وہ چار مرتبہ یہ الفاظ کہے: **سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اکبر** ۔بعض نے **لا حول ولا قوة الا بالله العظیم** کی زیادتی بھی نقل کی ہے۔

بعض بزرگوں سے یہ منقول ہے کہ فضیلت میں یہ کلمات دو رکعتوں کے مساوی ہیں اور اس بات کی تائید وہ جابر بن زید کے قول سے ہوتی ہے جو بڑے جلیل القدر تابعی اور امام ہیں کہ جب تو مسجد میں داخل ہو تو نماز پڑھ اگر نماز نہ پڑھے تو اللہ کا ذِکر کر تو اللہ کا ذکر گویا ایسے ہی ہے جیسا کہ تو نے نماز پڑھی۔

اور جو مسجدِ حرام میں داخل ہو اور طواف کا ارادہ رکھتا ہو تو چاہیے کہ پہلے طواف کرے ورنہ پھر نماز پڑھے بخلاف ان لوگوں کے کہ جنہوں نے اس کے خلاف گمان کیا ہے جیسا کہ ان کا یہ کہنا کہ مسجدِ حرام کی تحیۃ المسجد اس کا طواف کرنا ہے۔ پھر حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیٹھنے کی وجہ سے یہ امر فوت ہو جائے گا لیکن ابن حبان نے ابو ذرؓ سے صحیح روایت میں نقل کیا ہے کہ ابو ذر فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں داخل ہوا پس میں نے اچانک دیکھا کہ حضور ﷺ مسجد میں اکیلے بیٹھے ہیں۔ پس میں بھی آپ ﷺ کے قریب بیٹھ گیا پس فرمایا اے ابو ذر! مسجد کیلئے بھی تحیہ (سلامی) ہے اور اس کی سلامی و تحیہ دو رکعتیں ہیں، پس کھڑا ہو جا اور دو رکعات پڑھ۔ ابو ذر فرماتے ہیں میں کھڑا ہوا اور میں نے دو رکعتیں پڑھیں۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ زائر جب مسجد نبوی میں داخل ہو تو پہلے نماز پڑھے پھر آپؐ کے روضہ اقدس کی زیارت کرے اللہ تعالیٰ کے حق کو مقدم کرتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے حق کو رسول اللہ ﷺ کے حق پر عظمت و تکریم دیتے ہوئے۔

سفر سے واپسی پر مسجد میں آنے کا حکم

۷۰۵: وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقْدِمُ مِنْ سَفَرٍ اِلَّا نَهَارًا فِي الضُّحٰى فَاِذَا قَدِمَ بَدَأَ بِالْمَسْجِدِ فَصَلّٰى فِيْهِ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ جَلَسَ فِيْهِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۹۳/۶ حدیث رقم ۳۰۸۸۔ وأخرجه مسلم فی صحیحه ۴۹۶/۱ حدیث رقم (۷۴۔۷۱۶) واللفظ ۔وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۲۲۰/۳ حدیث رقم ۲۷۸۱ ۔وأخرجه النسائی مطولًا ذکر فیه قصة المخلفین فی السنن ۵۳/۲ حدیث رقم ۷۳۲۔ وأخرجه الدارمی فی السنن ۴۲۸/۱ حدیث رقم ۱۵۲۰۔ وأخرجه أحمد فی المسند ۳۸۶/۶ فی قصة طویلة ۔

ترجمہ: ''حضرت کعب بن مالک ؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی عادت تھی کہ جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو چاشت کے وقت آتے اور سب سے پہلے مسجد میں تشریف لے جاتے ۔ وہاں دو رکعت نماز پڑھ کر کچھ دیر بیٹھے رہتے ۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: **لا یقدم**: دال کے فتحہ کے ساتھ ہے ای لا یرجع۔

الا نهارا فی الضحی: ضحیٰ سورج کے بلند ہو جانے کے وقت کو کہتے ہیں (یعنی جب اچھی طرح روشن ہو جائے)۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس وقت آنے میں حکمت یہ تھی کہ یہ ایسا وقت ہے کہ اس میں کسی قسم کی کوئی مشقت نہیں ہوتی ہوگی آپ ﷺ کے پاس آنے میں بخلاف دوپہر کے کیونکہ وہ راحت وآرام کا وقت ہے اور بخلاف دِن کے آخری حصے میں کیونکہ اس میں آدمی کی مختلف قسم کی مشغولیت (عشاء وغیرہ) ہوتی ہے اور بخلاف رات کے کہ اس میں حرکت کرنا اور آنا جانا باعث مشقت ہوتا ہے۔

ثم جلس فیه: قبل اس سے کہ اپنے گھر میں داخل ہوں تاکہ مسلمان آپ کی زیارت کرلیں یہ آپ ﷺ اُمت پر شفقت کرتے تھے۔

متفق علیه: بقول میرک شاہؒ اس کو ابوداؤد اور نسائی نے بھی نقل کیا ہے۔ اور عبدالحق نے اس روایت: **اذا دخل بیته فلیصل فیه رکعتین** کو روایت کیا ہے اور اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان منع ہے

۷۰۶: وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَمِعَ رَجُلًا يَنْشُدُ ضَالَّةً فِي الْمَسْجِدِ فَلْيَقُلْ لَا رَدَّهَا اللّٰهُ عَلَيْكَ فَاِنَّ الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهٰذَا۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۳۹۷/۱ حدیث رقم (۷۹۔۵۶۸)۔وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۲۱/۱ حدیث رقم ۴۷۳۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۲۵۲/۱ حدیث رقم ۷۶۷۔وأخرجه أحمد فی المسند ۳۴۹/۲۔وذکر

أبو داوٗد و أحمد "أداها" بدل "ردها"۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو آدمی کسی کو مسجد میں اپنی گم شدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنے۔ تو اسے چاہئے کہ وہ اس کے جواب میں یہ کہہ دے اللہ کرے تجھے تیری گم شدہ چیز نہ ملے۔ اس لئے کہ مسجدوں کو اس لئے نہیں بنایا گیا۔ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **ینشد:** یہ یطلب کے معنی اور ہم وزن ہے۔ **(ضالة فی المسجد) فی السمجد** یہ ینشد سے متعلق ہے یعنی اس کو اونچی آواز سے اس چیز گمشدہ چیز کو طلب کر رہا ہو۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: **نشدت الضالة انشدها نشدة و نشدانا طلبتها** اور **انشدتها** الف کے ساتھ جب کہ یہ **نشد** سے ہو اس کا معنی ہے آواز بلند کرنا، اور اس حکم میں ہر وہ چیز داخل ہوگی کہ جس کے لئے مسجد نہیں بنائی گئی جیسے بیع و شراء وغیرہ اور بعض بزرگ اس بات کو جائز نہیں سمجھتے تھے کہ وہ کسی سائل کو جو کہ مسجد میں مانگ رہا ہو صدقہ دیں۔

فان المساجد: یہ حکم کی علت ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ قول کا مقولہ ہو یعنی یہ کہے:

لم تبن لهذا: یعنی گمشدہ چیز طلب کرنے کیلئے مساجد نہیں بنائی گئی بلکہ یہ تو اللہ کے ذِکر، تلاوت، وعظ وغیرہ کیلئے بنائی گئی ہیں یہاں تک کہ حضرت امام مالکؒ نے مسجد میں علمی بحث کو مکروہ کہا ہے اور امام ابو حنیفہؒ اور ان کے علاوہ بعض دوسروں نے اس کو جائز قرار دیا ہے کہ مسجد میں بحث علمی کی لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے کیونکہ مسجد میں لوگ جمع ہوتے ہیں، یہ ابن الملکؒ کی تشریح ہے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے عقدِ نکاح مستثنیٰ ہے کیونکہ وہ اَمر کی وجہ سے سنت ہے (یعنی مساجد میں نکاح کا حکم دیا گیا)

(رواه مسلم) اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ (قالہ میرکؒ)

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک آدمی کو سنا کہ وہ سرخ اونٹ کا اعلان مسجد میں کر رہا تھا تو فرمایا کہ تو اپنے اونٹ کو نہ پائے: **انما بنیت المساجد لما بنیت له**'' کہ مساجد اسی چیز کیلئے ہیں جس کیلئے وہ بنائی گئی ہیں''۔

اور امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا کہ جس میں یہ آیا ہے کہ جب تم کسی کو بیع و شراء مسجد میں کرتے ہوئے دیکھو تو پس تم کہو: **لا اربح الله تجارتك** اللہ تعالیٰ تیری تجارت میں نفع نہ دے اور جب تم کسی کو مسجد میں گمشدہ چیز کا اعلان کرتے دیکھو تو یہ کہو: **لا ردها الله علیك** کہ اللہ تمہارے چیز تمہیں واپس نہ لوٹائے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں اسی طرح مستحب ہے کہ جو مذموم اشعار مسجد میں پڑھے اس کو یوں کہا جائے: **فض الله فاك** (اللہ تیرے منہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے) تین مرتبہ۔ اس میں اَمر کی وجہ سے جس کو ابن السنی نے روایت کیا ہے۔

اور مسجد میں سائل کو کچھ دینے میں حرج نہیں ہے دلیل وہ صحیح روایت ہے جس میں یوں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: **هل احدمنكم اطعم الیوم مسكینا؟** کہ کیا تم میں سے کسی نے آج کسی مسکین کو کھانا کھلایا ہے تو حضرت ابو بکر صدیقؓ فرماتے ہیں میں مسجد میں داخل ہوا تو میں نے وہاں ایک سائل کو پایا، پس میں نے عبدالرحمان کے ہاتھ میں ایک روٹی کا ٹکڑا پایا۔ میں نے اس سے لے لیا اور سائل کو دے دیا۔

اور بیہقی نے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے سلیک عطفانی کو جمعہ کے دِن اثناء خطبہ میں نماز پڑھنے کا حکم دیا تا کہ لوگ

اس کو دیکھ لیں اور اس پر صدقہ کریں اور حضور ﷺ نے لوگوں کو صدقے کا حکم دیا اس حال میں کہ آپ ﷺ منبر پر تھے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی کوئی دلالت نہیں ہے کہ وہ سائل تھے حالانکہ کلام سائل کے بارے میں ہے اور بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ مسجد میں دینا حلال نہیں ہے جیسا کہ بعض احادیث و اثار میں آیا ہے کہ قیامت کے دن یہ اعلان کیا جائے گا ''اللہ کے مبغوض لوگ کھڑے ہو جائیں'' پس مسجد میں سوال کرنے والے کھڑے ہوں گے اور بعض حضرات نے اس فقیر کے درمیان کہ جو لوگوں کو گزرنے میں تکلیف دیتا ہے اور اس کے برخلاف دوسرے فقیر کے درمیان تفصیل بیان کی ہے۔ کہ جو تکلیف دیتا ہے اس کو دینا مکروہ ہے کیونکہ یہ ایک ممنوع پر اس کی اعانت ہے اور جو تکلیف نہیں دیتا تو اس کو دینا مسنون ہے اس لئے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں سائلین مسجد میں سوال کرتے تھے یہاں تک کہ روایات میں ہے کہ حضرت علیؓ نے انگوٹھی نماز کی حالت میں صدقہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اس فعل پر یوں مدح فرمائی: ﴿وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ﴾ ''کہ وہ رکوع کی حالت میں زکوۃ (صدقات) دینے والے ہیں''۔ [المائده: ۵۵]

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں اس تفصیل میں کچھ نظر ہے وہ یہ کہ حدیث میں اور اسی طرح آیت میں اس بات کی دلالت نہیں ہے کہ حضرت علیؓ کا انگوٹھی دینا مسجد میں تھا اور ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمانے کا اختلاف ہے سائلین کے بدلنے اور مختلف ہونے کی بناء پر۔

بدبودار اشیاء کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت

۷۰۷: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ الْمُنْتِنَةِ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا فَاِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَتَاَذّٰى مِمَّا يَتَاَذّٰى مِنْهُ الْاِنْسُ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/۳۳۹ حديث رقم ۸۵۴۔ وأخرجه مسلم في صحيحه ۱/۳۹۴ حديث رقم (۷۲۔۵۶۴) واللفظ لمسلم۔ وأخرجه النسائي في السنن ۲/۴۳ حديث رقم ۷۰۷ وذكر فيه الثوم والبصل والكرات۔ وأخرجه أحمد في المسند ۳/۳۷۴۔

ترجمہ: ''حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی اس بدبودار درخت میں سے کچھ کھائے تو وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ جس بدبو سے انسان کو تکلیف ہوتی ہے اس سے فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: من اكل من هذه الشجرة: قاموس میں لکھا ہے کہ: الشجر من النبات ما قام على ساق او سما بنفسه دق او جل قاوم الشتاء او عجز عنه الواحدة بهاء۔ کہ شجر نباتات میں سے اس کہتے ہیں جو اپنے تنے پر قائم ہو یا بذاتِ خود بڑھا ہو چھوٹا ہو یا بڑا سردی کا مقابلہ کر سکے یا اس سے عاجز آ جائے اس کی واحد ھاء کے ساتھ شجرۃ ہے۔ پس ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ اس کا نام شجرۃ تغلیباً رکھا گیا ہے یہ ظاہر نہیں ہے ہاں اگر یوں کہتے کہ لہسن کو شجرہ مجازاً کہا ہے تو اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور اسی وجہ سے کہا ہے کہ شجرۃ حقیقۃً اس کو کہتے ہیں کہ جس کا تنا اور شاخیں ہوں اور شجرہ کے برعکس وہ نجم ہے (یعنی جس کا تنا اور

شاخیں نہ ہوں) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ﴾ [الرحمٰن: ٦] ''اور بوٹیاں اور درخت سجدہ کر رہے ہیں'' یہ تشریح کہ (نجم سے وہ پودا ہے کہ جس کی ساق وتنا اور شاخیں نہ ہو) یہ ایک قول ہے اس آیت کی تفسیر میں ورنہ مجاہدؒ نے فرمایا ہے کہ نجم سے مراد ستارہ ہے اور اس کے سجود سے مراد طلوع ہے۔

المنتنة: یعنی لہسن اور اسی پر پیاز اور مولی اور اسی طرح جو بدبودار چیزیں ہیں جیسا کہ کراث وغیرہ قیاس کی گئی ہیں۔ (کراث ایک بدبودار بوٹی ہے) علماءِ کرام فرماتے ہیں اس حکم میں وہ آدمی بھی ہے کہ جس کے منہ کی بدبو بہت زیادہ ہو یا ایسے زخم والا ہو کہ جس سے بدبو آتی ہے۔

فلا یقربن مسجدنا: بعض نے کہا ہے کہ یہ ''نہی'' تمام مساجد کے ساتھ متعلق ہے، پس اضافت یہاں یا تو ملک کیلئے ہے یا یہاں عبارت مقدر ہے: مسجد أهل ملتنا کیونکہ علت (فان الملئكة تاذى) ہے اور ایک صحیح نسخہ میں ہے: تَتأذى اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو عبادات کی جگہ پر عام طور پر حاضر ہوتے ہیں اور یہ تمام مساجد میں پائی جاتی ہیں، پس یہ حکم عام ہوگا اور علت بیان کرنا دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ آدمی اس حالت میں مسجد میں داخل نہ ہوگا اگرچہ مسجد خالی ہو کیونکہ مساجد ملائکہ کا محل ہیں۔

مما یتاذى منه الانس: یہ محمول ہوگا ان کھ وجود کی تقدیر پر۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ مسلم کی ایک روایت میں ہے: من اكل البصل والثوم والكراث فلا يقربن مسجدنا، ''جس نے اس لہسن کے درخت میں سے کھایا اور ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے پیاز، لہسن اور گندنا کھایا تو وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے'' اور ایک روایت میں مساجدنا ہے اور ایک دوسری روایت میں فلا یاتین المساجد ہے۔ ''نبی ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اس لہسن کے درخت میں سے کھایا اور ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے پیاز، لہسن اور گندنا کھایا تو وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ فرشتے ان چیزوں سے تکلیف محسوس کرتے ہیں جن سے انسان تکلیف محسوس کرتے ہیں۔'' (صحیح مسلم: جلد اول: حدیث نمبر ۱۲۴۹ حدیث متواتر حدیث مرفوع' مکررات ۷ متفق علیہ ۱۲)

اور ان روایت سے اس آدمی کا رد ہو جاتا ہے جس نے یہ کہا ہے کہ یہ حکم مسجد نبویؐ کے ساتھ خاص ہے۔

متفق علیه: بقول میرکؒ کے کہ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ علامہ نوویؒ نے فرمایا مسلم کی شرح میں اس حدیث: لقد رايت رسول الله اذا وجد ريحا من الرجل في المسجد امر به فاخرج الى البقيع، ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب آپؐ مسجد میں ان درختوں کی کسی آدمی سے بدبو محسوس کرتے تو حکم فرماتے کہ اسے بقیع کی طرف نکال دیا جائے، تو جو آدمی انہیں کھائے تو خوب انہیں پکا کر ان کی بدبو مار دے'' کے تحت لکھا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس آدمی سے ریح محسوس ہوا سے مسجد سے نکالنا چاہیے جیسا کہ جو پیاز وغیرہ مسجد میں کھا کر آئے منکر کو جس قدر ممکن ہو اپنے ہاتھ سے دور کیا جائے۔

مسجد میں تھوکنا گناہ ہے

۷۰۸: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْبُزَاقُ فِي الْمَسْجِدِ خَطِيْئَةٌ وَ

كَفَّارَتُهَا دَفْنُهَا .(متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٥١١/١حديث رقم ٤١٥۔وأخرجه مسلم في صحيحه (٥٥۔٥٥٢)وأخرجه أبوداؤد في السنن ٣٢٢/١حديث رقم ٤٧٥۔أخرجه الترمذي في السنن ٤٦١/٢حديث رقم ٣٧٢۔وأخرجه النسائي في السنن ٥٠/٢حديث رقم ٧٢٣۔وأخرجه الدارمي في السنن ٣٧٧/١حديث رقم ١٣٩٥۔وأخرجه أحمد في المسند٢٣٢/٣۔

ترجمہ:''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو زمین میں دفن کیا جائے۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح:البزاق: یعنی تھوک کا ڈالنا، اور کبھی اس کو بصاق اور بساق بھی پڑھا جاتا ہے۔(**خطیئة**) ای **اثم** اور احمدؒ کی ایک روایت میں **سیئة** ہے۔اور تھوک ناک کی ریزش کی طرح ہے بلکہ اس سے خفیف ہے۔

دفنها: یعنی جب اس تھوک کو زائل کر دیا یا کسی پاک چیز سے چھپا دیا تھوکنے کے بعد تو اس سے یہ گناہ دور ہو جائے گا۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس کے کفارہ ہونے کا معنی یہ ہے کہ دفن کرنا اس تحریم کو قطع کر دیتی ہے جو واقع ہوئی ہے نہ یہ کہ یہ بالکل ختم ہو جاتی ہے (یعنی دفن کرنے سے مکمل گناہ ختم نہیں ہوگا)۔بعض مالکیہ اس سے اختلاف کرتے ہیں اسی وجہ سے امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ یہ بات (کہ دفن بالکل گناہ کو ختم کر دیتا ہے) باطل ہے کیونکہ یہ اِس مذکور صحیحین کی روایت کے منافی ہے۔

اور یہ حدیث: **رایت رسول الله صلی الله علیه وسلم یفعله فی المسجد** ضعیف ہے۔دوسرا یہ کہ اس حدیث میں اس کی دلیل نہیں ہے کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے اس پر دلیل نہیں پکڑی جائے گی۔

اور تھوک کے دفن کرنے میں حکمت وہ اس حدیث میں ہے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی ناک صاف کرے پس چاہیے کہ وہ اس ریزش کو چھپا دے تاکہ کسی مؤمن کی جلد یا کپڑے کو نہ لگ جائے، پس یہ اس کیلئے تکلیف کا باعث ہوگا۔ابن العلماء نے فرمایا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جس نے مسجد میں تھوکا مسجد کی اہانت وتوہین کرتے ہوئے تو اس نے کفر کیا۔

مسجد کو گندگی سے پاک کرنا ثواب ہے

۷۰۹: وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عُرِضَتْ عَلَیَّ اَعْمَالُ اُمَّتِیْ حَسَنُهَا وَسَیِّئُهَا فَوَجَدْتُّ فِیْ مَحَاسِنِ اَعْمَالِهَا الْاَذٰی یُمَاطُ عَنِ الطَّرِیْقِ وَوَجَدْتُّ فِیْ مَسَاوِیْ اَعْمَالِهَا النُّخَاعَةَ تَکُوْنُ فِی الْمَسْجِدِ لَا تُدْفَنُ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٣٩٠/١حديث رقم (٥٧۔٥٥٣)وأخرجه ابن ماجة في السنن ١٢١٤/٢حديث رقم ٣٦٨٣ وأخرجه أحمدفي المسند ١٧٨/٥۔

ترجمہ:حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے سامنے میری امت کے اچھے اور برے اعمال پیش کئے گئے میں نے اس کے اچھے اعمال میں راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کو دور کرنا پایا اور

برے اعمال میں مسجد کے اندر تھوکنا دیکھا جس کو دفن نہ کیا گیا ہو۔اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **عرضت علیّ اعمال امتی:** یعنی عاملین کے بیان کے بغیر اجمالاً اور تفصیلاً پیش کیئے جانے کا بھی احتمال ہے اور ظاہر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اعمال جوارح مراد ہیں۔(**حسنها و سيئها**) یہ مرفوع ہیں **اعمال امتی** سے بدل کی بناء پر۔

فی محاسن اعمالها: محاسن یہ حُسن کی جمع ہے، خلاف قیاس۔(**الاذی**) یعنی تکلیف دہ چیز مقصود ہے اس کا زائل کرنا ''لام'' اس میں عہد ذھنی کیلئے ہے اور بعض کا یہ کہنا ہے کہ ''لام'' جنس کیلئے ہے۔

بما عن الطریق: بقول علامہ طیبیؒ یہ **الاذی** کی صفت ہے۔(**فی مساوی اعمالها**) مساوی یہ سوء کی جمع ہے علی خلاف القیاس اور اس میں ''یاء'' ہمزہ سے منقلب ہے۔(**النخاعة**) نون کے ضمہ کے ساتھ ہے یعنی وہ تھوک جو منہ کی جڑ (انتہاء) سے نکلتا ہے اور مراد یہاں سے تھوکنا ہے۔اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد تھوک ہے اور نخامہ بلغم کو کہتے ہیں۔

تکون فی المسجد: یہ **نخاعه** کی صفت ہے۔(**لا تدفن**) بقول ابن الملکؒ یہ دونوں جملے یا تو صفت ہیں یا حال ہیں۔حال متداخلہ ہوں یا مترادفہ۔

نماز کی حالت میں بلغم آجائے تو کیا کرے؟

۷۱۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ اَحَدُكُمْ اِلَى الصَّلَاةِ فَلَا يَبْصُقْ اَمَامَهٗ فَاِنَّمَا يُنَاجِی اللّٰهَ مَادَامَ فِیْ مُصَلَّاهُ وَ لَا عَنْ يَمِيْنِهٖ فَاِنَّ عَنْ يَمِيْنِهٖ مَلَكًا وَلْيَبْصُقْ عَنْ يَسَارِهٖ اَوْتَحْتَ قَدَمِهٖ فَيَدْفِنُهَا۔

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱/۵۱۲حدیث رقم ۴۱۶۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۳۸۹حدیث (۵۳۔۵۵۰) وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۳۲٦)حدیث رقم ۱۰۲۲۔واللفظ للبخاری۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی آدمی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے سامنے نہ تھوکے اس لیے کہ جب تک وہ نماز کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ سے سرگوشی کرتا ہے اور دائیں طرف بھی نہ تھوکے کیونکہ دائیں طرف ایک فرشتہ ہوتا ہے' البتہ بائیں طرف اور قدموں کے نیچے تھوک دے اور پھر اس کو زمین میں دبا دے۔''

تشریح: **فلا یبصق امامه:** یہ ''نہی'' ہے، بعض نے کہا ہے کہ نفی ہے جو ''نہی'' کے معنی میں ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ حکم عام ہے چاہے مسجد یا غیر مسجد ہو یعنی اپنے سامنے قبلے کی طرف نہ تھوکے اور قبلے کی تخصیص کرنا باوجود یہ کہ تمام جہات کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف برابر ہے یہ اس قبلے کی تعظیم کی وجہ سے ہے۔

فانما یناجی الله: یعنی جب تک نماز کی جگہ پر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ سے مخاطب رہتا ہے اور جو اس طرح مثلاً کسی سے مخاطب ہوتا ہے وہ اس کی طرف تھوکتا نہیں ہے۔(**لا عن یمینه**) دائیں طرف کی عظمت اور شرف کی وجہ سے۔

فان عن یمینه ملکا: وہ نیکیاں لکھتا ہے جو رحمت کی علامت ہیں، پس وہ فرشتہ معزز و مکرم ہوگا اور تنکیر یہاں پر تعظیم کیلئے ہے اور تحقیق حدیث میں آیا ہے کہ یہ فرشتہ بائیں طرف والے پر امیر ہوتا ہے تین ساعات تک یہ بائیں طرف والے فرشتے کو برائیوں کے لکھنے سے روکتا ہے اس اُمید سے کہ شاید گنہگار اس سے رجوع و توبہ کر لے۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہاں یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد کوئی اور فرشتہ ہو کراماً کاتبین کے علاوہ جو نماز کے وقت تائید الہام اور اس کی دعا پر آمین کہنے کیلئے حاضر ہوتا ہو تو اس کا آنا ایسے ہے جیسے کہ کوئی زیارت کرنے والا آتا ہے تو واجب ہے کہ اس فرشتے زائر کی عزت و تکریم کراماً کاتبین سے بھی بڑھ کر کی جائے۔

اور یہ احتمال بھی ہے کہ دائیں جانب والے فرشتے کو کرامت کے ساتھ خاص کیا گیا ہو اس بات پر تنبیہ کرتے ہوئے کہ دونوں فرشتوں کے درمیان میں سے رحمت اس کے ساتھ ہے جیسا کہ یمین اور شمال میں قوت اور کرامت کا فرق ہے (یعنی دائیں طرف زیادہ معزز ہے) اور ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب کے درمیان تمیز کرتے ہوئے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ بعض حضرات نے مسجد نبوی میں قبلے کی جانب منہ کرنے والے کو اس حکم سے مستثنٰی مانا ہے کیونکہ اس کا اس وقت دائیں طرف میں تھوکنا اولی ہے کیونکہ بائیں جانب آپ ﷺ تشریف فرما ہیں۔

(ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں) یہ بہتر ہے جیسا کہ اس کی بائیں طرف کوئی جماعت ہو اور پاؤں کے نیچے تھوکنا ممکن نہ ہو پس بے شک اس وقت ظاہر یہ ہے کہ دائیں طرف بہتر ہے۔

اور ظاہر یہ ہے کہ جب کعبہ یا حجر (خانہ کعبہ کے شمالی حصہ) میں نماز پڑھے، پس اس وقت قدم کے نیچے تھوکنا ہی متعین ہے جب کہ قدم کے نیچے کپڑا ہو یا اس تھوک کو آستین یا دامن کے ساتھ صاف کر دے۔

لیبصق: اور ایک نسخہ میں واؤ عاطفہ کے ساتھ ہے اور لام کسرہ اور سکون کے ساتھ۔ **(عن یسارہ)** یعنی اپنے کپڑے پر اگر وہ مسجد میں ہو۔

او تحت قدمه: جب کہ قدم کے نیچے کپڑا ہو، اور ایک روایت میں **وتحت قدمه** "واؤ" کے ساتھ ہے اور ایک دوسری روایت میں بغیر واؤ کے ساتھ ہے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا کہ یہ اس وقت ہے جب کہ نمازی مسجد کے علاوہ میں ہو یا مسجد میں ہو لیکن یہ تھوک مسجد کے کسی حصے تک نہ پہنچے اور اس حکم میں خارج صلوٰۃ کو بھی ملایا جائے گا اگرچہ مسجد میں نہ ہو، اذرعیؒ اس کے خلاف ہیں سبکی کی طرح۔ پھر بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے مراد مطلقاً وہ شخص ہے جو نماز سے خارج ہو، اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ حکم (یعنی دائیں طرف نہ تھوکو بلکہ بائیں طرف یا قدم کے نیچے تھوکو) اس وقت ہے جب کہ یہ قبلہ کی طرف منہ کیئے ہو سامنے کی جانب تھوکنے کے مکروہ ہونے کی طرف نسبت کرتے ہوئے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ بعض روایات میں اس طرح آیا ہے جیسا کہ مصنف عبدالرزاق وغیرہ کی روایت ہے ابن مسعودؓ سے کہ وہ دائیں طرف تھوکنے کو ناپسند سمجھتے تھے نماز کے علاوہ بھی اور حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہ جب سے میں مسلمان ہوا ہوں میں نے دائیں طرف نہیں تھوکا۔ فتح الباری میں لکھا ہے۔ گویا کہ وہ شخص جس نے اس کو حالت صلوٰۃ کے ساتھ خاص کیا ہے اس نے یہ بات "نہی" کی علت سے اخذ کی ہے یعنی **بان عن یمینه ملکا** سے۔ یہ بات اس صورت

میں تو ظاہر ہے کہ اگر مَلَکٌ سے کاتب کے علاوہ مراد لیں (یعنی کراماً کاتبین نہ لیں) ورنہ اس اختصاص پر اشکال ہو جائے گا یعنی یہ اعتراض ہوگا کہ ہم آپ کی بات تسلیم نہیں کرتے کہ دائیں جانب فرشتے کے ہونے کی وجہ سے منع فرمایا کیونکہ بائیں طرف بھی فرشتہ ہے۔ مقدمین میں سے ایک جماعت نے اس اعتراض کا جواب یہ دیا ہے کہ دائیں طرف والے فرشتے کو خاص کرنے میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ اس میں دائیں والے فرشتے کو شرف اعزاز سے نوازا نا ہو۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس میں جو اعتراض ہے وہ کسی پر مخفی نہیں ہے۔ اور متاخرین میں سے بعض نے اس کا جواب دیا ہے کہ بے شک نماز بدنی نیکیوں کی ماں ہے پس برائیوں کے لکھنے والے فرشتے کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوگا اور اس بات کی شہادت وتائید ابن ابی شیبہ کی اس حدیث سے ہوتی ہے: **فان عن یمینه کاتب الحسنات** اور طبرانی کی روایت ہے: **انه یقوم بین یدی الله وملك عن یمینه وقرینه عن یساره** ۔ پس تھوک اس صورت میں وہ قرین پر پڑھے گا اور وہ شیطان ہے اور شاید کے کراماً کاتبین میں سے بائیں طرف والا فرشتہ وہ اس جگہ میں ہو جہاں اسے کوئی چیز نہ پہنچتی ہو۔

فیدفنھا: یہ مرفوع اور مجزوم مروی ہے اور دفن کرنا وہ تکلیف کو دفع کرنے کیلئے ہے۔

۷۱۱: وَفِیْ روایة اَبِیْ سَعِیْدٍ تَحْتَ قَدَمِهِ الْیُسْرٰی ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۵۱۲/۱حدیث رقم ۴۱۶۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ۳۸۹/۱حدیث (۵۳۔۵۵۰) وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۳۲۶/۱)حدیث رقم ۱۰۲۲۔واللفظ للبخاری ۔

ترجمه: اور ابو سعید کی روایت میں یہ الفاظ ہیں اپنے بائیں پاؤں کے نیچے تھوک دے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **وفی روایة ابی سعید تحت قدمه الیسری**: اور یہ جملہ تقیید کا احتمال رکھتا ہے اور اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ مراد قدم سے تو دونوں ہوں لیکن بائیں کے نیچے تھوکنا افضل ہو۔

قبر پر سجدہ حرام ہے

۷۱۲: وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِیْ مَرَضِهِ الَّذِیْ لَمْ یَقُمْ مِنْهُ لَعَنَ اللّٰهُ الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَائِهِمْ مَسَاجِدَ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۴۰/۸حدیث رقم ۴۴۴۴۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ۳۷۶/۱حدیث رقم (۱۹۔۵۲۹) وأخرجه أحمد فی المسند۱۲۱/۶۔

ترجمه: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بیماری میں جس سے آپ ﷺ اٹھ نہ سکے فرمایا: ''عیسائیوں اور یہودیوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا'' (بخاری ومسلم)

تشریح: **ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال فی مرضه الذی لم یقم منه**:

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ گویا حضور ﷺ نے پہچان لیا کہ وہ اس عالم فانی سے عنقریب کوچ کرنے والے ہیں اور آپ ﷺ کو یہ ڈر محسوس ہوا کہ کہیں لوگ آپ ﷺ کی ابلیسی تعظیم نہ کریں جس طرح کہ یہود ونصاریٰ نے کی تو اس پر حضور ﷺ

نے لعنت کے ساتھ تعریض کی تا کہ لوگ آپ ﷺ کی قبر کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کریں، پس فرمایا: (**لعن الله اليهود والنصارى**) اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد: (**اتخذوا قبور انبيائهم مساجد**) یہ ان پر لعنت کا سبب ہے یا تو اس لئے کہ وہ انبیاء کی قبور کو سجدہ کرتے تھے ان کی تعظیم کرتے ہوئے اور یہ شرک جلی (واضح) ہے اور یا اس لئے کہ یہود و نصاریٰ انبیاء کی دفن ہونے والی جگہوں میں اللہ کے لئے نماز پڑھتے، اور ان کی قبور پر سجدے کرتے اور نماز کی حالت میں ان کی قبور کی طرف توجہ کرتے دو باتوں کو مقصود سمجھتے ہوئے ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کو اور دوسرا انبیاء علیہم السلام کی تعظیم میں مبالغہ کرنے کو تو یہ شرک خفی بنا کیونکہ اس میں مخلوق کی ایسی تعظیم مذکور ہے کہ جس کی اجازت نہیں دی گئی ہے، پس حضور ﷺ نے اپنی اُمت کو اس سے روکا یا تو اس لئے کہ اس میں یہود کے طریقے کی مشابہت ہے یا اس وجہ سے کہ یہ شرک خفی کو متضمن ہے۔ ہمارے ائمہ میں سے بعض شراح نے اسی طرح تشریح فرمائی ہے اور اس کی تائید ایک روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں یہ الفاظ مذکور ہیں: **يحذر ما صنعوا** کہ حضور ﷺ یہود کے کیئے ہوئے عمل سے (جو سبب لعنت بنا) ڈرا رہے تھے۔

اور قاضیؒ نے فرمایا ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے انبیاء کی قبور کو سجدہ کرتے تھے اور اس کو قبلہ بناتے تھے اور نماز میں ان قبور کی طرف متوجہ ہوتے تھے پس تحقیق انہوں نے ان قبور کو بُت بنا رکھا تھا پس اسی وجہ سے حضور ﷺ نے ان پر لعنت کی اور مسلمانوں کو اس سے روک دیا اور باقی وہ شخص جس نے کسی نیک آدمی کی قبر کے قریب مسجد بنائی یا اس کے مقبرہ میں نماز پڑھی اور اس کی روح کے وسیلے سے مدد طلب کی یا اس کو عبادت میں سے کسی اثر کے پہنچانے کا ارادہ کیا نہ اس کی تعظیم اور نہ اس کی طرف توجہ کی نیت کی تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ اسماعیل علیہ السلام کی قبر مسجد حرام میں حطیم کے پاس ہے اور یہ جگہ جہاں اسماعیل علیہ السلام کی قبر ہے یہ افضل جگہوں میں سے ہے جہاں نمازی نماز پڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور قبرستان میں نماز پڑھنے کی جو "نہی" ہے وہ خاص ہے ان قبروں کے ساتھ کہ جن کو کھودا جاتا ہے اس لئے کہ اس میں نجاست ہوتی ہے۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ اور بعض دوسرے حضرات نے ذکر کیا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام کی قبر کی صورت وہ بیت اللہ کے شمالی گوشے میں میزابِ رحمت کے نیچے ہے اور یہ کہ حطیم میں حجر اسود اور زمزم کے درمیان ستر انبیاء علیہم السلام کی قبور ہیں۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس بات میں کلام ہے کیونکہ اسماعیلؑ کی قبر کی صورت اور ان کے علاوہ دوسری قبور اب مٹ چکی ہیں ان کا وہاں نشان تک بھی نہیں ہے لہٰذا اس بات سے استدلال ٹھیک نہیں ہے۔

اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ شارح نے اسماعیل علیہ السلام کی قبر کے پاس نماز پڑھنے کے اشکال کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نماز مقبرہ میں مکروہ ہے اور اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس بات کا محل وہ مقبرہ ہے جس کی قبور کھودی جاتی ہوں تو ان میں کراہت نجاست کی وجہ سے ہے۔ یہ ساری کی ساری بات مشائخ کے اس قول سے غفلت کی بناء پر ہے کیونکہ مشائخ **کثرهم الله** نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اس حکم سے انبیاء کی قبور مستثنیٰ ہیں: **لا نهم احياء فى قبورهم**۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں اور علی سبیل التنزل بھی شارح کا یہ جواب صحیح نہیں کیونکہ مشائخ نے غیر انبیاء کے مقبرہ میں نماز پڑھنے کے مکروہ ہونے کی صراحت کی ہے اگرچہ اس کو کھودا نہ گیا ہو کیونکہ وہ آدمی اس صورت میں نجاست کے محاذی کھڑا ہوگا اور نجاسات کی محاذات نماز میں مکروہ ہے اور یہ برابر بات ہے کہ نجاسات اس کے اوپر ہوں یا اس کے پیچھے یا اس کے نیچے جس پر یہ کھڑا ہے۔

اور شرح السنہ میں لکھا ہے کہ مقبرہ میں نماز پڑھنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے پس علماء کی ایک جماعت نے اس کو مکروہ کہا ہے اگرچہ مٹی و مکان پاک و طاہر ہوں اور ان علماءِ کرام نے بعد میں آنے والے حدیث سے استدلال کیا ہے۔

اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ مقبرہ میں نماز پڑھنا جائز ہے اور حدیث کی تاویل یہ ہے کہ اکثر قبرستان میں مٹی مردوں کے پیپ اور گوشت وغیرہ کے ساتھ مختلط ہوتی ہے اور ''نہی'' وہ مکان کی نجاست کی وجہ سے ہے پس اگر جگہ پاک ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اسی طرح کوڑا خانہ اور ذبح کرنے کی جگہ اور راستے کا حکم ہے اور راستے میں نماز پڑھنے سے منع کرنے میں ایک اور سبب بھی نظر آتا ہے وہ یہ کہ نمازی کو ہر گزرنے والا اپنے میں مشغول کرے گا۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طریق سے یہ منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقبرہ میں نماز پڑھنے سے روکا ہے اور علماء نے اس ''نہی'' کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ یہ ''نہی'' تنزیہی ہے یا تحریمی ہے امام احمدؒ کا مذہب یہ ہے کہ ''نہی'' تحریم کیلئے ہے بلکہ نماز ہی منعقد نہیں ہوگی اس لئے کہ امام احمدؒ کے نزدیک امکنہ کی نہی (یعنی ان جگہوں میں نماز پڑھنے سے روکنے کی نہی) وہ اوقات کی نہی کی طرح تحریم اور بطلان کا فائدہ دیتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر سجدہ کرنے سے منع کیا ہے

۷۱۳: وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ أَلَا وَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدَ أَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ إِنِّيْ أَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه من حديث طويل ۱/۳۷۷ حديث رقم (۲۳-۵۳۲)۔

ترجمہ: حضرت جندبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ خبردار تم سے پہلے لوگوں نے اپنے انبیاء اور اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا دیا تھا لہٰذا خبردار تم لوگ قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا میں اس سے تمہیں منع کرتا ہوں اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: الا تنبیہ کیلئے ہے۔ (و انّ) یہ کسرہ کے ساتھ ہے انبھکم واقول ان...... کے مقدر ماننے کی صورت میں اور فتحہ کے ساتھ بھی مروی ہے، پس تقدیر عبارت یوں ہوگی: تنبھوا واعلموا ان......۔ (من کان قبلکم) یعنی یہود و نصاریٰ یا ان سے عام مراد ہیں۔

الا فلا تتخذوا القبور مساجد: حرف تنبیہ کو یہاں پر سبب اور مسبب کے درمیان بطور مبالغے کے زائد مکرر ذکر کیا ہے اور جس طرح تنبیہ کو مکرر ذکر کیا ہے اسی طرح نہی کو بھی مکرر ذکر کیا ہے۔ اپنے اس ارشاد: انی انھاکم عن ذلك میں۔

(رواہ مسلم)

گھر کو قبرستان نہ بناؤ

۷۱۴: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِجْعَلُوْا فِيْ بُيُوْتِكُمْ مِنْ صَلَاتِكُمْ

وَلَا تَتَّخِذُوْهَا قُبُوْرًا۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۵۲۸/۱ حديث رقم ۴۳۲۔ وأخرجه مسلم في صحيحه ۵۳۸/۱ حديث (۲۰۸۔۷۷۷) وأخرجه أبوداوٗد في السنن ۶۳۲/۱ حديث رقم ۱۰۴۳۔ وأخرجه الترمذي في السنن ۳۱۳/۲ حديث رقم ۴۵۱ ولفظه "صلوا......" وكذلك النسائي في السنن ۱۹۷/۳ حديث رقم ۱۵۹۸۔ وأحمد في المسند ۱۶/۲۔

ترجمه: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم کچھ نماز اپنے گھروں میں پڑھ لیا کرو اور گھروں کو قبریں نہ بناؤ'' (بخاری ومسلم)

تشریح: **اجعلو في بيوتكم**: بُيُوْت ضمہ ''باء'' اور فتحہ ''باء'' دونوں طرح ہے۔ (**من صلاتكم**) یعنی نوافل جن کو گھر میں اداء کیا جائے گا اور **من صلاتكم** مفعول اول ہے اور **في بيوتكم** مفعولِ ثانی ہے اس مفعول ثانی کو مقدم کیا **بيوت** کی شان کے اہتمام کی بناء پر اور بے شک گھر کے حقوق میں سے یہ بھی ایک حق ہے کہ طاعات میں سے اس کے لئے بھی حصہ کیا جائے تاکہ وہ منور ہو جائے کیونکہ وہ گھر تمہارا ٹھکانہ اور آنے جانے کی جگہ ہے اور یہ **بيوت** تمہاری قبور کی طرح نہیں ہے کہ جس میں تمہارا نماز پڑھنا درست نہیں ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا: (**ولا تتخذوها**) ای **بيوتكم**۔

قبورا: اس طرح کہ تم اس میں نماز پڑھنا چھوڑ دو جس طرح کہ تم قبرستان میں نماز نہیں پڑھتے۔ اس حدیث میں اس مکان کو جو خالی ہو عبادت سے قبرستان سے تشبیہ دی ہے اور عبادت سے غافل آدمی کو میت سے تشبیہ دی ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم اپنے گھروں کو صرف نیند ہی کی جگہ نہ بناؤ کہ تم اس میں نماز نہ پڑھو کیونکہ نیند موت کی بہن ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ کے ذکر کرنے والے کی مثال اور ذکر نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی طرح ہے کہ ان میں سے ایک گھروں میں رہنے والا ہے اور ایک قبروں میں رہنے والا ہے، پس وہ شخص جو اپنے گھر میں نماز نہیں پڑھتا تو اس کے گھر کو بمنزلہ قبر کے قرار دیا جیسا کہ اس کی ذات کو بمنزلہ میت کے قرار دیا اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تم ان گھروں میں مردوں کو دفن نہ کرو تاکہ تمہارا معاش اور رہنے کی جگہ مکدر نہ ہو۔

متفق عليه: اور مسلم کی ایک روایت میں ہے: **لا تتخذوا بيوتكم مقابر**۔ ''اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ'' میرکؒ نے اس کو ذکر کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ نوافل میں افضل یہ ہے کہ گھروں میں ادا کئے جائیں دلیل مسلم کی حدیث ہے: **افضل صلاة المرء في بيته الا المكتوبة**۔ دوسرا یہ کہ گھر میں نماز ریاء سے محفوظ ہوتی ہے اور اس لئے بھی کہ اس میں گھر اور گھر والوں کی طرف برکت کا لوٹنا ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ' کہ نوافل کا پڑھنا بھی مسجد میں افضل ہے اور بعض نے کہا ہے کہ دن میں افضل ہے کہ مسجد میں پڑھے جائیں اور رات کو افضل ہے کہ گھر میں پڑھے جائیں اور بعض نے کہا کہ اگر نوافل کو گھر میں پڑھنے سے سستی کرے تو مسجد میں پڑھنا افضل ہے اور یہ قول ظاہر نہیں ہے اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حضور ﷺ نے بعض نوافل مسجد میں بیان جواز کیلئے اداء کئے جیسا کہ جمعہ کے بعد دو رکعتیں۔ ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور جیسا کہ دو رکعتیں مغرب کے بعد جس کی ترمذی نے تعلیقاً تخریج کی ہے۔

اور بعض حنابلہ نے یہ گمان کیا ہے کہ مسجد میں نوافل حرام ہیں اور ابوثور سے یہ نقل کیا گیا ہے اس حدیث کی وجہ سے

افعلوها فی بیوتکم۔

الفصل الثانی:

مشرق اور مغرب کے درمیان قبلہ ہے

۷۱۱۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ.

(رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/۱۷۳حدیث رقم ۳۴۴ وقال حدیث حسن صحیح وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۳۲۳ حدیث رقم ۱۰۱۱۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مشرق اور مغرب کے درمیان قبلہ ہے اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: ما بین المشرق والمغرب قبلة: آپ ﷺ اس سے سورج کے سردیوں میں طلوع ہونے اور گرمیوں میں غروب ہونے کی جگہ کے درمیانی حصے کو مراد لے رہے ہیں۔ سردیوں میں سورج کی جائے طلوع وہ قلب العقرب کی جائے طلوع میں ہے (قلب العقرب چاند کی منازل میں سے ایک منزل ہے) اور گرمیوں میں سورج کی جائے غروب وہ سماک الرامع کی جائے غروب میں ہے (سماک الرامع ایک ستارہ ہے) اور حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اہل مدینہ کا قبلہ مراد ہے کیونکہ وہ مشرق اور مغرب کے درمیان واقع ہے اور اہل مدینہ کا قبلہ مغربی جانب زیادہ مائل ہے، علامہ طیبیؒ نے اسی طرح فرمایا ہے اور اس پر حضور ﷺ کا یہ ارشاد: اذا اتیتم الغائط فلا تستقبلوا القبلة ولا تستد بروها ولکن شرقوا او غربوا۔ ''جب بیت الخلاء میں آؤ، تو قبلہ کی طرف منہ نہ کرو اور نہ اس کی طرف پشت کرو، بلکہ مشرق کی طرف منہ کرلو یا مغرب کی طرف'' بھی دلالت کرتا ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث جہت والے قول کی تائید کرتی ہے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کو ہمارے اصحاب نے لیا ہے اور اذرعیؒ نے اس کو اختیار کیا ہے بلکہ ابن العربی المکی نے اس میں بڑا مبالغہ کیا ہے پس اس نے یہ گمان کیا ہے کہ اس کا خلاف کرنا وہ باطل ہے اور ابن العربی نے مذکورہ حدیث اور حضرت عمرؓ کے ارشاد سے جو صحیح طریق سے استدلال کیا ہے ثابت ہے اور حضرت عمرؓ ایسی بات بغیر سنے نہیں کہہ سکتے۔

ہمارے اصحاب رحمہم اللہ نے اس کا یوں جواب دیا ہے کہ ہم اس حدیث کو اہل مدینہ پر محمول کریں گے اور اسی طرح جو اہل مدینہ کے قریب ہوں گے ان پر محمول کرینگے اس لئے کہ مشرق اور مغرب کے درمیان مطلقاً قطعی طور پر قبلہ نہیں ہے، پس اس کو اس پر محمول کرنا متعین ہوگا جس کا ذکر ہوا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس بات میں بحث ہے جو کہ قاری پر مخفی نہیں ہے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے کہ جس پر قبلہ مشتبہ ہوگیا ہو، پس غور وفکر کے ساتھ جس جہت کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے گا تو نماز جائز ہے اور یہ اس کے لئے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ [البقرہ: ۱۱۵] ''اور

مشرق اور مغرب سب خدا ہی کا ہے تو جدھر تم رخ کرو ادھر خدا کی ذات ہے بیشک خدا صاحب وسعت اور باخبر ہے''۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد سواری پر نفل پڑھنے والا ہے کسی جہت کی طرف۔ ان دونوں اقوال میں نظر ہے اس لئے کہ اگر یہ مراد ہوتے تو پھر مشرق اور مغرب کی قید کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

اور مظہرؒ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اہل مشرق میں سے اول مغارب یعنی گرمیوں میں سورج کی جائے غروب کو دائیں جانب کرے اور آخر مشارق یعنی سردیوں میں سورج کے جائے طلوع کو بائیں جانب کرے تو وہ قبلہ کی طرف منہ کرنے والا ہوگا اور اہل مشرق سے اہلِ کوفہ و بغداد و حورستان و فارس و عراق و خراسان اور اسی طرح وہ علاقے جو ان کے متعلق ہیں مراد ہیں۔

رواه الترمذی: کئی طرق سے نقل کیا ہے اور ان کی تصحیح کی ہے اور حاکمؒ نے اس کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ شیخین کی شرط پر ہے اور ذہبیؒ نے اس کا اقرار کیا ہے۔ میرکؒ نے اسی طرح کہا ہے۔

گرجہ کو مسجد بنانا

۷۱۶: وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ خَرَجْنَا وَفْدًا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَبَايَعْنَاهُ وَصَلَّيْنَا مَعَهٗ وَاَخْبَرْنَاهُ اَنَّ بِاَرْضِنَا بِيْعَةً لَّنَا فَاسْتَوْهَبْنَاهُ مِنْ فَضْلِ طَهُوْرِهٖ فَدَعَا بِمَاءٍ فَتَوَضَّأَ وَتَمَضْمَضَ ثُمَّ صَبَّهٗ لَنَا فِيْ اِدَاوَةٍ وَاَمَرَنَا فَقَالَ اخْرُجُوْا فَاِذَا اَتَيْتُمْ اَرْضَكُمْ فَاكْسِرُوْا بِيْعَتَكُمْ وَانْضَحُوْا مَكَانَهَا بِهٰذَا الْمَاءِ وَاتَّخِذُوْهَا مَسْجِدًا قُلْنَا اِنَّ الْبَلَدَ بَعِيْدٌ وَالْحَرُّ شَدِيْدٌ وَالْمَاءُ يُنْشَفُ فَقَالَ مُدُّوْهُ مِنَ الْمَاءِ فَاِنَّهٗ لَا يَزِيْدُهٗ اِلَّا طِيْبًا ۔ (رواه النسائی)

أخرجه النسائی فی السنن ۳۸/۲ حديث رقم ۷۰۱۔

ترجمہ: حضرت طلق بن علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک وفد کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے آپ سے بیعت کی اور حضور ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی اور پھر یہ بھی ہم نے بتایا کہ ہمارے علاقے میں ہمارا ایک گرجا ہے اس کے بعد ہم نے آپ ﷺ کے وضو کا بچا ہوا پانی مانگا آپ نے پانی منگوایا اور وضو کیا کلی کی اور اس کلی کا پانی ہماری چھاگل میں ڈلوایا اور فرمایا کہ جاؤ جب تم اپنے علاقے میں پہنچو تو اس گرجہ کو توڑ کر اس کی جگہ یہ پانی چھڑک دینا اور پھر وہاں مسجد بنا دینا ہم نے عرض کیا کہ ہمارا شہر تو بہت دور ہے اور گرمی بہت زیادہ ہے لہٰذا پانی خشک ہو جائے گا آپ نے فرمایا اس میں اور پانی ملا دینا اس سے اس کی پاکیزگی اور برکت میں اضافہ ہوگا اس حدیث کو امام نسائیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: خرجنا وفدا: وفد وہ جماعت جو کسی عظیم کام کیلئے آئے۔ وفدًا حال ہے۔ (فبايعناه) توحید رسالت اور سمع وطاعت پر۔ (وصلينا معه) ایک نماز یا کئی نمازیں۔ (بيعة) یہ ''باء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے مراد عیسائیوں کا گرجا۔ (فاستوهباه) ''فاء'' اس کے مابعد کا مجموعہ پر عطف کیا گیا ہے۔ ای خرجنا وفعلنا فاستوهبناه۔

من فضل طهوره: طهوره ''طاء'' ~~کے فتحہ کے ساتھ~~ ہے یعنی مابقیٰ جو بچا ہوا اس سے جس سے طہارت حاصل کی

جاتی ہے۔(**وتمضمض**)اس پانی سے وضوء کے بعد یا اثناء وضوء میں کلی کی۔(**ثم صبه**)یعنی جس سے کلی کی تھی بطور فضل کے ان کے مطلوب پر زیادتی کرتے ہوئے۔(**في اداوة**)اور ممکن ہے کہ وہ پانی کہ جس کو بہایا گیا ہو وہ وہ ہو کہ جو بچا ہوا ہو اور اسی کو طلب کیا جا رہا ہو۔ **اداوه** چمڑے کی چھاگل۔(**فاكسروا بيعتكم**)یعنی اس کے محراب کو بدل ڈالو اور کعبہ کی طرف پھیر دو۔اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو خراب کر دو۔

مكانها بهذا الماء: تاکہ اس جگہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضوء سے بچے ہوئے پانی کی برکت پہنچ جائے ،پس اس میں وضوء سے مابقیہ کی طرف اشارہ ہوگا اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ **هذا الماء** سے جنس ماء کی طرف اشارہ ہے اور مراد اس سے اس گرجا گھر کو پاک کرنا اور دھونا ہے اس سے جو اس میں باقی رہ گیا ہے۔

ينشف: تخفیف کے ساتھ یہ مجہول کا صیغہ ہے کہا جاتا ہے **نشف الثوب العرق بالكسر ونشف الحوض الماء ينشفه** یعنی جب وہ پانی خشک ہو جائے اور کپڑا اس کو اپنے اندر جذب کر لے۔(**مدوه من الماء**)یعنی اس وضوء سے بچے ہوئے پانی میں دوسرا مزید پانی زائد کر کے ملاتے رہو۔اور اس کا حاصل وہ ہے جو ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ اس پانی پر دوسرا پانی بہاؤ۔

فانه لا يزيده: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ **فانه** میں ضمیر یا تو **ماء وارد** یعنی جوڑا لا جا رہا ہے اس کی طرف راجع ہے یا مورود یعنی جس میں پانی ملایا جا رہا ہے(تو دونوں صورتوں میں مطلب الگ الگ ہوگا)یعنی **ماء وارد** وہ **مورود** میں سوائے پاکیزگی کے اور کچھ زائد نہیں کرے گا مورود کی برکت کی وجہ سے یا معنی یہ ہے کہ ماء مورود جو کہ پاکیزہ ہے وہ زیادہ نہیں ہوگا وارد کے ساتھ مگر پاکیزگی میں۔یعنی وارد کے ملنے سے پاکی ہی حاصل ہوتی ہے نہ کہ اور کوئی چیز۔یہاں یہ بات مخفی نہیں ہے کہ پہلا معنی سیاق کلام کے زیادہ قریب ہے اور زیادتی کی بنسبت زیادہ مناسب ہے اگرچہ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ اس کا عکس مراد لینا وہ بہتر ہے اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن سے جو چیز ملی ہو اس پر تغیر طاری نہیں ہو سکتا بلکہ وہ اپنے اس انتہائی کمال پر باقی رہتا ہے جو اس کو اعضاء شریف کے ساتھ ملامست کی وجہ سے حاصل ہوا تھا ،پس ہر وہ چیز کہ جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوا ہو تو یہ چھونا اس میں پاکیزگی اور اچھائی ہی کو پیدا کرتا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہاں یہ بات مخفی نہیں ہے کہ ابن حجرؒ کے اس اشارہ میں دونوں باتیں مشترک ذکر ہیں اور **طيبًا** "طاء" کے کسرہ اور "یاء" کے سکون کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ طاء کے فتحہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بچے ہوئے پانی سے تبرک حاصل کرنا ثابت ہے اور دوسرے شہروں میں اس کو نقل کرنا بھی ثابت ہوتا ہے اور اس کی نظیر زمزم کا پانی ہے بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم امیر مکہ سے زمزم ہدیئے میں طلب کرتے تھے تاکہ اس کے ذریعے اہلِ مدینہ تبرک حاصل کریں۔اور اس حدیث سے یہ بات بھی اخذ ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثین علماء وصلحاء کا بچا ہوا بھی اسی طرح ہے۔

اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں یہ روایت تفصیل سے نقل کی ہے: **عن ابی خليفة حدثنا مسدد بن سرهد حدثنا ملازم بالسند**۔اس روایت میں یوں ہے' ہم چھ آدمی وفد کی صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ۵ بنی حنیفہ میں سے تھے اور چھٹا آدمی بنی ضبیعہ بن ربیعہ میں سے تھا۔جب ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ہم نے بیعت کی اور

آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، ہم نے آپ ﷺ کو بتلایا کہ ہمارے ہاں ایک گرجا ہے (اب ہم اس کا کیا کریں؟) اس کے بعد ہم نے آپ ﷺ کے وضوء کا بچا ہوا پانی طلب کیا آپ نے پانی منگایا اور اس سے وضوء کیا اور وضوء کے بعد آپ ﷺ نے کلی کی اور کلی سے بچا ہوا پانی ہماری چھاگل میں ڈال دیا اور فرمایا کہ جاؤ جب تم اپنے ملک میں پہنچو تو اس گرجا کو توڑ کر اس کی جگہ پر پانی چھڑک دینا اور پھر وہاں مسجد بنالینا، ہم نے عرض کیا کہ ہمارا شہر بہت دور ہے گرمی کی شدت ہے لہٰذا یہ پانی راستے میں خشک ہو جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا اس میں اور پانی ملا لینا اس سے اس کی پاکیزگی اور برکت میں اضافہ ہوگا۔ پس ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو ہم میں سے ایک نے اس پانی کو اپنے پاس رکھنے میں حرص ظاہر کی، پس حضور ﷺ نے ہم میں سے ہر ایک کیلئے ایک دن رات مقرر کر دیا، پس ہم اپنے شہر پہنچے تو ہم نے ویسے ہی کیا جیسے حضور ﷺ نے ہمیں حکم دیا تھا اور اس قوم کا راہب وہ قبیلہ طیٔ میں سے تھا پس ہم نے نماز کیلئے جب نداء کی تو راہب نے کہا یہ حق کی دعوت ہے پھر وہ بھاگ گیا دوبارہ نظر نہیں آیا۔ میرکؒ نے اس کو صاحبِ تخریج سے نقل کیا ہے۔

ایک شہر میں ایک سے زائد مساجد کی تعمیر

۷۱۷: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ اَمَرَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبِنَاءِ الْمَسْجِدِ فِي الدُّوَرِ وَاَنْ يُّنَظَّفَ وَيُطَيَّبَ ۔ (رواه ابوداود والترمذی وابن ماجة)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/ ۳۱٤ حديث رقم ٤٥٥ ـ وأخرجه الترمذی فی السنن ۲/ ٤٨٩ حديث ٥٩٤ وأخرجه ابن ماجة في السنن ۱/ ۲٥۰ حديث رقم ۷٥٨ ـ

ترجمہ: "امّ المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محلوں میں مساجد تعمیر کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اور کہا کہ ان مساجد کو پاک وصاف رکھا جائے اور خوشبوؤں سے ان کو مہکایا جائے۔" (ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ)

تشریح: في الدور: یہ دار کی جمع ہے یہ بناء اور صحن اور محلے تینوں کیلئے مستعمل ہے یعنی یہ ان تمام میں اسم جامع ہے۔ اور یہاں الدور سے مراد محلے ہیں کیونکہ اہل عرب اس محلے کا کہ جس میں ایک قبیلہ جمع ہو جائے دار سے نام رکھتے تھے۔ یا یہ حدیث محمول ہے گھر میں ایک کمرے کو مسجد بنانے پر جیسے کہ مسجد تا کہ گھر والے اس کمرے میں نماز پڑھیں۔ ابن الملکؒ نے اس طرح فرمایا ہے۔ لیکن پہلا قول وہ قابل اعتماد ہے اور اسی پر عمل بھی ہے۔ پھر میں نے ابن حجرؒ کے کلام کو دیکھا کہ انہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد محلے اور قبائل ہیں۔

اور ہر محلے میں مسجد بنانے کے حکم واجازت میں یہ حکمت ہے کہ بسا اوقات ایک محلے والوں کیلئے دوسرے محلے میں جانا مشکل ہو جاتا ہے، پس جب وہ نہیں جا سکیں گے تو مسجد کے اَجر اور جماعت کی فضیلت سے محروم ہو جائیں گے، پس اس وجہ سے ان لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ ہر محلے والے اپنی مسجد بنالیں تا کہ ان کو اس میں عبادت کرنا آسان ہو بغیر کسی مشقت و پریشانی کے اور بغویؒ نے فرمایا ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے دور میں بہت زیادہ فتوحات ہوئی (اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کو بہت بڑی خلافت عطاء فرمائی) تو حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ مساجد تعمیر کریں اور اس طرح تعمیر کرنے کا حکم دیا کہ ایک مسجد والوں کو

دوسری مسجد سے تکلیف نہ ہو تکلیف کا مطلب یہ ہے کہ جب مسجد اتنی بڑی ہے کہ اس میں تمام محلے والے اور نمازی آسکتے ہیں تو پھر نئی مسجد بنا کر جماعت کو متفرق کرنا یہ صحیح نہیں ہے۔ پس اگر مسجد تنگ پڑ جائے تو پھر اس مسجد کی توسیع کرنا یا اور دوسری مسجد بنانا جو ان کے لئے کافی ہو مسنون ہے۔

وان ینظف: گندگیوں اور مٹی وغبار وغیرہ کو زائل کر کے۔

ویطیب: چھینٹے مار کر یا عطر وغیرہ لگا کر۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے اس جملے کی تشریح میں یعنی حضور ﷺ نے ایک اور حکم دیا جو مسجد ہی کے متعلق ہے اور اس پر محافظت بھی متعین ہے وہ یہ کہ اس کو معطر رکھا جائے اور صاف رکھا جائے۔ ابن حجرؒ کا یطیب کو ینظف پر مقدم کرنا یہ بہتر نہیں ہے کیونکہ یہ اس روایت اور درایت کے مخالف ہے جو کہ صحیح نسخوں کے موافق ہے۔

رواہ ابو داود والترمذی وابن ماجه: بقول علامہ میرکؒ کے کہ ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں اس کو نقل کیا ہے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد کو بخور (خوشبو) سے دھونی دینی مستحب ہے۔ امام مالکؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں وہ اس کو مکروہ سمجھتے ہیں پس تحقیق ابن عمرؓ مسجد نبوی میں خوشبو کی دھونی دیتے تھے جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر بیٹھتے تھے اور بعض حضرات نے مسجد کو خلوق خوشبو جو زعفران اور عطر وغیرہ کو ملا کر بنتی ہے لگانا مستحب قرار دیا ہے اور روایت میں یہ آیا ہے کہ حضور ﷺ نے ایسے کیا ہے اور شعبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ سنت ہے اور ابن ابی شیبہ کی ایک روایت میں ہے کہ جب ابن زبیرؓ نے کعبہ کو بنایا تو اس کی دیواروں پر مشک کو ملا اور مسجد کو صاف کرنا اور اس میں جھاڑو دینا مستحب ہے۔ ابن ابی شیبہ کی ایک روایت ہے کہ جس میں یہ آتا ہے کہ حضور ﷺ کھجور کی شاخ وٹہنی سے غبارِ مسجد کو تلاش کرتے تھے (یعنی اس کے ذریعے اس کو صاف کرتے)۔

مساجد کی زیب وزینت میں یہود ونصاریٰ کی پیروی کرنے والوں کو انتباہ

۷۱۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اُمِرْتُ بِتَشْيِيْدِ الْمَسَاجِدِ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَتُزَخْرِفُنَّهَا كَمَا زَخْرَفَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۳۱۰ حدیث رقم ۴۴۸۔ وأخرج البخاری تعلیقًا "لتزخرفنها کما زخرفت الیهود والنصاری" ۱/۵۳۹ باب بناء المساجد۔

''اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''مجھے مساجد کو بلند کرنے اور آراستہ کرنے کا حکم نہیں ہوا'' اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ''جس طرح یہود ونصاریٰ اپنے عبادت خانوں کی زینت کرتے ہیں اسی طرح تم بھی فقط (ظاہراً) مساجد کی زینت کرنے تک ہی محدود ہو جاؤ گے''۔ (ابوداوٗد)

تشریح: **ما امرت**: یہ ''ما'' نافیہ ہے۔

بتشييد المساجد: یعنی مساجد کو بلند کرنے اور اس کی تعمیر کو بلند وبالا بنانے سے یا اس کو چونا کرنے سے کیونکہ یہ دونوں باتیں ضرورت سے زائد ہیں۔

قال ابن عباس: یہ روایت اگرچہ موقوف ہے لیکن مرفوع کے حکم میں ہے۔

لتزخرفنها: لام کے فتحہ اور یہ لام ''قسم'' ہے اور تاء کے ضمہ زاء کے فتحہ خاء کے سکون اور فاء کا ضمہ اور نون کی تشدید کے ساتھ ہے اور نون تاکید ہے اور زخرفہ کہتے ہیں زینت کو اور اصل زخرف کی ہے سونے کی زینت پھر ہر وہ چیز کہ جس سے زینت حاصل کی جائے اس کو اس میں استعمال کیا جانے لگا۔

اور علامہ طیبیؒ کی شرح میں جو مشکوۃ کی ایک شرح ہے اس میں یہ مذکور ہے کہ لتزخرفنها میں لام اس نفی کی تعلیل کیلئے ہے جو اس سے پہلے ہے، مطلب یہ ہے کہ مجھے مساجد کے اونچا اور بلند کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تا کہ یہ زینت کا ذریعہ نہ بن جائے، پھر فرمایا کہ اس میں لام کا فتحہ بھی جائز ہے اس بناء پر کہ یہ جواب قسم ہے۔

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں یہی آخری توجیہ زیادہ معتمد ہے اور پہلی توجیہ روایت سے اصلاً ثابت نہیں ہے، پس اس پر اعتماد بھی نہیں کیا جائے گا اور عبداللہ بن عباسؓ کا کلام وہ حضور ﷺ کے کلام سے جدا ہے کتب مشہورہ اور اس کے علاوہ اور دوسری کتابوں میں منقول ہے۔ میرک شاہؒ نے شیخ محی الدین سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

کما زخرفت الیهود والنصاریٰ: اور یہ بدعت ہے کیونکہ حضور ﷺ نے ایسے نہیں کیا اور اس میں اہلِ کتاب کی موافقت ہے۔ نہایہ میں ہے کہ زخرف وہ نقوش اور تصاویر ہیں جو سونے سے بنائی ہوں۔

اور شرح السنہ میں لکھا ہے کہ یہود ونصاریٰ جب انہوں نے اپنے دین میں تحریف کر دی تو وہ مساجد کو مزیّن کرنے کے پیچھے ہو گئے۔ کیا تم بھی ان کے حال کی طرف چلنے لگ گئے ہو۔ مساجد اور اس کی زینت میں ایک دوسرے پر فخر اور ریا کاری کرنے میں اور حضور ﷺ کے دور میں مسجدِ نبوی کچی اینٹوں سے بنی تھی اور اس کی چھت کھجور کی شاخیں تھیں اور اس کے ستون کھجور کی لکڑی کے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس میں کچھ زیادتی کی، پس حضور ﷺ کی دور ہی کی طرح کچی اینٹوں اور کھجور کی شاخوں سے بنایا اور اس کے ستون لکڑی کے دوبارہ بنائے، پھر حضرت عثمانؓ نے بہت بڑی توسیع کی اس کی دیواروں اور ستونوں کو نقش پتھروں سے بنایا اور اسی طرح چونے اور گچ کو اس میں استعمال کیا اور چھت وہ ساج لکڑی کی بنائی۔

رواہ ابو داؤد: بقولِ علامہ میرکؒ امام ابوداؤد اور منذریؒ نے اس حدیث پر خاموشی اختیار کی ہے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ امام بخاریؒ نے پہلے حصے کو تعلیقاً بیان کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے یہ حدیث نقل کی ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: **ابنوا المساجد واتخذوها جمًا** (جیم کے ضمہ اور میم کی تشدید کے ساتھ وہ چیز کہ جس کی کنگریاں نہ ہوں) تو مطلب حدیث کا یہ ہے کہ مساجد اس طرح بناؤ کہ اس میں کنگریاں نہ ہو، یعنی عمارت بغیر کنگریوں کے بناؤ۔ اور ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ ہمیں حضور ﷺ نے روکا یا روکا گیا اس سے کہ ہم کنگریوں والی مسجد میں نماز پڑھیں۔

اور ابونعیم کی یہ روایت ہے کہ جب کسی قوم کا عمل خراب وبُرا ہو جائے تو وہ مساجد کو مزیّن کرنے لگ جاتے ہیں اور حضرت انسؓ کی حدیث ہے کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ لوگ مساجد (بنانے) میں ایک دوسرے پر فخر نہ کرنے لگیں گے۔

اور بخاری شریف کی ایک روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے مسجد بنانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ لوگوں کو (اس تعمیر کرنے سے

صرف) بارش سے بچاؤ (یعنی اتنی تعمیر ہو جائے کہ لوگ اس میں چھپ کر نماز وغیرہ میں بارش سے بچ جائیں) اور اس کو سرخ اور زرد (رنگ) کرنے سے بچو۔ اور ابن مسعودؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ایک مسجد کے پاس سے گزرے جو مسجد مزین و منقش تھی تو فرمایا اللہ تعالیٰ لعنت کرے اس پر جس نے ایسے کیا ہے۔

۷۱۹: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ اَنْ يَّتَبَاهَى النَّاسُ فِي الْمَسَاجِدِ۔ (رواه ابو داود والنسائي والدارمي وابن ماجة)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۳۱۱/۱ حديث رقم ۴۴۹۔ وأخرجه النسائي في السنن ۳۲/۲ حديث رقم ۶۸۹ وأخرجه الدارمي في السنن ۳۸۳/۱ حديث رقم ۱۴۰۸۔ وأخرجه ابن ماجة في السنن ۲۴۴/۱ حديث ۷۳۹۔

ترجمه: ''اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''علاماتِ قیامت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگ مساجد کی بابت فخر کیا کریں گے۔'' (ابوداؤد' نسائی' دارمی' ابن ماجہ)

تشریح: من اشراط الساعة: اشراط یہ شرطٌ (بالتحریك) کی جمع ہے۔ اور شرَط علامت کو کہتے ہیں خبر کو مبتدا پر اس کے اہتمام کی وجہ سے اور اس کے کرنے والے پر شدید انکار کرنے کی خاطر مقدم کیا گیا ہے نہ کہ تخصیص اور حصر کیلئے۔ یعنی قیامت کی علامات میں سے یہ ہے کہ

ان یتباهی الناس في المساجد: یعنی اس کی حالت اور اس کی تعمیر میں یعنی ہر کوئی اپنی مسجد کے بارے میں فخر کرے گا اور کہے گا کہ میری مسجد سب سے بلند و مزین اور وسیع ہے اور سب سے خوبصورت ہے ریاء اور شہرت کی خاطر اور لوگوں کی مدح و تعریف کے حصول کی خاطر۔

۷۲۰: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عُرِضَتْ عَلَيَّ اُجُوْرُ اُمَّتِيْ حَتَّى الْقَذَاةُ يُخْرِجُهَا الرَّجُلُ مِنَ الْمَسْجِدِ وَعُرِضَتْ عَلَيَّ ذُنُوْبُ اُمَّتِيْ فَلَمْ اَرَ ذَنْبًا اَعْظَمَ مِنْ سُوْرَةٍ مِنَ الْقُرْاٰنِ اَوْ اٰيَةٍ اُوْتِيَهَا رَجُلٌ ثُمَّ نَسِيَهَا۔ (رواه الترمذي وابو داود)

أخرجه الترمذي في السنن ۱۶۳/۵ حديث رقم ۲۹۱۶ وقال غريب لانعرفه إلا من هذا الوجه۔ وأخرجه أبوداوٗد في السنن ۳۱۶/۱ حديث رقم ۴۶۱۔

ترجمه: اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے سامنے میری امت کے ثواب پیش کئے گئے یہاں تک کہ اس تنکے اجر بھی جسے کسی آدمی نے مسجد سے باہر نکالا ہو اسی طرح میرے سامنے میری امت کے گناہ بھی پیش کئے گئے ان گناہوں میں مجھ کو اس سے بڑا کوئی گناہ نظر نہیں آیا کہ کسی شخص نے قرآن کریم کی کوئی سورت یا آیت یاد کی ہو پھر اس کو اس نے بھلا دیا ہو۔ (ترمذی' ابوداؤد)

تشریح: عرضت علی: ظاہر یہ ہے کہ یہ واقعہ معراج میں ہوا۔

حتی القذاة: یہ مرفوع ہے یا مجرور اور قذاہ قاف کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ قذاہ وہ مٹی گھاس یا میل، وغیرہ ہے جو آنکھ میں پڑ جائے۔ یہاں کلام میں مضاف مقدر ماننا ضروری ہے ای اجور اعمال امتی و اجر القذاة۔

یعنی تنکے کے نکالنے کا اجر۔ یہ القذاۃ یا توجَر کے ساتھ ہے اور حتی الی کے معنی میں ہے اور تقدیر عبارت یہ ہے: الی اخراج القذاۃ اس بناء پر (یخرجھا الرجل من المسجد) جملہ مستانفہ ہوگا بیان کیلئے اور یا یہ حتی القذاۃ مرفوع ہے علی اجور پر عطف کرتے ہوئے، پس قذاہ مبتدا ہے اور یخرجھا اس کی خبر ہے۔

من القرآن: یہ بات ماقبل جو کبائر میں گزری اس کے منافی ہے۔ ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں میں کہتا ہوں کہ اگر اعظم اور اکبر کو مترادف مان لیا جائے (یعنی اولا ہم اس کو تسلیم ہی نہیں کرتے) تو پس نسیان پر وعید اس وجہ سے ہے کہ شریعت مطہرہ کا مدار اسی قرآن پر ہے، پس قرآن کا بھولنا ایسا ہے جیسا کہ اس شریعت کو میں خلل ڈالنے کی کوشش کرنا (تو شریعت میں خلل ڈالنا بہت بڑا گناہ یعنی اکبرالکبائر بن گیا)۔ پس اگر یہ اعتراض ہو کہ نسیان پر تو مواخذہ نہیں کیا جائے گا، میں کہتا ہوں کہ یہاں جان بوجھ کر چھوڑنا ہے جو کہ نسیان کی حد تک پہنچ جائے۔

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ معنی یہ ہے کہ صغیرہ گناہوں میں سب سے اعظم یہ گناہ ہے اگر استخفاف (ہلکا جاننے) اور تعظیم کی کمی کی وجہ سے نہ ہو۔ میرکؒ نے ازھار سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

ثم نسیھا: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ حدیث کا یہ ٹکڑا اس آیتِ مبارکہ سے مقتبس ہے: ﴿قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى﴾ [طٰہٰ: ۱۲۶] "(خدا) فرمائے گا کہ ایسا ہی (چاہئے تھا) تیرے پاس ہماری آیتیں آئیں تو تو نے ان کو بھلا دیا اسی طرح آج ہم تجھ کو بھلا دیں گے۔"

یعنی ایک قول کی بناء پر تفسیر ہوگی کہ اس سے مسلمان مراد ہے لیکن اکثر مفسرین اس پر ہیں کہ اس سے مشرک مراد ہے اور نسیان کا مطلب ہے ترکِ ایمان۔

اور حضور ﷺ نے اوتیھا فرمایا نہ کہ حفظھا اس میں اس اَمر کو بتلانا ہے کہ یہ اتنی بڑی نعمت اللہ نے مرحمت فرمائی تھی تاکہ یہ اس کا شکر یہ ادا کر سکے اس نے اس کو بھلا کر اس کی نعمت کی ناشکری کر دی، پس اس معنی کو دیکھتے ہوئے یہ بڑا گناہ ہے اگرچہ اس کو کبائر میں شمار نہ کیا جائے۔ ابن حجرؒ نے علامہ طیبیؒ پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ شارح کی یہ بات وان لم یعد من الکبائر عجیب بات ہے حالانکہ ہمارے ائمہ نے تصریح کی ہے کہ قرآنِ کریم کے ایک حرف کو بھی بلا عذر کے بھلانا کبیرہ گناہ ہے عذر سے مراد ہے مرض اور عقل کا ختم ہونا۔ ہمارے نزدیک نسیان اسے کہتے ہیں کہ وہ اس پر بھی قادر نہ رہے کہ دیکھ کر پڑھ سکے، شرح شرعۃ الاسلام میں اسی طرح ہے۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ جب حضور ﷺ نے مسجد سے تنکوں اور غبار وغیرہ نکالنے کو کہ جس کی کوئی اتنی پروا نہیں کرتا اُجور میں سے شمار کیا اللہ کے گھر (مسجد) کی تعظیم کی وجہ سے تو نسیان کو بھی اعظم جرم قرار دیا، اللہ کے کلام کی تعظیم کی وجہ سے۔ گویا کہ اس (پہلے) نے حقیر کو عظیم سمجھا عظیم کی طرف نسبت کی وجہ سے تو اس کا ازالہ کر دیا اور اِس آدمی نے عظیم کو حقیر سمجھا اور اسے اپنے دل سے بھلا دیا۔

(رواہ الترمذی) اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے (نقلہ میرکؒ)۔ (ابو داؤد) اور منذریؒ نے اور ابن ماجہ نے اور ابن ماجہ نے اپنی صحیح میں، میرکؒ نے اس کو ذکر کیا ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ترمذیؒ اور ابوداؤد نے بھی اس کی تخریج کی ہے جس میں یوں ہے: من قرا القرآن ثم نسيه لقی الله يوم القيمة اجذم۔ "کہ جس نے قرآن پڑھا اور اس کو بھلا دیا تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو جذام کی حالت میں ملے گا"۔

مُنہ اندھیرے مسجدوں میں جانے والوں کو نورانی روشنی عطا کیا جانا

۷۲۱: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَشِّرِ الْمَشَّائِيْنَ فِى الظُّلَمِ اِلَى الْمَسَاجِدِ بِالنُّوْرِ التَّامِّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواه الترمذی وابوداود)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۱/ ۳۷۹ حديث رقم ۵۶۱ ـ وأخرجه الترمذی فی السنن ۱/ ۴۳۵ حديث رقم ۲۲۳ وقال: حديث غريب من هذا الوجه مرفوع ـ هو صحيح مسند و موقوف إلی أصحاب النبی ا ولم يسند إلی النبی ا۔

ترجمہ: "اور سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو لوگ مُنہ اندھیرے مساجد کی طرف جاتے ہیں انہیں یہ خوشخبری پہنچا دو کہ قیامت کے دن ان کے اس عمل کے باعث ان کو کامل اور مکمل روشنی نصیب ہوگی"۔ (ترمذی ابوداوٗد)

تشریح: بشر المشائين: یہ مشاءٌ کی جمع ہے یعنی بکثرت چلنے والا۔ (فی الظلم الی المساجد) بعض حضرات نے کہا ہے کہ اگر اندھیرے میں روشنی لے کر چلا تا کہ اندھیرے کی آفات وغیرہ سے بچ جائے تو جزاء پھر بھی اپنی حالت ہی پر باقی رہے گی ورنہ نہیں۔ ابن الملکؒ نے اس کو ذکر کیا ہے۔ (بالنور) یہ بشرؔ کے ساتھ متعلق ہے۔

التام يوم القيمة: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ نور کو تام کے ساتھ موصوف کرنے اور اس کو قیامت کے دن کے ساتھ مقید کرنے میں اشارہ ہے مؤمنین کے وجہ کی طرف قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے اس قول میں: ﴿نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا﴾ [التحريم: ۸] "بلکہ ان کا نور ایمان ان کے آگے اور داھنی طرف (روشنی کرتا ہوا) چل رہا ہوگا اور وہ خدا سے التجا کرینگے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارا نور ہمارے لئے پورا کر اور ہمیں معاف فرما۔"

اور اس میں اشارہ ہے منافقین کے چہرے کی طرف، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں: ﴿اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ [الحديد: ۱۳] "کہ ٹھہرو ہمیں ذرا اپنے نور سے فائدہ اٹھانے دو"۔

ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ جب پل صراط پر منافقین کا نور بجھ جائے گا تو مؤمنین کہیں گے: ربنا اتمم لنا نورنا۔ "اے ہمارے رب ہمارے نور کو پورا فرما"۔

۷۲۲: وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ وَاَنَسٍ۔

"ابن ماجہ میں سہل بن سعد اور انس رضی اللہ عنہ سے بھی (بعینہٖ) مروی ہے۔"

أخرجه ابن ماجة عن سهل فی السنن ۱/ ۲۵۶ حديث رقم ۷۸۰ و عن أنس أخرجه ۱ / ۲۵۷، حديث ۷۸۱

تشریح: رواه ابن ماجه عن سهل بن سعد و انس: امام منذریؒ نے فرمایا ہے کہ حضرت بریدہ کی روایت کے رجال ثقہ ہیں اور ابن ماجہ نے انہی الفاظ سے اس حدیث کو حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ قیامت کے دِن ان لوگوں کو جو مسجدوں میں اندھیرے میں جاتے ہیں چمکدار اور واضح نور عطار فرمائے گا۔ اس روایت کو طبرانی نے اوسط میں اسنادِ حسن سے نقل کیا ہے اور حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جو رات کی تاریکی میں مسجد کی طرف چلا' تو اللہ تعالیٰ کو قیامت کے دِن نور کے ساتھ ملے گا۔ اس روایت کو امام طبرانی نے کبیر میں اسنادِ حسن کے ساتھ روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں ان الفاظ سے نقل کیا ہے: **من مشى فى ظلمة الليل اتاه الله نور اليوم القيمة۔**

اور حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اندھیرے میں رات کو مسجد کی طرف جانے والوں کو قیامت کے دِن کے نور کے منبروں کی خوشخبری دے دو کہ جس وقت لوگ گھبرائے ہوئے ہونگے ان کو کوئی گھبراہٹ و پریشانی نہ ہوگی۔ اس کو طبرانی نے کبیر میں نقل کیا ہے، اور اس کی سند میں ضعف ہے۔

اور حضرت سہل بن سعد الساعدیؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: **ليبشّر لا المشاؤون فى الظلم الى المساجد بالنور التام يوم القيمة۔** ''تاریکی میں چلنے کے عادی لوگوں کو قیامت کے دن کامل نور کی خوشخبری دے دو۔'' اس کو ابن ماجہ نے اور ابن حبان نے صحیح میں نقل کیا ہے اور الفاظ ابن حبان کے ہیں اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ شیخین کی شرط پر ہے اور اس حدیث کو ابن عباسؓ، ابن عمر، ابوسعید خدری، زید بن حارثہ، عائشہؓ اور ان کے علاوہ اور دوسرے حضرات سے روایت کیا گیا ہے۔

مساجد کو آباد کرنے والے ہی اللہ پر حقیقی ایمان رکھنے والے ہیں

۷۲۳: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ إلْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا رَاَیْتُمُ الرَّجُلَ یَتَعَاھَدُ الْمَسْجِدَ فَاشْھَدُوْا لَهٗ بِالْاِیْمَانِ فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یَقُوْلُ اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ .

(رواه الترمذی و ابن ماجة و الدارمی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱۴/۱ حديث رقم ۲۶۱۷ وقال : غريب حسن۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۲۶۳/۱ حديث رقم ۸۰۲ ولفظه "يعتاد" وأخرجه الدارمی فی السنن ۳۰۲/۱ حديث رقم ۱۲۲۳۔ وأخرجه أحمد بلفظ "يعتاد" ۶۸/۳۔

ترجمہ: اور سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی شخص کو تم مسجد کی خبر گیری کرتے پاؤ تو اس کے ایمان کی گواہی دو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ ''اللہ کی مسجدوں کو وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے ہیں''۔

(ترمذی' ابن ماجہ' دارمی)

يتعاهد المسجد: یعنی مسجد کی خدمت کرے اور اس کو آباد کرے اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد مسجد کی طرف نماز کے قائم کرنے اور جماعت کیلئے بار بار جانا اور یہی حقیقی خبر گیری ہے اور صورۃً اور معنیً مسجد کو آباد کرنا ہے۔

فاشهدو اله بالايمان: کہ یہ مؤمن ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں آپ ﷺ کے اس قول میں حضرت عائشہؓ کی اس حدیث سے اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جس میں آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کی اس بات پر کہ جوانہوں نے ایک انصاری بچے کی وفات میں کہی کہ یہ بچہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے انکار کیا اور اس طرح کہنے سے روکا اور ممکن ہے کہ ان دونوں حدیثوں میں یہ تطبیق دی جائے کہ یہاں پر جو ایمان کی گواہی ہے وہ بطور ظناً ہے۔ اور جو حضرت عائشہؓ کی حدیث سے اس میں قطعیت اور یقین کا بیان ہے کہ وہ جنتی ہے اور اس کی تائید ابن مظعونؓ کی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے اس شخص پر جس نے ان کے لئے قطعی طور پر جنتی ہونے کی گواہی دی اس کا انکار فرمایا۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ **تعهد** اور **تعاهد** کہتے ہیں کسی چیز کی حفاظت کرنا، اور تعاھد میں مبالغہ ہے اس لئے کہ فعل جب مبالغے کے وزن پر ہو تو یہ قوت پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ تفسیر کشاف میں **يخادعون الله** کی تفسیر میں ہے اور بعض روایات میں آیا ہے جو کہ ترمذی کی روایت ہے **يعتادُ يتعاهدُ** کے بدلے اور **يعتاد** سنداً بھی زیادہ قوی ہے اور معنی کے بھی زیادہ موافق ہے اس لئے کہ یہ تمام ان باتوں کو جو مسجد کے متعلق ہیں ان کو شامل ہے یعنی مسجد کو آباد کرنا، اور نماز وغیرہ کا عادی ہونا۔ آنحضرت ﷺ کے الفاظ دیکھئے کہ آپ نے لفظ **فاشهدوا** کے ساتھ گواہی دی ہے، یعنی اس کے لئے قطعی طور پر ایماندار ہونے کی گواہی دو اس لئے کہ شہادت ایسا قول ہے جو دل کی موافقت سے یقینی طور پر صادر ہوتا ہے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ بلکہ **تعهد** اولی ہے کیونکہ **تعهد** ان مذکورہ امور کے ساتھ ساتھ مسجد کی حفاظت اس کو آباد کرنا اس کو خوشبودار رکھنا اور اس میں جھاڑو وغیرہ دینے کو بھی شامل ہے جیسا کہ حضور ﷺ کا اس آیت سے استشہاد کرنا اس پر دلالت کرتا ہے وہ آیت یہ ہے: ﴿اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ﴾ یعنی مساجد کو جانے یا اس میں ترمیم کرنے یا اس کو عبادت اور دروس سے آباد کرنے کے ساتھ۔

من امن بالله واليوم الاخر: صاحب کشاف نے فرمایا ہے کہ عمارتِ مسجد سے مراد اس میں جھاڑو دینا اور اس کو صاف کرنا اور چراغوں وغیرہ کے ساتھ مسجد کو روشن کرنا اور اس کی تعظیم کرنا اور اس کو ذِکر وعبادت کیلئے تیار کرنا اور مسجد کی حفاظت کرنا اس چیز سے جس کے لئے مسجد نہیں بنائی گئی یعنی دنیا کی باتوں سے چہ جائیکہ مسجد میں فضول گفتگو ہو۔

رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی: اور اسی طرح ابن خزیمہ اور حاکم نے ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے اور حاکمؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور ذہبیؒ نے فرمایا ہے کہ' کہ اس کی اسناد میں دراج راوی ہے اور دراج اکثر منکر روایتیں نقل کرتا ہے۔ میرکؒ نے اس کو صاحب تخریج سے نقل کیا ہے۔

خصی ہونے کی ممانعت کا بیان

۷۲۴: وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ قَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ائْذَنْ لَنَا فِي الْاِخْتِصَاءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَيْسَ مِنَّا مَنْ خَصٰى وَلَا اخْتَصٰى اِنَّ خِصَاءَ اُمَّتِي الصِّيَامُ فَقَالَ ائْذَنْ لَنَا فِي السِّيَاحَةِ فَقَالَ اِنَّ سِيَاحَةَ اُمَّتِي الْجِهَادُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَقَالَ ائْذَنْ لَنَا فِي التَّرَهُّبِ فَقَالَ اِنَّ تَرَهُّبَ اُمَّتِي الْجُلُوْسُ فِي

اَلْمَسَاجِدِ اِنْتِظَارَ الصَّلَاةِ . (رواہ فی شرح السنة)

رواہ فی شرح السنة ۲/ ۳۷۰ حدیث ٤٨٤ـ

ترجمہ: اور سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو خصی ہونے کی اجازت ہے؟ آپؐ نے فرمایا ایسا شخص ہم میں سے نہیں۔ یعنی ہمارے طریقہ پر نہیں جو کسی کو خصی کرے یا خود خصی ہو جائے۔ میری امت کے لئے تو روزہ رکھنا (ہی) خصی ہونے کے مترادف ہے۔ یہ سن کر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا پھر مجھے سیر و سیاحت کی اجازت ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ (مؤمن کی) سیر و سیاحت اللہ کے راستے میں جہاد ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے عرض کیا تو پھر مجھے راہب بننے کی اجازت ہے؟ آپؐ نے فرمایا مساجد میں ایک نماز کے بعد دوسری کا انتظار کرنا یہی میری امت کا راہب بننا ہے۔ (شرح السنۃ)

راویٔ حدیث:

عثمان بن مظعون۔ یہ عثمان بن مظعون ہیں۔ جن کی کنیت ''ابو سائب'' ہے۔ ''قرشی'' ہیں۔ رسول ﷺ کے رضاعی بھائی ہیں۔ تیرہ آدمیوں کے بعد یہ اسلام لائے تھے۔ ہجرتِ حبشہ اور ہجرتِ مدینہ انہوں نے یہ دونوں ہجرتیں کی ہیں۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ زمانہ جاہلیت میں بھی شراب سے رکنے والے تھے۔ آنحضور ﷺ نے ان کے مرنے کے بعد ان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور جب دفن کئے گئے تو فرمایا یہ شخص گزرنے والوں میں سے ہمارے لئے بہترین شخص تھے۔ ''جنت البقیع'' میں دفن کئے گئے۔ بڑے عابد، مرتاض، صاحب فضل صحابہ میں سے تھے۔ ان کے بیٹے ''سائب'' اور ان کے بھائی ''قدامہ بن مظعون'' ان سے روایت کرتے ہیں۔

تشریح: **فی الاختصاء**: یعنی خصیتین کو نکالنا تا کہ شہوتِ نساء ختم ہو جائے، اس لئے کہ عورتوں کی شہوت ایسی چیز ہے جو ہر خیر سے کاٹ دیتی ہے اور ہر مشقت اور تکلیف کو کھینچتی ہے اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ: **ضاع العلم فی افخاذ النساء** ''کہ علم عورتوں کی رانوں میں ضائع ہو گیا''۔

لیس منا: یعنی وہ ان میں سے نہیں ہے جو ہماری سنت کی اقتداء کرے اور ہمارے طریقے سے ہدایت حاصل کرے۔ (**من خصی**) یعنی جو دوسرے کے خصیوں کو نکالے۔

ولا اختصی: یہاں مَنْ کو حذف کر دیا کیونکہ ماقبل اس پر دلالت کر رہا: **ای ولا من سل خصیة نفسه**۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ مَنْ کو مقدر ماننے کی یہاں ضرورت ہے تا کہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ منہی عنہ یعنی میں اس فعل سے روکا جا رہا ہے جو ان دونوں کو جمع کرتا ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں اس بات میں نظر ہے اس لئے کہ حرف ''لا'' جو نفی کی تاکید کر رہا ہے وہ اس وہم کو ختم کر دیتا ہے، اور یہ بات بھی نظر سے خالی نہیں۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک حرام ہے اور اس کے معنی میں یہ بھی ہے کہ ایسی دوائی کھانا یا کھلانا کہ جس سے یقینی طور پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے شہوت اور نسل ختم ہو جائے اور اسی طرح نادراً جو نسل اور شہوت کو ختم کرے اگر اس نے دوسرے کو بغیر اجازت کے دوائی کھلائی۔

ان خصاء امتی الصیام: کیونکہ روزہ شہوت کو توڑتا ہے اور اس کے ضرر کو بھی ختم کرتا ہے جیسا کہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد

ہے: **یا معشر الشباب**......اے جوانوں کی جماعت جو تم میں سے نکاح کی طاقت رکھتا ہے وہ نکاح کرے اور جو اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو اس پر لازم ہے کہ وہ روزے رکھے کیونکہ روزہ شہوت کو توڑ دیتا ہے اور روزے رکھنے میں ایک فائدہ یہ بھی دے کہ خصی ہونے کی صورت میں جو نفس کو عذاب میں ڈالنا اور نسل کو ختم کرنا تھا اس سے بھی سلامتی ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح روزے رکھنے میں ثواب ملے گا اور روزے میں ایسی نفس کی مشقت ہوگی کہ جس سے وہ اپنے مولیٰ کے احکامات کو مانے گا۔

فی السیاحة: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ سیاحت کہتے ہیں شہروں سے جدائی اختیار کرنا اور زمین (کسی طرف) نکل جانا جیسا کہ بنی اسرائیل کے عبادت گذار کیا کرتے تھے۔ پس یہ بات مشائخ صوفیا کی سیاحت کے منافی نہیں ہے جو وہ مشائخ کی زیارت اور علام و معارف کے حصول کی خاطر اور روپوشی کے حصول کیلئے اور اسی طرح اِن مقاصد کی خاطر کرتے تھے جو شریعت مصطفویہ میں پسندیدہ ہیں۔

سیاحة امتی الجهاد فی سبیل الله: یعنی عبادت اور گوشہ نشینی کی اور لوگوں سے بھاگ کر راہبوں کی طرح اونچے پہاڑوں میں جا کر رہنے کی اور ترہب اصل میں رہب سے ہے جس کا معنی ہے خوف کیونکہ وہ راہب اشغالِ دنیا سے خلوت کے ساتھ خوفزدہ ہوتے تھے حتی کہ ان میں بعض وہ بھی تھے جنہوں نے اپنے آپ کو خصی بنایا دیا تھا اور زنجیر وغیرہ اپنے گلے میں ڈال رکھی تھی۔

ان ترهب امتی الجلوس فی المساجد انتظار الصلٰوة: "انتظار الصلٰوة" یہ اضافت کے ساتھ ہے اور اس کی نصب اس وجہ سے ہے کہ یہ مفعول لہٗ ہے جلوس کیلئے **ای لا نتظار الصلٰوة** کیونکہ مسجد میں بیٹھنا یہ گوشہ نشینی نے فضائل کو مع زیادتی فضائل کے شامل ہے۔

فی شرح السنة: متصل سند کے ساتھ سعد بن مسعود صحابی کی حدیث سے **ان عثمان بن مظعون الی النبی ﷺ فقال یا رسول الله اتذن لنا فی الاختصاء** اور ایسی سند کے ساتھ اس کو لائے ہیں کہ جس میں کلام ہے۔ میرکؒ نے اس طرح کہا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا اللہ عزوجل کو خواب میں دیکھنا

۷۲۵: وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَائِشٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رَأَيْتُ رَبِّیْ عَزَّوَجَلَّ فِیْ اَحْسَنِ صُوْرَةٍ قَالَ فِيْمَا يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْاَعْلٰى قُلْتُ اَنْتَ اَعْلَمُ قَالَ فَوَضَعَ كَفَّهٗ بَيْنَ كَتِفَیَّ فَوَجَدْتُّ بَرْدَهَا بَيْنَ ثَدْيَیَّ فَعَلِمْتُ مَافِی السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَتَلَا وَكَذٰلِكَ نُرِیْ اِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (رواه الدارمی) مُرْسَلًا وَلِلترمذی نحوه عنه۔

أخرجه الدارمی فی السنن ۲/ ۱۷۰حدیث رقم ۲۱٤۹عن عبدالرحمن بن عائش أخرجه الترمذی تعليقًا من قول البخاری ٥/ ۳٤٤بعد حدیث ۳۲۳٥۔

ترجمہ: "اور سیدنا عبدالرحمٰن بن عائش رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" میں نے

اپنے ربّ کو خواب میں بہت اچھی صورت میں دیکھا تو میرے ربّ نے مجھ سے پوچھا کہ مقربین فرشتے کس طرح آپس میں بحث کر رہے تھے؟ میں نے عرض کیا اے میرے اللہ! تو ہی بہتر جانتا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرا یہ جواب سن کر اللہ تعالیٰ نے میرے شانوں کے درمیان اپنا ہاتھ رکھا جس کی ٹھنڈک مجھے اپنے سینہ میں محسوس ہوئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں میں جان چکا ہوں گویا وہی بات ہوئی جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو پیش آئی جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے: "وَكَذٰلِكَ نُرِيْ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ" "اور اس طرح ہم نے ابراہیم کو زمین و آسمان کی سیر کرائی تا کہ وہ یقین کرنے والوں میں شامل ہو جائے"۔ دارمی (مرسلًا)

راویٔ حدیث:

عبدالرحمٰن بن عایش۔ یہ عبدالرحمٰن بن عایش "حضرمی" ہیں۔ ان کا شمار اہل شام میں ہوتا ہے۔ ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔ ان سے "رؤیت باری" کے بارے میں حدیث منقول ہے۔ ان سے ابوسلام ممطور اور خالد بن اللجلاج روایت کرتے ہیں اور ان کی حدیث: ((عن مالك بن يخامر عن معاذ بن جبل عن رسول الله ﷺ)) ہے اور بعض نے کہا ہے کہ بلاواسطہ کسی دوسرے صحابی کے آنحضور ﷺ سے نقل حدیث کرتے ہیں۔ لیکن صحیح پہلی ہی سند ہے۔ اسی کی تصدیق امام بخاری وغیرہ نے کی ہے۔ "عایش" یائے تحتانی دو نقطوں والی کے زیر اور شین معجمہ کے ساتھ ہے۔ اور "یخامر" میں دو نقطے والی یا ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور خائے معجمہ غیر مشدد ہے۔ اور میم مکسور ہے آخر میں رائے مہملہ ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مالک بن یخامر کی یہ روایت مرسل ہے۔ اس لئے کہ اُن کو آنحضور ﷺ سے سماع ثابت نہیں۔ ایک نسخہ میں "عایش" کے بجائے "عابس" ہے یعنی بائے موحدہ اور سین مہملہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: رایت ربی عزوجل فی احسن صورۃ: ظاہر یہ ہوتا ہے کہ اس حدیث کی نسبت خواب کی طرف ہوگی جو حضور ﷺ نے دیکھا تھا کیونکہ طبرانی نے مالک بن یخامر عن معاذ کی سند سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ ایک دِن صبح کی نماز میں آپ ﷺ اتنی تاخیر سے تشریف لائے کہ سورج طلوع ہونے کے قریب ہو چکا تھا، پس جب آپ ﷺ نے فجر پڑھالی تو فرمایا کہ رات کو میں نے نماز پڑھی جس قدر اللہ نے میرے لئے مقدر کر رکھی تھی پھر میں مسجد میں لیٹ گیا، پس میرے پاس اللہ عزوجل خوبصورت صورت میں تشریف لائے۔ اس توجیہ کی بناء پر اس حدیث پر کوئی اشکال نہیں ہو گا کیونکہ آدمی خواب میں بغیر شکل والی چیز کو شکل والی اور شکل والی کو بغیر شکل کے دیکھتا ہے پھر اس کو دیکھنے والے اور خوب میں کوئی خلل بھی شمار نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے اور دوسرے اسباب ہوتے ہیں جو علم منام یعنی تعبیر الرؤیا میں مذکور ہیں اور اگر یہ اسباب نہ ہوتے تو انبیاءِ کرام علیہم السلام کے خواب تعبیر کے محتاج نہ ہوتے۔

اور اگر اس سے بیداری میں دیکھنا مراد ہو جیسا کہ امام احمد بن حنبلؒ کی روایت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جس میں یوں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے نماز میں اُونگھ آ گئی تو میں بیدار ہوا تو میرا ربّ عزوجل اچانک میرے پاس تھے بہترین صورت میں۔ (الحدیث)

پس سلف ان جیسی احادیث میں اس بات کی طرف گئے ہیں کہ جب صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہوگی تو اس کے ظاہر

پر ایمان لایا جائے گا اور اس کی تفسیر اس طرح نہ کی جائے گی جس طرح مخلوق کی صفات کی تفسیر کی جاتی ہے بلکہ اس سے کیفیت کی نفی کی جائے گی اور اس کے باطن کے علم کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا جائے گا، پس بے شک اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو غیب کے پردے کے پیچھے سے جو چاہتے ہیں دکھاتے ہیں اسی طرح کہ ہمارے عقول کو اس کے ادراک میں کوئی راستہ نہیں ہے۔ لیکن ترک تاویل لوگوں کے عقائد کا فتنے میں پڑ جانے کا سبب اور ذریعہ بن جاتا ہے، گمراہ کن عقائد کے پھیلنے کی وجہ سے۔ لہٰذا اگر اس طرح تاویل کی جائے کہ جو علی وجہ الاحتمال شریعت کے موافق ہو نہ کہ قطعی طور پر یہاں تک کہ ان نصوص کو ایسی چیز پر محمول نہ کیا جائے جو شرعاً جائز نہیں ہے تو اس کی گنجائش ہے۔

احسن صورۃ: میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ میں نے اپنے رب کو دیکھا اس حال میں کہ میں بہترین صورت اور صفت میں تھا اللہ تعالیٰ کے مجھ پر انتہائی انعام اور لطف کرنے کی وجہ سے۔ یا اس حال میں کہ میرا ربّ بہترین صورت میں تھا اور کسی چیز کی صورت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی وجہ سے غیر سے جدا ہو جائے چاہے وہ اس کی عین ذات ہو یا اس کا ایسا جز ہو جو اس کو غیر سے جدا کر دے یا ایسی صفت جو ممیزہ بن جائے اور جیسا اس کا اطلاق جُثّہ (جسم) پر ہوتا ہے ایسے ہی اس کا اطلاق معنی پر ہوتا ہے جیسا کہ کہا جاتا کہ مسئلہ کی صورت یہ ہے اور صورت حال یہ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی صورت (اور اللہ تعالیٰ ہی اس کو بہتر جانتا ہے جو اس کی ذات مخصوصہ ہے جو ان تمام چیزوں سے جو اس کے علاوہ ہیں ان کی مماثلت سے منزہ ومبرا ہے جو ذاتِ اقدس کمال مراتب کی انتہاء کو پہنچے ہوئے ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کی صورت سے مراد اس کی صفت مخصوصہ ہے یعنی میرا ربّ خوبصورت تھا اکرام میں یا مہربانی کرنے میں دوسرے وقت سے، علامہ طیبیؒ اور تو پشتی نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ حتی استیقظت والی روایت اس میں تصحیف ہوئی ہے، پس بے شک جو روایت محفوظ ہے وہ وہ روایت ہے جو امام احمد اور امام ترمذیؒ کی روایت ہے جیسا کہ مصنف اس کو ذکر کریں گے اور وہ یہ روایت ہے: حتی استثقلتُ۔ اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ یہ روایت اس سے اصح ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ: **رایت علمته وعرفته** کے معنی میں ہو یعنی **علمته وعرفته فی احسن صورۃ**۔

اور میں نے اپنے شیخ عطیہ مسلمی سے سنا جو اپنے شیخ ابوالحسن بکری سے نقل کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی کچھ تجلیات صوریہ ہیں باوجودیکہ اس کی ذات احد مثلیت سے منزہ ومبرا ہے۔ اس تقریر سے قرآن وحدیث کے بہت سارے متشابہت کا حل نکل آتا ہے اور اعتراض واشکال ختم ہو جاتا ہے۔

الملاء: ملاء یعنی وہ لوگ جو مجالس کو اور سینوں کو عظمت اور جلال سے بھر دیتے ہیں۔

الاعلیٰ: یعنی ملائکہ مقربین ان کو اس سے یا تو اس لئے موصوف کیا گیا کہ ان کا مکان بلند ہے یا اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا مرتبہ بلند ہے اور ان کا آپس میں بحث کرنا یا تو یہ عبارت ہے ان کے اعمال کو ثابت کرنے میں جلدی کرنے سے اور آسمان کی طرف لے جانے سے اور یا یہ عبارت ہے ان کے ان اعمال کے فضل وشرف میں بات چیت کرنے سے اور یا یہ عبارت ہے فرشتوں کے لوگوں پر رشک کرنے سے ان فضائل کی وجہ سے کیونکہ یہ فضائل بندوں کے ساتھ خاص ہیں۔

فرشتوں کے آپس میں ایک دوسرے سے بحث کرنے کو اور سوال وجواب کرنے کو دو جھگڑا کرنے والوں کے ساتھ تشبیہ دی

ہے اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ یہ ایسی شئی ہے کہ جس میں رغبت کرنے والے ایک دوسرے کے مقابلہ میں رغبت کریں اور مصابیح میں یہ زیادتی ہے یا محمدا اور اس میں مزید شرف ہے۔

قلت انت اعلم: یعنی اس کو اور اس کے علاوہ دوسرے اُمور کو اور مصابیح میں اَیْ رب کی زیادتی ہے۔ ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اَیْ سے سے پکارا نہ کہ یا ربّ سے، اس لئے کہ یاء کے ذریعے دور والے کو پکارا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں اور باقی جو دعاؤں میں یا (اللہ یا ربنا) حدیث میں آیا ہے تو وہ نفس کے توڑنے (علاج) کیلئے ہے اور بندوں کے دعاء کی قبولیت کو بعید سمجھنے کی وجہ سے ہے اور یہی بات دعا کے حال کے مناسب ہے پھر مصابیح میں دو مرتبہ کے لفظ کی زیادتی ہے۔ ابن الملکؒ نے فرمایا ہے: **فیم یختصم** سے متعلق ہے، یعنی ربّ کی طرف سے دو مرتبہ سوال ہوا اور میری طرف سے دو مرتبہ یہ جواب رہا۔

کفه بین کتفی: کتفیّ "یاء" کی تشدید کے ساتھ ہے اور یہ کنایہ ہے اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید فضل اور فیض پہنچانے کی تخصیص سے کیونکہ مہربانی کرنے والے کی شان یہ ہوتی ہے کہ جس پر شفقت اور لطف سے کام لیتا ہے اس کے کندھوں کے درمیان اپنے ہاتھ کو رکھتا ہے اس بات پر تنبیہ کرتے ہوئے کہ وہ اس کی وجہ سے اس کی تکریم اور تائید کا ارادہ رکھتا ہے۔

فوجدت بردھا: ای راحتا الکف: یعنی لطف کی راحت۔ (**بین ثدییّ**) یہ تثنیہ ہے یعنی میرے دِل یا میرے سینے کے درمیان اور یہ کنایہ ہے اس فیض کے دِل تک پہنچنے سے اور رحمت کے نزول سے اور علوم کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہانے سے اور اس فیض سے تاثر لینے سے اور اس میں رسوخ و اتقان سے اور اس پر یقین رکھنے سے۔ **ثلج صدرہ واصابه بردُ الیقین** اس شخص کیلئے کہا جاتا ہے کہ جس کو کسی شئی کا یقین اور ثبات حاصل ہو جائے۔ (**فعلمت**) یعنی اس فیض کے پہنچنے کے سبب۔

ما فی السموٰت والارض: یعنی جو اللہ تعالیٰ نے مجھے ان میں سے بتلایا یعنی ملائکہ درخت وشجر ذلک اور یہ جملہ آپ کے علم کی وسعت سے عبارت ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھولا تھا۔

اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے یعنی تمام کائنات جو آسمانوں میں ہے بلکہ جو اس کے اوپر ہے جیسا کہ قصہ معراج سے ثابت ہوتا ہے اور **الارض** یہاں بھی جنس کے ہے یعنی تمام وہ جو ساتوں زمینوں میں ہے بلکہ جو اس کے نیچے ہے جیسا کہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے بیل اور مچھلی کے بارے میں کہ جس پر تمام زمینیں ہیں اور ممکن ہے کہ **سموٰت** سے مراد جہت علیا ہو اور ارض سے مراد جہت سفلی، پس یہ تمام کو شامل ہو گی لیکن اس تقید کی پھر بھی ضرورت پڑے گی جو ہم نے ذکر کی ہے اس لئے کہ تمام کچھ کا بتلایا جانا اس کا اطلاق صحیح نہیں ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

وتلا: بعض حضرات نے کہا ہے کہ پڑھنے والے اللہ تعالیٰ ہیں۔ (**وکذلك**) یعنی جیسے ہم آپ کو دین کے احکام اور آسمانوں وزمین کے دکھاتے ہیں اسی طرح:

نری ابراھیم: صیغہ مضارع ہے اور اس کا معنی ماضی والا ہے اور ماضی سے مضارع کی طرف عدول یہ حال ماضی کی حکایت کو بطور تعجب ذکر کرنے کے ارادے کی وجہ سے ہے تو معنی ہیں اَرَیْنَا ابراھیم۔

ملکوت السموٰت والارض: ملک سے مخلوق کے وزن پر ہے اور اس میں ملک کا معنی عظمت کے ساتھ ہے اور اس

سے مراد عالم معقولات ہیں یعنی ربوبیت اور الوھیت۔ ہم نے اس کو ان کی معرفت کی توفیق دی۔

اور بعض نے کہا ہے کہ آیت کو پڑھنے والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اس بات کی تائید علامہ طیبیؒ کی اس حدیث کی تشریح میں اس عبارت سے ہوتی ہے ثم استشهد بالاية یعنی جیسے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو زمینوں و آسمان کی سیر کرائی اور ان کو ابراہیمؑ کیلئے کھول دیا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مجھ پر غیبوں کے دروازے کھول دیئے۔

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ خلیل اللہ نے پہلے زمین و آسمان کو دیکھا پھر ان کو اس کے پیدا کرنے والے کا یقین حاصل ہوا اور حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے پیدا کرنے والے کو دیکھا پھر جو کچھ زمین و آسمان میں تھا اس کو جان لیا۔ ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے اس لئے کہ وہ آدمی جو مؤثر سے اثر کی طرف منتقل ہو یہ بہت بڑھ کر ہے اس آدمی سے جو اثر سے مؤثر کی طرف منتقل ہو۔ اسی وجہ سے جب عارفین میں سے ایک نے یہ کہا کہ ما رايت شيئا الا ورايت الله بعده (کہ میں نے کسی چیز کو بھی نہیں دیکھا مگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کو دیکھا) تو دوسرے عارف نے اس سے بھی زیادہ بلیغ جملہ لاکر اس کا معارضہ کیا کہ: ما رايت شيئًا الا ورايت الله قبله۔ ''کہ میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا مگر اللہ تعالیٰ کو اس سے پہلے دیکھا''۔

وليكون من الموقنين: یہ مقدر جملہ پر عطف ہے یعی ليستدل به علينا وليكون من الموقنين۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ کسی محذوف کیلئے علت ہو اَیْ وليكون من الموقنين فعلنا ذلك اور جملہ ماقبل والے جملہ پر معطوف ہے۔

رواه الدارمی: یعنی مرسلاً جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے۔ میرکؒ نے فرمایا ہے بلکہ یہ مفصل روایت ہے کیونکہ عبدالرحمان بن عابس کی صحبت (صحابی ہونا) میں اختلاف واقع ہوا ہے اور صحیح یہ ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پایا بلکہ اس روایت کو مالک بن یخامر نے معاذؓ سے نقل کیا ہے جیسا کہ مسند احمد میں ہے اور اس کی اسناد جید ہے اور عبدالرحمان کی سوائے اس حدیث کے اور کوئی حدیث نہیں ہے۔

۷۲۶: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَمُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ وَ زَادَ فِيهِ قَالَ يَامُحَمَّدُ هَلْ تَدْرِیْ فِيمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْاَعْلٰی قُلْتُ نَعَمْ فِي الْكَفَّارَاتِ وَالْكَفَّارَاتُ الْمُكْثُ فِي الْمَسَاجِدِ بَعْدَ الصَّلٰوتِ وَالْمَشْيُ عَلَى الْاَقْدَامِ اِلَى الْجَمَاعَاتِ وَاِبْلَاغُ الْوُضُوْءِ فِي الْمَكَارِهِ وَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ عَاشَ بِخَيْرٍ وَمَاتَ بِخَيْرٍ وَكَانَ مِنْ خَطِيْئَتِهٖ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ وَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اِذَا صَلَّيْتَ فَقُلِ اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِيْنِ فَاِذَا اَرَدْتَّ بِعِبَادِكَ فِتْنَةً فَاقْبِضْنِيْ اِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ قَالَ وَالدَّرَجَاتُ اِفْشَاءُ السَّلَامِ وَاِطْعَامُ الطَّعَامِ وَالصَّلٰوةُ بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ وَلَفْظُ هٰذَا الْحَدِيْثِ كَمَا فِي الْمَصَابِيْحِ لَمْ اَجِدْهُ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اِلَّا فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ۔

أخرجه الترمذی من طريق ـ عن عبدالرحمٰن عن عائش الحضرمی عن مالك بن يخامر السكيكی عن معاذ بن جبل نحوه بالفاظه وزيادات فی السنن ٥ / ٣٤٣ حديث رقم ٣٢٣٥ رواه فی شرح السنة۔

ترجمہ: ''(اور ترمذی نے بعض اختلاف کے ساتھ اس روایت کو عبدالرحمٰن بن عائش)، ابن عباس اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے اس میں مزید یہ الفاظ ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو معلوم ہے کہ مقربین فرشتے کس بارے میں بحث کر رہے ہیں؟ آپ ﷺ فرماتے ہیں میں نے جواباً عرض کیا ہاں؟ میں جانتا ہوں کہ وہ کفارات کے متعلق گفتگو کر رہے تھے اور وہ کفارات یہ ہیں کہ ایک نماز ادا کرنے کے بعد مسجد میں دوسرے وقت کی نماز کے انتظار میں آدمی بیٹھے اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہے اور پیدل چل کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرے۔ نیز یہ کہ سردی ہو یا گرمی اچھی طرح وضو کرے اگر کوئی شخص ایسا کرے تو وہ بھلائی پر زندہ رہے گا اور بھلائی پر مرے گا اور اپنے گناہوں سے اس طرح پاک ہو جائے گا گویا اس کی ماں نے اُس کو آج ہی جنا ہے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوں تو یہ دعا پڑھا کریں: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِيْنَ فَاِذَا اَرَدْتَّ بِعِبَادِكَ فِتْنَةً فَاقْبِضْنِىْ اِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ (اے اللہ میں تجھ سے نیکیاں کرنے اور برائیوں سے بچنے اور مسکینوں کی دوستی کا سوال کرتا ہوں اور جب تو بندوں میں گمراہی ڈالنے کا ارادہ کرے تو مجھے بغیر فتنہ وآزمائش کے اٹھا لیجئے) اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ درجات یہ ہیں کہ ہر ایک کو سلام پیش کیا جائے (السلام علیکم کہا جائے) مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے اور رات کو اس وقت تک جب لوگ سوئے ہوئے ہوں نماز پڑھی جائے۔''

اسنادی حیثیت: صاحب مشکوٰۃ کہتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ جیسا کہ مصابیح میں عبدالرحمٰن سے منقول ہے سوائے شرح السنہ کے کسی کتاب میں نہیں دیکھی''۔

تشریح: **وعن ابن عباس:** اس کا عطف عنہ پر ہے۔ (**یا محمد هل تدری فیم یختصم الملأ الاعلی**) اور مصابیح میں یا محمد مؤخر ہے۔

نعم فی الكفارات: اور مصابیح میں نعم کے بغیر ہے اور حضرت معاذ بن جبل کی روایت قابل اعتماد روایت ہے جس میں یہ ہے: **قلت فی الدرجات والكفارات** ان مذکورہ خصائل کو کفارات سے تعبیر کیا اس لئے کہ یہ ماقبل گناہوں کیلئے کفارہ بن جاتے ہیں۔

والكفارات: یعنی وہ چیز کہ جس میں ملاءِ اعلیٰ والے بحث کر رہے ہیں۔ یہ مبتدا ہے اس کی خبر (**المكث**) ہے میم کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ ہے اور قاموس میں ہے مَكْث تینوں لفظوں کے ساتھ اور کاف کو حرکت بھی دی جاتی ہے۔

فی المساجد بعد الصلوات: یعنی ہر نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کیلئے یا اس سے مراد اعتکاف کرنا ہے یا مطلق توقف ہے مخلوق سے علیحدگی کرنے کیلئے اور حق تعالیٰ میں مشغول ہونے کیلئے۔

فی المكاره: یعنی شدید سردی میں، اور مصابیح کے الفاظ یہ ہیں **قال وما هُنَّ**؟ ابن الملکؒ نے فرمایا کہ یہ ان کفارات کے بارے میں استفہام ہے اور مقصود اس سے اس علم تفصیلی کا اظہار ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سکھلایا تھا اور یہ کہ آپ ﷺ اپنی اُمت کو اس کی خبر دیں تاکہ وہ اس پر عمل کریں (آگے مصابیح کی روایت یوں ہے) کہ میں نے کہا کہ جماعات کی طرف پیدل چل کر جانا اور نمازوں کے بعد مساجد میں بیٹھنا اور پانی فرائض اور سُنن کی جگہوں میں مبالغے سے پہنچانا اور ان

چیزوں کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا تا کہ ان کے کرنے پر ترغیب ہو جائے کیونکہ یہ افعال دائمی ہیں تو اس میں اس بات کا خدشہ ہے کہ ان میں سستی اور غفلت برتی جائے۔ ابن الملکؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

ومن فعل ذلك عاش بخير ومات بخير: جیسا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [النحل: ۹۷] ''کہ جو مؤمن مرد ہو یا عورت نیک عمل کرے، پس ہم اس کو ضرور پاکیزہ حیات عطاء فرمائیں گے اور ان کے اچھے کاموں کے عوض میں انکا اَجر دیں گے''۔ حیاۃ طیبہ کی تفسیر طاعت کی حلاوت اور عبادت کی توفیق کے ساتھ کی گئی ہے۔ ابن عباسؓ نے اس کی تفسیر رزق حلال سے کی ہے اور میں نے اس کی تفسیر قناعت اور رضا بالقضاء سے کی ہے جو کہ دنیوی نعمتوں کی انتہاء ہے اور اَجر کا بدلہ احسن عمل سے دینے سے مراد یہ ہے کہ اس کے تمام وہ اعمال جو اس عمل سے کم ہیں ان کو اس عمل فاضل (فضیلت والے عمل) کے برابر کر دیا جائے گا اور یہ اخروی نعمتوں کی انتہائی ہے۔ اور اس کا مقدمہ موت ہے خیر و عافیت کے ساتھ یعنی موت اسلام اور توبہ پر ہو اور راحت اور ریحان اور جنت کی خوشخبری کی حالت میں ہو۔

وکان من خطٰیئة: اور مصابیح کے الفاظ یہ ہیں **ومن يَفْعَلُ ذلك يعش بخير ويمت بخير ويكون من خطينته......**

کیوم ولدته: یوم، یہ مبنی علی الفتح ہے، ماضی کی طرف اس کی اضافت کی وجہ سے اور جب اس کی اضافت مضارع کی طرف ہو تو اس کے مبنی ہونے میں اختلاف ہے، طیبیؒ نے اس طرح فرمایا ہے۔ اور مضارع کی مثال وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ﴾ [المائدہ: ۱۱۹] ''خدا فرمائے گا کہ آج وہ دن ہے کہ راست بازوں کو ان کی سچائی ہی فائدہ دے گی۔'' نافع نے یومَ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی نے رفع کے ساتھ۔ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ وہ گناہوں سے بری ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ اس دِن بری تھا جس دِن اس کو اس کی ماں نے جنا تھا اور ابن حجرؒ نے عجیب بات کی اور کہا ہے **وکان خارجا کخروجه** کہ اس بچے کے گناہوں سے نکلنے کی طرح یہ بھی نکل جاتا ہے۔ تو اس طرح یہاں مقابلے کے طور پر تعبیر کرنا ہے کیونکہ اس کی حقیقت یہاں مراد لینا محال ہے۔ اس لئے کہ مولود (بچہ) کے گناہ ہی نہیں ہوتے یہاں تک کہ وہ اس گناہوں سے نکلتا۔ اسی وجہ سے علامہ طیبیؒ نے مبرأ سے تعبیر کیا ہے اور ہم نے یہاں اسی کو ترجیح دی ہے اس لئے کہ حضورؐ نے اپنے ایک ارشاد میں اسی سے تعبیر کیا ہے فرمایا: **من حج فلم يرفث ولم يفسق خرج من ذنوبه كيوم ولدته امه** یعنی وہی پہلی مذکورہ تاویل کے ساتھ اور ابن حجرؒ کے قول کی غرابت کی وجہ ایسی چیز کو مقدر ماننا ہے جو تاویل کی محتاج ہے اور ایسی چیز کو چھوڑنا ہے جو تاویل کی محتاج نہیں ہے اور ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ یہ آدمی گناہوں سے جو بری ہو جاتا ہے اس سے مراد صغائر ہیں۔

فقل: ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے بعد جیسا کہ نظم کلام اس کا فائدہ دے رہا ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ نظم اس معنی کے مراد لینے کے بھی منافی نہیں ہوگا کہ جب تو نماز پڑھے تو تو نماز کے آخر میں اس کو کہہ۔

اسئلك الخیرات: اور ایک نسخہ میں **فعل الخیرات** ہے فاء کے کسرہ کے ساتھ اور بعض نے فاء کا فتحہ بتلایا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اول اسم ہے ثانی مصدر ہے اور خیرات وہ ہے جو شریعت میں افعال حمیدہ میں سے اور نیک افعال میں سے

معروف ہو۔

وترك المنكرات وحب المساكين: لیکن ظاہر یہی ہوتا ہے کہ یہ (حب المساكين) ماقبل کی طرح مصدر کی اضافت مفعول کی طرف کے قبیل سے ہے اور یہ تخصیص بعد التعمیم کے قبیل سے ہے کیونکہ یہ خیرات میں داخل ہے جس کو منکرات کے مقابلہ میں ذکر کیا گیا ہے اس کے باوجود اس کو ذکر کرنا اس فرد (حب المساکین) کے اہتمام کی وجہ سے ہے جیسا کہ: فاذا اردت بعبادك ...... میں فتنہ کو منکرات کی جانب میں خاص کیا گیا ہے۔

فتنه: یعنی گمراہی یا دنیاوی سزا۔ (فاقبضنی) باء کے کسرہ کے ساتھ ای توفنی۔

اليك غير مفتون: ای غير ضال او غير معاقب اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ جب تو ان کو گمراہ کرنے کا ارادہ کرے تو میری موت کو بغیر فتنے میں پڑے ہوئے مقدر کر دے۔

والدرجات: یہ مبتدا ہے یعنی وہ چیز جو رفع درجات کا سبب ہیں۔ (افشاء السلام) یعنی اس پر سلام کرے جس کو پہچانتا ہے اور اس کو بھی سلام کرے جس کو نہیں پہچانتا۔ (اطعام الطعام) یعنی ہر خاص و عام کو کھلانا۔

والناس نيام: اور مصابیح کے الفاظ یہ ہیں ومن الدرجات (یعنی وہ چیز جو درجات کو بلند کرتی ہیں اور جو درجات تک پہچانتی ہیں۔ پس مِن تبعیض کیلئے ہے) اطعام الطعام وبذل السلام وان يقام (بالليل والناس نيام) (ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ ان چیزوں کو رفع درجات کیلئے اس لئے خاص کیا گیا ہے کیونکہ یہ واجب سے زائد ہیں پس لامحالہ ان کا کرنے والا فضل کا مستحق ہوگا اور وہ فضل درجات کا بلند ہونا ہے)۔ قل اللهم انى اسئلك الطيبات (یعنی اقوال اور نیک احوال)۔ وفعل الخيرات وترك المنكرات وان تغفرلی وتتوب علی واذا اردت بعبادك فتنة فی يوم فتوفنی اليك غير مفتون۔

۷۲۷: وَعَنْ اَبِىْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثَةٌ كُلُّهُمْ ضَامِنٌ عَلَى اللّٰهِ رَجُلٌ خَرَجَ غَازِيًا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَهُوَ ضَامِنٌ عَلَى اللّٰهِ حَتّٰى يَتَوَفَّاهُ فَيُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ اَوْ يَرُدَّهٗ بِمَا نَالَ مِنْ اَجْرٍ اَوْ غَنِيْمَةٍ وَرَجُلٌ رَاحَ اِلَى الْمَسْجِدِ فَهُوَ ضَامِنٌ عَلَى اللّٰهِ وَرَجُلٌ دَخَلَ بَيْتَهٗ بِسَلَامٍ فَهُوَ ضَامِنٌ عَلَى اللّٰهِ۔

(رواه ابوداود)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ۳/۱۶ حديث رقم ۲۴۹۴۔

ترجمہ: اور سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تین اشخاص ایسے ہیں جن کا ذمہ اللہ عزوجل نے لیا ہے کہ ان کو آخرت کے مصائب سے دور رکھے گا: ① ایک وہ شخص جو جہاد کے لئے نکلا تو وہ اللہ کریم کی ذمہ داری میں ہے کہ یا تو اس کو شہادت عطا فرما کر جنت پہنچائے یا غازی بنا کر اس کو گھر میں بھیج دے اور اسے مال و متاع دے کر دنیوی فائدہ سے مالا مال کر دے۔ ② دوسرا شخص وہ ہے جو محض اللہ کی رضا کے لئے مسجد جائے' اللہ اس کا ضامن ہے کہ اس کو اس کی عبادت کا اجر و ثواب مرحمت فرمائے۔ ③ تیسرا وہ جو گھر میں داخل ہوتے وقت گھر والوں پر سلام پیش کرے تو وہ بھی گویا اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری میں ہے"۔ (ابوداؤد)

تشریح: کلھم: یعنی ان میں سے ہر ایک اور افراد لفظ کل کے اعتبار سے ہے۔ (ضامن) ای ذو ضمان یعنی حفظ ورعایت والے ہیں جیسا کہ لابنٌ اور عامرٌ۔ (علی اللہ) یا ضامن مضمون کے معنی میں ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے ھو عامرٌ ای معمورٌ جیسا کہ ماءٌ دافق ای مدفوق مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان سے پکا وعدہ کیا ہے ان کو ان کی مراد دینے میں اس کی طرف سے وعدہ خلافی نہیں ہوگی اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے ضامن بمعنی ذی الضمان ہے جو واجب کی طرف لوٹتا ہے یعنی اللہ پر واجب ہے کہ وہ اپنے وعدے کے اقتضاء کی وجہ سے ان کی دین اور دنیا میں مصائب سے حفاظت کرے۔

فھو ضامن علی اللہ: یعنی اس کی حفاظت ورعایت کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے جیسے وہ شئی کہ جس کو اپنے ذمہ لیا جائے۔ (حتی یتوفاہ) یعنی اللہ تعالیٰ اس کی روح قبض کرے یا موت دے کر یا اپنے راستے میں شہادت کے ساتھ۔ (اویردہ) یہ یتوفاہ پر عطف ہے۔ (من اجر) یعنی فقط ثواب۔

اوغنیمۃٍ: یعنی اَجر کے ساتھ غنیمت بھی۔ پس اَوْ تنویع کیلئے ہے۔ اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اَوْ ھما (یعنی دونوں) پس اَوْ منع خلو کیلئے ہوگا۔ اور اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ غنیمت بغیر اَجر کے پائی جائے، اور یہ بات مردود ہے کیونکہ یہ خلافِ مفروض ہے۔ پس اس کو غور سے سمجھ لو، کیونکہ یہ جگہ غلطی اور پھسلنے کی ہے۔ اور ایک حدیث قدسی میں ہے: من خرج مجاھدًا فی سبیلی وابتغاء مرضاتی فانا علیہ ضامن او ھو علی ضامن۔ راوی کو اس میں شک ہے، مطلب یہ ہے کہ میں اس بندے پر رقیب اور حفیظ (نگہبان) ہو یا وہ مجھ پر واجب الحفظ ہے (یعنی اس کی حفاظت کرنا مجھ پر واجب ہے)۔

ورجل دخل بیتہ بسلام: یعنی گھر والوں پر سلام کرتے ہوئے داخل ہوا اور بعض نے کہا ہے کہ گھر میں سلامتی کیلئے داخل ہوا اور بعض نے کہا کہ اس کا معنی ہے کہ فتنوں سے سلامتی طلب کرتے ہوئے داخل ہوا کیونکہ اس سے وہ امن میں ہو جائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ﴾ [الحجر: ٤٦] ''(ان سے کہا جائے گا کہ) ان میں سلامتی (اور خاطر جمع) سے داخل ہو جاؤ۔'' یعنی عذاب سے بچتے ہوئے۔ لیکن اس توجیہ کو ردّ کیا گیا ہے کیونکہ آیت سے یہ معنی امنین کی وجہ سے ہے۔ پس بسلام کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے ان پر سلام کریں گے یا ان میں سے بعض بعض پر سلام کریں گے۔

فھو ضامن علی اللہ: ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو برکت اور ثوابِ کثیر عطاء فرمائیں گے اس لئے کہ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ان کو فرمایا اے بیٹے جب تو اپنے گھر والوں کے پاس جائے تو ان کو سلام کر یہ تجھ پر اور تیرے اہل پر برکت کا سبب ہوگا اور جب گھر میں کوئی نہ ہو تو بندہ اپنی ذات ہی پر سلام کرے اس لئے کہ جو آدمی خالی گھر میں داخل ہو اس کیلئے مسنون ہے کہ وہ یوں کہے: السلام علینا وعلی عباد اللہ الصلحین، اور شاید اس میں جو راز ہے وہ یہ ہو کہ گھر ملائکہ اور بعض مسلمان جنات سے تو خالی نہیں ہوتا اور آخری دو میں مضمون یہ کو ماقبل پر اکتفاء کرتے ہوئے ذکر نہیں کیا اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو جب بھی گھر میں داخل ہو گھر والوں پر سلام کرے اور مضمون بہ وہ برکت ہے اس پر اور اس کے اہل وعیال پر اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے وہ آدمی مراد ہے کہ جو سلامتی کی طلب میں اور فتن سے بچاؤ کی خاطر گھر کو لازم پکڑے اور یہ معنی زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ اللہ کے راستے میں سفر کے اندر مجاہدہ

کرنا اور حضر میں مسجد کی طرف جانا اور گھر کو لازم پکڑنا فتنوں سے بچنے کی خاطر تو ان میں سے بعض بعض کے ساتھ مربوط ہیں۔ پس اس بناء پر مضمون یہ اللہ تعالیٰ کا حفاظت کرنا اور فتنوں سے بچانا ہے۔

رواہ ابو داؤد: بقول میرکؒ امام ابوداؤد اس پر خاموش رہے ہیں۔

وضو گھر سے ہی کر کے جانا افضل ہے

۷۲۸: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ خَرَجَ مِنْ بَيْتِهٖ مُتَطَهِّرًا اِلٰى صَلَاةٍ مَكْتُوْبَةٍ فَاَجْرُهٗ كَاَجْرِ الْحَاجِّ الْمُحْرِمِ وَمَنْ خَرَجَ اِلٰى تَسْبِيْحِ الضُّحٰى لَايُنْصِبُهٗ اِلَّا اِيَّاهُ فَاَجْرُهٗ كَاَجْرِ الْمُعْتَمِرِ وَصَلَاةٌ عَلٰى اِثْرِ صَلَاةٍ لَا لَغْوَ بَيْنَهُمَا كِتَابٌ فِيْ عِلِّيِّيْنَ۔ (رواہ احمد وابوداود)

أخرجه أحمد في المسند ٥/٢٦٨۔ وأخرجه أبوداوٗد في السنن ١/٣٧٧ حديث رقم ٥٥٨۔

ترجمہ: اور سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص وضو کر کے گھر سے نکلا اور فرض نماز ادا کرنے کے لئے مسجد گیا تو وہ اتنے ثواب کا مستحق ہوا جتنے ثواب کا مستحق احرام باندھ کر حج کرنے والا ہے اور جس شخص نے چاشت کی نماز ادا کی اُس نے عمرہ کا ثواب پایا اور ایک نماز باجماعت ادا کرنا دوسری نماز باجماعت ادا کرنے تک ان دونوں نمازوں کے درمیان جو گناہ اس سے سرزد ہوئے یا لغو باتیں ادا ہوئیں وہ سب اس کو معاف کر دی گئیں اور اس کا یہ عمل ''علیین'' میں لکھا گیا جو ایک محفوظ مقام ہے۔ (ابوداؤد)

تشریح: **متطهرا الی الصلاۃ:** یہ حال ہے یعنی مسجد کی نماز کے ارادے سے نکلا۔

کاجر الحاج: یعنی حج کرنے والے کے اَجر کے مثل۔ زین العرب نے فرمایا ہے ای **کاصل اجرہ**۔ یعنی اس کے اصل اجر کی طرح اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ حج کرنے والے کے اَجر کی طرح اِس حیثیت سے ہے کہ اِس کے لئے ہر قدم کے بدلے ایک نیکی (یا یک گناہ معاف یا ایک درجہ بلند) لکھا جاتا ہے جیسا کہ حج کرنے والے کیلئے اگرچہ دونوں اَجر کثرت وقلت میں یا کمیت اور کیفیت میں مختلف اور متغائر ہوں۔ یا اس حیثیت سے ہے کہ وہ نمازیوں جیسا ہی پورا پورا اَجر وصول کرتا رہتا ہے گھر سے نکلنے سے لے کر لوٹنے تک اگرچہ اس نے بعض اوقات میں نماز پڑھی ہے جیسا کہ حج کرنے والا اپنا اَجر پورا پورا وصول کرتا رہتا لوٹنے تک اگرچہ حج اس نے صرف عرفہ میں کیا تھا۔

المحرم: حاجی مُحرِم سے تشبیہ دی اس لئے کہ نماز کی وجہ سے پاکی حاصل کرنا بمنزلہ احرام کے ہے جو حج کیلئے باندھا جاتا ہے کیونکہ حج بغیر احرام کے اور نماز بغیر وضو نہیں ہوتی پھر جب حج کرنے والا احرام کی حالت میں ہو تو اس کا ثواب اتم ہوگا، پس اسی طرح جو نماز کیلئے نکلتا ہے پاکی کی حالت میں پس اس کا ثواب بھی افضل ہوگا۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ: **من خرج من بیته** یعنی **قاصدا الی المسجد لاداء الفرائض**۔ اور ہم نے جو یہاں قصد (ارادے) کو مقدر کیا وہ اس لئے ہے تاکہ حج کے مطابق ہو جائے اس لئے کہ حج وہ قصد خاص کو کہتے ہیں۔ پس نیت (ارادہ) طہارت کے ساتھ یہ بمنزلہ احرام کے ہے اور اس جیسی احادیث برابری کیلئے نہیں ہوتیں اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ

ناقص کو کامل کے ساتھ ملانا کامل کی فضیلت کا وجوباً مقتضی ہے تا کہ مبالغے کا فائدہ ہو ورنہ یہ عبث ہے، پس ان نمازیوں کے حال کو کہ جو فرض نماز کے ارادے سے نکلے فضیلت میں تشبیہ دی گئی ہے حاجی محرم کے حال کے ساتھ مبالغے اور ترغیب کے طور پر تا کہ لوگ جماعت میں غفلت اور سستی نہ برتنے لگیں۔

ومن خرج الی تسبیح الضحی: یعنی چاشت کی نماز۔ اور ہر نفلی نماز تسبیح اور دُعا ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ فرض اور نفل نماز اگر چہ وہ یہ دونوں اس امر میں متفق ہیں کہ ان میں سے ہر ایک میں تسبیح پڑھی جاتی ہے لیکن نفل نماز اس نماز کے ساتھ اس لئے خاص طور پر مذکور ہے کیونکہ تسبیحات فرائض اور نوافل میں سنت ہیں گویا کہ نفل نماز کو اس بناء پر تسبیح کہا گیا ہے کہ یہ واجب نہ ہونے میں اذکار کے مشابہ ہے اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اسی حدیث سے ہمارے ائمہ نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ چاشت کی نماز مسجد میں پڑھنا مسنون ہے اور یہ ان میں سے ہوگی جو اس حدیث: **افضل صلوٰۃ المرء فی بیتہ الا المکتوبہ** سے مستثنیٰ مانی گئی ہیں۔

ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں یہ بات ملحوظ رہے کہ متن حدیث کے صحیح ماننے کے بعد یہ حدیث جواز پر تو دلالت کرتی ہے نہ کہ افضل ہونے پر، یا اس حدیث کو محمول کیا جائے گا اس شخص پر جس کا کوئی گھر نہ ہو یا گھر ہو لیکن اس میں کوئی مشغولی ہو رہی ہو اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ حدیث میں مسجد کا بالکل ذکر نہیں، پس معنی یہ ہیں کہ جو گھر سے یا بازار سے یا اپنے مشغل سے اشتغال دنیا کو چھوڑتے ہوئے چاشت نماز کی طرف نکلے۔

لا ینصبہ: یاء کے ضمہ کے ساتھ یہ انصاب سے ہے اور اس کا معنی تھکانا، یہ نَصِبَ بالکسرہ سے ہے یعنی جب تھک جائے **وانصبہ غیرہ ای تبعۂ** اور یاء کے فتحہ کے ساتھ بھی مروی ہے نَصب ای اقامہ سے، یہ زین العربؒ نے فرمایا ہے۔ اور علامہ تور پشتیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ یاء کے ضمہ کے ساتھ ہے اور فتحہ احتمال لغوی ہے روایت کے اعتبار سے میں اس کو ثابت نہیں مانتا۔

الا ایاہ: یعنی نہیں تھکاتا یہ نکلنا مگر چاشت کی غرض سے اور ضمیر منصوب کو یہاں مرفوع کی جگہ رکھا گیا ہے: **ای لا یخرجہ ولا یزعجہ الا ھو** اور حدیث الوسیلہ کے برعکس ہے (کہ اس میں مرفوع منصوب کی جگہ ہے) **وارجوان اکون اناھو**۔ طیبیؒ نے اس طرح فرمایا ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس میں معنی کی طرف میلان ہے نہ کہ لفظ کی طرف اور یہ علم عربیت میں ایک عظیم الشان باب ہے۔ اور صاحبِ کشافؒ اسی سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلاً مِّنْهُمْ﴾ کو بتایا ہے قراءت شاذہ کے ساتھ اس لئے کہ معنی یہ ہوں گے: **لم یطیعوہ الا قلیل منھم** اور اسی طرح یہاں پر کہ **لا ینصبہ الا ایاہ** کا معنی ہوگا: **لا یقصد ولا یطلب الا ایاہ**۔ اور ابن الملکؒ نے فرمایا کہ یہاں ضمیر منصوب کو مرفوع کے قائم مقام رکھا گیا ہے کیونکہ یہ استثناء مفرغ ہے یعنی **لا یتعبہ الا الخروج الی تسبیح الضحی**۔

کاجر المعتمر: اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ عمرہ سنت ہے۔ (**علی اثر**) اِثر ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اور سکون کے ساتھ یا دو فتحوں کے ساتھ **ای عقیبھما**۔

فی علیین: یہ اس دیوان (رجسٹر) خیر کا نام ہے جس میں نیکوں کے اعمال لکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا عِلِّيُّوْنَ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ [المطففین: ۱۸ تا ۲۱] ”ہرگز ایسا نہیں

نیک لوگوں کا نامۂ اعمال علیین میں رہے گا اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ علیین کیا چیز ہے وہ ایک نشان کیا ہوا دفتر ہے جس کو مقرب فرشتے دیکھتے ہیں''۔ علیین یہ علیؔ کی جمع اور یہ علوّ سے فعیل کے وزن پر ہے اور اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ اس کو تکریماً ساتویں آسمان تک اٹھایا جاتا ہے اور اس لئے بھی کہ یہ درجات کی بلندی کا سبب ہے اور عِلّیّۃ لام اور یاء کی تشدید کے ساتھ ہے غرفہ: بالاخانہ کو کہتے ہیں اسی طرح بعض حضرات نے کہا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد اعلیٰ جگہ اور بلند مراتب ہیں یعنی نماز پر مداومت (ہمیشگی) بغیر کسی ایسے خلل کے کہ جو اس کے منافی ہو اعمال میں سے کوئی چیز بھی اس سے اعلیٰ نہیں ہے پس اس کو علیین سے کنایہ لیا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ **کتا ب فی علیین** کا مطلب ہے **عمل کتاب فی علیین یا کتاب مرفوع فی علیین یا سبب کتب اسم عاملہ فی علیین** یعنی یہ اس کے علیین میں نام لکھنے کا سبب ہے اور وہ' وہ جگہ ہے کہ جس میں صالحین کے اعمال لکھے جاتے ہیں۔

رواہ احمد وابوداود: اور اس پر امام ابوداوٗدؒ نے خاموشی اختیار کی ہے اور اس کی سند میں قاسم ابوعبدالرحمان ہے اور اس میں کلام ہے۔ میرکؒ نے اسی طرح کہا ہے۔

تسبیحات' جنت کے میوے

۷۲۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا مَرَرْتُمْ بِرِیَاضِ الْجَنَّةِ فَارْتَعُوْا قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا رِیَاضُ الْجَنَّةِ قَالَ الْمَسَاجِدُ قِیْلَ وَمَا الرَّتْعُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ . (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥/٤٩٧ حدیث رقم ٣٥٠٩ ـ وقال : حسن غریب ـ

''اور سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہٗ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم جنت کے باغوں میں جاؤ تو وہاں سو کھا میوہ کھاؤ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ یارسول اللہ دنیا میں جنت کے باغات کہاں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ مساجد ہیں۔ پھر آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میوہ کھانا کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ)) اللہ پاک ہے اور تمام اچھی تعریفیں اسی کے لئے ہیں اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے مسجدوں میں ان تسبیحات کا ادا کرنا سو کھا میوہ کھانا (ہی تو) ہے''۔ (ترمذی)

تشریح: **فارتعوا:** یعنی تم خاموش نہ ہو بلکہ تم دِل سے یا زبان سے ذِکر کرتے رہو اور اہل معرفت ان دونوں کو جمع کرتے ہیں۔ یا مطلب یہ ہے کہ تم اس چرنے کو غنیمت سمجھو کہ جس میں عبادت و ذِکر کی مختلف اقسام اور مختلف علوم و معارف حاصل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر مجھے مسجد اور جنت میں اختیار دیا جائے تو میں مسجد کو اختیار کروں گا۔ شاید حضرت علیؓ یہ بات اس لئے ارشاد فرما رہے ہوں کہ مسجد ہی وہ جنت میں کمال مرتبہ کا سبب ہے یا اس لئے کہ اس میں نفس کی مخالفت ہے اور دِل کی موافقت ہے اور اللہ کی رضا ہے۔

قیل یا رسول اللہ: دونوں جگہ سوال کرنے والے ابو ہریرہؓ ہی ہیں جو راوی حدیث ہیں اور یہ بات ترمذی میں واضح ہے، علامہ میرکؒ نے اسی طرح کہا ہے۔

ما ریاض الجنة قال المساجد: یہ اس دوسری روایت کے منافی نہیں ہے کہ جس میں **حلق الذکر** آیا ہے اس لئے کہ ذِکر کے حلقے اس کا مصداق مسجد بھی ہے اور غیر مسجد بھی، پس وہ اعم ہے اور اس میں سے اس جگہ مساجد کو خاص کیا گیا کیونکہ یہ افضل ہے اور مساجد کو جنت کے باغ بنانا یہ اس بناء پر ہے کہ ان میں عبادت کرنا جنت کے باغوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔

قبل وما الرتع یا رسول اللہ قال سبحان اللہ......: لفظاً اور معنًی مناسبت کی رعایت کی وجہ سے رتع کو قول کی جگہ رکھا اس لئے کہ ان کلمات کا کہنا بہت بڑے ثواب کے حاصل کرنے کا سبب ہے اور رتع کا یہاں معنی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد جیسا ہے (جو یوسف علیہ السلام کے بارے میں ان کے بھائیوں نے کہا تھا) : ﴿یَرْتَعْ﴾ [یوسف: ۱۲] اور رتع اصل میں کہتے ہیں کہ پھلوں اور لذت والی اشیاء کھانے کیلئے کثرت سے مہیا ہونا اور اسی طرح سرسبز باغات اور نہروں کی طرف سیر کیلئے نکلنا جیسا کہ لوگوں کی عبادت ہے کہ جب وہ باغات کی طرف نکلتے ہیں۔ پھر اس لفظ میں وسعت کی گئی اور اس کا استعمال بڑے ثواب کے ساتھ ملنے والی کامیابی پر ہونے لگا۔ اور حدیث کے معنی کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ جب مساجد میں گزرو تو یہ کہو۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح کہا ہے اسی وجہ سے بعض علماء نے کہا ہے کہ جو اوقات مکروہ میں مسجد میں داخل ہو تو وہ یہ کلمات کہے، پس یہ کلمات تحیۃ المسجد کے قائم مقام ہوں گے پھر یہ بات ہے کہ یہ رتع (چرنا) صرف اذکار میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس حدیث اور ان جیسی دوسری احادیث سے مقصود باقی رہنے والے نیک اعمال ہیں کو جو باغاتِ جنت تک پہنچانے کا سبب ہیں اور بلند درجات کے رفع کا سبب ہے۔

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اگر چرنے کے ذکر سے اشارہ ہو اس درخت کے پھل کھانے کی طرف کہ جس کو ذکر کرنے والا مسجد کے باغ میں لگاتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں معراج والی رات میں ابراہیم علیہ السلام کو ملا تو انہوں نے ارشاد فرمایا اے محمد ﷺ میری طرف سے آپ اپنی اُمت کو سلام کہنا اور ان کو یہ بتلانا کہ جنت بڑی پاکیزہ مٹی والی ہے اور میٹھے پانی والی ہے اور یہ جنت چٹیل میدان ہے اور اس کے پودے و درخت سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ہیں۔ تو یہ انوکھا اسلوب اور عجیب وغریب اشارہ ہوگا جو آپ ﷺ نے ذکر کیا ہے۔

پھر حلق الذکر میں اشارہ ہے کہ ہر ذِکر میوے چرنا ہے اور جو یہاں ان کلمات کو خصوصاً ذکر کیا گیا تو اس لئے کہ آیت میں **والباقیات الصالحات** کی تفسیر انہی کلمات سے کی گئی ہے اور اس حدیث کی وجہ سے بھی کہ جس میں ہے کہ یہ افضل کلام ہیں اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ جس کو ہم نے ذکر کیا ہے: **اذا دخلتم المسجد فعلیکم بالارتاع قالوا وما الارتاع یا رسول اللہ قال الدعا والرغبة الی اللہ عزوجل۔**

رواہ الترمذی: اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند میں حمید مکی ہے اور وہ متکلم فیہ ہے (نقلہ میرک) اور حدیث میں آیا ہے کہ مساجد آخرت کے بازار ہیں جو اس میں داخل ہوگا وہ اللہ کا مہمان ہے اور اس کی جزاء مغفرت ہے اور اس کی سلامی کرامت ہے اور تم پر چرنا لازم ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ چرنے سے کیا مراد ہے فرمایا دعا اور اللہ

تعالیٰ کی طرف رغبت۔

اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے

۷۳۰: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ اَتَى الْمَسْجِدَ لِشَيْءٍ فَهُوَ حَظُّهُ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۱/ ۳۲۰ حديث رقم ۴۷۲۔

ترجمہ: ''سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' جو شخص مسجد میں آئے گا وہ جس کام کے لئے آئے گا اسے اس میں سے حصہ عطا کیا جائے گا''۔ (ابوداؤد)

تشریح: ''حرام'' حاء مہملہ کے کسرۂ اور زاۂ معجمہ کے ساتھ ہے۔

من اتی المسجد :یعنی اخروی یا دنیوی شئی کے حصول کے ارادے سے۔ **(فهو) ای ذلك الشئی۔**

حظه:اس کا نصیب ہے جیسا کہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے: **انما لکل امری مانوی**، پس اس حدیث میں تشبیہ ہے کہ مسجد میں آتے وقت نیت صحیح ہو تا کہ کہیں دنیوی عرض کے ساتھ مختلط نہ ہو جائے جیسا کہ دوستوں کے ساتھ مصاحبت اور چلنے کی نیت بلکہ اعتکاف، خلوت' گوشہ نشینی، عبادت، اللہ کے گھر کی زیارت اور علمی استفادہ وافادہ اور اس طرح کے اُمور کی نیت کرے۔

رواہ ابوداود:میرکؒ نے کہا کہ امام ابوداؤدؒ نے اس پر خاموشی اختیار کی ہے اور اس کی اسناد میں عثمان بن ابی العاتکہ ہے۔منذریؒ نے فرمایا کہ اس کو بعض علماء نے ضعیف قرار دیا ہے، ذہبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس کو نسائی وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔واللہ اعلم

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جو مساجد سے الفت رکھے اللہ عزوجل اس سے الفت رکھے گا اور یہ بھی حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ میرے گھر میری زمین میں مساجد ہیں، اور اس میں سے میری زیارت کرنے والے وہ ہیں جو اس کو آباد کرنے والے ہیں، پس خوشخبری اس بندے کیلئے کہ جس نے گھر میں پاکی حاصل کی پھر میرے گھر میں میری زیارت کی پس مزور (میزبان) پر ضروری ہے کہ وہ اس زائر کا اکرام کرے اور یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ عزوجل ارشاد فرمائیں گے کہ میرے پڑوسی کہاں ہیں' میرے پڑوسی کہاں ہیں، پس فرشتے کہیں گے اے ہمارے ربّ کس کیلئے مناسب ہے کہ آپ کا پڑوسی بنے پس اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ مساجد کی زیارت (اور آباد) کرنے والے کہاں ہیں۔

مسجد کے اندر جاتے اور باہر آتے وقت کی تسبیحات

۷۳۱: وَعَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ الْحُسَيْنِ عَنْ جَدَّتِهَا فَاطِمَةَ الْكُبْرٰى قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا دَخَلَ الْمَسْجِدَ صَلّٰى عَلٰى مُحَمَّدٍ وَسَلَّمَ وَقَالَ رَبِّ اغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ وَافْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ وَاِذَا

خَرَجَ صَلّٰی عَلٰی مُحَمَّدٍ وَسَلَّمَ وَقَالَ رَبِّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ فَضْلِكَ (رواه الترمذی واحمد وابن ماجة وفی روایتهما) قَالَتْ اِذَا دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَكَذَا اِذَا خَرَجَ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ بَدَلَ صَلّٰی عَلٰی مُحَمَّدٍ وَسَلَّمَ وَقَالَ الترمذی لَیْسَ اِسْنَادُهٗ بِمُتَّصِلٍ وَفَاطِمَةُ بِنْتُ الْحُسَیْنِ لَمْ تُدْرِكْ فَاطِمَةَ الْكُبْرٰی۔

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/۱۲۷ حدیث رقم ۳۱۴ وقال حدیث حسن ولیس إسناده بمتصل ۔وأخرجه أحمد فی المسند ۶/۲۸۲ ۔وابن ماجة فی السنن ۱/۲۵۳ حدیث رقم ۷۷۱۔ وذکر بسم اللّٰه والسلام علی رسول اللّٰه۔

ترجمہ: ''سیدہ فاطمہ بنت حسین اپنی دادی فاطمہ کبریٰ سے روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد میں تشریف لاتے تو محمد ﷺ پر درود وسلام بھیجتے اس کے بعد یہ دعا پڑھتے: رَبِّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ۔ اے میرے رب میرے گناہ بخش دے اور میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے اور جب مسجد سے باہر آتے تو محمد ﷺ پر درود وسلام بھیج کر اس طرح دعا پڑھتے رَبِّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ فَضْلِكَ اے میرے رب میرے گناہ بخش دے اور میرے لئے اپنے فضل کے دروازے کھول دے یہ روایت ترمذی' احمد' ابن ماجہ نے نقل کی ہے اور احمد' ابن ماجہ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب رسول اللہ مسجد میں داخل ہوتے اور اسی طرح جب باہر نکلتے تو: صلی علی محمد وسلم کی بجائے یہ الفاظ فرماتے بسم اللّٰه والسلام علی رسول اللّٰه میں اللہ کے نام سے داخل ہوتا ہوں اور نکلتا ہوں اور سلامتی ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔''

اسنادی حیثیت: امام ترمذی کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند متصل نہیں کیونکہ حضرت حسین کی دختر فاطمہؓ نے سیدہ فاطمہ بنت زہرا بنت رسول اللہ ﷺ کا زمانہ نہیں پایا اور نہ ان سے ملاقات ہوئی۔

تشریح: عن جدتها فاطمة الكبرٰی: یعنی بتول فاطمۃ الزہراءؓ جو حضور ﷺ کی صاحبزادی ہیں ان کو کبریٰ ان کی شان وفضیلت کی وجہ سے کہا۔

اذا دخل المسجد صلی علی محمد وسلم: اس میں دونوں احتمال ہیں کہ داخل ہونے سے پہلے یہ پڑھتے یا داخل ہونے کے بعد لیکن پہلا معنی زیادہ بہتر ہے پھر اس کی حکمت اُمت کو تعلیم دینے کے بعد یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ پر اپنی ذات پر ایمان لانا بھی واجب ہے جیسا کہ دوسروں پر آپ ﷺ کی ذات پر ایمان لانا واجب ہے، پس جس طرح اوروں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ حضور ﷺ کی ذاتِ قدس پر درود بھیجیں اسی طرح آپ ﷺ سے آپ کی ذات کی تعظیم کا مطالبہ کیا گیا اپنی ذات پر درود بھیج کر۔ (یعنی آپ ﷺ بھی اپنی ذات پر درود پڑھیں)۔

وقال رب: اور سابقہ روایت میں اللّٰهم ہے پس یہ سارے ہی الفاظ مسنون ہیں اللّٰهم ہو یا رب ہو۔ (وافتح لی ابواب رحمتك) اور مغفرت کو وافتح لی پر مقدم کرنے میں ایسا نکتہ ہے جو کہ کسی پر مخفی نہیں ہے۔

رب اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابواب فضلك: علامہ طیبیؒ کے حوالے سے پہلے نکتہ گزر چکا ہے کہ دخول میں رحمت اور نکلنے میں فضل کے ذکر کا فرق کیوں کیا ہے۔ اور میرے دِل میں بھی ایک نکتہ کھٹکتا ہے، واللہ اعلم۔ ممکن ہے شاید یہی نکتہ ہو وہ یہ

کہ داخل ہونے والا جب عبادت کی جانب متوجہ ہوتا ہے، تو وہ اس رحمت کا طالب ہوتا ہے جو اس عبادت سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ اللہ کی رحمت محسنین کے قریب ہے اور جب نکلتا ہے تو اُمور مباحہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، پس اس وقت مناسب یہی ہے کہ یہ آدمی فضل ربی کو طلب کرے کیونکہ نہ تو کوئی فعل عبادت ہے اور نہ ہی کوایسا سبب ہے جو رحمت وعنایت کا پیدا کرنے والا ہو (لہٰذا فضل کو اللہ سے مانگنا اس حال کے مناسب ہے)۔

وقال الترمذی لیس اسنادہ بمتصل : وہ اس لئے کہ فاطمہ صغریٰ بنت حسین بن علی اس حدیث کو اپنی دادی فاطمۃ الکبریٰ سے روایت کررہی ہیں اور حالانکہ فاطمہ صغریٰ نے اپنی دادی کو نہیں پایا۔

وفاطمہ بنت الحسین لم تدرك فاطمة الکبریٰ: یہ جملہ حالیہ ہے، یا مستانفہ ہے اور عدم اتصال کو بیان کرنے والا ہے۔ اور شیخ جزریؒ نے فرمایا ہے کہ فاطمہ صغریٰ نے اس روایت کو اپنے والد کے حوالے سے فاطمہ کبریٰ سے سنا ہے (یعنی حضرت حسین نے فاطمۃ الکبریٰ اپنی والدہ سے اور حضرت حسین سے ان کی بیٹی فاطمہ صغریٰ نے) اس کو ابن مردویہ نے باب الدعا میں اپنے مصنف کے اندر روایت کیا ہے۔ اور بعض حضرات کے بارے میں میرا یہ گمان ہے کہ انہوں نے اس کو موصول قرار دیا ہے۔ میرکؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

مساجد میں ممنوع کئے گئے کام

۷۳۲: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ تَنَاشُدِ الْاَشْعَارِ فِي الْمَسْجِدِ وَعَنِ الْبَيْعِ وَالْاِشْتِرَاءِ فِيْهِ وَاَنْ يَّتَحَلَّقَ النَّاسُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ قَبْلَ الصَّلَاةِ فِي الْمَسْجِدِ.

(رواہ ابوداود والترمذی)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ١/٦٥١ حديث رقم ١٠٧٩۔ وأخرجه الترمذی فی السنن ٢/١٣٩ حديث رقم ٣٢٢ وقال حديث حسن ۔ وأخرجه النسائی مختصرًا فی السنن ٢/٤٧ حديث رقم ٧١٤۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن مختصرًا ولم يذكر التحلق يوم الجمعة ١/٢٤٧ حديث رقم ٧٤٩۔

ترجمہ: اور عمرو بن شعیبؒ اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجدوں میں اشعار پڑھنے' خرید وفروخت کرنے اور جمعہ کے روز نماز سے پہلے لوگوں کو حلقہ باندھ کر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔

(ابوداوٗد' ترمذی)

تشریح: عن جدہ یعنی عبداللہ ابن عمرو بن العاص۔ (تناشد الاشعار) یعنی مذموم اشعار۔

فی المسجد: علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ تناشد یہ ہے کہ ہر ایک اپنے ساتھی کو اپنے بارے میں یا اپنے علاوہ کسی اور کے بارے میں بطور فخر ومقابلے کے کوئی شعر سنائے یا بطور تفریح وقت گزارنے کیلئے ایسے اشعار پڑھنا کہ جس سے آدمی خوش ہو اور نفوس اس کی طرف مائل ہوں، پس یہ بات قابل مذمت ہے۔ باقی اگر اشعار حق اور اہل حق کی مدح میں یا باطل اور اہلِ باطل کی مذمت میں ہوں یا ان اشعار میں قواعدِ دین کی تمہید ہو یا دین کے مخالفین کا رد ہو، تو وہ اس مذمت سے خارج ہیں۔ اگرچہ اس

میں تشبیب بھی ملی ہوئی ہو (تشبیب کہتے ہیں کہ شعراء اشعار کے شروع میں اپنی جوانی وکھیل کود یا عورتوں کے محاسن وصفات کو ذکر کریں) اور تحقیق حضور ﷺ کے سامنے اس دوسری قسم کے اشعار کا پڑھنا ثابت ہے اور حضور ﷺ اس سے منع نہیں فرماتے تھے کیونکہ آپ ﷺ کو غرض صحیح کا علم تھا۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

اور ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ' کہ نہی یہاں شعر حسن کے علاوہ کے ساتھ خاص ہے اس لئے کہ حضرت حسانؓ مسجد میں حضور ﷺ کی موجودگی میں آپ کو اشعار سناتے تھے اور آپ ﷺ اس کو اچھا سمجھتے تھے اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات صحیح طریق سے ثابت ہے کہ حضرت حسانؓ اور کعب بن زہیر مسجدِ نبوی میں حضور ﷺ کی موجودگی میں اشعار سناتے تھے ایک مرتبہ حضرت عمرؓ گزرے اور حضرت حسانؓ مسجد میں شعر سنا رہے تھے تو حضرت عمرؓ نے ان کو آنکھوں کے کناروں سے دیکھا (یعنی اس بات کو معیوب سمجھا) تو حضرت حسانؓ نے فرمایا کہ میں اس وقت بھی اسی طرح شعر سناتا تھا جبکہ آپ سے بہتر اس جگہ ہوتے تھے (یعنی حضور ﷺ) پھر حضرت حسانؓ، حضرت ابو ہریرہؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا میں تجھے قسم دیتا ہوں کیا تو نے حضور ﷺ سے یہ سنا ہے کہ حضور ﷺ یہ کہہ رہے ہوں: **اجب عنی اللھم ایدہ بروح القدس** اے حسان میری طرف سے جواب دے، اے اللہ حسان کی روح القدس (جبرئیل) کے ذریعے مدد فرما، تو ابو ہریرہؓ نے فرمایا: **اللھم نعم**۔ ہاں ایسے ہی ہے۔

اور امام احمدؒ نے اپنی مسند میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ شعر کلام کی طرح ہے اچھے اشعار اچھے کلام کی طرف ہیں اور قبیح اشعار قبیح کلام کی طرح ہیں اور اسی پر حضور ﷺ کا یہ ارشاد بھی محمول کریں جس میں یہ آتا ہے کہ آدمی اپنا پیٹ پیپ وغیرہ سے بھرے یہ بہتر ہے اس سے کہ وہ اپنے پیٹ کو اشعار سے بھرے اور اسی طرح اس ارشاد کو بھی کہ جس میں آیا ہے کہ جس کو تم دیکھو کہ وہ مسجد میں شعر سنا رہا ہے تو تم کہو: **فض اللہ فاك** (اللہ تمہارے دانت گرادے) تین مرتبہ۔ ابن سنی نے اُس کو روایت کیا ہے۔

وعن البیع والاشتراء: اور ہمارے علماء نے معتکف کیلئے بغیر مبیع حاضر کرنے کے خریدنے کو جائز قرار دیا ہے اور انتہائی قبیح قسم کی بدعات میں سے بیت اللہ کے غلاف مقامِ ابراہیم کے پیچھے بیچنا ہے اور کتابوں وغیرہ کو مسجدِ حرام میں بیچنا ہے اور اس سے بھی قبیح عورتوں کی پالکی تخت رواں (اسٹریچر) اور مشکیزوں اور ردی سامان کو مسجدِ حرام میں رکھنا ہے خصوصاً موسم حج کے ایام میں اور بھیڑ کے وقت۔ **واللہ ولی امر دینہ ولا حول ولا قوہ الا باللہ**۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اسی طرح مسجد میں کسی پیشے کیلئے بیٹھنا بھی مکروہ ہے مگر علومِ شرعیہ کی کتابوں کا لکھنا اور اس کے آلات (فنون) وغیرہ کی کتب کا لکھنا مکروہ نہیں ہے۔ اور اگر کبھی مسجد میں کپڑے سلائی کرے تو کوئی حرج نہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک درزی کو کپڑے سلائی کرتے مسجد میں دیکھا تو اس کو مسجد سے نکالنے کا حکم دیا کسی نے کہا اے امیر المومنین یہ مسجد میں جھاڑو دیتا ہے اور دروازہ بند کرتا ہے تو حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: **جنبوا صناعکم مساجدکم**۔ ''اپنے کاریگروں سے اپنی مساجد کو بچاؤ (یعنی یہاں پر کسی کو اپنا پیشہ کرنے کی اجازت نہیں)''۔ عبدالحقؒ نے اس کو روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے۔

اور عطاء بن یسارؒ جب کسی ایسے آدمی کے پاس سے گزرتے جو مسجد میں خرید وفروخت کر رہا ہو تو فرماتے اے! تو دنیا کے

بازار میں جایہ تو آخرت کا بازار ہے اور عمرؓ نے مسجد نبوی میں ایک آدمی کی بلند آواز سنی تو فرمایا تجھے پتہ ہے کہ تو کہاں پر ہے۔

وان يتحلق الناس يوم الجمعة قبل الصلاة فى المسجد: یعنی حضور ﷺ نے منع فرمایا اس بات سے کہ لوگ حلقے کی صورت میں بیٹھیں۔ کہا جاتا ہے تحلق القوم جبکہ وہ حلقے' حلقے کی صورت میں بیٹھ جائیں اور نہی کی علت ہے یہ کہ لوگ جب حلقوں کی صورت میں بیٹھ جاتے ہیں تو پھر اکثر یہی ہوتا ہے کہ وہ آپس میں بات چیت شروع کر دیتے ہیں اور آوازیں بلند ہو جاتی ہیں اور جب وہ اس طرح کریں گے تو وہ خطبہ توجہ سے نہیں سن سکتے حلانکہ ان کو خطبہ سننے کا مامور بنایا گیا ہے۔ بعض حضرات نے اسی طرح فرمایا ہے۔

اور علامہ تورپشتیؒ نے فرمایا ہے کہ' کہ نہی یہاں پر دو معنوں کا احتمال رکھتی ہے: ① یہ صورت وہیئت نمازیوں کے اجتماع کے مخالف ہے۔ ② جمعہ کیلئے جمع ہونا یہ بڑا عظیم الشان عمل ہے۔ جو جمعہ میں حاضر ہوئے اس کے لئے گنجائش نہیں کہ کسی اور کام میں لگے یہاں تک کہ اس سے فارغ ہو جائے اور نماز سے پہلے جمعے کے دِن لوگوں کا حلقے بنانا اس امر (جمعہ) میں غفلت کو پیدا کر سکتا ہے کہ جس کے لئے ان کو بلایا گیا ہے۔

اور شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ حدیث میں نمازِ جمعہ سے پہلے حلقے بنانے کا مکروہ ہونا علمی مذاکرے کیلئے ہے یعنی اس وقت علمی مذاکرہ میں نہ لگیں بلکہ نماز اور ذکر میں لگیں اور خطبہ کیلئے خاموشی اختیار کریں جمعہ کے بعد حلقے بنانے میں کوئی حرج نہیں۔

اور احیاء میں لکھا ہے کہ نماز سے پہلے حلقوں کی صورت میں بیٹھنا مکروہ ہے۔

خطابیؒ نے فرمایا ہے کہ بعض حضرات اس روایت کو نهى عن الحلْق (لام کے سکون کے ساتھ) روایت کرتے رہے یعنی حضور ﷺ نے نمازِ جمعہ سے پہلے حلق کروانے کو مکروہ قرار دیا ہے اور مجھے اس آدمی نے یہ بتلایا کہ میں ۴۰ سال سے نمازِ جمعہ سے پہلے سر کو منڈاتا نہیں ہوں پس میں نے کہا یہ حلَق لام کے فتحہ کے ساتھ حلقہ کی جمع ہے۔

رواه ابوداود والترمذى: اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے اور ابن ماجہ نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ (ذکرہ میرک)

مساجد میں بیع اور گمشدگی کے اعلانات کی ممانعت

۷۳۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَأَيْتُمْ مَنْ يَّبِيْعُ اَوْ يَبْتَاعُ فِي الْمَسْجِدِ فَقُوْلُوْا لَا اَرْبَحَ اللّٰهُ تِجَارَتَكَ وَاِذَا رَأَيْتُمْ مَنْ يَّنْشُدُ فِيْهِ ضَالَّةً فَقُوْلُوْا لَارَدَّهَا اللّٰهُ عَلَيْكَ۔

(رواه الترمذى والدارمى)

أخرجه الترمذى فى السنن٣/٦١٠ حديث رقم ١٣٢١ وقال حسن غريب وأخرجه الدارمى فى السنن ١/٣٧٩ حديث رقم ١٤٠١۔

ترجمہ: ''اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''جب تم مسجد میں کسی شخص کو خرید و فروخت کرتے ہوئے دیکھو تو کہو اللہ کرے تیری اس سوداگری میں نفع نہ ہو اور جب تم کسی شخص کو بلند آواز

سے گم شدہ چیز ڈھونڈتے ہوئے دیکھو تو کہو اللہ کرے تیری یہ چیز نہ ملے۔" (ترمذی، دارمی)

تشریح: فی المسجد: یہاں مفعول محذوف ہے اور یہ حذف مفعول عموم پر دلالت کرتا ہے پس یہ ثوب کعبہ اور قرآن مجید اور تسبیحات وغیرہ کی بیوع کو شامل ہے۔

فقولوا: یعنی ان دونوں میں سے ہر ایک کیلئے جہری طور پر یا آہستہ سے دِل میں۔ (**لا اربح اللہ تجارتك**) یہ بدعا ہے یعنی اللہ تیری تجارت کو نفع و فائدے والا نہ بنائے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ: ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ﴾ [البقرة: ١٦] "نہ تو ان کی تجارت ہی نے کچھ نفع دیا" ہے اور اگر ایک ساتھ: **لا اربح اللہ تجارتکما** دونوں کو کہہ دے تو بھی جائز ہے مقصود کے حصول کی وجہ سے۔

فقولوا لا رد اللہ علیك: اور ایک روایت میں **لا ردھا اللہ علیك** ہے۔ یہ بدعا اس لئے ہے کہ اس میں بے ادبی ہے مسجد میں اونچی آواز سے گمشدہ کو طلب کر رہا تو اس نے نمازیوں کے خشوع و خضوع کو خراب کر دیا یا معتکفین کے ذِکر یا ان کی حضوری کو یا ان کے قال کو یا حال مشوش کر دیا۔

رواہ الترمذی: اور ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ میرکؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔ (**والدارمی**) اور احمدؒ نے بھی اس کو نقل کیا ہے اور امام نسائیؒ نے عمل الیوم واللیلہ میں اور ابن حبان نے اور خزیمہ نے اور حاکمؒ نے اور فرمایا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے مسلم کی شرط پر۔ میرکؒ نے اس کو ذکر کیا ہے۔ اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس کا دوسرا حصہ مسلم کے حوالے سے گزر چکا ہے۔

مساجد میں حدود قائم کرنے کی ممانعت کا بیان

۷۳۴: وَعَنْ حَکِیْمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْ یُّسْتَقَادَ فِی الْمَسْجِدِ وَاَنْ یُّنْشَدَ فِیْهِ الْاَشْعَارُ وَاَنْ تُقَامَ فِیْهِ الْحُدُوْدُ .

(رواہ ابوداود فِیْ سُنَنِهٖ وَصَاحِبُ جَامِعِ الْاُصُوْلِ فِیْهِ عَنْ حَکِیْمٍ)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ٤/٦٢٩ حدیث رقم ٤٤٩٠۔ وأخرجه أحمد مختصراً فی مسنده ٣/٤٣٤۔

ترجمہ: "اور سیدنا حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں قصاص لینے، اشعار پڑھنے اور حدود کے قائم کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد) اور اس روایت کو صاحب جامع الاصول نے اپنی کتاب جامع الاصول میں حکیم سے یعنی بغیر لفظ ابن حزام کے روایت کیا ہے۔"

راویٔ حدیث:

حکیم بن حزام۔ یہ حکیم بن حزام ہیں ان کی کنیت "ابو خالد قریشی اسدی" ہے۔ یہ حضرت امّ المؤمنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے ہیں۔ واقعہ فیل سے تیرہ سال قبل "کعبہ" میں پیدا ہوئے۔ یہ قریش کے بڑے لوگوں میں ہوئے ہیں۔ جاہلیت اور اسلام دونوں دور میں ان کی عزت کی گئی ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ ۵۴ھ میں اپنے مکان کے اندر مدینہ میں وفات پائی

ان کی عمر ایک سوبیس (۱۲۰) سال کی ہوئی۔ ساٹھ (۶۰) سال جاہلیت میں گزارے اور ساٹھ (۶۰) سال زمانہ اسلام میں زندگی پائی۔ یہ بڑے بزرگ، سمجھدار، فاضل متقی صحابہ میں سے ہیں۔ ان کا اسلام بہت اچھا (مخلصانہ) تھا۔ حالانکہ یہ ابتداء میں مؤلفۃ القلوب میں سے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں سو غلاموں کو آزاد کیا اور سو اونٹ سواری کے لئے بخشے۔ ان سے ایک جماعت نے روایت حدیث کی ہے۔

''حزام'' حاء مہملہ کے کسرہ اور زاء معجمہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: ''حکیم بن حِزام'' حاء کے کسرہ اور زاء کے ساتھ یہ یہ ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بھتیجے ہیں۔ طیبیؒ نے طرح ذکر کیا ہے۔

ان یستقاد: ای یطلب القود : یعنی قصاص مسجد میں لیا جائے یعنی مقتول کے بدلے میں قاتل کو قتل کرنا۔ (**فی المسجد**) تا کہ خون کے قطرات ارض مسجد میں نہ گریں اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ قصاص لینا مکروہ ہے اگر نجاست زمین کو نہ پہنچتی ہو ورنہ حرام ہے۔

فیه الحدود: یعنی تمام حدود یہ تخصیص کے بعد تعمیم یعنی وہ حدود جو اللہ یا بندے کے متعلق ہیں اس لئے کہ اس میں مسجد کی بے حرمتی ہے اور مسجد کے خون ونجاست وغیرہ سے بھر جانے کا احتمال ہے (یعنی قصاص یا حدود میں خون مسجد میں گرے گا) اور ابن ابی یعلی کا یہ کہنا کہ حدود کو مسجد میں قائم کیا جائے یہ ان کا قول شاذ ہے۔ ابن حجرؒ نے اسی طرح کہا ہے۔ ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ وجہ یہ ہے کہ تا کہ مسجد اس سے آلودہ نہ ہو جائے اور شرح السنۃ میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ اس شخص کے بارے میں کہ جس پر مسجد میں حد لازم ہوگئی تھی فرمایا کہ اس کو مسجد سے نکالو اور حضرت علیؓ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔

رواه ابوداود فی سننه : کتاب الحدود کے آخر میں طیبیؒ نے کہا ہے اور منذریؒ نے فرمایا ہے اس کی اسناد میں عبداللہ بن مہاجر ہے اور شعیبی بصری دمشقی ہے بعض حضرات نے شعیبی بصری کو ثقہ قرار دیا ہے اور ابو حاتم رازیؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی حدیث کو لکھا جائے گا لیکن اس سے استدلال نہیں کیا جائے گا میرکؒ نے اس کو نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اصحاب سنن نے اس سے روایت کی ہے۔

وصاحب جامع الاصول فیه: ای الجامع۔

عن حکیم: یہ رواہ سے متعلق ہے ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی سند میں محمد بن عبداللہ الشعیبی ہیں۔ ابو حاتم نے کہا ہے کہ **یکتب حدیثه ولا یحتج به** نیز اس میں زفر بن وثیمہ بھی ہے ابن القطان نے اس کو مجہول قرار دیا ہے اور ابن حزم نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے اور خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ حدیث حسن ہے جیسا کہ بعض حفاظِ حدیث نے کہا ہے۔

۷۳۵: وَفِی الْمَصَابِیْحِ عَنْ جَابِرٍ۔

مصابیح السنۃ ۱ / ۲۹۷ حدیث رقم ۲۵۰

ترجمہ: مصابیح میں حضرت جابر سے (بھی) مروی ہے۔

تشریح: وفی الصابیح عن جابر : علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ اصول میں حضرت جابر سے روایت مصابیح میں نہیں

پائی گئی اور میرکؒ نے فرمایا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ حکیم بن حزام سے روایت ہے۔

کچا لہسن اور پیاز کھا کر مساجد آنے کی ممانعت

٧٣٦: وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ قُرَّةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ هَاتَيْنِ الشَّجَرَتَيْنِ يَعْنِي الْبَصَلَ وَالثَّوْمَ وَقَالَ مَنْ اَكَلَهُمَا فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا وَقَالَ اِنْ كُنْتُمْ لَابُدَّ آكِلِيْهِمَا فَاَمِيْتُوْهُمَا طَبْخًا۔

(رواه ابو داؤد)

أخرجه أبو داؤد في السنن ٤/٢٧٢ حديث رقم ٣٨٢٧۔ وأخرجه أحمد في المسند ٤/١٩۔

ترجمہ: ''اور سیدنا معاویہ بن قرہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو درختوں یعنی پیاز اور لہسن (کے استعمال) سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے جو شخص ان کو کھائے وہ ہماری مساجد میں نہ آئے۔ نیز فرمایا کہ اگر ان کا کھانا ضروری سمجھو تو ان کو پکا کر ان کی بدبو کو دور کر دو پھر کھالو۔'' (ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

معاویۃ بن قرۃ۔ یہ معاویہ ہیں۔ قرہ کے بیٹے ہیں۔ ''ابوایاس'' کنیت ہے۔ بصرہ کے باشندے ہیں۔ اپنے والد سے اور انس بن مالک و عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہم سے حدیث کی سماعت کی۔ ان سے قتادہ، شعبہ اور اعمش نے روایت کی۔ ایاس میں ہمزہ مکسور، دو نقطوں والی یاء غیر مشدد ہے۔

هاتين الشجرتين: یہ اشارہ ہے اس چیز کی طرف جو اس جیسی دوسری چیزیں جیسے ذہن میں ہے۔ (**يعني البصل والثوم**) اور ممکن ہے کہ یہ دونوں مجلس میں موجود ہوں۔ پس یہ اشارہ حسیہ ہوگا۔ (**من اكلهما**) اور اس جیسی دوسری چیزیں جیسے گیندنا اور مولی (گیندنا پیاز لہسن کے مشابہ ہوتی ہے)۔ (**فلا يقربن مسجدنا**) یعنی ہماری ملت کی مسجد کے یعنی جب تک وہ خبیث بو اس کے ساتھ ہوگی اور اس کی علت پہلے گزر چکی ہے کہ جن چیزوں سے انسانوں کو تکلیف ہوتی ہے انہی چیزوں سے فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے اور اس حدیث میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ مسجد اگرچہ لوگوں سے خالی ہو تو فرشتوں سے تو خالی نہیں ہوتی (اس لئے خالی مسجد میں بھی نہیں جانا چاہیے ان چیزوں کو کھا کر)۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ جملہ پہلے جملے کیلئے بیان کی طرح ہے تو یہ بیان اس کا فائدہ دیتا ہے کہ تقدیر عبارت یوں ہے: **نهى عن اكلهما** اور یہ بھی فائدہ دیتا ہے کہ ان دونوں کے کھانے سے نہی کی شرط اس کا داخل ہونے کے ارادے سے ملا ہوا ہونا ہے اس طرح کہ ان کی بدبو بھی باقی ہو اور باقی اس نیت کے بغیر کھانا تو وہ اس نہی کے تحت داخل نہیں ہوگا اور قریب نہ جانے کی جانے سے اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ داخل ہونے سے نہی بطریق اولیٰ ہے۔

(**لا بد**) یعنی اگر تمہیں اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو اور تم اس کو استعمال کیے بغیر نہ رہو شدید ضرورت یا ان کی کھانے کی شدید خواہش کی بناء پر۔ یہ جملہ، جملہ معترضہ ہے جو کَانَ کے اور اس کی خبر (**اكلهما**) کے درمیان میں ہے۔ یعنی تم مسجد میں

داخل ہونے کا ارادہ رکھتے ہو (اور کھانے کی بھی شدید حاجت ہو)۔

فامیتو هما طبخا: اماتت یہ عبارت ہے ان دونوں کی بد بو کی قوت کو زائل کرنے سے یعنی پکانے کے ساتھ ان کی بو کو ختم کرو اور اسی کے حکم میں ہے بو کو پکانے کے علاوہ ختم کرنا۔ طبخ کا ذکر یہ بطور قید اتفاقی کے ہے۔

رواه ابوداود: اور امام ابوداؤدؒ نے اس پر خاموشی اختیار کی ہے اور نسائی نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ (قالہ میرکؒ)

قبر اور نہانے کی جگہ پر نماز پڑھنے کی ممانعت کا بیان

۷۳۷: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدٌ اِلَّا الْمَقْبُرَةَ وَالْحَمَّامَ . (رواه ابوداود والترمذی والدارمی)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۳۳۰حديث رقم ۴۹۲ ـوأخرجه الترمذی فی السنن۲/۱۳۱حديث رقم ۳۱۷وقال فيه اضطراب ـوأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۲۴۶حديث رقم ۷۴۵ـوأخرجه الدارمی فی السنن ۱/۳۷۵ حديث رقم ۱۳۹۰ـ

ترجمه: ''اور سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مقبرہ اور حمام کے علاوہ ساری زمین مسجد ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ تھا کہ ہر جگہ نماز پڑھی جا سکتی ہے''۔

تشریح: الارض کلها مسجد: یعنی اس میں بغیر کراہت کے سجدہ کرنا جائز ہے۔ **(الا المقبره)** مقبرہ، باء کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ ہے اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ تینوں حرکتوں کے ساتھ ہے۔ اور قاموس میں لکھا ہے کہ مقبرہ ''باء'' کی تینوں حرکات کے ساتھ ہے جیسے مَكْنَسَةٌ۔ قبروں کی جگہ کو مقبرہ کہتے ہیں۔ اس کا حکم پہلے گزر چکا ہے۔

الحمام: ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ ان دونوں میں نماز مکروہ ہے اور شارح منیہ نے فرمایا ہے کہ' کہ فتاویٰ میں ہے کہ مقبرہ میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں جبکہ اس میں کوئی جگہ نماز کیلئے بنائی گئی ہو اور اس جگہ میں قبر نہ ہو۔

رواه ابوداود والترمذی: اور ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں اضطراب ہے ارسال اور اسناد کی حیثیت میں اور کہا ہے کہ سفیان ثوری نے اس کو مرسلاً نقل کیا ہے اور یہی روایت زیادہ صحیح اور ثابت ہے۔ اور تحقیق امام ابوداؤدؒ نے اس کو مسنداً روایت کیا ہے اور جس نے اس کو مرفوعاً (موصولا) نقل کیا ہے وہ بھی ثقہ ہے۔ پس ارسال اس حدیث کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ میرکؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ **(والدارمی)** ابن حجرؒ نے اور ابن ماجہؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی سند حسن ہے۔

سات ایسے مقامات کا بیان جہاں نماز کی ممانعت ہے

۷۳۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ یُّصَلّٰى فِیْ سَبْعَةِ مَوَاطِنَ فِی الْمَزْبَلَةِ وَالْمَجْزَرَةِ وَالْمَقْبُرَةِ وَقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ وَفِی الْحَمَّامِ وَفِیْ مَعَاطِنِ الْاِبِلِ وَفَوْقَ ظَهْرِ بَيْتِ اللّٰهِ .

(رواه الترمذی وابن ماجة)

أخرجه الترمذي في السنن ۲/۱۷۷ حديث رقم ۳۴۶ وقال إسناده ليس بذاك القوی۔ وأخرجه ابن ماجة في السنن ۱/۲۴۶ حديث رقم ۷۴۶۔

ترجمہ: ''اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سات مقامات پر نماز پڑھنا ممنوع ہے: ① وہ جگہ جہاں ناپاک چیزیں ڈالی جاتی ہوں ② جہاں جانور ذبح کئے جاتے ہوں ③ مقبرہ ④ راستہ کے درمیان ⑤ حمام کے اندر ⑥ اونٹوں کے باندھنے کی جگہ (باڑہ) ⑦ بیت اللہ کی چھت۔'' (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: في المزبلة: باء کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ باء کے ضمہ کے ساتھ ہے وہ جگہ کہ جہاں گوبر، لید اور اس طرح کی دوسری نجاستیں پڑی ہوں۔ (والمجزرة) زاء کے کسرہ کے ساتھ اور فتحہ بھی دیا جاتا ہے۔ صحاح میں لکھا ہے مجزِرہ زاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ عسقلانیؒ نے فرمایا ہے کہ اس کا فتحہ بھی جائز ہے۔ ابن حجرؒ نے فتحہ پر اقتصار کیا ہے اور یہ صحیح روایت اور صحیح نسخوں کے خلاف ہے، اس سے مراد وہ جگہ کہ جہاں پر اونٹ کو نحر کیا جاتا ہے۔ اور گائے، بیل بکری وغیرہ کو ذبح کیا جاتا ہے اس سے منع فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ اس جگہ خون اور گوبر اور لید وغیرہ ہوتی ہے۔

والمقبره وقارعة الطريق: قارعۃ الطریق میں اضافت بیان کیلئے ہے ای وسطه مراد اس سے وہ راستہ ہے کہ جس کو لوگ اور چوپائے اپنے پاؤں کے ساتھ روندتے ہیں یہاں ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ آدمی حق سے ہٹ کر مخلوق میں مشغول ہو جاتا ہے اس وجہ سے بعض حضرات نے کہا کہ راستہ کی ممانعت کا تعلق آبادی میں ہے نہ کہ صحرا میں۔

وفي الحمام: کیونکہ حمام نجاست اور شیطان کی آماجگاہ ہے یہ حمیم سے ماخوذ ہے اور حمیم گرم پانی کو کہتے ہیں اور اسی سے مسلخہ کپڑے اتارنے کی جگہ ہے اور یہاں یہ علت بیان کرنا کہ ممانعت اس لئے ہے کہ حمام میں لوگوں کا داخل ہونا اس کو مشغول کر دے گا یہ علت جامع نہیں ہے۔ پس اس کی طرف دیکھا بھی نہیں جائے گا۔ ابن حجرؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے اور ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ اعتبار اکثریت کا ہے۔

وفي معاطن الابل: یہ عطن کی جمع ہے اور عطن کہتے ہیں اونٹ کا پانی کے ارد گرد بیٹھنا، علامہ طیبیؒ نے یہ فرمایا ہے۔ ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ یہ معطِن طاء کے کسرہ کے ساتھ ہے وہ جگہ کہ جہاں اونٹ پانی پی کر آ کر بیٹھیں اور اس کا استعمال اس جگہ میں بھی ہوتا ہے جہاں پر اونٹ رات کے وقت ٹھہرتے ہیں اور اس کی تائید مسلم کی حدیث سے ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے بیٹھنے کی جگہ میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا اور فرمایا اس لئے کہ یہ جگہیں نجاست والی ہیں، پس اگر اس میں بغیر مصلےٰ (وقالین) کے نماز پڑھی تو اس کی نماز باطل ہوگئی اور مصلےٰ وغیرہ کے ساتھ بھی مکروہ ہے بدبو کی وجہ سے اور یہ اس وقت ہے کہ جب اس میں اونٹ نہ ہوں اور جب اس میں اونٹ ہوں تو اس وقت نماز مطلقاً مکروہ ہے ان کے بدکنے اور سرکش ہونے کی شدت کی وجہ سے۔

وفوق ظهر بيت الله: اس لئے کہ کعبہ کی سطح کی طرف نفس ارتقاع مکروہ ہے کعبہ پر بلندی کی وجہ سے جو کہ ادب کے منافی ہے۔ ابن الملکؒ نے فرمایا کہ فوق کے ساتھ ظهر کا لفظ ذکر کیا اس لئے کہ نماز اس جگہ پر مکروہ نہیں ہے جو بیت اللہ سے اوپر اور اونچی ہو جیسے ابوقبیس کا پہاڑ اور فوق کا لفظ ذکر کیا اس لئے کہ دیواریں بھی تمام کی تمام بیت اللہ کا ظہر ہے۔

اور طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ ان سات جگہوں میں نماز پڑھنے سے نہی کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے کہ آیا یہ نہی تحریمی

ہے یا تنزیہی ہے اور جو لوگ تحریم کے قائل ہیں انہوں نے صحت صلوٰۃ کے بارے میں اختلاف کیا ہے اس بنیاد پر کہ نہی فساد پر دلالت کرتی ہے یا نہیں چار اقوال ہیں اور چار مذاہب ہیں: ① مطلقاً فساد پر دلالت کرتی ہے۔ ② مطلقاً دلالت نہیں کرتی۔ ③ عبادات میں دلالت کرتی ہے نہ کہ معاملات میں۔ ④ نہی فساد پر دلالت کرتی ہے جبکہ نہی کا متعلق نفس فعل ہو یا وہ چیز جو لوازم میں سے ہو جیسا کہ عید کے دن کا روزہ اور اوقاتِ مکروہہ میں نماز پڑھنا' سودی بیع اور جب وہ اس طرح نہ ہو تو پھر نہی فساد پر دلالت نہیں کرتی جیسا کہ مغصوبہ زمین میں نماز پڑھنا اور وادی (وادی دو پہاڑوں کے درمیان کی جگہ جو سیلاب کی گزرگاہ ہو) میں، اور اونٹوں کی جگہ میں اور اذان جمعہ کے وقت بیع کرنا۔

رواہ الترمذی اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی اسناد قوی نہیں ہے۔ میرکؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔ **(وابن ماجة)** ابن حجرؒ نے فرمایا کہ اس کی سند حسن ہے۔

اونٹوں کے باڑے میں نماز نہیں پڑھنی چاہئے لیکن بھیڑ' بکری کے پڑھی جاسکتی ہے

۷۳۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلُّوْا فِیْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ وَلَا تُصَلُّوْا فِیْ اَعْطَانِ الْاِ بِلِ . (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/ ۱۸۰ حدیث رقم ۳۴۸۔ وأخرجه ابن ماجة مع زیادة فی السنن ۱/ ۲۵۲ حدیث رقم ۷۶۸۔ و كذلك أحمد فی المسند ۲/ ۴۵۱۔ والدارمی فی السنن ۱/ ۳۷۵ حدیث رقم ۱۳۹۱۔

ترجمہ: ''اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بکریوں کے باندھنے کی جگہ نماز پڑھ لو لیکن اونٹوں کے رہنے کی جگہ مت نماز پڑھو۔'' (ترمذی)

تشریح: فی مرابض الغنم: یعنی مصلےٰ وغیرہ پر جب کہ وہاں پر نماز پڑھنے کی ضرورت ہو اور یہ مربِض کی جمع ہے، مَرْبِض باء کے کسرہ کے ساتھ ہے بکریوں کا باڑہ۔

ولا تصلوا فی اعطان الابل: اعطان، عطن کی جمع ہے اور یہ معطِن کی طرح ہے اور انٹوں کی جگہ اور بکریوں کے باڑے میں جو فرق بیان کیا ہے وہ اس لئے کہ اونٹ بہت زیادہ بدکنے اور بھاگنے والے جانور ہیں، پس نمازی جب اونٹوں کی جگہ میں نماز پڑھے گا تو وہ اس بات سے امن میں نہیں ہوگا کہ اونٹ بدک کر بھاگے اور اس کی نماز کو توڑ ڈالے یا اس کا دِل مشوش ہو جائے جو کہ خشوع وخضوع کے لئے مانع ہے (پس اسی وجہ سے اونٹوں کی جگہ میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا) بخلاف بکریوں کے کہ ان میں یہ چیز نہیں ہوتی۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ اسی کی طرف حضور ﷺ نے اپنے اس ارشاد: **لا تصلوا فی مبارك الابل فانها خلقت من الشیاطین۔** ''کہ اونٹوں کی جگہ میں نماز نہ پڑھو کیونکہ یہ شیاطین سے پیدا کیے گئے ہیں''۔ اور ان حبان نے اس کی تاویل اس طرح کی ہے کہ ان کو شیاطین کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے (یعنی **خلقت من الشیاطین ای معها**) اور یہ کہا ہے کہ ورنہ حضور ﷺ سواری (اونٹ) پر وتر نماز نہ پڑھتے یعنی صحیح علت وہی ہے جو گزری یعنی ان کا بدکنا اور بھاگنا جو کہ باعث ہے قطع

صلوٰۃ کا یا منع خشوع، شیاطین سے پیدا ہونا علت نہیں ہے اور ابل کی وجہ سے غنم (بکریاں) نکل گئیں تو بکریوں کے پاس نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے کیونکہ ان کا بھاگنا بدکنا خشوع کو خراب نہیں کرتا کیونکہ ان کے اندر سکون و عاجزی ہوتی ہے اسی وجہ سے حدیث میں آیا ہے: ما من نبی الا رعی الغنم کہ کوئی بھی نبی ایسا نہیں گزرا کہ جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں اور اس کی تائید امام شافعیؒ کی اس روایت سے ہوتی ہے جس میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم نماز کے وقت کو پاؤ اس حال میں کہ تم بکریوں کے باڑے میں ہو تو وہاں نماز پڑھ لو کیونکہ ان کے اندر سکون اور برکت ہے اور جب تم اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ میں ہو اور نماز کا وقت ہو جائے تو وہاں سے نکل کر نماز پڑھو (وہاں نہ پڑھو) کیونکہ یہ جن ہیں جو جن سے پیدا ہوتے ہیں کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب یہ بدکیں اور بھاگیں تو کیسے اپنے ناک کو تکبر سے چڑھاتے ہیں۔

اور اسی طرح تمام شیاطین کی جگہوں میں نماز پڑھنا مکروہ ہے ان میں سے ایک وہ وادی ہے کہ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صبح کی نماز قضاء ہوگئی تھی جیسا کہ گزر چکا ہے اور ان میں سے ہر وہ جگہ جہاں اللہ کا غضب و عذاب نازل ہوا ہے جیسا کہ قوم ثمود اور بابل کا علاقہ اور قوم لوط کا علاقہ اور وادی محسر اس بناء پر کہ وہاں عذاب نازل ہوا تھا۔ ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ اگر نماز پڑھی اس حال میں کہ جگہ پاک ہو تو اکثر حضرات کے نزدیک یہ صحیح ہے اور بکریوں والے وہ باڑوں کو صاف کرتے ہیں، پس اسی وجہ سے اس میں نماز کو مباح قرار دیا گیا اور یہی امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔

رواہ الترمذی: اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ میرکؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

قبور پر غیر شرعی اعمال سرانجام دینے والے مرد وزن پر پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی لعنت

۷۴۰: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِيْنَ عَلَيْهَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ . (رواہ ابوداود والترمذی والنسائی)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۵۵۸/۳ حديث رقم ۳۲۳۶۔ وأخرجه الترمذي في السنن ۱۳۶/۲ حديث رقم ۳۲۰ وقال حديث حسن۔ وأخرجه النسائي في السنن ۹۴/۴ حديث رقم ۲۰۴۳۔ وأخرج ابن ماجة أوله ۵۰۲/۱۔ حديث رقم ۱۵۷۵۔ وأخرجه أحمد في المسند ۲۲۹/۱۔

ترجمہ: ''سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور قبروں کو سجدہ گاہ بنا لینے والوں پر اور قبروں پر چراغ جلانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔''

(ابوداؤد' ترمذی' نسائی)

تشریح: **لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زائرات القبور:** شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ بعض حضرات نے کہا کہ یہ رخصت سے پہلے کا ارشاد ہے، پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصت دیدی تو اس رخصت میں مرد اور عورت دونوں داخل ہو گئے۔

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ عورتوں کو قبروں کی زیارت کی نہی اب بھی باقی ہے ان کے صبر کی کمی کی وجہ سے اور کثرت

سے جزع فزع کرنے کی وجہ سے جس وقت وہ قبروں کو دیکھتی ہیں۔

اور رخصت سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: **کنت نهیتکم عن زیارة القبور فزوروها لا نها تذکر الاخرة۔**
''کہ میں نے تم کو زیارت قبور سے روکا تھا پس اب تم ان کی زیارت کرلیا کرو اسلئے کہ قبرستان میں جانا آخرت کو یاد دلاتا ہے''۔

اور ممکن ہے نہی کو محمول کرنا ان بوڑھی عورتوں کیلئے کہ جو خوشبو لگا کر اور زینت کر کے نکلیں۔ یا جوان عورتوں پر نہی محمول ہے اگر چہ وہ گندے کپڑوں میں ہی کیوں نہ ہو کیونکہ ان کے نکلنے میں فتنے کا خطرہ ہے قیاس کرتے ہوئے عورتوں کے مسجد کی طرف جانے کے مکروہ ہونے پر۔ ابن الملک ؒ نے فرمایا ہے کہ بعض نسخوں میں لکھا ہے: **زوارات القبور**۔ تو زوارات یہ زوّارۃ کی جمع ہے اور یہ مبالغہ کیلئے ہے اور مبالغہ یہ دلالت کرتا ہے اس پر کہ جو عورتیں قبروں کی زیارت کو عادت بنالیں پس وہ عورتیں ملعونہ ہونگی۔

جمہور حضرات کے نزدیک اس عموم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مستثنیٰ ہے۔

والمتخذین علیها المساجد: ابن الملک ؒ نے فرمایا ہے کہ قبور پر مساجد بنانا حرام ہے اس لئے کہ اس میں نماز پڑھنا یہود کے طریقے کو اختیار کرنا ہے۔

اور حدیث میں **علیها** کی قید ہے اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ قبور کے قریب مساجد بنانا اس میں کوئی حرج نہیں اور اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرکہ انہوں نے اپنے انبیاء اور صلحاء کی قبور کو سجدہ گاہ (مساجد) بنالیا ہے۔

والسرج: یہ ''سراج'' کی جمع ہے اور چراغوں کے قبروں پر رکھنے کی نہی اس لئے ہے کہ اس میں مال کو ضائع کرنا ہے اس لئے کہ اس چراغ سے کسی کو بھی نفع نہیں ہوتا اور اس لئے بھی کہ یہ جہنم کے آثار میں سے ہے اور یا قبروں کی تعظیم سے احتراز کیلئے اس طرح فرمایا، قبروں کو مساجد بنانے کی نہی کی طرح۔ اس طرح بعض علماء نے فرمایا ہے۔

(**رواه ابو داؤد والترمذی**) اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ میرک ؒ نے اس طرح نقل کیا ہے۔

اللہ عزوجل اور جبرئیل علیہ السلام کے درمیان ستّر ہزار پردے حائل ہیں

۷۴۱: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ اِنَّ حِبْرًا مِّنَ الْیَهُوْدِ سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَیُّ الْبِقَاعِ خَیْرٌ فَسَکَتَ عَنْهُ وَقَالَ اَسْکُتُ حَتّٰی یَجِیْءَ جِبْرِیْلُ فَسَکَتَ وَجَاءَ جِبْرِیْلُ عَلَیْهِ السَّلَامُ فَسَأَلَ فَقَالَ مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ وَلٰکِنْ اَسْأَلُ رَبِّیْ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی ثُمَّ قَالَ جِبْرِیْلُ یَامُحَمَّدُ اِنِّیْ دَنَوْتُ مِنَ اللّٰهِ دُنُوًّا مَا دَنَوْتُ مِنْهُ قَطُّ قَالَ وَکَیْفَ کَانَ یَاجِبْرِیْلُ قَالَ کَانَ بَیْنِیْ وَبَیْنَهٗ سَبْعُوْنَ اَلْفَ حِجَابٍ مِّنْ نُوْرٍ فَقَالَ شَرُّ الْبِقَاعِ اَسْوَاقُهَا وَ خَیْرُ الْبِقَاعِ مَسَاجِدُهَا۔ (رواه حبّان فی صحیحه عن ابن عمر)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۳/۵۵۸حدیث رقم ۳۲۳۶۔وأخرجه الترمذی فی السنن ۲/۱۳۶حدیث رقم ۳۲۰ وقال حدیث حسن۔وأخرجه النسائی فی السنن ۴/۹۴حدیث رقم ۲۰۴۳۔وأخرج ابن ماجة أوله ۱/۵۰۲۔

حديث رقم ١٥٧٥ ـ وأخرجه أحمد في المسند ١/ ٢٢٩ـ

ترجمہ: اور سیدنا ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن ایک یہودی عالم نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ بہتر جگہ کون سی ہے؟ آپؐ اس کے جواب میں خاموش رہے اور فرمایا جب تک جبریلؑ نہیں آئیں گے میں خاموش رہوں گا۔ مختصر یہ کہ آپؐ خاموش رہے جب جبرئیلؑ آئے تو آپؐ نے ان سے پوچھا۔ جبرئیلؑ نے کہا کہ اس معاملہ میں میں آپؐ سے زیادہ نہیں جانتا البتہ میں اپنے ربّ ذوالجلال والاکرام سے اس کے متعلق ضرور پوچھوں گا۔ پھر جبریلؑ نے آ کر عرض کیا کہ اے محمدؐ! آج میں اللہ تعالیٰ سے اتنا قریب ہو گیا تھا کہ اس سے پہلے کبھی اتنا قریب نہیں ہوا آپؐ نے پوچھا اے جبرئیلؑ یہ فاصلہ کس قدر رہ گیا تھا؟ جبریلؑ نے عرض کیا میرے اور اللہ کے درمیان ستر ہزار نور کے پردے باقی رہ گئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے سوال کے بارے میں بتایا ہے کہ بدترین مقامات بازار ہیں اور بہترین مقامات مساجد ہیں (یہ روایت ابن حبان نے اپنی صحیح میں سیدنا عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کی ہے)۔

تشریح: ان حبرا: "حبر" حاء کے فتحہ کے ساتھ زیادہ مشہور ہے، حاء کے کسرہ سے۔ ابن الملکؒ نے اس طرح فرمایا ہے اور صحاح جوہری میں لکھا ہے کہ حاء کا کسرہ اصح ہے لیکن استعمال میں مشہور فتح ہے تاکہ عالم اور سیاہی (روشنائی) میں فرق ہو سکے۔ مفاتیح میں اسی طرح ہے اور بعض نے کہا ہے کہ کسرہ میں مشہور ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عالم کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے، واللہ اعلم۔ اور ابن عباسؓ کو حبر اور بحر کہا جاتا ہے ان کی وسعتِ علم کی وجہ سے۔ علامہ طیبیؒ نے یہ کہا ہے مراد ان کی حبر سے عالم ہے۔

ای البقاع: باء کے کسرہ کے ساتھ ہے بُقْعَةٌ کی جمع ہے۔ وہ جگہ کہ جس میں لوگ مطلقاً جمع ہوتے ہوں۔ (خیر) یعنی افضل و خیر کثیر کا سبب ہو۔ (وقال) یعنی اپنی جی میں کہا نہ کہ الفاظ کے ساتھ۔ علامہ طیبیؒ نے اسی طرح کہا ہے۔ اور یہاں الفاظ کے ساتھ مراد لینے پر کوئی مانع بھی نہیں ہے بلکہ یہی مقصود میں اظہر ہے اور الزام کے توہم کو دور کرنے والا ہے اور آنے والی روایات اس پر دلالت کر رہی ہیں۔

اسكت: یہ متکلم کے صیغہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں امر کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ (حتى يجئى جبرئيل) علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ معلوم ہوتا ہے کہ جس سے کوئی ایسا مسئلہ پوچھا گیا جس کو وہ نہیں جانتا تھا، پس اس پر لازم ہے کہ فتویٰ دینے میں جلدی نہ کرے کیونکہ یہ حضور ﷺ کی اور جبرئیلؑ کی سنت ہے۔

فسال: یعنی حضور ﷺ سے پوچھا اس کے بارے میں یا حضور ﷺ نے حضرت جبرئیل سے پوچھا۔ (ولكن اسال ربى تبارك) یعنی جو خیر کثیر والا ہے اور نیکی کا والی ہے۔ (وتعالى) یعنی ہر اس چیز سے جو اس کی کبریائی کے مناسب نہیں اس سے بلند ہے، پس پہلے جملے میں صفات ثبوتیہ کا اثبات تھا، اور دوسرے میں صفاتِ سلبیہ کی نفی ہے، مطلب یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے اس کا سوال کروں گا۔ (من الله دنوًا) یہ فعول کے وزن پر دَنَا کا مصدر ہے۔

ما دنوت منه قط: یعنی میرے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے تقرب کی اجازت اس حد تک دی جتنی اس سے پہلے کبھی نہیں دی۔ ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ شاید اس مرتبہ قرب کی زیادتی حضور ﷺ کی تعظیم کی وجہ سے ہو کبھی محب محبوب کے قاصد کا بہت

زیادہ احترام کرتا ہے محبوب کی وجہ سے۔ یا حضرت جبرئیلؑ اتنا قریب علم کی تلاش میں ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ جو میرے ایک بالشت قریب ہو تو وہ اس کی طرف ایک باع (دو زراع) [دو ہاتھ] قریب ہوتا ہے۔ اور اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے بھی اللہ تعالیٰ سے علم اور قرب میں ترقی کرتے ہیں مگر فرشتوں کی علم وقربِ الٰہی میں ترقی نادر ہے، بخلاف انسان کے۔

سبعون الف حجاب من نور: ظاہر یہ ہے کہ اس میں تحدید ہے۔ اے مخاطب تو جان لے کہ پردے مقدر محسوس کا احاطہ کرتے ہیں اور وہ چیز مخلوق ہے۔ پس لوگ اللہ تعالیٰ سے حجاب میں ہیں اس کے اسماء وصفات وافعالی کے معانی کی وجہ سے اور ملائکہ میں سے سب سے قریب وہ فرشتے ہیں جو عرش کو گھیرے ہوئے ہیں وہ بھی ھیبت اور عظمت اور کبریائی اور جلال کے نور کی وجہ سے پردے میں ہیں۔ اور باقی آدمی تو بس بعض ان میں سے نعمتوں کے دیکھنے کی وجہ سے منعم سے پردے میں ہیں اور مشاہدہ اسباب کی وجہ سے مسبب سے پردے میں ہیں اور بعض جائز یا حرام شہوات کی وجہ سے یا مال اور عورتوں اور بیٹوں اور دنیاوی زندگی کی زینت اور جاہ کی وجہ سے پردے میں ہیں۔

اور اسی طرح صوفیاء کا یہ ارشاد ہے کہ علم حجاب ہے۔ بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ علم حجاب ہے لیکن نورانی حجاب ہے، پس اس سے یہ پتہ چلا کہ حجاب کی دو قسمیں ہیں ظلمانی اور نورانی۔ اور حدیث میں اس قول کے ساتھ اسی کی طرف اشارہ ہے مِن نُّورٍ۔

شر البقاع اسواقها: اس لئے کہ یہ محل غفلت اور معصیت ہیں۔ (**وخير البقاع مساجدها**) اس لئے کہ یہ محل حضوری ومحل طاعت ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے شر اور خیر دونوں کے بارے میں جواب دے دیا اگرچہ سوال صرف خیر کے بارے میں تھا، رحمان اور شیطان کے گھر پر تشبیہ کرتے ہوئے (یعنی یہ رحمان کا گھر ہے اور یہ شیطان کا گھر ہے)۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں میں یہ کہتا ہوں کہ یہ اس لئے کہا کیونکہ اضداد کی وجہ سے اشیاء کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔

رواہ: مصنفؒ کے اصل نسخہ میں یہاں جگہ خالی ہے بعد میں بعد والوں نے اس جگہ ابن حبان عن ابن عمر کا حوالہ درج کیا ہے اسی وجہ سے علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے روای یعنی تخریج کنندہ کا ذکر بعد میں ملایا گیا ہے (یعنی جو تخریج کی گئی ہے وہ بعد میں ساتھ ملائی گئی ہے)۔ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ایک نسخہ میں ہے اخرج احمد وابویعلی الموصلی والحاکم اور حاصل یہ ہے کہ ابن حبان نے اس کو ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے اور احمدؒ نے اس کی تخریج کی ہے (اور حاکمؒ نے اس کو صحیح قرار دیا) جبیرؓ بن مطعم کی حدیث سے، اور طبرانی نے حضرت انسؓ کی حدیث سے اس کی تخریج کی ہے اور یہ حدیث صحیح ہے اور بے شک وہ آدمی جس نے یہ کہا کہ پردوں کی کثرت کسی صحیح حدیث میں وارد نہیں ہوئی اس کے کلام کو اس پر محمول کیا جائے گا جو معراج کی حدیث میں آیا ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے: **سبعين حجابا**...... کہ ستر پردے تھے ہر پردے کی موٹائی وہ پانچ سال کی مسافت ہے پھر مجھے سبز بچھونے پر بٹھایا گیا اس کی روشنی سورج کی روشنی پر غالب تھی یہاں تک کہ میں عرش تک پہنچ گیا۔

اور جیسا کہ ایک روایت میں ہے **ثم اى بعد انقطاع جبرئيل عنه**...... کہ حضور ﷺ نے فرمایا (کہ جبرئیلؑ مجھ سے الگ ہوئے اور کہا کہ اگر میں اس سے آگے بڑھوں گا تو میں جل جاؤں گا) پھر مجھے نور میں داخل کر دیا گیا پس مجھے ستر پردوں کو چیر کر لے جایا گیا اس میں کوئی پردہ بھی ایسا نہیں تھا کہ جو دوسرے کے مشابہ ہو۔ پس یہ دونوں حدیثیں اور اس طرح کی دوسری

روایات وہ ثابت نہیں ہیں، بخلاف اس روایت کے کہ جس میں ہم بحث کر رہے ہیں (کہ یہ ثابت ہے)۔

حاصل یہ ہے کہ حجاب صوری وہ حق تعالیٰ کے حق میں متصور نہیں، بخلاف نوری معنوی کے اور کس قدر خوبصورت و حسین قول ہے ابن عطاءؒ کا، کہ حق تعالیٰ محجوب نہیں ہیں اور بے شک تو اس سے حجاب میں ہے اس کی طرف دیکھنے سے اس لئے اگر کوئی چیز اس کے لئے حجاب (پردہ) بنے تو وہ شئی جس نے اس پر پردہ کیا ہے وہ اس کو چھپا وڈھانپ لے گی اور اگر اللہ تعالیٰ کیلئے چھپانے والے کا وجود مانیں تو وہ شئی اس کے وجود کیلئے حاصر (گھیرنے واحاطہ کرنے والا) ہوگا اور ہر حاصر (محصور شئی پر) غالب وقاھر ہوتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام بندوں پر غالب ہیں اور ابن عطاء کے کلام میں یہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے وجودِ قہری پر دلالت کرتا ہے، کہ اے مخاطب تیرا اس سے پردے میں ہونا اس چیز کے ساتھ ہے جو اس ذاتِ اقدس کے ساتھ موجود نہیں۔ نیز ان کا یہ بھی کلام ہے کہ یہ کیسے منصور ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی چھپائے گی حالانکہ وہ ذات ایسی ہے کہ جس نے ہر چیز کو ظاہر کیا اور کیسے یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس کو کوئی چیز چھپائے حالانکہ وہ ہر چیز کے وجود سے پہلے ظاہر تھا۔ یہ کیسے متصور ہو سکتا ہے کہ اس کو کوئی چھپائے حالانکہ وہ واحد ہے کہ جس کے ساتھ کوئی چیز نہیں یہ کیسے متصور ہے کہ اس کو کوئی چیز چھپائے حالانکہ وہ تیری طرف ہر چیز سے زیادہ قریب ہے؟

اور سید جمال الدینؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ کتب مشہورہ معتمدہ میں سے میں نے کسی میں بھی نہیں دیکھی لیکن میں نے سلمی کی مصابیح کی احادیث کی تخریج میں دیکھا ہے کہ انہوں نے یہ فرمایا کہ ابن حبان نے اس کو اپنی صحیح میں روایت کی ہے: **عن محارب بن دثار عن ابن عمرؓ ان رجلا سال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ای البقاع شر؟ قال لا ادری حتی اسال جبرئیل فسال جبرئیل فقال لا ادری حتی اسال میکائیل فجاء فقال خیر البقاع المساجد وشرھا الاسواق۔**

میرک شاہؒ نے فرمایا کہ پھر میں نے الترغیب والترھیب للمنذری میں دیکھا کہ انہوں نے اسی مضمون کی روایت کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے: **ان رجلا سال النبی ﷺ ای البقاع خیر وای البقاع شر قال لا ادری حتی اسال جبرئیل**....، اس روایت کو طبرانی نے کبیر میں، اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے۔ اور انس بن مالک سے بھی اسی مضمون کی روایت ہے جو طبرانی نے اوسط میں نقل کیا ہے۔ اور جبیر بن مطعم سے بھی اسی مضمون کی روایت مروی ہے جس کو احمد اور بزارؒ نے (الفاظ بزار کے ہیں) اور ابو یعلیٰ نے اور حاکم نے روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ صحیح الاسناد ہے۔ اھ

میرک کا کلام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حجب کا ذکر ان روایات میں نہیں ہے، پس ابن حجرؒ کا اس کو علی الاطلاق صحیح قرار دینا صحیح نہیں ہے، پس اس کو غور سے سمجھ لو اور اس کا حاصل یہ ہے کہ ستر کا عدد صحیح نہیں ہے نہ کہ نفس حجاب کیونکہ مسلم کی روایت میں ہے جیسا کہ کتاب کے شروع میں گزرا ہے ابو موسیٰ کی روایت سے مرفوعاً **حجابه النور لو كشفه لا حرقت سبحات وجهه ما انتهى اليه بصره من خلقه** ہے۔

الفصل الثالث:

مساجد میں کسی دنیاوی غرض سے آنے والے کی مثال

۷۴۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ مَنْ جَاءَ مَسْجِدِیْ هٰذَا لَمْ یَأْتِ اِلَّا لِخَیْرٍ یَتَعَلَّمُهٗ اَوْ یُعَلِّمُهٗ فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ الْمُجَاهِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَمَنْ جَاءَ لِغَیْرِ ذٰلِكَ فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ الرَّجُلِ یَنْظُرُ اِلٰی مَتَاعِ غَیْرِهٖ۔ (رواہ ابن ماجة والبیهقی فی شعب الایمان)

أخرجه ابن ماجة فی مقدمة سننه ۸۲/۱ حدیث رقم ۲۲۷۔ وأخرجه البیهقی فی شعب الایمان ۲۶۳/۲ حدیث رقم ۱۶۹۸۔

ترجمہ: ''سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا ہے ''جو شخص میری اس مسجد میں محض اس غرض سے آئے کہ نیک کام سیکھے اور سکھلائے تو وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے برابر ہے جو شخص اس غرض سے نہ آئے تو وہ اس شخص کی مانند ہے جو دوسرے کے اسباب کو تعجب کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔''

(ابن ماجہ' بیہقی)

تشریح: **فی مسجدی هذا**: یعنی مسجدِ نبوی مدینہ منورہ کے اندر۔ (**لم یأت**) یعنی اسی لئے آئے۔ (**الا لخیر**) یعنی علم یا عمل۔

یتعلمه او یعلمه: اَوْ یہاں تنویع کیلئے ہے اور اس میں مسجد میں تدریس کے جواز کی واضح دلالت ہے، بخلاف امام مالکؒ جیسا کہ پہلے گزرا اور شاید کہ امام مالک نے بلند آواز سے منع کیا جو کہ تشویش کا باعث بنے (یعنی کسی دوسرے نمازی یا ذاکر یا عابد کی عبادت میں خلل ڈالے)۔

فهو بمنزلة الجهاد فی سبیل الله: اس لئے کہ دونوں آدمی اعلاء کلمۃ اللہ کا ارادہ رکھتے ہیں یا اس لئے کہ علم اور جہاد دونوں میں سے ہر ایک کبھی فرضِ عین ہوتا ہے اور کبھی فرضِ کفایہ یا اس لئے کہ دونوں میں سے ہر ایک' ایک ایسی عبادت ہے کہ جس کا نفع عام مسلمانوں تک پہنچتا ہے۔

ومن جاء لغیر ذلك: یعنی علم اور عمل کے علاوہ اور علم وعمل یہ نماز اعتکاف زیارت مسجد (وزیارت صلحاء وغیرہ) کو بھی شامل ہے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے یہ وہم ہوتا ہے کہ نماز **لغیر ذلك** میں داخل ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے اس لئے کہ نماز کے ذکر سے فراغت ہو چکی ہے اور نماز اصل کلام سے مستثنیٰ ہے۔

فهو بمنزلة الرجل ینظر الی متاع غیره: پس یہ آدمی قابل حسرت وافسوس اور محروم ہے اس چیز سے کہ جس سے لوگ دنیا میں نفع اٹھا رہے ہیں یعنی علم اور عمل اور تعریفِ حسن اور آخرت میں یہ محروم ہوگا درجات اور بڑے اَجر کے حصول سے۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ جو مسجد میں نماز تعلیم کیلئے آئے اس کے حال کو تشبیہ دی گئی ہے اس آدمی کی حالت کے ساتھ جو دوسرے کے سامان کی طرف بغیر اس کی اجازت کے دیکھ رہا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے شرعی طریقہ سے اس کی ملک کے

حصول کا ارادہ بھی نہ کیا ہو، پس بے شک یہ بات ممنوع ہے اسی طرح مسجد میں بغیر اس غرض کے آنا جس کے لئے مسجد بنائی گئی ہے یہ بھی ممنوع ہے خصوصاً مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اھ

لیکن محض دوسرے کے سامان کے دیکھنے کو ممنوع کہنا محل نظر ہے پھر یہاں میں نے ابن حجرؒ کو دیکھا کہ انہوں نے علامہ طیبیؒ کا تعاقب کیا ہے اپنے اس قول کے ساتھ کہ محظور (ممنوع) وہ محرم (حرام) چیز ہوتی ہے اور یہاں پر کوئی حرمت نہیں ہے بلکہ دوسرے کے سامان کو دیکھنا جائز ہے اگر چہ اس کے مالک بننے کا ارادہ نہ کیا ہو جب تک کہ روشندان وغیرہ سے جھانک کر نہ دیکھا جائے۔

اور جب امام نوویؒ نے احیاء کے اس قول کو نقل کیا کہ اگر مسجد کی چھت حرام مال سے ڈالی گئی ہو تو اس کے نیچے بیٹھنا حرام ہے کیونکہ اس میں حرام سے انتفاع اٹھانا ہے۔ تو فرمایا کہ ان کی اس بات میں نظر ہے اور راجح مذہب یہ ہے کہ بیٹھنا حرام نہیں ہے اور یہ دوسرے کے چراغ کی روشنی سے فائدہ اٹھانے کے قبیل میں سے ہے اور اس کے شیشے میں دیکھنے کے قبیل میں سے ہے جب کہ ان دونوں چیزوں پر قابض نہ ہو تو یہ دونوں چیزیں بغیر اختلاف کے جائز ہیں اور علامہ طیبیؒ کا یہ کہنا: **وکذلك اتیان المسجد لغیر ما بنی محظورا......** یہ بھی ممنوع ہے کیونکہ وہ امور کہ جن کے لئے مسجد نہیں بنائی گئی ہے ان میں سے مسجد میں گزرنے کیلئے داخل ہونا اور اس میں سونا ہے اور ان دونوں میں کوئی نہیں ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ابن حجرؒ کی مراد حظر سے حرمت ہے ورنہ بغیر ضرورت کے مسجد کو گزرگاہ بنانا بلا خلاف مکروہ ہے اور سونے کے اندر تفصیل ہے جیسا کہ گزر چکا لیکن وہ مکروہ ہے، بالاجماع حرام نہیں ہے۔

مساجد کو مرکز رسومات بنانے والے زمانے کے آنے کی اطلاع

۷۴۳: **وَعَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلاً قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ يَكُوْنُ حَدِيْثُهُمْ فِيْ مَسَاجِدِهِمْ فِيْ أَمْرِ دُنْيَاهُمْ فَلَا تُجَالِسُوْهُمْ فَلَيْسَ لِلّٰهِ فِيْهِمْ حَاجَةٌ۔** (رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

أخرجه ابن ماجة فى مقدمة سننه ۸۲/۱ حديث رقم ۲۲۷۔ وأخرجه البيهقى فى شعب الايمان ۲۶۳/۲ حديث رقم ۱۶۹۸۔

ترجمہ: "اور حسن بصریؒ سے مرسلاً روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لوگوں پر عنقریب ایسا وقت آئے گا کہ وہ اپنی دنیاداری کی باتیں اپنی مسجدوں میں کیا کریں گے لہٰذا تم اُن کے قریب بھی نہ پھٹکنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں"۔ (بیہقی)

تشریح: عن الحسن: یعنی حسن بصری۔ (مرسلا) اس لئے کہ وہ تابعی ہیں۔

فی امر دنیاھم: اور مساجد تو اُمور دینیہ کیلئے بنائی گئی ہیں۔ ابن الہمامؒ نے ہدایہ کی شرح میں لکھا ہے کہ کلام مباح مسجد میں مکروہ ہے یہ نیکیوں کو کھا جاتا ہے۔ (**فلا تجالسوھم**) یعنی ان لوگوں کے پاس کہ جن کا ابھی ذکر ہوا اور اس میں اطلاق کا بھی احتمال ہے اور مسجد کے ساتھ مقید ہونے کا بھی احتمال ہے۔ (**فلیس للہ فیھم**) یعنی ان کے مسجد میں آنے اور عبادت کرنے کی

اللہ کو کوئی حاجت نہیں۔

حاجة: یہ کنایہ ہے ان کی طاعت کے قبول نہ ہونے سے۔ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے یہ کنایہ ہے اللہ تعالیٰ کے ان سے بَری ہونے اور ان کے اللہ تعالیٰ کے ذمے سے نکلنے سے ورنہ اللہ تعالیٰ تو مطلقاً حاجت سے منزہ ہیں اور اس میں ان لوگوں کو بہت بڑی ڈانٹ اور دھمکی ہے ان کے ظلم کی وجہ سے اور ان کے شئی کو غیر محل میں رکھنے کی وجہ سے اس لئے کہ مسجد سوائے عبادات کے اور کسی چیز کیلئے نہیں بنائی گئی۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ تقدیر عبارت یوں ہو: **فليس لا هل الله في مجالستهم حاجة**۔ ''پس اہل اللہ کیلئے انکے ساتھ بیٹھنے میں کوئی حاجت نہیں''۔

مساجد میں شور وشغب کرنے کی ممانعت کا بیان

۷۴۴: وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ قَالَ كُنْتُ نَائِمًا فِي الْمَسْجِدِ فَحَصَبَنِيْ رَجُلٌ فَنَظَرْتُ فَإِذَا هُوَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَقَالَ اذْهَبْ فَأْتِنِيْ بِهٰذَيْنِ فَجِئْتُهُ بِهِمَا فَقَالَ مِمَّنْ اَنْتُمَا اَوْ مِنْ اَيْنَ اَنْتُمَا قَالَا مِنْ اَهْلِ الطَّائِفِ قَالَ لَوْ كُنْتُمَا مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ لَاَوْجَعْتُكُمَا تَرْفَعَانِ اَصْوَاتَكُمَا فِيْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ. (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱/ ۵۶۰ حدیث رقم ۴۷۰ ولفظه "أهل البلد" بدل "أهل المدینة"۔

ترجمہ: ''اور سیدنا سائب بن یزید کہتے ہیں کہ میں ایک روز مسجد میں پڑا سو رہا تھا کسی شخص نے مجھ پر کنکر پھینکی میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ سیدنا عمر بن خطاب ہیں۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم اٹھو اور ان دونوں اشخاص کو میرے پاس لے آؤ جو مسجد میں بلند آواز سے باتیں کر رہے ہیں۔ میں اُن کو لے کر سیدنا عمر فاروق کے پاس آیا انہوں نے ان سے پوچھا تم کون ہو؟ یا فرمایا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو تو وہ کہنے لگے کہ ہم طائف کے رہنے والے ہیں۔ عمر فاروق نے فرمایا کہ اگر تم مدینہ کے رہنے والے ہوتے تو میں تم کو سزا دیتا لیکن چونکہ تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو اور مسجد کے آداب سے واقف نہیں ہو یا یہ کہ مسافر ہو اس لئے معافی کے مستحق ہو پھر فرمایا بڑے افسوس کی بات ہے تم لوگ رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں زور زور سے باتیں کر رہے ہو''۔

تشریح: **كنت نائما في المسجد**: اور ایک صحیح نسخہ میں قائمًا ہے۔ میرکؒ نے شیخؒ سے نقل کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ اسی طرح اصول میں ''قاف'' کے ساتھ واقع ہے اور ایک روایت میں نائمًا ہے اور اس کی تائید اسماعیلی کی روایت سے ہوتی ہے جس میں یہ لفظ ہے: **مضطجعا**۔

فحصبنی رجل: یعنی مجھے کنکری ماری۔ (**من اهل الطائف**) یہ دونوں قسم کے سوالوں کا جواب ہے۔

لو كنتما من اهل المدينة لا وجعتكما: اس لئے کہ اس صورت میں تمہارے لئے کوئی عذر باقی نہ ہوتا۔ علامہ طیبیؒ نے اس طرح فرمایا ہے۔ یعنی اہل مدینہ حضور ﷺ کی مسجد کے احترام کو زیادہ پہچانتے ہیں دوسروں کے مقابلے میں پس ان کے بارے میں مسافروں جیسی مسامحت ونرمی نہیں برتی جائے گی اس لئے کہ ممکن ہے کہ یہ دونوں نومسلم ہوں اور ان کو ابھی اسلام اور

احکامِ اسلام کی اتنی معرفت نہ ہو۔ میرکؒ نے فرمایا ہے کہ اسماعیلی کی روایت میں جَلدًا کی زیادتی وارد ہے (یعنی کوڑے مارنے کے ساتھ سزا دینا) اور اسی جہت سے یہ بات وضح ہو جاتی ہے کہ اس حدیث کو مرفوع کے حکم میں مانیں گے اس لئے کہ حضرت عمرؓ ان دونوں کو کوڑے مارنے کے ساتھ صرف امرِ توقیفی ہی کی مخالفت پر ڈرا سکتے ہیں (نہ کہ اس کے علاوہ اور کسی امر آخر پر)۔

ترفعان: یہ جملہ مستانفہ ہے بیان کیلئے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ سوال مقدر کا جواب ہے گویا کہ ان دونوں نے کہا: **لم توجعنا قال لا نكما ترفعان**۔

اور (**اصواتکم**) کا ارشاد تو مالکیؒ نے فرمایا ہے کہ جو مضاف معنیً تثنیہ ہو اور مضاف الیہ کا جز ہو تو اس کو مفرد ذکر کرنا بھی جائز ہے جیسے **اكلت راس شاتين** اور جمع ذکر کرنا زیادہ بہتر اور اچھا ہے جیسے **صغت قلوبكما** اور تثنیہ اصل ہونے کے باوجود وہ قلیل الاستعمال ہے۔ اور اگر مضاف الیہ کا جز نہ ہو پس اکثر اس کو تثنیہ سے ذکر کرتے ہیں جیسے: **سل الزيدان سيفيهما** اور اگر التباس سے امن ہو تو مضاف کو جمع بنا کر ذکر کرنا بھی جائز ہے جیسے کہ حدیث میں: **يعذبان في قبورهما**۔ میرکؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ مراد **اصوات** سے اس جگہ حقیقۃً جمع ہے اس لئے کہ ہر حرف کیلئے ایک آواز ہے جیسا کہ یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے۔

في مسجد رسول ﷺ: یعنی خصوصاً آپ کی مسجد میں اس لئے کہ اس میں مسجد کی شرافت کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی خصوصیت کی زیادتی ہے وہ یہ کہ آپ ﷺ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ......﴾ [الحجرات: ٢] ''اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کرو۔''

امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ مسجد میں علم وغیرہ (کے سیکھنے اور سکھانے) میں آواز کو بلند کرنا مکروہ ہے اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ امام مالکؒ سے پوچھا گیا مسجد میں علم (کے سیکھنے وسکھلانے) میں آواز کو بلند کرنے کے بارے میں تو فرمایا کہ اس میں کوئی خیر نہیں ہے علم کے ساتھ اور نہ ہی علم کے بغیر اور البتہ تحقیق میں نے پہلے بزرگوں کو اس حال میں پایا کہ وہ عیب لگایا کرتے تھے اس شخص پر جو اس طرح کی مجلس میں ہوتا (کہ جس میں رفع صوت ہوتی) اور میں بھی اس کو ناپسند سمجھتا ہوں اور اس میں کوئی خیر نہیں جانتا۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ابن ابی شیبہ نے حضرت عمرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے ایک آدمی کی آواز سنی کہ وہ مسجد نبوی میں بلند آواز سے بول رہا تھا تو فرمایا کہ کیا تو جانتا ہے کہ تو کہاں پر ہے پھر ابن حجرؒ نے کہا کہ ایک جماعت کا یہ مذہب ہے کہ اس میں کوئی کراہت نہیں ہے ان میں سے امام ابو حنیفہؒ ہیں اور انہوں نے اس مذہب پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے وضوء کے باب میں گزری ہے حضور ﷺ کا ارشاد ہے: **ويل للاعقاب من النار**۔ اور یہ بات اس وجہ سے مردود ہے کہ حدیث میں یہ ذکر نہیں ہے کہ وہ مسجد میں تھے بلکہ سیاقِ حدیث تو اس میں بالکل واضح ہے کہ وہ مسجد میں نہیں تھے ہاں البتہ کعب بن مالک اور ابن ابی حدرد سے جو صحیح روایت میں آیا ہے قرض کے بارے میں جو کہ کعب بن مالک کا قرض تھا ابن ابی حدرد پر کہ دونوں کی آوازیں مسجدِ نبوی میں بلند ہو گئیں اور آپ ﷺ نے ان پر انکار نہیں فرمایا اور یہ فرمایا کہ: **ضع من دينك الشطر** کہ تو آدھا قرضہ اس کو معاف کر دو اور کبھی اس حدیث کا یوں بھی جواب دیا جاتا ہے کہ حضور ﷺ نے جو ان پر انکار نہیں کیا تو وہ بیان جواز

کیلئے تھا یعنی ترک انکار بیان جواز کیلئے تھا پس یہ کراہت کے منتفی ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔(اھ)۔ابن حجرؒ کا کلام مکمل ہوا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس کلام میں کئی طریقوں سے نظر ہے:

① اس میں امام اعظمؒ کی طرف مطلق کراہت کی نفی کی نسبت کی گئی ہے۔اور یہ ان پر افتراء ہے اس لئے کہ امام اعظمؒ کا مذہب یہ ہے کہ مسجد میں آواز بلند کرنا اگرچہ ذکر کے ساتھ بھی ہو یہ مکروہ ہے، ہاں انہوں نے تدریس کی اجازت دی ہے مسجد میں اور اسی طرح بحث علمی اس طرح کہ وہ نمازیوں کے خشوع کو خراب نہ کرے یا رفع صورت میں تدریس اس وقت ہوگی کہ جب نمازی نہ ہوں۔

② دوسری بات یہ ہے کہ حدیث مذکور سے امام صاحبؒ کی طرف دلیل پکڑنے کی نسبت کرنا یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ اگر **ويل للاعقاب من النار** کے ارشاد کا مسجد میں ہونا بھی مان لیں تب بھی اس میں مطلقاً کراہت کی نفی پر دلالت نہیں ہے کیونکہ حدیث میں کوئی ایسی وضاحت نہیں ہے جو بلند آواز سے اس بات (**ويل للاعقاب من النار**) کے کہنے کو بتلا رہی ہو اور اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ ارشاد بلند آواز سے تھا تو منکر سے مسجد میں روکنا اگرچہ بلند آواز سے ہی کیوں نہ ہو یہ بالاجماع مکروہ نہیں ہے۔

③ ان کا حضرت کعب والی حدیث کا جواب دینا وہ بعد سے خالی نہیں اور اس کا سب سے قریب و بہتر جواب یہ ہے کہ اس کو ﴿لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ......﴾ [الحجرات : ۲] ''اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کرو۔'' کے نزول سے پہلے پر محمول کیا جائے۔

مسجد کے باہر خلیفہ دوم کا ایک چبوترہ تعمیر کروانا

۷۴۵: وَعَنْ مَالِكٍ قَالَ بَنٰى عُمَرُ رَحْبَةً فِيْ نَاحِيَةِ الْمَسْجِدِ تُسَمَّى الْبُطَيْحَاءُ وَقَالَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ اَنْ يَلْغَطَ اَوْ يُنْشِدَ شِعْرًا اَوْ يَرْفَعَ صَوْتَهٗ فَلْيَخْرُجْ اِلٰى هٰذِهِ الرَّحْبَةِ۔ (رواه فى الموطأ)

أخرجه مالك بلاغا فى الموطأ ۱/۱۷۵ حديث رقم ۹۳ من كتاب قصر الصلاة فى السفر.

ترجمه: ''اور امام مالک کہتے ہیں کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مسجد کے ایک کونہ میں ایک چبوترہ بنوا دیا تھا جس کا نام انہوں نے ''بطیحاء'' رکھا تھا اور لوگوں سے کہہ دیا کہ جو شخص اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا چاہے یا اشعار پڑھنا چاہے یا بلند آواز سے باتیں کرنا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ (مسجد سے نکل کر) اس چبوترہ پر آ جائے''۔(مؤطا)

تشریح: **وعن مالك**: اس سے مراد امام مالکؒ ہیں جو کہ فقہ مالکی کے امام ہیں۔

رحبة فى ناحية المسجد: یعنی خارج مسجد میں ایک خالی جگہ۔قاموس میں ہے: **رحبة المكان وتسكن ساحته ومتسعه** کہ رَحَبَہ اور رَحْبہ دونوں طرح یہ کھلی جگہ اور صحن کو کہتے ہیں اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ رَحَبَہ حاء کے فتحہ کے ساتھ وہ گھروں کے درمیان کشادہ و خالی جگہ اور رحبۃ المسجد کہتے ہیں مسجد کے صحن کو۔ابوعلی الدقاق فرماتے ہیں کہ حائضہ کیلئے جائز نہیں کہ مسجد جماعت کے رحبہ (صحن) میں داخل ہو وہ متصل ہو یا منفصل اور حاء کو حرکت دینا احسن ہے، (اھ)۔اس حدیث میں رحبہ

سے مراد یہ ہے اور باقی حضرات علیؓ کی حدیث کہ جس میں یہ ہے :وصف وضوء رسول اللہ فی رحبة الکوفة ۔تو یہ چبوترہ وہ اونچی جگہ تھی جو کوفہ کی مسجد کے درمیان میں تھی حضرت علیؓ اس پر بیٹھتے اور لوگوں کو وعظ وغیرہ کرتے ۔

من کان یرید ان یلغط: "لغط" کہتے ہیں کہ آیسی آواز اور شور کہ جس کا معنی سمجھ میں نہ آتا ہو۔طیبیؒ نے یہ کہا ہے اور مراد اس سے وہ آدمی ہے کہ جو لایعنی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

او ینشد شعرا :اپنے لئے یا کسی اور کیلئے ،اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ :شعرًا مذمومًا یہ صحیح نہیں کیونکہ مذموم اشعار تو بالکل مباح نہیں ہیں۔(او یرفع صوته) اگرچہ ذکر کے ساتھ ہو۔(فلیخرج الی هذه الرحبة) کیونکہ اس میں ان اُمور کو کرنا آسان اور ہلکا ہے۔

رواه فی الموطا: مؤطا ہمزہ اور الف کے ساتھ ،اور تحقیق پہلے مصنفؒ کے اس انداز پر اعتراض گزر چکا ہے تو یہاں پر حق یہ تھا کہ یوں کہتے :وعن عمر انه بنی رحبة...... پھر کہتے رواہ مالک۔

مساجد میں ممنوع کام دیکھا جائے تو نمازیوں کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے؟

۷۴۶:وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ رَاَی النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم نُخَامَةً فِی الْقِبْلَةِ فَشَقَّ ذٰلِكَ عَلَیْهِ حَتّٰی رُئِیَ فِیْ وَجْهِهٖ فَقَامَ فَحَكَّهٗ بِیَدِهٖ فَقَالَ اِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا قَامَ فِی الصَّلَاةِ فَاِنَّمَا یُنَاجِیْ رَبَّهٗ وَاَنَّ رَبَّهٗ بَیْنَهٗ وَبَیْنَ الْقِبْلَةِ فَلَا یَبْزُقَنَّ اَحَدُكُمْ قِبَلَ قِبْلَتِهٖ وَلٰكِنْ عَنْ یَّسَارِهٖ اَوْ تَحْتَ قَدَمِهٖ ثُمَّ اَخَذَ طَرَفَ رِدَائِهٖ فَبَصَقَ فِیْهِ ثُمَّ رَدَّ بَعْضَهٗ عَلٰی بَعْضٍ فَقَالَ اَوْیَفْعَلُ هٰكَذَا ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱/ ۵۰۷ حدیث رقم ۴۰۵۔

ترجمہ:''اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں قبلہ کی طرف رینٹ پڑا ہوا دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ناگوار گزرا یہاں تک کہ اس ناگواری کا اثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر ظاہر ہو گیا لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور اسے خود اپنے دست مبارک سے کھرچ کر دور پھینک دیا پھر فرمایا''تم میں سے جب کوئی نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے پروردگار سے مناجات کرتا ہے اور اس وقت اس کا رب اس کے اور اس کے قبلہ کے درمیان ہوتا ہے اس لئے تم میں سے ہر ایک کو چاہئے کہ قبلہ رو ہو کر مت تھوکے بلکہ اپنی بائیں طرف یا قدموں کے نیچے تھوک لے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر مبارک کا ایک کونہ لیا اور اسی میں تھوکا پھر کپڑے کو آپس میں مَلا پھر فرمایا''اس طرح کیا کرے''۔(بخاری)

تشریح:فی القبلة :یعنی مسجد کی اس دیوار سے جو قبلہ میں واقع تھی اس سے مراد محراب نہیں ہے کہ جس کو لوگ قبلہ کہتے ہیں اس لئے کہ محراب تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بنائے گئے ہیں اسی وجہ سے اسلاف میں سے ایک جماعت نے اس کے بنانے اور اس میں نماز پڑھنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔قضاعیؒ نے فرمایا ہے سب سے پہلے محراب کو ایجاد کرنے والے وہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ہیں اور یہ اس وقت ولید بن عبدالملک کی طرف سے مدینہ کے عامل تھے تو انہوں نے مسجد نبوی کو گرا کر اس کی بنیاد رکھی تو اس میں محراب کی زیادتی کی۔

اور امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو محراب کہا جاتا ہے اس لئے کہ یہ مجالس مسجد میں سب سے معزز جگہ ہے اور اسی سے بعض حضرات نے قصر (محل) کو محراب کہا ہے کیونکہ وہ منازل میں سے سب سے معزز شمار ہوتا ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ محراب بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اس میں اس کے منفرد (علیحدہ) ہونے کی وجہ سے اسی طرح محراب مسجد ہے کیونکہ اس میں امام منفرد ہوتا ہے تمام لوگوں سے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس کو محراب اس لئے کہتے ہیں کیونکہ نمازی اس میں شیطان سے جنگ کرتا ہے۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ نخامہ وہ تھوک جو حلق کے اخر سے نکلتا ہے خاء کے مخرج سے اور نہایہ میں اسی طرح ہے اور یہی آنے والے قول کے مناسب ہے جس میں یہ ہے **فلا یبزقن** لیکن علامہ طیبیؒ کا اقصی حلق کہنا ٹھیک نہیں اس لئے کہ خاء معجمہ کا مخرج ادنیٰ حلق ہے اور کتاب مغرب میں لکھا ہے کہ نخاعہ اور نخامہ وہ چیز کہ جو ناک کی جڑ سے گلا صاف کرتے (کھانسی وغیرہ کرتے) نکلے اور قاموس میں لکھا ہے کہ نخاعہ یہ نخامہ کو کہتے ہیں یا وہ چیز جو ناک کی جڑ سے نکلے (یعنی رینٹ)۔

حتی رئی فی وجهه: علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ وہ ضمیر جو فاعل کے قائم مقام ہے وہ **فشق ذلك عليه** کے معنی کی طرف راجع ہے اور وہ کراہت ہے۔

فحكه بيده: اپنے لطیف ہاتھ سے اس کو کھرچا کمزور اُمت کے بدلے میں اور اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ قوم کا سرداران کا خادم ہوتا ہے۔ اور اپنے رب جل جلالہ کیلئے تواضع کرتے ہوئے اور اس کے گھر سے محبت کرتے ہوئے۔

ان احدكم اذا قام فی الصلوٰة: یعنی نماز میں داخل ہو برابر ہے کہ مسجد میں ہو یا اس کے علاوہ اور کہیں ہو۔ (**فانما يناجی ربه**) یعنی بزبان قال سے اس سے مخاطب ہوتا ہے جیسا کہ قراءت اور ذکر اور دعا اور اسی طرح زبان حال سے جیسا کہ انتقال کے احول کے مختلف اقسام، اسی وجہ سے کہا گیا ہے **الصلوٰة معراج المؤمنين** کہ نماز مؤمن کی معراج ہے۔

ون ربه بينه وبين القبلة: شرح السنہ میں لکھا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے رب تعالیٰ کا قصد کیئے ہوئے ہے قبلہ کی طرف توجہ کے ساتھ پس اس تقدیر کے ساتھ وہ اس طرح ہو جائے گا کہ گویا کہ اس کا مقصود اس کے اور قبلے کے درمیان میں ہے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس جہت کو تھوک وغیرہ سے بچایا جائے۔ علامہ طیبیؒ نے یہ فرمایا ہے۔

قبلته: اس لئے کہ جانب قبلہ سب سے مکرم محترم ہے اور قبلے کی طرف تھوکنا وہ ہمیشہ ممنوع ہے پس جملہ شرطیہ یہ مزید قباحت کا فائدہ دینے کیلئے ہے۔

عن يساره اوتحت قدمه: ای یسار، علامہ نوویؒ نے فرمایا ہے کہ بائیں طرف تھوکنے کا حکم یا قدموں کے نیچے تھوکنے کا حکم اس وقت ہے جب کہ وہ مسجد کے علاوہ میں ہو اور جب مسجد میں ہو تو صرف کپڑے کے علاوہ اور کسی چیز میں نہ تھوکے۔

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ یہ محل نظر ہے اس لئے کہ وہ مسجد میں ایسی چیز پر ہے کہ جو اس کے لئے اس میں بچھائی گئی ہے تو اس کے لئے اس پر بائیں جانب تھوکنا یا قدم کے نیچے تھوکنا جائز ہے۔ اس لئے کہ غرض یہ ہے کہ تھوک وہ اس کی بچھائی ہوئی چیز کو پہنچے اور اجزاء مسجد میں سے کسی چیز کو کچھ نہ لگے۔ اھ

اور ابن حجرؒ نے جو ذکر کیا ہے یہ الافی ثوبہ کے اطلاق سے مفہوم ہوتا ہے (یعنی علامہ نوویؒ کے کلام الا فی ثوبہ سے یہی بات

معلوم ہوتی ہے) پس اس میں نظر صحیح نہ ہوگی جیسا کہ یہ بات واضح ہے، غور سے سمجھ لو اور حضور ﷺ کا چادر کو پکڑنے اور اس پر اقتصار کرنے کے ساتھ صورت بیان کرنا اس لئے ہے کہ لوگ اس وقت اپنے نیچے کوئی کپڑے وغیرہ نہیں بچھاتے تھے۔

امام نے قبلہ کی جانب تھوکا تو نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو ایسے امام مقرر کرنے کی ممانعت فرمادی

۷۴۷: وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ خَلَّادٍ وَهُوَ رَجُلٌ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اِنَّ رَجُلاً اَمَّ قَوْمًا فَبَصَقَ فِي الْقِبْلَةِ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَنْظُرُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِقَوْمِهٖ حِيْنَ فَرَغَ لَا يُصَلِّيْ لَكُمْ فَاَرَادَ بَعْدَ ذٰلِكَ اَنْ يُصَلِّيَ لَهُمْ فَمَنَعُوْهُ فَاَخْبَرُوْهُ بِقَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ نَعَمْ وَحَسِبْتُ اَنَّهٗ قَالَ اِنَّكَ قَدْ آذَيْتَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ١/٣٢٤ حديث رقم ٤٨١۔

ترجمہ: ''اور سیدنا سائب بن خلاد سے روایت ہے جو رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے ایک صحابی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص ایک جماعت کو نماز پڑھا رہا تھا اُس نے قبلہ کی طرف تھوک دیا۔ رسول اللہ ﷺ اس کی طرف دیکھ رہے تھے جب وہ نماز سے فارغ ہوگیا تو آپ ﷺ نے اس کے مقتدیوں سے فرمایا ''آئندہ سے یہ شخص تمہیں نماز نہ پڑھائے'' اس کے بعد اُس شخص نے جب نماز پڑھانی چاہی تو اُن لوگوں نے اسے نماز پڑھانے سے روک دیا اور اس سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد بیان کر دیا۔ وہ شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس واقعہ کا ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں میں نے ہی اُن کو تمہیں امام بنانے سے روک دیا۔ راوی کا بیان ہے کہ میرا خیال ہے آپ ﷺ نے اُس شخص سے امامت کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ تم نے اس ممنوع فعل کا ارتکاب کیا اور اس طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو تکلیف پہنچائی۔'' (ابوداؤد)

تشریح: هو :اور ایک نسخہ میں وَ هُوَ ہے۔(رجل من اصحاب النبی ﷺ) یہ بات شاید اس لئے ذکر کی کہ یہ مشہور صحابہ میں سے نہیں ہیں یا ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہوا ہوگا۔(ان رجلا ام قوما) اور شاید لوگ وفد کی صورت میں آئے ہوں۔(فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لقومه) مقتدیوں سے تب کہا' جب حضور ﷺ نے اس آدمی کی (حرکت) دیکھی۔

لا يصلي لكم :یاء کے اثبات کے ساتھ۔شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ' کہ اصل کلام یوں ہونا چاہیے تھا: **لا تصل لهم** پس اس سے نفی کی طرف عدول کیا اس بات کو بتلانے کیلئے کہ یہ آدمی امامت کی صلاحیت نہیں رکھتا اس کے اور امامت کے درمیان منافات ہے، نیز شدید غصے کی بناء پر اعراض کرتے ہوئے ایسا کیا کہ اس کو محل خطاب نہیں بنایا اور گویا یہ نہی اس کے غائب ہونے کی حالت میں ہے۔

وحسبت انه فقال :یعنی راوی کہتے ہیں میرے گمان کے مطابق حضور ﷺ نے نَعَمْ سے زیادہ بات کہی اور فرمایا:(انك قد أذيت) یعنی تو نے تکلیف دی ہے۔

الله ورسوله: اس میں بڑی عظیم تشدید ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا﴾ [الاحزاب: ٥٨] ''بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو تکلیف دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے (یعنی جہنم)''۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہاں ذکر یا تو تبرک کیلئے ہے یا اس بات کے بیان کرنے کیلئے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دینا اس کی نہی کی مخالفت کر کے خصوصاً ان کی موجودگی میں یہ اللہ تعالیٰ کو تکلیف دینے کے قائم مقام ہے۔ ابن حجرؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے اور ابن حجرؒ کا یہ کلام اس پر مبنی ہے کہ انہوں نے ایذاء کو حقیقت پر محمول کیا ہے۔

رواه ابو داود: اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں، میرکؒ نے اسی طرح کہا ہے۔ پھر میرکؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ سائب بن خلاد کی اس حدیث کا شاہد بھی موجود ہے وہ حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث ہے فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو ظہر پڑھانے کا حکم دیا اس نے قبلہ کی جانب تھوک دیا نماز پڑھانے کی حالت میں، پس جب عصر کا وقت ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے آدمی کی طرف نماز پڑھانے کا پیغام بھیجا، پس پہلا آدمی ڈر گیا، پس وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آیا اور اس نے کہا اے اللہ کے رسولؐ! کیا میرے بارے میں کوئی چیز نازل ہوئی ہے؟ فرمایا نہیں، لیکن تو نے لوگوں کو نماز پڑھانے کی حالت میں قبلہ کی جانب تھوکا تھا پس تو نے اللہ اور ملائکہ کو تکلیف دی۔

طبرانی نے اس کو جید اسناد کے ساتھ کبیر میں روایت کیا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب ارشاد فرمانا

٧٤٨: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ احْتَبَسَ عَنَّا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم ذَاتَ غَدَاةٍ عَنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ حَتّٰى كِدْنَا نَتَرَاءٰى عَيْنَ الشَّمْسِ فَخَرَجَ سَرِيْعًا فَثُوِّبَ بِالصَّلَاةِ فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَ تَجَوَّزَ فِيْ صَلَاتِهٖ فَلَمَّا سَلَّمَ دَعَا بِصَوْتِهٖ فَقَالَ لَنَا عَلٰى مَصَافِّكُمْ كَمَا اَنْتُمْ ثُمَّ انْفَتَلَ اِلَيْنَا ثُمَّ قَالَ اَمَا اِنِّيْ سَأُحَدِّثُكُمْ مَاحَبَسَنِيْ عَنْكُمُ الْغَدَاةَ اِنِّيْ قُمْتُ مِنَ اللَّيْلِ فَتَوَضَّأْتُ وَصَلَّيْتُ مَا قُدِّرَ لِيْ فَنَعَسْتُ فِيْ صَلَاتِيْ حَتَّى اسْتَثْقَلْتُ فَاِذَا اَنَا بِرَبِّيْ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى فِيْ اَحْسَنِ صُوْرَةٍ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ قُلْتُ لَبَّيْكَ رَبِّ قَالَ فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَاُ الْاَعْلٰى قُلْتُ لَا اَدْرِيْ قَالَهَا ثَلَاثًا قَالَ فَرَأَيْتُهٗ وَضَعَ كَفَّهٗ بَيْنَ كَتِفَيَّ حَتّٰى وَجَدْتُ بَرْدَ اَنَامِلِهٖ بَيْنَ ثَدْيَيَّ فَتَجَلّٰى لِيْ كُلُّ شَيْءٍ وَعَرَفْتُ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ قُلْتُ لَبَّيْكَ رَبِّ قَالَ فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَاُ الْاَعْلٰى قُلْتُ فِي الْكَفَّارَاتِ قَالَ مَاهُنَّ قُلْتُ مَشْيُ الْاَقْدَامِ اِلَى الْجَمَاعَاتِ وَالْجُلُوْسُ فِي الْمَسَاجِدِ بَعْدَ الصَّلَوَاتِ وَاِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ حِيْنَ الْكَرِيْهَاتِ قَالَ ثُمَّ فِيْمَ قُلْتُ فِي الدَّرَجَاتِ قَالَ وَمَا هُنَّ قُلْتُ اِطْعَامُ الطَّعَامِ وَلِيْنُ الْكَلَامِ وَالصَّلٰوةُ بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ قَالَ سَلْ قُلْتُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْأَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِيْنِ وَاَنْ تَغْفِرَلِيْ

وَتَرْحَمَنِيْ وَإِذَا أَرَدْتَّ فِتْنَةً فِيْ قَوْمٍ فَتَوَفَّنِيْ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ وَأَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ يُقَرِّبُنِيْ إِلَى حُبِّكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّهَا حَقٌّ فَادْرُسُوْهَا ثُمَّ تَعَلَّمُوْهَا۔ (رواه احمد والترمذی وقال هذا حديث حسن صحيح وسألتُ محمد ابن اسمٰعيل عن هذا الحديث فَقَالَ هٰذا حديث صحيح)

أخرجه الترمذی فی السنن ۵/۳۴۳ حديث رقم ۳۲۳۵۔ وقال : حديث حسن صحيح۔

ترجمه: اور سیدنا معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز میں تشریف لانے سے تاخیر فرمائی اور تاخیر اتنی ہوگئی قریب تھا کہ سورج نکل آئے اتنے میں آپ ﷺ عجلت سے تشریف لائے نماز کے لئے تکبیر کہی گئی اور آپؐ نے نماز پڑھائی نماز میں بہت تخفیف کی اور سلام پھیرنے کے بعد ہم سے مخاطب ہوئے اور بلند آواز سے فرمایا کہ ''جس طرح تم لوگ بیٹھے ہو اسی طرح اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہنا پھر آپؐ ہماری طرف متوجہ ہوئے تو فرمایا کہ تم کو معلوم ہے کہ میں نماز میں دیر سے آیا تو میں تمہیں دیر سے آنے کی وجہ بتانا چاہتا ہوں میں نے آج رات تہجد کی نماز کے لئے اٹھ کر وضو کیا اور جتنی نماز پڑھنا چاہتا تھا پڑھی نماز میں مجھے اونگھ آئی اور نیند مجھ پر غالب آ گئی تو اُس وقت میں نے اچانک اپنے پروردگار کو اچھی صورت میں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے فرمایا اے محمدؐ! میں نے عرض کیا میرے اللہ میں حاضر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہیں معلوم ہے کہ مقربین فرشتے کس بات میں بحث کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا اے میرے پروردگار میں نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے تین بار یہ بات پوچھی اور میں اسی طرح جواب دیتا رہا۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دونوں کندھوں کے درمیان اپنا ہاتھ رکھا یہاں تک کہ میں نے اس کی ٹھنڈک اپنے سینے کے درمیان میں محسوس کی اور میرے سامنے ہر چیز ظاہر ہوگئی اور میں تمام باتیں جان گیا پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمدؐ! میں نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں حاضر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اب بتاؤ مقربین فرشتے کس بات میں بحث کر رہے تھے؟ میں نے عرض کیا کہ گناہوں کو مٹا دینے والی چیزوں کے بارے میں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ کون سی چیزیں ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ جماعتوں کے واسطے مسجد میں جانا اور نماز پڑھ کر مسجد میں بیٹھے رہنا اور سختی کے وقت یعنی سردی اور بیماری میں باوجود تکلیف کے اچھی طرح وضو کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور کس کس چیز میں بحث کر رہے تھے؟ میں نے عرض کیا درجات کے بارے میں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ کیا ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ لوگوں کو کھانا کھلانا' نرم لہجے میں بات کرنا اور رات میں اس وقت نماز پڑھنا جب لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا اب اپنے لئے جو دعا چاہو کرو میں نے دعا کی کہ اے اللہ! میں تجھ سے نیکیاں کرنے اور برائیاں چھوڑنے' مسکینوں سے محبت کا سوال کرتا ہوں اور یہ کہ آپ میری مغفرت فرمادیں اور تیری رحمت کا سوال کرتا ہوں اور جب تو کسی قوم میں گمراہی ڈالنا چاہے تو مجھے بغیر گمراہی کے اپنی طرف اٹھا لے اور میں تجھ سے تیری محبت اور اس شخص کی محبت جو تجھ سے محبت کرتا ہے اور ایسے عمل کی محبت کا جو تیری محبت سے نزدیک کردے سوال کرتا ہوں پھر آپؐ نے فرمایا میرا یہ خواب حقیقت پر مبنی ہے۔ تم اسے خود یاد کرو اور دوسروں کو یاد کراؤ (احمد' ترمذی) اور امام ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن اسماعیل سے اس حدیث کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

تشریح: احتبس :یہ معلوم کے صیغہ کے ساتھ ہے اور مجہول کے ساتھ بھی مروی ہے۔(عن صلاۃ الصبح) یہ بدل اشتمال ہے حرف جر کے اعادہ سے۔

نتراء ی عین الشمس: نرٰی کی جگہ نتراء ی جمع کیلئے ذکر کیا۔علامہ طیبیؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے اور اس سے بھی اظہر بات وہ ہے جو ابن حجرؒ نے ذکر کی ہے کہ نرٰی سے نتراءی کی طرف اس لئے عدول کیا کیونکہ اس میں فعل کی طرف زیادہ توجہ کالحاظ رکھنا ہے اور اس کثرت توجہ کا سبب سورج کا طلوع ہونا ہے جو کہ فجر کی نماز کے اداء کو فوت کرنے والا ہے۔

علی مصافکم: یعنی اپنی جگہ پر ہی بیٹھے رہو، مصاف یہ مصف کی جمع ہے صف کی جگہ کو کہتے ہیں۔(کما انتم) یعنی اس حالت پر جس پر تم ہو، یا ایسا ثبوت جو اس ثبوت کی طرح ہو جو نداء سے پہلے تھا بغیر کسی تقدیم وتاخیر کی تبدیلی کے۔

ساحدثکم: سین محض تاکید کیلئے ۔ہے۔(الغداۃ) یہ ظرفیت کی بناء پر منصوب ہے۔(فنعست) فتح کے ساتھ یہ نعاس سے ہے، اونگھ کو کہتے ہیں۔(فاذا) یہ اذا مفاجاتیہ ہے۔

فی احسن صورۃ: یعنی صفتہٖ، اچھی صفت میں یا اس سے مراد تجلی صوری مراد ہے یا احسن صورہ حال ہے متکلم کی ضمیر سے جیسا کہ اس پر پہلے تفصیلی کلام ہو چکا ہے اور حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رویت نیند میں تھی، پس یہاں تاویل کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

قلت لبیّك: یعنی جواب کے بعد جواب اور اطاعت کے بعد اطاعت، اس میں اشارہ ہے عبودیت کے دوام کی طرف اور ربوبیت کے حق میں عبادت کے قیام کی طرف۔

رب: حرف نداء، یاء کے حذف کے ساتھ اور یاء اضافت کے حذف کے ساتھ۔(فیم) ماء استفہامیہ پر جب حرف جر داخل ہو جاتا ہے تو اس کا الف حذف ہو جاتا ہے۔

قالھا ثلاثا: یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ بات تین مرتبہ کہی اور تین مرتبہ میں نے اس کا جواب دیا لا ادری کے ساتھ عدم علم کے اعتراف کی تاکید کرتے ہوئے۔اور قالھا ثلاثا کو موخر ذکر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس کو ہم نے بیان کیا۔(بین کتفی) اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ کنایہ ہے قدرت اور ارادے کے تعلق سے۔

ظھر لی کل شی: یعنی عوالم علویہ اور سفلیہ میں سے مطلقاً جس چیز کے ظہور کو اللہ نے میرے لئے چاہا وہ ظاہر ہو گئی یا خصوصاً اس چیز میں سے کہ جس میں فرشتے بحث کر رہے تھے۔(وعرفت) امر کی حقیقت کو میں نے پہچان لیا اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا عرفتہ عیاناً یہ بیان کا محتاج ہے۔

الجلوس فی المساجد: جو کہ باغاتِ جنت ہیں۔(حین الکریھات) یعنی سردی کے ایام میں یا پانی کے مہنگا ہونے کے زمانے میں۔(قال ثم فیم) اس میں اشارہ ہے کفارات کے مقدم کرنے پر۔(اطعام الطعام) عام وخاص کو کھانا کھلانا۔

والناس نیام: یہ جملہ حالیہ ہے نیام یہ نائم کی جمع ہے۔(ثم قال سل) اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ دعائیں طاعات کے بعد ہوتی ہیں۔(وحب المساکین) یہاں اضافت دونوں طرح ہو سکتا ہے، الی الفاعل او الی المفعول۔بہتر اور مناسب اضافت الی المفعول ہے۔جیسا کہ اس سے پہلے جملوں میں ہے۔

ان تغفرلی: وہ جو مجھ سے کمی واقع ہوئی یعنی سیئات کو۔ (وترحمنی) میرے عبادات کو قبول کرنے کے ساتھ مجھ پر رحم فرما۔ (فتوفنی غیر مفتون) اس میں اشارہ ہے عافیت کے طلب کرنے اور سلامتی کے دوام کے حصول کی طرف حسن خاتمہ تک۔

واسئلك حبك: طیبیؒ فرماتے ہیں اس میں یہ احتمال ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اسئلك حبك ایای کہ میں تیرے مجھ سے محبت کرنے کا سوال کرتا ہوں، یا میں آپ کی محبت کا سوال کرتا ہوں۔ ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلا معنی اکمل ہے، پس اسی پر اعتماد کیا جائے گا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ﴾۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اسی تقریر پر (وحب من یحبك) کے قول کو محمول کیا جائے گا۔ ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہاں یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اضافت یہاں پر مفعول کی جانب لینا ہی زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہی تواضع کے زیادہ قریب ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اور باقی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد (وحب عمل یقرب نبی الی حبك) پس یہ دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ آپ عمل کی محبت کے طالب ہیں تاکہ آپ عمل کریں اور یہ عمل کرنا اللہ تعالیٰ کے آپ سے محبت کا وسیلہ بن جائے۔ پس مناسب ہے کہ اس حدیث کو محمول کیا جائے طرفین میں جس حد تک محبت ممکن ہے اس کی انتہاء پر۔ اور شاید کہ اللہ تعالیٰ کا آپ کو حبیب اللہ کہنے کا جو راز ہے وہ اس قول سے خالی نہیں اور علامہ طیبیؒ کا لا یَخْلو کا قول ظاہر ہے اور دوسرے احتمال سے خالی نہیں ہے۔

حق: اس لئے کہ انبیاء کے خواب وحی ہوتے ہیں۔ (فادرسوھا) یعنی تم ان الفاظ کو یاد کرو جو میں نے تمہارے لئے اس خواب کے ضمن میں ذکر کیئے یا یہ کلمات حق ہیں، پس اس کو پڑھو۔ (ثم تعلموھا) یعنی ان معانی کو جس پر یہ خواب دلالت کرتا ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں ای لتعلموھا۔ پس لام امر کو یہاں محذوف کر دیا گیا ہے۔

رواہ احمد والترمذی وقال ھذا حدیث حسن: ای لذاتہ، یعنی حسن لذاتہ۔ (صحیح) لغیر، یعنی صحیح لغیرہ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی "اَوْ" صحیح حرف تردید (اَوْ) کے حذف کی صورت میں یعنی اَوْ تنویع کیلئے ہے یعنی ایک قوم کے نزدیک حسن ہے اور دوسروں کے نزدیک صحیح ہے۔ اور اس کی تائید امام ترمذی کے امام بخاری سے سوال کرنے اور امام بخاریؒ کے اس کو جواب دینے سے ہوتی ہے جو آگے آنے والا ہے۔

اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا یعنی اس حدیث کی دو سندیں ہیں دونوں میں سے ایک کے ساتھ حسن ہے اور دوسرے کے ساتھ صحیح ہے۔ یا حسن سے مراد اس کا معنی لغوی ہے یعنی وہ روایت کہ جس کی طرف نفس مائل ہو اور اس کا انکار نہ کرے۔

مسجد میں داخلے کے وقت دُعائیہ الفاظ

۷۴۹: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ اِذَا دَخَلَ الْمَسْجِدَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِوَجْهِهِ الْكَرِيْمِ وَسُلْطَانِهِ الْقَدِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ قَالَ فَاِذَا قَالَ ذٰلِكَ قَالَ الشَّيْطَانُ حُفِظَ مِنِّيْ سَائِرَ الْيَوْمِ ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ۱/ ۳۱۸ حديث رقم ٤٦٦۔

ترجمہ: "اور سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی مسجد میں داخل ہوتے تو یہ دعا

پڑھتے: ((اَعُوْذُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَبِوَجْھِہِ الْکَرِیْمِ وَسُلْطَانِہِ الْقَدِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ)) یعنی میں عظمت والے اللہ جو بزرگ ذات والا ہے اور ہمیشہ سلطنت والا ہے اس کی شیطان مردود سے پناہ مانگتا ہوں۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا جو کوئی شخص مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ یہ بندہ پورے دن کے لئے میرے شر سے محفوظ ہو گیا۔'' (ابوداؤد)

تشریح: اذا دخل المسجد: یعنی جب مسجد میں داخل ہونے کا ارادہ کرتے دروازے تک پہنچنے کے وقت۔ (الکریم) جو اپنے بندوں پر احسان کرنے والا ہے اپنے بندوں پر فضل کرتے ہوئے۔ (من الشیطان) یہ شطن ای بُعد سے ماخوذ ہے یعنی اللہ کی رحمت سے دور کیا ہوا۔

الرجیم: یہ فعیل مفعول کے معنی میں ہے یعنی اللہ کے دروازے سے نکالا ہوا یا اللہ کی لعنت سے گالی دیا ہوا۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ خبر ہے اس کا معنی ہے دُعا یعنی اے اللہ میری شیطان کے وسوسے اور اس کے گمراہ کرنے اور اس کے اثرات اور اس کے خطرات سے اور اس کے بہکانے سے میری حفاظت فرما کیونکہ یہی شیطان گمراہی میں سبب ہے، اور گمراہی اور جہالت کا باعث ہے، ورنہ حقیقت میں ہدایت دینے والا اور گمراہ کرنے والا وہ اللہ ہی ہے۔

ورنہ بعض عارفین نے کہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے پناہ مانگنے کا حکم نہ دیا ہوتو میں سے اس سے پناہ نہ مانگتا کیونکہ یہ سب سے حقیر اور سب سے چھوٹا (کمتر) ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ پناہ مانگنا اس کی صفات سے ہو اور اس کے خلاق سے ہو یعنی حسد، تکبر، عجب (خود پسندی)، غرور انکار اور گمراہ کرنے سے۔

فاذا: ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ فاء فصیحہ ہے ای فقال النبی ﷺ اذا (قال) ای قائل (ذلک) یعنی مذکورہ قول کو، اور علامہ طیبیؒ فرماتے :ای فقال النبی اذا قال المؤمن ذلک۔

قال الشیطان حفظ منی سائر الیوم: یعنی بقیہ تمام دِن یا پورا دِن اور رات بھی اسی پر قیاس ہوگی یا یوم سے مطلق وقت ہے پس وہ رات کو بھی شامل ہوگا۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں اگر اس سے مراد اس کا جنس شیاطین سے محفوظ رہنا مراد ہوتو پھر اس کو ہر مخصوص شئ سے محفوظ رہنے پر محمول کرنا متعین ہوگا جیسے کبائر میں سب سے بڑے گناہ سے محفوظ ہونا یا مراد محفوظ ہونے سے صرف ابلیس سے خاص طور پر محفوظ ہونا ہے تو پھر حفاظت عموم پر باقی رہے گی اور جو اس کے باوجود گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ جنود ابلیس کے گمراہ کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے اور میں نے اس بات کو اس لئے ذکر کیا کہ ہم دیکھتے رہتے ہیں کہ بعض لوگ یہ دُعا پڑھتے ہیں پھر بھی بہت سارے گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں، پس حدیث کو اس پر محمول کرنا متعین ہوگا جس کو میں نے ذکر کیا ہے۔ اھ

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بات یاد رہے کہ الشیطان میں الف لام عہدی ہے اور اس سے مراد اِس کا وہ موکل ہے جو اس کے گمراہ کرنے پر مقرر ہے۔ اور اس دُعا کا پڑھنے والا وہ اس کی برکت سے اس قرین (شیطان) سے فی الجملہ اس وقت بعض گناہوں سے محفوظ ہو جاتا ہے اور بعض گناہوں کی تعیین اللہ کو معلوم ہے اور اللہ کے ہاں متعین ہے۔ اس سے یہ اشکال اُٹھ جاتا ہے۔ واللّٰہ اعلم بالحال۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی قبر مبارک کو شرک سے محفوظ رکھنے کی دعا کرنا

۷۵۰: وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ لَاتَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُعْبَدُ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰى قَوْمٍ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ ـ (رواه مالك مرسلا)

أخرجه مالك في الموطأ ١٧٢/١ حديث رقم ٨٥ من كتاب قصر الصلاة في السفر ـ

ترجمہ: ''اور سیدنا عطاء بن یسار سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی: اَللّٰهُمَّ لَاتَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُعْبَدُ ۔ اے میرے اللہ میری قبر کو بت نہ بنانا کہ لوگ اس کی عبادت کرنے لگیں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جن لوگوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا اُن پر اللہ تعالیٰ کا شدید غضب ہوا۔'' (مالک مرسلاً)

تشریح: عن عطاء بن یسار: یہ مشہور تابعی ہیں۔ (اللهم لا تجعل قبری وثنا یعبد) یعنی میری قبر کو بت کی طرح نہ بنائیے گا لوگوں کی تعظیم کرنے میں اور زیارت کیلئے دوبارہ آتے وقت اس کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہوئے ابتداء کرنے میں جیسا کہ ہم سنتے اور مشاہدہ کرتے رہتے ہیں آجکل بعض مزاروں اور قبور کے بارے میں (کہ لوگ وہاں سجدے کرتے ہیں اور تعظیم کرنے میں غلو کرتے ہیں)۔

اشتد: یہ استئناف ہے گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ آپ یہ دعاء کیوں مانگ رہے ہیں، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشتد غضب..... سے جواب دیا اپنی اُمت پر رحمت اور مہربانی کرتے ہوئے۔ علامہ طیبیؒ نے اس حدیث کی یوں تشریح فرمائی ہے۔ اور ابن حجرؒ نے بھی ان کی اس میں پیروی کی ہے۔ لیکن زیادہ واضح بات یہاں یہ ہے کہ یہ مبالغہ اُمتوں کے واقعے کے بارے میں خبر دیتا ہے اُمت مرحومہ کو ان کے فعل کی مشابہت اختیار کرنے سے ڈراتے ہوئے (یعنی یہ بھی ان کی طرح نہ کرنے لگیں) پس ان پر بھی اللہ تعالیٰ کا شدید غصہ واقع ہو جائے۔

علی قوم: یعنی یہود و نصاریٰ۔ (مرسلا) یعنی صحابی کا ذکر نہیں۔

باغات (صاف و شفاف مساجد) میں نماز پڑھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب تھا

۷۵۱: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم يَسْتَحِبُّ الصَّلَاةَ فِي الْحِيْطَانِ قَالَ بَعْضُ رُوَاتِهٖ يَعْنِي الْبَسَاتِيْنَ رواه الترمذی وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ لَا نَعْرِفُهٗ اِلَّا مِنْ حَدِيْثِ الْحَسَنِ بْنِ اَبِيْ جَعْفَرٍ قَدْ ضَعَّفَهٗ يَحْيَى بْنُ سَعِيْدٍ وَغَيْرُهٗ ـ

أخرجه الترمذي في السنن ١٥٥/٢ حديث رقم ٣٣٤ وقال حديث غريب لانعرفه إلا من حديث الحسن بن أبي جعفر ـ

ترجمہ: ''اور سیدنا معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ 'حیطان' میں نماز پڑھنا پسند فرماتے تھے اور اس حدیث کے بعد راویوں نے کہا ہے کہ حیطان سے مراد 'بساتین' یعنی باغات ہیں۔''

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے اس روایت کونقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اس لئے کہ یہ روایت بجز حسن بن ابی جعفر کی سند کے اور کسی سند سے منقول نہیں اور انہیں یحیٰ بن سعید وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔

تشریح: الصلاۃ: نفل نماز یا مطلق نماز۔ (فی الحیطان) یعنی دیوار کے قریب تا کہ کوئی گزرنے والا سامنے سے نہ گزرے اور کوئی چیز مشغولیت کا سبب نہ بنے۔ (قال بعض رواته البساتين) اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حیطان بھی بساتین کے معنی میں آتا ہے باقی یہاں اس کا مراد ہونا تو وہ محل بحث ہے۔ اور ابن حجرؒ نے اس کی حکمت میں بڑا طویل کلام کیا ہے کہ جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مختلف مساجد میں مراتب کے لحاظ سے اجر وثواب کا بیان

٧٥٢: وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةُ الرَّجُلِ فِيْ بَيْتِهٖ بِصَلَاةٍ وَصَلَاتُهٗ فِيْ مَسْجِدِ الْقَبَائِلِ بِخَمْسٍ وَعِشْرِيْنَ صَلَاةً وَصَلَاتُهٗ فِي الْمَسْجِدِ الَّذِيْ يُجَمَّعُ فِيْهِ بِخَمْسِمِائَةِ صَلَاةٍ وَصَلَاتُهٗ فِي الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى بِخَمْسِيْنَ اَلْفَ صَلَاةٍ وَصَلَاتُهٗ فِيْ مَسْجِدِيْ بِخَمْسِيْنَ اَلْفَ صَلَاةٍ وَصَلَاتُهٗ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ بِمِائَةِ اَلْفِ صَلَاةٍ . (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجة في السنن ١/٤٥٣ حديث ١٤١٣۔

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ''آدمی کی نماز اپنے گھر میں ایک ہی نماز کے برابر ہے اور محلہ کی مسجد میں نماز ادا کرنا پچیس نمازوں کے برابر ہے اور اس مسجد میں نماز ادا کرنا جہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہو پانچ سو نمازوں کے برابر اور مسجد اقصیٰ میں اور میری مسجد میں اس کی نماز پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور مسجد حرام میں یعنی بیت اللہ میں اس کی نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔'' (ابن ماجہ)

تشریح: صلاۃ الرجل: یعنی اکیلے کی نماز۔ اسی طرح بعض حضرات نے کہا ہے۔ اور زیادہ ظاہر بات یہاں یہ ہے کہ یہ صلاۃ الرجل اعم ہے۔

فی بیتہ: امام طحاوی اور بعض دوسرے حضرات نے فرمایا ہے کہ نماز سے مراد یہاں پر نفل کے علاوہ ہے حضور ﷺ کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ آدمی کی افضل نماز وہ ہے جو گھر میں پڑھی جائے سوائے فرض نماز کے۔ ابہریؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں یہاں یہ بات بعید نہیں ہے کہ اَجر کا دو چند ہونا نفل نماز کو بھی شامل ہے باوجود یکہ اِس کا گھر میں ہونا افضل ہے۔ واللہ اعلم

بصلاۃ: یعنی ایک نماز کے برابر ہے اس مکان کی وجہ سے اس کا اَجر دو چند نہیں ہوا گرچہ کسی دوسرے اعتبار مثلاً مکان یا زمان یا جماعت کی وجہ سے اس نماز کا اَجر دو چند ہو جائے اور حیثیت سے کہ جو ایک نیکی لے کر آئے اس کیلئے دس گنا ہو گا سات سو گنا تک اور اس مقدار تک کہ جس کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔

وصلاتہ: یعنی فرض نماز جماعت کے ساتھ اسی طرح بعض حضرات نے کہا ہے اور عموم مراد لینا زیادہ ظاہر ہے۔

(بخمس وعشرین صلاۃ) یعنی گھر کی نماز کی بنسبت نہ کہ مطلقاً جیسا کہ ابھی گزرا۔ (بخمسمائہ صلوٰۃ) یعنی محلے کی مسجد کی بہ نسبت۔

وصلاتہ فی المسجد الاقصیٰ: یعنی بیت المقدس کی مسجد میں اس کو اقصیٰ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے اور مکہ کے درمیان کافی مسافت ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ اقصیٰ (زیادہ مسافت والی) ہے مسجدِ نبوی سے کیونکہ مسجد نبوی مکہ سے دور ہے اور بیت المقدس اس سے بھی دور ہے۔

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس کو اقصیٰ اس لئے کہا ہے کہ اس کے ورے کوئی ایسی عبادت کی جگہ نہیں کہ جس کی طرف آدمی سفر کر کے جائے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس کو اقصیٰ کہا گندگیوں اور خباثت سے دور ہونے کہ وجہ سے۔ اور مُقَدَّسْ جو ان چیزوں سے پاک کیا ہوا ہے۔

بخمیسن الف صلوٰۃ: یعنی ماقبل کی بنسبت، اور سید جمال الدین کے اصل نسخہ کے حاشیے میں بالف صلوٰۃ اور یہی ظاہری نسخہ ہے۔

وصلاتہ فی المسجد الحرام بمائۃ الف صلوٰۃ: یعنی مسجد نبوی کی بنسبت جیسا کہ سیاق کلام اس پر دلالت کر رہا ہے۔ پس یہاں پر بعض اعداد کو بعض کے ساتھ ضرب دینے کی ضرورت ہے اس ضرب سے بہت زیادہ اَجر بنے گا جیسا کہ پہلے گزر چکا اور اسی کے ذریعے روایات میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ پھر ابن حجرؒ کے کلام کو میں نے دیکھا کہ انہوں نے میری موافقت کی ہے (واللہ اعلم)۔ جیسا کہ اس پر آئندہ کلام ہوگا۔

رواہ ابن ماجۃ: اور اس کے راوی ثقہ ہیں مگر ابوخطاب دمشقی جس کے بارے میں ابھی تک میرے پاس کوئی چیز نہیں پہنچی اور سوائے ابن ماجہ کے اصحابِ ستہ نے اس سے روایت نہیں کی، منذریؒ نے اسی طرح کہا ہے۔ اور ذہبیؒ نے فرمایا ابوالخطاب مشہور آدمی نہیں ہے اور شیخ ابن حجر عسقلانیؒ نے فرمایا ہے یہ مجہول ہے۔ میرکؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

اور ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے کیونکہ یہ روایت ثقات کے مخالف ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس روایت میں اور ثقات کی روایت میں تطبیق ممکن ہے اس طرح کہ ثقات کی اس روایت کو، کہ جماعت کی نماز اکیلے کی نماز کی بنسبت ۲۵ یا ۲۷ درجے زیادہ ہوتی ہے، اس پر محمول کیا جائے کہ یہ شروع میں تھی پھر اس مقدار کو زیادہ کر دیا گیا اس مسجد میں جس میں جمعہ قائم ہوتا ہے اور اسی طرح جو یہ آیا ہے، کہ مسجد اقصیٰ میں ایک نماز باقی مساجد میں ہزار نمازوں کے برابر ہے اور مسجد نبوی کی ایک نماز مسجد اقصیٰ میں ہزار نمازوں کے برابر ہے، یہ دونوں باتیں شروع میں تھیں پھر ان دونوں میں زیادتی کی گئی پس پہلی میں ۵۰ ہزار نمازوں کی زیادتی ہوئی (یعنی باقی مساجد کی ۵۰ ہزار نمازوں کے برابر مسجد اقصیٰ کی ایک نماز ہے) اور دوسری یعنی مسجد نبوی میں ۵۰ ہزار نمازوں کی زیادتی مسجد اقصیٰ کی نمازوں میں ہوئی (یعنی مسجد نبوی کی ایک نماز مسجد اقصیٰ کی ۵۰ ہزار نمازوں کے برابر ہے) اور مسجد الحرام کی ایک نماز مسجد نبوی کی ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہوئی اس صورت میں اَجر کا دوچند ہونا وہ بڑھتا ہی چلا جائے گا جیسا کہ ہم نے باب کے شروع میں مسجد الحرام اَجر کے کئی گُنا تک بڑھنے کو بتلایا۔ پس اس میں تو غور کرے ایک لاکھ کو ۵۰ ہزار، ہزار میں ضرب دیتے ہوئے پھر اس کے حاصل شدہ کو ۵۰ ہزار میں، تو اے مخاطب تجھے ہماری ذکر کی

ہوئی بات کی صحت معلوم ہوگی اور اس بات کی وضاحت جو ہم نے تحریر کی ہے۔ (ایک لاکھ کو ٥٠ ہزار، ہزار میں ضرب سے ٥٠ کھرب کا نتیجہ نکلتا ہے پھر ٥٠ کھرب کو ٥٠ ہزار میں ضرب دینے سے ١٦/١٠×٢٥ کا نتیجہ نکلتا ہے (یعنی اتنی مقدار کہ جس کو گننا بھی مشکل ہے)۔

بیت اللہ کی افضلیت کا بیان

٧٥٣: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ مَسْجِدٍ وُضِعَ فِی الْاَرْضِ اَوَّلُ قَالَ الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ قُلْتُ ثُمَّ اَیٌّ قَالَ ثُمَّ الْمَسْجِدُ الْاَ قْصٰی قُلْتُ کَمْ بَیْنَهُمَا قَالَ اَرْبَعُوْنَ عَامًا ثُمَّ الْاَرْضُ لَكَ مَسْجِدٌ فَحَیْثُ مَا اَدْرَكَتْكَ الصَّلَاۃُ فَصَلِّ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٦/٤٠٧حدیث رقم ٣٣٦٦_وأخرجه مسلم فی صحیحه ١/٣٧٠حدیث رقم (٢_٥٢٠) واللفظ له_ وأخرجه النسائی فی السنن ٢/٣٢حدیث رقم ٦٩٠_وأخرجه ابن ماجة فی السنن ١/٢٤٨ حدیث رقم ٧٥٣_وأخرجه أحمد فی المسند٥/١٥٦_

ترجمہ: ''سیدنا ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمین کے اوپر سب سے پہلی مسجد کونسی بنائی گئی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسجد حرام یعنی بیت اللہ۔ میں نے عرض کیا اس کے بعد؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس۔ پھر میں نے پوچھا کہ ان دونوں مسجدوں کے درمیان کتنا عرصہ گزرا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چالیس سال۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اب تو ساری زمین تمہارے لئے مسجد ہے جہاں نماز کا وقت ہو جائے وہیں نماز ادا کرلو''۔ (سوائے ممنوع مقامات کے)۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: وضع فی الارض: یعنی جو عبادت کیلئے بنائی گئی ہو نہ کہ وہ جو دیواروں کے ساتھ تعمیر کی گئی ہو۔

اول؟: اولُ لام کے ضمہ کے ساتھ ہے ابوالبقاءؒ نے فرمایا ہے کہ اول یہ مبنی برضمہ ہے منقطع الاضافت ہونے کہ وجہ سے قبلُ) اور بعدُ کی طرح، تو تقدیر عبارت ہوگی اول کل شی اور فتحہ بھی جائز ہے منصرف ہونے کی حالت میں اور غیر منصرف ہونے کی حالت میں۔ ابھریؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

اور ابوالبقاء کا یہ کہنا کہ منصرف ہونے کی حالت میں...... تو یہ اس جگہ کے علاوہ ہے اس لئے کہ یہاں اسم اس کی تائید نہیں کرتا اور غیر منصرف ہونے کی حالت کا قول تو وہ ظرفیت کی بناء پر منصوب ہونے کی وجہ سے ہے اور اول کا غیر منصرف ہونا یہ وزن فعل اور وصفیت کی بناء پر ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ﴿وَالرَّکْبُ اَسْفَلَ مِنْکُمْ ط﴾۔

المسجد الحرام: پس بے شک ابراہیم علیہ السلام نے اس کی تجدید کی تھی۔ (المسجد الاقصٰی) علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ داؤد اور سلیمان علیہما السلام نے مسجد اقصیٰ کے منہدم ہو جانے کے بعد اس کو بنیادوں سے اٹھایا تھا اور ان دونوں حضرات نے اس میں کچھ اضافہ کی تھی۔

قلت کم بینهما؟ قال اربعون عامًا: ابہریؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں اشکال ہے کیونکہ ابراہیم علیہ السلام نے

کعبۃ اللہ کو بنایا اور سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کو یعنی سلیمان علیہ السلام تو اہل تواریخ کے مطابق ابراہیم علیہ السلام سے ۱۰۰۰ سال سے بھی زیادہ عرصہ بعد میں آئے ہیں (تو پھر یہ ۴۰ سال کا کیا مطلب) اور اس بات کی دلیل کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مسجد اقصیٰ کو بنایا ہے، نسائی کی روایت ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے سال اللہ تعالی خلالا ثلاثا...... (پوری حدیث نسائی میں فضل المسجد الاقصیٰ میں مذکور ہے)۔ اور سب سے بہتر جواب ابن الجوزیؒ نے دیا ہے کہ یہاں اول سے مراد اول بناء کی طرف اشارہ ہے یعنی سب سے پہلی تعمیر اور مسجد کی سب سے پہلے بنیاد۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ پہلے آدمی نہیں ہیں جنہوں نے کعبہ کو بنایا اور نہ سعی سلیمان علیہ السلام وہ پہلے آدمی ہیں کہ جنہوں نے بیت المقدس کو بنایا، پس تحقیق ہم نے یہ روایت نقل کی ہے کہ سب سے پہلے کعبہ کی تعمیر آدم علیہ السلام نے ہی ہے پھر آدم علیہ السلام کی اولاد زمین میں پھیل گئی تو ممکن ہے کہ اولادِ آدمؑ میں سے کسی نے بیت المقدس کی بنیاد بھی رکھ دی ہو پھر ابراہیمؑ نے کعبہ کی تعمیر کی ہو۔ شیخ نے فرمایا ہے کہ میں نے اس بات کا شاہد بھی پایا ہے پس ابن ہشام نے کتاب التیجان میں ذکر کیا ہے کہ آدم علیہ السلام نے جب کعبہ کو تعمیر کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بیت المقدس کی طرف سفر کرنے اور جانے کا حکم دیا اور یہ کہ اس کو تعمیر کریں پس آدم علیہ السلام نے اس کو تعمیر کیا اور اس میں عبادت بھی کی اور آدم علیہ السلام کا کعبۃ اللہ کو تعمیر کرنا تو مشہور و معروف ہے۔ اھ

ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس اشکال اٹھانے والے کی بات اس لئے مردود ہے کہ یہ تاریخ سے جہالت ہے کیونکہ سلیمان علیہ السلام وہ مجدد تھے نہ کہ مؤسس یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام نے دوبارہ از سرِ نو تعمیر کی تھی، بنیاد رکھنے والے نہیں تھے۔ بنیاد رکھنے والے حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں اور یہ بنیاد انہوں نے اپنے دادا ابراہیم علیہ السلام کے کعبہ کو تعمیر ۴۰ سال کے بعد رکھی اور ابو حاتم بن حبان بستی کو اپنی صحیح میں اس حدیث کے سمجھنے میں دھوکہ لگا ہے، انہوں نے حدیث کو ظاہر پر محمول کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابراہیم اور داؤد علیہما السلام کے درمیان ۴۰ سال ہیں اور اس شخص کی بات کا رد کیا ہے کہ جس نے یہ گمان کیا ہے کہ ان دونوں کے درمیان ۱۰۰۰ سال کی مدت ہے اور جس طرح ابو حاتم نے سمجھا ہے اس طرح نہیں ہے اور حافظ ضیاء المقدسیؒ نے فرمایا ہے کہ حدیث کی وجہ یہ ہے کہ دونوں مساجد قدیم زمانے میں بنائی گئی پھر دونوں خراب ہو گئیں (یعنی منہدم ہو گئیں) پھر ان کی تعمیر کی گئی اور بعض حضرات نے کہا کہ اس حدیث سے یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ مسجد الحرام سب سے پہلی مسجد ہے جو روئے ارض پر بنائی گئی اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ سب سے پہلی تعمیر تھی جو روئے ارض پر کی گئی اور علماء کرام کا: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ﴾ [آل عمران: ۹۶] ''پہلا گھر جو لوگوں (کے عبادت کرنے) کے لئے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو مکے میں ہے بابرکت اور جہاں کے لئے موجب ہدایت'' کے بارے میں اختلاف ہوا ہے اور آیت کا سبب نزول یہود کا یہ قول ہے کہ بیت المقدس کعبہ سے افضل ہے اور مسلمان اس کے برعکس کہتے تھے۔ پس بعض حضرات نے کہا کہ یہ سب سے پہلا گھر ہے جو مطلقاً بنایا گیا اور اسی قول کی بنیاد پر بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہی وہ پہلی چیز ہے جو پانی کے اوپر اس وقت رکھی گئی جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا، پس کعبہ کو اللہ تعالیٰ نے زمین کے پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا اور اس بیت اللہ کے نیچے زمین کو بچھایا۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ زمین کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے کعبہ موجود تھا اور پانی پر تھا اور اس پر دو فرشتے تھے

جو دن رات تسبیح کرتے رہتے تھے۔

اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ دنیا کو پیدا کرنے سے ہزار سال پہلے کعبہ کو پانی پر چار ارکان (ستونوں) پر رکھا گیا پھر زمین کو اس کے نیچے سے بچھایا گیا۔

اور مجاہدؒ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بیت اللہ کی جگہ کو زمین سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا اور اس کی بنیادیں نیچے ساتوں زمین تک پہنچی ہوئی اور ملی ہوئی ہیں۔

اور کعبؒ نے فرمایا ہے کہ کعبہ زمین و آسمان کے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے پانی پر ایک جھاگ کی طرح تھا اور اسی سے زمین کو بچھایا گیا۔

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام کو جب زمین پر اُتارا گیا تو وہ اجنبیت محسوس کرنے لگے پس اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ میرے لئے زمین پر ایک گھر بناؤ اور اس کے اردگرد تم وہی عمل بجالاؤ جو تم نے فرشتوں کو میرے عرش کے اردگرد کرتے دیکھا ہے پس آدم علیہ السلام نے گھر کو تعمیر کیا اس روایت کو ابو صالح نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ بیت اللہ کو حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اُتارا گیا پس جب طوفان نوح آیا تو اس کو آسمانوں پر اٹھالیا گیا اور وہی آسمانوں میں بیت المعمور بن گیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے انہی نشانات پر کعبہ کی تعمیر کی۔ یہ قتادہؒ نے کی روایت ہے۔

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ حدیث کا معنی یہ ہے کہ اس کو آدم اور حواء علیہما السلام نے بنایا ہے کیونکہ دلائل النبوۃ میں بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مرفوعاً یہ روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو آدم اور حواء کی طرف بھیجا اور ان دونوں کو کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا پس آدم علیہ السلام نے اس کو تعمیر کیا پھر اللہ تعالیٰ نے کعبہ کے طواف کا حکم دیا اور آدم علیہ السلام سے یہ کہا گیا کہ آپ لوگوں میں سے سب سے پہلے ہیں اور یہ سب سے پہلا گھر ہے جو روئے ارض میں بنایا گیا اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ کعبہ سے پہلے بھی کئی گھر تھے سب سے پہلے جس نے کعبہ کی تعمیر کی وہ شیث بن آدم ہیں اور بیت اللہ کی تعمیر سے پہلے یہ سرخ یاقوت تھا آدم علیہ السلام اس کا طواف کرتے تھے اور اس سے مانوس تھے اس لئے کہ یہ سرخ یاقوت جنت سے آیا تھا پھر طوفانِ نوح سے اس کے نشانات محو ہو گئے یہاں تک کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس کو تعمیر کیا۔

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے پہلے کئی گھر تھے لیکن یہ سب سے پہلی مسجد ہے جو روئے ارض پر بنائی گئی کیونکہ بیہقیؒ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ان سے ایک آدمی نے سوال کیا: **اول بیت وضع للناس للذی ببکة**، کے بارے میں کہ کیا یہی وہ گھر تھا جو زمین پر سب سے پہلے بنایا گیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا نہیں اس سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام تھے اور وہ گھروں میں رہتے تھے اور ابراہیم علیہ السلام اس سے پہلے تھے اور وہ بھی گھروں میں رہتے تھے لیکن یہ سب سے پہلا وہ گھر ہے کہ جس میں برکت اور ہدایت کو رکھا گیا، اور جو اس میں داخل ہوگا وہ مامون ہو جائے گا۔

پس اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وضع وہ بناء کے علاوہ ہے اور بعض متاخرین نے اسی قول کو صحیح قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہی قول یقینی طور پر آیت سے مراد ہے اس لئے کہ اس کو بنانے سے مراد عبادت کیلئے بنانا ہے پس فضیلت اور

شرف میں اولیت پر آیت کی دلالیت ایسا امر ہے جو بدیہی طور پر ثابت ہے۔اس لئے کہ اولیت کے ذکر سے مقصود اولیٰ اس فضیلت کا بیان ہے جو کعبۃ کو بیت المقدس پر ترجیح دینے کیلئے ہے اور اس فضیلت میں تعمیر میں پہلے ہونے کی وجہ سے کوئی تاثیر نہیں ہے اور ابن الجوزیؒ نے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے اسلام میں مسجد بنائی وہ عمار بن یاسر ہیں۔ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس سے مسجد قباء مراد ہے۔

فحیثما ادرکتك الصلاۃ فصل : اور ایک صحیح نسخہ میں **فصلہ** ہاء سکوت کے ساتھ ہے۔

علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اے ابو ذر! تو نے ان جگھوں کے بارے میں سوال کیا میں جن کو مساجد بنایا گیا اور عبادت کو ان کے ساتھ خاص کیا گیا اور یہ کہ ان میں سے کونسی زمانے کے اعتبار سے مقدم ہے پس میں نے تجھے ان دونوں مساجد کے بنائے جانے اور ان کے باقی مساجد پر فوقیت اور تقدم کو بتلا دیا، پھر تجھے اس بات کی خبر دیتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اور میری اُمت پر انعام کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حرج کو ختم فرما دیا ہے اور ساری زمین کو ادائے عبادت کے لئے برابر درجہ کی بنا دیا ہے۔

متفق علیہ:اور بخاریؒ کے بعض طرق میں یوں ہے: **فاینما ادرکتك الصلاۃ فصل فان الفضل فیہ** کہ جہاں نماز کا وقت ہو جائے نماز پڑھ لو کیونکہ فضیلت اسی میں ہے۔اور عمرو بن شعیب کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: **وکان من قبلی انما کانوا یصلون فی کنائسھم** کہ میری بعثت سے پہلے یہ یہود و نصاریٰ اپنے کلیساؤں اور گرجا گھروں میں عبادت کرتے تھے اور ابن عباسؓ کی حدیث میں یہ گزر چکا ہے کہ انبیاء میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا کہ وہ نماز پڑھے یہاں تک کہ اپنے محراب میں نہ پہنچ جائے (یعنی نماز صرف اپنے اپنے محراب میں پڑھتے تھے) اور اس سے ان لوگوں کا قول باطل ہو جاتا ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ: **جعلت لی الارض مسجدا وطھورا** والی حدیث کا معنی یہ ہے کہ: **جعلت لغیری مسجدا لاطھورا** (یعنی میرے علاوہ کیلئے مسجد تو زمین کو بنایا گیا نہ کہ پاک کرنے والی) اس لئے کہ عیسیٰ علیہ السلام وہ زمین میں سیاحت کرتے تھے اور جہاں ان کو نماز کا وقت ہو جاتا وہ نماز پڑھ لیتے (تو ماقبل تقریر سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ انبیاءؑ بھی وہ صرف محراب میں نماز پڑھتے باقی رہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا عمل) تو ممکن ہے کہ یہاں یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کیلئے کئی جگھوں کو محراب بنا دیا تھا اور تمام انبیاء سے عیسیٰ علیہ السلام کو خاص کیا گیا کیونکہ وہ آخری عمر میں ہمارے نبی ﷺ کے تابع ہونگے۔

بَابُ السَّتْرِ

ستر ڈھانپنے کا بیان

یعنی شرمگاہ اور دیگر اعضاء کا ستر۔ستر فتحہ کے ساتھ مصدر ہے سترۃ کا لفظ اسوقت بولا جاتا ہے جب اسے ڈھانپا جائے اور کسرہ کے ساتھ ستور اور استار کی واحد ہے اور بدن اور کپڑے کی طہارت کو شامل ہے۔

الفصل الاول:

ایک چادر میں نماز پڑھنے کا مسئلہ

۷۵۴: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ اَبِیْ سَلَمَةَ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ فِيْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ مُشْتَمِلاً بِهٖ فِيْ بَيْتِ اُمِّ سَلَمَةَ وَاضِعًا طَرَفَيْهِ عَلٰى عَاتِقَيْهِ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤٦٩/١حديث رقم ٣٥٦۔وأخرجه مسلم في صحيحه ٣٦٨/١حديث رقم (٢٧٨۔٥١٧) وأخرجه الترمذي في السنن ١٦٦/٢حديث رقم ٣٣٩۔وأخرجه مالك في الموطأ ١٤٠/١ حديث رقم ٢٩من كتاب صلاة الجماعة وأخرجه أحمد في المسند ٢٦/٤۔

ترجمہ: ''حضرت عمر بن سلمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں ایک کپڑے میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ آپ اس کپڑے کو اپنے جسم سے اس طرح لپیٹے ہوئے تھے کہ اس کے دونوں کنارے آپ ﷺ کے کندھوں پر تھے۔'' (بخاری ومسلم)

راویٔ حدیث:

عمر بن ابی سلمة ۔ یہ عمر بن ابی سلمہ ہیں۔ ان کا نام ''عبداللہ بن عبدالاسد'' مخزومی قریشی ہیں اور یہ ''عمر'' آنحضور ﷺ کے لے پالک تھے۔ ان کی والدہ ''ام سلمہ'' ہیں جو ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے ہیں۔ ۲ھ میں حبشہ میں پیدا ہوئے اور جس وقت آنحضور ﷺ کی وفات ہوئی۔ ان کی عمر ۹ سال کی تھی۔ ان کے والد بھی صحابی تھے۔ ۸۳ھ میں بزمانہ عبدالملک بن مروان مدینہ میں وفات پائی۔ آنحضور ﷺ سے احادیث کو سن کر یاد کیا اور آنحضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ایک جماعت نے احادیث نقل کی ہیں۔

تشریح: **عن عمرو بن ابی سلمه رضی الله عنها**: یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اربیب ہیں اور ان کی والدہ کا نام ام سلمہ ہے اور ان کے والد قریشی مخزومی ہیں۔

قال رایت رسول الله صلی الله علیه وسلم یصلی فی توب واحد مشتملاً: مشتملاً یہ بخاری کے اکثر نسخ میں نصب کے ساتھ ہے اور کشمنی اور حموی کی روایت کے مطابق جر کے ساتھ ہوگا مجاورت کی بناء پر یا رفع کے ساتھ ہوگا حذف کی بناء پر۔ ابہری نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ اور حذف سے مراد یہ ہے کہ مبتدا حذف ہے جو ھو ہے۔

به: یعنی اس کپڑے کے ساتھ اپنے بدن کو لپیٹا ہوا تھا۔ یعنی اس کے کچھ حصے کو بطور ازار استعمال کیا ہوا تھا اور اس کے ایک حصے کو اپنے کندھے پر لٹکایا ہوا تھا۔ شرح المصابیح میں روایت کیا گیا ہے کہ مشتملاً نصب کے ساتھ ہوگا۔ یعنی یک طویل ازار میں تھے۔ طیبیؒ کہتے ہیں کہ اشتمال اُس مخالفت کو کہتے ہیں جو ایک کپڑے کی دو طرفوں سے ہو یعنی کسی کپڑے کو بائیں ہاتھ کے نیچے سے دائیں کندھے کے اوپر ڈالا ہو اور دوسری طرف دائیں ہاتھ کے نیچے سے بائیں کندھے پر ڈالا گیا ہو پھر ان دونوں اطراف کو سینے پر باندھ دیا جائے تا کہ وہ نیچے نہ لٹکے۔

في بيت ام سلمة: یہ امہات المؤمنین میں سے ہیں۔

واضعا طرفيه: یہ مشتملا کی تفسیر ہے۔

على عاتقيه: عاتق کندھے سے گردن تک درمیان والے حصے کو کہتے ہیں۔

متفق عليه: اس روایت کو ابوداؤدؒ، ترمذیؒ اور نسائی نے ذکر کیا ہے۔

نماز میں کندھوں کو ڈھانپنا چاہیے

۷۵۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايُصَلِّيَنَّ اَحَدُكُمْ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ لَيْسَ عَلٰى عَاتِقَيْهِ مِنْهُ شَيْءٌ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤٧١/١حديث رقم ٣٥٩۔وأخرجه مسلم في صحيحه ٣٦٨/١حديث رقم (٢٧٧۔٥١٦) واللفظ له إلا قوله "لا يصلين"فقد ذكره "لايصلي"۔ وأخرجه أبوداوٗد في السنن ٤١٤/١حديث رقم ٦٢٦وذكر "منكبيه" بدل"عاتقيه"۔وأخرجه النسائي بهذا اللفظ ٧١/٢حديث رقم ٧٦٩۔وأخرجه الدارمي في السنن ٣٦٧/١حديث رقم ١٣٧١وأخرجه أحمد في مسند ٢٤٣/٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی آدمی ایک کپڑے میں (اس حالت میں) نماز نہ پڑھے کہ اس کپڑے کا کوئی حصہ اس کے کندھوں پر نہ ہو۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: وعن ابی هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ولايصلين احدكم في الثوب الواحد: ابن اثیر کہتے ہیں اور **صحيحين** کی روایت میں **لا يصلي** اثبات ''یاء'' کے ساتھ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ''لا'' نافیہ ہے اور خبر ''نہی'' کے معنی میں ہے۔ میرکؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

وليس على عاتقيه منه شئي: یہ جملہ منفیہ حال ہے نووی، ابن حجر اور اکثر علماء فرماتے ہیں کہ یہ اُس وقت ہے جب اُس کپڑے کو بطور ازار استعمال کیا جائے اور کندھے پر کوئی چیز نہ ہو اُس وقت ستر کھلنے کا ڈر رہے گا۔ بخلاف اُس صورت کے جب کپڑے کا کچھ حصہ کندھے پر ڈال دیا جائے۔ پہلی صورت میں منع اس لئے فرمایا ہے کہ اُس کپڑے کو ہاتھ سے پکڑنے کی ضرورت ہوگی تو وہ اس میں مشغول ہو جائے گا اور وہ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھنے پر قادر نہیں ہوگا۔ لہٰذا وہ سنت فوت ہو جائے گی جو کہ نماز میں مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ [الاعراف: ۳۱] ''ہر نماز کے وقت اپنے تئیں مزین کیا کرو''۔

میں کہتا ہوں کہ یہ تمام بات جو ان حضرات نے ذکر کی ہے ساری گفتگو محل نظر ہے یہ تمام بات جو ان حضرات نے ذکر کی ہے اس بناء پر ہے کہ ضمیر کو اُسی کپڑے کی طرف لوٹایا جائے، حالانکہ درست یہ ہے کہ یہ ضمیر مطلق کپڑے کی طرف لوٹ رہی ہے لہٰذا اس صورت میں ازار کی چادر کا کندھے پر رکھنا سنت ہوگا اور اس پر قادر ہونے کے باوجود چھوڑنا کراہت ہوگا۔ اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روایت میں قصداً مبالغہ کہا کہ اگر وہ کوئی کپڑا نہ پائے تو اسی کپڑے کو کندھے پر رسّی کی طرح لٹکالے تاکہ کندھا

بالکل خالی نہ جائے۔ایک روایت میں ہے کہ کچھ نہ کچھ پہنو اگرچہ وہ رسّی کا حصہ کیوں نہ ہو۔اسی روایت کی تائید اُس تفصیلی روایت سے ہوتی ہے جو کہ شیخین نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں فرمایا جب تم نماز پڑھو اور تمہارے پاس ایک کپڑا ہو اگر وہ کپڑا وسیع ہو تو اسے لپیٹ لو اور تنگ ہو تو ازار بند کے طور پر استعمال کرو۔اور مسلم کے الفاظ ہیں کہ اگر وہ کپڑا وسیع ہو تو دونوں جانبوں پر ڈال لینا چاہیے اور اگر وہ تنگ ہو تو ازار کی جگہ باندھ لے۔اس میں حکمت یہ ہے کہ، کہ وہ نمازی بالکل ہی خالی نہ ہو اس لئے کہ یہ ادب کے زیادہ قریب ہے اور اللہ تعالیٰ سے حیاء میں زیادہ مناسب ہے اور زینت حاصل کرنے میں زیادہ کامل ہے۔واللہ اعلم۔پھر نوویؒ، مالکؒ، ابوحنیفہؒ، شافعیؒ اور جمہور کہتے ہیں کہ یہ نہی تنزیہ پر محمول ہے نہ کہ تحریم پر۔لہٰذا اگر ایک آدمی ایک کپڑے میں ستر چھپا کر نماز اداء کرے اور اس کی کندھے پر کوئی شئی نہ ہو تو اس کی نماز صحیح ہو گی لیکن کراہت کے ساتھ۔جب کہ امام احمدؒ اور بعض سلف اس بات کے قائل ہیں کہ ظاہری حدیث پر عمل کرتے ہوئے نماز صحیح نہ ہو گی۔

متفق عليه: میرکؒ کہتے ہیں کہ اس میں کئی وجوہ سے نظر ہے۔پہلی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں میں **لا يصلين** کا لفظ نہیں ہے بلکہ ان میں **لا يصلي** استعمال ہوا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ **على عاتقيه** بخاری میں نہیں ہے بلکہ اُس میں **على عاتقه** ہے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ "**منه**" یہ بخاری میں نہیں ہے یہ مسلم کے افراد میں سے ہے جیسا کہ شیخ ابن حجرؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔غرائب مالک میں دارقطنی نے امام شافعیؒ کے واسطے سے **لایصل** بغیر "یاء" کے نقل کیا ہے جب کہ عبدالوھاب بن عطاء کے واسطے سے لفظ **لا يصلين** ہے یعنی تاکید کے اضافے کے ساتھ ہے۔ابہری اسی طرح کہتے ہیں۔

۷۵۲: وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ صَلّٰى فِيْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ فَلْيُخَالِفْ بَيْنَ طَرَفَيْهِ۔ (رواه البخاري)

أخرجه البخاري في صحيحه ١/٤٧١ حديث رقم ٣٦٠۔وأخرجه أبوداوٗد في السنن ١/٤١٤ حديث رقم ٦٢٧ وزاد "على عاتقيه" وأخرجه أحمد في المسند ٢/٢٥٥۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو آدمی صرف ایک کپڑے میں نماز پڑھے اسے چاہئے کہ کپڑے کے دونوں کناروں کو ایک دوسرے کے مخالف رکھے۔"

(بخاری)

تشریح: **وعنه**: یعنی ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ "**قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من صلى في ثوب**" یعنی ایک کپڑے میں نماز پڑھے۔صحیح نسخوں میں ایسا ہی ہے۔

فليخالف: یعنی اس کے ایک طرف کو بطور ازار استعمال کرنا چاہیے اور دوسری طرف کو کندھے پر ڈال لینا چاہیے کہا جاتا ہے کہ، کہ وہ دائیں طرف کو بائیں طرف پر اور بائیں طرف کو دائیں طرف رکھ لے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ احرام باندھنے والے کی طرح کرے، اور جب کپڑا تنگ ہو تو اس کو گرہوں سے باندھ لے۔(رواه البخاري)

نقش ونگار والی چادر میں نماز پڑھنے کا مسئلہ

۷۵۷: وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ خَمِيْصَةٍ لَهَا اَعْلَامٌ فَنَظَرَ اِلٰى اَعْلَامِهَا نَظْرَةً فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ اذْهَبُوْا بِخَمِيْصَتِيْ هٰذِهٖ اِلٰى اَبِيْ جَهْمٍ وَاْتُوْنِيْ بِاَنْبِجَانِيَّةِ اَبِيْ جَهْمٍ فَاِنَّهَا اَلْهَتْنِيْ اٰنِفًا عَنْ صَلَاتِيْ (متفق عليه وفي رواية للبخاري) قَالَ كُنْتُ اَنْظُرُ اِلٰى عَلَمِهَا وَاَنَا فِي الصَّلَاةِ فَاَخَافُ اَنْ يَفْتِنَنِيْ.

أخرجه البخاري في الصحيح مع زيادة الرواية الثانية۔ ۱/۴۸۲ حديث رقم ۳۷۳۔ وأخرجه مسلم في الصحيح ۱/۳۹۱ حديث رقم (۶۲۔۵۵۶) واللفظ للبخاري ۔ وأخرجه أبوداوٗد في السنن مختصرًا ۱/۵۶۲ حديث رقم ۹۱۴۔ وكذلك النسائي في السنن ۲/۷۲ حديث رقم ۷۷۱۔ وابن ماجة في السنن ۲/۱۱۷۶ حديث رقم ۳۵۵۰ والامام مالك في الموطأ ۱/۹۷ حديث رقم ۶۷ من كتاب الصلاة ۔ وأحمد في مسنده ۶/۱۷۷۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسی چادر میں نماز پڑھی جس پر نقش و نگار تھا چنانچہ آپ نے اس کے نقش و نگار کی طرف دیکھا جب نماز سے فارغ ہوئے تو ارشاد فرمایا یہ چادر ابوجہم کے پاس لے جاؤ اور ابوجہم سے انجانیہ کی چادر لے آؤ کیونکہ اس چادر نے ابھی مجھے نماز سے غفلت میں ڈال دیا۔ (بخاری ومسلم) اور بخاری کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نماز کے دوران اس چادر کے نقش و نگار کی طرف دیکھنے لگا اور مجھے یہ خوف ہوا کہیں یہ میری نماز نہ خراب کر دے۔''

تشریح: **وعن عائشة قالت: صلی رسول الله صلی الله علیه وسلم فی خمیصة:** نہایہ میں ہے کہ ''خمیصہ'' ریشم اور اُون کے بنے ہوئے کالے کپڑے کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ''خمیصة'' اس کالے کپڑے کو کہتے ہیں جس پر نقش و نگار ہوں۔ یہ قدیم زمانے میں لباس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ تورپشتی کہتے ہیں کہ اس صورت میں حضرت عائشہؓ کے فرمان: **لها اعلام** سے مراد تاکید ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں صنعت تجرید ہو۔

فنظر الی اعلامها نظرة: یعنی آپ ﷺ نے اس پر ایک نگاہ ڈالی۔

فلما انصرف: یعنی جب وہ نماز سے لوٹے۔

قال: اذهبوا بخمیصتی هذه: ایک روایت میں ہے کہ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا **(الهتنی اعلام هذه اذهبوا بها)**: کہ ان نقوش کو لے جاؤ اس لئے انہوں نے مجھے غافل کر دیا ہے۔

الی ابی جهم: یہ قریشی عدوی تھے انہوں نے یہ آپ ﷺ کو ہدیہ کیا تھا۔

واتونی بأنبجانیة ابی جهم: آپ ﷺ نے اس سے **أنبجانیة** (اُون کی بنی ہوئی چادر) طلب کی تاکہ اُسے ہدیہ واپس لوٹانے کی وجہ سے تکلیف نہ ہو۔ یہ ہمزہ کے فتحہ اور ''نون'' کے سکون اور ''ج'' کے کسرہ اور ''یاء'' کے نیچے ''شد'' کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ صحیح نسخوں میں ایسا ہی مذکور ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں یہ ہمزہ کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے مغنی میں ہے کہ یہ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ اس چادر کو کہتے ہیں جس پر کوئی نقش نہ ہو۔

قاموس میں ہے کہ "منبج" یہ مجلس اور موضع کے وزن پر ہے اور کساء منبجانی و أنبجانی یہ "باء" کے فتحہ کے ساتھ خلاف قیاس ہے۔

نہایہ میں ہے کہ انبجانیه یہ "باء" کے کسرہ کے ساتھ ہے اور فتحہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے اور منبج یہ شام کا ایک مشہور شہر ہے جس کی طرف یہ چادر منسوب ہے اور یہ "باء" کے کسرہ کے ساتھ ہے تو نسبت کی وجہ سے اسے فتحہ دیا گیا اور "میم" کو ہمزہ سے بدل دیا گیا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اس جگہ کی طرف منسوب ہے جسے أنبجان کہا جاتا ہے اور یہی زیادہ درست ہے اس لئے کہ پہلے میں بے جا تکلف ہے۔ یہ اس چادر کو کہتے ہیں جو اُون سے بنی ہوئی ہو اور اس میں کوئی نقش وغیرہ نہ ہو اور یہ موٹے کپڑوں میں سے ہے اور ہمزہ اس میں زائد ہے۔ خطابیؒ کہتے ہیں کہ یہ أذربیجان کی طرف منسوب ہے اس کے بعض حروف کو حذف کیا گیا ہے۔ قاضیؒ کہتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چادر ابوجہم کو واپس بھیج دی اس لئے کہ یہ چادر اس نے ہبہ کی تھی لیکن جب اس چادر کے نقوش نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں غافل کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا کہ یہ تکبر مناسب نہیں ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ چادر اس کو واپس لوٹا دی۔ اشرفؒ کہتے ہیں اس میں وضاحت ہے کہ تصویروں ظاہری اشیاء کا پاک نفوس پر اثر پڑتا ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ اس میں نقش ونگاری کی کراہت کی طرف اشارہ ہے جو کہ لوگ اپنی چادروں پر بنا لیتے ہیں بلکہ آگے اس بات کی وضاحت فرما دی ہے۔

فانها: یعنی خیصة۔

الهتنی: یعنی مجھے غافل کر دیا۔

آنفا: یہ لفظ "مد" کے ساتھ بھی ہے اور بغیر "مد" کے بھی، یہ دونوں طریقوں سے تلاوت کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿مَاذَا قَالَ اٰنِفًا﴾ [محمد: ١٦] یعنی اس ساعت میں۔

عن صلاتي: یعنی کامل خشوع وخضوع سے۔ (متفق علیہ)

میرکؒ کہتے ہیں کہ محل اشکال ہے اس لئے کہ یہ حدیث مسلم میں اس لفظ کے ساتھ نہیں ہے یہ بخاری کے لفظ ہیں۔ مسلم کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نقش ونگار والی چادر میں نماز پڑھ رہے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس چادر کے اعلام کی طرف دیکھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز مکمل کر لی تو فرمایا: اذهبو بهذه الخميصة الى ابى جهم بن حذيفة واتونى بانبجانيته فانها الهتنى آنفا فى صلاتى۔ پس الفاظ کے اختلاف پر غور وفکر کریں۔

وفى رواية البخارى، قال: كنت انظر الى علمها وانا فى الصلاة، فأخاف أن يفتنى: یعنی مجھے نماز سے روکتی ہے اور مجھے کامل خصوع سے غافل کرتی ہے اور یہاں حکمت ہے کہ یہاں دو اسلوب بیان کئے گئے ہیں اس طرح کہ پہلے کو الهاء سے تعبیر کیا گیا اور دوسرے کو فتنہ سے تعبیر کیا گیا۔

اور یہ بہتر توجیہ ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ معنی مراد لیئے جائیں کہ مجھے ڈر پیدا ہوا کہ میں کہیں عذاب میں مبتلا نہ ہو

جاؤں یا ایسے فتنہ میں جو کہ عذاب کی طرف لے جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ﴾ [الذاریات: ۱۴] اور ظاہر یہ ہے کہ یہ کہا جائے الهتنى کا مطلب یہ ہے کہ ارادہ کیا گیا کہ مجھے مبتلا کیا جائے لہٰذا اس طرح یہ پہلے قول کے مخالف نہیں ہوگا بلکہ دوسرا قول پہلے قول کی تفسیر بن جائے گا۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے متاثر نہیں ہوتے تھے یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کے خوف کی وجہ سے کہا لیکن جو آدمی یہ گمان کرے کہ اُمت کا دِل بھی اس سے متاثر نہیں ہوتا تو وہ غلط راستے پر ہے۔ باقی ابن حجر کا یہ کہنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دِل اس سے متاثر ہوا تھا' درست نہیں ہے اور اشرفؒ نے جو ''تاثیراً'' کہا ہے تو شاید مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پتا چل گیا تھا کہ اس کا اثر پڑے گا۔ ابن حجرؒ کہتے کہ بعض ائمہ کہتے ہیں کہ اس جو شخص اس صورت حال میں مبتلا ہو تو وہ اپنی آنکھیں بند کر لے تا کہ اس کے خشوع وخضوع میں فرق نہ آئے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات گزر چکی ہے کہ ایسے کپڑے میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور نماز میں آنکھیں بند کرنا یہ بھی مکروھات میں سے ہے تو مکروہ کو مکرو: سے کیسے دور کیا جائے گا حالانکہ مکروہ کو مکروہ سے دور نہیں کیا جا سکتا۔

تصویر سے نماز میں خلل

۷۵۸: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ قِرَامٌ لِعَائِشَةَ سَتَرَتْ بِهٖ جَانِبَ بَيْتِهَا فَقَالَ لَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمِيْطِيْ عَنَّا قِرَامَكِ هٰذَا فَاِنَّهٗ لَا يَزَالُ تَصَاوِيْرُهٗ تَعْرِضُ فِيْ صَلَاتِيْ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱/۴۸۴ حدیث رقم ۳۷۴ وأخرجه أحمد فی المسند ۳/۱۵۱۔

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے گھر کے ایک حصہ پر پردہ ڈال دیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اس پردہ کو ہٹا دو کیونکہ اس کے نقش و نگار نماز پڑھتے وقت میری توجہ کو ہٹا دیتے ہیں۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **وعن انس قال: كان قرام**: یہ کسرہ کے ساتھ اس باریک پردہ کو کہتے ہیں جس میں نقوش اور تصاویر ہوں۔ طیبیؒ کہتے ہیں کہ وہ باریک پردہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اُون کا مختلف رنگوں والا پردہ ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مطلق پردہ ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرام موٹے پردہ کے پیچھے باریک پردہ کو کہتے ہیں اسی وجہ سے دوسری حدیث میں اس کا اضافہ بھی ہے۔

لعائشة سترت به جانب بيتها: ممکن ہے کہ یہ پردہ دروازے پر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ دیوار پر ہو۔

فقال: یعنی حضرت عائشہؓ سے کہا جیسا کہ نسخے میں ہے۔

النبی صلی الله علیه وسلم امیطی: یعنی اس کو دور کرو۔

عنا قرامك هذا فانه: ضمیر شان ہے یا قرام کی طرف جب کہ ایک نسخہ میں ''فانها'' ہے تو پھر ضمیر قصہ ہوگی۔

لا یزال تصاویر: یہ تصویر کی جمع ہے صورۃ کی معنی میں یعنی بت یا نقوش۔

تعرض: یعنی میرے لئے جیسا کہ نسخہ میں ہے یعنی ظاہر ہوتی ہے۔

فی صلاتی :یعنی نماز میں خلل آتا ہے۔

رواہ البخاری :یعنی اس کے ساتھ امام بخاری منفرد ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد ریشمی جبہ اُتار دیا

۷۵۹: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ اُهْدِیَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرُّوْجُ حَرِيْرٍ فَلَبِسَهٗ ثُمَّ صَلّٰى فِيْهِ ثُمَّ انْصَرَفَ فَنَزَعَهٗ نَزْعًا شَدِيْدًا كَالْكَارِهِ لَهٗ ثُمَّ قَالَ لَايَنْبَغِىْ هٰذَا لِلْمُتَّقِيْنَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱/۴۸۴حدیث رقم ۳۷۵۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ۳/۱٦٤٦حدیث رقم (۲۳۔۲۰۷۵) ۔ وأخرجه النسائی فی السنن ۲/۷۲حدیث رقم ۷۷۰وأحمد فی المسند ٤/۱٤۹۔

ترجمہ: ''حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ریشمی جبہ کسی آدمی نے بطور ہدیہ بھیجا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہن کر نماز پڑھی اور نماز پڑھنے کے فوراً بعد اس کو اتار دیا۔ جیسے کوئی آدمی کسی چیز کو ناپسند کرے۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا یہ پرہیز گار لوگوں کے لئے مناسب نہیں۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: وعن عقبة بن عامر: قبیلہ جہینہ سے تعلق رکھتے تھے، حضرت معاویہؓ کے دور میں مصر کے والی تھے۔

قال اهدی: یہ مجہول ہے۔

فروج حریر: ''فاء'' کے فتحہ کے ساتھ اور ''راء'' کی تشدید کے ساتھ اس جبہ کو کہتے جو پیچھے سے کھلا ہوا ہو۔

فلبسه: کہا گیا ہے کہ یہ بعثت سے قبل کا واقعہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے یہ بعثت کے بعد کا واقعہ ہے لیکن تحریم سے پہلے کا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تحریم کی ابتداء پر محمول ہو اس لئے کہ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ آپ علیہ السلام نے ریشم کے ایک قباء میں نماز پڑھی اور پھر اسے اتار دیا اور فرمایا کہ مجھے جبریلؑ نے اس سے روکا ہے۔

ثم صلی فیه، ثم انصرف فنزعه نزعا شدیدا کالکارہ له: اس لئے کہ اس میں رعونت اور تکبر ہے یا اس وجہ سے کہ ممانعت کی وحی نازل ہوگئی تھی۔ طیبیؒ کہتے ہیں کہ درست بات یہ ہے کہ یہ تحریم سے قبل کا واقعہ ہے اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرما کر اُتار دیا اس لئے کہ اس میں رعونت تھی جب کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تحریم کے بعد کا واقعہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ہدیہ بھیجنے والے کی دلجوئی کے لئے پہنا تھا اور وہ صاحب اسکندریہ تھے یا صاحبِ دومہ وغیرہ تھے علی الاختلاف اس کے بعد ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کو تحریم کے باوجود محض دلجوئی کے لئے پہننے کا مذہب اختیار کرنا درست نہیں ہے خصوصاً نماز میں جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایسے اتارا بھی' جیسے کوئی نفرت کرنے والا آدمی اتارتا ہے۔

ثم قال: لا ینبغی :یعنی مناسب نہیں ہے۔

هذه للمتقین :یعنی کامل مؤمنین۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ اس میں یہ دلیل ہے کہ یہ تحریم سے قبل کا واقعہ ہے اس لئے کہ متقی اور غیر متقی یہ دونوں تحریم میں برابر ہیں **لا ینبغی** کا مطلب یہ ہے کہ جائز نہیں ہے۔ (**متفق علیه**) اور اس کو نسائی نے بھی ذکر کیا ہے۔ میرکؒ نے اسی طرح کہا ہے۔

الفصل الثانی:

شکاری کے لئے ایک کپڑے میں نماز جائز ہے

۷۶۰: عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّىْ رَجُلٌ اَصِيْدُ اَفَاُصَلِّىْ فِى الْقَمِيْصِ الْوَاحِدِ قَالَ نَعَمْ وَازْرُرْهُ وَلَوْ بِشَوْكَةٍ . (رواه ابوداوٗد وروى النسائى نحوه)

أخرجه أبوداوٗد فى السنن ۱/۴۱۶ حديث رقم ۶۳۲ـ والنسائى بنحوه ۲/۷۰ حديث رقم ۷۶۵ـ وأخرجه أحمد فى المسند ۴/۴۹ـ

ترجمہ: ''حضرت سلمہ بن اکوع سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! میں ایک شکاری آدمی ہوں کیا میں ایک ہی قمیص میں نماز پڑھ لیا کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں پڑھ لیا کرو لیکن اسے ٹانک لیا کرو چاہے ایک کانٹے ہی سے اس کو اٹکا لیا جائے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے اسی طرح کی حدیث امام نسائیؒ نے نقل کی ہے۔''

راویٔ حدیث:

سلمہ بن الاکوع۔ یہ سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ ہیں ان کی کنیت ''ابومسلم'' ہے اسلمی ومدنی ہیں۔ درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے ہیں۔ پیدل جنگ کرنے والوں میں سب سے زیادہ بہادر اور قوی تھے۔ ۷۴ھ میں مدینہ میں انتقال ہوا۔ اس وقت اسّی (۸۰) سال کی عمر تھی۔ ان سے بہت لوگ روایت کرتے ہیں۔

تشریح: قال: قلت: یا رسول اللہ: انی رجل اصید: یہ أبیع کے وزن پر ہے یعنی شکار کرنا اور ایک نسخہ میں ہے یہ أکرم کے وزن پر ہے۔ نہایہ میں ہے کہ أصید اس کو کہتے ہیں جس کی گردن میں کوئی تکلیف ہو جس کی وجہ سے وہ اِدھر اُدھر متوجہ نہ ہو سکے جب کہ مشہور یہ ہے کہ 'أصید' اصطیاد سے ہے۔ دوسری صورت زیادہ مناسب ہے اس لئے کہ شکاری ہلکا پھلکا ہونا چاہتا ہے۔

افأصلی فی القمیص الواحد؟ قال: ''نعم'': یعنی میں اس میں نماز پڑھ لوں۔

وازراہ: ''راء'' کے ضمہ کے ساتھ یعنی باندھ لے۔

ولو بشوکۃ: طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہ اس وقت ہے جب قمیص وسیع ہو جس سے اس کا ستر ظاہر ہو جاتا ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ ازار پہنے تاکہ ستر نہ کھلے۔ شرح شرعۃ الاسلام میں ہے کہ یہ نماز کے آداب میں سے ہے اس لئے کہ ستر کا چھپانا اپنی ذات سے یہ شرط نہیں ہے۔ یہاں تک اگر کپڑے کے دامن سے اس کی نظر ستر پر پڑ جائے تو وہ نماز کو نہیں لوٹائے گا۔ تبیین میں اسی طرح ہے جب کہ شرح المنیہ میں بعض مشائخ نے فتویٰ دیا ہے کہ جب وہ اپنے ستر کو دیکھ لے گا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ یہ بات ظاہر حدیث کے مطابق ہے۔

رواہ ابوداؤد: یعنی انہی الفاظ کے ساتھ امام ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔(وروی النسائی نحوہ) یعنی نسائی وغیرہ نے اسی مطلب میں حدیث ذکر کی ہے اور اس کی سند حسن ہے بلکہ حاکمؒ نے صحیح قرار دی ہے۔

ازار لٹکانے والے کے لئے وعید

۷۶۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ بَیْنَمَا رَجُلٌ یُصَلِّیْ مُسْبِلٌ اِزَارَهٗ قَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذْهَبْ فَتَوَضَّأْ فَذَهَبَ وَتَوَضَّاَ ثُمَّ جَاءَ فَقَالَ رَجُلٌ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَالَكَ اَمَرْتَهٗ اَنْ یَتَوَضَّاَ قَالَ اِنَّهٗ كَانَ یُصَلِّیْ وَهُوَ مُسْبِلٌ اِزَارَهٗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَقْبَلُ صَلَاةَ رَجُلٍ مُسْبِلٍ اِزَارَهٗ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۱ /۴۱۹ حدیث رقم ۶۳۸ وذکر "اذهب فتوضا" مرتین۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی ازار لٹکائے ہوئے نماز پڑھ رہا تھا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا جاؤ جا کر وضو کرو وہ آدمی گیا اور اس نے جا کر وضو کیا ایک دوسرے آدمی نے جو اس وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود تھا پوچھا اے اللہ کے رسول ﷺ اس آدمی کو آپ نے وضو کرنے کا حکم کیوں دیا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ آدمی اپنا ازار لٹکائے ہوئے نماز پڑھ رہا تھا اور جو آدمی ازار لٹکائے اللہ تعالیٰ اس کی نماز کو قبول نہیں کرتا۔ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **وعن ابی هریرة قال: بینما رجل یصلی مسبل ازاره:** یہ رجل کی صفت ہے۔ یعنی ازار کو تکبر کی وجہ سے ٹخنے سے نیچے لٹکانے والا۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ازار کا ٹخنے سے نیچے لٹکانا مکروہ ہے چاہے نماز میں ہو یا نماز سے باہر لیکن امام مالکؒ نماز میں جائز قرار دیتے ہیں لیکن ویسے چلنے میں جائز قرار نہیں دیتے کہ اس میں تکبر ہے۔

قال له رسول الله صلی الله علیه وسلم: یعنی نماز کے بعد۔ اس لئے کہ اس کی نماز صحیح تھی لیکن آپ ﷺ نے چاہا کہ یہ وضاحت کر دیں کہ وہ نماز غیر مقبول تھی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: **اذهب فتوضأ۔** بعض علماء نے کہا ہے کہ شاید وضوء کے حکم میں جب کہ اس کا وضوء تھا' راز یہ ہو کہ یہ شخص اس حکم کے سبب کے بارے میں سوچے اور یوں اسے اپنے مکروہ کام کا پتا چل جائے اور اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کے حکم یعنی ظاہری طہارت کے حکم کی برکت سے اس کے باطن کو بھی پاک کر دیں۔ اس لئے کہ ظاہر کی پاکی باطن کی پاکی پر مؤثر ہوتی ہے۔ طیبیؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

فذهب وتوضا ثم جاء: یعنی واپس اس حالت میں آیا کہ اس کا ازار نیچے نہیں لٹکا ہوا تھا۔

فقال رجل یا رسول الله! مالك امرته ان یتوضا: یعنی بظاہر تو وہ پاک تھا۔

قال: انه کان یصلی وهو مسبل ازاره' وان الله لا یقبل: یعنی اللہ ایسی نماز کو کامل طور پر قبول نہیں کرتا۔

صلاة رجل مسبل ازاره: ظاہر یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے اسے وضوء کے اعادہ کا حکم اس لئے دیا کہ جب وہ نماز پڑھ رہا تھا تو قبول کامل اس کی نماز کے ساتھ متعلق نہیں تھا اور طہارۃ یہ نماز کی شرائط اور خارجی اجزاء میں سے ہے تو عدم قبول مؤثر ہوا طہارت میں بھی اس لئے آنحضرت ﷺ نے اکمل وافضل پر ابھارتے ہوئے اسے طہارت کے اعادہ کا حکم دیا۔ آپ ﷺ کا

قول یصلی کا مطلب ہے کہ جب وہ نماز کا ارادہ کرے تو اسے نماز سے پہلے وضوء کا حکم ہوگا اور جو ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے کہ ظاہر حدیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے اسے نماز کے توڑنے کا حکم دیا پھر وضوء کا حکم دیا یہ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ﴾ کی وجہ سے درست نہیں ہے۔

رواہ ابوداؤد: میرکؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ابوجعفر ہیں اور وہ اہلِ مدینہ میں سے تھے، ان کا نام کوئی نہیں جانتا۔ منذریؒ کہتے ہیں کہ تقریب میں ہے کہ ابوجعفر موذن انصاری اور مدنی ہیں یہ طبقہ ثالثہ کے مقبول راوی ہیں۔ طبرانیؒ نے روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہا تھا اور اس نے اپنا کپڑا نیچے لٹکایا ہوا تھا تو آپ ﷺ اس کے قریب ہوئے اور اس کے کپڑے کو موڑ دیا یعنی تہہ کر دیا اور کپڑا لٹکا ہوا نہ رہا۔

بالغہ عورت کی نماز بغیر چادر کے نہیں ہوتی

۷۶۲: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُقْبَلُ صَلَاةُ حَائِضٍ اِلَّا بِخِمَارٍ.

(رواہ ابوداود والترمذی)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۴۲۱/۱ حدیث رقم ۶۴۱۔ وأخرجه الترمذی فی السنن ۲۱۵/۲ حدیث رقم ۳۷۷ وقال حدیث حسن۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۲۱۵/۱ حدیث رقم ۶۵۵۔ وأخرجه أحمد فی المسند ۱۵۰/۶۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بالغہ عورت کی نماز بغیر چادر کے قبول نہیں ہوتی اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: وعن عائشةؓ قالت: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا تقبل: یہ تانیث کے ساتھ ہے مطلب یہ ہے کہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اصل نفی قبول میں نفی صحت ہے مگر دلیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ [الاعراف: ۳۱] ''ہر نماز کے وقت اپنے تئیں مزین کیا کرو''۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں یعنی کپڑے پہنا کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا﴾ [الاعراف: ۲۸] ''اور جب کوئی اور بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بزرگوں کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے'' ابن عباسؓ وغیرہ کہتے ہیں کہ یہاں مراد برہنہ طواف کرنا ہے اور نماز میں ستر کے چھپانے پر اجماع ہے اس کی تفصیل فروع میں آ رہی ہے۔

صلاة حائض: یعنی بالغہ عورت کی نماز۔ (الا بخمار) یعنی وہ کپڑا جس سے سر کو چھپایا جاتا ہے۔ یہ آزاد عورت کا مسئلہ ہے۔ ابن ملک کہتے ہیں اس سے وہ آزاد عورت مراد ہے جو حیض کی عمر کو پہنچی ہو، جب کہ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ درست یہ ہے کہ ''حائض'' سے مراد حیض والی عورت لی جائے تا کہ وہ چھوٹی کو بھی شامل ہو جائے اس لئے کہ نماز میں سر کو چھپانا یہ نماز کی صحت کیلئے شرط ہے۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ عورت کا سر ستر ہے، بخلاف باندی کے۔

رواہ ابوداؤد، والترمذی: حسن کہتے ہیں کہ ابن حجرؒ نے اسے روایت کیا ہے اور حاکم نے مستدرک میں، اور کہا ہے

کہ یہ صحیح ہے۔ میرکؒ نے اسے سند صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے۔

بڑے کُرتہ میں عورت نماز ادا کرسکتی ہے

۷۶۳: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّهَا سَأَلَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتُصَلِّى الْمَرْاَةُ فِىْ دِرْعٍ وَخِمَارٍ لَيْسَ عَلَيْهَا اِزَارٌ قَالَ اِذَا كَانَ الدِّرْعُ سَابِغًا يُغَطِّىْ ظُهُوْرَ قَدَمَيْهَا۔

(رواه ابو داود ذكر جماعةً وَقَفُوْهُ عَلٰى اُمِّ سَلَمه)

أخرجه أبوداوٗد فى السنن ۱/ ۴۲۰ حديث رقم ۶۴۰۔وأخرج أوله مالك فى الموطأ ۱/ ۱۴۲ حديث رقم ۳۸ من كتاب صلاة الجماعة ۔

ترجمه: ''حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا عورت کرتہ اور چادر میں نماز ادا کرسکتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہاں نماز پڑھ سکتی ہے بشرطیکہ کرتہ بڑا ہو کہ جو پاؤں کی پشت کو چھپا دے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے اور امام ابوداؤدؒ نے فرمایا کہ ایک جماعت نے اس روایت کو حضرت ام سلمہؓ پر موقوف بتایا ہے۔ یعنی کہ حضور ﷺ کا فرمان نہیں بلکہ حضرت ام سلمہ ؓ کا اپنا قول ہے۔''

تشریح: **وعن ام سلمة، انها سالت رسول الله صلى الله وسلم: اتصلى المرأة فى درع:** یعنی قمیص۔
وخمار ليس عليها: یعنی اس قمیص کے نیچے یا اوپر۔ (ازار) کوئی ازار نہ ہو اور شلوار بھی اسی حکم میں ہے۔
قال: یعنی فرمایا جی ہاں۔ **(اذا كان الدرع سابغا):** یعنی جب قمیص کامل اور وسیع ہو۔
يغطى طهور قدميها: اشرف کہتے ہیں یہ اس بات کی دلیل ہے اس بات کی کہ عورت کے قدم کا ظاہری حصہ ستر ہے جس کو چھپانا واجب ہے۔ شرح السنۃ میں کہتے ہیں امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر نماز کے دوران عورت کا ہاتھ اور چہرے کا کچھ حصہ کھل جائے تو اس پر نماز کا اعادہ کرنا واجب ہے، اس کو طیبیؒ نے نقل کیا ہے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یدین سے مراد ہتھیلیاں ہیں۔ قاضی خان میں ہے کہ ہتھیلی کا ظاہر اور باطن جوڑوں تک ستر نہیں ہے۔ ظاہر روایت میں ہے کہ اس کا ظاہر ستر ہے۔ ابن ھمامؒ کہتے ہیں کہ جوڑ ستر میں شامل ہے۔ ابو یوسف سے روایت ہے کہ وہ ستر نہیں ہیں۔ شرح المنیۃ میں ہے کہ پاؤں میں مشائخ کا اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ پاؤں ستر نہیں ہیں، محیط نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ صاحب ہدایہ اور کرخی نے اسی کو اختیار کیا ہے ہتھیلی کے ظاہری اور باطنی حصہ میں کوئی فرق نہیں ہے بخلاف اس کے جو کہا گیا ہے کہ ہتھیلی کا اندرونی حصہ ستر نہیں ہے اور اس کا ظاہری حصہ ستر ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ظاہر حدیث تو اسی کی تائید کرتی ہے جو مذکور ہے خانیہ میں ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ چوتھائی قدم کا کھلنا جواز نماز سے مانع ہے ان تمام اعضاء کی طرح جو ستر میں شمار ہوتے ہیں۔

رواه ابو داؤد: یعنی اس حدیث کو مرفوعاً نقل کیا ہے ایک جماعت نے اس روایت کو ام سلمہؓ سے موقوفاً نقل کیا ہے، اس کو میرکؒ نے ذکر کیا ہے۔ **(وذكره):** یعنی ابوداؤدؒ نے ذکر کیا ہے۔

جماعة: یعنی راویوں کی ایک جماعت نے ذکر کیا ہے۔ (وقفوه) یعنی اس حدیث کو موقوف ذکر کیا ہے۔ (على ام سلمة) طیبیؒ نے کہا ہے کہ یعنی ابوداؤدؒ نے ذکر کیا ہے یا محدثین کی جماعت کے راویوں نے اس حدیث کو موقوف ذکر کیا ہے اور اُمِ سلمہؓ پر موقوف ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث کا انہی مذکورہ الفاظ کے ساتھ موقوف ہونا ممکن نہیں ہے۔ شاید موقوف اس حدیث کا معنی ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ایک جماعت نے اُمِ سلمہؓ پر موقوف ذکر کیا ہے۔ لہٰذا اس وقت ان پر موقوف ہونا کوئی نقصان نہیں ہوگا کیونکہ جن حضرات نے اسے مرفوع ذکر کیا ہے وہ اعلم میں۔ لہٰذا انہی کی بات کو ترجیح ہوگی اور یہ حدیث موقوف ہونا قیاس سے سمجھ آنے والے مسائل کی قبیل سے نہیں ہے لہٰذا یہ مرفوع کے حکم میں ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں آدمی کا ستر ناف سے گھٹنے تک ہے اس کی دلیل آپ علیہ الصلوٰۃ السلام کا قول ہے کہ (عورة المؤمن ما بين سرته الى ركبته)۔ مؤمن کے ساتھ مقید کرنا یہ غلبہ کی وجہ سے ہے اس کی سند حسن ہے۔ اگرچہ اس میں ایک آدمی مختلف فیہ ہے مگر شواہد کی وجہ سے اسے ردّ نہیں کیا جا سکتا اسکے شواہد کیتعداد چار ہے اور بعض علماء نے کہا ہے کہ ''ستر'' وہ صرف دو شرمگاہیں ہیں، اس لئے کہ مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ وہ تشریف فرما تھے اور ان کی ران کھلی ہوئی تھی۔ اس حال میں ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما داخل ہوئے آپ ﷺ نے نہیں چھپایا پھر حضرت عثمانؓ داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے چھپالیا۔ لیکن اس روایت سے یہ مسئلہ ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس پر شبہ ہوتا ہے کہ مسلم کی روایت میں جو مکشوف حصہ ہے اس میں شک ہے کہ کیا وہ پنڈلی تھی یا کہ ران لہٰذا اس روایت سے یقینی طور پر ران کا کھلنا ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس وقعہ میں یہ بھی احتمال ہے کہ کھلا ہوا حصہ ایک طرف سے تھا دونوں اطراف سے نہیں تھا۔

میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ حالت استغراق کے اندر کشف تھا اور بعد میں افاقہ کے بعد آپ ﷺ نے چھپالیا تھا اور باقی جو صحیحین کی خبر میں ہے کہ آپ علیہ السلام خیبر میں گھوڑے پر سوار تھے پھر آپ ﷺ کی ران سے ازار سرک گیا یہاں تک کہ حضرت انسؓ نے ران کو دیکھا تو یہ واقعہ اس بات پر محمول ہے کہ گھوڑا چلانے کی وجہ سے وہ خود ہی ہٹ گیا تھا۔

ترمذیؒ نے تین طرق سے روایت نقل کی ہے ہر طرق میں انہوں نے کہا ہے کہ آپ ﷺ نے جرہد (جیم اور ھاء مفتوحہ کے ساتھ) سے کہا کہ اپنی ران کو چھپاؤ اس لئے کہ ران یہ ستر کا حصہ ہے۔ لہٰذا مسلم کی اس روایت کی وجہ سے ہر مکلّف پر واجب ہے کہ وہ اپنے ستر کو چھپائے اگرچہ وہ اکیلا ہو۔ کہ جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم برہنہ مت چلو، اور احمد اور دیگر ائمہ اربعہ کی روایت کی وجہ سے جس کی سند حسن ہے کہ (احفظ عورتك الا من زوجتك او ما ملكت يمينك) (کہ اپنی ستر کو چھپاؤ سوائے اپنی بیوی کے اور اپنی باندیوں کے) تو میں نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ جب آدمی اکیلا ہو تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ اس بات کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے حیاء کی جائے۔ پھر برہنہ اور مستتر اللہ کی نگاہ میں دونوں برابر ہیں مگر یہ کہ دوسرا مؤدب ہے جب کہ پہلا ادب کو چھوڑنے والا ہے۔ اور امام ترمذیؒ نے جو وجوت نقل کیا ہے تو یہ مطلقاً صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ضرورت تو ممنوع کو مباح کر دیتی ہے جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ تسمیہ یہ ستر کو جنوں کی آنکھوں سے چھپاتا ہے اور ظاہر بات یہ ہے کہ تنہائی میں ستر کا چھپانا استحباب پر محمول ہے نہ کہ وجوب پر۔ واللہ اعلم۔

سدل نماز میں منع ہے

۷۶۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنِ السَّدْلِ فِی الصَّلَاةِ وَاَنْ يُّغَطِّیَ الرَّجُلُ فَاهُ۔ (رواه ابو داود والترمذی)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۱/۴۲۳ حدیث رقم ۶۴۳۔ وأخرج شطره الأول: الترمذی فی السنن ۲/۲۰۷، حدیث رقم ۳۷۸۔ وأحمد فی المسند ۲/۳۴۱۔

''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں سدل کرنے سے اور منہ ڈھانپنے سے منع کیا ہے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **وعن ابی ھریرۃ، ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن السدل فی الصلاۃ**: بعض علماء نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہاتھوں کا چھوڑنا ہے۔ جب کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ تکبر کی وجہ سے کپڑا زمین کی طرف لٹکانا ہے۔ فائق میں ہے کہ سدل کپڑے کو اس کے طرفین کے ملائے بغیر لٹکانا ہے۔ نہایہ میں ہے کہ سدل کپڑے کو اپنے جسم کے ساتھ یوں لپیٹنا ہے کہ آدمی ہاتھوں کو اندر داخل کرے اور اسی طرح رکوع اور سجدہ کرے، یہود اپنی نمازوں میں ایسا کرتے تھے اس لئے اُن سے مشابہت کی وجہ سے ممانعت کی گئی ہے۔ قاضی کہتے ہیں کہ سدل سے مطلقاً ممانعت مراد ہے اس لئے کہ یہ تکبر میں سے ہے اور یہ نماز کے اندر بہت زیادہ بُرا ہے۔ شرح المنیۃ میں ہے کہ سدل کپڑے کو کندھے پر رکھنا ہے اور اس کے کناروں کو بازو یا سینے پر لٹکانا ہے۔ بعض علماء کہتے کہ سدل کپڑے کو سر پر یا کندھے پر رکھ کر اس کے کناروں کو اطراف میں لٹکانا ہے۔ فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ سدل کپڑے کو سر پر یا گردن پر اور اس کی اطراف کو سامنے سینے کی طرف لٹکانا ہے۔ یہ تمام سدل ہے۔ اس لئے کہ سدل لغت میں لٹکانے کو کہتے ہیں، اس کی کراہت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہی کی وجہ سے ہے۔

اس حکم میں حکمت قلب کو مشغول کرنا ہے۔ اسی لیے اگر اس کی ایک طرف دوسری طرف سے مربوط ہو تو یہ مکروہ نہ ہوگا۔

وان یغطی الرجل فاہ: یعنی نماز میں منہ کو چھپانا۔ عرب عمامہ باندھتے تھے اور عمامہ کے اطراف کو گردنوں کے نیچے کرتے تھے تو اس طرح وہ اپنے منہ کو چھپا لیتے تھے تاکہ ٹھنڈی اور گرم ہوا ان کو نہ پہنچ سکے۔ اس سے آپ ﷺ نے ممانعت کی ہے اس لئے کہ اس میں حسن قراءۃ اور کمال سجود میں رکاوٹ ہے۔ شرح السنہ میں اس حدیث کی وجہ سے جس کو طیبیؒ نے ذکر کیا ہے کہ اگر آدمی کو جمائی آئے تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے منہ کو کپڑے یا ہاتھ سے چھپا لے۔

اس میں فرق ظاہر ہے اس لئے کہ نہی سے مراد بغیر ضرورت کے ہمیشگی ہے اور جواز کسی عارض کی وجہ سے ہے۔ شرح المنیۃ میں ہے کہ نماز پڑھنے والے کیلئے منہ اور ناک کا چھپانا مکروہ ہے، قاضی خان نے اسے ذکر کیا ہے سوائے جمائی کے وقت اس لئے کہ جمائی میں ادب کا پہلو یہ ہے کہ اسے روکا جائے یعنی آپ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ منہ کے کھلنے سے اس پر رکا جائے اگر اس پر قادر ہو سے (**اذا تثاء ب احدکم فی الصلاۃ فلیکظم ما استطاع**)۔ ایک روایت میں ہے **فلیمسك بیده علی فمه فان الشیطان یدخل فیه** اس کو مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔ اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اپنے

ہاتھ کو اپنے منہ پر رکھے۔اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہے۔علماء نے کہا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے روکے اس لئے کہ دایاں ہاتھ رفع تکلیف کیلئے ہے۔میں کہتا ہوں کہ شاید یہ حالت قیام کے علاوہ میں ہے حالت قیام میں وہ اپنے دائیں ہاتھ کی پشت کو منہ پر رکھے گا۔

رواہ ابو داؤد، والترمذی:اس میں شبہ ہے اس لئے کہ ترمذی میں یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنے منہ کو ڈھانپے جیسا کہ صاحب تخریج کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ترمذیؒ کہتے ہیں کہ وہ نہیں جانتے حدیث عطاء کو ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً مگر سوائے حدیث غسل کے اور وہ یضان التیمی الیربوعی کا بیٹا تھا۔اس کی کنیت ابوقرۃ تھی،ضعیف الحدیث ہیں۔اس حدیث کو ابوداؤدؒ نے سلیمان الأعش کی حدیث سے ذکر کیا ہے وہ عطاء سے اور وہ ابو ہریرہ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں۔میرک شاہؒ نے تصحیح کے ساتھ اسی طرح ذکر کیا ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ ابوداؤدؒ نے یہ روایت مکمل ذکر کی ہے جب کہ ترمذیؒ وغیرہ نے اس کے پہلے جزء کو نقل کیا ہے اس روایت کا دوسرا جزء صحیح ہے جیسا کہ گذرا ہے اور پہلے جزء یعنی "سدل" سے ممانعت کو اکثر نے ضعیف شمار کیا ہے۔نوویؒ کہتے ہیں کہ پہلے جزء پر اعتماد کی وجہ یہ ہے کہ احادیث صحیحہ میں ازار کے نیچے لٹکانے کے بارے میں نفی ہے۔اسی وجہ سے ہمارے ائمہ کہتے ہیں کہ کپڑے کا ٹخنے سے نیچے لٹکانا مکروہ ہے اگر چہ وہ زمین تک نہ پہنچے،جب کہ اس سے مقصود تکبر نہ ہو ورنہ ایسا کرنا حرام ہوگا۔

جوتے پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے

۷۶۵: وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَالِفُوا الْيَهُوْدَ فَإِنَّهُمْ لَا يُصَلُّوْنَ فِيْ نِعَالِهِمْ وَلَا خِفَافِهِمْ۔ (رواہ ابو داود)

أخرجه أبو داؤد فی السنن ۱/ ۴۲۷ حدیث رقم ۶۵۱۔

ترجمہ: "حضرت شداد بن اوسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم یہودیوں کی مخالفت کرو کیونکہ وہ اپنے جوتے اور موزوں میں نماز نہیں پڑھتے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔"

راویٔ حدیث:

شداد بن اوس۔یہ شداد بن اوس ہیں۔ان کی کنیت "ابویعلیٰ نصاری" ہے۔حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بھتیجے ہیں۔بیت المقدس میں قیام تھا۔اہل شام میں شمار ہوتے تھے ۵۸ھ میں جب کہ ان کی عمر پچھتّر (۷۵) سال کی تھی ملک شام میں انتقال ہوا۔عبادہ بن صامت اور ابوالدرداء کہا کرتے تھے کہ شداد اُن لوگوں میں سے تھے کہ جن کو علم وحلم کی دولت سے نواز گیا تھا۔

تشریح: قال:قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خالفوا اليهود:یعنی نماز میں مخالفت کرو جوتے وغیرہ میں۔

فانهم لا يصلون فی نعالهم و لا خفافهم: ابن الملکؒ کہتے ہیں کہ ان میں نماز پڑھنا جائز ہے جب یہ پاک ہوں۔

وو راہ ابو داؤد: یعلی بن شداد اپنے والد سے مرفوعا روایت کرتے ہیں، ابوداؤدؒ نے انہیں ضعیف قرار نہیں دیا ہے۔ اور نہ ہی منذریؒ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ میرکؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے، حاکمؒ نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ ابن حبانؒ نے صحیح ذکر کیا ہے اور یہ مسئلہ جوتوں اور موزوں میں نماز کے استحباب پر دال ہے۔ لیکن خطابیؒ کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ نماز میں ادب کا پہلو یہ ہے کہ جوتے اُتار دے اور حدیث پر عمل کرتے ہوئے جب ان کی طہارت کا یقین ہو تو جمع کرنا مناسب ہے اور ان کے ساتھ سجدہ کو کامل طریقے سے اداء کرنے پر قادر ہو کہ وہ پاؤں کی تمام انگلیوں کے ساتھ سجدہ کرنے پر قادر ہو تو جمع کرنا مناسب ہے اور جو روایت امام شافعیؒ سے برعکس منقول ہے وہ ظاہری خطاء ہے اس لئے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب کامل طہارت کا یقین نہ ہو اور ان کے ساتھ کامل طریقے سے سجدہ کرنا ممکن نہ ہو

لہٰذا بہتر یہ ہے کہ امام شافعیؒ کے اس قول کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ وہ ادب جس پر آپ ﷺ کا آخری امر تھا وہ جوتے اُتارنے کا تھا یا ادب ہمارے زمانے میں ہے جبکہ یہود و نصاریٰ نہیں ہیں، پھر حدیث کا معنیٰ یہ ہوگا کہ یہودیوں کی مخالفت کرو نماز کے جواز میں جوتوں اور موزوں کے ساتھ کیونکہ وہ نماز اداء نہیں کرتے یعنی نماز ان میں جائز قرار نہیں دیتے۔ لہٰذا اس روایت سے فعل کا کرنا لازم نہیں آتا۔ آپ علیہ السلام نے فعلاً ایسا کیا ہے جیسا کہ آنے والی حدیث میں ہے بالخصوص اس مذہب کے مطابق جو یہ کہتا ہے کہ دلیل فعلی دلیل قولی سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔

اگر نماز کے اندر معلوم ہو جائے کہ جوتا ناپاک ہے تو اس کو اتار دو

۷۶۶: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ بَیْنَمَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یُصَلِّیْ بِاَصْحَابِہٖ اِذْخَلَعَ نَعْلَیْہِ فَوَضَعَھُمَا عَنْ یَسَارِہٖ فَلَمَّا رَاٰی ذٰلِكَ الْقَوْمُ اَلْقَوْا نِعَالَھُمْ فَلَمَّا قَضٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ صَلَاتَہٗ قَالَ مَاحَمَلَکُمْ عَلٰی اِلْقَائِکُمْ نِعَالَکُمْ قَالُوْا رَأَیْنَاكَ اَلْقَیْتَ نَعْلَیْكَ فَاَلْقَیْنَا نِعَا لَنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّ جِبْرِیْلَ اَتَانِیْ فَاَخْبَرَنِیْ اَنَّ فِیْھِمَا قَذَرًا اِذَا جَاءَ اَحَدُکُمُ الْمَسْجِدَ فَلْیَنْظُرْ فَاِنْ رَاٰی فِیْ نَعْلَیْہِ قَذَرًا فَلْیَمْسَحْہُ وَلْیُصَلِّ فِیْھِمَا . (رواہ ابوداود والدارمی)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۴۲۶ حدیث رقم ۶۵۰۔ وأخرجه الدارمی فی السنن ۱/۳۷۰ حدیث رقم ۱۳۷۸۔ وأخرجه أحمد فی المسند ۳/۲۰۔

ترجمہ: ”حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کو نماز پڑھا رہے تھے کہ آپ نے اچانک اپنے جوتے اتار کر بائیں طرف رکھ دیئے جب لوگوں نے آپ کی طرف دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے جوتے اتار دیئے اور ایک طرف کو ڈال دیئے رسول اللہ ﷺ جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو جوتے اتارنے پر کس چیز نے برانگیختہ کیا انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے اپنے جوتے اتار دیئے ہیں تو ہم نے بھی اپنے اپنے جوتے اتار ڈالے تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے پاس

نماز میں جب جبرائیلؑ آئے تھے اور انہوں نے مجھے خبر دی کہ میرے جوتے نجاست سے آلود ہیں تم میں سے جو کوئی آدمی نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آئے تو اپنے جوتوں کو دیکھ لیا کرے اگر اپنے جوتوں میں کوئی نجاست لگی دیکھے تو صاف کر لے اور صاف کرنے کے بعد ان کو پہن کر نماز پڑھ لے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: وعن ابی سعید الخدری، قال: بینما رسول الله صلی الله علیه وسلم یصلی باصحابه اذ

خلع: یعنی اُتارا۔

نعلیه: یعنی اپنے پاؤں سے۔

فوضعها عن یساره: یہ روایت لفظ ''عن'' کے ساتھ صحیح ہے اس میں تجاوز کے معنی ہیں۔ یعنی ان جوتوں کو دائیں طرف دور رکھا۔ اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں جوتے اُتار۔ لے، طیبیؒ اور ابن الملکؒ کہتے ہیں کہ اس میں اُمت کیلئے تعلیم ہے جوتوں کے بائیں طرف اُتارنے کی' نہ کہ دائیں طرف۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں عمل قلیل کے جواز پر دلیل ہے۔

فلما رأی ذلك القوم، القوا انعالهم: یہ کمال متابعت کی دلیل ہے۔

فلما قضی رسول الله صلی الله علیه وسلم صلاته، قال: ما حملکم علی القائکم نعالکم: یہ نصب کے ساتھ ہے۔

قالوا: رأیناك القیت نعلیك فالقینا نعالنا: قاضیؒ کہتے ہیں اس میں آپ علیہ السلام کی متابعت کے وجوب پر دلیل ہے۔ اس لئے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب ان سے جوتے اُتارنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے متابعت کا جواب دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تقریر فرمائی اور اپنے فعل کے خاص ہونے کی توجیہ بیان کی۔

فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان جبریل اتانی: یعنی آپ علیہ الصلوٰۃ وسلام کے اللہ تعالیٰ سے تعلق اور عبادت کی وجہ سے۔

فاخبرنی ان فیهما قذرا: یہ فتح کے ساتھ ہے ایک روایت خبث آتا ہے اور جب کہ دوسری روایت میں گندگی یا تکلیف یا خون آتا ہے اور یہ (حرکت کے ساتھ) بڑی گندگی کو کہتے ہیں۔ قاضیؒ کہتے ہیں کہ اس میں دلیل ہے کہ نجاست والا آدمی اگر اس سے ناواقف ہو تو اس کی نماز ٹھیک ہے امام شافعیؒ کا بھی قدیم قول یہی ہے اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوتے اُتارے لیکن نماز دوبارہ شروع نہیں کی۔ اور جو فساد صلوٰۃ کا قائل ہے اس نے گندگی کو عرفاً گندگی پر محمول کیا ہوگا۔

ابن الملکؒ کہتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نجاست کی خبر دینا اس وجہ سے تھا تاکہ آپ کے کپڑے سجدہ کے وقت اس نجاست کے ساتھ ملوث نہ ہو جائیں۔ میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ یہ اس نجاست کی مقدار معاف ہو اور اس کی خبر اس لئے دی تاکہ کامل طریقے سے نماز اداء ہو سکے اور شاید خبر کی تاخیر میں یہ وجہ بھی ہو کہ یہ بتانا مقصود ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غیب سے صرف وہی کچھ جانتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا جاتا ہے۔ یہ حکم احادیث سے ثابت ہے پھر میں نے ابن حجرؒ کو دیکھا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ائمہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ گندگی اگر طاہر کے حکم میں ہو یعنی خون اگر اس کی مقدار کم ہو اور اس طرح کہ روایت خبث اس کی تفسیر روایت دَم سے کی گئی ہے۔

قذرا فليمسحه: ابن ملک کہتے ہیں کہ مسجد کو ان گندی اشیاء سے بچانے کے لئے۔

وليصل فيهما: قاضی کہتے ہیں کہ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ جس کے جوتوں میں نجاست ہو جب وہ اس کو زمین پر رگڑے گا تو یہ پاک ہو جائے گا اور اس میں نماز جائز ہوگی۔ یہ بھی امام شافعیؒ کا قول قدیم ہے۔ ہمارے مذہب کا حاصل یہ ہے کہ جب موزے یا جوتے کو کوئی نجاست لگ جائے تو اگر وہ ہلکی جسامت والی ہو اور اس کی مسح مٹی یا ریت سے ہو اگر مبالغہ کے طریقے سے اس کو صاف کیا جائے ہو پاک ہو جائے گا اور اسی طرح رگڑنے سے بھی پاک ہو جائیگا۔ اگر وہ نجاست جسامت والی نہ ہو جیسے بول و براز اور شراب تو اس کیلئے اتفاقاً دھونا واجب ہے خشک ہو یا تر ہو۔

رواه ابو داؤد: اس پر انہوں نے اور منذری نے سکوت کیا ہے۔ میرکؒ نے یہ ذکر کیا ہے۔

والدارمی: ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے۔ اس میں اس بات پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ نجاست اس کا ان دونوں چیزوں سے صاف کرنا کافی ہے یا اس کے علاوہ سے بھی صاف کرنا ہوگا اس لئے کہ اس حدیث کے رجال میں اختلاف ہے اور اگر اس کو صحیح تسلیم کرلیں تو جیسا کہ سیاق دلالت کرتا ہے یہ معاف رہا اس ہے کا صاف کرنا یہ صورۃ قباحت کو دور کرنا ہے اور مسجد کو گندگی سے بچانا ہے، اس لئے نہیں کہ اس سے پاک ہو جائے گا۔

مسجد کے اندر جوتے کہاں رکھے جائیں؟

۷۶۷: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ فَلَا يَضَعْ نَعْلَيْهِ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَلَا عَنْ يَسَارِهٖ فَتَكُوْنَ عَنْ يَمِيْنِ غَيْرِهٖ اِلَّا اَنْ لَا يَكُوْنَ عَلٰى يَسَارِهٖ اَحَدٌ وَلْيَضَعْهُمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ وَفِیْ رواية اَوْلِيُصَلِّ فِيْهِمَا . (رواہ ابوداود وروی ابن ماجۃ:معناہ)

أخرجه أبو داوٗد فى السنن ١/ ٤٢٨ حديث رقم ٦٥٤ ـ والرواية الثانية حديث رقم ٦٥٥ ـ وأخرج ابن ماجة نحوه فى السنن ١/ ٤٦٠ حديث رقم ١٤٣٢ ـ

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو وہ اپنے جوتے اپنی دائیں طرف نہ رکھے اور نہ ہی بائیں طرف رکھے کیونکہ بائیں طرف رکھنے سے دوسرے آدمی کا دایاں ہوگا ہاں البتہ اگر بائیں طرف کوئی نہ ہو تو پھر بائیں طرف جوتا رکھ لے ورنہ اس کو چاہئے کہ اپنے پاؤں کے درمیان جوتے رکھ لے اور ایک روایت میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ جوتے پہن کر نماز پڑھے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے اور امام ابن ماجہ نے بھی اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہیں۔

تشریح: **وعن ابی هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا اصلى احدكم:** یعنی جب وہ نماز کا ارادہ کرے۔

فلا يضع نعليه: جزم کے ساتھ یہ ''اذا'' کا جواب ہے۔

عن يمينه ولا عن يساره: یعنی بغیر کسی ضرورت کے بوجہ اس کے جو پہلے حدیث میں گزر چکا ہے۔

فتكون: صحیح قول کے مطابق یہ تانیث کے ساتھ ہے یعنی جوتے طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہ نصب کے ساتھ جواب ''نہی'' ہے یعنی بائیں طرف کسی آدمی ہونے کے باوجود بائیں طرف رکھنا یہ اس آدمی کے دائیں طرف ہوگا اور اس میں اس آدمی کی اہانت ہے مؤمن پر لازم ہے کہ وہ دوسروں کیلئے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور دوسروں کیلئے اس کو ناپسند کرے جس کو اپنے لیے ناپسند کرتا ہے۔

الا ان لا يكون عن يساره أحد: ایک صحیح نسخہ میں ہے علی یسارہ یعنی اس کے بائیں طرف۔
یعنی اگر بائیں طرف کوئی آدمی نہ ہو تو پھر بائیں طرف جوتے اُتار دے۔

وليضعهما بين رجليه: یعنی اپنے جوتے اپنے سامنے رکھے اگر بائیں طرف کوئی آدمی موجود ہو۔

وفي رواية: یعنی اضافہ ہے تبدیلی نہیں ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں ایک روایت میں ہے کہ یعنی جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو وہ اپنے جوتے اُتار دے جب کہ اس سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے ورنہ اپنے پاؤں میں پہنے رکھے۔ یہاں پر أو خلفه نہیں کہا تاکہ کسی اور کے قدموں میں نہ واقع ہو یا تاکہ اس کا خشوع نہ چلا جائے۔

او ليصل فيهما: یعنی اگر جوتے پاک ہوں۔

رواه ابو داؤد: اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن قیس ہیں۔ منذریؒ کہتے ہیں شبہ ہے کہ وہ زعفرانی بصری ہوں گے جن کی کنیت ابومعاویہ ہے اس کو میرکؒ نے تخریج سے ذکر کیا ہے۔ (وروى ابن ماجه معناه)

الفصل الثالث:

چٹائی پر نماز پڑھنا

۷۶۸: عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَرَأَیْتُهٗ یُصَلِّیْ عَلٰی حَصِیْرٍ یَسْجُدُ عَلَیْهِ قَالَ وَرَأَیْتُهٗ یُصَلِّیْ فِیْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ مُتَوَشِّحًا بِهٖ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۳۶۹/۱ حدیث رقم (۲۸۴ـ۵۱۹)۔

ترجمه: ''حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے دیکھا آپ ایک چٹائی پر نماز پڑھ رہے تھے اور اسی پر سجدہ کر رہے تھے حضرت ابوسعید فرماتے ہیں کہ میں نے یہ بھی دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے جسم پر ایک کپڑا لپیٹے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: عن ابی سعید الخدری قال: دخلت علی النبی: ایک نسخہ میں علی رسول اللہ ہے (صلی اللہ علیہ وسلم فرایته یصلی علی حصیر): فائق میں ہے کہ یہ دلیل ہے کہ کسی ایسی چیز پر نماز جائز ہے جو زمین اور اس کے درمیان حائل ہو۔ چاہے وہ زمین کی جنس سے ہو یا نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں عمومیت پر دلالت نہیں ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ زمین پر نماز اداء کرنا یہ زیادہ افضل ہے مگر کسی ضرورت یعنی گرمی یا سردی یا نجاست کی وجہ سے نہ کرنا بھی درست ہے۔ شرح

السنہ میں ہے کہ زمین پر یا زمین کی نباتات وغیرہ جیسے چٹائی وغیرہ پر نماز پڑھنا زیادہ افضل ہے اس لئے کہ یہ تواضع کے زیادہ قریب ہے بخلاف امام مالکؒ کے کیونکہ ان کے نزدیک جو چیز زمین کی جنس میں سے نہ ہو اس پر سجدہ کرنا مکروہ ہے۔

يسجد عليه: یہ بدل البعض من الکل ہے۔

قال ورايته يصلى فى ثوب واحد متوشحا به: یعنی اس کے دونوں کنارے اپنے دونوں کندھوں پر رکھے ہوئے تھے۔ (رواہ مسلم)

نماز کے اندر جوتے اُتارنے اور پہننے کا مسئلہ

۷۶۹: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ حَافِيًا وَّ مُنْتَعِلًا۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فى السنن ۱/ ۴۲۷ حديث رقم ۶۵۳۔ وأخرجه ابن ماجة فى السنن ۱/ ۳۳۰ حديث رقم ۱۰۳۸۔

ترجمہ: ”حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو (کبھی) جوتے پہن کر اور (کبھی) ننگے پاؤں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔“

تشریح: **وعن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده قال: رايت رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلى حافيا):** یعنی کبھی ننگے پاؤں نماز پڑھتے دیکھا۔

(رواہ ابوداؤد)(**ومنتعلا**): یعنی کبھی جوتے پہن کر بھی نماز پڑھتے دیکھا، صحیح نسخہ میں ہے **متنعلا** (باب تفعل ۔تنعل سے)۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں لوگوں کو کپڑوں کی وسعت میسر نہ تھی

۷۷۰: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ قَالَ صَلّٰى جَابِرٌ فِيْ اِزَارٍ قَدْ عَقَدَهٗ مِنْ قِبَلِ قَفَاهُ وَثِيَابُهٗ مَوْضُوْعَةٌ عَلَى الْمِشْجَبِ فَقَالَ لَهٗ قَائِلٌ تُصَلِّيْ فِيْ اِزَارٍ وَّاحِدٍ فَقَالَ اِنَّمَا صَنَعْتُ ذٰلِكَ لِيُرَانِيْ اَحْمَقُ مِّثْلُكَ وَاَيُّنَا كَانَ لَهٗ ثَوْبَانِ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخارى فى الصحيح ۱/ ۴۶۷ حديث رقم ۳۵۲۔ وأخرجه أحمد فى المسند ۳/ ۳۳۵۔

ترجمہ: حضرت محمد بن منکدرؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں حضرت جابرؓ نے نماز پڑھائی ایک چادر میں جس کو انہوں نے اپنی گدی پر باندھ رکھا تھا اور حالانکہ ان کے کپڑے کھونٹی پر لٹکے ہوئے تھے ان سے کسی نے سوال کیا کہ آپ نے صرف ایک چادر میں نماز پڑھی انہوں نے جواب دیا میں نے ایسا اس لیے کیا ہے تاکہ تم جیسا بیوقوف مجھے دیکھ لے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہم میں سے ایسا کون تھا کہ جس کے پاس دو کپڑے ہوں اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: وعن محمد بن المنکدر: یہ اکابر تابعین میں سے تھے اور مستجاب الدعوات میں سے تھے۔

قال صلی: یعنی ہمیں پڑھائی۔جیسا کہ ایک نسخہ میں ذکر ہے۔

جابر فی ازار قد عقدہ من قبل قفاہ وثیابہ: "واؤ" حال کیلئے ہے۔

موضوعة علی المشجب: یہ مشجب "میم" کے کسرہ کیساتھ اور "جیم" کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ مشجب اس چیز کو کہتے ہیں جس پر کپڑے لٹکائے جائیں۔نہایہ میں اسی طرح ہے۔

فقال له قائل: تصلی فی ازار واحد؟: اس میں ہمزہ انکار محذوف ہے۔یعنی واضح تردید کی گویا کہ کہا گیا کہ آپ نے نبی کریم ﷺ کی رفاقت پائی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی سنت کو نہیں جانتے۔کہ واجب کپڑوں میں نماز پڑھیں حالانکہ کپڑے لٹکے ہوئے تھے، اسی وجہ سے انہیں ڈانٹا اور احمق کہا۔

فقال انما صنعت ذلك لیرانی احمق مثلك: ابہریؒ کہتے ہیں کہ احمق سے مراد جاہل ہے اور "حمق" کسی چیز کو غیر اس کی قباحت جاننے کے باوجود محل میں رکھنا ہے

وأینا کان له ثوبان علی عهد رسول الله: یعنی تم کیسے اعتراض کرتے ہو۔

ایک نسخہ میں "النبی صلی الله علیه وسلم" کے الفاظ مذکور ہیں۔فائق میں ہے کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ نماز کا دو کپڑوں میں اداء کرنا افضل ہے اور باقی آپ ﷺ اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا ایک کپڑے میں نماز اداء کرنا تو وہ دوسرا کپڑا نہ ہونے کی وجہ سے تھا اور دوسرا کپڑا ہونے کے باجود نماز اداء کرنا وہ بیانِ جواز کیلئے تھا۔

رواه البخاری: میرکؒ کہتے ہیں کہ بخاری نے اس روایت کو سعید بن المسیب کی سند سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ایک سائل نے آپ ﷺ سے ایک کپڑے میں نماز کا حکم پوچھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا (او لکلم ثوبان؟) خطابیؒ کہتے ہیں لفظ استفہام کا ہے اور مطلب ہے کپڑوں کی کمی کی خبر دینا مطلب یہ کہ تم کپڑوں کی کمی اور ستر کو چھپانے کے بارے میں جانتے ہو تو ان کپڑوں میں جوازِ صلاۃ کو کیوں نہیں جانتے۔

ضرورت کے وقت ایک کپڑے میں نماز پڑھنا جائز ہے

۷۷۱: وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ الصَّلَاةُ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ سُنَّةٌ كُنَّا نَفْعَلُهُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَلَا يُعَابُ عَلَيْنَا فَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ اِنَّمَا كَانَ ذَاكَ اِذْ كَانَ فِي الثِّيَابِ قِلَّةٌ فَاَمَّا اِذَا وَسَّعَ اللّٰهُ فَالصَّلَاةُ فِي الثَّوْبَيْنِ اَزْكٰى۔ (رواه احمد)

أخرجه أحمد في المسند ٥/١٤١۔

ترجمہ: "حضرت ابی بن کعب سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھ لینا سنت ہے کیونکہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایسا کیا کرتے تھے اور ہمیں کوئی برا نہیں کہتا تھا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایسا کرنا اس وقت تھا جب کپڑوں کی قلت تھی اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے کپڑوں کے بارے میں ہمیں وسعت دے دی ہے تو اب دو

کپڑوں میں نماز پڑھنا زیادہ بہتر ہے اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **وعن ابی بن کعب قال: الصلاۃ فی الثوب الواحد سنۃ:** یعنی جائز ہے جو کہ سنت سے ثابت ہے اگر چہ دو کپڑوں میں نماز اداء کرنا افضل ہے جیسا کہ ابن مسعودؓ سے آرہا ہے لہٰذا ان دونوں کے درمیان تضاد نہیں ہوگا۔

کنا نفعلہ: یعنی نماز کا ایک کپڑے میں اداء کرنا۔

مع رسول اللہ: یعنی ہمارے فعل کے ساتھ آپ ﷺ شامل تھے یا ہمارے ساتھ آپ ﷺ موجود تھے۔

ولا یعاب علینا: یعنی آپ نے اس سے ہمیں نہیں روکا تو اس طرح یہ تقریر نبوی ہوگئی۔ لہٰذا اس کا جواز سنت سے ثابت ہوگیا اس لئے کہ عدم انکار یہ جواز کی دلیل ہے نہ کہ استحباب کی دلیل۔

فقال ابن مسعود انما کنا ذاك: یعنی نماز کا اداء کرنا ایک کپڑے میں بغیر کسی کراہت کے۔

اذا کان: ایک نسخہ میں ''**اذ کان**'' مذکور ہے۔

فی الثیاب قلۃ: جب کپڑے کم ہوتے ہیں۔ (**فالصلاۃ فی الثوبین**) یعنی ازار اور قمیص میں۔

ازکی: یعنی زیادہ اولیٰ ہے اس لئے کہ اس میں اللہ کیلئے زیادہ ادب ہے۔ طیبیؒ کہتے ہیں یعنی پاک ہے یا افضل ہے اس لئے کہ زکاۃ اس اضافہ کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی برکت سے حاصل ہو یا نفس کی گندی عادتوں سے پاکی کو زکوٰۃ کہتے ہیں حدیث میں دونوں معنی محتمل ہیں اور رہا افضل ہونا تو وہ ظاہر ہے اور تزکیہ اس لئے ہے کہ نمازی نماز پڑھتے وقت ایک کپڑے میں ستر کے کھلنے سے محفوظ نہیں ہوتا کہ ہوا چلنے یا گرہ کھلنے یا کسی اور وجہ سے ستر کھل نہ جائے بخلاف دو کپڑوں کہ اس میں محفوظ ہوتا ہے۔

ابن حجرؒ نے بھی یہی بیان کیا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس علت بیان کرنے میں نظر ہے اس لئے کہ اختلاف نہیں ہے کہ جواز ار کا ذکر کیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ قمیص تھی یا نہیں لہٰذا بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ ''ازکی'' یہ ''انمی'' کے معنی میں ہے یعنی زیادہ ثواب کا باعث ہے یا پھر اظہر کے معنی میں ہوگا اس لئے کہ اس میں گندی عادتوں سے دوری ہے جو کہ نماز کو کراہت کے ساتھ اداء کرنا ہے۔ بیہقیؒ کی روایت میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی آدمی نماز پڑھے اسے چاہیے کہ وہ دو کپڑے پہنے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ ان کیلئے زینت اختیار کی جائے۔ اگر اس کے پاس دو کپڑے نہ ہوں تو جب نماز پڑھے ازار پہن لے اور اسی طرح آپ ﷺ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ عمامہ کے ساتھ نماز اداء کرنا یہ بغیر عمامہ کے نماز سے ستر گنا زیادہ افضل ہے اور اسی طرح جو دیلمی نے ابن عمر کی حدیث سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ عمامہ کے ساتھ نماز اداء کرنا یہ پچیس گنا زیادہ افضل ہے اور جمعہ عمامہ کے ساتھ اداء کرنا یہ ستر جمعوں سے افضل ہے اور جو روایت حضرت انسؓ سے مرفوعاً منقول ہے کہ، کہ عمامہ کے ساتھ نماز اداء کرنا ''دس گنا'' زیادہ اجر کا باعث ہے۔ منوفی کہتے ہیں کہ یہ تمام باطل ہے جیسا کہ خطابیؒ نے نقل کیا ہے واللہ اعلم بالصواب۔ (رواہ احمد)

بَابُ السُّتْرَةِ

سترہ کا بیان

ضمہ کے ساتھ جس کے ذریعے اوٹ کی جائے۔ اکثر استعمال میں اس چیز کو کہتے ہیں کہ جس کو نمازی اپنے سامنے گاڑتا ہے۔ عصاء یا کوڑا، یا اس کے علاوہ کوئی اور چیز آدمی، درخت، جانور وغیرہ سے جس سے نمازی کے سجدہ کرنے والی جگہ واضح ہو سکے تا کہ نمازی اس کے اور سجدہ کرنے کی جگہ کے درمیان کوئی نہ گذرے۔ ''سترة'' موٹائی میں ایک انگلی کے برابر اور لمبائی میں ایک ہاتھ کے برابر کافی ہے۔ نوویؒ کہتے ہیں کہ علماء نے کہا ہے کہ ''سترہ'' میں حکمت نظر کو اِدھر اُدھر گھمانے سے روکنا ہے۔ اور مناسب ہے کہ سترۃ کو قریب رکھے اور تین گز سے زیادہ فاصلہ نہ کرے اور اگر عصاء وغیرہ نہ ملے تو پتھر اور مٹی کو جمع کرے ورنہ ایک خط کھینچ لے۔ امام کا سترہ مقتدی کا سترہ بھی ہے مگر یہ کہ پہلی صف میں اگر جگہ خالی ہو تو جائز ہے کہ دوسری صف کے سامنے سے گذر جائے کیونکہ دوسری صف والوں نے کوتاہی کی ہے۔ طیبیؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ شرح المنیہ میں ہے کہ سترہ کو ترک کرنا جائز ہے ایسی جگہ پر جو گزرنے سے محفوظ ہو۔

عرضِ مترجم: باب السترہ کی اکثر و بیشتر احادیث کی شرح کا (لب لباب) باب ما یقرأ بعد التکبیر کی احادیث میں ضمنی طور آ رہا ہے، طالبِ شوق وہاں پر ملاحظہ کریں یہاں ترجمہ سے بخوفِ طوالت وتکرار صرفِ نظر کیا گیا۔

الفصل الاول:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سترہ

۷۷۲: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَغْدُوْ اِلَى الْمُصَلّٰى وَالْعَنَزَةُ بَيْنَ يَدَيْهِ تُحْمَلُ وَتُنْصَبُ بِالْمُصَلّٰى بَيْنَ يَدَيْهِ فَيُصَلِّيْ اِلَيْهَا۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ٤٦٣/٢ حديث رقم ٩٧٣۔ وأخرجه بن ماجة فی السنن ٤١٣/١ حديث رقم ١٣٠٤ مع بعض التقديم والتاخير۔ وأخرجه الدارمی مختصرًا فی السنن ٣٨٣/١ حديث رقم ١٤١٠ وأحمد فی المسند ١٤٥/٢۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت عیدگاہ کی طرف تشریف لے جاتے اور آپ کے آگے آگے ایک نیزہ بھی لے جایا جاتا جو عیدگاہ میں آپ کے سامنے گاڑ دیا جاتا اور آپ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیتے تھے اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔''

سترہ کے سامنے سے گزرنا جائز ہے

۷۷۳: وَعَنْ اَبِيْ جُحَيْفَةَ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم بِمَكَّةَ وَهُوَ بِالْاَ بْطَحِ فِيْ قُبَّةٍ حَمْرَاءَ مِنْ اَدَمٍ

وَرَاَیْتُ بِلَالًا اَخَذَ وَضُوْءَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وَرَاَیْتُ النَّاسَ یَبْتَدِرُوْنَ ذٰلِكَ الْوَضُوْءَ فَمَنْ اَصَابَ مِنْہُ شَیْئًا تَمَسَّحَ بِہٖ وَمَنْ لَّمْ یُصِبْ مِنْہُ اَخَذَ مِنْ بَلَلِ یَدِصَاحِبِہٖ ثُمَّ رَأَیْتُ بِلَالًا اَخَذَ عَنَزَۃً فَرَکَزَھَا وَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فِیْ حُلَّۃٍ حَمْرَاءَ مُشَمِّرًا صَلّٰی اِلَی الْعَنَزَۃِ بِالنَّاسِ رَکْعَتَیْنِ وَرَاَیْتُ النَّاسَ وَالدَّوَابَّ یَمُرُّوْنَ بَیْنَ یَدَیِ الْعَنَزَۃِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤٨٥/١ حديث رقم ٣٧٦۔ وأخرجه مسلم في صحيحه ٣٦٠/١ حديث رقم (٢٥٠۔٥٠٣)۔

ترجمہ: ''حضرت ابو جحیفہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ مکرمہ میں مقام ابطح پر چمڑے کے ایک سرخ خیمے میں دیکھا اور میں نے حضرت بلالؓ کو آپ ﷺ کے وضو کا بچا ہوا پانی لیتے ہوئے دیکھا اور دوسرے لوگوں کو بھی میں نے دیکھا کہ وہ پانی لینے کے لئے سبقت کر رہے تھے۔ چنانچہ جس آدمی کو اس میں سے کچھ مل گیا۔ اس نے اس کو اپنے جسم پر مل لیا اور جس آدمی کو کچھ نہ ملا اس نے ساتھ والے آدمی کی رطوبت لے کر اس کو اپنے جسم پر مل لیا پھر میں نے بلالؓ کو دیکھا کہ انہوں نے نیزہ لے کر اس کو گاڑ دیا اور رسول اللہ ﷺ سرخ دھاری دار جوڑا زیب تن کیے ہوئے اور لباس کو سمیٹتے ہوئے تشریف لائے اور نیزہ کی طرف رخ کر کے لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائی اور میں دیکھ رہا تھا کہ آدمی اور چوپائے اس نیزہ کے سامنے سے گزر رہے تھے۔'' (بخاری و مسلم)

راویٔ حدیث:

ابو جحیفۃ ۔ ان کا نام ''وہب بن عبداللہ العامری'' ہے۔ یہ سوائی ہیں یہ کوفہ میں فروکش ہوئے۔ یہ کم سن صحابہ میں سے ہیں۔ جب آنحضور ﷺ کی وفات ہوئی تو یہ ابھی سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچے تھے۔ لیکن آنحضور ﷺ سے انہوں نے حدیث کو سنا ہے اور آپ ﷺ سے روایت حدیث بھی کی ہے۔ کوفہ میں ۷۴ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ ان کے بیٹے عونؒ اور تابعین کی ایک جماعت نے ان سے روایت کی ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے جلد ہشتم کی حدیث کے تحت عون کے بجائے ''عوف'' ذکر کیا ہے ہے۔ اھ جحیفہ جیم کے پیش اور حاء اور فاء دونوں کے زبر اور یا ساکن کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ ''سوائی'' سین کے ضمہ واؤ کی تخفیف اور الف عدودہ کے ساتھ ہے۔

جانور کو سترہ بنانا

۷۷۴: وَعَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَعْرِضُ رَاحِلَتَہٗ فَیُصَلِّیْ اِلَیْھَا متفق علیه وزاد الْبُخَارِیُّ قُلْتُ اَفَرَاَیْتَ اِذَا ھَبَّتِ الرِّکَابُ قَالَ کَانَ یَاْخُذُ الرَّحْلَ فَیُعَدِّلُہٗ فَیُصَلِّیْ اِلٰی اٰخِرَتِہٖ۔

أخرجه البخاري في صحيحه مع الزيادة ١/ ٥٨٠ حديث رقم ٥٠٧۔ وأخرجه مسلم في صحيحه ٣٥٩/١ حديث

رقم (٢٤٧-٥٠٢)۔

ترجمہ: ''حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری کے اونٹ کو آگے بٹھا کر اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔(بخاری ومسلم) اور بخاری نے یہ الفاظ زیادہ نقل کیے ہیں کہ حضرت نافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا کہ جب اونٹ چرنے کے لیے اور پانی پینے کے لیے چلے جاتے تھے پھر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کجاوے کی لکڑی کو ٹھیک کر کے سامنے رکھ لیتے تھے اور کجاوے کی پچھلی لکڑی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیتے تھے۔''

سترہ کے قابل کونسی چیز ہے؟

٧٧٥: وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِاللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وَضَعَ اَحَدُكُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ مِثْلَ مُؤَخَّرَةِ الرَّحْلِ فَلْيُصَلِّ وَلَايُبَالِ مَنْ مَرَّوَرَاءَ ذٰلِكَ ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٣٥٨/١ حديث رقم (٢٤١ـ ٤٩٩)۔وأخرجه أبوداوٗد في السنن ٤٤٢/١ حديث رقم ٦٨٥۔وأخرجه الترمذي في السنن ١٥٦/١ حديث رقم ٣٣٥۔وأخرجه ابن ماجة في السنن ٣٠٣/١ حديث رقم ٩٠٤۔وأخرجه أحمد في المسند ١٦١/١۔

ترجمہ: ''حضرت طلحہؓ بن عبیداللہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی کجاوہ کی پچھلی لکڑی کے مثل سترہ بنا کر رکھ لے تو اس کو چاہیے کہ وہ نماز پڑھ لے اور اس کے سامنے جو گزرے اس کی پرواہ نہ کرے اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔''

نمازی کے آگے سے گزرنا گناہ ہے

٧٧٦: وَعَنْ اَبِىْ جُهَيْمٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَوْ يَعْلَمُ الْمَارُّ بَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّىْ مَاذَا عَلَيْهِ لَكَانَ اَنْ يَقِفَ اَرْبَعِيْنَ خَيْرًا لَّهُ مِنْ اَنْ يَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ قَالَ اَبُوالنَّضْرِ لَااَدْرِىْ قَالَ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا اَوْشَهْرًا اَوْسَنَةً. (متفق عليه)

البخاري ٥٨٤/١ حديث رقم ٥١٠۔ومسلم ٣٦٣/١ حديث (٢٦١ـ٥٠٧)۔وأبوداوٗد ٤٤٩/١ حديث رقم ٧٠١ والترمذي ١٥٨/٢ حديث رقم ٣٣٦۔والنسائي ٦٦/٢ حديث ٧٥٦ وابن ماجة ٣٠٤/١ حديث ٩٤٥۔ والدارمي ٣٨٧/١ حديث ١٤١٧ ومالك ١٥٤/١ حديث رقم ٣٤ من كتاب قصر الصلاة في السفر ۔وأحمد ١٦٩/٤۔

ترجمہ: ''ابوجہیمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نمازی کے سامنے سے گزرنے والا اگر یہ جان لے کہ اسکی سزا کیا ہے تو وہ نمازی کے آگے سے گزرنے کے بجائے چالیس تک کھڑے رہنے کو بہتر سمجھے گا اس حدیث کے راوی ابونضرؒ فرماتے ہیں کہ چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس سال مجھے معلوم نہیں کہ اس سے کیا مراد ہے۔'' (بخاری ومسلم)

نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کو روکنا

۷۷۷: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ اِلٰی شَیْءٍ یَّسْتُرُہٗ مِنَ النَّاسِ فَاَرَادَ اَحَدٌ اَنْ یَجْتَازَ بَیْنَ یَدَیْهِ فَلْیَدْ فَعْهُ فَاِنْ اَبٰی فَلْیُقَا تِلْهُ فَاِنَّمَا هُوَشَیْطَانٌ (هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِیِّ وَلِمُسْلِمٍ مَعْنَاهُ)۔

أخرجه البخاری ۱/۵۸۱حدیث ۵۰۹۔ومسلم ۱/۳۶۲حدیث (۲۵۹۔۵۰۵)وأبو داوٗد ۱/۴۴۹حدیث رقم ۷۰۰ والنسائی ۲/۶۶حدیث۷۵۷۔وابن ماجةبمعناه ۱/۳۰۷حدیث۹۵۴والدارمی ۱/۳۸۴حدیث ۱۴۱۱ ومالك ۱۵۴حدیث ۳۳ من کتاب قصر الصلاة فی السفر وأحمد ۳/۳۶۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی کسی شئی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے جو اس کے اور لوگوں کے درمیان حائل ہو اور کوئی آدمی اس کے آگے سے گزرنے کا ارادہ کرے تو اس کو روک دے اگر وہ نہ مانے تو اس سے لڑائی کرے کیونکہ وہ شیطان ہے حدیث کے یہ الفاظ بخاری کے ہیں اور مسلم نے اس روایت کو بالمعنیٰ نقل کیا ہے۔''

نمازی کے سامنے سے عورت' گدھا اور کتا گزرنے کا حکم

۷۷۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَقْطَعُ الصَّلَاةَ الْمَرْاَةُ وَالْحِمَارُ وَالْکَلْبُ وَیَقِیْ ذٰلِكَ مِثْلُ مُؤَخَّرَةِ الرَّحْلِ ۔ (رواہ مسلم)

مسلم ۱/۳۶۵حدیث (۲۶۶۔۵۱۱)وأخرج ابن ماجة أوله ۱/۳۰۵حدیث ۹۵۰۔وأحمد ۲ ۴۲۵۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا عورت' گدھا اور کتا نماز کو ختم کر دیتے ہیں اور کجاوہ کی پچھلی لکڑی کے مثل چیز کو سترہ بنا دینے سے نماز کو بچا لیتا ہے اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔''

۷۷۹: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ کَانَ النَّبِیُّ ﷺ یُصَلِّیْ مِنَ اللَّیْلِ وَاَنَا مُعْتَرِضَةٌ بَیْنَهٗ وَبَیْنَ الْقِبْلَةِ کَاعْتِرَاضِ الْجَنَازَةِ ۔ (متفق علیه)

البخاری فی صحیحه ۱/۴۹۲حدیث رقم ۳۸۳۔ومسلم ۱/۳۶۶حدیث رقم (۲۶۷۔۵۱۲)وأبو داوٗد بالفاظ متقاربة ۱/۴۵۶حدیث ۷۱۱۔وابن ماجة ۱/۳۰۷حدیث ۹۵۶۔وأحمد ۶/۱۹۹۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رات کے وقت نماز پڑھتے رہتے تھے اور میں آپ کے اور قبلہ کے درمیان اس طرح لیٹی ہوتی تھی جیسے جنازہ نمازیوں کے آگے رکھا ہوتا ہے۔'' (بخاری ومسلم)

گدھے کے گزرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی

۷۸۰: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَقْبَلْتُ رَاكِبًا عَلٰى اَتَانٍ وَاَنَا يَوْمَئِذٍ قَدْنَاهَزْتُ الْاِحْتِلَامَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّيْ بِالنَّاسِ بِمِنًى اِلٰى غَيْرِ جِدَارٍ فَمَرَرْتُ بَيْنَ يَدَىْ بَعْضِ الصَّفِّ فَنَزَلْتُ وَاَرْسَلْتُ الْاَتَانَ تَرْتَعُ وَدَخَلْتُ فِي الصَّفِّ فَلَمْ يُنْكِرْ ذٰلِكَ عَلَيَّ اَحَدٌ۔ (متفق عليه)

البخاري في صحيحه ١/٥٧١حديث ٤٩٣۔ومسلم ١/٣٦١حديث (٢٥٤۔٥٠٤)وأبو داوٗد ١/٤٥٨حديث ٧١٥۔ ومالك ١/١٥٥حديث ٣٨من كتاب قصر الصلاة في السفر ۔وأحمد ١/٢٦٤۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب میں بلوغت کے قریب تھا تو ایک دن گدھی پر سوار ہو کر آیا رسول اللہ ﷺ منیٰ میں لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے اور آپ کے آگے کوئی دیوار نہیں تھی میں کچھ صف کے سامنے سے گزرا اور پھر گدھی سے اترا اور میں نے گدھی کو چھوڑ دیا وہ چرنے لگی اور میں صف میں داخل ہو گیا اور مجھ پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔'' (بخاری و مسلم)

الفصل الثانی:

سترہ قائم کرنے کا حکم

۷۸۱: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ فَلْيَجْعَلْ تِلْقَاءَ وَجْهِهٖ شَيْئًا فَاِنْ لَّمْ يَجِدْ فَلْيَنْصِبْ عَصَاهُ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ مَعَهٗ عَصًى فَلْيَخْطُطْ خَطًّا ثُمَّ لَايَضُرُّهٗ مَامَرَّ اَمَامَهٗ.

(رواه ابو داود و ابن ماجة)

أبو داوٗد ١/٤٤٣حديث ٦٨٩۔وابن ماجة في السنن ١/٣٠٣حديث ٩٤٣۔وأحمد ٢/٢٤٩۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی آدمی نماز پڑھنا چاہے تو اپنے سامنے کی جانب کوئی چیز رکھ لے اور اگر کچھ نہ ملے تو اپنا عصا کھڑا کر دیا کرے اگر اس کے پاس عصا بھی نہ ہو تو خط کھینچا کرے پھر اس کے سامنے سے کوئی گزر جائے تو اسے کچھ نقصان نہیں ہوگا اس حدیث کو امام ابو داؤدؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔''

سترہ قریب کھڑا کیا جائے

۷۸۲: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ اَبِيْ حَثْمَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ اِلٰى سُتْرَةٍ فَلْيَدْنُ مِنْهَا لَايَقْطَعِ الشَّيْطَانُ صَلَاتَهٗ۔ (رواه ابو داود)

أبو داوٗد ١/٤٤٦ حديث ٦٥٥۔ والنسائی ٢/٦٢ حديث ٧٤٨۔

ترجمہ: ”حضرت سہل بن ابی حثمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی آدمی سترہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے تو اس کو چاہئے کہ وہ سترہ کے قریب رہے تاکہ شیطان اس کی نماز کو نہ توڑے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔“

راویٔ حدیث:

سہل بن حثمہ:۔ یہ سہل بن ابی حثمہ ہیں۔ ”ابومحمد“ ان کی کنیت ہے۔ انہی کو ”ابوعمارہ“ بھی کہا جاتا ہے۔ انصاری واوسی ہیں۔ ۳ھ میں پیدا ہوئے۔ کوفہ میں اقامت گزیں ہوئے۔ ان کا شمار مدینہ والوں میں ہوتا ہے اور مدینہ ہی میں مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان کا انتقال ہوا۔ ایک بڑا گروہ ان سے روایت حدیث کرتا ہے۔ حثمہ حائے مہملہ کے فتحہ اور ہائے مثلثہ کے سکون کے ساتھ ہے۔

سترہ پیشانی کے بالکل سامنے نہ ہو

۷۸۳: وَعَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْاَسْوَدِ قَالَ مَارَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّيْ اِلٰى عُوْدٍ وَلَا عَمُوْدٍ وَلَا شَجَرَةٍ اِلَّا جَعَلَهٗ عَلٰى حَاجِبِهِ الْاَيْمَنِ اَوِالْاَ يْسَرِوَلَا يَصْمُدُ لَهٗ صَمْدًا۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه أبو داوٗد ١/٤٤٥ حديث ٦٩٣۔ وأحمد في المسند ٦/٤۔

ترجمہ: ”حضرت مقداد بن اسودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو جب بھی دیکھا کہ آپ لکڑی، ستون اور درخت کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہوں تو یہ چیزیں آپ کے دائیں یا بائیں ابرو کے سامنے ہوتیں اور آپ ﷺ کی بالکل سیدھ میں کھڑے نہ ہوتے تھے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔“

کتے اور گدھے کے گزرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی

۷۸۴: وَعَنِ الْفَضْلِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَتَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَنَحْنُ فِيْ بَادِيَةٍ لَنَا وَمَعَهٗ عَبَّاسٌ فَصَلّٰى فِيْ صَحْرَاءَ لَيْسَ بَيْنَ يَدَيْهِ سُتْرَةٌ وَحِمَارَةٌ لَنَا وَكَلْبَةٌ تَعْبَثَانِ بَيْنَ يَدَيْهِ فَمَابَالٰى بِذٰلِكَ.

(رواه ابوداود والنسائي نحوه)

أبو داوٗد ١/٤٥٩ حديث رقم ٧١٨۔ والنسائي بمعناه ٢/٦٥ حديث رقم ٧٥٣ وأحمد ١/٢١١۔

ترجمہ: ”حضرت فضل بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ ہمارے پاس تشریف لائے جب کہ ہم اپنے جنگل میں تھے اور حضرت عباسؓ بھی آپ کے ساتھ تھے اور آپ ﷺ نے جنگل میں نماز پڑھی اس وقت آپ کے سامنے سترہ موجود نہ تھا ہماری گدھی اور کتیا آپ کے سامنے کھیل رہی تھی آپ نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام نسائیؒ نے روایت کیا۔“

راویٔ حدیث:

فضل بن عباس۔ ''فضل'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ حنین میں شامل ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جو لوگ اس موقع پر ثابت قدم ہے ان میں یہ بھی تھے۔ حجۃ الوداع میں بھی شریک تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے موقع پر دوسروں کے ساتھ موجود تھے۔ شام کی طرف بغرضِ جہاد تشریف لے گئے۔ صرف اکیس (۲۱) سال کی عمر میں اطراف ''اردن'' میں طاعون عمواس میں ۱۸ھ میں انتقال فرمایا۔ کہا گیا ہے کہ جنگ یرموک میں شہید ہوئے اور بھی بعض اقوال ذکر کیے جاتے ہیں۔ اُن سے اِن کے بھائی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں۔

کسی چیز کے گزرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی

۷۸۵: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَقْطَعُ الصَّلَاةَ شَیْءٌ وَادْرَؤُوْا مَا اسْتَطَعْتُمْ فَاِنَّمَا هُوَ شَیْطَانٌ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/ ٤٦٠ حدیث ۷۱۹۔

''حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی چیز نماز کو فاسد نہیں کر سکتی اور تم روکو جس قدر طاقت رکھتے ہو کیونکہ سامنے سے گزرنے والا شیطان ہے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔''

الفصل الثالث:

اگر عورت نمازی کے سامنے لیٹی ہو تو نماز فاسد نہیں ہوگی

۷۸۶: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ کُنْتُ اَنَامُ بَیْنَ یَدَیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَرِجْلَایَ فِیْ قِبْلَتِهٖ فَاِذَا سَجَدَ غَمَزَنِیْ فَقَبَضْتُ رِجْلَیَّ وَاِذَا قَامَ بَسَطْتُّهُمَا قَالَتْ وَالْبُیُوْتُ یَوْمَئِذٍ لَیْسَ فِیْهَا مَصَابِیْحُ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی الصحیح ۱/ ۵۸۸ حدیث ۵۱۳ ـ ومسلم ۱/ ۳٦۷ حدیث (۲۷۲ـ۵۱۲) وأبو داوٗد ۱/ ٤۵۷ حدیث ۷۱۲ ـ وأخرجه النسائی فی السنن ۱/ ۱۰۲ حدیث ۱٦۸ وأخرجه مالك ۱/ ۱۱۷ حدیث ۲ من کتاب صلاة اللیل ـ وأحمد ٦/ ۱٤۸۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سوئی ہوتی تھی اور میرے دونوں پاؤں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبلہ کی طرف ہوتے تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کرتے تھے تو مجھے دبا دیتے تھے اور میں اپنے پاؤں کو سمیٹ لیتی تھی اور جب آپ کھڑے ہوتے تھے تو پھر میں پاؤں کو پھیلا دیتی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ان دنوں میں گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے۔'' (بخاری و مسلم)

نمازی کے سامنے سے گزرنا جرم ہے

۷۸۷: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَوْیَعْلَمُ اَحَدُكُمْ مَالَهٗ فِیْ اَنْ یَّمُرَّ بَیْنَ یَدَیْ اَخِیْهِ مُعْتَرِضًا فِی الصَّلَاةِ كَانَ لَاَنْ یُّقِیْمَ مِائَةَ عَامٍ خَیْرٌ لَّهٗ مِنَ الْخَطْوَةِ الَّتِیْ خَطَا ـ (رواه ابن ماجة)

ابن ماجة فی السنن ١/٣٠٤ حديث رقم ٩٤٦ـ

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تم میں سے کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ اپنے مسلمان بھائی کے سامنے سے جب کہ وہ نماز پڑھ رہا ہو عرضاً گزرنا کتنا بڑا گناہ ہے تو اس کے لیے سو سال تک کھڑے رہنا ایک قدم بڑھانے سے بہتر ہے۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔''

زمین میں دھنس جانا نمازی کے آگے گزرنے سے ہلکا ہے

۷۸۸: وَعَنْ كَعْبِ الْاَحْبَارِ قَالَ لَوْ یَعْلَمُ الْمَارُّ بَیْنَ یَدَیِ الْمُصَلِّیْ مَاذَا عَلَیْهِ لَكَانَ اَنْ یُّخْسَفَ بِهٖ خَیْرًا لَّهٗ مِنْ اَنْ یَّمُرَّ بَیْنَ یَدَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ اَهْوَنُ عَلَیْهِ۔ (رواه مالك)

أخرجه مالك فی الموطأ ١/١٥٥ـ حديث رقم ٣٥ من كتاب قصر الصلاة فی السفر ـ

ترجمہ: ''حضرت کعب احبارؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ نمازی کے سامنے سے گزرنے والا اگر یہ جان لے کہ اس کی کیا سزا ہے تو اس کو اپنا زمین میں دھنسایا جانا نمازی کے آگے سے گزرنے زیادہ بہتر معلوم ہو اور ایک دوسری روایت میں بجائے۔ بہتر۔ کے زیادہ آسان کا لفظ ہے۔ اس حدیث کو امام مالکؒ نے روایت کیا ہے۔''

نمازی کے سامنے سے کتنے فاصلے سے گزرنا درست ہے؟

۷۸۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ اِلٰى غَیْرِ السُّتْرَةِ فَاِنَّهٗ یَقْطَعُ صَلَاتَهُ الْحِمَارُ وَالْخِنْزِیْرُ وَالْیَهُوْدِیُّ وَالْمَجُوْسِیُّ وَالْمَرْاَةُ وَتُجْزِئُ عَنْهُ اِذَامَرَّبَیْنَ یَدَیْهِ عَلٰى قَذْفَةٍ بِحَجَرٍ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبو داؤد ١/٤٥٣ حديث ٧٠٤ـ فی المخطوطة عن

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ تم میں سے جو آدمی بغیر سترہ کے نماز پڑھے گا تو اس کی نماز اس کے سامنے سے گدھے' خنزیر' یہودی مجوسی اور عورت کے گزر جانے سے فاسد ہو جائے گی ہاں البتہ اگر یہ پتھر پھینکنے کے فاصلہ سے گزریں تو پھر کوئی حرج نہیں۔'' (ابوداؤد)

بَابُ صِفَةِ الصَّلٰوةِ

نماز پڑھنے کا بیان

الفصل الاول:

ادائے نماز کا طریقہ

۷۹۰: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَجُلاً دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ جَالِسٌ فِیْ نَاحِيَةِ الْمَسْجِدِ فَصَلّٰی ثُمَّ جَاءَ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَعَلَيْكَ السَّلَامُ اِرْجِعْ فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ فَرَجَعَ فَصَلّٰی ثُمَّ جَآءَ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَقَالَ وَعَلَيْكَ السَّلَامُ اِرْجِعْ فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ فَقَالَ فِی الثَّالِثَةِ اَوْ فِی الَّتِیْ بَعْدَهَا عَلِّمْنِیْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ اِذَا قُمْتَ اِلَی الصَّلَاةِ فَاَسْبِغِ الْوُضُوْءَ ثُمَّ اسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ فَكَبِّرْ ثُمَّ اقْرَأْ بِمَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ثُمَّ ارْكَعْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ رَاكِعًا ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰی تَسْتَوِیَ قَائِمًا ثُمَّ اسْجُدْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ جَالِسًا ثُمَّ اسْجُدْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰی تَطْمَئِنَّ جَالِسًا وَفِیْ رواية ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰی تَسْتَوِیَ قَائِمًا ثُمَّ افْعَلْ ذٰلِكَ فِیْ صَلَاتِكَ كُلِّهَا۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری ۲/۲۳۷حديث رقم ۷۵۷۔ومسلم ۱/۲۹۸حديث (۴۵۔۳۹۷)وأبو داوٗد ۱/۵۳۴حدیث ۸۵۶۔ والترمذی بمعناه ۲/۱۰۳رقم ۳۰۳والنسائی ۱/۱۹۳حديث رقم ۱۰۵۳۔وابن ماجة ۱/۳۳۶حدیث ۱۰۶۰ وأحمد ۲/۴۳۷۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ مسجد کے ایک گوشہ میں تشریف فرما تھے کہ ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا پہلے اس نے نماز پڑھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا۔ آپؐ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا جاؤ پھر نماز پڑھو۔ اس لیے کہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ وہ چلا گیا جس طرح پہلے نماز پڑھی تھی اسی طرح پھر نماز پڑھی اور آپ ﷺ کی خدمت میں آ کر سلام عرض کیا آپ ﷺ نے سلام کا جواب دے کر پھر فرمایا کہ جاؤ نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی۔ تیسری مرتبہ یا چوتھی مرتبہ اس آدمی نے عرض کیا۔ اللہ کے رسول ﷺ مجھے سکھلا دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو اچھی طرح وضو کرلو۔ پھر قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو کر تکبیر کہو اور پھر قرآن جو تمہیں آسان معلوم ہو اس کو پڑھو۔ پھر آرام کے ساتھ رکوع کرو۔ پھر سر اٹھاؤ یہاں تک کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ پھر آرام سے سجدہ کرو۔ پھر سر اٹھاؤ اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔ پھر آرام سے دوسرا سجدہ کرو۔ پھر سر اٹھاؤ اور آرام سے

بیٹھ جاؤ۔ ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ پھر سر اٹھاؤ اور سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ پھر اپنی تمام نماز اسی طرح مکمل کرو۔ (بخاری و مسلم)

رسول اللہ ﷺ کی نماز کا طریقہ

۷۹۱: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَسْتَفْتِحُ الصَّلَاةَ بِالتَّكْبِيْرِ وَالْقِرَاءَ ةِ بِالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَكَانَ اِذَا رَكَعَ لَمْ يُشْخِصْ رَأْسَهٗ وَلَمْ يُصَوِّبْهُ وَلٰكِنْ بَيْنَ ذٰلِكَ وَكَانَ اِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ لَمْ يَسْجُدْ حَتّٰى يَسْتَوِىَ قَائِمًا وَكَانَ اِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ السَّجْدَةِ لَمْ يَسْجُدْ حَتّٰى يَسْتَوِىَ جَالِسًا وَكَانَ يَقُوْلُ فِىْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ التَّحِيَّةُ وَكَانَ يَفْرِشُ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى وَيَنْصِبُ رِجْلَهُ الْيُمْنٰى وَكَانَ يَنْهٰى عَنْ عُقْبَةِ الشَّيْطَانِ وَيَنْهٰى اَنْ يَّفْتَرِشَ الرَّجُلُ ذِرَاعَيْهِ افْتِرَاشَ السَّبُعِ وَكَانَ يَخْتِمُ الصَّلَاةَ بِالتَّسْلِيْمِ۔ (رواه مسلم)

مسلم ۳۵۷/۱ (۲۴۰۔۴۹۸) وأبو داؤد فی السنن ۴۹۴/۱ حديث رقم ۷۸۳ وأحمد ۱۹۴/۶۔

ترجمه: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز کو تکبیر تحریمہ سے اور قراءت کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے شروع کرتے تھے اور جب آپ رکوع کرتے تو اپنا سر مبارک نہ تو بلند کرتے تھے اور نہ پست لیکن اس کے درمیان رکھتے تھے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تھے تو بغیر سیدھا کھڑے ہوئے سجدہ میں نہ جاتے تھے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو بغیر سیدھا بیٹھے ہوئے سجدہ میں نہ جاتے تھے ہر دو رکعتوں کے بعد التحیات پڑھتے تھے اور اپنا بایاں پاؤں بچھاتے اور دایاں کھڑا رکھتے تھے اور آپ شیطان کی بیٹھک سے منع کرتے تھے اور مرد کو دونوں ہاتھ سجدہ میں بچھانے سے منع کرتے تھے جس طرح درندہ اپنے بازوؤں کو بچھا لیتا ہے اور آپ ﷺ نماز کو سلام پر ختم کرتے تھے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

طریقہ نماز سے متعلق چند اُمور

۷۹۲: وَعَنْ اَبِىْ حُمَيْدِ السَّاعِدِىِّ قَالَ فِىْ نَفَرٍ مِّنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَا اَحْفَظُكُمْ بِصَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ رَاَيْتُهٗ اِذَا كَبَّرَ جَعَلَ يَدَيْهِ حِذَاءَ مَنْكِبَيْهِ وَاِذَا رَكَعَ اَمْكَنَ يَدَيْهِ مِنْ رُكْبَتَيْهِ ثُمَّ هَصَرَ ظَهْرَهٗ فَاِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ اسْتَوٰى حَتّٰى يَعُوْدَ كُلُّ فَقَارٍ مَكَانَهٗ فَاِذَا سَجَدَ وَضَعَ يَدَيْهِ غَيْرَ مُفْتَرِشٍ وَلَا قَابِضِهِمَا وَاسْتَقْبَلَ بِاَطْرَافِ اَصَابِعِ رِجْلَيْهِ الْقِبْلَةَ فَاِذَا جَلَسَ فِى الرَّكْعَتَيْنِ جَلَسَ عَلٰى رِجْلِهِ الْيُسْرٰى وَنَصَبَ الْيُمْنٰى فَاِذَا جَلَسَ فِى الرَّكْعَةِ الْاٰخِرَةِ قَدَّمَ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى وَنَصَبَ الْاُخْرٰى وَقَعَدَ عَلٰى مَقْعَدَتِهٖ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲/ ۳۰۵ حدیث ۸۲۸۔ وأبو داوٗد مع زیادۃ و سباق مغایر ۱/ ۴۶۷ حدیث ۷۳۰۔

ترجمه: حضرت ابوحمید الساعدیؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت میں فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے طریقہ نماز کو تم سب سے زیادہ جانتا ہوں میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ جب آپ ﷺ تکبیر کہتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھاتے تھے اور جب رکوع میں جاتے تھے تو اپنے دونوں گھٹنوں کو مضبوط پکڑتے تھے اور پیٹھ جھکا لیتے تھے اور جب اپنا سر اٹھاتے تھے تو سیدھے کھڑے ہو جاتے یہاں تک کہ تمام جوڑ اپنی اپنی جگہ پر آ جاتے تھے اور جب سجدہ میں جاتے تو دونوں ہاتھ زمین پر رکھ دیتے تھے اور انہیں پھیلاتے نہیں تھے اور نہ سمیٹتے تھے اور پاؤں کی انگلیاں قبلہ کی طرف متوجہ رکھتے تھے اور جب دو رکعتیں پڑھنے کے بعد بیٹھتے تو بائیں پاؤں پر بیٹھتے اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھتے اور جب آخری رکعت پڑھ کر بیٹھتے تو بائیں پاؤں کو آگے نکال دیتے اور دوسرے پاؤں کو کھڑا کر کے سرین پر بیٹھ جاتے تھے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ابوحمید۔ ابوحمید ساعدی کے نام کے بارے میں اختلاف ہے۔ مؤلف رحمہ اللہ لکھتے ہیں: عبدالرحمٰن ابن سعد انصاری خزرجی ساعدی ہیں۔ ان کی کنیت زیادہ مشہور ہے۔ ان سے ایک جماعت نے روایت حدیث کی ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے آخر دورِ خلافت میں انہوں نے انتقال فرمایا۔ ''حمید'' صیغۂ تصغیر کے ساتھ ہے۔

رفع یدین کا مسئلہ

۷۹۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ اِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ وَاِذَا كَبَّرَ لِلرُّكُوْعِ وَاِذَا رَفَعَ رَاْسَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ رَفَعَهُمَا كَذَالِكَ وَقَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ وَكَانَ لَا يَفْعَلُ ذٰلِكَ فِي السُّجُوْدِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی الصحیح ۲/ ۲۱۸ حدیث ۷۳۵۔ ومسلم ۱/ ۲۹۲ حدیث (۲۲۔۳۹۰) وأبو داوٗد ۱/ ۴۶۳ رقم ۷۲۲۔ والترمذی رقم ۲۵۵۔ والنسائی ۲/ ۱۲۲ حدیث ۸۷۸۔ وابن ماجة فی ۱/ ۲۷۹ حدیث ۸۵۸۔ والدارمی ۱/ ۳۱۶ حدیث رقم ۲۵۰ وأخرجه مالك فی الموطأ ۱/ ۷۵ حدیث ۱۶ من کتاب الصلاۃ۔

ترجمه: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تو دونوں ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھاتے تھے اور جب رکوع کے لئے تکبیر کہتے یا رکوع سے سر اٹھاتے تو پھر بھی اسی طرح دونوں ہاتھ اٹھاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کہتے اور رسول اللہ ﷺ سجدوں میں ایسا نہیں کرتے تھے۔'' (بخاری و مسلم)

ابن عمر رضی اللہ عنہما کا رفع یدین

۷۹۴: وَعَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ اِذَا دَخَلَ فِي الصَّلَاةِ كَبَّرَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَاِذَا رَكَعَ رَفَعَ يَدَيْهِ وَاِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَفَعَ يَدَيْهِ وَاِذَا قَامَ مِنَ الرَّكْعَتَيْنِ رَفَعَ يَدَيْهِ وَرَفَعَ ذٰلِكَ ابْنُ عُمَرَ اِلَى النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری ۲/۲۲۲ حدیث رقم ۷۳۹۔

ترجمہ: ”حضرت نافع سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب نماز شروع کرتے تھے تو تکبیر کہتے اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے اور جب رکوع میں جاتے تو دونوں ہاتھ اٹھاتے اور جب تسمیع اور تحمید کہتے تو دونوں ہاتھ اٹھاتے اور جب دو رکعتیں پڑھ کر اٹھتے تب بھی دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع نقل کرتے تھے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔“

۷۹۵: وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا كَبَّرَ رَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا اُذُنَيْهِ وَاِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ فَقَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فَعَلَ مِثْلَ ذٰلِكَ وَفِيْ رِوَايَةٍ حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا فُرُوْعَ اُذُنَيْهِ۔ (متفق علیه)

البخاری فی صحیحه ۲/۲۱۹ حدیث ۷۳۷۔ ومسلم ۱/۲۹۳ حدیث (۲۵۔۳۹۱)۔ والنسائی ۲/۱۲۲ حدیث ۸۸۰۔ وابن ماجة فی السنن ۱/۲۷۹ حدیث ۸۵۹ والدارمی ۱/۳۱۷ رقم ۱۲۵۱۔ وأحمد ۳/۴۳۶۔

ترجمہ: ”حضرت مالک بن حویرثؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تکبیر کہتے تھے تو اپنے ہاتھوں کو اتنا اٹھاتے کہ ان کو کانوں کے برابر لے جاتے تھے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو تسمیع اور تحمید کہہ کر اسی طرح کرتے تھے اور ایک دوسری روایت میں ہے دونوں ہاتھوں کو اپنے کانوں کے اوپر تک لے جاتے تھے۔“

جلسہ استراحت

۷۹۶: وَعَنْهُ اَنَّهٗ رَأَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ فَاِذَا كَانَ فِيْ وِتْرٍ مِنْ صَلَاتِهٖ لَمْ يَنْهَضْ حَتّٰى يَسْتَوِيَ قَاعِدًا۔ (رواه البخاری)

البخاری فی صحیحه ۲/۳۰۲ حدیث ۸۲۳۔ وأبو داؤد ۱/۵۲۷ حدیث ۸۴۴ وأخرجه الترمذی ۲/۷۹ حدیث ۲۸۷۔ وأخرجه النسائی ۲/۲۳۴ حدیث ۱۱۵۲۔

ترجمہ: ”حضرت مالک بن حویرثؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ جب آپ اپنی نماز کی طاق رکعت میں ہوتے جب تک سیدھے بیٹھ نہ جاتے (اس وقت تک) کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔“

نماز میں ہاتھ کس طرح باندھنے چاہئیں؟

۷۹۷: وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ اَنَّهٗ رَاَى النَّبِیَّ ﷺ رَفَعَ يَدَيْهِ حِيْنَ دَخَلَ فِي الصَّلَاةِ كَبَّرَ ثُمَّ الْتَحَفَ بِثَوْبِهٖ ثُمَّ وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلَى الْيُسْرٰى فَلَمَّا اَرَادَ اَنْ يَّرْكَعَ اَخْرَجَ يَدَيْهِ مِنَ الثَّوْبِ ثُمَّ رَفَعَهُمَا وَكَبَّرَ فَرَكَعَ فَلَمَّا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَفَعَ يَدَيْهِ فَلَمَّا سَجَدَ سَجَدَ بَيْنَ كَفَّيْهِ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم ۱/ ۳۰۱ حديث (۵۴-۴۰۱)۔

ترجمہ: ''حضرت وائل بن حجرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ نے نماز شروع کرتے وقت دونوں ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہی پھر ہاتھ کپڑے کے اندر کر لئے اور دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھا پھر جب رکوع میں جانے کا ارادہ کیا تو دونوں ہاتھوں کو کپڑے سے نکال کر اٹھایا اور تکبیر کہہ کر رکوع میں چلے گئے اور جب سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ کہا تو ہاتھوں کو اٹھایا پھر جب سجدہ کیا تو دونوں ہاتھوں کے درمیان کیا اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

وائل بن حجر۔ یہ وائل ہیں، حجر ابن ربیعہ بن وائل بن یعمر کے بیٹے اور ''حضرمی'' ہیں۔ حضرموت کے سرداروں میں سے ہیں۔ ان کے والد وہاں کے بادشاہ تھے۔ طبقہ صحابہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بصورت وفد حاضر ہوئے جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی اصحاب سے ان کے آنے سے پہلے یہ خوشخبری سنادی تھی کہ تمہارے پاس بہت دور (حضرموت) سے ''وائل بن حجر'' آرہے ہیں ان کا آنا اطاعت گذاری اور اللہ اور اس کے رسول کے شوق و رغبت کے لیے ہے۔ یہ شاہی خاندان صاحب فضیلت افراد میں سے تھے۔ جب یہ حاضر ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے ان کو ''مرحبا'' کہا اور اپنے قریب جگہ دی۔ اپنی ردائے مبارک ان کے لیے بچھا دی اور اس پر ان کو بیٹھایا۔ اور فرمایا ''اے اللہ وائل اور ان کی اولاد اور ان کی اولاد کی اولاد میں برکت عطا فرما''۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو ''حضرموت'' کے سرداروں پر افسر مقرر فرمایا۔ ان سے ان کے دونوں بیٹے علقمہ اور عبدالجبار اور ایک جماعت نے روایت کی۔ ''حجر'' میں حاء مہملہ مضموم، جیم ساکن اور آخر میں راء ہے۔

اور صحیح بات یہ ہے کہ عبدالجبار نے اپنے والد سے سماع نہیں کیا۔ واللہ اعلم

عرض مرتب: علقمہ بن وائل رضی اللہ عنہ کا اپنے والد سے سماع مختلف فیہ ہے۔ چنانچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب العلل الکبیر'' میں نقل کیا ہے علقمہ بن وائل رضی اللہ عنہ کا سماع اپنے والد سے نہیں ہے لیکن دوسری طرف ترمذی شریف میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں: علقمہ بن وائل رضی اللہ عنہ بن حجر نے اپنے والد سے سماع کیا ہے، علقمہ بن وائل، عبدالجبار بن وائل رضی اللہ عنہم سے بڑے تھے۔ اور عبدالجبار رضی اللہ عنہ نے اپنے والد سے سماع نہیں کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے: (باب ما جاء في المرأة اذا استكرهتاعل الزنا) عبدالجبار رضی اللہ عنہ کے سماع کے بارے میں کچھ کلام حدیث: ۸۰۲ کے تحت بھی آئے گا۔

۷۹۸: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ كَانَ النَّاسُ يُؤْمَرُوْنَ اَنْ يَّضَعَ الرَّجُلُ الْيَدَ الْيُمْنٰى عَلٰى ذِرَاعِهٖ

الْيُسْرٰى فِي الصَّلَاةِ ۔ (رواه البخاري)

أخرجه البخاري ٢/٢٢٤ حديث رقم ٧٤٠۔ ومالك في الموطأ ١/١٥٩ حديث ٤٧ من كتاب قصر الصلاة في السفر۔

ترجمہ: ”حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ نماز میں دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھیں۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔“

نماز کے اندر تکبیرات کا مسئلہ

۷۹۹: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا قَامَ اِلَى الصَّلَاةِ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَقُوْمُ ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَرْكَعُ ثُمَّ يَقُوْلُ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ حِيْنَ يَرْفَعُ صُلْبَهٗ مِنَ الرَّكْعَةِ ثُمَّ يَقُوْلُ وَهُوَ قَائِمٌ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَهْوِيْ ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَرْفَعُ رَأْسَهٗ ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَسْجُدُ ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَرْفَعُ رَأْسَهٗ ثُمَّ يَفْعَلُ ذٰلِكَ فِي الصَّلَاةِ كُلِّهَا حَتّٰى يَقْضِيَهَا وَيُكَبِّرُ حِيْنَ يَقُوْمُ مِنَ الثِّنْتَيْنِ بَعْدَ الْجُلُوْسِ ۔

(متفق عليه)

أخرجه البخاري ٢/٢٧٢ حديث ٧١٩۔ ومسلم ١/٢٩٣ حديث (٢٨۔٣٩٢) والنسائي ٢/٢٣٣ حديث ١١٥٠ وأحمد في المسند ٢/٤٥٤۔

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز کے لئے کھڑا ہونے کا ارادہ کرتے تو قیام کے وقت تکبیر تحریمہ کہتے پھر رکوع میں جانے کے وقت تکبیر کہتے پھر جب رکوع سے اٹھتے تو سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ کہتے پھر قیام کی حالت میں رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کہتے پھر سجدہ کے لیے جھکتے تو تکبیر کہتے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو تکبیر کہتے پھر نماز پوری کرنے تک تمام نماز میں اسی طرح کرتے اور جب دو رکعت پڑھنے کے بعد اٹھتے تو تکبیر کہتے۔“

(بخاری و مسلم)

افضل نماز کونسی ہے؟

۸۰۰: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الصَّلَاةِ طُوْلُ الْقُنُوْتِ۔

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم ١/٥٢٠ حديث (١٦٤۔٧٥٦)۔ والترمذي ٢/٢٢٩ حديث ٣٨٧۔ وابن ماجة ١/٤٥٦ حديث ١٤٢١۔ وأحمد ٣/٣٠٢۔

ترجمہ: ”حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے بہتر نماز وہ ہے کہ جس میں قیام طویل ہو“ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔“

الفصل الثانی:

نماز کا طریقہ

۸۰۱: عَنْ اَبِیْ حُمَیْدِ السَّاعِدِیِّ قَالَ فِیْ عَشَرَۃٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَا اَعْلَمُکُمْ بِصَلَاۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قَالُوْا فَاَعْرِضْ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِذَا قَامَ اِلَی الصَّلَاۃِ رَفَعَ یَدَیْہِ حَتّٰی یُحَاذِیَ بِھِمَا مَنْکِبَیْہِ ثُمَّ یُکَبِّرُ ثُمَّ یَقْرَأُ ثُمَّ یُکَبِّرُ وَیَرْفَعُ یَدَیْہِ حَتّٰی یُحَاذِیَ بِھِمَا مَنْکِبَیْہِ ثُمَّ یَرْکَعُ وَیَضَعُ رَاحَتَیْہِ عَلٰی رُکْبَتَیْہِ ثُمَّ یَعْتَدِلُ فَلَا یُصَبِّیْ رَأْسَہٗ وَلَایُقْنِعُ ثُمَّ یَرْفَعُ رَأْسَہٗ فَیَقُوْلُ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ ثُمَّ یَرْفَعُ یَدَیْہِ حَتّٰی یُحَاذِیَ بِھِمَا مَنْکِبَیْہِ مُعْتَدِلاً ثُمَّ یَقُوْلُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ ثُمَّ یَھْوِیْ اِلَی الْاَرْضِ سَاجِدًا فَیُجَافِیْ یَدَیْہِ عَنْ جَنْبَیْہِ وَیَفْتَحُ اَصَابِعَ رِجْلَیْہِ ثُمَّ یَرْفَعُ رَأْسَہٗ وَیَثْنِیْ رِجْلَہُ الْیُسْرٰی فَیَقْعُدُ عَلَیْھَا ثُمَّ یَعْتَدِلُ حَتّٰی یَرْجِعَ کُلُّ عَظْمٍ فِیْ مَوْضِعِہٖ مُعْتَدِلاً ثُمَّ یَسْجُدُ ثُمَّ یَقُوْلُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَیَرْفَعُ وَیَثْنِیْ رِجْلَہُ الْیُسْرٰی فَیَقْعُدُ عَلَیْھَا ثُمَّ یَعْتَدِلُ حَتّٰی یَرْجِعَ کُلُّ عَظْمٍ اِلٰی مَوْضِعِہٖ ثُمَّ یَنْھَضُ ثُمَّ یَصْنَعُ فِی الرَّکْعَۃِ الثَّانِیَۃِ مِثْلَ ذٰلِکَ ثُمَّ اِذَا قَامَ مِنَ الرَّکْعَتَیْنِ کَبَّرَ وَرَفَعَ یَدَیْہِ حَتّٰی یُحَاذِیَ بِھِمَا مَنْکِبَیْہِ کَمَا کَبَّرَ عِنْدَ افْتِتَاحِ الصَّلَاۃِ ثُمَّ یَصْنَعُ ذٰلِکَ فِیْ بَقِیَّۃِ صَلَاتِہٖ حَتّٰی اِذَا کَانَتِ السَّجْدَۃُ الَّتِیْ فِیْھَا التَّسْلِیْمُ اَخْرَجَ رِجْلَہُ الْیُسْرٰی وَقَعَدَ مُتَوَرِّکًا عَلٰی شِقِّہِ الْاَیْسَرِ ثُمَّ سَلَّمَ قَالُوْا صَدَقْتَ ھٰکَذَا کَانَ یُصَلِّیْ (رواہ ابوداود وَالدَّارِمِیُّ وروی الترمذی وابن ماجۃ معناہ وقال الترمذی ھذاحدیث حسن صحیح وفی روایۃ لابی داود من حدیث ابی حمید) ثُمَّ رَکَعَ فَوَضَعَ یَدَیْہِ عَلٰی رُکْبَتَیْہِ کَاَنَّہٗ قَابِضٌ عَلَیْھَا وَوَتَرَیَدَیْہِ فَنَحَّا ھُمَا عَنْ جَنْبَیْہِ وَقَالَ ثُمَّ سَجَدَ فَأَمْکَنَ اَنْفَہٗ وَجَبْھَتَہٗ الْاَرْضَ وَنَحّٰی یَدَیْہِ عَنْ جَنْبَیْہِ وَوَضَعَ کَفَّیْہِ حَذْوَمَنْکِبَیْہِ وَفَرَّجَ بَیْنَ فَخِذَیْہِ غَیْرَحَامِلٍ بَطْنَہٗ عَلٰی شَیْءٍ مِنْ فَخِذَیْہِ حَتّٰی فَرَغَ ثُمَّ جَلَسَ فَافْتَرَشَ رِجْلَہُ الْیُسْرٰی وَاَقْبَلَ بِصَدْرِالْیُمْنٰی عَلٰی قِبْلَتِہٖ وَوَضَعَ کَفَّہُ الْیُمْنٰی عَلٰی رُکْبَتِہِ الْیُمْنٰی وَکَفَّہُ الْیُسْرٰی عَلٰی رُکْبَتِہِ الْیُسْرٰی وَاَشَارَ بِاِصْبَعِہٖ یَعْنِی السَّبَّابَۃَ وَفِیْ اُخْرٰی لَہٗ وَاِذَا قَعَدَ فِی الرَّکْعَتَیْنِ قَعَدَ عَلٰی بَطْنِ قَدَمِہِ الْیُسْرٰی وَنَصَبَ الْیُمْنٰی وَاِذَا کَانَ فِی الرَّابِعَۃِ اَفْضٰی بِوَرِکِہِ الْیُسْرٰی اِلَی الْاَرْضِ وَاَخْرَجَ قَدَمَیْہِ مِنْ نَاحِیَۃٍ وَاحِدَۃٍ۔

أخرجہ أبوداؤد فی السنن ۱/۴۶۷ حدیث ۷۳۰۔والدارمی ۱/۳۶۱ حدیث ۱۳۵۶ والترمذی ۲/۱۰۵ حدیث رقم ۳۰۴ بمعناہ ۔وابن ماجۃ ۱/۳۳۷ حدیث ۱۰۶۱ وأحمد ۵/۴۲۴ والراویۃ الأولی أخرجھا أبوداؤد ۱/۴۷۱ حدیث ۷۳۴۔والثانیۃ أبو داؤد ۱/۴۶۹ حدیث ۴۶۸۔

ترجمہ: حضرت ابوحمید ساعدیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے دس صحابہؓ کی جماعت سے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کو تم سے زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں صحابہ کرام کی اس جماعت نے کہا اچھا پیش کیجئے'' انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر کندھوں کے برابر لے جاتے اور تکبیر کہتے پھر قراءت کرتے اس کے بعد تکبیر کہہ کر اپنے دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھاتے اور رکوع میں جا کر دونوں ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں پر رکھتے اور کمر سیدھی کر لیتے اور سر کو نہ نیچا کرتے اور نہ بلند کرتے پھر ہاتھ اٹھاتے وقت **سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ** کہتے اور دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھاتے اور سیدھے کھڑے ہو جاتے پھر تکبیر کہتے ہوئے زمین کی طرف جاتے اور سجدہ کرتے اور اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں پہلوؤں سے الگ رکھتے اور اپنے پاؤں کی انگلیوں کو موڑ کر رکھتے تھے پھر سجدہ سے سر اٹھاتے اور بایاں پاؤں موڑ کر اس پر سیدھے بیٹھ جاتے یہاں تک کہ ہر عضو اپنی جگہ پر برابر آ جاتا پھر تکبیر کہہ کر سجدہ میں چلے جاتے اور پھر تکبیر کہہ کر سجدہ سے اٹھتے اور بایاں پاؤں موڑ کر اس پر اطمینان سے بیٹھ جاتے یہاں تک کہ جسم کا ہر عضو اپنی جگہ پر آ جاتا تھا پھر دوسری رکعت میں بھی اس طرح کرتے تھے اور جب دو رکعت پڑھنے کے بعد کھڑے ہوتے تو **اَللّٰہُ اَکْبَر** کہتے ہوئے دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھاتے جیسے نماز کو شروع کرتے وقت تکبیر کہتے تھے پھر باقی نماز اسی طرح پڑھتے تھے اور پھر جب وہ سجدہ کر چکے ہوتے جس کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے تو اپنا بایاں پاؤں باہر نکالتے اور بائیں سرین پر بیٹھ جاتے اور پھر سلام پھیر لیتے تھے وہ سب صحابہ بولے کہ بیشک تم نے سچ فرمایا ہے رسول اللہ ﷺ اسی طرح نماز پڑھتے تھے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام دارمیؒ نے روایت کیا امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے اس روایت کو بالمعنی نقل کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور ابوداؤدؒ کی ایک روایت میں (جو ابوحمیدؓ سے مروی ہے) یہ الفاظ ہیں پھر رکوع میں جا کر دونوں ہاتھ گھٹنوں پر اس طرح رکھے جیسے انہیں مضبوطی سے پکڑے ہوں اور اپنے ہاتھوں کو کمان کی تانت کی طرح کھینچ کر رکھا اور کہنیوں کو اپنے دونوں پہلوؤں سے دور رکھا راوی کہتے ہیں کہ پھر سجدہ میں گئے تو اپنے ناک اور پیشانی کو زمین پر رکھا اور ہاتھوں کو پہلوؤں سے جدا رکھا اور دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اور دونوں رانوں کو کشادہ رکھا اور اپنے پیٹ کو دونوں سے الگ رکھا یہاں تک کہ سجدہ سے فارغ ہوئے اور پھر اس طرح بیٹھے کہ بایاں پاؤں بچھا لیا اور دائیں پاؤں کی پشت کو قبلہ کی طرف متوجہ کیا اور دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر اور بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر رکھا اور اپنی سبابہ انگلی سے اشارہ کیا اور ابوداؤد کی ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ جب دو رکعتیں پڑھ کر بیٹھتے تو بائیں پاؤں کے تلوے پر بیٹھتے اور دائیں پاؤں کو کھڑا کر دیا کرتے تھے اور جب چوتھی رکعت پڑھ کر بیٹھتے تو بائیں سرین کو زمین سے ملاتے اور دونوں پاؤں کو ایک طرف نکال لیتے تھے۔

تشریح: **عن ابی حمید الساعدی**: تصغیر کے ساتھ۔ **(قال)**: یعنی اگلے جملے **انا اعلمکم** کے بارے میں فرمایا۔

فی عشرۃ: یعنی دس آدمیوں کی موجودگی میں۔ **(من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا اعلمکم بصلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ وسلم)**: ایک نسخہ میں **صلوٰۃ النبی** ﷺ کے الفاظ ہیں۔ **(قالوا فاعرض)**: ہمزہ وصلی کے ساتھ۔

یعنی جب تم آپ علیہ اسلام کی نماز کی کیفیت زیادہ جانتے ہو تو اس کو بیان کرو۔نہایہ میں ہے یقال عرضت علیه امر كذا او عرضت له الشی) اس کو خوب ظاہر کرو۔''اعرض'' صرف کسرہ کے ساتھ ہے۔یعنی آپ ﷺ کی نماز کے متعلق جو جانتے ہو بیان کرو اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہوئے اور ہماری یاداشت کے مطابق بیان کیا تو ہم آپ کے ساتھ موافقت کریں گے ورنہ آپ سے استفادہ کریں گے۔

قال كان النبی: اور ایک نسخہ میں ''رسول اللہ'' کا لفظ ہے۔

اذا قام الى الصلوٰة رفع يديه حتى يحاذى بهما: یعنی ہتھیلیوں کو۔(منكبيه): اور انگلیوں کے سرے کانوں کے برابر ہوتے۔(ثم یکبر): بقولِ ابن حجرؒ کے یہاں لفظ ''ثم'' ''واؤ'' کے معنی میں ہے۔بخاری شریف کی روایت کی وجہ سے جس میں ''حين يكبر'' کے الفاظ ہیں۔اس کی وجہ تقدیم یہ ہے کہ وہ زیادہ صحیح اور مشہور ہے اور اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ تمام تکبیر تحریمہ کا حالت قیام میں ہونا واجب ہے جیسا کہ پہلے گذرا۔(ثم يقرء): اور ممکن ہے کہ قراءت کا لفظ تسبیح اور ثناء کو شامل ہو یا یہاں عبارت مقدر ہے پھر دُعا وتعوذ پڑھتے جیسا کہ دیگر روایات سے ثابت ہے، پھر سورۃ فاتحہ پھر سورت پڑھتے جیسا کہ دوسری روایات سے بھی ثابت ہے۔

ثم يكبر ويرفع يديه حتى يحاذى بهما منكبيه ثم يركع ويضع راحتيه: یعنی ہتھیلیوں کو۔

على ركبتيه: اور انگلیوں کو خوب کھول دیتے۔انگلیوں کا صرف حالتِ رکوع میں کشادہ کرنا اور سجدہ میں ملانا ہے ان کے علاوہ (حالت تحریمہ وتشہد) میں اپنی حالت پر رکھے، کھولنے اور ملانے میں تکلف نہ کرے۔منیہ کی شرح میں اسی طرح ہے۔

ثم يعتدل: یعنی رکوع اس طرح کرتے کہ سر اور کمر تلوار کی طرح بالکل برابر رکھتے۔اور اس کی تفسیر اگلے قول فلا يصبى سے ہوتی ہے۔(فلا يصبى): تشدید کے ساتھ۔یعنی نیچے نہیں کرتے تھے۔

راسه: یعنی پشت سے غریبین میں ہے صبى الرجل راسه يصبيه اس وقت کہا جاتا ہے جب سر کو بہت زیادہ جھکا دے۔ صبا الرجل اذا مال الى النساء سے۔بعض نسخوں میں الى الصبا ہے۔نہایہ میں اس کی تشدید کی وجہ تکثیر ہے۔میں کہتا ہوں کہ اس کا تعدیہ کیلئے ہونا زیادہ درست ہے۔اور اظہریؒ نے کہا ہے کہ الصواب' يصوب ہے۔میں کہتا ہوں کہ جب لغت اور روایت کے اعتبار سے ''صبى'' صحیح ہے تو پھر الصواب کہنے کا کوئی معنیٰ ہے۔

ولا يقنع: اقنع' راسه سے اذا رفع سے۔یعنی سر کو پشت سے اونچا نہیں کرتے تھے۔

ثم يرفع راسه: یعنی قومہ کیلئے اعتدال کے ساتھ۔

فيقول سمع الله لمن حمده'' ثم يرفع يديه حتى يحاذى بهما منكبيه معتدلا: حال ہے ''یرفع'' کے فاعل سے۔

ثم يقول الله اكبر ثم يهوى: یعنی تکبیر شروع کرنے کے بعد یعنی جھکتے۔(الى الارض ساجدا): یعنی سجدہ کے ارادے سے نیچے جھکتے۔(فيجافى): یعنی دور رکھتے سجدہ میں۔(يديه): یعنی کہنیوں کو۔(عن جنبيه ويفتخ): ''خاء'' کے فتحہ کے ساتھ۔

اصابع رجلیه: یعنی انگلیوں کا رخ قبلہ کی طرف کرتے۔ اور نہایہ میں ہے کہ انگلیوں کو کھڑا کر کے پوروں کو پاؤں کی اندر کی طرف موڑتے۔ اور "فتخ" کا اصل معنیٰ سمیٹنا ہے۔ اسی لئے عقاب کو فتخ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ، وہ بھی اُترنے کے لئے پروں کو سمیٹ لیتا ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہاں انگلیوں کو اندرونی حصہ کے سہارا پر کھڑا کرنا اور ان کے سروں کو قبلہ رو کرنا مراد ہے کیونکہ صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے مسجد میں سات ہڈیوں کے لگانے کا حکم ہوا ہے، پیشانی، اور ناک کی طرف اشارہ فرمایا، اور دونوں ہاتھ، گھٹنے اور قدموں کے کنارے، اور بخاری شریف کی سابقہ روایت کی وجہ سے کہ آپ ﷺ نے سجدہ میں پیروں کی انگلیوں کے اطراف کو قبلہ رُخ کیا اور اس میں انگلیوں کے باطن کے ذریعہ قبلہ رو ہونا اور سہارا لینا لازمی ہے۔

ثم یرفع رأسه: یعنی تکبیر کہتے ہوئے۔ **(ویثنی)**: پہلی "یاء" کے فتحہ کے ساتھ یعنی موڑتے تھے۔

رجله الیسری فیقعد علیها ثم یعتدل: یعنی بیٹھنے میں۔ **(حتی یرجع کل عظم فی موضعه)**: یعنی اطمینان سے بیٹھتے اور صحیح نسخہ میں، **الی موضعه** ہے یعنی پہنچ جانا، **(معتدلا)**: یعنی بیٹھنے میں اور یہ جملہ حال مؤکدہ ہے بقولِ ابن حجرؒ اس حدیث میں جلسہ استراحت کے وجوب کا ذکر ہے اور اسی میں عدم وجوب پر دلالت بھی ہے۔

ثم یسجد: یعنی تکبیر کے بعد۔ **(ثم یقول الله اکبر ویرفع)**: یعنی سَر کو دوسرے سجدہ سے۔

ویثنی رجله الیسری: یعنی اس کو اندر کی طرف موڑتے تھے۔ **(فیقعد علیها ثم یعتدل)** صحیح نسخہ کے مطابق۔

حتی یرجع: یعنی لوٹ۔ **(کل عظم الی موضعه)**: بقولِ ابن حجرؒ کے اس میں بغیر تشہد والی رکعت میں جلسہ استراحت کا استحباب ثابت ہے اور اس کو عذر یا بیانِ جواز پر محمول کرنا ممکن ہے **بالجمع بین الروایات**۔

ثم ینهض : یعنی کھڑے ہوتے۔ **(ثم یصنع فی الرکعة الثانیة مثل ذلك)**: یعنی پہلی رکعت کی طرح استثناء کے ساتھ۔

ثم اذا قام من الرکعتین کبر ورفع یدیه حتی یجاذی بهما منکبیه کما کبر عند افتتاح الصلوٰة: قاضیؒ کا قول ہے کہ امام شافعیؒ نے ایک سے دوسری رکعت کی طرف اٹھتے وقت رفع یدین کا ذکر نہیں کیا اس لئے کہ ان کے قول کی بنیاد حدیث ابن شہاب عن سالم ہے اور انہوں نے اس سے تعرض نہیں کیا لیکن ان کا مذہب اتباعِ سنت ہے جب ثابت ہو گیا تو لازماً اس کے قائل ہو گئے۔ [ذکرہ الطیبی]

ثم یصنع ذلك: یعنی گذشتہ کیفیات۔ **(فی بقیة صلاته)**: دو رکعت والی ہو یا کوئی اور، **حتی اذا کانت السجدة التی فیها**، یعنی بعد۔ **(التسلیم اخر)**: یعنی نکال لیتے، صحیح نسخہ کے مطابق۔ **(رجله الیسری)**: یعنی نیچے سے دائیں طرف۔

وقعد متورکا علی شقه الایسر: یعنی دائیں سرین بغیر پاؤں پر بیٹھے، امام طیبیؒ نے کہا ہے کہ "**تورك**" چوتڑ پر بیٹھ کر پاؤں باہر نکال دینے کو کہتے ہیں۔ **(ثم سلم قالوا)**: یعنی صحابہ نے۔ **(صدقت)**: یعنی بات میں۔

هکذا کان: یعنی رسول اللہ ﷺ۔ **(یصلی، رواہ ابوداؤد)**: اور امام نوویؒ فرماتے ہیں **اسنادہ علی شرط مسلم ورواہ ابن حبان فی صحیحه**، ذکرہ میرک۔ **(والدارمی)**: یعنی اس لفظ کے ساتھ۔

وروی الترمذی وابن ماجة معناه وقال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح :یعنی حسن لذاتہ اور صحیح لغیرہ ہے یا اسنادَیْن کے اعتبار سے ہے۔

وفی روایة:یعنی دوسری۔ابی داؤد من حدیث ابی حمید۔(ثم رکع فوضع یدیه علی رکبتیه کانه قابض علیهما وتریدیه):یعنی اپنے بازوؤں کی گویا کمان بنائی۔تو تیر سے ہے جس کا معنی ہے کمان پر چلہ چڑھانا۔فنحا هما عن جنبیه' تنحیه سے ہے بمعنی دور کرنا یعنی کہنیوں کو پہلوؤں سے گویا کہ آپ ﷺ کے ہاتھ مبارک تانت اور پہلو کمان ہیں۔

نہایہ میں ہے :جعلها کالوتر من قولك وترت القوس وا وترته یعنی رکوع کرنے والے کو کمان سے تشبیہ دی جب کہ وہ ہاتھوں سے گھٹنوں کو مضبوط پکڑ کر کھول کر رکھے۔ہدایہ میں ہے کہ ہاتھوں سے گھٹنوں کو مضبوط پکڑے اور پنڈلی سیدھی رکھے،ابن ہمامؒ کا قول ہے کہ بازوؤں کو قوس کی مثل جھکانا (جس طرح کہ عموماً لوگ کرتے ہیں) مکروہ ہے۔ان کا یہ قول "روضة العلماء" میں مذکور ہے۔

وقال ثم سجد فامکن:یعنی خوب جمائے۔

انفه وجبهته الارض :حرف جر محذوف ہے،یعنی زمین سے،اور ایک روایت میں من الارض ہے یعنی ناک اور پیشانی زمین پر اطمینان کے ساتھ رکھے،اور ہدایہ میں ہے کہ اگر ان میں سے ایک پر اکتفاء کیا تو ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز مع کراہت ہے اور صاحبین کے نزدیک صرف ناک پر سجدہ کرنا بلا عذر جائز نہیں،ابن ہمامؒ فرماتے ہیں ناک کے سخت حصے کا اعتبار ہے نرم کا نہیں،اور بقولِ ابن حجرؒ کے اس روایت سے پیشانی کو زمین پر کھول کر بلا حائل رکھنے نیز اس پر وزن ڈالنے کا وجوب ثابت ہوا حدیث صحیح کی وجہ سے،آپ ﷺ نے فرمایا جب تو سجدہ کرے تو پیشانی جما اور ٹھونگ نہ مار۔میں کہتا ہوں کہ ان دونوں حدیثوں سے چہرہ کھولنے پر استدلال بالکل نہیں ہوسکتا چہ جائیکہ وجوب پر،پھر کیا یہ بھی صحیح حدیث ہے کہ صحابہؓ نے آپ علیہ السلام سے پیشانی اور ہتھیلیوں پر گرمی کی شدت کی شکایت کی تو آپ علیہ السلام نے تمام کے بارے میں ان کی شکایت کا ازالہ نہ فرمایا اسی وجہ سے ہاتھ،گھٹنے اور پاؤں کھولنا واجب نہیں،ابن ماجہ کی خبر کی وجہ سے کہ آپ علیہ السلام نے مسجد بنی اشہل میں اس حالت میں نماز ادا کی کہ کنکریوں سے بچنے کیلئے اپنی چادر پر ہاتھ رکھتے تھے۔

اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ پہلی حدیث میں ان کے دعویٰ پر کوئی دلیل نہیں،کیونکہ اہلِ السنة کا جائے نماز پر سجدہ کے جواز پر اجماع ہے،پس عدم ازالہ شکایت کو آخری وقت تک مؤخر کرنے کے عدم اجازت پر محمول ہوگا،واللہ اعلم۔

رہا ابن حجرؒ کا قول اور صرف پیشانی کھولنے کے وجوب کی حکمت تو وہ اس کا دوسرے اعضاء کے مقابلہ میں سہل ہونا اور پیشانی پر سجدہ کرنے کے مقصد حاصل ہونا ہے اور وہ مقصد اشرف الاعضاء کو قدموں اور جوتوں کی جگہ روندنے کی وجہ سے انتہائی عاجزی اور ذلت ہے۔پس اس میں وجوب اور سنیت جس کے ہم قائل ہیں دونوں پر دلالت ہے۔پھر ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ بعض پیشانی پر اکتفاء کی وجہ تمام پر وجوب میں مشقت کا ہونا ہے اور ضعیف حدیث میں ہے کہ آپ علیہ السلام نے بعض پر سجدہ کیا،اگر صحیح فرض کر لیا جائے تو وہ بیان جواز کیلئے ہے،پس امام شافعیؒ کے کراہت کے قول کے منافی نہ ہوئی۔اور حدیث میں ناک رکھنے کا وجوب بھی ہے اور بہت سے ائمہ اسی کے قائل ہیں اور عدم وجوب کے قائلین (جیسے ہمارے اصحاب) کی دلیل یہ

ہے کہ ناک پر سجدہ کے وجوب والی اخبار ندب پر محمول ہیں' ان اخبار صحیحہ کی وجہ سے جن میں پیشانی پر اختصار کا ذکر ہے، اور امام نوویؒ نے اس کو ردّ کیا ہے کہ یہ زیادہ قوی ہے اور دونوں میں کوئی منافات نہیں۔

ونحّی: تشدید کے ساتھ یعنی دور رکھا۔

یدیه عن جنبیه ووضع کفیه حذو منکبیه: ابن ھمامؒ کا قول ہے کہ مسلم شریف میں حضرت وائل بن حجر سے روایت ہے کہ آپ علیہ السلام نے سجدہ میں اپنے چہرہ کو ہتھیلیوں کے درمیان رکھا (اھ) اور اس طرح چہرہ رکھنے والے کے ہاتھ اس کے کانوں کے برابر ہوں گے تو یہ روایت بخاری کی روایت کے متعارض ہوئی یعنی ابوحمید کی حدیث ہے کہ آپ علیہ السلام سجدہ میں ہاتھ کندھوں کے برابر رکھتے تھے اور پہلی روایت کی وجہ تقدیم یہ ہے کہ سند بخاری میں فلیح بن سلیمان متکلم فیہ ہے اگر چہ اس کا ثقہ ہونا راجح ہے چنانچہ، نسائی، ابن معین، ابوحاتم، ابوداؤد، یحیٰی بن قطان، اور ساجی نے اس کو ضعیف کہا ہے، اور یقیناً متعدد احادیث میں آپ ﷺ کا ہاتھوں کو کانوں کے برابر رکھنا آیا ہے، اور اگر قائل یہ کہتا کہ ان دونوں طریقوں پر عمل سے سنت ادا ہو جاتی ہے تو جمع بین الروایات آسان ہو جاتا۔ اس بناء پر کہ آپ علیہ اسلام بعض اوقات ایسا کرتے تھے اور کبھی اس کے خلاف کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی ''بین الکفین'' افضل ہے کیونکہ اس میں تجافات مسنون (بازوں کا فاصلہ) پائی جاتی ہے جو دوسرے میں نہیں۔

وفرج: یعنی پاؤں کو جدا رکھنا۔ (**بین فخذیه غیر حامل**): یعنی بغیر بچھائے۔ (**بطنه علی شئی من فخذیه حتی فرغ**): یعنی سجدہ سے۔ (**ثم جلس**): یعنی مطلقاً، اور عند الشافعیؒ تشہدِ اوّل کیلئے بیٹھنا۔ (**فافترش رجله الیسری**): یعنی اس نیچے والے حصہ پر بیٹھے۔

واقبل بصدر الیمنٰی علی قبلته: یعنی دائیں پاؤں کی انگلیوں کے سروں کو قبلہ رخ کیا، یہ طیبیؒ کا قول ہے اور میرکؒ نے ازھار سے نقل کیا ہے کہ دائیں پاؤں کے اگلے حصے کو قبلہ کے مقابل کیا اس طرح کہ انگلیوں کا باطن زمین پر قبلہ رُو رکھا اور پاؤں پر کچھ دباؤ دے کر کھڑا کیا۔

ووضع کفه الیمنی علی رکبته الیمنی وکفه الیسری علی رکبتیه الیسری واشار باصبعه یعنی السبابه: **بروزن نعالة**، سبٌ سے، کیونکہ عرب کسی کو بُرا بھلا کہتے وقت انگوٹھے کے ساتھ والی انگشت سے اشارہ کرتے تھے۔

ابن ہمامؒ کہتے ہیں کہ مسلم شریف میں ہے کہ آپ علیہ السلام نماز میں دائیں ہتھیلی کو دائیں ران پر رکھ کر انگلیاں بند کر کے شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے تھے اور بائیں ہتھیلی کو بائیں ران پر رکھتے اور اس میں شک نہیں کہ وضع کف (اس صورت میں) حقیقۃً متحقق نہیں ہوسکتا پس مراد یہ ہے کہ پہلے ہتھیلی رکھتے پھر اشارہ کے وقت مٹھی بند کرتے (واللہ اعلم) کیفیت اشارہ میں امام محمدؒ سے یہی مروی ہے فرمایا چھنگلی اور ساتھ کی انگلی بند کر کے درمیانی انگلی اور انگوٹھے سے حلقہ بنائے اور شہادت کی انگلی کھڑی کرے۔ امام ابویوسفؒ سے امالی میں اسی طرح روایت ہے اور تصحیح اشارہ کی فرع ہے، اور بہت سے مشائخ بالکل اشارہ نہیں کرتے اور یہ درایت وروایت کے خلاف اور حلوانی سے مروی کہ انگلی لا الہ پر اٹھائے اور الا اللہ پر نیچی کرے تا کہ اُٹھانا نفی اور رکھنا اثبات کیلئے ہو جائے اور مناسب ہے کہ انگلیوں کے سرے گھٹنے پر رہیں دور نہ ہوں، ابن حجرؒ کا قول ہے کہ اس کی تفصیل بقیہ روایات میں بیان ہیں، اور ہمارے ائمہ کا اسی پر عمل ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ بوجہ اتباع ہتھیلی کو گھٹنوں کے قریب رانوں پر رکھنا

مسنون ہے اس کو مسلم نے روایت کیا اور اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ دائیں شہادت کی انگلی اٹھانا مسنون ہے لیکن تھوڑی سی جھکا کر کیونکہ صحیح روایت میں: الی جھة القبلة کے الفاظ ہیں نیز اس حدیث کی وجہ سے جس میں: وعند قوله الا الله کا ذکر ہے اتباع کی وجہ سے (رواہ مسلم وغیرہ) اور اسی سے روایت ابی داؤدؒ کے عموم کی تخصیص ہوتی ہے کہ آپ علیہ السلام دُعا یا تشہد کے وقت اشارہ فرماتے اور تشہد حقیقت میں شہادتین کو زبان سے اداء کرنا ہے اور اشارہ کرتے وقت خالصۃً توحید کی نیت کرنا بھی مسنون ہے اتباع کی وجہ سے، بیہقی نے سند مجہول کے ساتھ روایت کیا اور یہ بھی سنت ہے کہ نظر اشارہ کی جگہ سے آگے نہ اٹھے، اتباع کی وجہ سے، ہمارے نزدیک انگلی کو حرکت مکروہ ہے اس لئے کہ آپ علیہ السلام ایسا نہیں کرتے تھے اور بعض اس کے سنت ہونے کے قائل ہیں کیونکہ آپ علیہ السلام حرکت دے دیتے تھے۔ دونوں روایتیں بیہقی نے نقل کی ہیں اور ان کو صحیح کہا ہے۔ پھر اس سے مراد میں کرنا یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ روایت میں تحریک سے مراد محض اُٹھانا ہو نہ کہ تکرار، اور یہ احتمال ظاہر ہے جمع بین الحدیثین کیلئے، رہی خبر جس میں تحریک اصابع کا دافع شیطان ہونا مذکور ہے تو وہ ضعیف ہے۔

وفي اخرى له: یعنی ابوداؤدؒ کی دوسری روایت میں، اس کی سند میں عبیداللہ بن لہیعہ ہے جس کے متعلق کلام ہے، میرکؒ نے اس کو تخریج سے نقل کیا ہے۔

واذا قعد في الركعتين: یعنی پہلی۔

قعد على بطن قدمه اليسرى ونصب اليمنى واذا كان في الرابعة افضى: یعنی ملالیا۔

بوركه اليسرى الى الارض: یعنی سرین کا نرم حصہ زمین پر رکھ دیا، جوھری نے کہا، **افضى بيديه الى الارض** جب کہ زمین پر ہتھیلی رکھی جائے، طیبیؒ نے اس کو ذکر کیا۔

واخرج قدميه من ناحية واحدة: دائیں طرف، اور دائیں کے اخراج کا مطلق ہونا تغلیباً ہے کیونکہ تخرج حقیقۃً صرف بایاں ہی ہے، ابن حجرؒ نے اس کو ذکر کیا ہے، اور یہ امام شافعیؒ کی آخری قعدہ میں سرین کے بل بیٹھنے کی سنیت کی دلیل ہے۔ ابن الملکؒ نے اس کو بیان کیا ہے۔ اور ہمارے نزدیک یہ عذر پر محمول ہے یا بیانِ جواز کیلئے ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ایسا سلام پھیرنے کے بعد کیا ہو۔

تکبیر تحریمہ کے رفع یدین کا مسئلہ

۸۰۲: وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ اَنَّهٗ اَبْصَرَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ قَامَ اِلَی الصَّلَاةِ رَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰی كَانَتَا بِحِيَالِ مَنْكِبَيْهِ وَحَاذٰی اِبْهَامَيْهِ اُذُنَيْهِ ثُمَّ كَبَّرَ (رواه ابوداود وفي رواية له) **يَرْفَعُ اِبْهَامَيْهِ اِلٰی شَحْمَةِ اُذُنَيْهِ......**

أخرجه أبوداوٗد ۱/۴۶۵ حديث ۷۲۴۔ وأخرج الرواية الثانية ۱/۴۷۳ حديث ۷۳۷۔ والنسائی ۲/۱۲۳ حديث رقم ۸۸۲۔

ترجمہ: ''حضرت وائل بن حجرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ

نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھایا اور دونوں انگوٹھوں کو کانوں تک لے گئے اور پھر تکبیر کہی۔ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے اور ابوداؤدؒ کی دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ آپ ﷺ انگوٹھوں کو کانوں کے نرموں تک اٹھاتے تھے۔"

تشریح: وعن وائل بن حجر انه ابصر النبی صلی الله علیه وسلم حین قام الی الصلوٰۃ: ظرف ہے ابصر کا۔

رفع یدیه: حال ہے بتقدیر قد۔ یعنی آپؐ کو نماز کی حالت میں ہاتھ اٹھائے دیکھا۔

حتی کانتا: یعنی ہتھیلیاں۔ **(بحیال منکبیه):** یعنی برابر۔ **(وحاذی):** "کانتا" پر عطف ہے یعنی مقابل کیا۔

ابهامیه اذنیه: یعنی انگوٹھوں کو کانوں کے برابر کیا اور مراد کان کی لو ہے جیسا کہ عنقریب صراحۃً آئے گا۔

ثم کبر: ثم "واؤ" کے معنی میں ہے یا کبّر انتہاءِ تکبیر کے معنی میں ہے اس طرح ہاتھ اُٹھانا اور تکبیر کہنا ساتھ ساتھ ہوا۔

رواہ ابوداؤد: یعنی حدیث عبدالجبار بن وائل، جو وہ باپ سے روایت کرتے ہیں، اور عبدالجبار کا سماع ثابت نہیں۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں میں نے محمد سے پوچھا کہ عبدالجبار نے اپنے والد سے سماع کیا ہے؟ کہنے لگے نہیں وہ اپنے والد کے چھ ماہ بعد پیدا ہوئے، تخریج میں اسی طرح ہے۔ اور مزنی نے تہذیب الکمال میں کہا ہے کہ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ عبدالجبار نے خود فرمایا کہ میں بچہ تھا اپنے والد کی نماز سمجھتا نہیں تھا۔ انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ میں والد کی وفات کے وقت پیٹ میں تھا، پس ابن حجرؒ کا بسند حسن کہنا مستحسن نہیں۔

وفی روایة له: یعنی ابوداؤدؒ، میرکؒ کا کہنا ہے کہ تخریج سے امام نسائیؒ کی روایت سمجھ آتی ہے۔

یرفع ابهامیه الی شحمة اذنیه: یعنی دونوں لو، یعنی کان کی نرم جگہ، یہی امام ابوحنیفہؒ کا اور امام شافعیؒ کا مختار مذہب ہے۔

ہاتھ باندھنے کا طریقہ

۸۰۳: وَعَنْ قَبِيْصَةَ بْنِ هُلْبٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَؤُمُّنَا فَيَاْخُذُ شِمَالَهٗ بِيَمِيْنِهٖ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة)

أخرجه الترمذی ۳۲/۲ حدیث ۲۵۲۔ وقال حدیث حسن وأخرجه ابن ماجة ۶۶/۱ حدیث ۸۰۹ وأحمد ۲۲۶/۵۔

ترجمہ: "حضرت قبیصہ بن ہلبؓ سے روایت ہے وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں نماز پڑھاتے تھے تو اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو پکڑتے تھے۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔"

راویٔ حدیث:

قبیصہ۔ ان کا نام قبیصہ ہے۔ یہ ہلب کے بیٹے ہیں خاندانی اعتبار سے بنو طے میں سے ہیں۔ اپنے والد سے روایت

کرتے ہیں۔ان کے والد صحابی ہیں۔امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہلب کا نام یزید تھا اور بعض نے سلامۃ بن عدی بتایا ہے۔ ہلب کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ گنجے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک ان کے سر پر پھیرا تو ان کے بال بہت گھنے اُگ آئے۔ چنانچہ اس وجہ سے ان کو ''ہلب'' کہا جانے لگا۔قبیصہ سے ''سماک'' نے روایت کی ہے۔''ہلب'' میں ہاء پر ضمہ، لام ساکن اور آخر میں باء موحدہ ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ ''ہلب'' کو ہاء کے فتحہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ تلفظ کرنا صحیح ہے۔

تشریح: وعن قبیصۃ: ''قاف'' کے فتح کے ساتھ۔

ابن هلب: ''لام'' کے سکون اور ''ھاء'' کے ضمہ کے ساتھ مصابیح میں اسی طرح ہے۔طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ ان کے والد صحابی تھے۔

عن ابیه : بقولِ امام بخاریؒ کے ھلب کا نام یزید ہے، بعض نے سلامۃ بن عدی کہا ہے ان کو ہلب اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ان کے سر پر بال نہ تھے آپ علیہ السلام نے ہاتھ پھیرا تو گھنے بال آ گئے اس لئے نام ہلب پڑ گیا۔میرکؒ نے اس کو تخریج سے نقل کیا ہے۔

قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یؤمنا: یعنی ہمارے امام ہوتے تھے۔(فیاخذ شماله)؛ یعنی گٹے کو۔ بیمینه : یعنی دائیں ہتھیلی سے بقول ابن الملکؒ کے، اور اظہر یہ ہے کہ چھنگلی اور انگوٹھے سے پکڑتے تھے اور ہتھیلی دوسری ہتھیلی پر اور باقی انگلیاں بازو پر ہوتی تھیں۔جمع بین الاحادیث اسی صورت میں ہو سکتا ہے اور یہ رکھنا قیام کے وقت اور بقولِ امام محمدؒ کے قراءت کے وقت تھا۔

رواہ الترمذی :اور حدیث کو حسن کہا ہے، میرکؒ نے نقل کیا ہے۔''وابن ماجہ''

تعدیل ارکان کی رعایت کی تعلیم

۸۰۴: وَعَنْ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ فَصَلّٰى فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ جَاءَ فَسَلَّمَ عَلَى النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم اَعِدْ صَلَاتَكَ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ فَقَالَ عَلِّمْنِيْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ اُصَلِّيْ قَالَ اِذَا تَوَجَّهْتَ اِلَى الْقِبْلَةِ فَكَبِّرْ ثُمَّ اقْرَاْ بِاُمِّ الْقُرْآنِ وَمَا شَآءَ اللّٰهُ اَنْ تَقْرَاَ فَاِذَا رَكَعْتَ فَاجْعَلْ رَاحَتَيْكَ عَلٰى رُكْبَتَيْكَ وَمَكِّنْ رُكُوْعَكَ وَامْدُدْ ظَهْرَكَ فَاِذَا رَفَعْتَ فَاَقِمْ صُلْبَكَ وَارْفَعْ رَأْسَكَ حَتّٰى تَرْجِعَ الْعِظَامُ اِلٰى مَفَاصِلِهَا فَاِذَا سَجَدْتَّ فَمَكِّنِ السُّجُوْدَ فَاِذَا رَفَعْتَ فَاجْلِسْ عَلٰى فَخِذِكَ الْيُسْرٰى ثُمَّ اصْنَعْ ذٰلِكَ فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ وَسَجْدَةٍ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ هٰذَا لَفْظُ الْمَصَابِيْحِ (ورواه ابو داود مع تغيير يسير وروى الترمذى والنسائى مَعْنَاهُ وَفِى رواية للترمذى) قَالَ اِذَا قُمْتَ اِلَى الصَّلَاةِ فَتَوَضَّاْ كَمَا اَمَرَكَ اللّٰهُ بِهٖ ثُمَّ تَشَهَّدْ فَاَقِمْ فَاِنْ كَانَ مَعَكَ قُرْاٰنٌ فَاقْرَاْ وَاِلَّا فَاحْمَدِاللّٰهَ وَكَبِّرْهُ وَهَلِّلْهُ ثُمَّ ارْكَعْ۔

أخرجه أبوداوٗد فى السنن ۱/۵۳۷۔۵۳۸ حديثين رقم ۸۵۹۔۸۶۰ مع بعض التغاير۔وللترمذى معناه فى السنن

۲/۱۰۵ حدیث ۳۰۲۔وقال حدیث حسن۔ والنسائی فی السنن ۲/۱۹۳ حدیث رقم ۱۰۵۳۔وأخرجه الدارمی مطولًا فی السنن ۱/۳۵۰ حدیث رقم ۱۳۲۹۔وأخرجه أحمد فی المسند ۴/۳۴۰ والروایة : "إذا قمت للصلاة فتوضا......"أخرجها : أبو داوٗد فی السنن ۱/۵۳۸ حدیث رقم ۸۶۱۔والترمذی ضمن حدیث رقم ۳۰۲۔

ترجمہ: حضرت رفاعہ بن رافعؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی مسجد میں آیا اور نماز پڑھی اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور سلام عرض کیا رسول اللہ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا تم اپنی نماز دوبارہ پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی اس آدمی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ آپ مجھے نماز پڑھنے کا طریقہ بتا دیجئے کہ میں کیسے نماز پڑھوں؟ آپ نے فرمایا جب تم قبلہ کی طرف متوجہ ہو تو تکبیر کہو پھر اس کے بعد سورۂ فاتحہ اور اس کے بعد جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہیں قرآن سے سکھایا ہے اس کو پڑھو پھر جب تم رکوع میں جاؤ اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھو اور اس طرح رکوع میں اطمینان کے ساتھ قائم رہو اور اپنی پشت کو ہموار رکھو اور جب تم رکوع سے سر اٹھاؤ اپنی پشت کو سیدھا رکھو اور بالکل سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ یہاں تک کہ تمہاری تمام ہڈیاں اپنی اپنی جگہ آ جائیں اور جب سجدہ کرو اچھی طرح سجدہ کرو اور جب تم سجدہ سے سر اٹھاؤ تو اپنی بائیں ران پر بیٹھ جاؤ پھر اسی طرح ہر رکوع وسجدہ کرو یہاں تک کہ ہر رکوع کی صحیح ادائیگی پر ان کو اطمینان ہو جائے یہ الفاظ مصابیح کے ہیں اور امام ابوداوٗدؒ نے اسے کچھ تبدیلی کے ساتھ نقل کیا ہے اور اسی طرح امام ترمذیؒ اور امام شافعیؒ نے بھی اس کو بالمعنیٰ نقل کیا ہے اور ترمذی کی ایک روایت میں الفاظ اس طرح ہیں کہ جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو اس طرح وضو کرو جیسے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے پھر کلمہ شہادت پڑھو پھر اچھی طرح نماز ادا کرو قرآن کریم میں سے جو کچھ تم کو یاد ہو اس کو پڑھو اگر قرآن میں سے کچھ بھی یاد نہ ہو تو الحمد للہ، اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کہو پھر رکوع کرو۔

راویٔ حدیث:

رفاعہ بن رافع۔ ان کی کنیت "ابومعاذ" ہے۔ "رفاعہ" راء مہملہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یہ زرقی انصاری ہیں۔ یہ خالد بن رافع کے بھائی ہیں۔ یہ غزوۂ بدر، غزوۂ احد بلکہ تمام غزوات میں آنحضور ﷺ کے ساتھ حاضر رہے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ جنگ جمل اور جنگ صفین میں بھی موجود رہے ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے شروع دورِ امارت میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کے بیٹے "عبید" اور "معاذ" اور ان کے بھتیجے "یحیٰی بن خلاد" ان سے روایت کرتے ہیں۔

تشریح: **وعن رفاعة:** "راء" کے کسرہ کے ساتھ۔ **(ابن رافع):** انصاری۔

قال جاء رجل: ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ ان کے بھائی خلاد بن رافع تھے، جیسا کہ باب کہ شروع میں بحث گزری۔

فصلی فی المسجد: یعنی ناقص یا فاسد نماز۔

ثم جاء فسلم علی النبی علیه السلام: خالق کے حق کو مخلوق پر مقدم کرتے ہوئے۔ **(فقال النبی اعد صلاتك فانك لم تصل):** ابن ملکؒ فرماتے ہیں یہ حکم نماز انتہائی ناقص ہونے کی وجہ سے ہوا۔ **(فقال):** یعنی آدمی نے۔ **(علمنی یا رسول الله کیف اصلی؟):** احتمال ہے کہ یہ ایک قصہ ہے یا الگ الگ۔ **(قال اذا توجهت الی القبلة):** اور یہ بالاتفاق

شرط ہے۔

فکبر: اس لئے کہ یہ بالاتفاق فرض ہے اختلاف اس کے رُکن اور شرط ہونے میں ہے۔

ثم اقرء بام القرآن: یعنی فاتحہ۔ **(وماشاء الله ان تقرء)**: یعنی تجھے فاتحہ کے بعد جو پڑھنے کی توفیق ہو۔ پس ایک آیت کا پڑھنا بالاجماع فرض ہے البتہ سورہ فاتحہ جمہور کے نزدیک فرض ہے اور ہمارے نزدیک واجب ہے اس لئے کہ یہ دلیل ظنی سے ثابت ہے بہرحال سورت یا اس کے قائم مقام کا ملانا ہمارے نزدیک واجب ہے اور امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک سنت ہے اور یہ حدیث ان کے خلاف حجت ہے کیونکہ امر اصل میں وجوب کیلئے ہوتا ہے۔ اور مشیت کے ساتھ معلق کرنا اصل قراءت میں نہیں بلکہ اس کی مقدار میں ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں ائمہ کی ایک جماعت اسی کی قائل ہے اور انہوں نے تین آیات کی قراءت کو واجب قرار دیا ہے اور ہمارے بعض علماء نے کہا ہے کہ امام شافعیؒ کی دلیل قوی ہے کیونکہ آپ علیہ السلام نے اس کو ناقص نہیں بتایا جواب یہ ہے کہ یہ تاکید پر محمول ہے نہ کہ وجوب پر خبر صحیح کی وجہ سے، اور وہ آپ علیہ السلام کا فرمان ہے کہ سورۃ فاتحہ غیر کا عوض ہے اور غیر اس کا عوض نہیں۔

اور اس میں بحث ہے اس لئے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ فاتحہ فرض اور واجب دونوں کے قائم مقام ہے اور بقیہ ایسا نہیں اس لئے کہ غیر فاتحہ سے صرف فرض اداء ہوتا ہے نہ کہ واجب پس یہ ہمارے مذہب اور ہمارے ائمہ کی اصطلاح کی تائید کرتی ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں آپ علیہ السلام نے ''ماشاء اللہ'' فرمایا ''ماشئت'' نہیں فرمایا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت مقدم ہے بندہ کی مشیت پر جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ [الانسان: ۳۰] ''اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر جو خدا کو منظور ہو''۔

فاذا رکعت فاجعل راحتیك: یعنی ہتھیلیوں کو۔

علی رکبیتك: ایسا کرنا بالاتفاق سنت ہے۔

ومکن رکوعك: یعنی اعضاء سے یعنی اپنے تمام اعضاء کو رکوع میں مکمل استعمال کر۔ اس کے قائل طیبیؒ ہیں اور ابن ملکؒ فرماتے ہیں یعنی اطمینان کے ساتھ مکمل کر اور بقولِ ابن حجرؒ کے اعضاء کی تفصیل میں جو گزرا اس کی بجا آوری کے ذریعہ مکمل کر۔

وامدد: یعنی بچھا دے۔ **(ظهرك)**: اور یہ کیفیت بھی مستحب ہے۔ **(فاذا رفعت)**: یعنی سر کو رکوع سے۔ **(فاقم صلبك)**: اس کی تفسیر گزر چکی۔

وارفع راسك حتی ترجع العظام: لازم ومتعدی کی بنیاد پر رفع ونصب دونوں جاری ہو سکتے ہیں یعنی لوٹ آئے یا تو لوٹائے۔

الی مفاصلها: اس حکم بھی گزر چکا۔ **(فاذا سجدت فمکن)**: یعنی ہاتھ۔ بقولِ طیبیؒ کے۔

للسجود: یعنی سجدہ کامل طریقہ سے اطمینان سے کر، بقولِ ابن ملکؒ کے۔ اور ہاتھوں کا سجدہ میں زمین پر رکھنا ہمارے نزدیک سنت ہے اور عند الشافعیؒ فرض ہے اور ابن حجرؒ اس کا معنی بیان کرتے ہیں کہ پیشانی سجدہ کی جگہ جما کر رکھ چنانچہ اس طرح سر ٹیکنا واجب ہے کہ زور بھی دے اس طرح کہ نیچے اگر روئی ہو تو دب جائے۔

فاذا رفعت: یعنی سرکو سجدہ سے۔

فاجلس علی فخذك اليسرى: یعنی دایاں پاؤں کھڑا رکھ جیسا احادیث سابقہ میں بیان ہوا اسی وجہ سے سجدوں کے درمیان پاؤں بچھا کر بیٹھنا سرین کے بل پر بیٹھنے سے بہتر ہے اس لئے کہ آپ علیہ السلام کے احوال میں یہ زیادہ ملتا ہے اور اس میں بہتر یہ ہے کہ اکثر کو سنت پر محمول کیا جائے اور عذر کی وجہ سے ہے یا بیانِ جواز کیلئے۔

ثم اصنع: یعنی جو تمام گذرا۔ **(فی كل ركعة وسجدة):** یعنی رکوع سجود، اور ابن حجرؒ کا قول ہے "**ركعة**" کو حقیقت پر باقی رکھنا صحیح ہے اور سجدہ سے مراد سجدہ تلاوت وشکر ہوگا کیونکہ ان دونوں میں سجدہ صلوٰۃ کی طرح سب کچھ واجب ہے۔

حتی تطمئن: ابن الملکؒ کہتے ہیں کہ مراد آخر صلوٰۃ کا جلسہ ہے اس لئے کہ استقرار کا محل وہی ہے یعنی فراغت تک، اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ مراد تمام ارکان میں اطمینان ہے لہٰذا رکوع، اعتدال، سجدہ، جلوس بین السجدتین سب میں واجب ہوگا اور اکثر علماء کی طرح ہمارا بھی یہی مذہب ہے۔

هذا لفظ المصابيح ورواه ابوداؤد: یعنی اس لفظ کو۔ **(مع تغيير ليسير):** یعنی لفظ میں کچھ تغیر کے ساتھ۔

وروی الترمذی، والنسائی معناه : اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے یہ حدیث حسن ہے اور ابن عبدالبر کے بقول یہ حدیث ثابت ہے اس کو میرکؒ نے نقل کیا ہے منذریؒ سے۔

وفی رواية للترمذی: میرکؒ کا قول ہے کہ اس میں کلام ہے کیونکہ اس میں ترمذی کی تخصیص نہیں بلکہ ابوداؤدؒ نے بھی اس کی تخریج کی ہے۔

قال اذا قمت: یعنی قیام کا ارادہ کرے۔ **(الی الصلوه):** سبب کی جگہ مسبّب کو رکھا۔ **(فتوضا كما امرك الله به):** یعنی سورہ مائدہ میں۔ **(ثم تشهد):** یعنی کلمہ شہادت پڑھ وضوء کے بعد۔

فاقم: یعنی نماز، ابن حجرؒ فرماتے ہیں ایک روایت "واقم" ہے، بعض کے نزدیک تشہد سے مراد اذان ہے اس لئے کہ اس میں شہادتین موجود ہیں اس صورت میں "اقم" سے مراد اقامت ہوگی، میرکؒ نے ازھار سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن حجرؒ کا قول ہے کہ اس میں اذان و اقامت کے واجب علی الکفایہ کے قائلین کی دلیل ظاہر ہے اور بقولِ بعض مراد یہ ہے کہ حضورِ قلب پیدا کر، نیت کر اور نماز قائم کر، یا حضورِ قلب کے ساتھ کھڑا ہو۔

فان كان معك قرآن: فاتحہ یا کوئی اور سورت۔ **(فاقرأ):** یعنی جو آسان لگے، اور ابن حجرؒ کا فرمانا ہے کہ فاتحہ یاد ہے تو پڑھ ورنہ اس کے بدلہ میں حروف کے بقدر سات آیات، چاہے اکٹھی ہوں یا متفرق جگہوں سے اور بس اور جو یہ فرمایا کہ یہ اس تفصیل پر حمل حدیث سابق **:ام القرآن عوض عن غيرها وليس غيرها كذالك** کی بنا پر ہے، کیونکہ وہ اس پر ظاہر دلیل ہے۔ تو یہ بہت عجیب بات ہے۔

والا: یعنی اگر قرآن یاد نہ ہو۔ **(فاحمد الله):** یعنی الحمدللہ کہہ لو۔ **(وكبره):** یعنی اللہ اکبر۔

وهلله: یعنی لا الٰہ الا اللہ اور عنقریب "باب القراۃ" میں اس کی تحقیق آنے والی ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں ہمارے ائمہ نے اسی سے دلیل لی ہے کہ جس کو قرآن حفظ نہ ہو اس کے لئے بالاتفاق ذکر لازم ہے، پھر اس میں اختلاف ہے کہ کیا فاتحہ کے

حروف کے بقدر سات انواع کا ذکر واجب ہے؟ صحیح یہ ہے کہ واجب ہے اسی حدیث کی وجہ سے تاکہ ہر نوع ایک آیت کے قائم مقام ہو جائے، اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس حدیث کی وجہ سے نہیں کیونکہ یہ عدم وجوب سبع انواع میں نص کی طرح ہے اور اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ حدیث میں تین انواع کا ذکر ہے جس کے وہ بھی قائل نہیں لہٰذا دونوں اقوال پر اس حدیث سے تمسک نہیں ہوسکتا اور یہ عجیب وغریب تقریر وتحریر ہے جو کہ آپس کی حجت بازی پر مشتمل ہے پھر فرمایا کہ یہ حدیث عند البعض صحیح ہے اور نوویؒ نے اس کا ضعف بیان کیا ہے کہ ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں قرآنِ پاک یاد نہیں کر سکتا مجھے نماز میں کفایت کیلئے کچھ سکھا دیں، آپ علیہ السلام نے فرمایا سبحان اللہ، الحمد للہ، ولا الہ الا اللہ، واللہ اکبر، ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم، اور یہ پانچ بلکہ سات انواع پر مشتمل ہے اور ظاہر ہے کہ اس کو بسم اللہ یاد تھی، پس یہ حدیث بتقدیر مذکور راجح مذہب کی دلیل ہے، میں کہتا ہوں چھ نوع کے وجود کی تقدیر پر بھی دلیل ہے۔ (ثم ارکع)

فرض نماز کے بعد دُعا مانگنی چاہیے

۸۰۵: وَعَنِ الْفَضْلِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَلصَّلَاةُ مَثْنٰى مَثْنٰى تَشَهُّدٌ فِيْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَتَخَشُّعٌ وَّتَضَرُّعٌ وَّتَمَسْكُنٌ ثُمَّ تُقْنِعُ يَدَيْكَ يَقُوْلُ اِرْفَعُهُمَا اِلٰى رَبِّكَ مُسْتَقْبِلًا بِبُطُوْنِهِمَا وَجْهَكَ وَتَقُوْلُ يَارَبِّ يَارَبِّ وَمَنْ لَّمْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَهُوَ كَذَا وَكَذَا وَفِيْ رِوَايَةٍ فَهُوَ خِدَاجٌ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ۲/ ۲۲۵ حديث ۳۸۵۔ وأحمد في المسند ۱/ ۲۱۱۔

ترجمہ: حضرت فضل بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نفل دو دو رکعت ہے اور ہر دو رکعت میں تشہد ہے اور نماز میں خشوع وخضوع اور مسکنت کا اظہار ہے پھر اپنے پروردگار کی طرف اپنے ہاتھوں کو اس طرح اٹھانا کہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں منہ کی طرف ہوں اور زبان سے کہے اے میرے رب اور جو آدمی اس طرح نہ کہے تو اس کی نماز ایسی ویسی ہے اور ایک دوسری روایت میں ذکر کیا گیا ہے اس کی نماز ناقص ہے اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: عن الفضل بن عباس قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصلٰوۃ مثنی مثنی: بقولِ بعض کے الصلٰوۃ مبتدا اور مثنی مثنی خبر ہے۔ پہلا مثنی تکریر اور ثانی تاکید ہے اور اگلا قول (تشهد فی کل رکعتین): خبر بعد الخبر ہے جیسا کہ مثنی مثنی کا بیان ہے یعنی تشہد والی۔ تمام معطوفات بھی اسی طرح ہیں اور اگر امر کے صیغے مان لیا جائے تو نظم فاسد اور کلام کا حسن ورونق باقی نہیں رہتا بقولِ طیبیؒ کے اور تورپشتیؒ نے کہا ہے کہ ہمیں ایسی روایت بھی ملی ہے جس میں صرف تنوین ہے اور بہت سے لاعلم، امر ہونے پر زور دیتے ہیں حالانکہ یہ تصحیف ہے، ابن الملکؒ کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ الصلٰوۃ رکعتین رکعتین اور عند الشافعیؒ یہ نوافل میں ہے اس لئے کہ ان کے نزدیک دِن ہو یا رات دو رکعت پر سلام پھیرنا افضل ہے اور عند الاحناف ہے دن ہو یا رات چار رکعت ایک سلام کے ساتھ افضل ہیں اور صاحبین دن کے نفل میں امام صاحب کے ساتھ اور رات میں امام شافعیؒ کے ساتھ ہیں، میں کہتا ہوں کہ بات ظاہر ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نماز کی

اصل مقدار دو رکعتیں ہیں پس اس سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ بتیر اء منع ہے جیسا کہ ہمارا مذہب ہے اور ان کے بعد تشہد واجب ہے دو سے زیادتی منع نہیں اور دو پر سلام کی کوئی دلیل نہیں جو اس اختلاف میں ذکر ہو سکے اور جنس کا اصل پر باقی رکھنا اس کو نفل کے ساتھ مقید کرنے سے بہتر ہے جس میں یہ وہم بھی ہے کہ آنے والے اوصاف اس کے ساتھ خاص ہیں۔

تخشع: سکون وتذلل، بقولِ بعض خشوع اور خضوع قریب المعنی ہیں مگر خضوع بدن کے اندر اور خشوع آنکھ بدن اور آواز میں ہوتا ہے اور عند البعض خضوع ظاہر اور خشوع باطن میں ہوتا ہے۔ اظہر یہ ہے کہ ان کا ایک معنی ہے کیونکہ آپ علیہ السلام نے فرمایا: **لو خشع قلبه لخشعت جوارحه**، "یعنی قلب کا خشوع بدن پر ظاہر ہوتا ہے"، ابن الملکؒ نے باطن وظاہر میں خشوع کا معنی اطمینان بیان کیا ہے یعنی حرکت نہ کرے اور دئیں بائیں متوجہ نہ ہو، اور خشوع کمال صلوٰۃ کا حصہ ہے، فرمانِ الٰہی ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾ [المومنون: ۱۔۲] "بے شک ایمان والے لوگ رستگار ہو گئے۔ جو نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں۔" اور فرمانِ نبوی ﷺ **تخشع** میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر خشوع نہ ہو تو اس میں تکلف کرے نفس پر زور دے **تشبه بالخاشعين** کرے۔

وتضرع: یعنی اللہ کی طرف، نہایہ میں ہے کہ تضرع انتہائی ذلت اور سوال میں مبالغہ کرنا ہے۔

تمسكن: تمسکن اپنی مسکنت ظاہر کرنے کو کہتے ہیں ابن الملک کے بقول، یا اس کا معنی اللہ تعالیٰ اس کے حکم وقضا قدر کے سامنے بے حرکت ہونا ہے یا اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرنا ہے، مظہر کا قول ہے کہ **تمسكن** مسکین بروزن مفعیل سے ہے یعنی سکون سے کیونکہ نمازی لوگوں سے سکون میں ہوتا ہے اور "میم" کا اضافہ شاذ ہے سیبویہ نے صرف اس میں اور تمدرع میں روایت کیا ہے طیبیؒ نے یہ نقل کیا۔ بقولِ بعض کے "**سكينة**" سے ہے بعض نے معنی سکون اور وقار کیا ہے "میم" ان دونوں صورتوں میں زائد ہے اور آپ علیہ السلام کا قول۔

ثم تقنع يدك: اقناع الیدین سے ہے جس کا معنی دعا میں رفع الیدین ہے۔ اسی سے فرمان الٰہی ہے: ﴿مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ﴾ [ابرهيم: ٤٣] یعنی ہاتھ نماز کے بعد دعا کیلئے اٹھا، عطف محذوف پر ہے یعنی: **اذا فرغت منها فسلهم ثم ارفع يديك سائلا حاجتك**، پس یہاں موضع طلب میں خبر کو رکھا گیا۔ مظہر فرماتے ہیں اگر ان کو امر بنا کر تشہد کو اول جملہ سے کاٹ کر الگ کر دیتے خبر اور طلب کے خلاف کی وجہ سے اور امر کا عطف امر پر ہوتا تو تقدیری عبارت سے سہولت رہتی۔

میں کہتا ہوں اس سورت میں کلام فصیح میں تعقید اور تکرار ہو جاتا جو کہ مذموم ہے، اور ابن اثیر نے ذکر کیا ہے کہ افعال کو بار بار لانا تعاظل کہلاتا ہے اور ہم نے اس کے کئی شواہد تبیان میں نقل کیے ہیں اس کو طیبیؒ نے نقل کیا ہے، تعاظل "ظاء" کے ساتھ ہے چنانچہ قاموس میں ہے، **تعظلوا عليه** یعنی جمع ہوئے اور یوم العظالی معروف ہے بروزن حباری اس لئے کہ لوگ ایک دوسرے پر سوار ہوئے، یا اس وجہ سے کہ ایک سواری پر دو تین افراد سوار ہوئے۔

يقول: یعنی راوی، اس کا معنی "**ترفعهما**" ہے یعنی طلب حاجت کیلئے اور "**الى ربك**"، تقنع کے متعلق ہے اور بقولِ بعض کے "**يقول**" کا فاعل لفظ "نبی" ہے اور **ترفعهما** تفسیر ہے **ثم تقنع يديك** کی۔

مستقبلا ببطونهما وجهك: یعنی اگرچہ دُعاءِ استعاذہ ہی ہو۔ (**وتقول يارب يارب**): ظاہر ہے تکرار سے تکثیر وارد ہے۔

ومن لم يفعل ذلك: یعنی مذکورہ بالا اعمال نماز میں۔(**فهو**): یعنی فعل صلوٰۃ۔(**كذا و كذا**): بقولِ طیبیؒ یہ کنایہ ہے نماز کے ناقص ہونے کی طرف جس کا بیان دوسری یعنی **فهو خداج** والی روایت میں ہے۔

وفي رواية: میرک کہتے ہیں کہ اس کی سند میں عبداللہ بن نافع بن ابی العمیاء ہے جس کی حدیث کے متعلق امام بخاریؒ نے عدم صحت کا حکم لگایا ہے، تخریج میں اسی طرح ہے۔

فهو خداج: ''جیم'' کے کسرہ کے ساتھ، یعنی فضیلت اور اجر میں ناقص ہے، بقولِ بعض تقدیری عبارت: **فهو ذات خداج** ہے یعنی یہ نماز خداج والی ہے یا مصدر ہے جس کا ذکر مبالغہ کیلئے کیا ہے اور معنی یہ ہے کہ نماز ناقص ہے اور فائق میں خداجت الحامل کا مصدر کہا ہے جس کا معنی اونٹنی کا قبل الوقت حمل گرانا ہے پھر استعارۃ اس معنی میں لیا گیا اور مطلب ہوا ''نقصان والی'' مضاف محذوف ہے اور نہایہ میں ہے کہ مصدر کا ذکر کرنا مبالغہ کیلئے جیسا کہ قول: **فانما اقبال و ادبار** میں ہے۔(**رواه الترمذي**): حسن ہے سنداً بقولِ ابن حجرؒ۔

الفصل الثالث:

تکبیراتِ انتقال بلند آواز سے کہی جائیں

۸۰۶: وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ الْمُعَلّٰى قَالَ صَلّٰى لَنَا اَبُوْ سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِيّ فَجَهَرَ بِالتَّكْبِيْرِ حِيْنَ رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ السُّجُوْدِ وَحِيْنَ سَجَدَ وَحِيْنَ رَفَعَ مِنَ الرَّكْعَتَيْنِ وَ قَالَ هٰكَذَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ . (رواه البخاري)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/۳۰۳ حديث رقم ۸۲۵۔

ترجمہ: ''حضرت سعید بن حارث بن معلّٰی سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے ہمیں نماز پڑھائی انہوں نے جب سجدہ سے سر اٹھایا اور جب سجدہ میں گئے اور جس وقت دو رکعت پڑھ کر اٹھے تو بلند آواز سے تکبیر کہی اور فرمایا میں نے اسی طرح رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو بلند آواز سے تکبیرات کہتے ہوئے دیکھا ہے اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

سعید بن حارث۔ یہ سعید بن حارث ابن معلّٰی انصاری وحجازی ہیں مدینہ کے قاضی اور بڑے مشہور تابعین میں سے ہیں انہوں نے ابن عمر، ابو سعید و جابر رضی اللہ عنہم سے اور ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی ہے۔ معلّٰی: ''تعلية'' سے اسم مفعول کے وزن پر ہے۔

تشریح: عن سعيد بن الحارث بن المعلى: اسم مفعول ہے تعلیہ سے، جامع الاصول میں ہے کہ ابن معلّٰی مدینہ کے قاضی اور مشہور تابعی ہیں۔

قال صلی لنا ابو سعید الخدری فجھر بالتکبیر: کیونکہ امام تھے۔(حین رفع راسه من السجود): لوگوں کو بتانے اور اتباع کیلئے۔(وحین سجد) یعنی دوسری مرتبہ۔(وحین رفع) یعنی سر، اور بخاری میں قیام کا ذکر کا ذکر ہے۔
من الرکعتین: یعنی پہلی۔(وقال ھکذا رایت النبی صلی الله علیه وسلم۔ (رواہ البخاری)

چار رکعت نماز میں بائیس تکبیرات ہیں

۸۰۷: وَعَنْ عِكْرِمَةَ قَالَ صَلَّيْتُ خَلْفَ شَيْخٍ بِمَكَّةَ فَكَبَّرَ ثِنْتَيْنِ وَعِشْرِيْنَ تَكْبِيْرَةً فَقُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ اَحْمَقُ فَقَالَ ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ سُنَّةُ اَبِی الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/۲۷۲ حديث رقم ۷۸۸۔

ترجمہ: ''حضرت عکرمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بوڑھے آدمی کے پیچھے مکہ میں نماز پڑھی تو انہوں نے نماز میں بائیس تکبیرات کہیں چنانچہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اس کا تذکرہ کیا کہ معلوم ہوتا ہے یہ آدمی احمق ہے جو اتنی زیادہ تکبیرات کہتا ہے تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا تیری ماں تجھے گم کرے یہ تو ابوالقاسم کی سنت ہے اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: وعن عکرمة: ابن عباس کے آزاد کردہ غلام اور بڑے تابعی ہیں۔
قال صلیت خلف شیخ بمکة: میرکؒ کا کہنا ہے وہ ابوہریرہؓ تھے جیسا کہ طحاویؒ، احمدؒ طبرانی میں ان کا نام بھی مذکور ہے۔
فکبر ثنتین وعشرین تکبیرة: بقولِ طیبیؒ کے یہ عدد چار رکعت نماز کا ہے تکبیر تحریمہ اور تشہد اول سے قیام کی تکبیر کے اضافہ کے ساتھ۔
امك: پہلے گذر چکا کہ یہ کلمہ تعجب ہے اور بظاہر بددُعا ہے اور ایسا مدح وضم میں کہا جاتا ہے اور یہاں ہلاکت پر محمول ہے ان کی بات کو رد کرنے کیلئے یعنی ابوالقاسم کی سنت پر عمل کرنے والے کو تو احمق کہتا ہے؟
سنة ابی القاسم: مبتداء محذوف کی خبر ہے یعنی خصلته التی انکرتھا منه سنة ابی القاسم ﷺ۔ یہاں کنیت کا ذکر کرنا بلاغت کی وجہ سے ہے، بقولِ طیبیؒ کے اور گویا کہ اس کنیت سے انہوں نے عکرمہ پر بڑی عطاء کی طرف اشارہ کیا کیونکہ ورثاء النبی ﷺ کو جو علم و معرفت ملی ہے وہ یقیناً آپ علیہ السلام کی تقسیم ہے کیونکہ حدیث میں ہے: انما انا قاسم والله یعطی۔ (رواہ البخاری)

۸۰۸: وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ مُرْسَلًا قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُكَبِّرُ فِي الصَّلَاةِ كُلَّمَا خَفَضَ وَرَفَعَ فَلَمْ تَزَلْ تِلْكَ صَلَاتُهٗ ﷺ حَتّٰى لَقِيَ اللّٰهَ۔ (رواہ مالک)

أخرجه مالك في الموطأ ۱/۷۶ حديث رقم ۱۷ من كتاب الصلاة۔

ترجمہ: ''حضرت علی ابن حسین سے مرسل طریقہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں تکبیر کہتے تھے جب نیچے

جھکتے اور جب اوپر اٹھتے ہمیشہ نبی علیہ السلام کی نماز اسی طرح رہی یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی اس حدیث کو امام مالکؒ نے روایت کیا ہے۔''

راویٔ حدیث:

علی بن الحسین۔ نام علی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں۔ کنیت ابوالحسن ہے۔ ''زین العابدین'' کے نام سے معروف ہیں۔ اہل بیت میں سے اکابر سادات میں سے تھے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ قریش میں سے میں نے کسی شخص کو ان سے زیادہ افضل نہیں پایا۔ ۹۴ھ میں بعمر ۵۸ سال وفات پائی۔ بقیع میں اسی قبر میں مدفون ہوئے جس میں ان کے عم محترم حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما مدفون تھے۔

تشریح: عون بن عبداللہؒ عتبہ بن مسعود کے بیٹے ہیں۔

وعن علی: یعنی زین العابدین۔ **(ابن الحسین رضی اللہ عنہ مرسلا):** کیونکہ انہوں نے نبی علیہ السلام کا زمانہ نہیں پایا، ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ''مرسلا'' حال ہے جو مقدم ہے ذوالحال پر۔ اور یہ صحیح نسخوں کے موافق ہے جن میں مفعول کا صیغہ لکھا ہے لیکن ممکن ہے کہ مرسلا فاعل کا صیغہ ہو اس صورت میں حال ذوالحال سے موخر ہوگا۔

قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکبر فی الصلوٰۃ کلما خفض: یعنی رکوع وسجدہ کے ارادہ کے وقت۔

ورفع: یعنی جب بھی رکوع سے قومہ کو اٹھتے، کیونکہ آپ علیہ السلام پہلے تسمیع وتحمید کہتے پھر تکبیر کہتے جھکنے کیلئے لائے ہیں۔

فلم یزل: صیغہ مذکر کے ساتھ اور بعض مؤنث کا صیغہ لائے ہیں۔

تلک: یعنی وہ تکبیر والی نماز۔ **(صلاتہ):** رفع اور بقول بعض نصب کے ساتھ ضمیر ہو جو عائد ہو لفظ ''نبی'' کی طرف اور جملہ اسمیہ اس کی خبر ہو، اور یہ بھی کہ ''تلک'' اسم اور صلہ تھا اور احتمال ہے کہ ''لم یزل'' کا اسم خبر منصوب کی روایت میں اور برعکس مرفوع کی روایت میں۔ **(حتی لقی اللہ تعالٰی)**۔ (رواہ مالک)

رفع یدین صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہے

۸۰۹: وَعَنْ عَلْقَمَةَ قَالَ لَنَا ابْنُ مَسْعُوْدٍ اَلَا اُصَلِّيْ بِكُمْ صَلَاةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَصَلّٰى وَلَمْ يَرْفَعْ يَدَيْهِ اِلَّا مَرَّةً وَاحِدَةً مَعَ تَكْبِيْرِ الْاِفْتِتَاحِ رواہ الترمذی وابوداود والنسائی وَقَالَ اَبُوْدَاوُدَ **لَيْسَ هُوَ بِصَحِيْحٍ عَلٰى هٰذَا الْمَعْنٰى۔**

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/ ۴۷۷ حدیث رقم ۷۴۷ وقال: "لیس هو بصحیح علی هذا اللفظ"۔ وأخرجه الترمذی فی السنن ۲/ ۴۰ حدیث رقم ۲۵۷۔ وقال حدیث عبداللہ بن مسعود حسن۔ وأخرجه النسائی الترمذی فی السنن ۱/ ۱۹۵ حدیث رقم ۱۰۵۸ وأخرجه أحمد بمعناه فی المسند ۱/ ۴۴۲۔

ترجمہ: ''حضرت علقمہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ہم سے فرمایا کہ میں تم کو رسول

اللہ ﷺ کی نماز پڑھ کر نہ دکھاؤں پھر انہوں نے نماز پڑھی تکبیر تحریمہ کے سوا پوری نماز میں رفع یدین نہیں کیا اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام ابوداؤدؒ اور امام نسائیؒ نے روایت کیا ہے اور امام ابوداؤدؒ نے فرمایا ہے کہ اس معنی کے اعتبار سے یہ حدیث صحیح نہیں۔"

تشریح: وعن علقمہ: مشہور تابعی ہیں۔

قال: قال لنا ابن مسعود الا اصلی بکم صلاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصلی ولم یرفع یدیہ الا مرۃ واحدۃ مع تکبیرۃ الافتتاح رواہ الترمذی۔

اور باب میں براء بن عازب کی روایت بھی ہے اور حدیث ابن مسعودؓ حسن ہے اور بہت سے تابعین اسی کے قائل ہیں، سفیان ثوری اور اہل کوفہ کا یہی قول ہے۔

وابوداؤد والنسائی: ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ دارقطنی وابن عدی نے تخریج کی ہے محمد بن جابر سے انہوں نے حمادہ انہوں نے ابراہیم، انہوں نے علقمہ، انہوں نے عبداللہ سے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی علیہ السلام، ابوبکرؓ وعمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی انہوں نے صرف نماز کے شروع میں رفع یدین کیا اور طحاویؒ پھر بیہقیؒ نے سند صحیح کے ساتھ حسن بن عیاش کی حدیث نقل کی ہے، اسود سے فرماتے ہیں کہ میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا انہوں نے تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کیا پھر نہیں کیا۔

وقال ابوداؤد لیس ھو بصحیح علی ھذا لمعنی: یعنی اگر سند صحیح ہے اس لئے کہ ابن مسعودؓ کے علاوہ نے رفع یدین روایت کیا ہے رکوع، قومہ، اور تشہد اول سے اٹھتے وقت، بعض نے کہا کہ ابن مسعودؓ ان جگہوں پر رفع یدین ذکر کرنا بھول گئے اور یہ بہت بعید ہے اور اس سے بعید تو یہ ہے کہ ابن مسعودؓ چھوٹے قد کے تھے اس لئے کہ ان کا قد ایک ذراع کی مقدار تھا اور وہ کمال خشوع کی وجہ سے سر نہیں اٹھاتے تھے اس لئے ان کو صرف تحریمہ کے وقت رفع یدین کا علم ہوا کیونکہ اب تک وہ نماز میں داخل نہیں ہوتے تھے، میرکؒ نے کہا ہے کہ اس میں کلام ہے کیونکہ ابوداؤد میں اس طرح نہیں ہے اس میں صرف: "**لیس بصحیح**" کے الفاظ ہیں۔ ابن ہمامؒ نے اس جگہ بھرپور بحث کی ہے اس لئے ان کی شرح ہدایہ دیکھو۔

رسول اللہ ﷺ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرتے تھے

۸۱۰: وَعَنْ اَبِیْ حُمَیْدِ نِ السَّاعِدِیِّ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ اِلَی الصَّلٰوۃِ اِسْتَقْبَلَ الْقِبْلَۃَ وَرَفَعَ یَدَیْہِ وَقَالَ اللّٰہُ اَکْبَرُ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

أخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/ ۲٦٤ حدیث رقم ۸۰۳۔

ترجمہ: "حضرت ابوحمید ساعدیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو پہلے قبلہ کی طرف متوجہ ہوتے اور پھر دونوں ہاتھ اٹھاتے اور اللہ اکبر کہتے تھے اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔"

تشریح: وعن ابی حمید الساعدی قال کان رسول اللہ اذا قام الی الصلوٰہ استقبل القبلۃ: اس میں

جهة کے اعتبار کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ''کعبۃ'' لفظ استعمال نہیں کیا۔

ورفع يديه: یعنی کانوں کے برابر۔ (**وقال الله اكبر**) (رواہ ابن ماجہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلط نماز پڑھنے پر تنبیہ فرمائی

۸۱۱: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الظُّهْرَ وَفِيْ مُؤَخَّرِ الصُّفُوْفِ رَجُلٌ فَاَسَاءَ الصَّلَاةَ فَلَمَّا سَلَّمَ نَادَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَافُلَانُ اَلَا تَتَّقِي اللّٰهَ اَ لَا تَرٰى كَيْفَ تُصَلِّيْ اِنَّكُمْ تَرَوْنَ اَنَّهٗ يَخْفٰى عَلَيَّ شَيْءٌ مِمَّا تَصْنَعُوْنَ وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَرٰى مِنْ خَلْفِيْ كَمَا اَرٰى مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ۔ (رواہ احمد)

أخرجه أحمد في المسند ٢/٤٤٩۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک مرتبہ ظہر کی نماز پڑھائی اور آخری صف میں ایک آدمی تھا جس نے غلط نماز پڑھی جب اس آدمی نے سلام پھیرا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلایا آواز دے کر اے فلاں کیا تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا نہیں کیا تجھے معلوم نہیں کہ نماز کس طرح ادا کی جاتی ہے کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جو کچھ تم کرتے ہو وہ چیز مجھ پر پوشیدہ ہے اللہ کی قسم جس طرح میں اپنے سامنے کی چیزیں دیکھتا ہوں اسی طرح میں اپنے پیچھے بھی دیکھتا ہوں اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **وعن ابی هريرة قال صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم الظهر وفي موخر الصفوف رجل فاساء الصلاة**: طیبیؒ کا کہنا ہے کہ ''فاء'' سببیہ ہے یعنی دور ہونے کی وجہ سے نماز صحیح نہیں پڑھتا تھا اسی وجہ سے آپ علیہ السلام نے سختی سے فرمایا میں پیچھے بھی دیکھتا ہوں اور اس میں بحث ہے ابن حجرؒ کا قول ہے: **فاساء الصلوٰة** کا مطلب ہے کہ وہ مرتکب مفسد صلوٰۃ ہوا جیسا کہ اس پر **الا تتقى الله** دال ہے اور ''فاء'' یہاں زائد اور تزیین کیلئے ہے اور اظہر اس کا تعقیب کیلئے ہونا ہے تقدیری عبارت یہ ہے: **وفي موخر الصفوف رجل صلى معنا فاساء الصلوٰة**۔

فلما سلم: یعنی نبی علیہ السلام نے یا شخص نے۔ (**ناداه رسول الله صلى الله عليه وسلم يا فلان الا تتقى الله؟**) یعنی اس کی نافرمانی یا عتاب سے، اور اس ابہام کو ''الا ترى'' بیان کرتا ہے یعنی غور وفکر کر۔ (**كيف تصلى؟**): صیغہ خطاب کے ساتھ، ایک نسخہ میں ''نون'' متکلم کے ساتھ ہے۔ (**انكم ترون**): ''تاء'' کے ضمہ کے ساتھ، یعنی تمہارا گمان ہے۔

انه يخفى على شئى تصنعون: یعنی نماز میں مطلقاً بعض اوقات۔ (**والله**): ''واؤ'' قسمیہ ہے۔

انى لارى: یعنی دیکھتا اور جانتا ہوں۔ (**من خلفى**): حرفِ جر کے ساتھ، ایک نسخہ میں ''مَن'' موصولہ کے ساتھ۔

كما أرى من بين يدى: ''مِن'' کے کسرہ کے اور ''بَین'' کے جر کے ساتھ، ایک نسخہ میں ''من'' کے فتحہ ''بَین یدی'' کے نصب کے ساتھ ظرف ہونے کی وجہ سے۔ ابن حجرؒ کے بقول یعنی دورانِ نماز، کیونکہ آپ علیہ السلام کو غایت قرب اور تجلیات کی وجہ سے نماز میں آنکھوں کی ٹھنڈک حاصل تھی اس لئے آپ علیہ السلام کیلئے موجودات اپنی حقیقت کے ساتھ منکشف ہوتی تھیں اس لئے آپ علیہ السلام کو سامنے کی طرح پیچھے کا ادراک بھی ہو جاتا تھا۔ لہٰذا آپ کے عالمِ غیب میں ہوتے ہوئے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عالم شہادت مخفی نہیں ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ یہ آپ علیہ السلام کے اس فرمان کے منافی نہیں کہ میں دیوار کے پیچھے کا علم نہیں رکھتا بتقدیر صحت حدیث اس لئے کہ یہ نماز سے خارج کی بات ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ آپ علیہ السلام کے مونڈھوں کے درمیان سوئی کے ناکے کی طرح دو آنکھیں تھیں آپ ان سے دیکھ سکتے تھے، باوجود اس کے اس میں حقیقتاً منافات نہیں کیونکہ رؤیت بصری یہاں ثابت ہے اور وہاں نفی علم مغیبات کی ہے لہٰذا دو الگ چیزیں ہوئیں اور معنی میں صحیحین کی خبر بھی ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم میرے آگے دیکھ سکتے ہو؟ خدا کی قسم مجھ پر تمہارا رکوع سجدہ مخفی نہیں ہوتا میں اپنے پیچھے بھی دیکھتا ہوں۔ مسلم کی روایت میں ہے اے لوگو! میں تمہارا امام ہوں تم رکوع، سجدہ میں مجھ سے آگے نہ بڑھو اس لئے کہ میں آگے پیچھے دونوں طرف دیکھتا ہوں۔

اور آنکھ میں بصارت کا پیدا کرنے والا قادر ہے کہ کسی اور جگہ روشنی رکھ دے، بقولِ بعض کے دیکھنا کا ذریعہ یہ تھا کہ لوگوں کی صورتیں قبلہ کی طرف منعکس ہو جاتی تھیں، اور اس کا ردّ یہ ہے کہ اس جیسی بات بغیر نقل صحیح کرنے کی جرأت نہیں کرنا چاہیے۔

اور عند البعض رؤیت قلب مراد ہے اور بقولِ بعض کے وحی اور الہام، اور اس کا ردّ یہ ہے کہ درست آنکھ سے دیکھنا ہی ہے جیسا کہ گذر چکا اور "وراء الجدار" والی روایت کے بھی منافی نہیں اس بناء پر کہ آپ علیہ السلام نے بے شمار مغیبات کی خبر دی ہے اس لئے کہ وہ اصل کے اعتبار سے ہے اور خرقِ عادت، وحی یا الہام کے ذریعہ سے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ کلام میں تناقض بلکہ اصرار ہے، پھر کہا کہ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ آپ کی اونٹنی گم ہوگئی، بعض منافقین نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں آسمان کی خبریں بتانے کا دعویٰ کرتا ہے حالانکہ اس کو اپنی اونٹنی کا علم نہیں، آپ علیہ السلام نے فرمایا، واللہ مجھے صرف وہی علم ہے جو اللہ نے عطا کیا ہے اور اونٹنی کا بھی اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ وہ فلاں جگہ ہے اس کی لگام ایک درخت سے پھنس گئی ہے، چنانچہ لوگوں نے وہاں جا کر دیکھا تو ایسا ہی پایا اور خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ کے احوال مختلف ہیں اسی وجہ سے یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے اپنے یوسف علیہ السلام کو قریبی کنویں میں دیکھ نہ سکے اور مصر سے قافلہ نکلتے وقت یوسفؑ کی قمیص کی خوشبو سونگھ لی۔ (رواہ احمد)

بَابُ مَا يَقْرَأُ بَعْدَ التَّكْبِيرِ

تکبیر تحریمہ کے بعد پڑھے جانے والے اذکار کا بیان

الفصل الاول:

تکبیر تحریمہ کے بعد پڑھے جانے والے اذکار

۸۱۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَسْكُتُ بَيْنَ التَّكْبِيرِ وَبَيْنَ الْقِرَاءَةِ اِسْكَاتَةً فَقُلْتُ بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِسْكَاتَكَ بَيْنَ التَّكْبِيرِ وَبَيْنَ الْقِرَاءَةِ مَا تَقُوْلُ قَالَ اَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ

بَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَّ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اَللّٰهُمَّ نَقِّنِيْ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ اَللّٰهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِالْمَآءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲۲۷/۲حدیث رقم ۷۴۴۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ۴۱۹/۱حدیث رقم (۱۴۷۔۵۹۸) واللفظ للبخاری ۔وأخرجه أبوداؤد فی السنن ۴۹۳/۱حدیث رقم ۷۸۱۔وأخرجه النسائی فی السنن ۵۰/۱حدیث رقم ۶۰۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۲۶۴/۱ حدیث رقم ۸۰۵وأخرجه الدارمی فی السنن ۳۱۳/۱حدیث رقم ۱۲۴۴۔وأخرجه أحمد فی المسند ۲۳۱/۲۔

ترجمه: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تکبیر تحریمہ اور قراءت کے بعد خاموشی اختیار کرتے تھے چنانچہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں آپ تکبیر تحریمہ اور قراءت کے بعد خاموش رہتے ہیں اس وقت آپ کیا پڑھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا یہ دعا پڑھتا ہوں: **اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي**...... اے اللہ! میرے گناہوں کے درمیان اتنی دوری پیدا کر دے جتنی کہ تو نے مشرق اور مغرب کے درمیان دوری پیدا کی ہے۔اے اللہ! مجھے گناہوں سے اس طرح پاک کر دے جیسے سفید کپڑے کو صاف کیا جاتا ہے میل سے۔اے اللہ! تو میرے گناہ دھو ڈال ساتھ پانی، برف اور اولوں کے۔''

تشریح: **عن ابی هریره قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یسکت**: ''اسکات'' سے ہے، اور لازم ہے۔تورپشتیؒ کہتے ہیں کہ ہم نے بفتح السین اور بضم الکاف ضبط کیا ہے، اور کرمانی کہتے ہیں کہ ''اسکات'' سے ہے، میں کہتا ہوں اکثر نسخے اور جمہور شراح اسی پر ہیں اور اگلے مصدر کے مناسب بھی یہی ہے۔جوھریؒ کہتے ہیں کہا جاتا ہے **تکلم الرجل ثم سکت** (بغیر الف کے) **فاذا انقصلع کلامه**، میں ''اسکت'' کا قائل ہوں یہ قسطلانی سے منقول ہے۔

بین التکبیر وبین القراۃ اسکاتة: بروزن افعالہ سے سکوت سے، اور اس سے ترکِ کلام مراد نہیں ہوتا بلکہ آواز بلند نہ کرنا مراد ہوتا ہے، اگلے جملہ: **ماتقول فی اسکاتك**؟ کی وجہ، بقولِ طیبیؒ یا قراءت سے خاموشی مراد ہے نہ کہ ذکر سے بقولِ ابہریؒ اور یہی اظہر ہے۔

فقلت بابی انت وامی یا رسول الله!: بقولِ توپشتیؒ ''باء'' محذوف سے متعلق ہے، بقول البعض یہ اسم ہے لہٰذا ''مابعد'' مرفوعا ہوگا تقدیری عبارت ہوگی، **انت مفدی بابی وامی** اور بقول بعض یہ فعل ہے یعنی **فدیتك**، اور اس کا مابعد منصوب ہے حذف کرنا کثرتِ استعمال کی وجہ سے تخفیف اور مخاطب کو معلوم ہونا ہے، طیبیؒ نے یہ ذکر کیا۔

اسکاتك: نصب اور بقول بعض رفع کے ساتھ۔

بین التکبیر وبین القراۃ: بقولِ ابن حجرؒ دوسرا ''بَین'' زائد ہے اس لئے یہ متعددات پر ہی داخل ہوتا ہے۔

ماتقول؟: یعنی خاموشی کے وقت، بقولِ مظہرؒ حالتِ نصب میں مفعول ہوگا فعل مقدر کا، یعنی **اسئالك اسكاتك ما تقول فيه يا في اسكاتك ما تقول**؟ بحذف حرف ''جر''، یہ طیبیؒ نے نقل کیا ہے۔اور ابن حجرؒ کے بقول ہماری روایت میں مبتداء ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، یہ میرکؒ نے نقل کیا ہے، اور استفہام کے طور بفتح الھمزہ وضم السین روایت کیا گیا ہے۔

قال اقول اللهم باعد بيني وبين خطاياى كم باعدت بين المشرق والمغرب: مبالغہ کیلئے ہے کیونکہ اگر چہ مبالغہ کیلئے نہ ہو پھر بھی مبالغہ کیلئے ہی ہوتا ہے، اور بقولِ بعض **بعد من الجانبين** کا فائدہ دیتا ہے۔ گویا کہ کہا گیا **اللهم باعد بيني وبين خطاياى وباعد بين خطاياى وبيني، والخطايا،** لاحقہ مراد ہو تو معنی ہوگا **اذا قدرلي ذنب فبعد بيني وبينه** (مقصود بعد میں بیان ہوگا) یا سابقہ مراد ہو تو معنی ہوگا: **المحو والغفران لم حصل منها،** اور یہ مجازاً ہے کیونکہ حقیقی مباعدت زمان اور مکان میں ہوتی ہے، وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح مشرق ومغرب کا ملنا محال ہے اسی طرح میں بھی گناہوں کے بالکل قریب نہ ہوں، لفظ ''بین'' مکرر ذکر کیا نہ کہ ''مشرق ومغرب'' کیونکہ ضمیر مجرور پر عطف میں جار کا بھی اعادہ ہوتا ہے، ذکر کیا میرکؒ نے۔

اللهم نقني: یعنی پاک کر۔ **(من الخطايا):** یعنی دِل کو پراگندہ وسیاہ کرنے والی۔ **(كما ينقى):** صیغۂ مجہول کے ساتھ۔

الثوب الابيض من الدنس: یعنی میل کچیل، ''ابیض'' کی قید لگانے میں مبالغہ ہے جو مخفی نہیں۔

اللهم اغسل خطاياى بالماء والثلج: ساکن۔ **(البرد):** ''باء'' ''راء'' کے فتحہ کے ساتھ، تورپشتیؒ کا کہنا ہے کہ آسمان سے اُترنی والی مختلف مطہرات (جن میں سے کسی ایک بغیر طہارت کامل نہیں) کا ذکر کرنا مغفرت کی انواع کو بیان کرنے کیلئے ہے جن کے بغیر خطائیں معاف نہیں ہوتیں، یعنی ان انواعِ مغفرت کے ذریعہ پاک کر دے خطاؤں سے جو گناہ مٹانے میں ایسی ہیں جیسا کہ یہ تینوں چیزیں گندگی، ناپاکی، جنابت وحدث دور کرنے میں مؤثر ہیں۔ ''ثلج'' اور ''برد'' کو خاص طور پر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دونوں پانی خلقۃً ٹپکے ہوئے غیر مستعمل ہیں ان میں ہاتھ اور پاؤں نہیں پڑے جیسا کہ دیگر پانیوں میں کہ ان میں مٹی ملتی ہے نہر میں چلتے، اور حوض میں جمع ہوتے ہیں، ۔ لہٰذا وہ دونوں پانی طہارت میں زیادہ کامل ہیں، اگر تو سوال کرے کہ گرم پانی سے غسل اچھی طرح ہوسکتا ہے پھر ان کو کیوں ذکر کیا؟ میں کہتا ہوں بقولِ محی السنۃؒ کے اس کا معنٰی **طهرني من الذنوب** ہے، اور ان کا ذکر صرف مبالغہ کیلئے ہے اس لئے ان کی ضرورت پڑتی ہے خطابی کہتے ہیں یہ مثالیں ہیں یہاں ذرات مراد نہیں اور صرف تاکید ومبالغہ مراد ہے تطہیر وتنقیح میں، ابن دقیق العید کا قول ہے کہ اس سے انتہائی صفائی تعبیر کی جاتی ہے اس لئے کہ کپڑے پر تین صفائی کی چیزیں لگانے سے کپڑا انتہائی صاف ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا﴾۔ طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ''ثلج'' اور ''برد'' کے ذکر کے بعد جہنم کی انتہائی گرم آگ کو بجھانے کیلئے رحمت اور انواعِ مغفرت کو بھی شامل کرلیا ہو، اسی لئے **برد الله مضجعه** کہتے ہیں یعنی ''رحم فرما'' اور دوزخ کے عذاب سے بچا، میرکؒ نے یوں ہی کیا ہے کہتے ہیں کہتا ہوں اقرب یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے خطاؤں کو جہنم کی آگ کی بمنزلہ رکھا اور تاکید کیلئے اس کی گرمی کا غسل کے ذریعہ ازالہ کیا، اور ممکن ہے کہ تینوں دعاؤں میں تین زمانوں کی طرف اشارہ ہو، پس مباعدت مستقبل کیلئے غسل ماضی، تنقیہ حال کیلئے، اور مستقبل کو مقدم کیا کسی چیز کو قبل الوقوع دفعہ کرنے کے اہتمام کیلئے، واللہ اعلم۔

اور ممکن یہ بھی ہے کہ مباعدت اس میں ہو جو بالکل واقع نہیں ہوئی اور تنقیہ حال ومستقبل اور غسل واقع شدہ میں اور آلاتِ غسل کا مکرر ذکر گناہوں سے متعلق انواع ومراتبِ رحمت کی طرف اشارہ کیلئے ہے، واللہ اعلم۔ یہ تمام چیزیں اُمت کی تعلیم، ان

کے لئے دُعا یا حسنات الابرار سیّئات المقربين کے اعتبار سے، اور یہی اظہر ہے۔(متفق علیه): میرکؒ کا قول ہے کہ۔ یہ ابوداوُدؒ، ترمذی، نسائی نے بھی نقل کی ہے۔

نماز کے اندر پڑھی جانے والی دُعائیں

۸۱۳: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا قَامَ اِلَى الصَّلٰوةِ وَفِيْ رِوَايَةٍ كَانَ اِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ كَبَّرَ ثُمَّ قَالَ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَنْتَ رَبِّيْ وَاَنَا عَبْدُكَ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ جَمِيْعًا اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ وَاهْدِنِيْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا يَهْدِيْ لِاَحْسَنِهَا اِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّيْ سَيِّئَهَا لَا يَصْرِفُ عَنِّيْ سَيِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهٗ فِيْ يَدَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ اِلَيْكَ اَنَابِكَ وَاِلَيْكَ تَبَارَكْتَ وَتَعَالَيْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ وَ اِذَا رَكَعَ قَالَ اَللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَلَكَ اَسْلَمْتُ خَشَعَ لَكَ سَمْعِيْ وَبَصَرِيْ وَمُخِّيْ وَعَظْمِيْ وَعَصَبِيْ فَاِذَا رَفَعَ رَاْسَهٗ قَالَ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْاَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمِلْاَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُوَ اِذَا سَجَدَ قَالَ اَللّٰهُمَّ لَكَ سَجَدْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَلَكَ اَسْلَمْتُ سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهٗ وَصَوَّرَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ثُمَّ يَكُوْنُ مِنْ اٰخِرِ مَا يَقُوْلُهٗ بَيْنَ التَّشَهُّدِ وَالتَّسْلِيْمِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَسْرَفْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ (رواه مسلم وفى رواية للشافعي) وَالشَّرُّ لَيْسَ اِلَيْكَ وَالْمَهْدِيُّ مَنْ هَدَيْتَ اَنَابِكَ وَاِلَيْكَ لَامَنْجَا مِنْكَ وَلَا مَلْجَاَ اِلَّا اِلَيْكَ تَبَارَكْتَ .

أخرجه مسلم فى صحيحه ٥٣٤/١ حديث رقم (٢٠١-٧٧١) أخرجه أبوداوٗد فى السنن ٤٨١/١ حديث رقم ٧٦٠ وذكر "وأنا أول المسلمين" وأخرجه الترمذى فى السنن ٤٥٢/٥ حديث رقم ٣٤٢١-ورواية كان إذا افتتح اصلاة : أخرجها مسلم فى صحيحه ٥٣٦/١ حديث (٢٠٢-٧٧١) والنسائى إلى قوله "أستغفرك وأتوب إليك" فى السنن ١٢٩/٢ حديث رقم ٨٩٧- ورواية الشافعى أخرجها فى الأم-

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ جب نماز شروع کرتے تو پہلے تکبیر تحریمہ کہتے اور پھر یہ دعا پڑھتے: وَجَّهْتُ وَجْهِيَ...... میں نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا۔ میں حق کی طرف متوجہ ہونے والا ہوں یکسو ہو کر اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں میری نماز میری عبادت میری زندگی اور میری موت اللہ ہی کے لیے ہے

جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور اسی بات کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں مسلمانوں میں سے ہوں اے اللہ! تو بادشاہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو ہی میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ ہوں میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے میں اپنے گناہ کا اقرار کرتا ہوں تو میرے گناہ معاف کر دے کیونکہ تیرے سوا اور کوئی گناہ بخشنے والا نہیں اور بہترین اخلاق کی طرف میری رہنمائی کر کیونکہ تیرے سوا اور کوئی اچھے اخلاق کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتا اور برے اخلاق کو مجھ سے دور کر دے کیونکہ تیرے سوا مجھے کوئی برے اخلاق سے نہیں بچا سکتا تیری خدمت میں حاضر ہوں تیرا حکم ماننے کے لئے تیار ہوں تمام بھلائیاں تیرے ہی ہاتھ میں ہیں اور برائی تیری طرف منسوب نہیں کی جا سکتی میں تیرے ہی سبب سے ہوں اور تیری ہی طرف رجوع کرتا ہوں تو برکت والا ہے اور بلند ہے میں تجھ سے مغفرت مانگتا ہوں اور تیرے ہی سامنے توبہ کرتا ہوں اور جب آپ رکوع میں جاتے تو یہ دعا پڑھتے تھے **اَللّٰھُمَّ لَكَ رَكَعْتُ**...... اے اللہ میں نے تیرے ہی لیے رکوع کیا اور تجھ پر ایمان لایا اور تیرے ہی لیے اسلام لایا میرے کان اور میری آنکھ اور میرا گودا اور میری ہڈی اور میرے پٹھے تیرے ہی لیے خشوع کرتے ہیں اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو یہ دعا پڑھتے: **اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ**...... اے اللہ اے ہمارے رب تیرے ہی لیے تعریف ہے آسمانوں اور زمینوں کے برابر اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کے برابر اور جو کچھ اس کے بعد پیدا کرے گا اس کے برابر اور جب سجدہ میں جاتے تو یہ دعا پڑھتے: **اَللّٰھُمَّ لَكَ سَجَدْتُ**...... اے اللہ میں نے تیرے لیے سجدہ کیا اور تجھ پر ایمان لایا اور تیرے لیے اسلام قبول کیا اور میرے چہرے نے اس ذات کو سجدہ کیا جس نے اس کو پیدا کیا اور اس کو صورت دی اور اس کے کان کھولے اور اس نے آنکھ کھولی اللہ بہت برکت والا اور بہترین پیدا کرنے والا ہے پھر آخر تشہد اور سلام کے درمیان یہ دعا پڑھی: **اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ مَا قَدَّمْتُ** ...... اے اللہ میرے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دے اور ان گناہوں کو بخش دے اور ان گناموں کو معاف کر دے جن کو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے اور تو اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے آگے کر دے اور جس کو چاہے پیدا کر دے تیرے سوا کوئی معبود نہیں اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک پہلی دعا میں **فِیْ یَدَیْكَ** کے بعد یہ الفاظ ہیں اور برائی تیری طرف منسوب نہیں ہے اور ہدایت یافتہ وہی ہے جس کو تو نے ہدایت کی اور میں تیری قوت کے ذریعہ سے ہوں اور تیری ہی طرف رجوع کرنے والا ہوں نہیں ہے نجات اور بے پرواہی تیری ذات سے مگر تیری ہی طرف اور تو ہی برکت دینے والا ہے۔

تشریح: **وعن علی رضی اللہ عنه قال كان النبی صلی اللہ علیه وسلم اذا قام الی الصلٰوۃ)**: بقولِ بعض صلوٰۃ سے ''نفل'' مراد ہے۔ بوجہ روایت نسائی، جو فصل ثالث کے آخر میں آئے گی جس میں ''تطوعًا'' کے الفاظ ہیں اور روایت ابن حبان جس میں ''مکتوبہ'' کا لفظ ہے اس کے خلاف ہے اور دار قطنیؒ کی روایت جس میں ''فریضہ'' کا لفظ ہے۔ وہ بھی اس کے خلاف ہے مسلم وغیرہ کی روایت مطلق ہے اسی وجہ سے بعض نے جواب دیا کہ یہ ابتداء زمانہ کا عمل ہے۔ ابن امیر حارج کی شرح منیۃ میں اسی طرح ہے۔

وفی روایة كان اذا افتتح الصلٰوۃ كبر، ثم قال وجهت: لفظ ''انی'' کے حذف میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس سے مراد قراءت نہیں۔

وجھی: ''یاء'' کے فتح وسکون کے ساتھ، یعنی توجھت بالعبادۃ، یعنی میں نے اپنی عبادت خالص اللہ کے لئے کردی اخلاصِ عبادت للہ کے، بقولِ طیبیؒ کے، اور بقولِ بعض صرفت وجھی وعملی ونیتی یا اخلصت قصدی ووجھتی، نمازی کیلئے مناسب ہے کہ ان کی ادائیگی کے وقت غایت حضور واخلاص کے ساتھ کھڑا ہو ورنہ عملاً جھوٹا ہوگا۔ اور یہ سب سے قبیح جھوٹ ہے کیونکہ انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑا ہے جس سے کچھ مخفی نہیں۔

للذی فطر السموات والارض: یعنی اس کی طرف جس نے زمین وآسمان بغیر نمونہ کے پیدا کیے اور میں نے اس کے غیر سے اعراض کیا، اس لئے کہ وہ ذات جس نے ان چیزوں کو انتہائی خوش اسلوبی اور مضبوطی سے بنایا زیادہ لائق ہے کہ اس کی طرف جھکیں، قلوب تمام احوال میں اسی کی طرف رجوع کریں کہیں اور التفات نہ کریں ہمیشہ اس کی رضا جوئی میں رہیں، ''سموات'' جمع لائے اس کی وسعت یا طبقات مختلف ہونے کی وجہ سے یا اس لئے کہ اس کا وجود مقدم ہے یا جہت سماء کے شرف اور سکانِ سماء کی فضیلت کی وجہ سے یا صحیح قول کے مطابق ان آسمانوں کی فضیلت کی وجہ سے، ورنہ زمینیں بھی سات ہیں صحیح قول کے مطابق کیونکہ فرمانِ الٰہی: وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ط اور رب الارضین السبع بھی آیا ہے۔

حنیفا: ''وجہت'' کی ضمیر سے حال ہے یعنی ہر باطل دین سے دینِ حق کی طرف ثابت قدمی سے اور ''حنیف'' عرب کے نزدیک ملت ابراہیمی پر قائم شخص کہلاتا ہے۔ بقولِ بعض کے مراد مسلمان ہے۔ بقول طیبیؒ یعنی ادیانِ باطلہ اور غلط ذہنوں سے اعراض کرکے یہ ''حنف'' سے ہے جس کا معنیٰ مطلق میلان ہے پھر الحاد کے عکس کیلئے معروف ہوگیا، کیونکہ الحاد اصل میں مطلق مائل ہونے کیلئے ہے اور ''لحد'' بھی اسی سے ہے، عرف میں مشہور ہے: المیل من الحق الی الباطل، یا مائلا عن کل جھة وقصد الی الحضور والاخلاص فی عبادۃ فاطر السموات والارض، پس ''حنیفاً'' حال موکدہ ہے ''وجہت'' وجھی کیلئے، ابن حبان کی روایت میں ''حنیفاً'' کے بعد ''مسلماً'' کا اضافہ ہے، یعنی اللہ کے قضاء وقدر اور حکم کے سامنے فرمانبردار ومطیع بن کر۔

وما انا من المشرکین: اس میں تاکید اور اعراض ہے، اور بقول ابن حجرؒ یہ ''ماقبل'' کی تاکید ہے یا نیا جملہ ہے جب کہ نفی کو تمام ظاہر وباطن شرک کی طرف لوٹایا جائے مگر یہ صرف خواص کیلئے خاص ہے بعض مواقع میں۔

ان صلوتی: یعنی عبادت ونماز اس میں ماقبل کی علت ہونے کا شائبہ ہے۔ (ونسکی): یعنی دین، بعض کے قول کے مطابق عبادت وتقرب اور حج، ان دونوں کو جمع کیا اللہ کے فرمان: ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ ''تو اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھا کرو اور قربانی کیا کرو'' کی وجہ سے۔ (ومحیای): فتح وسکون کے ساتھ، یعنی زندگی۔ (ومماتی): سکون وفتح کے ساتھ، یعنی موت۔ (للہ): یعنی وہ خالق اور چلانے والا ہے، بقول بعض زندگی کے اعمال وخیرات کی نسبت موت کی طرف کی ہے، جیسے وصیت اور مدبر بنانا یا میری موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہے غیر کا تصرف اس میں نہیں، یا میری زندگی کی عبادت اور میری موت اللہ کیلئے ہے خالصۃً، یا میری زندگی کا مقصد خالص ذکر اللہ اور اس کا حضور وقرب اور اس کے امر، قضاء قدر پر رضا ہے یا میری موت وحیات اور بعد کے تمام احول اللہ کیلئے ہیں۔ (رب العلمین): بدل یا عطف بیان ہے یعنی ماسواء اپنے تمام کا مالک ومربی وہی ہے، صحیح قول کے مطابق۔ (لا شریک له): ذات وصفات وافعال میں۔ (وبذالك): یعنی توحید کامل جو قول

واعتقاد میں اخلاص کو بھی شامل ہو۔ (امرت وانا من المسلمین): یعنی فرمانبردار مطیع، ابن حجرؒ فرماتے ہیں عنقریب اول المسلمین والی روایت آرہی ہے اور آپ علیہ السلام کبھی اس طرح فرماتے کبھی دوسری طرح، کیونکہ آپ علیہ السلام اس اُمت کے پہلے مسلمان ہیں بلکہ یوں بھی آیا ہے کہ آپ ﷺ کا نور خلقت پیدائش مخلوق سے بہت پہلے وجود میں آیا۔ آپ ﷺ کے سواء کیلئے سنت صرف اولیٰ کہنا ہے الا یہ کہ قرآنی آیت مقصود ہو، پھر اذکار و دعاؤں میں مرد و زن کے درمیان کوئی فرق نہیں تغلیب یا ارادہ اشخاص پر حمل کرتے ہوئے۔ (اللھم): بمعنی یا اللہ، ''میم'' حرفِ نداء کا بدل ہے اسی وجہ سے دونوں شعر کے علاوہ میں جمع نہیں ہوتے۔ (انت الملك): مِلک ومُلک اسی کا ہے۔ (لا الہ الا انت): یعنی آپ الوہیت میں منفرد ہیں۔ (انت ربی): تخصیص بعد التعمیم ہے۔ بقولِ میرکؒ کے ''للہ رب العٰلمین'' میں اللہ تعالیٰ کیلئے الوھیۃ مطلقہ کا اثبات ہے حصر کے طریقہ پر اس کے لئے ملک ثابت کرنے کے بعد، اسی طرح ''انت الملك'' میں بھی، اس لئے کہ خبر کا معرف ''بالام'' ہونا اس پر دالّ ہے۔ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرتے ہوئے فرمانِ الٰہی: ﴿مَلِكِ النَّاسِ۔ اِلٰهِ النَّاسِ﴾ کے مطابق، اور ''انت ربی'' میں ربوبیت کو مؤخر کرنے کی وجہ صفت کی تخصیص، اور اپنی طرف نسبت کے ساتھ تقیید اور اس کو اطلاق سے خارج کرنے کیلئے ہے۔ (وانا عبدك): خدا تعالیٰ کیلئے ربوبیت اور اپنے لئے عبودیت کا اعتراف ہے۔

ظلمت نفسی: یعنی ذکر سے غفلت یا غیر اللہ کی محبت کی وجہ سے۔ (واعترفت بذنبی): یعنی خلاف اولیٰ عمل یا اپنے وجود کی وجہ سے جو کہ گناہ کی جگہ ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے وجودك ذنب، یعنی تیرا وجود گناہ ہے۔ لا یقاس به ذنب اس کے گناہ کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

فاغفرلی ذنوبی: یعنی میری کوتاہیاں۔ (جمعا انه): کسرہ کے ساتھ نیا جملہ، اس میں تعلیل کے معنی ہیں۔ ایک نسخہ میں فتح کے ساتھ ہے اور ضمیر شان ہے۔

لا یغفر الذنوب: یعنی تمام۔ (الا انت): اس لئے کہ تو غفار و غفور ہے۔ (واھدنی): یعنی راہنمائی کر، توفیق دے، ثابت رکھ، اور پہنچا۔

لا حسن الاخلاق: یعنی عبادت اور اخلاق ظاہرہ و باطنہ میں۔ (لا یھدی لا حسنھا الا انت): اس لئے کہ آپ ہادی مطلق ہیں اور مخلوق کا عجز محقق ہے۔ (واصرف عنی): یعنی دور فرما اور حفاظت فرما۔

سیّئھا: یعنی بُرے اخلاق۔ (لا یصرف عنی): چہ جائیکہ دوسروں سے۔ (سیھا الا انت): اس لئے کہ کوئی اور قادر نہیں۔

لبیك: یعنی میں ہمیشہ ہمیشہ تیری اطاعت کرتا رہوں گا، بقولِ بعض کے ہمیشہ قائم رہنا ہے، البّ بالمکان سے جس کا معنی اقامت کرنا ہے ایک قول یہ ہے: اتوجه الیك، مراد رخ کرنا، قولِ عرب داری تلب دارك سے، یعنی سامنے، پس حاصل یہ ہے کہ ''لب یا ''الب'' کا مصدر ہے زوائد کے حذف کے بعد، مضاف ہے مخاطب کی طرف اور ''نون'' اضافت کی بناء پر حذف ہوگئی اور تثنیہ سے تکرار مراد ہوتا ہے جیسا کہ فرمانِ الٰہی میں ہے ﴿ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ﴾ یعنی بار بار یکے بعد دیگرے۔

وسعدیك: یعنی کمر بستہ رہوں ہمیشہ، یا سعادت مند ہوں تیری طاعت اور تیرا حکم بجا لا کر بار بار۔ **(والخیر کله):** اعتقادی، قولی، فعلی۔ **(فی یدیك):** یعنی قدرت، ایک قول کے مطابق وسعت طول اور کثرتِ فضل، یا قدرتِ ارادہ کی طرف کنایہ ہے اسی لئے کہ کوئی چیز ان کے بغیر نہیں ہو سکتی، بقولِ طیبیؒ کے یعنی سب کچھ تیرے نزدیک محفوظ مقبوض شئی کی طرح ہے تیرے فیصلہ اس میں جاری ہوتا ہے جب تیرے حکم کے بغیر غیر سے نہیں ہو سکتی۔

والشر لیس الیك: یعنی بذریعہ شر تیرا قرب نہیں مل سکتا، یا نسبت نہیں ہو سکتی تیری طرف، بلکہ انسانوں کی طرف ہو گی یا تو اس کا فیصلہ نہیں کرتا من حیث الشر بلکہ اس میں غالب فوائد ہوتے ہیں پس فیصلہ ذاتاً خیر کا ہوتا ہے اور شر اس میں عرضاً داخل ہوتا ہے، بقولِ طیبیؒ معنی یہ بیان کیا جاتا ہے کہ شر خدا کی طرف نسبت سے شر نہیں اور مخلوق کی طرف نسبت سے شر ہے، یا شر خدا کی طرف چڑھتا نہیں کیونکہ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ﴾ [فاطر: ۱۰] یعنی پاک کلمات۔ بقول بعض شر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں ہوتی حسن ادب کی وجہ سے اسی وجہ سے یا خالق الخنازیر نہیں کہا جاتا اگرچہ خنزیر کا خالق وہی ہے اور قولِ ابراہیم علیہ السلام کی طرح ہے: ﴿وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ﴾ [الشعرآء: ۸۰] مرض کی نسبت اپنی طرف کی اور شفاء کی اس کی طرف، اور خضر علیہ السلام نے عیب کی نسبت اپنی طرف کی اور نسبِ رحمت اللہ کی طرف، چنانچہ فرمایا، ﴿فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ یَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا﴾ [الکهف: ۸۲] اور اس میں تعلیم آداب کی طرف راہنمائی ہے جیسا کہ انہوں نے کہا اسی قبیل سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾ [الفاتحة: ۷] ''ان لوگوں کے راستے جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا نہ ان کے جن پر غصے ہوتا رہا، اور نہ گمراہوں کے'' اس میں غور و فکر کرو کیونکہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے، میں نے کسی کو یہ مسئلہ بیان کرتے نہیں دیکھا۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ معتزلہ نے بندہ کی طرف شر کی نسبت کی دلیل اسی کو بنایا ہے کیونکہ وہ جار کا متعلق منسوباً مقدر مانتے ہیں اور یہ سینہ زوری ہے اس لئے منسوباً کی طرح اس کی تقدیری عبارت، مقرباً، مضافا، صاعداً یا منوباً ہو سکتی ہے لیکن مراد وہ نہیں جو وہ سمجھے ہیں، مراد یہ ہے کہ شر صرف اللہ کی طرف منسوب نہیں کیونکہ مقتضی ادب ہے کہ حقیر چیزوں کی نسبت مستقل اس کی طرف نہ کی جائے بلکہ تبعاً کرنی چاہیے۔

انا بك: یعنی تیری پناہ تجھ پر اعتماد اور تیرا سہارا چاہتا ہوں۔ **(والیك):** توجہ انابت، التجاء، رجوع تیری طرف کرتا ہوں میرا معاملہ تیرے حوالہ ہے کیونکہ تو ہی مبدی اور منتہیٰ ہے۔ بقولِ بعض استعانت و توجہ مراد ہے بقول بعض معنی یہ ہے کہ تجھ پر یقین کرتا ہوں میرا علم تیری توفیق سے ہے اور میری التجاء کی نسبت تیری طرف ہے یا میری موت و حیات تیری قبضہ میں ہے اور میرا لوٹنا تیری طرف ہے یا وجود و توفیق تجھ سے ہے اور تیری طرف زاری ہے اور تجھ سے پناہ چاہتا ہوں۔

تبارکت: یعنی تو عظمت و بزرگی والا ہے یا بابرکت یا کثیر خیر والا ہے، اور اصل میں یہ کلمہ دوام کیلئے ہے۔ **(وتعالیت):** یعنی وہم اور عقل کے تصور سے، اور صرف اللہ تعالیٰ کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔ بقولِ ابن حجرؒ و میرکؒ کے۔

استغفرك: یعنی مغفرت طلب کرتا ہوں۔ **(واتوب):** بقیہ زندگی میں گناہوں سے توبہ کرتا ہوں، متوجہ ہو کے۔ **(الیك):** موت تک توفیق اور ثابت قدمی کے ساتھ۔

واذا رکع قال اللهم لك رکعت وبك آمنت: تقدیم جار میں تخصیص کی طرف اشارہ ہے۔ **(ولك اسلمت):**

یعنی عاجزی وانکساری، یا خالص تیری طرف منہ کیا یا تیرے سامنے اپنے کو ذلیل کیا اور خواہشات چھوڑی۔ (خشع): یعنی جھکنا، تواضع، سکون۔ (لك سمعی): پس تیرا حکم سنوں گا۔ (وبصری): تیری حکم کے مطابق دیکھوں گا، اور یہ دونوں تیرے لئے خاص ہیں، اس لئے کہ اکثر آفات ان کی وجہ سے ہیں جب دونوں تابع ہوں گی تو وساوس کم ہوں گے، بقولِ ابن الملکؒ یا تحصیل علم نقل وعقل انہی سے ہے اور ''سمع'' کو مقدم اس لئے کیا کہ مدار شروع پر ہے۔ جان لے کہ بعض فضلاء نے ''کان'' کو افضل کہا ہے، ابن قیم نے اس کی نسبت امام شافعیؒ کی طرف کی ہے اور بقولِ بعض یہ اکثر فقہاء کا قول ہے، اور بعض نے آنکھ کو افضل کہا اور یہ قول اصحابِ حنفیہ کی طرف منسوب ہے اور قتیبہ اور اکثر متکلمین سے منقول ہے اور بعض محققین نے توقف کیا ہے جیسے امام رازی وغیرہ اور امام نیشاپوری نے فرمایا ہے تفصیل میں تطویل (فضوال) ہے۔

ومخی: تیری طرف سے جمع ہے، اس کے قائل ابن حجرؒ ہیں اور اس میں تامل ہے۔ (**وعظمی وعصبی**): ان کا قیام وحرکت طاعت میں حرف تیری وجہ سے ہے۔

فاذا رفع راسه: یعنی رکوع سے۔ (**قال**): یعنی اٹھتے وقت تسمیع اور سیدھے کھڑے ہو کر تحمید۔ (**اللهم ربنا لك الحمد**): صحیح روایت میں ''**ولك الحمد**'' ہے اور پہلے گزر چکا ہے کہ یہ افضل ہے کیونکہ یہ زیادتی پر دالّ ہے جس پر حذف دالّ نہیں۔ (**ملٔ السموات**): نصب کے ساتھ مشہور ہے (جیسا کہ شرح مسلم میں ہے) اور مصدر محذوف کی صفت ہے اور بقولِ بعض حال ہے یعنی آسمان اس کے اجزاء سے بھر جائے جب کہ اس کا جسم مانا جائے اور مرفوع ہونے کی صورت میں الحمد کی صفت ہوگی۔ (**والارض وبينهما وملء ماشئت من شئ بعد**، بقولِ طیبیؒ یعنی آسمان وزمین کے بعد اور بقولِ ابن حجرؒ **بعد ذالك** (اس صورت میں شئی کی صفت ہوگی) یعنی کرسی وعرش اور اس کے اوپر اور زمینوں کے نیچے کی اشیاء جن کا علم ان کے خالق وموجد کو ہے اور اظہر یہ ہے کہ اوپر نیچے کی جسم دار چیزیں ہیں۔ بقولِ ابن ملکؒ یہ اللہ کی حمد کی انتہاء ہے کیونکہ اس میں موجود، معدوم اور غیب ممکن سب کے برابر حمد ہوگئی اور بقولِ میرکؒ یہ مکمل کوشش کے بعد بھی تعریف کے حق ادا نہ کر سکنے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ آپ علیہ السلام نے آسمان وزمین اور ان کے درمیان بھر حمد بیان کرنے کے بعد معاملہ مشئیت الٰہی پر چھوڑ دیا اور اس کے ورے حمد کی کوئی انتہاء نہیں اسی مرتبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ''احمد'' کہلانے کا مستحق ہے جس تک مخلوق کی رسائی نہیں ہو سکی۔

واذ سجد قال اللهم لك سجدت وبك آمنت ولك اسلمت سجد وجهی: دو طرح پڑھا جا سکتا ہے، یعنی عاجزی وذلت اور فرمانبرداری کی۔ (**للذی خلقه**): یعنی عدم سے وجود دیا۔ (**وصوره**): بہترین صورت دی۔ (**وشق سمعه**): یعنی سماعت کا راستہ، کیونکہ قوت کان میں نہیں بلکہ اس کے سوراخ میں ہے۔ (**وبصره تبارك الله**): یعنی بلندی وعظمت والا، پس روایت میں ''فاء'' نہیں ہے۔ (**احسن الخالقين**): یعنی صورت بنانے والے اور اندازہ لگانے والے، کیونکہ خالق صرف وہی ذات ہے جو وجود دینے اور مدد کرنے میں یکتا ہے اور ماسواء اللہ کے باقی ہے صرف صورتوں کو رنگ دیتے ہیں اس میں حقیقی تخلیق بالکل نہیں ہوتی اور ساتھ ہی ہر صانع اور اس کی صنعت کا خالق بھی اللہ ہی ہے۔ **والله خلقكم وما تعملون، والله خالق كل شئ**۔

ثم يكون: یعنی رکوع سجود سے فراغت کے بعد۔ (**من آخر ما يقول بين التشهد والتسليم اللهم اعفرلی ما**

قدمت): خطائیں۔(وما اخرت): عمل یعنی جو کمی رہ گئی، بقول طیبیؒ کے اور بقول بعض نبوت سے قبل اور بعد، ایک قول ہے کہ وہ گناہ جن کے کرنے کا تو نے میرے لیے فیصلہ کیا اور وہ تیرے علم میں ہیں۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اگر مستقبل میں گناہ ہو وہ بھی معاف فرما۔(وما اسررت): یعنی مخفی طور پر۔(وما اعلنت): تخصیص بعد التعمیم ہے جیسا کہ اگلے جملہ میں اس عکس ہے۔(وما اسرفت): یعنی حد سے تجاوز کی، یہ ہر قسم کے گناہ ذکر کر کے طلبِ مغفرت میں مبالغہ ہے۔(وما انت اعلم به منی): یعنی وہ گناہ جن کی تعداد و حکم میں نہیں جانتا۔

انت المقدم: بعض بندوں کو توفیق اطاعت کے ساتھ۔(وانت المؤخر): یعنی بعض کو مدد سے محروم کر کے، یا تو جسے چاہے کمالِ مراتب اور جلال کی انتہاء کو پہنچا دے اور جسے چاہے بلندی سے پستی میں پھینک دے، پس ہمارا سوال ہے کہ ہمیں ان میں سے بنا جن کو تو نے دین کی بلندی پر پہنچایا اور پناہ مانگتے ہیں اس سے کہ تو ہمیں یقین کے راستہ سے پیچھے پھینک دے، یا مطلب یہ ہے کہ تو بلند کرنے والا، اور گرانے والا ہے، اور عزت و ذلت تیرے ہاتھ میں ہے۔

لا الله الا انت: پس تیرے سواء مطلوب و محبوب کوئی نہیں۔(رواہ مسلم)

بقولِ میرکؒ کے اس کو چاروں ائمہ اور ابن حبان نے صحیح میں روایت کیا ہے اس میں "حنیفًا مسلمًا" زائد ہے۔

وفی روایة للشافعی الشر لیس الیك: اس کلام میں اس طرف راہنمائی ہے کہ ثناء الٰہی میں آدب کے الفاظ استعمال کیے جائیں، اور اللہ کی طرف اچھی چیزوں کی نسبت کی جائے نہ کہ برائیوں کی اور اللہ کی قدرت سے کسی شئی کی نفی مقصود نہیں اسی طرح اثبات شئی کسی اور کیلئے مقصود نہیں۔ اس کو سید جمالؒ نے نقل کیا ہے قاضی سے۔ میرکؒ کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾[الاعراف: ۱۸۰] "خدا کے سب نام اچھے ہی ہیں تو اس کو اس کے ناموں سے پکارکرو۔" اسی قبیل سے ہے۔

والمهدی من هدیت: یعنی ہدایت یافتہ وہی ہے جسے تو ہدایت دے اور گمراہی سے محفوظ رکھے، اور گمراہ وہی ہے جسے تو گمراہ کرے (اور صرف ہدایت کا ذکر) مراعاتِ آدب کی وجہ سے ہے یا صرف مد مقابل کے بیان پر اکتفاء کے باب سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ﴾[النحل: ۸۱] لہٰذا معتزلہ کی دلیل نہیں بن سکتی اور کیسے بنے حالانکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں ﴿يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [النحل: ۹۳] "لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے"۔

انابلك: یعنی پالیا۔(والیك): میرا منتہاء یعنی تو مبدأ اور منتہیٰ ہے بقول طیبیؒ کے لا منجأ، بغیر لمبا کیے اور ابن حجرؒ نے عجیب بات کہی ہے کہ: لا منجا مقصود ہے لیکن اس کو "مد" اور "قصر" کے ساتھ پڑھنا درست نہیں ان کا حق یوں کہنا تھا کہ ہمزہ درست نہیں نہ "مد" کے ساتھ نہ "قصر" کے۔ اور یہ مصدر میمی ہے یا ظرفِ مکان ہے یعنی نجات کی جگہ کوئی نہیں۔(منك): یعنی تیرا عذاب۔(ولا ملجا): اصل میں ہمزہ کے ساتھ ہے، بعض نرمی سے ہمزہ اداء کرتے ہیں تاکہ "منجا" کے مشابہہ ہوجائے یہ سید جمال الدین نے قاضی سے نقل کیا ہے، یعنی بلاؤں اور مصائب کے نزول کے وقت جائے پناہ کوئی نہیں۔(الا الیك): اس لئے کہ تو ہی غمزدہ کا غم دور کرنے والا، پناہ طلبوں کی پناہ ہے یا مراد یہ ہے کہ طالب کیلئے جائے فرار و نجات اور پناہ تیرے سوا کوئی

نہیں اور یہ معنی اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ففروا الی اللّٰہ۔ وتبتل الیہ تبتیلا﴾ سے لیا گیا ہے۔

تبارکت: ایک نسخہ میں ''تعالیت'' ہے یعنی تو کسی کی طرف احتیاج سے بلند ہے، ہاں ایسا کوئی نہیں جو ہر معاملہ میں تیرا محتاج نہ ہو۔

قیمتی وظیفہ

۸۱۴: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلًا جَاءَ فَدَخَلَ الصَّفَّ وَقَدْ حَفَزَهُ النَّفْسُ فَقَالَ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ فَلَمَّا قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَلَاتَهٗ قَالَ اَيُّكُمُ الْمُتَكَلِّمُ بِالْكَلِمَاتِ فَاَرَمَّ الْقَوْمُ فَقَالَ اَيُّكُمُ الْمُتَكَلِّمُ بِالْكَلِمَاتِ فَاَرَمَّ الْقَوْمُ فَقَالَ اَيُّكُمُ الْمُتَكَلِّمُ بِهَا فَاِنَّهٗ لَمْ يَقُلْ بَأْسًا فَقَالَ رَجُلٌ جِئْتُ وَقَدْ حَفَزَنِي النَّفْسُ فَقُلْتُهُمَا فَقَالَ لَقَدْ رَأَيْتُ اِثْنَيْ عَشَرَ مَلَكًا يَبْتَدِرُوْنَهَا اَيُّهُمْ يَرْفَعُهَا۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٤١٩ حديث رقم (١٤٩۔٦٠٠) وأخرجه أبوداوٗد في السنن ١/٤٨٥ حديث رقم ٧٦٣ وأخرجه النسائي في السنن ٢/١٣٢ حديث رقم ٩٠١۔ وأخرجه أحمد في المسند ٣/١٠٦۔

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن ایک آدمی آیا اور نماز کی صف میں شامل ہو گیا اس کا سانس پھولا ہوا تھا اس نے کہا: اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ۔ جب رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ تم میں سے کس نے یہ کلمات کہے سب لوگ خاموش رہے رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ پوچھا کہ تم میں سے کس نے یہ الفاظ کہے پھر بھی کسی نے جواب نہیں دیا رسول اللہ ﷺ نے تیسری مرتبہ پوچھا کہ تم میں سے کس نے یہ کلمات کہے سن لو جس نے یہ الفاظ کہے تھے اس نے کوئی بری بات نہیں کہی ایک آدمی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! جب میں آیا تو میرا سانس پھولا ہوا تھا میں نے یہ کلمات کہے آپ نے فرمایا میں نے دیکھا کہ فرشتے جلدی کر رہے تھے کہ ان کلمات کو کون پہلے لے جائے اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **وعن انس ان رجلا جاء فدخل الصف وقد حفزه:** ''فاء'' اور ''زاء'' کے ساتھ یعنی سانس پھول رہا تھا۔ **(النفس):** یعنی نماز کیلئے جلدی چلنے کی وجہ سے سانس کی حرکت تیز تھی، مفاتیح میں اسی طرح ہے اور تورپشتیؒ کے بقول دوڑ کر آیا ''حفز'' کسی چیز کو پیچھے سے حرکت دینے کو کہتے ہیں مراد سانس تیز چلنا ہے، گویا کہ وہ نماز کی طرف سبقت کرنے کی وجہ سے سانس تیز تیز لے رہا تھا۔ پس کلام تورپشتی میں تو کوئی اشکال نہیں البتہ طیبیؒ کا کلام یہ ہے کہ وہ جماعت فوت ہونے کے خوف سے تیز بھاگ رہا تھا۔ تو یہ حدیث کے منافی ہے فرمایا جب تم نماز کیلئے آؤ تو دوڑے نہ آؤ بلکہ سکون وقار سے چلو جو مل جائے پڑھ لو جو رہ جائے بعد میں پڑھ لو، ابن حجرؒ نے اس کا جواب دیا ہے جو ہمارے بعض ائمہ کا مذہب ہے کہ کراہت اس شخص کیلئے ہے جس کو بغیر دوڑے جماعت مل جانے کا علم ہو البتہ جس کو نہ ملنے کا علم ہو اس کے لئے مکروہ نہیں، پھر فرمایا کہ راجح ہمارے نزدیک یہی کہ اس میں کوئی فرق نہیں، اور علم کے باوجود آپ علیہ السلام کا انکار نہ کرنا جواز پر دلالت کرتا ہے نہ کہ نفی کراہت پر اور یا کلام غیر جمعہ

میں ہے البتہ جمعہ کے لئے سعی کرنا واجب ہوگا جب کہ سعی کرنے پر ہی جمعہ کا ملنا موقوف ہو اور جمعہ کی نماز کا ملنا دوسری رکعت کے رکوع کے ملنے سے ہی شمار ہوتا ہے۔ **(فقال)**: یعنی آدمی نے۔ **(الله اکبر، الحمد لله حمدا کثیرا)**: بقولِ طیبیؒ کے فعل مضمر کی بناء پر منصوب ہے جس پر لفظ ''الحمد'' دلالت کرتا ہے اور احتمال یہ بھی ہے اس سے بدل ہو اپنے محل پر رہتے ہوئے، اور ''مطیبا'' اس کی صفت ہے یعنی ریاء وغیرہ سے پاکی، اور ''مبارکا'' برکت اور خیر کثیر کا تقاضا کرتا ہے۔

ابن الملکؒ بیان کرتے ہیں **حمدا جعلت البرکة فیه** یعنی ایسی ''حمد'' جس میں انتہائی زیادہ برکت ہو اور بقولِ بعض جوذات وانجام کے اعتبار سے دائمی مبارک ہو۔

فلما قضی رسول الله صلی الله علیه وسلم: یعنی اداء کر لی۔ **(صلوته قال ایکم المتکلم بالکلمات)**: یعنی ابھی سنے گئے کلمات۔ **(فارم القوم)**: بقولِ محی السنۃ کے ''راء'' کے فتح اور ''میم'' کی تشدید کے ساتھ، یعنی خاموش رہے، نہائی میں اسی کو مشہور کہا ہے۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں مسلم شریف کے علاوہ میں ''زاء'' مفتوحہ اور ''میم'' کی تخفیف کے ساتھ ہے، الازم سے مشتق ہے یعنی رُکنا، معنی کے اعتبار سے یہی صحیح ہے ایک نسخہ میں اسی طرح ہے، اور ابن حجرؒ کا ''زاء'' کے فتح اور ''میم'' کے تشدید کے ساتھ کہنا خطا ہے، اور غیر مسلم کی ایک روایت میں ''راء'' مفتوحہ اور تشدید ''میم'' کے ساتھ ہے الارم سے، بمعنی ''رُکنا'' (اھ)۔

فقال ایکم بمتکلم بها: جان لے کہ شیخ عفیف الدین کارزونیؒ کے نسخہ میں ''فارم القوم'' ایک مرتبہ ہے اور جو ''**ایکم المتکلم بها**'' کے الفاظ ہیں اور نسخہ شیخ نورالدین ایجی میں ''**بها**'' کے بدلے، ''**کلمات**'' ہے اور شیخ عبدالرحمٰن کے نسخہ کے الفاظ یوں ہیں **ایکم المتکلم بالکلمات**، اور ''فارم القوم'' دو مرتبہ اور تیسری مرتبہ **ایکم المکلم بها** مذکور ہے۔

فانه لم یقل باسا: بقول باساً مفعول ہوسکتا ہے یعنی قابلِ مواخذہ بات نہیں کی، اور مفعول مطلق بھی یعنی **ما قال قولا شدیدا**۔

فقال رجل: ظاہر فقال الرجل ہے۔ **(جئت وقد حفزنی النفس فقلتها)**: یعنی کلمات۔ **(فقال: لقد رأیت اثنی عشر ملکا یبتدرونها)**: یعنی اس کا ثواب، ابن کہتے ہیں کہ لکھنے اور اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے تھے ان کے عظیم بلند قدر ہونے کی وجہ سے اور مقدار کی تخصیص پر ایمان لانا اور (حکمت) اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اور ممکن ہے کہ عددِ کلمات کی طرف اشارہ ہو کیونکہ کلمات بھی بارہ ہیں، واللہ اعلم۔

ایهم یرفعها: مبتداء اور خبر ہے اور جملہ محل نصب میں ہے یعنی اٹھانے کیلئے سبقت اور جلدی کرتے تھے۔ ابوالبقاء کا قول ہے کہ قول باری تعالیٰ: ﴿إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ﴾ [آل عمران: ٤٤] ''اور جب وہ لوگ اپنے قلم (بطور قرعہ) ڈال رہے تھے کہ مریم کا متکفل کون بنے'' میں ''**ایهم**'' مبتداء ہے اور خبر موضعِ نصب میں ہے یعنی **یقترعون ایهم**، قرعہ ڈالنا پس عامل فعل محذوف ''**یقترعون**'' ہے جس پر ''**یلقون**'' دالّ ہے بحوالہ طیبیؒ، بقولِ بعض مراد یہ ہے کہ پہلے کون اٹھائے۔

(رواہ مسلم)

الفصل الثانی:

تکبیر تحریمہ کے بعد ثناء پڑھی جائے

۸۱۵: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا افْتَتَحَ الصَّلٰوةَ قَالَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَآ اِلٰهَ غَيْرُكَ۔ (رواہ الترمذی وابوداود)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۴۹۱ حدیث رقم ۷۷٦ وأخرجه الترمذی فی السنن ۲/۱۱ حدیث رقم ۲۴۳ وقال حدیث عائشة لانعرفه إلا من هذا الوجه وحارثة قد تکلم فیه من قبل حفظه ۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۲٦۵ حدیث ۸۰٦۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ ...... اے اللہ تو پاک ہے اور ہم تیری پاکی تیری تعریف کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ تیرا نام برکت والا ہے۔ تیری شان برتر اور بلند ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: **عن عائشه رضی الله عنها قالت کان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا افتتح الصلٰوة:** یعنی تکبیر کے ساتھ۔

قال سبحانك اللهم وبحمدك: یعنی توفیق دے بقولِ ابہریؒ، اور ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ ''سبحان'' اسم قائم مقام مصدر ہے اور وہ تسبیح ہے اور منصوب ہے فعل مضمر کی وجہ سے، تقدیری عبارت **اسبحك تسبيحًا** ہے یعنی تیری ہر نقص اور بُرائی سے پاکی بیان کرتا ہوں، اور مخلوقات کے اوصاف جو تیری شان کے مناسب نہیں یعنی اہل وعیال، اولاد سے دور خیال کرتا ہوں اور مطلب یہ ہے کہ میرا اعتقاد ہے کہ تو ہر نامناسب سے بَری اور ہر اس چیز سے منزہ ہے جو تیرے جلال ذاتی اور کمال صفاتی کے شایانِ شان نہیں اور بقول بعض تقدیری عبارت یہ ہے: **اسبحك تسبيحًا تسبيحا ملسبا و مقترنا بحمدك**، پس ''باء'' ملابست کیلئے اور ''واؤ'' زائدہ ہے اور بعض نے ''واؤ'' ''صبغی مع کہا ہے، یعنی **اسبحك مع التلبس بحمدك**، اور اس میں ضمناً صفات سلبیہ کی نفی اور نعوت ثبوتیہ کا اثبات ہو گیا۔ یا عبارت **بحمدك سبحتك**، ہے یعنی میں تیری تنزیہہ کا معتقد ہوں اس حال میں کہ تیری کے ساتھ ملتبس ہوں یا تیری ثناء جمیلہ کے سبب میرا اعتقاد تیری تنزیہہ کا ہے، اور مصدر محذوف کی صفت بنانا بھی صحیح ہے یعنی: **اسبحك تسبيحا مقرونا بشكرك**، اس لئے کہ مکلّف کی طرف سے ہر حمد طرح طرح کی نعمتوں کو کھینچتی اور توفیق الٰہی کو ساتھ لیتی ہے اور اسی وجہ سے حضرت داؤد علیہ السلام سے مروی ہے: **یا رب کیف اقدر ان اشکرك وانا لا اقوم بشکر بنعمتك الا بنعمتك** ''یعنی اے رب میں تیرے شکر پر قادر نہیں اور تیری نعمت کا شکر تیری نعمت کے بغیر نہیں کر سکتا'' اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ شکر سے عجز ظاہر کرنا شکر ہے یا عبارت ہے: **لك الحمد علی توفیقك ایای علی تسبیحك**۔ اور علامہ خطابیؒ کہتے ہیں مجھے ابن خلّاد نے بتایا کہ میں نے زجاج سے **وبحمدك** کے ''واؤ'' کے بارے میں

پوچھا انہوں نے جواب دیا اس کا مطلب یہ ہے: سبحانك اللهم وبحمدك سبحتك، اس میں دو احتمال بیان کیے گئے ہیں اول یہ کہ ''واؤ'' حالیہ ہے دوسرا یہ کہ جملہ فعلیہ کا جملہ فعلیہ پر عطف ہے اس وقت تقدیری عبارت یوں ہوگی: انزهك تنزيها واسبحك تسبيحا مقيدا بشكرك، دونوں صورتوں میں ''اللهم'' جملہ معترضہ ہے، اور ''وبحمدك'' کی ''باء'' سببیہ اور جار فعل مقدر سے متعلق ہے یا الصاق کیلئے ہے اور جار مجرور فاعل سے حال ہے، یہ طیبیؒ کا قول ہے۔

وتبارك اسمك: یعنی تیرا نام بڑی برکت والا ہے کیونکہ تمام خیریں تیرے نام کے ذکر سے وجود میں آتی ہیں اور بقول بعض تعاظم ذاتك یا وہ حقیقی معنیٰ پر ہے کیونکہ جب عظمت اسماء کیلئے ثابت ہے تو ذات کیلئے بدرجہ اولی ہوگی اور اس کی نظیر فرمانِ باری: سبح اسم ربك الاعلى ہے۔ وتعالٰى جدك: یعنی عظمت یعنی انسانوں نے تیری معرفت وعبودیت کا حق ادا نہیں کیا۔ اور بقولِ میرکؒ یہ تفاعل ہے ''علوّ'' سے یعنی تیری عظمت غیر سے انتہائی بلند وبرتر ہے اور ابن حجرؒ کے مطابق معنی یہ ہے کہ خرچ کرنے سے کم ہونے یا کسی کی مدد ونصرت کی احتیاج سے تو انتہائی مستغنی ہے۔ (ولا اله غيرك، رواه الترمذی وابوداؤد)

۸۱۶: وَرَوَاهُ ابْنِ مَاجَةِ عَنِ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَقَالَ التَّرمِذِیُ هٰذَا حَدِیْثُ لَا نُعْرِفُهٗ اِلَّا مِنْ حَارِثَةِ وَقَدْ تُکُلِّمَ فِیْهِ مِنْ قِبَلِ حِفْظِهٖ۔

وأخرجه ابن ماجة فی السنن عن أبی سعید الخدری ۱ / ۲٦٤ حدیث رقم ۸۰٤

ترجمہ: ''اور امام ابن ماجہؒ نے اس حدیث کو حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا ہے۔''

اسنادی حیثیت: اور ترمذی نے کہا ہے اس حدیث کو ہم سوائے حارثہ راوی کے نہیں جانتے اور اس میں قوتِ حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے کلام کیا گیا ہے۔

راویٔ حدیث:

حارثہ بن ابی الرجال۔ یہ حارثہ بن ابی الرجال ہیں جنہوں نے اپنے والد ''ابوالرجال'' سے اور اپنی دادی ''عمرہ'' سے روایت حدیث کی ہے ان سے ابن نمیر یعلی بن عبید اور کچھ لوگوں نے حدیث کی روایت کی ہے۔ محدثین نے ان کو ''ضعیف'' کہا ہے۔

تشریح: ابن ماجه عن ابی سعيد وقال الترمذی هذا هديث لانعرفه الا من حارثه: یعنی ابن ابی الرجال۔

وقد تکلم: یعنی طعن کیا۔ (فيه): یعنی حارثہ۔ (من قبل حفظه): یعنی عدالت میں نہیں، بقول تورپشتیؒ یہ حدیث حسن اور مشہور ہے اور خلفاء میں سے حضرت عمرؓ نے اس کو لیا ہے اور مسلم شریف میں اس کی تخریج ہوئی ہے حضرت عمرؓ سے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ فقہاء صحابہؓ نے اس کو دلیل بنایا ہے اور بہت سے تابعین کا یہی مذہب ہے اور علماء میں سے امام ابوحنیفہؒ وغیرہ نے اس کو اختیار کیا ہے، پس یہ حدیث ضعف کی طرف منسوب کیسے ہوسکتی ہے حالانکہ بڑے بڑے علماء حدیث کا یہ مذہب

ہے جیسے سفیان ثوری، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ؟ البتہ جو کلام ترمذیؒ نے ذکر کیا ہے تو وہ ان کی اپنی ذکر کردہ حدیث میں ہے اور انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ اس کی اسناد من کل الوجود قابل مواخذہ ہیں باوجود یہ کہ جرح التعدیل اختلاف کی بنیاد پر اقوام کے حق میں ہوتا رہتا ہے، چنانچہ ایک راوی چند ائمہ کے نزدیک ضعیف ہوتا ہے اور چند دوسروں کے نزدیک ثقہ، اور اس حدیث کو چوٹی کے علماء حدیث نے روایت کیا اور دلیل بنایا ہے اور امام ابوداؤدؒ نے جامع میں اپنی سند کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے اور وہ سند حسن اور اس کے رجال پسندیدہ ہیں، پس معلوم ہوا کہ امام ترمذیؒ کا کلام ان کی اپنی ذکر کردہ سند میں ہے۔ **کذا فی شرح الطیبی** اور اس حدیث سے بعد والی احادیث کی طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ دُعا افتتاح نماز کی سنت ہے اور مالکؒ کا اس کی نفی کرنا اس وجہ سے کہ ''مسیئ صلوٰۃ'' والی حدیث میں اس کا ذکر نہیں، نیز اس وجہ سے کہ حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ وابوبکر وعمر ؓ نماز فاتحہ سے شروع کرتے تھے بڑی عجیب بات ہے اس لئے کہ ان کے پاس ان احادیث میں سے کسی کا جواب نہیں، اور مسیئ صلوٰۃ کی خبر میں بعض فرائض ونوافل کا ذکر ہے صرف، اور خبر کا معنی یہ ہے کہ قراءت فاتحہ سے شروع کرتے تھے، جیسا کہ روایت سابقہ میں اس کی تصریح ہے بلکہ اگر ایک صحابی اس کی نفی کی تصریح بھی کر دیتا پھر بھی دوسروں کا اثبات حجت ہوتا، پھر ادعیہ افتتاح کے درمیان جمع کرنا مناسب ہے اس طرح کہ اس حدیث کی دُعا فرائض کیلئے خاص ہو اور نفل میں جو چاہے پڑھے جیسا کہ ہمارا مختار مذہب یہی ہے یا ہر نماز میں دونوں طرح کی پڑھی جائیں امام ابویوسفؒ وغیرہ کے مذہب کے مطابق، پھر اختلاف ہے کہ مقدم کونسی کرے؟ تو مختار امام نوویؒ کے بیان مطابق جمع کی پیروی کیلئے ''سبحانك الله'' کو مقدم کرے حدیث بیہقی کی وجہ سے کہ آپ علیہ السلام نماز شروع کرتے تو سبحانك الله...... پڑھتے بقولِ ابن حجرؒ یہ روایت ردّ ہے کیونکہ اس کے تمام طرق ضعیف ہیں، میرا جواب یہ ہے کہ ضعف تسلیم کر لیا جائے تو بھی نقصان نہیں کرتا اس لئے کہ یہ فضائل اعمال کے بارے میں ہے، اور ان کا ردّ مردود اور ہمارا جمع کرنا محمود ہے۔ واللہ اعلم۔

نماز میں پڑھی جانے والی ایک دُعا

۸۱۷: وَعَنْ جُبَیْرِ بْنِ مُطْعِمٍ اَنَّہٗ رَاٰی رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یُصَلِّیْ صَلَاۃً قَالَ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰہِ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا ثَلَاثًا اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ مِنْ نَفْخِہٖ وَنَفْثِہٖ وَھَمْزِہٖ (رواہ ابوداود وابن ماجۃ) اِلَّا اَنَّہٗ لَمْ یَذْکُرْ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا وَذَکَرَ فِیْ اٰخِرِہٖ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ وَقَالَ عُمَرُ نَفْخُہُ الْکِبْرُ وَنَفْثُہُ الشِّعْرُ وَھَمْزُہُ الْمُؤْتَۃُ۔

أخرجه أبوداؤد ۱/۴۸۶ حدیث رقم ۷٦٤۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۱/۲٦٥ حدیث رقم ۸۰۷ وذکر "اللهم انی أعوذبك من الشیطان الرجیم" وأخرجه أحمد فی المسند ٤/۸۰۔

ترجمہ: ''حضرت جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور آپ ﷺ نے یہ دعا پڑھی: اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ

كَثِيرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيرًا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّاَصِيلًا ۔ تین مرتبہ پڑھا۔ پھر اس کے بعد یہ دعا پڑھی: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ نَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ وَهَمْزِهٖ۔ میں شیطان کے تکبر اس کے شعروں اور اس کے وساوس سے پناہ مانگتا ہوں۔ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔ البتہ امام ابن ماجہ نے وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيرًا کا جملہ ذکر نہیں کیا اور آخر میں مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ذکر کیا ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ شیطان کے نفخ سے تکبر، اس کے نفث سے شعر اور اس کے ہمز سے جنون مراد ہے۔''

راویٔ حدیث:

جبیر بن مطعمؓ ۔ ان کی کنیت ابومحمد قرشی نوفلی ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے: جبیر بن مطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف۔ فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے۔ مدینہ میں تشریف لے گئے اور وہیں ۵۴ھ میں انتقال کیا۔ ان سے ایک جماعت نے حدیث کی روایت کی ہے۔ وہ نسب قریش کے بڑے عالم تھے۔

تشریح: **انه رای رسول الله صلی الله علیه وسلم یصلی صلٰوة قال**: یعنی تحریمہ کے بعد بقولِ ابن حجرؒ، اور ظاہر ہے کہ انہوں نے تحریمہ کے ساتھ کچھ زائد بھی متعین کیا، واللہ اعلم۔

الله اکبر: سکون اور ضمہ کے ساتھ۔ (**کبیرا**): حال موکدہ ہے بقول بعض اسم اللہ کی وجہ سے منصوب ہے دوسرا قول یہ ہے کہ ''اکبر'' مضمر ہے تیسرا قول یہ ہے کہ یہ محذوف کی صفت ہے یعنی تکبیراً کبیراً۔ (**الله اکبر کبیرا الله اکبر کبیرا**): ممکن ہے کہ تکرار تاکید کیلئے ہو یا پہلا ذات اور دوسرا صفات اور تیسرا افعال کیلئے، اور افعل کا وزن صرف مبالغہ کیلئے ہے یا معنی **اعظم من ان یعرف عظمته** ہے۔ ابن ہمام کہتے ہیں کہ وزن افعل اور فعیل صفات اللہ میں برابر ہیں کیونکہ ''اکبر'' میں غیر کی نسبت صفت میں زیادتی کا اثبات مراد نہیں ہوتا مشارکت کے بعد، کیونکہ اصل کبریائی میں کوئی اس کے برابر نہیں ہوسکتا۔

والحمد لله کثیرا: موصوف محذوف کی صفت ہے یعنی حمدً کثیراً۔ (**والحمد لله کثیرا، والحمد لله کثیرا**): دینا وآخرت کی ظاہری باطنی نعمتوں پر۔ (**وسبحان الله بکرة واصیلا**): یعنی دن کے شروع اور آخر میں، دونوں منصوب ہیں ظرفیت کی بناء پر اور عامل ''سبحان'' ہے۔ ان دونوں وقتوں کی تخصیص کی وجہ ان میں فرشتوں کا جمع ہونا ہے، کذا ذکرہ الابھری، وصاحبِ المفتاح اور ممکن ہے کہ تخصیص کی وجہ یہ ہو کہ تغیر عالم کے وقت اللہ تعالیٰ تغیر سے پاک ہے، واللہ اعلم اور طیبیؒ کے قول کے مطابق اظہر یہ ہے کہ اس سے دوام مراد ہے جیسا کہ قرآن میں ہے: ﴿وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا﴾ ''اور ان کے لئے صبح وشام کھانا تیار ہوگا''۔ (**ثلاثا**): سب کے لئے قید ہے مصابیح میں اسی طرح ہے، ممکن ہے کہ صرف آخری کیلئے قید ہو بلکہ یہی ظاہر ہے کیونکہ پہلے دونوں تین مرتبہ کہنے کی وجہ سے قید سے مستثنیٰ ہیں۔

اور حدیثِ مسلم میں ہے کہ آپ علیہ السلام نے ان کلمات کے بعد فرمایا، مجھے تعجب ہوا ان کلمات پر کیونکہ ان کے آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے اور ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد ''افلاک تسعہ'' ہوں کیونکہ یہ عدد مذکورہ کے موافق ہے۔

اعوذ بالله من الشیطان الرجیم من نفخه: بدل اشتمال ہے یعنی اس کے تکبر سے جو کفر تک پہنچانے والا ہے۔ (**ونفثه**): یعنی جادو۔ (**وهمزه**): یعنی وسوسہ۔ بقول طیبیؒ کے نفخ کنایہ ہے تکبر سے شیطان انسان میں وسوسہ ڈالتا ہے پھر

اپنے کو بڑا اور لوگوں کو حقیر دیکھا تا ہے، اور نفث کنایہ ہے شعر کی طرف کیونکہ انسان شعر کو دم کی طرح منہ سے پھونکتا ہے (اھ)۔ بقول بعض نفخ سے تکبر مراد ہے یعنی جس تکبر کا شیطان حکم دیتا ہے اور نفثه سے وہ شعر مذموم جن کے پڑھنے کا حکم دیتا ہے یعنی جس میں مسلمان کی تذلیل یا کفر و فسق ہو، اور همزہ سے مراد یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے بہکاوے اور شرارت سے مجنون بنائے۔

(رواہ ابوداؤد)

اور بقول ابن حجرؒ کے اس کو احمد نے روایت کیا ہے، اور میرکؒ کہتے ہیں کہ ابن حبان نے صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔ (وابن ماجه الا انه)؛ یعنی ابن ماجہ نے۔ (ثم يذكر والحمد لله كثيرا) اور اس کا نقصان نہیں کیونکہ اس لئے کہ زیادتی ثقہ مزید علیہ کے معارض نہیں ہوتی لہٰذا مقبول ہوگی۔ (وذكر في آخره من الشيطان الرجيم) اور زیادتی بھی قابل عمل ہے اس طرح کہ جمع بین الروایات ہو جائے اس طریقہ پر کہ زیادتی بعد میں فرمائی یا کبھی ایک طرح پڑھتے تھے کبھی دوسری طرح۔

وقال عمر: بقول میرکؒ کے درست لفظ ''عمرو'' ہے۔ (ونفخه): اعراب لگائیں جاتیں تو مرفوع اور حکایۃ پڑھا جائے تو مجرور ہے۔ (الكبر ونفثه الشعر): یعنی شعر مذموم کیونکہ ابوداؤد میں ہے ان من اشعر حکما، یعنی مواعظ وامثال، اور بخاری میں ان من الشعر حکمۃ ہے یعنی سچا اور حق کے مطابق قول، اور بخاری نے الادب میں روایت کیا ہے کہ آپ علیہ السلام نے شریدی کو امیہ بن ابی صلت کے اشعار پڑھنے کو فرمایا تو اس نے سو قافیے پڑھے اور مطلق کراہت کے قائلین پر اس سے رد کیا ہے، اور ان کا دلیل پکڑنا ابن مسعودؓ کے فرمان سے کہ شعر شیطان کی بانسریاں ہیں نیز اس خبر سے کہ ابلیس جب زمین پر اُترا تو اس نے کہا اے ربّ مجھے پڑھنے کیلئے عطا کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''شعر''۔ مردود ہے کیونکہ حدیث ضعیف ہے اگر بالفرض صحیح بھی ہو تو وہ افراطِ شعر پر محمول ہے، ابن حجرؒ نے اسی طرح ذکر کیا، اور اظہر یہ ہے کہ صحتِ حدیث کی صورت میں ''لام'' عہدی مانا جائے اور مراد شعر مذموم ہے یا جنسی کہا جائے اور اچھے شعر کو مستثنیٰ کر لیا جائے جمع بین الحدیثین کیلئے، واللہ اعلم۔

وهمزه الموتة: ''تاء'' کے ضمہ وفتحہ کے ساتھ، جنون اور مرگی کی قسم ہے جس میں آدمی کپڑ اُتار دیتا ہے جب افاقہ ہوتا ہے تو مکمل عقل لوٹ آتی ہے سونے اور نشے والے کی طرح، یہ قول طیبیؒ کا ہے۔

طیبیؒ نے کہا ہے کہ اگر تو یہ تفسیر متن حدیث سے ملتی ہے پھر تو اعراض نہیں اور اگر کسی راوی کی ہے تو مناسب یوں کہنا ہے کہ نفث سے مراد سحر ہے کیونکہ فرمانِ الٰہی ہے، ﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ﴾ [الناس: ٤] اور ''ہمز'' سے مراد وسوسہ ہے اس لئے کہ قرآن میں ہے: ﴿وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ﴾ [المؤمنون: ٩٧] ''اور کہو کہ اے پروردگار! میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں'' اور اس کے خطرات ہیں اس لئے کہ وہ انسان کو گناہوں پر ایسے اکساتے ہیں جیسے چابک سے چوپائے، اور اس میں نظر ہے اس لئے کہ ''سحر'' قول پر موقوف نہیں ہوتا اگرچہ بعض افراد میں پایا جاتا ہے اور اس وقت طیبیؒ کیلئے آیت میں کوئی شواہد نہیں بنتے یہ قول ابن حجرؒ کا ہے، اور یہ طیبیؒ کے حق میں ظلم ہے اس لئے کہ ان کا یہ کہنا کافی تھا کہ: ''نفث'' آیت میں سحر کے معنی میں آیا ہے لہٰذا شعر سے سحر مراد لینا اولیٰ ہے۔ اس لئے کہ یہ شعر کے معنی میں مطلقاً نہ آیت میں ہے نہ کہیں اور، طیبیؒ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ صرف نفث کے ذریعے ہی جادو ہوتا ہے تاکہ ان پر ردّ کیا جائے گا، اس کو خوب سمجھ لو اور اصل میں

لغتاً نفث منه سے ہوتا ہے جو پھونک کے مشابہ اور تھوکنے سے کم ہوتا ہے۔اور "نفث" کا سحر کے معنی میں ہونا اظہر ہے، البتہ صاحب قاموس کا شعر کو نفث شیطان کہنا صحابی کی تفسیر سے منقول ہے اسی وجہ سے نہایہ میں کہا ہے کہ نفث کی تفسیر حدیث میں شعر کی ہے اس لئے کہ وہ منہ سے پھونکا جاتا ہے اور تحقیق یہ ہے کہ اس میں سحر کے معنی آتے ہیں اس لئے کہ شیطان سحر ہی کے ذریعہ شاعر کو شعر وشاعری میں ڈالتا ہے، واللہ اعلم۔

نماز میں سکتہ کا بیان

۸۱۸: وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ اَنَّهٗ حَفِظَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَكْتَتَيْنِ سَكْتَةً اِذَا كَبَّرَ وَسَكْتَةً اِذَا فَرَغَ مِنْ قِرَاءَةِ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ فَصَدَّقَهٗ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ.

(رواه ابوداود وروى الترمذي وابن ماجة والدارمي نحوه)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/۴۹۲ حديث رقم ۷۷۹۔وأخرج الترمذي نحوه في السنن ۲/۳۰ حديث رقم ۲۵۱ وكذلك ابن ماجة في السنن ۱/۲۷۵ حديث رقم ۸۴۴۔وأيضاً الدارمي في السنن ۱/۳۱۳ حديث رقم ۱۲۴۳۔ وأخرجه أحمد في المسند ۵/۷۔

ترجمہ: "حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دو سکتے یاد کئے ہیں۔ایک سکتہ تکبیر تحریمہ کے بعد اور ایک سکتہ اس وقت کرتے تھے جب غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ پڑھ کر فارغ ہوتے تھے حضرت ابی بن کعب نے حضرت سمرہ بن جندبؓ کی تصدیق کی اسی حدیث کو امام ابوداوٗدؒ نے روایت کیا ہے امام ترمذیؒ امام ابن ماجہؒ اور امام دارمیؒ نے اس جیسی روایت نقل کی ہے۔"

تشریح: وعن سمرة: بفتح السین وضم المیم۔(ابن جندب): "جیم، دال" کے ضمہ اور یا دال کے فتح کے ساتھ۔

انه حفظ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم سكتتين سكتة اذا كبر: یعنی تحریمہ۔

وسكتة اذا فرغ من قراة غير المغضوب عليهم والا لضالين: سکتہ ثانیہ عند الشافعی واحمد مسنون ہے پہلے "سکتہ" کی طرح اور امام ابوحنیفہؒ و مالکؒ کے نزدیک مکروہ ہے بقول طیبیؒ کے، اور اظہر یہ ہے سکتہ اولی ثناء اور سکتہ ثانیہ آمین کیلئے ہے، زین العرب کا قول ہے کہ آپ علیہ السلام دو مرتبہ سکوت فرماتے تھے ایک تکبیر کے بعد، اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ مقتدی نیت اور تکبیر تحریمہ سے فارغ ہو جائے تا کہ فاتحہ کا سماع فوت نہ ہو، اور دوسرا سکتہ فاتحہ پوری کرنے کے بعد اور اس سے غرض یہ ہے کہ مقتدی فاتحہ پڑھ لے اور امام سانس اور کچھ آرام کرے، اور ان دونوں میں نظر ہے اس لئے کہ سکتہ اولی ذکر اللہ سے خالی نہ ہوتا تھا۔حاصل یہ ہے کہ پہلا سکتہ میں بلند آواز سے سکوت تھا اور سکتہ ثانیہ کا سانس اور راحت کیلئے ہونا مسلم ہے لیکن مقتدی کی قراءت کیلئے ہونا قلب موضوع ہے اور حدیث میں اس پر دلالت نہیں ہے۔

فصدقه ابی بن كعب: یعنی موافقت کی۔(رواہ ابوداوٗد): یعنی اس لفظ کے ساتھ، میرک نے یونس بن عبید، عن الحسن عن سمرۃ کے طریق سے بیان کیا ہے فرماتے ہیں کہ عمران بن حصین نے اس پر انکار کیا چنانچہ لوگوں نے مدینہ میں ابی بن کعب کو

خط لکھا تو انہوں نے سمرۃ کی تصدیق کی۔ اور حسنؒ کے سمرہ سے سماع میں اختلاف ہے اصح ان کا صحت سماع ہے اور ابن حبان نے صحیح میں اس کی تخریج کی ہے اور بقول بعض حفاظِ حدیث یہ حدیث سمرۃ وابی کعب اور عمران بن حصین سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔

اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ابوداؤدؒ نے اس کو روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن بلکہ صحیح ہے اور انہی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول پاک ﷺ دو سکتے فرماتے تھے، ایک بسم اللہ پڑھتے یعنی بسم اللہ کے ارادہ کے وقت (اس کی دلیل: سکتة اذا کبو ہے) اور دوسرا سکتہ جب تمام قراءت سے فارغ ہوتے اور دوسری روایت میں فاتحہ اور سورت اور عندالرکوع کے الفاظ ہیں، اور ان دونوں میں کوئی مخالفت نہیں بلکہ ان دونوں کے مجموعہ سے تین سکتوں کا ثبوت ملتا ہے: ① تحریمہ کے بعد۔ ② فاتحہ کے بعد۔ ③ سورت کے بعد۔

اور "سکتات" سے مراد اواخر آیات میں حد تنفس سے کچھ زیادہ سانس لینا ہے کیونکہ آپ علیہ السلام کا یہ عمل ثابت ہے کہ الحمدللہ رب العٰلمین پڑھتے پھر کچھ ٹھہرتے تھے اسی طرح آیات کے شروع میں، البتہ قراء کا بغیر سانس لیے سکتہ کا اطلاق کرنا ان کی اپنی اصطلاح پر مبنی ہے، واللہ اعلم۔

پھر ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے ائمہ نے بھی دُعا اِفتتاح وتعوذ، اور تعوذ و فاتحہ نیز آمین اور سورت کے اور سورت اور تکبیر رکوع کے درمیان سکتہ کو مستحب کہا ہے، اور یہ تمام سکتات سبحان اللہ کی مقدار بالکل ضعیف ہیں جیسا کہ امام غزالیؒ نے بعض سکتوں کے بارے میں فرمایا ہے، باقی اسی پر قیاس ہیں مگر آمین اور سورت کے درمیان سکتہ امام کیلئے باقیوں کی نسبت کچھ زیادہ ہونا چاہیے اس لئے کہ سنت یہ ہے کہ امام اتنی مقدار ذکر اور تلاوتِ قرآن میں مشغول رہے جتنی دیر میں مقتدی سورت فاتحہ پڑھنے سے فارغ ہو جائے تاکہ امام سن لے۔

اتنی بات ہے کہ اس حدیث میں اس سکتہ کی سنت پر دلالت تو ہے لیکن اس میں کچھ پڑھنا آپ علیہ السلام سے ثابت نہیں باوجود یہ کہ سکتہ بظاہر قراءت کے خلاف بھی ہے نیز امام کا مقتدی قراءت سننا کسی اصل صحیح یا ضعیف میں وارد نہیں ہوا بلکہ اس جگہ مقتدی کے بلند آواز سے قراءت بلکہ اصل قراءت کرنے سے نہی وارد ہوئی ہے، واللہ اعلم۔

رواه الترمذی، وابن ماجه والدارمی نحوه: یعنی اس کے معنی۔

ثناء صرف پہلی رکعت میں پڑھی جائے گی

۸۱۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَ انْهَضَ مِنَ الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ اسْتَفْتَحَ الْقِرَاءَ ةَ بِالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَلَمْ يَسْكُتْ هٰكَذَا فِیْ صَحِيْحِ مُسْلِمٍ وَذَكَرَهُ الْحُمَيْدِیُّ فِیْ اَفْرَادِهٖ وَكَذَاصَاحِبُ الْجَامِعِ عَنْ مُسْلِمٍ وَحْدَهٗ۔

أخرجه مسلم فی الصحيح ۱/ ۴۱۹ حديث رقم (۱۴۸-۵۹۹)۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب دوسری رکعت پڑھنے کے بعد اُٹھتے تھے تو اَلْحَمْدُ

لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ سے شروع کر دیا کرتے تھے اور خاموش نہیں رہتے تھے۔ (مسلم) اس روایت کو حمیدی نے اپنی کتاب "افراد" میں ذکر کیا ہے اور صاحب جامع الاحوال نے بھی اس روایت کو مسلم سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: وعن ابی هريرة قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا نهض: یعنی کھڑے ہوتے۔ من الركعة الثانية: یعنی رکعت ثانیہ کیلئے۔ (استفتح القراة بالحمد لله رب العلمين): مراد خاص سورت ہے بقول طیبیؒ کے اس میں تسمیہ کے جز وفاتحہ نہ ہونے پر دلیل نہیں ہے، لیکن ظاہر حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ علیہ السلام تسمیہ آہستہ پڑھتے تھے۔ (ولم يسكت): یعنی ثناء کیلئے۔ (هكذا في صحيح مسلم وذكره الحميدی فی افراده): یعنی مفردات ومختصاتِ مسلم میں۔ (وكذا صاحب الجامع): یعنی اصول کے، وہ ابن اثیر ہیں۔ (عن مسلم وحده): پس صاحبِ مصابیح کا اس حدیث کو فصل اول کی بجائے فصل ثانی میں لانا ان کے قاعدہ کی وجہ سے مناسب نہیں، میرک کہتے ہیں تعجب ہے کہ حاکمؒ نے مستدرک میں اس کی تخریج کی ہے اور علی شرطهما کہا ہے۔

میں کہتا ہوں ہو سکتا ہے کہ حاکمؒ نے اس کو مسلم کی سند کے علاوہ کسی دوسری سند سے روایت کیا ہو اور اس کے رجال بخاری ومسلم کی شرط پر ہوں۔

الفصل الثالث:

تکبیر تحریمہ کے بعد کی دُعا

۸۲۰: عَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا اسْتَفْتَحَ الصَّلَاةَ كَبَّرَ ثُمَّ قَالَ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ لِاَحْسَنِ الْاَعْمَالِ وَاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَايَهْدِيْ لِاَحْسَنِهَا اِلَّا اَنْتَ وَقِنِيْ سَيِّئَ الْاَعْمَالِ وَسَيِّئَ الْاَخْلَاقِ لَايَقِيْ سَيِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ۔

أخرجه النسائی فی السنن ۱۲۹/۲ حديث رقم ۸۹۶۔

ترجمہ: "حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تو سب سے پہلے تکبیر تحریمہ کہتے۔ پھر اس کے بعد یہ دعا پڑھتے: اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ...... بیشک میری نماز میری قربانی میری زندگی اور میری موت اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں اے اللہ نیک اعمال اور اچھے اخلاق کی طرف میری رہنمائی کر کیونکہ اچھے اعمال اور اچھے اخلاق کی طرف صرف تو ہی رہنمائی کر سکتا ہے اور بد اخلاقی سے صرف تو ہی بچا سکتا ہے اس حدیث کو امام نسائیؒ نے روایت کیا ہے۔"

تشریح: عن جابر قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذ استفتح الصلوة: یعنی استقبالِ قبلہ اور نیت کے ساتھ۔

کبر: تحریمہ کیلئے۔(ثم قال ان صلاتی و نسکی): یعنی بقیہ عبادت۔(و محیای و مماتی): یعنی موت وحیات کے احوال۔(لله): یعنی خالص اللہ کیلئے۔(رب العالمین، لا شریك له و بذالك): یعنی اخلاص۔

امرت وانا اول المسلمین: طیبیؒ کے بقول تنزیل کی یہ لفظ قولِ ابراہیم علیہ السلام سے حکایت ہے انہوں نے اوّل المسلمین کہا، کیونکہ ہر نبی کا اسلام اس کے اُمتی کے اسلام سے مقدم ہوتا ہے،(اھ)۔اور قرآن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے نبی علیہ السلام یہ کہنے کے مامور تھے اس لئے کہ اللہ نے آپ ﷺ سے فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [الانعام: ۱٦٢] ''(یہ بھی) کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب خدائے رب العالمین ہی کے لئے ہے۔'' لیکن نبی پاک ﷺ کبھی اس طرح فرماتے اور کبھی ''انا من المسلمین'' (جیسے کہ پہلے گزرا) اپنے آپ کو اُمت کا عام فرد شمار کر کے تواضع کیلئے، جیسا کہ دُعا کی کہ مجھے مساکین میں سے اٹھانا، اور ازھار میں ہے کہ اول المسلمین کا لفظ نبی پاک ﷺ کے ساتھ خاص ہے اور عام لوگ یوں نہ کہیں بلکہ انا من المسلمین کہیں اس کو ابہری نے ذکر کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ ورنہ اگر آلا یہ کا لفظ نہ کہے تو جھوٹا ہوگا یعنی اس قول سے اپنی خبر نہ دے بلکہ تلاوتِ قرآن کرتا ہو۔ابن ہمامؒ کہتے ہیں کہ اگر اول المسلمین کہا تو نماز فاسد ہو جائیگی اور بقول بعض فاسد نہ ہوگی اور یہی اولی ہے کیونکہ تلاوت کرنے والا ہے خبر دینے والا نہیں۔

اللهم اهدینی لا حسن الاعمال: یعنی ظاہری۔(واحسن الاخلاق): یعنی باطنی۔(لا یهدی لا حسنها): یعنی مذکورہ دونوں قسمیں۔(الا انت وقنی سییء الاعمال وسیی الاخلاق، لا یقی سیئها الا انت): ''سیی'' کہنے اور ''اسوء'' (جو کہ احسن کا مقابل ہے) نہ کہنے میں نکتہ ہے جو مخفی نہیں۔(رواہ النسائی)

نفل نماز کی ایک دُعا

۸۲۱: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ مَسْلَمَةَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اِذَا قَامَ یُصَلِّیْ تَطَوُّعًا قَالَ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَذَکَرَ الْحَدِیْثَ مِثْلَ حَدِیْثِ جَابِرٍ اِلَّا اَنَّہٗ قَالَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ثُمَّ قَالَ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ ثُمَّ یَقْرَاُ۔ (رواہ النسائی)

أخرجه النسائی فی السنن ۲/ ۱۳۱ حدیث رقم ۸۹۸۔

ترجمہ: ''حضرت محمد بن مسلمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نفل نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے تو یہ دعا پڑھتے: اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَجَّھْتُ...... اللہ بہت بڑا ہے میں نے نماز میں اپنا چہرہ اس ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اور میں یکسو ہو کر دین کی طرف مائل ہونے والا ہوں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں اس کے بعد راوی نے حضرت جابرؓ کی حدیث کی مثل حدیث بیان کی لیکن محمد بن مسلمہؓ نے وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ کی جگہ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ کے لفظ ذکر کیے ہیں اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا پڑھی اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ......

اے اللہ تو ہی بادشاہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے اور تیرے ہی لیے تعریف ہے اس کے بعد قراءت کرتے اس حدیث کو امام نسائیؒ نے روایت کیا ہے۔"

راویٔ حدیث:

محمد بن مسلمہ۔ یہ "محمد" ہیں۔ "مسلمہ" کے بیٹے انصاری اوسی اور حارثی ہیں۔ غزوۂ تبوک کے علاوہ باقی تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ سے روایت کی۔ اہل فضل صحابہ میں سے تھے۔ یہ ان صحابہ میں سے ہیں جو حضرت مصعب بن عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مدینہ میں مشرف باسلام ہوئے۔ مدینہ ہی میں ۴۳ھ میں بعمر ۷۷ سال وفات پائی۔

تشریح: وعن محمد بن مسلمة: انصاری اوسی، سوائے تبوک کے تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے اور مصعب بن عمیرؓ کے ہاتھوں مسلمان ہونے والوں میں تھے اور بڑے صحابہؓ میں سے تھے، طیبیؒ نے اس کو ذکر کیا۔

قال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذ اقام يصلي تطوعا: اس کا ظاہر ہمارے مذہب کی تائید کرتی ہے کہ آپ علیہ السلام و جهت و جهي نفل و سنن میں پڑھتے تھے۔

قال الله اكبر وجهت وجهي: "یاء" کے سکون و فتحہ کے ساتھ، یعنی اپنا قصد یا ذات کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کیا۔ **(للذى فطر السموات والارض):** یعنی بلا نمونہ بنایا۔ **(حنيفا):** یعنی غیر سے رخ موڑ کر، فاعل سے حال ہے اور شرح ابن حجرؒ میں حنیفا کے بعد "مسلمًا" بھی ہے اور اصل مشکوٰۃ میں نہیں ہے۔ **(وما انا من المشركين):** تاکید اعراض عن الغیر اور احسان پر اظہار لذت اور نعمت کا شکر ہے۔ **(وذكر):** یعنی محمد بن مسلمہ۔ **(الحديث مثل جابر الا انه):** یعنی محمد۔

قال وانا من المسلمين: اول المسلمین کی جگہ۔ **(ثم قال):** یعنی نبی علیہ السلام نے۔ **(اللهم انت الملك، لا اله الا انت سبحانك وبحمدك ثم يقرأ)**۔ (رواہ النسائی)

بَابُ الْقِرَآءَةِ فِى الصَّلَاةِ
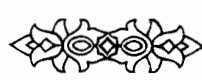
نماز میں قراءت کا بیان

الفصل الاول:

نماز میں سورۃ الفاتحہ پڑھنے کا مسئلہ

۸۲۲: عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاصَلٰوةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتٰبِ (متفق عليه و فى رواية لمسلم) لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ فَصَاعِدًا .

أخرجه البخاري في صحيحه ٢٣٦/٢حديث رقم ٧٥٦۔وأخرجه مسلم في صحيحه ٢٩٥/١حديث رقم (٣٤۔٣٩٤) وأخرجه أبوداوٗد في السنن ٥١٤/١حديث رقم ٨٢٢وزاد"وصاعدًا"۔وأخرجه الترمذي في السنن ٢٥/٢۔ حديث رقم ٢٤٧۔وأخرجه النسائي في السنن١٣٧/٢حديث رقم ٩١٠۔وأخرجه ابن ماجة في السنن ٢٧٣/١ حديث رقم ٨٣٧۔ وأخرجه أحمد في المسند ٣١٤/٥۔ورواية عن لم يقرأبأم القرآن فصاعدا۔ أخرجها مسلم في صحيحه ٢٩٦/١حديث رقم (٢٧۔٣٩٤)والدارمي من غير لفظ "فصاعداً"في السنن ٣١٢/١حديث رقم ١٢٤٢۔

ترجمه:''حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس آدمی نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی۔ (بخاری ومسلم)اور مسلم کی ایک روایت میں الفاظ اس طرح ہیں کہ اس آدمی کی نماز نہیں ہوتی جو سورۂ فاتحہ اور اس کے بعد کچھ اور نہ پڑھے۔''

تشریح:**عن عبادة بن الصامت قال:قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا صلاة**:یعنی کامل جیسا کہ ہمارا مذہب ہے یا صحیح، جیسا کہ شافعیؒ کا مذہب ہے۔**(لمن لم يقراء بفاتحة الكتاب)**:بقولِ طیبیؒ یعنی قراءت فاتحہ سے شروع نہ کی، بقولِ ابن حجرکہ "یقرأ" کے متضمن بمعنی یبداء ہونے کی وجہ سے متعدی بنفسہٖ ہونے کے باوجود''باء'' لازم آتا ہے شوافع میں سے کوئی اس کا قائل نہیں' ہمارے علم کے مطابق، پس درست یہ ہے کہ''با'' زائدہ تاکید کیلئے ہے اور فاتحہ کو **فاتحة الكتاب** نام پڑنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اس سے شروع ہوتا ہے اور اس لئے کہ نماز اس سے شروع کی جاتی ہے، یا یوں کہا جائے کہ یہ اپنے پڑھنے والے کے اعضاء سبعۃ کیلئے خیر کے دروازے کھولتی ہے اور جہنم کے دروازے بند کرواتی ہے اور اس کی وجہ سے جنت کے آٹھ یا سات دروازے کھلتے ہیں ان کی تعداد میں اختلاف کی بناء پر جیسا کہ سورۃ فاتحہ کی آیات کی تعداد میں اختلاف ہے، واللہ اعلم۔

متفق عليه:بقولِ میرکؒ چاروں ائمہ نے اس کو روایت کیا ہے۔**(وفى رواية لمسلم لمن لم يقرأ بام القرآن)**: ''ام القرآن'' اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ مقاصدِ قرآن پر مشتمل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کیلئے واجب چیزوں کا اثبات اور محال کی نفی، اور جو اللہ تعالیٰ اور انبیاء کے حق میں ممکن ہے اور دنیا آخرت کے احوال، خبر وطلب، قصص، ہدایت یافتہ لوگوں کی مدح اور گمراہوں کی مذمت اور ان کو دو قسموں (ضالین، اور مغضوبِ علیہ) میں منقسم ہونا، وغیرہ وغیرہ۔ حتیٰ کہ بعض عارفین نے کہا ہے کہ راہ چلنے والوں کی تمام منازل کی بناء **اياك نعبد واياك نستعين** پر ہے۔ اور بقولِ بعض کے تمام قرآن کا اجمال فاتحہ ہے اور فاتحہ کا بسم اللہ اور بسم اللہ کا اس کی ''باء'' اور ''باء'' کا اجمال اس کے نکتہ میں آ گیا، گویا کہ نکتہ سے مراد معنی توحیدی ہیں اور اسی وجہ سے کہا گیا:''**العلم نقطة كثرها الجاهلون**'' یعنی علم نقطہ ہے اور جہلاء اس کی کثرت کے سبب بنے کیونکہ وہ اجمال نہ سمجھے۔

تشریح:**فصاعدا**: یعنی زیادہ، **صعود** سے ہے بمعنی چڑھنا، بقولِ مظہرؒ کے یعنی زائدہ، اور منصوب ہے حال ہونے کی وجہ سے عبارت یہ ہے: **لا صلوٰة لمن لم يقرأ بام القرآن فقط، او بام القرآن حال كون قراء ته زائدا على ام القرآن**، اور دوسری حدیث سے دوسرے معنی سمجھ آتے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ دونوں معنی دونوں حدیثوں سے مفہوم ہوتے تھیں۔ بقولِ بعض کے دونوں حدیثوں میں قراءت پر قادر شخص کیلئے قراءت کے وجوب پر دلالت ہے، اور معترض

یہ کہہ سکتا ہے کہ فصاعدًا کا لفظ اس کی نفی کرتا ہے کیونکہ اس لئے کہ فاتحہ سے زائد پڑھنا واجب نہیں، یہ طیبیؒ کا قول ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فصاعدًا ہماری تاویل یعنی نفیِ کمال مراد ہونے پر دلالت کرتا ہے، واللہ اعلم۔ بعض شوافع نے یہ جواب دیا ہے کہ نماز میں وجوب قراءت کے قائلین کا آپس میں تعین وعدم تعین میں اختلاف ہے لیکن کوئی بھی فاتحہ مع الغیر کے وجوب کا قائل نہیں، پس یہ حدیث وجوبِ فاتحہ پر دلالت کرتی ہے نہ کہ زائد پر گویا کہ یوں کہا گیا الفاتحه واجبة في حال كونها مقرونة بشئي مما هو غير واجب (یعنی فاتحہ غیر فاتحہ کے ساتھ مل کر واجب ہے اور تصحیح سے قطع نظر ان کا کلام غلط گمان پر محمول ہے اس لئے کہ فاتحہ اور سورت ہمارے سردار ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب میں واجب ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے ہاں وجوب کا درجہ فرضیت سے کم ہے کیونکہ فرائض ادلہ قطعیہ سے ثبوت کے ساتھ خاص ہیں نہ کہ ظنیہ کے ساتھ۔

فاتحہ نہ پڑھنے سے نماز ناقص ہوتی ہے

۸۲۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ صَلّٰى صَلَاةً لَمْ یَقْرَأْ فِیْهَا بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ فَهِیَ خِدَاجٌ ثَلَاثًا غَیْرُ تَمَامٍ فَقِیْلَ لِاَبِیْ هُرَیْرَةَ اِنَّا نَكُوْنُ وَرَآءَ الْاِمَامِ قَالَ اِقْرَأْبِهَا فِیْ نَفْسِكَ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى قَسَّمْتُ الصَّلَاةَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ وَلِعَبْدِیْ مَاسَأَلَ فَاِذَا قَالَ الْعَبْدُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ وَاِذَا قَالَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَثْنٰى عَلَیَّ عَبْدِیْ وَاِذَا قَالَ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ قَالَ مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ وَاِذَا قَالَ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ قَالَ هٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَاسَأَلَ فَاِذَا قَالَ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ قَالَ هٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَاسَأَلَ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۲۹۶/۱ حديث رقم (۳۸۔۳۹۵)۔وأخرجه أبوداؤد فی السنن ۵۱۲/۱ حديث رقم ۸۲۱۔ وأخرجه الترمذی فی السنن ۱۸۳/۵ حديث رقم ۲۹۵۳۔وأخرجه النسائی فی السنن ۱۳۵/۲ حديث رقم ۹۰۹۔ وأخرجه ابن ماجة مختصرًا فی السنن ۲۷۳/۱ حديث رقم ۸۳۸۔وأخرجه مالك فی الموطأ ۸۴/۱ حديث رقم ۳۹ من كتاب الصلاة ۔وأخرجه أحمد فی المسند ۲۸۵/۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص نماز پڑھے اور اس میں فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز ناقص ہے آپ ﷺ نے یہ تین مرتبہ فرمایا حضرت ابوہریرہؓ سے سن کر کسی نے پوچھا کہ جب ہم امام کے پیچھے ہوں تو اس وقت بھی پڑھیں حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا اپنے دل میں پڑھو اس لیے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرمایا ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے نماز اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کی ہے اور بندہ جو مانگے وہ اسے دیا جائے گا جب بندہ کہتا ہے کہ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف بیان کی ہے جب بندہ کہتا ہے: الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے

بندے نے میری ثناء بیان کی اور جب بندہ کہتا ہے :مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری تعظیم کا اظہار کیا ہے جب بندہ کہتا ہے :اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے اور میرا بندہ جو مانگے گا وہ اسے عطا کیا جائے گا جب بندہ کہتا ہے :اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ...... تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے بندہ کے لئے ہے اور میرے بندہ کے لیے وہی ہوگا جو وہ مانگے گا اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **وعن ابی ہریرۃ قال:قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی صلاۃ:** میرکؒ کا کہنا ہے کہ ''صلاۃ،نکرہ سے اگر بعض مراد لیا جائے، جیسے ظہر،عصر وغیرہ تو مفعول بہ ہوگا اس لئے کہ اس وقت ''صلوٰۃ'' ہیئات مخصوصہ کا نام ہوگا اور فعل ان پر واقع ہوگا اور اگر جنس مراد ہو تو مفعول مطلق و مفعول بہ دونوں کا احتمال ہے۔

لم یقرأ فیہا بام القرآن؛ اس میں ان کا ردّ ہے جو فاتحہ کو ''اُم القرآن'' کہنا مکروہ بتاتے ہیں۔**(فھی)**:یعنی نماز۔ **(خداج)**:یعنی ناقص، **خدجت الناقۃ ولدھا** سے جبکہ اونٹنی قبل از وقت کمالِ خلقت کے بعد بچہ گرادے۔**(ثلاثا)**:یعنی تین بار فرمایا۔

غیر تمام:''خداج'' کا بیان یا اس سے بدل ہے اور ایک نسخہ میں غیر تام ہے یعنی غیر کامل۔ایک قول یہ ہے کہ تاکید ہے اور دوسرا قول (مصنف کا) یہ ہے کہ یہ''خداج'' کی تفسیر ہے،اس کو ابن الملکؒ نے ذکر کیا ہے اور اظہر یہ ہے کہ یہ مصنف کا کلام نہیں ہے بلکہ کسی راوی کا ہے اور یہ ہمارے علماء کے مذہب یعنی نقصِ صلاۃ کے بارے میں صریح ہے، پس یہ آپ علیہ السلام کے فرمان ''لا صلوٰۃ''، کیلئے مبیّن ہے کہ اس سے مراد نفی کمال ہے نفی صحت نہیں لہٰذا ابن حجرؒ کا قول باطل ثابت ہوا کہ اس حدیث سے نماز کی عدم صحت اور نفی سے نفی صحت مراد ہے کیونکہ نفی صحت ہی حدیث کا موضوع ہے، پھر فرمایا کہ اس کی دلیل وہ احادیث ہیں جن میں تاویل نہیں ہوسکتی، ان میں سے ایک حدیث صحیح سند کے ساتھ ابی سعید سے مروی ہے کہ ہمیں فاتحہ اور جو آسان لگے پڑھنے کا حکم دیا گیا، اور یہ حدیث ان پر حجت ہے،ہم پر نہیں کیونکہ وہ وجوبِ سورت کے قائل نہیں اور ساتھ یہ احتمال بھی ہے کہ ''واؤ''مع، یا''اوْ'' کے معنی میں ہو اور یہ فاتحہ سے عاجز ہونے کی صورت میں بالاجماع جائز اور اس پر قدرت کے وقت کافی ہے ہمارے مذہب میں، انہی میں سے دوسری ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم کی خبر ہے، صحاح میں سند صحیح کے ساتھ کہ جس نماز میں فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ کافی نہیں ہوتی، اور دارقطنی نے یہ صحیح سند کے ساتھ روایت کی ہے اور بقول نوویؒ کے اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور یہ اجزاء کامل پر محمول ہے انہی میں سے تیسری صحیح روایت یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے مسیئی صلاۃ سے فرمایا :**ثم اقرأ بام القرآن** یعنی فاتحہ پڑھ اور پھر فرمایا کہ ایسا تمام نمازوں میں کیا کر اور حدیث سابق :**ثم اقرأ بام القرآن وما شاء اللہ ان تقرأ** اور ظاہر کے اعتبار سے شوافع پر حجت ہے نہ کہ ہم پر کیونکہ ہم اس کے وجوب کے قائل ہیں اور ساتھ ساتھ اس حدیث میں کچھ ایسے امور کا ذکر ہے جو بالاجماع وجوب پر حمل نہیں ہوسکتے، انہی میں سے آپ علیہ السلام کا نماز میں فاتحہ پر مداومت کرنا ہے جیسا کہ مسلم و بخاری میں ہے کہ نماز ایسی پڑھو جیسا مجھے دیکھتے ہو نماز میں، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ اس پر مداومت نہ فرماتے تو ہم اس کے سنت ہونے کے قائل ہوتے نہ کہ وجوب اور تارکِ فاتحہ کے گنہگار ہونے کے، رہی بخاری کی روایت تو وہ

بالاجماع مخصوص البعض ہے کیونکہ آپ علیہ السلام کے بعض اعمال بلا اختلاف سنت ہیں اور حدیث: لا صلوٰۃ الا بقرآن ولو بفاتحہ الکتاب ضعیف ہے، اقلی حجزئی الفاتحة یعنی کم سے کم مقدار جیسا کہ ھمّ ولو یومًا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ضعف صحیح مان لیا جائے تو بھی مرادی معنی کو تقویت دیتی ہے باوجود اس کے کہ حدیث ضعیف ہمارے نزدیک رائی محض پر مقدم ہے اور اس کو ہماری ذکر کردہ حدیث کی نظیر بنانا انتہائی بعید ہے بلکہ اس کی نظیر حدیث اتقوا النار ولو بشق تمرہ ہے، پس نتیجہ یہ نکلتا ہے صرف فاتحہ پڑھنا کافی ہے لیکن سورت کا ملانا واجب ہے، اور حضرت عمرؓ اور علیؓ سے مروی جو کہ اصل سے عدمِ وجوبِ قراءت کو مقتضی ہے وہ بھی ضعیف ہے، میں کہتا ہوں اگر صحیح مان لی جائے تو فرضیتِ فاتحہ پر محمول ہوگی نہ کہ وجوب پر جمع بین الادلۃ کیلئے، اور: قول زید بن ثابت: القرأۃ سنة ای طریقة متبعة (اگر عربی قواعد کے خلاف ہے) کا جواب یہ ہے کہ (اس کا معنی یہ ہے کہ) اس کی فرضیت سنت سے ثابت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ [المزمل: ۲۰] ''پس جتنا آسانی سے ہو سکے (اتنا) قرآن پڑھ لیا کرو۔'' بظاہر مطلق ہے، اور مسلم نے روایت کیا ہے کہ جناب رسول ﷺ عصرین (ظہر وعصر) کی تمام رکعتوں میں فاتحہ پڑھتے تھے اور یہ روایت ابن عباسؓ کی روایت سے مقدم ہے کہ آپ علیہ السلام قراءت نہیں کرتے تھے اس لئے کہ یہ نفی ہے باوجودیکہ پہلی اور اس جیسی روایت کے راوی عمر میں بڑے اور صحابیت میں مقدم ہیں تو یہ بات صحیح ہوگئی کہ ان کو اس میں شک ہے، فرمایا میں نہیں جانتا کہ آپ علیہ السلام ظہر وعصر میں قراءت فرماتے تھے یا نہیں اور ان کے علاوہ کثیر راوی قراءت یقینی بتاتے ہیں لہٰذا وہی تقدیم کے مستحق ہیں، میں کہتا ہوں کہ ان کی نفی آخری رکعتوں میں مابعد الفاتحہ پر محمول ہے یا اخفاء قراءت پر، کیونکہ ان کو قراءت کرنے نہ کرنے کا علم نہیں ہوا اور اس پر عصرین کی قید لگانا دلالت کرتا ہے اور یہ خبر بھی ضعیف ہے کہ آپ علیہ السلام پہلی رکعتوں میں قراءت اور آخری رکعتوں میں تسبیح کرتے تھے، میں کہتا ہوں کہ بفرض صحت یہ روایت بیانِ جواز پر محمول ہے جیسا کہ ہمارے علماء قائل ہیں لیکن فرض میں نہ کہ نفل میں، لیکن ایسا کرنا مکروہ اور کرنے والا خطا کار ہے، واللہ اعلم۔

فقیل لابی هریرة انا نکون وراء الامام): یعنی قراءت کریں نہ کریں؟۔

قال اقرأبها: یعنی فاتحہ۔ (فی نفسك): آہستہ۔ شافعیؒ کی دلیل یہی ہے اور یہ ایک صحابی کا مذہب ہے جس سے کسی پر حجت قائم نہیں ہوسکتی باوجود یہ کہ اس میں سرّی کے ساتھ مقید ہونے کا احتمال ہے، جیسا کہ امام مالکؒ اور امام محمد قائل ہیں، یا امام کی قراءت کے درمیانی سکتوں میں پڑھنے پر حمل ہو جیسا کہ مسبوق کیلئے حکم ہے ثناء میں، یا اس کا معنی یہ ہے کہ استحضارِ الفاظ کے ساتھ معنی کو دل میں سوچ لے نہ کہ حروف۔ (فانی سمعت رسول الله ﷺ یقول): اس میں دلیل ہے کہ انہوں نے یہ بات بطورِ استدلال فرمائی۔ (قال الله تعالیٰ قسمت الصلوٰۃ): یعنی فاتحہ، فاتحہ کو صلوٰۃ سے تعبیر کیا کیونکہ یہ بھی قراءت اور نماز کا جزء ہے بقولِ ابن الملکؒ کے، اور بقولِ بعض قراءت فی الصلوٰۃ مراد ہے اس صورت میں مجازاً (کل کا اطلاق جزء پر کر کے) کہا گیا اس لئے کہ یہ بھی نماز کا رُکن ہے یا مضاف محذوف ہے یعنی قراءۃ الصلوٰۃ بقولِ زین العرب اس کی تائید اگلے جملہ: بینی وبین عبدی نصفین سے ہوتی ہے کیونکہ اصل نماز تو خالص اللہ کیلئے ہے، پس معلوم ہوا کہ اس سے مراد قرآن ہے اور حدیث کا تتمہ فاتحہ مراد ہونے پر دالّ ہے اور تنصیف آیاتِ سورت پر، کیونکہ آیات سات ہیں تین میں ثناء اور تین میں سوال

ہے اور درمیانی آیت نصف ثناء اور نصف دُعا پر مبنی ہے، کیونکہ تسمیہ فاتحہ کی آیت نہیں ہے، جواب یہ ہے کہ تنصیف تمام نماز کی طرف راجع ہے نہ کہ کہ صرف فاتحہ کی طرف جیسا کہ الفاظ (الصلوٰۃ) ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ فاتحہ کے ساتھ خاص کامل آیات کی طرف راجع ہے اور امام ابوحنیفہؒ اور متبعین نے اس حدیث سے تسمیہ کے فاتحہ کا جز نہ ہونے پر اور طرح دلیل بنائی ہے اور وہ یہ ہے کہ حدیث قدسی میں تسمیہ نہیں ہے، جواب یہ ہے کہ بعض طرق میں یہ الفاظ ملتے ہیں: **فاذا قال العبد بسم الله الرحمن الرحیم یقول الله تعالٰی ذکرنی عبدی**، میرکؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ روایت بقول ابن حجرؒ ضعیف ہے پھر فرمایا ہوسکتا ہے اس وقت تک تسمیہ کا نزول نہ ہوا ہو (اگر چہ یہ جواب بعید ہے) کیونکہ اقرء جو صحیح قول کے مطابق سب سے پہلے نازل ہوئی کے شروع میں بسم اللہ نہیں ہے، اور یہ بعید اس لئے کہ اس کے راوی ابو ہریرہؓ ہیں اور وہ ۷ھ میں اسلام لائے مگر یہ کہ ابو ہریرہؓ کسی اور سے اور وہ نبی علیہ السلام سے روایت کرے، اور یہ بھی مروی ہے کہ فرمایا مجھ پر سب سے بسم اللہ نازل ہوئی لیکن یہ روایت ثابت نہیں، جواب یہ ہے کہ اس کا ذکر نہ کرنا اس کے مستقل ہونے کے باوجود فاتحہ کے ساتھ خاص نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کو مستقل کہنا ممنوع اور متدل بہ کا محتاج ہے، واللہ اعلم اور بقول بعض کے تنصیف معنی کے اعتبار سے ہے لفظ کے نہیں اس لئے کہ دُعا کا نصف ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ ثناء کے نصف سے زیادہ ہے۔ اور ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ [الفاتحہ: ۵] اور بقولِ ابن حجرؒ کے نصفین اس اعتبار سے ہے کہ بعض آیات کا نفع دنیوی وآخروی ظاہر ہے، جیسے اس کے سوال کا پورا ہونا اور مرغوب چیز کا مل جانا، اور بعض آیات کا فائدہ سوائے عبادت اور امتثالِ امر کے دنیا میں کچھ نہیں لہٰذا وہ اِس اعتبار سے صرف اللہ کی طرف راجع ہے اور اُس اعتبار سے بندہ کی طرف، اگر چہ عبادت کے اعتبار سے تمام آیات بندہ کی طرف اور عظمت وجلال کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں۔

ولعبدی ماسال: یعنی ایک نصف، (آدھا آدھا) جو بندہ نے مجھ سے مانگا اور بعینہٖ اس کو سوال کردہ چیز ملے گی اگر اس کا ملنا سوال پر معلق ہو، ورنہ اس کو دیا جائے گا یعنی درجات بلند ہوں گے یا بلا ہٹا دی جائے گی، وغیرھما۔ اور اظہر یہ ہے کہ تقدیری عبارت یہ ہے کہ: **لذاتی ما وصف من الثناء ولعبدی ماسئال من الدعا** ''یعنی ثناء میرے لیے اور دُعا بندہ کیلئے'' اور اسی وجہ سے فرمایا: **فاذا قال العبد**۔

اور کمال انسان اور جمال احسان کی انتہاء ہے اسی وجہ سے آپ علیہ السلام کی بزرگی اور امامت اور کراہت کے مقام میں اس لفظ سے توصیف کی گئی: **سبحان لذی اسری بعبده لیلا، اور نزل الفرقان علی عبده، فاوحی الی عبده ما اوحی**۔ صوفیہ کے کلام میں ہے کہ عبودیت سے اعلیٰ مقام کوئی نہیں کیونکہ مخلوق کا حق تعالیٰ سے یہی واسطہ ہے۔

الحمد لله رب العالمین، قال الله حمدنی عبدی واذا قال الرحمن الرحیم: ''جر'' کے ساتھ حکایۃً۔

قال الله: بقولِ بعض کے ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے بطورِ فخر کہتے ہوں۔ (**اثنی علی عبدی**): ظاہر یہ ہے کہ حمد وشکر سے مراد اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی رحمتوں اور اس کی شفقت ومہربانی کی باریکیوں پر ثناء بیان کرنا ہے جس نے مخلوق کو عدم کے اندھیرے سے وجود کی روشنی میں نکالا تا کہ بندے اس کی فرضیات میں جلدی کریں اور وہ دنیا سے آخرت کا توشہ اور جنت کے درجات حاصل کرلیں۔ (**واذا قال ملك یوم الدین**): یعنی جزاء۔ (**قال مجدنی**): یعنی عظمت بیان کی۔ (**عبدی**):

تمجید "مجد" سے ہے جس کا معنی کرم یا عظمت ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ تمجید صفاتِ جلالیہ پر تعریف کرنا ہے، اور اس کی مالك یوم الدین کے ساتھ مطابقت کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کو بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دِن اکیلے مالک ہیں جیسا کہ دنیا میں اس اس اعتراف میں تعظیم اور تفویض امر الی اللہ ہے جو کہ مخفی نہیں۔

واذا قال ایاك نعبد: یعنی عبادت خاص تیری ہی کرتے ہیں۔ (**وایاك نستعین**): یعنی عبادت وغیرہ میں تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ (**قال هذا بینی وبین عبدی**): اس لئے کہ عبادت اللہ کیلئے اور استعانت اللہ کی طرف سے ہے، اور ابن ملک وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ قول، **ایاك نعبد وایاك نستعین** بندہ کیلئے ہے۔

ولعبدی ماسال: یعنی اس کے بعد۔ (**فاذا قال اهدنا الصراط المستقیم**): یعنی ہمیں دین اسلام یا نبی علیہ السلام کی پیروی پر ثابت قدم رکھ۔ (**صراط الذین انعمت علیهم**): یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین، اور یہ بصریین کے مذہب پر دلیل ہے کیونکہ "**انعمت علیهم**" تک کو آیت شمار کر کے اس پر وقف کرتے ہیں، بخلاف کوفین کے اس بنا پر کہ فاتحہ کی سات آیات ہیں، اور اس حدیث میں بسم اللہ کا ذکر نہیں ہے۔

غیر المغضوب علیهم: یعنی یہود۔ (**ولا الضالین**): یعنی نصاریٰ۔ (**قال هذا لعبدی ولعبدی ماسال**): یعنی اس کے علاوہ یا یہ بھی اور ساتھ اس کی مثل اور بھی، اور اس سے بعض جاہلین کا جواب بھی ہو گیا کہ دُعا کا کوئی فائدہ نہیں اس لئے کہ مانگی گئی چیز اگر مقدر ہوئی تو مل ہی جائیگی بغیر دُعا کے، ورنہ دُعا سے بھی نہ ملے گی، ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ یہ دُعا جلدی قبول ہونے کا پتہ دیتی ہے، میں کہتا ہوں تمام حاجات کی اجابت کی اُمید کا بھی۔ (رواہ مسلم) میرکؒ کہتے ہیں کہ اس کو ائمہ اربعہ نے نقل کیا ہے۔

نماز میں بسم اللہ پڑھنے کا مسئلہ

۸۲۴: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا كَانُوْا یَفْتَتِحُوْنَ الصَّلٰوةَ بِالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲۲۶/۲ حدیث رقم ۷۴۳۔ وأخرجه مسلم فی صحیحه ۲۹۹/۱ حدیث رقم (۵۰۔۳۹۹) واللفظ للبخاری۔ وأخرجه أبوداؤد فی السنن ۴۹۴/۱ حدیث رقم ۷۸۲۔ وأخرجه الترمذی فی السنن ۱۵/۲ حدیث رقم ۲۴۶ والنسائی فی السنن ۱۳۵/۲ حدیث رقم ۹۰۷۔ وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۲۶۷/۱ حدیث رقم ۸۱۳۔ وأخرجه الدارمی فی السنن ۳۱۱/۱ حدیث رقم ۱۲۴۰۔ وأخرجه أحمد فی المسند ۱۰۱/۳۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما نماز کو الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا۔"

تشریح: **وعن انس ان النبی صلی الله علیه وسلم وابا بکر، وعمر کانوا یفتتحون الصلٰوة بالحمد لله رب العالمین**: اس کا مطلب یہ ہوا کہ تعوذ کی طرح تسمیہ بھی آہستہ پڑھتے تھے پھر فاتحہ بلند آواز سے پڑھتے تھے،

اور شرح السنۃ میں ہے کہ امام شافعیؒ نے حدیث میں یہ تاویل کی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورت سے قبل فاتحہ سے نماز شروع فرماتے تھے اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تسمیہ نہیں پڑھتے تھے جیسا کہ کہا جاتا ہے "قرأ البقرہ"، اور ان کی دوسری روایت میں ہے کہ یہ تینوں حضرات نماز الحمدللہ سے شروع کرتے تھے، قراءت کے شروع میں تسمیہ نہیں کہتے تھے نہ اس کے آخر میں اور ابن حجرؒ نے یہ اضافہ کیا ہے کہ اس کی وضاحت حضرت انسؓ کا اپنا عمل کرتا ہے جو مقبول ہے اور دار قطنی و حاکم صحیح سند سے ثابت ہے کہ وہ خود تسمیہ بلند آواز سے پڑھتے اور فرماتے تھے کہ میں آپ ﷺ جیسی نماز پڑھنے میں کوتاہی نہیں کرتا، میں کہتا ہوں کہ یہ روایت بفرضِ صحت اصح روایت کے معارض ہے پس اس کی طرف التفات نہیں ہوسکتا۔

کیونکہ ان سے مختلف معانی کی روایات ثابت ہیں ان میں سے ایک ان کے یہ الفاظ ہیں، کبرت و نسیت، اور ان سے پوچھا گیا کہ آپ علیہ السلام نماز فاتحہ سے شروع فرماتے تھے یا تسمیہ سے تو انہوں نے فرمایا تم مجھ سے ایسی بات پوچھتے ہو جو مجھے یاد نہیں اور اس سے قبل کسی نے پوچھی نہیں، اور اگر جہر کا ثبوت مان لیا جائے تو وہ بیان جواز یا اعلام پر محمول ہوگا تعلیم کیلئے جیسا کہ ساری نمازوں میں قراءت کے سماع میں ہے، اور اس کا رد مسلم شریف میں انسؓ کے اپنے الفاظ سے ہوتا ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ و ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی میں نے ان کو تسمیہ پڑھتے نہیں سُنا۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ انسؓ نے قراءتِ تسمیہ کی نفی نہیں کی بلکہ اخفاء کی وجہ سے سماع کی نفی کی ہے اس دلیل سے جس کی تصریح انہوں نے خود کی ہے کہ: **فکانوا لا یجھرون** ...... اس کو احمد و نسائی نے روایت کیا صحیح کی شرط پر، اور ابن حجرؒ نے عجیب بات کی ہے کہ یہ روایتِ ترمذی کے معارض ہے جو حضرت عباسؓ سے مروی ہے فرمایا آپ علیہ السلام نماز تسمیہ سے شروع فرماتے تھے، اس لئے کہ یہ روایت اس کے معارض نہیں اس لئے کہ اثبات سے اس کا اخفاء اور نفی سے جہر مراد ہے اور معارضہ تسلیم کرنے کی صورت میں بھی ترمذی کی روایت جس کی صحت بھی غیر معروف ہے شیخین وغیرہ کی روایت کے معارض کیسے ہوسکتی ہے، اور ابن جوزیؒ نے فرمایا ہے کہ جہر کے متعلق کوئی روایت بھی صحیح نہیں، اور بعض شوافع کا مسلم کی دو روایتوں کا یہ جواب دینا (کہ دونوں روایتیں ایک دوسری کے الفاظ کیلئے روایت بالمعنی ہیں، راوی نے اپنی سمجھ کے مطابق اس کو تعبیر کیا ہے اور اگر دوسرے کو وہ روایت بلفظہٖ پہنچتی تو وہ اس کو درست کہتا) بے موقع طعن کرنا ہے، اس لئے کہ اگر یہ دروازہ کھل گیا تو خطاب کا دروازہ بن ہوجائے گا، پھر کہا جائے گا تیرے پاس کیا دلیل ہے کہ بخاری کے رواۃ نے باللفظ اور مسلم کے رواۃ نے بالمعنی نقل کیا ہے، باجود یہ کہ دو سندیں ایک سند سے قوی ہوتی ہیں اور زیادتیٔ ثقہ بالاجماع مقبول ہے، پس غور وفکر کر کیونکہ یہ پھسلنے کی جگہ ہے۔ (رواہ مسلم)

میرکؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث انسؓ کو امام بخاریؒ باب **مایقول بعد التکبیر** میں حرف بحرف اس لفظ کے ساتھ لائیں ہیں اس لئے مصنف اس کے آخر میں، **متفق علیہ واللفظ للبخاری** کہنا زیادہ بہتر تھا' خوف غور کرلو اور بقول ابن حجرؒ مسلم نے اس کو روایت کیا ہے اسی طرح بخاریؒ نے بھی، اس کے الفاظ یہ ہیں: **کان النبی و ابو بکر، عمر، یفتتحون الصلٰوۃ بالحمد للہ رب العالمین**، لہٰذا متفق علیہ کہنا مناسب تھا و **لفظہ لمسلم**، بلکہ **لفظہ لمسلم** کہنے کی ضرورت نہ تھی اس لئے کہ اس طرح کا اختلاف اتفاق کیلئے نقصان دہ نہیں اور اختلافِ لفظی حرف وہاں ذکر کیا جاتا ہے جہاں کسی درجہ میں اختلاف

معنوی بھی ہو۔

آمین کہنے کا مسئلہ

۸۲۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَمَّنَ الْاِمَامُ فَاَمِّنُوْا فَاِنَّهٗ مَنْ وَافَقَ تَاْمِیْنُهٗ تَاْمِیْنَ الْمَلَائِکَةِ غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ (متفق علیه وفی روایة) قَالَ اِذَا قَالَ الْاِمَامُ غَیْرِالْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ فَقُوْلُوْا آمِیْنَ فَاِنَّهٗ مَنْ وَافَقَ قَوْلُهٗ قَوْلَ الْمَلَائِکَةِ غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِیِّ وَلِمُسْلِمٍ نَحْوَهٗ وَفِیْ اُخْرٰی لِلْبُخَارِیِّ قَالَ اِذَا اَمَّنَ الْقَارِیُٔ فَاَمِّنُوْا فَاِنَّ الْمَلَائِکَةَ تُؤَمِّنُ فَمَنْ وَافَقَ تَاْمِیْنُهٗ تَاْمِیْنَ الْمَلَائِکَةِ غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ۔

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲۶۲/۲حدیث رقم ۷۸۰۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ۳۰۷/۱حدیث رقم (۷۲۔۴۱۰) وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۵۷۶/۱حدیث رقم ۹۳۶۔وأخرجه الترمذی فی السنن ۳۰/۲حدیث رقم ۲۵۰۔وأخرجه النسائی فی السنن ۱۴۴/۲حدیث رقم ۹۲۸۔وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۲۷۷/۱حدیث رقم ۸۵۱۔وأخرجه مالك فی الموطأ ۸۷/۱۔حدیث رقم ۴۵من کتاب الصلاة ۔ أما روایة"إذا قال الامام : غیر المغضوب علیهم ولا الضالین"فقد أخرجها : البخاری فی صحیحه ۲۶۶/۲حدیث رقم ۷۸۱ومسلم بنحوها۳۰۷/۱حدیث رقم (۷۶۔۴۱۰)۔وأبو داوٗد فی السنن ۵۷۵/۱حدیث رقم ۹۳۵۔والنسائی فی السنن ۱۴۴/۲حدیث رقم ۹۲۹۔والدارمی فی السنن ۳۱۴/۱حدیث رقم ۱۲۴۶۔وأخرجه مالك فی الموطأ ۸۷/۱۔حدیث رقم ۴۵من کتاب الصلاة ۔وروایة "إذا امن القاریء......"فقد أخرجها : البخاری فی صحیحه ۲۰۰/۱۸حدیث رقم ۶۴۰۲۔والنسائی فی السنن ۱۴۳/۲حدیث رقم ۹۲۵۔وابن ماجة فی السنن ۲۷۷/۱۔حدیث رقم ۸۵۲والدارمی فی السنن ۳۱۴/۱حدیث رقم ۱۲۴۵وأحمد فی المسند ۴۴۹/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ کیونکہ جس کی آمین ملائکہ کی آمین کے موافق ہو جاتی ہے تو اس کے پہلے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ (بخاری، مسلم) ایک روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔ کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگی تو اس کے پہلے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں اور مسلم کے الفاظ بھی اسی کے مثل ہیں اور بخاری کی ایک دوسری روایت کے الفاظ اس طرح ہیں جب قاری آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ کیونکہ ملائکہ بھی آمین کہتے ہیں اور جس کی آمین ملائکہ کی آمین کے موافق ہوگی تو اس کے پہلے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

تشریح: **وعن ابی هریرة قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا امن الامام**: تشدیدِ میم کے ساتھ یعنی آمین کہے۔

فامنوا: بقول خطابیؒ یعنی امام کے ساتھ آمین کہو، اور تاخیر پر دلالت نہیں کرتا جیسا کہ اذا رحل الامیر فارحلوا میں یعنی امام جب آمین کا ارادہ کرے تو اس کے ساتھ ہی آمین کہو، آئیندہ آنے والی روایت کی وجہ سے، اور یہ معنیٰ ہمارے مذہبِ آمین بالسر کے مطابق متعین ہے۔ (فانہ): ضمیر شان ہے۔ (من وافق): شرح السنۃ میں ہے کہ "فانہ من وافق" کا مضمر پر عطف ہے اور وہ تامینِ ملائکہ کی خبر ہے جیسا کہ بعد والے قول میں صراحت ہے کہ: اذا امن القاری فامنوا فان الملائکتہ تومن فمن وافق ...... یہ حدیث طیبیؒ نے نقل کی ہے موافقت سے مطابقت مراد ہے۔ (تامینہ): یعنی اخلاص وخشوع میں، ایک قول میں اجابت اور ایک دوسرے قول میں وقت مراد ہے، اور یہی صحیح ہے اور ابن الملکؒ کا قول ہے کہ اس قول کی تائید اگلی روایت: فانہ من وافق قولہ قول الملائکۃ سے ہوتی ہے۔ (تامین الملائکتہ): بقولِ بعض محافظ فرشتے مراد ہیں۔ ابن دقیق العید اور سبکی نے اسی کو راجح قرار دیا ہے اور بقولِ بعض کوئی اور فرشتے، اس لئے کہ ایک روایت میں ہے: من وافق قولہ قول اھل السماء۔ اور عسقلانیؒ نے بعض سے اس کا مختار ہونا نقل کیا ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ ان فرشتوں سے مراد مؤمنین کیلئے استغفار ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بظاہر یہ اختلاف لفظی ہے اس لئے کہ فرشتے آسمان ہی کی مخلوق ہے اگر چہ زمین پر ہوں محافظ ہوں یا کوئی اور، اور ظاہر ہے کہ وہ نمازی کے اھدنا...... پر آمین کہتے ہیں تو یہ استجب یا اللّٰہم فعل کے معنی میں ہوا۔ (غفرَ): مجہول، اور بقولِ بعض معروف ہے۔ اور ایک نسخہ میں "غفر اللہ" ہے۔ (لہ ما تقدم من ذنبہ): یعنی صغیرہ گناہ اور احتمال کبیرہ کا بھی ہے، بعض طرق میں۔ "ما تاخر" کی زیادتی ہے، اور یہ زیادتی شاذ ہے جس کے دوسرے بھی ہیں لیکن وہ ضعیف ہیں۔ بقول یہ روایت "متفق علیہ" ہے۔

وفی روایۃ: یعنی متفق علیھا روایت۔ (قال): یعنی نبی علیہ السلام۔ (اذا قال الامام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقولوا، آمین): "مد" کے ساتھ، اور قصر جائز ہے۔ اور شرح ابھری میں شیخ کا قول ہے کہ یہ تمام روایات اور قراء سے "مد" اور تخفیف کے ساتھ ثابت ہے، اور یہ اسم فعل ہے جو "اسمع" اور "استجب" کے معنی میں ہے یا اس کا معنیٰ کذالك فلیکن ہے، یا بقول ابن الملکؒ اسماء باری تعالیٰ میں سے ایک نام ہے اور بقولِ ابھری کے عبد الرزاق نے ابو ہریرہؓ سے سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا ہے یا ابھری کے بیان کے مطابق اللھم أمنا بخیر کے معنی میں ہے، اور تخفیف کے ساتھ پڑھنے کی کوئی ظاہر وجہ نہیں ہے البتہ آمین تشدید اور "مد" کے ساتھ پڑھنا غلط ہے، اور قاری کی نماز کے فساد میں اختلاف ہے اور اصح عدم فساد ہے کیونکہ قرآن میں بھی اس طرح آیا ہے: ﴿وَلَآ آٰمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ﴾ [المائدہ: ۲] یعنی ارادۂ بیت الحرام، اس کا معنیٰ أمنا بخیر ہے (یعنی ہمارے ساتھ خیر کا ارداہ فرما) حال کوننا قاصدین طاعتك اور رضاء لك اوبابك اوسؤالك یعنی جبکہ ہم تیری طاعت، تیری رضا تیرے در پر سوال کے قصد سے حاضر ہیں۔ البتہ ابن حجرؒ کا قول یعنی ارادۂ تامین کے ساتھ آمین کہنا، صحیح نہیں۔

فانہ من وافق قولہ قول الملائکۃ غفرلہ ما تقدم من ذنبہ، ھذا لفظ البخاری ولمسلم نحوہ: اسی معنی کے ساتھ۔

وفی اخری للبخاری قال: یعنی نبی علیہ السلام۔ (اذا امن القاری فامنوا فان الملائکۃ تومن، فمن وافق

تامینہ' تامین الملائکۃ غفرلہ ماتقدم من ذنبہ): اور ابوداؤد وابن ماجہ کی روایت میں ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً منقول ہے وکان اذا قال آمین یسمع من یلیہ من الصف الاول یعنی آپ کی آواز پہلی والے سن لیتے تھے، اور ابن ماجہ نے فیرتج بھا المسجد کا اضافہ کیا ہے یعنی اس کو میرکؒ نے تصحیح سے نقل کیا ہے اور طبرانیؒ نے ایسی سند سے نقل کیا ہے جس میں کوئی ضعف نہیں کہ آپ علیہ السلام جب ولا الضالین کہتے تو رب اغفرلی آمین کہتے، اور تین مرتبہ آمین کہنا بھی مروی ہے اور یہ بھی روایت میں ہے کہ آپ علیہ السلام آمین آہستہ کہا کرتے تھے۔

نماز باجماعت کا طریقہ

۸۲۶: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِذَا صَلَّیْتُمْ فَاَقِیْمُوْا صُفُوْفَکُمْ ثُمَّ لِیَؤُمَّکُمْ اَحَدُکُمْ فَاِذَا کَبَّرَفَکَبِّرُوا وَاِذَا قَالَ غَیْرِالْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ فَقُوْلُوْا آمِیْنَ یُجِبْکُمُ اللّٰہُ فَاِذَا کَبَّرَوَرَکَعَ فَکَبِّرُوْا وَارْکَعُوْا فَاِنَّ الْاِمَامَ یَرْکَعُ قَبْلَکُمْ وَیَرْفَعُ قَبْلَکُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فَتِلْکَ بِتِلْکَ قَالَ وَاِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ فَقُوْلُوْا اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ یَسْمَعُ اللّٰہُ لَکُمْ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم مطولًا في الصحيح ۳۰۳/۱ حديث رقم (۶۲-۴۰۴)۔ وأخرجه أبوداوٗد في السنن ۵۹۴/۱ حديث رقم ۹۷۲۔ وأخرجه النسائي في السنن ۱۹۶/۲ حديث رقم ۱۰۶۴ وأخرجه الدارمي في السنن ۳۴۳/۱ حديث رقم ۱۳۱۲۔ وأخرجه أحمد في المسند ۴۰۱/۴۔

ترجمہ: ''حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم نماز پڑھنے لگو تو اپنی صفوں کو سیدھا کرو۔ اور پھر ایک آدمی تم میں سے تمہیں امامت کرائے۔ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو۔ اور جب امام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔ پڑھے تو تم آمین کہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول کرے گا۔ پھر جب امام تکبیر کہے اور رکوع کرے تو تم بھی تکبیر کہو اور رکوع کرو۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ امام تم سے پہلے رکوع کرتا ہے اور تم سے پہلے سر اٹھاتا ہے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا امام کا پہلے سر اٹھانا پہلے رکوع کرنے کا بدلہ ہے اور جب امام۔ سمع اللہ لمن حمدہ۔ کہے تو تم اللّٰھم ربنا ولك الحمد۔ کہو اللہ تعالیٰ تمہاری تعریف سنتا ہے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: وعن ابی موسیٰ الاشعری قال: قال رسول اللہ صلی اللہ وسلم اذا صلیتم: یعنی نماز کا ارادہ کرو۔ (فاقیموا): یعنی سیدھا کرو۔ (صفوفکم): لہٰذا اس طرح سیدھی کرنا کہ صف ٹیڑھی اور خلا نہ ہو سنت ہے۔ (ثم لیؤمکم): ''لام'' کے کسرہ وسکون کے ساتھ۔ (احدکم): اور افضل کا امام بننا افضل ہے، لہٰذا یہ اکبر کم والی روایت کے منافی نہیں، اس لئے کہ وہ افضلیت کے بیان کیلئے اور یہ اصل جماعت کے حصول کے بیان کیلئے ہے، یا اس صورت پر محمول ہے جب تمام لوگ عمر اور افضلیت میں برابر ہوں۔

فاذ اکبر: بقولِ ابن الملکؒ کے مراد امام کی موافقت کا وجوب بیان کرنا ہے اور بقولِ ابن حجرؒ اس روایت سے معلوم ہوا کہ مقتدی کی تمام تکبیر تحریمہ کا امام کی تمام تکبیر سے مؤخر ہونا واجب ہے پس جس نے امام سے پہلے تکبیر کہہ دی یا ساتھ ساتھ تو یا اس میں شک ہوا تو اس کی نماز باطل ہے۔(**واذا قال غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقولوا آمین**):اس میں سکوت اور استماع کی طرف اشارہ ہے، بقولِ ابن حجرؒ اس سے امام کی آمین کے ساتھ ساتھ آمین کہنا مستحب ثابت ہوا، اس لئے کہ یہ بات پہلے معلوم ہوگئی کہ امام کیلئے فاتحہ سے فراغت کے بعد آمین کہنا مندوب ہے اور مقتدی کو بھی اس حدیث میں امام کی فراغت کے بعد آمین کہنے کا حکم ہے لہٰذا دونوں آمین ایک وقت میں ہوئی، پس جمع بین الحدیثین کیلئے سابق خبر کا معنی یہ متعین ہوا کہ جب امام ارادہ تامین کرے تو تم آمین کہو۔

اس میں اتنی بات ہے کہ اس شرطیت اور سابقہ شرطیت میں کوئی واضح فرق نہیں اس اعتبار سے کہ پہلی وجوب اور دوسری ندب کا فائدہ دیتی ہے ہاں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کسی اور دلیل سے متضاد ہے،(**فتدبر**)(**یجبکم اللہ**): جواب امر ہونے کی وجہ سے مجذوم ہے۔

فاذا اکبر، ورکع، فکبروا وارکعوا فان الامام یرکع قبلکم ویرفع قبلکم:اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: **فان الامام انما جعل لیوتم به**،(امام اقتداء کیلئے بنایا جاتا ہے) بقولِ طیبیؒ کے، یہ جزاء کے شرط پر مرتب ہونے کی علت ہے اس لئے کہ جزاء مسبب پر شرط ہے اور سبب ٔمسبب پر مقدم ہوتا ہے۔(**فقال**):یعنی علت بیان کرنے بعد۔(**رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم**):یہی درست اور تصحیح شدہ ایسے نسخوں کے موافق ہے جن میں صلوٰۃ وسلام تحریر ہے، جو اس کی تصریح کرتا ہے کہ قائل آپ علیہ السلام ہی ہیں۔اور ابن حجرؒ کو غلطی لگی کہ انہوں راوی ابوموسیٰ کو قائل قرار دیا۔(**فتلك بتلك**): بقول نوویؒ کے اس کا معنی یہ ہے کہ امام کے تم سے پہلے رکوع میں چلے جانے سے تمہارے رکوع میں جو کمی آئی امام سے کچھ دیر بعد رکوع سے اٹھنے سے دور ہو جائیگی اور تمہارا عمل امام کے برابر ہو جائے گا۔

قال:یعنی نبی علیہ السلام نے۔(**واذا قال**):یعنی امام۔(**سمع اللہ لمن حمدہ**)ضمہ اور سکون کے ساتھ۔(**فقولوا اللھم ربنا لك الحمد**):امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس میں ان ائمہ کے مذہب کی دلیل ہے جو مقتدی کے "ربنا لک الحمد" سے زائد اور تسمیع نہ کہنے کے قائل ہیں اور ہمارا مذہب یہ ہے کہ مقتدی ومنفرد تحمید وتسمیع دونوں کہے اس لئے کہ آپ علیہ السلام کا فرمان ہے نماز ایسی پڑھو جیسے مجھے پڑھتا دیکھتے ہو۔

اور اس میں بات یہ ہے کہ دلیل قولی دلیل فعلی سے قوی ہوتی ہے کیونکہ آپ علیہ السلام کا فرمان شریعت ہے جس میں خصوصیت کا احتمال نہیں بخلاف فعل کے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں کہنا منفرد کیلئے ہو اور صرف تحمید جماعت کی حالت پر محمول ہو، اسی سے جمع بین الروایات حاصل ہو جائے گا۔اور حدیث سابق صلو کما...... کی موافقت بھی، واللہ اعلم۔اور امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہاں **لك الحمد** "واؤ" کے بغیر ہے اور بعض جگہ "واؤ" کے ساتھ ہے، اور مختار یہ ہے کہ دونوں طرح جائز ہے کسی کو ترجیح نہیں، اور ہمارے اصحاب میں سے مولانا ابوالمکارم نے شرح النقایہ میں فرمایا ہے کہ تحمید کے بارے میں چار روایات آئی ہیں:

① ربنا لك الحمد، قنیہ میں اسی کو صحیح کہا ہے اور امام طحاویؒ نے اس کو اصح کہا ہے، اور قنیہ میں ② ربنا ولك الحمد کو اظہر قرار دیا۔ ③ واللھم ربنا لك الحمد محیط میں اسی کو افضل کہا ہے۔ ④ اللھم ربنا ولك الحمد اور یہ تمام نبی علیہ السلام سے منقول ہیں (کافی میں اسی طرح ہے)۔

اور ابن قیمؒ نے ہدیہ میں کہا ہے کہ یہ تمام نبی علیہ السلام سے صحیح سند سے ثابت ہیں مگر اللھم اور ''واؤ'' کو جمع کرنا صحیح نہیں، لہٰذا ابن حجرؒ کا لفظ حدیث کے بعد، او ولك الحمد وھو الافضل کہنا درست نہیں، قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ ''واؤ'' کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں لفظ ''ربنّا'' ماقبل سے متعلق ہوگا، تقدیری عبارت یہ ہوگی: سمع الله لمن حمده یا ربنا فاستجب حمدنا ودعاء نا ولك الحمد، اور اس پر ہونے والا اعتراض پہلے گذر چکا۔ (یسمع الله لکم): بقولِ ابن ملکؒ ''عین'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ (یعنی قبول کرنا) اور اصل میں جواب امر کی وجہ سے مجزوم تھا پھر کسرہ کے ساتھ متحرک ہوا۔ امام ابوحنیفہؒ و مالک واحمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام صرف سمع الله لمن حمده کہے اس لئے کہ دو ذکروں کے درمیان تقسیم شرکت کو ختم کر دیتی ہے۔ (رواہ مسلم) بقولِ میرک کے ابوداؤد ونسائی نے بھی۔

۸۲۷: وَفِیْ رِوَایَةٍ لَهٗ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَقَتَادَةَ وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا۔

ترجمہ: ''اور مسلم کی دوسری روایت جو حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت قتادہؓ سے مروی ہے کہ جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔''

تشریح: وفی روایة له: یعنی مسلم اور بقول میرک ابن ماجہ کی بھی، (عن ابی ھریرہ وقتادة): یعنی وعن قتادہ، لہٰذا یہ اثر ہوگی نہ کہ حدیث، میرک کا کہنا ہے کہ ظاہری عبارت مقتضی ہے کہ یہ زیادتی مسلم نے حدیث ابی ہریرۃ سے تخریج کی ہے حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ مسلم کے کلام سے سمجھ آتا ہے کہ مسلم نے ابوہریرہ کی اس حدیث کی تخریج ہی نہیں کی کیونکہ ان کی کتاب میں حدیث ابی موسیٰ کے بعد لکھا ہے کہ مسلم سے پوچھا گیا، کیا حدیث ابی ہریرۃ: واذا قرء فانصتوا صحیح ہے؟ تو انہوں نے فرمایا صحیح ہے پھر کہا کہ پھر اس حدیث کو اپنی کتاب میں کیوں نہیں رکھتے؟ تو انہوں نے فرمایا میں اپنے نزدیک تمام صحیح حدیثیں اس میں نہیں لکھتا بلکہ اس میں صرف مجمع علیہا روایات لکھتا ہوں۔ اور امام نوویؒ نے اپنی شرح میں حفاظ کا قول نقل کیا ہے کہ: فاذا قرء فانصتوا کا جملہ آپ علیہ السلام سے صحیح طریق سے ثابت نہیں، اور بیہقی نے اس کے بطلان میں خوب مبالغہ کیا اور اس کی علتیں بیان کی ہیں اور اس کا باطل ہونا محی بن معین، ابوحاتم رازی، ابوداؤد، ابوعلی نیسا پوری وغیرہ سے نقل کیا ہے۔ (واذ قرء فانتصوا): یعنی چپ رہو، امام ابوحنیفہؒ قائل ہیں کہ مقتدی قراءت نہ کرے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک قراءتِ فاتحہ کے وقت، اور ابن حجرؒ کے بقول یہ سورت پر محمول ہے، اور یہ حمل بعید ہے ساتھ اس کے کہ امام شافعیؒ کی اس قول سے مراد بھی بیان نہیں کہ آیا امام کے قراءتِ سورت کے وقت چپ رہو یا قراءتِ امام کے وقت سورت پڑھنے سے خاموش رہو، اور اس میں چند قابلِ فہم باتیں ہیں جو ان کے مقتضاءِ مذہب کے مطابق صحیح نہیں، پس غور کر کے انصاف کرو اور تیرہ گوں نہ ہونا، بقولِ ابن ہمامؒ کے واذا قرء فانتصوا کے الفاظ مسلم نے حدیثِ اذا اکبر فکبروا میں زائد بیان کیے ہیں اور امام ابوداؤدؒ نے اس کو ضعیف قرار دیا اور اس کے صحت طریق اور رواۃ کے ثقہ ہونے کے بعد اس طرف التفات نہیں کیا اور یہ وہی شذوذ ہے جو عند المحدثین مقبول ہے اور

اس طرح کا شذوذ حدیثِ من كان له امام فقرأة الامام له قرأة میں بھی واقع ہے، اور شرحِ ہدایہ میں اس حدیث اور اس کے طریق کے متعلق تفصیلی گفتگو ہے اگر تفصیل کی ضرورت سمجھو تو اس کو دیکھو، اور زیادتی والی حدیث مستقل طور پر فصل ثانی میں آرہی ہے جس کو ابوداؤد، نسائی ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

نماز میں قراءت کا مسئلہ

۸۲۸: وَعَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقْرَأُفِي الظُّهْرِ فِي الْاُوْلَيَيْنِ بِاُمِّ الْكِتَابِ وَسُوْرَتَيْنِ وَفِي الرَّكْعَتَيْنِ الْاُخْرَيَيْنِ بِاُمِّ الْكِتَابِ وَيُسْمِعُنَا الْاٰيَةَ اَحْيَانًا وَيُطَوِّلُ فِي الرَّكْعَةِ الْاُوْلٰى مَا لَا يُطِيْلُ فِي الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ وَهٰكَذَا فِي الْعَصْرِ وَهٰكَذَا فِي الصُّبْحِ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۲۶۰/۲حديث رقم ۷۷٦۔وأخرجه مسلم فی صحيحه ۳۳۳/۱حديث رقم (۱۵٤۔٤۵۱) واللفظ للبخاری ۔وأخرجه النسائی فی السنن ۱٦٦/۲حديث رقم ۹۷۸۔وأخرجه أحمد فی المسند ۳۸۳/٤۔

ترجمہ: ''حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ دو سورتیں پڑھتے تھے۔ اور بعد کی دونوں رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے۔ اور کبھی کبھی ہمیں بھی کوئی آیت سنا دیا کرتے تھے اور پہلی رکعت کو دوسری رکعت کی بنسبت زیادہ لمبا کرتے تھے۔ اسی طرح عصر اور فجر کی نماز میں بھی کرتے تھے۔'' (بخاری، مسلم)

تشریح: وعن ابی قتادہ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الظھر فی الأولیئین بام الکتاب سورتین: یعنی ہر رکعت میں ایک سورت۔ (وفی الرکعتین الاخریین بام الکتاب): یعنی صرف، لہٰذا اس حدیث کی بناء پر آخری رکعتوں میں سورت پڑھنا مسنون نہ ہوا نیز اس حدیث کی وجہ سے جو شیخین نے مغرب کے بارے میں اور نسائی نے بھی سندِ حسن کے ساتھ روایت کی ہے اور یہی ہمارا مذہب ہے، بقولِ ابن حجرؒ بعض اس کی سنیت کے قائل ہیں اتباع کی وجہ سے، شیخین نے ظہر وعصر اور مالکؒ نے مغرب کے بارے میں روایت کیا ہے اور عشاء بھی اس پر قیاس ہے۔ (ویسمعنا): اسماع سے۔ (الایۃ): یعنی مطلق فاتحہ سے یا پہلی رکعتوں کی سورت سے۔ (احیانا): یعنی ظہر میں قراءتِ سری ہونے کے باوجود کبھی ایسا ہوتا تھا، بقولِ طیبیؒ کے مطلب یہ ہے کہ فاتحہ وسورت کے بعض کلمات بلند آواز سے پڑھتے اس طرح کہ لوگ سُن لیں کہ کونسی سورت پڑھتے ہیں، بقول ابن ملک تاکہ سننے والا اس جیسی نماز میں ایسی ہی قراءت کرے، اور بقول ابن حجرؒ ایسا غور وفکر میں غلبہ استغراق کی وجہ سے بلاقصد ہو جاتا تھا، یا بیان جواز کیلئے یا قرآت یا قراءتِ سورت بتانے کیلئے تھا تاکہ لوگ آپ ﷺ کی پیروی کریں اور بیان جواز کا قول ہمارے نزدیک درست نہیں (البتہ جہر اور اخفاء امام پر واجب ہیں) مگر یہ کہ بیان جواز سے یہ مراد ہو کہ ایک دو آیتوں کا سننا سری ہونے سے خارج نہیں کرتا۔

ویطول: تشدید کے ساتھ۔ (فی الرکعۃ الاولی مالا یطیل): نکرہ موصوفہ ہے یعنی اطالۃ لا یطیلھا۔ (فی الرکعۃ

الثانیه): یا مصدر یہ ہے، یعنی غیر اطالته فی الثانیة، اس صورت میں الرکعة الاولی ما ضمیر کے ساتھ ملکر مصدر محذوف کی صفت ہوگی۔ ابن حجرؒ اس کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ پہلی رکعت میں نشاط زیادہ ہوتا ہے لہٰذا اس میں خشوع خضوع بھی اسی حساب سے ہوگا لہٰذا پہلی کو لمبا کیا اور باقی کو مختصر کیا تنگ دلی سے بچنے کیلئے، نیز اس لئے بھی تا کہ لوگ رکعت پالیں جیسا کہ راوی بعض طرق میں تصریح کیا ہے، اور شوافع کا پہلی رکعت کو لمبا کرنے کی سنیت میں اختلاف ہے۔ (وهكذا): یعنی صرف پہلی رکعتوں میں قراءت کرنا اور پہلی رکعت کو دوسری کی نسبت لمبا کرنا۔ (فی العصر وهكذا): یعنی پہلی کو لمبا کرنا، بقولِ بعض کے لمبا کرنا ثناء کی زیادتی کے اعتبار سے ہے سوائے فجر کے، اور اس پر ہونے والا اعتراض آگے آئے گا۔ (فی الصبح متفق علیه): بقولِ میرکؒ کے شیخ جزری کے کلام سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ یہ حدیث ابی قتادۃ ان میں سے ہے جو صرف بخاری نے نقل کی ہیں، پس غور کر۔

نماز میں قیام کی مقدار

۸۲۹: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ كُنَّا نَحْزُرُ قِيَامَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِی الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ فَحَزَرْنَا قِيَامَهٗ فِی الرَّكْعَتَيْنِ الْاُوْلَيَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ قَدْرَ قِرَاءَ ةِ الٓمّٓ تَنْزِيْلُ السَّجْدَةِ وَفِیْ روایة فِیْ كُلِّ رَكْعَةٍ قَدْرَ ثَلَاثِيْنَ اٰيَةً وَحَزَرْنَا قِيَامَهٗ فِی الْاُخْرَيَيْنِ قَدْرَ النِّصْفِ مِنْ ذٰلِكَ وَحَزَرْنَا فِی الرَّكْعَتَيْنِ الْاُوْلَيَيْنِ مِنَ الْعَصْرِ عَلٰى قَدْرِ قِيَامِهٖ فِی الْاُخْرَيَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ وَفِی الْاُخْرَيَيْنِ مِنَ الْعَصْرِ عَلَى النِّصْفِ مِنْ ذٰلِكَ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ۱/ ۳۳٤حديث رقم (۱۵٦۔٤۵۲)۔وأخرجه أبوداوٗد جامع بين الروايتين فی سننه ۱/ ۵۰۵ حديث رقم ۸۰٤ والنسائی فی السنن ۱/ ۲۳۷حديث رقم ٤۷۵۔وأخرجه أحمد فی المسند ۳/ ۲۔ وأخرج الرواية الثانية مسلم فی صحيحه ۱/ ۳۳٤حديث رقم (۱۵٦۔٤۵۲)والنسائی ۱/ ۲۳۷حديث ٤۷٦۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کا نماز ظہر اور عصر میں اندازہ کرتے تھے۔ تو ہم نے اندازہ لگایا کہ آپ ﷺ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں الٓمّٓ تَنْزِيْلُ السَّجْدَةِ کی قراءت کے بقدر قیام کرتے تھے۔ اور ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ ہر رکعت میں تیس آیتیں پڑھنے کے بقدر قیام کرتے تھے اور ظہر کی آخری دو رکعتوں میں ہم نے اس سے نصف کا اندازہ لگایا اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں اس سے نصف کے بقدر قیام کیا اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔''

تشریح: وعن ابی سعید الخدری قال کنا نحزر: ''زاء'' کے ضمہ کے ساتھ، ''زاء'' کے بعد ''راء'' الحزر سے، اور اس کا معنی تقدیر اور حرص ہے یعنی اندازہ کرتے تھے۔ (قیام رسول اللہ فی الظھر والعصر) یعنی دونوں نماز میں قیام کی مقدار۔ (فحزرنا): یعنی اندازہ لگایا۔ (قیامه فی الرکعتین الاولین من الظھر قدر قرأة الم تنزیل): رفع کے ساتھ حکایۃً، اور بدلیت کی بناء پر مجرور اور اعنی مقدر خیال کر کے منصوب بھی جائز ہے۔ (السجدة): شرح مسلم میں ہے کہ لفظ سجدہ کو

بدلیت کی وجہ سے مجرور اور بتقدیر اعنی منصوب پڑھنا جائز ہے اسی طرح مبتداء محذوف کی خبر بنا کر مرفوع پڑھنا بھی جائز ہے اور یہ بات مخفی نہیں کہ یہ تینوں صورتیں اس وقت ہیں جب تنزیل حکایۃً مرفوع پڑھا جائے، اور اعراب کی صورت میں سجدۃ کا مجرور ہونا اضافت کی وجہ سے متعین ہے۔ (وفی روایة۔فی کل رکعة): یعنی ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سے ہر ایک کے قیام کا اندازہ کرتے تے۔

قدر ثلاثين آية وحزرنا قيامه في الاخريين: یعنی ظہر کی۔ (قدر النصف من ذلك) اور یہ حدیث دال ہے کہ نبی علیہ السلام آخری دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ سورت بھی ملاتے تھے اور امام شافعیؒ کا قولِ جدید اسی کے موافق ہے لیکن فتویٰ قولِ قدیم پر ہے اور مذہب حنیفہؒ کے یہی موافق ہے، لہٰذا آپ ﷺ کا فعل جواز پر محمول ہوگا نہ کہ سنت پر۔ (وحزرنا): یعنی قیام کا۔

نمازِ ظہر کی قراءت

۸۳۰: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الظُّهْرِ بِاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى وَفِيْ رِوَايَةٍ بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى وَفِي الْعَصْرِ نَحْوَ ذَالِكَ وَفِي الصُّبْحِ اَطْوَلَ مِنَ ذٰلِكَ۔

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۳۳۷/۱ حدیث رقم (۱۷۰۔۴۵۹)۔وأخرجه أبوداؤد مطولاًفی السنن ۵۰۶/۱ حدیث رقم ۸۰۶۔وأخرجه النسائی فی السنن ۱۶۶/۲ حدیث رقم ۹۸۰۔وأخرج الروایة الثانیة مسلم فی صحیحه ۳۳۸/۱ حدیث رقم (۱۷۱۔۴۶۰)وأحمد فی مسنده ۸۶/۵۰۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز میں سورۂ واللیل اذا یغشٰی پڑھا کرتے تھے۔ اور دوسری ایک روایت میں مذکور ہے سورہ سبح اسم ربك الاعلٰی پڑھا کرتے تھے۔ اور عصر کی نماز میں بھی اسی قدر پڑھتے تھے۔ اور فجر کی نماز میں اس سے طویل قراءت کرتے تھے۔'' (مسلم)

تشریح: وعن جابر بن سمرة قال كان النبي صلى الله عليه وسلم يقرء في الظهر بالليل اذا يغشى وفي رواية وبسبح باسم ربك الاعلى وفي العصر نحو ذلك: یعنی قریب قریب مذکورہ سورتوں کے۔ (وفي الصبح اطول من ذلك): یعنی تمام ذکر کردہ سورتوں سے۔ (رواہ مسلم)

علماء فرماتے ہیں کہ قراءت کی مقدار کا اختلاف مختلف احوال کے اعتبار سے تھا چنانچہ جب صحابہؓ کو دیکھتے کہ وہ لمبا کرنے کو ترجیح دیتے ہیں تو لمبا کرتے ورنہ مختصر، اور یہ بھی مروی ہے کہ آپ علیہ السلام فجر میں مؤمنون، روم، یٰسین، واقعہ، قٓ۔ زلزال، معوذتین اور ظہر میں لقمان، الم سجدۃ، زاریات، بروج، طارق، اعلی، غاشیہ، الشمس، الیل پڑھتے تھے لیکن کچھ حصہ بلند آواز سے تعلیم کی غرض سے پڑھتے اور عصر میں طارق، بروج، اعلی اور غاشیہ پڑھتے تھے۔

نمازِ مغرب میں قراءت

۸۳۱: وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ بِالطُّوْرِ. (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/۲۴۷حديث رقم ۷۶۵۔وأخرجه مسلم في صحيحه ۱/۳۳۸حديث رقم (۱۷۴۔۴۶۳) واللفظ له ۔أبوداؤد في السنن۱/۵۰۸حديث رقم ۸۱۰۔والنسائي في السنن ۲/۱۶۹حديث رقم ۹۸۷۔ والدارمي في السنن ۱/۳۳۶۔حديث رقم ۱۲۹۵۔وأخرجه مالك في الموطأ ۱/۷۸حديث رقم ۲۳من كتاب الصلاة ۔وأحمد في مسنده ۴/۸۴۔وابن ماجة في السنن ۱/۲۷۲حديث رقم ۸۳۲۔

ترجمہ: ''حضرت جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب کی نماز میں سورۂ طور پڑھتے ہوئے سنا ہے۔'' (بخاری، مسلم)

تشریح: وعن جبير بن مطعم قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرأ في المغرب بالطور: ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ مغرب کا وقت غروبِ شفق تک رہتا ہے کیونکہ آپ علیہ السلام غور فکر کے ساتھ قراءت فرماتے تھے اور سورت طور اس غور وخوض کے ساتھ پڑھی جائے تو اس سے فراغت غروبِ شفق کے قریب ہی ہو سکتی ہے۔ اور یہ استدلال عجیب وغریب ہے اس لئے کہ ممکن ہے کہ سورت کا کچھ حصہ دو رکعتوں میں یا آدھا حصہ ایک رکعت میں اور دوسرا آدھا دوسری میں پڑھتے ہوں، اور اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے تو بھی وقت مغرب نہیں نکلتا اس لئے کہ یہ پارے کا آٹھواں حصہ بنتی ہے اور ہم مغرب سے عشاء تک دو پارے پڑھ لیتے ہیں۔ باوجودیکہ امام شافعیؒ خروج، وقت تک نماز لمبی کرنے کو جائز کہتے ہیں اور عنقریب فصل ثانی میں آئے گا کہ آپ علیہ السلام نے مغرب میں سورۃ اعراف تلاوت کی۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ بھی روایات میں آیا ہے کہ نبی علیہ السلام مغرب میں الانفال، دخان، توبہ، اعلیٰ، کافرون، التین، القارعہ اور عشاء میں الانشقاق، الشمس، التین پڑھتے تھے۔ (متفق علیہ)

بقول میرکؒ اس کو ابوداؤدؒ، نسائیؒ اور ابن ماجہؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

۸۳۲: وَعَنْ اُمِّ الْفَضْلِ بِنْتِ الْحَارِثِ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ بِالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۰/۵۱۵حديث رقم ۶۱۰۶۔وأخرجه مسلم في صحيحه ۱/۳۳۹حديث رقم (۱۷۸۔۴۶۵)أخرجه أبوداؤد في السنن ۱/۵۰۰حديث رقم ۷۹۰۔وأخرجه النسائي في السنن ۱/۱۷۲حديث رقم ۹۹۸۔وابن ماجة مختصرًا ۱/۳۱۵حديث رقم ۹۸۶۔والدارمي في السنن ۱/۳۳۷حديث رقم ۱۲۹۶۔

ترجمہ: ''سیدہ ام فضل بنت حارث رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نمازِ مغرب میں سورۃ مرسلات تلاوت فرماتے ہوئے سنا۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: وعن ام الفضل بنت الحارث قالت سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرأ في

المغرب بالمرسلات عرفا: یعنی بعض اوقات بیان جواز کیلئے ورنہ اس میں قصار مفصل پڑھنا مستحب ہے۔ (متفق علیه): بقول میرک چاروں ائمہ نے اس کو روایت کیا ہے۔

اقتداء المفترض خلف المتنفل کا حکم

۸۳۳: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ يُصَلِّي مَعَ النَّبِيِّ ﷺ ثُمَّ يَأْتِي فَيَؤُمُّ قَوْمَهُ فَصَلّٰى لَيْلَةً مَعَ النَّبِيِّ ﷺ الْعِشَاءَ ثُمَّ اَتٰى قَوْمَهُ فَأَمَّهُمْ فَافْتَتَحَ بِسُوْرَةِ الْبَقَرَةِ فَانْحَرَفَ رَجُلٌ فَسَلَّمَ ثُمَّ صَلّٰى وَحْدَهُ وَانْصَرَفَ فَقَالُوْا لَهُ نَا فَقْتَ يَا فُلَانُ قَالَ لَا وَاللّٰهِ وَلَآتِيَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَلَاُخْبِرَنَّهُ فَاَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا اَصْحَابُ نَوَاضِحَ نَعْمَلُ بِالنَّهَارِ وَاِنَّ مُعَاذًا صَلّٰى مَعَكَ الْعِشَاءَ ثُمَّ اَتٰى قَوْمَهُ فَافْتَتَحَ بِسُوْرَةِ الْبَقَرَةِ فَاَقْبَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى مُعَاذٍ فَقَالَ يَا مُعَاذُ اَفَتَّانٌ اَنْتَ اِقْرَأْ وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى وَسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٢٥١ حديث رقم ٧٦٩ـ ومسلم في صحيحه ١/٣٣٩ حديث رقم (١٧٧ـ٤٦٤) وأخرجه ابن ماجة في السنن ١/٢٧٣ حديث رقم ٨٣٥ـ وأحمد في المسند ٤/٢٩١ـ

ترجمہ: ''حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبلؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ کر آتے اور پھر اپنی قوم کو نماز پڑھایا کرتے تھے ایک دن انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی اور پھر آ کر اپنی قوم کو نماز پڑھائی اور سورۂ بقرہ کو شروع کیا ایک آدمی سلام پھیر کر جماعت سے نکل آیا اور اکیلے نماز پڑھ کر چلا گیا لوگوں نے جب یہ دیکھا تو اسے کہا اے فلاں کیا تم منافق ہو گئے۔ اس نے کہا نہیں اللہ کی قسم میں منافق نہیں ہوا۔ میں رسول اللہ کی خدمت میں جا کر صورت حال بتاؤں گا۔ چنانچہ وہ آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی ''اے اللہ کے رسول ہم اونٹ والے لوگ ہیں دن کو کام کرتے ہیں اور حضرت معاذ ؓ آپ کے پاس نماز پڑھ کر آئے اور ہمیں نماز پڑھائی اور سورۂ بقرہ شروع کر دی یہ سن کر رسول اللہ ﷺ حضرت معاذ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ''اے معاذ کیا تم لوگوں کو فتنہ میں ڈالنا چاہتے ہو بہتر یہ ہے کہ تم سورۂ والشمس وضحها ، والیل اذا یغشٰی اور سبح اسم ربك الاعلٰی ان جیسی سورتیں پڑھایا کرو۔'' (بخاری، مسلم)

تشریح: وعن جابر قال کان معاذ بن جبل یصلی مع النبی ﷺ: یعنی مسجد نبوی میں ''ﷺ'' یعنی عشاء، پھر اپنی قوم کے پاس جاتے اور ان کو وہ نماز (عشاء) پڑھاتے، بخاری میں صلوٰۃ مکتوبہ کے الفاظ ہیں۔ شمنی شرح نہایہ میں اسی طرح ہے۔ (ثم یاتی): گاؤں کی مسجد میں۔ (فیئوم قومه): قاضی کہتے ہیں کہ حدیث اقتداءِ مفترض خلف المتفصل کے جواز پر دلالت کرتی ہے کیونکہ جو فرض ادا کر چکا اور پھر دوبارہ پڑھے تو وہ نفل ہوں گے۔ بقولِ ابن الملکؒ کے امام شافعیؒ اسی کے قائل ہیں۔ اس میں بات یہ ہے کہ نیت بغیر نیت کرنے والے کے بتائے معلوم نہیں ہو سکتی تو ممکن ہے کہ حضرت معاذؓ نبی علیہ السلام کے پیچھے تعلم اور تبرک اور اپنے سے درفع تہمت نفاق کی غرض سے نفل کی نیت کرتے ہوں پھر قوم کو فرض پڑھاتے ہوں دونوں

فضیلتوں کے حصول کیلئے باوجود یہ کہ عشاء کی نماز تاخیر سے پڑھنا اصح قول کے مطابق افضل ہے، اور اس پر محمول کرنا اولیٰ ہے اس لئے کہ اس پر شوافع بھی متفق ہیں بخلاف پہلے کے۔ قاضی کہتے ہیں کہ حدیث فرض کے اعادہ کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ چھت کا ثبوت ہو تو نقش و نگار ہوتا ہے۔

فصلی: یعنی معاذؓ نے۔ (**لیلة مع النبی ﷺ العشاء ثم اتی قومه فأهم فافتتح بسورة البقرة**): یعنی فاتحہ کے بعد، یا فاتحہ اور سورت البقرۃ کے ساتھ۔ (**فانحرف رجل**): یعنی صف سے نکل گیا، یا قبلہ سے پھیر کر نماز سے الگ ہو گیا (اور وہ آدمی حزام بن ابی کعب انصاری ہیں) یا جدا ہونے کا ارادہ کیا۔ (**فسلم**): بقولِ ابنِ حجرؒ یعنی نماز توڑ دی نہ کہ سلام کے ذریعہ نماز توڑنے کا قصد کیا جیسا کہ بعض عوام کرتے ہیں اس لئے کہ محلِ سلام نماز کا آخر ہے لہٰذا اس پر مقدم کرنا جائز نہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس آدمی نے اس کو محلِ سلام گمان کر کے ایسا کیا ہو اور یہ کوئی حجت نہیں کیونکہ یہ اس شخص کا اپنا گمان اور اجتہاد ہے جس کی آپ علیہ السلام کو خبر نہ ہوئی لہٰذا عوام کے فعل کیلئے حجت نہیں بن سکتی۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا خواص علماء بھی کرتے ہیں اس صحابی کی اتباع میں، اور اگر اس میں اختلاف ہو کہ نماز قطع کرنے کیلئے کھڑا کھڑا سلام ایک طرف پھیرے یا دونوں طرف یا قعدہ میں بیٹھ جائے پھر سلام پھیرے تو حدیث میں جو طریقہ وارد ہے اس طریقہ سے سلام پھیرنے میں سلامتی ہے، واللہ اعلم۔

ثم صلی وحده: یعنی از سرِ نو اکیلے نماز پڑھی اس لئے کہ اس کو معلوم نہ تھا کہ نیت کے ساتھ الگ ہو کر اسی نماز کو پورا کر لینا جائز ہے۔ ابن ملک نے اس کو ذکر کیا ہے۔ اور اس میں ہمارے نزدیک نیتِ مفارقت کے جواز کا وہم ہوتا ہے حالانکہ ایسا نہیں بلکہ مذہب یہ ہے کہ نماز شروع سے پڑھے۔ (**وانصرف**): یعنی مسجد سے نکل گیا۔ (**فقالوا**): یعنی لوگوں نے۔ (**له أنافقت یا فلان؟**): بقولِ طیبیؒ کے انہوں نے تشدیداً کہا، کیا تم نے نماز مختصر کر کے اور نماز توڑ کر منافقین جیسا کام نہیں کیا؟ (**قال لا والله ولآتین**): معطوف بنانا بھی جائز ہے یعنی بخدا میں منافق نہیں ہوں اور میں رسول اللہ ﷺ کے پاس جاتا ہوں۔ (**رسول الله**): یا نئی قسم ہے اور مقسم بہ مقدر ہے۔ البتہ ابن حجرؒ کا لآتین کو مقسم علیہ کہنا خطاء ہے جو اصل کی تصحیح نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی، اس لئے کہ صحیح نسخوں میں ولآتین "واؤ" کے ساتھ ہے۔ (**فلا خبرنه فاتی رسول الله ﷺ فقال یا رسول الله انا اصحاب نواضح**): ناضحہ کی جمع ناضح کی مؤنث ہے، اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس پر پانی لاد کر درخت و کھیتی کو سیراب کیا جائے۔ (**نعمل بالنهار**): یعنی دن بھر طلبِ معاش کیلئے کھیتی پر محنت کرتے ہیں جو آخرت کے امور کا وسیلہ ہے اور ابن حجرؒ کا یہ مطلب بیان کرنا کہ یہ مشقت کا کام ہے جو بعض دِن کرنا مشکل ہے اور ہمارا جو سارا دن یہ کام کرتے ہیں کیا حال ہوگا، مقبول نہیں کیونکہ حدیث میں اس پر دلالت نہیں۔ (**وانّ معاذاً صلی معك العشاء ثم اتی**): یعنی قوم کے پاس، صحیح نسخہ کے مطابق۔ (**فافتتح بسورة البقرة**): احتمال ہے کہ معاذؓ کا ارادہ کچھ سورت پڑھ کر رکوع کا ہو اور مقتدی کو وہم ہوا کہ سورت پوری کریں گے اس لئے اس نے نماز توڑ دی، چنانچہ آپ علیہ السلام نے حضرت معاذؓ کو اس سے منع فرمایا کیونکہ یہ لوگوں کی دوری کا سبب ہے اور اس کی نظیر خواجہ کلہ کوئی (جو کہ خراسان کے مشائخ میں سے ہیں) کے پیش آئی کہ سفر حج میں وہ مولانا جامی کے ہمراہ تھے ان کی عادت قراءت لمبی کرنی کی تھی خصوصاً فجر میں، چنانچہ انہوں نے سورت فتح شروع کی اور مقتدی میں شدید اضطراب پیدا ہو گیا پھر تین آیات پڑھ کر رکوع کر دیا۔ اور یہ قصہ ان کی خوش طبعی شمار کیا جاتا ہے۔ اور مصابیح میں ہے کہ حضرت معاذؓ نے

گذشتہ رات نماز پڑھائی اور سورت بقرۃ پڑھی، چنانچہ میں نے اپنی نماز مختصر کردی۔ بقولِ بعض ترکِ متابعت کے ذریعہ رخصت مراد ہے، ایک قول کے مطابق الجوز سے بمعنی قطع کرنا، اور یہ دلالت کرتا ہے کہ مقتدی کو جب کوئی حاجت پیش آجائے تو وہ امامت سے نکل کر نئے سرے سے نماز پوری کرے، پس لوگوں نے منافق گمان کیا۔

فاقبل رسول اللہ ﷺ علی معاذ: بصورت اعراض متوجہ ہوئے، بقولِ ابن حجرؒ ایک احتمال ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اس شخص کے پیچھے آپ کی خدمت میں پہنچ گئے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ وہ صاحب دوسرے روز حاضر ہوئے اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ احتمال بھی ہے کہ انہوں نے دِن یا رات کو حاضر ہو کر معاملہ عرض کردیا پھر جب معاذ رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو آپ ﷺ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

فقال یا معاذ: عتاب کی شکل میں خطاب ہے۔ **(افتان):** یعنی نفرت دلانے والا ہے۔ **(انت؟)** اور لوگوں کو فتنہ میں ڈالنے والا ہے، بقولِ طیبیؒ استفہام بشکل زِجر اور ڈانٹ اور ان کے اس نامناسب فعل پر تنبیہ ہے کیونکہ ان کی وجہ سے اس شخص نے جماعت ترک کی اور ترکِ جماعت فتنہ کا سبب ہوا۔ شرح السنۃ میں ہے فتنہ کا معنی کیا ہے لوگوں کو دین سے پھیرنا اور گمراہی میں ڈالنا، فرمانِ الٰہی ہے: **ما انتم علیه بفاتنین**۔ یعنی گمراہ کرنے والے۔ **اقرأ والشمس وضحاھا:** یعنی پہلی رکعت میں۔ **(والضحی):** یعنی دوسری رکعت میں جیسا کہ آپ علیہ السلام کا فعل دال ہے۔ **(واللیل اذا یغشی وسبح اسم ربك الاعلی):** ''واؤ'' مطلق جمع کیلئے ہے لہٰذا کوئی اشکال نہیں یا معنی یہ ہے کہ یہ اور اس جیسی اوساط مفصّل سورتیں پڑھا کر، اور اس میں امام کیلئے نماز ہلکی پڑھانے اور کمزورتر کا لحاظ کرنے کے مسنون ہونے پر دلالت ہے۔ بقولِ ابن حجرؒ ان تمام کے ساتھ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ پہلی پہلی رکعت اور دوسری دوسری رکعت کیلئے ہو اور اس وقت بیانِ جواز کیلئے ہوگا اس لئے کہ ہمارے نزدیک دو سورتوں کا پے در پے ہونا اور قرآن کی ترتیب پر قراءت کرنا مسنون ہے اور اس کے خلاف کرنا عند البعض مفضول اور عند البعض خلاف اولیٰ ہے۔ ہمارے ائمہ کا قول ہے اگر پہلی رکعت میں سورۃ الناس پڑھی تو دوسری رکعت میں سورہ بقرہ کا شروع پڑھے۔ اگر تو اعتراض کرے کہ حدیث اس کی تردید کرتی اور اس کے منافی ہے تو میں کہتا ہوں کہ کوئی منافات نہیں بلکہ یہ اس مطلق بیان پر محمول ہے کہ امام کیلئے ضروری ہے کہ جو لوگ لمبی قراءت سے تنگ اور ناراض ہوں ان کے لئے نماز ہلکی پڑھائے چنانچہ آپ علیہ السلام کی طرح ان سورتوں کے ساتھ پڑھائے اور ظاہری سیاق کا مقتضی ہے (یعنی ترتیب اور پے در پے نہ ہونا) مراد نہیں جیسا کہ آپ کے فعل سے معلوم ہوا جس کا حکم **صلو کما رائیتمونی اصلی** ''نماز ایسے پڑھو جیسے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو'' میں ہمیں دیا گیا، اور اگر تو کہے کہ اگر کسی نے آیات کی ترتیب کے خلاف قراءت کی تو گنہگار ہوگا تو فرق کیا ہوا؟ میں کہتا ہوں فرق یہ کیا گیا ہے کہ سورتوں کی ترتیب بقولِ بعض ظنی ہے اس لئے کہ آپ علیہ السلام کے بعد صحابہؓ کے اجتہاد سے مقرر ہوئی بخلافِ آیات کی ترتیب کے اس لئے کہ وہ سماع پر موقوف اور قطعی ہے لہٰذا قطعی اپنی حرمت مخالفت کی بناء پر جدا ہوگیا، بخلاف ظنی کے۔ اور یہ فرق بھی کیا جاتا ہے کہ عکس آیات اعجازِ قرآنی (جو قرآن کا بڑا مقصد ہے) کیلئے مخل ہے، ایک فرق یہ بھی کیا جاتا ہے کہ آیات کے برعکس پڑھنے سے اکثر معنی غلط ہوجاتا ہے لہٰذا حلال نہیں بخلاف عکسِ سور کے، واللہ اعلم۔ **(متفق علیه):** بقولِ میرکؒ کے ابوداؤد و نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش آواز تھے

۸۳۴: وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْعِشَاءِ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَمَا سَمِعْتُ اَحَدًا اَحْسَنَ صَوْتًا مِّنْهُ ۔ (متفق علیه)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۳۳۷حديث رقم (۱٦۸-٤٥۸)وأخرجه أحمد في المسند ۵/۹۱۔

ترجمہ: ''حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عشاء کی نماز میں سورۃ والتین والزیتون پڑھتے ہوئے سنا ہے اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے کسی کی اچھی آواز نہیں سنی۔'' (بخاری، مسلم)

تشریح: **وعن البراء قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم**: ایک نسخہ میں ''نبی'' کا لفظ ہے۔ **(يقرأ في العشاء والتين والزيتون)**: اور یہ اوساط مفصل میں سے ہے۔ **(وما سمعت احدا احسن صوتا منه، متفق عليه)**: بقولِ میرکؒ چاروں ائمہ نے روایت کیا۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں حدیثِ ابن عساکر بھی اسی کے موافق ہے کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو خوبصورت چہرہ خوبصورت آواز دے کر بھیجا حتی کہ تمہارے نبی کی بعثت بھی انہی چیزوں کے ساتھ ہوئی ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ علیہ السلام کی آواز مبارک وہاں پہنچتی تھی جہاں کوئی اور آواز نہ پہنچتی تھی۔ چنانچہ حدیث بیہقی میں ہے کہ آپ علیہ السلام نے خطبہ ارشاد فرمایا تو عورتوں نے اپنی پردہ گاہ میں سن لیا، اور حدیث ابی نعیم میں ابن رواحہ کے بارے میں ہے کہ وہ بنی تمیم میں تھے انہوں نے آپ علیہ السلام کا جمعہ کے دن منبر پر یہ ارشاد سنا کہ بیٹھ جاؤ چنانچہ وہ وہیں بیٹھ گئے، اور حدیث ابن ماجہ میں ہے کہ حضرت ام ھانی اپنے گھر بیٹھے آپ علیہ السلام کی رات کو کعبہ کے قریب قراءت سن لیتی تھیں۔

مختلف سورتوں کی قراءت

۸۳۵: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْفَجْرِ بِقٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ وَنَحْوِهَا وَكَانَتْ صَلَاتُهُ بَعْدُ تَخْفِيْفًا ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۳۳٦حديث رقم (۱٦٤-٤٥٦)وأخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/۵۱۱حديث رقم ۸۱۷ ولفظه مخالف لمسلم۔ وأخرجه الدارمي في السنن ۱/۳۳۸حديث رقم ۱۲۹۹۔وأخرجه أحمد في مسنده ٤/۳۰۷۔واللفظ لمسلم۔وأخرجه ابن ماجة في السنن ۱/۲٦۸ حديث ۸۱۷۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز میں ''سورۃ قٓ والقرآن المجید'' اور اس جیسی کوئی اور سورت پڑھتے تھے اور فجر کے بعد آپ کی نماز ہلکی ہوتی تھی'' (امام مسلم)

تشریح: **وعن جابر بن سمرة**: یہ حضرت سعد بن وقاصؓ کی بھانجے ہیں۔ **(قال كان النبي صلى الله عليه وسلم يقرأ في الفجر بقٓ والقرآن المجيد ونحوها)**: جر کے ساتھ، پڑھنا ظاہر ہے۔ اور بقولِ بعض نصب کے ساتھ جار مجرور کے محل پر عطف کی وجہ سے۔ **(وكان)**: ایک صحیح نسخہ میں ''كانت'' ہے۔ **(صلوته بعد)**: یعنی بعد الفجر۔ **(تخفيفا)**:

باقی نمازوں کے مقابلہ میں، اور بقولِ بعد کا زمانہ مراد ہے کیونکہ آپ علیہ السلام ہجرت کے شروع زمانہ میں قراءت طویل کرتے تھے کیونکہ صحابہ کی تعداد کم تھی پھر جب لوگ زیادہ ہو گئے اور کھیتی باڑی وتجارت کی وجہ سے ان پر لمبی نماز شاق ہوتی تو آپ ﷺ نے بطورِ شفقت تخفیف کری، بقول ابن حجرؒ عند البعض "کان" اس طرح کے موقعوں پر دوام اور استمرار کا فائدہ دیتا ہے جیسا کہ عرب کے قول: كان حاتم يكرم الضيف میں، اور بقولِ بعض اس کا فائدہ نہیں دیتا اور بعض محققین نے درمیانی بات کہی ہے عرفاً مفید ہے نہ کہ وضعاً، اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ "کان" اس حدیث میں استمرار کیلئے نہیں جیسا کہ قولِ باری تعالیٰ: ﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا﴾ [الاسراء: ۱۱] "اور انسان جلد باز (پیدا) ہوا ہے" میں، بلکہ نئی حالت بتانے کیلئے جیسا کہ قولِ باری تعالیٰ: ﴿كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا﴾ [مریم: ۲۹] "کہ ہم اس سے کہ گود کا بچہ ہے کیونکر بات کریں؟" میں۔ (رواہ مسلم)

۸۳۶: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ حُرَيْثٍ أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ يَقْرَأُ فِي الْفَجْرِ وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۳۳۶/۱ حديث رقم (۱۶۳-۴۵۵) وأخرجه أبوداود في السنن ۴۲۶/۱ حديث رقم ۶۴۹ وأخرجه النسائي في السنن ۱۷۶/۲ حديث رقم ۱۰۰۷- وأخرجه ابن ماجة في السنن ۲۶۹/۱ حديث رقم ۸۲۰- وأخرجه أحمد في المسند ۴۱۱/۳- وأخرجه البخاري في صحيحه تعليقًا ۲۵۵/۲- باب الجمع بين السورتين في الركعة كتاب الأذان-

ترجمہ: "حضرت عمرو بن حریثؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ نے فجر کی نماز میں واللیل اذا یغشٰی کی تلاوت کی" (مسلم)

راویٔ حدیث:

عمرو بن حریث۔ یہ عمرو بن حریث قریشی ومخزومی ہیں۔ ان کو آنحضرت ﷺ کا دیدار نصیب ہوا اور آپ ﷺ سے حدیث کو سنا ہے۔ آپ ﷺ نے ان کے سر پر دست مبارک پھیرا اور برکت کی دعاء دی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جب آنحضور ﷺ کی وفات ہوئی تو ان کی عمر بارہ سال کی تھی۔ کوفہ آئے اور وہیں قیام پذیر ہوئے اور کوفہ کے امیر بنائے گئے اور وہیں ۸۵ھ میں وفات پائی۔ ان سے ان کے بیٹے جعفر وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ "حریث" صیغۂ تصغیر کے ساتھ ہے۔

تشریح: انه سمع النبی ﷺ یقرأ فی الفجر واللیل اذا عسعس: یعنی پیٹھ پھیر دے، بقولِ بعض یعنی اندھیرا چھا جائے اور اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ آپ علیہ السلام نے صرف اسی آیت پر اکتفاء کیا اور اسی وجہ سے ابن حجرؒ کا قول ہے کہ ظاہر حدیث کہ آپ علیہ السلام کا اس آیت کی قراءت پر اکتفاء کرنا بتاتا ہے لہٰذا اس سے فجر کی نماز کی تخفیف ثابت ہوئی، اور یہ آپ علیہ السلام کے تین سے کم پر اکتفاء نہ کرنے کے ثبوت کے خلاف ہے، اور ان کا یہ کہنا کہ آپ علیہ السلام اس آیت پر اکتفاء کسی ضروری کام کی وجہ سے کیا تو یہ قول انتہائی بعید ہے اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو ضرور منقول ہوتا اور شرح السنہ میں مذکور ہے کہ امام شافعیؒ کے بقول صحابی کی مراد سورت تکویر ہے اس بناء پر کہ مکمل سورت کا پڑھنا اگرچہ چھوٹی ہو بعض سورت پڑھنے سے افضل ہے اگرچہ لمبی ہو، بقولِ طیبیؒ کے، پس مطلب یہ ہوا کہ آپ علیہ السلام نے وہ سورت تلاوت فرمائی جس میں مذکورہ آیت ہے اور احتمال یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اس آیت سے آخر سورت تک پڑھا ہو، بقول ابن حجرؒ اصحابِ شافعیؒ کا اس مسئلہ میں اختلاف

ہے کہ کامل سورت پڑھنا بعض سورت سے افضل ہے اگر چہ طویل ہو جیسا کہ بکری کی قربانی اونٹ میں حصہ ڈالنے سے بہتر ہے اگر چہ گوشت شرکت کی صورت میں زیادہ ہوگا، اور اس وجہ سے کہ سورت کے بھی مکمل جوڑ (اعضاء) ہیں۔

بلکہ بقولِ بعض کے آپ علیہ السلام سے کامل سورت سے کم پڑھنا منقول نہیں اور نہ ہی ایک سورت کو دو حصے کر کے پڑھنا منقول ہے سوائے مغرب کے کہ اس میں سورت اعراف دو رکعتوں میں پڑھی اور سوائے فجر کی رکعتوں کے کہ ان میں آپ علیہ السلام نے سورت بقرۃ کی دو آیات اور آل عمران تلاوت فرمائی، اور دوسرے ائمہ صرف معتدبہ مقدار کے افضل ہونے کے قائل ہیں۔ ان کا یہ قول اس قیاس کی بناء پر ہے کہ ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ہیں اور بعض نے درمیانی راہ نکالی ہے کہ طویل قراءت طوالت کی وجہ سے اور سورت کامل سورت ہونے کی وجہ سے افضل ہے، لہٰذا ہر ایک من وجہ راجح ہے اور محلِ اختلاف تراویح کے علاوہ ہے کیونکہ تراویح میں اس قدر پڑھنا کہ قرآن مہینہ میں ختم ہو جائے افضل ہے چھوٹی سورتوں سے، اس لئے کہ ان میں تمام میں قرآن پڑھنا سنت ہے، اور ہمارے بعض ائمہ کا فتویٰ ہے کہ اگر کسی نے بعذر ایک سورت دو رکعتوں میں پڑھی تو اس کو کامل سورت کا ثواب ملے گا، اور یہ بحث بڑی سورتوں کے بارے میں ہے بخلاف تین چار آیات کی سورت کے کہ ان میں تفریق کرنا خلاف سنت ہے۔ (رواہ مسلم)

بقولِ میرکؒ کے ابوداؤدؒ نے بھی روایت کیا ہے اور طبرانی نے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا: صبح کی نماز میں بیس آیات سے کم نہ پڑھو اور عشاء میں دس آیات سے کم، اور ظاہر کے دس' بیس سے مراد ہر رکعت میں اتنی مقدار پڑھنا ہے، اسی وجہ سے ہمارے بعض علماء نے حد اسفار کے بارے میں کہا ہے کہ اعادہ کی صورت میں بالترتیب چالیس آیات پڑھنا ممکن ہو جب کہ فساد نماز کے آخر میں ہو۔

۸۳۷: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ السَّائِبِ قَالَ صَلّٰى لَنَارَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصُّبْحَ بِمَكَّةَ فَاسْتَفْتَحَ سُوْرَةَ الْمُؤْمِنِيْنَ حَتّٰى جَآءَ ذِكْرُ مُوْسٰى وَهَارُوْنَ اَوْ ذِكْرُ عِيسٰى اَخَذَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُعْلَةٌ فَرَكَعَ . (رواہ مسلم)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۳۷۷/۲حدیث رقم ۸۹۱۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ۵۹۹/۲حدیث رقم (۶۵۔۸۸۰)وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۶۴۸/۱حدیث رقم ۱۰۷۴۔وأخرجه النسائی فی السنن ۱۵۹/۲حدیث رقم ۹۵۵وأخرجه ابن ماجة فی السنن ۲۶۹/۱ حدیث رقم ۸۲۳۔وأخرجه الدارمی فی السنن ۴۳۵/۱حدیث رقم ۱۵۴۲۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن سائبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں مکہ مکرمہ میں فجر کی نماز پڑھائی اور سورۃ المؤمنین کی قراءت شروع کی جب آپ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون یا حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) کے ذکر پر پہنچے تو آپ کو کھانسی شروع ہوگئی پھر آپ ﷺ رکوع میں چلے گئے۔'' (مسلم)

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن السائب۔ یہ عبداللہ بن سائب مخزومی قریشی ہیں۔ کبار صحابہ میں سے ہیں۔ ان سے مکہ والوں نے قراءت سیکھی ہے۔ مکہ والوں میں ان کو شمار کیا جاتا ہے۔ عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے قتل سے پہلے مکہ میں وفات ہوئی۔ ان سے ایک گروہ روایت کرتا ہے۔

تشریح: **وعن عبد الله بن السائب قال صلى لنا رسول الله صلى الله عليه وسلم الصبح بمكة:** یعنی فتح مکہ کے موقع پر جیسا کہ روایت نسائی میں ہے بقولِ عسقلانی کے، اور اسی سے ابن حجرؒ کے اس احتمال کا جواب بھی ہوگیا کہ ایسا شروع زمانہ میں تھا جب کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محصور تھے اس حالت میں قطعی طور پر وہ تطویل صلوٰۃ پر راضی ہوتے تھے یا آپ علیہ السلام صحابہ کی اجازت سے طویل قراءت کرتے تھے پھر جب مدینہ میں صحابہ کرام کی تعداد زیادہ ہوگئی تو تخفیف کردی، اور اذنِ صحابہ کا قول کتنا بعید ہے اور اس کا بعید ہونا مخفی نہیں۔ **(فاستفتح سورة المؤمنين)** مراد قد افلح المؤمنون ہے۔ **(حتى جاء ذكر موسٰى)**: ایک نسخہ میں نصب کے ساتھ ہے یعنی آپ علیہ السلام پہنچے۔ **(وهارون)**: یعنی قولِ باری تعالیٰ: ﴿ثُمَّ أَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَأَخَاهُ هٰرُوْنَ﴾ [المؤمنون: ٣٠] **(او ذكر عيسٰى)**: اور وہ قول باری تعالیٰ: ﴿وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهٗ اٰيَةً﴾ [المؤمنون: ٥٠] ہے۔ **(اخذت النبى ﷺ)**: کسی وہم سے بچنے کیلئے ضمیر نہیں لائے اگرچہ وہم بعید ہے۔

سعلة: فتح کے ساتھ، اور بقول عسقلانی ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے، یعنی کھانسی۔ ابن ملک فرماتے ہیں "سعال" حلق کے درد اور خشک ہونے کی وجہ سے نکلنے والی آواز کو کہتے ہیں اور بقولِ طیبیؒ **فعلة** کے وزن پر ہے "سعال" سے۔ یعنی ان قصوں میں تدبر کی وجہ سے اتنا روئے کہ کھانسی شدید ہوگئی اور سورت پوری نہ فرما سکے۔ (فركع، رواه مسلم)

جمعہ کے دن فجر کی قراءت

٨٣٨: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَاُ فِی الْفَجْرِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ بِالٓمّٓ تَنْزِيْلُ فِی الرَّكْعَةِ الْاُوْلٰى وَفِی الثَّانِيَةِ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ ـ (متفق عليه)

أخرجه مسلم فی صحيحه ٢/٥٩٧حديث رقم (٦١-٨٧٧)وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ١/٦٧٠حديث رقم ١١٢٤- وأخرجه الترمذی فی السنن ٢/٣٩٧حديث رقم ٥١٩-وأخرجه ابن ماجةفی السنن ١/٣٥٥حديث رقم ١١١٨-

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن فجر کی پہلی رکعت میں الم تنزیل پڑھتے تھے اور دوسری رکعت میں هل اتٰى على الانسان پڑھتے تھے۔" (بخاری، مسلم)

تشریح: **وعن ابى هريرة قال كان النبى صلى الله عليه وسلم:** بقولِ طیبیؒ "کان" ان احادیث میں استمرار کیلئے نہیں جیسا کہ قولِ باری تعالیٰ: ﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا﴾ [الاسراء: ١١] "اور انسان جلد باز (پیدا) ہوا ہے" میں، بلکہ نئی حالت بتانے کیلئے جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ﴿كَيْفَ نُكَلِّمُ﴾ ......میں۔

يقرأ في الفجر: یعنی نماز صبح۔ **(يوم الجمعة):** ''میم'' کے ضمہ اور سکون کے ساتھ، اور ہو سکتا ہے کہ اس میں حکمت ابتداء عالم اور اس کے فنا ہونے، جنت و جہنم اور ان میں جانے والوں اور قیامت کے احوال کا ذکر ہو، اور یہ سب کچھ ہونے والا ہے اور اس کا وقوع جمعہ کے دن ہوگا۔ **(بالم):** ''باء'' زائد ہے۔ **(تنزيل):** رفع کے ساتھ حکایۃً۔ **(في الركعة الاولى وفي الثانية هل أتى على الانسان):** اسی وجہ سے ابن دقیق العید نے فرمایا کہ حدیث میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو مداومت کو مقتضی ہو، اور شوافع کی ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ امام کیلئے ان دو سورتوں کا یا کبھی کبھی ان کے سجدہ تلاوت کا ترک کرنا اولیٰ ہے اس لئے کہ عوام اس کے وجوبِ قراءت کے معتقد ہو چکے ہیں اور ترک پر انکار کرتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ بلکہ بعض لوگوں کا اعتقاد ہو چکا ہے کہ شوافع کے مذہب میں نمازِ فجر کی تین رکعتیں ہیں اس لئے کہ سجدہ تلاوت کرنے سے جاہل یہ سمجھتا ہے کہ نمازی مجھ سے پہلے رکوع کر کے سجدہ میں گئے ہیں چنانچہ وہ رکوع سجدہ کرنے کے بعد پھر دوبارہ سجدہ کرتا اور پھر کھڑا ہوتا ہے اور ایسا واقعہ ہمارے زمانہ میں خصوصاً بعض عوام کو ضرور پیش آتا ہے۔ بلکہ لطیفہ یہ ہے کہ کچھ عجمی لوگ بخاری گئے تو ایک نے کہا میں نے مکہ میں عجیب بات دیکھی وہ یہ کہ شوافع نمازِ فجر تین رکعات پڑھتے ہیں اور دوسرے نے کہا نہیں وہ ایسا صرف جمعہ کے دن فجر میں کرتے ہیں، اور اس کا سبب شوافع کا اس پر مداومت کرنا اور حنفیہ و مالکیہ کا بالکلیہ ترک کرنا لہٰذا ان پر لازم تھا کہ وہ بھی بعض اوقات ایسے کرتے، اور ہو سکتا ہے کہ انہوں نے یہ لحاظ کیا ہو کہ عوام کی حفاظت نہ کرنے میں نسبت کرنے کے زیادہ ہے، اسی وجہ سے انہوں نے نمازِ جمعہ و عیدین میں سجدہ سہو ترک کرنے کو جائز کیا۔ ہے، واللہ اعلم۔

متفق عليه: بقولِ میرکؒ نسائی و ابن ماجہ نے بھی روایت کیا، ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ طبرانی نے ابوسعید سے روایت کیا ہے کہ آپ علیہ السلام ہمیشہ جمعہ کے دن یہ دو سورتیں فجر میں پڑھا کرتے تھے، اور ابو حاتم کا اس کے مرسل ہونے کی تصویب کرنا اس کی حجیت کے منافی نہیں اس لئے کہ ان جیسے مسائل میں مرسل پر عمل کرنا بالا جماع جائز ہے بشرطیکہ اس کا شاہد موجود ہو، طبرانی نے بھی کبیر میں حضرت ابن عباسؓ سے لفظ کل جمعہ کے ساتھ اس کی تخریج کی ہے، ہاں بقولِ بعض کے آپ علیہ السلام کا ان دو کے علاوہ پڑھنا بھی ثابت ہے اور بقولِ بعض اس خبر کی سند میں نظر ہے کہ آپ علیہ السلام نے فجر میں ''آلم تنزیل'' کے علاوہ سجدہ والی کوئی سورت پڑھی، بفرضِ صحت وہ بیان جواز کیلئے ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ آپ علیہ السلام نے سجدہ والی سورت ظہر میں قراءت کی اور سجدہ کیا اور یہ احتمال گمان کرنا کہ آپ علیہ السلام نے بروزِ جمعہ فجر میں سورۃ سجدہ پڑھی اور سجدہ نہ کیا، باطل ہے چنانچہ صحیح طرق سے ثابت ہے کہ جناب رسول ﷺ نے جمعہ کی صبح میں سورت سجدہ پڑھ کر سجدہ کیا۔

نمازِ جمعہ کی قراءت

۸۳۹: وَعَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ اسْتَخْلَفَ مَرْوَانُ اَبَا هُرَيْرَةَ عَلَى الْمَدِيْنَةِ وَخَرَجَ اِلٰى مَكَّةَ فَصَلّٰى لَنَا اَبُوْ هُرَيْرَةَ الْجُمُعَةَ فَقَرَأَ سُوْرَةَ الْجُمُعَةِ فِي السَّجْدَةِ الْاُوْلٰى وَفِي الْاٰخِرَةِ اِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُوْنَ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ بِهِمَا يَوْمَ الْجُمُعَةِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في الصحيح ٢/٥٩٨ حديث رقم (٦٢-٨٧٨) وأخرجه أبوداوٗد في السنن ١/٦٧٠ حديث رقم

۱۱۲۲ وأخرجه الترمذى فى السنن ۲/۴۱۳ حديث ۵۳۳ ـ وأخرجه النسائى فى السنن ۳/۱۱۲ حديث ۱۴۲۴ وأخرجه الدارمى فى السنن ۱/۴۲۳ حديث رقم ۱۵۶۸ ـ وأخرجه مالك فى الموطأ ـ

ترجمہ: ''حضرت عبیداللہ بن ابی رافعؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ مروان نے حضرت ابوہریرہؓ کو مدینہ میں اپنا قائم مقام مقرر کیا اور خود مکہ چلا گیا حضرت ابوہریرہؓ نے ہمیں جمعہ کی نماز پڑھائی اور انہوں نے پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ اور دوسری رکعت میں سورۂ منافقون کی تلاوت کی اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو جمعہ کے دن ان دونوں سورتوں کو پڑھتے ہوئے سنا ہے۔'' (مسلم)

راویٔ حدیث:

عبیداللہ بن ابی رافع ۔ تابعی ہیں۔ حضرت علی اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے حدیث کی سماعت کی اور ابو رافع رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کاتب تھے۔ ثقہ ہیں۔ تیسرے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

تشریح: **قال استخلف مروان ابا هريرة:** یعنی ان کو خلیفہ و نائب بنایا۔ **(على المدينة وخرج):** یعنی مروان۔ **(الى مكة فصلى لنا ابوهريرة الجمعة):** یعنی نماز جمعہ۔ **(فقرأ سورة الجمعة فى السجدة):** یعنی رکعت۔ **الأولى وفى الاخرة اذا جاءك المنافقون:** یعنی سورت یا اس کے آخر تک۔ **(فقال):** یعنی ابوہریرہؓ نے۔ **(سمعت رسول الله ﷺ):** یعنی بلاواسطہ۔ **(يقرأبهما):** یعنی مذکورہ دونوں سورتیں۔ **(يوم الجمعة):** یعنی نماز جمعہ میں۔ (رواہ مسلم) بقول میرکؒ چاروں ائمہ نے،

نمازِ عیدین کی قراءت

۸۴۰: وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي الْعِيْدَيْنِ وَفِى الْجُمُعَةِ بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى وَهَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ قَالَ وَاِذَا اجْتَمَعَ الْعِيْدُوَالْجُمُعَةُ فِيْ يَوْمٍ وَاحِدٍ قَرَأَ بِهِمَا فِى الصَّلَاتَيْنِ ـ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فى صحيحه ۲/۶۰۷ حديث رقم (۱۴ـ۸۹۱)ـ وأخرجه أبوداوٗد فى السنن ۱/۶۸۳ حديث رقم ۱۱۵۴ وأخرجه الترمذى فى السنن ۲/۴۱۵ حديث رقم ۵۳۴ وأخرجه النسائى فى السنن ۳/۱۸۳ حديث رقم ۱۵۶۷ ـ وابن ماجة بنحوه ۱/۴۰۸ حديث رقم ۱۲۸۲ وأخرجه مالك فى الموطأ ۱/۱۸۰ حديث رقم ۸ من كتاب العيدين ـ

ترجمہ: ''حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عیدالاضحیٰ عیدالفطر اور جمعہ کی نماز میں **سبح اسم ربك الاعلى** اور **هل اتك حديث الغاشيه** پڑھا کرتے تھے اور حضرت نعمان بن بشیرؓ فرماتے ہیں کہ جب عید اور جمعہ دونوں ایک ساتھ جمع ہو جاتے تو آپ نماز عید اور نماز جمعہ دونوں میں یہی دونوں سورتیں پڑھا کرتے تھے۔''

تشریح: وعن نعمان: ''نون'' کے ضمہ کے ساتھ۔(ابن بشير قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرأ في العيدين وفي الجمعة بسبح اسم ربك الاعلى وهل اتاك حديث الغاشية قال): یعنی نعمان نے۔(واذا اجتمع العيد والجمعة في يوم واحدقرأ فيهما): یعنی دونوں سورتیں۔(في الصلاتين' رواه مسلم)

نمازِ عید کی قراءت

۸۴۱: وَعَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ سأَلَ اَبَا وَاقِدِ اللَّيْثِيَّ مَا كَانَ يَقْرَأُ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِي الْاَضْحٰى وَالْفِطْرِ فَقَالَ كَانَ يَقْرَأُ فِيهِمَا بِقٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ وَاقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۵۰۲/۱ حديث رقم (۹۸۔۷۲۶)۔وأخرجه النسائي في السنن ۱۵۵/۲ حديث رقم ۹۴۵ وأخرجه ابن ماجة في السنن ۳۶۳/۱ حديث رقم ۱۱۴۸۔

ترجمہ: ''حضرت عبیداللہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے حضرت ابوواقد لیثیؓ سے سوال کیا کہ رسول اللہ ﷺ عیدالاضحیٰ اور عیدالفطر کی نماز میں کیا پڑھتے تھے انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ ان دونوں نمازوں میں سورۂ قٓ والقرآن المجید اور سورۂ اقتربت الساعۃ پڑھا کرتے تھے۔'' (مسلم)

راویٔ حدیث:

ابوواقد۔ یہ ابوواقد ہیں۔ان کا نام حارث ہے۔عوف کے بیٹے لیثی ہیں۔ پرانے مسلمان تھے۔ان کا شمار اہل مدینہ میں ہے۔ایک سال مکہ کے قرب وجوار میں رہے اور مکہ ہی میں ۶۸ھ میں بعمر ۷۵ سال انتقال فرمایا' اور مقام فخ میں مدفون ہوئے۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کا نام معلوم ہے' اور نہ ان کے والد کا نام معلوم ہے۔ ''تقریب'' میں ہے کہ ابوواقد صحابی ہیں۔ان کے نام کے بارے میں مختلف اقوال ہیں: ① حارث بن مالک ② ابن عون ③ عون بن حارث۔

تشریح: ان عمر بن الخطاب سال ابا واقد الليثي: بقول ابن الملکؒ ان کا اور ان کے والد کا نام معروف نہیں اور تقریب میں ابوواقد کو صحابی بتایا گیا ہے، بقول بعض ان کا نام حارث بن مالک اور بقول بعض ابن عون ہے، ایک قول عون بن حارث کا بھی ہے۔(ما كان يقرأ به رسول الله ﷺ في الاضحى والفطر؟): یعنی کیا قراءت فرماتے تھے؟

فقال كان يقرأ فيهما بق والقرآن المجيد واقتربت الساعة' رواه مسلم: شرح مسلم میں یہ روایت مرسلاً ہے اس لئے کہ عبیداللہ نے عمر بن خطابؓ کا زمانہ نہیں پایا۔لیکن حدیث یقیناً صحیح اور متصل ہے، مسلم ہی کی دوسری روایت کی وجہ سے کہ عبیداللہ ابوواقد سے روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے عمر بن الخطابؓ نے سوال کیا...... اور ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ کا سوال کرنا تقریر اور حاضرین کے ذہن میں بٹھانے کیلئے ہو ورنہ خود عمر رضی اللہ عنہ آپ علیہ السلام کے ساتھ رہنے اور آپ کے احوال وافعال کو جاننے والے تھے۔

فجر کی سنتوں کی قراءت

۸۴۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ فِیْ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ بِقُلْ يٰاَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ وَقُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ . (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/ ۵۰۲ حديث رقم (۱۰۰ـ۷۲۷)۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فجر کی سنتوں میں قل یا ایہا الکافرون اور قل ہواللہ احد پڑھتے تھے۔'' (مسلم)

تشریح: وعن ابی هريرة قال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قرأ فی رکعتی الفجر: یعنی سنت، چنانچہ پہلی رکعت میں۔

قولوا آمنا بالله وما انزل الينا: مکمل آیت یوں ہے: ﴿قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ [البقرة: ۱۳۶] ''(مسلمانو!) کہو کہ ہم خدا پر ایمان لائے اور جو (کتاب) ہم پر اتری اس پر اور جو (صحیفے) ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے ان پر اور جو (کتابیں) موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا ہوئیں ان پر اور جو اور پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملیں ان پر (سب پر ایمان لائے) ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (خدائے واحد) کے فرمانبردار ہیں''۔

والتی فی آل عمران: رکعت ثانیہ میں، ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ بقیہ آیت یہ ہے: ﴿اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ [آل عمران: ٦٤] ''کہہ دو کہ اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی ہے) اس کی طرف آ ؤ وہ یہ کہ خدا کے سوا ہم کسی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا کسی کو کارساز نہ سمجھیں اگر یہ لوگ (اس بات کو) نہ مانیں تو (ان سے) کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم (خدا کے) فرمانبردار ہیں'' اوران کی قراءت کرنے میں فاتحہ کے ساتھ سورت یا اس کے قائم مقام کے ملانے کے وجوب کی طرف اشارہ ہے۔ (رواہ مسلم)

۸۴۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ فِیْ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَالَّتِیْ فِیْ اٰلِ عِمْرَانَ قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۔(رواه مسلم)

أخرجه الترمذي في السنن ۲/ ۱٤ حديث رقم ۲٤۵ وقال ليس إسناده بذاك ۔

''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فجر کی سنتوں میں سورۂ بقرہ کی یہ آیت: قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا اور سورۂ آل عمران کی یہ آیت: قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ پڑھتے تھے۔'' (مسلم)

الفصل الثانی:

نماز میں بسم اللہ پڑھنے کا مسئلہ

۸۴۴: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْتَتِحُ صَلَاتَهٗ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ (رواه الترمذی وقال هذاحديث لَيْسَ اِسْنَادُهٗ بِذَاكَ)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/۲۷حديث رقم ۲۴۸وقال حديث حسن۔وأخرجه أبو داوٗد فی السنن ۱/۵۷۴ حديث رقم ۹۳۲و ذكر "رفع" بدل "مد" وأخرجه الدارمی فی السنن ۱/۳۱۵حديث رقم ۲۴۷وأخرجه النسائی فی السنن بنحوه ۲/۱۲۲حديث رقم ۸۷۹۔وأخرجه أحمد فی المسند۴/۳۱۶۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی نماز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کرتے تھے''۔ (ترمذی)

اسنادی حیثیت: اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد قوی نہیں۔

تشریح: **عن ابن عباس قال کان رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم یفتتح صلاتہ ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم**: یعنی آہستہ آواز میں تاکہ سابقہ روایت کے منافی نہ ہو جس میں یہ بیان ہے کہ نبی علیہ السلام بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے بلکہ ابتداءِ قراءت ''الحمدللہ'' سے کرتے تھے۔ زین العرب فرماتے ہیں کہ آپ علیہ السلام کا تسمیہ سے شروع کرنا دلالت کرتا ہے کہ یہ فاتحہ کا جزء ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں نظر ہے اس لئے کہ استحباباً اس سے شروع کرنا جائز ہے، پھر فرمایا کہ افتتاحِ سری کا قول خلاف ظاہر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ خلاف ظاہر کا ارتکاب جمع بین الاحادیث کیلئے ہے، واللہ اعلم۔

رواه الترمذی وقال هذا حدیث لیس اسناده بذاك: یعنی قوی، بقولِ طیبیؒ کے ''بذاك'' کا مشار الیہ علم حدیث میں غور کرنے والے اور اسنادِ قوی کا اعتبار کرنے والے کا ذھب ہے، بقولِ تورپشتی اس حدیث کی سند میں کمزوری ہے اس لئے کہ ابوعیسیٰ اس کی تخریج اس طرح کرتے یہ متفرد ہیں (عن احمد بن عبدۃ، عن المعتمر، عن اسماعیل بن حماد بن ابی سلیمان) اس کے قائل میرکؒ ہیں، اور اس میں نظر ہے بلکہ اس حدیث کو یقیناً حاکم نے روایت کیا ہے اور کہا کہ اس کی سند صحیح اور غیر سقیم ہے اور دار قطنی نے روایت کر کے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح غیر مجروح ہے، ان کا یہ قول تخریج میں ہے اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ترمذی کا اس حدیث کو جس میں تسمیہ کے جزء فاتحہ ہونے کا ذکر ہے ضعیف کہنا عملاً اور ظناً (نہ کہ قطعاً) مؤثر نہیں اس لئے کہ اس کے بارے میں دوسری صحیح احادیث بھی موجود ہیں۔ ایک حدیث یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے پہلے تسمیہ پھر فاتحہ پڑھی اور تسمیہ کو فاتحہ کا جزء شمار کیا۔ دار قطنی، ابن خزیمہ اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دوسری حدیث آپ علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جب تم فاتحہ پڑھو تو بسم اللہ بھی پڑھو اس لئے کہ فاتحہ ام القرآن اور سبع مثانی ہے۔ اور بسم اللہ...... اس کی ایک آیت ہے، دار قطنی نے اس کو سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس میں ابن جوزی نے بے محل نزاع کیا۔

تیسری حدیث سند صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انہوں قرآن کے فرمان: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ

الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ﴾ [الحجر : ٨٧] ''اور ہم نے تم کو سات (آیتیں) جو (نماز میں) دوہرا کر پڑھی جاتی ہیں (یعنی سورہ الحمد) اور عظمت والا قرآن عطا فرمایا ہے۔'' کی تفسیر فرمائی تو کسی نے عرض کیا ساتویں آیت کونسی ہے فرمایا وہ ''بسم اللہ'' ہے اور ابن حجرؒ کا قول ہے کہ ہمارا مذہب بھی یہی ہے کہ سورتِ فاتحہ بالجہر پڑھتے وقت تسمیہ بھی بالجہر پڑھی جائے، اور اکثر اہلِ علم اس پر ہیں اتباع کی وجہ۔ بقولِ ابن عبدالبر کے احمد اور بیس (۲۰) صحابہؓ نے طرقِ ثانیہ سے اس کو روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں حدیث ابن مسعودؓ اس کے معارض ہے وہ یہ آپ علیہ السلام، ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے فرض نماز میں تسمیہ بالجہر نہیں پڑھی، اور ابن جبیر کا فرمان ہے کہ جہر منسوخ ہے، اور عنقریب عبداللہ کی حدیث آئے گی جس میں فرمایا اے بیٹے! یہ حدیث بیان کرنے سے احتراز کرو کیونکہ میں نے نبی علیہ السلام و ابوبکرؓ عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ نماز اداء کی ہے میں نے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا، اس کو ترمذی نے روایت کیا اور حسن کہا ہے اور بعض تابعین جہر کے بدعت ہونے کے قائل ہیں۔

آمین بالجہر کا حکم

۸۴۵: وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ فَقَالَ اٰمِيْنَ مَدَّبِهَا صَوْتَهٗ۔ (رواه الترمذی وابوداود والدارمی وابن ماجة)

أخرجه أبو داؤد في السنن من قصة طويلة ١/٥٧٧ حديث رقم ٩٣٨۔

ترجمہ: ''حضرت وائل بن حجرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ پڑھا اور پھر بلند آواز سے آمین کہا۔'' (ابوداؤد۔ ترمذی، دارمی، ابن ماجہ)

تشریح: **وعن وائل بن حجرؓ**: ''حاء'' مضمومہ ''جیم'' ساکن پر تقدیم کے ساتھ۔ **(قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقال آمین مدبھا صوتہ)**: یعنی کلمہ کے آخر کو، اور یہ ''مد'' عارضی ہے اور اس میں طول، توسط اور قصر بھی جائز ہے یا ''الف'' کو لمبا کیا اس لئے کہ اس کو ''مد'' اور قصر دونوں طرح پڑھنا جائز ہے اور یہ ''مد'' بدل کہلاتی ہے۔ اور اس میں بھی تینوں وجہیں جائز ہیں۔ **(صوتہ)**: اور آواز سنائی دینے سے جہر لازم نہیں آتا جیسا کہ مخفی نہیں، اور یہ تعلیم اور جواز پر محمول ہے۔ **(رواہ الترمذی)**: اور حسن کہا ہے اور شعبہ نے روایت کیا اور فرمایا کہ اس میں آواز پست کی اور بقول میرکؒ حفاظ ان کی اس غلطی پر متفق ہیں اور صوابِ معروف یہ ہے کہ ''مد'' کے ساتھ پڑھا اور بلند آواز کے ساتھ، اور اس میں کچھ بحث تو ہے ہی۔ **(وابو داؤد والدارمی وابن ماجه)**

بقول میرکؒ کے مدِّ صوت کی روایت ترمذی و احمد اور ابن ابی شیبہ نے اور رفع صوت کی روایت ابوداؤد نے روایت کی ہے اور انہوں نے گویا بالمعنی نقل کی ہے اور بقولِ ابن حجرؒ روایتِ ابن ماجہ میں ہے کہ آمین اس زور سے کہی کہ قریب والی پہلی صف والوں نے سنی اور مسجد گونج اٹھی، اور بیہقیؒ اور ابن حبانؒ نے ثقات میں روایت کیا ہے کہ میں ایسے دوسو صحابہؓ سے ملا ہوں جنہوں نے امام کے ''ولا الضالین'' کہتے وقت آمین بلند آواز سے کہی، اور ہمارے ائمہ نے رفع صوت کی روایت کو شروع زمانہ میں تعلیم پر محمول کیا ہے پھر جب دین مضبوط ہو گیا (کچھ زمانہ گزر گیا) تو اخفاء پر عمل کیا، واللہ اعلم۔ اور بقول ابن حجرؒ بیہقیؒ نے فرفوعاً

نقل کیا ہے کہ یہود ہمارے قبلہ و جماعت اور امام کے پیچھے آمین کہنے سے حسد کرتے تھے۔ اور طبرانی کی روایت میں ہے کہ یہود نے مسلمانوں سے تین فضیلت والی چیزوں میں حسد کیا سلام کا جواب، صفیں سیدھی کرنا، اور فرض نماز میں خلف الامام آمین کہنا۔ اور ابن عدی کی روایت میں ہے کہ یہود تم سے افشاء سلام، اقامت صف، اور آمین میں حسد کرتے ہیں۔ بقولِ ابن ہمامؒ کہ امام احمد، ابویعلی طبرانی دارقطنی اور حاکم نے مستدرک میں حدیثِ شعبہ عن علقمہ عن ابیہ روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز اداء کی، جب آپ علیہ السلام "غیر المغضوب علیھم و لا الضالین پر پہنچے تو آمین کہا آہستہ آواز سے۔

اور ابوداؤد و ترمذی وغیرہ نے حدیثِ سفیان عن وائل بن حجر سے روایت کی ہے اس میں رفع صوت کا ذکر ہے لہٰذا رفع صوت کے بارے میں سفیان نے شعبہ کے خلاف بیان کیا، اور جب حدیث میں اختلاف ہو گیا تو صاحب ہدایہ نے حدیثِ ابن مسعودؓ سے عدول کیا جس میں اخفاء کا ذکر ہے کیونکہ اس کی تائید آپ علیہ السلام کے عمل اخفاء کے معلوم ہونے سے ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسکے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ دُعا میں اصل اخفاء ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ [الاعراف: ٥٥] "لوگو! اپنے رب سے عاجزی اور چپکے چپکے دعائیں مانگا کرو" اور آمین کے دُعا ہونے میں کوئی شک نہیں، اور تعارض کے وقت اس کی وجہ سے اور تمام دُعاؤں اور اذکار پر قیاس کر کے اخفاء کو ترجیح ہوگی، اس وجہ سے کہ آمین بالاجماع قرآن میں سے نہیں ہے لہٰذا اس کا قرآن کی آواز سے بلند ہونا مناسب نہیں جیسا کہ اس کی کتابت مصحف میں جائز نہیں اور تعوذ بھی قرآن نہ ہونے کی وجہ سے آہستہ پڑھی جاتی ہے اور تسمیہ کے جہر کے اختلاف اس کے قرآن ہونے نہ ہونے کی بنیاد پر ہے۔

آمین باعثِ برکت ہے

٨٤٦: وَعَنْ اَبِیْ زُهَيْرِ النُّمَيْرِيِّ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَأَتَيْنَا عَلٰى رَجُلٍ قَدْ اَلَحَّ فِی الْمَسْأَلَةِ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ اَوْجَبَ اِنْ خَتَمَ فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ بِاَیِّ شَیْءٍ یَخْتِمُ قَالَ بِآمِیْنَ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه النسائی فی السنن ٢/ ١٧٠ حدیث رقم ٩٩١۔

ترجمہ: "حضرت ابوزہیر نمیریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک رات کو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باہر نکلے اور ایک آدمی کے پاس آئے جو دعا کرنے میں خوب آہ وزاری کر رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واجب کیا اگر ختم کیا۔ ایک آدمی نے سوال کیا کہ کس چیز کے ساتھ ختم کرے؟ فرمایا آمین کے ساتھ۔" (ابوداؤد)

تشریح: وعن ابی زھیر النمیری: دونوں کی تصغیر کے ساتھ۔ (قال خرجنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات لیلة): یعنی رات کو۔ (فاتینا): یعنی گزرے۔ (علی رجل قد الح فی المسالة): یعنی اللہ تعالیٰ سے دُعا اور سوال میں مبالغہ کیا۔ (فقال النبی ﷺ اوجب): یعنی جنت اپنے لئے، کہا جاتا ہے اوجب الرجل جبکہ کوئی ایسا فعل کرے جس سے جنت یا جہنم یا گناہ کی مغفرت یا دُعا کی قبولیت واجب ہو جائے۔ اور عقائد میں یہ بات طے شدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کچھ واجب نہیں یہ وجوب صرف ان کے فضل اور اس وعدہ کی وجہ سے ہے جس کی وعدہ خلافی اللہ تعالیٰ نہیں کرتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے

خود بتایا ہے اگرچہ اس کے لئے مطیع کو عذاب دینا اور عاصی کو ثواب دینا جائز ہے۔ (ان ختم): یعنی سوال کرنا۔ (فقال رجل من القوم بای شیء یحتم؟ قال بآمین): بقولِ طیبیؒ کے اس میں اس پر دلیل ہے کہ دُعا کرنے والے کے لیے دُعا کے بعد آمین کہنا مستحب ہے، اور اگر امام ہو تو وہ دُعا کرے اور بقیہ لوگ آمین کہیں لہٰذا مقتدی کی آمین کافی ہوگی امام کو کہنے کی حاجت نہیں، اور اس میں نظر ہے اس لئے کہ نماز پر قیاس کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ امام بھی آمین کہے، البتہ خارجِ نماز مناسب یہی ہے کہ تمام لوگ آمین و دُعا دونوں کہیں۔ بقولِ بعض کے یہ حدیث ترجمۃ الباب کے مناسب نہیں، میں کہتا ہوں کہ مناسبت اس میں اتباع ہے یا مناسبت دُعا کی وجہ سے جو کہ نماز و خارج نماز میں عام ہے، واللہ اعلم۔

(رواہ ابوداؤد) بقولِ میرکؒ یہ حدیث ضعیف ہے اور بقول ابن عبدالبرؒ اس کی سند قائم نہیں۔

نمازِ مغرب کی قراءت

۸۴۷: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الْمَغْرِبَ بِسُوْرَةِ الْاَعْرَافِ فَرَّقَهَا فِيْ رَكْعَتَيْنِ۔ (رواه النسائی)

أخرجه أحمد فی المسند ١٤٩/٤۔١٥٠وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ١٥٢/٢حدیث رقم ١٤٦٢۔وأخرجه النسائی فی السنن مختصرًا ١٥٨/٢ حدیث رقم ٩٥٣۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی نماز میں سورۂ اعراف تقسیم کر کے دونوں رکعتوں میں پڑھی ہے۔'' (مسلم)

تشریح: وعن عائشة رضی الله عنها قالت ان رسول الله صلی الله علیه وسلم سلی المغرب بسورة الاعراف: بقول تورپشتیؒ اس حدیث کی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نبی علیہ السلام لوگوں کو دین کے احکام کامل مکمل طریقے سے بیان کرتے رہتے تھے اور کبھی قول اور کبھی فعل سے جائز ناجائز کی تفصیل کرتے تھے اور جب مغرب کی نماز کا وقت تنگ ہوتا ہے تو اس میں تطویل اور تخفیف دونوں کا اختیار دے دیا، پھر آپ علیہ السلام نے چاہا کہ کبھی مغرب حدیث میں ذکر کردہ (قراءت کے ساتھ) پڑھوں تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ نماز اس طرح پڑھنا جائز ہے (اگرچہ فضیلت لمبا کرنے کی ہی ہے) اور لوگوں کو بتائیں مغرب کے وقت میں اس قدر قراءت کی گنجائش ہے۔ اور بقولِ خطابی کے اس میں اشکال ہے اس لئے کہ جب سورت اعراف غور تدبّر کے ساتھ پڑھی تو عشاء کا وقت داخل ہو گیا، اور اس کی تاویل یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے پہلی رکعت میں سورت کا کچھ حصہ قراءت کیا تا کہ مغرب کی ایک رکعت وقت کے اندر ادا ہو جائے پھر بقیہ سورت دوسری رکعت میں پڑھی اور اس کی خارج وقت میں ادائیگی میں کوئی حرج نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ سورت سے مراد بعض حصہ ہو۔ بقولِ میرکؒ کے یہ احتمال قولِ راوی کے مناسب نہیں۔ (فرقها فی رکعتین): ایک نسخہ میں فی الرکعتین ہے۔ فرمایا کہ پہلا احتمال بعید ہے یعنی دوسری رکعت کے (پہلی پر) لمبا ہونے کی وجہ سے، ہاں یوں کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ضرورت لاحق ہو گئی ہو۔ میں کہتا ہوں کہ ضرورت کو وجہ بنانا ظاہر نہیں ہے۔

پھر میرکؒ نے یہ احتمال بیان کیا کہ آپ علیہ السلام نے تمام سورت اپنے معجزہ سے زبان کی لپیٹ کی وجہ سے دو رکعتوں میں پڑھ لی۔ میں کہتا ہوں کہ تمام سورت کا دو رکعتوں میں اس طرح پڑھنا کہ بعض ایک رکعت بعض دوسری رکعت میں ہو خرق عادت نہیں ہے اس لئے کہ اتنے وقت میں اس سے زیادہ پڑھنے کی گنجائش ہے اس لئے کہ یہ تمام سورت سوا پارے کی ہے اور مغرب عشاء تک دو پارے پڑھ لیتے ہیں مگر یہ کہ اس سے تنگ وقت مراد ہو اور عنقریب فصل ثالث میں آئے گا کہ ابو بکرؓ نے فجر میں سورۃ بقرہ دو رکعتوں میں پڑھی جو تقریباً اڑھائی پارے بنتے ہیں۔ بقولِ ابن حجرؒ اس حدیث میں ضیقِ وقت (اور یہ واضح ہے) اسی طرح امتدادِ وقت کی بناء پر بھی (اس طرح کہ نبی علیہ السلام قراءت میں خصوصاً قراءت اعراف میں غور تدبر زیادہ فرماتے تھے اس طرح قراءتِ مغرب کے وقت کو گھیر لیتی تھی) ہمارے مذہب کی واضح دلیل ہے کہ جو شخص مثلاً اوّل وقت نماز میں داخل ہوا اس کے لیے قراءت کے ذریعہ نماز لمبی کرنا جائز ہے اسی طرح قراءت کے علاوہ دیگر اعمال کے ذریعہ بھی قراءت پر قیاس کر کے اس علتِ جامع کی وجہ سے کہ جب تک نماز میں رہے گا تو مشغولیت نماز وقت نکلنے تک عبادت شمار ہوگی اور اگر کوئی رکعت بھی وقت کے اندر نہ ہوئی تو وہ قضا ہوگی لیکن گناہ نہ ہوگا۔ اور ابو بکرؓ نے نمازِ فجر کے اپنے اس عمل کی علت بیان فرمائی ہے چنانچہ ان سے عرض کیا گیا اے خلیفہ رسول! سورج طلوع کے قریب ہے تو فرمایا اگر طلوع ہو گیا تو وہ ہمیں غافل نہ پائے گا۔ لہٰذا یہ حدیث دلالت اس پر تو کرتی ہے کہ ابو بکرؓ نے اسفار میں مبالغہ کیا لیکن نماز کی صحت وفساد کے بارے اس میں کوئی دلالت نہیں، گذشتہ قیاس، قیاس مع الفارق ہے اس لئے کہ خروج وقت مغرب دوسری نماز کے وقت کے دخول کو مستلزم ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک بعض علماء کے مذہب کے مطابق دونوں نمازوں کا وقت ہے بخلاف وقت صبح کے، ہاں خروج وقتِ ظہر حالتِ نماز میں قیاس صحیح ہے۔ پھر فرمایا حدیث کی تقریر سے قولِ خطاب کا جواب ہو گیا اور اس طرح کہ یہ ظاہر ہے کہ کھینچنا مدّ کے بیان جواز کیلئے اور یہ بیان کرنے کیلئے ہے کہ جواز مدّ میں رکعت کا وقت کے اندر ہونا شرط نہیں، میں کہتا ہوں حدیث میں وقوع وعدم وقوع پر دلالت نہیں اور بیہقی نے قید کسی دوسری حدیث سے لی ہے اور وہ یہ کہ جس نے صبح کی ایک رکعت پالی اس نے نماز فجر پالی اور جس نے عصر کی رکعت پالی اس نے عصر پالی، خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے علماء نے گذشتہ تقریر سے فجر وعصر کے درمیان فرق کیا ہے، واللہ اعلم۔

(رواہ النسائی) بقولِ میرک اس کی سند حسن ہے۔

معوذتین کی فضیلت

۸۴۸: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ كُنْتُ اَقُوْدُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ نَاقَتَهٗ فِي السَّفَرِ فَقَالَ لِيْ يَاعُقْبَةُ اَلَا اُعَلِّمُكَ خَيْرَ سُوْرَتَيْنِ قُرِئَتَا فَعَلَّمَنِيْ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ قَالَ فَلَمْ يَرَنِيْ سُرِرْتُ بِهِمَا جِدًّا فَلَمَّا نَزَلَ لِصَلَاةِ الصُّبْحِ صَلّٰى بِهِمَا صَلَاةَ الصُّبْحِ لِلنَّاسِ فَلَمَّا فَرَغَ الْتَفَتَ اِلَيَّ فَقَالَ يَاعُقْبَةُ كَيْفَ رَأَيْتَ۔ (رواہ احمد وابوداود والنسائی)

البغوی فی شرح السنة ۳/۸۱ وابن حبان ۳/۱۵۸ حدیث ۱۸۳۸۔

ترجمہ: ”حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کی نکیل پکڑ کر چل رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا اے عقبہ۔ کیا میں تمہیں بہترین دو سورتیں جو ہم پر پڑھی گئی ہیں نہ بتلادوں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے قل اعوذ برب الفلق۔ اور قل اعوذ برب الناس کی تعلیم دی۔ حضرت عقبہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ان دونوں سورتوں سے زیادہ خوش نہیں دیکھا۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کے لئے اترے تو ان دو سورتوں کے ساتھ لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو گئے تو میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ اے عقبہ تم نے کیسا دیکھا ان دو سورتوں کو۔“ (احمد۔ ابوداؤد۔ نسائی)

تشریح: **وعن عقبة بن عامر قال كنت اقود لرسول الله صلى الله عليه وسلم ناقته:** یعنی آگے سے ہانکتا تھا راستہ کے دشوار یا اونٹنی کے سرکش ہونے کی وجہ سے یا شدید اندھیرے کی وجہ سے۔ (**في السفر فقال لي يا عقبة! ألا اعلمك خير سورتين قرائتا؟**): یعنی عقبہ کے لئے بہتر اس لئے کہ وہ ان کے محتاج تھے یا جو شرور سے (خصوصاً سفر میں) تعوذ کے لئے آسانی سے حفظ ہو جائیں ورنہ سارا قرآن بہترین ہے۔ (**فعلمني قل اعوذ برب الفلق وقل اعوذ برب الناس**): یعنی جب قرآن کے شروع سے آخر تک سورتوں کو دو دو کیا جائے تو پناہ مانگنے کیلئے ان سے بہتر کوئی سورت نہیں۔ (**قال**): یعنی عقبہ۔ (**فلم يرني**): یعنی نبی علیہ السلام۔

سررت: مجہول ہے یعنی خوش۔ (**بهما جدًا**): یعنی انتہائی خوشی اس لئے کہ نبی علیہ السلام کو ان کا اہتمام کرتے اور نماز میں پڑھتے نہیں دیکھا تھا اور ابن حجرؒ کی ”جدّا“ کے معنی میں اصلاً کہنے کی بالکل کوئی وجہ نہیں۔ (**فلما نزل**): یعنی نبی علیہ السلام۔

الصلوة الصبح صلى بها صلاة الصبح للناس: سفر میں جلدی پڑھنے کے حکم کی وجہ سے یا مقتضاء مقام یعنی (رسمِ جاہلیت سے) بچنے کیلئے، اس لئے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ جب کسی منزل پر اُترتے تو کہتے تھے: ”**نعوذ لسيد هذا الوادی**، یعنی ہم وادی کے سردار کی پناہ میں آتے ہیں۔ یہ وجہ میرے دِل میں آئی ہے، واللہ اعلم۔ (**فلما فرغ التفت الى فقال يا عقبة كيف رايت؟**): یعنی ان سورتوں کی عظمت کیسی پائی اس حیثیت سے کہ لمبی سورتوں کے قائم مقام پڑھی گئیں، یعنی اگر یہ عظیم القدر نہ ہوتیں تو میں ان کو نماز میں نہ پڑھتا اور طول کا دروازہ بند نہ کرتیں، بقولِ طیبیؒ یہ کہنا ممکن ہے کہ حضرت عقبہ کو ابتداء میں ان کی خوشی نہ ہوئی جب تک ان کا بہترین ہونا ظاہر نہ ہوا اور دِل کی گھبراہٹ باقی رہی اور جب نماز میں پڑھی تو نماز کی برکت سے ان پر یہ معنی منکشف ہو گیا اور خوف زائل ہو گیا۔ پس **كيف رائت** کا **كيف وجدت** کے معنی میں ہونا میرے قول ”**خير سورتين قرئتا في باب التعوّذ**“ کا مصداق ہے، اس صورت میں ”**قرئتا**“ صفتِ ممیّزہ ہو گی۔ بقولِ تورپشتی آپ علیہ السلام نے عقبہ کی حالت موجودہ میں اس کی بہتری کی طرف اشارہ فرمایا کیونکہ وہ سفر پر تھے کہ رات کا اندھیرا چھا گیا اور آپ علیہ السلام نے محسوس فرما لیا کہ اس کو ہلاکت اور رات کے شر کو دور کرنے کے لئے کسی چیز کے سیکھنے کی ضرورت ہے لہٰذا آپ علیہ السلام نے ”معوذتین“ متعین فرمائیں جن کے الفاظ کم اور معنی جامع ہیں اور عقبہ ان دو سورتوں کی تخصیص کی مراد نہ سمجھے چنانچہ ان کا گمان تھا کہ بہتری سورتوں کے بڑے چھوٹے ہونے کے اعتبار سے ہوتی ہے اسی وجہ سے فرمایا کہ آپ علیہ السلام نے مجھے زیادہ خوش نہ دیکھا، اور آپ علیہ السلام نے نماز میں صرف اس لئے پڑھی تاکہ ان کو پتہ چل جائے کہ موجودہ

حالت میں ان سورتوں کا پڑھنا دیگر سورتوں سے زیادہ مناسب ہے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ سورتیں دو بڑی سورتوں کے قائم مقام ہیں، اور جواھر الفقہ میں ہے کہ ''معوذتین'' کا بلاتاویل انکار کرنے والا کافر ہے۔ بقولِ بعض متاخرین کے مطلقاً کافر ہے تاویل کرے نہ کرے، اور بعض فتاویٰ میں ہے کہ ''معوذتین'' کے انکار میں مشائخ کا اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ ان کا انکار کفر ہے۔ مفتاح السعادۃ میں اسی طرح ہے اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ تسمیہ کا قرآن کا جزء ہونا ظنی ہے اس لئے اس کا منکر اور مثبت بالاجماع کافر نہیں کیونکہ کُفر کا حکم ظنیات سے نہیں لگتا بلکہ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قطعیات سے بھی نہیں لگتا کیونکہ اس میں اختلاف کا شبہ ہے، جیسا کہ ''معوذتین'' کے قرآن ہونے کے انکار کے بارے حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے اور امام نوویؒ کا اس قول کو ان پر بہتان کہنا بھی غلط ہے اس لئے کہ یہ ان سے صحیح طرق سے ثابت ہے لیکن اس میں یہ تاویل کی جاتی ہے کہ یہ اصل قرآن نہ ہونے کے بارے میں نہیں بلکہ مصحف میں اثبات کے بارے میں ہے اس لئے کہ مصحف میں اثبات کے لئے آپ علیہ السلام کا حکم شرط ہے کہ اس کو مصحف میں رکھو اور یہی تاویل ابن مسعود کے فاتحہ کو اپنے مصحف سے ساقط کرنے کے بارے میں ہے، میں کہتا ہوں کہ نوویؒ کے قول کو اصل قرآن ہونے کے انکار پر محمول کیا جائے تو ان کا قول مقبول ہوگا مردود نہ ہوگا اور یہی ظاہر ہے۔

رواہ احمد وابو داؤد والنسائی : یعنی قاسم مولیٰ معاویہ عن عقبہ کی حدیث، اور یہ قاسم ابوعبدالرحمٰن القاسم بن عبد الرحمٰن قرشی ہیں اور یحیٰ بن معینؒ وغیرہ نے ان کو ثقہ کہا ہے اور چند نے متکلم فیہ لکھا ہے بقول میرکؒ کے۔

شبِ جمعہ میں نمازِ مغرب کی قراءت

۸۴۹: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِيْ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ وَقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ (رواه في شرح السنة)

البغوی فی شرح السنة ۳/۸۱ وابن حبان ۳/۱۵۸ حدیث ۱۸۳۸۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب جمعہ میں نماز مغرب میں سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص کی تلاوت کرتے تھے۔ اس حدیث کو شرح السنہ میں نقل کیا ہے۔''

تشریح: **وعن جابر بن سمرہ قال كان النبي صلى الله عليه وسلم يقرأ في المغرب**: یعنی فرض میں، اور احتمال سنت کا بھی ہے۔ (**ليلة الجمعة قل يا ايها الكافرون وقل هو الله احد**)۔ (**رواہ**) یعنی بغویؒ نے ''فی الشرح السنۃ'' یعنی اپنی اسناد کے ساتھ، بقول شیخ جزری کے ابن حبان نے بھی روایت کیا اور پوری حدیث یہ ہے: **وفي العشاء سورة الجمعة والمنافقون** یعنی جمعہ کی رات نماز عشاء میں سورۃ جمعہ اور منافقون پڑھتے تھے۔ میرکؒ نے شیخ جزری سے نقل کیا ہے کہ ابن حبان نے اس کی تخریج کی ہے اور اس کی سند میں سعید بن سماک ہے اور وہ متروک ہے۔ دارقطنی کہتے ہیں کہ محفوظ یہ ہے کہ ان دو کو بعد المغرب دو رکعتوں میں پڑھا۔

۸۵۰: وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اِلَّا اَنَّهُ لَمْ يَذْكُرْ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ۔

أخرجه ابن ماجة فی سننه ۱ / ۲۷۲' حدیث رقم ۸۳۳

ترجمه: ''اور امام ابن ماجہ نے یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے مگر اس میں لیلۃ الجمعہ کے الفاظ نہیں ذکر کئے۔''

تشریح: **ورواه ابن ماجه عن ابن عمر**: بقولِ میرکؒ بظاہر اس کی سند صحیح ہے لیکن معلول ہے۔ دارقطنیؒ کہتے ہیں بقولِ ابن حجرؒ اس کے بعض راوی نے غلطی کی ہے۔

الا انه لم یذکر لیلة الجمعة: ابن الملکؒ کہتے ہیں جان لے کہ ایسا اور اس کی مثل اور قراءت کرنا ہمیشہ نہیں ہوتا بلکہ ہر وقت ایسا جوازِ قراءت بتانے کے لئے کرتے تھے۔

۸۵۱: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ مَا اُحْصِیْ مَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقْرَاُ فِی الرَّكْعَتَیْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ وَفِی الرَّكْعَتَیْنِ قَبْلَ صَلَاةِ الْفَجْرِ بِقُلْ یَا اَیُّهَا الْكَافِرُوْنَ وَقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/۲۹۶حدیث رقم ۴۳۱وقال حدیث غریب لا نعرفه إلا من حدیث عبدالله بن معدان عن عاصم۔

''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں شمار نہیں کو سکتا کہ میں نے کتنی مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب کی نماز کے بعد اور فجر کی نماز سے قبل دونوں سنتوں میں سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص پڑھتے ہوئے سنا ہے۔'' (اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے)۔

تشریح: **وعن عبد الله بن مسعود قال ما احصی**: ''ما'' نافیہ ہے یعنی شمار نہیں کر سکتا۔ **(ما سمعت)**: ''ما'' موصولہ اور بقولِ بعض مصدریہ ہے یعنی میرا سماع۔ **(رسول الله ﷺ یقرأ)**: یعنی میں شمار نہیں کر سکتا کہ آپ علیہ السلام یہ سورتیں کتنی مرتبہ مغرب میں پڑھتے تھے، یا وہ مدت شمار نہیں کر سکتا جس میں' میں نے آپ علیہ السلام سے سنیں اور یہ کثرت کی طرف کنایہ ہے۔ بقولِ طیبیؒ ''یقرأ'' حال ہے ''ما'' کی طرف لوٹنے والی ضمیر سے، اصل میں عبارت یہ تھی **ما سمعت قراءته**، چنانچہ مفعول بہ کو اس کی جگہ سے زائل کر کے حال بنا دیا گیا جیسا کہ قولِ باری تعالیٰ میں ہے: ﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ﴾ [آل عمران: ۱۹۳] ''اے پروردگار! ہم نے ایک ندا کرنے والے کو سنا کہ ایمان کے لیے پکار رہا تھا'' یعنی نداء المنادی اور ابن حجرؒ نے بھی طیبیؒ کی طرح فرمایا، اور اس میں بات یہ ہے کہ ''منادیًا'' تو بالاتفاق ''سمعنا'' کا مفعول ہے اختلاف صرف ''ینادی'' میں ہے کہ وہ ''منادیًا'' کی صفت ہے یا اس سے حال ہے بمطابق ابوالبقاء کی کتاب ''اعراب'' کے۔ اور بقولِ بعض ''سمعت'' متعدی بدو مفعول ہے۔

فی الرکعتین بعد المغرب وفی الرکعتین قبل صلاة الفجر بقل یا ایها الکافرون ......: دونوں نمازوں کی پہلی رکعت میں۔ **(وقل هو الله احد** ......**)**: دونوں کی دوسری رکعت میں۔ (رواه الترمذی)

بقولِ ذہبیؒ ابو حاتم وغیرہ نے اس کو ضعیف کہا ہے اور ابن حبان نے اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔

۸۵۲: وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ یَذْكُرْ بَعْدَ الْمَغْرِبِ۔

أخرجه ابن ماجة في السنن عن أبي هريرة ١ / ٣٦٣ حديث رقم ١١٤٨ و عن ابن عمر ١١٤٩ ولم يذكر! بعد المغرب۔

ترجمہ: ''اور امام ابن ماجہ نے اس حدیث کو حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے لیکن اس روایت میں بعد المغرب کے الفاظ نہیں ہیں) یعنی ان سورتوں کو ان سنتوں میں اکثر پڑھا کرتے تھے۔''

تشریح: **ورواه ابن ماجه عن ابی هریره الا انه:** یعنی ابن ماجہ یا ابوہریرہؓ نے۔ **(لم یذکر بعد المغرب):** یعنی **فی الرکعتین بعد المغرب** کے الفاظ ذکر نہیں کیے۔

مفصلات کی قراءت

۸۵۳: وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ مَاصَلَّيْتُ وَرَاءَ اَحَدٍ اَشْبَهَ صَلَاةً بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنْ فُلَانٍ قَالَ سُلَيْمَانُ صَلَّيْتُ خَلْفَهٗ فَكَانَ يُطِيْلُ الرَّكْعَتَيْنِ الْاُوْلَيَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ وَيُخَفِّفُ الْاُخْرَيَيْنِ وَيُخَفِّفُ الْعَصْرَ وَيَقْرَاُ فِى الْمَغْرِبِ بِقِصَارِ الْمُفَصَّلِ وَ يَقْرَاُ فِى الْعِشَاءِ بِوَسَطِ الْمُفَصَّلِ وَيَقْرَاُ فِى الصُّبْحِ بِطِوَالِ الْمُفَصَّلِ (رواه النسائی وروی ابن ماجة) اِلٰى وَيُخَفِّفُ الْعَصْرَ۔

أخرجه ابن ماجة في السنن عن أبي هريرة ٣٦٣/١حديث رقم ١١٤٨وعن ابن عمر ١١٤٩ولم "يذكرابعد المغرب"۔

ترجمہ: ''حضرت سلیمان بن یسارؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کسی آدمی کے پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مشابہ نماز نہیں پڑھی مگر فلاں آدمی کے پیچھے۔ حضرت سلیمانؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بھی اس آدمی کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ وہ ظہر کی پہلی دو رکعتوں کو طویل کرتے تھے اور دوسری دو رکعتوں کو ہلکا کرتے تھے۔ اور عصر کی نماز میں تخفیف کرتے تھے۔ مغرب کی نماز میں قصار مفصل اور عشاء میں اوساطِ مفصل اور فجر کی نماز میں طوال مفصل پڑھا کرتے تھے۔ (نسائی، ابن ماجہ) ان کی روایت میں صرف وَيُخَفِّفُ الْعَصْرَ تک کے الفاظ ہیں۔''

راویٔ حدیث:

سلیمان بن یسار۔ یہ سلیمان بن یسار ہیں۔ ان کی کنیت ''ابوایوب'' ہے۔ یہ میمونہ زوجہ نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ ہیں۔ ان کے بھائی عطاء بن یسار ہیں۔ اہل مدینہ سے ہیں۔ بڑے درجہ کے تابعین میں سے ہیں۔ یہ فقیہ، فاضل، قابل اعتماد، عابد، پرہیزگار اور حجۃ تھے (یعنی ان کی طرف کسی قول کا منسوب ہونا مستقل دلیل تھی) فقہائے سبعہ میں سے ہیں۔ ۱۰۷ھ میں ان کا انتقال ہوا جب کہ ان کی عمر (۷۳) سال کی تھی۔

تشریح: **عن ابی هریره قال ما صلیت وراء احد اشبه صلاة برسول الله:** یعنی آپ کی نماز کے۔ **(صلی الله علیه وسلم من فلان):** بقولِ بعض حضرت علیؓ (ابن ملک نے اس کو بیان کیا) دوسرے قول کے مطابق عمرو بن سلمہ بن نفیع، تیسرا قول عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں ہے۔ تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس (آخری) روایت پر اعتماد نہیں ہوسکتا

اس لئے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز ۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور حضرت ابو ہریرہ ۵۷ھ میں فوت ہو چکے تھے، دوسرے قول کے مطابق ۵۸ھ میں اور تیسرا قول ۵۹ھ میں وفات کا ہے، البتہ حضرت انسؓ کی روایت بھی ایسی ہی ہے جو کہ باب الرکوع فصل ثالث میں آرہی ہے۔اس میں انہوں نے صراحۃً فرمایا کہ فلاں سے مراد حضرت عمر بن عبدالعزیز ہیں اور یہی صحیح ہے اس لئے کہ طیبیؒ کے بیان کے مطابق حضرت انسؓ کی وفات ۹۱ھ میں ہوئی اور بقولِ بعض یہ ایک شخص تھے جو مدینہ کے امیر تھے اور طیبیؒ کا مختار قول یہی ہے۔

قال سليمان صليت خلفه: یعنی اس فلان کے پیچھے۔**(فكان يطيل الركعتين الا وليس من الظهر ويخفف الاخريين ويخف العصر):** یعنی ظہر کی نسبت۔

ويقرأ في المغرب بقصار المفصل يقرأ في العشاء بوسط المفصل: اور ہمارے مذہب میں ظہر وعصر، عشاء کے ساتھ لاحق ہے۔**(ويقرأ في الصبح بطوال المفصل):** ''طاءُ'' کے کسرہ کے ساتھ، البتہ ابن حجرؒ ''طاء'' کا ضمہ وکسرہ کے ساتھ کہنا سہو ہے۔قاموس میں ہے: **طال امتدّ فهو طويل وطوال كغراب(ج) طوال وطيال بكسرهما** بقولِ مظہر کے، سات مفصلات کی پہلی سورت ''حجرات'' ہے ان کو مفصل اس لئے کہتے ہیں کہ ان کی سورتیں چھوٹی ہیں ہر سورت کلام کے فصل کی طرح ہے اور بقولِ بعض طوالِ مفصل سورتِ ''نبأ'' تک ہے اور اوساط مفصل ''الضحیٰ'' تک، طیبیؒ نے اس کو نقل کیا اور میرک نے ازہار سے نقل کیا ہے کہ مفصلات کی پہلی سورت میں اختلاف ہے۔

① ایک سورت ''محمد'' کا ہے۔

② دوسرا قول سورت ''فتح'' اور تیسرا قول سورت ''حجرات'' کا ہے اور یہی زیادہ مشہور ہے۔

اور شرح منیۃ میں ہے کہ طوال مفصل ''حجرات'' سے ''بروج'' تک، اور اوساط مفصل ''بروج'' سے ''بینہ'' تک، اور قصار مفصل ''بینہ'' سے آخرِ قرآن تک۔جمہور کا مذہب یہی ہے۔

(رواه النسائي): بقول میرک یہ نسائی کے الفاظ ہیں۔**(وروى ابن ماجه الى ويخفف العصر)۔**

قراءت خلف الامام کا حکم

۸۵۴: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ كُنَّا خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ فِيْ صَلَاةِ الْفَجْرِ فَقَرَأَ فَثَقُلَتْ عَلَيْهِ الْقِرَاءَةُ فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ لَعَلَّكُمْ تَقْرَأُوْنَ خَلْفَ اِمَامِكُمْ قُلْنَا نَعَمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَا تَفْعَلُوْا اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَاِنَّهُ لَاصَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْبِهَا (رواه ابوداود والترمذی وللنسائی معناه وفی رواية لابی داود) **قَالَ وَاَنَا اَقُوْلُ مَالِيْ يُنَازِعُنِي الْقُرْاٰنَ فَلَا تَقْرَأُوْا بِشَيْءٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ اِذَا جَهَرْتُ اِلَّا بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ۔**

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/۵۱۵حديث رقم ۸۲۳۔وأخرجه الترمذي في السنن ۲/۱۱۶حديث رقم ۳۱۱۔ وقال حديث حسن ۔وأخرجه أحمد في المسند ۵/۳۲۲وأخرج النسائي نحوه ۲/۱٤۱حديث رقم ۹۲۰

وأخرج أبوداؤد روایة "مالی أنازع......" ١/٥١٥ حدیث ٨٢٤۔

ترجمہ: ''حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ فجر کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قراءت شروع کی تو آپ ﷺ کے لئے پڑھنا مشکل ہوگیا۔پھر جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ شاید تم لوگ امام کے پیچھے قراءت کیا کرتے ہو۔ہم نے عرض کیا جی ہاں۔اے اللہ کے رسول۔آپ ﷺ نے فرمایا سوائے سورۂ فاتحہ کے کچھ نہ پڑھا کرو۔اس لئے کہ جو آدمی سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔(ابوداؤد۔ترمذی) امام نسائی نے یہ روایت بالمعنی نقل کی ہے اور ابوداؤد شریف کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جب ہی تو میں کہتا تھا کہ یہ کیا ہوگیا کہ قراءت مجھ پر مشکل ہورہی ہے جب میں قراءت جہر کے ساتھ کروں تو تم لوگ سوائے سورۂ فاتحہ کے اور کچھ نہ پڑھا کرو۔''

تشریح: **وعن عبادة بن الصامت قال کنا خلف النبی صلی الله علیه وسلم فی صلاة الفجر فقرأ فثقلت**: یعنی دشوار ہوگئی۔(**علیه القرأة فلما فرغ قال لعلکم تقرون خلف امامکم قلنا نعم یا رسول الله!**): بقول طیبیؒ سوال استفہام کے معنی میں ہے۔یعنی آپ علیہ السلام ان کے فعل کے بارے میں پوچھ رہے تھے اسی وجہ سے صحابہ نے ہاں میں جواب دیا، گویا کہ آپ علیہ السلام پر قراءت دشوار ہوگئی لیکن دشواری کا سبب معلوم نہ ہوا لہٰذا ان سے سوال کیا۔آپ علیہ السلام کا فرمان: **مالی ینازعنی القرآن** اس پر دلیل ہے اور آپ علیہ السلام نے **خلف امامکم** فرمایا، اور بظاہر ''خلفی'' ہونا چاہیے تھا، یہ بتانے کے لئے ایسا فرمایا کہ یہ فعل کسی بھی مقتدی کے لئے مناسب نہیں اور بقول احتمال یہ بھی ہے کہ ثقل کا سبب آپ علیہ السلام کی قراءت پر اکتفاء نہ کرنے کے سبب پیدا ہونے والا نقص ہو اور کامل آدمی بعض اوقات پیچھے والوں کی کمی سے متاثر ہو جاتا ہے جیسا کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ نمازِ فجر میں سورت الروم شروع فرمائی اور اس میں غلطی ہوگئی تو ارشاد فرمایا کہ ایسا میرے پیچھے ان لوگوں کی وجہ سے ہوا جو طہارت اچھی طرح نہیں کرتے۔اور بقولِ مظہر دشواری کا سبب مقتدیوں کی آوازوں کی کثرت تھی اور سنت یہ ہے کہ مقتدی اس طرح قراءت کرے کہ ہر ایک کو اپنی آواز سنائی دے اور مقتدی کے قراءت کرنے کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے چنانچہ امام شافعیؒ کا اصح قول یہ ہے کہ مقتدی سرّی و جہری دونوں نمازوں میں قراءت کرے اور یہی مذہب امام احمدؒ کا ہے اور امام شافعیؒ کا ایک قول یہ ہے کہ سرّی میں قراءت کرے کیونکہ جہری نماز میں امام کی قراءت سننا کافی ہے اور امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ مقتدی نہ سرّی میں قراءت کرے نہ جہری میں، طیبیؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے اور ائمہ حنفیہ میں سے امام محمدؒ سرّی نماز میں امام شافعیؒ کے موافق ہیں اور جمع بین الروایات الحدیثیہ کے لئے یہی قول اظہر ہے اور امام مالکؒ کا مذہب بھی یہی ہے۔

قال لا تفعلوا الا بفاتحه الکتاب: ''نہی'' کراہت کے لئے ہے لہٰذا وسوسہ میں پڑنے کے خوف سے امام کی قراءت کے وقت قراءت کرنا مکروہ ہے۔خطابی یہ احتمال بیان کرتے ہیں کہ ''نہی'' جہری قراءت سے ہے، دوسرا احتمال یہ کہ ''نہی'' فاتحہ سے زائد پڑھنے سے ہے، ازھار میں اسی طرح ہے۔میرکؒ کہتے ہیں کہ میں دوسرے احتمال کو اظہر کہتا ہوں بلکہ درست یہی ہے اس لئے کہ اگر جہر مراد ہو تو فاتحہ کا استثناء قائم نہیں رہتا۔

میں کہتا ہوں کہ آئندہ آنے والی ایک دوسری روایت بھی اسی کی موید ہے اور آپ علیہ السلام کا سوال کرنا بھی اس کے لئے ممد ہے اس لئے کہ اگر قراءت جہری ہوتی تو آپ علیہ السلام "**لعلکم تقرؤن**" نہ فرماتے۔ لیکن اس روایت سے سرّی قراءت کرنے کا حکم دینا حاصل نہیں ہوتا حالانکہ امام کو تشویش سے بچانے کے لئے یہی مقصود ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے ائمہ نے اس مسئلہ میں اسی حدیث کو دلیل بنایا ہے کہ مقتدی جہری نماز میں سورت نہ پڑھے بلکہ امام کی قراءت غور سے سنے اس لئے کہ جہر سے مقصود مقتدیوں کو سنانا ہی ہے تاکہ وہ اس میں غور تدبر کریں اور اسی وجہ سے اگر مقتدی نے امام کی قراءت نہ سنی یا آواز سنی لیکن سمجھا نہیں تو فاتحہ کے بعد سورت پڑھنا اس کیلئے سنت ہے اس لئے کہ یہ قراءت اس کے حق میں بمنزلہ سرّی کے ہے۔

فانه لا صلوٰة لمن لم يقرابها: بقولِ ابن الملکؒ امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے فاتحہ پڑھے۔ ہم کہتے ہیں یہ ابتداءِ زمانہ پر محمول ہے۔ میں کہتا ہوں تمام مسئلہ کے حل کیلئے قراءت فاتحہ سے خاص طور پر منع کرنے کی تاریخ کی پہچان ضروری ہے، واللہ اعلم۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی) یعنی اس لفظ کے ساتھ۔

وللنسائی معناه: میرکؒ نے ابن الملقن سے نقل کیا ہے کہ حدیث عبادہ بن صامت کو ابوداؤد، وترمذی، دارقطنی، ابن حبان، بیہقی، حاکم نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے حسن کہا ہے اور کہا کہ اس کی سند حسن اور اس کے رجال ثقہ ہیں اور بقولِ خطابی اس کی سند جید ہے جس میں کوئی طعن نہیں اور بقولِ حاکم اس کی سند مستقیم اور بقول بیہقی صحیح ہے۔ لہٰذا ابن حجرؒ کا **صحّحه الترمذی والدارقطنی والحاکم والبیهقی والخطابی وغیرهم** کہنا محدثین کی اصطلاح میں صحیح نہیں۔ (**وفی روایة لابی داؤد قال صلی الله علیه وسلم**): "**لا تفعلوا**" کی جگہ۔ (**وانا اقول**): یعنی دِل میں۔ (**ما لی ینازعنی**): یعنی ٹکراتا ہے اور آسان نہیں ہوتا۔ (**القرآن**): فرع کے ساتھ، بقولِ طیبیؒ یعنی آسانی سے نہیں پڑھ سکتا گویا میں اس کو کھینچتا ہوں اور وہ نافرمانی کرتا ہے اور مجھ پر ثقیل ہوتا جاتا ہے، اور نصب کے ساتھ، یعنی میرے پیچھے والے قراءت کے ذریعہ غالب آنے کے لئے مجھ سے جھگڑتے ہیں یعنی ان کی قراءت میری قراءت سے خلط ہو جاتی ہے۔ اور اس کی تائید ایک نسخہ کے ان الفاظ سے ہوتی ہے: **ینازعنی بضم العین وتشدید النون علی حذف الواو ونصب القرآن** (یعنی ینازعنی عین کے ضمہ اور نون کی تشدید کے ساتھ ہے جب کہ واؤ کو حذف کر دیا جائے، اور نصب کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں قرآن مراد ہے) لیکن اس کے صحیح ہونے میں نظر ہے اس لئے کہ تاکید صرف مستقبل میں جائز ہے بشرطیکہ اس کی طلب وحاجت بھی ہو۔ (**فلا تقرأوا بشئی من القرآن**): بظاہر مطلق ہے یعنی سرّی وجہری دونوں کو شامل ہے اور مقام سرّی کے ساتھ مقید ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ (**اذا جهرت الا بام القرآن**): یعنی آہستہ، اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب امام جہری نہ کرے تو مقتدی کیلئے فاتحہ کے علاوہ سورت بھی آہستہ آواز میں پڑھنے کی اجازت ہے، اور اس میں راز یہ ہے کہ جہری نماز میں فاتحہ کے علاوہ کا سننا قراءت کے قائم مقام ہو جاتا ہے بخلاف سرّی کے اس لئے کہ اس میں صرف سکوت ہوتا ہے اور آپ ﷺ کے فرمان: **من کان له امام فقراة الامام قراة له**، کا یہی مطلب ہے، واللہ اعلم۔

جہری نماز میں قراءت کی ممانعت

۸۵۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِنْصَرَفَ مِنْ صَلَاةٍ جَهَرَ فِيْهَا بِالْقِرَاءَةِ فَقَالَ هَلْ قَرَأَ مَعِیَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ اٰنِفًا فَقَالَ رَجُلٌ نَعَمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنِّیْ اَقُوْلُ مَالِیْ اُنَازَعُ الْقُرْاٰنَ قَالَ فَانْتَهَی النَّاسُ عَنِ الْقِرَاءَةِ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْمَا جَهَرَ فِيْهِ بِالْقِرَاءَةِ مِنَ الصَّلَوَاتِ حِيْنَ سَمِعُوْا ذٰلِكَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ۔ (رواہ مالك واحمد وابوداود والترمذی والنسائی وروی ابن ماجة نحوہ)

أحمد فی المسند ۲/ ۲٤۰وأخرجه مالك ۱/ ۸٦ حدیث رقم ۲٤من كتاب الصلاة وأبوداوٗد ۱/ ۵۱٦ حدیث ۸۲٦ والترمذی ۱/ ۱۱۸حدیث ۳۱۲۔والنسائی ۲/ ۱٤۰حدیث ۱٤۱۔وابن ماجة بمعناہ ۱/ ۲۷٦ حدیث ۸٤۸۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہری قراءت والی نماز سے فارغ ہوئے اور فرمایا کیا ابھی تم میں سے کسی نے میرے ساتھ قراءت کی ہے۔ایک آدمی نے عرض کیا ہاں۔اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا میں کہتا تھا کہ کیا ہو گیا مجھ سے قرآن پڑھنے میں جھگڑا کیا جا رہا ہے۔حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں جب لوگوں نے یہ سنا تو جن نمازوں میں رسول اللہ ﷺ بلند آواز سے قراءت کرتے تھے ان میں قراءت کرنے سے باز آ گئے۔(مالک۔احمد۔ابوداوٗد۔ترمذی۔نسائی) امام ابن ماجہ نے بھی اس کی مثل روایت نقل کی ہے۔''

تشریح: **وعن ابی هریرة أن رسول الله صلی الله علیه وسلم انصرف**: یعنی فارغ ہوئے۔**(من صلٰوة جهر فیها بالقراة فقال هل قرا معیی احدمنكم آنفا؟)**: ''مد'' کے ساتھ اور قصر کے ساتھ بھی جائز ہے یعنی ''ابھی'' مراد قریب قریب۔اور ظاہر ہے کہ سوال سرّی قراءت کے بارے میں تھا، ورنہ ج جہر مخفی نہیں ہوتا۔**(فقال رجل نعم یا رسول الله! قال انی اقول ما لی انازع القرآن؟)**: ''زاء'' کے فتحہ کے ساتھ اور ''القرآن'' کے نصب کے ساتھ، اس بناء پر کہ وہ مفعولِ ثانی ہے یعنی قرآن میں، میرکؒ کے نقل کے مطابق ازہار میں اسی طرح ہے، اور ایک نسخہ میں ''زاء'' کے کسرہ کے ساتھ ہے، اور ابن الملکؒ کی شرح المصابیح میں ہے کہ بقولِ بعض ''انازع'' مجہول ہے یعنی قراءت میں میرے ساتھ مداخلت اور مشارکت اور مجھ پر غلبہ کی کوشش کی جا رہی ہے اور یہ اس وجہ سے کہ لوگوں نے آپ علیہ السلام کے پیچھے جہری قراءت کی یا افضل (آپ کی قراءت سننا) کو چھوڑ کر اپنی قراءت میں مشغول ہو گئے اور ان کا مشغول ہونا گویا آپ کے ساتھ منازعت تھی اور اس کو آپ علیہ السلام کے فاتحہ سے فارغ ہونے سے پہلے سرّی قراءت کرنے پر محمول کرنا اظہر ہے، یا لوگوں کے فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد فاتحہ کے علاوہ سرّی قراءت کرنے پر، اس صورت میں گذشتہ حدیث کے موافق ہو جائے گا۔

(قال): یعنی (بقولِ ابن الملکؒ) ابوہریرہ نے، اور یہی ظاہر ہے لیکن میرکؒ نے ابن الملقن سے نقل کیا ہے، نیز بقولِ بخاری، ذہبی، ابن فارس، ابوداوٗد، ابن حبان، خطابی وغیرہم کے، **فانتهی الناس** زہری کا کلام ہے، مرفوع نہیں ہے۔

(فانتهی الناس عن القراة): یعنی ترک کر دی۔**(مع رسول الله ﷺ)**: اور ظاہر اطلاق جہری وسری فاتحہ اور غیر فاتحہ سب کو شامل ہے اور ہو سکتا ہے کہ گذشتہ حدیث کیلئے یہ حدیث ناسخ ہو کیونکہ ابوہریرہؓ بعد میں اسلام لائے۔

فیما جھر فیه بالقراء ة من الصلوات: اور اس کا مطلب یہ ہے لوگ سرّی قراءت کی نماز میں سری قراءت کرتے تھے اور یہی اکثر کا مذہب ہے اور ہمارے ائمہ میں سے امام محمدؒ بھی اسی پر ہیں۔ **(حین سمعوا ذلك):** یعنی گذشتہ ارشاد۔ **(من رسول الله صلی الله علیه وسلم):** بقولِ ابن الملکؒ جو جہری نماز میں قراءتِ خلف الامام کے قائل ہیں ان کا یہ قول امام کے پیچھے آواز بلند نہ کرنے پر محمول ہے اور یہ آپ ﷺ کے قول **هل قرأ معی احد منکم**، کے ظاہر کے خلاف ہے۔

(رواہ مالک واحمد وابوداوٗد والترمذی والنسائی)

یعنی اس لفظ کے ساتھ حدیثِ ابن اُکیمۃ لیثی سے جو وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نماز کے بارے نقل کرتے ہیں، اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے، بقول نوویؒ کے ائمہ نے ترمذی پر اس کو حسن کہنے میں تنکیر کی ہے اور اس کے ضعف پر متفق ہیں اس لئے کہ ابن اکیمہ مجہول ہے اور اس پر بھی کہ **فانتھی الناس عن القراء ة** والا جملہ حدیث نہیں بلکہ زہری کا کلام ہے جو آہستہ آہستہ اس میں شامل ہو گیا، یہ بات متقدین متاخرین حفاظ کے نزدیک متفق علیہ ہے جن میں سے بعض یہ ہیں امام اوزاعی، محمد بن یحییٰ ذہلی، بخاری ابوداوٗد، خطابی وغیرہ، اور روایتِ ابوداوٗد عن الزہری میں ہے کہ فرمایا میں نے ابن اکیمہ کو سعید بن المسیّب سے حدیث بیان کرتے سُنا انہوں نے فرمایا میں نے ابو ہریرہ کو یہ کہتے سُنا کہ ہمیں رسول علیہ السلام نے نماز پڑھائی، میرے گمانؒ کے مطابق وہ نماز فجر تھی پھر **ما لی انازع** فیھاتک حدیث بیان کی۔ معمر فرماتے ہیں کہ لوگ قراءت سے رُک گئے اور ایک روایت میں معمر زہری سے اور وہ ابو ہریرہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ لوگ رُک گئے، اس کو میرکؒ نے نقل کیا ہے اور آخری روایتِ ظاہرہ مشکوٰۃ کی ہے، واللہ اعلم۔ **(وروی ابن ماجه ونحوه):** یعنی اس کا معنی، بقول میرکؒ عن الملقن حدیث ابی ہریرہ کو امام مالک، شافعیؒ اور چاروں ائمہ نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کو حسن اور ابن حبان نے صحیح اور حمیدی و بیہقی نے ضعیف کہا ہے اس سے معلوم ہوا کہ امام نوویؒ کا اس کے ضعف کو متفق علیہ کہنا صحیح نہیں، اور خبر **من صلی خلف الامام فان قراء ة الامام قراء ة له** بھی ضعیف ہے، اسی طرح **نهی عن القراء ة خلف الامام** والی روایت بھی، جیسا کہ بیہقی نے بیان کیا ہے، باوجود یہ کہ ان کو مسبوق یا قراءتِ سورت پر حمل کرنا ممکن ہے۔

نمازی اللہ سے مناجات کرتا ہے

۸۵۲: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَ الْبَيَاضِيِّ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُصَلِّيَ يُنَاجِيْ رَبَّهٗ فَلْيَنْظُرْ مَا يُنَاجِيْهِ وَلَا يَجْهَرْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ بِالْقُرْآنِ۔ (رواہ احمد)

أخرجه أحمد ٤/٣٤٤ ومالك ١/٨٠ حديث رقم ٢٩ من كتاب الصلاة۔

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت بیاضیؓ سے روایت ہے یہ دونوں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نمازی اپنے رب سے مناجات کرتا ہے لہٰذا اس کو چاہئے کہ اپنی مناجات میں غور کرے اور قرآن پڑھنے میں تم میں سے کوئی ایک دوسرے پر آواز بلند نہ کرے۔“ (احمدؒ)

راویٔ حدیث:

البیاضی۔ بیاضہ بن عامر کی طرف منسوب ہے اور ان کا نام ''عبداللہ بن جابر الانصاری'' ہے۔ صحابی تھے۔ الاکمال میں ''بیاضی'' کی تحقیق کی قدر ہے' البتہ بیاضی بائے موحدہ کے فتحہ' یائے تحتیہ' اور آخر میں ضاد معجمہ ہے۔ یہ نسبت کئی چیزوں کی طرف کی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک ''بیاضیۃ الانصاری'' ہے یہ ان کا ایک بطن ہے اھ بیاضی، ہی عبداللہ بن غنام ہیں بعض کا کہنا ہے کہ بیاضہ بن عامر بن زریق کی طرف منسوب ہے اور ''بیاضی'' بلاتسمیہ مطلق بولا جائے تو عبداللہ بن جابر مراد ہوتے ہیں۔

تشریح: قالا: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان المصلی یناجی ربہ: یعنی کلام کرتا ہے اور یہ قرب معنوی کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ نماز مؤمن کی معراج ہے۔ (فلینظر ما یناجیہ): اور ایک نسخہ میں ما یناجی بہ ہے، ''ما'' استفہامیہ یا موصولہ ہے یعنی کسی چیز کے ساتھ اللہ تعالیٰ مناجات کر رہا ہے ذکر قرآن خشوع خضوع حضور قلب، اس لئے کہ آدمی کے لئے نماز میں سے صرف وہی ہے جو سمجھ کر کرے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ معانی میں غور وفکر کرے یا غور کرے کہ اس مقام میں کیا مناجات کر رہا ہے، بقول طیبیؒ ''ما'' استفہامیہ ہے اور یناجی کی ضمیر لفظ الرّب کی طرف راجع ہے اور ''بہ'' کی ضمیر ''ما'' کی طرف، اور ''ما'' مفعول ہے۔ فلینظر کا معنی یہ ہے کہ جس قول کے ساتھ مناجات کر رہا ہے اس کے جواب میں تعظیم کے ساتھ اور دِل کو زبان کے موافق کر کے تمام بدن کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر کے، غور وفکر کرا اور یہ اس صورت میں ہی ہوسکتا ہے جب مناجی قراءت کے ذریعہ منازعت نہ کرے اسی وجہ سے بعد میں فرمایا، (ولا یجھر بعضکم علی بعض بالقراء ۃ) اور ''نہی'' نماز پڑھنے والے اور خارج نماز دونوں کو شامل ہے، بقول طیبیؒ یجھر کو علی کے ساتھ متعدی اس لئے کیا چونکہ غلبہ کے معنی مراد تھے یعنی قراءت بالجہر کی وجہ سے کوئی کسی پر غالب نہ ہو اور نہ اس کو دشواری میں ڈالے، اور لفظِ بعض مصلّی، ہونے والا قراءت کرنے والا، سب کو شامل ہے اور بالقرآن سے مراد یہ ہے کہ جب قرآن کی وجہ سے منازعت درست نہیں تو باقی چیزوں کی وجہ کیسے درست ہوگی اس لے کہ یہ ایذاء کا سبب ہے اور ایذاء دینا مسلمانوں کی شان نہیں چہ جائیکہ نمازی اور قراءت کرنے والے، لہٰذا اس جملہ کا ماقبل سے ربط واضح ہوگیا۔ اور اُمت کا مقتدی کے قراءت بالجہر کرنے کے مکروہ ہونے پر اجماع ہے اگر چہ امام کی قراءت سن رہا ہو۔ (رواہ احمد)

اور امام مالک نے موطا میں، اسی طرح نسائی نے حدیث ابی سعید سے، اس کو میرکؒ نے تصحیح سے نقل کیا ہے۔

امام کی متابعت لازم ہے

۸۵۷: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِیُؤْتَمَّ بِهٖ فَاِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا وَاِذَا قَرَاَ فَاَنْصِتُوْا ۔ (رواہ ابوداود والنسائی وابن ماجة)

أخرجه أبوداؤد ۱/۴۰۴حدیث رقم ۶۰۴۔والنسائی ۲/۱۴۲حدیث رقم ۹۲۲وابن ماجة ۱/۳۷۶حدیث ۸۴۶۔ وأحمد ۲/۴۲۰۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ امام اس لئے

مقرر کیا گیا ہے تا کہ اس کی پیروی کی جائے۔لہٰذا جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔'' (ابوداؤد۔نسائی۔ابن ماجہ)

تشریح: وعن ابی هریره قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم انما جعل الامام لیوتم به: یعنی اقتداء کے لیے۔(فاذا کبر فکبروا): بقولِ ابن حجرؒ امام کے بعد تکبیر کہے ساتھ اور اس سے پہلے نہ کہے اور یہ تکبیر تحریمہ میں واجب ہے (اس لئے کہ تابع کی نماز کا انعقاد من حیث التابع متبوع سے پہلے نہیں ہو سکتا) اور باقی تکبیرات میں مندوب اس لئے کہ مقارنت اور تقدم میں کوئی ایسی بات نہیں جو اصل تبعیت قائم کرنے میں مخل ہو۔(واذا قرء): بظاہر مطلق ہے اسی وجہ سے فرمایا، (فانصتوا) یعنی خاموش رہو اور استماع کا لفظ استعمال نہیں کیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا﴾ [الاعراف: ۲۰۴] یعنی حالت جہر میں، اور خاموش رہو حالت سرّی میں، اور یہ بھی ہمارے ائمہ کی دلیل ہے اور انہوں نے قراءت کو قراءتِ امام پر حمل کیا ہے، بقولِ ابن الملکؒ حدیث خلف الامام قراءت نہ کرنے پر دلالت کرتی ہے اور جمع بین الاحادیث کیلئے جہر کے ساتھ مقید ہونے کا بھی احتمال ہو سکتا ہے اور ہر صورت میں ظاہراً اقتداء سے استثناء کے منزلہ ہے، اور ممکن یہ بھی ہے پہلی حدیث قراء ت الامام......کے ساتھ معلل ہو، واللہ اعلم اور بقول ابن حجرؒ یعنی جب امام فاتحہ یا سورت پڑھتا ہو اور تم اس کی قراءت سن سکو تو فاتحہ کے علاوہ پڑھنے سے خاموش رہو اس لئے کہ تمہاری قراءت سے امام کی قراءت سننے کا مقصد فوت ہو جائے گا، البتہ فاتحہ کی قراءت واجب ہے اگرچہ قراءتِ امام سن رہا ہو، سابق حدیث صحیح ہونے کی وجہ سے۔

(رواہ مسلم، وابوداؤد، والنسائی، وابن ماجہ)

جو آدمی قراءت پر قادر نہ ہو اس کا حکم

۸۵۸: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰی قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ اِنِّیْ لَا اَسْتَطِیْعُ اَنْ اٰخُذَ مِنَ الْقُرْاٰنِ شَیْئًا فَعَلِّمْنِیْ مَا یُجْزِئُنِیْ قَالَ قُلْ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ قَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذَا لِلّٰهِ فَمَاذَا لِیْ قَالَ قُلْ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ وَعَافِنِیْ وَاهْدِنِیْ وَارْزُقْنِیْ فَقَالَ هٰكَذَا بِیَدَیْهِ وَقَبَضَهُمَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَمَّا هٰذَا فَقَدْ مَلَاَ یَدَیْهِ مِنَ الْخَیْرِ (رواه ابوداود وَانْتَهَتْ روایة النسائی) عِنْدَ قَوْلِهٖ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

أخرجه أبوداؤد ۱/۵۲۱ حدیث ۸۳۲۔وأخرج أوله النسائی فی السنن ۲/۱۴۳ حدیث ۹۲۴۔وأحمد ۴/۳۵۳۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی اے اللہ کے رسولؐ! میں قرآن میں سے کچھ بھی یاد کرنے پر قادر نہیں ہوں۔اس لئے آپ ﷺ مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دیں جو میرے لئے کافی ہو جائے۔آپ ﷺ نے فرمایا تم یہ پڑھ لیا کرو: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۔پھر اس آدمی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول یہ تو اللہ تعالیٰ کے لئے ہے میرے لئے کیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا تم یہ پڑھ لیا کرو: اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ وَعَافِنِیْ وَاهْدِنِیْ

وَارْزُقْنِی ۔اے اللہ مجھ پر رحم کر۔مجھ کو عافیت سے رکھ۔مجھ کو ہدایت دے اور مجھ کو رزق دے۔پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے اشارہ کیا اس طرح اور ان کو بلند کیا اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس آدمی نے اپنے دونوں ہاتھ خیر سے بھر لئے۔(ابوداؤد) نسائی کی روایت الا باللہ تک مکمل ہو جاتی ہے۔"

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن ابی اوفی: یہ عبداللہ بن ابی اوفیٰ ہیں۔اور ابواوفیٰ کا نام "علقمہ بن قیس اسلمی" ہے۔حدیبیہ، خیبر اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوئے ہیں۔ہمیشہ مدینہ منورہ میں قیام فرمایا۔یہاں تک کہ آنحضور ﷺ کی وفات پیش آ گئی۔اس کے بعد کوفہ تشریف لے گئے۔کوفہ میں انتقال کرنے والے حضرات صحابہ میں سے یہ سب میں آخری صحابی ہیں۔۸۷ھ میں انتقال فرمایا۔ان سے امام شعبی وغیرہ نے روایت کی ہے۔

عرض مرتب: ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ جلد ہفتم میں عبداللہ ابی بن اوفی رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ان سے ابوامامہ اور جابر رضی اللہ عنہما نے بھی روایت کی ہے اور ۵۴ ہجری میں مدینہ میں وفات پائی۔یہ کھلم کھلا تعارض ہے اور جلد ہشتم' حدیث ۴۹۳۱ میں لکھتے ہیں کہ یہ جہنی اور انصاری ہیں۔جنگ احد اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک ہوئے۔

تشریح: **وعن عبد اللہ بن ابی اوفی قال جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: انی لا استطیع ان اخذ:** یعنی وظیفہ سیکھ اور حفظ کر سکوں۔**(من القرآن شیئا فعلمنی ما یجزئنی):** یعنی قرآن کے وظیفہ یا نماز میں قراءت کے لیے کافی ہو۔

قال: اور ایک نسخہ میں "فقال" ہے۔**(قل اسبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ)** اس لئے کہ یہ باقیات صالحات ہیں اور اذکار طیّبات کا خلاصہ، اور یہ اذکار قرآن میں ایسے کلمات میں موجود ہیں جو کہ متفرق جگہ وارد ہوئے ہیں اور صفاتِ تنزیہیہ اور ثبوتیہ اور وحدانیتِ باری تعالیٰ کو اور اس کی کبریائی، عظمت وقدرت کو جامع ہیں۔**(قال یا رسول اللہ! ھذا للہ)** یعنی یہ کلمات خاص اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے ہیں میں ان سے اللہ تعالیٰ کو یاد کروں گا۔**(فماذا لی)** یعنی ایسی چیز سکھا دیں جو میرے اپنے لئے دُعا واستغفار اور اللہ تعالیٰ کے ہاں میرے ذکر پر مشتمل ہو۔**(قال قل اللھم ارحمنی)** یعنی ہمیشہ کے لئے گناہ ترک کرنے کے سبب یا ان کی مغفرت کی وجہ سے۔**(وعافنی)** دنیا آخرت کی آفات سے۔**(واھدنی)** یعنی دین اسلام پر ثابت رکھ، یا احکام کی پیروی کی توفیق عطا فرما۔**(وارزقنی)** یعنی حلال طیب رزق جو کافی ہو اور لوگوں سے مستغنی کر دے یا توفیق، قبولیت اور حسنِ خاتمہ عطا فرما۔**(فقال)** یعنی آدمی نے کیا۔**(ھکذا)** بقولِ طیبیؒ اس اشارہ محسوسہ کی طرح اشارہ کیا۔**(بیدیہ)** تفسیر وبیانِ ماقبل ہے۔**(وقبضھما)** اور ایک نسخہ میں "فاء" کے ساتھ ہے، پس بقولِ بعض یعنی ان کلمات کو انگلیوں پر شمار کیا اور ہر کلمہ کے شمار پر انگلی بند کی، بقولِ ابن حجرؒ پھر راوی نے ہاتھوں کے اشارہ کی مراد بیان کی چنانچہ فرمایا ان کو بند کیا یعنی حضور ﷺ کے ارشاد کو محفوظ کر لینے کی طرف اشارہ جیسا کہ کوئی نفیس چیز مٹھی بند کر کے محفوظ کی جاتی ہے اور ظاہر سیاق یہ ہے کہ اشارہ کرنے والا ماموری ہے یعنی جو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے مضبوطی سے حفظ کر لیا ہے اور میں اس کو ضائع نہ ہونے دوں گا اور راوی کا یہ قول اس کی تائید کرتا ہے۔**(فقال رسول اللہ ﷺ اما ھذا)** یعنی آدمی۔**(فقد**

ملا يديه من الخير) بقول ابن حجرؒ امتثالِ امر کے ذریعہ ذخائرِ خیر کے حاصل کر لینے سے کنایہ ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ ہاتھوں سے اشارہ نبی علیہ السلام نے کیا ہو اس شخص کو حکم پورا اور اس کی حفاظت کرنے پر ابھارنے کے لیے اور اس صورت میں راوی کے قول فقال رسول الله ﷺ کا معنی یہ ہوگا کہ اس شخص کے امتثالِ امر کو سمجھ گئے اور اس کو خوشخبری دی اور تعریف فرمائی کہ یہ ایسی چیز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جو اور کوئی نہ لے سکا۔ بقول طیبیؒ اس شخص کی مراد یہ تھی کہ میں قرآن یاد کرنے اور اس کو وظیفہ بنانے کی استطاعت نہیں رکھتا لہٰذا ایسی چیز سکھا دیں جس کو اپنا دن رات کرنے کا وظیفہ بنالوں جب آپ علیہ السلام نے اس کو تعظیمی کلمات سکھا دیئے تو اس نے اپنی حاجت یعنی رحمتِ الٰہی اور عافیت وہدایت اور رزق طلب کیا اور اس کی تائید فرمائی۔

اور بعض کو یہ حدیث اس باب میں لانے سے یہ وہم ہوا کہ یہ واقعہ نماز کے بارے میں ہے، لہٰذا انہوں نے کہا کہ ہر زمانے میں ایسا کرنا جائز نہیں اس لئے کہ جو شخص یہ کلمات سیکھ سکتا ہے وہ یقیناً فاتحہ سیکھنے پر قادر ہے، بلکہ اس کی تاویل یہ ہے کہ میں ابھی ابھی قرآن سیکھ نہیں سکتا حالانکہ نماز کا وقت ہو چکا ہے تو آپ علیہ السلام نے فرمایا سبحان اللہ کہو،...... لہٰذا جس شخص پر فرض نماز کا وقت داخل ہوا اور اس کو فاتحہ یاد نہیں لیکن کچھ اور قرآن یاد ہے تو لازم ہے کہ وہ آیات اور حرف کی تعداد کے اعتبار سے فاتحہ پڑھے اور اگر کچھ بھی یاد نہ ہو تو یہ کلمات پڑھے، اور یہ تاویل بہت بعید ہے اس لئے کہ وہ عربی جو اس جیسا کلام کر سکتا ہے اس کا اس قدر قرآن سیکھنے سے عاجز ہونا بہت بعید ہے جس سے نماز اداء ہو جائے، اور رسول اللہ ﷺ "ما له و ما عليه" بیان کیئے بغیر اس کو تسبیح پر اکتفاء کرنے کی رخصت کہاں دینے والے تھے۔ اور میرکؒ نے زین العرب سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں کہ اس کا قول فعلمني ما يجزئني اور ساتھ ہی محدثین کا اس کو اس باب میں ذکر کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مراد اتنی مقدار ہے جو نماز کے لیے کافی ہو جائے ورنہ اس حدیث کو باب التسبیح میں لانا زیادہ مناسب تھا، اور جو بُعد بیان کیا ہے وہ بعید نہیں ہے اس لئے کہ جس طرح بعض عرب انتہائی فصیح وبلیغ ہوتے ہیں اسی طرح بعض انتہائی اُجڈ اور کند ذہن ہوتے ہیں، اور (آپ علیہ السلام سے) سوال کرنے والا بلا شبہ پہلے گروہ میں سے تھا لہٰذا استبعاد اپنی جگہ قائم ہے، اور بقول تورپشتیؒ یہ حدیث اس پر دلالت نہیں کرتی کہ وہ نماز میں تھا اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو راوی ضرور اس کو بیان کرتا اور کوئی دوسرا صحابی ضرور نقل کرتا اور اگر کوئی اس کا نماز میں ہونا گمان کرے تو میں کہتا ہوں کہ یہ غیرِ فرض یا غیر فاتحہ پر محمول ہے، پھر ظاہر یہی ہے کہ وہ مطلقاً نماز میں تھا۔ اس لئے کہ ترمذی کی روایت رفاعہ کتاب صفۃ الصلوٰۃ میں گذر چکی ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا جب تو نماز کے لیے کھڑا ہو تو وضو کر جیسا اللہ نے حکم دیا پھر نماز کے لیے کھڑا ہو پھر اگر تجھے کچھ قرآن یاد ہو تو پڑھ ورنہ اللہ تعالیٰ کی حمد وتکبیر وتہلیل کر اور پھر رکوع کر، لہٰذا دونوں حدیثوں کو شروع زمانہ میں جو آسانی وسہولت پر مبنی تھا پر محمول کرنا اولیٰ ہے، واللہ اعلم۔

رواه ابو داؤد۔ اور نسائی، ابن حبان اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ شرطِ بخاری پر صحیح ہے۔ اور ابن سکن نے روایت کر کے صحیح کہا ہے۔ اس کو میرکؒ نے ابن الملقن سے نقل کیا ہے، اور اسی سے اس کے قول: "وانتهت رواية النسائي عند قوله الا بالله" کی وجہ ظاہر ہوتی ہے، بقول ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ بعض حفاظ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

سبحان ربی الاعلیٰ کا ثبوت

۸۵۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا قَرَأَ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى قَالَ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى ۔ (رواہ احمد وابوداود)

أخرجه أحمد في المسند ۱/۲۳۲۔أبوداوٗد في السنن ۱/۵٤۹ حديث ۸۸۳۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں سبح اسم ربك الاعلیٰ پڑھا کرتے تھے تو سبحان ربی الاعلیٰ کہتے تھے۔" (احمد۔ابوداوٗد)

تشریح: وعن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا قرأ سبح اسم ربك الاعلی قال سبحان ربی الاعلی: بقول مظہر عند الشافعیؒ اس جیسی چیزیں نماز وغیر نماز میں جائز ہیں اور ابوحنیفہؒ کے نزدیک صرف غیر نماز میں جائز ہے، بقول تورپشتی رحمۃ اللہ اسی طرح امام مالکؒ کے نزدیک نوافل میں جائز ہے، حدیث مسلم عن حذیفہ میں حکم اسی طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے انہوں نے نماز پڑھی تو آپ علیہ السلام آیت تسبیح سے گزرتے تو تسبیح کہتے اور سوال کی آیت پر سوال کرتے اور تعوّذ کی آیت پر پناہ مانگتے۔ (رواہ احمد، وابوداوٗد)

اور فرمایا کہ یہ روایت مرفوعاً بھی مروی ہے، میرکؒ نے اس کو نقل کیا ہے، اور ابن حجرؒ کے نسخہ میں جو ابوداوٗد کو امام احمدؒ سے مقدم کیا ہے تو یہ کاتب کا سہو ہے۔

آیاتِ قرآنیہ کا جواب

۸۶۰: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَرَأَ مِنْكُمْ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ فَانْتَهٰى اِلٰى اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ فَلْيَقُلْ بَلٰى وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَمَنْ قَرَأَ لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَانْتَهٰى اِلٰى اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى فَلْيَقُلْ بَلٰى وَمَنْ قَرَأَ وَالْمُرْسَلَاتِ فَبَلَغَ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ فَلْيَقُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ (رواه ابوداود والترمذی) اِلٰى قَوْلِهٖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ) ۔

أخرجه أبو داوٗد ۱/۵۵۰ حديث ۸۸۷۔والترمذی ۵/٤۱۳ حديث ۳۳٤۷۔وأحمد ۱/۲٤۹۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو آدمی سورۃ والتین والزیتون پڑھے اور الیس اللہ باحکم الحاکمین۔ پر پہنچے تو یہ الفاظ پڑھے: بلٰی وانا علی ذلك من الشاھدین۔ ہاں کیوں نہیں اور میں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں۔ اور جو آدمی لا اقسم بیوم القیامۃ پڑھے اور جب اس آیت پر پہنچے: الیس ذالك بقٰدر علی ان یحیی الموتٰی۔ کیا اللہ اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کرے تو یہ کہے۔ بلٰی۔ ہاں کیوں نہیں اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے اور جب سورۃ والمرسلات

پڑھے اور اس آیت پر پہنچے: فبای حدیث بعده یؤمنون۔ تو کہے امنا باللہ کہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے۔ (ابوداؤد، ترمذی) ترمذی نے اس حدیث کو والتین کی آیت وانا علی ذالك من الشاهدین تک نقل کیا ہے۔''

تشریح: وعن ابی هریرة قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من قرأ منكم والتین والزیتون: یعنی پوری سورت یا کچھ حصہ۔ (فانتهی الی الیس الله باحكم الحاكمین) یعنی اے محمد! سب سے بہترین فیصلہ کرنے والا آپ کے اور آپ کو جھٹلانے والوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ (فلیقل بلی) یعنی ہاں کیوں نہیں۔ (وانا علی ذلك) یعنی تیرے ''احکم الحاکمین'' ہونے پر۔

من الشهادین: یعنی میں انبیاء واولیاء کی لڑی میں پرویا جاتا ہوں جن کو شہادتین بالمشافہۃ حاصل ہیں۔ بقول ابن حجرؒ یہ لفظ ''انا'' اور ''انه فی الاخرة لمن الصالحین'' میں ''وكانت قانتة، اور ''فی الاخرة صالح'' بلاغت زیادہ ہے اس لئے کہ جو کاملین کے شمار میں آ گیا اور اس کو ان کے ساتھ فضائل میں حصہ مل گیا وہ اس شخص کی طرح نہیں ہو سکتا جو ان سے الگ ہے، اور بقول بعض اس لئے کہ وہ کنایہ ہے اور کنایہ صریح سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ (ومن قرأ لا اقسم بیوم القیامة فانتهی الی الیس ذلك) یعنی وہ ذات جس نے انسان کو رحم میں ٹپکنے والے نطفہ سے پیدا کیا۔ (بقادر علی ان یحیی الموتی فلیقل بلی) اور ایک روایت میں ہے: بلی انه علی كل شیءٍ قدیر، البتہ ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ یہ الفاظ کہے: بلی وانا علی ذلك من الشاهدین، اور ان کو حذف اس لئے کیا گیا کیونکہ یہ جملہ پہلے جملے سے معلوم ہو چکا، بعید ہے۔

ومن قرأ والمرسلات فبلغ فبای حدیث بعده: یعنی قرآن کے بعد، اس لئے کہ قرآن بصیرت دینے والی نشانی اور واضح معجزہ ہے تو جب اس پر ایمان نہیں لائے تو کس کتاب پر لائیں گے۔ (یومنون فلیقل آمنا باللہ) یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے کلام پر اور اس کے عام ہونے کی وجہ سے آمنا با القرآن نہیں فرمایا، اور بقولِ طیبیؒ یعنی یوں کہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کی مخالفت کرتا ہوں۔

رواہ ابوداود: یعنی مکمل حدیث، بقولِ ابن حجرؒ ضعیف ہے اس لئے کہ اس کی سند میں مجہول ہے لیکن یہاں فضائل میں روایت چل جائے گی۔

والترمذی: یعنی اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ (الی قوله، وانا علی ذلك من الشاهدین) اور ایک نسخہ میں ''وللترمذی'' ہے اور یہی ظاہر ہے۔

جنات کا جواب

۸۶۱: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِلٰی اَصْحَابِهٖ فَقَرَأَ عَلَیْهِمْ سُوْرَةَ الرَّحْمٰنِ مِنْ اَوَّلِهَا اِلٰی اٰخِرِهَا فَسَكَتُوْا فَقَالَ لَقَدْ قَرَأْتُهَا عَلَی الْجِنِّ لَیْلَةَ الْجِنِّ فَكَانُوْا اَحْسَنَ مَرْدُوْدًا مِنْكُمْ كُنْتُ كُلَّمَا اَتَیْتُ عَلٰی قَوْلِهٖ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ قَالُوْا لَابِشَیْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ۔

(رواہ الترمذی وقال هذا حدیث غریب)

أخرجه الترمذی ۳۷۲/۵ حدیث ۳۲۹۱۔وقال حدیث غریب لا نعرفه إلا من حدیث الولید بن مسلم عن زهیر بن محمد ۔

ترجمہ: ''حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کی ایک جماعت کے پاس تشریف لے گئے۔اور ان کے سامنے اول سے آخر تک سورۂ رحمٰن پڑھی۔صحابہ کرام خاموش رہے۔آپ ﷺ نے فرمایا یہ سورت میں نے جنات کے سامنے اس رات میں پڑھی تھی جس رات کو وہ مسلمان ہوئے تھے اور وہ جواب دینے میں تم سے بہتر تھے۔جب بھی میں اس آیت پر پہنچا: **فبای الاء ربکما تکذبان**۔تو وہ جواب میں کہتے: **لا بشیء من نعمك ربنا نكذب فلك الحمد**۔اے رب ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے اور تمام تعریفات تیرے ہی لئے ہیں۔(ترمذی) فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔''

تشریح: **وعن جابر قال خرج رسول الله صلی الله علیه وسلم علی اصحابه فقرأ علیهم سورة الرحمن**: اور ایک نسخہ میں ''بسورۃ الرحمٰن'' ہے۔**(من اولها الی آخرها)** تاکید ہے، **فسکتوا** یعنی سننے والے۔**(فقال لقد قرأتها علی الجن لیلة الجن)** یعنی ان کے آپ علیہ السلام کے پاس جمع ہرنے کی رات، جیسا کہ روایت میں آتا ہے۔**(فکانوا)** یعنی جن۔**(احسن مردودا)** یعنی

منکم: بقول طیبیؒ ''المردود'' بمعنی ''السوذ'' ہے جیسا کہ المخلوق اور المعقول، ان کا کان لگا کر سننے کیلئے خاموش رہنا حسن رد کی منزلہ ٹھہرا اللہذا افعل التفضیل کا صیغہ استعال کیا، اور کلام ابن الملکؒ اس کی وضاحت کرتا ہے چنانچہ فرمایا کہ ان کا سکوت اس بات کا اعتراف سمجھا گیا کہ جنوں اور انسانوں میں جس طرح اللہ کی نعمتیں جھٹلانے والے ہیں اسی طرح جنوں میں ان کا اعتراف کرنے والے بھی ہیں، لیکن زبان کے ساتھ بھی ان کا اپنے سے تکذیب کی نفی کرنا اجابت اور قبول ما جاء بہ الرسول ﷺ پر صحابہؓ کے سکوت سے زیادہ دلالت کرتا ہے۔**(کنت)** یعنی لیلۃ الجن میں۔**(کلما اتیت علی قوله)** یعنی قراءتِ قول باری تعالیٰ پر ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾، بقول ابن الملکؒ جن و انس دونوں کو خطاب ہے یعنی تمہارے اوپر کی ہوئی کن نعمتوں کو جھٹلاتے اور انکار کرتے ہو، اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور رسولوں کی تکذیب اور حکم خداوندی کی نافرمانی کر کے۔**(قالوا بشیء)** اگلے تکذب سے متعلق ہے۔**(من نعمك ربنا)** مضوب ہے اور حرف نداء محذوف ہے۔**(نكذب)** یعنی ان میں سے کسی کی تکذیب نہیں کرتے۔**(فلك الحمد)** یعنی ظاہری و باطنی نعمتوں پر۔اور سب سے کامل نعمت ایمان اور قرآن ہے جو کہ دوزخ سے نجات اور جنت کو واجب کرنے والے ہیں اسی وجہ سے اس کو عروس القرآن کہنا وارد ہوا ہے۔

(رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب): بقولِ ابن حجرؒ یہ حدیث صحیح ہے، جیسا کہ غیر ترمذی نے کہا ہے۔بقول بعض اس حدیث کو اور اس سے قبل دو حدیثوں کو اس باب میں لانا بھی غریب ہے، کیونکہ باب سے ان کی مناسبت بظاہر کوئی نہیں ہے۔میں کہتا ہوں ہوسکتا ہے کہ پہلی دونوں حدیثیں داخل صلوٰۃ و خارجِ صلوٰۃ کے احتمال کی وجہ سے اور آخری حدیث ان کی تبعیت اور حکم میں متحد ہونے کی بناء پر لائے، واللہ اعلم۔

الفصل الثالث:

دو رکعتوں میں ایک سورت پڑھنا

۸۶۲: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْجُهَنِي قَالَ اِنَّ رَجُلاً مِنْ جُهَيْنَةَ اَخْبَرَهٗ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَرأَ فِي الصُّبْحِ اِذَا زُلْزِلَتْ فِي الرَّكْعَتَيْنِ كِلْتَيْهِمَا فَلاَ اَدْرِىْ اَنَسِيَ اَمْ قَرأَ ذٰلِكَ عَمَدًا۔ (ابوداود)

أخرجه أبوداؤد ۱/ ۵۱۰ حديث ۸۱۶۔

ترجمہ: "حضرت معاذ بن عبداللہ جہنیؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ قبیلہ جہنی کے ایک آدمی نے مجھ سے بیان کیا کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فجر کی دونوں رکعتوں میں سورۂ اذا زلزلت الارض پڑھتے سنا ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قصداً ایسا کیا تھا یا بھول گئے تھے۔" (ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

معاذ بن عبداللہ۔ یہ "معاذ" ہیں۔ عبداللہ بن خبیب کے بیٹے تھے۔ جہنی اور مدنی ہیں۔ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔

تشریح: عن معاذ بن عبد الله الجهني: تابعی ہیں، مؤلف نے اس کا ذکر کیا ہے۔ (قال ان رجلا من جهينة اخبره) ضمیر مستتر "رجل" کی اور ضمیر بارز "معاذ" کی طرف راجع ہے اور معاذ کا مجہول ہونا مضر نہیں کیونکہ صحابی تمام عادل ہیں۔ (انه) یعنی شخص نے۔ (سمع رسول الله ﷺ قرأ فى الصبح اذا زلزلت فى الركعتين كليتهما) تبعیض کا وہم دور کرنے کے لیے تاکید ہے، بقول ابن الملکؒ یعنی ہر رکعت میں مکمل سورت پڑی، اور بقولِ ابن حجرؒ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورت دو رکعتوں میں پڑھی۔ (فلا ادرى انسى) یعنی پہلی رکعت میں اذا زلزلت پڑھنا۔ (ام قرأ ذالك عمدا) حاصل یہ ہے کہ ایسا بیان جواز کیلئے کیا جب کہ سورت فاتحہ کے ساتھ سورت یا اس کے قائم مقام تین چھوٹی آیات یا بڑی ایک ملانا واجب ہے ہمارے مذہب میں اور عند الشافعیؒ سنت ہے اور افضل مکرر نہ پڑھنا ہے خصوصاً فرائض میں بقول ابن حجرؒ ظاہر یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے عمداً ایسا کیا تا کہ بیان کر دیں کہ ایک سورت کو دو رکعتوں میں بار بار پڑھنے سے اصل سنت اداء ہو جاتی ہے۔ اور کامل سورت پر حمل کرنا اولیٰ ہے خصوصاً فجر میں جس میں طویل قراءت کرنا مطلوب ہے۔

نیز تبعیض سے، "انسى" جملہ بھی انکار کرتا ہے اس لئے کہ اس کو اس پر حمل کرنا بہت بعید ہے کہ آپ علیہ السلام حکم بھول گئے یا بعض سورت بھول گئے اور ایسا واقعہ پیش بھی آیا کہ کسی امام نے پہلی رکعت میں سورۃ الکافرون پڑھی پھر دوسری میں دوبارہ پڑھ دی تو کسی نے امام کو خوش طبعی کے طور پر کہا ہو سکتا ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ اپنے لئے اور دوسری مرتبہ ہمارے لئے پڑھی ہو۔ (رواہ ابوداؤد)

۸۶۳: وَعَنْ عُرْوَةَ قَالَ اِنَّ اَبَا بَكْرِنِ الصِّدِّيْقَ صَلَّى الصُّبْحَ فَقَرَأَ فِيْهِمَا بِسُوْرَةِ الْبَقَرَةِ فِي الرَّكْعَتَيْنِ كِلْتَيْهِمَا ۔ (رواه مالك)

أخرجه مالك ۱/۸۲حديث رقم ۳۳ من كتاب الصلاة ۔

ترجمہ:''حضرت عروہ بن زبیرؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ نے فجر کی نماز میں دونوں رکعتوں میں سورۂ بقرہ کی تلاوت کی۔'' (امام مالکؒ)

راویٔ حدیث:

ابوبکر الصدیق۔ یہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں ان کا نام ''عبداللہ'' ہے۔ یہ ''عثمان ابوقحافہ'' کے بیٹے تھے۔ ''قحافہ'' کے قاف پر پیش ہے۔ ابوقحافہ کے بیٹے تھے اور وہ عمرو کے اور وہ کعب کے اور وہ سعد کے اور وہ تیم کے اور وہ مرہ کے۔ اس طرح ساتویں پشت پر ان کا نسب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔

آپ رضی اللہ عنہ کو ''عتیق'' سے اس لئے موسوم کیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((من ارادن ینظر الٰی عتیق من النار فلینظر الٰی ابی بکر)) ''جو شخص کسی ایسے شخص کو دیکھنا چاہیے جو نارِ جہنم سے آزاد اور بے کھٹکے ہو چکا ہے وہ ابوبکر کو دیکھ لے''۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر غزوہ میں شریک رہے اور آپ سے کبھی جدا نہیں ہوئے نہ قبل از اسلام اور نہ بعد از اسلام (بلکہ بعد از وفات بھی اپنے جسم المبارک سمیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی رہے)۔ یہ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لائے تھے۔

حلیہ مبارک:

ان کا رنگ سفید تھا۔ لاغر اندام تھے۔ رخسار پتیل تھے۔ چہرے پر گوشت بہت کم تھا۔ آنکھیں اندر کو تھیں۔ پیشانی ابھرواں تھی انگلیوں کی جڑیں گوشت سے خالی تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہ مہندی اور وسمہ سے خضاب کرتے تھے۔

خاص فضیلت:

ان کو اور ان کے والدین کو اور ان کی اولاد کو اور پوتے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف صحبت حاصل ہوا۔ اتنی بڑی نعمت تمام اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔

ولادت:

واقعہ فیل کو دو سال چار مہینے سے چند دن کم گزرے تھے جب کہ مکہ میں آپ رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔ آپ کی عمر ۶۳ سال ہوئی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے یہ وصیت کی تھی کہ آپ رضی اللہ عنہ کو آپ کی زوجہ اسماء بنت عمیس غسل دیں اس لئے انہوں نے آپ کو غسل دیا اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپ رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ دو سال چار ماہ ہے۔

روایات:

آپ سے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت کثیر نے روایت کی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ سے بہت کم حدیثوں کی روایت ہوئی۔ کیونکہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تھوڑی مدت حیات رہے۔ (اور انصرام امورِ خلافت کی بناء پر اس کی فرصت بھی نہ مل سکی)۔

تشریح: وعن عروۃ: یعنی ابن الزبیر، مشہور تابعی ہیں۔(قال ان ابا بکر الصدیق رضی اللہ عنہ صلی الصبح فقرأ فیھما) یعنی صبح کی دو رکعتوں میں، اور ایک نسخہ میں "فیھا" ہے یعنی نمازِ فجر۔(سورۃ البقرۃ فی الرکعتین کلتیھما) یعنی دو رکعتوں میں تقسیم کر کے، نہ کہ ہر رکعت میں مکمل سورت، اس لئے کہ فجر کا وقت اتنا نہیں ہوتا، اور جواز کے متفق علیہ قول پر حمل کرنا اختلافی قول پر محمول کرنے سے اولیٰ ہے، بقولِ ابن حجرؒ یہ اس واقعہ کی نظیر ہے کہ آپ علیہ السلام نے سورۃ الاعراف دو رکعتوں میں پڑھی جیسا کہ گذر چکا اور یہ تقسیم سورت کے بیان جواز کیلئے ہے۔ اور آپ ﷺ کا ہر رکعت میں مکمل سورت پڑھنا بہت نادر ہے، بیانِ افضلیت کیلئے۔ (رواہ مالک)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فجر کی نماز میں سورۃ یوسف پڑھتے تھے

۸۶۴: وَعَنِ الْفَرَافِصَةِ بْنِ عُمَيْرِ الْحَنَفِيِّ قَالَ مَا اَخَذْ تُ سُوْ رَةَ يُوْسُفَ اِلاَّ مِنْ قِرَاءَ ةِ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ اِيَّاهَا فِي الصُّبْحِ مِنْ كَثْرَةِ مَاكَانَ يُرَدِّدُهَا۔ (رواہ مالك)

أخرجه مالك في الموطأ ۸۲/۱ حديث ۳۵ من كتاب الصلاة۔

ترجمہ: "حضرت فرافصہ بن عمیر حنفیؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے سورۂ یوسف حضرت عثمانؓ سے سن سن کر یاد کی ہے کیونکہ وہ اس سورت کو نماز فجر میں کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔" (امام مالکؒ)

راویٔ حدیث:

الفرافصۃ۔ نام "فرافصہ" ہے "عمیر" کے بیٹے ہیں۔ "بنوحنیفہ" سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیز مدینہ کے طبقہ اول کے تابعین میں سے ہیں۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت کی۔ ان سے قاسم بن محمد وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ "فرافصہ" میں دو فاء، راء غیر مشدد اور صاد غیر منقوطہ ہے۔ محدثین کے یہاں یہ فاء اول کے فتحہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ لیکن ابن حبیب کہتے ہیں کہ عرب میں "فرافصہ" جب بھی نام ہوگا تو فاء اول مضموم ہوگی، صرف "فرافصہ بن الاحوص" اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ابن حبیب کی تحقیق کے مطابق فرافصہ بن عمیر فاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ اہل لغت کے یہاں یہ لفظ کسی جگہ بھی فتحہ فاء کے ساتھ نہیں ہے اھ۔ قاموس میں لکھتے ہیں: **الفرافص' باضم الأسد الشديد الغليظ كافرافصة وبالفتح رجل**۔ مرتب عرض کرتا ہے کہ طاہر پٹنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرافصہ بن احوص کے ساتھ حجام بن فرافصہ کو بھی ذکر کیا ہے کہ ان دونوں کا فاء مفتوح ہے۔ (المغنی فی ضبط اسماء الرجال، ص:۱۹۶)

تشریح: قال ما اخذت: یعنی نہیں سیکھی۔(سورۃ یوسف الا من قراء ۃ عثمان بن عفان) غیر منصرف ہے اور کبھی منصرف ہوتا ہے۔(رضی اللہ عنہ ایاھا): یعنی وہ مکمل سورت یا بعض حصہ۔(فی الصبح) یعنی نماز صبح۔(من کثرۃ ما کان یرددھا) یعنی نمازِ فجر میں اکثر پڑھتے تھے اسی وجہ سے مجھے حفظ ہوگئی۔ بقولِ بعض سورۃ یوسف کا ہمیشہ پڑھنا شہادت کی موت کا باعث ہے اور یہ بات تجربہ شدہ ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں اگر تو کہے کہ حضرت عثمانؓ کے عمل اور قول سلطان العلماء العز

بن عبدالسلام میں منافات ہے وہ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں دو چیزیں ہیں۔

① فاضل:

جیسے آیت الکرسی اس لئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ اپنے بارے میں کلام فرماتے ہیں۔اور

② مفضول:

جیسے سورۃ ''تبت''، اس لئے کہ اس میں اللہ کے دشمن کے بارے میں کلام ہے اور صرف فاضل کی قراءت پر مداومت کرنا مناسب نہیں اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا اور اس وجہ سے کہ اس پر مداومت باقی قرآن بھول جانے کا سبب ہے، اور ان کے علاوہ ہمارے اصحاب کا قول کہ فقہاء نے معین سورت پر مداومت کو مکروہ کہا ہے اس لئے کہ اس صورت میں باقی قرآن کی تلاوت چھوٹ جاتی ہے۔

میں کہتا ہوں ان میں منافات نہیں اس لئے کہ فقہاء کی مراد (جس پر ان کی بیان کردہ علت دلیل ہے) تمام نمازوں میں اس پر مداومت ہے اور حضرت عثمانؓ کے واقعہ میں ایسا نہیں بلکہ کثرت کے ساتھ خصوصاً فجر میں اس کو پڑھنا ہے۔(رواہ مالک)

۸۶۵: وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ صَلَّيْنَا وَرَاءَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ الصُّبْحَ فَقَرَأَ فِيْهِمَا بِسُوْرَةِ يُوْسُفَ وَسُوْرَةِ الْحَجِّ قِرَاءَةً بَطِيْئَةً قِيْلَ لَهٗ اِذًا لَقَدْ كَانَ يَقُوْمُ حِيْنَ يَطْلُعُ الْفَجْرُ قَالَ اَجَلْ ۔ (رواه مالك)

أخرجه مالك في الموطأ ۱/۸۲ حديث رقم ۳۴ من كتاب الصلاة ۔

ترجمہ: ''حضرت عامر بن ربیعہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت عمرؓ کے پیچھے فجر کی نماز پڑھی اُنہوں نے دونوں رکعتوں میں سورۂ یوسف اور سورۂ حج کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کسی نے حضرت عامرؓ سے پوچھا پھر تو حضرت عمرؓ فجر کے طلوع ہوتے ہی کھڑے ہو جاتے ہوں گے تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں۔'' (امام مالکؒ)

راویٔ حدیث:

عامر بن ربیعہ۔ یہ عامر بن ربیعہ ہیں' ان کی کنیت ابوعبداللہ الغزی ہے۔ ہجرتِ حبشہ اور ہجرتِ مدینہ دونوں کے مہاجر ہیں۔ غزوۂ بدر اور دوسرے تمام غزوات میں شریک ہوئے ہیں۔ قدیم الاسلام ہیں۔ ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔ ۳۲ھ میں وفات پائی۔ مرتب عرض کرتا ہے کہ مرقاۃ مشکوٰۃ کے فوقانی متن میں ''عبداللہ بن عامر بن ربیعہ'' ہے اور تحتانی متن میں عامر بن ربیعہ ہے اور مؤطا میں عبداللہ بن عامر بن ربیعہ ہے اور یہی درست ہے۔

عبداللہ بن عامر۔ یہ عبداللہ بن عامر بن کریز قریشی ہیں۔ یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ماموں کے بیٹے ہیں اور مرقاۃ میں یوں ہے کہ یہ حضرت عثمان بن عفان کے ماموں تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر دَم کیا تھتکارا اور اعوذ پڑھی جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ان کی عمر تیرہ سال تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بھی روایت نہیں کی' اور نہ ہی انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سن کر یاد کی۔ حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو خراسان اور بصرہ کا حاکم بنا دیا تھا اور یہ وہاں برابر حاکم رہے یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے۔ پھر جب امارت کے اختیار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف منتقل ہوئے تو ولایت خراسان و بصرہ ان کو دوبارہ دے دی گئی۔ یہ بڑے سخی، کریم، کثیر المناقب ہیں۔ انہوں نے ہی خراسان کو فتح کیا اور "کسریٰ" شاہ فارس کو انہی کی گورنری کے زمانہ میں قتل کیا گیا۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ انہوں نے فارس کے تمام اطراف اور اسی طرح عامہ خراسان، اصفہان، کرمان اور حلوان کو فتح کیا۔ انہوں نے ہی بصرہ کی نہر کھدوائی۔ ۵۹ میں وفات پائی۔

تشریح: قال صلينا وراء عمر بن الخطاب رضى الله عنه الصبح فقرأ فيهما: یعنی دونوں رکعتوں میں، اور ایک نسخہ میں "فيها" ہے یعنی نماز فجر میں۔ (بسورة يوسف) یعنی ایک رکعت میں پوری سورت یا کچھ حصہ۔ (وسورة الحج) اسی طرح دوسری رکعت میں۔ (قرأة بطيئة) ہمزہ کے ساتھ، اور تشدید کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے، یعنی تجوید و ترتیل کے ساتھ صاف صاف پڑھنا۔ (قيل له) یعنی عامر سے۔ (اذا لقد كان يقوم حين يطلع الفجر) "لام" کے ضمہ کے ساتھ، یعنی صبح صادق ہوتے ہی۔ بقول "اذًا" جواب اور جزاء ہے یعنی کسی نے عامر سے کہا اگر معاملہ ایسا ہی تھا جیسا تم نے بیان کیا تو واللہ نماز اول وقت اندھیرے میں شروع کرتے ہوں گے۔ (قال اجل) یعنی ہاں ایسا ہی تھا، میں کہتا ہوں اس کے جواز میں تو کوئی اختلاف نہیں، لہٰذا جواز پر محمول ہے نہ کہ اس کے بہتر ہونے پر اس لئے کہ حدیث میں اس پر ہمیشگی کی کوئی دلیل نہیں۔ (رواہ مالک)

۸۶۶: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ مَامِنَ الْمُفَصَّلِ سُوْرَةٌ صَغِيْرَةٌ وَلَا كَبِيْرَةٌ اِلَّا قَدْسَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَؤُمُّ بِهَا النَّاسَ فِى الصَّلَاةِ الْمَكْتُوْبَةِ۔ (رواه مالك)

أبو داؤد ١/ ٥١٠ حديث ٨١٤۔

ترجمہ: "حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں وہ فرماتے تھے کہ مفصل کی کوئی بھی چھوٹی بڑی سورت ایسی نہیں ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں کو نماز پڑھاتے ہوئے نہ سنی ہو۔" (امام مالکؒ)

تشریح: وعن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده قال: یعنی دادا عبداللہ بن عمرو بن العاص نے، بقولِ ابن حجر ضمیر کے جدّ شعیب کی طرف لوٹنے کا یہاں احتمال نہیں ہے لہٰذا حدیث عمرو سے ہی مروی ہے اس لئے کہ دیگر روایات میں بھی پہلے ہی کی تصریح ہے۔ (ما من المفصل سورة صغيرة ولا كبيرة الا قد سمعت رسول الله ﷺ يوم بها الناس فى الصلوٰة المكتوبة) یعنی فرضِ عین، اور وہ پانچ چیزیں ہیں، پھر آپ کا یہ عمل یا تو بطورِ استحباب (جس پر عمل کرنا ماعدا سے مقدم ہے) یا جوازِ بیان کیلئے ہے، بقولِ ابن حجرؒ مفصلات آپ علیہ السلام کے ساتھ خاص ہیں چنانچہ حدیث ابی نعیم میں ہے کہ مجھے خاص طور سورۃ البقرہ کی آخری آیات عرش کے خزانوں سے ملی ہیں جو کسی اور نبی کو نہیں ملی، اور مجھے تورات کے بدلے مثانی، اور انجیل کے بدلے مئین، اور حٰم سے شروع ہونے والی سورتیں زبور کے بدلے ملیں ہیں اور مفصلات میں میں ان سے منفرد ہوں، اور مثانی سے مراد فاتحہ ہے حدیثِ بخاری کی وجہ سے کہ اُم القرآن مثانی ہیں یعنی قول باری تعالیٰ: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِىْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ﴾ [الحجر: ۸۷] "اور ہم نے تم کو سات (آیتیں) جو (نماز میں) دوہرا کر پڑھی جاتی ہیں (یعنی

سورہ الحمد) اور عظمت والا قرآن عطا فرمایا ہے۔'' میں، اور ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ''سبع مثانی'' سبع طوال ہیں جن کی پہلی سورۃ البقرہ اور آخری سورۃ الانفال ہے التوبہ سمیت، اور بعض نے الانفال کی جگہ سورہ یونس کو رکھا ہے۔

رواہ مالك: ان کی عادت مقتضی یہ تھا کہ چاروں احادیث جمع کرکے ''رواہ مالک'' کہتے۔

۸۶۷: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ بِحٰمٓ الدُّخَانِ۔ (رواہ النسائی مرسلا)

أخرجه النسائی ۲/۱۶۹ حدیث رقم ۹۸۸۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عتبہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مغرب کی نماز میں سورۂ حم دخان کو پڑھا۔'' (اس روایت کو امام نسائیؒ نے مرسل طریقے سے نقل کیا ہے)

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن عتبہ۔ نام عبداللہ بن عتبہ ابن مسعود ہے۔ آنحضرت ﷺ کا زمانہ پایا ہے۔ ان کا شمار کبار تابعین میں ہوتا ہے۔ بنو ہذیل میں سے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بھتیجے ہیں۔ اصل میں مدینہ کے باشندہ ہیں پھر کوفہ میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ انہوں نے خلیفہ دوم حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے حدیث کی سماعت کی ہے۔ ان کے صاحبزادے عبیداللہ اور محمد بن سیرین وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے۔ ''بشر بن مروان'' کے دور ولایت میں ان کا انتقال ''کوفہ'' میں ہوا۔

تشریح: قال قرأ رسول الله ﷺ فی صلوٰۃ المغرب بحم الدخان: یعنی تمام سورت یا بعض حصہ دو رکعتوں میں، اور سید جمال الدینؒ کی اصل میں ''حٰم'' کے کسرہ اور ''الدخان'' کے جر کے ساتھ لکھا ہے اور پہلے کی وجہ یہ ہے کہ التقاء ساکنین کی وجہ سے کسرہ کی حرکت دی گئی اور دوسرے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مضاف الیہ یا بدل یا بیان ہے اور ایک نسخہ میں ''میم'' کے فتحہ کے ساتھ ہے اس لئے کہ فتح اخف الحرکات ہے، اور دوسرے نسخہ میں ''الدخان'' کے نصب کے ساتھ ہے اور ''اعنی'' مقدر ہے۔

(رواہ النسائی مرسلا): اس لئے کہ راوی تابعی ہے اور صحابی محذوف ہے۔

بَابُ الرُّكُوْعِ

رکوع کا بیان

اس کا رُکن صلوٰۃ ہونا قرآن وحدیث اور اجماع اُمت سے ثابت ہے، لغت میں ''جھکنے'' کو کہتے ہیں، اور کبھی اس سے خضوع مراد لیا جاتا ہے، اور بقولِ بعض یہ رکوع اس اُمت کی خصوصیت ہے اس لئے کہ بعض مفسرین قولِ باری تعالیٰ: ﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ﴾ [البقرة: ۴۳] کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ان کو رکوع کا حکم اس لئے دیا گیا کیونکہ ان کی نماز میں رکوع نہ تھا اور رکوع کرنے والے محمد ﷺ اور ان کی اُمت ہیں اور قولِ باری تعالیٰ: ﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ﴾ [البقرة: ۴۳] کا مطلب یہ ہے

کہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھ، بقول بعض سجدہ دوبار اور رکوع ایک بار کرنے میں حکمت یہ ہے کہ رکوع سجدہ کا وسیلہ اور مقدمہ ہے اور سجدہ عاجزی کا اعلیٰ درجہ ہے کیونکہ سجدہ میں انسان اپنے اشرف الاعضاء (چہرہ) کو جوتوں اور قدموں کی جگہ رکھ دیتا ہے لہٰذا اس کا مکرر ہونا مناسب ہوا اس لئے کہ یہ مقصود کا کفیل اور ضامن ہے کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ بندہ اللہ کے انتہائی قریب سجدہ میں ہوتا ہے، اور بقولِ بعض سجدہ کے تکرار میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان زمین سے پیدا کیا گیا اور اسی میں دوبارہ جائے گا اور اسی سے نکلے گا گویا کہ وہ پہلے سجدہ میں کہتا ہے "منها خلقتني"، اور دوسرے سجدہ میں "وفيها تعيدني"، اور سجدہ ثانی سے سَر اُٹھانے میں "ومنها نخرجكم تارة اخرى" کہتا ہے۔ اور بقولِ بعض تکرارِ سجدہ کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں کو سجدہ کا حکم ہوا تو انہوں نے سجدہ کیا جب سجدہ کے بعد انہوں نے ابلیس لعین کو سجدہ سے انکار کرتے دیکھا تو انہوں نے اللہ کی توفیق سجدہ کا شکر اداء کرنے کے لیے دوسرا سجدہ کیا۔ اور اظہر یہی ہے کہ یہ محض امر تعبدی ہے۔

الفصل الاول:

رکوع اور سجدہ صحیح کرنے کا حکم

۸۶۸: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقِيْمُوا الرُّكُوْعَ وَالسُّجُوْدَ فَوَاللّٰهِ اِنِّىْ لَاَرَاكُمْ مِنْ بَعْدِىْ ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٢٢٥ حديث ٧٤٢ ـ ومسلم ١/٣١٩ حديث (١١٠ ـ ٤٢٥)۔

ترجمہ: "حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رکوع اور سجدہ ٹھیک طریقہ سے کیا کرو۔ اللہ کی قسم میں تمہیں اپنے پیچھے سے بھی دیکھ لیا کرتا ہوں۔" (بخاری، مسلم)

تشریح: **عن انس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اقيموا الركوع والسجود:** بقولِ طیبیؒ یعنی مکمل طرح اداء کرو "اقام العود" اذا قومه سے ہے۔ **(فو الله انی لا راكم من بعدی)** یعنی میرے پیچھے نماز کے رکوع وسجدہ میں جو کمی کرتے ہو وہ میں جانتا ہوں، اور یہ خرقِ عادت چیز ہے جو آپ علیہ السلام کو دی گئی (اس کو ابن الملکؒ نے ذکر کیا ہے) اور یہ بظاہر ان کشفی چیزوں میں سے ہے جن کا تعلق ان دِلوں سے ہوتا ہے جن پر علومِ غیب کا ظہور ہوتا ہے۔ بقولِ ابن الملکؒ حدیث میں نماز کو قائم کرنے پر ابھارا گیا اور کوتاہی کرنے سے منع کیا گیا ہے اس لئے کہ جب نمازیوں کی کوتاہیاں نبی علیہ السلام پر مخفی نہیں تو اللہ تعالیٰ سے کیسے چھپ سکتی ہیں اور رسول ﷺ کو اس کا علم اللہ تعالیٰ کے بتانے اور ظاہر کرنے سے ہوا، اور بقولِ عسقلانی صحیح بات یہ ہے کہ یہ سب ظاہر پر محمول ہے اور یہ دیکھنا خرقِ عادت طریقہ پر حقیقی قوتِ باصرہ سے ادراک کرنا ہے اور آپ علیہ السلام کی خصوصیت ہے، چنانچہ آپ علیہ السلام اس قوت سے کوئی چیز سامنے اور قریب کیئے بغیر دیکھ لیتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ کی پشت کی طرف ایک آنکھ تھی، اور ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ کے دونوں کندھوں کے درمیان دو آنکھیں تھیں۔ جن کے لئے کوئی چیز رکاوٹ نہ بنتی تھی۔ (متفق علیہ)

بقولِ میرکؒ نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رکوع اور سجدہ کی مقدار

۸۶۹: وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ كَانَ رُكُوْعُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسُجُوْدُهٗ وَبَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ وَاِذَا رَفَعَ مِنَ الرُّكُوْعِ مَا خَلَا الْقِيَامَ وَالْقُعُوْدَ قَرِيْبًا مِنَ السَّوَاءِ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخارى ۲/۲۷٦حديث رقم ۷۹۲۔ومسلم ۱/۳٤۳حديث (۱۹۳۔٤۷۱)وأخرجه النسائى ۲/۱۹۷ حديث ۱۰٦٥۔وأبوداوٗد ۱/۵۳۲حديث ۸۵٤۔

ترجمہ: ”حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکوع اور سجدہ اور دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا اور رکوع سے سر اٹھانا یہ چاروں چیزیں قیام اور قعود کے علاوہ تقریباً برابر ہوتے تھے۔“ (بخاری، مسلم)

تشریح: وعن البراء قال كان ركوع النبى صلى الله عليه وسلم وسجوده وبين السجدتين: یعنی دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا۔(واذا رفع) سجدہ سے قیام کی طرف اٹھنا، کیونکہ ”اذا“ سے جب استقبال کے معنی نکال لیے جائیں تو محض وقت کے معنی میں رہ جاتا ہے۔(من الركوع ما خلا القيام والقعود) صرف نصب کے ساتھ دونوں کے، بقول طیبیؒ معنی سے استثناء ہے اس لئے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ علیہ السلام کے قراءت وتشہد کے افعال (سوائے قیام کے) ہوتے تھے۔(قريبا من السواء) یعنی تقریباً برابر اور ایک جیسے نہ زیادہ لمبے نہ مختصر، اور بقولِ طیبیؒ وبين سجدتين واذا رفع دونوں کا عطف ”کان“ کے اسم پر ہے اور مضاف مقدر ہے یعنی زمان ركوعه وسجوده وبين السجدتين، و وقت رفع راسه من الركوع سواء۔

متفق عليه: بقولِ میرکؒ اس میں نظر ہے اس لئے کہ ما خلا القيام والقعود والا جملہ بخاری کا تفرد ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قومہ اور سجدہ

۸۷۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ قَامَ حَتّٰى نَقُوْلَ قَدْاَوْهَمَ ثُمَّ يَسْجُدُ وَيَقْعُدُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ حَتّٰى نَقُوْلَ قَدْاَوْهَمَ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم ۱/۳٤٤حديث (۱۹٦۔٤۷۳)وأحمد ۳/۲۰۳۔

ترجمہ: ”حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سمع اللہ لمن حمدہ کہتے ہوئے رکوع سے کھڑے ہوتے یہاں تک کہ ہم اپنے دل میں کہنے لگتے شاید کہ آپ کو وہم ہو گیا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کرتے اور دونوں سجدوں کے درمیان اتنی دیر تک بیٹھے رہتے کہ ہم اپنے دل میں کہتے شاید کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہم ہو گیا ہے۔“ (مسلم)

تشریح: وعن انس قال كان النبى صلى الله عليه وسلم اذا قال سمع الله عن حمده: اس کے الفاظ ومعنی کے متعلق بحث گذر چکی۔(قام حتى نقول) نصب کے ساتھ، اور بقولِ بعض حکایۃً مرفوع ہے، بقول تورپشتی ”حتی“ کی

وجہ سے "نقول" منصوب ہے اور اکثر کا قول یہی ہے، اور بعض ایسے وقت "حتّٰی" کو عمل نہیں دیتے جب کہ یفعل کی جگہ فعل استعمال کرنا حسین لگے جیسا کہ اس حدیث کے الفاظ: حتی قلنا قد اوهم میں، اور ہمارے علم کے مطابق اکثر راوی نصب کے قائل ہیں، اور معنی کے اعتبار سے اس کا ترک کرنا کامل و بلیغ ہے۔ طیبیؒ کہتے ہیں کہ بقولِ بعض مراد یہ ہے کہ جب مضارع ماضی کی حکایت کے لیے ہو تو اس میں عمل کرنا حسن نہیں رکھتا اور نہ عمل حسین ہوتا ہے، اور یہ حدیث پہلی صورت کی قبیل سے ہے "قام" کی دلیل سے، اور اس میں بحث ہے اس لئے کہ قرآن میں وارد ہے: ﴿ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ﴾ [البقرہ: ٢١٤] اکثر منصوب پڑھتے ہیں اور نافع مرفوع، جب کہ معنی یہ ہے کہ ان کو جھنجوڑا گیا حتی کہ رسول اور مؤمنین نے کہا اللہ کی مدد کب آئے گی؟ اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نبی علیہ السلام قیام اتنا لمبا کرتے کہ ہمیں گمان ہوتا، اور یہ معنی اس لئے ہیں کہ اگلا جملہ یہ معنی بیان کرتا ہے۔ (قد اوهم) ماضی معروف کے صیغے کے ساتھ، اور بقولِ بعض مجہول ہے، فائق میں ہے اوهمت الشيء اذا تركته واوهمت في الكلام والكتاب اذا اسقت منه شيئا، طیبیؒ نے اس کو ذکر کیا، یعنی رکوع سے کھڑے ہو کر اس قدر ٹھہرے رہتے کہ ہمیں گمان ہوتا رکوع والی رکعت چھوڑ کر دوبارہ قیام کیلئے کھڑے ہو گئے ہیں، بقول ابن الملکؒ کہا جاتا ہے اوهمتة اذا اوقعته في الغلط، اور اس بناء پر "اوہم" ماضی مجہول کا صیغہ ہوگا یعنی آپ ﷺ پر غلطی واقع ہو گئی اور آپ ﷺ بھول کر کھڑے ہو گئے، اور بقولِ ابن حجرؒ یعنی لوگوں کے وہم میں یعنی ذہن میں ڈال دیا کہ آپ ﷺ نے رکعت چھوڑ دی۔ (ثم يسجد ويقعد بين السجدتين) یعنی سجدوں کے درمیان زیادہ وقت تک بیٹھتے تھے۔ (حتى نقول قد اوهم) یعنی گمان ہوتا کہ آپ ﷺ نے دوسرا سجدہ ساقط کر دیا، اور ظاہر ہے کہ یہ طوالت نوافل میں ہوتی تھی یا فرض میں کبھی کبھی بیان جواز کیلئے کرتے تھے اور "كان" کا لفظ ربط کیلئے ہے نہ کہ بیانِ مواظبت کیلئے۔

رواه مسلم: بقولِ میرکؒ ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے۔

سجدہ اور رکوع کی دُعا

۸۷۱: وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكْثِرُ اَنْ يَّقُوْلَ فِيْ رُكُوْعِهٖ وَسُجُوْدِهٖ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ يَتَاَوَّلُ الْقُرْاٰنَ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري ٢٩٩/٢ حديث ٨١٧۔ وأخرجه مسلم ٣٥٠/١ حديث (٢١٧۔٤٥٤)۔ وأبو داوٗد ٥٤٦/١ حديث ٨٧٧۔ وأخرجه النسائي ٢١٩/٢ حديث ١١٢٢۔ وابن ماجة ٢٨٧/١ حديث ٨٨٩ وأحمد ١٩٠/٦۔

ترجمہ: "حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اکثر اپنے رکوع اور سجدہ میں یہ دعا پڑھتے تھے: سبحانك اللهم ربنا وبحمدك اللهم اغفرلي۔ اے اللہ تو پاک ہے۔ اے ہمارے پروردگار میں تیری تعریف بیان کرتا ہوں۔ اے اللہ تو میرے گناہ معاف کر۔" (بخاری، مسلم)

تشریح: وعن عائشه رضى الله عنها قالت كان النبى صلى الله عليه وسلم يكثر: اکثار سے، ان يقول في ركوعه وسجوده سبحانك اللهم ربنا وبحمد: یعنی میں تیری تسبیح بیان کرتا ہوں، فرمانِ الٰہی: فسبح

بحمد ربك حين تقوم کے جواب میں، بقولِ ابن الملکؒ کے۔ پس معنی یہ ہے کہ جب تو عبادت کیلئے کھڑا ہو ورنہ مجلس یا نیند سے کھڑے ہوتے وقت "اللهم اغفرلی" پڑھنا اس آیت کی تفسیر میں مشہور ہے یعنی قولِ باری تعالیٰ: ﴿رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ﴾ [المؤمنون: ۱۱۸] کے جواب میں، بقولِ ابن الملکؒ اور اس سے ان کی مراد قولِ باری تعالیٰ: ﴿وَقُل رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ﴾ ہے، اور وہ لفظ "ربّ" کو "اللّٰھم" سے تبدیل کرنے اور اغفر پر اکتفاء کرنے کے مناسب نہیں چنانچہ اظہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے جواب میں ہے: ﴿وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾ [محمد: ۱۹] پس معنی یہ ہے کہ مجھے اور میری اُمت کو (معاف فرما) اور حقیقت میں دُعا اُمت کے لیے ہے کیونکہ آپ ﷺ بخشے بخشائے ہیں اور ممکن ہے کہ آپ علیہ السلام نے مغفرت پر ثابت قدمی طلب کی ہو یا حسنات الابرار سیئات المقربین کی قبیل سے ہو۔

يتاول القرآن: بقولِ عسقلانی یعنی قرآن کے حکم پر عمل کرنے کے لیے، بقولِ ابن الملکؒ یعنی قرآن کی تفسیر اور کلماتِ قرآن یعنی تسبیح وحمد اور استغفار کی تاویل میں غور وتدبر کرتے ہوئے۔ بقولِ قاضیؒ یہ جملہ يقول کی ضمیر سے حال ہے یعنی قرآن کی آیت: ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ﴾ [النصر: ۳] "اپنے پروردگار کی تسبیح بیان کرو اور اس سے مغفرت مانگو" کی مراد بیان کرتے ہوئے گذشتہ تسبیحات کہتے تھے اور اس کے مقتضاء کو پورا کرتے ہوئے اور یہی لفظاً اور معنیً اظہر ہے، واللہ اعلم۔ بقول ابن حجرؒ اگرچہ یہ کسی حالت کے ساتھ مقید نہیں لیکن پھر بھی اس کا سب سے افضل حالت میں کرنا امتثالِ امر میں زیادہ بلیغ اور تعظیم وتکریم میں اظہر ہے اور سب سے افضل حالت' حالتِ نماز ہے۔

(متفق عليه): بقولِ میرکؒ روایت کیا ہے، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ واحمد نے بھی۔ بقولِ ابن حجرؒ روایتِ مسلم میں الفاظ یہ ہیں: سبحانك اللهم وبحمدك لا اله الاانت، لہٰذا دونوں مسنون ہیں۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ آپ علیہ السلام رکوع سجود میں یوں کہا کرتے تھے: سبحان ذی الجبروت والملكوت والكبرياء والعظمة۔ اور ابن مسعودؓ سے صحیح سند سے ثابت ہے فرماتے ہیں کہ جب نبی علیہ السلام پر ﴿اِذَاجَآءَ نَصْرُاللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ [النصر: ۱] "جب اللہ کی مدد آ پہنچی اور فتح (حاصل ہوگئی)" نازل ہوئی تو اس کو پڑھتے وقت اور رکوع میں اکثر یوں کہا کرتے تھے: سبحانك اللهم وبحمدك اللهم اغفرلی انك انت التواب الرحيم۔

۸۷۲: وَعَنْهَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ فِيْ رُكُوْعِهٖ وَسُجُوْدِهٖ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحُ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم ۳۵۳/۱ حديث (۲۲۳۔۴۸۷) وأخرجه أبوداؤد ۵۴۳/۱ حديث ۸۷۲ وأخرجه النسائي ۱۹۰/۲ حديث ۱۰۴۸۔ وأحمد ۱۹۳/۶۔

ترجمہ: "حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رکوع اور سجدہ میں یہ دعا کرتے تھے۔ سبوح قدوس رب الملائكة والروح۔ بہت پاک اور نہایت پاک ہے فرشتوں اور جبرئیل کا رب۔" (مسلم)

تشریح: وعنها: یعنی حضرت عائشہ۔

ان النبی صلی الله علیه وسلم كان: بعض اوقات۔

یقول فی رکوعه وسجوده: سبوح قدوس: نہایہ میں ہے کہ دونوں ضمہ کے ساتھ مروی ہیں اور فتح قیاساً ہے اور ضمہ اکثر استعمال ہوتا ہے اور یہ مبالغہ کے صیغے ہیں اور ان سے تنزیہہ مراد ہے، اور ہو سکتا ہے تکرار تاکید کیلئے ہو یا ایک تنزیہہِ ذات اور دوسرا تنزیہہِ صفات کیلئے ہو۔ بقولِ مظہر یہ دونوں مبتداء محذوف کی خبریں ہیں تقدیری عبارت یہ ہے **رکوعی وسجودی لمن هو سبوح وقدوس** یعنی مخلوقات کی صفات سے منزہ ہے، طیبیؒ نے اس کو ذکر کیا، اور ابن حجرؒ نے بھی اور اظہر اس کی تقدیری عبارت یہ ہے: **انت سبوح یا هو سبوح** یعنی ہر عیب سے پاک ہے اور یہ **سبحت الله** سے بنا ہے جس کا معنی ہے کہ میں نے اس کی پاکی بیان کی۔ اور **قدوس** یعنی ہر عیب سے پاک اور ہر قبیح سے منزہ، بروزن فعول ہے، مفعول میں مبالغہ کے معنی پیدا کرنے کیلئے۔

رب الملائکة: بقولِ ابن حجرؒ یعنی جو تمام عالم سے اور سب سے فرمانبردار اور ہمیشہ عبادت کرنے والے ہیں اسی وجہ سے لفظ ربّ کی نسبت ان کی طرف خصوصی طور پر کی گئی اور ابوالشیخ کے نزدیک ایک حدیث میں یوں ہے کہ اللہ کی سب مخلوق میں سے فرشتوں کی تعداد زیادہ ہے اور ہر اُگنے والی چیز پر فرشتوں کو مقرر کیا گیا ہے۔ اور ایک اثر میں ہے کہ بارش کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کی اولاد سے زیادہ تعداد میں فرشتے اترتے ہیں جو ہر قطرہ کو شمار کرتے ہیں اور یہ کہ وہ قطرہ کہاں گرتا ہے اور اس سے اُگنے والی کھیتی کو کون کھائے گا۔

اور حفاظ کی ایک جماعت نے تخریج کی ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے فرشتے بھی ہیں جن کے سینے اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپتے ہیں اور ہر ایک کی آنکھ سے گرنے والے قطرہ سے ایک فرشتہ تسبیح کرتا ہوا پیدا ہو جاتا ہے، اور بعض فرشتے زمین آسمان کے پیدا کیے جانے کے وقت سے سجدہ میں ہیں اور قیامت تک سر سجدہ سے نہیں اٹھائیں گے اور کچھ فرشتے رکوع میں قیامت تک رکوع میں رہیں گے اور کچھ صف بنائے کھڑے ہیں آج تک اور قیامت تک کھڑے رہیں گے اور جب روزِ قیامت اللہ تعالیٰ ان کے سامنے آئیں گے تو وہ فرشتے عرض کریں گے اے ذات تو پاک ہے ہم تیری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکے اور طبرانی کی حدیث میں ہے کہ ساتوں آسمانوں میں ایک بالشت اور قدم برابر جگہ ایسی نہیں جہاں کوئی فرشتہ قیام یا سجدہ میں نہ ہو اور قیامت کے دِن تمام فرشتے کہیں گے تو پاک ہے ہم تیری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکے مگر اتنی بات ہے کہ تیرے ساتھ ہم کسی کو شریک نہیں کرتے تھے۔

اور ایک اثر میں ہے کہ جبرائیل علیہ السلام روزانہ حوضِ کوثر میں غوطہ لگاتے ہیں اور ان کے جسم سے گرنے والے ہر قطرہ سے ایک فرشتہ پیدا ہوتا ہے، اور حضرت کعب فرماتے ہیں کہ زمین پر سوئی کے برابر جگہ نہیں مگر اس پر فرشتہ مقرر ہے، ان کی تعداد کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، بیت المعمور میں جو کعبہ کے بالکل برابر اوپر آسمانوں میں ہے روزانہ ستّر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں پھر قیامت تک ان کی باری نہیں آئے گی اور **کروبیین** (مقرب فرشتوں کی جماعت) جو صبح شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں اور کوتاہی نہیں کرتے تعداد میں تمام فرشتوں میں (نوے فیصد) ہے اور باقی دس فیصد ہر چیز کی حفاظت پر مامور ہیں۔

والروح: بقولِ طیبیؒ کہ یہ وہی روح ہے جس سے ہر چیز قائم ہے، البتہ قرآن میں بعض جگہ جیسے: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا﴾ [النباء: ۳۸] ”جس دن روح (الامین) اور فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہوں گے“ وغیرہ روح سے مراد

جبرائیل علیہ السلام ہیں، تمام سے افضل ہونے کی وجہ سے خاص طور پر ان کا تذکرہ کیا۔ بقولِ بعض ''روح'' فرشتوں کی ایک قسم ہے ایک قول کے مطابق صف باندھے کھڑے فرشتوں کو ''روح'' کہتے ہیں۔ بقولِ ابن حجرؒ جبرائیلؑ ہی مراد ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴾ [الشعراء: ۱۹۳] یا خلقت میں سب سے بڑے فرشتے کا نام ہے جیسا کہ حفاظ کی ایک جماعت نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے یا اللہ تعالیٰ کا دربان فرشتہ جو کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوگا اور یہی سب سے بڑا فرشتہ ہے اگر منہ کھولے تو تمام فرشتے اس کے منہ میں آ جائیں۔ لہٰذا مخلوق قیامت میں اسی طرف دیکھے گی اور اس کے خوف سے اس سے اوپر (ذاتِ الٰہی) کی طرف سر نہ اٹھا سکیں گے۔ ابوالشیخ نے ضحاک سے اس کی تخریج کی ہے۔

یا وہ فرشتہ ہے جس کے ستر ہزار چہرے ہیں ہر چہرہ میں ستر ہزار زبانیں اور ہر زبان میں ستّر ہزار لغات ہیں اور وہ ان ستّر ہزار زبانوں میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے ہر تسبیح کے بدلہ اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے اور وہ فرشتہ دیگر فرشتوں کے ساتھ قیامت تک اُڑتا رہے گا۔ تمام ائمہ نے حضرت علیؓ سے اس کی تخریج کی ہے لیکن اس کی سند ضعیف ہے یا وہ فرشتہ ہے جس کے دس ہزار بازو ہیں دو بازو کا مشرق سے مغرب تک کا پھیلاؤ ہے اس کے ایک ہزار چہرے ہیں ہر چہرہ میں ہزار زبانیں دو آنکھیں دو ہونٹ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی قیامت تک تسبیح کرتا رہے گا۔ ایک جماعت نے ابن عباسؓ سے اس کی بھی تخریج کی ہے۔

یا وہ فرشتہ جو تمام فرشتوں سے اشرف اور عنداللہ سب سے مقرّب ہے اور یہی وحی کا فرشتہ ہے، اس کی تخریج ابن منذرؒ نے مقاتل بن حبان سے کی ہے یا وہ چوتھے آسمان کا فرشتہ جو آسمانوں اور پہاڑوں سے بڑا ہے، اور بعض فرشتے روزانہ بارہ ہزار مرتبہ تسبیح کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ہر تسبیح کے بدلے ایک ایسا فرشتہ پیدا فرماتا ہے جو ایک صف میں اکیلا ہی آتا ہے، ابن جریر نے اس کی تخریج کی ہے ابن مسعودؓ سے۔

یا روح ایک مخلوق بنی آدم کی شکل میں ہے۔ ائمہ کی جماعت نے ابن عباسؓ اور مجاہدؒ سے اس کی تخریج کی ہے، اور ایک جماعت نے انہی سے تخریج کی ہے کہ ''الرّوح'' کھاتے پیتے ہیں ان کے ہاتھ پاؤں سَر بھی ہیں لیکن وہ فرشتے نہیں ہیں، ایک جماعت نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ آسمان سے اُترنے والے ہر فرشتہ کے ساتھ ایک روح ہوتا ہے، اور جماعتِ حفاظ نے ابن عباسؓ سے اور انہوں نبی علیہ السلام سے روایت کیا ہے فرمایا روح اللہ تعالیٰ کا ایک لشکر ہے جو فرشتے نہیں ان کے ہاتھ پاؤں اور سَر بھی ہیں، پھر نبی علیہ السلام نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا ﴾ [النبا: ۳۸] ''جس دن روح (الامین) اور فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہوں گے'' اور فرمایا یہ ہیں، لشکر یہ ہیں، لشکر یہ ہیں۔

اور ایک جماعت نے عبداللہ بن بریدہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں کہ تمام انسان، جنات، فرشتے و شیاطین روح کا عشر بھی نہیں ہیں اور ابوالشیخ نے سلمان سے تخریج کی ہے کہ انسان جنات کا دسواں حصہ ہیں اور جنات فرشتوں کا دسواں حصہ اور فرشتے روح کا دسواں حصہ اور روح کروبیّین کا دسواں حصہ ہیں۔ اور ابونجیح سے روایت ہے کہ روح فرشتوں پر نگران جماعت کا نام ہے اور مجاہدؒ سے مروی ہے کہ وہ فرشتے ہی ہیں لیکن ان کو نظر نہیں آتے، یہ بحث ختم ہوگئی۔

اور اس نسبت سے فرشتوں کا انسان سے افضل ہونا متضاد نہیں ہوتا کیونکہ یہ سب جسمانی اعتبار سے بڑے ہونے کی نسبت سے ہے۔

(رواہ مسلم) بقولِ میرکؒ اس کو ابوداؤد، نسائی، واحمد نے بھی روایت کیا ہے۔

رکوع اور سجدہ میں قرآن پڑھنا منع ہے

۸۷۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَا اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَقْرَأَ الْقُرْآنَ رَاكِعًا اَوْسَاجِدًا فَاَمَّا الرُّكُوْعُ فَعَظِّمُوْا فِیْهِ الرَّبَّ وَاَمَّا السُّجُوْدُ فَاجْتَهِدُوْا فِی الدُّعَاءِ فَقَمِنٌ اَنْ یُّسْتَجَابَ لَكُمْ۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم ۱/۳۴۸ حدیث (۲۰۷-۴۷۹) وأبوداؤد ۱/۵۴۵ حدیث ۸۷۶۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لوگو! خبردار مجھے اس سے منع کیا گیا ہے کہ میں رکوع اور سجدہ کی حالت میں قرآن پڑھوں۔ لہٰذا تم رکوع میں اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کرو اور سجدہ میں دعا کی پوری پوری کوشش کیا کرو مناسب ہے کہ یہ دعا تمہارے لئے قبول کی جائے۔'' (مسلم)

تشریح: الا: تنبیہ کا کلمہ ہے۔

انی نهیت: یعنی نہی تنزیہی نہ کہ تحریمی، بقولِ ابن الملکؒ کے۔ اور بقولِ ابن حجرؒ اکثر علماء اسی کے قائل ہیں اور بقول بعض نہی تحریمی ہے اور یہ قیاس ہے۔

ان اقراء القرآن: یعنی قراءتِ قرآن سے۔

راکعا او ساجدا: یعنی ان دونوں حالتوں میں، خطابی فرماتے ہیں کہ جب رکوع و سجود (جو کہ انتہائی ذلت اور عاجزی کا نام ہے) ذِکر کیلئے مخصوص ہیں تو آپ علیہ السلام نے ان میں قراءت سے منع فرمادیا گویا آپ علیہ السلام نے کلام اللہ اور مخلوق کے کلام کو ایک جگہ جمع کرنا ناجائز اور ناپسند فرمایا اگر ایسا ہوتا تو دونوں کلام برابر ہو جاتے۔ طیبیؒ نے اس کو ذکر کیا۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ حالت قیام میں دونوں کو جمع کرنے سے نماز فاسد ہو جائے گی۔

اور بقولِ ابن الملکؒ اس منع کی وجہ یہ ہے کہ قیام نماز کا سب سے افضل رُکن ہے اور سب سے افضل ذِکر قرآن ہے لہٰذا افضل کو افضل کیلئے مقرر فرمایا، اور غیر قیام میں قراءت سے منع فرمایا تاکہ تمام بقیہ اذکار کے ساتھ اس کی برابری کا وہم نہ ہو اور بقولِ بعض قراءت کو قیام کے ساتھ اور قیام سے عاجز ہونے کے وقت بیٹھنے کے ساتھ مخصوص فرمایا اس لئے یہ دونوں افعال عادیہ ہیں اور محض عبادت کیلئے ہوتے ہیں بخلاف رکوع و سجود کے، اس لئے کہ وہ بالذات عادت کے خلاف ہیں اور عاجزی اور عبادت دونوں پر دلالت کرتے ہیں اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ رکوع و سجود دو حالتیں ہیں جو ذلت پر دال ہیں اور دُعا و تسبیح ان کے مناسب ہے تو قرآن کی تعظیم کی خاطر اور پڑھنے والے (جو کہ کلیم کے قائم مقام ہے) کے اظہارِ بزرگی کیلئے ان دونوں میں قراءت سے منع فرمادیا اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے۔ قاضیؒ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کا منع فرمانا رکوع میں قراءت کے عدمِ جواز پر دلالت کرتا ہے لیکن اگر قراءت کی تو نماز باطل نہ ہوگی مگر یہ کہ جب فاتحہ پڑھی کیونکہ اس میں اختلاف ہے یعنی شافعیؒ کے نزدیک، اس لئے کہ رُکن کا اضافہ تو کر دیا لیکن نظم صلوٰۃ میں تبدیلی نہیں آئی۔

فاما الرکوع فعظموا فیه الرب: یعنی سبحان ربی العظیم کہو۔

واما اسجود فاجتهدوا: یعنی مبالغہ کرو۔

فی الدعاء: یعنی حقیقۃً اور یہ ظاہر ہے یا حکماً جیسا کہ سبحان ربی الاعلیٰ میں، اور بعض فرماتے ہیں سبحان ربی الاعلیٰ کے بعد دُعا کرو۔ طیبیؒ کا قول ہے کہ نبی علیہ السلام کا خاص طور سے رکوع میں سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں دُعا کا حکم کرنا دلالت کرتا ہے کہ قراءت سے خاص طور پر حضور ﷺ کو منع نہیں فرمایا گیا بلکہ اُمت بھی اس میں داخل ہے، اور ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ یہ امر ندب کیلئے ہے نہ کہ وجوب کیلئے کیونکہ نبی علیہ السلام نے دیہاتی کو جب نماز سکھائی تو اس کو اس کا حکم نہیں فرمایا۔

فقمن: ''میم'' کے فتحہ وکسرہ کے ساتھ، طیبیؒ کا قول ہے کہ جن کے نزدیک فتحہ ہے ان کے ہاں اس کی تانیث وتثنیہ اور جمع نہیں آتی اس لئے کہ یہ مصدر ہے یعنی تعریفِ باری تعالیٰ اور جو کسرہ دیتے ہیں ان کے نزدیک اس کی تثنیہ وجمع وتانیث آتی ہے اس لئے کہ یہ صفت ہے یعنی اصل کے اعتبار سے، اسی طرح یعنی القمن کی طرح القمین (بالکسر) بھی ہے۔ **القمین** وصف ہونے کی صورت میں ''یاء'' کے ساتھ ہے اور جدیر، خلیق، لائق، حقیق کے معنی میں ہے ان تمام کا معنی ''لائق'' ہے۔

ان یستجاب لکم: اس لئے کہ بندہ سجدہ میں ربّ کے زیادہ قریب ہوتا ہے لہٰذا اس حالت میں دُعا مانگنا قبولیت کے زیادہ قریب ہوگی۔

رواہ مسلم: بقولِ میرکؒ احمد نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

نماز میں تحمید کی فضیلت

۸۷۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا قَالَ الْاِمَامُ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ فَاِنَّهٗ مَنْ وَّافَقَ قَوْلُهٗ قَوْلَ الْمَلاَئِكَةِ غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ. (متفق علیه)

البخاری ۲/۲۸۳حدیث ۷۹۶۔ومسلم ۱/۳۰۶حدیث رقم (۷۱۔۴۰۹)وأخرجه أبو داوٗد فی السنن ۱/۵۲۹ حدیث ۸۴۸۔والترمذی ۲/۵۵حدیث رقم وأخرجه النسائی ۲/۱۹۶حدیث ۱۰۶۳۔وأخرجه مالك ۱/۸۸ حدیث رقم ۴۷ من کتاب الصلاۃ۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب امام **سمع اللہ لمن حمدہ** کہے تو تم۔ **اللھم ربنا لك الحمد**۔ کہو۔ کیونکہ جس کا یہ قول ملائکہ کے قول کے مطابق ہو جائے تو اس کے سابقہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔'' (بخاری، مسلم)

تشریح: اذا قال الامام سمع اللہ لم حمدہ: ضمیر ہونے کی وجہ سے مضموم اور ''ھاء'' سکتہ کی صورت میں ساکن ہے، بقولِ ابن الملکؒ کے۔ اور بقولِ جعبری قرآن سے منقول ہے کہ بعض عرب ''ھاء'' ضمیر کو ماقبل متحرک ہونے کی صورت میں ساکن پڑھتے ہیں چنانچہ مشہور ہے ضربته ضرباً ''میم'' جمع پر حمل کرتے ہوئے، اور بقولِ بعض وقف پر محمول ہے یعنی وصل وقف کے بمنزلہ ہو گیا، اور حاصل یہ ہے کہ دونوں صورتیں ضمہ، سکون جائز ہیں وصلی کر کے باوجود یہ کہ قراء کے نزدیک ''حاءِ''

ضمیر بھی بن سکتی ہے، البتہ "ھاء" سکتہ کا اعتبار کرتے ہوئے دو وجہیں جائز ہیں: ① ھاء باقی رکھنا۔ ② حذف کرنا وصل کیلئے تمام کے نزدیک اور معنی یہ ہے کہ لقبل اللہ منہ حمدہ و اجابہ یعنی اللہ تعالیٰ اس کی حمد قبول کرے، تو کہتا ہے **اسمع دعای** یعنی قبول فرما۔

فقولوا اللھم ربنالك الحمد فانه: ضمیر شان ہے۔

من وافق قوله: یعنی مقتدی کا امام کی تسمیع کے بعد تحمید کہنا۔

قول الملائكة: یعنی زمانہ یا قبولیت میں۔

غفرله ماتقدم من ذنبه: یعنی صغیرہ گناہ عدل کے تقاضا کی بنیاد پر، اور کبیرہ گناہ فضل کی وجہ سے۔ (متفق علیہ)

بقول میرکؒ ابوداؤد، ترمذی و ابن ماجہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

قومہ کی دُعا

۸۷۵: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِىْ اَوْفٰى قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا رَفَعَ ظَهْرَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْأَ السَّمٰوٰتِ وَمِلْأَ الْاَرْضِ وَمِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَیْءٍ بَعْدُ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم ۳۴۶/۱ حديث (۲۰۲-۴۷۶) وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۵۲۸/۱ حديث رقم ۸۴۶۔ وأخرجه ابن ماجة ۲۸۴/۱۔ حديث ۸۷۸۔ وأحمد ۳۵۳/۴۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رکوع سے اپنی پشت اٹھاتے تھے تو یہ کہتے تھے اللہ تعالیٰ نے قبول کیا اس آدمی کی تعریف کو جس نے اس کی حمد و ثنا کی۔ اے اللہ اے ہمارے پروردگار۔ تیرے لئے ہی تمام تعریف ہے تمام آسمان بھر کر، زمین بھر کر اور اس شئی کے بقدر بھر کر جس کو تو آسمانوں اور زمین کے بعد پیدا کرنا چاہے۔" (مسلم)

تشریح: قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا رفع ظهره: یعنی جب اٹھنا شروع فرماتے۔

من الركوع قال سمع الله لمن حمده: یعنی اور جب سیدھے کھڑے ہو جاتے اور سجدہ کی طرف جھکتے وقت کہتے۔

اللهم ربنا لك الحمد: اور نوافل میں اضافہ فرماتے۔

مل السموات: اکثر کے قول کے مطابق مصدر محذوف کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور بقول بعض حرفِ جر ہے یعنی **بملء السموات**، الحمد کی صفت ہونے کی بنیاد پر مرفوع بھی ہو سکتا ہے۔ اور "**الملء**" کسرہ کے ساتھ، اس چیز کو کہتے ہیں جو برتن کے بھرنے کے بعد اس میں ڈالی جائے، اور یہ مجازاً کثرت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بقول مظہر یہ تمثیل ہے اس لئے کہ کلام ماپی نہیں جا سکتی اور نہ برتن میں آ سکتی ہے، اس سے مراد صرف عدد بڑھانا ہے یعنی اگر ان کلمات کے جسم ہوتے جو تمام جگہ بھر دیتے تو یہ کثرت کی وجہ سے اس درجہ کو پہنچ جاتے کہ تمام زمینیں اور آسمان بھر جاتے۔

وملء الارض وملء ماشئت من شئی بعد: یعنی زمین وآسمان کے بعد، یعنی ان کا درمیان یا مذکورہ چیزوں کے علاوہ جیسے عرش، کرسی تحت الثریٰ اوراظہر یہ ہے کہ زمین وآسمان سے مراد دو جہتیں بلندی، پستی ہیں اور ملء ماشاء من شیء سے مراد مشیت الٰہی کے بعد۔ بقول تورپشتیؒ یہ اشارہ ہے اداءِ حق سے عاجز آجانے کے اعتراف کی طرف پوری کوشش کے بعد۔اس لئے کہ آسمان وزمین بھرنے کے بقدر حمد آپ ﷺ نے کردی۔اور یہاں سبقت کرنے والوں کے قدموں کی انتہاء ہو گئی پھر آپ ﷺ اور بلند ہوئے اور آگے بڑھے اور معاملہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر چھوڑ دیا اس لئے کہ بعدِ حمد کی کوئی انتہاء نہیں اور اس مرتبہ کی وجہ سے آپ علیہ السلام احمد کہلانے کے مستحق ہوئے جن پر مخلوق میں سے کوئی نہ پہنچ سکا۔(رواہ احمد)

۸۷۶: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِذَا رَفَعَ ظَهْرَهٗ مِنَ الرُّکُوْعِ قَالَ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْاَ السَّمٰوٰتِ وَمِلْاَ الْاَرْضِ وَمِلْاَ مَاشِئْتَ مِنْ شَیْءٍ بَعْدُ اَهْلُ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ اَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ وَکُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَاالْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم ۳٤۷/۱ حدیث (۲۰۵-٤۷۷) وأخرجه أبوداوٗد ۵۲۹/۱ حدیث رقم ۸٤۷۔ والنسائی فی السنن ۱۹۸/۲ حدیث رقم ۱۰٦۸۔ والدارمی ۳٤٤/۱ حدیث ۱۳۱۳۔ وأحمد ۸۷/۳۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رکوع سے سر اٹھاتے تو یہ کہتے تھے: اے اللہ! اے ہمارے پروردگار تیرے ہی لئے تمام تعریف ہے تمام آسمان بھر کر۔ زمین بھر کر۔ اور اس چیز کے بھرنے کے بقدر جس کو تو آسمانوں اور زمین کے بعد پیدا کرنا چاہے۔ اے ہر قسم کی تعریف اور بزرگی کے مستحق۔ تیری ذات اس تعریف سے بالاتر ہے جو انسان کرتا ہے۔ ہم سب تیرے ہی بندے ہیں اے اللہ تو نے جس کو جو چیز عطا کردی ہے اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے اور جس کو تو نے دینے سے روک لیا اس کو کوئی دینے والا نہیں ہے اور مالدار کو اس کی مالداری تیرے عذاب سے کوئی نفع نہیں دیتی۔'' (مسلم)

تشریح: اذا رفع راسه من الرکوع ''قال'': یعنی منفرد ہونے کی حالت میں۔

اللھم ربنا لك الحمد ملء السموات وملء الارض وملء ماشئت من شیء بعد اھل الثناء: رفع کے ساتھ، جب کہ ''انت'' مقدر مانا جائے، اور اگلی پچھلی عبارت کے لحاظ سے بھی یہی زیادہ مناسب ہے یا مقدر مان کر مدح کی بنیاد پر منصوب ہے یا حرف نداء یا مقدر ہونے کی وجہ سے۔

والمجد: یعنی عظمت یا کرم۔

احق ما قال العبد: رفع کے ساتھ، اور ''ما'' موصولہ یا موصوفہ ہے اور ''الف لام'' جنسی یا عہدی ہے اور معہود نبی علیہ السلام ہیں، یعنی تو بندہ کے تیری مدح کرنے کا غیر سے زیادہ مستحق ہے یا تقدیری عبارت یوں ہوگی: المذکور من الحمد لکثیر احق ما قاله العبد۔ اوراظہر یہ ہے کہ أحق مبتداء ہے اور اللھم...... جملہ اس کی خبر، اور مبتداء اور خبر کے درمیان جملہ حالیہ معترضہ ہے اور منصوب ہوسکتا ہے مدح یا مصدر ہونے کی بنیاد پر یعنی قلت احق ما قاله العبد، یعنی میں اس کی تصدیق

تثبیت کرتا ہوں۔ بقول ابن الملکؒ أحق سے اس کا فعل ماضی ہونا بھی جائز ہے یعنی **اصاب العبد الحق فیما قال بانك اهل الثناء والمجد۔**

بقولِ طیبیؒ بعض روایات میں **حق ما قال العبد** ہے اس صورت میں یہ مکمل جملہ استینافیہ ہوگا، اور قول **و کلنا لك عبد** اسی روایت میں اضافہ ہے اور اس روایت میں یہ بھی احتمال ہے کہ "حق" ماضی یا وصف ہو، بقول زین العرب **حق** بغیر الف کے بھی مروی ہے تو اس صورت میں یہ خبر اور "مَا" مبتداء ہوگا اور پہلی روایت کے مطابق "مَا" اضافت کی وجہ سے مجرور ہے۔

اللّٰھم لا مانع: یعنی کسی سے۔

لما اعطیت: یعنی بندہ کو۔

بلا عمل: ابتداءً یا عمل کے بعد کوئی عطاء کر۔

ولا معطی: کسی کو۔

لما منعت: یعنی جو چیز یا عطاء تو روک دے تو کوئی دینے والا نہیں اور یہ اس فرمانِ الٰہی سے مقتبس ہے: ﴿مَا یَفْتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَۃٍ فَلَا مُمْسِکَ لَھَا ۚ وَمَا یُمْسِکْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَہٗ مِنْ بَعْدِہٖ ؕ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ﴾ [فاطر : ۲] "خدا جو اپنی رحمت (کا دروازہ) کھول دے تو کوئی اس کو بند کرنے والا نہیں اور جو بند کر دے تو اس کے بعد کوئی اس کو کھولنے والا نہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے" اور مناسب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دینا اور روک لینا تیرے اس ذات سے حاجب نہ بنے اس لئے کہ ابن عطاء کا فرمان ہے کہ کبھی دے کر اللہ تعالیٰ روک لیتے ہیں اور کبھی روک کر عطا کر دیتے ہیں۔ **(ولا ینفع ذالجد منك الجد)** "میم" کا فتحہ مشہور ہے جس کا معنی عظمت یا حصہ یا غنٰی یا نسب ہے۔

بقول تورپشتیؒ یعنی غنی کو غناء نفع نہیں دیتا بلکہ تیری اطاعت والے اعمال نفع دیتے ہیں، اور احتمال دوسرا بھی ہے کہ تیرے عذاب سے اس کا غنی ہونا بچا نہیں سکتا، بقول مظہر یعنی اگر تو عذاب دینا چاہے تو بندہ کا غنی ہونا اور اس کی عظمت عذاب روک نہیں سکتے اور بقولِ بعض یعنی فضل اور نصیب والا ہونا تیری اطاعت کا بدل نہیں ہوسکتا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ: **لا ینفع** کا ماقبل پر عطف ہے یعنی **ولا ینفع عطاء ہ کما لا یضر منعه** اور **ذا الجد** منادی ہے یعنی **یا ذا الجد** یعنی اے غنٰی اور عظمت والے۔ خیر وفضل تیری طرف سے ہے نہ کہ کسی اور کی طرف سے، اور بقولِ بعض "الجد" سے مراد "دادا" اور "نانا" ہے، یعنی شریف نسب والے کو نسب نفع نہ دے گا۔ اور بقول راغب معنی یہ ہے کہ قیامت میں ثواب اور بدلہ نسب و مرتبہ کی بنا پر نہ ملے گا بلکہ طاعات میں کوشش پر ملے گا اور بعض روایات اور چند نسخوں میں "میم" کے کسرہ کے ساتھ ہے، پس معنی یہ ہوگا کہ محض جد و جہد نفع نہ دے گی بلکہ توفیق اور قبولیت نفع دے گی۔

رواہ مسلم: اور بقولِ میرکؒ ابوداؤد ونسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

۸۷۷: وَعَنْ رِفَاعَۃَ بْنِ رَافِعٍ قَالَ کُنَّا نُصَلِّیْ وَرَاءَ النَّبِیِّ ﷺ فَلَمَّا رَفَعَ رَأْسَہٗ مِنَ الرَّکْعَۃِ قَالَ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ فَقَالَ رَجُلٌ وَّرَائَہٗ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا کَثِیْرًا طَیِّبًا مُّبَارَکًا فِیْہِ فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ مَنِ الْمُتَکَلِّمُ اٰنِفًا قَالَ اَنَا قَالَ رَأَیْتُ بِضْعَۃً وَّثَلَاثِیْنَ مَلَکًا یَبْتَدِرُوْنَھَا اَیُّھُمْ یَکْتُبُھَا اَوَّلُ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٢٨٤ حديث ٧٩٩ـ وأخرجه أبوداوٗد ١/٤٨٨ حديث ٧٧٠ وأخرجه النسائي ٢/١٩٦ حديث ١٠٦٢ـ وأخرجه مالك في الموطأ ١/٢١١ حديث ٢٥ عن كتاب القرآن وأحمد ٤/٣٤٠ـ

ترجمہ: ''حضرت رفاعہ بن رافعؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔ جب آپ ﷺ رکوع سے سر اٹھاتے تو سمع اللہ لمن حمدہ کہتے۔ ایک آدمی نے آپ کے پیچھے یہ کلمات کہے: رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيْهِ۔ اے ہمارے رب اور تیرے ہی لئے بہت تعریف ہے۔ ایسی تعریف جو ریا سے پاک ہے اور بابرکت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا ابھی ان کلمات کو کون پڑھ رہا تھا۔ اس آدمی نے کہا میں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے تیس سے زائد فرشتوں کو دیکھا جو آپس میں جلدی کر رہے تھے کہ ان کلمات کے ثواب کو کون پہلے لکھے۔'' (بخاری)

تشریح: رفع راسه من الركعة: یعنی رکوع سے، اور ہوسکتا ہے کہ اس کو رکعت اس لئے فرمایا کیونکہ اس کے مل جانے سے رکعت مل جاتی ہے۔

قال سمع الله لمن حمدهٗ فقال رجل وراءه ربنا ولك الحمد: یعنی تیرے لیے ہی نعمت اور تیرے لیے ہی حمد ہے۔

حمدا كثيرا: کائنات کی کثرت کی بقدر اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ جو چاہے۔

طيبا: یعنی خالص اور کمی سے پاک۔

مباركا فيه: یعنی تمام نعمتوں کو شامل۔

فلما انصرف : صلی اللہ علیہ وسلم۔

قال من المتكلم آنفا: ''مد'' اور قصر دونوں طرح یعنی ''ابھی''۔

قال: یعنی آدمی نے۔ (انا) وہ الفاظ کہنے والا۔

قال رايت: اور طبرانی کی ایک روایت میں ہے **والذى نفسى بيده لقد رايت**۔

بضعة: تین سے نو تک کو کہتے ہیں۔

وثلاثين ملكا: ظاہر ہے کہ ہر حرف کیلئے ایک فرشتہ تھا اس لئے کہ کلمات کے حروف چونتیس ہیں۔

يبتدرونها: یعنی وہ کلمات لکھنے میں ایک دوسرے پر سبقت کر رہے تھے۔

ايهم يكتبها اول: یعنی سب سے پہلے ان کلمات کو کون لکھتا ہے عظیم القدر ہونے کی وجہ سے۔ بقولِ ابن الملکؒ لفظ اول نصب کے ساتھ زیادہ بہتر ہے یعنی سب سے پہلے، مفاتیح میں کہا ہے کہ اس کا نصب حال یا ظرف ہونے کی وجہ سے ہے، بقولِ عسقلانی لفظ اول ضمہ کے ساتھ مروی ہے مبنی ہونے کی وجہ سے اور منصوب ہے حال ہونے کی وجہ سے، البتہ ''ايهم'' کو ہم نے رفع کے ساتھ روایت کر کے مبتداء بنایا ہے اور ''يكتبها'' اس کی خبر ہے۔ اور بقولِ طیبیؒ اُول مبنی برضمہ ہے اور مضاف محذوف ہے یعنی **يسرع كل واحد منهم ليكتبها قبل الاخر ويصعدبها**۔ یعنی ہر ایک، سب سے پہلے لکھنے اور لے کر جانے میں

جلدی کررہا تھا۔ بقولِ ابن حجرؒ ایک روایت میں ''اولاً'' ہے اور ہر ایک کی ایک وجہ ہے کیونکہ اول مقطوع الاضافی ہونے کی وجہ سے لفظاً نہ کہ معنیً یعنی اوّلھم۔ اور دمامینی نے کہا ہے کہ ''ایھم'' استفہامیہ مبتداء ہے اور اس کی خبر یکتبھا ہے۔

پھر اگر تو کہے کہ اس جملہ استفہامیہ کا تعلق کس سے ہے؟ تو میں کہتا ہوں محذوف سے متعلق ہے جس پر یبتدرونھا دالّ ہے۔ گویا کہ یوں کہا گیا: یبتدرونھا لیعلموا ایھم یکتبھا اور اس کا یبتدرونھا کے متعلق ہونا صحیح نہیں کیونکہ وہ ان افعال میں سے نہیں جن سے استفہام متعلق ہوتا ہے، اور زرکشی کا اس کو استفہامیہ بنانا اور یبتدرون کے متعلق کرنا غلطی ہے۔

لہٰذا نبی علیہ السلام کے کلام کو اس پر محمول کرنا مناسب نہیں، اور انہوں نے یہ بھی جائز کہا ہے کہ ایُّ موصولہ بنا کر یبتدرون کے فاعل سے بدل بنا دیا جائے۔

رواہ البخاری: میرکؒ کہتے ہیں کہ تعجب کی بات ہے کہ حاکم نے حدیثِ رفاعہ بن رافع کو اپنی مستدرک میں صحیحین کی شرط پر روایت کیا ہے اور وہ بخاری میں ہے اور حاکم کے رجال بھی وہی ہیں جو بخاری کے ہیں مگر مستدرک میں عبدالرحمٰن عن مالک کے طریق سے ہے اور بخاری میں عن القعنبی عن مالک کے طریق سے، اور یہ مغایرت دونوں کے درمیان کافی ہے، واللہ اعلم۔

بقولِ ابن حجرؒ اور بروایتِ طبرانی ایک شخص نے آپ علیہ السلام کے سامنے چھینکا پھر اس نے کہا: **الحمد لله حمدًا كثيرًا طيبا مباركًا فيه حتى يرضى ربنا بعد الرضا والحمد لله على كل حال** جب آپ علیہ السلام نماز سے فارغ ہوئے تو ارشاد فرمایا یہ کلمات کس نے کہے؟ اس نے عرض کیا میں نے یا رسول اللہ ﷺ، فرمایا میں نے بارہ فرشتوں کو لکھنے میں ایک دوسرے سے جلدی کرتے دیکھا اور ہوسکتا ہے کہ یہ عدد کلمات کے اعتبار سے ہو، اور **الحمد لله على كل حال** تاکید اور تذییل کے لیے ہو جس طرح کہ خلاصہ جو کہ اجمال بعد التفصیل پر دلالت کرتا ہے۔

الفصل الثانی:

تعدیل ارکان کا حکم

۸۷۸: عَنْ اَبِيْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُجْزِئُ صَلَاةُ الرَّجُلِ حَتّٰى يُقِيْمَ ظَهْرَهٗ فِي الرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ۔

(رواه ابوداود والترمذی والنسائی وابن ماجة والدارمی وقال الترمذی هذا حديث حسن صحيح)

أخرجه ابوداؤد ۱/۵۳۳ حديث ۸۵۵۔ وأخرجه الترمذی ۲/۵۱ حديث ۲۶۵ وقال حديث حسن صحيح أخرجه النسائی ۲/۱۸۳ حديث رقم ۱۰۲۷۔ وأخرجه ابن ماجة ۱/۲۸۲ حديث ۸۷۰۔ والدارمی ۱/۳۵۰ حديث ۱۳۲۷۔

ترجمہ: ''حضرت ابو مسعود انصاریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کسی آدمی کی نماز اس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک کہ وہ رکوع اور سجدہ میں اپنی کمر کو سیدھا نہ کرے۔ (ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ دارمی) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔''

تشریح: لا تجزی صلاۃ الرجل حتی یقیم ظهره :بقول مظہر یعنی جوشخص اپنی پشت برابر نہ کرے اس کی نماز جائز نہیں۔

فی الرکوع والسجود: اور اس سے مراد اطمینان سے اداء کرنا ہے اور یہ عند الشافعیؒ واحمدؒ واجب ہے رکوع سجدہ وغیرہ میں، اور عند ابی حنیفہؒ واجب نہیں اس لئے کہ طمانیت۔

اس کو طیبیؒ نے ذکر کیا ہے اور شرح منیۃ المصلی میں ہے کہ تعدیل ارکان یہ ہیں طمانینت اور اعضاء کو حرکت نہ دینا، اور اس کی کم از کم مقدار تسبیح کے برابر فرض ہے، امام ابو یوسف اور تینوں ائمہ کے نزدیک حدیث مذکور کی وجہ سے اور جواب یہ ہے کہ اس سے فرضیت ثابت نہیں ہوتی اس لئے کہ فرض وہ ہے جو دلیل قطعی سے ثابت ہو، لہٰذا امام ابو حنیفہؒ ومحمدؒ کے نزدیک واجب ہے اس لئے کہ دلیل ظنی سے ثابت ہے، اور بقول بعض سنت ہے۔

پھر شرح منیۃ میں کہا اسی طرح رکوع سے کھڑا ہونا اور دو سجدوں کے درمیان کچھ بیٹھنا اور طمانیت یہ تمام چیزیں فرض ہیں امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اور طرفین کے نزدیک سنت ہے، ہدایہ کے تذکرہ کے مطابق اور ابن ہمامؒ نے شرح ہدایہ میں فرمایا ہے کہ قومہ اور جلسہ کا واجب ہونا مناسب ہے اس لئے کہ نبی علیہ السلام نے اس پر مواظبت فرمائی ہے اور اس پر قاضی خان کی بات بھی دلالت کرتی ہے جو موجب سہو چیزوں کے ضمن میں ذکر فرمائی ہے کہ جس میں نمازی بھول کر رکوع سے سر اٹھائے بغیر سجدہ کی طرف جھک جائے تو طرفین کے نزدیک نماز ہوگئی اور اس پر سہو واجب ہے اور بقول ابن حجرؒ فی ''مِنْ'' کے معنی میں ہے۔

رواه ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجه والدارمی وقال الترمذی هذا حديث حسن صحيح۔

تسبیحاتِ رکوع وسجود

۸۷۹: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِجْعَلُوْهَا فِيْ رُكُوْعِكُمْ فَلَمَّا نَزَلَتْ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى قَالَ اِجْعَلُوْهَا فِيْ سُجُوْدِكُمْ.

(رواه ابوداود وابن ماجة والدارمی)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ١/ ٥٤٢ حديث رقم ٨٦٩۔ وأخرجه ابن ماجة ١/ ٢٨٧ حديث ٨٨٧۔ وأخرجه الدارمی ١/ ٣٤١ حديث ١٣٠٥۔ وأحمد ٤/ ١٥٥۔

ترجمہ: ''حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: فسبح باسم ربک العظیم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اس کو اپنے رکوع میں شامل کرلو۔ اور جب یہ آیت نازل ہوئی: سبح اسم ربک الاعلیٰ فرمایا اس کو اپنے سجدوں میں شامل کرلو'' (ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجعلوها : یعنی اس کا مضمون اور خلاصہ۔

فی رکوعکم: یعنی سبحان ربی العظیم کہو۔ فخر الرازی فرماتے ہیں العظیم کا معنی ہے ذات وصفات میں کامل، اور جلیل کا معنی ہے صفات میں کامل، اور کبیر کا معنی ذات میں کامل۔

فلما نزلت سبح اسم ربك الاعلى قال اجعلوها فى سجودكم: بقول ابن حجرؒ تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ **الاعلیٰ' العظیم** سے زیادہ بلیغ ہے لہٰذا تواضع میں زیادہ بلیغ کے لیے رکھا گیا اور وہ سجدہ ہے جو کہ رکوع سے افضل ہے اور یہ صحیح طریق سے ثابت ہے کہ بندہ سجدہ میں اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہوتا ہے اور بعض مرتبہ قربِ مسافت کا وہم ہوتا ہے لہٰذا اس میں تسبیح مندوب ہوئی۔

بقولِ طیبیؒ **الاسم** یہاں صلہ ہے اس دلیل سے کہ نبی علیہ السلام سجدہ میں **سبحان ربی الاعلی** کہا کرتے تھے، پھر لفظِ اسم کو حذف کر دیا گیا اور یہ ترکیب اس کے قول کے مطابق ہے جس کے زعم میں اسم مسمّٰی کا غیر ہے اور بقول بعض کے غیر صلہ ہونا بھی ممکن ہے اور معنی اللہ تعالیٰ کے نام کا پراگندہ اور تحقیراً ذکر کیے جانے سے منزہ ہونا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ جس طرح ذاتِ باری تعالیٰ کا نقائص سے پاک ہونا ضروری ہے اسی طرح اس کے لئے وضع کردہ الفاظ کا بیہودگی اور بے ادبی سے پاک ہونا بھی۔ (رواہ ابوداؤد)

بقول میرکؒ منذری نے اس سے سکوت کیا ہے اور نوویؒ فرماتے ہیں اس کی سند حسن ہے اور حاکمؒ نے مستدرک میں روایت کیا اور صحیح کہا ہے۔ بقول ذہبی اس کی سند میں ایاس بن عامر ہے اور وہ معروف نہیں ہے لیکن تقریب میں کہا ہے کہ ایاس بن عامر صدوق ہے۔ (وابن ماجہ والدارمی)

۸۸۰: وَعَنْ عَوْنِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا رَكَعَ اَحَدُكُمْ فَقَالَ فِىْ رُكُوْعِهٖ سُبْحَانَ رَبِّىَ الْعَظِيْمِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَقَدْ تَمَّ رُكُوْعُهٗ وَذٰلِكَ اَدْنَاهُ وَاِذَا سَجَدَ فَقَالَ فِىْ سُجُوْدِهٖ سُبْحَانَ رَبِّىَ الْاَعْلٰى ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَقَدْ تَمَّ سُجُوْدُهٗ وَذٰلِكَ اَدْنَاهُ (رواه الترمذى وابوداؤد وابن ماجة وقَالَ الترمذى) **لَيْسَ اِسْنَادُهٗ بِمُتَّصِلٍ لِاَنَّ عَوْنًا لَمْ يَلْقَ ابْنَ مَسْعُوْدٍ۔**

أخرجه أبوداؤد السنن ١/ ٥٥٠ حديث ٨٨٦ ـ وقال سرسل فعون لم يدرك ابن مسعود ـ أخرجه ١/ ٢٨٧ حديث ٨٩٠ ـ والترمذى ٢/ ٤٦ حديث ٢٦١ وقال إسناده ليس بمتصل ـ

ترجمہ: ''حضرت عون بن عبداللہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی رکوع کرے تو وہ اپنے رکوع میں **سبحان ربی العظیم**۔ تین مرتبہ کہے۔ تو اس کا رکوع مکمل ہو جائے گا اور یہ ادنی درجہ ہے اور جب تم میں سے کوئی آدمی سجدہ کرے تو اس کو اپنے سجدہ میں **سبحان ربی الاعلیٰ** تین مرتبہ کہنا چاہئے۔ اس سے اس کا سجدہ پورا ہو جائے گا۔ اور یہ ادنیٰ درجہ ہے۔ (ترمذی۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس کی سند متصل نہیں ہے کیونکہ عون بن عبداللہ کی ملاقات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ثابت نہیں ہے۔''

تشریح: وعن عون بن عبد الله: یعنی ابن عتبہ بن مسعود۔

عن ابن مسعود: یعنی عبداللہ۔

اذا ركع احدكم فقال فى ركوعه سبحان ربي العظيم: لفظ ''ربّی'' یاء کے فتحہ اور سکون کے ساتھ۔

ثلاث مرات فقدتم رکوعه: بقول ابن حجرؒ یعنی کامل ہو گیا ورنہ اصل کمال ایک مرتبہ کہنے سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

وذلك ادناه: یعنی تمام رکوع کا ادنی درجہ ہے، بقول ابن الملکؒ یعنی عدد میں کامل ہونے کا ادنیٰ درجہ ہے اور اکمل درجہ سات مرتبہ کہنا ہے اور فرمایا کہ درمیانہ درجہ پانچ مرتبہ ہے اور شرح منیۃ میں ہے رکوع وسجود کی رکنیت کا درجہ یہ ہے کہ اس پر رکوع وسجدہ کا اطلاق ہو سکے، اور شرح الاسیجابی میں مذکور ہے کہ اگر تین تسبیحات نہ پڑھیں یا اتنی مقدار نہ ٹھہرا تو اس کا رکوع وسجدہ جائز نہیں، اور یہ قول شاذ ہے جیسا کہ ابو مطیع بلخی کا تسبیحات رکوع وسجود کی تثلیث کی فرضیت کا قول۔ حتی کہ اگر ایک تسبیح کی کمی کی تو رکوع وسجدہ ادا نہ ہوگا۔

واذ اسجد فقال فی سجوده سبحان ربی الاعلی ثلاث مرات فقد تم سجوده وذلك ادناه رواه الترمذی: عون بن عبداللہ بن عتبہ عن ابن مسعود کے طریق سے، بقول میرکؒ۔

وابو داوٗد وابن ماجه وقال الترمذی لیس اسناده: یعنی اس حدیث کی سند۔ **بمتصل لان عونا لم یلق ابن مسعود** اور بقول ابن حجرؒ عدم اتصال سند یہاں اس سے استدلال کیلئے مضر نہیں اس لئے کہ حدیث منقطع پر فضائل میں بالا جماع عمل کیا جاسکتا ہے۔

نماز میں طلبِ رحمت اور عذاب سے پناہ کی دعا

۸۸۱: وَعَنْ حُذَيْفَةَ اَنَّهٗ صَلّٰى مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ يَقُوْلُ فِيْ رُكُوْعِهٖ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ وَفِيْ سُجُوْدِهٖ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى وَمَا اَتٰى عَلٰى اٰيَةِ رَحْمَةٍ اِلَّا وَقَفَ وَسَاَلَ وَمَا اَتٰى عَلٰى اٰيَةِ عَذَابٍ اِلَّا وَقَفَ وَتَعَوَّذَ ۔ (رواه الترمذی وابوداود والدارمی وروی النسائی وابن ماجة الی قوله الاعلی وقال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح)

الترمذی ۴۸/۲ حدیث ۲۶۲ ـ وقال حسن صحیح ـ وأبو داوٗد ۵۴۳/۱ حدیث رقم ۸۷۱ والنسائی إلی قوله "سبحان ربی الأعلی "۱۹۰/۲ حدیث رقم ۱۰۴۶ وکذلك ابن ماجة ۲۸۷/۱ حدیث ۸۸۸ ـ والدارمی ۳۴۱/۱ حدیث ۱۳۰۶ ـ أحمد ۳۸۲/۵ ـ

ترجمہ: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رکوع میں سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھتے تھے اور جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی آیت رحمت پر پہنچتے تھے تو وہاں رک جاتے اور دعا کرتے۔ اور جب کسی آیت عذاب پر پہنچتے تو وہاں رک کر عذاب سے پناہ مانگتے۔ (ترمذی۔ ابوداوٗد۔ دارمی) امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے اس روایت کو سبحان ربی الاعلیٰ تک نقل کیا ہے۔ اور امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔''

تشریح: وکان یقول: یعنی نبی علیہ السلام بعض اوقات یا نوافل میں۔

فی سجوده سبحان ربی الاعلی وما اتی علیٰ ایة رحمة الا وقف وسأل: یعنی رحمتِ الٰہی۔

وما اتی علی آیة عذاب الا وقف وتعوّذ: یعنی اللہ تعالیٰ کی پناہ اس کے عذاب سے، ہمارے اصحاب اور مالکیہ نے اس کو اس پر محمول کیا ہے کہ آپ علیہ السلام کی نماز نفل تھی اس لئے کہ یہ حضرات فرض نماز میں قراءت کے دوران تعوّذ اور سوال کرنے کو جائز نہیں کہتے، اور اس کو جواز پر حمل کرنا بھی ممکن ہے کیونکہ اس کے ساتھ بالاجماع نماز صحیح ہو جاتی ہے اور اس کا نادر الوقوع ہونا ہی اس پر دلالت کرتا ہے۔

رواہ الترمذی وابوداود والدارمی: یعنی مکمل حدیث۔

وقال الترمذی ھذا حدیث حسن صحیح) شیخ جزری کے بقول یہ حدیث حذیفہ مسلم، ترمذی، نسائی اور اسی طرح ابن ماجہ نے بھی روایت کی ہے۔ اور محیُ السنة کا اس حدیث کو حسان میں لانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حدیث صحیحین میں سے کسی میں بھی نہیں ہے خصوصاً ان کا اس کو صحیح کہنا جیسا کہ ان کی عادت ہے کہ صحیح اسی کو کہتے ہیں جو صحیحین میں سے کسی میں نہ ہو، لٰہذا مناسب یہ تھا کہ اس کو صحاح پر مقدم کرتے اس لئے کہ یہ صحیح مسلم میں ہے، میرکؒ نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

الفصل الثالث:

رکوع کی ایک دُعا

۸۸۲: وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قُمْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا رَكَعَ مَكَثَ قَدْرَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ وَيَقُوْلُ فِيْ رُكُوْعِهِ سُبْحَانَ ذِى الْجَبَرُوْتِ وَالْمَلَكُوْتِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْعَظَمَةِ۔

(رواہ النسائی)

النسائی ۲/۱۹۱ حدیث ۱۰۴۹ وأبوداوٗد ۱/۵٤٤ حدیث ۸۷۳۔

ترجمہ: ''حضرت عوف بن مالکؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب آپ ﷺ رکوع میں گئے تو سورۂ بقرہ کی قراءت کے برابر ٹھہرے اور یہ پڑھتے تھے: ''سُبْحَانَ ذِى الْجَبَرُوْتِ وَالْمَلَكُوْتِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْعَظَمَةِ'' پاک ہے قہر، بادشاہی اور بڑائی والا اللہ۔'' (نسائی)

تشریح: **قال قمت**: یعنی نماز کیلئے، اور بقول ابن حجرؒ یعنی نماز پڑھی، اور اس میں حاصل معنی ہونے کا احتمال ہے۔ یا انہوں نے مطلق قیام بول کر نماز مراد لی ہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے رکعت اور سجود کا نماز پر اطلاق کیا جاتا ہے یعنی جزء بول کر کل مراد لینا، اور اس کا رُکن ہونا شرط نہیں کیونکہ سبحة الضحی کا صلوٰۃ کے معنی میں ہونا وارد ہے۔

مکث ''ثاء'' کے ساتھ، اور متحرک بھی پڑھا جاتا ہے بمعنی ٹھہرنا جیسے نصر، کرم۔

ویقول فی رکوعه سبحان ذی الجبروت: **الجبر** سے، بروزن فعلوت بمعنی قہر وغلبہ۔ نہایہ میں اسی طرح ہے۔ بقول طیبیؒ حدیث میں ہے **ثم یکون ملك وجبروت** یعنی نافرمانی اور غلبہ۔

والملکوت: بروزن فعلوت الملک سے، یعنی بادشاہت ظاہری و باطنی۔

والکبریاء: ذات کے اعتبار سے۔

والعظمة: صفات کے اعتبار سے۔ (رواہ النسائی)

۸۸۳: وَعَنِ ابْنِ جُبَيْرٍ قَالَ سَمِعْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُوْلُ مَا صَلَّيْتُ وَرَاءَ اَحَدٍ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَشْبَهُ صَلَاةً بِصَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنْ هٰذَا الْفَتٰى يَعْنِىْ عُمَرَ ابْنَ عَبْدِالْعَزِيْزِ قَالَ قَالَ فَحَزَرْنَا رُكُوْعَهُ عَشْرَ تَسْبِيْحَاتٍ وَسُجُوْدَهُ عَشْرَ تَسْبِيْحَاتٍ۔ (رواہ ابوداود والنسائی)

أبوداوٗد فی السنن ۱/ ۵۵۱ حدیث ۸۸۸۔ وأخرجه النسائی ۲/ ۲۲٤ حدیث ۱۱۳۵۔

ترجمہ: ''حضرت ابن جبیرؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالکؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس نوجوان یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے علاوہ کسی کی اقتداء میں ایسی نماز نہیں پڑھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مشابہ ہو۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ نے فرمایا ہم نے ان کے رکوع کا دس تسبیحات کے بقدر اور سجدہ کا دس تسبیحات کے بقدر اندازہ لگایا۔'' (ابوداؤد۔ نسائی)

راویٔ حدیث:

ابن جبیر: جلیل القدر تابعی ہیں:

قال سمعت انس بن مالك يقول ما صليت وراء احد بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم اشبه صلاة بصلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم منهذا لفتى يعنى عمر بن عبد العزيز۔

بقول ابن حجرؒ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حضرت انس کا زمانہ پایا اور ان سے حدیث لی ہے اس لئے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ ٦١ھ میں پیدا ہوئے اور حضرت انسؓ کی وفات ۹۱ھ میں ہوئی۔

تشریح: قال: یعنی انسؓ۔

فحزرنا: ''زاء'' مفتوحہ کی تقدیم کے ساتھ، یعنی اندازہ لگایا۔

رکوعه: یعنی آپ علیہ السلام کے رکوع کا، یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے۔

۸۸۴: وَعَنْ شَقِيْقٍ قَالَ اِنَّ حُذَيْفَةَ رَاٰى رَجُلاً لَا يُتِمُّ رُكُوْعَهُ وَلَا سُجُوْدَهُ فَلَمَّا قَضٰى صَلَاتَهُ دَعَاهُ فَقَالَ لَهُ حُذَيْفَةُ مَا صَلَّيْتَ قَالَ وَاَحْسِبُهُ قَالَ وَلَوْمُتَّ مُتَّ عَلٰى غَيْرِ الْفِطْرَةِ الَّتِىْ فَطَرَ اللّٰهُ مُحَمَّدًا ﷺ۔ (البخاری)

أخرجه البخاری ۲/ ۲۷٤ حدیث ۷۹۱۔

ترجمہ: ''حضرت شقیقؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت حذیفہؓ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ نماز میں اپنے رکوع اور سجود کو پوری طرح ادا نہیں کر رہا تھا۔ جب وہ نماز پڑھ چکا تو اس کو بلایا اور فرمایا کہ تم نے پوری طرح نماز نہیں پڑھی۔ حضرت شقیقؒ فرماتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے اس آدمی سے یہ بھی کہا کہ اگر تم مرجاؤ تو تم غیر فطرت پر مرو گے۔ یعنی فطرت اسلام کے علاوہ جس پر کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا ہے۔'' (بخاری)

تشریح: **وعن شقیق:** یعنی ابن سلمہ تابعی ابو وائل کوفی مخضرم ہیں، خلفاء راشدین اور حضرت حذیفہ وغیرہ سے روایت کی، اس کے ثقہ ہونے اور بزرگی پر سب کا اتفاق ہے تہذیب میں اسی طرح ہے۔

قال ان حذیفة رای رجلا لایتم رکوعه ولاسجوده: کسی واجب کے ترک کی وجہ سے۔

فلما قضی صلاته دعاه فقال له حذیفة ما صلیت: یعنی صحیح یا کامل نماز یا "مَا" نافیہ ہے۔

قال: یعنی شقیق نے۔

واحسبه: یعنی گمان کرتا ہوں۔

قال: یعنی حذیفہؓ نے۔

ولومت: ضمہ اور کسرہ کے ساتھ، یعنی اس پر۔

مت علی غیر الفطرة: یعنی طریقہ یا سنت یا ملت۔

التی فطر الله: یعنی جس پر پیدا کیا۔

محمدًا ﷺ یعنی نماز چھوڑنے کی وجہ سے، اور نماز جان کر چھوڑنا مطلق کفر ہے۔ بہت سے صحابہ وتابعین اوران کے بعد والے علماءؒ کے نزدیک جیسے احمد واسحاق، اور اکثر کے نزدیک ترک نماز کو حلال سمجھنے کی شرط کے ساتھ مقید ہے، لہٰذا اس بناء پر **الفطرة** کامل دین اسلام کے معنی میں ہے۔ بقولِ طیبیؒ یہ حدیث رکوع وسجود میں طمانینت کے وجوب پر دالّ ہے، اس لئے کہ حضرت انسؓ کا فرمان: **ولومت مت علی غیر الفطرة** بہت بری دھمکی ہے، یعنی جس ملت حنیفیہ دین اسلام پر تو پیدا ہوا تو نے اس کو بدل دیا اور اللہ کے دین کو بدلنے والوں کے زمرہ میں داخل ہو گیا۔ پھر اگر سوال کیا جائے کہ ان کا فرمان: **لا یتم** اس پر کیسے دلالت کرتا ہے ان کامل اداء ہونا طمانینت پر موقوف نہیں ہے؟ جواب یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کا فرمان پہلے گذر چکا، فرمایا جس نے رکوع میں تین مرتبہ **سبحان ربی العظیم** کہا تو اس کا رکوع مکمل ہو گیا اور یہ ادنیٰ درجہ ہے۔

اور اس جواب میں نظر ظاہر ہے اس لئے کہ پہلی حدیث سے ثابت ہوا کہ "واوٗ" کمال کا ادنیٰ درجہ ہے نہ کہ تسبیح کا، اور یہ ہے بھی صحابی کا قول جس میں اجتہاد کا احتمال بھی ہے جب کہ اس کی سند صحیح ہو، اور ابن حجرؒ نے بڑی بعید بات کہی جب کہ انہوں نے فرمایا کہ حدیث جس بات پر دلالت کرتی ہے تجھے وہ کہنے کا حق ہے اگر چہ یہ فرض کیا جائے کہ یہ قول حذیفہ کا ہے اس لئے کہ وہ اس جیسی دھمکی بغیر سنے (حضور ﷺ سے) بیان نہیں کر سکتے اسی وجہ سے میں نے بعض فتاویٰ میں اس حدیث کے بارے میں صحت کا کہا ہے جس میں ہے کہ جو شخص بغیر حج کیے مر گیا تو یہودی ہو کر مرے چاہے نصرانی ہو کر۔ اگر چہ نوویؒ نے اس کو ضعیف کہا ہے اس لئے کہ یہ حضرت عمرؓ سے صحیح سند سے ثابت ہے اور یہ بات اپنی رائے سے نہیں کہی جا سکتی لہٰذا مرفوع کے حکم میں ہو گئی لہٰذا اس کا حضرت عمرؓ سے صحیح طرق سے ثابت ہونا نبی علیہ السلام سے صحیح طرق سے ثابت ہونے کو مستلزم ہے کہ اس شخص نے رکوع سجود کا واجب ترک کیا البتہ خاص طور پر ترکِ طمانینت پر حدیث میں کوئی دلالت نہیں ہے۔

اور قول ابن حجرؒ کے بعد کی وجہ یہ ہے کہ حدیث پر صحت اور ضعف کا حکم اسناد کی وجہ سے لگتا ہے (جیسا کہ محدثین کے نزدیک طے شدہ ہے) نہ معنی کے اعتبار سے، اسی وجہ سے بعض ایسی حدیثوں پر موضوع باطل اور بے اصل ہونے کا حکم لگتا ہے جو قرآن

کے مطابق ہوتی ہیں باوجود یہ کہ نفس الامر میں صحیح حدیث کے موضوع اور موضوع کے صحیح ہونے کا احتمال ہوتا ہے، واللہ اعلم۔
مالکی کہتے ہیں کہ لو مت مت جملہ اس بات پر شاہد ہے کہ جزاء لفظ میں شرط کے موافق ہوتی ہے نہ کہ معنی میں اس لئے کہ اس کا مابعد اس سے متعلق ہوتا ہے۔اور یہ حدیث ان جگہوں میں سے ہے جن میں فضیلت کے در پے ہوا جاتا ہے کیونکہ فائدہ اسی پر موقوف ہوا اور قول باری تعالیٰ انہی مواضع میں سے ہے:﴿اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ﴾ [الاسراء: ۷] ''اگر تم نیکو کاری کرو گے تو اپنی جانوں کے لئے کرو گے''پس اگر علی غیر الفطرۃ اور لا لفکم والا قول نہ ہوتا تو کلام کا کوئی فائدہ نہ تھا۔
(رواہ البخاری)

نماز میں چوری

۸۸۵:وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَسْوَأُ النَّاسِ سَرِقَةً الَّذِیْ يَسْرِقُ مِنْ صَلَاتِهٖ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ يَسْرِقُ مِنْ صَلَاتِهٖ قَالَ لَا يُتِمُّ رُكُوْعَهَا وَلَا سُجُوْدَهَا۔

(رواہ احمد)

أحمد فی المسند ۵/ ۳۱۰ والدارمی ۱/ ۳۵۰ حدیث رقم ۱۳۲۸۔

ترجمہ:''حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا چوری کرنے کے لحاظ سے سب سے بڑا چور وہ ہے جو اپنی نماز کی چوری کرے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا اے اللہ کے رسولؐ! نماز کی چوری کیسے ہوتی ہے؟ فرمایا رکوع اور سجدہ کو پورا نہ کرنا۔''(بخاری)

تشریح: وعن قتادة قال:قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اسوأ الناس:یعنی سب سے بُرا۔
سرقة: ''راء'' کے کسرہ کے ساتھ،اور فتحہ بھی پڑھا جاتا ہے،قاموس کے مطابق۔اور سرقة مصدر ہے،بقول طیبیؒ تمیز ہے۔راغب کہتے ہیں کہ سرقہ کسی کی چیز چپکے سے لینے کو کہتے ہیں اور شرع میں اس کی تعریف یہ ہوگئی کسی چیز کا مخصوص جگہ اور مخصوص مقدار میں لینا۔

الذی یسرق من صلاته:''اسوء'' کی خبر ہے اور ابن حجرؒ نے عجیب وغریب بات کی،فرماتے ہیں اسوء مبتدا اور الّذی اس کی خبر اور مضاف محذوف ہے یعنی ''سرقته''(اھ) اور غرابت کی وجہ یہ ہے کہ مقدر عبارت نکالے بغیر حمل صحیح ہے اور تقدیری عبارت نکالنے سے حمل نہیں رہتا،ہاں یہ حذف آئندہ حدیث میں مذکور ہے جو عنقریب آئے گی۔

قالو یا رسول الله! وکیف یسرق من صلاته؟ قال لا یتم رکوعها ولا سجودها: بقولِ بعض جنسِ سرقہ کی دو قسمیں ہیں متعارف،غیر متعارف۔آپ علیہ السلام نے غیر متعارف کو بری چوری فرمایا اس لئے کہ کسی کا مال لینے سے بعض مرتبہ دنیا میں نفع مل جاتا ہے اور چوری کرنے والا مالک سے اجازت لے لیتا ہے یا اس کا ہاتھ کٹ جاتا ہے اور آخرت کے عذاب سے محفوظ ہو جاتا ہے بخلاف غیر متعارف کے کیونکہ یہ چور اپنے ہی حق یعنی ثواب میں چوری کرتا ہے اور اس کے بدلے عذاب لیتا ہے اور اس کے ہاتھ سوائے نقصان کے کچھ نہیں آتا۔(رواہ احمد)

بقول میرکؒ طبرانی ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے بھی روایت کیا اور اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

نماز کا چور برا ہے

۸۸۶: وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ مُرَّةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَا تَرَوْنَ فِی الشَّارِبِ وَالزَّانِیْ وَالسَّارِقِ وَذٰلِكَ قَبْلَ اَنْ تَنْزِلَ فِیْهِمُ الْحُدُوْدُ قَالُوْا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ هُنَّ فَوَاحِشُ وَفِیْهِنَّ عُقُوْبَةٌ وَاَسْوَءُ السَّرِقَةِ الَّذِیْ یَسْرِقُ مِنْ صَلَاتِهٖ قَالُوْا وَکَیْفَ یَسْرِقُ مِنْ صَلَاتِهٖ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَا یُتِمُّ رُکُوْعَهَا وَلَا سُجُوْدَهَا ۔ (رواه مَالِكٌ واحمد وروى دارمي نحوه)

مالك في الموطأ ١/١٦٧ حديث ٧٢ من كتاب قصر الصلاة في السفر۔

ترجمہ: ''حضرت نعمان بن مرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فرمایا کہ تم لوگوں کا کیا خیال ہے شراب پینے والے، زنا کرنے والے اور چوری کرنے والے کے بارے میں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سوال حدود کے نازل ہونے سے پہلے کیا تھا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ سب کبیرہ گناہ ہیں اور ان میں سزا بھی ہے اور اس سے بری چوری وہ ہے جو انسان اپنی نماز میں کرتا ہے صحابہ کرام نے عرض کیا اے اللہ کے رسول۔ نماز میں چوری کیسے ہو سکتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا نماز کی چوری سے مراد یہ ہے کہ جو آدمی نماز میں رکوع اور سجدہ صحیح مکمل ادا نہ کرے۔'' (مالک۔ احمد۔ دارمی)

راویٔ حدیث:

نعمان بن مرہ۔ رومی، انصاری ومدنی ہیں۔ تابعین میں سے ہیں۔ فی الجملہ صحابہ میں شمار کئے جاتے ہیں ''الاکمال'' میں مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا اسم گرامی ذکر نہیں کیا۔

تشریح: **ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ما ترون**: یعنی اعتقاد رکھتے ہو۔

في الشارب: یعنی شراب وغیرہ۔

والزاني والسارق؟ وذلك: یعنی یہ سوال۔

قبل ان تنزل: صیغہ مجہول کے ساتھ، اور بقولِ بعض معروف ہے۔

فيهم الحدود: یعنی آیاتِ حدود۔

قالوا الله ورسوله اعلم قال هن فواحش: یعنی کبائر۔

وفيهن عقوبة: یعنی اُخروی، یا عنقریب نازل ہوگی، یا تنوین تعظیم کے لیے ہے۔

واسوأ السرقة: ''راء'' کے کسرہ کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں فتحہ ہے۔

الذي يسرق من صلواته: جمع کے صیغہ کے ساتھ، اور ایک صحیح نسخہ میں من صلاته مفرد ہے، بقول طیبیؒ اسوء السرقة مبتداء اور الذي يسرق اس کی خبر ہے اور مضاف محذوف ہے یعنی سرقة الذي يسرق۔ اور ''راء'' کے فتحہ کے

ساتھ بھی جائز ہے اس صورت میں سارق کی جمع ہوگی جیسے فاجر کی جمع فجرة، اور اس کی تائید حدیثِ ابی ہریرہ سے بھی ہوتی ہے جس میں اسوء الناس کے الفاظ ہیں، جان لے کہ شیخ نورالدین ایجی کے نسخہ اور بہت سے نسخوں میں یہ بات تصحیح شدہ ہے کہ "السرقه" یہاں بھی "راء" کے کسرہ کے ساتھ ہے، لیکن طیبیؒ کی یہ تقریر فتحہ کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ صرف فتحہ کے ساتھ جمع ہے اور مصدر کسرہ کے ساتھ ہے اور کبھی فتح بھی پڑھا جاتا ہے۔

قالوا کیف یسرق صلواته؟ اور ایک نسخہ میں "صلاۃ" مفرد ہے۔

یا رسول اللہ؟ قال لا یتم رکوعها ولاسجودها۔ (رواہ مالك وأحمد)

صحیح نسخہ کے مطابق "وروی الدارمی نحوه" یعنی اس کے معنی نہ کہ لفظ۔

بَابُ السُّجُوْدِ وَفَضْلِهٖ

سجدہ اور اس کی فضیلت کا بیان

یعنی اس کی کیفیت "وفضله" یعنی اس کے بارے میں جو فضائل وارد ہوئے ہیں اس لئے کہ سجدہ مستقل عبادت ہے بخلافِ رکوع کے۔

سجدہ نماز کے ارکان میں ایک اہم رکن ہے۔ سجدہ کے لغوی معنی ہیں زمین پر جھکنا اور عاجزی کا اظہار کرنا اور اصطلاح میں سجدہ کی تعریف ہے: وضع الوجه علی الارض علی طریق مخصوص "کہ خاص طریقہ سے اپنے چہرہ کو زمین پر رکھنا" اور نماز کی چار حالتیں ہیں: ① قیام، ② قعود، ③ رکوع اور ④ سجدہ۔ ان میں سے پہلی دو عادت اور عبادت کے درمیان مشترک ہیں اور دوسری دو عبادت کے ساتھ خاص ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر اللہ کے سامنے رکوع اور سجدہ بالکل جائز نہیں ہے۔

الفصل الاول:

سجدہ کے اعضاء سات ہیں

۸۸۷: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُمِرْتُ اَنْ اَسْجُدَ عَلٰى سَبْعَةِ اَعْظُمٍ عَلَى الْجَبْهَةِ وَالْيَدَيْنِ وَالرُّكْبَتَيْنِ وَاَطْرَافِ الْقَدَمَيْنِ وَلَانَكْفُتَ الثِّيَابَ وَلَا الشَّعْرَ۔ (متفق علیه)

البخاري في الصحيح ۲/۲۹۷ حديث ۸۱۲۔ ومسلم ۱/۳۵۴ حديث (۲۳۰۔۴۹۰)۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات ہڈیوں پر سجدہ کروں۔ پیشانی، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے، دونوں پاؤں کے کنارے اور مجھے منع کیا گیا کہ کپڑوں اور بالوں کے سمیٹنے سے۔" (بخاری)

تشریح: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم امرت ان اسجد على سبعة اعظم: عظم کی جمع ہے یعنی مجھے سجدہ میں ان سات اعضاء کے رکھنے کا حکم ہے۔

علی الجبهة: بدل ہے حرفِ جر کے اعادہ کے ساتھ، اور ناک پیشانی کے تابع ہے، بقول ابن حجرؒ سر کے اگلے حصہ کے دو کناروں کے درمیان کو "الجبهة" کہتے ہیں اور اس کو مقدم اس کے شرف کی وجہ سے اور اس وجہ سے کیا کہ سجدہ، جو عاجزی کی انتہاء ہے، کا مقصود اس سے حاصل ہوتا ہے۔

و الیدین: یعنی ہتھیلیاں، بقولِ ابن حجرؒ یعنی اندرونی حصہ کیونکہ بیہقی کی خبر میں ہے کہ رسول علیہ السلام سجدہ فرماتے وقت انگلیوں کو ملا لیتے۔

و الرکبتین و اطراف القدمین: جان لے کہ حنفیہ کے مذہب میں اگر پیشانی زمین پر ہو اور ناک نہ رکھی تو بالاتفاق جائز ہے اور بلا عذر مکروہ ہے اور اگر صرف ناک رکھی تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہی حکم ہے اور صاحبین کے نزدیک صرف ناک پر سجدہ جائز نہیں مگر یہ کہ پیشانی پر کوئی عذر ہو، شرح منیہ میں اسی طرح ہے اور دونوں قدموں کا کنارہ لگانا ضروری ہے البتہ ہاتھ اور گھٹنوں کا رکھنا سجدہ میں سنت ہے، بقول ابن حجرؒ ہمارے ائمہ نے ان سات پر اقتصار سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ ناک رکھنا واجب نہیں اور فقہاء نے ان احادیث سے اس کو جواب دیا ہے جو ناک رکھنے کے وجوب میں ظاہر ہیں اور مجتہدین کی ایک جماعت اس کی قائل ہے: ① ایک خبر یہ ہے کہ فرمایا مجھے سات اعضاء پر سجدہ کا حکم ہے پیشانی، ناک، دونوں ہاتھ...... دوسری خبر صحیح یہ ہے کہ نبی علیہ السلام سجدہ میں پیشانی اور ناک زمین پر ٹیک دیتے تھے، اسی طرح صحیحین کی روایت کہ مجھے سات اعجاء پر سجدہ کا حکم ہے پیشانی، اور ناک کی طرف اشارہ فرمایا اور دنوں ہاتھ...... ان دونوں کو ندب پر حمل کرتے ہوئے اور اس میں نظر ہے اس لئے کہ اس زیادہ کا لینا ضروری ہے، ہاں یہ خبر کہ جس شخص کی ناک کا کچھ حصہ زمین پر نہ لگے اس کی نماز نہیں ہوتی، مرسل ہے اور اس کا مرفوع ہونا ثابت نہیں ہے، اور مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے اور بحکم مرفوع کے ہے اس لئے کہ اس جیسی بات رائے سے نہیں کہی جا سکتی۔

و لا نکفت: "فاء" کے کسرہ کے ساتھ، اور بقولِ ابن الملکؒ نصب کے ساتھ، یعنی ہمیں کپڑے سمیٹنے سے منع کیا گیا ہے۔

الثیاب: مٹی سے بچانے کے لیے۔

و لا الشعر: "عین" کے فتحہ اور سکون کے ساتھ، اور "لا" زائد تاکید کے لیے ہے اور اکثر نسخوں میں نہیں ہے اور بقول بعض تقدیری عبارت یہ ہے: **وامرت ان لا نکفتهما بل نترکهما حتی یتعا علی الارض یسجد بجمیع الاعضاء و الثیاب** یعنی ہمیں ان کے بچانے کا نہیں بلکہ چھوڑنے کا حکم ہے تا کہ وہ بھی زمین پر تمام اعضاء کے ساتھ سجدہ کریں اور یہی اظہر ہے بقولِ طیبیؒ اسی حدیث کی بناء پر فقہاءؒ نے بالوں کی چوٹی اور جوڑا باندھنے اور سجدہ کے وقت کپڑوں کے اٹھانے کو مکروہ کہا ہے۔

بقولِ ابن حجرؒ بالاتفاق مکروہ تنزیہی ہے۔ نماز میں کپڑوں اور بالوں کو سمیٹنا اگر چہ عمداً ایسا نہ کرے مثلاً نماز سے پہلے ایسا کیا اور اسی حالت میں نماز پڑھ لی، بخلاف مالکؒ ~~کے اور~~ سمیٹنے میں یہ صورتیں بھی داخل ہیں، بالوں کی چوٹی بنانا، یا عمامہ کے نیچے

دبانا، کپڑے سمیٹنا یا درمیان سے باندھ لینا یا شملہ کا سینا، اوراس سے منع کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ان کے سمیت سجدہ نہیں ہوسکتا، اسی طرح فقہاء نے اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ ایسا کرنا خشوع کے منافی ہے جب کہ نماز میں روک ٹوک کرے اور هئية خاشع کے منافی ہے، جب کہ اس کو اس کی حالت پر چھوڑ دے۔

بقولِ قاضی لفظ امرت عرفًا دلالت کرتا ہے کہ حکم دینے والے اللہ تعالیٰ ہی ہیں اور یہ سجدہ میں ان اعضاء کو زمین پر رکھنے کے وجوب کو مقتضی ہے اور علماء کے اس بارے میں کئی اقوال ہیں چنانچہ امام شافعیؒ اور احمدؒ کا ایک قول یہ ہے ظاہر حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام اعضاء کا رکھنا واجب ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ صرف پیشانی رکھنا واجب ہے اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے قصہ رفاعہ میں صرف اس پر اکتفاء کیا فرمایا پیشانی زمین پر جما کر رکھ، اور باقی چھ اعضاء کا رکھنا سنت ہے اور مندوب اور واجب کے درمیان موافقت کیلئے امر کو ان دونوں کے درمیان اشتراک پر محمول کیا جائے گا، اور اس لئے کہ "اسجد" کا معطوف علیہ لانکفت: واجب نہیں بالاتفاق، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ بال اور کپڑے لٹکے چھوڑ دے اور ان کو اپنے ساتھ نہ سمیٹے مٹی سے بچانے کے لیے اور "کفت" سمیٹنے کو کہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اظہر یہ ہے کہ امر استحباب ہے اور جو کسی دوسری سے معلوم ہو اس کے وجوب کیلئے ہے، پھر فرمایا کہ عند ابی حنفیہؒ ناک اور پیشانی میں سے ایک رکھنا واجب ہے اس لے کہ اس پر سجدہ کا نام بولا جاتا ہے اور اس لئے کہ ناک کی ہڈی پیشانی کی ہڈی سے متصل اور جڑی ہوئی ہے لہٰذا ناک رکھنا پیشانی رکھنے کی طرح ہے، اور مالکؒ اور اوزاعیؒ اور ثوریؒ کے نزدیک ان دونوں کا ایک ساتھ رکھنا واجب ہے اس لئے کہ مروی ہے کہ نبی علیہ السلام نے ایک آدمی کو دیکھا جس کی ناک بالکل زمین پر نہ لگتی تھی تو ارشاد فرمایا جس کی ناک زمین پر پیشانی کے ساتھ نہ لگے اس کی نماز نہیں۔ (متفق علیہ)

بقولِ میرکؒ احمدؒ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

سجدہ میں اعتدال کا حکم

۸۸۸: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِعْتَدِلُوْا فِي السُّجُوْدِ وَلَا يَبْسُطْ اَحَدُكُمْ ذِرَاعَيْهِ اِنْبِسَاطَ الْكَلْبِ ۔ (متفق علیه)

أخرجه مسلم ۳۵٦/۱ حديث (۲۳٤-٤۹۳) وأحمد في المسند ٢٨٣/٤۔

ترجمہ: "حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سجدہ میں اعتدال اختیار کرو اور تم میں سے کوئی آدمی سجدہ میں اپنے دونوں بازوؤں کو کتے کی طرح نہ پھیلائے۔" (بخاری، مسلم)

تشریح: وعن انس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اعتدلوا في السجود: بقولِ مظہر سجدہ میں اعتدال یہ ہے کہ سجدہ میں برابر رہے اور ہتھیلی زمین پر رکھے، کہنیاں زمین سے اونچی رکھے اور پیٹ کو رانوں سے دور رکھے۔ طیبیؒ نے اس کو ذکر کیا، اور یہ مخفی نہیں کہ اس کا قول "ويضع كفه" اعتدال کی تفسیر نہیں بلکہ عدم "انبساط" کی تفسیر ہے، آپ علیہ السلام کے فرمان (ولا يبسط) میں، اور یہ "نہی" ہے، اور بقولِ بعض "نفی" ہے یعنی نماز میں نہ بچھائے۔

احدکم ذراعیه انبساط الکلب: یعنی کتے کی طرح، اور عفیف کے نسخہ میں ابتساط بے افتعال سے، بقول تورپشتی عسقلانی لا ینبط کے بارے میں کہتے ہیں کہ اکثر کے نزدیک اسی طرح ہے یعنی ''با'' سے قبل نون ساکن ہے۔ اور حموی کے نزدیک یبتط یعنی با ء کے بعد تاء ہے، اور ابن عساکر کی روایت میں صرف باء ساکن کے ساتھ ہے اور اسی پر صاحب العمدہ نے اقتصار کیا ہے اور لفظ انبساط پہلے کے ساتھ اور تیسرے جملہ میں نون کے ساتھ اور دوسرے میں تاء کے ساتھ اور یہی ظاہر ہے اسی طرح تیسرے میں بھی، تقدیری عبارت یہ ہے: ولاینبط ذراعیه فیبتط انبساط الکلب۔

اور بقول ابن دقیق العید یہ حکم کا ذکر ہے جو علت کے ساتھ مقرون ہے اس لئے کہ نماز کے بارے میں گھٹیا چیزوں کے ساتھ تشبیہ کا ترک کرنا مناسب ہے۔ سیوطی نے اس کو ذکر کیا۔ بقول ابن حجرؒ ایسا کرنا مکروہ ہے کیونکہ یہ قبیح ہئیت ہے جو خشوع کے منافی ہے ہاں جس پر سجدہ طویل ہونے کی وجہ سے جس کیلئے ہاتھوں پر سہارا شاق ہو، تو اس کے لئے بازو گھٹنوں پر رکھنے کی اجازت ہے اسلئے کہ خبر میں ہے کہ صحابہؓ نے سجدہ کی مشقت کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا گھٹنوں سے مدد لے سکتے ہو، اس کو ایک جماعت نے موصولاً روایت کیا اور مرسلاً بھی مروی ہے اور یہی اصح ہے جیسا کہ بخاری وترمذی نے کہا ہے۔ (متفق علیہ) بقول میرکؒ ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

سجدہ میں کہنیوں کو زمین سے اُٹھا کر رکھنا

۸۸۹: وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا سَجَدْتَ فَضَعْ كَفَّيْكَ وَارْفَعْ مِرْفَقَيْكَ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم ۱/۳۵۶ حديث (۲۳۴ـ۴۹۳) وأحمد في المسند ٤: ۲۸۳ـ

ترجمہ: ''حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم سجدہ (کا ارادہ) کرو تو اپنے دونوں ہاتھوں کو (زمین پر) رکھو اور کہنیوں کو (زمین یا اپنے پہلوؤں) سے اٹھا کر رکھو۔'' (مسلم)

تشریح: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا سجدت یعنی سجدہ کے ارادہ کرے۔

فضع: یعنی زمین پر۔

کفیك: یعنی انگلیاں ملا کر اور ہتھیلی کھول کر کانوں کے برابر، اور بقول بعض کے کندھوں کے برابر (حسب روایات) ان پر سہارا لے کر جیسا کہ نبی علیہ السلام کیا کرتے تھے اور ان کا کھولنا واجب نہیں ہے کیونکہ ابن ماجہ میں ہے کہ آپ علیہ السلام نے مسجد بنی اشہل میں نماز پڑھی آپ ﷺ نے چادر لپیٹ رکھی تھی اور گرمی کی تپش سے بچنے کیلئے آپ علیہ السلام اس پر ہاتھ رکھتے تھے، ہاں چھپانا مکروہ ضرور ہے۔

مرفقیك: ''میم'' اور ''فاء'' کے فتحہ کے ساتھ، اور اس کے برعکس۔

سجدہ میں بازوؤں کو پہلوؤں سے جدا رکھنا

۸۹۰: وَعَنْ مَيْمُوْنَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا سَجَدَ جَافٰى بَيْنَ يَدَيْهِ حَتّٰى لَوْ أَنَّ بَهْمَةً أَرَادَتْ أَنْ

تَمُرَّ تَحْتَ يَدَيْهِ مَرَّتْ هٰذَا لَفْظُ اَبِيْ دَاوٗدَ كَمَا صَرَّحَ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ بِاِسْنَادِهٖ وَ لِمُسْلِمٍ بِمَعْنَاهُ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا سَجَدَ لَوْ شَاءَ تْ بَهْمَةٌ اَنْ تَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ لَمَرَّتْ ۔

أخرجه مسلم فی صحيحه ۱/۳۵۷حديث رقم (۲۳۷۔۴۹۶)۔أخرجه أبوداؤد ۱/۵۵٤حديث ۸۹۸۔وأخرجه النسائی ۲/۲۱۳حديث ۱۱۰۹۔وابن ماجة ۱/۲۸۵حديث ۸۸۰۔وأخرجه الدارمی ۱/۳۵۱حديث رقم ۱۳۳۱۔وأحمد ٦/۳۳۱۔

ترجمہ:''حضرت میمونہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ میں جاتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان اتنا فرق رکھتے تھے کہ اگر بکری کا بچہ ہاتھوں کے نیچے سے گزرنا چاہتا تو گزر سکتا۔(ابوداؤد) علامہ بغوی نے اپنی سند کے ساتھ اس کی تصریح کر دی ہے اور امام مسلمؒ نے اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے (اور اس کے الفاظ اس طرح ہیں) کہ حضرت میمونہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح سجدہ کرتے تھے کہ اگر بکری کا بچہ آپ ﷺ کے ہاتھوں کے درمیان سے گزرنا چاہتا تو گزر سکتا۔''

تشریح: **وعن ميمونة**: اُم المؤمنین۔

قالت كان النبي صلى الله عليه وسلم اذا سجد جافي: یعنی دور اور الگ رکھتے۔

بين يديه: یعنی اس کے مقابل جسم سے۔

حتى لو ان بهمة: ''باء'' کے فتحہ اور ''یاء'' ساکن کے ساتھ، بکری کے بچہ سے بڑا بھیڑ کا بچہ، بقول ابن الملکؒ اور قاموس میں ہے کہ ''**بهمة**'' بھیڑ، بکری دونوں کے بچہ کو کہا۔

ارادت ان تمر تحت يديه: اور ایک نسخہ میں **بين يديه** ہے۔

بقول طیبیؒ **البهمة** فتح کے ساتھ، بھیڑ کا بچہ مذکر ہو یا مؤنث، بقول اشرف حدیث میں **البهمه** مؤنث ہے کیونکہ **ارادت** مؤنث کا صیغہ ہے، جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ نے ''**نملة سليمان**'' کے متعلق فرمایا۔

اور بقول ابن الملکؒ جائز ہے کہ **بهمه** مؤنث ہو تانیثِ لفظی کی وجہ سے اور معتبر امام صاحب کا ذکر کیا گیا قول ہے اور شرح طیبیؒ میں اس کی نظیر بھی ہے جو صاحب کشاف نے امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں ذکر کی ہے کہ امام صاحب نے فرمایا سلیمان کے واقعہ میں چیونٹی مؤنث تھی ''**قالت**'' کی وجہ سے، اور کسی علامت کے ذریعہ ان میں فرق ضروری ہے جیسا کہ نحویوں کا قول ہے **حمامة ذكر وحمامة انثى**، اور ابن حاجب کا یہ کہہ کر اس پر ردّ کرنا، کہ ممکن ہے کہ تانیث' تانیث لفظی کی وجہ سے ہو جیسے آپ یوں کہیں: **جاء ت الظلمة**، کچھ حیثیت نہیں رکھتا اس لئے کہ یہاں فرق کرنے کی ضرورت ہی نہیں بخلاف ہمارے زیر بحث لفظ کے، اور اس کی تائید ابن السکیت کے قول سے بھی ہوتی ہے انہوں نے کہا: **هذا بطة وهذا حمامة** مذکر ہے اور **هذا شاه** مذکر ہے جب کہ مینڈا مراد ہو اور ''**هذا بقرة**'' بھی جب کہ بیل مراد ہو اور جب مؤنث مراد ہو تو **هذه بقرة** کہا جائے گا، پس قول امام صاحب کا ہی صحیح ہوا، ہاں اگر **قالت طلحة** کہنا جائز کہتے تو ردّ کی وجہ بنتی تھی اور بہتر ایسا نہ کہنا ہے لہٰذا امام صاحب کا ذکر کردہ قول ہی معتبر ہوا۔ جیسا کہ شاعر کہتا ہے۔

اذا قالت حذام فصدقوها ☆ فان القول ما قالت حذام

''جب حزام کوئی بات کرے تو اس کی تصدیق کرو اس لئے کہ اصل بات وہی جو حزام نے کہی''۔

هذا: یعنی یہ حدیث یا لفظ۔

کما صرّح: اور ایک نسخہ میں کما صرحہ ہے یعنی بغوی نے۔

فی شرح السنة باسناده "ولمسلم": یعنی اس حدیث کا لفظ مسلم کا ہے۔

لمعناه: یعنی لفظ حدیث ابی داؤد کے معنی، اور وہ یہ ہے۔

کان النبی صلّی الله علیه وسلم اذا سجد لو شاء ت بهمة ان تمر بین یدیه لمرت: لہٰذا صاحب مصابیح پر اعتراض کسی درجہ میں واقع ہوتا ہے۔

سجدہ میں بغلوں کو کشادہ رکھا جائے

۸۹۱: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَالِكِ ابْنِ بُحَيْنَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَجَدَ فَرَّجَ بَيْنَ يَدَيْهِ حَتّٰى يَبْدُوَ بَيَاضُ اِبْطَيْهِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری ۱/۴۹۶ حدیث ۳۹۰ وأخرجه مسلم ۱/۳۵٦ حدیث (۲۳۵-۴۹۵) والنسائی فی السنن ۲/۲۱۲ حدیث رقم ۱۱۰٦۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مالک بن بحینہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تھے تو اپنے ہاتھوں کو اتنا کشادہ رکھتے تھے کہ بغلوں کی سفیدی ظاہر ہو جاتی تھی۔'' (بخاری، مسلم)

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن مالک بن بحینہ۔ پورا نام ''عبداللہ بن مالک بن القشب الازدی'' ہے۔ ان کی والدہ ''بحینہ'' ہیں۔ ان کے نانا کا نام ''حارث بن عبدالمطلب'' ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ حکومت میں ۵۴ھ یا ۵۸ھ میں انتقال کیا۔

تشریح: ''قشب'' میں قاف مکسور شین منقوطہ ساکن اور باء موحدہ ہے۔

وعن عبد الله بن مالك: تنوین کے ساتھ۔

ابن بحینة: ''باء'' کے ضمہ اور ''حاء'' کے فتحہ کے ساتھ، اس کے بعد ''یاء'' ساکنہ پھر نون اور تاء تانیث ہے، مالک کی بیوی کا نام ہے اور وہ اُم عبداللہ ہیں۔ بقول نوویؒ درست یہ ہے کہ مالک کو تنوین دی جائے اور لفظ ابن ''الف'' کے ساتھ لکھا جائے اس لئے کہ ابن بحینہ مالک کی صفت نہیں بلکہ عبداللہ کا صلہ ہے کیونکہ ان کے والد کا نام مالک ہے اور والدہ کا نام بحینہ جو کہ مالک کی بیوی ہے، اس کو طیبیؒ نے ذکر کیا۔

قال کان النبی صلی الله علیه وسلم اذا سجد فرج: دور رکھتے۔

بین یدیه حتی یبدو: یعنی ظاہر ہو جاتی۔

بیاض ابطیه: بقول المغرب ''باء'' کے سکون کے ساتھ، اور قاموس میں ہے کہ ''باء'' مکسور بھی ہو سکتی ہے، بقول ابن حجر شوافع میں سے طبرانی وغیرہ نے اس حدیث سے اور حضرت انسؓ کی متفق علیہ حدیث سے بھی اس پر استدلال کیا ہے کہ آپ علیہ السلام کی بغل مبارک کی سفیدی حقیقت میں آپ علیہ السلام کی خصوصیت ہے اور حدیث انسؓ یہ ہے کہ آپ علیہ السلام دُعاءِ استسقاء میں ہاتھ اس قدر بلند فرماتے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی ظاہر ہونے لگتی، بقول قرطبی آپ کی بغلوں میں بال نہ تھے، اور اس پر حافظ عراقی نے شرحِ تقریب الاسناد میں عدمِ ثبوت کا اعتراض کیا ہے بلکہ کسی معتبر کتاب میں موجود ہی نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ خصوصیات احتمال سے ثابت نہیں ہو سکتیں۔

اور حضرت انسؓ وغیرہ کے بغلوں کے ذکر کرنے سے ان میں بال نہ ہونا لازم نہیں آتا اس لئے کہ جب بال مونڈ دیئے جائیں تو جگہ سفید رہ جاتی ہے، اگرچہ بالوں کے نشانات بھی ہو، اسی وجہ سے حدیث میں جس کی ایک جماعت نے تخریج کی ہے اور ترمذی اسے حسن کہتے ہیں، کہ جب نبی علیہ السلام سجدہ فرماتے تو میں آپ کی بغلوں کی رنگت دیکھ لیتا تھا۔ ''عفرۃ'' مٹی مائل سفیدی کو کہتے ہیں اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بالوں کے نشانات جن کو محل بیاض بنایا گیا ہے، خاکستری رنگ کے تھے، اس لئے کہ اگر بغل مبارک بالکل بالوں سے صاف ہوتی تو اس کی رنگت ایسی نہ ہوتی، ہاں ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ نبی علیہ السلام کی بغلوں سے بدبو نہ آتی تھی بلکہ صاف شفاف اور خوشبودار تھیں جیسا کہ صحیح میں مذکور ہے اور بالوں کے ہوتے ہوئے بدبو کا نہ ہونا کرامت میں زیادہ بلیغ ہے جیسا کہ مخفی نہیں۔ (متفق علیہ)

بقول میرکؒ نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

سجدہ کی ایک دُعا

۸۹۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِیْ سُجُوْدِهٖ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ كُلَّهٗ دِقَّهٗ وَجِلَّهٗ وَاَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ وَعَلَانِیَتَهٗ وَسِرَّهٗ ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في الصحيح ۱/ ۳۵۰ حدیث (۲۱۶ـ ۴۸۳) وأبو داؤد ۱/ ۵۴۶ حدیث رقم ۸۷۸۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں یہ دعا پڑھتے تھے: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ..... اے اللہ میرے تمام چھوٹے بڑے، پہلے اور بعد والے ظاہر اور پوشیدہ سب گناہ معاف کر دے۔'' (مسلم)

تشریح: وعن ابی هریرة قال کان النبی صلی الله علیه وسلم یقول: یعنی بعض اوقات۔

فی سجوده: تسبیح سمیت یا بغیر تسبیح پڑھے، دونوں احتمال ہیں۔

اللهم اغفر لی ذنبی کله: تاکید کیلئے ہے، اور اس کا مابعد تفصیل انواع کیلئے ہے یا کلہ کے بیان کیلئے اور بتقدیر اعنی اس کا نصب بھی ممکن ہے۔

دقه: کسرہ کے ساتھ، یعنی دقیق اور چھوٹے۔

وجله: ''جیم'' کے کسرہ کے ساتھ، اور کبھی ضمہ بھی ہوتا ہے یعنی بڑے، بقول بعض الدق کو الجل پر مقدم اس لئے کیا کیونکہ سائل اپنے سوال میں دربدرجہ پڑھتا رہتا ہے اور اس وجہ سے کبیرہ گناہ اکثر صغیرہ گناہوں پر اصرار کرنے اور ان سے لاپرواہی سے کبیرہ بنتے ہیں تو گویا صغائر وسیلہ ہیں کبائر کا، اور وسیلہ کا حق ہے کہ اس کو اثبات ورفع میں مقدم کیا جائے۔ (واوله وآخره) مقصود تمام گناہوں کا احاطہ ہے۔ (وعلانيته وسره) یعنی جو کسی بندہ کے سامنے کیے جائیں ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دونوں برابر ہیں۔ وہ پوشیدہ سے پوشیدہ کو جانتا ہے۔ (رواہ مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سجدہ بزبان حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

۸۹۳: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ فَقَدْتُّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَيْلَةً مِّنَ الْفِرَاشِ فَالْتَمَسْتُهُ فَوَقَعَتْ يَدِىْ عَلٰى بَطْنِ قَدَمَيْهِ وَهُوَفِى الْمَسْجِدِ وَهُمَا مَنْصُوْبَتَانِ وَهُوَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْكَ لَا اُحْصِىْ ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ ۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم ١/٣٥٢حديث (٢٢٢_٤٨٦)وأبو داوٗد ١/٥٤٧حديث ٨٧٩وأخرجه الترمذي ٥/٤٨٩حديث ٣٤٩٣_ وأخرجه النسائي ٢/٢٢٢حديث ١١٣٠وابن ماجة ٢/١٢٦٢حديث ٣٨٤١_ومالك ١/٢١٤حديث رقم ٣١من كتاب القرآن وأحمد ٦/٥٨_

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کے وقت بستر پر نہ پایا میں آپ ﷺ کو تلاش کر رہی تھی کہ میرا ہاتھ آپ ﷺ کے پاؤں کو جالگا۔ میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز تھے اور آپؐ دونوں پاؤں پر کھڑے تھے اور یہ دُعا کر رہے تھے: اللهم انى اعوذ ۔ اے اللہ میں تیری رضا کے لئے تیرے غیظ وغضب سے پناہ چاہتا ہوں۔ معافی کے ذریعہ تیرے عذاب سے پناہ چاہتا ہوں اور تجھ سے پناہ کا طلبگار رہوں۔ میں تیری تعریف کا شمار اور احاطہ نہیں کر سکتا۔ تو ایسا ہی ہے جس طرح تو نے اپنی تعریف خود کی ہے۔''

تشریح: وعن عائشة قالت فقدت: یعنی تلاش کیا تو نہ پایا۔

رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلة من الفراش: ''فقدت'' سے متعلق ہے اور مطلب یہ ہے کہ میں بیدار ہوتی تو آپ علیہ السلام کو بستر پر اپنے قریب نہ پایا۔

فالتمسته: یعنی ہاتھ سے ٹٹولا، بقول بعض مطلب یہ ہے کہ میں نے حجرہ سے مسجد میں ہاتھ بڑھایا۔

فوقعت يدى: ایک ہاتھ۔

على بطن قدميه: بقول قاضی اس میں دلالت ہے کہ جس کو چھوا جائے اس کا وضو نہیں ٹوٹتا، اس لئے کہ اتفاقاً چھونے کا کوئی اثر نہیں ہوتا اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ علیہ السلام سجدہ میں برقرار نہ رہتے۔ بقول اشرف یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ

دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل تھی۔ طیبیؒ نے اس کو ذکر کیا اور ظاہرِ حدیث سے ہمارے (حنفیہ کے) مذہب کی موافقت ہوئی ہے۔

وھو فی المسجد: ''جیم'' کے فتحہ کے ساتھ، یعنی سجدہ میں، یا تو مصدر میمی ہے یا ظرف مکان، یعنی حجر میں نماز کی جگہ، اور ایک نسخہ میں ''میم'' کے کسرہ کے ساتھ ہے اور اس میں مسجد البیت یعنی عبادت گاہ مسجدِ نبوی کا احتمال ہے۔ بقول طیبیؒ صحیح مسلم، کتاب الحمیدی، اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں **فی المسجد** کے الفاظ ہیں اور بعض میں **فی السجدۃ** اور بعض میں **فی السجود** ہے۔ اور ابن حجرؒ نے بڑی عجیب وغریب بات کہی جنہوں نے مشکوٰۃ کے اصل نسخہ میں **وھو فی السجدۃ** کا کہا اور پھر فرمایا کہ ایک نسخہ میں **المسجد** ہے اور یہ صحیح مسلم وغیرہ میں نہیں ہے اور بہتر تھا کہ اس طرح کہتے کہ مصابیح کے بعض نسخوں میں **السجدۃ** اور بعض مین **المسجد** ہے اور جو اکثر نسخوں میں لفظ ہے وہ مسلم میں نہیں ہے، اور وجہِ غرابت یہ ہے کہ:

وھما: یعنی دونوں قدم مبارک۔

منصوبتان: یعنی سیدھے کھڑے تھے۔

وھو یقول اللھم انی: ''یاء'' کے سکون کے ساتھ اور فتح بھی پڑھا جاتا ہے۔

اعوذ برضاك من سخطك: یعنی ایسے فعل سے جو مجھ پر یا میری اُمت پر تیری ناراضگی کا سبب ہو۔

وبمعا فاتك: یعنی تیری معافی کے سبب، اور مبالغہ کا لفظ استعمال کیا مبالغہ کیلئے، یعنی تیری بہت زیادہ معافی۔

من عقوبتك: اور عقوبت ناراضگی کی علامت ہے، اور صفاتِ رحمت کے واسطے سے پناہ اس لئے مانگی کیونکہ صفاتِ رحمت کو سبقت حاصل ہے اور وہ صفاتِ غضب پر غالب ہیں۔

واعوذ بك منك: اس لئے کہ تیرے ساتھ ملکیت میں کوئی شامل نہیں، اس لئے اپنے غصہ سے پناہ بھی تو ہی دے گا۔ بقول طیبیؒ دوسری روایت میں پہلے معافی مانگی پھر رضا، تو اس صورت میں ابتداء صفات افعال سے کی پھر صفاتِ ذات پھر ترقی کر کے ذات سے۔ امام غزالیؒ نے احیاء میں اسی طرح ذکر کیا ہے، البتہ یہ کہنا کہ یہ صفاتِ ذات سے صفاتِ افعال کی طرف اُترنا ہے (جسے تدلی کہتے ہیں) اور ایک روایت میں اس کا عکس ہے باب ترقی سے بنانے کیلئے، اس لئے صفاتِ ذات میں زیادہ بزرگی اور عظمت ہے۔ ذات پر ختم کرنے سے غفلت ہے اس لئے کہ اس کے ساتھ تدلی صحیح نہیں جیسا کہ یہ بات ظاہر ہے کہ تدلی تین امور کے درمیان ہوتی ہے۔

لا احصی ثناء علیك: بقول طیبیؒ احصاء اصل میں کنکریوں پر گننا ہے یعنی تیرے حق کے مطابق تیری تعریف کی طاقت نہیں رکھتا۔

انت کما اثنیت: ''مَا'' موصولہ یا موصوفہ ہے اور ''کاف'' مثل کے معنی میں ہے، بقول طیبیؒ کے۔ اور یوں کہنا اظہر ہے کہ ہر لمحہ اور ذرہ میں جو تیری تعریف کرنا مجھ پر واجب ہے میں اس کا ایک حصہ بھی اداء کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، اس لئے کہ ہر لمحہ تیرے احسانات مجھ پر ہوتے ہیں اور ہر ذرہ میں جو تیری نعمتیں ہوتی ہیں میں ان کو شمار کرنا چاہوں تو ان کی کثرت کی وجہ سے میں اس سے عاجز ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے، پس تیری شکر گزاری سے عاجز ہوں اس لئے تیری رضا اور درگزر کا سوال کرتا ہوں۔

علی نسك: یعنی ذات پر، اپنے اس فرمان کے ساتھ فلله الحمد رب السموات ورب الارض رب العالمین وله الكبرياء فی السموات والارض وهو العزيز الحيكم، (رواہ مسلم)

بقول میرک چاروں ائمہ حدیث نے اس کو روایت کیا ہے۔

سجدہ میں اللہ کا قرب ہوتا ہے

۸۹۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقْرَبُ مَايَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهٖ وَهُوَسَاجِدٌ فَاَكْثِرُوا الدُّعَاءَ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم ۱/ ۳۵۰حديث (۲۱۵ـ۴۸۲)ـوأخرجه أبوداوٗد ۱/ ۵۴۵حديث ۸۷۵ـوالنسائی ۲/ ۲۲٦ حديث ۱۱۳۷ـوأحمد ۲/ ۴۲۱ـ

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندہ سب سے زیادہ قریب اللہ تعالیٰ سے سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے اس لئے سجدہ میں تم بہت زیادہ دعا کیا کرو۔'' (مسلم)

تشریح: قرب کی نسبت وقت کی طرف مجازاً کی اور وقت کی طرف نسبت قرب بندہ کیلئے ہے، یعنی بندہ سجدہ کی حالت میں بقیہ حالتوں سے زیادہ رب کے قریب ہوتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ بندہ افعال واحوال میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی رضا وعطاء کے قریب سجدہ کی حالت ہے اور بقول بعض اقوب مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے کیونکہ حال اس کو ظاہر کرنے میں رکاوٹ ہے تقدیری عبارت یہ ہے :اقوب ما يكون العبد من ربه حاصل فی حال كونه ساجدا۔

فاكثروا الدعاء: بقول ابن الملکؒ یہ حکم اس وجہ سے ہے کیونکہ سجدہ کی حالت انتہائی ذلت اور اپنے بندہ ہونے اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے اعتراف پر دلالت کرتی ہے لہٰذا قبولیتِ دُعا کی جگہ ہو اس لئے سجدہ میں کثرتِ دُعا کا حکم فرمایا، اور اسی سے کثرتِ سجود کے طولِ قیام سے افضل ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے۔ (رواہ مسلم)

بقول میرکؒ چاروں ائمہ اور احمد نے اس کو روایت کیا۔

شیطان کا پچھتاوا

۸۹۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا قَرَأَ ابْنُ اٰدَمَ السَّجْدَةَ فَسَجَدَ اِعْتَزَلَ الشَّيْطَانُ يَبْكِیْ يَقُوْلُ يَاوَيْلَتٰى اُمِرَ ابْنُ اٰدَمَ بِالسُّجُوْدِ فَسَجَدَ فَلَهُ الْجَنَّةُ وَاُمِرْتُ بِالسُّجُوْدِ فَاَبَيْتُ فَلِیَ النَّارُ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ۱/ ۸۷حديث رقم (۱۳۳ـ۸۱)ـوابن ماجه فی السنن ۱/ ۳۳۴حديث ۱۰۵۳

وأخرجه أحمد ٢/٤٤٣۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب ابن آدم سجدہ تلاوت کی آیت پڑھتا ہے پھر وہ سجدہ ادا کرتا ہے تو اس وقت شیطان روتا ہے اور کہتا ہے ہائے افسوس ابن آدم کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کرلیا تو اس کے لئے جنت ہے اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا تو میں نے انکار کر دیا تو میرے لئے جہنم کی آگ ہے۔'' (مسلم)

تشریح: **وعنه:** یعنی ابوہریرہ۔

قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا قرأ ابن آدم: آدم علیہ السلام کا تذکرہ اس قصہ کی طرف اشارہ کرنے کیلئے کیا جو آدم علیہ السلام اور شیطان کے درمیان پیش آیا اور دونوں میں عداوت کا سبب بنا۔

السجدة: یعنی آیتِ سجدہ۔

فسجد: یعنی پڑھنے اور سننے والا بندہ، اللہ کا حکم پورا کرنے، اور اس کی اطاعت میں رغبت کرتے ہوئے۔

اعتزل الشیطان: یعنی شیطان جو اس کو دوسری طرف مشغول کرنے کیلئے وسوسے ڈالتا ہے وہ اس پڑھنے والے سے ہٹ جاتا ہے، کیونکہ قاری اس قرب سے مزین ہوتا ہے اور شیطان اس قرب سے انتہائی دور ہوتا ہے اور جو بھی کسی جانب پھر جائے وہ معتزل ہے اسی لئے معتزلہ کو معتزلہ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے پہلے لوگوں سے الگ ہو گئے اس وقت جب کہ حضرت حسن بصریؒ کو ان لوگوں نے اپنے غلط عقیدہ کے خلاف تقریر کرتے سنا جو غلط عقیدہ مسجد کے گوشے میں بیٹھ کر بیان کیا کرتے تھے تو حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا یہ الگ ٹولہ ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ فرمایا یہ ہم سے الگ ہو گئے تو اس وقت سے ان کا نام معتزلہ پڑ گیا۔

یبکی یقول: بقول طیبیؒ یہ دونوں اعتزل کی ضمیر سے حالِ مترادفہ ہیں یعنی باکیاً وقائلاً، یا حال متداخلہ ہیں یعنی باکیا قائلاً ہے۔

یا ویلتی: بقول ابن الملکؒ اصل میں **یا ویلی** ہے ''یاء'' متکلم کو ''تاء'' سے بدل دیا گیا اور اس کے بعد ''الف'' کا اضافہ کر دیا گیا آہ وبکاہ اور غم وہلاکت کیلئے گویا کہ وہ یوں کہتا ہے **یا حزنی ویا ھلاکی احضر فھذا وقتك واوانك**، بقول طیبیؒ وہ ہلاکت کو اپنی بزرگی چھن جانے اور لعنت وخسارہ ملنے کی وجہ سے پکارتا ہے جو اس کو بنی آدم سے حسد کی وجہ سے حصہ میں آیا، اس کا ہی بیان یہ ہے: ''**امر ابن آدم بالسجود فسجد فله الجنة وامرت بالسجود فأبیت**''، یعنی تکبر کرتے ہوئے سجدہ نہ کیا، بقول ابن حجرؒ یعنی اللہ کا حکم پورا کرنے اور بنی آدم کو حقیر سمجھ کر سجدہ کرنے یعنی آدم کو سجدہ کیلئے قبلہ بنانے سے رُک جانے کی وجہ سے، اس لئے کہ حکم پیشانی رکھنے کا نہ تھا بلکہ صرف جھکنے کا تھا یا پیشانی رکھنے کا حکم تو ہوا لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے اور آدم کو صرف قبلہ بنایا گیا کعبہ کی طرح۔

فلی النار: اس میں سجدہ سہو کے وجوب پر دلیل ہے جیسا کہ ہمارا مذہب ہے اور بظاہر یہ ہے کہ اس کو حکم تھا کہ اللہ کو سجدہ کر، اور آدمؑ قبلہ تھے لیکن اس نے ان کے قبلہ ہونے کے جواز کا انکار کر دیا نص کے مقابلہ میں قیاس فاسد کی وجہ سے، واللہ اعلم۔

کثرتِ سجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا ذریعہ ہے

۸۹۶: وَعَنْ رَبِيْعَةَ بْنِ كَعْبٍ قَالَ كُنْتُ اَبِيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَاَتَيْتُهُ بِوَضُوْءِهٖ وَحَاجَتِهٖ فَقَالَ لِيْ سَلْ فَقُلْتُ اَسْاَلُكَ مُرَافَقَتَكَ فِي الْجَنَّةِ قَالَ اَوْ غَيْرَ ذٰلِكَ قُلْتُ هُوَذَاكَ قَالَ فَاَعِنِّيْ عَلٰى نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُوْدِ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۳۵۳ حديث (۲۲۶-۴۸۹)۔ والنسائي ۲/۲۲۷ حديث ۱۱۳۸۔

ترجمہ: ''حضرت ربیعہ بن کعبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا کرتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کا پانی اور دوسری ضرورت کی چیزیں پیش کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے مجھ سے کہا مجھ سے کچھ مانگ لو۔ تو میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! مجھے جنت میں آپ کی رفاقت نصیب ہو جائے۔ رسول اللہ نے فرمایا اس کے علاوہ کچھ اور مانگو میں نے عرض کیا میری درخواست تو صرف یہی ہے۔ آپ نے فرمایا اس مرتبہ کو حاصل کرنے کے لئے تم کثرتِ سجود کے ذریعے اپنی ذات سے میری مدد کرو۔'' (مسلم)

تشریح: **وعن ربيعة بن كعب**: یعنی اسلمی۔

قال كنت ابيت: ''بیتوتہ'' سے یعنی رات کو آپ کے پاس ہوتا تھا۔

مع رسول الله صلى الله عليه وسلم: ہوسکتا ہے کہ یہ واقعہ سفر کا ہو، اور بقول ابن حجرؒ یعنی سفر میں یا حضر میں، اور معیت سے مراد اتنا قریب ہونا ہے جس سے کسی ضرورت کیلئے پکارنے پر آواز سنائی دے سکے۔

فاتاه: یعنی لایا۔

بوضوئه: ''واؤ'' کے فتح کے ساتھ، یعنی وضو اور طہارت کا پانی۔

وحاجته: یعنی تمام ضرورت کی چیزیں مثلاً مسواک مصلّٰی وغیرہ۔

فقال لى: بقول ابن الملکؒ یعنی خوش ہو کر۔ یا خدمت کے صلہ میں۔

سل: یعنی حاجت طلب کر، اور بقول ابن حجرؒ میری خدمت کے مقابلہ میں تجھے تحفہ دوں، اس لئے کہ کریم لوگوں کی یہی شان ہے اور نبی علیہ السلام سے زیادہ کریم کوئی نہیں ہے اور آپ علیہ السلام کے مطلقاً سوال کا حکم دینے سے اس مسئلہ پر استدلال کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام خزانوں پر اختیار دیا ہے جو چاہیں عطا کریں اسی وجہ سے ہمارے ائمہ نے آپ علیہ السلام کی یہ خصوصیت شمار کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس کے ساتھ جو خاص کرنا چاہیں کر سکتے ہیں جس طرح نبی علیہ السلام خزیمہ بن ثابت کی گواہی دو کے برابر کر دی (رواہ البخاری) اور جس طرح آپ علیہ السلام نے اُمِ عطیہ کو خصوصی طور پر کسی پر نوحہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ (رواہ مسلم) بقول نوویؒ شارع کو عام سے خاص کرنے کی اجازت ہوتی ہے اور جس طرح آپ علیہ السلام نے ابی بردہ بن نیار کو سال سے کم عمر بکری کا بچہ قربانی کرنے کی رخصت دی، اور ابن سعد نے خصائص وغیرہ میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو جنت کی زمین آپ کو عطا فرما دی تھی آپ علیہ السلام اس سے جس کو جو چاہتے تھے دیتے تھے۔

فقلت اسالك مرافقتك: یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ۔

فی الجنة: اس طرح کہ کہ آپ علیہ السلام کے قریب رہوں اور آپ علیہ السلام کو دیکھتا رہوں۔

قال: اور ایک نسخہ میں "فقال" ہے۔

او: "واؤ" ساکن کے ساتھ، اور فتح بھی پڑھا جاتا ہے۔

غیر ذلك؟ نصب ورفع کے ساتھ، بقول زین العرب یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى﴾ [الاعراف: ۹۸] کی طرح ہے، یعنی "او" میں دونوں وجہیں جائز ہیں، البتہ "اھل" صرف مرفوع ہے اور حدیث کی تقدیری عبارت یہ ہے: تسال ذلك او غیر ذلك، اس لئے کہ یہ آسان ہے، یا مسئوولك ذلك او غیر ذلك، اس لئے کہ یہ بلند درجہ ہے، پس "او" کا عطف مقدر پر ہے لہٰذا "غیر" کا نصب ورفع دونوں جائز ہیں تقدیری عبارت کے اعتبار سے، اور بقول بعض ہمزہ استفہام کیلئے اور "غیر" منصوب ہے تو معنی یہ ہوگا أثابت انت فی طلبك ام لا وتسال غیره، اور یہ امتحان ہے یہ دیکھنے کیلئے کہ یہ اس مطلوبہ عظیم چیز پر پختہ ہے جس کا کوئی چیز مقابلہ نہیں کرسکتی اس لئے کہ اعلیٰ مقامات کی طلب پر قائم رہنا بڑا کمال ہے۔

قلت هو ذاك: (او، عاطفہ کی صورت میں) یعنی میرا سوال صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ ہے اور استفہامیہ کی صورت میں عبارت یہ ہے مسئوولی ذلك لا اتجاوز عنه۔ میں کہتا ہوں کہ وہ ذات پاک ہے جس نے ان کے لئے حسن خدمت اور بلند ہمتی جمع کر دی۔

قال فاعنی علی نفسك یعنی اپنے آپ کو اس سوال کے قابل بنانے میں میری مدد کر۔

بکثرة السجود: دنیا میں تاکہ آخرت میں میرے ساتھ رہے، بقول ابن الملک اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ بلند مرتبہ صرف سجدوں سے حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ تعالیٰ سے اس کی دُعا سے حاصل ہوا۔ اور علی نفسك میں یہ بات بتائی کہ بلند مراتب کا حصول صرف اس ذلیل نفس کی مخالفت سے ہوتا ہے۔ بقول ابن مظہر "او" واوَ ساکن کے ساتھ ہے اور محی الدین فتح کے قائل ہیں، پس "واؤ" عاطفہ ہے جو معطوف کا تقاضا کرتی ہے اور ہمزہ استفہام فعل چاہتا ہے پہلے قول کے مطابق معنی یہ ہے: سل غیر ذلك تو جواب دیا هو ذاك یعنی مسئوولی ذلك لا انتهی عنه اور قولِ ثانی کے مطابق معنی یہ ہے: اتسال هذا وهو شاق تترك ما هو اهون منه؟ یعنی آسان چھوڑ کر مشکل کا سوال کرتا ہے، تو جواب میں عرض کیا: مسئولی ذلك لا اتجاوز عنه، اور آپ علیہ السلام کا لفظ ذلك فرمانا اس کے بُعد کی طرف اشارہ ہے سائل کو بطور امتحان اس سے روکنے کیلئے جب سائل کا عزم مصمم معلوم ہوگیا تو جواب میں اعنی فرمایا، اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ آپ علیہ السلام کا قرب جنت میں قرب کے بغیر نہیں ہوسکتا طیبیؒ نے اسی طرح بیان کیا۔ (رواہ مسلم)

اور بقول میرکؒ ابن ماجہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

سجدہ کی فضیلت

۸۹۷: وَعَنْ مَعْدَانَ بْنِ طَلْحَةَ قَالَ لَقِيْتُ ثَوْبَانَ مَوْلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقُلْتُ اَخْبِرْنِيْ بِعَمَلٍ

اَعْمَلُهٗ يُدْخِلُنِي اللّٰهُ بِهِ الْجَنَّةَ فَسَكَتَ ثُمَّ سَأَلْتُهٗ فَسَكَتَ ثُمَّ سَأَلْتُهُ الثَّالِثَةَ فَقَالَ سَأَلْتُ عَنْ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ عَلَيْكَ بِكَثْرَةِ السُّجُوْدِ لِلّٰهِ فَإِنَّكَ لَا تَسْجُدُ لِلّٰهِ سَجْدَةً اِلَّا رَفَعَكَ اللّٰهُ بِهَا دَرَجَةً وَحَطَّ عَنْكَ بِهَا خَطِيْئَةً قَالَ مَعْدَانُ ثُمَّ لَقِيْتُ اَبَا الدَّرْدَاءِ فَسَأَلْتُهٗ فَقَالَ لِيْ مِثْلَ مَا قَالَ لِيْ ثَوْبَانُ . (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٣٥٣حديث (٢٢٥-٤٨٨)والترمذي مختصراً ٢/٢٣٠حديث ٣٨٨والنسائي ٢/٢٢٨ حديث ١١٣٩-وأحمد ٥/٢٧٦-

ترجمہ: ''حضرت معدان بن طلحہؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبانؓ سے ملاقات کی اور میں نے ان سے عرض کی کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیں کہ جب میں اس کو عمل کروں تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل کر دے۔ وہ میرا سوال سن کر کچھ دیر خاموش رہے میں نے دوبارہ سوال کیا وہ پھر بھی خاموش رہے جب میں نے تیسری مرتبہ سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہی سوال میں نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ تم اللہ کے لئے کثرت سے سجدے کیا کرو۔ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہارا ایک درجہ بلند کر دے گا اور اس کی وجہ سے ایک گناہ معاف کر دے گا۔ حضرت معدانؒ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے حضرت ابودرداءؓ سے ملاقات کی ان سے بھی میں نے یہی سوال کیا اور انہوں نے بھی مجھے وہی جواب دیا جو حضرت ثوبانؓ نے دیا تھا۔''

راویٔ حدیث:

معدان بن طلحہ: یہ ''معدان'' ہیں۔ ''طلحہ'' کے بیٹے اور ''یعمری'' ہیں۔ ان کو ''ابن ابوطلحہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شامی ہیں۔ انہوں نے عمر اور ابوالدرداء اور ثوبان سے حدیث کی سماعت کی۔ روایت حدیث میں ثقہ شمار ہوتے ہیں۔

تشریح: وعن معدان بن طلحة: اور بقول بعض ابن ابی طلحہ شامی، ثقہ ہیں، یہ بات تقریب میں کہ ہے۔

اخبرني بعمل اعمله: لفظ عمل کی صفت ہونے کی وجہ سے رفع کے ساتھ، اسی طرح ''يدخلني الله به الجنة'' بقول طیبیؒ اعمله جواب امر بھی ہوسکتا ہے اور یدخلنی اس سے بدل اور یہ اس وجہ سے ہے کہ معدان کو جب خبر دینے کے سبب عمل ہونے کا اعتقاد ہے تو یہ ترکیب درست ہوئی۔

فسكت: یعنی ثوبان۔

ثم سالته: احتمال ہے کہ دوبارہ سوال کسی اور وقت میں کیا ہو، اور ''ثم'' صرف مطلقاً عطف کیلئے بھی ہوسکتا ہے۔

فسكت: گویا وہ اپنے سے ان کی رغبت دیکھنا چاہتے تھے۔

ثم سالته الثالثة فقال: کہ ''سالت عن ذلك رسول الله صلى الله عليه وسلم'' بظاہر ان کو بھی آپ علیہ السلام سے تین مرتبہ سوال کرنا پڑا ہوگا۔

فقال: صلی اللہ علیہ وسلم۔

عليك بكثرة السجود: یعنی کثرت لازم پکڑ۔

لله تعالٰی: بقول ابن الملکؒ سجدہ سے آپ کی مراد سجدۂ نماز یا تلاوت یا شکر ہے۔

فانك لا تسجد لله سجدة الا رفعك الله بها درجة وحط عنك بها خطيئة ' قال معدان ثم لقيت اباالدرداء فسالته فقال لى مثل ما قال لى ثوبان۔ (رواه مسلم)

اور بقول میرکؒ ترمذی، نسائی ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

الفصل الثانی:

سجدہ میں گھٹنے پہلے رکھنے کا حکم

۸۹۸: وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَجَدَ وَضَعَ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ وَاِذَا نَهَضَ رَفَعَ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ ۔ (رواه ابوداود والنسائى وابن ماجة والدارمى)

أخرجه أبوداوٗد فى السنن ۵۲۴/۱ حديث ۸۳۸۔والترمذى فى السنن ۵٦/۲ حديث ۲٦۸ وقال حديث حسن غريب والنسائى ۲۰٦/۲ حديث ۱۰۸۹ ۔وأخرجه ابن ماجة ۲۸٦/۱ حديث ۸۸۲ والدارمى ۳۴۷/۱ حديث ۱۳۲۰۔

ترجمہ: ''حضرت وائل بن حجرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب آپ سجدہ کرنے کا ارادہ کرتے تو ہاتھوں سے پہلے اپنے دونوں گھٹنوں کو زمین پر رکھتے تھے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تھے تو پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے تھے پھر دونوں گھٹنوں کو۔'' (ابوداؤد۔نسائی۔ابن ماجہ)

تشریح: **اذا سجد**: سجدہ کا ارادہ فرماتے۔

وضع ركبتيه قبل يديه: امام ابوحنیفہؒ وشافعیؒ اسی کے قائل ہیں۔

واذا نهض: یعنی ارادہ فرماتے، قیام کا۔

رفع يديه قبل ركبتيه: امام ابوحنیفہؒ اسی کے قائل ہیں اور امام شافعیؒ کا ابوحنیفہؒ سے اس صورت میں اختلاف ہے۔ ترمذی نے اس حدیث حسن غریب کہا ہے اور حاکم نے کہا ہے کہ یہ صحیح علی شرطِ مسلم ہے۔اور ابن حبان نے بھی اس کو صحیح قرار دیا۔

والنسائى وابن ماجه والدارمى: بقول میرکؒ احمد دارقطنی، حاکم نے بھی۔ بقول ابن حجرؒ دوسرے حصہ کو نوویؒ نے ضعیف کہا ہے، اسی وجہ سے ہمارے اصحاب کا متفق علیہ مذہب ہے کہ سجدہ سے قیام کی طرف اٹھتے وقت ہتھیلیوں کے اندرونی حصہ پر سہارا لینا اور انگلیاں زمین پر ملا کر رکھنا سنت ہے اتباع کیلئے، بخاری نے اس کو قیام من السجود کے باب میں روایت کیا ہے۔اور اسی پر قیام من القعود کو قیاس کیا جاتا ہے اور اس سے نہی ضعیف ہے اسی طرح وہ خبر بھی جس آپ علیہ السلام صدور قدمین پر قیام کا ذکر ہے اسی طرح حضرت علیؓ کی روایت بھی کہ آپ علیہ السلام کی سنت ہے ہاتھوں پر سہارا نہ لگانا مگر اس بوڑھے کیلئے جو اس سے عاجز ہو اسی طرح عطیہ عوفی کا قول بھی کہ میں نے صحابہ کی جماعت کو دیکھا وہ صدور قدمین پر اٹھتے تھے نماز میں، اس

لئے کہ یہ عطیہ ضعیف ہے۔

میں کہتا ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ روایت جب کثرت سے نقل ہو جائے تو اس کا ضعف قوت میں بدل جاتا ہے اور یہ قوت کیلئے ہو سکتا ہے حالانکہ ترمذی نے ''اصل'' کی اس حدیث کو حسن اور حاکم وحبان نے صحیح کہا ہے اور یقیناً یہ لوگ امام نوویؒ سے بڑے ہیں تو پھر اس نص کے ہوتے ہوئے قیام مذکور جس کا فرق ظاہر ہے کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ البتہ وسیط غزالی میں جو یہ روایت ہے کہ آپ علیہ السلام نماز میں اٹھتے وقت عاجز آدمی کی طرح ہاتھ زمین پر رکھتے تھے تو ابن صلاح نے کہا ہے' یہ حدیث غیر معروف اور غیر صحیح ہے۔ اور بقول نوویؒ ضعیف یا باطل ہے اور روایتِ ابوداوٗد میں بھی ہے کہ آپ علیہ السلام گھٹنوں پر اٹھتے اور رانوں پر سہارا لیتے تھے، بقول حافظ زین عراقی ابوداوٗد کی یہ روایت اپنے ماقبل کے موافق ہے اس لئے کہ جب ہاتھ زمین سے اٹھا لیے تو گھٹنوں پر اٹھنا متعین ہو گیا کیونکہ ان کے علاوہ کوئی اور چیز سہارے کیلئے نہیں رہی، اور **اعتمد علی فخذه** کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھوں سے رانوں کو پکڑ کر اٹھنے میں ان سے مدد لیتے تھے۔

۸۹۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا سَجَدَ اَحَدُکُمْ فَلَا يَبْرُكْ كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيْرُ وَلْيَضَعْ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ (رواه ابوداودوالنسائی والدارمی) **قَالَ اَبُوْسُلَيْمَانَ الْخَطَّابِیُّ حَدِيْثُ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ اَثْبَتُ مِنْ هٰذَا وَقِيْلَ هٰذامَنْسُوْخٌ۔**

أخرجه أبوداوٗد ۱/۵۲۵حدیث ۸۴۰۔والنسائی ۱/۲۰۷حدیث ۱۰۹۱والدارمی ۱/۳۴۷حدیث ۱۳۲۱ وأحمد ۲/۳۸۱۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو وہ اونٹ کے بیٹھنے کی طرح نہ بیٹھے بلکہ اسے چاہئے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے زمین پر رکھے۔ (ابوداوٗد۔نسائی۔داری) ابوسلیمان خطابی فرماتے ہیں کہ وائل بن حجر کی حدیث اس سے زیادہ صحیح ہے۔ اور اس حدیث کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ ہے۔''

تشریح: **قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا سجد احدکم فلا یبرك:** نہی اور بقول بعض نفی ہے۔

کما یبرك البعیر: یعنی گھٹنوں سے پہلے ہاتھ نہ رکھے جس طرح اونٹ بیٹھتا ہے، اس بیٹھنے کو اونٹ کے بیٹھنے سے تشبیہ دی، باوجود یکہ اونٹ ہاتھ پہلے اور پاؤں بعد میں رکھتا ہے اس لئے کہ انسان کا گھٹنا ٹانگ میں اور چوپایوں کا گھٹنا بازو میں ہوتا ہے اور نمازی جب گھٹنے پہلے رکھتا ہے تو بیٹھنے میں اونٹ کے مشابہ ہوا۔

ولیضع: ''لام'' کے سکون اور کسرہ کے ساتھ۔

یدیه قبل رکبتیه: بقول تورپشتیؒ اونٹ کی طرح بیٹھنے سے نہی کیسے ہوئی کہ پھر خود بھی پہلے ہاتھ اس کے بعد گھٹنے رکھنے کا حکم فرمادیا؟ جواب یہ ہے کہ انسان کا گھٹنا ٹانگ میں اور چوپایوں کا بازو میں ہوتا ہے۔

رواه ابو داوٗد: بقول میرکؒ یہ ابوداوٗد کا لفظ ہے اور ترمذی نے روایت کیا اور حدیث غریب فرمایا ہے۔

والنسائی والدارمی: بقول ابن حجرؒ اس کی سند جید ہے۔

قال ابو سلیمان الخطابی: ائمہ شوافع میں سے۔

حدیث وائل بن حجرؓ اثبت من ھذا: بقول طیبیؒ اکثر اہلِ علم کا مذہب یہ ہے کہ سجدہ کرنے والے کیلئے سب سے پسندیدہ یہ ہے کہ پہلے گھٹنے پھر ہاتھ رکھے، وائل بن حجر کی روایت کی وجہ سے۔اور مالک واوزاعیؒ نے اس حدیث کی بنیاد پر اس کے برعکس فرمایا ہے اور پہلا طریقہ اثبت ہے اربابِ نقل کے نزدیک، بقول ابن حجرؒ اس کے اثبت ہونے کی وجہ جماعتِ حفاظ کا اس کو صحیح کہنا ہے، اس میں یہ طعن نہیں ہوسکتا کہ اس روایت میں شریک قاضی ہے اور وہ قوی نہیں اس لئے کہ مسلم نے اس کی روایت لی ہے اور وہ شرطِ مسلم پر ہے، ویسے بھی اس روایت کے دو طریق اور بھی ہیں جن سے یہ کمی پوری ہو جاتی ہے۔

وقیل ھذا: یعنی حدیثِ ابی ہریرہ۔

منسوخ: منسوخ ہے۔

میرک تصحیح سے نقل کرتے ہیں کہ بعض محدثین کے بقول یہ حدیث مصعب بن سعد بن ابی وقاص کی حدیث کی وجہ سے منسوخ ہے جو وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ہم ہاتھ گھٹنوں سے پہلے رکھا کرتے تھے پھر ہمیں پہلے گھٹنے پھر ہاتھ رکھنے کا حکم ہوا اس کو ابن خزیمہ نے روایت کیا ہے، پس اگر حدیثِ ابو ہریرہؓ اس سے پہلے کی نہیں تو دو مرتبہ نسخ لازم آئیگا اور یہ خلافِ دلیل ہے۔

اور جو بات مجھ پر کھلی ہے (واللہ اعلم) وہ یہ ہے کہ اس حدیث کا آخری حصہ بعض روایات پر تبدیل ہو گیا ہے اور ان کا عمل گھٹنوں سے پہلے ہاتھ رکھنے کا نہ تھا اس لئے کہ اس حدیث کا ابتدائی حصہ آخری حصہ کے خلاف ہے وہ اس طرح کہ اگر ہاتھ پہلے اور گھٹنے بعد میں رکھتے تھے تو اس طرح کرنا اونٹ کا بیٹھنا ہے کیونکہ اونٹ پہلے ہاتھ رکھتا ہے اور اس میں نظر ہے اس لئے کہ اگر انقلابِ روایت کا دروازہ کھل گیا تو روایت کے صحیح ہونے کے باوجود کسی راوی کی روایت پر اعتماد نہ رہے گا۔ پھر فرمایا کہ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اونٹ کے گھٹنے اس کے ہاتھ میں ہوتے ہیں نہ کہ پاؤں میں، اور وہ بیٹھتے وقت پہلے گھٹنے رکھتا ہے اور نہی اسی بارے میں وارد ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ یہ بات کئی وجہ سے فاسد ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ اونٹ بیٹھتے وقت ہاتھ پہلے رکھتا ہے اور پاؤں کھڑے رہتے ہیں اور اٹھتے وقت پاؤں پہلے کھڑے کرتا ہے اور اس کے ہاتھ زمین پر لگے رہتے ہیں اور آپ علیہ السلام نے اسی سے منع فرمایا ہے اور اس کے خلاف کیا ہے اور یہی بیٹھنا محل نزاع ہے۔ پھر کہا کہ آپ علیہ السلام زمین سے زیادہ قریب جسم کا حصہ پہلے رکھتے پھر اس سے قریب والا اور اٹھانے میں پہلے سب سے اوپر کا عضو اٹھاتے پھر اس کے بعد والا، چنانچہ سب سے پہلے گھٹنے رکھتے پھر ہاتھ اس کے بعد پیشانی اور اٹھتے وقت پہلے سر اٹھاتے پھر ہاتھ پھر گھٹنے۔

میں کہتا ہوں ہمارا مذہب یہی ہے اور وہ مذہب تاویل کے خلاف ہے پھر کہا کہ یہ بیٹھنا اٹھنا اونٹ کے فعل کے برعکس ہے اور آپ علیہ السلام نے نماز میں حیوانات کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے چنانچہ اونٹ کی طرح بیٹھنے سے، لومڑی کی طرح جھانکنے سے، درندہ کی طرح بازو پھیلانے سے، اور کتے کی طرح بیٹھنے سے، کوے کی طرح ٹھونگ مارنے سے اور سلام کے وقت سرکش گھوڑے کی طرح ہاتھ اٹھانے سے منع فرمایا۔

الشمس ''شین'' کے ضمہ اور ''میم'' ساکن کے ساتھ، شموس اس کی جمع، بمعنی سرکش۔ میں کہتا ہوں کہ سلام کی قید اس کے قائل کے مذہب میں تاویل ہے، البتہ ہمارے نزدیک سوائے تکبیر تحریمہ کے مطلقاً ہاتھ اٹھانا منع ہے۔ پس نماز کی حالت حالت حیوانات سے مختلف ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ کہنا کہ اونٹ کے گھٹنے ہاتھ میں ہوتے ہیں اہلِ لغت کے نزدیک غیر معقول وغیر معروف ہے گھٹنے ٹانگ میں ہی ہوتے ہیں، چنانچہ یہ مجازاً یا تغلیباً ہے، میں کہتا ہوں جب کلام کو حقیقت پر محمول کرنا درست نہ ہو تو تصحیح کلام کیلئے مجازاً بولنا جائز ہے اور اس کے ساتھ ساتھ صاحبِ قاموس کا قول ہے کہ الرکبة ضمہ کے ساتھ، ران کے نچلے حصہ کے کنارے اور پنڈلی کے اوپر والے حصہ کے درمیانی جوڑ کو کہتے ہیں، یا ہر چیز کے بازو کی کہنی کو۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا ہی تھا تو آپ علیہ السلام ارشاد فرماتے فلیبرك كما يبرك البعير یعنی اونٹ کی طرح بیٹھنے کا حکم فرماتے نہ کہ منع کرتے، اس لئے کہ زمین پر سب سے پہلے گھٹنے ہی لگتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ یہ انوکھا حکم اور عجیب معاملہ ہے اور جس کسی نے اونٹ کے بیٹھنے میں غور کیا ہے اور آپ علیہ السلام کے اس سے منع فرمانے کو جانتا ہے اس کو معلوم ہے کہ حدیثِ وائل بن حجر ہی درست ہے، اور اس کی وجہ ظاہر نہیں ہوئی، واللہ اعلم بالصواب۔

بقول ابن حجرؒ حاصل یہ ہے کہ ہمارا مذہب پہلی حدیث پر عمل ہے اور امام مالکؒ کا مذہب دوسری حدیث پر، اور ہر ایک کی کوئی وجہ ہے اور جب دونوں حدیثیں اصلِ صحت میں برابر ہیں تو نوویؒ فرماتے ہیں کہ سنت کے اعتبار سے کسی ایک مذہب کی ترجیح مجھ پر ظاہر نہیں ہوئی اور اس میں نظر ہے اس لئے کہ اگرچہ ہم اس کا منسوخ ہونا نہ بھی کہیں کیونکہ نسخ پر حدیث ضعیف دالّ ہے، لیکن پھر پہلی حدیث اصح ہے لہٰذا وہی مقدم ہوگی باوجودیکہ اکثر علماء اسی کے قائل ہیں۔ نیز نمازی کیلئے سہولت اسی میں ہے اور یہ ہیئت اور شکل دیکھنے میں حسین بھی ہے۔

جلسہ کی دُعا

۹۰۰: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاهْدِنِيْ وَعَافِنِيْ وَارْزُقْنِي ۔ (رواہ ابوداود والترمذی)

أخرجه أبو داوٗد ١/ ٥٣٠ حديث ٨٥٠ والترمذی ٢/ ٧٦ حديث ٢٨٤ وابن ماجة ١/ ٢٩٠ حديث ٨٩٨۔ وأخرجه أحمد ١/ ٣٧١۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سجدوں کے درمیان یہ کہا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاهْدِنِيْ وَعَافِنِيْ وَارْزُقْنِي۔ اے اللہ مجھے بخش دے، مجھ پر رحم کر، مجھے ہدایت دے، مجھے عافیت دے اور مجھے رزق عطا کر۔'' (ابوداوٗد۔ ترمذی)

تشریح: كان النبي صلى الله عليه وسلم يقول بين السجدتين: ہمارے نزدیک یہ نفل پر محمول ہے۔

اللهم اغفرلي: یعنی میرے گناہ یا اطاعت میں میری کوتاہی کو معاف فرما دے۔

وارحمنی: یعنی اپنے پاس سے نہ کہ میرے عمل کی وجہ سے، یا میری عبادت قبول فرما کر رحم فرما۔

واھدنی: نیک اعمال کیلئے، یا دین حق پر ثابت رکھ۔

وعافنی: دنیا آخرت کے آزمائش سے یا ظاہری و باطنی امراض سے۔

وارزقنی: بہترین رزق یا اطاعت کی توفیق یا آخرت میں بلند درجہ۔

بقول میرکؒ حاکم، ابن ماجہ، بیہقی نے بھی روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح الاسناد کہا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث میں رب اغفرلی کے الفاظ بھی ہیں۔ اور ترمذی اور بیہقی نے واجبرنی کے الفاظ زیادہ بیان کیے ہیں، اور ابن ماجہ وحاکم نے وارفعنی کا اضافہ کیا ہے (یعنی دونوں جہانوں میں رفعت اور بلندی عطا فرما)۔

۹۰۱: وَعَنْ حُذَيْفَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ بَيْنَ السَّجْدَ تَيْنِ رَبِّ اغْفِرْلِيْ۔

(رواہ النسائی والدارمی)

أخرجه النسائی ۲/۲۳۱حدیث ۱۱۴۵۔والدارمی ۱/۳۴۸حدیث ۱۳۲۴۔وأبو داوٗد ۱/۵۴۴حدیث ۸۷۴۔ وابن ماجة ۱/۲۸۹۔حدیث ۸۹۷۔وأخرجه أحمد ۵/۳۹۸۔

ترجمہ: ''حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سجدوں کے درمیان یہ کہا کرتے تھے رب اغفرلی۔ اے میرے رب میرے گناہ معاف کردے۔'' (نسائی۔ دارمی)

تشریح: اس سے لمبی حدیث ہے، اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے اور ان دونوں کے الفاظ یہ ہیں: رب اغفرلی رب اغفرلی تین تین مرتبہ، میرک نے اسے شیخ سے نقل کیا ہے۔

الفصل الثالث:

تین چیزوں سے منع کیا گیا ہے

۹۰۲: عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ شِبْلٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ نَقْرَةِ الْغُرَابِ وَافْتِرَاشِ السَّبُعِ وَاَنْ يُوَطِّنَ الرَّجُلُ الْمَكَانَ فِي الْمَسْجِدِ كَمَا يُوَطِّنُ الْبَعِيْرُ.

(رواہ ابوداود والنسائی والدارمی)

أبوداوٗد ۱/۵۳۸حدیث رقم ۸۶۲والنسائی ۲/۲۱۴حدیث رقم ۱۱۱۲وابن ماجة ۱/۴۵۹۔حدیث رقم ۱۴۲۹والدارمی ۱/۳۴۸حدیث رقم ۱۳۲۳وأحمد ۳/۴۲۸۔

ترجمہ: ''حضرت عبدالرحمٰن بن شبلؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (نماز کے دوران) کوے کی طرح ٹھونگ مارنے سے اور درندوں کی طرح ہاتھ پھیلانے سے منع کیا ہے اور اس سے بھی منع کیا ہے کہ کوئی آدمی مسجد میں جگہ متعین کرے جیسے اونٹ جگہ مقرر کرتا ہے۔'' (ابوداوٗد۔ نسائی۔ دارمی)

راویٔ حدیث:

عبدالرحمٰن بن شبل ۔ یہ عبدالرحمٰن بن شبل انصاری ہیں۔ان کا نسب یوں ہے: عبدالرحمٰن بن شبل بن عمرو بن زید انصاری۔ان کا تعلق قبیلہ ''اوس'' تھا۔ان کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے۔نقباء میں سے ہیں۔ان سے تمیم بن محمد اور ابو راشد روایت کرتے ہیں۔''حمص'' میں فروکش ہوئے۔حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد امارت میں وفات پائی۔

تشریح: ''شبل'' شین کے معجمہ کے کسرہ اور بائے موحدہ کے سکون کے ساتھ ہے۔

عن عبد الرحمن بن شبل: ''شین'' کے کسرہ اور ''باء'' ساکن کے ساتھ، ابن عمرو بن زید انصاری، اوسی، مدنی حضرت معاویہ کے زمانہ میں وفات پائی۔میرک نے تقریب سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

قال نهى رسول الله صلى الله وعليه وسلم عن نقرة الغراب: ''نون'' کے فتحہ کے ساتھ، سجدہ میں بہت کم ٹھہرنا اور اس قدر ٹھہرنا مراد ہے جس میں کھانے کیلئے کوّا ٹھونک مارتا ہے۔

وافتراش الثعلب: اور وہ یہ ہے کہ سجدہ میں کلائیاں زمین پر بچھادے۔

وان يوطن: ''طاء'' کی تشدید کے ساتھ، اور تخفیف بھی جائز ہے۔

الرجل المكان في المسجد كما يوطن البعير: کہا جاتا ہے اوطن الارض ووطنها استوطنها یعنی وطن بنانا۔ابن ہمامؒ نے نہایہ میں حلوانی کے متعلق فرمایا ہے کہ انہوں نے روزہ کے بارے میں ہمارے اصحاب سے ذکر کیا ہے کہ مسجد میں نماز کیلئے جگہ متعین کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس سے متعین جگہ عبادت کرنے کی طبیعت بن جائیگی اور کسی دوسری جگہ عبادت مشکل ہوگی اور عبادت جب طبیعت بن جائے تو اس کو چھوڑ دینا چاہیے، اسی لئے صوم دہر (ہمیشہ روزہ رکھنے) کو مکروہ کہا ہے (جب یہ منع ہے) تو کسی غرض فاسد کیلئے تعین مکان کیسے منع نہ ہو؟

اور نہایہ میں اس کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ آدمی مسجد کے کسی مخصوص حصہ سے مانوس ہوجائے نماز کیلئے، جس طرح اونٹ کسی ریتلی جگہ ٹھہرنے اور بندھنے کے بعد کسی دوسری جگہ نہیں رہتا، دوسرے قول کے مطابق مطلب یہ ہے کہ نمازی اونٹ کی طرح (سجدہ کرتے وقت) ہاتھ لگانے سے پہلے گھٹنے ٹیک دے۔طیبیؒ نے یہ نقل کیا ہے اور یہاں دوسرا معنی کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس کا مشبہ بہ بنا ممکن نہیں ہے، اور اگر یہ معنی مراد لے بھی لیا جائے تو نہی مسجد میں مخصوص جگہ بنالینے کے ساتھ خاص نہ رہے گی، لہٰذا مذکورہ تقریر دلالت کرتی ہے کہ مراد پہلا معنی ہی ہے۔بقول ابن حجرؒ اس میں حکمت یہ ہے کہ اس سے ریاکاری، شہرت اور دکھلاوا پیدا ہوتا ہے اور نمازی عادت کا پابند ہوجاتا ہے اور حظِ نفس اور شہوات جنم لیتی ہیں، اور یہ تمام آفات ہیں تو جہاں تک ہو سکے ان چیزوں سے دور رہنا متعین ہوگیا جو آفات کا سبب بنتی ہیں۔ (رواہ ابوداؤد، والنسائی، والدارمی)

بقول میرکؒ امام احمدؒ، ابن ماجہ وابن حبان نے اپنی صحیح میں بھی روایت کیا ہے بقول منذری کے۔ابن عمرؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ جب تو سجدہ کرے تو پیشانی زمین پر جمادے اور ٹھونگ نہ مار۔ابن حبان نے اپنی صحیح میں اسی طرح روایت کیا مگر من الارض کا لفظ حذف کردیا ہے اور امام نوویؒ کا شرح المہذب میں اس کو غریب ضعیف کہنا تعجب کی بات ہے ہاں بقول ابن الملقن کے اس کا ایک اور ضعیف طریق بھی ہے جس کی طبرانی نے الکبیر میں تخریج کی ہے۔

اقعاء منع ہے

۹۰۳: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَاعَلِيُّ اِنِّيْ اُحِبُّ لَكَ مَا اُحِبُّ لِنَفْسِيْ وَاَكْرَهُ لَكَ مَا اَكْرَهُ لِنَفْسِيْ لَا تُقْعِ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ ۔ (رواه الترمذی)

الترمذی ۲/۷۲ حدیث رقم ۲۸۲۔

ترجمہ: ''حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے علیؓ جو چیز میں اپنے لئے محبوب رکھتا ہوں وہ تمہارے لئے بھی محبوب رکھتا ہوں۔ اور جو چیز اپنے لئے ناپسند کرتا ہوں وہ تمہارے لئے بھی ناپسند کرتا ہوں دونوں سجدوں کے درمیان اقعاء نہ کرو۔'' (ترمذی)

تشریح: **یا علی انی احب لك ما احب لنفسي واكره ما اكره لنفسي:** مقصود نصیحت کرنے کیلئے اظہارِ محبت ہے ورنہ محبت تو ہر مؤمن کے ساتھ ایسی ہی ہے۔

لا تقع : ''تاء'' کے ضمہ کے ساتھ۔

بين السجدتين: بقول بعض اقعاء اس کو کہتے ہیں کہ آدمی سرین زمین پر لگا کر پنڈلیاں کھڑی کر دے اور دونوں ہاتھ زمین پر رکھ دے جیسے کتا بیٹھتا ہے، اور بقول بعض سرین ایڑیوں پر رکھنے کو کہتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ''اقعاء'' کہتے ہیں رانیں اور پاؤں کھڑے کر کے سرین پر بیٹھنا اور یہی قول اصح ہے۔

المستقص میں کہا ہے کتے کا اقعاء زمین پر ہاتھ کھڑے رکھنے میں اور آدمی کا اقعاء گھٹنے کھڑے کر کے سینے کے ساتھ لگانے میں ہے اور اس کو شرح منیۃ میں ذکر کیا ہے، اور بقول ابن حجرؒ مطلب یہ ہے کہ سرین پر نہ بیٹھے رانیں کھڑی کر کے، اس لئے کہ یہ بہت سے علماء کے نزدیک مکروہ ہے یا ایڑھیوں پر مت بیٹھو، اس لئے کہ یہ بھی ایک جماعت کے نزدیک مکروہ ہے لیکن مسلم شریف کی حدیث میں آیا ہے کہ دو سجدوں کے درمیان اقعاء سنت ہے اور خطابی کے زعم میں حرام ہے نیز یہ کہ یہ حدیث منسوخ اور ضعیف ہے۔ (رواہ الترمذی)

رکوع اور سجدہ میں پشت کو سیدھا رکھنا

۹۰۴: وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ الْحَنَفِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى صَلَاةِ عَبْدٍ لَا يُقِيْمُ فِيْهَا صُلْبَهٗ بَيْنَ خُشُوْعِهَا وَسُجُوْدِهَا ۔ (رواه احمد)

أحمد فی المسند ٤/٢٢۔

ترجمہ: ''حضرت طلق بن علی حنفیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ اس انسان کی نماز کی طرف نہیں دیکھتا جو اپنی نماز کے رکوع اور سجدہ میں اپنی پیٹھ کو سیدھا نہیں کرتا۔'' (احمد)

تشریح: **وعن طلق بن علی الحنفی :** بنی حنیف قبیلہ سے ہیں۔

قال: قال رسول الله صلی علیه وسلم لا ینظر الله عزوجل: یعنی نظر قبولیت سے نہیں دیکھتے۔

الی صلاۃ عبد لا یقیم فیها حلبه یعنی قومہ میں، اس کی وضاحت یہ ہے۔

بین خشوعها: یعنی رکوع۔

وسجودها: رکوع کو خشوع اس لئے کہا کہ خشوع والے کی یہی حالت ہوتی ہے، نیز اس بات پر تنبیہ کرنے کیلئے کہ اس حالت کا اولین مقصد خشوع اور عاجزی ہے۔ طیبی نے اس کو ذکر کیا۔ (رواہ احمد)

بقول میرکؒ طبرانی نے الکبیر میں روایت کیا ہے، اور اس میں بین رکوعها وسجودها کے الفاظ ہیں اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

ہاتھ بھی سجدہ کرتے ہیں

۹۰۵: وَعَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ کَانَ یَقُوْلُ مَنْ وَضَعَ جَبْهَتَهٗ بِالْاَرْضِ فَلْیَضَعْ کَفَّیْهِ عَلَی الَّذِیْ وَضَعَ عَلَیْهِ جَبْهَتَهٗ ثُمَّ اِذَا رَفَعَ فَیَرْفَعُهُمَا فَاِنَّ الْیَدَیْنِ تَسْجُدَانِ کَمَا یَسْجُدُ الْوَجْهُ۔ (رواہ مالك)

مالك فی الموطأ ۱/۱۶۳ حدیث رقم ۶۰ من کتاب قصر الصلاۃ فی السفر۔ أبوداوٗد ۱/۵۵۳ حدیث ۸۹۲۔

ترجمہ: ''حضرت نافعؒ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے تھے کہ جو آدمی اپنی پیشانی زمین پر رکھے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو بھی زمین پر اسی جگہ رکھے جہاں پیشانی رکھی جاتی ہے پھر جب سجدہ سے اٹھے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو بھی اٹھالے کیونکہ جس طرح چہرہ سجدہ کرتا ہے اسی طرح دونوں ہاتھ بھی سجدہ کرتے ہیں۔'' (مؤطا امام مالک)

تشریح: وعن نافع: ابن عمر کے آزاد کردہ غلام۔

ان ابن عمر کان یقول من وضع جبهته: یعنی رکھنے کا ارادہ کرے۔

بالارض فلیضع کفیه علی الذی: یعنی اس جگہ کے مقابل۔

وضع علیه جبهته: جیسا کہ ہمارا مختار مذہب یہی ہے یعنی نہ کہ کندھوں کے برابر جیسا کہ شافعیؒ کا مختار مذہب ہے۔

ثم اذا رفع: یعنی پیشانی اٹھائے۔

فلیرفعهما: یعنی ہتھیلیاں۔

فان الیدین: ہتھیلیاں رکھنے کی علت ہے۔

تسجدان کما یسجد الوجه: یعنی پیشانی اور ناک، اس میں انگلیاں قبلہ کی طرف رکھنے کے استحباب کی طرف اشارہ ہے۔ (رواہ مالک)

بقول ابن حجرؒ ابوداؤد نے مرفوعاً اس کو روایت کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: ان الیدن تسجداین کما یسجد الوجه فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنا چہرہ رکھے تو ساتھ ہی دونوں ہاتھ رکھ دے اور جب چہرہ اٹھائے تو ہاتھ بھی اٹھالے۔

بَابُ التَّشَهُّدِ

تشہد کا بیان

بقول قاضی مخصوص ذِکر کو تشہد کا نام اس لئے دیا کہ اس میں دو کلمہ شہادت ہیں۔

الفصل الاول:

قعدہ کا طریقہ

۹۰۶: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَعَدَ فِی التَّشَھُّدِ وَضَعَ یَدَہُ الْیُسْرٰی عَلٰی رُکْبَتِہِ الْیُسْرٰی وَوَضَعَ یَدَہُ الْیُمْنٰی عَلٰی رُکْبَتِہِ الْیُمْنٰی وَعَقَدَ ثَلَاثَۃً وَخَمْسِیْنَ وَاَشَارَ بِالسَّبَّابَۃِ۔

مسلم ۱/۴۰۸ حدیث (۱۱۵ـ۵۸۰)۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشہد میں بیٹھتے تو اپنا بایاں ہاتھ اپنے بائیں گھٹنے پر رکھتے اور اپنا دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر رکھتے اور اپنا ہاتھ مثل ترپن عدد کے بند کر کے سبابہ انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے تھے۔''

تشریح: **اذا قعد فی التشھد**: یعنی زمانہ تشہد میں یا تشہد کیلئے، یہ احتمال دوسرے اور پہلے سے عام ہے۔

وضع یدہ الیسری: یعنی ہاتھ کا اندرونی حصہ انگلیاں کھول کر اور قبلہ کی طرف کر کے اتباع کیلئے، جیسا کہ آ رہا ہے۔

علی رکبتہ الیسری: یعنی گھٹنے کے قریب بائیں ران کے اوپر یہ معنی جمع بین الاحادیث کیلئے ہے، اور ہوسکتا ہے کہ بایاں ہاتھ پہلے اس لئے رکھتے ہوں تا کہ دایاں ہاتھ سجدہ کی جگہ رہے جو کہ قعدہ سے اشرف ہے جس طرح مسجد سے نکلتے وقت بایاں پاؤں رکھنے میں مقدم ہے یا اگلے حکم پر عطف کی وجہ سے

ووضع یدہ الیمنی علی رکبتہ الیمنی: مکمل ہاتھ گھٹنوں پر رکھنے میں حکمت لغو حرکت سے حفاظت اور ادب کی رعایت کیلئے ہے۔

وعقد: یعنی دائیں ہاتھ سے، اور ''واوَ'' مطلق جمع کیلئے ہے، لہٰذا معیت کا بھی احتمال ہے جیسا کہ شوافع کا مذہب ہے اور بدایت کا بھی احتمال ہے جیسا کہ ابن ہمام نے کہا ہے۔

ثلاثۃ و خمسین: اور وہ اس طرح ہے کہ چھنگلی اور اس کے ساتھی والی اور بڑی انگلی کی جڑ میں رکھے۔

بقولِ طیبیؒ فقہاء کے نزدیک اس کی کئی صورتیں ہیں، ایک جو بیان ہو چکی، دوسری صورت یہ کہ بڑی انگلی بند کر کے انگوٹھے کو اس کے ساتھ ملا دے جیسا کہ تئیس کا عدد بنانے کیلئے کیا جاتا ہے اس لئے کہ ابن زبیرؓ نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ تیسری

صورت یہ کہ چھنگلی اور اس کے ساتھ کی انگلی بند کر لے اور شہادت کی انگلی کھلی رکھے اور انگوٹھا اور بڑی انگلی ملا کر حلقہ بنائے، جیسا کہ وائل بن حجر نے روایت کیا ہے اور آخری صورت ہی ہمارے نزدیک مختار ہے، بقول رافعی ان تمام صورتوں کے بارے میں احادیث وارد ہوئی ہیں گویا کہ آپ علیہ السلام کبھی ایک طرح عقد بناتے تھے کبھی دوسری طرح۔

واشار بالسبابة: بقول طیبیؒ یعنی ''الا اللہ'' کہتے وقت اٹھائے تا کہ توحید میں قول وفعل کی مطابقت ہو جائے، اور ہمارے نزدیک ''لا الٰہ'' کے وقت اٹھائے ''الا اللہ'' پر رکھ دے کیونکہ اٹھانا نفی کے مناسب ہے اور رکھنا اثبات کے، اور تا کہ حقیقۃً قول و فعل مطابق ہو جائیں۔ بقول ابن حجرؒ اس کو **سبابه** اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ جھگڑے اور بُرا بھلا کہتے وقت اس سے اشارہ کیا جاتا ہے اور اس کو **سبحه** بھی کہتے ہیں اس لئے کہ اس سے اللہ تعالیٰ توحید وتنزیہہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

پھر فرمایا کہ ابن عمرؓ کا اس عقد اور مخصوص اور انتہائی مشکل حساب جاننا اس حدیثِ مشہور کے منافی نہیں جس فرمایا کہ ہم امّی اُمت ہیں لکھنا، پڑھنا اور حساب کرنا نہیں جانتے، اس لئے کہ یہ اکثر افراد پر محمول ہے یا اس حساب مذموم پر محمول ہے جو فنِ نجوم تک پہنچائے، پھر شہادت کی انگلی کو خاص کیا گیا کیونکہ اس کا دل کی رگ کے ساتھ ملاپ ہے تو اس کو حرکت دینا یہ حضورِ قلب کا سبب ہوگا اور **یمنی، یمن** سے ہے بمعنی برکت، اس لئے اس کو بند کر کے نمازی کیلئے خیر و برکت کی نیک فالی کی طرف اشارہ کیا گیا۔

۹۰۷: وَفِیْ رِوَایَةٍ کَانَ اِذَا جَلَسَ فِی الصَّلَاةِ وَضَعَ یَدَیْهِ عَلٰی رُکْبَتَیْهِ وَرَفَعَ اِصْبَعَهُ الْیُمْنَی الَّتِیْ تَلِی الْاِبْهَامَ یَدْعُوْبِهَا وَیَدَهُ الْیُسْرٰی عَلٰی رُکْبَتِهٖ بَاسِطَهَا عَلَیْهَا۔ (رواه مسلم)

مسلم ۴۰۸/۱ حدیث (۱۱۴-۵۸۰)۔

ترجمہ: ''اور ایک دوسری روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بیٹھتے تو دونوں ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں پر رکھ لیتے تھے اور دائیں ہاتھ کی انگلی کو جو انگوٹھے کے قریب ہے اٹھاتے اور اس کے ساتھ اشارہ کرتے اور بایاں ہاتھ اپنے گھٹنے پر کھول کر رکھتے۔'' (مسلم)

تشریح: وفی روایة کان اذا جلس فی الصلاة: یعنی تشہد کیلئے جیسا کہ پہلی روایت نے وضاحت کی۔

وضع یدیه علی رکبتیه: بقول ابن حجرؒ لیکن اس بارے میں روایات مختلف ہیں جیسا کہ گزشتہ اور آئندہ آنے والی روایات سے معلوم ہوا۔

ورفع اصبعه: بقول ابن حجرؒ اس کا قبلہ رخ اٹھانا سنت ہے کیونکہ اس کے بارے میں حدیث میں وارد ہے، جس کو بیہقی نے روایت کیا ہے اور یہ بھی سنت ہے کہ اس کو اٹھاتے وقت توحید واخلاص کی نیت کر لے کیونکہ اس بارے میں بھی حدیث وارد ہے جس کو بیہقی نے روایت کیا ہے اور یہ بھی سنت ہے کہ نظر اشارہ کی جگہ سے آگے نہ جائے آئندہ آنے والی روایت کی اتباع کی وجہ سے، اور یہ بھی کہ خاص ''الا اللہ'' کہتے وقت انگلی اٹھائے روایت مسلم کی وجہ سے، اور اسی سے حدیث ابی داؤد کے عموم کی تخصیص بھی ہوتی ہے یہ روایت آئندہ آنے والی ہے اس میں دُعا کے وقت اشارہ کا ذکر ہے مراد اس سے بھی تشہد کے وقت اٹھانا ہے۔

اور تشہد کو دُعا اس لئے کہا کیونکہ یہ دُعا پر مشتمل ہے۔ اور دوسری روایت آپ علیہ السلام کا ارشاد ویدعو بھا اسی قبیل سے ہے یعنی تشہد کہے۔ اور تشہد کے آخر تک انگلی اٹھا کر رکھنا بھی سنت ہے جیسا کہ بعض ائمہ اس کے قائل ہیں۔

الیمنی التی تلی الابھام: اس حدیث کا ظاہر دلالت کرتا کہ اشارہ کرتے وقت انگلیاں بند نہ کی جائیں، اور ہمارے بعض ائمہ کا مختار قول یہی ہے۔

یدعو: اور ایک نسخہ میں **فیدعو** ہے یعنی "**لا الٰہ الا اللہ**" کہے اور حمد بیان کرے، تہلیل وتحمید کو دُعا کا نام دیا، اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی وفضل کو حاصل کرنے کے قائم مقام ہے، اور اسی وجہ سے کہا گیا: **اذا اثنی علیك المرء یوما، کفاہ من تعرضہ الثناء** یعنی جب کسی دِن آدمی نے تیری تعریف کر دی، تو اس کو اس کے تعرض سے تعریف کرنا کافی ہو گیا، اور آپ علیہ السلام کا فرمان اسی قبیل سے ہے کہ عرفہ کے دن سب سے بہتر دُعا **لا الٰہ الا اللہ وحدہ** ہے......۔ اور بقول ابن حجرؒ تشہد کو دُعا اس لئے فرمایا کیونکہ اس میں دُعا بھی ہے اس لئے کہ: **السلام علیك ایھا النبی** سے **صالحین** تک تشہد کا حصہ ہے اور یہ تمام دُعا ہے اور اس کو لفظ اخبار سے تعبیر کیا مزید تاکید کیلئے اور اسی وجہ سے ائمہ بیان نے کہا ہے کہ **غفر اللہ لہ** کا جملہ **اللھم اغفر لہ** سے بہتر ہے کیونکہ پہلا جملہ وقوعِ مغفرت کی قوی اُمید کو ظاہر کرتا ہے گویا مغفرت ہو چکی اور اب ماضی کے صیغہ سے مغفرت کی خبر دے رہا ہے، بخلاف دوسرے کے کہ اس میں محض طلب ہے۔

بھا: بقول طیبیؒ کے یا تو **یدعو** کے ضمن میں **یشر** کا معنی کا ہے یعنی **یثیر بھا داعیا الی وحدانیۃ اللہ بالا لھیۃ** یا حال ہے یعنی **یدعو مشیرًا بھا**)۔

ویدہ الیسری: نصب کے ساتھ ہے صحیح نسخوں میں، اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ، اور یہی ظاہر ہے۔

علی رکبیتہ باسطھا: بقول ابن الملکؒ "طاء" کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ، یعنی ہاتھ کھول کر۔

علیھا: یعنی تشہد کے وقت انگلی اٹھائے بغیر، گھٹنے پر۔ (رواہ مسلم)۔ بقولِ میرکؒ نسائی نے بھی۔

قعدہ میں اشارہ کیا جائے

۹۰۸: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا قَعَدَ يَدْعُوْ وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُمْنٰى وَيَدَهُ الْيُسْرٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُسْرٰى وَاَشَارَ بِاِصْبَعِهِ السَّبَّابَةِ وَوَضَعَ اِبْهَامَهُ عَلٰى اِصْبَعِهِ الْوُسْطٰى وَيُلْقِمُ كَفَّهُ الْيُسْرٰى رُكْبَتَهُ ۔ (رواہ مسلم)

مسلم ۱/۴۰۸ حدیث (۱۱۴۔۵۸۰)۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیٹھتے تو اپنے دائیں ہاتھ کو اپنی دائیں ران پر اور اپنے بائیں ہاتھ کو بائیں ران پر رکھتے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے تھے اور اپنے انگوٹھے کو درمیانی انگلی پر رکھتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بائیں ہاتھ سے بایاں گھٹنا پکڑتے رکھتے تھے۔" (مسلم)

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن الزبیر۔ یہ عبداللہ بن زبیر ہیں ان کی کنیت ''ابوبکر'' ہے۔مرتب عرض کرتا ہے کہ جلد دہم میں مذکور ابونوفل معاویہ بن مسلم کی روایت حدیث:۶۰۰۳ میں ان کی کنیت ''ابوخبیب'' مذکور ہے اھ۔ یہ اسدی قریشی ہیں۔ان کی یہ کنیت ان کے نانا جان ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کی کنیت پر اوران کے نام پر نام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا تھا۔مدینہ میں مہاجرین میں یہ سب سے پہلے بچے تھے۔ جو اھ میں پیدا ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے کان میں اذان کہی ان کی والدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے مقام قباء میں ان کو جنا اوران کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائیں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں رکھ دیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوارا منگایا اوراس کو چبایا اور کچھ لعاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے منہ میں ڈالا اور چھوارا چبا کر ان کے تالو سے لگایا۔تو سب سے پہلی چیز جو ان کے پیٹ میں داخل ہوئی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لعاب مبارک تھا۔پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے برکت کی دعاء کی۔ یہ بالکل صاف چہرہ والے تھے۔ ایک بال بھی ان کے چہرے پر نہ تھا' نہ داڑھی تھی۔ یہ بڑے روزے رکھنے والے اور بہت نوافل پڑھنے والے تھے۔موٹے تازے' بڑے قوی' بارعب تھے۔حق بات ماننے والے تھے۔تعلقات اور شتہ کے قائم رکھنے والے تھے ان میں وہ باتیں جمع تھیں جو دوسرے میں نہ تھیں۔ چنانچہ ان کے والد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مصاحبین میں سے تھے۔ان کی والدہ اسماء رضی اللہ عنہا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں۔ان کے نانا ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے ان کی دادی صفیہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں۔ان کی خالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں جو ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے ہیں۔آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی جب کہ ان کی عمر آٹھ سال کی تھی۔حجاج بن یوسف نے مکہ میں ان قتل کیا اور منگل کے دن ۱۷ جمادی الثانیہ ۷۳ھ کوانہیں سولی پر لٹکایا۔ان کے لیے ۶۴ھ میں خلافت کے لیے بیعت لی گئی۔اس سے پہلے ان کی خلافت کی کوئی بات چیت نہ تھی ان کی خلافت ماننے پر اہل حجاز' یمن' عراق' خراسان وغیرہ سوائے شام کے یا کچھ حصہ شام کے سب تیار تھے انہوں نے لوگوں کے ساتھ آٹھ حج کئے ان سے ایک بڑی جماعت روایت کرتی ہے۔

عرض مرتب: ان کی شہادت کی تفصیل جلد دہم' باب مناقب قریش وذکر الفضائل' فصل ثالث حدیث:۶۰۰۳ کے تحت آئے گی۔اھ

تشریح: کان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا قعد یدعو: یعنی تشہد پڑھتے، بقول طیبیؒ دُعا پر مشتمل ہونے کی وجہ سے تشہد کو دُعا فرمایا، اس لئے کہ السلام علیک اور السلام علینا دونوں جملے دعا ہیں۔

ویده الیسری علی فخذه الیسری واشار باصبعه السبابة) یعنی شہادت کی انگلی سے اشارہ فرمایا۔

ووضع: حال ہے یعنی وقد وضع۔اور بقول ابن حجرؒ یعنی تشہد کیلئے بیٹھنے کے شروع سے، جیسا کہ اس پر دیگر روایات دلالت کرنے والی ہیں اور ہمارے نزدیک معتمد اشارہ کا ارادہ کرتے وقت کرنا ہے۔

ابهامه علی اصبعه الوسطی ویلقم: یعنی بعض اوقات۔

کفه الیسری رکبته: یعنی بایاں، بقول سید جمال الدین مظہر نے یلقم کو التلقیم سے بنایا ہے اور جمہور شراح کے نزدیک الالقام سے ہے۔

بقول طیبیؒ کہا جاتا ہے: **لقمت الطعام** اس وقت بولا جاتا ہے جب لقمہ منہ میں ڈالا جائے۔ یعنی گھٹنے کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں داخل کرتے۔ بقول ابن الملکؒ یعنی گھٹنا ایسے ہو جاتا جیسے ہاتھ میں لقمہ، بقول ابن حجرؒ اس میں اور گذشتہ اُس روایت میں کوئی منافات نہیں جس میں ہتھیلیوں کو رانوں پر گھٹنوں کے قریب رکھنے کی سنت مذکور ہے اس طرح کہ انگلیاں گھٹنوں کو مَس کریں اس لئے کہ وہ کمال سنت کے بیان کیلئے اور یہ اصل سنت کے بیان کیلئے ہے، لہٰذا ہمارے اصحاب میں سے جو اس کو اس وجہ سے ترک کرنے کے قائل ہیں کہ ایسا کرنے سے اس کا رُخ قبلہ کی طرف نہیں رہتا تو وہ اس روایت سے غافل ہیں اور شرح مسلم میں ذکر کردہ امام نوویؒ کا جو قول میں نے ذکر کیا ہے اس سے اس کی تائید ہوتی ہے اور وہ قول یہ ہے کہ ہاتھوں کو گھٹنوں کے قریب یا گھٹنوں پر رکھنے کے مندوب ہونے پر اجماع ہے۔ (رواہ مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشہد میں اصلاح کی

۹۰۹: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كُنَّا اِذَا صَلَّيْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ قُلْنَا السَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ قَبْلَ عِبَادِهٖ اَلسَّلَامُ عَلٰى جِبْرِيْلَ السَّلَامُ عَلٰى مِيْكَائِيْلَ اَلسَّلَامُ عَلٰى فُلَانٍ فَلَمَّا انْصَرَفَ النَّبِيُّ ﷺ اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ قَالَ لَا تَقُوْلُوْا اَلسَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّلَامُ فَاِذَا جَلَسَ اَحَدُكُمْ فِي الصَّلٰوةِ فَلْيَقُلْ اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ فَاِنَّهٗ اِذَاقَالَ ذٰلِكَ اَصَابَ كُلَّ عَبْدٍ صَالِحٍ فِي السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ لِيَتَخَيَّرْ مِنَ الدُّعَاءِ اَعْجَبَهٗ اِلَيْهِ فَيَدْعُوْهُ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری ۲/۳۱۱حديث رقم ۸۳۱ ومسلم۱/۳۰۱حديث رقم (۵۵-۴۰۲)وأبو داوٗد ۱/۵۹۱حديث رقم ۹۶۸ والنسائی ۲/۲۴۰حديث ۱۱۶۸-وابن ماجة ۱/۲۹۰حديث رقم ۸۹۹-والدارمی ۱/۳۵۵حديث ۱۳۴۰- وأحمد ۱/۳۷۶-

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے تھے تو یہ پڑھا کرتے تھے: **السلام علی اللہ......** ۔اللہ پر سلام ہے اس کے بندوں پر سلام بھیجنے سے پہلے جبرائیل پر سلام ہے میکائیل پر سلام ہے اور فلاں پر سلام ہے جب ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اللہ پر سلام نہ کہو کیونکہ اللہ خود سلام ہے جب تم میں سے کوئی نماز میں بیٹھے تو یہ کہے کہ **التحیات للہ**۔ سب زبانی عبادتیں اور بدنی عبادتیں اور مالی عبادتیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں اے نبی آپ پر سلام اور اللہ کی برکتیں ہم پر بھی اور اللہ کے سب نیک بندوں پر سلام ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی ان کلمات کو کہتا ہے تو اس کی برکت زمین و آسمان میں ہر نیک بندے کو پہنچتی ہے میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور بندے ہیں اس کے بعد آدمی کو جو دعا پسند

ہو وہ اختیار کرے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے۔'' (بخاری، مسلم)

تشریح: قال كنا اذا صلينا مع النبى صلى الله صلى وسلم قلنا: یعنی حالت تشہد میں، تشہد کے شروع ہونے سے پہلے۔

السلام على الله قبل عباده: یعنی بندوں پر سلام سے پہلے، اور یہ ظرف ہے، ہم کہتے ہیں کہ السلام مصدر ہے بمعنی سلامتی، اور اللہ تعالیٰ کا نام بھی ہے۔ اور السّلام سے موصوف اس لئے کیا کیونکہ اس لفظ میں اللہ تعالیٰ کے تمام نقائص سے پاک ہونے یا سلامتی دینے میں مبالغہ ہے، خلخالیؒ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔ بقول میرک ''قبل'' ہمارے اصل سماع کے مطابق مشکوۃ میں اسی طرح ہے، اور صحیح بخاری میں ''قاف'' کے فتحہ اور ''باء'' کے سکون کے ساتھ ہے اور ان دونوں کے بعض نسخوں میں ''قاف'' کسرہ اور ''باء'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اور بخاری کی روایت اس کی تائید کرتی ہے جس میں **السلام على الله من عباده** کے الفاظ ہیں، (اھ) اور السلام علی اللہ تمام نقائص سے اللہ تعالیٰ کے سلامت ہونے کے معنی میں ہے اور ''**على**'' لام کے معنی میں ہے۔

السلام على جبريل: اس میں چار لغات مشہور ہیں۔

السلام على ميكائيل: اس میں تین لغات ہیں۔ لیکن ایک لغت ومیکال، یہاں رسم الخط کے مطابق نہیں بنتی۔

السلام على فلان: یعنی فلان فرشتہ یا فلان نبی، یعنی یہ کلمات التحیات کے بدلے کہتے تھے۔

فلما انصرف النبى صلى الله عليه وسلم: یعنی نماز سے فارغ ہوئے اور بقول بعض معراج سے۔

اقبل علينا بوجهه: یعنی صرف کلام کے ساتھ نہیں، اور بقول بعض یہ تاکید ہے اور جملہ انصرف سے بدل اور ''**لما**'' کا جواب ہے۔

قال لا تقولوا السلام على الله: کیونکہ السلام علیک کا معنی آفات سے سلامتی کی دُعا ہے۔ یعنی تو بُری چیزوں اور عذاب سے سلامت رہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کیلئے جائز نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہی ''السّلام'' ہے یعنی بندوں کو سلامتی وہی دیتا ہے، لہٰذا اسکے لئے دُعا کیسے کی جاسکتی ہے حالانکہ تمام حالات میں اس کے آگے دُعا کی جاتی ہے۔ اور دُعا میں ہے: **اللهم انت السلام**) یعنی یہ نام آپ ہی کے ساتھ خاص ہے نہ کہ کسی اور کیلئے، اس لئے کہ جملہ کے دونوں جزء معرفہ ہیں اور یہ حصر پر دلالت کرتا ہے اور **ومنك السلام** سلامتی کا حصول تجھ ہی سے ہے۔ **واليك يعود السلام** یعنی تیرے غیر سے جو سلامتی صادر ہوتی ہے وہ سلامتی کی صورت ہے اور حقیقت تیری طرف راجع ہے۔

فاذا جلس فى الصلاة فليقل: اس میں امر وجوب کیلئے ہے، بقول ابن الملکؒ۔ لہٰذا رہ جانے کی صورت میں سجدہ سہو کرنا ہوگا۔ اسی طرح قعدہ اولی بھی واجب ہے اس لئے کہ پہلے گزر چکا کہ نبی علیہ السلام نے اس کے چھوٹ جانے سے سجدہ سہو کیا، البتہ قعدہ اخیرہ ہمارے نزدیک فرض ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ جب امام قعدہ اخیرہ میں بیٹھا گیا پھر اس کا وضو ٹوٹ گیا تو اس کی نماز مکمل ہوگئی اور حضرت علیؓ کی موقوف روایت کی وجہ سے کہ جب نمازی تشہد کی مقدار بیٹھا پھر حدث لاحق ہوگیا تو اس کی نماز مکمل ہوگئی اور یہ روایت اگرچہ موقوف ہے لیکن یہاں مرفوع کے حکم میں ہے، البتہ ابن حجرؒ کا ان دونوں کو بالاتفاق ضعیف کہنا

ضعیف ہے کیونکہ اس میں محدثین کا اختلاف ہے۔

التحیات للہ: یعنی نہ کہ کسی اور کیلئے، بقول بعض یہ لفظ "الحیاۃ" سے ہے بروزنِ تفعلۃ، بمعنی زندہ اور باقی رہنا اور بقول بعض "التحیۃ"، بمعنی ملک ہے اور یہ نام اس وجہ سے پڑ گیا کیونکہ ملک (بادشاہت) تحیّہ مخصوصہ کا سبب ہوتا ہے جیسا کہ عربوں کا قول ہے: ابیت اللعن، اسلم، انعم وغیرہ۔ ایک قول کے مطابق التحیہ بمعنی بقاء ہے۔ ایک اور قول میں بمعنی "السّلام" ہے اور جمع کی صورت یہ ہے کہ یہ تمام انواع مراد لی جائیں۔

والصلوات: یعنی پانچوں نمازیں، دوسرا قول یہ ہے وہ تمام عبادات مراد ہیں، یعنی تمام عبادات کا وہی مستحق ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ اللہ کی رحمت مراد ہے۔ ایک اور قول کے مطابق یا انواع رحمت یا وہ دُعائیں جن سے تعظیم مراد ہوتی ہے۔

والطیبات: بقول طیبیؒ جو اس کے لائق و مناسب ہیں، بقول بعض وہ کلمات جو خیر پر دلالت کرتے ہیں جیسے سقاہ اللہ اور رعاہ اللہ۔ اور بقول ابن الملکؒ نمازیں، دُعا، ثناء۔ بقول بعض التحیات سے عبادات قولیہ اور الصلوٰت عبادات سے بدنیہ اور الطیبات سے خیراتِ مالیہ مراد ہے۔ سیوطی نے اس کو نقل کیا ہے۔ اور یہی تمام اقوال میں سے زیادہ جامع قول ہے۔ بقول قاضی اور ایک احتمال یہ ہے کہ الصلوٰات اور الطیبات کا عطف ہو التحیات پر، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ الصلوات مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے اور الطّیّبات معطوف علیہا ہے اور پہلا "واوٗ" جملہ کے ماقبل جملہ پر عطف کیلئے ہے اور دوسرا "واوٗ" مفرد کے جملہ پر عطف کیلئے اور اظہر یہ ہے کہ دونوں "واوٗ" جملہ کے جملہ پر عطف کیلئے ہیں، خبر دونوں میں محذوف ہے جس پر خبر سابق دالّ ہے اور اس کی تائید بعد میں آنے والی حدیث کرتی ہے۔ اور بقول خطابی ابن عباسؓ کی روایت سے "واوٗ" اختصاراً حذف کر دی گئی ہے، اور ایسا کرنا جائز اور عربی زبان میں مشہور ہے، اور امام شافعیؒ نے روایت ابن عباسؓ اور امام ابوحنیفہؒ نے روایتِ ابن مسعودؓ اور امام مالکؒ نے روایتِ عمر رضی اللہ عنہ کو اختیار کیا، اور ان میں کسی کے ساتھ بھی نماز جائز ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں، بحث صرف افضلیت میں ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اختلاف روایات کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بعض نے آپ علیہ السلام سے سن کر کلمات کے معنی یاد کر لیے الفاظ یاد نہ کیے اور بعض نے الفاظ اور معنی دونوں یاد کر لیے اور یہ سب پڑھنا جائز ہے اس لئے کہ مقصود ذکر ہے اور یہ تمام ذِکر ہی ہے اور معنی میں اختلاف نہیں، اور جب قرآن پاک مختلف قراءت میں پڑھنا جائز ہے تو ذکر بدرجہ اولی جائز ہوگا، اور اس میں قرآن کو بالمعنی نقل کرنے کے جواز کا وہم ہے حالانکہ ایسا کرنا بالاجماع ناجائز ہے بخلافِ نقل حدیث کے، اس لئے کہ اس میں بہت بڑا اختلاف ہے پھر طیبیؒ نے حضرت ابن عمرؓ کی وہ روایت بیان کی جو وہ منبر پر بیان کرتے اور لوگوں کو سکھاتے تھے جس میں تشہد کے الفاظ یہ ہیں:

التحیات للہ، الزاکیات للہ، الطیبات، الصلوات للہ، السلام علیك ایھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین۔ اس کو امام مالکؒ نے اختیار کیا ہے اور امام شافعیؒ کا قدیم مذہب یہی ہے۔

السلام علیك: بقول بعض بمعنی اسم "اسلام" ہے یعنی **اسم اللہ علیك**، کیونکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا نام ہے اس لئے کہ

اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کو آفات سے سلامت رکھتا ہے۔ اور بقول زہری اسلام تسلیم کے معنی میں ہے اور جس پر اللہ تعالیٰ سلام نازل کریں وہ تمام آفات سے سلامت رہتا ہے اور بقول بعض عبارت یہ ہے: **السلامة من الآفات كلها عليك**۔ بقول ابن حجرؒ آپ علیہ السلام پر سلام کہنے کی فضیلت میں کئی احادیث وارد ہوئی ہیں ایک حدیث یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا جس رات میری بعثت ہوئی اس رات میں جس درخت اور پتھر کے پاس سے گزرتا تو اس سے آواز آتی السلام علیک یا رسول اللہ۔ دوسری حدیث یہ ہے کہ فرمایا میں مکہ کے ایک ایسے پتھر کو پہچانتا ہوں جو بعثت کی راتوں میں مجھ پر سلام کہا کرتا تھا، اور جب اس کے پاس سے میرا گزر ہوتا ہے تو اس کو پہچان لیتا ہوں۔ بقول بعض یہ وہ مشہور پتھر ہے جو اب باب الجنائز کے سامنے موقف کے راستہ میں ہے۔

ايها النبي ورحمة الله: ''رحمت'' لغت میں نرمی اور نفس کے میلان کو کہتے ہیں اور اس کا نتیجہ فضل واحسان وانعام ہے اور چونکہ نرمی قلب اور میلانِ نفس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر محال ہے اس لئے اس کا نتیجہ مراد لے لیا جو کہ صفت فعل یا صفت ذات ہے۔

وبركاته: برکت اللہ کی طرف سے دائماً آنے والی خیر کو کہتے ہیں اور بقول بعض خیر میں زیادتی کو برکت کہتے ہیں اور لفظ برکة جمع لائے نہ کہ سلام ورحمۃ، اس لئے کہ یہ دونوں مصدر ہیں اور مصدر میں واحد اور جمع برابر ہوتے ہیں۔

السلام علينا: یعنی موجود نمازیوں کی جماعت اور ان کے ساتھ کے فرشتے اور بقیہ مؤمنین جن وانس اور اپنے آپ کو مقدم اس لئے کیا کیونکہ یہ دُعا کا اُدب ہے اور نبی علیہ السلام کو مقدم اس لئے کیا کیونکہ وہ وسیلہ ہیں۔

وعلى عباد الله الصالحين فانه: ضمیر شان ہے یا مصلّی مراد ہے۔

اذا قال ذلك اصاب: اس کا فاعل اس کی خبر ہے یعنی اس دُعا کا ثواب یا اس کی برکت حاصل کر لی۔

كل عبد صالح: صالح کی قید اس لئے لگائی کیونکہ مفسد شخص سلام کا مستحق نہیں ہوتا، اور صالح وہ ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں اداء کرے، یہ بات نوویؒ نے میں زجاج وغیرہ سے نقل کی ہے اور بقول بعض اس سے تمام مسلمان مراد ہیں۔

في السماء والارض: طیبیؒ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے صحابہؓ کو دُعا کا طریقہ سکھایا کہ دُعا مؤمنین کیلئے ایسی کرنی چاہیے جو تمام مسلمانوں کو شامل ہو اور زیادہ عام ہو اور آپ علیہ السلام نے ان کو اپنے متعلق الگ ذکر کرنے کا حکم دیا اُشرف ہونے کی وجہ سے اور زیادتی مرتبہ کی وجہ سے، اور خاص طور پر اپنے لئے دُعا کا حکم دیا، اس لئے اس کا اہتمام ضروری ہے۔

اشهد: یعنی دِل سے جانتا اور زبان سے بیان کرتا ہوں کہ:

ان لا اله الا الله: یعنی کائنات میں معبودِ حقیقی سوائے اللہ کے کوئی نہیں جو اپنی ذات میں واجب الوجود ہے۔

واشهد ان محمدًا عبده ورسوله: بقول ابن الملکؒ مروی ہے کہ معراج میں آپ علیہ السلام نے ان کلمات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ثناء کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **السلام عليك ايها النبي ورحمة الله وبركاته**، پھر آپ علیہ السلام نے کہا **السلام علينا وعلى عباد الله الصالحين** تو جبرائیلؑ نے کہا: **أشهد ان لا اله الا الله وأشهد ان محمدًا عبده ورسوله**۔ اور صیغہ خطاب کی وجہ بھی اس سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کو آپ کی معراج کی حکایت کے طور پر نماز کے آخر میں پڑھا

جاتا ہے جو کہ مؤمنین کی معراج ہے۔

ثم لیتخیر: یعنی پسند کرے۔

من الدعاء اعجبه الیه: یعنی دین و دنیا و آخرت کے متعلق جو دُعا اس کو محبوب اور پسند ہو۔

فیدعوہ: یعنی پسندیدہ دُعا پڑھے، اور بقول بعض تقدیری عبارت **فیدعو به** ہے اور یہ بابِ حذف وایصال سے ہے اور بقول بعض مقدر عبارت یوں ہے: **فیدعو الله به**، مفعول ثانی کو مشہور ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا۔ اور ایک قول کے مطابق جوابِ امر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، پھر جان لے کہ سب سے پسندیدہ دُعا وہی ہے جو نبی علیہ السلام سے مروی ہے اس لئے آپؐ کہ اُدب سکھانے والے ہیں۔

متفق علیه: بقول میرک چاروں نے اس کو روایت کیا ہے مگر نسائی نے کہا ہے کہ لفظِ سلام **سلام علینا** میں نکرہ ہے، اورانہوں نے **وحدہ لا شریك له** کا اضافہ بھی کیا ہے۔

اور ملا حنفی نے حاشیۃ الحصن میں عسقلانی سے نقل کیا ہے کہ حدیثِ ابن مسعودؓ کے کسی طریق میں ''لام'' حذف نہیں اور یہ اختلاف صرف حدیثِ ابن عباسؓ میں ہوا ہے۔ (ملا حنفی کا کلام مکمل ہوا)

اور ہر حال میں ابن مسعودؓ کی روایت الفاظِ تشہد کے بارے میں وارد تمام روایات سے اصح ہے لہٰذا اسی پر عمل کرنا اولیٰ اور اتم ہے جیسا کہ امام اعظمؒ اور جمہور علماء کا یہی مذہب ہے حتیٰ کہ بعض شوافع کا بھی، جن میں سے ایک شیخ علاء الدولۃ سمنانی بھی ہیں۔

کونسا تشہد افضل ہے؟

۹۱۰: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُعَلِّمُنَا التَّشَهُّدَ كَمَا يُعَلِّمُنَا السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْاٰنِ فَكَانَ يَقُوْلُ اَلتَّحِيَّاتُ الْمُبَارَكَاتُ الصَّلَوَاتُ الطَّيِّبَاتُ لِلّٰهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِاللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَرواه مسلم وَلَم اَجِدْ فِي الصَّحِيْحَيْنِ وَلَافِي الْجَمْعِ بَيْنَ الصَّحِيْحَيْنِ سَلَامٌ عَلَيْكَ وَسَلَامٌ عَلَيْنَا بِغَيْرِ اَلِفٍ وَلَامٍ۔ (وَلٰكِنْ رواه صاحب الجامع عن الترمذی)

مسلم ۳۰۲/۱ حدیث رقم ۴۰۳/۶۰۔وأبو داؤد ۵۹۶/۱ حدیث رقم ۹۷۴۔والترمذی ۸۳/۲ حدیث رقم ۲۹۰۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں جس طرح قرآن کریم کی کوئی سورت سکھاتے تھے اس طرح تشہد بھی سکھایا کرتے تھے چنانچہ کہا کرتے تھے تمام برکت والی تعریفیں اور تمام بدنی اور مالی عبادتیں اللہ ہی کے لئے ہیں اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ ﷺ پر سلام اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں ہم پر بھی اور اللہ کے نیک بندوں پر بھی سلام ہو اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ (مسلم) میں نے اس روایت کو

صحیحین میں نہیں پایا اور نہ جمع بین صحیحین میں سلام علیک اور سلام علیک بغیر الف لام کے پایا ہے لیکن اس کو صاحب جامع الاصول نے امام ترمذیؒ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يعلمنا التشهد: جزء اشرف کے نام پر کل کا نام تشہد پڑ گیا جیسا کہ اہلِ بلاغت کا تسمیۃ الکل باسم البعض کے بارے میں قاعدہ ہے۔

كما يعلمنا السورة من القرآن: اس میں اس کے اہتمام پر دلالت اور وجوب کی طرف اشارہ ہے۔

الصلوات الطيبات لله: ہمارے علماء کا قول ہے کہ تشہدِ ابن مسعودؓ کی وجہِ ترجیح ایک یہ بھی ہے کہ "واوٴ" عطف مغایرت کا تقاضا کرتی ہے لہٰذا اس پر جملہ مستقل ثناء بنے گا بخلاف اس صورت کے کہ جب واوٴ گر جائے کیونکہ پہلے لفظ کے علاوہ تمام الفاظ اس کی صفت ہونے کی وجہ سے ثناء کا ایک جملہ بنے گا اور پہلی صورت زیادہ بلیغ ہے، اور واوٴ کے ذریعے عطف کرنا جائز ہے لیکن عبارت مقدر لانا خلاف ظاہر ہے اس لئے کہ معنی تقدیری عبارت کے بغیر بھی صحیح ہے۔

بقول طیبیؒ امام شافعیؒ نے روایت ابن عباسؓ کو اختیار کیا حالانکہ ابن مسعودؓ کی روایت انتہائی صحیح ہے اس لئے کہ ابن عباسؓ بڑے فقیہ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے شوافع کے نزدیک وہ بڑے فقیہ ہوں لیکن ہمارے امام صاحبؒ کے نزدیک ابن مسعودؓ خلفاء راشدین کے بعد تمام صحابہؓ سے بڑے فقیہ ہیں اور یہ اظہر ہے اس لئے کہ وہ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں بڑی عمر کے تھے اور اکثر آپ علیہ السلام کے ساتھ رہے، اور ہمیشہ آپ کی خدمت کرتے تھے مثلاً نعل مبارک، تکیے اور لوٹے اور مصلیٰ کی دیکھ بھال وغیرہ۔ پھر طیبیؒ نے شافعیؒ مذہب کی ترجیح کی دوسری وجہ بیان کی کہ روایت ابن عباسؓ زیادت پر مشتمل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ زیادت ثقہ مقبول ہے لیکن موجبِ ترجیح نہیں ہے، پھر کہا ان کی روایت قولِ باری تعالیٰ ﴿تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً﴾ [النور: ٦١] "(یہ) خدا کی طرف سے مبارک (اور) پاکیزہ (تحفہ) ہے" کے موافق ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ موافقت محض لفظی ہے ورنہ یہ آیت گھروں داخل ہوتے وقت سلام کے بارے میں ہے، پھر کہا اور اس لئے کہ ان کے الفاظ میں الفاظ رسول ﷺ کی زیادتی ضبط پر دلالت ہے اور وہ ان کا یہ قول ہے: **كان يعلمنا**...... اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ ابن عباسؓ کے ساتھ سیکھنے میں اور صحابہ بھی شریک تھے اور ان کا اس کو نقل کرنا زیادت ضبط پر دلالت نہیں کرتا بلکہ تمہارا جواب وہ روایت ہے جو تشہدِ ابن مسعودؓ کے بارے میں صحیح سنت سے ثابت ہے (جس کے الفاظ یہ ہیں)۔

علمني النبي صلى الله عليه وسلم وكفي بين كفيه التشهد كما يعلمني السورة من القرآن التحيات لله...... اور یہ روایتِ جابرؓ کے منافی نہیں جس میں **انه كان يعلمنا كما يعلم السورة** کے الفاظ ہیں کیونکہ روایتِ ابن مسعودؓ اصح ہے اور اسی لیے امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ اور جمہور فقہاء و محدثین نے اس کو اختیار کیا، اور امام مالکؒ و شافعیؒ نے قولِ قدیم میں تشہدِ عمرؓ کو اختیار کیا جو کہ حضرت عمرؓ نے منبر پر سکھایا تھا، اور وہ یہ ہے: **التحيات لله، الزاكيات لله، الطيبات لله، الصلوات لله السلام عليك**......

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا نزاع آپ سے اصلی ثبوت کے بارے میں نہیں بلکہ اس بارہ میں ہے کہ اکثر اہتمام کس کا فرماتے تھے یا اس طریق کے بارے میں ہے جس سے ہمیں اصح روایت پہنچی ہے، اور وہ تشہد ابن مسعودؓ ہے اور ظاہر ہے کہ

افضلیت میں اور تمام کے جائز ہونے میں اختلاف ایسا ہی ہے جیسا کہ روایاتِ قرآنیہ میں اختلاف اور طیبیؒ نے ذکر کیا ہے کہ امام شافعیؒ کے بقول احتمال ہے کہ تشہدات میں اختلاف پیدا ہونے کی وجہ یہ ہو کہ بعض نے معنی تعبیر کر دیئے نہ کہ لفظ، اور آپ علیہ السلام نے ان کو اس پر قائم رکھا کیونکہ مقصود ذِکر ہے اور ابن حجرؒ نے عجیب طریقہ سے ان کی گرفت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ احتمال غریب ہے بلکہ یہاں تو لفظ ہی مقصود ہے اس لئے کہ واجب تشہد کے کلمہ کو اس جیسے کلمہ سے بدلنا جائز نہیں تو کسی اور لفظ سے بدلنا کیسے جائز ہو گیا؟

السلام علیك ایها النبی ورحمة الله وبركاته بقول طیبیؒ اس میں اور مابعد میں اعنی کہنا جائز ہے۔

السلام علینا وعلی عباد الله الصالحین: ''لام'' کے حذف واثبات کے ساتھ، اور اثبات افضل ہے اور وہی روایت صحیحین میں موجود ہے۔ میں کہتا ہوں بلکہ صحاحِ ستہ جیسا کہ پہلے گزرا، اور عنقریب آگے آئے گا۔

اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدًا رسول الله: ابن عباسؓ اس لفظ کے بیان میں منفرد ہیں کیونکہ تمام تشہدات جو حضرت عمرؓ، ابن مسعودؓ، جابرؓ، ابو موسیٰؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ سے مروی ہیں ان سب میں **واشهد ان محمدًا عبده ورسوله** کا لفظ ہے اور منقول ہے کہ آپ علیہ السلام کا تشہد ہمارے تشہد کی طرح تھا، البتہ رافعی کا یہ کہنا کہ نبی علیہ السلام اپنے تشہد میں **اشهد انی رسول الله** کہا کرتے تھے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بے اصل بات ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء میں کہا ہے کہ السلام علیک کہنے سے پہلے اپنے دل میں آپ علیہ السلام کی ذات کا استحضار پیدا کر اور دل تصدیق کرے۔

اور آپ علیہ السلام اس سے اکمل طریقہ سے تجھے جواب دیتے ہیں البتہ ابن مسعودؓ کا یہ قول کہ آپ علیہ السلام کی زندگی مبارک میں ہم **السلام علیك ایها النبی** کہا کرتے تھے اور وفات کے بعد السلام علی النبی کہنے لگے تو یہ ابو عوانہ کی روایت ہے اور بخاری کی روایت اس سے اصح ہے جو بیان کرتی ہے کہ یہ حضرت ابن مسعودؓ کا قول نہیں ہے بلکہ راوی ان سے اس طرح سمجھے، اور اس کے الفاظ یہ ہیں: **فلما قبض قلنا سلام یعنی علی النبی** پس ان کا قول **قلنا سلام** احتمال یہ بھی ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ ہم صیغہ خطاب سے رک گئے اور جب لفظ میں احتمال پیدا ہو جائے تو اس میں دلالت نہیں رہتی ابن حجر نے اسی طرح ذکر کیا۔ (رواہ مسلم)

اور بقول ائمہ اربعہ احمد اور ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے۔

ولم اجده فی الصحیحین ولا فی الجمع یعنی حمیدی کی۔

بین الصحیحین۔

سلام علیك وسلام علینا بغیر الف ولام ولكن رواه ۔ یعنی ابن اثیر۔ **(صاحب الجامع)** یعنی اصول ستہ کے۔

عن الترمذی: بقول ابن حجرؒ بعض ائمہ نے مسلم سے ذکر کیا ہے، پس بظاہر بعض نسخوں میں اور گویا کہ وہ ائمہ حدیث کے نزدیک صحیح نہیں، کہا کہ شافعی اور احمد نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ پس خلاصہ یہ نکلا کہ یہ روایت صحاح کے خلاف ہے پھر **سلام علیك** اصل میں **سلمت سلاما علیك** تھا، پھر فعل کو حذف کر کے مصدر کو اس کا قائم مقام بنا دیا اور مبتداء ہونے کی وجہ سے

نصب سے رفع میں تبدیل ہو گیا دوام اور ثبوت کا معنی حاصل کرنے کیلئے پھر "الف لام" عہد ذہنی کا بڑھا دیا گیا یعنی السلام الذی وجه للانبیاء علیك ایها النبی والسلام الذی وجه لصالحی الأمم علینا وعلی اخواننا۔ بقول میرکؒ روایت ابن ماجہ ونسائی میں اشهدان محمدًا عبده ورسوله ہے۔

الفصل الثانی:

اشارہ کے وقت اُنگلی کو حرکت دینا

۹۱۱: وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ ثُمَّ جَلَسَ فَافْتَرَشَ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى وَوَضَعَ يَدَهُ الْيُسْرٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُسْرٰى وَحَدَّ مِرْ فَقَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى فَخِذِهِ الْيُمْنٰى وَقَبَضَ ثِنْتَيْنِ وَحَلَقَ حَلْقَةً ثُمَّ رَفَعَ اِصْبَعَهُ فَرَأَيْتُهُ يُحَرِّكُهَا يَدْعُوْبِهَا ۔ (رواہ ابوداودو الدارمی)

أحمد في المسند ٤/٣١٨۔ والدارمي ١/٣٦٢ حديث رقم ١٣٥٧۔ وأخرجه أبوداوٗد ١/٥٨٧ حديث رقم ٩٥٧۔ والنسائي ٣/٣٧ حديث ١٢٦٨۔

ترجمہ: "حضرت وائل بن حجرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ سے اٹھ کر اس طرح بیٹھے کہ اپنا بایاں پاؤں بچھالیا اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھ لیا اور دائیں ران پر دائیں کہنی الگ رکھی اور دونوں انگلیاں بند کر کے حلقہ بنایا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کی انگلی اٹھائی اور میں نے دیکھا کہ آپ انگلی کو حرکت دیتے تھے اور اس کے ساتھ اشارہ کر رہے تھے۔" (ابوداؤد، داری)

تشریح: عن وائل بن حجر عن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: یعنی راوی نے۔

ثم جلس: یعنی نبی علیہ السلام، اس کا عطف کتاب الصلاۃ کی حدیث پر ہے اور وہ یہ کہ راوی نے کہا کہ میں آپ علیہ السلام کی نماز دیکھ رہا ہوں کہ آپ ﷺ کیسے نماز پڑھتے تھے، چنانچہ آپ علیہ السلام کھڑے ہوئے اور قبلہ کی طرف چہرہ کیا پھر تکبیر کہی، اور ہاتھ کانوں تک اٹھائے پھر دائیں ہاتھ سے بائیں کو پکڑا، پھر جب رکوع کا ارادہ فرمایا تو اسی طرح ہاتھ اٹھائے پھر ہاتھ گھٹنوں پر رکھے پھر جب رکوع سے سر اٹھایا تو اسی طرح رفع یدین کیا پھر جب سجدہ کیا تو سجدہ کی جگہ دونوں ہاتھوں کے درمیان سر رکھا پھر بیٹھ گئے، بقول طیبیؒ کے۔ اور ابن حجرؒ نے بھی ان کی طرح کہا اور بقول طیبیؒ اس کا عطف واذا نهض رفع یدیه قبل رکبتیه پر ہے جو باب السجود کے شروع میں ہے۔

فافترش رجله الیسری: یعنی اور اس کے باطن پر بیٹھے اور بایاں پاؤں کھڑا کیا۔

وضع یده السیری علی فخذه الیسری وحدّ: ماضی مجہول کے صیغہ کے ساتھ، دال کی تشدید کے ساتھ "واوٗ" عاطفہ کے بعد۔

مرفقة: میم کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ، اور اس کا عکس بھی ہوتا ہے

اليمنى على فخذه اليمنى: بقول بعض "حد" کا اصل معنی روکنا اور دو چیزوں کے درمیان فصل کرنا ہے، اور اس ہی سے نام پڑ گیا المناهى حدود الله اور مطلب یہ ہے کہ کہنی اور پہلو کے درمیان فاصلہ رکھا، اور ران سے اونچے ہونے کی حالت میں آپس میں مل نہ جائیں۔ طیبیؒ نے اسی طرح کہا ہے۔ اور بقول مظہر یعنی کہنی کو ران سے بلند کیا اور کہنی کی ہڈی کو مسنخ کے سر کی طرح بنایا، پس طیبیؒ نے "حد" دال کی تشدید کے ساتھ الحدة سے لیا ہے اور بقولِ اشرف "حدّ" کے مبتداء ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے البتہ مرفق کی طرف مضاف ہونے کا اور على فخذه کے خبر اور جملہ کے حال ہونے کا احتمال ہے۔

دوسرا احتمال وضع کے مفعول پر عطف کی وجہ سے ہے نصب کا بھی ہے یعنی: **وضع يده اليسرى على فخذه اليسرى، ووضع حد مرفقه اليمنى على فخذه اليمنى**۔ میرکؒ نے اس کو نقل کیا اور اس کے نیچے لکھا ہے کہ اس میں نظر ہے اور ہوسکتا ہے کہ وجہ نظر یہ ہو کہ کہنی کا سرا رکھنا کسی ایک عالم سے بھی ثابت نہیں، اور بیہقی کی تصحیح شدہ حدیث کے مطابق اس قول پر کوئی دلالت نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے دائیں کہنی دائیں ران پر رکھی، جیسا کہ مخفی نہیں اور بعض نسخوں میں **وحّد مرفقه** ہے، توحید سے، یعنی ران سے اس کو الگ رکھنا۔

وقبض: یعنی دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پکڑا۔

ثنتين: یعنی چھنگلی اور اس کے ساتھ والی دونوں انگلیوں کو۔

وحلق: لام کی تشدید کے ساتھ حلقہ بنایا۔

حلقة: لام کے سکون و فتح کے ساتھ، یعنی انگوٹھے کو بڑی انگلی کے ساتھ پکڑا، حلقہ کی طرح۔

ثم رفع اصبعه: یعنی شہادت کی انگلی، جیسے کہ پہلے گزر چکا۔

فرايته: صحیح نسخوں میں اسی طرح ہے یعنی میں نے نبی علیہ السلام کو دیکھا۔

يحركها: اس کا ظاہر مذہب امام مالک کے موافق ہے لیکن آئندہ آنے والی روایت سے معارض ہے جس میں آپ علیہ السلام کا حرکت نہ دینا مروی ہے اور يحرك بمعنی يرفع ہونا بھی ممکن ہے اس لئے کہ بغیر اٹھائے حرکت دینا ممکن نہیں، واللہ اعلم۔

بقول مظہر اشارہ کیلئے انگلی اٹھاتے وقت اس کو حرکت دینے میں اختلاف ہے اور اصح بلا تحریک نیچے رکھنا ہے۔

(يدعو بها) یعنی اشارہ کرتے، یعنی ایک انگلی اٹھا کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف دُعا یعنی تشہد میں، اور وہ حقیقت میں شہادتین کے الفاظ بولنا ہے اور تشہد کو دُعا اس لئے کہا کیونکہ اس میں دعا بھی ہے اور اسی وجہ سے اُحد اُحد کے الفاظ وارد ہیں، جیسا کہ عنقریب آئے گا۔

رواه ابوداود: بقول میرکؒ ابوداوٗد نے اس کو ضعیف نہیں کہا اور منذری نے اس پر سکوت کیا۔

والدارمى: بقول میرکؒ نسائی نے بھی۔

اشارہ کے وقت اُنگلی کو حرکت دینے کی نفی

۹۱۲: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُشِيْرُ بِاِصْبَعِهٖ اِذَا دَعَا وَلَا

يُحَرِّكُهَا (رواه ابوداود والنسائى وزادابوداود) وَلَايُجَاوِزُ بَصَرُهٗ اِشَارَتَهٗ۔

أخرجه أبوداؤد ١/٦٠٤ حديث رقم ٩٩٠ والنسائى ٣/٣٩ حديث ١٢٧٥۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے تھے جب دعا کرتے تھے اور انگلی کو حرکت نہیں دیتے تھے۔ (ابوداؤد۔نسائی) ابوداؤد نے یہ الفاظ زیادہ نقل کیے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اشارہ سے تجاوز نہ کرتی تھی۔''

تشریح: ابوداؤد کی روایت میں جو اضافہ ذکر کیا گیا ہے۔ **لایجاوز بصره اشارته**۔ اس کے تین معانی ہیں۔

كان النبى صلى الله عليه وسلم يشير باصبعه اذا دعا) یعنی جب کلماتِ توحید کہتے۔

ولا يحركها : بقول ابن الملکؒ اس پر دلالت کرتی ہے کہ اشارہ کے کیلئے اٹھاتے وقت حرکت نہ دیتے تھے اور امام ابو حنیفہؒ اسی پر ہیں۔

رواه ابوداؤد: بقول نوویؒ اس کی سند صحیح ہے اس کو میرک نے نقل کیا، اور تعارض کے وقت پہلی حدیث کو ترجیح ہوگی کیونکہ وہ روایت ان الفاظ سے ساکت ہے۔

والنسائى وزاد ابوداود: یعنی سند صحیح کے ساتھ، بقول ابن حجرؒ۔

ولا يجاوز بصره اشارته : یعنی آنکھ اشارہ کے تابع ہوتی اس لئے کہ یہ اَدب خضوع کے موافق ہے اور مطلب یہ ہے کہ توحید کی طرف اشارہ کرتے وقت آسمان کی طرف نظر نہیں اٹھاتے تھے، جیسا کہ بعض لوگوں کی عادت ہے، بلکہ انگلی کی طرف دیکھتے تھے اور اس کے آگے نظر نہیں بڑھتی تھی تا کہ اللہ تعالیٰ کے آسمان پر ہونے کا وہم نہ ہو اور اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند ہیں، بقول ابن حجرؒ **تحريك الاصابع مذعرة للشيطان** والی حدیث ضعیف ہے۔

اشارہ ایک اُنگلی سے ہوگا

۹۱۳: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ اِنَّ رَجُلاً كَانَ يَدْعُوْ بِاِصْبَعَيْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَحِّدْ اَحِّدْ .

(رواه الترمذى والنسائى والبيهقى فى الدعوات الكبير)

أخرجه الترمذى ٥/٥٢٠ حديث ٣٥٥٧۔ والنسائى ٣/٣٨ حديث ١٢٧١ وأحمد ٢/٥٢٠۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی تشہد میں دو انگلیوں سے اشارہ کرتا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ ایک ہی انگلی سے اشارہ کرو۔ ایک ہی انگلی سے اشارہ کرو۔ (ترمذی۔نسائی) امام بیہقی نے اس کو دعوات کبیر میں روایت کیا ہے۔''

تشریح: **قال ان رجلا**: (بقول میرک) وہ سعد بن ابی وقاصؓ ہیں جیسا کہ ابوداؤد اور نسائی کی روایت میں حدیثِ سعد میں وارد ہے۔

كان يدعو: یعنی اشارہ کرتے تھے۔

باصبعيه: بظاہر شہادت اور بڑی انگلی ہوگی۔

فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم احد احد: بقول ابن الملکؒ تکرار ایک (انگلی سے اشارہ) کی تاکید کیلئے ہے یعنی ایک انگلی سے اشارہ کر۔ اس لئے کہ جس ذات کی (وحدانیت) کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ تنہا ہے اور اس کی اصل وحد ہے جو توحید سے امر حاضر کا صیغہ ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار ہے، "واو" کو ہمزہ میں بدل دیا جیسے أحد، إحدى، أحاد، ''واؤ'' کو تینوں حالتوں مضموم، مکسور، مفتوح، میں ہمزہ سے بدل دیا گیا لیکن مضمومہ کا بدلنا قیاسی ہے جیسے قولِ باری تعالیٰ: أقتت میں ہے البتہ غیر مضمومہ واؤ کا ہمزہ میں بدلنا سماعی ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ایک انگلی اٹھا اس لئے کہ جس ذات کی وحدانیت کی طرف تیرا اشارہ ہے وہ تنہا ہے جس کا ثانی نہیں ہے نہ ذات میں نہ صفات میں۔ اور ہو سکتا ہے کہ تکرار اسی معنی کیلئے ہو۔

رواه الترمذی: اور اس کو حسن غریب کہا ہے۔ میرکؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

والنسائی والبیهقی فی الدعوات: یعنی کتاب الدعوات میں۔ (الکبیر) یعنی بیہقی کی۔

قعدہ میں بیٹھنے کا صحیح طریقہ

۹۱۴: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَجْلِسَ الرَّجُلُ فِي الصَّلَاةِ وَهُوَ مُعْتَمِدٌ عَلٰى يَدِهٖ (رواه احمد وابوداود وفی روایة) لَهٗ نَهٰى اَنْ يَعْتَمِدَ الرَّجُلُ عَلٰى يَدَيْهِ اِذَا نَهَضَ فِي الصَّلَاةِ۔

أخرجه أبو داوٗد ۲/ ۶۰۴ حديث ۹۹۲۔ وأحمد ۲/ ۱۴۷۔ والرواية الثانية أخرجها أبو داوٗد ۱/ ۶۰۵ عقب الحديث۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے کہ نماز میں کوئی شخص اپنے ہاتھ پر ٹیک لگا کر بیٹھے۔ (احمد۔ ابوداوٗد) ابوداوٗد کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ کوئی آدمی نماز میں اٹھتے ہوئے ہاتھوں پر سہارا لے۔''

تشریح: قال نهی رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يجلس الرجل فی الصلاة وهو معتمد: یعنی ٹیک لگا کر۔

علی یده: اور ایک نسخہ میں علی یدیه ہے، یعنی بلکہ ان کو رانوں پر رکھے۔

رواه احمد وابوداود وفی روایة له: یعنی روایت ابی داوٗد یہ بھی اضافہ ہے۔

نهی ان یعتمد: یعنی تکیہ لگانا۔

الرجل علی یدیه اذا نهض: یعنی کھڑا ہو۔

فی الصلاة: بلکہ پاؤں کے اگلے حصہ (پنجہ) پر کھڑا ہو بغیر زمین پر سہارا لیے۔ اور امام ابوحنیفہؒ اسی کے قائل ہیں، بقول میرکؒ نقلاً عن الازهار ان یجلس الرجل فی الصلاة وهو معتمد علی یده کا مطلب یہ ہے کہ تشہد میں ہاتھ زمین پر رکھے اور اس پر سہارا لگائے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ آدمی زمین پر بیٹھے اور ہاتھ رانوں کی طرف سے زمین پر لٹکائے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ہاتھ گھٹنوں کے زمین پر لگنے سے پہلے زمین پر رکھے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ قیام کی طرف اٹھتے وقت

ہاتھ زمین پر رکھے اور پہلا قول لفظاً اور آخری قول لفظاً و معنیً انتہائی بعید ہے اس لئے کہ اس کا معنی نہی عن الجلوس کے مناسب نہیں ہے، نیز اگر کسی دوسرے معنی پر محمول کیا جائے تو ایک راوی کی دو روایتوں میں تناقض ہو جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ امام شافعیؒ اسی کے قائل ہیں۔

اور امام ابو حنیفہؒ نے دوسری روایت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ نمازی قیام کیلئے اٹھتے وقت زمین پر ہاتھ نہ ٹیکے اور پاؤں کی پشتہ پر کھڑا ہو اس لئے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے جو روایت کی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدور قدمین پر اٹھتے تھے، اس کو ابو داؤد نے بھی روایت کیا ہے اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قیام کے وقت ہاتھوں پر سہارا لے اس لئے کہ بخاری نے مالک بن حویرث سے روایت کیا ہے کہ نبی علیہ السلام نے زمین پر ہاتھ ٹیکے، اور اس کو بیانِ جواز یا بڑھاپے کی حالت پر محمول کرنا ممکن ہے اور یہ تاویل کے زیادہ قریب ہے اگرچہ روایۃ اصح ہے اس لئے کہ روایتِ ابو داؤد میں لفظ کان ہے جو کہ استمرار پر دلالت کرتا ہے اور استمرار نہی کیلئے اس کی ضد کے مقابلہ میں مؤید ہے اور اس کے ساتھ ہی حدیثِ بخاری نے اعتمادِ یدین کی جگہ بیان نہیں کی لہٰذا اس میں یہ احتمال ہے کہ اعتماد حالتِ سجود میں ہو۔

البتہ ابن حجر یہ کہنا کہ اسی سے اس کا مکروہ ہونا ماخوذ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنا متکبرین کی عادت ہے اور اس سے اعتدالِ جلوس ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اس وقت اس کا چہرہ پر سہارا ہوگا یا ایک طرف جھکا ہوا ہوگا، قابلِ وقعت نہیں ہے اور گویا وہ اپنے ائمہ کی ذکر کردہ تقریر سے غافل ہیں۔ رہا دوسری روایت کو ضعیف کہنا تو بلا ضعف بیان ایسا کرنا اسی پر ردّ ہے خصوصاً جب کہ مجتہد نے اس سے استدلال کیا ہو۔

قعدہ کی مقدار

۹۱۵: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُوْلَيَيْنِ كَأَنَّهٗ عَلَى الرَّضْفِ حَتّٰى يَقُوْمَ۔ (رواه الترمذی وابوداود والنسائی)

أخرجه أحمد ۳۸٦/۱۔وأبو داؤد ۶۰٦/۱حديث ۹۹۵۔والترمذی ۲۰۲/۲حديث ۳٦٦والنسائی ۲۴۳/۲ حديث ۱۱۷٦۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی دو رکعتوں میں اس قدر بیٹھتے تھے گویا کہ آپ ﷺ گرم پتھر پر بیٹھے ہیں۔ یہاں تک کہ کھڑے ہو جاتے تھے۔'' (ترمذی۔ابوداؤد۔نسائی)

تشریح: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الرکعتین الاولیین: یعنی دو رکعتوں کے بعد، اور وہ تین یا چار رکعت والی نماز میں قعدہ اولی ہے، بقول ابن الملکؒ۔

کانہ: یعنی بیٹھنے والے۔

علی الرضف حتی یقوم: ضاد کے سکون اور فتح کے ساتھ، اور اس کے بعد فاء، رضفۃ کی جمع ہے۔ آگ پر تپائے ہوئے پتھر کو کہتے ہیں، البتہ ابن حجرؒ کا کہنا کہ الرضف ''راء'' اور ''ضاد'' کے فتحہ کے ساتھ، رضفۃ کی جمع ہے اور ضاد کے سکون

کے ساتھ بھی مروی ہے، صحیح نسخوں کے خلاف ہے نیز قاموس کے متضاد ہے۔ بقول طیبیؒ ابن مسعودؓ کی مراد تین چار رکعت والی نماز میں قعدہ اولی مختصر کرنا اور قیام میں جلدی کرنا ہے یعنی تشہد اول میں زیادہ دیر ٹھہرا نہ رہے بلکہ اس کو مختصر کر کے جلدی کھڑا ہو جائے جیسا کہ وہ گرم پتھر پر بیٹھا ہے چنانچہ ہمارے مذہب کے مطابق تشہد پر اکتفاء کرے گا اور درود اور دُعا نہیں پڑھے گا اور شافعیہ کے نزدیک تشہد اور بطور دُعا درود پڑھے گا۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے ائمہ نے آل رسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم پر تشہد اول میں درود پڑھنے کے مسنون نہ ہونے پر اسی کو دلیل بنایا ہے اور اظہر قول بعض شراح کا ہے وہ یہ کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب پہلی دو رکعتوں میں کھڑا ہو یعنی ہر چار رکعت والی نماز کی پہلی اور تیسری رکعت پر دو رکعتوں میں سے پہلی ہے جن دونوں کے درمیان فصل تشہد فاصل ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ تیسری رکعت دوسرے شفعہ کی پہلی رکعت ہے اور اس معنی کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ فی الرکعتین فرمایا، بعدهما نہیں فرمایا، واللہ اعلم۔

بقول تورپشتیؒ چار رکعت والی نماز کی تیسری اور چوتھی رکعت مراد ہے یعنی ان دو رکعتوں میں سجدہ سے سر اٹھا کر ٹھہرتے نہیں تھے بلکہ سیدھے کھڑے ہو جاتے تھے۔ بقول بعض یہ تاویل ضعیف ہے، اور ان کا تین اور دو رکعتی نماز میں ان الفاظ میں عذر پیش کرنا کہ صحابی نے چار رکعت نماز کا ہر دو رکعت میں سے پہلی رکعت کے ذکر کرنے پر اکتفاء کرنے سے استدلال کرنا تعسف ہے، نیز یہ تاویل اس حدیث کو باب التشہد میں لانے کے موافق نہیں ہے۔ طیبیؒ نے اسی طرح اس کو ذکر کیا ہے اور ضعف ہمارے تاویل کردہ عذر کی قوت سے دور ہو گیا۔ بہر حال اعتراض، اعتراض کو رفع نہیں کر سکتا اور اللہ تعالیٰ مراد بہتر جانتے ہیں۔

(رواه الترمذی وابو داؤد، والنسائی) اور ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے، بقول ابن حجرؒ نووی نے مجموع میں اس کا رد کیا ہے اور کہا ہے کہ حسن و صحیح نہیں بلکہ منقطع ہے اور ابن دقیق العید نے ان کی موافقت میں اس کو ضعیف کہا ہے، اسی وجہ سے ہمارے متاخرین اصحاب کی ایک جماعت نے آل پر درود پڑھنے کے ندب کو اختیار کیا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ نووی نے طرق ترمذی میں سے کسی ایک طریق کے بارے میں رد کیا ہو ورنہ اس جیسی حدیث کا منقطع ہونا مخفی کیسے رہ سکتا ہے، اور ہمارے اس قول پر امام ترمذی کا حسن صحیح کہنا دال ہے۔

اور وہ اس پر محمول ہے کہ اس حدیث کی دو سندیں ہیں اور منقطع وہ سند ہے جسے ترمذی نے حسن کہا ہے تو ان کی مراد یہ ہے کہ یہ حدیث حسن لغیرہ ہے اور وہ غیر دوسری سند ہے جو کہ ان کے نزدیک صحیح ہے، پس غور و فکر کر کیونکہ یہ مشکل جگہ ہے اور امام ترمذی دوسرے لوگوں سے بڑے ہیں۔

الفصل الثالث:

تشہد کی تعلیم کا اہتمام

۹۱۶: عَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُعَلِّمُنَا التَّشَهُّدَ كَمَا يُعَلِّمُنَا السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْاٰنِ بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ الصَّلَوَاتُ الطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ

عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَسْاَلُ اللّٰهَ الْجَنَّةَ وَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ النَّارِ ۔ (رواه النسائی)

النسائی ۲/۲۴۳حدیث ۱۱۷۵۔

ترجمه: ''حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں جس طرح قرآن کی کسی سورت کی تعلیم دیتے تھے اسی طرح تشہد بھی سکھاتے تھے۔بسم اللہ وباللہ...... اللہ کے نام اور اللہ کی توفیق کے ساتھ شروع کرتا ہوں اور تمام تعریفیں اور تمام مالی وبدنی عبادتیں اللہ ہی کے لئے ہیں اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر سلام اللہ کی برکت اور رحمتیں ہوں اور ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر سلام ہو اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور شہادت دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے جنت کی درخواست کرتا ہوں اور جہنم سے پناہ مانگتا ہوں۔'' (نسائی)

تشریح: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يعلمنا التشهد كما يعلمنا السورة من القرآن: یعنی تشہد کے الفاظ کے اختلاف میں سورت کے الفاظ کے اختلاف کی طرح۔

بسم الله وبالله: یہ زیادتی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا تفرد ہے۔

الصلوات الطيبات: حرف عطف کے حذف کے ساتھ، اور لفظ ''لله'' میں اخلاص کی طرف اشارہ ہے۔

السلام عليك ايها النبى ورحمة الله وبركاته: اور صیغہ خطاب کا جائز ہونا آپ علیہ السلام کی خصوصیت ہے۔اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی غائب یا حاضر کو **السلام عليك** کہا جائے تو نماز باطل ہو جاتی ہے۔

السلام علينا وعلى عباد الله الصالحين: اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ نمازی اس کے نیک بندوں میں سے ہیں۔

اشهد ان لا اله الله واشهد ان محمدًا عبده ورسوله: اور اس میں تجدید ایمان اور اس سے متفق ہونے کی تاکید ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا......﴾ [النساء: ۱۳۶] ''اے ایمان والو! ایمان لاؤ''۔ اور آپ علیہ السلام نے فرمایا اپنے ایمان کی تجدید کرتے رہا کرو۔

اسال الله الجنة: اس لئے کہ جنت رضا اور ملاقات کی جگہ ہے۔

واعوذ بالله من النار: اس لئے کہ دوزخ ناراضگی اور بدبختی کی جگہ ہے۔ (رواہ النسائی)

شہادت کی اُنگلی سے شیطان کو تکلیف ہوتی ہے

۹۱۷: وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ كَانَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ اِذَا جَلَسَ فِى الصَّلَاةِ وَضَعَ يَدَيْهِ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ وَاَشَارَ بِاِصْبَعِهٖ وَاَتْبَعَهَا بَصَرَهٗ ثُمَّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَهِىَ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنَ الْحَدِيْدِ يَعْنِى السَّبَّابَةَ۔ (رواه احمد)

أحمد فى المسند ۲/۱۱۹

ترجمہ: ''حضرت نافعؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب نماز میں بیٹھتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھتے تھے اور اپنی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے اور اپنی نظر انگلی پر رکھتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شہادت کی انگلی شیطان پر لوہے سے زیادہ سخت ہے۔'' (احمد)

تشریح: **وعن نافع:** جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے غلام تھے۔

قال کان عبد الله بن عمر اذا جلس فی الصلاۃ: یعنی تشہد کیلئے۔

وضع یدیه علی رکبتیه: اس میں ہاتھوں کے کھولنے اور دائیں ہاتھ کو بند کرنے کا احتمال ہے۔

واشار باصبعه: یعنی شہادت کی انگلی سے۔ **واتبعها:** یعنی اشارہ یا انگلی۔ (بصرہ) اشارہ کرتے وقت۔

ثم قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لهی: وحدانیت کی طرف اشارہ ہے۔

اشد علی الشیطان من الحدید: اس لئے کہ وہ لوہے سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا کہ توحید سے۔

یعنی: یہ راوی کا کلام ہے یعنی لهی ضمیر سے آپ علیہ السلام کی مراد۔

السبابة: یعنی اس سے اشارہ کرنا، بروزن فعالة السب سے جس کا معنی گالی گلوچ دینا، اور کاٹنے کے بھی آتے ہیں اور دوسرے معنی پر حمل کرنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس میں لوہے کا ذکر ہے گویا کہ اس کے اشارہ سے شیطان کی نمازی کو گمراہ کرنے کی طمع کٹ جاتی ہے بقول طیبیؒ کے۔

میں کہتا ہوں پہلا معنی زیادہ مشہور ہے اور اس میں لوہے کے ذکر سے مناسبت اظہر ہے گویا کہ نمازی اشارہ سے اللہ تعالیٰ کی توحید بیان کر کے اس کی حمد بیان کرتا ہے اور شیطان کو شرک کرنے اور بڑی گمراہی میں پڑنے پر ابھار کر اس کی مذمت کرتا ہے اور وہ بھلائی کی بات سے اس قدر متاثر ہوتا ہے جتنا لوہے کے اسلحہ سے متاثر نہیں ہوتا اور کسی نے کیا خوب کہا ہے: ''نیزوں کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں لیکن زبان سے دیئے گئے زخم نہیں بھرتے''۔ (رواہ احمد)

تشہد آہستہ پڑھی جائے

۹۱۸: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ كَانَ يَقُوْلُ مِنَ السُّنَّةِ اِخْفَاءُ التَّشَهُّدِ۔

(رواہ ابوداود والترمذی وقال هذا حدیث حسن غریب)

أبوداؤد ۱/۶۰۲۔ حدیث ۹۸۶ والترمذی ۲/۸۴ حدیث ۲۹۱۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ تشہد آہستہ آواز سے پڑھنا سنت ہے (ابوداؤد۔ ترمذی) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔''

تشریح: بقول طیبیؒ جب کوئی صحابی یوں کہے: **من السنة کذا یا السنة کذا،** تو اس کا یہ قول حکم میں ایسا ہی ہے جیسا کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ جمہور محدثین اور فقہاء کا مذہب ہے اور بعض نے اس کو موقوف بنایا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں اور بقول بعض **سن کذا** کا معنی قال فعل اور قرر کے معنی کو شامل ہے۔